ماہنامہ

فاران

ماہر القادری

جلد (۷) نمبر (۱)

ماهنامه

فاران

اپریل سنہ ۱۹۵۵ء ——— ایڈیٹر ——— ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸ر

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱ر

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ جہاں کسی نے شرک وکفر کیا اور اُس پر فوراً آسمان سے بجلی گر پڑی اور حق کا کلمہ بلند کرنے والے کے سر پر پھولوں کی بارش ہونے لگی - اور نہ یہ ہوتا آیا ہے کہ اہلِ نفاق کے ماتھے پر "نفاق" اور اربابِ خلوص کی پیشانی پر "مخلص" لکھ جایا کرے" تاکہ مخلصین اور منافقین ایک نظر میں پہچان لئے جائیں - اللہ تعالیٰ چاہے تو یہ سب کچھ ہو سکتا ہے - جو بات ہم انسانوں کے نزدیک محال اور ناممکن ہے اللہ کی قدرت کے لئے وہ اس سے بھی زیادہ سہل اور آسان ہے - جتنی آسانی کے ساتھ ہم اپنے پلک جھپکاتے ہیں ـــ مگر اللہ تعالیٰ نے دین و دُنیا کے معاملات میں معجزوں کی بہت کم اور اسبابِ فطرت اور قانونِ قدرت کی زیادہ تر رعایت رکھی ہے !

منافقین خود عام مسلمانوں ہی میں ملے جُلے رہتے ہیں اور اسلام ہی کی خیر خواہی کے نام پر اپنے نفاق کے مظاہرے کرتے ہیں - اگر وہ کھُل کر اسلام کی مخالفت کریں تو اُن کی بات کون سُنے - وہ تو اسلام کے بڑے ہمدرد اور مسلمانوں کے انتہائی غم خوار بن کر منظرِ عام پر آتے ہیں - جیسے ملّت کے غم میں ان بیچاروں کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں - اور اسلام کی ترقی کے لئے یہ "مصلحینِ عظام" ہر لمحہ تڑپتے رہتے ہیں !

یہ کام عوام مسلمانوں کا ہے - وہ مخلصین اور منافقین میں تمیز کریں - ان دونوں گروہوں کو پہچانیں اور اخلاص و نفاق کے مابین خطِ امتیاز کھینچ دیں - اور جب وہ ان لوگوں کے نفاق سے آگاہ ہو جائیں تو اس وبا سے صرف خود ہی بچے بچے نہ رہیں بلکہ دوسروں کو بھی بچائیں - کسی مسلمان کو بے راہ روی اور گمراہی سے بچانے کی کوشش کرنا سب سے بڑی نیکی، ہمدردی اور بھلائی کا کام ہے !

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں منافقین کلمہ بھی پڑھتے تھے اور ظاہری طور پر اسلام کی خیر خواہی کا دم بھی بھرتے تھے۔ مگر دل میں اسلام کی ترقی سے جلتے تھے اور اُن کے نفاق کی سب سے بڑی علامت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلاتے تھے۔ اور اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ مسلمانوں کو حضورؐ کی ذاتِ سے جو عقیدت و محبت ہے اور آپؐ کی اطاعت و اتباع کا جو والہانہ جذبہ یہ لوگ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ وہ کسی طرح فنا ہو جائے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی مرکزِ اطاعت نہ رہی اور حضورؐ کا اتباع مدارِ نجات اور ایمان کی اساس نہ رہا تو پھر ایک مسلمان کے مرتد اور ملحد ہونے میں اور کسر ہی کیا رہ جائے گی۔ اُن کے نفاق نے یہ بہروپ بھی اختیار کر رکھا تھا کہ حضورؐ کی محفل میں عام مسلمانوں کی طرح ادب و احترام ہی کے ساتھ آتے جاتے تھے۔ مگر "راعنا" اور "اسمع غیر مسمع" جیسے لفظ بول کر حضورؐ کی تحقیر و اہانت کے پہلو نکالتے اور خوش ہوتے کہ ہم نے زبان کو گھما پھرا کر اور مبہم اور گول مول بات کہہ کر مسلمانوں کو کیسا چکمہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین بھی کر دی اور بظاہر عقیدت مند بھی بنے رہے!

اخلاص و نفاق کے اس فرق کو صرف ایک مثال کے ذریعہ سمجھئے:۔

> ایک شخص اشتراکی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اشتراکیت کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے بھی ملاتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ کارل مارکس کے اشتراکی تصورات میرے لئے قابلِ استناد نہیں ہیں اور نہ کارل مارکس کی زندگی اور اس کے حالات میں میرے لئے کوئی نمونہ ہے۔ صحیح اشتراکیت تو وہ ہے جو میں نے سمجھی ہے۔

کیا ایسے شخص کو اشتراکیت کا مخلص کہا جا سکتا ہے؟ کیا اشتراکی دنیا اس قسم کے منافق کو اپنے اندر گوارا کر سکے گی؟ کیا اشتراکی حکومتیں اس "دشمنِ اشتراکیت" کو کارل مارکس کے خلاف اس پروپیگنڈے کی اجازت دے سکیں گی؟

اشتراکیت میں کارل مارکس کی جو حیثیت ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلام میں اتنی حیثیت بھی نہیں ہے؟ اگر کوئی فلسفی ارسطو اور افلاطون کے فلسفیانہ تصورات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ تو کیا مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے بے نیاز ہو سکتے ہیں؟

قرآن کیا کہتا ہے؟ قرآن کس پر نازل ہوا تھا۔ جبل ابو قبیس اور کوہِ احد پر یا حضرت محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر؟ ہبطِ وحی مکہ اور مدینہ کے کھجور اور ببول تھے یا ذاتِ رسالت مآبؐ تھی؟ اور کیا ایسا ہوتا تھا کہ حضورؐ نے وحی لوگوں کو سنائی اور وحی سناتے ہی کسی غار میں جا کر چھپ گئے اور پھر جب وحی آئی تو اللہ کی وحی سنانے کے لئے دوبارہ بستی میں آ گئے۔ اور تلاوتِ آیات کے بعد پھر گوشہ نشین ہو گئے! اگر حضورؐ وحی سنانے کے بعد انسانوں ہی میں رہے اور بائیس سال سے کچھ زائد مدت تک رہے۔ تو یہ زندگی کس طرح گزاری؟ قرآن کے مطابق یا (نعوذ باللہ) قرآن کے خلاف! یہ تو بدیہی بات ہے کہ رسولؐ وحیِ الٰہی کے خلاف زندگی نہیں گزار سکتا اور اللہ تعالیٰ کسی ایسے انسان کو نبوت کے لئے منتخب کر ہی نہیں سکتا جس کے بارے میں وہ یہ بھی علم رکھتا ہو کہ ہبطِ وحی خود اپنے عمل سے وحی کی مخالفت کرے گا۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے عین مطابق زندگی بسر کی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو آپؐ نے عملاً برت کر دکھایا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول و عمل کی دین میں آخر کوئی حیثیت بھی ہے؟ حضورؐ کا قول و عمل دین کے کسی معاملہ میں کسی نظیر، سند اور نمونہ کی حیثیت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟ یا یہ صرف "تاریخی واقعات" تھے۔ جیسے بادشاہوں

سپہ سالاروں اور فلسفیوں کی زندگی کے ہوا کرتے ہیں۔ کہ ہم اُن کو پڑھ کر خوش اور رنجیدہ تو ہو سکتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی زندگی کے لئے اُن کو نمونہ نہیں بنا سکتے!

اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل کی بس زیادہ سے زیادہ "تاریخی واقعات" کی حیثیت ہے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دُنیا کے لئے "نمونہ" ٹھہرا کر اور:۔

"اطیعوا اللہ" کے ساتھ "واطیعوا الرسول"

فرما کر (معاذ اللہ) ایک عجیب محدود فکر کا ثبوت دیا۔ کیونکہ منکرینِ حدیث کے پیرومرشد اسلم صاحب جیراجپوری کے قول کے مطابق اطاعتِ رسول کا حکم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی تک محدود تھا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسا حکم دیا اور بار بار دیا جس کا تعلق صرف چند لاکھ انسانوں (صحابہ) کی زندگی سے تھا۔ اور قیامت تک کے لئے بے شمار انسانوں سے اس حکم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔! اس قسم کا تصور کیا خود قرآن کے ساتھ مذاق نہیں ہے؟ اگر اسی فکر کا نام "قرآنی فکر" ہے۔ تو پھر وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کا۔ رسُول کا اور قرآن کا تو احترام کرتے ہیں اور اُن پر ایمان بھی لاتے ہیں۔ مگر قرآن کے احکام کو ہر زمانے کے لئے قابلِ عمل نہیں سمجھتے۔ قرآن جس دَور کے لئے نازل ہوا تھا۔ وہ دَور ختم ہو چکا ــــ ان لوگوں کے اس طرزِ فکر اور اسلم جیراجپوری کی "قرآنی فکر" میں کیا فرق ہے؟ دونوں کے سوچنے کا کیا ایک ہی انداز نہیں ہے؟

قرآن پاک میں جو بار بار "اطاعتِ رسول" کا حکم دیا گیا ہے اور یہ تک فرما دیا گیا ہے:۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم۔ قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لایحب الکافرون

اے نبی! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا اور اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ اُن سے کہو "اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کرو" پھر اگر وہ (اللہ اور رسول کی) اطاعت قبول نہ کریں تو اللہ کافروں سے ہرگز محبت نہیں کرتا۔

اس آیت میں نہ کوئی تشابہ ہے نہ ابہام ہے نہ اس میں کسی مابعد الطبیعاتی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ جس میں کسی تاویل کی ضرورت پیش آئے۔ اللہ تعالیٰ نے دوٹوک انداز میں فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی محبت کا عین تقاضا ہے۔ اور جو شخص رسولؐ اللہ کی اطاعت سے روگردانی کرتا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے۔

قرآنِ پاک واضح طور پر کہتا ہے:۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

(جس نے رسولؐ کی اطاعت کی۔ اُس نے دراصل خدا کی اطاعت کی)

حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے "نمونہ" قرار دیا ہے اور یہ بھی فرما دیا گیا ہے:۔

فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلموا تسلیما!

اے محمدؐ! تمہارے رب کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے کو باہمی اختلافات
میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اُس پر اپنے دلوں میں کوئی
تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کر لیں!

ایک غیر مسلم بھی ان آیتوں کو پڑھے گا تو اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اللہ نے اپنی اطاعت کی طرح فرض قرار دیا ہے۔ قرآن کریم کی اس قدر واضح اور محکم آیات کے ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، سنّت اور قول و عمل کو دین میں حجت نہ سمجھنا "منافقت" نہیں تو اور کیا ہے؟ حضورؐ کے ساتھ اس سے زیادہ بیزاری اور دشمنی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے طریقِ عمل، اسوۂ حسنہ اور سنّتِ مطہرہ کو دین سے خارج کر کے اُسے بس "تاریخ" کی حیثیت دے دی جائے!

یہ عجیب منطق اور نرالے قسم کا انصاف ہے کہ جو کوئی قرآن کی متعدد محکم آیات کے بین شواہد و دلائل کے ساتھ کسی قسم کی تاویل کے بغیر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی اطاعت کو فرض اور سرکارؐ کی سنّت کو دین میں حجت بتائے وہ "ملّا" تنگ خیال بلکہ خود قرآن کا مخالف۔ مگر جو کوئی کسی قرآنی دلیل کے بغیر محض اپنی ذاتی رائے سے تیر تکے لڑا کر اور قرآنی آیات کے واضح متن میں افسانوی انداز کی تاویلیں کر کے حضورؐ کی سنت کو "تاریخ سے زیادہ حیثیت نہ دے اور اسے دین سے یکسر خارج کر دے وہ روشن خیال، متنور الفکر اور قرآنی انکار کا سب سے بڑا معلّم، داعی اور مبلّغ! ؏

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد!

کوئی چاہے تو فقیہوں کے "باب الحیل" پر جتنا چاہے برس لے مگر یہ حضورؐ کی اطاعت کا مسئلہ کوئی فقہی حیلہ و تاویل تو نہیں ہے۔ یہ تو قرآن کا عین مطالبہ ہے۔ یہ تو اللہ کی مشیّت کا تقاضا ہے۔ یہ تو وہ حکم ہے۔ جس کے دو مفہوم ہو ہی نہیں سکتے — تو تنگ نظر اور گمراہ وہ لوگ ہیں جو کسی تاویل اور ذاتی رائے کے بغیر قرآنی آیات کو اُسی طرح قبول کر رہے ہیں جس طرح وہ نازل ہوئی ہیں — یا تنگ نظر اور کج فہم وہ حضرات ہیں جو اس قدر محکم آیتوں کی طرح طرح سے تاویلیں کرتے ہیں اور اطاعتِ رسولؐ سے بچنے کے لئے رنگا رنگ نکتے اور بوقلموں حیلے تراشتے ہیں!

اطاعتِ رسولؐ کا نام اگر "ملّا ازم" اور اطاعتِ رسولؐ سے انحراف کا نام "روشن خیالی" ہے۔ تو خدا کی قسم "ملّا ازم" عین دین ہے اور ہر مسلمان "ملّا" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ایسی روشن خیالی سے سو بار پناہ! جس میں اطاعتِ رسولؐ سے گریز کی راہیں اختیار کی جائیں!

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

لقد من اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولا من انفسھم یتلوا علیھم
آیٰتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ (آلِ عمران)

(اہلِ ایمان پر اللہ نے احسان کیا ہے کہ اُن کے درمیان خود انہی میں ایک ایسے رسول کو مبعوث فرمایا جو اُس کی آیتیں انھیں سناتا ہے اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور اُن کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت میں ذرہ برابر بھی کوئی ابہام نہیں ہے۔ ایک کھلا ہوا بیان ہے اور محکم آیت ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد

ہر عامی سے عامی شخص اس نتیجہ کے سوا اور کسی نتیجہ پر پہنچ ہی نہیں سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام صرف قرآن کی تلاوت ہی نہیں تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مزکی اور کتاب وحکمت کا معلم بنا کر بھی بھیجا تھا۔

ہر کتاب کی "تعلیم" معلم کی زبان سے شرح وبیان چاہتی ہے۔ اگر کوئی معلم صرف کتاب کے متن ہی کو دہراتا رہے تو وہ "قاری" ہوا۔ "معلم" کہاں ہوا؟ معلم کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ کتاب کی ساتھ ہی ساتھ تشریح کرتا جائے۔ شاگرد کوئی بات پوچھیں تو اُن کو جواب دے کر مطمئن کردے اور جہاں ضرورت محسوس کرے وہاں خود بھی شرح وتفسیر سے کام لے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات کی تشریح اپنے قول ہی سے نہیں عمل سے بھی کی اور یہ آپ کی تعلیم گم نہیں ہوگئی اور نہ بھلادی گئی بلکہ آپ کے شاگردوں (صحابہ) نے اسے سینوں میں اور بعض نے سفینوں میں بھی محفوظ رکھا اور انہوں نے دوسروں (تابعین) سے حضور کی اس تعلیم کو روایت کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کتاب وحکمت کی تعلیم دینا اور اُسے صحابہ کا محفوظ رکھنا اور پھر اُس تعلیم کا دوسروں تک پہنچانا۔ اس میں کون سی بات عقل، تجربہ، درایت، دین، قرآن، ایمان اور اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف ہے۔

اُن شاگردوں سے زیادہ بدبخت کون ہوگا جو اپنے اُستاد کی تعلیم اور شرح وتفسیر کو یکسر فراموش کردیں۔ اور اُستاد بھی کیسا اُستاد جسے اللہ تعالیٰ نے معلم کتاب وحکمت اور مزکی بنا کر بھیجا ہو۔ جس کی اطاعت کو اپنی اطاعت کہا ہو۔ جس کی محفل میں بات چیت کرنے کے آداب لوگوں کو سکھائے ہوں۔ جو سراج منیر ہو۔ جو رحمۃ اللعٰلمین اور رؤف ورحیم ہو۔ کیا عقل باور کرسکتی ہے کہ صحابہ کرام جیسے جاں نثار شاگردوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے شفیق وبرگزیدہ اُستاد کی تعلیم حضور کی وفات کے بعد بھلادی۔ اور اس طرح بھلائی کہ کانوں کان اُس کی کسی کو خبر نہ ہونے دی۔ اور جتنے حصّہ کو یاد رکھا اور لوگوں سے بیان کیا تو اُس کو دین سے یکسر خارج کردیا۔ آپ نے یہ ظلم کبھی سُنا ہے کہ کسی قانون کے شارح اور حَکَم (Judge) کا کوئی فیصلہ اور تشریح قانون میں "نظیر" نہ بن سکے۔ اس کو صرف ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت دے دی جائے!

"طلوعِ اسلام" کا متاثرہ حلقہ اس کو باور کرلے تو کرلے مگر کوئی شخص چاہے اُس کی گرہ میں رمق برابر ہی عقل کیوں نہ ہو اس بات کو درست مان ہی نہیں سکتا! یہ کیسے ممکن ہے کہ صحابہ کرام سفر میں، حضر میں، صلح میں، جنگ میں، حج میں، نمازیں، باغ میں، مکان میں، بازار میں، جنگل میں۔ غرض ہر جگہ آپ کے ساتھ رہتے ہوں اور حضور کے اقوال واعمال کا کوئی نقش ہی قبول نہ کرتے ہوں۔ اور جو نقش انہوں نے حضور کی سیرت سے قبول کئے بھی ہوں وہ حضور کی وفات کے بعد ذہن وقلب سے مٹادیں کہ بس اب ان نقوش کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ اور یہ نقش ہیں بھی، تو ان کی زیادہ سے زیادہ "تاریخ" کی حیثیت ہے!

ایک غیر مسلم دریافت کرسکتا ہے کہ تمہارے رسولؐ پر جو کتاب نازل ہوئی تھی وہ تو یہ "قرآن" ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم کی بناء پر کتاب وحکمت کی جو تعلیم تمہارے رسولؐ دیا کرتے تھے وہ کہاں ہے؟ اس کے جواب میں "منکرینِ حدیث" جو افسانہ بھی تراش دیں تھوڑا ہے۔ مگر خدا اور رسولؐ کے احکام کو ماننے اور جاننے والے احادیث کے مجموعے اس کے جواب میں اُس شخص کے سامنے رکھ دیں گے کہ اس میں ہمارے رسولؐ کی زندگی، سیرت اور تعلیم وحکمت کا ایک ایک نقش محفوظ ہے۔ اس میں یہ تک ملے گا کہ حضورؐ پانی کتنے گھونٹوں میں پیتے تھے اور رات کو کس کروٹ سوتے تھے!

دُنیا میں کیسے کیسے بڑے فرمانروا، شہنشاہ، سپہ سالار، فاتح، فلسفی، علماء وفضلاء۔ یہاں تک کہ انبیاء کرام تک گزرے ہیں۔ مگر کسی کی زندگی بھی اس تفصیل کے ساتھ محفوظ ہے؟ اور وہ بھی تاریخ کے انداز میں نہیں کہ مؤرخ واقعات کو بس بیان کرتا

چلا جاتا ہے۔ حضورؐ کی زندگی کے ضبط و حفاظت کے لئے عظیم الشان فن وجود میں آیا ہے۔ جو راویوں کو پرکھتا ہے، اسناد کی جانچ کرتا ہے، وروایت کے نازک کانٹے پر تولتا ہے۔ اور جس میں جہاں کوئی علت، کمزوری اور شبہ نظر آتا ہے اُسے ظاہر کردیتا ہے۔ اور یہ اہتمام اس لئے کیا گیا ہے کہ دنیا میں صرف اسی "انسانِ کامل" کی زندگی انسانوں کے لئے نمونہ ہے۔ یہ نمونہ گم ہوجاتا تو قرآنی اخلاق کو ایک محسوس اور تجربہ کی ہوئی شکل میں لوگ کہاں ڈھونڈتے؟

اور یہ کون کہتا ہے اور کس نے دعویٰ کیا ہے کہ ان مجموعوں میں جتنی احادیث ملتی ہیں وہ سب کی سب قطعی، صحیح اور یقینی ہیں۔ اگر محدثین کا یہی دعویٰ ہوتا تو پھر حدیثوں کی اتنی قسمیں کیوں بنتیں اور راویوں پر جرح و قدح کیوں ہوتی؟ بس یہ کہہ دیا جاتا کہ جو کچھ ان کتابوں میں درج ہے وہ لفظ بلفظ صحیح اور یقینی ہے اور قرآن کی طرح یہ سب کے سب مجموعے "لاریب فیہ" ہیں!

محدثین کرام کی دیانت کی سب سے بڑی دلیل یہی تو ہے کہ انہوں نے احادیث کو پرکھا اور جانچا ہے اور صرف کسی کے "قال قال رسول" کہنے پر آنکھ بند کرکے ہر قول کو قبول نہیں کرلیا۔ اگر یہ لوگ خدا نخواستہ دین کے معاملہ میں غیر مخلص ہوتے تو اسناد وروات اور اسماء الرجال کی اس قدر کد وکاوش کی کیا ضرورت تھی؟ ان برگزیدہ نفوس کا تو نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ علمی دنیا پر احسان ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو صحیح سے صحیح طریقہ پر جانچنے کی جو کوششیں ہوسکتی تھیں وہ سب کی سب صرف کردیں۔ (رحمہم اللہ تعالیٰ)

"منکرینِ حدیث" جو احادیث پر جرح و قدح فرماتے ہیں۔ تو اسے دیکھ کر ناواقف اور سیدھے سادے لوگ مرعوب ہوجاتے ہیں کہ کیا تحقیق ہے، کیا استدلال ہے؟ کیا ژرف بیں نگاہ پائی ہے؟ حالانکہ یہ سب اُنہی محدثین کرام کی خوشہ چینی ہے جن کو یہ بدتوفیق گروہ "دین میں سازش کرنے والا" کہا کرتا ہے! اور پھر اس بددیانتی اور ہٹ دھرمی کی بھی کوئی حد ونہایت ہے کہ ان محدثین کی "جرح و قدح" تو قبول کرلی جاتی ہے۔ مگر جن حدیثوں کی یہ تصویب کرتے ہیں اور صحیح بتاتے ہیں اُن سے صرفِ نظر کرلیا جاتا ہے! اس علمی اور فکری تضاد کو کیا کہئیے؟

"منکرینِ حدیث" کو دین کے جس اصل اور فرع پر چوٹ کرنی ہوتی ہے تو اسے "ملاازم" کہہ کر مطعون کرتے ہیں۔ اور اپنی اس دریدہ دہنی پر ذرہ برابر شرم محسوس نہیں کرتے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال سے اب تک کسی ایک دن کے وقفہ اور تعطل کے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو ہر دور میں دین میں حجت سمجھا گیا ہے! کیا اب تک پوری کی پوری امت حضورؐ کی سنت کو دین میں حجت مان کر گمراہی میں مبتلا رہی ہے؟ کیا یہ ساڑھے تیرہ سو سال کا دور "ملاازم" اور "ملاؤں" کی اجارہ داری کا دور تھا؟ اور یہ احادیث کا ذخیرہ جو کتابوں میں ملتا ہے۔ کیا بریلی، دیوبند اور دہلی کے علماء، مولویوں اور ملاؤں کا جمع کیا ہوا ہے؟ یا کم سے کم بارہ سو سال سے کتابوں میں لکھا ہوا چلا آرہا ہے؟ امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام احمد حنبل، امام شافعی، امام بخاری، ابنِ جوزی۔ ابنِ تیمیہ، ابنِ قیم، شاہ ولی اللہ جیسے مخلص، ثقہ، پاکباز، پاک نفس صاحبِ دیانت و فراست لوگوں میں کون "ملا" تھا۔ اگر یہ سب "ملا" تھے تو پھر "ملا" گالی نہیں بہت بڑا اعزاز ہے یہ طنز نہیں تحسین ہے۔

دین کے سب سے بڑے اجارہ دار تو "بزمِ طلوعِ اسلام" کے ارکان بنے ہوئے ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ اگلے پچھلے تمام مفسرین، محدثین اور فقہاء وعلماء سے کٹ کر ہماری طرف آؤ کہ ہم جو قرآن کی تشریح کردیں بس وہی عین حق وصداقت ہے۔ دین کو، قرآن کو، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو، اسلام کی مرکزیت کو جیسا ہم نے سمجھا ہے۔ اُس کی ان "ملاؤں" کو ہوا بھی

نہیں لگی! بیشک نہیں لگی اور خدا نہ کرے کہ کسی کو یہ ہوا لگ جائے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے بے نیاز ہو کر دین کو کسی نے آج تک نہیں سمجھا۔ یہ جدت و بدعت تو "منکرین حدیث" ہی کے حصہ میں آئی ہے کہ وہ حضور کی سنت کو پس پشت ڈال کر "ربوبیت عامہ" کا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں!

احادیثِ رسولؐ کے خلاف ان محاذ قائم کرنے والوں سے ہم پوچھتے ہیں کہ اسلامی تاریخ کا جتنا بھی حصہ تمہارے نزدیک معتبر ہے۔ کیا اس میں یہ چیز نہیں ملتی کہ اُمّتِ مسلمہ میں فقہی اختلاف اور کلامی مباحث کے باوجود جو چیز قدرِ مشترک رہی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کے ساتھ حضورؐ کی سنّت کو بھی دین کا ستون اور اسلام کا رکن سمجھا گیا ہے!

صحابہ کرامؓ سے بڑھ کر قرآن کا سمجھنے والا اور دین کی روح کا پہچاننے والا اور کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے احادیثِ رسولؐ کو دین میں جس طرح حجت سمجھا اس کی ہزاروں مثالیں کتابوں میں موجود ہیں۔ جب یہ مشاہدات اور واقعات ہیں تو پھر کوئی شخص اسلام کی تیرہ سو سالہ تاریخ سے آنکھیں بند کرکے اور یہ سمجھ کر کہ یہ سب کا سب موضوع اور جعلی ہے کیا پرویز صاحب کے ارشادات پر ایمان لے آئے! اور اگر نہ لائے تو وہ مُلّاؤں کے دام میں گرفتار ہے۔ وہ کج فہم ہے۔ دین سے ناآشنا ہے!

یہ عجیب منطق ہے کہ دین میں اگر علمائے کرام بولیں تو وہ "اجارہ داری" ہے۔ پروہتوں اور پنڈتوں کی طرح دھرم کی ٹھیکیداری ہے۔ مگر پرویز صاحب دین کی جو شرح فرمائیں۔ اس پر ایمان لانا حریتِ فکر کی دلیل ہے۔ یہ آزادیٔ رائے ہے۔ دینی مسائل میں پرویز صاحب کے فکر و اجتہاد قبول کرنے سے نہ آزادیٔ فکر پر کوئی حرف آئے گا اور نہ حریتِ ضمیر مجروح ہوگی؟ یہ حضرت سب پر تنقید کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ان پر کوئی تنقید کر ہی نہیں سکتا۔ اور ایسی جرأت کر بیٹھے تو وہ "ملّا گزیدہ" اور "مولوی پرست" ہے!

یہ تو ہو سکتا ہے اور ایسا ہوتا آیا ہے کسی ایک یا چند فرعی مسائل میں علماء کے ایک گروہ سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے خود ائمہ فقہا کے شاگردوں نے استادوں سے اختلاف کیا ہے اور ان کا یہ اختلاف اس بات کی دلیل ہے کہ ائمہ، محدثین اور علماء کو "معصوم" کسی نے نہیں مانا۔ اور نہ ان کی رائے کو خدا اور رسولؐ کے حکم کا درجہ دیا۔ مگر سنّتِ رسولؐ کے حجت ماننے یا نہ ماننے کا اختلاف کوئی فقہی یا فرعی اختلاف نہیں ہے۔ یہ تو بنیادی اختلاف ہے۔ یہ تو کفر و ایمان کا سوال ہے، بالکل اسی طرح جس طرح خود حضورؐ کی رسالت کا اقرار ایمان کی بنیاد ہے۔ حضورؐ کی سنّتِ مطہرہ تو ہماری جان و ایمان کے ساتھ اس طرح مربوط و متصل ہے کہ ہم اسے چھوڑ کر ایمان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور ہمارے اس عقیدے پر قرآن گواہ ہے۔ اور اس کی بے شمار نظیریں صحابہ کرامؓ کے حالات میں ملتی ہیں!

متقشف سے متقشف علماء بلکہ گروہ بند علماء کے یہاں بھی مذہب کی اس اجارہ داری اور چودھراہٹ کی پرچھائیں بھی نہیں ملتی۔ جو اجارہ داری پرویز صاحب نے قائم کر رکھی ہے۔ علماء جو کچھ کہتے ہیں قرآن، حدیث، آثار اور فقہاء کے اجتہادات کے حوالے سے کہتے ہیں۔ مگر پرویز صاحب اپنے زعم میں بجائے خود حجت اور اتھارٹی ہیں۔ درمیان کے تمام سلسلے غائب۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا بھی انکار! اب لے دے کر قرآن رہ جاتا ہے۔ تو اسے جس طرح یہ "مسٹر" سمجھا دیں وہی حق ہے اور اسی پر ایمان لانا ضروری ہے!

قرآن تو یہ کہتا ہے کہ کسی مسئلہ میں جب تنازع پیدا ہو جائے تو۔

"فردوا الی اللہ والرسول"

مگر پرویز صاحب "المرسول" کا واسطہ درمیان سے اڑا کر صرف "الی اللہ" باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ "الی اللہ" سے مراد قرآن پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ خود تو آکر کسی معاملہ کا تصفیہ نہیں کیا کرتا۔ "قرآن" کے افہام و تفہیم میں اگر دقت پیش آئے تو کیا کریں؟ یہی کریں کہ اب تک کے تمام مفسرین، محدثین اور فقہا کے تمام علمی اور دینی کارناموں کو بالائے طاق رکھ کر "نظامِ ربوبیتِ عامہ" کے اس علمبردار کے ارشادات کو قبول کر لیں کہ حق جو تیرہ سو سال سے مظلومیت کی زندگی گزار رہا تھا اور کوئی اسے پناہ دینے والا نہ تھا، اب وہ "طلوعِ اسلام" والوں کی پناہ میں آگیا ہے؟؟؟

کیا یہی دینِ خالص ہے؟

"مرکزی بزم طلوعِ اسلام۔ کراچی" کا ایک ۱۶ ورق کا کتابچہ ہمارے سامنے ہے جس کا نام "دینِ خالص" رکھا گیا ہے۔ اس کتابچہ پر اگر شروع سے لے کر آخر تک گفتگو کی جائے تو پوری ایک کتاب بن جائے گی۔ ہم بس دو تین سامنے کی باتوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے گزر جائیں گے!

"طلوعِ اسلام" کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ مسلمانوں جیسی زندگی بسر نہ کریں......"

اگر "طلوعِ اسلام" یہی کہتا ہے تو پھر اس کے اور عام مسلمانوں کے درمیان سرے سے کوئی وجہ نزاع ہی نہیں ہے حالانکہ یہ عبارت لکھ کر "طلوعِ اسلام" نے مسلمانوں کو بڑا چکمہ دیا ہے اور وہ بات کہی ہے جو اس کے ضمیر، مسلک، مشرب اور عزائم کی آواز نہیں ہے!

مسلمان تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو دین میں حجت سمجھتے ہیں اور حضورؐ ہی کی سنت کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ مسواک سے لے کر تلوار تک اور گھر کے باورچی خانے سے لے کر ایوانِ حکومت تک کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسولؐ کے اتباع ہی کو مسلمان اپنے لئے ذریعۂ نجات اور سرمایۂ سعادت جانتے ہیں۔ مگر "طلوعِ اسلام" کا مشن ہی احادیث کی مخالفت ہے۔ سنتِ رسولؐ کی مخالفت میں طلوعِ اسلام کی شدت کا یہ عالم ہے کہ قراردادِ مقاصد میں پاکستان کے دستور کی بنیاد "کتاب و سنت" کو جو قرار دے دیا گیا ہے تو وہ "سنت" کو کاغذ پر لکھا ہوا دیکھ کر کیسے کیسے پیچ و تاب کھاتا ہے اور "طلوعِ اسلام" کی تمام کوشش اسی تخریب کے لئے وقف ہیں کہ "سنت" کا نام دستور سے خارج کر دیا جائے۔ فکر و نظر کے تضاد کا جب یہ بعد المشرقین ہے تو عام مسلمانوں کی زندگی "طلوعِ اسلام" کے قائم کئے ہوئے معیار سے کیا مطابقت رکھتی ہے؟ مسلمان جس چیز (سنتِ رسولؐ) کو اپنی زندگی کے لئے کامل ترین نمونہ سمجھتا ہے اور جس سے سرِ مو تجاوز اس کے نزدیک معصیت ہے اور جس سے بیزاری، دوری اور عداوت اس کی نگاہ میں ایمان کی نفی اور اسلام کا انکار ہے۔ وہی سنتِ رسولؐ "طلوعِ اسلام" کی نگاہ میں دین کا سب سے بڑا فتنہ اور قرآن کے خلاف سب سے بڑی عجمی سازش ہے!

مسلمان تو عید الضحیٰ پر قربانی کرتے ہیں مگر "طلوعِ اسلام" اُسے اسراف کہتا ہے! اس کتابچہ میں یہ لکھا ہے کہ "طلوعِ اسلام کبھی یہ نہیں کہتا کہ آپ پانچ نمازیں نہ پڑھئیے۔ تین پڑھیں یا اس طرح نہ پڑھیں اس طرح پڑھیں"۔ مگر اس سے قبل "طلوعِ اسلام" نے یہ بھی کہا ہے کہ "اقامتِ صلوٰۃ کو مسلمانوں نے نماز سے بدل دیا"۔ یعنی مسلمانوں کی نماز "طلوعِ اسلام" کے خیال میں قرآن کی "اقامتِ صلوٰۃ" سے کوئی مختلف چیز ہے۔ قدم قدم پر مسلمانوں کی دینی زندگی "طلوعِ اسلام" کے افکار و تصورات سے ٹکراتی ہے۔ اور ٹکرانی ہی چاہیئے کہ جس سنتِ رسولؐ کو مسلمان اپنی زندگی کی اساس معراج اور روح سمجھتا ہے، وہی چیز "طلوعِ اسلام" کی نگاہ میں غلط ہے۔ فاسد ہے اور فتنہ ہے (معاذ اللہ) اس صورت

میں کوئی شخص مسلمانوں جیسی زندگی بسر کرتے ہوئے "طلوع اسلام" کے مشن کا ساتھ کیسے دے سکتا ہے! اگر کوئی مسلمان "طلوع اسلام" کے پروگرام کا ساتھ دینا چاہتا ہے تو اسے لامحالہ اپنی "مسلمانوں جیسی زندگی" سے دستکش ہونا پڑے گا۔ یہ دو نقضاد ساتھ ساتھ چل ہی نہیں سکتے ؟

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جو بزرگ اصلاح وتجدید کا پروگرام لے کر اٹھے ہیں۔ انہوں نے "کتاب وسنت" ہی کی بنیاد پر دین کی تجدید کی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ نے اصلاح وتجدید کا علم بلند کیا اور شہنشاہی کو جھکا دیا۔ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا تو لقب ہی "محی الدین" پڑ گیا کہ آپ نے عقائدِ فاسدہ اور تصوراتِ باطلہ کی اس شدت سے تردید فرمائی کہ عرب وعجم اس کے شور سے گونج اٹھے اور ہزاروں بدعقیدہ لوگوں نے آپ کے دستِ حق پرست پر توبہ کی اور لوگوں کی زندگیاں بدل گئیں!

"طلوع اسلام" اگر شرک وبدعت کے خلاف آواز بلند کرے تو کون اہلِ حق اس کی ہمنوائی نہ کرے گا۔ بزم طلوع اسلام" اگر غلط اور بے بنیاد روایتوں کو چھانٹ کر الگ کردے تو اس کی یہ کوشش سراہی جائے گی۔ ادارہ طلوع اسلام اگر فقہاء کے کتاب وسنت کے مخالف اجتہاد وقیاس کی نشاندہی کردے اور نئے مسائل میں خود اجتہاد کرے تو اس پر ہر سنجیدہ مسلمان غور کرے گا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ طلوع اسلام "مجدد الف ثانی" نہیں "مسیلمہ کذاب" بن کر سامنے آیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے تیشہ "سنتِ رسول" پر چلایا ہے۔ اور یہی اس کا سب سے بڑا مشن ہے! رہا مسلمانوں کا غلبہ تو "سنتِ رسول" کو چھوڑ کر اگر مسلمان تمام دنیا پر غالب بھی آجائیں تو یہ مسلمانوں کا نہیں "بے دینوں" کا غلبہ ہوگا۔ سنتِ رسول سے عداوت وبیزاری سے بڑھ کر بے دینی اور کیا ہوگی؟ "اطاعتِ رسول" کے بغیر "اطاعتِ الٰہی" کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا!

تسخیرِ کائنات کا وہ پروگرام اور ربوبیتِ عامہ کا ایسا نظام ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔ جس سے "سنتِ رسول" کو خارج کر دیا گیا ہو۔ جس میں سنتِ رسول شامل نہ ہو مسلمان کے لئے وہ سربلندی سب سے بڑی ذلت ہے مسلمان رسول اللہ سے بے وفائی کر کے مسلمان ہی کب رہ سکتا ہے۔ اور جب دنیا کی ترقی ہی مقصود ٹھہری تو ایک مسلمان "طلوع اسلام" کے پروگرام کا ساتھ دے کر کسی آنے والے فائدے کے انتظار میں کیوں رہے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ وہ نصرانی یا یہودی بن جائے کہ اس کو ہاتھ کے ہاتھ دنیا کے فائدے مل جائیں گے اور خود پاکستان میں قادیانی مشن اس کو ہر طرح کے منافعے اور سہولتیں مہیا کردے گا!

"دینِ خالص" کے صفحہ ۸۔ اور ۹ پر قرآن کی آیت ترجمہ کے ساتھ درج ہے:۔

ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکمہ والنبوہ ثم یقول للناس
کونوا عباداً لی من دون اللہ ولکن کونو ربانین بما کنتم تعلمون
الکتاب وبما کنتم تدرسون۔ (۳ : ۷۸)

"کسی انسان کے لئے جائز نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کرے تو وہ لوگوں سے یہ کہنے لگ جائے کہ تم خدا کے احکام کی نہیں بلکہ میرے احکام کی تابعداری کرو۔ وہ یہی کہیگا کہ تم اس ضابطہ قوانین خداوندی کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو اور جس کی تعلیم عام کرتے ہو ایسے انسان بن جاؤ کہ خدا کی صفتِ ربوبیتِ عالمینی کے مظہر ہوں۔

فارسی میں ایک قدیم ترجمہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ صاحب کا فارسی ترجمہ بھی موجود ہے۔ اُردو میں قرآن پاک کے متعدد تراجم ہیں۔ انگریزی میں سیل اور پکتھال کے تراجم پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دُنیا کی بیسیوں زبانوں میں قرآن کے تراجم ہوئے ہیں۔ ان سب تراجم کو پڑھیئے۔ اور پھر اس ترجمہ کو ملاحظہ کیجئے جو "کونوا عبادا لی من دون اللہ" کا ترجمہ "طلوعِ اسلام" نے کیا ہے۔ آپ دنگ رہ جائیں گے کہ یہ ترجمہ نہ صرف یہ کہ تمام ترجموں سے لفظی طور پر مختلف ہے بلکہ "تحریف قرآنی" کی بدترین مثال ہے!

ہم اس ترجمہ کے لئے کسی عربی داں یہودی اور نصرانی عالم تک کو حَکم بنانے کے لئے تیار ہیں۔ کہ یہ ترجمہ جو "طلوعِ اسلام" نے کیا ہے وہ "ترجمہ" یا "ترجمانی" نہیں کھُلی ہوئی "تحریف" اور صریحاً بددیانتی ہے!

"کونوا" ـــــ ہو جاؤ یا بن جاؤ ـــــ "عباداً" ـــــ (عبد کی جمع) بندے ـــــ "لی" ـــــ میرے ـــــ "من دون اللہ" ـــــ اللہ کے سوا ـــــ! اس میں "احکام کی اطاعت" کا کہاں ذکر ہے؟ قرآن کے ساتھ قرآن ہی کی حمایت کے نام پر جو یہ مذاق ہو رہا ہے۔ اُس کے لئے فریاد لے کر آخر ہم کس کے پاس جائیں۔ اپنا دُکھ کس سے کہیں کہ سنتِ رسولؐ کے مٹانے کی آڑ میں خود قرآن ہی کا "مُثلہ" کیا جا رہا ہے۔ جو بیچارہ عربی نہیں جانتا وہ تو اسی ترجمہ کو درست سمجھے گا۔ اس لئے کہ کوئی مسلمان اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن کے ترجمہ میں کوئی شخص جس کا مسلمانوں کا سا نام ہو۔ تحریف بھی کر سکتا ہے!

سنتِ رسولؐ سے بیزاری اور دشمنی کا لازمی نتیجہ قرآن سے دُوری ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت کا احترام ہی دل سے نکل گیا۔ بلکہ اُس سے کد اور عداوت پیدا ہو گئی تو اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلنے اور مذاق کرنے میں کیا باک ہو سکتا ہے۔ جس آیت کا جو چاہا ترجمہ کر دیا۔ جس تصوّر اور خیال کو چاہا قرآنی تفسیر کا رنگ دے دیا۔ کسی نے ٹوکا تو فرما دیا کہ یہ تو "قرآنی نظامِ ربوبیت" ہے۔ اسلام اب تک غروب ہی ہوتا رہا۔ "طلوع" تو اب ہو رہا ہے۔ اور ....

> "ہمارا مقصد یہ ہے کہ ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دُنیا میں "قرآنی نظامِ ربوبیت" نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح زمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے" (دینِ خالص۔ ص۲)

یہ ڈینگ تو دیکھیے، یہ دعوے تو ملاحظہ فرمائیے! اُس دیدہ دلیر رہزن کو کیا کہیئے جو کھُلے خزانے رہزنی اور بٹ ماری بھی کرتا ہو اور ساتھ ہی یہ دعویٰ بھی کرتا جائے کہ دیکھنا! میرے اس "نظامِ سیاست عامہ" کے تحت ساری دُنیا امانت اور پاکبازی کی روشنی سے جگمگا اُٹھے گی! ـــــ زمانہ کی پستی کی کوئی حد ہے کہ پرویز جیسے کم سواد لوگ دُنیا کی قیادت کے خواب دیکھ رہے ہیں! ؏

تفو! بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

ایک اور شاہکار:۔

"ہمارے "علماءِ کرام" کا مطالبہ ہے کہ یہ ہم سے پُوچھو کہ فلاں معاملہ شریعت کے

مطابق ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے کہتا ہے کہ :۔

"وشاورھم فی الامر" (۳/۱۵۸)

معاملات میں ان سب سے مشورہ کیا کرو۔

"یعنی اللہ اپنے رسول تک سے یہ کہتا ہے کہ معاملات میں امت سے مشورہ کیا کرو اور ہمارے "علماء کرام" امت سے یہ کہتے ہیں کہ تم ہم سے پوچھا کرو اور جو کچھ ہم کہیں اس کے مطابق فیصلے کیا کرو۔ یعنی۔ یہ حضرات اپنا مرتبہ (معاذ اللہ) رسول اللہ سے بھی اونچا سمجھتے ہیں۔" (دینِ خالص ـــ (بزم طلوعِ اسلام) صفحہ ۱۲)

یہ ہے وہ "فکرِ قرآنی" اور "فراستِ ایمانی" جو سنتِ رسول سے بیزاری کے بعد حاصل ہوتی ہے! عوام کو ان چند جملوں میں جو مغالطے دیئے گئے ہیں اُن کے مکر و دنائت کی بھلا کوئی حد ہے! اب جو کوئی ان کھلی ہوئی چالبازیوں، دھوکوں، چکموں اور جھانسوں کے بعد بھی "طلوعِ اسلام" کے پھندے میں پھنس جائے تو اس کی عقل و فراست پر سوائے اس کے کہ فاتحہ پڑھ لی جائے اور کیا کیا جائے!

"وشاورھم فی الامر"

سے یہ مفہوم کہاں نکلتا ہے کہ شریعت کے مسئلہ میں مسلمان آپس میں مل کر بس مشورت کر لیا کریں۔ کسی جاننے والے سے پوچھا نہ کریں۔ اگر اس آیت کا یہی مفہوم ہے تو پھر قرآن کی اس آیت :۔

"فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون"

کی کیا تاویل کی جائے گی؟ کیا قرآن (معاذ اللہ) تضاد و اختلاف کا مجموعہ ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ شریعت کے مسائل میں کسی سے کچھ پوچھنے کے خلاف مشورت کا حکم دیتا ہے اور دوسری طرف فرماتا ہے کہ "جس بات کو تم نہیں جانتے اُسے "اہلِ ذکر" سے پوچھ لیا کرو"۔ علماء کی دشمنی میں اس کا بھی خیال نہ رہا کہ آیت کی ایسی تفسیر سے خود قرآن پاک پر تضاد بیانی کا الزام آرہا ہے۔ مگر قرآن کی حمایت، حفاظت اور عزت "طلوعِ اسلام" کا مقصد کب ہے۔ اُسے تو دنیا کی قیادت کرنی ہے۔ اور "نظامِ ربوبیت عامہ" کو قائم فرمانا ہے۔ اس کے لئے سنتِ رسول کے بعد چاہے قرآن ہی کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے!

دنیا میں کوئی علم و فن بھی ایسا ہے جس کے جاننے اور ماننے والے سب کے سب ایک ہی جیسی قابلیت رکھتے ہوں اور اُن میں کچھ لوگ "ماہرِ فن" یا "عالمِ فن" نہ ہوں اور ناواقف لوگوں کو اُن سے پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آتی ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے اور سوال و جواب کا یہ فطری طریق کار ہے تو قرآن جو صحیفۂ فطرت ہے۔ اس فطری اصول کو نظرانداز کیسے کر سکتا ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ناواقف لوگوں کو حکم دیا ہے کہ وہ "اہلِ ذکر" سے پوچھ لیا کریں!

اگر آج تک اسلامی تاریخ میں کوئی "اہلِ ذکر" نہیں گزرا تو پھر اللہ تعالیٰ نے حق "اہلِ ذکر" کا ذکر فرمایا جبکہ جانتا تھا کہ "اہلِ ذکر" اُمتِ مسلمہ میں پیدا ہی نہیں ہوں گے۔ اور اگر ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد "طلوعِ اسلام" کی بزم میں کچھ "اہلِ ذکر" پیدا ہو گئے ہیں تو پھر :۔

"وشاورھم فی الامر"

کی اس تفسیر کی کیا حیثیت رہ جائے گی جو "طلوعِ اسلام" نے کی ہے!

علمائے کرام کے پاس کیا آج تک کوئی مسلمان درزی یہ پوچھنے کے لئے گیا ہے کہ "میں اوورکوٹ اور پتلون کس طرح تراشوں"۔ کسی مسلمان کسان نے یہ فتویٰ طلب کیا ہے کہ میں اپنے کھیت میں جو ہل چلاتا ہوں یہ شریعت کے مطابق ہے یا نہیں ہے کسی سپاہی نے کسی عالم سے یہ دریافت کیا ہے کہ میں گھوڑے پر کس طرح سوار ہوا کروں۔ کیا اس قسم کے معاملات میں خود علماء نے مسلمانوں سے کبھی اپنے حکم بننے کا مطالبہ کیا ہے!

مگر ہاں جب ہل چلاتے میں ایک کسان کے کپڑوں پر بیل کے پیشاب کی چھینٹیں گر جائیں تو وہ اگر اس مسئلہ کو نہیں جانتا۔ اس صورت میں عالمِ دین سے پوچھ سکتا ہے کہ میرے کپڑے ناپاک تو نہیں ہوگئے۔ اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ مگر "طلوعِ اسلام" یہ فتویٰ دیتا ہے کہ اس معاملہ میں کسی عالم کے پاس دریافت کرنے کے لئے جانا منشاءِ الٰہی کے خلاف ہے۔ کسان کو چاہیئے کہ اپنے بھائی بندوں کو اکٹھا کرکے مشورہ کرے کہ بھائیو! تم رائے دو کہ اس طرح میرے کپڑے ناپاک تو نہیں ہوگئے؟ اس مجلسِ شوریٰ میں اگر کسانوں کی اکثریت کہہ دے کہ کپڑے پاک ہیں تو وہ پاک مان لئے جائیں اور کثرتِ رائے کپڑوں کی ناپاکی کے حق میں ہو تو کپڑے ناپاک سمجھے جائیں! اگر "وشاورھم فی الامر" کا مفہوم "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے علمبرداروں نے یہی سمجھا ہے تو اس قرآن فہمی سے لاکھ بار خدا کی پناہ!

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کے مسائل میں صحابہ کرام سے کبھی مشورہ لیا ہے؟ حضورؐ نے صحابہ کو جمع کرکے کبھی یہ پوچھا ہے کہ نماز میں کتنی رکعت مقرر کردیں۔ وضو کن کن باتوں سے ٹوٹ سکتا ہے۔ زکوٰۃ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ ایک سو درہم پر زکوٰۃ کی کیا شرح ہونی چاہیئے۔ سود کی کون کون سی شکل جائز ہے کون سی ناجائز ہے۔ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے سنگِ اسود کو چومیں کہ نہ چومیں۔ اس وقت فلاں قبیلہ کا وفد آیا ہوا ہے اور نماز کا وقت بھی ہے۔ آپ لوگوں کی رائے ہو تو اس وقت کی نماز ملتوی کردی جائے کہ اس قبیلہ سے گفت و شنید بھی دین ہی کا کام ہے — کیا اس قسم کی مشورت کی اسلامی تاریخ میں کوئی مثال ملتی ہے!

ہاں البتہ حضورؐ نے جنگ و صلح کے موقع پر صحابہ کرام سے ضرور مشورت فرمائی ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ کو قبول فرماکر ہی آپ نے خندق کھودنے کا حکم دیا۔ اسی لئے جنگ کا نام ہی "غزوۂ خندق" مشہور ہوگیا — "وشاورھم فی الامر" کا یہی منشاء ہے!

آج پاکستان میں بہت سے سیاسی مسائل عوام اور اُن کے نمائندوں کی مشورت کے محتاج ہیں۔ مثلاً کشمیر کے مسئلہ کا حل کیا ہوسکتا ہے؟ اس کے لئے باہمی مشورت سے تدابیر سوچی جاسکتی ہیں! صنعت و زراعت کی اسکیموں کے لئے مشورہ کی ضرورت لاحق ہوگی۔ غیر ممالک سے امداد لینے کا مسئلہ ہے، یہ مشورت ہی سے طے ہوگا کہ امداد لیں یا نہ لیں۔ اور اگر لیں تو اس کی مناسب شرائط کیا ہوسکتی ہیں! اسی قسم کے مسائل میں قرآن باہمی مشورت کا حکم دیتا ہے۔ تاکہ ملکی اور انتظامی معاملات کسی ایک شخص کی تنہا "رائے" کے ہی ہمیشہ کے لئے پابند ہوکر نہ رہ جائیں!

مگر شریعت کے بنیادی مسائل بلکہ اُن کے فروع تک عوام کے مشورے کے نہ تو محتاج ہیں اور نہ امت کے مشورے سے اُن میں ترمیم و اصلاح ہوسکتی ہے۔ زکوٰۃ کی شرح وہی رہے گی جو حضورؐ نے فرمائی ہے۔ اُس میں کمی بیشی امت نہیں کرسکتی نئے مسائل میں اجتہاد کیا جاسکتا ہے۔ مگر اجتہاد کا کام اُن لوگوں کا ہے جو دینی مسائل میں بصیرت رکھتے ہیں اور جو کتاب و سنت

کے منشاء اور اُس کی اسپرٹ کو سمجھتے ہیں۔ اجتہاد ہر عامی اور ہمہ شمہ کا منصب نہیں ہے!

تمام اُمّت صلاح مشورے کے بعد یہ طے کرے کہ کسی لیڈر یا مشہور شخصیت کا مجسمہ شہر کے چوک میں نصب کیا جائے۔ تو اس مشورت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔ کہ اسلام میں مجسمہ سازی جائز نہیں ہے اور ناجائز کو جائز اور جائز کو ناجائز ٹھہرانے کا منصب خدا اور رسولؐ کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اُمّت یا اُس کے نمائندے اتفاق رائے سے نمازوں کی ایک رکعت اور ایک سجدے کی بھی کمی بیشی نہیں کر سکتے۔ جو چیز شارع نے حلال کی ہے وہ ہمیشہ کے لئے حلال ہے۔ جسے حرام ٹھہرایا ہے۔ وہ ابد تک کے لئے حرام ہے۔ ان مسائل میں مشورہ کرنا ہی سرے سے غلط ہے! "طلوعِ اسلام" نے جس انداز پر ــــ "وشاورھم فی الامر" کی بحث کا آغاز کیا ہے۔ اُس نے دین میں فتنوں کے نہ جانے کتنے دروازے کھول دیئے ہیں۔ یہ نہایت ہی خطرناک طرزِ فکر ہے!

سازش!

انکارِ حدیث کے فتنۂ عظیمہ کا بانی مبانی مُسیلمہ کذاب ہے۔ اُس نے سب سے پہلے یہ کہا کہ "محمد رسول اللہ مرکزِ ملّت تھے۔ اُن کی اطاعت اُن کی زندگی میں واجب تھی۔ ان کے بعد اطاعت کا مرکز مُسیلمہ ہے۔ رسول اللہ کی اطاعت کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔ جس سے اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کے اقوال و افعال کی اطاعت واجب قرار دی جائے"!

یہ منکرینِ حدیث بھی مسیلمہ کذاب ہی کے قدم بہ قدم چل رہے ہیں۔ مسیلمہ اور پرویز کے اندازِ فکر میں کس درجہ مشابہت ہے۔ "طلوعِ اسلام" نے مسیلمہ کذاب ہی کے مشن کو آگے بڑھایا ہے!

ہندوستان میں سب سے پہلے عبد اللہ چکڑالوی نے فتنۂ انکارِ حدیث کی بناء ڈالی۔ مگر اسے انتہائی ناکامی ہوئی۔ اور اس کے مرنے کے بعد تو یہ فتنہ بالکل دب گیا۔ پھر اس فتنہ کو "نگار" کے ایڈیٹر نیاز فتحپوری نے خوب خوب ہوا دی۔ نیاز کے لکھنے کا انداز خاصا شگفتہ ہے۔ اس لئے وہ لوگ جو افسانوی اندازِ بیان کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں۔ اُن پر نیاز کی تحریروں کا جادو چل گیا۔ نیاز نے فقہ کا، حدیث کا اور اسلام کی بعض مسلّمہ اقدار و روایات کا "مُلّا" اور "مولوی" کی طنز کی آڑ میں مذاق اُڑایا۔ مگر وہ انگریز کا دَور تھا۔ عوام مسلمانوں نے جو احتجاج کیا تو اس کا یہ اثر نکلا کہ نیاز صاحب کو توبہ نامہ شائع کرنا پڑا!

حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری کے شاگرد مسٹر پرویز نے نیاز فتحپوری کے اس رنگ کو اُڑا لیا۔ وہی مُلّا اور مولوی پر طنزیں اور پھبتیاں، اسلامی فقہ کے ساتھ مذاق اور احادیثِ رسولؐ کا کھُل کر انکار! پرویز صاحب کے دل و دماغ کی تربیت انگریز کے دفتروں کے سایہ میں ہوئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد بھی انگریزی مزاج کے بعض سرکاری عہدیداروں نے مسٹر پرویز کی ہمّت بڑھائی۔ چنانچہ اب یہ فتنہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ "سنّتِ رسولؐ" کے خلاف باقاعدہ ایک ادارہ "بزمِ طلوعِ اسلام" کے نام سے قائم کیا گیا ہے اور اُسے ایک تحریک (movements) کے اصول پر چلایا جا رہا ہے۔ اور مسٹر پرویز ڈپٹی سیکرٹری حکومتِ پاکستان اس تحریک کے قائد ہیں!

مسلمانوں میں بدقسمتی سے ایک گروہ ایسا موجود ہے۔ جو "ماڈرن" قسم کا اسلام چاہتا ہے۔ اور اس طبقہ کی خواہشات کی راہ میں سب سے بڑا سنگِ گراں "سنّتِ رسولؐ" ہے۔ کیونکہ مسلمان تو ہر زندگی کو حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کے معیار پر جانچنا اور پرکھنا چاہتے ہیں۔ جب یہ معیار ہی لوگوں کی نگاہ میں (خاک بدہن گستاخ) بے اعتبار اور بے وزن ٹھہرا دیا گیا۔ تو پھر

ہر مسلمان کو کھلی چھٹی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گزارے! پرویز صاحب نے زمانہ کا رنگ دیکھ کر اس تحریک کو شروع کیا ہے۔ طبیعتیں شریعت کی حدود توڑ کر کارگاہِ حیات کی طرف بڑھنا اور اُن سے نفع اندوز ہونا چاہتی ہیں۔ اور اس "حدود شکنی" کے جواز کے لئے لٹریچر پرویز صاحب مہیّا کر رہے ہیں!

جماعتِ اسلامی اربابِ اقتدار کی معتوب جماعت ہے۔ تو حکومت کی اس روش سے بھی ادارہ "طلوعِ اسلام" بروقت فائدہ اُٹھا رہا ہے اور اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ جماعتِ اسلامی کو جیسے بنے کچل دیا جائے! ادارہ طلوعِ اسلام نے اپنا سب سے بڑا حریف جماعتِ اسلامی کو سمجھ رکھا ہے۔ اس لئے کہ جماعتِ اسلامی کی ساری کوشش حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہی کے اسوۂ حسنہ اور سنتِ مطہرہ کے اِرد گرد حرکت کرتی ہیں۔ جماعتِ اسلامی اسی "اسوۂ حسنہ" کو زندگی کے ہر شعبہ میں معیار مان کر اور یہی پیغام لے کر اُٹھی ہے۔ ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بُولہبی است

اور

ادارہ طلوعِ اسلام کا مشن ہی روشِ "بُولہبی" ہے کہ حضور خاتم الانبیاء سیدنا محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ (فداہ ابی وامی) کی سنت کو دین سے یکسر خارج کر دیا جائے!

آج پاکستان میں سچ مچ شرارِ بُولہبی چراغِ مصطفوی سے ستیزہ کار ہے۔ جو بُولہبی ہیں وہ ان شراروں کو بھڑکاتے رہیں گے اور جو مصطفوی ہیں وہ اس چراغ کی حفاظت کریں گے۔ چاہے اس کوشش میں اُن کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے! ناموسِ رسُول کو اتنا دُور رس اور منظم خطرہ شاید کبھی پیش نہیں آیا۔ منافقین کے ایک گروہ نے "قرآنی نظام" کے نام پر اسلام کے خلاف زبردست سازش کی ہے۔ اب یہ مخلص مسلمانوں کا فرض ہے اور اُن کی غیرتِ ایمانی اور فراستِ دینی کا تقاضا ہے کہ وہ اس ناپاک سازش کو ناکام بنا دیں!

ماہر القادری

۲۲ مارچ ۵۱ء

پروفیسر ضیا احمد بدایونی
(ایم اے)

فوق البشر کا تصور[1] اور اسلام

موضوع پر بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عنوان سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کو دور کر دیا جائے۔ سچ پوچھئے تو فوق البشر کا تصور اسلام میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ خدائے اسلام کو معلوم تھا کہ یہ نظریہ کس قدر مزلتہ للاقدام ہے۔ اور کس کس طرح ابلیسانہ فریب کاری نے انسان کو انسانیت سے بچھڑانے اور انسانیت کے ڈانڈے کو الوہیت سے ملانے کی برابر کوشش کی ہے۔ اسی لئے خدا کے آخری پیام (قرآن) نے صاف الفاظ میں اس کی نفی کر دی اور سب سے بڑے انسان (روحی فداہ) کی زبان سے ڈنکے کی چوٹ اعلان کرا دیا کہ:-

"قل انما انا بشر مثلکم"

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں"

یعنی نفس بشریت کے لحاظ سے ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی فرق نہیں ہے!

ظاہر ہے کہ رتبہ کے اعتبار سے رسول اور غیر رسول میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ معرفت الٰہی کا منتہائے کمال، اخلاق انسانی کا اعلیٰ معیار اور پھر رسالت کا منصب ارفع۔ ان امور کے پیش نظر رسول اور دوسرے انسانوں میں وہی نسبت ہے جو ہیرے اور معمولی پتھر میں۔ یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ کفار بھی رسول پر انہی الفاظ میں طعن کرتے تھے۔ قالوا ان انتم الا بشر مثلنا۔ یعنی منکر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔ پھر قرآن نے اس کو محل انکار میں کیوں پیش کیا۔ [illegible] منکر اس پر معترض تھے کہ انسان پیام الٰہی سے کیونکر سرفراز ہو سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ممکن ہے تو ہم کیوں نہ اس منصب پر مامور کئے گئے۔ چنانچہ ان کو جواب دیا گیا:-

ان نحن الا بشر مثلکم ولکن اللہ یمن علیٰ من یشاء من عبادہ۔

یعنی یہ تو سچ ہے کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں۔ لیکن اللہ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے۔ ایمان اور نبوت سے سرفراز فرماتا ہے یہ تو خدا کی دین ہے۔ جس کو اس کے لائق جانتا ہے عطا کرتا ہے۔ دوسری جگہ اسی قسم کے اعتراض پر ارشاد ہوا:-

اھم یقسمون رحمۃ ربک۔ خدا کی رحمت کے بانٹنے والے تم کون۔

غرض اب ہمارے موضوع کا دائرہ نسبتاً محدود اور بحث آسان ہو جاتی ہے۔ یعنی ہم کو یہ دکھانا ہے کہ اسلام میں انسانی زندگی کا نصب العین کیا ہے۔ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کے لئے کن ذرائع کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ آج نہیں ہمیشہ سے ہر مذہب اور ہر دبستان فکر کا یہ مسلک رہا ہے کہ معیاری انسان کی نشان دہی یا اس کی جستجو کو سب سے زیادہ اہمیت دے۔ لیکن اسلام سے پہلے کے مذاہب کے نظریات ایک گزشتہ مقالہ میں پیش

---

[1] "فوق البشر اور مرد مومن" جس میں نطشے اور اقبال کے خیالات کا موازنہ کیا گیا تھا۔

کیئے جا چکے ہیں۔ اس لئے یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اب اس سوال کے جواب کے لئے ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ قرآن بتاتا ہے کہ سب سے بڑا انسان وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ اس کے نزدیک بڑائی کا معیار نہ رنگ ہے نہ نسل۔ نہ وطن، نہ رہبانیت نہ یوگ، نہ دنیوی وجاہت نہ سماجی فوقیت۔ بلکہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ اور اہلِ تقویٰ کے فضائل میں بکثرت نصوص وارد ہیں۔ ھدیً للمتقین۔ یعنی قرآن اُن کے لئے ہدایت ہے جو اہلِ تقویٰ ہیں۔ اولٰئک الذین صدقوا و اولٰئک ھم المتقون۔ وہی ہیں جنہوں نے سچ بولا اور متقی ہیں۔ ولکن البر من اتقی۔ نیکی اسی کی ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ دوسری جگہ فرمایا۔ واتقوا اللہ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔ خدا سے ڈرو اور جان لو کہ خدا متقی لوگوں کے ساتھ ہے۔ فاصبر ان العاقبۃ للمتقین۔ صبر کیجئے۔ کیونکہ آخر کار کامیابی متقین کے لئے ہے۔ فان خیر الزاد التقویٰ۔ بہترین توشہ تقویٰ ہے۔

کلام پاک نے متقی افراد کے جو اوصاف گنائے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

اصل نیکی تقویٰ ہے۔

یہی بہترین توشہ ہے۔

خطاؤں سے درگزر کرنا تقویٰ سے قریب ہے۔

سچ بولنا۔ وفائے عہد کرنا۔ امانت ادا کرنا تقویٰ کا مقتضا ہے۔ اسی طرح ایمان۔ صبر و ثبات، حق تلفی اور سود خواری سے پرہیز۔ عدل، احسان۔ اصلاح۔ اقامتہ صلوٰۃ۔ ادائے زکوٰۃ۔ شعائر اللہ کی تعظیم۔ خدا کی عبادت۔ غیر اللہ کی پرستش سے بیزاری۔ خدا و رسول کی اطاعت۔ غرض تمام اوصاف حسنہ تقویٰ کی حدود میں داخل ہیں۔ اور تمام اوصاف رذیلہ سے بچنا اہلِ تقویٰ کا طغرائے امتیاز ہے۔

تقویٰ کے صلے میں اللہ جل شانہ نے مومنین سے جو وعدے فرمائے ہیں۔ اُن میں سے چند یہ ہیں:۔

وہ فلاح و کامیابی کے مستحق ہیں اور رحمتِ الٰہی کے مورد۔

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اور اُن سے محبت رکھتا ہے اور اُن کی عبادت قبول کرتا ہے۔

وہ مرتبے میں دوسروں سے اُونچے ہوں گے۔

آخرت میں جنت اور اس کی نعمتیں اُن کے لئے وقف ہیں۔

خدا اُن پر آسمان و زمین کی برکات نازل فرماتا ہے۔

وہ اولیاء اللہ میں داخل ہیں۔ جو خوف و حزن سے محفوظ ہیں۔

تمام آیات کا استقصا نہ مقصود ہے نہ اس مختصر صحبت میں ممکن۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ ایک طرف ایمان و یقین۔ دوسری طرف تمام اخلاقِ حمیدہ سے اتصاف۔ اور اخلاقِ رذیلہ سے اجتناب، تقویٰ کے مفہوم میں داخل ہے۔ دوسرے الفاظ میں تقویٰ علم و عمل کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلا سوال جو ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ ہے کہ تقویٰ کیا ہے۔ اور اس کی کیا تعریف ہے۔ جب ہم لغت کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی اصل وقی ہے۔ اور یہ تقیا تھا جس کو بدل کر تقویٰ کر لیا گیا۔

اس کے معنی میں بچاؤ - ڈر - پرہیز سب شامل ہیں - مفردات راغب اصفہانی میں ہے :-

التقویٰ جعلُ النفسِ فی وقایۃٍ مما یُخاف ھذا تحقیقہ ثم یُسمّی الخوف تارۃً تقویٰ والتقویٰ خوفاً حسب تسمیۃ مقتضی الشیٔ بمقتضیہ والمقتضی بمقتضاہ وصار التقویٰ فی تعارف الشرع حفظ النفس عما یُؤثِم وذلک بترکِ المحظور ویتم ذٰلک بترک بعض المباحات -

یعنی تقویٰ یہ ہے کہ نفس کو اُن چیزوں سے جو ڈرنے کے قابل ہیں بچایا جائے - یہی تحقیق ہے - پھر کبھی خوف کو تقویٰ اور تقویٰ کو خوف کہہ دیتے ہیں - جیسا کہ کسی چیز کے مقتضا کو مقتضی کے اور مقتضی کو مقتضا کے نام سے موسوم کرنے کا قاعدہ ہے - اور شریعت میں تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ گناہ سے نفس کو محفوظ رکھا جائے - اور اس کی صورت یہ ہے کہ تمام ممنوعات سے پرہیز کیا جائے اور اس کی تکمیل یوں ہوتی ہے کہ کبھی کبھی (گناہ میں مبتلا ہونے کے خوف سے) مباحات کو بھی چھوڑ دیا جاتا ہے -

تفسیر نسفی میں ہے :-

الوقایۃ فرط الصیانۃ وفی الشریعۃ من یقی نفسہ تعاطی ما یستحق بہ العقوبۃ من فعل او ترک -

یعنی تقویٰ وقایہ سے ہے - جس کے معنی کمال حفاظت کے ہیں اور شریعت میں متقی وہ ہے جو ایسے فعل یا ترک فعل سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے - جس کے ارتکاب سے مستحق عذاب ہو -

علمائے کرام نے تقویٰ کے مبحث پر بہت کچھ لکھا ہے - اور اس کی حدود اور اقسام کے بارے میں مفصل افادات فرمائے ہیں -

امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ خوف درد و سوزش دل کو کہتے ہیں - اور جس قدر خدائے پاک کے جلال و کمال اور اپنے نفس کے عیوب و نقائص کی معرفت قوی ہوگی اسی قدر خوف قوی ہوگا - اس کا ادنیٰ اثر عمل یہ ہے کہ آدمی محرمات و ممنوعات شرعی سے باز رہے - اس کا نام ورع ہے - اگر خوف کو زیادہ قوت ہوگی تو ایسی اشیاء سے بھی باز رہے گا جن میں امکان حرمت کا آسکتا ہو - اس درجہ کا نام تقویٰ ہے - اور کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ ایسی چیزوں کو جن میں کچھ مضائقہ نہیں ہوتا - شبہات کے خوف کے باعث ترک کر دیتا ہے - اس کو صدق فی التقویٰ کہتے ہیں -

بے محل نہ ہوگا اگر یہاں تقویٰ کی حقیقت اور اہمیت کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے خیالات نقل کر دیئے جائیں - وہ لکھتے ہیں :-

"ہر اچھے کام کرنے اور برائی سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لئے خلش ہو - یہ تقویٰ ہے - پھر اس کام کو خدائے واحد کی رضامندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے - یہ اخلاص ہے - پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے - یہ توکل ہے - اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو - تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے - یہ صبر ہے - اور اگر کامیابی کم ہو تو شکستہ تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے - اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان و زبان سے اس کا

اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے۔ یہ شکر ہے۔"
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ ہمارے اسلامی احکام کی غایت ہے۔
آگے چل کر مولانائے موصوف لکھتے ہیں:۔
"یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کرکے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بناء پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔"
اوپر کے بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ:۔
۱۔ تقویٰ ایک ایجابی صفت ہے۔ جو ہمارے تمام اعمالِ قلوب و جوارح پر اقتدار رکھتی ہے۔
۲۔ تقویٰ کا تعلق پہلے قلبِ انسانی سے ہے۔ پھر عام جوارح وغیرہ سے۔
چنانچہ اس کی دلیل آیۂ کریمہ:۔

ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب

(جو شخص شعائر الٰہی کا احترام کرتا ہے اس کا طریقِ عمل قلب کے تقویٰ کا نتیجہ ہے)

اسی طرح ایک موقع پر سرورِ عالم نے دل کی طرف اشارہ کرکے صحابۂ کرام سے فرمایا:۔

التقوی ھٰھنا۔ یعنی تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔

یہی نکتہ تھا۔ جس کی طرف اوپر ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا تھا کہ:۔

"تقویٰ علم و عمل کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔"

یہ در اصل وہ نقطۂ اتصال ہے۔ جس پر علم و عمل دونوں متحد ہو جاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو صحیح علم و عمل میں تفریق جائز ہی نہیں کیونکہ علم کے بغیر عمل ایک ایسی عمارت ہے جس کی سرے سے بنیاد ہی نہیں۔ ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے کہ اب گری اور تب گری۔ ایسی حالت میں یا تو عمل ہو گا ہی نہیں۔ یا اگر ہو گا تو ناکارہ اور بے سود۔ یہی حقیقت ہے۔ جس کو قرآن عزیز حبط اعمال (اعمال کا اکارت ہونا) سے تعبیر کرتا ہے۔

"والذین کفروا اعمالہم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً (الی آخر آیہ)"[1]

اسی طرح عمل کے بغیر علم ایک بنیاد سے مشابہ ہے۔ جس پر عمارت کھڑی نہ کی گئی ہو۔ در اصل حکم اس وقت تک پختہ نہیں ہوتا جب تک اس پر عمل نہ کر لیا جائے۔ ورنہ وہ صرف خیال اور دماغ تک محدود رہتا ہے۔ اور تمام روح میں سرایت نہیں کرتا نہ اس پر کوئی گہرا نقش چھوڑتا ہے۔ ایسے ہی علم کی نسبت فرمایا گیا ہے:۔

---

[1] اور جو لوگ منکر ہیں ان کے اعمال نرے دھوکے کی ٹٹی ہیں۔ جیسے چٹیل میدان میں چمکتا ہوا ریت کہ پیاسا اس کو دور سے پانی خیال کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس کے پاس گیا تو اس کو کچھ بھی نہ پایا۔ اور پیاسا تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ اور دیکھا تو خدا کو اپنے پاس موجود پایا۔ اور اس کے اعمال کا حساب پورا پورا چکا دیا۔ اور اللہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

[1] مثل الذین حملوا التورٰتہ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفاراً بئس مثل القوم۔ الخ

حضرات صوفیہ نے خوب کہا ہے کہ عمل کی بدولت خود علم میں ایک طرح کی پختگی (firmness) اور جلا (clearness) آجاتی ہے جو عمل کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں۔

بعض مرتبہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تقویٰ کی بنیاد خوف پر ہے۔ اور خوف کے عنصر کا وجود الٰہیات اور نیز نفسیات میں محلِ نظر ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ تقویٰ یا خدا ترسی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا سے ڈرتا رہے اور اس کی نافرمانی سے بچتا رہے۔ ورنہ خدائے پاک جو ایک باہیبت اور پُر جبروت ہستی ہے اس کو عذاب کے غار میں ڈھکیل دیگا۔ اور چونکہ اس سے ذات باری کا ایک بھیانک تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے۔ نیز انسان کی اخلاقی تربیت میں خوف بہت سی بناحتوں کا باعث ہے۔ اس لئے تقویٰ پر زور دینا سراسر بے جا ہے!

لیکن ہمارے خیال میں اگر معترضین نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غائر نظر ڈالی ہوتی تو یہ شبہ پیدا نہ ہوتا۔ یہ درست ہے کہ ایمان میں امید کے ساتھ بیم لازم ہے اور حق تعالیٰ سے بخشش کی توقع کے ساتھ عقوبت کا خوف بھی مومن کی شان ہے۔ ھو اھل التقویٰ واھل المغفرۃ۔ لیکن درحقیقت خوف کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ جل شانہٗ کو معاذ اللہ ایک خونخوار دیوتا یا دیوی سے مماثل ٹھہرایا جائے۔ جس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہو اور دوسرے ہاتھ میں خون آلودہ کٹا ہوا سر۔ اور جس کو ستانے اور خون بہانے سے خوشی ہوتی ہو۔ اس قسم کے تصور سے اسلام کو کوئی واسطہ نہیں اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ کتب ربکم علیٰ نفسہ الرحمۃ۔ تمہارے پروردگار نے مہربانی کرنا اپنی ذات پر لازم کرلیا ہے۔ نیز سبقت رحمتی علیٰ غضبی۔ میری رحمت غضب پہ غالب ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مرد عارف کو حق سبحانہٗ کی عظمت اور اپنی بے حقیقتی، اس کے لاانتہا کمالات اور ان کے مقابلے میں اپنے ذاتی نقائص کا ہمہ وقت اس قدر ادراک و استحضار ہو جائے کہ وہ اس سے ڈرتا رہے[2] کہ نہ معلوم مجھ سے کیا بھول چوک ہو گئی ہو یا جو تحفہ میں اس کی درگاہ میں پیش کر رہا ہوں۔ نہ جانے یہ قابلِ قبول ہو یا نہ ہو۔

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش۔ عذر بہ درگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خداوندیش۔ کس نتواند کہ بجا آورد

اس قسم کا خوف عوام کو نہیں۔ خواص کو بھی ہو سکتا ہے۔ بلکہ خواص حتیٰ کہ انبیائے عظام کو جو بالاتفاق معصوم ہیں۔ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو محبت اور خوف میں کوئی حقیقی منافات نہیں۔ مثلاً ہمیں کسی شخص سے محبت ہے۔ تو جس قد

---

[1] جن لوگوں کو توریت کا مکلف کیا گیا۔ پھر انہوں نے اس پر عمل نہ کیا۔ ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔ جس پر کتابیں لدی ہوں۔ جو لوگ خدا کی آیات کو جھٹلاتے ہیں ان کی بھی کیا بری مثال ہے۔ اور خدا ایسے بے انصاف لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا!

[2] آیہ کریمہ والذین یؤتون ما اتوا وقلوبھم وجلۃ انھم الیٰ ربھم راجعون (جو لوگ کام کرتے ہیں اور دل میں ڈرتے جاتے ہیں کہ ہمیں اپنے پروردگار کی طرف جانا ہے) کی تفسیر میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ میں نے رسولِ خدا سے پوچھا کہ کیا اس سے بدکار اور شرابی وغیرہ مراد ہیں۔ فرمایا۔ نہیں۔ بلکہ وہ لوگ جو نماز روزہ کے پابند ہیں۔ اور پھر ڈرتے ہیں کہ جانے ہماری حقیر خدمات قبول ہوں یا نہ ہوں۔

محبت کا علاقہ قوی ہوگا اسی قدر اس امر کا خوف ہوگا کہ ہم سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جو محبوب کی آزردگی اور ناراضگی کا موجب ہو۔ دوستانِ خدا کی تعریف میں فرمایا جاتا ہے:-

الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون۔

یاد رکھو خاصان خدا کو آخرت میں نہ خوف ہوگا نہ غم۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اور خدا سے ڈرتے رہے!

اس مضمون کو مولانائے روم نے اپنے خاص انداز میں پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ ترسد مرورا ایمن کنند ۔۔۔ مردِ دل ترسندہ را ساکن کنند

عارفاں زآنند دائم آمنوں ۔۔۔ کہ گذر کردند از دریائے خوں

سچ پوچھئے تو انسان کے خوف کی بنیاد خود اس کے نقائص یا معاصی ہوتے ہیں (خواہ اُن کا تعلق زمانۂ ماضی سے ہو یا مستقبل سے) اور ان کے فطری نتائج کو سمجھنا چاہیئے۔ قرآن مجید میں اہل کتاب کی اس روش پر مذمت کی گئی ہے کہ وہ سب سے زیادہ زندگی کے حریص تھے۔ اس کی وجہ تفسیر نسفی میں یہ بتائی ہے کہ:-

لانھم علموا انھم صائرون الی النار لعلمھم بحالھم۔

یعنی وہ اپنی حرکات سے واقف تھے اور ڈرتے تھے کہ ہمارا انجام دوزخ ہے۔

تفسیر طبری میں ہے:-

کانھم یومنون بالبعث ویعلمون ما لھا لک من العذاب۔

اہل کتاب (برخلاف مشرکین کے) آخرت کے قائل تھے اور جانتے تھے کہ وہاں ہمیں کیا کیا عذاب ہونا ہے۔

البتہ ماضی اور مستقبل کے خوف میں بڑا فرق ہے۔ اول الذکر کا نام قرآنی اصطلاح میں حسرت ہے۔ دوسرے کا تقویٰ۔ ایک گناہ گاروں کا مآل ہے۔ دوسرا نیکو کاروں کا حال۔ فشتان ما بینھما۔

رہا یہ امر کہ اخلاقی تربیت میں خوف کا عنصر قباحت رکھتا ہے۔ یہ بھی علی الاطلاق صحیح نہیں۔ انسانی طبائع یکساں نہیں ہوتیں۔ اور تجربہ شاہد ہے کہ انتظامی امور میں بسا اوقات قانون کا خوف عام افراد پر زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ ریاست بے سیاست مکمل نہیں ہوتی اور تدبیرِ منزل ہو یا سیاستِ مدن، اکثر رغبت و رہبت سے کام لینا ہی پڑتا ہے۔ البتہ ہر سوسائٹی میں مخصوص اصحاب ایسے ہو سکتے ہیں جو انعام و سزا کے خیال سے بے نیاز ہو کر کام کرتے ہوں۔ دوسرے الفاظ میں جو جنت کی طمع یا دوزخ کے خوف سے نہیں۔ بلکہ محض رضائے الٰہی کی خاطر سرگرمِ عمل ہوں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ بندے ایسے بھی ہوں گے جن کا مطلوب نہ جنت میں جانا ہوگا نہ دوزخ سے بچنا۔ صرف حق سبحانہٗ ہوگا۔ علاوہ بریں خوف کتنا ہی مفید ہو۔ تقویٰ کے اعلیٰ مفہوم میں (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

غرض آمدم بر سرِ مطلب۔ مقالہ ہذا کے آغاز میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ اسلام میں انسانی زندگی کا نصب العین کیا ہے گزشتہ بحث سے واضح ہو گیا ہوگا کہ سیرت و کردار، خیال و سعی، اعتقاد و عمل کی پاکیزگی اور پرہیزگاری کو اسلام نے زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے[1] اور افراد و اقوام میں جو سب سے زیادہ اس معیار پر پورا اترتا ہے وہی خدائے پاک کے

---

[1] - اسلام نے زندگی کا نصب العین بیشک اعتقاد و عمل کی پاکیزگی اور پرہیزگاری کو قرار دیا ہے۔ مگر خود اسلامی نصب العین کی یہ تعریف (باقی اگلے صفحہ پر)

نزدیک اکرم و اشرف ہے۔ ایسے فرد کو آپ۔ متقی۔ مومن صادق۔ انسانِ کامل۔ عبدِ ربانی۔ محدّث۔ مجدّد۔ مہدی۔ جو چاہے کہیں۔ مفہوم بہرحال ایک ہی ہے۔ عبارا تنا شتی وحسنک واحد۔ مسلم مفکرین میں سب سے پہلے کمالِ انسانی کی بحث حضرت بایزید بسطامی نے اُٹھائی۔ رسالہ قشیریہ میں ان کا قول نقل کیا گیا ہے۔ کہ "انسان مظہر صفاتِ الٰہی ہو کر "الکامل التام" ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا سے مل جاتا ہے[۱]۔ حلاج کی کتاب الطواسین میں بھی یہ بحث ہے۔ مگر زیادہ پیچیدگی اور بے اعتدالی کے ساتھ۔ البتہ امام غزالی نے اپنی تصانیف میں "المطاع" کی صفات پر جو روشنی ڈالی ہے۔ وہ شرعی اور عقلی اعتبار سے بے غبار ہے۔ "انسان کامل" کی ترکیب سب سے پہلے شیخ ابن عربی کے یہاں ملتی ہے۔ اور انہوں نے اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اُن کے نزدیک انسانِ کامل انسانیت کا وہ نقطۂ کمال ہے جو خدا سے واصل ہو گیا ہو[۲]۔ وہ صورتِ حق و صورتِ خلق دونوں کا جامع ہے۔ گویا وہ ایک آئینہ ہے جس میں حق اپنے کو دیکھتا ہے۔ اور وہی سببِ تخلیقِ عالم ہے۔

شیخ کے بعد عبد الکریم جیلی نے اس مسئلہ کو اپنایا۔ ان کی کتاب کا نام ہی "الانسان الکامل فی معرفۃ الاواخر والاوائل" ہے۔ اُن کے نزدیک تنزل (تجلی) کی تین منزلیں ہیں۔ احدیت۔ ہویت۔ انیت (ماخوذ از "انا") آخری منزل میں ذات صفت سے متصف ہوتی ہے۔ انسانِ کامل جو ذاتِ مطلق کے رجوع بہ خود کا نام ہے تجلیاتِ مختلفہ کا مظہر ہو کر ذات میں گم ہو جاتا ہے[۳]۔ پہلا مرتبہ تجلی اسماء کی مظہریت کا ہے۔ دوسرا تجلی صفات کی۔ تیسرا تجلی ذات کی۔ آخر مرتبہ میں وہ

(بقیہ حاشیہ) لوگوں کو غلط فہمی میں ڈالتی رہی ہے۔ کسی ملک میں مسلمان رہتے ہیں اور اُن کی اکثریت اللہ کے فضل سے نیک، پاکیزہ اور صاحبِ تقویٰ ہے مگر اس ملک کا قانون اسلامی قانون کی عین ضد ہے۔ وہاں اللہ اور رسول کے بتائے ہوئے "معروف" کو قدم قدم پر توڑا جاتا ہے اور "منکر" کو غلبہ اور عمومیت حاصل ہے۔ اس ملک کے مسلمان ان تمام باتوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر "منکر" کو بدلنے کا کوئی جذبہ اُن میں پیدا نہیں ہوتا۔ تو ایسی حالت میں اُن کا تقویٰ اور پرہیز گاری کیا اسلام کا نصب العین قرار دی جاسکتی ہے!

ایک مردِ مومن کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہے کہ وہ خود بھی نیک بنے اور دُنیا میں نیکی کو پھیلائے بھی۔ اس طرح کہ اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ دین کو قائم اور برپا کرنے کی جدوجہد۔ تقویٰ اور نیکوکاری کا لازمی نتیجہ ہونا چاہیے! جہاں یہ جدوجہد نہ ہو وہاں فقر و زہد میں "بوئے اسد اللہی" کی جگہ "بوئے گوسفندی" پائی جاتی ہے۔ (م۔ق)

[۲] .... بندہ خدا سے مل جاتا ہے .... اور "انسانِ کامل انسانیت کا وہ نقطۂ کمال ہے جو خدا سے واصل ہو گیا ہو"۔ یہ اندازِ بیان مغالطہ میں ڈالنے والا ہے۔ شرح و بیان میں آکر یہ باتیں اور خطرناک ہو جاتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ تمام کیف و وجدان کی باتیں ہیں۔ کتاب و سنت کی کوئی دلیل ان کے ساتھ نہیں ہے!

پرہیزگاروں اور نیکوکاروں کو آخرت میں جنت کی نعمتوں کا ابدی صلہ ملیگا۔ اور دیدارِ الٰہی بھی میسر آئے گا۔ بندہ کی اطاعت۔ اللہ کی فرمانبرداری اور خشیت و تقویٰ کا سب سے بڑا صلہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کا حصول ہی بندے کی عبادت اور مجاہدۂ نفس کا سب سے بڑا حاصل ہے۔ (م۔ق)

[۳] عبد الکریم جیلی کے ان اقوال سے "تصوف" کی خطرناکیوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ اس فن کے بعض اکابر، اساطین اور ائمہ تک شوخیٔ فکر اور مستیٔ خیال میں حلول و اتحاد کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ فاضل مصنف کا خدا بھلا کرے کہ انہوں نے عبد الکریم جیلی کے یہ

(باقی اگلے صفحہ پر)

قطب - مطاع - یا خلیفۂ الٰہی ہوتا ہے - اور عبد و رب میں واسطہ بنتا ہے - وہ صفات جمال - جلال و کمال کا آئینہ بن جاتا ہے - اور امانتِ الٰہی کا حامل - یہ انسانِ کامل رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہیں - جو عقلِ کل اور کلمۃ اللہ ہیں - آپ ہر زمانہ میں زندہ اولیاء اللہ کی شکلوں میں نمودار ہوتے رہے ہیں " ——— (معاذ اللہ)

اگرچہ جیلی نے پابندیٔ شریعت پر بہت زور دیا ہے اور حلول و اتحاد سے تبرّی کی ہے - لیکن اُن کے خیالات پر تثلیث کا اثر معلوم ہوتا ہے - اور وہ بعض صوفیہ کی طرح جادۂ اعتدال سے متجاوز نظر آتے ہیں -

مضمون ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے کلام سے چند اشعار جن میں انسانِ کامل کے اوصاف پیش کئے گئے ہیں - یہاں نقل کر دیئے جائیں - انھوں نے اس کو کہیں کامل - کہیں مومن - کہیں مردِ حُر، کہیں درویش سے تعبیر کیا ہے اور اپنے مافی الضمیر کو نہایت وضاحت اور خوبی سے بیان فرمایا ہے - ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن ۔ گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ۔ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی ۔ ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ۔ قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اُس کے ارادے ۔ دُنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ۔ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرودِ ازلی اُس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفتِ سورۂ رحمان

(بقیہ حاشیہ) اقوال نقل کر کے خود ہی اُن کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ " اُن کے خیالات پر تثلیث کا اثر معلوم ہوتا ہے "۔ ہر مضمون نگار اور مصنف تو اتنا صاف گو، جری اور ژرف بیں نہیں ہوتا - بہت سے تو شخصیتوں سے مرعوب ہو کر تنقید کی جرأت ہی نہیں کر سکتے - اور شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان صوفیاء کرام کے اقوال پر حرف گیری کی تو دین و ایمان کی خیر نہیں!

دُوسرا گروہ اُن اقوال کی تاویل کرتا ہے اور انھیں طرح طرح کے معنی پہنا کر شریعت کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے - اور تیسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو " قُم باذنی " اور " انا الحق " پر ایمان رکھتے ہیں - اور جن کا عقیدہ ہے کہ اس قسم کے شطحیات جو بعض صوفیائے کرام سے سرزد ہوئے ہیں وہ حقیقت میں علم لدنی کے وہ معارف و غوامض ہیں - جن کے سامنے شریعت چھلکے کی حیثیت رکھتی ہے - دین کا مغز تو یہی اسرار ہیں - علماء شریعت کو تو یہ لوگ " اہلِ ظاہر " کہتے ہیں!

ایمان کا تقاضا ہے اور ہونا چاہیئے کہ جو چیز کتاب و سنت سے ٹکراتی ہو اُس سے اظہار برأت کرنا ضروری ہے کہ دین کے ظاہر و باطن کی اصل کتاب و سنت کے سوا بعد کوئی چیز نہیں ہے! (م - ق)

پروفیسر آسکر احمد سہاوری

فلسفۂ مسرت

مسرت ہم اس کیفیت کو کہہ سکتے ہیں، جو ہمارے دل میں کسی مفید اور لذت بخش چیز کو حاصل کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔
مفید اور لذت بخش چیز ہر شخص کے زندگی گزارنے کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہے۔ مثلاً کوئی دولت حاصل
کر کے نسبتاً زیادہ خوش ہو سکتا ہے اور کوئی عزت پا کر۔ کوئی کسی بیکس کی خدمت کر کے اطمینان حاصل کر سکتا ہے دوسرا
کسی بیکس کا خون چوس کر فرحت محسوس کر سکتا ہے۔

مسرت کی نوعیت در اصل زندگی کی طرف دیکھنے کے زاویۂ نظر کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ اگر ہم مسرت کی نوعیت
میں یکسانیت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم زندگی کے زاویۂ نظر میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کریں
اور زندگی کو دیکھنے کے زاویۂ نظر میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ زندگی کی بری اور بھلی اقدار
میں یکسانیت، ہم آہنگی اور استقلال پیدا کیا جائے۔

ہمارا معیارِ خیر و شر یکساں ہونا چاہیئے۔ نیکی اور بدی کی ایک قومی یا بین الاقوامی فہرست مرتب ہو اور اس کو تمام اقوام
اور ہر قوم کے تمام افراد تسلیم کریں۔ ان تسلیم شدہ اخلاقی اقدار کو معاشرے کی بنیاد قرار دیا جائے۔ بلاشبہ جزئی معاملات
اور مقامی امور میں ہر ذیلی معاشرے کو اختیار رہے کہ وہ زندگی کے خاکے میں اپنا مقامی رنگ بھر سکے۔ لیکن بھلائی اور برائی
کے بنیادی قوانین ہر جگہ ایک سے ہوں۔ اور اس قسم کی اخلاقی ابتری اور انتشار کو ہرگز نہ ابھرنے دیا جائے۔ جس میں ہر شخص
کو اختیار ہے کہ وہ اپنی ذاتی خواہشات اور رجحانات کی بناء پر جو معیارِ خیر و شر چاہے وضع کر لے۔ جس چیز کو چاہے اپنے
لئے بھلا سمجھ لے اور جس چیز کو چاہے برا۔ یہ چیز اس وجہ سے بھی نامعقول اور غیر ممکن العمل ہے کہ پورا انسانی معاشرہ ایک
وحدت ہے۔ اس وحدت سے کسی فرد اور اس کے اعمال کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ کسی انسان کا کوئی فعل بشرطیکہ وہ
انسانوں میں رہ کر زندگی گزارتا ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا جس کا عمل اور ردِ عمل اس کی اپنی ہی ذات تک محدود رہتا ہو۔ بلکہ اس کا
ہر ہر فعل اس کے عزیزوں، دوستوں، پڑوسیوں، ہم وطنوں اور دوسرے دنیا والوں کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ضرور متاثر کرتا ہے۔
ہماری زندگی کی ایک بڑی ضرورت غذا ہے۔ ذرا غور فرمایئے کہ ہمارے ایک لقمہ میں کتنے لوگوں کی محنت شامل ہوتی
ہے۔ کتنے لوگ ہمارا ایک نوالہ فراہم کرنے کے فعل سے متاثر ہوتے ہیں۔ در اصل ہم اتنے ذرا سے کام کے عمل اور ردِ عمل۔ تاثیر
و تاثر کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ایسی صورت میں کوئی شخص یہ دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے یا اس کو اس قسم کا دعویٰ کرنے
کی اجازت کس طرح دی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے افعال کا مختار رہے۔ اسے اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے جس چیز کو چاہے پسند
کرے اور جس چیز کو چاہے رد کر دے۔ جس فعل کو چاہے نیکی شمار کرے اور جس کو چاہے بدی کی فہرست میں داخل کر دے۔
وہ یہ دعویٰ اسی وقت کر سکتا ہے جبکہ انسانی معاشرے سے بالکل کٹ کر علیحدہ ہو جائے اور سماج سے کسی قسم کا کوئی

تعلق نہ رکھے - لیکن اگر وہ انسانی معاشرے سے تعلق رکھنا چاہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا تو اس کو معاشرے کی بھلائی کے لئے جو بنیادی قوانین وضع کئے جائیں اُن کو تسلیم کرنا چاہیئے - اور اپنے افعال میں - اپنی پسند و ناپسند میں ان کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھنا اس کا فرض ہوگا - اگر ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہو جائے اور دوسروں کی خواہش کا خیال نہ کرے تو معاشرے کا شیرازہ ہرگز قائم نہیں رہ سکتا!

بین الاقوامی نقطۂ نظر سے بہت سی اخلاقی قدریں ایسی نکالی جاسکتی ہیں - جن پر تمام دُنیا متفق ہو جائیگی - مثلاً:-

سچ بولنا - کمزوروں کی مدد کرنا - مخلوقِ خدا سے محبت کے ساتھ پیش آنا - مظلوم کی دادرسی کرنا - کسی کی آزادی پر اُس وقت تک دست درازی نہ کرنا جب تک کہ اُس کی آزادی دُوسروں کے لئے خطرہ نہ بن جائے - وغیرہ وغیرہ -

اس کے بعد ہر قوم اور ہر ملّت کے اپنے مقامی اصول اور ضوابط بھی ہو سکتے ہیں - جو اپنی اپنی مقامی ضروریات کے لحاظ سے وضع کئے جاسکتے ہیں - بشرطیکہ یہ مقامی ضوابط بین الاقوامی اصولوں سے ٹکراتے نہ ہوں - یہ مقامی یا قومی ضوابط بھی مستقل اور پائیدار ہونے چاہئیں - تاکہ قوم کا ہر فرد اپنے لئے علیحدہ اصول مقرر کرکے سوسائٹی کے لئے باعثِ انتشار ثابت نہ ہو - اگر دو قوموں کے مفادات آپس میں ٹکرا جائیں تو بین الاقوامی ضوابط کو بروئے کار لایا جائے - اور اگر دو افراد کے مفادات آپس میں ٹکرا جائیں تو قومی یا مقامی ضوابط کو حرکت میں آنا چاہیئے!

اب مسرّت اور اُس کے حصول کے ذرائع کی نوعیت کے لحاظ سے بنی نوع انسان کو ہم دو قسم کے گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

ایک گروہ اس لحاظ سے وہ ہے جو خدا - حیات بعد الموت وغیرہ کا قائل ہے -

اس گروہ کے عقیدے کے مطابق زندگی اسی دُنیا میں ختم نہیں ہو جاتی - بلکہ یہ دُنیا تو ایک امتحان گاہ ہے - یہاں کی زندگی مختصر سی ہے - اس زندگی کے تمام اچھے اور بُرے اعمال کا احتساب دُوسری دُنیا اور دُوسری زندگی میں ہوگا - ان کے نزدیک اس پُوری کائنات کو پیدا کرنے والا خدا ہے اور اس کو اس کائنات پر پُوری پُوری قدرت حاصل ہے - اُس نے انھیں اس دُنیا میں زندگی گزارنے کے لئے کچھ قوانین دیئے ہیں - اگر وہ ان قوانین کے لحاظ سے اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں تو وہ خوش ہوتا ہے اور اگر ان قوانین سے بغاوت کرتے ہیں تو وہ ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے -

اس گروہ کے لحاظ سے مسرّت کی ایک خاص نوعیت ہے اور اس کو حاصل کرنے کے مخصوص طریقے ہیں - جن سے یہ گروہ انحراف نہیں کر سکتا - لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ گروہ بین الاقوامی فہرست اخلاقیات سے متفق نہ ہو سکے گا - کیونکہ بین الاقوامی فہرست وہ ہوگی - جس سے ہر شخص متفق ہو گا - اور بعض مسرّت کی قسمیں اور اُن کے حصول کے ذرائع ایسے ہیں - جن پر تمام دُنیا کے لوگ خواہ کسی قسم کے اصول کے تحت زندگی گزارتے ہوں - کلیۃً متفق اور متحد ہیں - صرف اتنی بات ہے کہ کوئی مؤثر قوتِ نافذہ نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات ان اصولوں کی پروا نہیں کرتے اور اپنی خود غرضی و مفاد پرستی کی بنا پر ان مسلّمہ اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں -

مثلاً ہر قوم اور ہر فرد یہ تسلیم کرتا ہے کہ ہر معاملہ میں سچ بولنا ضروری ہے - لیکن جب جھوٹ بولنے سے اپنی ذات یا قوم کو فائدہ ہوتا ہو تو ایسے موقع پر جھوٹ بول دیا جائے گا - اس لئے کہ جھوٹ بولنے پر کسی سزا کا خوف نہیں ہے!

کوئی بین الاقوامی قوتِ نافذہ ابھی تک ایسی تیار نہیں ہو سکی۔ جو اس قسم کی خود غرضیوں کا سدِ باب کر سکے۔ البتہ اگر خدا اور حیات بعد الموت کے تصور کو اعتقاد کی پوری پختگی کے ساتھ اپنا لیا جائے اور اس حقیقت پر افراد و اقوام ایمان لے آئیں کہ ایسی مافوق طاقت کا وجود ہے جو ہمیں بچے اصولوں سے بغاوت کرنے پر اس دُنیا میں یا دوسری دُنیا میں سزا دے سکتی ہے اور ہم اس کی زبردست گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ وہ ہمیں تاریک ترین گوشۂ تنہائی میں دیکھ سکتی ہے۔ ہمارے دل کی باتوں، نیتوں، ارادوں کو جانتی ہے۔ تو بلاشبہ ہم اس قسم کی بے انصافیوں سے باز آ سکتے ہیں اور دوسرے لوگوں کی بے انصافیوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔

بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ ہمیں اس کا تجربہ کرنا چاہیئے کہ نیکیوں کے لئے انسان بغیر کسی قوتِ نافذہ کے اور بغیر کسی انعام کے لالچ کے عمل کرے۔ لیکن اس تجربہ کا کامیاب ہونا غالباً ناممکن ہے۔ اس لئے کہ انسان کی فطرت میں اگر صرف بھلائی کی صلاحیت ہوتی یا برائی کی خواہش بہت کمزور ہوتی۔ پھر تو اس تجربہ کی کامیابی کا امکان تھا۔ لیکن انسان کی فطرت میں برائی کا عنصر ایک بڑی حد تک شامل ہے۔ اور گناہ کا داعیہ ایک بڑی قوت کا مالک ہے۔ اس کو بغیر کسی خوف یا لالچ کے دبانا بہت مشکل ہے۔ نفس کی بعض خواہشات اس قدر قوی اور زبردست ہیں کہ اُن کے آگے بسا اوقات وہ بالکل لاچار اور مجبور ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر بڑی سے بڑی سزا حتیٰ کہ جان کا نقصان بھی اس کے خواہشات کے مُنہ زور گھوڑے کو روکنے سے عاجز رہ جاتا ہے۔ پھر انسان عمرانی زندگی گزارتا ہے۔ یہاں ہر وقت ایک شخص کی خواہش دوسرے کی آرزو سے ٹکراتی رہتی ہے۔ ایک کامیابی دوسرے کی ناکامی کا پیش خیمہ ہے ایک کی خوشی دوسرے کے ماتم کا سبب ہے۔ ایک کا قہقہہ دوسرے کی آنکھوں کو پُرنم بنا دیتا ہے۔ بلکہ اکثر ایک کی زندگی کا دارومدار دوسرے کی موت پر ہوتا ہے!

ایسی کشاکش کی حالت میں نیکی کی خاطر کسی انسان سے بھلائی کی توقع رکھنا اس کی بساط سے بہت زیادہ اس سے توقع وابستہ کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ ہزاروں میں ایک آدمی ایسا نکل آئے جو بغیر اپنے کسی مفاد کے یا کسی تکلیف کے خیال کے نیکی کرے اور برائی سے بچتا ہے۔ ورنہ ایک بڑی اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہی ہے جو ہر کام کا کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی صورت میں معاوضہ چاہتے ہیں۔ اس کے خلاف انسان سے توقع کرنا غالباً اس کو اس کی فطرت سے منحرف کرنا ہے۔ جو شاید کبھی ممکن نہ ہو سکے گا۔ بقول غالب ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برقِ خرمن کا خونِ گرم دہقاں کا

اس مکتبۂ خیال کے لوگوں میں کہ انسان محض نیکی کی خاطر نیکی کر سکتا ہے اور اس کو نیکی کے عوض کی چنداں ضرورت ہی نہیں ۔
ایک امریکن فلسفی اسپنسر ایوریٹ اپنی کتاب "تصوراتِ حیات" میں صفحہ ۲۶۸ پر لکھتے ہیں:-

> "ہماری اخلاقی، مذہبی اور فلسفیانہ روایات میں انسانی فطرت کی خود غرضی کے عنصر کو بہت زیادہ پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اور اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ انسان کوئی اچھا کام بغیر جنت کی امید یا دوزخ کے خوف کے انجام نہیں دے سکتا۔ لیکن سزا و جزا کی یہ امید اس عیسائیت کے اصول سے ختم ہو جاتی ہے کہ کوئی گنہگار اگر اپنے آخری وقت میں توبہ کرے اور اپنے جرائم کا کسی پادری کے سامنے اعتراف کرلے تو وہ جنت کا حقدار ہو جائے گا۔"

واقعی عیسائیت میں جیسی کہ وہ اس وقت ہمارے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ اس قسم کی کمزوری موجود ہے۔ لیکن فاضل مصنف

نے اپنی کتاب میں بعض جگہ تمام مذاہب کو مخاطب کرکے کچھ اصول بیان کئے ہیں اور اس جگہ بھی سیاق وسباق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ موصوف تمام مذاہب کو سامنے رکھ کر یہ دلیل مذہب کے خلاف پیش کر رہے ہیں اور ایک جگہ تو انہوں نے عیسائیت کے ساتھ اسلام کا نام خاص طور پر لیا ہے۔ صفحہ ۲۷ پر مذکورہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں :۔

"بہت سے لوگوں نے مثلاً عیسائی اور مسلمانوں نے موت کے بے اثر بنا لینے کے لئے
بقائے دوام کا حربہ استعمال کیا ہے۔"

اس تخاطب کی ہمہ گیری کی بناء پر ہم یہ عرض کرنے کے لئے مجبور ہیں کہ اسلام نے ہرگز اس قسم کا اعتقاد پیدا نہیں کیا۔ کہ انسان عمر بھر خواہ کچھ بھی کرتا رہے۔ لیکن مرتے وقت توبہ کر لینے سے اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ اوّل تو بالکل آخری وقت کی توبہ مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق قبول ہی نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ :۔

"میں حقوق العباد معاف نہیں کروں گا۔ بلکہ وہی لوگ معاف کریں گے۔ جن کے
حقوق غصب کئے گئے ہوں گے۔ اگر وہ معاف نہیں کریں گے تو اُن کا بدلہ ضرور
لیا جائے گا۔"

پھر خداوند تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ فرمایا ہے کہ :۔

"میری رحمت سے مایوس نہ ہو۔ میں گناہوں کا بخشنے والا ہوں۔ تمہارا کام یہ ہے کہ
تم توبہ کرو اور گناہوں سے باز آجاؤ اور مجھ سے امید رکھو کہ میں رحیم وکریم ہوں۔
تم پر رحم کروں گا۔"

یہ کہیں نہیں فرمایا کہ میں ہر توبہ کرنے والے کے گناہ ضرور معاف کردوں گا۔ پھر جہاں اُس نے معافی کی امید دلائی ہے۔ وہاں اپنے غضب اور اپنی پکڑ سے بھی انتہائی طور پر ڈرایا ہے۔ در اصل بات یہ ہے کہ مغربی ممالک کے اکثر لوگ اسلام کے متعلق سُنی سنائی باتوں پر رائے زنی کرتے ہیں۔ تفصیلی اور غور سے مطالعہ کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ وہ اسلام کے تقریباً ہر عمرانی قانون کو عیسائیت کے قانون کے مطابق ہی خیال کر لیتے ہیں۔ اس لئے جب کبھی وہ عیسائیت میں کہیں خامی دیکھتے ہیں۔ تو فوراً مجرد مذہب سے ہی بیزاری کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اور اسی سلسلہ میں عیسائیت کے ساتھ ساتھ وہ اسلام کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں۔ چاہے اسلام کا ذرہ برابر بھی قصور نہ ہو!

پھر ایک بڑی ستم ظریفی اسلام کے ساتھ یہ ہوتی ہے کہ ہمارے مغرب سے بیجا طور پر مرعوب ومغلوب مسلمان بھائی بھی اسلام کو انہی مغربی حضرات کی عینک سے دیکھنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ حضرات بجائے اس کے کہ خود کوئی تحقیق کریں یا کسی ایسے شخص کی طرف رجوع کریں جو مذہب کو کماحقہ سمجھتا ہو۔ کرتے یہ ہیں کہ انہی مغربی حضرات کی تصانیف کا مطالعہ کر لیتے ہیں اور ان کی آراء پر آمنا وصدقنا کہہ کر اپنے ہم مذہب بھائیوں کو فتوے اور احکام سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور یہ لوگ بھی ایک حد تک معذور ہیں۔ اس لئے کہ جن زبانوں میں مذہبی معلومات کا ذخیرہ ہے اُن سے یہ بے بہرہ ہیں۔ اس لئے انگریزی زبان میں جو جھوٹی سچی باتیں نظر آجاتی ہیں ان حضرات کے نزدیک وہی سارے کا سارا عین اسلام ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بیگانوں کے ہاتھوں مسخ ہو کر جب اسلام کی تصویر اُن کے ہاتھوں میں آتی ہے تو وہ اندر ہی اندر اس کی بدصورتی کو دیکھ کر شرماتے ہیں۔ اور اغیار کے سامنے اسلام کا نام لینے سے کانپتے ہیں۔ بدحواسی میں پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی بڑا

اخلاقی جرم کر بیٹھے ہوں!

جو لوگ وجودِ خدا، حیات بعد الموت اور سزا و جزا کے قائل ہیں۔ اُن کے نزدیک سب سے بڑی مسرت یہ ہے کہ وہ اپنے خدا کو راضی کر لیں۔ اُس سے قرب حاصل کر لیں۔ اُس کے دیئے ہوئے احکام کے مطابق زندگی گزاریں۔ جس چیز کو اُس نے بُرائی کہا ہے اُس کو ترک کر دیں اور جس چیز کو اُس نے اچھائی کہا ہے اس کی طرف حریفانہ سبقت کرنے کی کوشش کریں۔ اُس نے فرمایا ہے:۔

"یسارعون فی الخیرات"۔ یعنی نیکیوں میں آگے بڑھنے اور سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ (کرتے ہیں)

اس ایک ذاتِ گرامی قدر کی خوشنودی سے تمام کی تمام جسمانی اور روحانی مسرتیں اور لذتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس زندگی میں بھی اور عالمِ جاودانی کی زندگی میں بھی تمام مسرتیں اس شخص کو حاصل ہیں جو اپنے خدا کو راضی کرے۔

یہ بھی ایک غلط فہمی عام طور پر مغربی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے کہ دُنیا کا ہر مذہب رہبانیت کی زندگی پر زور دیتا ہے۔ اور جو شخص خدا اور مذہب کا دلدادہ ہے۔ وہ زندگی کی تمام مسرتوں سے اپنی ذات کو محروم کر لیتا ہے۔ حالانکہ میرے خیال سے یہ ہر مذہب کی مسخ شدہ صورت ہے! اس قدر افراط و تفریط کی کسی سچے مذہب میں اجازت نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً اسلام میں تو رہبانیت کے خلاف واضح احکام موجود ہیں۔ اسلام میں زندگی کا پیش کردہ نقشہ ہی اس قسم کا ہے کہ ترکِ دُنیا اور رہبانیت کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں نکل سکتی۔ ایک جگہ قرآن شریف میں آیا ہے:۔

"کُنتُم خیرَ اُمّۃٍ اُخرِجَت لِلنّاس۔ تامُرونَ بالمعروفِ وتنھونَ عَنِ المُنکَر"

یعنی تم کو ایک ایسی اُمّت بنایا گیا ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائیوں سے روکتے ہو۔

ایسا آدمی کیا کسی کو نیکی کا حکم دے سکتا ہے اور بُرائیوں سے روک سکتا ہے جو دُنیا کو چھوڑ کر ایک غار میں جا کر بیٹھ گیا ہو۔ جس نے انسان اور اس کے معاشرے سے سارے تعلقات منقطع کر لئے ہوں۔

دراصل اسلام کے متعلق رہبانیت کو جائز سمجھنے کا خیال لوگوں کو چند خانقاہ نشین صوفیوں کے طریقہ کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ اوّل تو ترکِ دُنیا کر کے خانقاہ نشینی اسلام کی صحیح پیروی نہیں۔ پھر اکابر صوفیاء میں ایسے ایسے حضرات بھی ہیں جو مسلسل عمل پیہم اور متحرک زندگی کا پیغام دیتے رہے ہیں۔ مثلاً مولانا روم نے مثنوی میں بے عملی کی انتہائی بُرائی کی ہے اور کہا ہے کہ:۔

"خدا نے انسان کو ہاتھ اس لئے دیئے ہیں کہ وہ ان سے کام کرے۔ پیر اس لئے ہیں کہ وہ ان سے چلے پھرے اور زندگی کے لئے جدوجہد کرے۔"

غرض کہ جسم کے ہر عضو کا ایک مقصد ہے اور ایک متعین کام ہے۔ اگر کسی عضو کو معطل کر دیا گیا تو ایک زبردست کفرانِ نعمت ہو گا اور پیدا کرنے والے کی خواہش اور حکم سے سرتابی ہو گی۔ جس کی سخت سزا ملنے کا امکان ہے۔ پھر اکثر صوفیاء جو کسی وجہ سے خانہ نشین بھی ہو گئے تھے۔ ہرگز بیکار زندگی نہیں گزارتے تھے۔ بلکہ ہر وقت ملت اور حکومت کی اصلاح کے لئے سعی بلیغ کرتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر ہم مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت خواجہ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی پیش کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے خدا نے ان کو کہیں یہ حکم نہیں دیا کہ تم دُنیا سے بالکل مُنہ موڑ لو۔

کسی نعمت سے فائدہ نہ اٹھاؤ۔ بلکہ اس نے تو یہ حکم دیا ہے کہ :-

"میں جو نعمت تم کو بخشوں اُس سے پُورا پُورا فائدہ اٹھاؤ۔ خود کھاؤ اور دُوسروں کو کھلاؤ۔ خود پہنو اور دُوسروں کو پہناؤ۔ البتہ خزانہ کا سانپ بن کر نہ بیٹھو۔ نعمتوں پر اور خوش حالی پر اِترانے کی کوشش نہ کرو۔ اپنی آسودہ حالی کی وجہ سے مفلسوں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھو۔ بلکہ سلامتی کے شکرانہ میں اپنے غریب بھائیوں کی حتی المقدور مدد کرو"

حتیٰ کہ یہ بھی حکم ہے کہ تمہاری معاشرت سے ان جائز نعمتوں کا اظہار بھی ہونا چاہیئے۔ جو خدا نے تمہیں بخشی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر لذت اندوزی اور مسرت آفرینی کی اُس نے ایک حد مقرر کر دی ہے۔ تاکہ انسان مسرتوں میں ایسا نہ ڈوب جائے کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ حلال و حرام میں تمیز نہ کرے۔ بے خودی میں خدا بننے کی کوشش کرنے لگے۔ اور یہ بالکل واضح بات ہے کہ اگر حدود مقرر نہ کئے جائیں تو بے مہار زندگی سے ایسی ابتری پھیلے کہ ہر شخص کی زندگی وبال ہو جائے اور کوئی فردِ واحد مسرت کے حصول کا خواب بھی نہ دیکھ سکے !

اب حصولِ مسرت کے سلسلہ میں جو دُوسرا گروہ ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ :-

اس دُنیا کا پیدا کرنے والا کوئی نہیں۔ یہ کائنات خود بخود ایک مادّے سے پیدا ہو گئی ہے۔ ہماری زندگی اسی دُنیا میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس دُنیا کے اعمال کا کوئی حساب کتاب نہیں ہو گا۔ خوشی و غم۔ راحت و تکلیف۔ کامیابی و ناکامی جو کچھ ہے اسی دُنیا کی ہے۔ ان کے نزدیک اگر کسی شخص کو نیکی پر اُبھارا جائے تو یہ کہہ کر کہ نیکی کی خاطر نیکی کرو۔ اور اگر بدی سے بچایا جائے تو یہ کہہ کر کہ بدی سے محض بدی کی خاطر بچو !

اس نقطۂ نظر کی وجہ سے دُو بڑی مشکلات کا سامنا ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انسانی فطرت اس اصول پر کاربند نہیں رہنے دیتی۔ انسان فطرتاً ہر چیز کا کچھ نہ کچھ معاوضہ چاہتا ہے۔ اور وہ ابھی تک اس درجہ پر نہیں پہنچ سکا ہے کہ نیکی کو ہی اس کا معاوضہ سمجھ لے۔ گو بادی النظر میں یہ اصول ایک زریں اصول نظر آتا ہے۔ لیکن چونکہ انسانی خلقت کے خلاف ہے اس لئے چند مستثنیات کو چھوڑ کر آگے نہیں بڑھتا اور غالباً اسی دن آگے بڑھ سکے گا جس دن کہ انسانی فطرت کے بنیادی اجزاء میں تبدیلی رُونما ہو جائے گی۔ اور خمیرِ آدم کے عناصرِ ترکیبی بدل ڈالے جائیں گے۔

دُوسری بڑی مشکل اس سلسلہ میں یہ آپڑی کہ نیکی و بدی کا بنیادی معیار کیا ہو۔ کسے یہ حق حاصل ہو کہ وہ معیارِ خیر و شر قائم کرے۔ یہ گروہ کسی مافوقی طاقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پھر ایک انسان دُوسرے انسان کا مقرر کیا ہوا معیار کیوں قبول کرے۔ جبکہ ہر فرد کا مفاد دُوسرے فرد کے مفاد سے ہر ہر قدم پر اور ہر ہر لمحہ ٹکرا رہا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بعض لوگ نیکی اور بدی کو اضافی چیز سمجھنے لگے ہیں۔ یعنی ہر شخص کے لئے مخصوص چیزیں نیکی کا درجہ رکھتی ہیں اور دُوسری کچھ چیزیں بدکاری کا۔ اب ہر قوم، ہر قبیلے اور ہر جماعت کا نیکی و بدی کا پیمانہ خیر و شر کا معیار مخصوص ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس لئے کوئی کسی کی نہیں سُنتا اور جس کا جو جی چاہتا ہے۔ کرتا ہے۔ کچھ کہا جائے تو یہی جواب ملتا ہے کہ میرے نزدیک تو یہی

نیکی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ اس کو نیکی نہ خیال کرتے ہوں۔ مجھے اپنے فعل کا اختیار ہے۔ اس افراتفری کی بنا پر لوگوں کی طبیعتوں میں سخت انتشار اور بے قراری پیدا ہو گئی ہے۔ کسی کام میں مضبوطی اور استقلال باقی نہیں رہا۔ نہ سیاست میں۔ نہ معاشرت میں نہ ادب میں اور نہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ آج ایک اصول کو اپنایا جاتا ہے۔ کل اس اصول کے موجد ہی اس کو رد کر دیتے ہیں۔ پھر دوسرا اصول وجود میں آتے آتے دم توڑ دیتا ہے۔ یہ انتشار محض اس وجہ سے ہے کہ خیال کا کوئی مرکز نہیں۔ مرکز سے ہٹ کر ہر چیز منتشر ہو جاتی ہے۔ خیالات کے لئے جب تک ایک اعلیٰ اور مافوق مرکز نہ بنایا جائے یہ انتشار اور افراتفری ہماری زندگی سے دور نہیں ہو سکتی۔ اور یہ مرکزِ اعلیٰ سوائے خدائے واحد کی ذات کے کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔۔۔!

بعض لوگوں کا قول ہے کہ ہم خدا کے وجود کو اس لئے تسلیم نہیں کرتے کہ سائنس کے علوم کے ذریعہ سے ہمیں کسی ایسی طاقت کے وجود کا ثبوت نہیں ملتا۔ میں اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا سائنس نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے یہ حتمی طور پر معلوم کر لیا ہے کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ سائنسدانوں نے اگر خدا کے عدمِ وجود پر کچھ کہا ہے تو یہی کہ ہمیں سائنس نے ابھی تک کوئی ایسا ٹھوس اور محسوس ثبوت مہیا نہیں کیا کہ جس کی بناء پر ہم خدا کے وجود کو تسلیم کر لیں۔ لیکن سائنس کے ثبوت مہیا نہ کرنے سے یہ کہاں سے ثابت ہو گیا کہ خدا کا وجود نہیں ہے۔ بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کو سائنس ابھی تک معلوم نہیں کر سکی ہے۔ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے عدم کا ثبوت کس طرح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اب تک کسی مشہور سائنسدان نے پورے وثوق سے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ خدا کے نہ ہونے کا ہم کو علم ہو گیا ہے!

پھر کسی سائنسدان نے یہ دعویٰ بھی تو نہیں کیا کہ سائنس تمام کائنات کے ہر راز کو معلوم کر چکی ہے۔ بلکہ اکثر تو ان میں سے یہی کہتے ہیں کہ ہم ابھی کائنات کے سمندر میں سے ایک قطرے کا تجزیہ بھی نہیں کر سکے ہیں۔ پھر ایسے لوگوں کی طرف سے ایک ایسا دعویٰ کر دینا کہ ان کو کائنات کے سب سے بڑے راز یعنی خدا کے عدمِ وجود کو معلوم کر لیا ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے چوٹی کے سائنسدان ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ:۔

ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ اس کائنات کی پیدا کرنے والی کوئی ایسی باشعور ہستی ہے جس کے فہم و شعور کا ہم اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ اس کائنات کے نظام کا اعلیٰ معیار پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس کو کسی مافوق قوت نے سجایا ہے۔

یہاں میں امریکہ کے ایک ڈاکٹر الیکسس کیرل کی کتاب "رازِ انسانی" سے ایک نقلِ قول پیش کروں گا۔ فرماتے ہیں:۔

"جو لوگ زندگی اور کائنات کے راز کو معلوم کرنے کے ارادے سے نکلے۔ گویا ایک تاریک جنگل میں بھٹک گئے ہیں۔ یہ جنگل ایک طلسم خانہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کی ہر چیز اپنی جگہ پر ہر وقت بدلتی رہتی ہے۔ خود انسان اور اس کے متعلقہ علوم ابھی تک خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکے ہیں۔ ہم ابھی تک نہیں جانتے کہ زندگی اور موت کیا ہے۔ ہم ابھی تک کسی جاندار کو موت سے نجات نہیں دلا سکے ہیں۔ اگرچہ ہمارے پاس سائنس دانوں، فلسفیوں، شاعروں اور صوفیوں کے افکار و تجربات بڑے قیمتی ذخائر موجود ہیں۔ لیکن ہم ابھی تک انسانی زندگی کے صرف چند گوشوں کو نامکمل طریقے سے سمجھ سکے ہیں"

یہاں بے جا نہ ہو گا اگر ہم مسٹر موریسن سابق صدر نیو یارک اکاڈمی آف سائنس کی کتاب "انسان تنہا نہیں ہے"۔ میں سے

خدا کے وجود پر چند جملے نقل کر دیں۔ موصوف فرماتے ہیں:۔

"ہم نے ابھی سائنس کے انکشافات کا آغاز ہی کیا ہے۔ اور ابھی سے حال یہ ہے کہ ہماری
ہر نئی معلومات خدا کے وجود پر پہلے سے زیادہ تیزی سے روشنی ڈالتی ہے اور یہ ثابت
کرتی ہے کہ دنیا کسی انتہائی صاحبِ عقل و فراست ہستی نے پیدا کی ہے"

اس دوسرے گروہ کا جو خدا کو نہیں مانتا۔ مسرت کا تصور یہ ہے کہ:۔

ہمیں اس دنیاوی نعمتوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ مل جائے۔ لوگوں کی نظروں میں زیادہ سے
زیادہ عزت و احترام ہو۔ ہر خواہش کی زیادہ سے زیادہ تسکین ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کے لوگ دوسری دنیا میں اپنا کوئی حصہ نہیں رکھنا چاہتے۔ اس قسم کی مسرت میں کئی قسم کی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس دنیا کی زندگی بڑی مختصر اور ناقابلِ اعتماد ہے۔ اس لئے ہر وہ شخص جو دوسری زندگی میں اعتقاد نہیں رکھتا اس کے اختصار کی وجہ سے بڑا بدحواس ہو جاتا ہے۔ اور انتہائی بے قراری سے اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ جو کچھ مل سکے اس کو جلد از جلد حاصل کر لے اس بدحواسی میں جائز و ناجائز ذرائع کا بھی خیال نہیں کرتا۔ چنانچہ جوئے سے۔ سود خواری سے۔ چور بازاری سے۔ چوری اور ڈکیتی سے۔ بے آبروئی اور عصمت فروشی سے۔ غرضکہ ہر ممکن طریقہ سے وہ دولت اور دوسری چیزوں کو کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ حد تک حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ لیکن کبھی سیر و مطمئن نہیں ہوتا۔ اس بے قراری کی وجہ سے باوجود دولت اور دوسری نعمتوں کے اُس کو سکونِ قلب حاصل نہیں ہوتا۔ اس معاملہ کا انتہائی عبرتناک پہلو یہ ہے کہ اس کی بدحواسی اس کو حاصل شدہ نعمتوں سے لطف اندوز بھی نہیں ہونے دیتی۔ اور وہ کامیاب ہو کر بھی ناکام۔ سیر ہو کر بھی تشنہ لب۔ آسودہ حال ہو کر بھی پریشان ہی رہتا ہے۔ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا ہے کہ:۔

اس قسم کے لوگ ایسے بدحواس معلوم ہوتے ہیں کہ جیسے انھیں شیطان چھو گیا ہو۔ یا کسی آسیب کا
اثر ہو گیا ہو!

دراصل اس قسم کے لوگوں کی زندگی کا صحیح نقشہ اس ایک جملہ میں پیش کر دیا گیا ہے۔ فی الحقیقت اس قسم کے لوگ اپنی طبیعت کے اختصار کی وجہ سے آسیب زدہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ دوسری قباحت اس امر میں یہ آپڑتی ہے کہ حصولِ مسرت کے معاملہ میں انسان کی خواہشات اور آرزوؤں کو اعتدال پر کون رکھے۔ ہر شخص نے خیر و شر کا پیمانہ۔ نیکی و بدی کا معیار اپنا اپنا علیحدہ مقرر کر لیا ہے کوئی کسی پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ اور اگر کرے تو کوئی سنتا نہیں۔ خدا اور اس کے دیئے ہوئے اصولوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی فرد۔ کوئی گروہ۔ کوئی قوم نقطۂ اعتدال پر نہیں ٹھہرتی۔ ہر انسان اور ہر قوم اپنی آرزوؤں کی تکمیل کی خواستگار ہے۔ اس کے نزدیک دوسرے افراد اور اقوام جہنم میں جائیں۔ بلکہ یہی افراد و اقوام باقاعدہ ایک دوسرے کا شکار کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو اپنی تکمیلِ آرزو کا آلۂ کار بناتے ہیں۔ انسانوں کو جانوروں کی طرح ذبح کر ڈالتے ہیں۔ اُن کی عزت و عصمت پر ڈاکہ مارتے ہیں۔ اُن کی دولت کو جبراً چھین لیتے ہیں۔ اُن کو آزادی سے محروم کر دیتے ہیں۔ کوئی کسی کی فریاد سننے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اگر کچھ دادرسی ہوتی ہے تو اُسی وقت تک جب تک کہ اپنی مطلب برآری ہوتی رہے۔ اس کے بعد نہایت حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا ہے۔

چنانچہ آج کل آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ جہاں دولت جمع کرنے۔ آزادی تمازت لینے اور دوسرے معاملوں میں مسابقت کی عام

اجازت ہے۔ وہاں مقابلہ میں فتح حاصل کرنے کے لئے انتہائی شرمناک طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔ مثلاً، میں پچھلے دنوں امریکہ کی تجارتی انجمنوں کے متعلق ایک انگریزی اخبار میں ایک مضمون پڑھ رہا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ:-

"یہ تجارتی انجمنیں اپنے ملازمین کی بیویوں کو بھی مجبور کرتی ہیں کہ وہ ان فرموں کے لئے کچھ کام کریں۔ اور وہ کام اس قسم کے ہوتے ہیں کہ یہ بیویاں بڑے بڑے خریداروں کو خوش کرنے کے لئے ان کے ساتھ رقص کریں اور اُن کو مستقل گاہک بنانے کے لئے دُوسرے ذرائع استعمال کریں۔"

یہ تو ایک معمولی سی مثال تھی۔ سینکڑوں اس سے زیادہ شرمناک اور ظالمانہ مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ دوسری طرف جہاں تجارت آزاد نہیں اور ساری کی ساری تجارت حکومت کے ہاتھ میں ہے۔ وہاں دُوسری قسم کے مظالم توڑے جاتے ہیں۔ مثلاً افراد کی ہر قسم کی آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ تمام ضروریاتِ زندگی حکومت کے قبضۂ قدرت میں آجاتی ہیں۔ پھر کسی کو جرأت بھی نہیں ہوسکتی کہ باوجود انتہائی مظالم کے کوئی حکومت پر اعتراض کرسکے۔ ایسے معاشرے میں آزادئ رائے کا تو بالکل جنازہ ہی نکل جاتا ہے!

تیسری خرابی اس ضمن میں یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ ایسے معاشرے سے جہاں حصولِ مسرت اور لذت اندوزی پر کسی مافوق قوت کی کڑی نگرانی نہ ہو اور ہر شخص کا خیر و شر کا پیمانہ اور معیار علیحدہ ہو اخلاقیات پر انتہائی خوفناک تباہی آجاتی ہے۔ اخلاق کا تصوّر ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ جیسے جیسے حصولِ مسرت کے ذرائع آزاد ہو رہے ہیں۔ ویسے ویسے بداخلاقی کی تباہ کاریاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ اور نہایت تیزی سے دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں۔ اس خطرے کو کانٹ نے نہایت صحیح طریقے پر سمجھ لیا تھا اور اس لئے اپنی تحریروں میں اکثر یہ لکھا ہے کہ:-

"زندگی میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اخلاقیات کا وجود نہایت ضروری ہے اور اخلاقیات میں وزن اور پائیداری پیدا کرنے کے لئے تصوّرِ خدا اور حیات بعد الممات نہایت ضروری بلکہ ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ بغیر ان تصورات کے ہم اپنے اخلاقی قوانین کا نفاذ مستحکم طریقے پر نہیں کرسکتے۔"

کوئی دُنیاوی سیاسی اقتدار اخلاقی قوانین کا نفاذ صحیح اور خاطر خواہ طریقے سے نہیں کرسکا اور نہ آئندہ کرسکتا ہے اس کے لئے ہمیشہ اعتقاد کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ آجکل ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی حکومت اخلاقی قوانین کو اپنے حلقۂ نفاذ میں شامل نہیں رکھتی۔ اگر کوئی حکومت اس ضمن میں کوشش کرے بھی تو بہت تھوڑے قوانین کا نفاذ اسکے ذریعہ سے ممکن ہوسکتا ہے۔ تصوّرِ خدا اور حیات بعد الممات کی گرفت ڈھیلی پڑجانے کی وجہ سے جو اخلاقی تباہی کا سیلاب اُمنڈ آیا ہے۔ اُس کا بیان کرنا تحصیل حاصل ہے۔ اس لئے کہ آپ حضرات دن رات اخبارات، رسائل، سینما، ریڈیو اور افسانوی ... وغیرہ کے ذریعہ سے ان تباہ کاریوں کے حالات پڑھتے، سُنتے اور دیکھتے رہتے ہیں!

نتیجہ کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ:-

مسرت اُسی معاشرے میں بہ حیثیہ اتم اور بوجود احسن حاصل کی جاسکتی ہے اور اس سے

صحیح لطف اُٹھایا جا سکتا ہے جہاں اخلاقیات کا جنازہ نہ نکل گیا ہو اور جہاں لوگوں کے اخلاق و عادات کی نگرانی کسی مافوق طاقت کا تصور اور اعتقاد کرتا ہو۔ اُن کی خواہشات کو اعتدال پر رکھنے کے لئے اس مافوق طاقت کی طرف سے کچھ اصول و ضوابط مقرر کر دیئے گئے ہوں اور معاشرے میں ان اصول و ضوابط کا اجراء سیاسی قوتِ نافذہ بھی کرتی ہو۔ لوگوں کو یہ بھی خیال ہو کہ اگر سیاسی قوتِ نافذہ اور سماج کی قہر آلود نظر سے اپنے جرائم کو چھپا بھی لیا تو ایک ایسی ہمہ بین اور ہمہ داں طاقت بھی ہے جو ہم کو ہر صورت دیکھے گی اور اگر اس دُنیا میں ہم تعزیر سے بچ گئے تو دوسری دُنیا میں ہم ضرور کیفرِ کردار کو پہنچیں گے اور وہاں ہم کو نہ دولت بچا سکے گی نہ طاقت۔ نہ کوئی سفارش چلے گی نہ کوئی ہمدردی کام دے گی۔ وہاں بالکل صحیح صحیح فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور ہر حقدار کو اس کا حق دلا دیا جائے گا۔!

اس تصور کے ساتھ ہی انسان کے معاشرے میں سکون و مسرت کا حصول ممکن ہے!!

ترجمہ:- سید رضوان ندوی

رواداری اور اسلام

مصر کے مشہور ترین اسلامی مصنف سید قطب[1] کی کتاب

"اسلام اور امن عالم" کی ایک فصل کا ترجمہ!

اسلام اپنے اندر انسانی رواداری کی جو روح رکھتا ہے۔ کوئی بھی انصاف پسند اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہ رواداری تمام انسانی مجموعہ کے لئے ہے۔ جس میں کسی ایک قوم یا ایک دین کے پیروؤں کی تخصیص نہیں۔ اس کا صحیح اندازہ ہمیں دعوت اسلامی کی حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ داعئ حق کس بے لوثی کے ساتھ ہدایتِ انسانی کا فرض انجام دیتا اور روئے زمین سے ظلم و فساد کی جڑیں کاٹتا ہے۔ ایسا کرتے وقت نہ تو وہ کسی قوم پر اپنا اقتدار جماتا ہے اور نہ اس کے سینے میں کسی قوم و مذہب کی طرف سے کوئی کینہ و عداوت ہوتی ہے!

اسلام کی یہی روح ہے جو عالم میں امن قائم کر سکتی، قوموں، رنگوں، اور مذہبوں میں ہم آہنگی اور انسانوں میں باہمی رواداری و محبت اور ہمدردی پیدا کر سکتی ہے۔ باہمی حسد، طبقاتی جنگ، قومی پیکار اور مذہبی تعصب سے زندگی کی فضا کو پاک و صاف بنا سکتی ہے۔ یہی وہ روح ہے جو انسانیت کو ان قربان گاہوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ جو محض مادی منفعت، جھوٹی عظمت اور ملک گیری کی کینہ خواہشوں کے سبب آئے دن برپا ہوتی رہتی ہیں!

انسانی رواداری کی یہ روح اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے:-

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا۔ (آیۃ۔ حجرات)

"اے انسانو! ہم نے تم کو نر و مادہ سے پیدا کیا ہے اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔"

ایک دوسری آیت میں اس طرح ارشاد ہے:-

ولا تجادلوا اھل الکتاب الا بالتی ھی احسن الا الذین ظلموا منھم وقولوا آمنا بالذی انزل الینا وانزل الیکم والٰھنا والٰھکم واحد ونحن لہ مسلمون (عنکبوت۔ ۴۶)

"اہل کتاب سے انتہائی خوش اسلوبی کیساتھ مناظرہ کرو، ان میں سے ان لوگوں کے سوا جو ظالم ہیں، اور کہہ دو کہ ہم ایمان لائے ہیں اُس پر جو کچھ ہم پر اُتارا گیا ہے اور جو کچھ تم پر اُتارا گیا ہے اور ہمارا تمہارا معبود ایک ہے اور ہم اسکے مطیع و فرمانبردار ہیں!

---

[1] - سید قطب ان دنوں قاہرہ جیل میں جمال ناصر کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں!

حضرت جابر بن عبداللہ سے ایک روایت ہے:-

مررت بنا جنازۃ فقام وقمنا، فقلنا یا رسول اللہ انہ جنازۃ یہودی فقال اولیست نفساء اذا رائیتم الجنازۃ فقوموا -

"ہمارے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ بھی آپ کے اتباع میں کھڑے ہو گئے - اس پر ہم نے کہا یا رسول اللہ! یہ تو ایک یہودی کی میت تھی - آپ نے فرمایا کہ کیا وہ فرد انسانی نہ تھا؟ جب تم جنازے کو دیکھو تو کھڑے ہو جاؤ۔"

اسی خالص بے لوث انسانی رواداری پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء اور عموماً دوسرے مسلمان عمل پیرا رہے۔ تعصب کے چند ہنگامی وقفوں کے علاوہ مسلمان اس اصول سے کبھی نہ بھٹکے اور ایسا تعصب کسی دینی فریضہ کی ادائیگی یا ظلم وجور اور فساد کے مٹانے کے لئے نہ تھا بلکہ اُن افراد یا گروہوں کے ہاتھوں سرزد ہوا جو نہ تو اسلام کے صحیح نمائندے تھے اور نہ اس کے اعلیٰ تر مقاصد اور اُس کی انسانی روح سے واقف تھے!

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اندھے کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر آپ کو معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ تمہاری اس پریشان حالی اور گداگری کا کیا سبب ہے۔ اُس نے جواب دیا "جزیہ، ضرورت، اور بڑھاپا" اس پر آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر اُس کو اپنے گھر لے آئے اور اُس وقت کی ضرورت کے قابل فوراً اس کو مال عطا کیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آپ نے اسی وقت بیت المال کے خزانچی کو بُلا کر حکم دیا کہ اس کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بے مثال فقرہ جو ایک صالح اور جاندار معاشرے کا حیات افروز اصول ہے کہ:-

"خدا کی قسم یہ کوئی انصاف کی بات نہیں کہ ہم نے اُس کی جوانی سے تو فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اس کو اس طرح رسوائی کے ہاتھوں چھوڑ دیں۔ صدقات فقراء و مساکین کا حصہ ہے اور یہ اہل کتاب میں سے ایک مسکین ہے۔"

اسی طرح ایک بار جب آپ نے دمشق کا سفر کیا تو جذام زدہ کچھ عیسائیوں پر آپ کا گزر ہوا۔ آپ نے ان لوگوں کے لئے حکم دیا کہ ان کو مالی وظیفہ صدقات کے مال میں سے دیا جائے۔ اور ان کا کھانا مقرر کیا جائے۔

رواداری اور انسانی دردمندی کی یہی وہ روح ہے۔ جس نے لوگوں کو اسلام سے قریب کیا اور وہ غیر معمولی سرعت کے ساتھ روئے زمین پر پھیل گیا۔ حتیٰ کہ غیر مسلم اُس وقت کی مذہبی، اندھی داروگیر اور قومی تعصب سے بھاگ کر رواداری، انصاف اور مساوات کی امید میں اسلام کے گوشۂ عافیت میں پناہ لیتے تھے۔ سر ٹی ڈبلیو آرنلڈ اپنی کتاب "دعوتِ اسلام" میں رقمطراز ہیں:-

"۱۲ ویں صدی کے وسط میں انطاکیہ کے لاٹ پادری بخائیل اعظم کو اس کا موقع ملا کہ وہ اپنی تحریروں میں ان واقعات کی مدح سرائی کر سکے جو اُس کے دینی بھائیوں نے قلم بند کئے تھے۔ پانسو سال تک برابر مشرقی کلیساؤں کو اسلامی لنگر (؟) کے تحت رہ کر اُس کو آزمانے کا موقع ملا جس پر غور و فکر کے بعد اُس کو عربی فتوحات میں اللہ کا ہاتھ کارفرما نظر آیا۔ ہرقل کے مذہبی مظالم کو بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے:-

"عربی فتوحات کا اصل سبب یہ ہے کہ جب خدائے قدوس نے جو تنہا قوت و جبروت کا مالک ہے، رومیوں کے ظلم و تباہ کاری کو دیکھا۔ جنہوں نے قوت و طاقت کے نشہ میں اپنے

تمام مقبوضات میں ہمارے گرجاؤں کو لوٹا۔ ہماری تمام عبادت گاہوں کو بزور چھین لیا۔ ہمیں دردناک سزائیں دیں تو اُس نے اولادِ اسمٰعیلؑ کو جنوبی ممالک سے ہم کو رومیوں سے بچانے کے لئے بھیجا۔ عربوں کی آمد کے بعد ہم نے رومیوں کے ظلم وستم سے نجات پائی اور امن وسلامتی کی سانس لی۔"

ایک دُوسرا تاریخی واقعہ ہے۔ اسلامی لشکر جب وادیٔ اردن پہنچا اور حضرت ابوعُبیدہ کے فحل کے مقام پر ڈیرہ ڈالا تو اُس شہر کے عیسائیوں نے عربوں کو لکھا:۔

"مسلمانو! تم ہمیں رومیوں سے زائد محبوب ہو۔ اگرچہ وہ ہمارے ہم مذہب تھے۔ تم ہمارے ساتھ اُن کی بہ نسبت زائد خوش معاملہ و مہربان ہو۔ تم ہم پر ظلم روا نہیں رکھتے اور نہایت خوش اسلوبی کیساتھ حکومت کرتے ہو۔"

چنانچہ حمص کے باشندوں نے ہرقل کے لشکر کو روکنے کے لئے شہر کے دروازے بند کر دیئے اور مسلمانوں کو اطلاع دی کہ انھیں مسلمانوں کی حکومت یُونانیوں کے ظلم وستم سے زائد پسند ہے۔

۶۳۹-۳۳ء کی جنگوں کے وقت یہ احساس شامی شہروں میں عام تھا اور جس کے نتیجہ میں رومیوں کو عربوں کے مقابلہ سے بھاگنا پڑا۔ ۶۳۵ء میں دمشق نے عربوں کے ساتھ معاہدہ کر کے ایک مثال قائم کر دی۔ جس کے بعد تمام شامی شہروں نے جلد جلد اس طرح کے معاہدات کر کے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا اور اپنے آپ کو عربوں کی اطاعت میں دے دیا۔ تاکہ وہ رومیوں کے ظلم وستم سے بچ سکیں۔ حتیٰ کہ بیت المقدس کے لاٹ پادری نے اس شہر کو بھی معمولی شرائط کے ساتھ مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ تاکہ وہ رومی شہنشاہ کا مذہب قبول کرنے پر مجبور نہ ہو۔ مذہبی آزادی کا وہ وعدہ جو مسلمانوں نے اُن کے ساتھ کیا تھا۔ اُن کی نظروں میں رومی یا کسی بھی عیسائی حکومت کے ساتھ وابستگی سے زائد محبوب تھا۔ ان ابتدائی اندیشوں کے ختم ہونے کے بعد جو فاتح لشکر کے ملک میں داخل ہونے سے پیدا ہوتے ہیں وہ بہت گرمجوشی کے ساتھ عربوں کے جانب دار ہو گئے!

بازنطینی سلطنت جس پر مسلمان اپنی شجاعت و دلیری سے بہت جلد قابض ہو گئے تھے۔ اُس کو رواداری سے محظوظ ہونے کا ایسا موقع ملا جو صدیوں سے اُسے میسر نہ تھا اور جس کا سبب نسطوری اور یعقوبی آراء کی اشاعت تھی۔ اب تمام عیسائیوں کو آزادی دی گئی کہ وہ اپنے شعائر دین کو جس طرح چاہیں ادا کریں۔ اس سلسلہ میں کوئی اُن سے تعرض نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی رواداری کا صحیح اندازہ اُن معاہدات سے کیا جا سکتا ہے جو عربوں نے مفتوحہ ممالک کے علاقوں کے ساتھ کئے تھے اور جس میں انہوں نے مفتوحین کی جانی و مالی و مذہبی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی اور اس کے بدلے میں اسلام نہ لانے کی صورت میں اُن سے صرف اطاعت اور جزیہ کا مطالبہ کیا گیا تھا!

یہ کوئی آسان کام نہیں کہ ان سارے معاہدات کی صحیح تفاصیل ہم برآمد کر سکیں۔ کیونکہ ان پر بہت کچھ اضافے کئے جا چکے ہیں۔ بہر حال یہ روایات لفظی طور پر صحیح ہوں یا نہ ہوں۔ وہ بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ وہ اس تاریخی روایت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ جس کو دُوسری صدی ہجری کے مسلمان مؤرخین عام طور پر بیان کرتے ہیں۔ یہ روایت حضرت عمرؓ کے معاہدہ بیت المقدس سے متعلق ہے۔ جس کی رُو سے آپ نے وہاں کے تمام باشندوں کو جان و مال کی امان اور مذہبی آزادی کا اقرار کیا۔ اس کی ذمہ داری قبول کی کہ اُن کے کلیساؤں اور صلیب وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا اور وہ پُوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر برقرار رہیں گے!

آپ کا کنیسہ قیامتہ کا واقعہ بھی قابلِ نقل ہے۔ کہ مقدس مقامات کی زیارت کرتے کرتے جس وقت آپ مشہور کنیسہ
پہنچے تو نماز کا وقت ہوگیا تھا۔ پادری نے درخواست کی کہ آپ کنیسہ ہی میں نماز ادا فرمائیں تو آپ نے عذر کردیا کہ اگر ہم
یہاں نماز ادا کی تو ہمارے بعد ہمارے متبعین یہ دعویٰ کریں گے کہ یہ مقام اُن کی عبادت گاہ ہے۔ اس طرح کی رواداری اور بے لاگ
انصاف سے اسلام کے لئے ماضی میں ممکن ہوا اور مستقبل میں بھی ممکن ہے کہ وہ عالمی امن کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرسکے۔

پروفیسر گب اپنی کتاب "جہاں بھی اسلام ہوگا" میں لکھتا ہے:۔

"اسلام آج بھی انسانیت کی اہم اور بلند خدمات انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے سوا ہمیں کوئی ایسا عقیدہ و
نظام نظر نہیں آتا۔ جو باہم برسرپیکار انسانی ٹکڑیوں کو ایک ایسے مرکز پر جمع کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کرسکے
جس کی بنیاد مساوات ہو۔ افریقہ، ہندوستان، انڈونیشیا کا عظیم تر اسلامی مجموعہ بلکہ چین و جاپان کا بھی
چھوٹا سا اسلامی مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اسلام کو اب تک وہ قدرت حاصل ہے جو اُن مختلف اقوام
اور منفرق طبقات کو مکمل طور سے اپنے قابو میں رکھ سکتی ہے۔ لہٰذا مشرق و مغرب کی عظیم تر سلطنتوں کی باہمی
چپقلش اور بغض و عداوت کو مٹانے کے لئے اسلام ایک ضروری امر ہے۔"

میں نے مناسب سمجھا کہ اس ذیل میں دو بڑے یورپین عیسائی مصنفین کی شہادت پیش کروں۔ کیونکہ اسلام کی رواداری
بے لاگ عدل و انصاف پر اس کے مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی شہادت شبہات سے برتر ہے۔ یہاں نہیں کہا جاسکتا کہ اس
بنیاد مذہبی جانب داری یا مبالغہ آرائی پر ہے!

انسانی رواداری قیام امن کا ایک زبردست عنصر ہے۔ اور جس سے وہ تہذیب بے نصیب ہے جو آج دنیا پر سایہ فگن۔
آج دنیا کو مذہبی، قومی، سیاسی جتھہ بندیوں نے پارہ پارہ کرکے رکھ دیا ہے اور وہ تباہی کے گڑھے پر ہے، یہ تہذیب
یہ سیاست انسانی رواداری اور حقیقی انصاف سے بے بہرہ ہے۔ یہ اپنے جلو میں اقتصادی اور غیر اقتصادی کینوں اور
عداوتوں کا ایک لشکر لئے چل رہی ہے۔ اور جس کے نتیجہ میں انسانی زندگی امن و جنگ دونوں حالتوں میں جہنم سے بد
گئی ہے۔ وہ بھوک اور خون کا شکار ہے۔ جس نے قوموں کو باہم ایک دائمی اندیشہ اور ابدی اضطراب میں مبتلا کر
ہے۔ جس نے انسانی اعصاب پر اس قدر بار ڈال دیا ہے کہ وہ عصبی اور خونی دباؤ کا شکار ہیں۔ اور اپنی اور دوسروں
دردسری کا سبب بنی ہوئی ہے۔ اس تہذیب نے انسانیت کو ایک ایسے خوف، عداوت اور تاریکی سے دوچار کر رکھا ہے
جس میں دُور دُور کہیں امن، اطمینان اور نور کی کرن نہیں!

اس سب کے باوجود آپ اس تہذیب کو برخود پسند اور اپنا مدافع پائیں گے۔ درآں حالیکہ یہ انسانیت کو تباہی پر تبا
اور جنگ پر جنگ سے دوچار کررہی ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ اس تہذیب کے فرزند لوہے، آگ اور بجلی و بھاپ کی تسخیر پر قادر
جوہری اور ہائیڈروجن بم بناسکتے ہیں۔ لیکن محبت و رواداری کا ایک ذرہ انھیں نصیب نہیں!

درحقیقت یہ وہ مسخ ہے جو روحانی، تاریکی اور محرومی کے دَور میں انسانیت کی روح کو بدل دیتا ہے۔ اس دُنیا میں کو
ایسا روغن نہیں جو روح انسانیت کے چہرے سے اس مسخ کے کریہہ اثرات کو زائل کرسکے اور نہ کوئی ایسی نور کی کرن جو ا
باطنی ظلمتوں کو روشنی عطا کرسکے۔ سوائے اس کے کہ اسلام کے ہاتھ میں پھر ایک بار انسانی قیادت کی باگ دی جائے
وہ اپنی ہمہ گیر رواداری و محبت سے انسانی اکتشافات و علوم کو رحمت اور امن و سلامتی کا ذریعہ بنادے!!

محسوسات

(ارشد صدیقی ساگری (بھوپال)

ابھی شگفتِ گل دیا سمن کا نام نہ لے
چمن کو دیکھ بہارِ چمن کا نام نہ لے

ہم اہلِ دل کہیں ان بندشوں سے ڈرتے ہیں
ہمارے سامنے دار و رسن کا نام نہ لے

سُنا ہے ایسے کچھ آئین بننے والے ہیں
کہ اب چمن میں بھی کوئی چمن کا نام نہ لے

عجیب دَور سے گزرا ہے کاروانِ حیات
یہ حکم ہے کہ کوئی راہزن کا نام نہ لے

گُلوں کا خون ہوا ہے کچھ ایسا اب کے برس
بہار جائے تو برسوں چمن کا نام نہ لے

نہ پوچھ اہلِ وطن کی نوازشیں ارشدؔ!
وہ بے وطن ہوں جو اپنے وطن کا نام نہ لے

سونے چاندی کی کھنکتی ہوئی تلواروں سے
کاٹے جاتے ہیں غریبوں کے گلے اے ساقی!

اب وہ دن دُور نہیں ہیں کہ صنم خانوں میں
عود و عنبر کی جگہ خون جلے اے ساقی!

کچھ خبر بھی ہے تجھے، کتنے گراں قدر احساس
دب گئے ہیں غمِ دوراں کے تلے اے ساقی!

روک اِن رُوٹھے ہوئے بادہ کشوں کو ورنہ
ابرِ رحمت کی طرح یہ بھی چلے اے ساقی!

ہو چلے ظاہر و باطن میں نمایاں تفریق
ایسے ماحول سے تنہا ہی بھلے اے ساقی!

اہلِ ظرف، اہلِ نظر، کتنے ہیں میخانے میں
ہم بھی دیکھیں گے، ذرا شب تو ڈھلے اے ساقی!

(آسی۔ پرتاپ گڑھ (توری)

عشق میں جتنی زیادہ بے کلی ہوتی گئی
روح لذّت آشنائے زندگی ہوتی گئی

جتنی شدّت سے کیا بادِ چمن سے اتحاد
آشنا رازِ تبسّم سے کلی ہوتی گئی

اوّل اوّل جان لیوا ہی رہی دل کی کسک
آخر آخر یہ بھی جزوِ زندگی ہوتی گئی

(ماہر القادری)

یہ برہمی جو زلفِ شکن در شکن میں ہے
اب اُن کا التفات نئے پیرہن میں ہے

کیا اب بھی جھومتے ہیں وہ آب کے سبزہ زار
کیا اب بھی نغمگی وہی گنگ و جمن میں ہے

افسوںؔ بھوپالی

سوز و ساز

اے دل طلب و شوق کی منزل سے گزر جا
حاصل سے گزر جا غمِ حاصل سے گزر جا

جیسے ابھی دیکھا ہی نہیں تو نے یہ منظر
یوں مرحلۂ حسنِ مقابل سے گزر جا

محدودِ مقامات نہ کر فکر و نظر کو
مہر و مہ و انجم کی بھی محفل سے گزر جا

یا راہ کی دشواریٔ پیہم سے نہ گھبرا
یا جوشِ پرستاریٔ منزل سے گزر جا

بنیاد نہ رکھ عشق کی امیدِ کرم پر
آغاز میں انجام کی مشکل سے گزر جا

آغوشِ بلا ہی سہی آغوشِ تلاطم!
ساحل کا سکوں موت ہے ساحل سے گزر جا

غم وہ توفیقِ محبت کہ جو حاصل ہو جائے
آدمی عشرتِ کونین کے قابل ہو جائے

اپنے عرفانِ تجلی کو نہ یوں عام کرو
رنگِ محفل ہی نہ برہم کنِ محفل ہو جائے

مری دنیا ترے جلووں سے عبارت ہے مگر
تو جو مل جائے تو سب کچھ مجھے حاصل ہو جائے

خود وہ در پردہ جو تکلیفِ توجہ نہ کریں
آج کل سانس بھی لینا مجھے مشکل ہو جائے

ہائے وہ دل جسے مجبور زمانہ سمجھے
وائے وہ عشق کہ جو رحم کے قابل ہو جائے

ترے ہوتے ہوئے غم کی ترے دل میں کمی کیوں ہو
یہ گھر کتنا ہی ویرانہ سہی بے رونقی کیوں ہو

کہاں کا ضبطِ غم توہینِ رسمِ عاشقی کیوں ہو
بھڑک سکتی نہیں جو آگ وہ دل میں دبی کیوں ہو

نہیں اظہارِ دردِ عشق کوئی معصیت لیکن
بہ رنگِ التجا کیوں ہو بہ طرزِ عاجزی کیوں ہو

شفق کا حسن چمن کی شگفتگی کیا ہے
جو تو نہیں تو یہ فردوسِ عارضی کیا ہے

تری نگاہِ توجہ کو میں نے دیکھا ہے
مجھے خبر ہے مقامِ خود آگہی کیا ہے

تری نوازشِ بے حد و بے حساب سے دور
بس ایک جبرِ مسلسل ہے زندگی کیا ہے

مجھے تو قیدِ رضا سے نجات مل جاتی
یہ راز کون سمجھتا کہ زندگی کیا ہے

بجھی بجھی سی نگاہیں مٹے مٹے سے نقوش
غمِ حیات کی توہین ہے خوشی کیا ہے

جو تشنہ گانِ طلب کے دلوں پہ اے افسوںؔ
شراب بن کے نہ برسے تو چاندنی کیا ہے

روحِ انتخاب

مغربی کلچر ایک سراب ہے!

میرے عزیز بھائی اور بہنیں مغربی کلچر سے اور مغربی طرز زندگی سے کیوں اتنے متاثر اور مرعوب ہو رہے ہیں۔ جبکہ یہ معاشرہ خود ہی روز بروز زوال پذیر ہوتا جا رہا ہے۔

کیا میرے بھائیوں اور بہنوں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ اہلِ مغرب ان ساری مشکلات اور پیچیدہ مسائل سے دوچار نہیں ہو رہے ہیں؟ اگر آپ فی الحقیقت ایسا ہی سوچ رہے ہیں تو پھر سامراجی اقتدار اور غیر ملکیوں کے تسلط سے آزاد ہونے کے لئے اتنی جد و جہد اور قربانیاں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کیونکہ جس ذہنیت کو اپنانا ہو اُسے آزاد ہونے کے بعد ہی کیوں اپنایا جائے۔ جبکہ زیر تسلط اور زیر اقتدار رہ کر بھی بہت آسانی کے ساتھ شیر و شکر ہو کر پورے مغرب زدہ ہو سکتے ہیں ۔؟

نہیں ۔! آپ مجھ سے سنیئے۔ جو خود ایک مغربی ہے۔ اور جس نے نازی ازم۔ کمیونزم، سرمایہ داریت اور جمہوریت جیسے جاری و ساری تمام نظاموں کا مزہ چکھا ہے۔ میں اور مجھ جیسے ہزاروں لاکھوں افراد جو مغربی ممالک میں رہتے ہیں ایسے ہی ناخوشگوار اور غیر اطمینان بخش حالات سے دوچار ہیں!

بلاشبہ ہم لوگوں کا (اہلِ مغرب کا) معیار زندگی بہت بلند ہے۔ ہمارے مزدوروں تک کو بھاری اُجرتیں ملتی ہیں۔ غذا۔ کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضرورتیں بڑی آسانی اور اعلیٰ معیار کے ساتھ پوری ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے بادی النظر میں ان کی مادی زندگی عیش و عشرت اور بہت ٹھاٹ سے گزرتی ہے۔ کیونکہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ پُر مسرت بنانے کے لئے عیش و انبساط کے پورے سامان مہیا ہیں۔ لیکن اس کے باوجود زندگی کی حقیقی مسرتوں سے وہ تہی دامن ہیں۔! لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی بے چینی اور اضطرابی کیفیت میں عیش و انبساط کے یہ سارے وسائل کچھ اس طرح مدغم ہو چکے ہیں۔ کہ ناخوشگواری کا احساس کسی طرح مٹنے نہیں پاتا اور ایک موہوم سی خواہش اور اطمینانِ قلب کا احساس دل میں چٹکیاں لینے لگتا ہے!

شعوری طور پر یہ احساس عام ہو چکا ہے کہ:-

تمدن اور مادی ترقی کے اعلیٰ ترین مدارج طے کرنے کے باوجود ان مغربی ممالک میں صرف پچیس (۲۵) تیس برس کی قلیل مدت میں دو ہولناک جنگیں نمودار ہو چکی ہیں۔ اور ان دونوں جنگوں میں بہیمیت اور درندگی نے دل کھول کر اپنے حوصلے نکالے۔ ہزاروں لاکھوں افراد اس بہیمیت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اور لاکھوں افراد معذور اور اپاہج بن کر زندہ درگور ہو گئے۔ بڑے بڑے پُر رونق شہر دیکھتے ہی دیکھتے شمشان بھومی بن گئے۔ مرد، عورت اور بچے ہزاروں کی تعداد میں نہایت بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ ہزاروں، لاکھوں افراد نے اپنے گھروں سے بے گھر ہو کر فٹ پاتھ پر سسک سسک کر دم توڑ دیا!

اور ابھی تک جبکہ گزشتہ جنگِ عظیم کے ناسور رِس رہے ہیں اور وہ جان لیوا گھاؤ ابھی تک مندمل نہیں ہوتے
ہیں۔ سارے ماحول میں درد اور کرب کی فضا پیدا کر رہی ہیں۔ مصائب اور آلام سے دوچار "انسانیت" کی سسکیوں
کا تسلسل ابھی تک ٹوٹنے بھی نہیں پایا۔ ایک اور جنگ کیلئے "الاؤ" تیار کیا جا رہا ہے۔ اور ان بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا
دے کر پھر بھڑکایا جا رہا ہے۔ تاکہ یہ بچے کھچے انسان بھی ان شعلوں کی لپیٹ میں آکر جھلس جائیں۔ ان ساری تلخ حقیقتوں
کے پیشِ نظر یہ احساس عام ہوتا جا رہا ہے کہ یہ سارے جاری و ساری نظریات "ازمس" مل کر بھی انسانیت کے لئے
کوئی پُر امن اور سکون بخش حل تلاش نہیں کر سکیں گے!

تصویر کا دوسرا رُخ

مغربی زندگی کے دُوسرے پہلو یہ ہیں کہ جب سے مغرب نے اپنی زندگی کو مادّی بنیادوں پر استوار
کرنے کی طرف توجہ دی ہے۔ اُس وقت سے ابھی تک زندگی کا منشاء اور مقصود صرف
حصولِ دولت کے تنگ دائروں میں محدود ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انسانی زندگی کی ابتداء اور انتہا یہی ہے کہ:۔

انسان دولت کمانے کے لئے زندہ رہے اور اس کے لئے مرے۔ جس کے نتیجہ کے
طور پر خود غرضی اور مفاد پرستی جیسے عناصر کا وجود میں آنا ایک لازمی امر ہے۔ ہر
فرد کو خواہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں ہو دولت کے پیمانہ پر ناپ تول کر اُس کی
عظمت اور بندگی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ ہر معاملہ میں تجارتی ذہنیت اور ہر کام میں
نفع اندوزی کا احساس جنوں کی حد تک پہنچ چکا ہے:

عورتوں اور مردوں کے آزادانہ اختلاط نے خاندانی زندگی کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جنسی بے راہ روی اور
نفسانی خواہشات کی تکمیل کا شوق عورتوں اور مردوں میں حیوانیت کے درجہ تک پہنچ چکا ہے۔ فلم، ناچ گھر۔ فحش لٹریچر
اور آزاد عشق و عاشقی نے نوجوانوں کو ہوس پرستی اور نفسانی خواہشات کا غلام بنا دیا ہے!

اِن تمام برائیوں سے بڑھ کر یہ برائی ہے کہ تمام مغربی ممالک اور روس میں تمام معاملات میں انسان ہی اقتدارِ اعلیٰ
بن بیٹھا ہے۔ انفرادی مسائل سے لے کر اجتماعی مسائل تک تمام معاملات میں "انسان" کی ناقص عقل اور ناقص فیصلوں
کو اٹل مانا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے قدم قدم پر ناانصافی، تعصب اور مفاد پرستی کا مظاہرہ ہوتا ہے!

قانون سازی، نظریہ حیات مدوّن کرنے میں فرد اقتدارِ اعلیٰ کی حیثیت سے انسانی اقدار کی کبھی صحیح معنوں میں نگہداشت
نہیں کر سکتا۔ کیونکہ کوئی آدمی بھی انسانِ کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور نہ اس کی بصیرت اس حد تک محیط ہو سکتی
ہے کہ انسانی زندگی کے محدود مسائل کی صحیح صحیح نشاندہی اور ان کا مناسب حل تلاش کر سکے علوم و فنون کی لا محدود ترقی
بھی انسان کے محدود علم کو لا محدود نہیں بنا سکتی۔ جس کی بنا پر اُس کے فیصلوں میں، اس کی سمجھ بوجھ میں اور اس کی فکر
میں کوئی نہ کوئی ڈھکی چھپی خامی ایسی رہ جاتی ہے۔ جو شر و فساد اور بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی کا موجب بن جاتی
ہے ـــ!

اس کی وجہ سے موجودہ انسانوں کی زندگی اتنی پُر حوادث اور غیر محفوظ ہو چکی ہے کہ صحت اور سلامتی اس سے
رخصت ہوتے جا رہے ہیں!!

(محمد امان ہوبھام (جرمنی)

نور صفی

یہ بھی زندگی ہے؟

وہ میز پر کہنیاں ٹیک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے ہوئے سوچ رہا تھا۔ کہ اب زندگی کا کیا ہوگا؟ یہ کیسے گزرے گی؟ کیا زندگی کے گھنگور اندھیرے میں اُجالا ہوگا۔ کیا اس کے ویرانے میں پھول کھلیں گے۔ کیا اس دریا کی سطح کبھی ساکن بھی ہوگی؟۔۔ اچانک اس کے تصور میں ننھا طاہر مسکراتا، ہنستا اور کھیلتا ہوا آیا۔ اس کے بعد فہمیدہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ نمودار ہوئی۔ خالد بھی ہشاش بشاش نظر آیا۔ آخر وہ سب ایک کے بعد ایک پردۂ فلم کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے ابھر کر تیزی سے غائب ہو گئے۔ اس خیال سے جیسے اُس کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے دل کی کلی کِھل گئی۔ اور احساس میں چاندنی سی کھِل گئی۔ اُسے اندھیرے میں جگنوؤں کی چمک سی نظر آنے لگی!

پروین کافی دیر سے آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنی آرائش و زیبائش میں مشغول تھی۔ اور پونڈز کریم و پوڈر اور "ٹانگی" کا لِپ اِسٹک اور نیل پالش سب استعمال کر چکی تھی۔ مگر ابھی زلفوں کے پیچ و خم باقی تھے۔ جس میں وہ خود اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ وہ ایک زلف کو اپنے چہرے پر اس طرح سے لہرانا چاہتی تھی جیسے وہ قدرتی ہو۔ کیونکہ اکرم کو یہ چیز بہت پسند تھی۔ جب وہ اپنی انگلی سے زُلف کو اس کے چہرے سے ہٹا کر یہ شعر پڑھتا ؎

زُلف جو رُخ سے ہٹی ہوگیا روشن عالم
اس اندھیرے میں عجب ہم نے اُجالا دیکھا

تو وہ یہ سُن کر خوشی سے جھوم جھوم جاتی۔ آخر جب کاکلِ سرکش اُس کے چہرے پر سرکشی کرنے کے لئے تیار ہوگیا تو وہ مطمئن ہوگئی۔ اس کے بعد اپنے اُوپر "سینٹ اسپرے" سے فردوس کا "مدن مست" چھڑکنا شروع کر دیا۔ کمرے کی فضا مہک اٹھی۔ ہر چیز مشکبار ہوگئی۔ اس نے آخری دفعہ قدِ آدم آئینہ میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے سیاہ اور گھنگریالے بال عجیب شانِ بے نیازی کے ساتھ اُس کی گردن پر لہرا رہے تھے۔ اس کا شیفون کا دوپٹہ اس کے شانوں پر بے نیازانہ انداز میں پڑا ہوا تھا۔ البتہ اس کے دونوں پلّو ہوا سے یوں لہرا رہے تھے۔ گویا کہ وہ مائلِ پرواز تھی۔ وہ ابھی باہر جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ اتنے میں اس کا شوہر حامد آگیا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی:۔

"آج بہت دیر کر کے پہنچے۔ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا"۔

پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دیتا وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں اپنے بیگ کو گھماتی ہوئی گھر سے ایسے باہر نکل گئی جیسے کمان سے تیر۔ جاتے ہوئے صرف اتنا کہا کہ:۔

"میں ذرا ایک تقریب میں اپنی فلاں سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں"۔

حامد نے جیسے یہ سنا ہی نہیں۔ اس کے لئے پروین کی موجودگی اور عدم موجودگی برابر تھی۔ وہ اتنا عاجز آ چکا تھا کہ اس نے

اُس سے جاتے ہوئے یہ بھی دریافت نہیں کیا کہ وہ کب آئے گی۔ کیونکہ یہ پروین کا ہمیشہ کا معمول بن چکا تھا۔ اُس کی زندگی گھر سے باہر باغ و بہار اور گھر کے اندر ایک ناقابل برداشت گھٹن تھی۔ اس کے لئے گھر سے باہر رہنے کے سینکڑوں عذر اور بہانے تھے!

حامد آزاد خیال ضرور تھا۔ مگر انتہا پسند نہیں تھا۔ بلکہ ہر چیز میں اعتدال برتتا تھا۔ حسّاس اور غیرت مند ہونے کی وجہ سے اُسے پروین کی آزادروی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ مگر جب کبھی وہ پروین کو روکتا تو وہ ٹکا سا جواب دے دیتی۔ مثلاً وہ کہتا کہ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قوموں کی تباہی کے وقت عورتیں قومی زندگی میں پیش پیش آجاتی ہیں" وہ اس کا جواب یوں دیتی:-

"عورتوں کی پیش قدمی، اُن کی صحیح یا غلط راہ روی کی تمام تر ذمہ داری مردوں پر عائد ہوتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں مردوں نے کیا کیا۔ مردوں ہی نے عورتوں کو اُن کے اصلی مقام سے ہٹا دیا۔ اور عورتیں بھی اس جال میں پھنس گئیں۔ آج لاکھوں کروڑوں عورتیں اپنے مقصدِ اوّلین سے دُور جا پڑی ہیں۔ اور زندگی اُن کے لئے عذاب بن گئی ہے"!

وہ اس قسم کا جواب سُن کر دل میں نادم ہو جاتا۔ کیونکہ یہ سب کیا دھرا اُسی کا تھا جس کا اُسے احساس تھا۔ پہلے پہل اُسی نے پروین کو آزادی کے ساتھ گھمانا شروع کیا تھا۔ اگر وہ آج پروین کو سمندر لے گیا تو کل سینما لے جاتا۔ اگر کل ایک دوست کی سالگرہ میں اُس کے ساتھ تھی۔ تو پرسوں کسی کی شادی میں دونوں موجود ہوتے۔ یہی وہ رویّہ تھا جس نے پروین کو آزادروی اختیار کرنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ شروع میں حامد اسی رویّہ کو تہذیب جدید کے نام سے یاد کرتا تھا۔ مگر جب پروین کی پرواز اس کی پہنچ سے دُور ہو گئی تو اُس نے اس چیز کو اپنے لئے تباہ کن سمجھا اور پھر جب اُس نے پروین کی ہنسی، اس کا سنگار، اُس کی آرائش و زیبائش اور خوشی غرضکہ اُس کی ہر چیز دوسروں کے لئے دیکھی۔ تو اُس کی شکل بیدار ہو گئی۔ اور اس کی رگِ حمیت پھڑک اُٹھی۔ اس لئے اُس نے پروین کو اپنے ساتھ لے جانا چھوڑ دیا۔ مگر اب وہ سب لوگ جن سے پروین متعارف ہو چکی تھی۔ اُس کے دوست اور سہیلیاں بن گئے تھے۔ حامد کے ساتھ نہ جانے سے اُس کا نفسیاتی اثر یہ پڑا کہ وہ بلا جھجک اُن کی ہر تقریب میں جانے لگی۔ غرضکہ وہ اس کی دسترس سے بہت دُور ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی اجیرن ہو چکی تھی۔ اور وہ اس سے مایوس ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ ہاتھی کے دانت ایک مرتبہ باہر نکل کر دوبارہ اندر نہیں جاتے۔ اب اُس کو اُس کے تصور ہی سے اذیت پہنچتی تھی!

ہاں تو وہ آج بھی یونہی پروین کے جانے کے بعد سوچنے لگا کہ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ شوہر کو جب بیوی پر اعتماد نہ رہے اور گھر جہنم نہ بن جائے تو اور کیا بنے۔ یہ روز روز کی تلخی، بدمزگی، درشت کلامی، نوک جھونک، گھریلو تعلقات کے لئے موت کا پیغام ہیں۔ اس زندگی سے آخر کیا فائدہ جس میں سوائے رنج و محن کے مسرت و انبساط کا شائبہ تک نہیں۔ اور پھر ہمارے مزاج اور طبیعتیں الگ ہو گئی ہیں تو راستے بھی الگ ہو جانے چاہئیں۔ مگر جب علیحدگی کا سوال پیدا ہوتا تھا تو اُسے اُس کا کوئی حل نہیں سوجھتا تھا۔ کئی باتیں اس کے راستے میں حائل ہو جاتی تھیں۔ مثلاً سب سے پہلے تو یہی کہ ایک دفعہ جب اس کا کاروبار فیل ہونے لگا تھا۔ تو پروین نے اپنے باپ سے روپیہ لا کر مدد کی تھی۔ جس سے اس کا کاروبار دوبارہ چمک اُٹھا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس کے بارِ احسان سے دبا ہوا تھا۔ دُوسری چیز جو اُسے پروین کو ساتھ رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ اُس کا حُسن اور تعلیم تھی۔ جس سے وہ بے حد متاثر تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اگر اُسے چھوڑ دیا گیا تو کہیں کوئی جاہل اور بدصورت بیوی نہ مل جائے۔ جس کے تصوّر ہی سے وہ کانپ جاتا تھا۔ پھر وہ اپنی بدنامی سے بھی ڈرتا تھا۔ کہ دشمن

ہی نہیں خود اُس کے دوست اور عزیز و اقارب اس واقعہ پر نہ جانے کیا کیا رائے زنی کریں گے۔ یہی وہ تصورات، خیالات اور اندیشے تھے جو اُس کا راستہ روک کر کھڑے ہو جاتے اور فکر و خیال کی اس کشمکش سے جو ذہنی اذیت اُسے پہنچتی تھی اُسے وہی جانتا تھا!

اُس دن بھی اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کا دماغ پھٹ جائے گا۔ اُس کے جی میں آیا کہ کہیں بھاگ جائے۔ مگر کہاں؟ یہ سوچنے کی بات تھی۔ آخر کافی دیر سوچنے کے بعد اس نے لاہور اپنے بڑے بھائی خالد کے ہاں کچھ مدت کے لئے چلے جانے کا ارادہ کر لیا۔ اُس نے خیال کیا کہ وہاں پر اگر اور کچھ نہ ہو سکا تو کم از کم غم تو غلط ہو جائے گا۔ اور بھائی بھاوج جو اُس کے نہ آنے کی ہمیشہ شکایت کرتے رہتے ہیں۔ اس کی بھی اس طرح تلافی ہو جائے گی!

خیر وہ چند روز کے لئے لاہور چلا گیا۔ بھائی اور بھاوج کو چھوٹے بھائی کی اچانک آمد پر بے حد تعجب ہوا۔ مگر اُن کی خوشی کی بھی کوئی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیئے۔ مگر پروین کو ساتھ نہ لانے پر شکایت بھی کی۔ تو اُس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اگر ہم دونوں آجاتے تو گھر اکیلا رہ جاتا۔ وہ پھر کسی موقع پر آجائے گی۔

حامد کے جواب سے اُس کے بھائی اور بھاوج مطمئن نہ ہو سکے۔ مگر انہوں نے بات کی کرید بھی مناسب نہ سمجھی۔ اس لئے خاموش ہو گئے۔ مگر ایک دن یہ راز کھل ہی گیا۔ ہوا یہ کہ حامد کہیں باہر گیا ہوا تھا اور خالد کے دفتر کی چھٹی تھی۔ وہ گھر پر ہی تھا۔ حامد کے نام ایک تار آیا۔ جس میں لکھا تھا کہ پروین کئی دن سے غائب ہے۔ اکرم کے ساتھ چلے جانے کی خبر مشہور ہے!

دونوں میاں بیوی نے اس تار کو پڑھا تو وہ سکتہ میں آگئے۔ سب سے زیادہ دھچکا خالد کے دل کو لگا۔ بھائی کی عزت اور ناموس کا معاملہ تھا۔ ان دونوں نے تار کو چھپا لینے ہی میں مصلحت سمجھی!

ایک دن وہ یونہی لیٹا ہوا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔ سامنے پلنگ پر اُس کا بھتیجا طاہر سو رہا تھا۔ اُس نے اچانک جاگتے ہی رونا شروع کر دیا۔ حامد نے کتاب ایک طرف رکھ کر بچے کو گود میں اُٹھا لیا۔ وہ اور زور سے رونے لگا۔ آخر اس نے بھابی کو آواز دی جو باورچی خانہ میں کام کر رہی تھی۔ اُس نے وہیں سے جواب دیا:۔

"حامد بھیا اس کو پلنگ پر ہی لٹا دو۔ یہ آپ ہی خاموش ہو جائے گا۔ میں ابھی آرہی ہوں۔"

یہ سن کر اس نے روتے ہوئے بچے کو دوبارہ پلنگ پر لٹا دیا۔ اُس کی بھابی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا تھا۔ مگر وہ باورچی خانے میں چولھے کے آگے مونڈھے پر بیٹھی ہوئی پسینہ میں شرابور گوشت بھونے جا رہی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چمچہ سے مصالحہ نکال کر سونگھ لیتی تھی کہ کہیں کچا تو نہیں رہ گیا۔ چمچہ اور پتیلی کے ٹکراؤ سے ایسی آواز پیدا ہو رہی تھی جیسے کوئی پتی ورتا استری بیٹھی گھنٹی بجا رہی ہو اور ساتھ ہی "پتی چرن کے گن" گا رہی ہو۔ مگر وہ ایسا ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ نہ تو وہ پتی کے چرنوں کی دھول کو چندن سے اچھا سمجھتی تھی اور نہ اُس کے چرنوں میں سیس نوانا پسند کرتی تھی۔ وہ تو صرف اپنا فرض ادا کر رہی تھی۔ پھر اُس نے یونہی گوشت بھونتے بھونتے جب چمچہ میں مصالحہ نکال سونگھا تو وہ ابھی کچا تھا۔ اُس نے دوبارہ پتیلی میں ڈال دیا۔ اور چمچہ گھمانے لگی۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگی:۔

"یا اللہ! آج کا سالن تو ایسا لذیذ بنا دے کہ کھاتے ہی اُن کا دل باغ باغ ہو جائے اور وہ انگلیاں چاٹتے رہ جائیں۔ وہ کئی دفعہ کہہ چکے ہیں کہ کیا سالن پکانا بھول گئی ہو۔ آج کل کھانے میں مزہ بالکل نہیں آتا۔ کبھی مصالحہ کچا ہے تو کبھی نمک تیز"

وہ سوچنے لگی۔ وہ ٹھیک ہی تو کہتے ہیں۔ میں ہی اتنی پھوہڑ ہوں کہ اُن کو اچھا کھانا بھی تیار کر کے نہیں دے سکتی۔ اس سے اچھا تو وہ ہوٹل پر ہی کھا سکتے ہیں۔ مگر جب انہوں نے ہوٹل پر ہی کھانا کھا لیا تو اُن کے لئے میرا ہونا یا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

اسی سوچ بچار میں اُس نے زور سے چمچہ گھما کر تھوڑا سا مصالحہ نکالا اور ہتھیلی پر ڈال کر زبان سے چاٹ لیا۔ اور محسوس کیا کہ مصالحہ ٹھیک ہے۔ پھر اُس نے ذرا سی بوٹی توڑ کر دیکھا تو گوشت بھی گل چکا تھا۔ اس کے بعد اُس نے فوراً ہی آلوؤں کے چھلے ہوئے قتلے جو کہ اُس کے پاس ہی پانی سے بھرے ہوئے پیالے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ سب کا پانی جھٹک کر پتیلی میں ڈال دیئے اور چمچہ سے اچھی طرح ہلا کر تھوڑا سا پانی ڈال کر دھیمی دھیمی آنچ پر پکنے۔ کیلئے چھوڑ دیا۔

ادھر سے مطمئن ہو کر وہ آٹا گوندھنے کا ارادہ کرنے ہی لگی تھی کہ اُس نے ایک دھماکے کی آواز سُنی۔ وہ فوراً دوڑی ہوئی آئی تو دیکھا کہ بچّہ چارپائی پر سے فرش پر گرا پڑا ہے۔ حامد بچّے کو اُٹھانے کے لئے دوڑا۔ مگر اُس کی بھابی نے پہلے بڑھ کر اور ہائے اللہ کہہ کر فوراً اُسے گود میں اٹھا لیا اور اُسے تھپکنے اور چمکارنے لگی۔ مگر وہ خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ حامد نے کہا۔

"بھابی جان! آپ تو کام کی خاطر بچّہ کی بھی پروا نہیں کرتیں؟"

اتنا سُن کر اُس کے ہونٹوں پر خفیف سی مُسکراہٹ پیدا ہو کر ختم ہو گئی۔ وہ یونہی بچّہ کو کاندھے سے لگائے کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ آخر کافی دیر کے بعد بچّہ خاموش ہو گیا۔ پھر اُس نے دُودھ پلایا اور ایک چاکلیٹ دے کر فرش پر چھوڑ دیا۔ بچّہ فرش پر کھیلتا رہا۔ اور اس وقفہ میں اُس نے آٹا گوندھ لیا۔ اس کے بعد ہانڈی دیکھ کر نیچے اُتار دی اور چولھے پر توا ڈال دیا۔ آنچ اور تیز کر دی۔ بچّہ صحن میں لڑھکتے ہوئے چاکلیٹ چوستا رہا اور وہ روٹی پکاتی رہی۔ ابھی وہ روٹی اور ہانڈی سے فارغ ہونے ہی والی تھی کہ محلہ کی مسجد سے موذن نے اذان بلند کی۔ "اللہ اکبر" "اللہ اکبر"۔ اُس نے جلدی سے سب برتن وغیرہ سمیٹ کر کمرے کی بتی روشن کی اور کمرے میں نیلگوں روشنی پھیل گئی۔ بچّہ خوشی سے ٹمکنے لگا۔ اُس نے جھٹ پٹ وضو کر کے مُصلا بچھایا اور خدا کے حضور میں اپنا سرِ نیاز خم کر دیا۔ اس کا بچّہ بھی لڑھکتے لڑھکتے مُصلے پر آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے جھٹ سے اُسے ایک طرف ہٹا کر دوبارہ اپنے معبودِ حقیقی کے سامنے سر جُھکا دیا اس سے فارغ ہو کر اُس نے اپنے دل کو پُرسکون اور مطمئن سا پایا۔ اس کے بعد اُس نے سفید صاف سُتھرا مگر سادہ لباس زیب تن کیا۔ جس سے وہ کنول کا پھول سا بن گئی۔ پھر آئینے میں دیکھ کر بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے گنگنانے لگی:۔

"چھیتی چھیتی آ چن وے مینوں تیریاں اُڈیکاں"

(اے ساجن جلد آ میں تیرے انتظار میں ہوں)

اس کے بعد وہ بچّے کو گود میں لئے برآمدے میں کھڑے ہو کر اپنے شوہر کا انتظار کرنے لگی۔ کچھ دیر کے بعد جب اُس نے گھر کے سامنے والے پیڑوں کے پیچھے کسی کے قدموں کی آہٹ سُنی تو اس کا دل دھڑکا۔ جب قدموں کی آہٹ نزدیک آ گئی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آخر قدموں کی آہٹ اور دل کی دھڑکن دونوں ہم آہنگ ہو گئے۔ اتنے میں اُس کا شوہر مُسکراتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ وہ اُس کی طرف شرمائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر مُسکرا دی۔

خالد کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے کی ساری تھکن دُھل گئی ہے۔ دل میں خوشی کے کنول کھل گئے ہیں۔ ابھی وہ گھر میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ بچّے نے ابّا! ابّا! کہہ کر دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ وہ جھٹ اُسے گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اُن کے دل مسرت سے بھر گئے اور پھر ہنستے ہوئے کمرے میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر سستانے کے بعد خالد نے کپڑے تبدیل کئے اور ہاتھ مُنہ دھویا۔ اس اثناء میں بچّہ سو چکا تھا۔ حامد کی بھابی فہمیدہ نے دسترخوان بچھا دیا۔ اور دونوں بھائیوں کے آگے کھانا چُن دیا۔ اور انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔ خالد کھانے کے دوران ہی میں فہمیدہ سے

مخاطب ہو کر کہنے لگا:-

"واہ سبحان اللہ! آج کھانا اتنا لذیذ ہے کہ تمہیں انعام ملنا چاہیئے۔"

فہمیدہ یہ سُن کر، خالد کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ کر مُسکرا دی۔ خالد نے حامد کی تائید حاصل کرنا چاہی اور پوچھا:-

"کہو بھئی حامد! تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بالکل وہی جو آپ کا ہے۔ آج بھابی جان واقعی انعام کی مستحق ہیں۔ کیونکہ آج انہوں نے کھانے کی خاطر نخّے کے رونے کی بھی پرواہ نہیں کی۔" حامد نے مُنہ میں نوالہ رکھتے ہوئے کہا۔

فہمیدہ یہ سُن کر حامد کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگی:-

"بس بس! رہنے دو حامد بھیا! تم بھی اپنے بھائی جان کی طرح لگے بنانے۔"

حامد یہ سُن کر مُسکرا دیا۔

"ٹھیک ہی تو کہا ہے حامد نے۔" خالد نے جواب دیا۔

اس پر فہمیدہ کہنے لگی:-

"بالکل غلط۔ کیا تمام عورتیں اپنے گھر کا کام کاج محض انعام حاصل کرنے کی خاطر ہی کرتی ہیں۔ عورت کا اصلی مقام گھر ہے۔ اگر وہی اس کا خیال نہ کرے تو گھر سنوارنے کے لئے کیا کوئی آسمان سے آئے گا؟ خیر میری بات تو چھوڑیئے آپ اپنی سُنائیے۔ آپ صبح سے شام تک محنت کرتے ہیں۔ جان کھپاتے ہیں۔ تب جا کر کہیں پیسوں کی شکل دیکھنا نصیب ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ انعام کے مستحق تو آپ ہیں۔"

"گھر کی دیکھ بھال اور بیوی بچّوں کی حفاظت تو مرد کا فرض ہے۔ لہٰذا اس کے لئے انعام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"تو کیا گھر کی نوک پلک سنوارنا عورت کا فرض نہیں۔ پھر وہ انعام کی خواہش کیوں کرے۔ یہ آخر ہمارا گھر ہے کوئی کارخانہ یا دفتر نہیں۔ جہاں پر کسی معاوضہ یا انعام کی خاطر کام کیا جائے۔ مرد کا کمانا۔ عورت کا اُسے صحیح مصرف میں لانا بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک شخص نگینے جمع کرے دُوسرا ان نگینوں کو قرینے کے ساتھ جوڑتا چلا جائے۔"

"اچھا بابا اچھا! اب میرا پیچھا بھی چھوڑو۔ تم جیتیں اور میں ہارا۔"

حامد اور خالد کھانا کھا چکے تھے۔ فہمیدہ دستر خوان اور برتن سمیٹ کر باورچیخانے میں رکھنے چلی گئی۔ دونوں بھائی ایک دُوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑے۔

حامد جتنے عرصہ وہاں رہا بہت پُرسکون رہا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنے بھائی کی اور اپنی زندگی میں بہت تضاد پایا۔ اُس کی زندگی میں تلاطم تھا، موجیں تھیں اور تھپیڑے تھے۔ اُس کی کشتیِ حیات بھنور میں پھنسی ہوئی تھی۔ لیکن اُس کے بھائی کی زندگی صاف شفاف اور ساکن تھی۔ جس پر اس کی تمنّاؤں کی کشتی بڑے اطمینان کے ساتھ رواں دواں تھی۔ بھائی کی مطمئن اور پُرسکون زندگی پر اُسے رشک سا آنے لگا۔ میاں بیوی کے اچھے تعلقات دیکھ کر اُس کے دل کی چوٹیں اُبھر آئیں!

اب وہ کراچی جانا چاہتا تھا واپس! وہیں جہاں سے وہ اُکتا کر اور پریشان ہو کر لاہور چلا آیا تھا۔ بھائی کے اصرار پر دو دن اور ٹھہرا رہا۔ آخر ایک دن کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔ مگر یُونہی خالی خولی نہیں نئے عزائم کے ساتھ! گھر بیو

زندگی کی ایک متوازن اسکیم دل و دماغ میں لئے ہوئے!

گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی ہی تیزی کے ساتھ حامد بھی خیالات کی رو میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ بیٹھا بیٹھا تھک چکا تھا۔ آخر اس نے انگڑائی لی۔ اور سگریٹ سلگا کر کھڑکی میں دُور دُور تک پھیلے ہوئے سرسبز شاداب کھیت، درخت پودوں اور جھاڑیوں کو دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہ تار کے کھمبوں پر جم کر رہ گئی۔ جن کا لامتناہی سلسلہ لائن کے ساتھ ساتھ نہ معلوم کہاں تک چلا گیا تھا۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ اُسے تار سطح زمین سے آہستہ آہستہ بلند ہوتے ہوئے دکھائی دیئے۔ پھر اچانک ایک کھمبا بیچ میں آگیا۔ جو اس تار کو دوبارہ زمین کے ساتھ ملا کر گزر گیا۔ تار نے پھر اسی طرح سے اُبھرنا شروع کیا۔ کسی کھمبے نے پھر اُسے دبا دیا۔ وہ ایک چیز کو اُبھرنے اور دُوسری کو اُس کے دبانے پر غور کرنے لگا۔ بالکل یہی چیز اُسے درپیش تھی۔ اس دفعہ تار نے پھر آہستہ آہستہ اُبھرنا شروع کیا۔ اُس کے خیالات کے تار بھی اُبھرنے رہے!

اُس نے پروین کے متعلق سوچنا شروع کیا کہ اس کی تمام رعنائیاں دُوسروں کے لئے ہیں۔ وہ مجھ سے بے پروائی برت کر اور نظر انداز کر کے اپنے مہذّب ہونے پر فخر کرتی ہے۔ وہ میرے ہوتے ہوئے بھی اوروں کو حریصانہ نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس کے بعد ایک کھمبا تار کو دبا کر تیزی سے گزر گیا۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کے خیالات کے تار بھی دب گئے۔ اس دفعہ اس کے تصوّر میں اس کی بھابی آگئی۔ کھمبے نے تار کو دبا دیا۔ بھابی پروین کے تصورات پر غالب آگئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اُس کی بڑی بہن یا ماں ہے۔ کیونکہ اس کے سلوک میں اس نے شفقت کی جھلک دیکھی تھی۔ اُسے وہ خالد بھائی کے لئے ہار سنگھار کرتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کے کانوں میں بھابی کے وہی الفاظ گونجنے لگے:۔

> "عورت کا اصلی مقام گھر ہوتا ہے۔ کیا گھر کی نوک پلک سنوارنا عورت کا کام نہیں؟
> یہ آخر ہمارا اپنا گھر ہے، کوئی کارخانہ یا دفتر نہیں۔ جہاں پر کسی معاوضہ یا انعام کی
> خاطر کام کیا جائے۔ مرد کا کمانا، عورت کا اسے صحیح مصرف میں لانا بالکل ایسا ہی ہے
> جیسے ایک شخص نگینے جمع کرے دُوسرا ان نگینوں کو قرینہ کے ساتھ جوڑتا چلا جائے۔"

وہ دل میں کہنے لگا۔ بھابی اگر اُجالا ہے تو پروین اندھیرا ہے!

وہ انہی تصورات میں ڈوبا ہوا اپنے گھر آرہا تھا۔ جُوں جُوں کراچی نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی بے چینی بھی بڑھ رہی تھی۔ اُس کے احساسات اور تصورات دل و دماغ پر ایک جال سا بُن رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ عورت اگر چاہے تو گھریلو زندگی جنّت بن سکتی ہے۔ مگر پروین! (اُس کے ہونٹوں کو ہلکی سی آہ نے چھولیا) نے اپنی تمام رعنائیوں اور دل کشیوں کے باوجود گھر کو دوزخ بنا دیا ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات کو مضبوط رکھنے والی چیز حسن و صباحت نہیں۔ سیرت و کردار کی پاکیزگی اور ایک دوسرے کی غم خواری ہے!

حامد نے قدرے جھنجلاہٹ کے ساتھ بالوں کے پیچ کو زور سے مروڑ دیا۔ وہ دل ہی دل میں پروین سے قطع تعلق کی تدبیر سوچ رہا تھا کہ اچانک اُسے بیوی کا ایک ہیولیٰ سا نظر آیا۔ جیسے کہ وہ کہہ رہی ہو۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ میں تمہارے آڑے وقت کام آچکی ہوں۔ ورنہ آج تم در در ٹھوکریں کھاتے پھرتے۔ اگر تم مجھے چھوڑ دو گے تو لوگ تمہیں ذلیل سمجھیں گے۔ اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے ...... یہ خیال آتے ہی وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے

جذبات میں ایکا ایکی بریک لگا دیا۔ وہ اپنے دل سے باتیں کرنے لگا:۔
"مگر چھوڑنا تو پڑے گا۔ اور چارہ کار ہی کیا ہے۔ (قدرے تامل کے بعد) مگر لاؤ ایک بار اور کوشش کر دیکھوں۔
شاید پروین راہ راست پر آجائے...... مگر یہ سارا کیا دھرا میرا ہی تو ہے۔ میں نے ہی اُسے آزادی دی ہے۔ اگر میں شروع ہی سے
ڈھیل نہ دیتا تو ان باتوں کی نوبت کیوں آتی؟
انہی خیالات کے طوفانوں میں ہچکولے کھاتا ہوا وہ گھر پہنچا۔ مگر وہاں پہنچتے ہی ملازم کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ پروین تو اکرم
کے ساتھ فرار ہو گئی۔ اس کے دل کو زبردست دھچکا لگا۔ وہ صوفے پر اس طرح بیٹھا جیسے کسی نے اُسے دھکا دے کر گرا دیا ہو۔
"اوفو! یہ کیا ہوا۔ میری اس کوشش کو بھی بروئے کار آنے کا موقع نہ مل سکا"۔
اور وہ بڑبڑا ہی رہا تھا کہ کسی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا تو اس کا دوست نعیم مسکرا رہا تھا۔
"...... تم ہو...... نعیم...... کہو اچھے تو رہے..." حامد نے کہا۔
"جی اچھا ہوں...... مگر تم اپنی حالت تو دیکھو۔ چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہیں...... لیکن میں سب کچھ جانتا ہوں...
تمہاری یہ پریشان حالی بے سبب نہیں ہے۔ میں نے ہی تمہیں تار دیا تھا...."
حامد اپنے دوست کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "مگر مجھے تمہارا کوئی تار نہیں ملا"۔
"شاید تمہارے بھائی اور بھاوج نے اُس تار کو چھپا لیا کہ تمہیں صدمہ نہ ہو اور تم کہیں کوئی خوفناک اقدام نہ کر بیٹھو۔ اور
اُن کا گھر تمہارے غم کی وجہ سے ماتم خانہ نہ بن جائے"۔
نعیم کی گفتگو نے حامد کو اور ندھال سا کر دیا۔ وہ اس کے چہرے کو ایک گیونگے کی طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے تمام جذبات
اس کی آنکھوں میں کھنچ کر آ گئے تھے اور اس کی زبان اُن کے اظہار سے قاصر تھی!
"حامد! جو کچھ ہو چکا وہ ہو چکا۔ افسوس کرنے اور پچھتانے سے ہونی بات اَن ہونی تو نہیں ہو سکتی۔ افسوس کرنا اب بیکار ہے!"
"تو میں کیا کروں؟"
"سنو! اکرم اور پروین کے تمام حالات مجھے معلوم ہوتے رہے ہیں۔ اکرم نے پروین کو دغا دی۔ وہ اس کا تمام زیور اور روپیہ
پیسے لے کر چلتا بنا۔ ڈھاکہ جا کر اس نے کپڑے کی دکان کھول لی ہے۔ مگر پروین کو تو اس ظالم نے کہیں کا نہ رکھا۔ شوہر کے
گھر وہ واپس نہیں آ سکتی۔ میکے میں جائے تو کیا منہ لے کر جائے۔ جو کچھ اس کے پاس پتے تھا وہ اکرم کے ہتھے چڑھ گیا۔ اُس نے
مجبور ہو کر ایک ہوٹل میں نوکری کر لی ہے......"
"ہوٹل کی نوکری میں تو پروین کے اور مزے ہوں گے۔ ہر طرح کی پابندی سے آزاد......"
(بات کاٹ کر) "یہ نہ کہو حامد! عورت دھوکا کھا کر بہت کچھ سنبھل جاتی ہے۔ اُس کی آنکھیں کھل گئی ہوں گی۔ کہ
میں نے یہ کیا کیا؟ اب تم اُس کی دستگیری کرو......"
"میں دستگیری کروں اُس کی...... میری وفا اور محبت کو تو وہ ٹھکرا چکی......"
"حامد جذبات سے کام نہ لو۔ یہ عقل و ہوش سے کام لینے کا وقت ہے۔ پروین بے سہارا ہے۔ تم اُسے سہارا دو۔ مجھے
یقین ہے کہ اب وہ اپنے کو بالکل بدل کر زندگی کی کشمکش میں تمہارا ساتھ دے گی۔ پروین اس سلگتی ہوئی لکڑی کی طرح ہے
جسے قافلے والے آگ لگا کر چل دیئے ہوں۔ میرا کہا مان لو۔ حامد! بھلا دو جو کچھ اب تک ہو چکا ہے۔ یوں سمجھو کہ اب زندگی

نئے سرے سے شروع ہو رہی ہے!"

بہت دیر تک دونوں دوستوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ سوال، جواب، نرم گرم فقرے، دلیلیں، اندیشے۔ مگر آخر کار حامد کو نعیم کی بات ماننی پڑی۔ اُس نے ہامی بھر لی پروین کو اپنے گھر لانے کی!

حامد اور نعیم دونوں ہوٹل پہنچے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پروین فرسٹ فلور پر ہے۔ دو تین منٹ میں فرسٹ فلور بھی آگیا۔ پروین ہوٹل کے بیرے کو ہدایتیں دے رہی تھی۔ حامد کے پاؤں بوجھل سے ہو گئے۔ مگر نعیم کے اشارہ کرنے پر وہ ہمت کر کے آگے بڑھا۔ "پروین!" اُس نے آہستہ سے کہا۔ پروین نے مڑ کر دیکھا تو حامد پر نگاہ پڑتے ہی اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ رخساروں کی سرخی ایک دم پھیکی پڑ گئی!

پروین زینہ کی طرف جانے لگی۔

"پروین! جانتی ہو میں یہاں کس لئے آیا ہوں" حامد نے دل گیر ہو کر کہا۔

"ہوٹل میں تو لوگ ٹھہرنے کے لئے آیا کرتے ہیں۔" پروین نے جواب دیا۔

"میں مسافر نہیں ہوں۔ میں تمہارے لئے آیا ہوں ......"

حامد کی بات کاٹ کر پروین بولی۔ "مگر میں اب تمہارے لائق نہیں رہی۔ میرا خیال چھوڑ دو۔ مجھے اپنے کئے کی سزا بھگت لینے دو...... اور ......"

پروین زینہ کی طرف اُلٹی چل رہی تھی۔ پیچھے سے ایک اینگلو انڈین اپنے خوفناک کتے کو لئے ہوئے آ رہا تھا۔ پروین کا پاؤں کتے کے پنجہ پر پڑ گیا۔ کتے نے اُسے زمین پر گرا کر بُری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ کتا کیا تھا اچھا خاصا شیر تھا۔ لوگوں کے بچاتے بچاتے پروین کا بدن اُس کے دانتوں اور پنجوں سے لہو لہان ہو گیا۔ اور اُٹھنے کی کوشش میں اُس کا سر جو زینہ کے پتھر سے ٹکرایا تو خون کے فوارے چھوٹنے لگے!

"پروین! آنکھیں کھولو......" حامد نے اُس کے سر کو زانو پر رکھتے ہوئے کہا۔ مگر اب جواب کون دیتا۔ ایک سرد لاش اس کے سامنے تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا:

"پروین! میں تو نئی زندگی کا ایک پیغام لے کر آیا تھا۔ سوچا تھا دوبارہ ایک نیا آشیانہ بسائیں گے۔ مگر میری یہ آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ تم گھر سے چلی آئی تھیں۔ لیکن میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔ مگر تم اب ہمیشہ کے لئے کھو گئیں!"

گرم گرم آنسو حامد کی آنکھوں سے گر کر پروین کی گردن پر جمے ہوئے خون میں مل گئے!!

(حلقۂ ادب اسلامی کراچی میں پڑھا گیا)

ہماری نظر میں

تفسیر ماجدی (جلد دوم)

تفسیر ماجدی (جلد دوم) از:- مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ضخامت ۵۹۰ صفحات۔ (مجلد) ہدیہ درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:- تاج کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی۔

تفسیر ماجدی کی پہلی جلد پر "فاران" میں تبصرہ ہوچکا ہے۔ اب یہ دوسری جلد تاج کمپنی لمیٹڈ نے اسی اہتمام کے ساتھ شائع کی ہے جو اس کمپنی کا طرۂ امتیاز ہے۔ چکنا سفید کاغذ۔ خوبصورت ٹائپ۔ منقش سبز رنگ کی زمین پر۔ جلد دیدہ زیب اور پائیدار۔ غرض کتابت، طباعت، جلد سازی اور ظاہری زیب و زینت کی تمام خوبیاں اس جلد میں موجود ہیں۔ کہ آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔

تفسیر ماجدی کی دوسری جلد المائدہ سے شروع ہوکر التوبہ پر ختم ہوتی ہے ترجمہ اور تفسیر کے ساتھ! مولانا عبدالماجد دریابادی قدیم و جدید علوم میں دستگاہ رکھتے ہیں۔ متقدمین اور متاخرین کی تفاسیر کا بھی موصوف نے مطالعہ کیا ہے اور دورِ حاضر کے رجحانات سے بھی باخبر ہیں۔ توریت و انجیل بھی دورانِ تفسیر میں اُن کے سامنے رہی ہیں۔ اس لئے "تفسیر ماجدی" صحیفۂ افادیت بن کر منظرِ عام پر آئی ہے۔ ایک اقتباس:-

"جن لوگوں نے وسیلہ" وابتغوا الیہ الوسیلہ" کے تحت میں بزرگانِ دین کی استعانت اور انبیاء و اولیاء سے استغاثہ جائز رکھا ہے۔ انہوں نے عربی کے وسیلہ (بہ معنی قرب کو) اردو کے وسیلہ (ذریعہ) کا مرادف سمجھ لیا ہے اور ایسی شدید و فاحش غلطیاں نادر نہیں کثیر الوقوع ہیں۔ علامہ آلوسی نے بڑے بسط و تفصیل سے اس موضوع پر گفتگو کی ہے اور لکھا ہے:-

"میت یا غائب شخص سے دعا کرانے کے ناجائز ہونے میں کسی عالم کو بھی شک نہیں۔ اور یہ ایک ایسی بدعت ہے جس کا ارتکاب سلف میں کسی نے بھی نہیں کیا ہے۔" اور لکھا ہے ——

"حضرات صحابہؓ سے بڑھ کر نیکی اور ثواب کا حریص اور کون ہوا ہے۔ لیکن کسی صحابی سے منقول نہیں کہ انہوں نے صاحبِ قبر سے کچھ طلب کیا ہو۔ صحابیوں میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا اتباعِ سنت ضرب المثل کی حد تک شہرت رکھتا ہے۔ اُن کی یہ عادت تھی۔ "جب روضۂ نبویؐ میں زیارت کے لئے داخل ہوتے۔ تو صرف اس قدر کہتے السلام علیک یا رسول اللہ۔ السلام علیک یا ابا بکرؓ۔ السلام علیک یا ابت۔ اور اس سے زائد کچھ نہ کہتے نہ کچھ مانگتے۔ سردارِ عالم سے نہ اُن کے مکرم مقربین سے۔ درآنحالیکہ سارے زمین و آسمان کی مخلوقات میں اُن سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ روضۂ مبارک کے سامنے دعا کرنے سے بڑھ کر کون شے مقبول ہو سکتی ہے۔

لیکن — یہاں بھی صحابہ کرام اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے قبلہ رُخ ہوکر اور یہ نہیں کرتے تھے
کہ دعا کرتے وقت قبر شریف کی طرف مُنہ کرلیں باوجود اس کے کہ وہ مقام عرش سے بھی افضل
ہے — اور تو اور سلام پڑھتے وقت تک کے لئے ائمہ میں اختلاف ہے کہ مُنہ کس طرف
رکھنا چاہیئے۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کا فیصلہ اس موقع کے لئے بھی یہی ہے کہ مُنہ قبر شریف
کی طرف نہ کرے، بلکہ اُدھر پشت رکھے اور چہرہ قبلہ شریف کی طرف رہے"۔ غرض بدعت
نے لفظ "وسیلہ" سے جو اپنے لئے پناہ ڈھونڈھی ہے وہ سرتاسر بودی اور بے بنیاد ہے"

ترجمہ کی روانی اور سلاست کا ایک نمونہ:-

"آپ کہہ دیجئے کہ مجھے اس سے منع کیا گیا ہے کہ میں اُن کی عبادت کروں جنہیں تم اللہ کے سوا
پکارتے رہتے ہو۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری خواہشوں کی پیروی نہ کروں گا ورنہ میں بھی
بے راہ ہوجاؤں گا اور راہ پر چلنے والوں میں نہ رہوں گا۔ آپ کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو دلیل ہے
میرے پروردگار کی طرف سے اور تم اسی کو جھٹلاتے ہو جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ میرے
پاس نہیں ہے۔ حکم تو کسی اور کا نہیں بجز اللہ کے وہی حق بتلاتا ہے اور وہی بہترین فیصلہ
کرنے والا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے پاس وہ چیز ہوتی جس کا تم تقاضا کر رہے ہو۔ تو
(اب تک) میرے تمہارے درمیان فیصلہ ہوچکا ہوتا۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو!
اور اسی کے پاس ہیں غیب کے خزانے، نہیں بجز اس کے کوئی جانتا! اور وہی جانتا ہے جو
کچھ خشکی اور سمندر میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اُسے جانتا ہے اور کوئی دانہ
زمین کی تاریکیوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ سب) روشن کتاب میں
موجود ہے (الانعام — قل انی نہیت — (الیٰ) الا فی کتاب مبین)

يُجَادِلُونَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَأَنَّمَا يُسَاقُونَ إِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُونَ ۝

وہ آپ سے اس حقیقت کے باب میں بعد اس کے کہ اس کا ظہور ہوچکا تھا اس طرح رد و قدح کر رہے تھے گویا
وہ موت کی طرف ہنکائے جا رہے تھے۔

"یجادلونک" کا ترجمہ عام طور پر "تجھ سے جھگڑتے ہیں" کیا جاتا ہے۔ مگر فاضل مفسر نے جھگڑنے کی جگہ "رد و قدح"
کہہ کر ترجمہ کو مفہوم سے کس قدر قریب کردیا — حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بلاشبہ مولانا عبدالماجد
دریابادی سے علم تفسیر، عربی ادب اور اس کے نکات و معانی کا بہت زیادہ علم رکھتے تھے۔ مگر اردو ادب و انشاء میں عبدالماجد
ان حضرات سے بہت آگے ہیں۔ اسی لئے اُن کا ترجمہ زیادہ رواں، شستہ اور سلیس ہے۔

(۲) رُخ :-

وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ الْإِنْجِيلِ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فِيهِ ۚ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔ (المائدہ)

"اور اہل انجیل پر لازم ہے کہ اللہ نے جو کچھ اس میں نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کئے ہوئے
(احکام) کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں!

اس آیت کی تفسیر مولانا عبد الماجد دریا بادی یوں کرتے ہیں:۔

"ظاہر ہے کہ آیت کا خاص تعلق اہل انجیل ہی سے ہے۔ مسیحیوں ہی کو حکم مل رہا ہے کہ جب دعویٰ انجیل کے ماننے کا ہے تو عمل بھی اسی کتاب الٰہی کے مطابق ہونا چاہیئے۔ وقد تقدم ان ھذہ الآیۃ نزلت فی النصاریٰ وھو ظاھر من السیاق (ابن کثیر)..... آیت کو آج مسلمانوں پر چسپاں کرنا خوارج کی دعایت کا دانستہ یا نادانستہ شکار ہو جانا ہے"

اس تفسیر سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ قرآن کی جن جن آیتوں میں یہود و نصاریٰ کو خدا کی نافرمانی، فسق وفجور اور حدود اللہ کے توڑنے پر زجر و توبیخ فرمائی گئی ہے۔ وہ صرف اہل انجیل یا اہل توریت سے متعلق ہے۔ مسلمانوں پر ان کی تعمیل فرض نہیں۔ مثلاً:۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ۔

اور جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم نصرانی ہیں۔ ہم نے ان سے بھی عہد لیا تھا۔ تو جو کچھ انھیں نصیحت کی گئی اس کا بڑا حصہ وہ بھلا بیٹھے۔

کیا اس آیت کا تعلق صرف نصاریٰ سے ہے، مسلمانوں سے نہیں ہے، وہ چاہیں تو اللہ کے عہد کو۔ اس کی دی ہوئی کتاب کو اور اس کے رسول کی پیش کی ہوئی ہدایت کو بھلا سکتے ہیں۔ (معاذ اللہ)

یہ کیا طرز فکر ہے یہ کیا انداز تفقہ ہے کہ " وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ .... " کا بقول مولانا دریا بادی اہل انجیل ہی سے خاص تعلق ہے۔ تو کیا مسلمانوں کو اس کی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ اپنے معاملات کا فیصلہ اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق چاہیں کریں چاہیں نہ کریں اور ان کا دل چاہے تو کافرانہ قانون کو "حکم" اور حجت مان لیں حالانکہ اس آیت کے بعد ہی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے:۔

"....... فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ ...."

آپ لوگوں کے درمیان اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کیا کیجیے۔

لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَن قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (المائدہ)

کیوں ان کے مشائخ اور علماء انھیں گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے ہیں۔

کیسی بری ان کی کارستانیاں ہیں۔

اس آیت میں یہود کے مشائخ اور یہود کے علماء کی جن کارستانیوں پر زجر و توبیخ فرمائی گئی ہے۔ کیا مسلمانوں کے علماء اور مشائخ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ اس آیت سے غیر متعلق ہیں کہ وہ مسلمانوں کو نہ حرام کھانے سے روکیں اور نہ گناہ کی بات کہنے سے منع کریں۔ حالانکہ چوری، بدکاری، جھوٹ، دغا فریب، والدین کی نافرمانی، غیر اللہ کی پرستش، ناپنے تولنے میں کمی بیشی، حرام مال کھانے، معروف کے مٹانے۔ منکرات کے پھیلانے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام و قانون کو چھوڑ کر دوسروں کے قانون کو اختیار کرنے۔ غرض یہود و نصاریٰ ہی نہیں تمام دوسری امتوں کی نافرمانیوں پر جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں احتساب فرمایا ہے۔ وہ مسلمانوں کے لئے بھی "ضابطہ تعزیرات" اور فرد جرم ہے کہ وہ بھی ایسا نہ کریں!

قرآن پاک میں دوسری امتوں کا جس تفصیل سے ذکر ہے اگر اس سلسلہ کے قانونِ منکر و معروف اور ضابطۂ اخلاق کو صرف انہی امتوں کے ساتھ مخصوص کردیا جائے تو امتِ مسلمہ کے لئے قرآن میں کتنا حصہ قابلِ عمل رہ جائے گا؟

اور لطف یہ ہے کہ دوسرے ہی صفحہ (۲۴۷) پر مولانا دریابادی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں:-

"حافظ ابنِ کثیر نے اسی آیت (افحکم الجاھلیۃ یبغون) کے تحت میں بڑے سخت الفاظ میں اور بہت تفصیل کے ساتھ اُن لوگوں کی تتارڑ کی ہے جو خدائی قانون کے مقابلہ میں اپنے کا گیا بذۂ عجب دخل کرکے غیر قوموں کے قانون چلاتے ہیں یا بشری اختراعات کو دخل دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو قطعاً کافر ٹھہرایا ہے جن سے جہاد واجب ہے"

اگر "صدقِ جدید" کا خامہ سیف زباں ہمیں امان دے سکے تو عرض کریں کہ مولانا قبلہ! تفسیر میں، حدیث میں، فقہ میں ان "خوارج" سے کہیں مفر نہیں! اور یہ جو آپ کو خارجیت کا وہم ہو گیا ہے۔ اس لئے آپ کو صدعن سبیل اللہ کی راہ پر لگا دیا ہے۔ اسی خارجیت کے وہم کی بدولت اخوان المسلمین جیسی مخلص جماعت کی مظلومیت بھی آپ کا ہدف بننے سے محفوظ نہ رہ سکی! اور جماعتِ اسلامی کے سینہ پر ناوک فگنی تو آپ کا سب سے زیادہ پسندیدہ مشغلہ بن ہی چکا ہے!

"وامّہ صدّیقۃ" (اور ان کی ماں ایک ولیہ تھیں) (صفحہ ۲۶۵)

"صدیقہ" کا ترجمہ "ولیہ" کھٹکتا ہے۔ اس کا ترجمہ اس طرح ہوتا تو مفہوم کی ترجمانی بہتر انداز میں ہوجاتی:
"اور ان کی ماں راست باز (وسچے کیرکٹر) کی تھیں۔"[1]

تفسیر ماجدی کی افادیت اور انفرادیت اپنی جگہ بہرحال مسلّم ہے۔ اب رہی بقول جوک تو اس سے بڑے بڑے محفوظ نہ رہ سکے! فاضل مفسر نے دوسری تفاسیر کے عربی اقتباسات جگہ جگہ درج فرمائے ہیں اُن کے بھی اردو ترجمہ کی ضرورت تھی۔ تاج کمپنی کو چاہیئے کہ تفسیر ماجدی کی بقیہ جلدیں بھی جلد سے جلد منظرِ عام پر لے آئے۔ کہ عوام و خواص کو فاضل مفسر کی مکمل تفسیر سے افادہ کا موقع مل سکے۔ ان دو جلدوں نے تو شوق کو اور بڑھا دیا!

احکامِ شب برات

"احکام شب برات" مرتبہ۔ ابو محمد عبد الغفار۔ ضخامت ۲۴ صفحات۔ قیمت دو آنہ۔
ملنے کا پتہ:- منیجر مکتبہ دینیات محمدی مسجد آرٹیلری میدان بالمقابل بنس روڈ۔ کراچی۔

شب برات کو جو مسلمانوں نے ایک تہوار بنا لیا ہے اور اس میں طرح طرح کی خرافات کی جاتی ہیں۔ یہ رسالہ انہی کے رد میں لکھا گیا ہے۔ سیدھا سادہ اندازِ بیان ہے۔

گھر پھونک تماشہ دیکھا

"گھر پھونک تماشہ دیکھا" مرتبہ۔ ابو محمد عبد الغفار۔ ضخامت آٹھ صفحہ۔ قیمت دو آنے۔
ملنے کا پتہ:- عبد الغفار صاحب امام محمدی مسجد آرٹیلری میدان بالمقابل بنس روڈ۔ کراچی۔

شب برات میں یہ جو آتش بازی چھوڑی جاتی ہے اور مسلمان گھر پھونک کر تماشہ دیکھتے ہیں اس کے رد میں علماء کرام

---

[1] حضرت مریم علیہا السلام۔ لفظ "صدیقہ" کا لفظ بہت جامع ہے، کردار، فطرت اور چال چلن کی تمام خوبیاں اور سچائیاں اس لفظ میں ملفوف ہیں!

کے فتوے اس کتابچہ میں درج ہیں۔

مراق مرزا

"مراق مرزا" ضخامت آٹھ صفحات۔ قیمت ایک آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبۂ شعیب آرٹیلری میدان بالمقابل بنس روڈ کراچی۔

اس کتابچہ میں خود قادیانیوں کی کتابوں کے حوالے سے ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد کو مراق کا مرض تھا اور کثرتِ امراض نے اس کے دماغ اور قویٰ کو کمزور کر دیا تھا!

عقاید مرزا

"عقائد مرزا" ضخامت آٹھ صفحات۔ قیمت ایک آنہ۔
ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ شعیب آرٹیلری میدان بالمقابل بنس روڈ۔ کراچی۔

اس کتابچہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے چند عقائد جو اسلامی تعلیمات کی رُو سے غلط ہیں۔ درج کئے گئے ہیں۔ مگر ایسے دو ورقی کتابچے اس زمانے کے لوگوں کو جو بلند و شستہ ادب پڑھنا جانتے ہیں۔ کیا متاثر کریں گے؟

مناظرہ علم غیب

"مناظرہ علم غیب" از۔ مولانا عبدالستار کلانوری۔ ضخامت سولہ صفحات۔ قیمت تین آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دینیات محمدی مسجد۔ بنس روڈ۔ کراچی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "عالم الغیب" ہیں۔ یہ مسئلہ اہلِ بدعت کا تراشا ہوا ہے۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علم میں صرف "ذاتی" اور "عطائی" کا فرق کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ حضور کو "ماکان وما یکون" کا علم تھا!

دھولپور میں مولوی دیدار علی صاحب مفتی آگرہ سے مولانا عبدالستار کلانوری کا "علم غیب" کے مسئلہ پر مناظرہ ہوا۔ اور:۔

"اُن سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو علم غیب ثابت کیا جاتا ہے اُس کی کیا دلیل ہے؟ جواب ملا کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے آپ پر کلام مجید نازل کیا۔ جس کے متعلق ارشاد ہے ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شئی۔ یعنی جو کتاب ہم نے نازل کی ہے اس میں کل چیز کا بیان ہے اسی کو ہم علم غیب کہتے ہیں۔ ہماری طرف سے جواب دیا گیا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے یہ بھی تو فرمایا ہے۔ وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل۔ (سورہ نحل پارہ ۱۴) یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ (سورۂ مائدہ پارہ ۶) یعنی جو کچھ تمہاری طرف اُترا ہے وہ تم لوگوں کو پہنچا دو۔ اس آیت کی تعمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور آپ نے ہر "ما انزل الیہ" کو لوگوں کو پہنچا دیا۔ لہٰذا سارے عالم الغیب ہو گئے ـــــ بس یہ جواب ملنا تھا کہ مجلس برخاست ہو گئی . . ."

اس کتاب میں قرآنی آیات اور بعض مستند واقعات سے حضور کے "علم غیب" کی نفی ثابت کی گئی ہے!

عفت

"عفت" مرتبہ:۔ حمیدہ بیگم بی اے۔ درخشندہ کوکب۔ ضخامت ۹۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ خواتین۔ اچھرہ لاہور۔

نثر و نظم کے اس پاکیزہ مجموعہ کو ادارۂ خواتین لاہور نے خاصے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا ہر مضمون مقصدیت بلکہ افادیت رکھتا ہے۔ مضامین اخلاقی ہیں۔ اس لئے سنجیدہ اور بادقار ہیں مگر ساتھ ہی دلچسپ بھی ہیں۔ اپنے اپنے ذوق اور فکر و نظر کی بات ہے۔ کراچی سے ایک مسلم خاتون "MIRROR" نام کا پرچہ نکالتی ہیں۔ جو عورتوں میں حسن و جمال کے نمود کا ذوق اور بیباک و آزاد بننے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور حمیدہ بیگم صاحبہ اور رخشندہ کوکب صاحبہ "عفت" ترتیب دیتی ہیں۔ جو سیرت و کردار کو حسن اخلاق اور جمال پاکیزگی عطا کرتا ہے۔ یہ مجموعہ ہر مسلمان کے گھر میں بار پانے کے قابل ہے۔

ہفتہ وار "المنیر"

ہفتہ وار "المنیر"۔ ادارہ:- عبدالرحیم اشرف۔ اور عبدالحمید خاں بی ایس سی۔
سالانہ چھ روپے ششماہی تین روپے آٹھ آنہ۔ فی پرچہ دو آنہ ملنے کا پتہ۔ دفتر "المنیر" ماڈل ٹاؤن لائلپور۔

یہ ہفتہ وار مجلّہ دین کی، اخلاق کی اور علم و ادب کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے مقالے، شذرے اور مضامین سب کے سب پاکیزہ اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ "المنیر" یوں سمجھئے کہ ایک چراغ ہے جو ظلمت کدے میں جل رہا ہے! بد توفیق ہے وہ جو قدرت رکھنے کے باوجود اس کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھائے!

"المنیر" کو نکلے ہوئے ابھی کے دن ہوئے ہیں۔ مگر اس تھوڑی سی مدت میں اس نے "اخوان المسلمین نمبر" شائع کر کے دوست دشمن سبھی سے خراجِ تحسین حاصل کر لیا۔ "المنیر" ارباب ذوق کی زیادہ سے زیادہ توجہ، تعاون اور مساعدت کا مستحق ہے!

روزنامہ "اعلان"

روزنامہ "اعلان" ادارہ:- عبدالرحیم اشرف۔ عبدالحمید بی ایس سی۔
ملنے کا پتہ:- دفتر "اعلان" لائلپور۔

پاکستان کی صحافت جیسی کچھ ہے اُسے سب جانتے ہیں۔ عام طور پر یہاں کے اخباروں کا مقصد مالی منفعت ہے اور وہ چاہے کسی کرسی نشین کی "جی حضوری" کر کے حاصل ہو یا کسی ایکٹریس کی نیم عریاں تصویر چھاپ کر! ملک و ملت کے کیسے کیسے اہم مسائل کو پاکستانی اخباروں نے جان کر فراموش کر رکھا ہے۔

پریس عوام کی کتنی بڑی طاقت ہے مگر افسوس کہ عوام کی یہ طاقت جائز طور پر صرف نہیں ہو رہی ہے۔ پریس کی اس روش کو دیکھ کر عوام کی اخلاقی طاقت روز بروز گرتی چلی جا رہی ہے!

روزنامہ "اعلان" اس تاریک ماحول میں نیکی اور سچائی کی شمع لے کر منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ اخبار واقعی عدل و انصاف کے جمہوری تقاضوں کا پیامبر اور اقامت دین کی جد و جہد کا نقیب ہے!

اداریہ سے لے کر خبروں کی ترتیب تک ہر چیز خوب بلکہ خوب تر ہے۔ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف کی مضمون نگاری اور انشاء پردازی کے جوہر "اعلان" اور "المنیر" میں کھلے۔ "اعلان" سچ بات کہنے میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اس لئے اس کی زندگی اور بقا کے بارے میں طرح طرح کے اندیشے ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے "اعلان" کی ترقی اور بقاء کیلئے دعا کرتے ہیں اور اس بات پر ایمان بھی رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کوئی کتنا ہی بڑا اور طاقتور کیوں نہ ہو، کسی کو نقصان پہنچا نہیں سکتا۔ کاش! "اعلان" کی صدائے بازگشت دوسرے اخبارات سے بھی ہم سن سکیں!!

ماہنامہ

فاران

ماہر القادری

جلد ۷ نمبر ۲

ماہنامہ فاران

مئی ۱۹۵۵ء ——— ایڈیٹر ——— ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

"ایسا ظلم تاریخ میں کبھی نہیں ہوا" ——— "فلاں شخص نے اگلے پچھلے تمام ظالموں کے کارناموں کو مات کردیا" ——— اس قسم کے جملے شدتِ جذبات کے سبب قلم سے نکل جاتے ہیں۔ شعروادب کا یہ وہ مبالغہ ہے جسے گوارا کرلیا جاتا ہے اور پڑھنے والے جان لیتے ہیں کہ ظلم چاہے "فقید المثال" نہ ہو مگر شدید ضرور ہے۔ دُکھے ہوئے دل کی کراہ دردناک ہی ہوتی ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جمال ناصر نے مصر میں "اخوان المسلمین" کے ساتھ جو شقاوت آمیز سلوک کیا ہے اور اب تک کیا جارہا ہے۔ وہ اپنی شدت، بے رحمی اور کمینگی میں اس قدر دردناک اور شرمناک ہے کہ تاریخ میں اُس کی نظیر نہیں ملتی!

حکومتیں اپنے مخالفوں کو سزائیں بھی دیتی ہیں۔ انتقام بھی لیا جاتا ہے۔ مگر تعذیب و انتقام کی بھی کچھ نہ کچھ حدود ہوتی ہیں۔ آدمی کتنا ہی پست اور سنگ دل کیوں نہ ہوجائے۔ پھر بھی اس میں انسانیت کی تھوڑی بہت خوبو تو ضرور باقی رہتی ہے۔ لیکن جمال ناصر اور اُس کے ساتھی بالکل درندے اور وحشی بن گئے۔ بھیڑیوں اور ریچھوں سے بڑھ کر درندے! شیطان کی اتنی بڑی جیت شاید ہی کبھی ہوئی ہوگی۔ ظلم و ستم کے وہ وہ عنوان اختیار کئے گئے ہیں کہ اُن کے بیان کرنے کے لئے لوہے کا کلیجہ اور فولاد کا دل چاہیئے!

فرعون و چنگیز اور حجاج و ابن ہبیرہ کی ارواح کو سب سے بڑا خراج عقیدت جمال ناصر نے پیش کیا ہے۔ لفظی نہیں عملی۔ ا ——— عبد القادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھیں نکال لی تھیں۔ یقیناً یہ بہت بڑا ظلم اور انتہائی بے رحمی کی بات تھی۔ لیکن یہ ایک فرد کا معاملہ تھا۔ مگر یہاں تو سو دو سو نہیں کم و بیش چالیس ہزار انسان ظلم و ستم کے شکنجے میں کسے جارہے ہیں۔ اور دُنیا کی کوئی اذیت، ذلت اور جور و ستم ایسا نہیں ہے جسے خدا کے ان نیک بندوں پر

آزمایا نہ گیا ہو!

مصر کے جیل خانوں کی جب تاریخ لکھی جائے گی اور یہ حق پرست مظلوم جب اپنی بپتا بیان کریں گے اور جس وقت یہ دردناک واقعات تفصیل کے ساتھ لوگوں کے سامنے آئیں گے۔ تو دُنیا کو معلوم ہوگا کہ مصر کی حکومت بدقسمتی سے اُن خونخوار درندوں اور مردم آزار وحشیوں کے قبضہ میں آگئی تھی جن کے آدمیوں جیسے نام تھے اور جو انسانوں کی طرح بولتے لکھتے اور چلتے پھرتے تھے!

ایک طرف "اخوان" جیل خانوں کے طرح طرح کے عذاب میں مُبتلا کردیئے گئے ہیں اور دُوسری طرف اُن کے گھر والوں پر آذوقہ حیات کی راہیں بند کی جارہی ہیں۔ اِن دنوں عورتوں کو گرفتار کرکے جیل میں بند کردینے کی مہم جاری ہے۔ جرم صرف یہ ہے کہ ان بیچاریوں نے اخوان قیدیوں کے بال بچّوں کے حال زار پر ترس کھا کر اُن کی امداد کیوں کی؟ انتقام کی آگ بھڑکتی اور ظلم و شقاوت کا پارہ چڑھتا ہی چلا جارہا ہے!

مگر "اخوان" پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں کہ اُن کے صبر و استقامت کا بھی کوئی جواب نہیں۔ ایک ایک فرد کوہِ وقار ہے۔ جس نے اپنی جگہ سے ذراسی جنبش نہیں کی۔ اتنے بہت سے "احمد بن حنبلؒ" اسلامی تاریخ کے کسی دَور میں کہاں پیدا ہوئے ہیں؟ حیرت ہے کہ عیش و ہوس اور مصلحت و منافقت کے اس پُرآشوب دَور میں اتنے مخلص بے باک، جری اور حق پسند انسان پیدا کیسے ہوگئے؟ ان میں یہ جرأت آکہاں سے گئی کہ سروں پر ظلم و ستم کے آرے چل رہے ہیں۔ مگر زبانیں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر اور لبوں پر درود و تحیت کے نغمے رقصاں ہیں!

سچ تو یہ ہے کہ "اخوان المسلمین" کی عزیمت و استقامت نے اس زمانے میں جبکہ تھوڑے سے لالچ کے بدلے ضمیر بک جاتے ہیں۔ اور ذرا سے دباؤ اور خوف سے زبانیں باطل کی ہاں میں ہاں ملانے لگتی ہیں۔ اسلام کی لاج رکھ لی اور حق پرستی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ بے یقینی کے اس دَور میں یقین و اخلاص کی یہ کیفیت حقیقت میں ایک معجزے سے کم نہیں!

"اخوان" نے اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے اُس وقت جسموں پر زخم کھائے ہیں اور گردنوں میں پھانسی کے پھندے پہنے ہیں۔ جبکہ لوگوں کا خیال ہوچلا تھا کہ اللہ کے نام پر کوئی بدن پھانس کی چُبھن بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے!

پچھلے زمانے میں ظالموں، بدمعاشوں، لٹیروں اور جفاکاروں سے شرفاء بچتے تھے اور اُن سے ملتے ہوئے کتراتے تھے کہ ان بدبختوں کی پرچھائیں کہیں ہم پر بھی نہ پڑجائے اور اُن کے ساتھ ربط و ضبط دیکھ کر عوام کہیں ہمیں بھی اُن کا ہم مشرب نہ سمجھنے لگیں۔ مگر بیسویں صدی کی سیاست کی یہ عجوبہ کاری ہے کہ جمال ناصر، انوار السادات اور صلاح سالم جیسے ذلیل انسانوں اور خونخوار ظالموں کا حکومتوں کی طرف سے خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اُن کی خوب مہمانداری ہوتی ہے اور ان درندوں کو مشورت کے جلسوں میں شریک کیا جاتا ہے۔ بین الاقوامی سیاست کا یہ وہ انداز دلداری ہے۔ جو ظالموں کو اُن کے ظلم پر اور دلیر بناتا ہے اور جفاکار کو ذراسی دیر کے لئے بھی منفعل اور پشیمان نہیں ہونے دیتا!

ظلم، سازش، بے آئینی، اسلام دشمنی اور......!

شاہ فاروق کے معزول ہوجانے کے بعد دُنیا سمجھتی تھی کہ اب مصر کے دن پھریں گے اور اُس کی قسمت کے ستارے

چمکیں گے۔ مگر جمال ناصر نے شاہ کی برطرفی کے بعد ہی سے اپنے لئے زمین ہموار کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ شخص جتنا چالاک، عیار اور سازشی ہے۔ اُتنا ہی جنرل نجیب سادہ اور مرنجان و مرنج ہے! جمال ناصر نے دھیرے دھیرے جنرل نجیب کی جڑوں کو کاٹا۔ اُسے بے اثر بنایا اور یہ سب کچھ سازش نجیب کو بے خبری اور تاریکی میں رکھ کر کی گئی۔ یہاں تک کہ اُسے نظر بند کر کے خود وزارت عظمٰی کی مسند پر جم کر بیٹھ گیا۔ نجیب کا آخر قصور کیا تھا؟ یہی کہ ایک شخص مصر کا مالک و مختار بننا چاہتا تھا اور جنرل نجیب کی معزولی اور برطرفی کے بغیر اُس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہ آتی تھی!

جمال ناصر نے ایک طرف نجیب کو بے دست و پا بنایا۔ دوسری طرف "اخوان المسلمین" کو برباد کرنے میں اپنی پوری طاقت خرچ کر دی۔ فرد کے اعتبار سے نجیب اور جماعتی تنظیم کے لحاظ سے "اخوان" ناصر کی ہوس اقتدار کی راہ کے سنگِ گراں تھے!

"اخوان المسلمین" سے جمال ناصر کو آخر خطرہ کیا تھا؟ بہت بڑا بلکہ سب سے بڑا خطرہ تھا۔ اور وہ یہ کہ "اخوان" مصر کے طول و عرض میں اللہ کے دین کا قیام چاہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آمریت اور شخصی خود مختاری کے لئے اسلام کے نظامِ حکومت میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ "اخوان" اسلامی معاشرت کے مبلغ اور پاکبازی و تقویٰ کے داعی ہیں۔ اور جمال ناصر اور اس کے اعوان و انصار رندی و سرمستی کے رسیا اور بادہ و شاہد کے متوالے ہیں اور مغرب زدگی اُن کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی ہے۔ "اخوان" کے ہوتے ہوئے وہ رنگ رلیاں نہیں منا سکتے۔ من مانی کارروائیاں نہیں کر سکتے شاہی ٹھاٹ باٹ نہیں جما سکتے۔ "اخوان" ان نازیبا حرکتوں پر اُن کو ٹوکتے۔ تنقید کرتے۔ عوام کے سامنے اُن کی زندگیوں کو کھولتے اور لوگوں کو بتاتے کہ سویز یا سوڈان کا مسئلہ ہو۔ فلسطین کا عقدہ ہو یا برطانیہ اور امریکہ سے ربط و اتحاد کی پالیسی ہو۔ ان میں کونسی چیز اسلام اور مصر کے مفاد کے لئے کس حیثیت سے مفید ہے اور مضر ہے؟ اور کیوں ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟

امریکہ اور برطانیہ سے کروڑوں ڈالروں کا جو جنگی سامان مصر میں آتا ہے اور اس میں حکومت کے بڑے لوگوں کو جو کمیشن ملتا ہے۔ بڑے بڑے ٹھیکوں میں کرسی نشینوں کے جو حصے ہوتے ہیں۔ چند خاندانوں اور گھرانوں کی عیش سامانی کے لئے ملک کی دولت میں جس طرح خرد برد کی جاتی ہے۔ ان اسرار کو فاش کرنے والی "اخوان المسلمین" کے سوا اور کوئی جماعت نہ تھی!

جمال ناصر محسوس کر رہا تھا کہ "اخوان" کی تنظیم تیزی کے ساتھ پھیلتی اور جڑ پکڑتی جا رہی ہے۔ یونیورسٹیوں سے لے کر مزدوروں کی انجمنوں تک اس تحریک کا اثر ہے۔ میخانوں، کلب گھروں اور رقص خانوں کی زندگیوں سے تائب ہو کر لوگ اس تنظیم میں شامل ہو رہے ہیں۔ اگر اس تنظیم کو اسی طرح چلنے دیا گیا تو مصر کے پورے معاشرے پر دین و اخلاق کا رنگ چھا جائے گا۔ اور کسی نہ کسی دن رندوں، مفاد پرستوں اور ہوس کاروں کو حکومت کے مناصب اور عہدوں سے بے دخل ہونا پڑے گا۔ دین و اخلاق، بدکاری اور ہوسناکی کا غلبہ اور تسلط کس طرح گوارا کر سکتے ہیں۔ آگ پانی ایک جگہ کہیں جمع ہو سکے ہیں!

مفاد پرستی اور شخصی اقتدار کی ہوس جب غالب آجاتی ہے۔ تو آدمی نہ اپنی قوم کا بھلا سوچتا ہے اور نہ ملک کا فائدہ اُس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ قوم تباہ ہوتی ہے تو ہو جائے۔ ملک کا وقار خاک میں ملتا ہے تو مل جائے!

کسی قیمت پر ہی چاہے کیوں نہ ہو۔ بس اقتدار کی زمام "حضور پُرنور" کے ہاتھ میں رہے۔ ایک مفاد پرست حاکم سے کوئی بعید نہیں ہے کہ اپنے اقتدار کو جاتا دیکھ کر وہ کسی دشمن کی حکومت سے مل جائے اور اپنے اختیار کی چند شرطوں کے ساتھ ملک کے خزانے کی کنجیاں غیروں کو سونپ دے ـــ چنانچہ جمال ناصر نے صرف اپنے اقتدار کی خاطر "اخوان المسلمین" جیسی مخلص، محبِ وطن اور اسلام پسند جماعت کو کچلنے میں فوج اور پولیس کی تمام قوت صرف کر دی۔ حالانکہ "اخوان" جیسے مخلص، تربیت یافتہ اور بلند کردار افراد اربوں روپیہ خرچ کرنے کے بعد بھی کسی ملک کو میسّر نہیں آسکتے۔ یہ مصر کے دست و بازو ہی نہیں دل و دماغ بھی ہیں۔ ان میں سے کتنے ایسے تھے اور اب بھی ہیں کہ جو تنہا اپنی ذات سے علم و دانش کا دبستاں بلکہ یونیورسٹی ہیں۔ اور ان میں وہ بھی ہیں جو فلسطین کے معرکۂ جہاد میں یہودیوں کو نیچا دکھا چکے ہیں۔ تیغ و قلم، بزم و رزم، دین و دانش اور جرأت و علم کا ایسا امتزاج صدیوں کے بعد دیکھنے میں آیا ہے!

جمال ناصر نے "اخوان" کو تباہ کر کے مصر کے ساتھ بہت بڑی دشمنی کی۔ اس ظالم نے مصر کی سب سے بڑی قوت کو کچل دیا۔ مصر کے ناموس کو رسوا کیا۔ شرافت اور خود داری کو پھانسی دے دی۔ دین و اخلاق کو جور و ستم کا نشانہ بنایا اور جمہوریت و آزادی کا گلا گھونٹ دیا!

جمال ناصر اور اس کے رفقا پر اقتدار کا نشہ ہے کہ چھایا ہوا ہے اور اسی سرمستی کے عالم میں نتائج سے بالکل بے پروا ہو کر جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ مصر کے ان غاصب حاکموں کی یہ ٹولی چاہتی ہے کہ اقتدار بس ہر پھر کر انہی چند ہاتھوں میں گردش کرتا رہے۔ کوئی دوسرا دخیل نہ ہونے پائے اور مصلحتاً کسی کو شریک اقتدار کرنا بھی پڑے تو وہ مصر کے ان فرعونوں کا زبردست ہوا خواہ اور دعا گو ہو کر رہے!

ان چند مفاد پرستوں کی حرکتوں نے مصر کی آزادی اور ترقی کو برسوں پیچھے پھینک دیا۔ شاہ فاروق نے جن برائیوں کو چھوڑا تھا انھیں ان لوگوں نے مٹایا نہیں۔ بلکہ اور پروان چڑھایا۔ تخریب کو اور شہ دی اور بدکاریوں کی اُلٹی ہمت افزائی کی!

صرف "اخوان" کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے لئے مصر کی عدالتوں نے عدل و انصاف کو جس جس عنوان سے ذلیل کیا ہے وہ "ٹریجیڈی" ہی حقیقت میں ایک حساس دل کی موت ہے! جن مقدموں میں "اخوان" کو دس دس بارہ بارہ سال کی سزائیں دی ہیں۔ اُن کی کارروائی چند منٹوں میں ختم کر کے فیصلے سنائے گئے ہیں! ملزموں کو اپنی صفائی میں بولنے تک کا موقع نہیں دیا جاتا۔ وہ جرأت کر کے لب کشائی کرتے ہیں تو بھری عدالت میں اُن کو گالیاں سنائی جاتی ہیں۔ اور زد و کوب کیا جاتا ہے۔ اور قانون کچھ نہیں کہتا؟ قانون ہے کہاں جو کچھ کہے اس کا تو "آمریت" نے پہلے ہی گلا گھونٹ دیا! ڈکٹیٹرشپ تو عدل و انصاف اور ضابطہ و قانون کو روند کر اُن کی لاشوں ہی پر قائم ہوتی ہے! جس ملک میں چند آدمی "خدا" بن بیٹھیں۔ وہاں جو نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ اور مصر ان دنوں ایسے ہی خداوندوں کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے!

خبروں پر سنسر ہے اور اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی ہے۔ جمال ناصر کی حکومت کے خلاف کوئی لب کشائی نہیں کر سکتا۔ جس کسی نے جرأت کی اُس پر مصر کی زمین تنگ کر دی گئی۔ مصر کے اخبارات میں کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو بادلِ ناخواستہ ڈنڈے کے زور سے حکومت کی ہمنوائی یا سکوت پر مجبور ہیں اور کچھ ایسے ضمیر فروش اور جی حضوری

بھی ہیں۔ جن کا پیشہ ہی خوشامد اور قصیدہ خوانی ہے۔ حکومت کے ہر جھوٹ اور نا انصافی پر جو مبارکبادیں دیتے
ہیں اور ہر تباہی کو ملک کی "نجات" اور قوم کی "فلاح" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پریس اور ریڈیو مصری حکومت کے ظلم
ستم کو آیۂ رحمت ثابت کرنے کے لئے وقف ہیں!

حکومت نے "ہیئت تحریر" کے نام سے ایک نیم سرکاری جماعت کھڑی کردی ہے۔ جس کے لیڈروں کا کام ہی یہ ہے کہ مصر
کے حاکموں کی ہر ناجائز حرکت پر خوشی کے شادیانے بجائیں۔ مبارکباد کے پیغام بھیجیں اور لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ یہ
"بڑے لوگ" تو ملک کے نجات دہندے ہیں۔ تعمیر و ترقی کا دور تو اب آیا ہے۔ حق و انصاف کی شمعیں تو اب
روشن ہوئی ہیں۔ یہ جماعت "اخوان المسلمین" کو بدنام کرنے اور اُن کے خلاف طرح طرح کے بے سروپا الزامات تراشنے
کا کام بھی انجام دے رہی ہے۔ غرض جو کوئی بھی مصر میں دین و اخلاق کی قدروں کو پامال کرنے میں جتنی مستعدی دکھا
رہا ہے۔ اُتنا ہی وہ حکومت کی نظروں میں مقبول ہے اور اُس پر انعام و اکرام کی بارشیں کی جاتی ہیں!

پولیس اور فوج کی بارکوں میں رقاصاؤں کے نیم عُریاں ناچ کرائے جاتے ہیں۔ پینے کے لئے مفت شرابیں دی جاتی
ہیں۔ مرد و زن کو اختلاط کے مواقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ اور جب ہوس کاری اپنے شباب پر ہوتی ہے تو ان لوگوں سے
کہا جاتا ہے کہ یہ خشک مزاج "اخوان" تم سے عیش و تفریح کے یہ سامان چھین لینا چاہتے ہیں۔ ان "مُلّاؤں" کی
اسکیم ہی یہ ہے کہ قوم کو ان لذتوں سے محروم کردیا جائے۔ زندگی ان نظاروں میں ہے یا اُس تعلیم میں ہے کہ عورتیں اپنی
زینتوں کو چھپائے رہیں اور مرد نگاہیں نیچی کئے رہیں!

اور .... ہم مصریوں کے "ہیرو"

تو مصر کے فراعنہ ہیں۔ جن کی تہذیب کے آثار آج بھی مصر کے نام کو دُنیا میں اونچا کئے ہوئے ہیں۔ وقت آگیا ہے
کہ قاہرہ کے چوراہوں پر مصری شہنشاہوں کے مجسمے نصب کردیے جائیں۔

عمل۔ عمل۔ عمل!

یہ وہ دردناک حالات ہیں جن سے مصر گزر رہا ہے اور یہ حالات اگر خدانخواستہ دوچار سال
اور چلتے رہے تو مصر کے عوام میں دینی احساس ہی سرے سے باقی نہ رہیگا۔ "آرٹ" کے نام پر
فحاشی اور بے حیائی کو اتنا فروغ ہو جائے گا کہ لوگ دین و اخلاق کے تقاضوں ہی کو بھول جائیں گے۔ پھر حکمراں
طبقہ کو اسلامی اخلاق اور اسلامی دستور کے مطالبوں سے نجات مل جائے گی اور "اسلام" جو ان لوگوں کے لئے دردِ سر
بنا ہوا ہے ایک خواب فراموش ہو کر رہ جائے گا!

یہ معاملہ صرف مصر ہی تک محدود نہیں ہے۔ جمال ناصر اور انوار السادات کی ذہنیت کے افراد دُنیا کے جس ملک میں
بھی موجود ہیں وہاں قوم کو، ملک کو اور دینی جماعتوں کو اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑے گا! وہاں جمہوریت کو
اخلاق کو، دینی روایتوں کو اسی طرح پامال کیا جائے گا اور لادینی تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فضا تیار اور
منزل ہموار کی جائے گی۔ وہاں حکمراں طبقہ کی ناجائز سے ناجائز حرکت پر مبارکباد دینے کے لئے "جی حضوری" اس طرح
نکل پڑیں گے جیسے برسات میں حشرات الارض نکل پڑتے ہیں!

اس قسم کے حالات جہاں بھی موجود ہوں وہاں کے دردمند، آئین پسند، انسانیت دوست اور اخلاق سرشت انسانوں
کا فرض ہے کہ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے اختلافات کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیں اور ملک و قوم کو انتشار سے، لاقانونیت

ہے۔ پراگندگی اور بے آئینی سے۔ بداخلاقی اور مفاد پرستی سے بچانے کے لئے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں اور یہ عہد کر لیں کہ جب تک اللہ کا دین قائم نہ ہو جائے، برائیاں مٹ نہ جائیں۔ مفاد پرستوں کی انانیت کے بُت ٹوٹ نہ جائیں۔ اخلاق و شرافت اور ضبط و آئین کا دور دورہ نہ ہو جائے۔ ہم پر چین کی ایک سانس بھی حرام ہے!

حالات بدلنے کے لئے آسمان سے فرشتے نہیں آئیں گے۔ انسانوں نے حالات کو بگاڑا ہے اور انسان ہی اُسے سنواریں گے برائیاں مٹانے سے مٹیں گی اور اچھائیاں پھیلائی جائیں گی تو پھیلیں گی۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت عمل کی راہ دیکھتی رہتی ہے عمل کے ساتھ ہی اللہ کی قدرت کو حرکت ہوتی ہے اور مساعدت و تائید کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

دُنیا ایک امتحان گاہ ہے۔ یہاں باطل کی طاقتوں کو جان کر اُبھارا جاتا ہے کہ دیکھیں حق کا کون ساتھ دیتا ہے اور باطل سے کس کو بیزاری کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔ جو فرد، قوم یا جماعت اس امتحان میں پُوری اُتر گئی۔ اُس کے لئے دین و دُنیا میں مسرت و کامرانی میسر آتی ہے۔ عمل، توکل علی اللہ، اخلاص اور ایثار یہ وہ ہتھیار ہیں جو کبھی کند نہیں ہوئے اور ہر کشمکش میں بالآخر معرکہ انہی کے ہاتھ رہتا ہے!

"رجائیت" اسلام کی خصوصیت ہے۔ حالات کتنے ہی نامساعد اور ناسازگار کیوں نہ ہوں، مسلمان مایوس نہیں ہوتا مایوسی تو دہریوں اور خدا ناشناسوں کو زیب دیتی ہے۔ مکہ کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انتہائی مظلومیت کے دور میں بھی حق پرست مایوس نہیں ہوئے اور دین کے کام کو اس شان سے جاری رکھا کہ اُس کا اثر مدینہ میں محسوس کیا گیا۔ یہاں تک کہ ظلم و ستم کے بادلوں کو چھٹنا پڑا اور پھر فتح مندی اور کامیابی کے دروازے ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے۔

ہر ظلم غفلت کے لئے تازیانہ اور باطل کی ہر نمود غیرتِ حق کے لئے چیلنج ہے۔ سچائی مظلومیت کے کسی دَور میں بھی شکست قبول نہیں کرتی "اقامتِ دین" کی کوشش فرضِ کفایہ نہیں فرضِ عین ہے۔ جو مسلمان جہاں ہے، جس حال میں ہے، اُس کا فرض ہے کہ اللہ کے دین کو قائم و سربلند کرنے کے لئے جد و جہد کرے اور نتائج کو خدا کی مشیت پر چھوڑ دے۔ ہم نتائج کے نہیں کوششوں کے ذمہ دار ہیں ـــــ یہ "ذمہ داری" آج ایک ایک مسلمان کا دامن پکڑ کر مطالبہ کر رہی ہے!

ماہر القادری

۳۰ / اپریل ۱۹۵۵ء

آخری بات ـــــ عزم محکم ـــــ جس فیصلے کو بدلا نہیں جا سکتا۔

پہلے تو اس کا تصفیہ ضروری ہے

کہ

دستور سازی کی ذمہ داری جس "ادارہ" کو بھی تفویض کی جائے وہ ادارہ سو فیصدی جمہوری ہو اور قانونی طور پر دستور بنانے کا مجاز ہو ـــ یہ مرحلہ طے ہو جائے تو دستور ساز ادارہ اس کا پابند ہے کہ پاکستان کا دستور "کتاب و سنت" کی بنیادوں پر بنائے۔ اسلامی تصورات و افکار کے خلاف یہاں جو فرد اور ادارہ بھی کوئی چیز لائے گا اُسے رد کر دیا جائے گا! ہر غیر اسلامی اور غیر جمہوری اقدام کے خلاف جد و جہد کی جائے گی اور اس قسم کی تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا جائیگا! جن کے ہاتھوں میں طاقت ہے وہ طاقت کے زور سے کسی غیر جمہوری بات کو منوانے کا خیال ہی چھوڑ دیں۔ آرڈی ننس عوام اور حکومت کے درمیان اختلاف و بے اعتمادی کی خلیج پیدا کرتے ہیں۔ اس صورتِ حال کو ختم ہو جانا چاہیئے!

اسلامی آئین   اسلامی دستور   اسلامی معاشرہ

یہ ہے

قوم کی تمنّا۔ ملک کی آواز، عوام کا مطالبہ اور پاکستان کے دردمندوں اور خیرخواہوں کا فیصلہ

جو کوئی عوام کے مطالبہ سے

بے پروا ہو کر کوئی قدم اُٹھائے گا۔ اُسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ترجمہ:- سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی

مَصنُوعی دِین

کیا آپ کو معلوم ہے کہ اصلی ریشم اور نقلی ریشم میں کیا فرق ہے؟ حقیقی شیر اور مصنوعی شیر میں کیا فرق ہے؟ اس خارجی دُنیا اور نقشہ والی دُنیا میں کیا فرق ہے؟ بیدار رہ کر کام کرنے اور نیند کی حالت میں کسی کام کے ہو جانے میں کیا فرق ہے؟ آنکھوں کے سامنے آگ جل رہی ہو جو اپنی طرف ہر بڑھنے والی چیز کو اپنا لقمہ بنا لے اور لفظ "آگ" جو زبانوں پر ہر وقت بے خوف وخطر جاری رہتا ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ زندہ و متحرک انسان اور پتھر کے انسان میں جو کپڑے کی دکانوں میں لباسوں کی نمائش کے لئے رکھا رہتا ہے، کیا فرق ہے؟ جنگجو سپاہی کے ہاتھ کی تلوار اور خطیب کے ہاتھ کی لکڑی کی تلوار میں کیا فرق ہے؟ زندہ انسانوں اور سنیما کے پردۂ سکرین کے انسانوں میں کیا فرق ہے؟ اصل آواز اور گونج میں کیا فرق ہے؟ اگر آپ کو یہ سارے فرق معلوم ہیں تو آپ سمجھ لیجئے کہ بعینہٖ یہی فرق اصلی دین اور نقلی دین میں بھی ہے!

آج کے محققین و مؤرخین سرگرداں ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے عہدِ اوّل میں عجائبات لے کر آیا اور جنگ و جہاد کے ذریعہ عالم کی قیادت و سیادت کی باگ ڈور کا مالک بنا۔ اور آج کے مسلمان نے بھی عجائبات پیدا کئے۔ لیکن وہ ہر طرح سے کمزور و ذلیل اور بے یار و مددگار ہے۔ حالانکہ آج بھی وہی قرآن ہے۔ آج بھی وہی اسلامی تعلیمات ہیں۔ آج بھی وہی لا الٰہ الا اللہ ہے اور ہر چیز وہی ہے۔ دُنیا میں آج اس کی مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں اور لوگ اس کے متعدد اسباب بتاتے ہیں۔ لیکن میں اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھتا ہوں۔ جو اصلی دین اور نقلی دین کا فرق ہے۔ یہ مصنوعی دین صرف بعض حرکات و سکنات اور چند لفظوں کا دین ہے۔ جس کے پیچھے کوئی حقیقت و روح موجود نہیں ہے اور دینِ حق حقیقت و روح کا نام ہے۔ جس میں قلب کی حرارت مضمر ہوتی ہے!

اس مصنوعی دین میں نماز ایک ورزشی کھیل ہے۔ حج ایک خاص اور محدود ملک کی تفریح اور ایک بدنی سفر ہے۔ دینی شعار بازی گری کی مختلف شکلیں ہیں۔ اسی طرح لا اِلٰہ اِلا اللہ مصنوعی دین میں صرف ایک حسین آواز ہے۔ جس کا مخاطب نامعلوم ہے۔ لیکن حقیقی دین میں یہی آواز (لا الٰہ الا اللہ) سب کچھ ہے۔ یہی مال کی پرستش پر ایک بغاوت ہے۔ یہی بادشاہ کی پرستش پر بغاوت ہے۔ یہی جاہ و منزلت کی پرستش پر بغاوت ہے۔ یہی شہواتِ نفس کی پرستش پر بغاوت ہے اور ہر غیر اللہ کی پرستش پر ایک نقارۂ بغاوت ہے!

مصنوعی دین میں لا الٰہ الا اللہ جسمانی شہوتوں کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دینے کا نام ہے۔ جو ذلت و رسوائی کے مرادف ہے۔ لیکن اصلی دین میں یہ کلمہ (لا الٰہ الا اللہ) حق و یقین کا نام ہے۔ مصنوعی دین لا الٰہ الا اللہ ہواؤں کی طرح

ؔ مصر کے مشہور ادیب ڈاکٹر احمد امین کے مضمون (الدین الصناعی) کا ترجمہ!

اُڑ جاتا ہے۔ حقیقی دین میں اس سے پہاڑ لرز اُٹھتے ہیں!

مصنوعی دین نجاری اور پارچہ بافی کی طرح ایک فن ہے۔ جس میں انسان مشق و کوشش کے ذریعہ ماہر فنکار بن جاتا ہے۔ لیکن حقیقی دین عقیدہ اور روح و یقین کا نام ہے۔ جو خود ہی عمل نہیں ہے بلکہ ہر اچھے سے اچھے اور نیک عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دین ایک اکسیر ہے جو مُردے کو زندہ کر دیتا ہے۔ کمزور کو طاقتور بنا دیتا ہے۔ اور یہ ایسا پارس پتھر ہے جس پر پیتل، چاندی، سیسہ، رکھتے ہی سونا بن جاتے ہیں!

یہ وہ عقیدہ ہے جس کے معجزات کے سامنے سائنس و تاریخ اور فلسفہ متحیر رہ جاتے ہیں اور اس کی تشریح و تحلیل کرنے کی ان میں طاقت نہیں۔ یہ وہ تریاق ہے جس کا ایک قلیل جزو زندگی کے تمام زہریلے اثرات کو نیست و نابود کر دیتا ہے یہ ایسا کیمیاوی عنصر ہے جس کا مزاج ایک طرف تو دینی شعائر سے تیار ہوتا ہے۔ جو انسان کو اللہ تک پہچانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اور دُوسری طرف اس کے مزاج میں دُنیوی اعمال بھی شامل ہیں۔ جس میں انسان کی ہر پیچیدگی اور مشکل کا حل موجود ہے۔ اور جس کے ذریعہ وہ اپنی منزلِ مقصود تک بآسانی پہنچ سکتا ہے!

اس دین میں ایک کہربائی طاقت موجود ہے۔ جس کا کرنٹ زندگی کے پہیوں کو متحرک کرتا ہے اور قوتِ عمل کو بیدار کرتا ہے۔ جو دل کے شکستہ تاروں کو جھنجھنا دیتا ہے اور خاموش آواز میں راگنی پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی یہ سارے حرکات و اعمال یکلخت رُک جاتے ہیں اور زندگی موت میں تبدیل ہو جاتی ہے!

حقیقی دین انسان کو دین کے لئے زندہ رہنے اور دین کے لئے جہاد کرنے پر ابھارتا ہے۔ لیکن مصنوعی دین سے انسان خود اپنی زندگی کا ذریعہ ڈھونڈتا ہے۔ اسی کے ذریعہ وہ کھاتا کماتا ہے اور اسی کے سہارے وہ کسب منفعت کے مختلف حیلے اور تدبیریں سوچتا رہتا ہے۔ حقیقی دین اپنے ماننے والے کو ہر طاقت وحکومت اور ہر تدبیر و سیاست پر غالب بناتا ہے۔ اور مصنوعی دین کا ماننے والا اپنے دین کے ذریعہ ہر باطل طاقت اور ہر طاغوتی نظام کی خدمت کرتا ہے!

حقیقی دین دل ہے اور روحانی طاقت ہے تو مصنوعی دین صرف و نحو ہے اور اعراب و کلام ہے۔ اور مختلف قسم کی تاویلوں کا نام ہے۔ حقیقی دین میں روح و خون کا باہمی امتزاج ہوتا ہے۔ حق کی تائید کے لئے جرأت و بے خوفی ہوتی ہے ظلم و بغاوت سے نفرت ہوتی ہے اور عدل و انصاف کی راہ میں مرنا ہوتا ہے۔ لیکن مصنوعی دین میں ایک بڑا عمامہ ہوتا ہے ایک چمکدار عبا ہوتی ہے۔ اور ایک چوڑی آستینوں والی اچکن ہوتی ہے۔ حقیقی دین کی سند تو یہ ہے کہ:۔

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم و	بیشک اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے اُن کے جان و مال کو
اموالھم بأن لھم الجنۃ یقاتلون فی	خرید لیا ہے جنّت کے بدلے میں۔ کہ وہ اللہ کی راہ میں
سبیل اللہ فیقتلون و یقتلون۔	لڑیں گے اور لڑ کر ماریں گے اور مارے جاویں گے۔

لیکن مصنوعی دین کی سند میں کچھ اعراب ہوتے ہیں، کچھ جملے ہوتے ہیں۔ کسی متن کی تشریح ہوتی ہے۔ کسی شرح کی تفسیر ہوتی ہے۔ اور کہیں حاشیہ ہوتا ہے۔ کسی مصنف کے قول کی تصحیح ہوتی ہے۔ کسی اعتراض کا جواب ہوتا ہے!

حقیقی دین میں انسان اپنے اللہ، خالق، سے عمدہ رشتہ جوڑتا ہے اور انسان سے تعلقات پیدا کر کے رشتۂ آلہی میں مزید قوت پیدا کرتا ہے۔ مصنوعی دین انسان انسان سے اس لئے تعلق پیدا کرتا ہے تاکہ وہ اس سے کوئی نفع

حاصل کر سکے۔ کوئی جاہ و منزلت پا سکے، کسی غنیمت پر فائز ہو سکے۔ اور اپنے کسی نقصان کی تلافی کر سکے!

کہنے والے نے سچ کہا ہے:-

اِنَّ هٰذَا الدِّین لا یصلح آخرہ الا بما صلح بہ اوّلہٗ۔

اس دین کے آخر کو درست کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کے لئے بھی وہی قوت درکار ہے جس نے اس کے اول کی اصلاح کی تھی!

اور کون نہیں جانتا کہ یہ دین اپنی ابتدا میں روحانیت اور حقیقت سے معمور ہو کر آیا تھا۔ لیکن آج مادیت نے اس روحانیت پر قبضہ جما لیا ہے۔ اور اب یہ صرف ایک فن بن کر رہ گیا ہے!

ہر دیندار کا یہ صریح ظلم ہے۔ خواہ وہ جس دین کا بھی ماننے والا ہو کہ زمانے کی ترقیوں کے ساتھ وہ اپنے دین کی روح کو بھی کھوتا چلا جائے۔ حقیقت کو چھوڑ کر صرف صورت کو اختیار کر بیٹھے اور اس طرح قوانین کی خلاف ورزی کرے کہ اس کے نزدیک روح کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو۔ اور اس کے لئے سارا متاع زندگی اور ساری پونجی بس صورت ہی میں محدود ہو کر رہ جائے!

ایمان کی حالت بالکل عشق کی سی ہے۔ جو قلب کی برودت میں حرارت پیدا کر دیتا ہے۔ اور گمنامی کو شہرت میں بدل دیتا ہے۔ رذائل کو مٹا کر فضائل کو رواج دیتا ہے۔ اور جو خود پسندی کو ختم کر کے ایثار کا جذبہ پیدا کرتا ہے!

سچا ایمان جادو کی چھڑی ہے۔ جو کسی چیز سے لگ جائے تو فوراً اس کو مشتعل کر دے۔ اور منجمد چیز سے چھو جائے تو اس کو پگھلا دے اور کسی مردہ جسم پر پڑ جائے تو اس کو زندہ کر دے!

کیا اس کے لئے کوئی تیار ہے کہ پورے مصنوعی دین کو لے کر مجھ کو صحیح معنوں میں حقیقی دین کا ایک ذرہ عطا کر دے

عربی شاعر نے شاید اسی موقع پر کہا تھا ؎

ولی کبدٌ مقروحۃ من یبیعنی

بہا کبداً لیست بذات قروح

میرے پاس ایک زخمی جگر ہے۔ لیکن کون تیار ہے جو اس مجروح جگر کو لے کر مجھ کو ایک صحیح و سالم جگر دے دے!!

ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین
ترجمہ۔ سید حسن مثنیٰ ندوی

اسلام کا نظریۂ اجتماع

اقبال کی نظر میں

اقبال کا نظریۂ اجتماع کیا ہے؟ اور وہ معاشرہ کس قسم کا ہوگا جس کی نسبت ان کی رائے یہ ہے کہ صرف اسی کے اندر رہ کر افراد کی نشو و نما اس انداز سے ہو سکتی ہے کہ ایک طرف وہ موثر طور پر اپنے فرائض و واجبات سے عہدہ برآ بھی ہو سکیں اور دُوسری طرف مخالف و متضاد اجتماعی حالات ان کو قدم قدم پر ناکامیوں سے دوچار بھی نہ کر سکیں؟ یا اور زیادہ صحیح نفسیاتی شکل میں اس سوال کو یوں اپنے سامنے رکھیئے کہ وہ کونسا نظام اجتماعی ہے جو اس قسم کے افراد پیدا کرنے کا محرک بھی ہوگا اور اُن کا معین و مددگار بھی ثابت ہوگا؟ کیونکہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ فرد کی نشو و نما کبھی کسی خلاء میں نہیں ہوتی۔ نہ فقط درسگاہوں کی علمی فضا کے زیر اثر ہوا کرتی ہے۔ یہ نشو و نما درحقیقت نتیجہ ہوتی ہے اُن بے شمار قوتوں کا جو فرد پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔ یہ قوتیں خواہ فطری ہوں خواہ تہذیبی و ثقافتی۔ اس زمانے میں چونکہ فاسسٹ اطالیہ سے لے کر سوویٹ روس تک، اجتماعی و معاشی زندگی کی تعمیر جدید کے سلسلہ میں ہمہ قسم کے بنیادی و انقلابی تجربات ہوتے رہے ہیں اور نظام اجتماعی کا یہ مسئلہ بے حد کٹھن اور اختلافی موضوع بحث بن گیا ہے۔ اس لئے جب تک پوری حوصلہ مندی کے ساتھ اس سے نمٹنے کی کوشش نہیں کی جائے گی اقبال کا فلسفۂ تعلیم تو نامکمل ہی رہیگا!

پھر اس نظامِ اجتماعی کا تجزیہ کرتے وقت یہ پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ اقبال کے فکری محرکات کا سرچشمہ تعلیمات اسلام ہیں۔ نکلسن نے اسرارِ خودی کے پیش لفظ میں یہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

> "اقبال کا عقیدہ ہے کہ فرد کی مکمل نشو و نما ایک معاشرے کے ساتھ مشروط ہے۔ اور یہ مثالی معاشرہ اُن کو اُس تصور میں نظر آتا ہے جس کو وہ پیغمبرِ خدا کا نظریۂ اسلام قرار دیتے ہیں۔ جہاں ہر مسلمان اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ کامل بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہ کر خدا کی اس سرزمین پر حکومت الٰہیۂ اسلامیہ کے قیام میں معین و مددگار ثابت ہوتا ہے"۔

مگر اس سے پیشتر کہ اس معاشرے کے اہم خط و خال کا تجزیہ کیا جائے۔ اس سوال کے جواب سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے جو اکثر سامنے لایا جاتا رہا ہے کہ کیا اقبال کی یہ خواہش کہ اقدار اسلامی کی نشاۃ ثانیہ ہو۔ رجعت پسندانہ ہے۔ یعنی روشن خیالی کی بجائے تاریکی میں رہنے کا مشورہ ہے؟ یہ سوال متقاضی ہے کہ ان اجتماعی و معاشری اقدار کا ٹھنڈے دل سے بے لاگ جائزہ لیا جائے۔ اور ذہن و فکر کو اس بات کے لئے تیار کیا جائے کہ اگر ان کو قبول کرے تو ان کی خوبی و صف

کی بنا پر قبول کرے۔ یعنی صرف اس بنا پر کہ یہ قدیم ہیں اور ان کی حیثیت مسلّمہ مذہب سے ماخوذ ہے۔۔ تو یک لخت ان کو مسترد کر دیا جائے۔۔ نہ بے چون و چرا تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ موجودہ اجتماعی احوال و کوائف اور مشکلات و مسائل کے پیش نظر ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگایا جائے۔ اقبال خود بھی ہمیشہ حقیقتِ تغیّر اور معاشرۂ انسانی کی طوفانی اور فعّال نوعیت پر زور دیتے رہے ہیں کہ ؎

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز　　سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کو تاریخی تسلسل کا ایک ضروری اور حق بجانب احساس و شعور بھی رہا ہے۔ وہ ماضی سے صرف اس لئے بیزار نہیں ہیں کہ وہ قدیم ہے۔ اور نہ ہر چیز کے ساتھ اس لئے بہہ گئے ہیں کہ وہ جدید ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

”ہمیں یہ ہرگز بھولنا نہ چاہیئے کہ زندگی کوئی سادہ اور خالص تغیّر نہیں ہے۔ بلکہ قدامت اور تحفظِ قدامت کے عناصر اس کے اندر موجود ہیں۔ روحِ انسانی اپنی آگے کی طرف بڑھتی ہوئی حرکت میں انہی طاقتوں کے زیر اثر ہے جو مخالف سمت میں کارفرما معلوم ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہیئے کہ زندگی اس طرح حرکت کرتی ہے کہ اس کے ماضی کا وزن اس کی پشت پر ہوتا ہے لہٰذا معاشری تغیر و تبدل کی کسی صورت میں بھی قدامت پرستی کی قوتوں کے عمل دخل اور قدر و قیمت کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔۔۔۔۔۔۔ کوئی قوم برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ اپنے ماضی سے کلیتہً دست بردار ہو جائے۔ کیونکہ ماضی ہی پر اس کی شخصیت و انفرادیت کا امتیاز قائم ہوتا ہے“۔

بہرحال یہ تو ماضی کے ادارات و تجربات کو مسترد نہ کرنے کے سلسلہ میں ایک فلسفیانہ استدلال ہے۔ اسلامی ادارات کی قبولیت اور عہد جدید کے لئے اُن کی سُودمندی و افادیت اور اُن کے بیش بہا فوائد کی توثیق و تصدیق کے لئے دلائل اقبال کے پاس اس سے بھی زیادہ قطعی اور ایجابی موجود ہیں۔ ایک مرتبہ اقبال پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ آپ نے اپنی وسعتِ فکر و نگاہ کو محدود کر دیا ہے۔ عالمِ انسانیت کی پہنائیوں سے ہٹا کر عالمِ اسلام کی حدود میں اسے بند کر دیا۔ تو انہوں نے اس کا جواب یہ دیا تھا کہ:-

”میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی ”وکالت“ نہیں ہے۔ درحقیقت میں ایک بہتر نظامِ اجتماعی کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہوں۔ لیکن اس تلاش و تجسس میں یہ تو قطعی ناممکن ہے کہ ایک ایسے نظامِ معاشرہ کو نظر انداز کر دیا جائے جو واقعی موجود ہے اور جس کا مقصدِ اوّلین یہ ہے کہ نسل، ذات اور رنگ کے جملہ امتیازات کا خاتمہ کیا جائے“۔

چونکہ اقبال ایک ایسے نظامِ اجتماعی کی تعمیر کے لئے سرگرداں ہیں جس کی بنیاد وسیع ترین انسانیت پر در اساس پر قائم ہو اور جس میں نسل ذات اور رنگ، افتراق انگیز عوامل کی حیثیت سے قطعی موجود نہ ہوں۔ لہٰذا وہ اسلام کے اجتماعی و معاشری اقدار کا خیر مقدم کرتے ہیں اور پھر انہی کی تبلیغ کرتے ہیں۔ کیونکہ نسلیت اور وطنیت کے امنڈتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے سب سے زیادہ مضبوط اور مستحکم فصیل یہی اقدار مہیا کرتی ہیں۔ اور اس لئے بھی کہ ان اقدار کی روح سب سے بڑی ضمانت اور ایک طاقتور امید اس معاشرے کو عطا کرتی ہے جس کی بنیاد مساوات، عدل اجتماعی اور انسانی برادری پر

قائم ہو۔

لیکن اس سے پیشتر کہ ہم اس نظامِ اجتماعی کا تجزیہ کریں۔ جس کو اقبال معرضِ وجود میں لانا چاہتے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس معاشرے کا نقشہ بھی اپنے سامنے رکھ لیں۔ جو پیغمبرِ اسلام کی تشریف آوری سے پہلے سارے عرب اور دوسرے مشرقی ممالک پر چھایا ہوا تھا۔ کیونکہ ایک مایوس و نومید دُنیا کو پیغمبرِ اسلام نے جو نظریۂ اجتماع عطا کیا تھا اس کی انقلابی نوعیت کو ہم صحیح طور پر جبھی سمجھ سکتے ہیں اور اس کی قدر و قیمت پہچان سکتے ہیں جب اس کا تاریک پس منظر بھی ہمارے سامنے موجود ہو۔ اسلام کی آمد سے پہلے انسانیت کی تباہی کا عالم کیا تھا۔ اس کی تفصیل اقبال کی زبان سے سنیئے :۔

بود انساں در جہاں انساں پرست ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش بند ہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سُلطان و امیر بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

از غلامی فطرتِ اُو دوں شدہ نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

عہدِ جدید کے ایک یورپین مؤرخ نے اس عہد کی دُنیائے تہذیب کا نقشہ بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے جبکہ اسلام منصۂ تاریخ پر جلوہ گر ہوا تھا۔ اقبال اپنی تصدیق کیساتھ اس کا حسب ذیل اقتباس پیش کرتے ہیں :۔

"اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ وہ عظیم الشان تمدن جس کی تعمیر میں چار ہزار سال کی مدت صرف ہوئی تھی۔ تباہی کے کنارے آ لگا تھا اور انسانیت پھر اسی وحشت و بربریت کے عالم میں لوٹ جانے والی تھی۔ جہاں ہر قبیلہ دُوسرے قبیلے کے خلاف اور ہر جماعت دُوسری جماعت کے مقابل کمر باندھے کھڑی تھی۔ امن و امان اور نظم و انتظام کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا پُرانے قبائلی احکام و قوانین بھی سب بے اثر ہو چکے تھے۔ مسیحیت نے جو نئے احکام و قوانین وضع کر رکھے تھے وہ بھی اتحاد اور نظم و انتظام پیدا کرنے کی بجائے تفریق و انتشار اور تخریب و تباہی پھیلا رہے تھے۔ یہ عہد سرتاسر المناکیوں سے معمور تھا۔ کیا ایسی کوئی جذباتی ثقافت موجود تھی جو انسانیت کو ایک مرتبہ پھر متحد کرنے اور تمدن کو بچانے کے لئے سامنے لائی جاتی ؟ لازمی طور پر ضرورت ایک نئی قسم کی ثقافت کی تھی کیونکہ پُرانے قاعدے قانون اور رسوم و رواج سب مُردہ ہو چکے تھے۔ اور اسی طرح کے دُوسرے دستور و قوانین کی تعمیر و تشکیل صدیوں کی محنت و مشقت کی طالب ہوتی ۔"

پھر مؤرخ کچھ اور بحث و استدلال کے بعد لکھتا ہے :۔

"اس نازک دَور میں دُنیا کی نجات لازمی طور سے منحصر تھی کسی ایسی ثقافت کے فوری ظہور پر، جو اُس وقت کی رائج و موجودہ تمام ثقافتہائے تخت و تاج کو جن کے نظامہائے اتحاد کی بُنیاد رشتۂ خون پر قائم تھی یکسر منسوخ و معزول قرار دیتی ۔"

پھر وہ بڑے استعجاب کے ساتھ لکھتا ہے کہ :۔

"ایسی ثقافت کا ظہور تو ہوا مگر کہاں ؟ عرب میں !"

لیکن اقبال کی دقتِ نظری وبصیرت بے حد روشن ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"اس میں استعجاب کی مطلق کوئی بات نہیں ہے۔ "خود اس دنیا کی زندگی" بھی جبلّی ووجدانی طور پر اپنی ضروریات سے باخبر ہوتی ہے اور نازک مواقع پر اپنا رُخ آپ ہی متعین کرتی ہے۔ لہذا یہ بالکل فطری بات تھی کہ اسلام کا ظہور ایک ایسی سیدھی سادی قوم کے پردۂ احساس وشعور سے ہو جس کو اُس عہد کی رائج الوقت ثقافتوں کی ہَوا تک نہیں لگی تھی۔ اس کے علاوہ جغرافی اعتبار سے بھی اس کو تین تین براعظموں کے درمیان نقطۂ وصل ہونے کا مرتبہ ومقام حاصل تھا۔"

آیئے اب ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس جدید معاشری وثقافتی نظام کے نمایاں اور ممتاز خط وخال کیا ہیں جس کا ظہور تاریخ عالم کی ایسی نازک گھڑی میں اس فاتحانہ اور ظفرمندانہ انداز سے ہوا۔ اقبال بتاتے ہیں کہ :-

"اسلام کے اس نظامِ اجتماعی نے اپنے اصول توحید (وحدانیت) میں وحدتِ عالم کی (محکم ترین) بُنیاد واساس پیش کی ہے اور اسلام بحیثیت مذہب، واحد عملی ذریعہ ہے اس اصل الاصول کو بنی نوع انسان کی فکری وجذباتی زندگی میں ایک جان دار عامل بنانے کا۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ساری وفاداریاں صرف خدا کے لئے وقف ہونی چاہئیں۔ کسی تخت وتاج کے لئے نہیں، اور خدا ہی چونکہ آخری روحانی اساس ہے ساری زندگیوں کی۔ لہٰذا خدا کے ساتھ وفاداری کا مفہوم درحقیقت یہ ہو جاتا ہے کہ انسان خود اپنی مثالی فطرت کا وفادار ہے۔"

اس جدید فکر ونگاہ کے ساتھ جو اخلاقی اور نفسیاتی تغیر وابستہ ہے۔ وہ بہت ہی غیر معمولی عظمت واہمیت کا حامل ہے بلفظ دیگر ایک ایک فرد کو (بمفہوم کانٹ) بجائے خود ایک "ہستئ بے پایاں" تسلیم کیا گیا اور رشتۂ خون کو وحدتِ انسانی کی اساس قرار دینے سے صاف انکار کر دیا گیا۔ وہ رشتۂ خون جو اقبال کی زبان میں اصلاً (نباتاتی) "وابستگی ارضی" کے مرادف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :-

"وحدتِ انسانی کی خالص نفسیاتی بنیاد کی تلاش وجستجو صرف اسی تصور خاص کے ساتھ ممکن ہے کہ جملہ انسانی زندگی اپنی اصلیت میں روحانی ہے۔ اس قسم کا تصور تازہ تر وفاداریوں کی تخلیق کا موجب بھی ہے اور ان کو تازہ رکھنے کے لئے کسی طرح کے ظواہر ورسوم کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی بدولت انسان کے لئے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو زمین کی ہر وابستگی وگرفت سے آزاد وبے نیاز کرلے۔"

پس یہ اصولِ توحید، نفسیاتی نقطۂ نظر سے، افتراق وتشتت کی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی منقسم وپراگندہ دُنیا کے لئے دراصل وحدتِ سالمہ مہیا کرتا ہے اور ان تمام ثنویت پرستیوں کا فیصلہ کر دینے کے لئے بھی جو ارتقائے فکری کے راستے میں ہمیشہ رکاوٹیں ڈالتی رہتی ہیں۔ ایک علمی، فکری وذہنی جذبہ وجوشِ فراواں بہم پہنچاتا ہے اور پھر یہ اپنے جلو میں ایک نیا احساس آزادی وحریت اور نیا حوصلہ اور ولولہ بھی لئے آتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے غیر معقول خوف وہراس اور تعصبات واوہام سے بھی نجات دلا دیتا ہے۔ چنانچہ واقعی اسلامی تاریخ کے اوائل میں اس کے اثرات ہم دیکھتے ہیں ـــ

اسلامی معاشرے کے اندر جتنے بھی مختلف النوع مفادات اور مختلف الاقسام حلقے اور دائرے ہوں یہ اُن سب کے لئے ایک مرکز اجتماع۔ ایک نقطۂ اتحاد مہیا کر دیتا ہے۔ لیکن اقبال اس حقیقت پر بڑے افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ:۔

"توحید کی یہ صاف شفاف اور نکھری ہوئی پیشانی کفر و الحاد کی آلودگیوں سے داغدار ہو کر رہ گئی ہے۔ اور اسلام کے اخلاقیاتی تصوراتِ اعلیٰ کی کائناتی اور لامحدود حیثیت مقامات وحدود کی بندشوں میں پڑ کر ضائع ہو گئی ہے۔ لہٰذا ہم لوگوں کے لئے اب صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ اسلام کے جسم پر جو سخت قسم کی ایک پرت سی اُوپر سے جم گئی ہے اور ایک غلاف سا چڑھ گیا ہے اور جس نے زندگی کے بارے میں اس کے لازمی طور پر متحرک اور طوفانی فکر و نگاہ کو منجمد سا کر دیا ہے۔ اُتار کر علیحدہ کر دیں۔ اور آزادی و حریت، مساوات اور قیام و استحکام کے اصلی توقعات کو از سرِ نو برآمد کریں۔ تاکہ ہم اپنے اخلاقی معاشری اور سیاسی تصورات و نصب العین کی تعمیرِ جدید۔ اُن کی اصلی سادگی اور کائناتیت کے مطابق کر سکیں"۔

اقبال نے اپنی کتاب رموزِ بے خودی میں اس اصول کے لوازمات و متعلقات پر روشنی ڈالی ہے:۔

این کہ در صد سینہ پیچد یک نفس — سرّے از اسرارِ توحید است و بس
یک شود توحید را مشہود کن — غائبش را از عمل موجود کن
دین ازو حکمت ازو آئین ازو — زور ازو قوت ازو تمکین ازو
قدرتِ او برگزیند بندہ را — نوعِ دیگر آفریند بندہ را
بیم و شک میرد عمل گیرد حیات — چشم می بیند ضمیرِ کائنات
لا الٰہ سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکارِ ما

اللہ کے رسول محمدؐ کی غیر معمولی اور اہم شخصیت ایک اور اہم مرکز مہیا کرتی ہے۔ یہ مرکز اسلام کے بڑھتے اور اُبھرتے ہوئے آئینِ حکومت کی وفاداری کا ہے۔ اور یہی جذباتی مرکزیت وہ طاقتور ذریعہ ہے جو مسلمانوں کو ایک اہم، حیات افروز اور متحد و یک رنگ اُمت کے سانچے میں ڈھالتا ہے:۔

از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما آئینِ ما
از رسالت صد ہزار ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
ما زِ حکمِ نسبتِ او ملتیم! — اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم!
دامنش از دست دادن مردن است — چوں گل از بادِ خزاں افسردن است
از رسالت ہم نوا گشتیم ما — ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما
فرد از حق ملت از وے زندہ است — از شعاعِ مہرِ او تابندہ است

لیکن رسالتِ محمدیہؐ کی حقیقی عظمت و اہمیت در اصل اُس پیغام کی نوعیت میں مضمر ہے جو انسانیت کو دیا گیا ہے اُس انسانیت کو جو اپنی ہی خود ساختہ بیدرد زنجیروں میں بُری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ وہ پیغام، جو آزادی و حریت کا تھا۔

معاشری مساوات کا تھا - اور انسانی برادری کا تھا - یعنی تاریخ عالم کا وہ پہلا غیر مبہم اور واضح اعلانِ عام - کہ معاشری مرتبہ و مقام میں اور قانونی حقوق میں سب یکساں ہیں - سب برابر ہیں - کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہیں ہے - چنانچہ اس پیغام نے اُن تمام لوگوں کو شہریت و آدمیت کا پورا پورا مرتبہ و مقام عطا کیا جو نسل، رنگ، جنس یا معاشری و معاشی احوال کو الگ کی بنیاد پر حقوقِ انسانی سے محروم کر دیے گئے تھے - غرض اس زمانے میں جس حد تک بھی قابلِ عمل ہو سکتا تھا، اشتراکی جمہوریت (سوشیل ڈیموکریسی) کا یہ ایک زندہ اور جاندار عقیدہ تھا - اس نے دُنیا کو ـــ اور اس دُنیا کو جو پادریوں، پروہتوں اور دولت مندوں کے غلبہ و تسلط کا تختۂ مشق تھی - اور طرح طرح کے برسرِ جنگ سازشی گروہوں میں منقسم تھی ـــ اقتدار کا ایک مجموعۂ جدید سونپا اور بنی نوعِ انسان کے لئے ایک پروانۂ حریت و نجات کی پیش کش کی ـــ بالخصوص اُن غربا کے لئے، اور اُن پامال و خستہ حال طبقات کے لئے جن کو امیروں، دولت مندوں اور اقتدارِ سیاسی کے غاصبوں نے اپنے تغلب و تصرف کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑ رکھا تھا :-

تا امینے حق بحقداراں سپرد   بندگاں را مسند خاقاں سپرد

اعتبار کار بنداں را فزود   خواجگی از کارفرمایاں ربود

قوت او ہر کہن پیکر شکست   نوعِ انساں را حصارِ تازہ بست

تازہ جاں اندر تنِ آدم دمید   بندہ را باز از خداونداں خرید

حریت زاد از ضمیرِ پاکِ او   ایں مئے نوشیں چکید از تاکِ او

ناشکیب امتیازات آمدہ   در نہادِ او مساوات آمدہ

عصرِ نو کیں صد چراغ آوردہ است   چشم در آغوشِ او وا کردہ است

معاشری و اجتماعی مساوات اور عدل و انصاف کا یہ اعلان، امیر و غریب اور قوی و ضعیف کے مابین پیمانہ و میزان کا یہ اصول نظری ہی نہیں تھا بلکہ بڑے وسیع پیمانہ پر عملاً وجود میں آ گیا تھا - اس کی کارفرمائیاں مذہبی ارکان و مناسک میں بھی شامل تھیں اور روزمرہ کے معاشری اعمال و افعال میں بھی - تاریخ اسلام ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ معمولی سے معمولی آدمیوں کے حقوق تک طاقتور سے طاقتور حریفوں کے مقابلے میں نہایت ہی ظفر مندانہ طور پر ثابت و قائم ہو کر رہے ہیں - مثلاً اقبال نے اپنی مثنوی میں سلطان مراد کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے ایک معمار کا بازو صرف اس بنا پر اُکھڑوا دیا تھا کہ معمار کی صنعت گری اُسے مسرور نہ کر سکی تھی - معمار نے سلطان کے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا :-

گفت اے پیغامِ حق گفتارِ تو   حفظِ آئینِ محمدؐ کارِ تو !

سفتہ گوشِ سطوتِ شاہاں نیم   قطع کن از روئے قرآں دعویم

قاضئ عادل بدنداں خستہ لب   کرد شہ را در حضور خود طلب

رنگ شہ از ہیبتِ قرآں پرید   پیشِ قاضی چوں خطاکاراں رسید

قاضی نے مقدمہ کی سماعت کے بعد یہ فیصلہ صادر کیا :-

عبدِ مسلم کمتر از احرار نیست   خونِ شہ رنگیں تر از معمار نیست

اور قانون کے مطابق شہنشاہ پر جُرمانہ عائد کر دیا :-

یافت موجے بر سلیمانے ظفر　　　سطوت آئینِ پیغمبر نگر
پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است　　　بوریا و مسند دیبا یکے است

اس طرح وہ نظامِ اجتماعی، جو اسلام کا پیش کردہ و مطلوب ہے۔ اپنی قانون سازیوں اور فرمودات و احکام کا سارا وزن ناانصافیوں اور ناہمواریوں کی درستی و اصلاح پر ڈالتا ہے اور اس کا سارا رجحان و میلان یہی ہے کہ ہر قوی کے مقابلے میں کمزور کی امداد و اعانت کی جائے، اس نے اپنی اس بنیادی روح جمہوریت کے ذریعہ اور سوسائٹی کی جملہ معاشری و معاشی تفریق و تقسیم کی جڑ کاٹ کے۔ معاشری ربط و ارتباط کو متحرک و برسرِ عمل رکھنے کے لئے راستہ برابر ہموار کیا اور سوسائٹی کو جداگانہ قسم کے بے بنیاد و بے تعلق حلقوں میں تقسیم ہو کر منجمد ہو جانے سے ہمیشہ روکا۔ لہٰذا معاشری صحت و فلاح کے ان شرائط کو جو نظامِ اجتماعی بھی نظر انداز یا مسترد کرتا ہو۔ وہ اس تصورِ معاشرہ و اجتماع کے یکسر خلاف ہوگا۔ جس کی وضاحت اقبال کے فلسفہ میں کی گئی ہے!

سیاسی اعتبار سے یہ نظام اجتماعی نسلی اور جغرافی عوامل کے تمام تر دعاوی کا قطعی منکر ہے۔ وہ نہ تو قوم کی وفاداریوں پر اُن کی آمرانہ فرماں روائی کو مانتا ہے، نہ قومی وفاداریوں پر اُن کی عائد کردہ کسی تحدید اور پابندی کو تسلیم کرتا ہے۔ خطہ وارانہ وطنیت پرستی اور جارحانہ حب الوطنی کا حال ہی میں گلا پھاڑ کے جو پروپگنڈہ کیا جاتا رہا ہے اور اس کی اہمیت جتائی جاتی رہی ہے۔ وہ دراصل ایک فتنۂ عظیم ہے۔ کیونکہ یہ اسلام کے بین الاقوامی نصب العین کی جڑ کاٹتی ہے اور بنی نوع انسان کی بنیادی اجتماعیت اور استحکام و سالمیت کا شیرازہ بکھیرتی ہے۔ اس کا پنجۂ وحشت براہ راست سیاسی تمکنت و وقار کے جیب و دامن سے اُلجھ پڑتا ہے۔ چنانچہ تمام تر خونریزی و خونخواری، تخریب و تباہی اور غیر منصفانہ دار و گیر کی براہ راست ذمہ داریاں اسی کے سر ہیں جن کی بدولت موجودہ سیاسی صورتِ حال تلخ تر ہو رہی ہے۔ اقبال کی نظر میں اس جغرافی اور نسلی گروہ بندی کا بہتر سے بہتر پہلو صرف اتنا ہے کہ یہ سیاسی تنظیم کے لئے ایک زود اثر مگر عارضی تدبیر ہے۔ اور بدترین پہلو یہ ہے کہ وہ ہمہ قسم کی سیاسی برائیوں، پامالیوں، زبردستیوں اور جنگ و جدال کی بانی مبانی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے نزدیک جو لوگ قابلِ لعنت ملامت اور گمراہ ہیں۔ اُن میں ایک میکیا ولی بھی ہے۔ جس نے مملکت کو خدائے مطلق کے مرتبہ و مقام تک پہنچا دیا ہے اور جس نے علی الاعلان اس امر کی تلقین کی ہے کہ جملہ قسم کے اخلاق اور اصولِ اخلاق کو سیاسی مہمات و مفادات کے زیرِ فرمان اور تابع ہونا چاہیئے:۔

آں فلارنسا وی باطل پرست　　　سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخہ بہر شہنشاہاں نوشت　　　در گلِ ما دانۂ پیکار کشت
بُت گری مانند آذر پیشہ اش　　　بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دین او معبود ساخت　　　فکر او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر پائے ایں معبود زد　　　نقد حق را بر عیار سود زد

چنانچہ عہدِ جدید کے نازی ازم اور فاشسزم کے رجعت پسند بانیوں نے اس فتنہ انگیز و شر پسند دستور و عمل کو بڑے جوش و خروش کے ساتھ از سرِ نو زندہ کیا کہ جملہ اقدارِ عالیہ، اور جملہ وفاداریاں ایک خاص نسل یا قوم کے اغراض و مفادات کے تابع اور زیرِ فرمان ہوں۔ لیکن اقبال اس قسم کی ناپاک ذہنیت کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند! بر وطن تعمیر ملت کردہ اند!
تا وطن را شمع محفل ساختند نوع انساں را قبائل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شد و اقوام ماند

اور ان تمام اصنام پرستی رنگ و نسل و قوم کے نتائج جو کچھ ہیں۔ وہ اظہر من الشمس ہیں:۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند پیش پائے ایں بت نا ارجمند

نفرت و عناد کی پرورش کرنے والی اور دشمنی و مخاصمت کو ہوا دینے والی ان تمام قوتوں کے خلاف اقبال بنی نوع انسان کی قومیت کی بنیاد جغرافی حوادث و اتفاقات پر نہیں بلکہ خدائے واحد کے ایمان و اعتقاد پر رکھنا چاہتے ہیں۔ اور نتیجتہً انسانی برادری کو ایک فعّال نظریہ و تصور کی حیثیت سے رُو بہ عمل لانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صرف یہی ایک ایسا تصور ہے جو مفید قوتِ متحرکہ کی حیثیت سے کام کر سکتا ہے اور انسانیت کی بر سر جنگ حلقہ بندیوں کی تمام تقسیموں اور تفریقوں کو توڑ سکتا ہے — مٹا سکتا ہے۔ سیاسی اور دنیوی (سیکولر) نقطۂ نگاہ سے اقبال اسلامی معاشرے کی تعبیر ایک ایسے نظامِ اجتماعی کی صورت میں کرتے ہیں جس کا دروازہ ان تمام لوگوں کے لئے کھلا ہوا ہے جو نسل و قوم کے تصور کی پرستش سے تائب ہو جائیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو قابلِ احترام اور مقدس تسلیم کریں۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں اسلام کی بین الاقوامیت جملہ قسم کی خطہ داری یا نسلی وطن پرستی و حب الوطنی کا قطعی انکار کرتی ہے اور کسی قسم کی بھی کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اس کو صاف مسترد کر دیتی ہے:۔

قلب ما از ہند و روم و شام نیست مرز و بوم او بجز اسلام نیست
مسلم استی دل با قلیمے مبند گم مشو اندر جہان چون و چند
دل بدست آور کہ در پہنائے دل می شود گم ایں سرائے آب و گل

اور پھر:۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد
تا ز بخشش ہائے آں سلطانِ دیں مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں
صورت ماہی بہ بحر آباد شو یعنی از قید مقام آزاد شو
ہر کہ از قید جہات آزاد شد چو فلک در شش جہت آباد شو

یہاں یہ واضح کرنے کی شاید ہی کوئی خاص ضرورت ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ خطہ وارانہ وطنیت پرستی (نیشنلزم) کے انکار و استرداد میں عہدِ جدید کے بعض عظیم ترین اور انتہائی ترقی پسند مفکرین بھی اقبال کے ہمنوا ہیں۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک سیاسی وفاداریوں کی از سرِ نو تشکیل و تجدید نہ ہو گی۔ اور امن و سکون کی بنیادوں پر دنیا کی تنظیم نہ کی جائے گی۔ خواہ تعلیمی مہمات

ہوں۔ خواہ دُوسرے اجتماعی و معاشرتی اثرات۔ ایسی کوئی بنیادی تبدیلی نہ پیدا کرسکیں گے جو بہتر بھی ہو اور دُور رس نتائج و ثمرات کی حامل بھی ہو!

اس موقع پر ایک بڑا دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود اقبال کا رویّہ اُس حب الوطنی کے بارے میں کیا ہے۔ جس کو ہمیشہ ایک بڑی "خوبی" مانا گیا ہے اور یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ تعلیم میں بھی اس پر پُورا پُورا زور دیا جائے؟ جہاں تک حب الوطنی کی حیثیت ایک مفاہمت ناپذیر سیاسی عقیدے کی ہے۔ جس کا نعرہ یہ ہے کہ "میرا ملک" — خواہ برسرِ غلط ہو یا برسرِ حق — اور اسی پر اس کا ایمان ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ انسانیت کے وسیع تر مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ تو اس لحاظ سے وہ بین الاقوامیت کی اس روح کے یکسر خلاف ہے۔ جس کا علمبردار اسلام ہے اور جس کی وکالت اقبال کرتے ہیں۔ لیکن جہاں تک حب الوطنی کا تعلق اس مفہوم سے ہے کہ آدمی کو اپنے ملک کی یا جماعت کے کارناموں کی اچھی چیزوں سے محبت ہو۔ اور وہ اپنے خصوصی تہذیبی و ثقافتی مرتبہ و مقام کا۔ اُن کی خوبیوں کا اور افادیت عامہ کا قدر شناس ہو۔ تو پھر یہ ایک گرانقدر جذبہ ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال کے ہاں حب الوطنی مفقود ہے۔ لیکن یہ ایک غلط الزام ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ حقیقی حُب الوطنی کے بھی اتنی شدت کے ساتھ قدردان ہیں کہ بنگال کے میر جعفر اور دکن کے میر صادق کو اپنے ملک سے غداری کرنے، غیر ملکیوں کا ساتھ دینے اور اپنے ملک کو سیاسی آزادی و حریت سے محروم کردینے پر، جہنم کے شدید ترین و اذیت ناک عذاب کا مستحق قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے احساسات ان لوگوں کے بارے میں بے حد شدید ہیں ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

حتیٰ کہ جہنم تک ان لوگوں کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔ لہٰذا شاعر اس سے بھی زیادہ بدتر مقام اس کے لئے تجویز کرتا ہے یعنی مستلزم خونیں۔ اور وہ بھی جو فلکِ زحل میں واقع ہے!

اور زندہ رود اور سلطان ٹیپو کے مکالمہ کی صورت میں اقبال نے اپنی شدید محبت ملکی کا اظہار بھی بڑے پُرجوش انداز میں کیا ہے ؎

باز گو از ہند و از ہندوستاں	آنکہ با کاہش نیرزد بوستاں
آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد	آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم	آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غم ما کن غم او را قیاس	آہ از آں معشوق عاشق ناشناس

اور پھر اپنی کتاب ضرب کلیم میں انہوں نے "شعاعِ امید" بن کر ہندوستان کا تذکرہ ان محبت بھرے الفاظ میں کیا ہے:-

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز	اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن	یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی	جن کے لئے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں	محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بُت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن	تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

پھر یہ نظامِ اجتماعی — تعلیم اور سوسائٹی کے مسیحی تصوّر کی طرح — کسی دوسری دنیا کے Weltanschauung یعنی اس رہبانیت و ترکِ دنیا کی علمبرداری بھی نہیں کرتا - جو کفارہ و نجاتِ روح کے عوض جسم کو مبتلائے اذیت رکھنے اور ذہن و فکر کو شیطانِ مجسم بنا دینے کا عقیدہ رکھتا ہے - یہ نظامِ اجتماعی مادی دنیا سے بیگانہ و بے تعلق نہیں ہے بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ اس کو اپنے مقاصد و عزائم کے لئے استعمال کرنے کا طلب گار ہے - ان دونوں نظاموں کی محرک اگرچہ یہی خواہش ہے کہ "انسان کے اندر روح خودی کی توثیق و اثبات ہو" مگر مسیحیت کا نظریہ مادی دنیا سے منہ موڑ لینے کی تلقین کرتا ہے - اور "انسان کی روح کے اندر ایک نئی دنیائے کشف و کشود" کے لئے سرگرداں ہے -

دوسری طرف اسلام پوری جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ مادی دنیا کو "لبیک" کہتا ہے - اور اس کی جملہ حدود و قیود اور امکاناتِ خطر کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے - اسلام مثالی (آئیڈیل) اور حقیقی (Real) دونوں کو ایسی متضاد قوتیں نہیں سمجھتا جن میں کوئی تطبیق نہ ہو سکتی ہو - یہ مثالیت (آئیڈیل) کا پُراسرار لمس ہی تو ہے جو حقیقت (رئیل) کو زندہ و پائندہ رکھتا ہے - اور صرف اسی کے ذریعہ ہم آئیڈیل کا انکشاف و اثبات کر سکتے ہیں - آئیڈیل کی زندگی حقیقت سے بالکلیہ علیحدگی پر نہیں ہے - جس کا میلان وحدتِ جسدی کا شیرازہ بکھیر دینے کی طرف ہو - بلکہ آئیڈیل کی اس جد و جہد پر ہے کہ حقیقت کے ساتھ اس نیت سے مربوط و منسلک رہے کہ بالآخر اس کو اپنے آپ میں جذب کر لے - منقلب کر کے اپنے سانچے میں ڈھال لے اور پھر بحیثیت مجموعی اپنے پورے وجود کو منزّہ و منوّر کر لے -

ان دونوں نظاموں کے مطمحِ نظر و نصب العین کا یہی اختلاف اور یہی فرق ہے - جو سائنس کے بارے میں دونوں کے طرزِ فکر کی آئینہ داری کرتا ہے - مسیحیت اپنے عہدِ ترقی و اقتدار میں سائنس پر سخت غضب ناک رہی ہے - سائنٹیفک جذبہ و جوش کے خلاف جو عام دار و گیر اس کے نام پر ہوتی رہی - مسیحیت نے اس کو بے تکلف روا رکھا - نتیجہ یہ ہوا کہ اوائل عہدِ وسطیٰ میں یورپ علمی و ذہنی اعتبار سے تاریکی میں ڈوب کر رہ گیا - دوسری طرف تمدنِ اسلامی نے سائنس کی تلاش و جستجو کا غیر معمولی جذبہ و جوش پیدا کیا - اور اس حد تک اس کی حوصلہ افزائی کی کہ مورخِ تمدن بریفالٹ (Briffault) لکھتا ہے:-

> "سب سے زیادہ عظیم المرتبت و گرانقدر عطیہ جو عربی تمدن کی طرف سے دنیائے جدید کو ملا ہے - وہ سائنس ہی ہے - یہ (ثقافتِ اسلامیہ کی فیصلہ کن تاثیر) اتنی زیادہ واضح اتنی عظیم الشان صورت میں اور کہیں نمایاں نہیں ہے - جتنی اس طاقت کی تخلیق و دریافت میں نمایاں ہے - جو آج اس عہدِ جدید کی امتیازی قوّت اور اس کی ظفر مندیوں کا سرچشمہ اعلیٰ ہے - یعنی نیچرل سائنس اور سائنٹیفک اسپرٹ"

لہٰذا یہ لازمی ہے کہ اسلام کا نظامِ اجتماعی ماڈرن سائنس کی تمام ترقیوں کو پوری مستعدی کے ساتھ اپنائے - ان سے استفادہ کرے اور اس طرح اپنے مادی ماحول یعنی عالمِ آفاق پر پورا اقتدار و اختیار حاصل کرے - اقبال نے اپنی کتاب "رموزِ بیخودی" میں یہ بات صاف لفظوں میں واضح کر دی ہے کہ جب تک سائنس کی پوری پوری نشو و نما اور ترقی نہیں ہوتی اور اپنی ترقی و توسیع کے مقاصد میں اس سے استفادہ نہیں کیا جاتا - قومی زندگی کی تقویت و تکمیل ناممکن ہے:-

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد　　عالمے از ذرۂ تعمیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر　　تختۂ تعلیم ارباب نظر
اے کہ از تاثیر افیوں خفتۂ　　عالمِ اسباب را دوں گفتۂ
غایتش توسیع ذات مسلم است　　امتحان ممکنات مسلم است
گیر او را تا نہ او گیرد ترا　　ہمچو مے اندر سبو گیرد ترا
تا ز تسخیر قوائے ایں نظام　　ذو فنونیہائے تو گردد تمام
نائب حق در جہاں آدم شود　　بر عناصر حکم او محکم شود
دست رنگیں کن ز خونِ کوہسار　　جوئے آبِ گوہر از دریا برآر
تابش از خورشید عالمتاب گیر　　برق طاق افروز از سیلاب گیر
جستجو را محکم از تدبیر کن　　انفس و آفاق را تسخیر کن
آنکہ بر اشیا کمند انداخت است　　مرکب از برق و حرارت ساخت است

اور پھر موجودہ نسل کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

اے خرت لنگ از رہِ دشوار زیست　　غافل از ہنگامۂ پیکار زیست
ہمرہانت پے بہ منزل بردہ اند　　لیلیٰ معنی ز محمل بردہ اند
تو بصحرا مثل قیس آوارۂ　　خستۂ واماندۂ بیچارۂ

سائنس کی وکالت غالباً اس سے زیادہ پُرجوش انداز میں اور نہیں ہو سکتی کہ تعلیم اور زندگی کی تنظیم میں اس کی حیثیت ایک لازمی عنصر و عامل کی ہو؟ اقبال کا اصرار اس پر اتنی شدت کے ساتھ اس لئے بھی ہے کہ مسلمانوں پر جو زوال طاری ہوا۔ اس کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے سائنس کی طرف سے غفلت برتی۔ جس کی وجہ سے اُن کی علمی و ذہنی ترقی رُک گئی اور پھر اُن کا سیاسی و معاشی مُوقف کمزور ہو گیا۔ جس کا انحصار موجودہ عہد میں سراسر سائنٹفک طاقت و اقتدار پر ہے۔ لہٰذا تعلیم کے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ وہ اس نقص کو دُور کرنے کی پوری جدوجہد کرے!

اور آخری چیز یہ ہے کہ یہ نظام اجتماعی انتہائی متحرک اور طوفانی (Dynamic) قسم کا ہو۔ اسے بے حد چوکس اور جان دار ہونا چاہیئے۔ نیز تبدیل و تغیر کے حقائق اور ساخت و پرداخت کی تشکیلی قوتوں کے ردّ و قبول اور اثر و تاثر کے لئے۔ جو اس پر مسلسل اثر انداز ہو رہی ہیں۔ ہمہ دم تیار و مستعد رہنا چاہیئے۔ عہد حاضر کے بعض دُوسرے عظیم المرتبت مفکرین کی طرح اقبال بھی اس حقیقت کو واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ زندگی ایک مسلسل رواں دواں قسم کی کیفیت میں ہے۔ یہ ایک تبدیلی مسلسل یا حرکت سراپا ہے۔ چنانچہ وہ اس تصوّر کو ٹیپو سلطان کی زبان سے دریائے کاویری کو خطاب کرتے ہوئے یوں ادا کرتے ہیں :-

اے مرا خوشتر ز جیحون و فرات　　ہر نفس دیگر شود ایں کائنات
زندگانی انقلاب ہر دمے است　　زانکہ او اندر سراغ عالمے است
تار و پود ہر وجود از رفت و بود　　ایں ہمہ ذوق نمود از رفت و بود
جادہ ہا چوں رہرواں اندر سفر　　ہر کجا پنہاں سفر پیدا سفر

کاروانِ و ناقہ و دشت و نخیل ہر چہ بینی نالد از دردِ رحیل

معاشرے کا یہ متحرک اور طوفانی نظریہ منطقی نتیجہ ہے اسلام کے اُس نقطۂ نگاہ کا جو زندگی اور کائنات کے بارے میں اس کا ہے۔ اور جس پر ہم نے ابھی بحث کی ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں ایک پورا باب ہی "اسلام میں اصولِ حرکت" کے عنوان سے اس بحث کی نذر کیا ہے۔ اس باب میں انہوں نے مسئلہ اجتہاد پر روشنی ڈالی ہے اور حرکت و جمود کے دائروں کے مابین صحیح توازن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ:-

"ساری زندگی کی آخری اساس روحانی، جیسا کہ اسلام کا تصوّر ابدیت ہے۔ جس کا ظہور و نمود، تنوعات و تغیرات میں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کے نظریۂ حقیقت پر جس معاشرے کی بنیاد ہو گی اسے اپنی زندگی میں تغیر و ثبات، حرکت و وجود کے دونوں دائروں کے مابین مفاہمت و تطبیق لازماً پیدا کرنی پڑے گی اس کے پاس ایسے ابدی و جاودانی اصول کا موجود ہونا ضروری ہے۔ جو اس کی اجتماعی زندگی کا باقاعدہ نظم رکھ سکیں۔ کیونکہ اس عالمِ تغیرات میں ابدیت ہی ہمیں جگہ عطا کرتی ہے جہاں ہم اپنے قدم جما سکتے ہیں"

لیکن ساتھ ہی وہ یہ نکتہ بھی پیش کرتے ہیں کہ:-

"اصولِ ابدیت کو اگر یوں سمجھا جائے کہ تغیّر و تبدل کے جملہ امکانات ہی سرے سے خارج از بحث ہو جائیں حالانکہ قرآن کے مطابق، یہ تغیر و تبدّل خدا کی عظیم ترین نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ تو پھر لازماً اُن کا میلان اُن چیزوں کے انجماد و جمود کی طرف ہو جائے گا۔ جو اپنی فطرت میں قطعی طور پر متحرک اور غیر منجمد ہیں ...... قرآن کی یہ تعلیم کہ زندگی ایک ترتیب فعلی ہے ترقی پذیر تخلیق کو ضروری قرار دیتی ہے"

اقبال کو اُن فقہا سے بالکل اتفاق نہیں ہے جو اس عہد کے مسلمانوں کے لئے حقِ اجتہاد کے قائل نہیں ہیں۔ اقبال یہ کہتے ہیں کہ دروازۂ اجتہاد کا بند ہونا خالص اختراع ہے۔ جو کچھ تو اس لئے سامنے لایا گیا کہ اسلام کی "فکر قانونی" واضح شکل میں مرتب ہو چکی تھی اور کچھ اس لئے بھی کہ لوگوں میں علمی اور ذہنی کاہلی پیدا ہو گئی تھی۔ جس نے خصوصیت کے ساتھ روحانی تنزل کے زمانے میں بڑے بڑے مفکرین کو بھی بُت بنا کر رکھ دیا تھا!

اقبال کی فکر و نگاہ جس اسلامی نظامِ اجتماعی کو رُو بعمل لانے کی متمنی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وقتاً فوقتاً جن مادی اور ثقافتی قوتوں سے اس کو سابقہ پڑتا رہا ہے۔ اُن سے نپٹنے کے لئے وہ اثر و تاثر کے جملہ شرائط کے ساتھ ہر وقت آمادہ اور کمربستہ ہو!

سید محمد حسنی

سیّد احمد شہید رح

اور

اُن کا حقیقی کارنامہ

سیّد صاحب نے آج سے سَو برس پہلے ہندوستان میں جس عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ملک کے طول و عرض میں اسلامی زندگی کا صور پھونک دیا اور اپنے مجاہدانہ کارناموں سے تاریخ اسلام پر جو گہرا اور تابناک نقش چھوڑا۔ اُس کو یاد کرنے، دُہرانے اور عبرت حاصل کرنے کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی۔ سوانح اور تذکرے لکھے گئے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سیّد صاحب کی اس کامیابی اور رفعت و بلندی کا راز کیا ہے؟ وہ کیا چیز تھی جس نے "سیرت سیّد احمد شہید" کے مصنف کے بقول مشائخ اُمّت میں اس جوان کا سر اُونچا کر دیا ہے؟

کیا علم؟ وہ کسی مدرسہ کے فارغ نہیں تھے۔ انہوں نے فلسفہ و علم کلام کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں۔ اُن کے رفقاء شاہ اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحئی جہاں تک علم و معلومات کا تعلق ہے اُن سے بہت آگے تھے۔ ہندوستان اپنے زوال و انحطاط کے باوجود اہلِ فن، اہلِ کمال، مشائخ اور صوفیہ، محققین اور علماء سے معمور تھا۔ شاہ عبدالعزیز (م ۱۲۳۹) شاہ عبدالقادر دہلوی (م ۱۲۳۰) قاضی ثناء اللہ پانی پتی (م ۱۲۲۵) شاہ رفیع الدین (م ۱۲۳۳) مولانا عبدالعلی بحرالعلوم (م ۱۲۲۵) مولانا فضل امام خیر آبادی (م ۱۲۴۳) علوم دینیہ و عقلیہ کے وہ روشن ستارے تھے جن کے سامنے کسی نئی تصنیف اور کسی نئے اجتہاد کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔

کیا مجاہدہ و ریاضت؟ سیّد صاحب کے سامنے صوفیہ اور مشائخ کی عظیم الشان جماعت تھی۔ جس نے اپنی پُوری زندگی مجاہدہ و ریاضت کے لئے وقف کر دی تھی۔ ملک کے گوشہ گوشہ میں ہزاروں آدمی اُن سے فیضیاب ہو رہے تھے۔ ایک سے ایک صاحبِ کمال۔ اور بڑے سے بڑے صاحبِ دل موجود تھے۔ حضرت شاہ غلام علی کی خانقاہ میں پانچ پانچسو طالبین جمع رہتے تھے۔ جن کی ضروریات کا تکفل خانقاہ کی طرف سے ہوتا تھا۔ بیرونی ممالک میں سے سمرقند، تاشقند۔ بخارا۔ قندھار۔ کابل۔ غزنی تک کے۔ اور ہندوستان مغرب میں پشاور اور شمال میں کشمیر سے لے کر مشرق میں ڈھاکہ اور جنوب میں حیدرآباد تک کے لوگ ہوتے تھے[1]

کیا شجاعت و بہادری؟ شجاعت و بہادری، سرفروشی و جانبازی کا میدان بھی خالی نہیں تھا۔ اگرچہ یہی سیّد صاحب

---

[1] سیرت سیّد احمد شہید بحوالہ آثار الصنادید و دُر المعارف۔

کی خصوصیت ہے تو سلطان ٹیپو نے کیا قصور کیا تھا؟ امیر خان اور دوسرے سپہ سالار سید صاحب سے کیا کم تھے؟

کیا ادب و شاعری اور ذہانت و طباعی کی کمی تھی؟ اگر یہ بات ہے تو غالب، ذوق، مصحفی، آتش۔ اور میر تقی کس مرض کی دوا تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دور شعر و شاعری، بذلہ سنجی اور خوش بیانی کے اعتبار سے عہد بہار کہلانے کا مستحق تھا۔

کیا تصنیف و تالیف کی منظم کوشش اور بڑے پیمانہ پر علوم دینیہ کی خدمت و اشاعت کی ضرورت تھی؟ یہ کام بھی سید صاحب سے کچھ عرصہ پہلے بہت کامیابی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ اجتہاد و استنباط، شریعت اسلامی اور قانون اسلامی کے میدان میں بہت کافی ترقی ہوئی۔ بحث و نظر کے نئے دروازے کھلے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے خانوادہ کے علمی و دینی کمالات، گرانقدر اصلاحی خدمات اور اسلامی کتب خانہ پر ان کے عظیم احسانات۔ سے کون ناواقف ہے۔

منطق و فلسفہ تھا۔ شعر و شاعری تھی۔ حکمت و دانائی تھی۔ تصوف کا چرچا تھا۔ قرآن محفوظ تھا اور حدیث موجود تھی۔ پھر ان کی عبقریت کا راز کیا ہے؟ اور ان کی عظیم المرتبت شخصیت کی کلید کہاں ہے؟

قرآن اس طرح پڑھا جاتا تھا۔ جیسے وہ کوئی تاریخی کتاب ہے۔ جو اپنا پارٹ ادا کر چکی ہے۔ اور اپنی زندگی کھو چکی ہے۔ ان کا زیادہ وقت تاویلات یا متشابہات کی بحث میں صرف ہوتا تھا۔ اصحاب کہف، ذوالقرنین۔ حروف مقطعات، رموز و اسرار سے دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ لیکن جہاں تک امت مسلمہ اور انسانیت کے لئے اس کے پیغام عمل کا تعلق ہے اس کے چرچے مفقود تھے۔ اور زندگی پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ حدیث کا درس بہت سے دینی حلقوں میں جاری تھا۔ لیکن اس کی حیثیت "کتاب الفقہ" یا مجموعہ تعزیرات سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا بنیادی مقصد اور اصلی دعوت، صالح سوسائٹی کی تعمیر۔ فلاح امت اور اصلاح انسانیت اس کو وہ بھول گئے تھے۔ یا بھلا دیئے گئے تھے!

اسی بات کا نتیجہ تھا کہ بہت سے شریف خانوادوں اور ممتاز علمی و دینی حلقوں میں بھی غیر اسلامی شعائر داخل ہو گئے۔ لیکن انہیں نے کبھی ناگواری کا اظہار نہیں کیا۔ اور نہ اس کی مزاحمت کی کوشش کی۔ ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ بہت سے نامور علماء نے غیر اسلامی عادات کو اختیار کر لیا ہے۔ ان میں بڑے بڑے مفسر اور فقیہ تھے۔ لیکن ان کو اس کا خیال نہیں تھا کہ شریعت کی طرف رجوع کریں!

اس بات کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہو سکتا ہے:۔

"معتبر لوگوں کی شہادت ہے کہ سلام مسنون کی رسم ہی اٹھ گئی تھی۔ حتیٰ کہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شریعت کدہ میں بھی آداب و تسلیمات عرض کا رواج تھا۔ اس سنت سے اتنا بعد پیدا ہو گیا تھا کہ عالمگیر جیسا متشرع اور فقیہ بادشاہ بھی اس کا متحمل نہیں تھا۔ مشہور عالم مورخ میر سید عبدالجلیل بلگرامی کے صاحبزادے میر سید محمد اپنی کتاب تبصرۃ الناظرین ۱۰۹ سن جلوس عالمگیری ۷۰۰ھ کے واقعات کے ضمن میں لکھتے ہیں:۔

بست و ہفتم شعبان آب دارے برزینہ ہائے	۲۷۔ شعبان کو ایک سقہ نے جامع مسجد کے زینہ
مسجد جامع نزدیک رسیدہ سلام علیک گفت۔	پر بادشاہ کے نزدیک آکر سلام علیک کہا۔
حکم شد حوالہ کوتوال نمائند۔	حکم ہوا کو توال کے حوالہ کیا جائے[1]

---

[1] سیرت سید احمد شہید ص ۲۹۔

اس کا سبب کیا تھا ؟ اگر ذرا وضاحت سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ان کا طرزِ فکر فلسفہ سے متاثر تھا - اور اس میں
ایک قسم کی پیچیدگی اور دقت طلبی پیدا ہو گئی تھی - وہ قرآن کو حکمت و دانائی کا سرچشمہ ، معلومات کا مستند ذخیرہ - اور اسرار و
رموز کا دفینہ تو سمجھتے تھے - لیکن اس حیثیت سے کہ وہ عمل کی کتاب ہے ، زندگی پر حکمران ہے - سیاسی ، اجتماعی ، خانگی اور نظام
انسانی کے ہر شعبہ میں انقلاب لانا چاہتا ہے - انسانیت کی ترقی و بہبودی اور حقیقی کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد کی دعوت
دیتا ہے - یہ پہلو ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا - حالانکہ قرآن اسی لئے نازل ہوا ہے کہ وہ زندگی اور سوسائٹی پر نافذ کیا
جائے - فقہی موشگافیوں ، کلامی بحثوں ، منطق و فلسفہ کی معرکہ آرائیوں کے لئے میدان نہ بنایا جائے - انہوں نے قرآن کی اس
بنیادی حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا - لیکن ان کی ذہنیت جو فلسفہ و علم کلام سے متاثر تھی (اور فلسفہ اور زندگی کے درمیان
ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے) اس کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ قرآن کو اس طرح پڑھیں گویا وہ انہی کے لئے نازل ہوا ہے
وہی اس کے مخاطب ہیں اور وہ ان سے عمل کا متقاضی ہے !

اس ماحول میں سید صاحب نے اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھایا - زندگی کی تمام گتھیاں اور عقدے یکا یک حل ہو گئے - وہ
عظیم الشان انقلاب جس کی تمنا سب کو تھی - اور راستہ کسی کو معلوم نہیں تھا - اب بہت تیزی کے ساتھ رونما ہونے لگا - مشکلات
اور موانع کے بادل اس طرح چھٹ گئے جس طرح سورج کی روشنی کے سامنے رات کا گہر چھٹ جاتا ہے -

بدعات ، غیر اسلامی رسوم و عادات ، ضعف و اضمحلال ، علم و دین کے حلقوں اور دینی گھرانوں میں سرایت کر گیا تھا
عظیم الشان کتب خانے ، منطق و فلسفہ کی کتابیں ، حواشی اور شرحیں ، تفسیری نکتے اور عقلی دلائل اس کو روکنے میں ناکام رہے
تھے - لیکن اس جوان کی زندگی میں کوئی پیچیدگی اور کجی نظر نہیں آتی - اس کو اس ماحول کی ہوا بھی نہیں لگی تھی - ایسا معلوم ہوتا
کہ وہ کسی دوسری دنیا کا آدمی ہے - حالانکہ اس کا مطالعہ وسیع نہیں تھا - اور مجاہدہ و ریاضت کے اعتبار سے بھی وہ اپنے
بزرگوں سے بہت پیچھے تھا - بات کیا تھی ؟ اس نے زندگی کے کمرے کی وہ اہم کھڑکی بند کر لی تھی - جہاں سے مکھیاں داخل ہوتی
جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے - انہوں نے بہت احتیاط کے ساتھ وہ تمام کھڑکیاں مقفل کر دی تھیں - جن سے مکھیاں داخل
ہونے کا خطرہ تھا - لیکن وہ کھڑکی بند کرنا بھول گئے جس سے مکھیاں داخل ہو رہی تھیں اور جس کو بند کرنا سب سے مقدم تھا -
سید صاحب عملی آدمی تھے - ان کی دماغی ساخت ہی کچھ عمل پسند واقع ہوئی تھی - ان کے عملی اور حقیقت پسند دماغ کو فلسفہ
و منطق کی بحثوں نے آلودہ نہیں کیا تھا - ان کی سلامتِ طبع اور صحتِ فکر صحابہ کرامؓ سے ملتی جلتی تھی - جنہوں نے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تھی - اور آپؐ پر ایمان لائے تھے !

اس بات کی ضرورت تھی کہ عمومی طور پر ، بڑے پیمانہ پر مسلمانوں کو عمل کی دعوت دی جاتی - اور فِرُّوا الی اللہ کی صدا
کی جاتی - ان کا قرآن کے ساتھ بلا واسطہ تعلق پیدا کرایا جاتا - زندگی کے چھوٹے بڑے معاملہ میں - دن کی روشنی اور
کے اندھیرے میں وہ اس کو اپنا نگراں اور حکمراں ، رہبر اور رہنما سمجھتے - ان کو یقین ہوتا کہ قرآن اور اسلامی شریعت عمل
لئے ہے - اور عمل کے بغیر اصلاح و تجدید کی کوئی کوشش مفید اور بارآور نہیں ہو سکتی اور نہ اسلام کے معیار پر پوری
ہے - سید صاحب اس کا زندہ نمونہ تھے - انہوں نے مسلمانوں میں یہی روح پیدا کر دی - جس کے بعد زندگی کے تمام مسائل
خود حل ہو جاتے ہیں اور ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے - اس وقت اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے کتابیں لکھنے
ضرورت بھی باقی نہیں رہتی - اس لئے کہ زندہ اور متحرک اسلام لوگوں کی نگاہوں کے سامنے موجود ہوتا ہے - اس وقت

کے فضائل بیان کرنے اور عقلی دلائل پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہتی - اس لئے کہ اسلامی سوسائٹی معرضِ وجود میں آچکی ہوتی ہے اور اپنے عمل سے وہ اپنی صداقت کا مظاہرہ خود کرتی ہے -

انہوں نے قرآن مجید کو اس طرح دیکھا کہ وہ زندگی کی کتاب ہے، عمل کی کتاب، نجات کی کتاب ہے - اور گویا اس کے مخاطب وہی ہیں اور اس کی ذمہ داری اُنہی کے سر ڈالی گئی ہے اور گویا وہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے نہیں ابھی زمانے میں نازل ہوا ہے - اور وہ ان سے شاکی ہے کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے اور بھری بزم میں رہ کر بھی وہ تنہا ہے !

یہی وہ کنجی تھی، یہی وہ عصائے معجز نما تھا - یہی وہ اکسیر تھی - یہی وہ قیمتی راز تھا جس کو مسلمان بھول چکے تھے !

علاؤالدین کے چراغ کا مشہور قصہ آپ نے ضرور پڑھا ہوگا - علاؤالدین کے چراغ کو اس کی ضرورت نہیں تھی کہ اُس کو خوبصورت طاقوں میں سجا کر رکھا جائے، پُرتکلف محفلوں کی زینت بنایا جائے - اس کی شان میں قصیدے پڑھے جائیں - اس کی تاریخ یاد کی جائے - اس کے ماضی کی داستانِ ہوشربا سنائی جائے - اور لطیف و دقیق نکتے بیان کئے جائیں - اس کو ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ اس کو زمین پر رگڑ دیا جائے - جن کو بُلانے اور خدمت لینے کا یہی طریقہ تھا !

قرآن بھی انسانیت کے حق میں ایک ابدی چراغ ہے - اس کے لئے صرف غور و فکر، بحث و تحقیق اور نکتہ آفرینی کافی نہیں - اس کو عمل کی ضرورت ہے - رضائے الٰہی، دین و دُنیا کی سعادت اور حقیقی فلاح و کامرانی حاصل کرنے کے لئے یہی ایک شاہراہ ہے -

انہوں نے اس عجیب و غریب چراغ کو حاصل کر لیا تھا - اور اس کے طریقۂ استعمال سے واقف تھے - یہی وہ شاہ کلید تھی جو اُن کے ہاتھ لگ گئی تھی - اور دوسرے اس سے غافل تھے - یہ ایمان و یقین اُن کے رگ و پے میں پیوست تھا - اُن کے قلب و نگاہ پر حاوی تھا - اُن کے رجحانات و میلانات اس کے تابع تھے - جب وہ قرآن پڑھتے وقت وعید کی آیات سے گزرتے تو اُن پر رقت طاری ہو جاتی - بشارت کی آیات سے گزرتے تو مسرت و انبساط کا اظہار ہوتا - اگر کسی آیت میں عمل کی ترغیب اور جدوجہد کی دعوت ہوتی تو اس پر پورا پورا عمل کرنے کی کوشش کرتے - اگر عبادت و دعا کی ترغیب ہوتی تو راتوں کو گریہ وزاری اور تضرع و ابتہال میں نظر آتے !

اپنے بچپن میں انہوں نے اپنے بزرگوں، بوڑھوں اور کمزوروں کی اس طرح خدمت اور اعانت کی کہ بڑے بڑے اہل اللہ اور بزرگ حیرت میں پڑ گئے - آپ غور کریں، اس کی کیا وجہ تھی ؟ یہ وہی عملی طاقت تھی اور وہ یقین تھا جو صحابہ کرام میں بدرجۂ اتم موجود تھا - اور اس کی مدد سے انہوں نے دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا تھا - سید احمد شہید میں یہ سعادت فطری طور پر موجود تھی - اُن کے لئے ناممکن تھا کہ خدا و رسول کا حکم سنیں اور اُن کے اندر اس کی تعمیل کا جذبہ نہ پیدا ہو !

اس عملی مزاج کے ساتھ جس کو بحث و تحقیق اور تقریر و تحریر سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی - اور اس ایمان کے ساتھ جو اُن کی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھا - اور اس وجاہت اور تعلق کے ساتھ جو اُن کو دربار خداوندی میں حاصل تھا - انہوں نے اس میدان کو بآسانی فتح کر لیا - جس کے مقابلے میں علماء اور مشائخ کی ایک بڑی تعداد پیچھے رہ گئی تھی - انہوں نے ایک ایسی نسل تیار کی، جو وقت کی تمام بیماریوں، ماحول کے اثرات اور عہد ماضی کے باقیات سے پاک تھی - انہوں نے ایک ایسی سوسائٹی قائم کی جو تہذیب و تمدن، عدل و انصاف، دیانت و امانت، احساس ذمہ داری و فرض شناسی، خود کفالتی اور امداد باہمی کے اعتبار سے اس قابل تھی کہ دُنیا کی تمام قومیں اس پر رشک کریں - انہوں نے ایک ایسی حکومت اور ایسا نظام قائم کیا - جہاں جرائم نایاب تھے - اخلاقی پستی اور بدعنوانی مفقود تھی - یہ نئی نسل، یہ نوزائیدہ قوم، یہ صالح سوسائٹی، یہ اپنے

قائد کی طرح عمل کی دلدادہ - رضائے الٰہی کی طالب - جنّت کی شائق اور زندگی کے ہر شعبہ میں خدا کی مطیع و فرماں بردار تھی - وہ ایمان سے لبریز تھی - اور ایمان معجزات کا سرچشمہ ہے - یہ ایمان اس کے لئے ہر مصیبت کو آسان اور ہر تکلیف کو خوشگوار بنا دیتا تھا !

وہ اسلامی زندگی جس کی واپسی سے لوگ مایوس تھے - پوری بہار کے ساتھ منظر عام پر آگئی - اس کی بنیاد ایمان و یقین پر رکھی گئی تھی - اور ایمان و یقین ہی امتّ مسلمہ کی قوّت کا راز ہے !

اُن کو یقین تھا کہ امتِ مسلمہ کا مزاج عملی ہے - اور اسلام کو تعریف و توصیف کی ضرورت نہیں - اُن کو یقین تھا کہ اسلام کو اپنی مدافعت کے لئے وکلار اور ایڈوکیٹ درکار نہیں - جو اپنی قابلیت، چرب زبانی، منطق و استدلال سے اسلام کی پوزیشن کو خطرہ سے محفوظ رکھیں - اسلام کو ان بلند پایہ حکماء اور دقیق النظر فلاسفہ کی ضرورت نہیں - جو اس کے اسرار و رموز کا پردہ فاش کریں اس کی حکمتوں پر لیکچر دیں اور کتابیں لکھیں - ان مورخین کی ضرورت نہیں جو ابن رشد اور رازی کے فلسفہ کی شرح کرتے پھریں اور ان کو اسلام کے نمائندے قرار دیں - اس کو صرف عمل کرنے والوں کی ضرورت ہے - اور یہی آج دنیائے اسلام کی ٹریجڈی ہے !

سیّد صاحب کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں، اُن کی تاثیر و دلآویزی، اُن کی مردم سازی اور آدم گری - اُن کا گریۂ سحری اور نالہ نیم شبی - اُن کا غیر متزلزل یقین، اتباعِ سنّت اور راہِ حق میں جہاد - ہر عنوان اور ہر موضوع مستقل کتاب کا محتاج ہے - لیکن ان کا بنیادی وصف اور سب سے بڑا امتیاز اُن کی "عملی قوّت اور ایمانی طاقت" میں پوشیدہ ہے - اور یہی خصوصیت ان کو دوسرے مفکرین، مجاہدین اور اہلِ حق سے ممتاز کرتی ہے - اور اسلامی تاریخ میں بہت معزز جگہ عطا کرتی ہے ـــــ !

پروفیسر خان رشید
ایم اے

غزل کی ایک بے اعتدالی

ویسے تو غزل میں ہزاروں بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہاں ان سب کا اعادہ مقصود نہیں۔ اب اسی ایک بے اعتدالی کو لیجئے کہ قدیم غزل میں صنائع و بدائع کا استعمال حُسن شعری میں اضافہ نہ کرتا تھا بلکہ بسا اوقات اسے غصب کر لیتا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ کریہہ مبالغہ ہے۔ مبالغہ کی کئی قسمیں ہیں۔ ہمیں ان سب سے بحث نہیں۔ دراصل مبالغہ زور کلام کے لئے ہے۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ بعض اوقات مبالغہ آرائی انداز بیان کو ایک خصوصی ندرت عطا کردیتی ہے۔ تاہم جب یہ غلو کی سرحدوں کو چھوتا ہے تو نہ صرف یہ کہ زور کلام باقی نہیں رہتا۔ بلکہ اکثر کلام سے زور آزمائی ہونے لگتی ہے۔ مثلاً ؎

لاغر ہیں ہم ایسے کہ نگل جائے جو چیونٹی
اٹکے نہ ہمارا بدنِ زار گلے میں

اگر مفتی امیر مینائی جیسے حضرات فرماتے ہیں کہ ؎

بولے مجھ زار کی تربت پہ نکیرین امیر
لاش تو ہے نہیں خالی یہ کفن کس کا ہے

تو حضرت ناسخ کے یہاں اس کی سند بھی ملتی ہے ؎

انتہائے لاغری سے جب نظر آیا نہ میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے

بیچارہ ناسخ، لوگ کہتے ہیں پہلوان تھا۔ کیا پتہ شعر و شاعری سے بھی کشتی لڑنے کو جی چاہا ہو۔ خیر اگر ہم اسے چند ناقدین کے مطابق "پہلوان شاعری" نہ بھی مانیں تب بھی اس قسم کے اشعار سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے عشق نے اُسے اس بُری طرح سے پچھاڑا کہ محبوب جب عیادت کے لئے آیا تو ضعف سے اس قدر معدوم ہو چکا تھا کہ بستر کو جھاڑا گیا۔ تب کہیں نمودار ہوا۔

قدیم شاعری میں یہ سب کچھ روا تھا۔ کہیں عاشق سوکھ کر کانٹا بن جاتا ہے کہ مسافر بچ کر قدم رکھتے ہیں ؎

جان کر کانٹا مسافر بچ کے رکھتے ہیں قدم
اس قدر میں وادیٔ غربت میں لاغر ہو گیا
(ناسخ)

اور کہیں لاغری سے موت کو بھی نظر نہیں آتا ؎

موت بھی سو بار آئی اور اُلٹی پھر گئی
شکل پہچانی نہیں جاتی ترے بیمار کی
(داغ)

عاشق کی شکل بدلی تو بدلی۔ لیکن غضب یہ ہوا کہ اس مبالغہ آرائی کی وجہ سے کہیں کہیں خود غزل کی شکل بھی پہچاننی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ مبالغہ تو اگلے وقتوں کا تھا۔ لیکن آج بھی اس قسم کی بے اعتدالیوں کی کمی نہیں۔

overstatement کے بعد اگر آپ understatement پر نظر ڈالیں تو دورِ جدید کا ایک خصوصی رجحان رمزیت آپ کی توجہ اپنی طرف منعطف کرلے گا ۔ اشاریت اور رمزیت بلاشبہ شعر کی بڑی خوبیوں میں سے ہیں ۔ میلارمے نے اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"شعر کا حسن اور لذت یابی عبارت ہے اس مسرت سے جو ہمیں اس کی تلاش میں قدم قدم پر ہوتی ہے ۔ اشاروں ہی سے سوئے ہوئے خواب جاگ اٹھتے ہیں "

لیکن اسے کیا کیجئے کہ ہمارے شعراء نے اس کا استعمال کچھ اس طرح کیا کہ جاگے ہوئے خواب بھی اکثر سو جاتے ہیں ۔ دورِ قدیم میں اسے باریکی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا ۔ اور کہیں کہیں اس قدر باریکیوں سے کام لیا گیا کہ "کوتاہی قسمت سے نگاہیں مژگاں" بن کر رہ گئیں ۔ اور "شوخیٔ تحریر" "نقش فریادی" کا رنگ اختیار کر گئی ۔ کوئی باریکی سی باریکی ہے کہ معشوق کی موہوم کمر کا تو سراغ لگ جائے ۔ لیکن شعر کا مفہوم ڈھونڈنا آبِ حیوان سے بھی زیادہ مشکل ہو ۔

مومن کا شعر ہے ؎

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا کہ ناحق خون پروانوں کا ہوگا

اسی طرح دورِ جدید کی رمزیت نے کچھ اس قسم کی بے راہ روی اختیار کر لی ہے کہ بعض اوقات جھنجھلا کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے !

علامات کا استعمال (Symbolism) برا نہیں اور آج مغربی طرز شاعری کی تقلید میں یہ جدت بھی ہماری شاعری میں مستعمل ہے ۔ لیکن مغرب سے استفادہ کرتے وقت جب اپنی زبان اور ماحول کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا تو لارنس اور ایلیٹ کی تقلید کرنے والے خود اپنی بصیرت کو بھی کھو بیٹھتے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ناطقہ سر بگریباں ہو کر علامتی رنگ میں میراجی کا " کلموا کالا کلوٹا کوا " بن کر کائیں کائیں کرنے لگتا ہے ۔ گل و بلبل کی فرسودہ علامات سے تجاوز کر کے کنوؤں اور کوؤں کی علامات اختیار کرنے کے لئے بھی جمالیاتی شعور کی ضرورت ہے ۔

یہی اشاریت اپنی پوری آب و تاب اور صحیح مفہوم کے ساتھ فیض احمد فیض کے یہاں پائی جاتی ہے ۔ اور مشرق و مغرب کے متوازن امتزاج کے ساتھ فیض نے غزل کو جو ارتقائی شکل عطا کی ہے ۔ وہ یقیناً قابلِ تحسین ہے ۔ فیض کی مشہور نظم " کتے " Symbolism کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے ۔ نظم سے ہٹ کر اگر ہم اپنی مقبول عام صنف سخن غزل پر غور کریں تو اس میں ابھی تک یہ طنز ، یہ شوخی ، اور یہ تنقیدِ حیات مفقود ہے ۔ اور غزل کی سب سے بڑی بے اعتدالی اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ وہ تنقیدِ حیات سے بڑی حد تک معرا ہے ۔ اور اگر غزل میں مسائلِ حیات کا فقدان ہے تو اسے ترجمانِ حیات کہنا یقیناً بڑی بے انصافی ہوگی ۔

اس میں شبہ نہیں کہ غزل کی وسعت ، ہمہ گیری اور اختصار وہ خوبیاں ہیں جو اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گی ۔ لیکن پھر بھی غزل جن تاثرات کا احاطہ کرتی ہے ان میں ذرا اور وسعت دینے کی ضرورت ہے ۔ اور چند موضوعات پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دینی لازمی ہے ۔ شگفتگی ، بے خودی ، حسرت ، رنج ، درد ، اور الم وغیرہ تو اردو غزل میں تو اس کثرت سے موجود ہیں کہ ساری عمر رونے اور کھوئے رہنے کے سامان موجود ہیں ۔ تاہم اگر آپ مسکراہٹوں ، قہقہوں اور ہوش کے متلاشی ہوں تو اردو غزل ان سے عاری ملے گی ۔ اردو غزل زندگی کے المیہ سے معمور ہے ۔ لیکن المیہ کے اسباب اور ان کے انسداد پر توجہ نہیں

دیتی - اور طربیہ کا فقدان ہے تو اس وجہ سے کہ رجائیت کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا - یہ فراریت کچھ اس قدر ہمہ گیر ہے کہ شاعر صرف ماحول سے نہیں اپنے آپ سے بھی فرار اختیار کر لیتا ہے۔ دراصل قصور غزل کا نہیں بلکہ غزلگو کا ہے۔ دیکھئے میر بھی خود کو شاعر نہیں کہلوانا چاہتا ہے

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع کہ دیوان کیا

شاعر فی الحقیقت وہی ہے جو صرف چند چیزوں کو نہیں اپناتا - بلکہ اس کی وسعت تسخیر وجدان اور جذبہ کی بنا پر لامحدود ہے - اس کا احساس صرف اس عالم آب و گل سے متاثر نہیں ہوتا - بلکہ تخیل کی دنیا سے بھی پرے عالم حیرت کی بازگشت بننا چاہتا ہے

اب عشق کو درکار ہے اک عالم حیرت
کافی نہ ہوئی وسعت میدان تمنا

یہی وسعت غزل کو حاصل ہے۔

مولانا حالی نے غزل مروجہ پر اعتراضات کر کے ایک اصلاحی قدم اٹھایا تھا - اس لئے نہیں کہ وہ غزل کے حامی نہ تھے - (اور وہ صرف غزل کے حامی ہی نہ تھے خود بھی غزلگو تھے) بلکہ اس لئے کہ اردو غزل میں عشق و محبت - اُن کے متعلقات اور مختلف کیفیات پر لاتعداد اشعار موجود ہیں - لیکن دوسرے تاثرات علی الخصوص مسائل حیات یا تو پائے ہی نہیں جاتے - یا اگر پائے جاتے ہیں تو اس قدر کم اور محدود سے کہ معشوق کے حسن یا عاشق کے ارمانوں میں دب کر رہ جاتے ہیں مولانا نے ایک اصلاحی قدم اٹھایا - عشقیات اور خمریات میں کھوئے ہوئے شاعر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا - جیسے آوازِ جرس سوئے ہوئے راہی کو چونکا دیتی ہے - افسوس یہ جرس ہی نہ رہا - ورنہ قافلہ شارع حیات سے پھر نہ بھٹکنے پاتا - وہ حالی ہی تھے، جنہوں نے جدید تغزل کی بنیادیں استوار کیں اور غزل کو زندگی سے زیادہ قریب کر دیا !

حالی کے بعد کورانہ تقلید نے آزاد شاعری کو تو اتنا مہذب بنا دیا کہ ہر روز سایہ کچھ اوپر ہی اٹھتا چلا گیا - اور غزل کی گراہ کن ترقی پسندی نے اسرارِ حیات کو بے نقاب کرنے کی جگہ صرف محبوب کو بے حجاب بلکہ عریاں کرنے پر اکتفا کی - پھر بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر شعراء کی ایک بڑی تعداد نے حالی کے صحیح مفہوم کو سمجھا اور عالم خیال سے ہٹ کر عالم حادثات پر اپنی نگاہیں مرکوز کیں - لیکن پھر بھی غزل ابھی تک صرف زندگی کے دامن کو چھو رہی ہے - اور ضرورت ہے کہ وہ زندگی کے دامن کو مضبوطی سے پکڑ لے - اور اس کے لئے ضروری ہے کہ عشقیہ مضامین کو کم کر کے زیادہ تر توجہ مسائل حیات پر صرف کی جائے - تاکہ غزل صحیح معنوں میں زندگی کی ترجمان، رہنما اور نقاد بن سکے !

کون نہیں جانتا کہ اس جمہوری دور میں انفرادی مسائل سے زیادہ اجتماعی مسائل کی اہمیت ہے - انسانیت قدیم و جدید کے دوراہے پر حیران و سراسیمہ ہے - غزل اگر قدیم و جدید کے امتزاج سے ایک نئے راستہ کی طرف رہنمائی کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ زندگی کی بعید ترین منازل بھی قریب نظر آنے لگیں - آج دورِ جاگیرداری کی خوشامد کی ضرورت نہیں - نسطائیت اور سامراج کا خوف نہیں - اور پھر ایسے عشق کی بھی ضرورت نہیں جو مغلوب ہو کر، مظلوم ہو کر صرف ویرانوں اور صحراؤں ہی میں پناہ لے سکتا ہو - بلکہ اُس عشق کی ضرورت ہے جو دیوانوں کو ہوشیاری اور خلوت گزینوں کو جلوت

اختیار کرنے پر مجبور کردے!

آج خیالی اور موہوم محبوب کے لئے آہیں بھرنا غزل کا شعار نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ خود حقیقی آہوں کے جیب کا رنگ اختیار کرنا چاہیئے۔ آج غزل میں ناامیدی اور بےکسی کی سسکیوں ہی کی نہیں بلکہ لرزتی ہوئی چیخوں کی بجلیوں کی بھی ضرورت ہے۔ کل تک جو غزل لحنِ داؤدی بنی ہوئی تھی آج اسے صورِ اسرافیل بنانے کی ضرورت ہے۔ فنکار ہی قصرِ الحمراء کی خوابیدگی پیدا کرتا ہے اور وہ بھی تو فنکار ہی ہے جو ابو الہول کی ہیبت کو جنم دیتا ہے!

مسائلِ حیات میں معاش کا مسئلہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم غزل میں یا تو اس پر قلم ہی نہیں اٹھایا گیا۔ اور اگر کہیں کچھ کہا بھی گیا ہے تو ڈرتے ڈرتے اور دبی آواز میں۔ لیکن اس اخوت، آزادی اور جمہوریت کے دور میں جبکہ معاشیات پر صرف افراد کا نہیں بلکہ قوموں کی حیات کا مدار ہے۔ یہ مسئلہ انتہائی اہم ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جو بڑی حد تک اولوالعزمی اور پستی، اخلاق اور بداخلاقی۔ بلند خیالی اور ذہنی انحطاط کا ذمہ دار ہے۔ آج اُردو غزل ایک طبقہ کے نزدیک اسی بناء پر زندگی سے فراریت کے علاوہ کچھ اور نہیں کہ اس میں مادّی مصائب کا حل اور المیہ حیات پر تنقید نہیں پائی جاتی۔ مادہ کی تسخیر انسان کا بنیادی نصب العین ہے۔ اس عالمِ ناسوت پر عبور حاصل کئے بغیر لاہوت کا تصور لایعنی ہے۔

اگرچہ سہل ہوں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

یہ صرف آج کی ضرورت نہیں بلکہ ہر زمانے میں اس کے لئے آواز بلند کی گئی۔ مزدک ایرانی اور بزرجمہر جیسے مارکس ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ اور عمر بن عبدالعزیزؒ جیسے بزرگوں کی بھی تاریخ میں کمی نہیں۔

بہرحال اگر ہم ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ؂

اے زر تو خدا نہ ولیکن بخدا
ستارِ عیوب و قاضی الحاجاتی (سعدی)

مارکس تو آج نظر آرہا ہے۔ لیکن ابتدائے آفرینش سے زر کو یہی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اگر ایک طرف عمر خیام کہتا ہے کہ ؂

گویند کہ مرد را ہنر می باید یا نسبتِ عالی بہ پدر می باید
امروز چناں رسید در نوبت ما کیں با ہمہ ہیچ زر می باید

تو دوسری طرف شیکسپیئر اسی زر کو،

"O yellow glittering gold you are God."

کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ نیز زمانے کے تجربات سے ثابت ہے کہ ؂

زردار اگرچہ داں گویند عاقل است
بے زر اگرچہ دانا نسبت بہ خر کنند

اُردو نظم میں قدما میں سوائے سوداؔ اور نظیرؔ کے اس مسئلہ پر شاذ ہی کسی نے توجہ دی ہے۔ سوداؔ کے یہاں بھی ہجو، طنز اور ظرافت کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن نظیرؔ کا انداز بھی ایک مسخرے کے بانکپن سے زیادہ وقیع نہیں۔ سنجیدگی کے ساتھ

اس مسئلہ پر کسی نے بحث نہیں کی۔ شہر آشوب قسم کی نظمیں یا نظیر کی ؎

کوڑی کے سب جہاں میں نقش و نگین ہیں
کوڑی نہیں تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں

بھی بہر حال کچھ تو ہیں۔ لیکن اگر آپ قدیم غزل پر غور کریں تو خال خال ایسے اشعار ملیں گے اور بس۔ مثلاً ؎

کیجئے غور تو دولت بھی پیمبر ہے امیرؔ
کہ کریموں کو خدا سے یہ ملا دیتی ہے

یا

ہر گل زبان برگ سے کہتا ہے باغ میں
انساں کو کیا نبات کو ہے زر کی احتیاج

اور دلّی کی معاشی بدحالی میں آئے دن کے تجربات نے ہمارے شعراء کو یہ بھی سکھلا دیا تھا ؎

چاہیئے زر ان بتانِ سیم تن کے واسطے
ہم قلندر یاں نہیں کوڑی کفن کے واسطے

اس کے باوجود اگر آپ اس قسم کے اشعار پر نظر ڈالیں تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طنز و مزاح سے زیادہ تجاوز نہیں کرتے۔ اور پھر اُن کی تعداد بھی بڑی مختصر ہے۔ یہی مضامین اگر کچھ اور وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں تب بھی، گردشِ دوراں اور استبدادِ زمانہ یا شکوۂ تقدیر سے تجاوز نہ کر سکے۔ کوئی صحیح نصب العین کوئی صحیح پیغام جو معاشی گتھیوں کو سلجھا سکتا کہیں نہیں پایا جاتا۔ اقبالؔ نے اپنی غزلوں میں اس اہمیت کو محسوس کیا اور زندگی کے مختلف مسائل پر ایک مفکّر کی حیثیت سے نگاہ ڈالی۔ اُس نے پوری شدت کے ساتھ کوشش کی کہ زر، زن اور زمین کا نام لئے بغیر اس بنیادی ضرورت کا احساس پیدا کر دے جو زندگی کو صحیح معنوں میں زندگی بنا سکتی ہے۔ ایک مفکّر کی حیثیت سے اس نے زمین و آسمان کی علامت اختراع کیں اور مادّہ اور روح کے حقائق پر روشنی ڈالی۔ لیکن وقت کی قدر ناشناسی کہ اقبالؔ کے طرز کو کسی نے نہ اپنایا۔ بلکہ ایک طبقہ نے تو اُسے ایک سرے سے صفِ غزل گوئی سے خارج کر دیا۔ ایک دوسرے طبقہ نے صرف ؎

کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

پر نظر ڈالی اور اُسے درانتی اور ہتھوڑے کا ترجمان ثابت کرنے کی کوشش کر کے خود فکرِ اقبالؔ کے قصرِ عظیم کو ہلا کر رکھ دیا۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ اقبالؔ کو کمیونسٹ کہنا گالی دینے کے مترادف ہے۔ ایک اور گروہ متعصبانہ انداز سے اقبالؔ کو خالصتہً اسلامی شاعر ثابت کرنے پر تُل گیا۔ لیکن تنگ نظری کی وجہ سے بالکل مخالفِ اسلامی شاعر بنا کر رکھ دیا۔ اس لئے کہ اسلام کا تصور خود اُن حضرات کی اپنی فکر کا نتیجہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود پیامِ اقبالؔ کی صورت مسخ ہو کر رہ گئی۔ حالانکہ یہ سب جانتے ہیں کہ خود اقبالؔ کے الفاظ کے مطابق اس کا نظریہ صرف یہی تھا کہ اگر کمیونزم سے الحاد کو نکال دیا جائے تو وہی اسلام ہے۔ فی الحال یہ بحث غیر ضروری ہے۔ اس کی وضاحت کبھی آئندہ کی جائے گی۔ (مدیر:۔ مقالہ نگار کا مفہوم الجھ سا گیا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ خیالات محلِ غور ہیں۔ جس طرح اندرائن سے کڑواہٹ ...)

بات زر کی اہمیت کی تھی۔ اور اگر یہاں رسکن (RUSKIN) کے الفاظ پیش کر دیئے جائیں تو شاید زر کی

اہمیت کا صحیح اندازہ ہوسکیگا۔ رسکن کے مطابق "سوسائٹی میں تقسیمِ زر کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں خون دوڑتا ہے۔ اگر جسم کے کسی حصہ کو خون نہ ملے تو وہ ہر اعتبار سے ناکارہ اور مفلوج ہو جائے گا"

یہ ایک بیّن حقیقت ہے اور آج تک غزل میں اس خون سے حرارت نہیں پیدا کی گئی اور ضرورت ہے کہ اس طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

تقسیمِ زر پر اس قدر بحث کرنے کے بعد شاید یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ شاید یہ کسی "سُرخے" کی آواز ہے۔ تو میں عرض کر دوں کہ یہ انتہائی گمراہ کن ہوگا۔ میرے نزدیک زر ایک علامت ہے ضروریاتِ مادّی کی اور تاوقتیکہ یہ ضرورت پوری نہ ہو انسان سکونِ قلب نہیں پاسکتا۔ رہی عبادت و ریاضت۔ تو یاد رکھیئے "عالمِ ناسوت" کی تسخیر کے بعد ہی صحیح معنوں میں "عالمِ ملکوت" میں قدم رکھا جاسکتا ہے۔ آج معاشیات کی علمی حیثیت بھی اتنی ارتقائی اور اصولی ہے کہ اس پر توجہ نہ دینا ایک تباہ کن غلطی سے کم نہیں۔ غزل میں اسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیئے!

اب آئیے غزل کی ایک اور خامی پر غور کریں۔ شاعر معلم فلسفۂ اخلاق (ethics) بھی ہے۔ لیکن اگر آپ بہ نظر انصاف دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ قدیم غزل میں جس اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ وہ یکسر قنوطی اور فراری ہے۔ مجھے ستم ظریف نطشہ (Nietzsche) یاد آیا۔ جو منکرِ اخلاق تھا۔ اُس کے نزدیک اخلاق کی تعلیم صرف وہی دیتا ہے جو کمزور ہو۔ یہ فقرہ بڑا دلچسپ ہے۔ لیکن یہ رجحان نطشہ میں اسی وقت پیدا ہوا جب حضرت عیسیٰؑ کی بھیڑیں کلیسا کی قنوطی تعلیم کی وجہ سے بے عمل، ناکارہ اور بزدل ہوچکی تھیں۔ نطشہ کے اس قول میں ایک حقیقت بھی ہے۔ اور اخلاق، پستی اور بدحالی کے دَور میں یقیناً کمزوری کی نشانی ہے۔ مثال کے طور پر کہیں تنہائی میں اگر خدانخواستہ حضرت ماہر (معذرت کے ساتھ) حضرت شبنم رومانی کو مار بیٹھیں اور بلاوجہ ہی مار بیٹھیں۔ تو لازمی طور پر شبنم کو غصّہ آئے گا۔ لیکن ماہر کے تن و توش کو دیکھتے ہوئے جب شبنم جرأتِ مقابلہ نہ پائیں گے تو وہی غصّہ ایک انفعالی تشنج کے ساتھ اخلاقیات کا روپ اختیار کرلے گا اور لازمی طور پر شبنم۔ ماہر کو درسِ اخلاق دینا شروع کر دیں گے۔ اُن کے الفاظ کم و بیش یہی ہوں گے:۔

"واللہ ماہر صاحب! کچھ تو اخلاق سے کام لیجئے۔ آخر میں نے کیا ہی کیا ہے۔ جو آپ بگڑ بیٹھے"

اگر ماہر کی جگہ مجید لاہوری ہوں تو شبنم کے الفاظ اور بدل جائیں گے اور نرمی اختیار کرلیں گے۔ اور اُن میں اور زیادہ حسنِ اخلاق کا مظاہرہ ہوگا۔ مثلاً:۔

"حضور! میں نے تو کوئی بد اخلاقی نہ کی تھی۔ خدا جانے آپ کو کونسی بات بُری لگی۔ واللہ میں معافی چاہتا ہوں"

اور علیٰ ہذالقیاس۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کمزوری کا احساس جتنا زیادہ ہوگا اُتنا ہی زیادہ اخلاقیات میں انفعالی رنگ پیدا ہوتا جاتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر احساسِ کمتری اس قسم کے اخلاق کا اصل محرّک ہے!

قدیم غزل کے ماحول کو دیکھا جائے تو جاگیرداری اور استبداد، عناد اور دشمنی اور پھر طاقت اور کمزوری اس بات کے مظہر ہیں کہ درسِ اخلاق دراصل کمزوری کی دلیل اور بے بسی کی آئینہ داری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ وہ یکسر فراری اور قنوطی ہے۔ اس میں اس قسم کا درسِ اخلاق شامل نہیں جیسا اقبال نے پیش کیا ہے ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم

رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

ضرورت ہے کہ اقبال کی طرح غزل میں اخلاق کی اعلیٰ ترین رجائی قدروں کو اجاگر کیا جائے اور دیانت، اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کی وہ مشعلیں روشن کی جائیں۔ جن میں تیزی اور تندی کے ساتھ بیباکی بھی ہو جس میں "چھٹے نغمہ خواں" ہی نہیں بلکہ وقت کے تقاضے کے مطابق "سیلِ تند رو" بننے کا درس بھی ہو۔ روشِ گوسفندانہ کو نظر انداز کر کے بشری کی صفات پیدا کی جائیں اور ایک تھپڑ کھا کر دوسرا گال پیش کرنے کی جگہ تھپڑ مارنے کی تلقین ہو۔ تاکہ فرد قوم ہی نہیں، بلکہ انسانیت بھی باوجود کمزوریوں کے درندگی سے دست و گریباں ہونے کی قوت پا سکے!

کمزوروں کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ تاکہ صاحبِ قوت کا نشۂ قوت ہرن ہو سکے۔ مجھے یاد آیا۔ امن عالم کے تحفظ کے سلسلہ میں ٹیگور نے لیگ آف نیشنس کو ایک تار کے ذریعہ صرف یہی پیغام تو دیا تھا:۔

THE STRONG MUST SIEZE THEIR GREED AND THE WEAK MUST LEARN TO BE BOLD.

میرے خیال میں درسِ اخلاق کے اسی نظریہ کو اگر غزل میں اپنایا جائے تو بہت سے مسائل کا حل پیش کیا جا سکتا ہے۔

فلسفۂ اخلاق کے ساتھ اگر آپ غور کریں تو یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہماری غزل میں مذہب کی صحیح ترجمانی کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس سلسلہ میں بھی صرف اقبال کا نام ذہن میں آتا ہے۔ مثلاً ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

اور اسی قسم کے بے شمار اشعار جن کی اساس مثنوی مولانا روم کی طرح قرآن پاک پر رکھی گئی ہے۔ یاد رکھیے غزل ترجمانِ انسانیت ہے اور مذہب انسانیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ اگر مذہب کو اور اس کے اصولوں کو اعلیٰ ترین قدر سمجھ کر غزل کی بنیادیں استوار کی جائیں۔ تو خواہ مذہب کا نام لیا جائے یا نہیں۔ مسائلِ حیات کی بہت سی گتھیاں مزید سلجھائی جا سکتی ہیں۔ اسی طرح غزل کی مروجہ تلمیحات کے علاوہ سیرۃ و تاریخ کی تلمیحات کے اضافہ کی ضرورت ہے۔ تاکہ وسعتِ خیال اشارات میں سموئی جا سکے!

قدیم غزل میں سیاست کا بھی فقدان ہے۔ سوائے سودا، مصحفی اور نظیر کی ہجویات کے اردو غزل میں اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ انہوں نے البتہ نالائق حکام اور بد دیانت امراء پر تنقید کی ہے۔ لیکن وہ بھی نظموں میں اور بہت کم۔ رہی غزل تو اس میں اس کا قطعی فقدان ہے۔ سوائے چند ایک اشعار کے جیسا میر کا شعر ہے۔ جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ غلام قادر روہیلہ نے شاہ عالم کی آنکھوں میں سلائیاں پھروائی تھیں ؎

شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
انھی کی آنکھوں میں پھرتے سلائیاں دیکھیں

بہرحال آج کی سیاست افراد کو نہیں بلکہ انسانیت کو بھی اندھا کر سکتی ہے۔ غزل میں سیاسیات کو جگہ دینی ضروری ہے تمسخر اور ہزل کے انداز پر نہیں بلکہ اشاریت کی آڑ لے کر خوش سلیقگی سے۔ مثال کے لئے جگر کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

جہلِ خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

اسی سیاست سے متعلق حب الوطنی اور مذہب ہیں۔ مذہب کا ذکر آ چکا۔ لیکن ویسے وطنیت پر بھی قدیم غزل میں شاذ ہی زور

دبا گیا ہے۔ مجموعی شاعری میں بھی اگر کچھ ہے تو وہ نہیں کے برابر ہے۔ میر۔ سودا۔ فائز۔ جعفر زٹلی۔ وغیرہ کے عبرت نامے اور شہر آشوب اس کی مثالیں ہیں۔ دورِ جدید میں حالی۔ آزاد۔ اسمٰعیل میرٹھی اور اقبال وغیرہ نے اس کی طرف توجہ دی۔ اور غزل میں بھی اس کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ لیکن بقدرِ ضرورت پھر بھی نہیں۔ اس قسم کی شاعری فی الحقیقت ۱۸۵۷ء سے شروع ہوئی اور اس کا آغاز حالی اور آزاد نے کیا۔ سرور، چکبست وغیرہ کی نظمیں، پھولوں کا کنج، شمع انجمن، سرزمینِ وطن۔ خاکِ ہند وغیرہ منظرِ عام پر آئیں۔ خود حالی نے بھی کوشش کی ہے

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

حالی نے کسی حد تک شاعرانہ انداز سے ہٹ کر سیدھی سادی بات پیش کر دی ہے۔ لیکن اگر انہی مضامین کو ایسے شعراء جن میں وہی صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، پیش کریں اور خصوصیت کے ساتھ غزل کے اختصار میں ان حقائق کو مدِنظر رکھیں تو جذب و اثر کے اعتبار سے غزل میں تحریکی قوتیں ہمہ گیری اختیار کر سکتی ہیں۔ اور اُن کی افادیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اور ایک مختصر شعر مستقل نظموں سے کہیں زیادہ پُر اثر ہو سکتا ہے۔

اسی طرح مسئلہ تعلیم ایک ایسا مسئلہ ہے۔ جس پر قوموں کی زندگی کا مدار ہے۔ اس پر بھی اُردو غزل نے کبھی توجہ نہیں دی۔ قدیم مکاتب و ملا پر دو ایک ہجو ملتی ہیں۔ لیکن غزل میں اس کا ذکر ہی نہیں۔ دورِ حاضر کی غزل بھی اس سے قطعاً عاری ہے۔ اقبال نے اس پر قلم اُٹھایا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ اب قریب قریب رُک گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ غزل میں مسئلہ تعلیم کو بھی داخل کیا جائے۔ اسی طرح دورِ حاضر کے انفرادی رجحانات میں نفسیات کی اہمیت کو بھی غزل میں پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

غزل کے تحفظ اور بقا کے لئے لازمی ہے کہ اُسے زندگی سے زیادہ سے زیادہ قریب تر لایا جائے اور اس کا صرف یہی طریقہ ہے کہ مسائلِ حیات کو غزل میں نمایاں حیثیت حاصل ہو!

غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ غزل کی سب سے بڑی بے اعتدالی کیا ہے۔ اور اگر آپ مختصر الفاظ میں سننا پسند کریں تو ساری بحث کا خلاصہ یہ ہو گا کہ "غزل برائے غزل" کے دن گئے۔ اب "غزل برائے زندگی" کا دور ہے۔ وہی زندگی جس میں نشیب بھی ہیں فراز بھی۔ اور آہیں بھی ہیں قہقہے بھی —!

ماہرالقادری

طرحِ نو

جدید غزل

شرم و غیرت ہے آبروئے جمال
اے مرے شاہدِ پری تمثال

سر سے آنچل ڈھلک گئے تو کیا
تو مگر دامنِ نظر کو سنبھال

میری دُنیا میں ہے رمِ آہو
تیری دُنیا ہے صرف چشمِ غزال

ذرّے تاروں کو چھو کے لوٹ آئے
پستیوں کو ابھی کچھ اور اُچھال

کتنے عارض شراب سے گل رنگ
کتنے چہروں پہ صرف گردِ ملال

اُس کی باتیں چٹک شگوفوں کی
اُس کی رفتار یا نسیمِ شمال

مہر بر لب غریب ہیں لیکن
ہر نظر میں ہزار دستِ سوال

زندگی صرف ہے عمل ہی عمل
واعظِ خوش بیاں ہے قال ہی قال

کب کے دار و رسن سے کھیل چکے
اس زمانے کے صاحبانِ حال

قصرِ ایواں کی ہل گئی ہے بِنا
جب فقیروں کو آگیا ہے جلال

رقص و نغمہ، شراب و عیش و نشاط
ان دریچوں سے جھانکتا ہے زوال

آفتاب احمد جوہر بدایونی
ڈسٹرکٹ جج بستی آگرہ

نقش ہائے رنگ رنگ

ہر تیر بے خطا ہے، ہر وار کارگر ہے
صدقے تری نظر کے، آخر تری نظر ہے

اے طالبِ تجلّی، یہ بھی تجھے خبر ہے
یاں حاصلِ تماشہ محرومیٔ نظر ہے

یہ سود وہ زیاں ہے، یہ خیر ہے وہ شر ہے
اہلِ جنوں کی دُنیا اس سے بلند تر ہے

غمِ حیات سے چھوٹے، تو اک نیا غم ہے
کہ ایک ذرۂ پشیماں شریکِ ماتم ہے

مجھے معاف کریں جلوہ ہائے حُسنِ مجاز
مرے جنوں کو ذرا، فرصتِ نظر کم ہے

طلوعِ مہر ہو، پھر دیکھنا کمالِ عروج
ابھی تو قطرۂ شبنم کی آبرو کم ہے

جنوں کو زلفِ پریشاں پہ دسترس نہ سہی
مگر یہ نسبتِ آشفتگی ہی کیا کم ہے

حاصل جسے ذوقِ غمِ پنہاں نہیں ہوتا
ہو جائے فرشتہ، مگر انساں نہیں ہوتا

اس طرح سے حالِ غمِ دل پوچھ رہے ہیں
جیسے مرے چہرے سے نمایاں نہیں ہوتا

اب دادِ طلب دے کہ نہ دے یہ تری مرضی
میں غیر کا شرمندۂ احساں نہیں ہوتا

وہ ہیں کہ عطا پر بھی جھکی رہتی ہیں نظریں
دل ہے کہ خطا پر بھی پشیماں نہیں ہوتا

مجنوں ہو کہ فرہاد ہو، جوہرؔ ہو کہ منصور
بے فیضِ جنوں کارِ نمایاں نہیں ہوتا

روحِ انتخاب

"ہم اس ملک میں بننے والے دستور کے متعلق یہ چاہتے ہیں کہ وہ سنو فیصدی اسلام کا رنگ لئے ہوئے ہو۔ ہم اس ملک میں قائم ہونے والے نظامِ تعلیم کو چاہتے ہیں کہ وہ خالصاً اور کلیتہً کتاب و سنت کی اساس پر ہو۔ ہم اس ملک کے معاشی نظام کو بھی خالص اسلامی اصولوں پر مبنی دیکھنا چاہتے ہیں۔ الغرض ہماری تمنا اور کوشش یہ ہے کہ اس ملک کی زندگی کے ہر گوشہ پر اللہ کا رنگ چڑھ جائے اور کوئی کونا اور گوشہ بھی صبغۃ اللہ کی تنویر سے محروم نہ رہے۔ جب تک ایک نقطہ کے برابر بھی کسی گوشہ میں ایسی جگہ باقی رہیگی جس پر اسلام کا چھاپ ہوگا۔ اسوقت تک ہم سمجھیں گے کہ ابھی ہمارا کام ختم نہیں ہوا اور ہم برابر اپنی کوشش جاری رکھیں گے تاآنکہ اللہ تعالیٰ ہماری زندگی کے ہر گوشہ پر اپنے دین کو قائم فرمادے۔

اس ملک کے دستور کے ذریعہ ہماری انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کو خدا کے قانون کے تابع کیا جائے اور عیسائیوں اور ہندوؤں کے جاہلی تصورات سے اسکو بالکل پاک رکھا جائے اگرچہ ان الفاظ سے میرا مدعا واضح ہے لیکن میں اس کو مزید واضح کرنے کیلئے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ہم صرف یہ نہیں چاہتے کہ اس ملک میں شیخ الاسلامی کا کوئی منصب قائم کر دیا جائے یا کچھ علماء کو اوقاف و مساجد کی تولیت سپرد کردی جائے یا مسلمانوں کے طلاق و نکاح کے مسائل کو طے کرنے کیلئے کچھ قاضی مقرر کر دیئے جائیں۔ اس طرح کی باتیں جو لوگ سوچتے ہیں یا جو اُن کو اسلامی حکومت کی اصلی خصوصیات سمجھتے ہیں وہ ہمارے نزدیک نہایت ہی احمق قسم کے لوگ ہیں اور جتنی ہی جلدی وہ اپنی اس حماقت کا علاج کرالیں اُتنا ہی اچھا ہے۔ ہم صرف مساجد اور قبرستانوں کی تولیت کیلئے جد و جہد نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ہم اس خداداد مملکت کے چپہ چپہ پر اللہ کے دین کو قائم و جاری کرنے کے لئے جد و جہد کر رہے ہیں۔

اس اصولی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے میں اس ملک کے لیڈروں کو آگاہ کرتا ہوں کہ وہ ہمارے سابق انگریز آقاؤں کی طرح ہمارے لئے صرف مسجد کے اندر نماز اور اذان کی آزادی محفوظ کرنے کی فکر نہ فرمائیں بلکہ ایک ایسا دستور بنائیں جو انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور انسانوں کے بنائے ہوئے جابرانہ قوانین کی ہر تعدی سے محفوظ کرتا ہو۔ ایک اسلامی دستور کی ضروری خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے اندر ایگزیکٹیو کی ساری مطلق العنانیوں کا پوری طرح سدباب کر دیا جائے۔ عام رعایا جس قانون کی تابع ہو ایگزیکٹیو کے ارکان بھی اُسی قانون کے تابع ہوں۔ جس طرح عام رعایا کو اُن کی بدکاریوں پر عام عدالتوں میں مقدمہ چلا کر سزا دلائی جا سکتی ہے اسی طرح ایگزیکٹیو (Executive) کے بڑے سے بڑے ارکان کو بھی ان کی بدکرداریوں پر عام عدالتوں میں عام قانون کے تحت مقدمہ چلا کر سزا دلائی جا سکتی ہو۔ اسلامی شریعت میں ایگزیکٹیو کا منصب صرف خدا کی شریعت کی تنفیذ اور اس کا اجراء ہے ان کو ہرگز یہ حق نہیں ہے کہ وہ خدا کی شریعت میں کوئی تغیر کر سکیں!

اگر آپ نے اپنے دستور کے اندر کوئی ایسا خلا چھوڑا جو آپ کے ایگزیکٹیو کے ارکان کو اس بات کا موقع دیتا ہو کہ وہ کسی پہلو سے اپنے آپ کو عام قانون سے بالاتر بنا سکیں تو آپ اس ملک میں قیصر و کسریٰ کا نظام ہی لائیں گے۔ وہ نہیں لائیں گے جو حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت کا اظہار خود حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس طرح فرما دیا تھا۔ "کہ میں تمہارے اندر خدا کی شریعت کا جاری کرنے والا ہوں اپنی طرف سے کوئی نئی بات کرنے والا نہیں ہوں اور اگر میں اس شریعت سے سر مو انحراف کروں تو تم مجھے ٹھیک کر دینا۔"

(مولانا امین احسن اصلاحی — تقریر ۱۱- نومبر ۱۹۵۱ء بمقام کراچی)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

وہ جو غالب نے کہا تھا کہ "اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے"۔ تو مسٹر شہید سہروردی کا بھی شاید اسی "وحدت الوجود" کے شجرۂ عالیہ سے تعلق معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام اصطلاحوں کا "مادّہ" (ROOT) ایک ہے! ہاں! تو انہی مسٹر شہید سہروردی (بجمیع القابہم) نے اس دعوے کیساتھ قلمدانِ وزارت کو ہاتھ لگایا تھا کہ پاکستان میں جمہوریت کو بحال کر کے رہوں گا اور اُن کے وزیر ہونے کے بعد پاکستان میں جس شان و اہتمام اور تزک و احتشام کیساتھ جمہوریت بحال ہوئی ہے اس کی شہادت گورنر جنرل بہادر کے وہ آرڈی ننس دیں گے جنہوں نے نجانے کتنے درجن "قوانین" کی ایک سانس میں منظوری دے دی ہے۔ "عوامی لیگ کی جے"، "سہروردی زندہ باد!" اور جمہوریت ——! خدا کیلئے اس کا نام نہ لیجئے۔ بس اسی میں خیریت ہے۔ یہ آرڈی ننسوں کا دور ہے۔ یہاں "فرمانِ واجب الاذعان" کی راجدھانی ہے۔ نطقِ ہمایونی نے جو ارشاد فرمادیا بس وہی سب کچھ ہے!

سہروردی صاحب کو جانے دیجئے وہ تو مسلم لیگ کے ساختہ پرداختہ ہیں مگر ان ڈاکٹر خانصاحب کو کیا ہو گیا ہے کہ کانگریس کے جھنڈے تلے ایک زمانے میں جمہوریت اور آزادی کیلئے برطانیہ سے جنگ لڑ چکے ہیں مگر جب سے پاکستانی حکومت کے وزیر ہوئے ہیں، موقت سے "عزت مآب" کا رنگ ہی بدل گیا ہے۔ مزاج و فکر کے اس انقلاب کو "کایا کلپ" کہیں یا "کایا پلٹ"!

"اپوا" کی لیڈرانیاں ناراض ہیں۔ خفا ہیں۔ غضبناک ہیں کہ مسٹر محمد علی وزیر اعظم نے دوسری شادی کیوں رچائی؟ وزیر اعظم کی "دوسری بیوی" سعدیہ عالیہ کا انہوں نے بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ مگر تماشائی عرض کرتا ہے کہ بیچاری عالیہ کو پردیسی، غریب اور مجبور جان کر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے —— بیگم رعنا لیاقت علی خان کے خلاف یہ محاذ کیوں قائم نہیں کیا گیا۔ بلکہ انھیں تو "اپوا" نے اپنا سرپرست بنایا ہے اور مسٹر لیاقت علی مرحوم کی اُن "دوسری بیوی" کے سایہ میں "اپوا" کا پودا پروان چڑھا ہے۔ "اپوا" کی یہ دورنگی پالیسی کیوں؟

"آپ کے یہاں بدنظمی، افراتفری اور بے آئینی کی حد ہو گئی"۔ —— کراچی کارپوریشن کے ایک کونسلر سے ایک دردمند شہری نے کہا۔ "الناس علیٰ دینِ ملوکہم"۔ اس عربی ضرب المثل کا مفہوم کسی عربی داں سے پہلے پوچھ آیئے۔ پھر ہم پر اعتراض کیجئے"۔ کونسلر نے سگریٹ میں کش لگاتے ہوئے جواب دیا!

فانی بدایونی کہاں کے رہنے والے تھے —— غالب کا دیوان بیدل کہاں ملتا ہے —— گاندھی جی تھے تو بڑے نیک دل آدمی مگر غضب خدا کا اپنے روپے کی کبھی زکوٰۃ نہیں نکالی —— ڈاکٹر اقبال نے ولایت جا کر کئی سال ڈاکٹری پڑھی مگر قوم کی خاطر ایک دن کیلئے بھی ڈاکٹری نہیں کی —— یار! اس ڈاروِن کا تخلّص کیا تھا؟ —— شیخ سعدی نے رقعاتِ عالمگیری میں لکھا ہے کہ .... ! اگر نمازِ جنازہ میں سجدہ کرتے ہوئے ماتھے میں کنکریاں چبھ جائیں اور خون نکل آئے تو کیا وضو جاتا رہے گا؟

ہماری نظر میں

بیان القرآن "بیان القرآن" (جلد دوم) از - مولانا اشرف علی تھانوی۔ ضخامت ۱۱۹ صفحات - ملنے کا پتہ - تاج کمپنی - کراچی -

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف "بیان القرآن" کی دوسری جلد تاج کمپنی نے بڑے اہتمام سے دیدہ زیب بلاک پر چھاپی ہے۔ عربی اور اردو خط اس قدر پاکیزہ ہے کہ سچ مچ جنت نگاہ! پھر کاغذ، طباعت اور جلد کی خوبی اور نفاست نورٌ علیٰ نور!

"بیان القرآن" اردو کی نہایت ممتاز تفسیر ہے اور حضرت مولانا تھانوی کا بہت بڑا علمی اور دینی کارنامہ ہے۔ اپنی شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے یہ تفسیر کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

(صفحہ ۱۴۸) .... ویزکیھم ..... (ترجمہ) اور ان لوگوں کی صفائی کرتے رہتے ہیں"۔ یہاں "صفائی کرنا" اردو محاورے کے اعتبار سے کھٹک پیدا کرتا ہے۔ "زندگیوں کو سنوارتے رہتے ہیں"۔ یا اسی قبیل کا ترجمہ اچھا ہوتا۔

(صفحہ ۱۴۹) "اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا" (ترجمہ) اور جب تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دو حصے تم جیت چکے تھے ......" اس کے مقابلہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ قابلِ ملاحظہ ہے۔ "حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف) پر پڑ چکی ہے"۔ حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی "مصیبت" کا ترجمہ "ہار" نہیں "تکلیف" کیا ہے۔

(صفحہ ۱۴۹) "وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا" (ترجمہ) اور اُن سے یوں کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں لڑنا یا دشمنوں کا دفعیہ بن جانا"۔ "دشمنوں کا دفعیہ بن جانا" محلِ غور ہے۔ "تفہیم القرآن" میں اس آیت کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔ "اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا (کم از کم اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو"۔

(صفحہ ۱۵۶) "فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" (ترجمہ) "تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہے"۔ "عزم الامور" کا ترجمہ "تاکیدی احکام"۔ درست نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند نے "ہمت کا کام" اور مودودی صاحب نے "بڑے حوصلے کا کام" اس کا ترجمہ کیا ہے اور اسی کا یہاں محل ہے۔

(صفحہ ۱۸۶) "وَقُلْ لَّهُمْ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًاۢ بَلِيْغًا" (ترجمہ) اور اُن سے خاص اُن کی ذات کے متعلق کافی مضمون کہہ دیجئے"۔ "قولاً بلیغاً" کا ترجمہ "کافی مضمون" کمزور ترجمہ ہے۔

حضرت مولانا تھانوی کی تحریروں میں دو رنگ پائے جاتے ہیں، انتہائی سلیس و سادہ اور ادق و مشکل! یہی دونوں رنگ "بیان القرآن" میں بھی جھلکتے ہیں۔ تفسیر میں سلاست و سادگی کے ساتھ یہ انداز بھی ملتا ہے۔

(صفحہ ۱۹۵) "........ دُوسروں کا صدق لوازمِ کلام سے نہیں کہ عقلاً انفکاک ممتنع ہو اور کلام اللہ ہیں لوازم سے ہے کہ انفکاک ممتنع ہے گو یہ لازم بوجہ اس کے کہ خود بلمزوم مقدور ہے داخل تحت القدرت ہو اور اس کی مقدوریت سے اس کی ضد کی مقدوریت بھی ضرور ہے ...." اس عبارت میں عوام کے پلّے کیا پڑے گا ؟

انسانوں کے کام میں تھوڑا بہت جھول رہ ہی جاتا ہے۔ مجموعی طور پر "بیان القرآن" کی افادیت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ تاج کمپنی اس تفسیر کو چھاپ کر دین کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہی ہے !

اعجاز القرآن

"نمونہ اعجاز القرآن فی تجوید القرآن"۔ مرتبہ :۔ قاری سید محمد عنایت علی۔ ضخامت سولہ صفحات ملنے کا پتہ :۔ مسجد طٰہٰ موسیٰ جی۔ اسٹریٹ رام سوامی کوارٹرز کراچی (۳)

"دُنیا کا ہر انسان اس بات کو بخوبی جانتا اور سمجھتا ہے کہ دُنیا میں جتنی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں اگر اُن میں صحتِ لفظ اور اس کی ادائیگی کا کوئی صحیح معیار مقرر نہ ہو تو اس کے بولنے والے نہ خود لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ دُوسروں پر اچھے اثرات مرتب کر سکتے ہیں بالکل یہی صورت قرآن حکیم کے صحیح یا تجوید پڑھنے کی ہے۔ اگر آپ نے قرآن حکیم کے حروف کو اُن کے مخارج سے ادا نہ کیا۔ اُن کی صفات کی ادائیگی میں کوتاہی برتی اور معروف و مجہول کے امتیاز کو بھی نظر انداز کر دیا۔ تو یقیناً آپ نے کتاب اللہ کی تلاوت کا پُورا پُورا حق ادا نہیں کیا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کی عبادت جیسی ہونی چاہیے ویسی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ بعض اوقات قرآن حکیم کو با تجوید اور صحیح تلفظ کے ساتھ تلاوت نہ کرنے سے معنیٰ میں فرق پڑ کر ایمان کے بھی خطرے میں پڑ جانے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے بچنا ہر مسلمان کے لئے بے حد ضروری ہے۔ ....."

اس کتابچہ کا اس مفید عبارت سے آغاز ہوتا ہے۔ اور اس میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔ کوئی شک نہیں کہ ہم مسلمانوں کی اکثریت چونکہ تجوید و ترتیل سے ناواقف ہے۔ اس لئے تلاوتِ قرآن میں نہ جانے کیسی کیسی غلطیاں ہوتی ہوں گی !

ہمارے سامنے "اعجاز القرآن" کا ایک نمونہ ہے۔ جس میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کو تجوید کے اصول پر حرفاً حرفاً پیش کیا گیا ہے کہ ان حروف کو صحیح مخارج کے ساتھ تلاوت کس طرح کی جائے ؟ تجوید کی اصطلاحیں بھی درمیان میں آ گئی ہیں !

تجوید کے لئے زبانی تعلیم لازمی اور ضروری ہے۔ معلّم کے بغیر محض کتاب کی مدد سے فنِ تجوید نہیں سیکھا جا سکتا۔ کہ اس فن کا دار و مدار ہی "صوت" پر ہے۔ اور کتاب تو خاموش معلم ہے۔ مگر پھر بھی "اعجاز القرآن" پڑھ کر فن تجوید سے بیگانگی جاتی رہے گی۔ اور اس فن سے خاص مناسبت پیدا ہو جائے گی۔

مولوی قاری سید محمد عنایت علی صاحب میرٹھی نے جس ادارے (تبلیغ القرآن مع التجوید) کی بنا ڈالی ہے۔ وہ ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہے۔ اہلِ خیر تعاون فرمائیں گے تو یہ کام آگے بڑھے گا اور اس کے اچھے ثمرات ظاہر ہوں گے !

شعلۂ خیال

"شعلۂ خیال" - از:- نعیم صدیقی - ضخامت ۱۵۹ صفحات - مجلّد - قیمت تین روپے چار آنہ - ملنے کا پتہ - مکتبۂ چراغ راہ - لاہور -

"شعلۂ خیال" جناب نعیم صدیقی کے کلام کا مجموعہ ہے - جس کے شعروں میں گرمی ہی نہیں چمک بھی پائی جاتی ہے - "چمک" راہِ حق کے مسافروں کے لئے اور "گرمی" اُن کے لئے جو اس راہ میں چل تو چکے ہیں - مگر ابھی "گرم رَو" نہیں ہیں -

نعیم صدیقی اپنی ذات سے سچ مچ ایک انجمن واقع ہوئے ہیں - خطابت، تقریر، تحریر، افسانہ نگاری - تنقید - اور شعر گوئی - ان میں سے ہر منزل اُن کے اشہبِ فکر کی جولاں گاہ ہے - وہ جس راہ سے بھی نکل جاتے ہیں ۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی !

کا سماں بندھ جاتا ہے -

نعیم صدیقی کی شاعری سو فیصدی مقصدی شاعری ہے - وہ اپنا دل بہلانے اور لوگوں کو خوش کرکے اُن سے داد لینے کے لئے شعر نہیں کہتے - اُن کی شاعری اسلامی انقلاب کی نفیر ہے !

ان شعروں میں کتنی زندگی ہے :-

نمائشِ گل و لالہ پہ مر مٹی بلبل　　　　تھے وہ بھی جلوے جو محصورِ خار و خس میں رہے

کون اب اُس بُت کے آڑے آسکے گا شہر میں ؟　　　　اُونچے اُونچے پارسا دم بھر میں کافر ہو گئے

وفا کا رنگ تو کچا نہیں کہ اُڑ جائے　　　　حنا کا رنگ ہتھیلی سے اُڑ گیا ہوگا

چٹک رہی ہے کلی اک مرے قفس کے قریب　　　　جو زخم کھا کے مری طرح مسکرانے لگی

ہر اک سزا مجھے منظور ہے وفائی کی　　　　یہ راز کھول تو دو مسلکِ وفا کیا ہے ؟

کسی جفا سے مرا دل دہل نہیں سکتا　　　　کسی عطا سے طبیعت بہل نہیں سکتی

کل فروغِ آفتاب و ماہ و انجم کون تھا　　　　اب چراغِ گوشۂ تاریکِ زنداں کون ہے

خود قفس بھی جل اٹھا جس کے نفس کی آنچ سے　　　　بلبلو! یہ تو گرفتارِ غزل خواں کون ہے

گو موت کے گھاٹ اُتر گئے ہم　　　　پر عشق سا کام کر گئے ہم

جب مشعلِ تصورِ جاناں ہے میرے ساتھ　　　　تاریک جتنی ہو شبِ ہجراں ہوا کرے

کچھ اہتمامِ رونقِ میخانہ ہے ضرور !　　　　ٹھنڈی ہوا چلی تو ہے، بادل گھرے تو ہیں

ذکرِ حُسنِ یار پر دُنیا اُڑاتی ہے مذاق　　　　کیا زمانہ ہے کہ دل سینوں میں پتھر ہو گئے

ہر پھول کہ دیتا تھا طرب نقش ہے دل پر　　　　ہر خار کہ رکھتا تھا چبھن یاد رہے گا

جس جس نے کیا عشق نہ تھی خیر پھر اُس کی　　　　یہ معرکۂ دار و رسن یاد رہے گا

کبھی یہ شان کہ ٹھکرا دیا سفینوں کو　　　　کبھی یہ حال کہ تنکوں کے بھی سہارے لئے

ہمارے اشکِ ندامت کو چومنے کیلئے　　　　فلک سے چاند ستارے اُتر کے آئے ہیں

فسانہ حُسن کا بس اک نگاہ کی گردش　　　　حدیثِ عشق فقط ایک دل کی دھڑکن ہے

جو کل تھے کوچوان وہ اب شہریار ہیں　　　　اور قوم اقتدار کے رتھ میں جُتی رہی

آیا تو ہے مگر یہ ادھورا ہے انقلاب ـــــ انسان کی خودی تو دبی کی دبی رہی
دریا کے موتیوں کا بگاڑے گی موج کیا ـــــ کتنی ہی تند حرکتِ طوفاں ہوا کرے
عاشقی کو مصلحت سے بیر ہے ـــــ چپ رہو یا رو! اسی میں خیر ہے
کبھی خورشید کی مشعل تو جھلکی اُنکی پیشانی ـــــ ستاروں نے دیئے اپنے جلائے تو وہ یاد آئے
سمندر پُرسکوں جب تک رہا بھولے رہے اُن کو ـــــ فضا جب تند گردابوں میں آئے تو وہ یاد آئے
وفا کے سنگین مرحلوں میں کبھی جو تھکتے ہیں ہارتے ہیں
تو رازداری کے خاص لہجے میں نام تیرا پکارتے ہیں

دوسرا رُخ:-

جہاں پہ یاس کی بجلی تباہی لاتی ہے ـــــ وہیں سے ایک نئی کونپل نکال لیتی ہے آس (صفحہ ۳۶)
شعر میں بہت زیادہ آورد و تکلّف پایا جاتا ہے۔

ہو ستم کچھ تو صبر سے سہ جا ـــــ اے دل! اُن کے کرم کو بھول نہیں (صفحہ ۶۰)
"ہو ستم کچھ" وجدان کو بھلا نہیں لگتا۔ مصرعہ اولیٰ ہی سرے سے بدل دینے کے قابل ہے۔

اسلام سے "امنِ عامہ" میں ـــــ آتا ہے خلل تو یوں ہی سہی (صفحہ ۸۸)
"امنِ عامہ" نے مصرعہ کی شعریت کو غارت کر دیا۔

تمہارے ذہن تو کچھ اور ہی افکار رکھتے ہیں ـــــ تمہاری صورتوں سے دوسری سیرت ٹپکتی ہے (صفحہ ۹۸)
"دوسری سیرت ٹپکتی ہے"۔ یہ اندازِ بیان نامانوس اور غیر شاعرانہ ہے!

حاصل یہی ہوا ہے کہ آقا بدل گئے ـــــ آزادئ عوام نصیبوں جلی رہی (صفحہ ۱۱۱)
"نصیبوں جلی" اگر روزمرہ ہے تو پھر یہ عورتوں کی زبان ہے۔

"یقین جانو کہ عین اُس میں دبے پڑے ہیں شرار اب بھی!" (صفحہ ۱۱۴)
"عین" یہاں کس قدر بے جوڑ لگتا ہے۔

"گئے تھے روزوں کو بخشوانے نمازیں اور اُلٹا سر پڑی ہیں"۔ (صفحہ ۱۱۵)
ضرب المثل یوں ہے۔ "نمازیں بخشوانے گئے روزے گلے پڑ گئے"۔

جو بیج بوئے تھے ماضی کے کشت کاروں نے ـــــ وہ مر گئے تو نہیں ہیں جناب! اُبھریں گے
دوسرا مصرعہ کتنا پھس پھسا اور بے مزہ ہے۔ حالانکہ اسی نظم کا یہ شعر کتنا شگفتہ ہے ؎
یہ وادیاں جنہیں بنجر بنا دیا تم نے ـــــ انہی میں سرو و سمن و گلاب اُبھریں گے

کلیوں کے گال فسردہ دکھائی دیتے ہیں ـــــ فضا نے چوس لیا اُبتہاج کیا کہیے! (صفحہ ۱۴۳)
مصرعہ ثانی غیر شاعرانہ ہے۔

اُس نورِ زماں کا ذکر چھیڑے اس روحِ مکاں کی بات کریں ـــــ کیا اور جہاں میں رکھا ہے؟ اُس جانِ جہاں کی بات کریں (صفحہ ۱۴۴)
مصرعہ ثانی کس قدر جاندار ہے۔ مگر مصرعہ اولیٰ میں "نورِ زماں" اور "روحِ مکاں" جیسی نامانوس ترکیبوں نے بات بگاڑ دی۔

ابھی بیٹھے وہ جھکے جھکے، ابھی ہیں وہ کھچے کھچے
یہ میٹھا میٹھا لمبا ابتلا ہے اور کچھ نہیں (صفحہ ۱۴۷)

"ابتلا" کو "میٹھا میٹھا" کہنا جدت ہے مگر ناروا!

کہاں کا دردِ عاشقی! نہ دل رہا نہ قدرِ دل
کہیں سے کوئی ڈنک کھا لیا ہے اور کچھ نہیں (صفحہ ۱۴۶)

"ڈنک کھانا" عجیب اندازِ بیان ہے!

کئی جگہ "آہ اٹھانا" اور "نالے اٹھانا" نظم کیا ہے اور "جانِ من" کی جگہ "جانم" باندھا ہے۔ جو سامعہ کے لئے اجنبی سا ہے!

ہر ذرہ ہے "انا ولاغیری" کا مدعی
مٹی بھی کیا بہک گئی پی کر مئے حیات (صفحہ ۲)

تقطیع میں "ولغیری" آتا ہے۔ پڑھنے میں "لا" کے الف کا اظہار (اشباع) ضروری تھا۔

زمام جن کی ابھی عقل کی گرفت میں ہے
وہ لوگ عشق لگانے ہی! احتیاط کریں (صفحہ ۱۵۸)

"عشق لگانا" پہلی بار سُنا اور دیکھا "عشق کرنا" روزمرہ ہے۔ مزاح میں "عشق لڑانا" البتہ بولتے ہیں۔

اس نظم میں کتنی قوت، جوش، ولولہ اور زندگی ہے ؎

رواں ہے اک کاروانِ تقویٰ
کہ جس کی گرد و غبار ہوں میں

ہزاروں عزت مآب راہی
کہ جن کا اب راز دار ہوں میں

نہ جانے کیا کیا وہ قوتیں ہیں
جو مجھ مسافر کی ہم سفر ہیں

میں ایسی راہوں پہ بڑھ رہا ہوں
کہ ہم رکاب انجم و قمر ہیں

میں ایسی راہوں پہ بڑھ رہا ہوں
خدا کی آیات راہ بر ہیں

میں دیکھتا ہوں کہ میرے پیچھے
مجاہدوں کا ہجوم اٹھا

یہ حق بیں یادگار منظر
فلک نے دیکھا تو جھوم اٹھا

قید خانہ میں نعیم صدیقی نے جو غزلیں کہی ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اثر انگیز ہیں بلکہ حوصلہ افزا ہیں۔ قفس میں پہنچکر تو وہ بلبلِ ہزار داستان" ہو گئے۔ ان کے زمانۂ اسیری کی غزلیں پڑھ کر کیا عجب ہے کہ کسی آزاد کا "زندانی" بننے کو جی چاہنے لگے!

"اقرارِ جرم" جتنی اچھی نظم ہے۔ اتنی ہی "کالی بھاؤں" بے جوڑ سی ہے۔ یہ اندازِ بیان تو نام نہاد "ترقی پسندوں" ہی کو بس زیب دیتا ہے!

نعیم صدیقی بہت مصروف زندگی رکھتے ہیں۔ مصروفیات اور مشاغل کا ہجوم اُن کو ہر آن گھیرے رہتا ہے۔ اور شاعری کے لئے فرصت درکار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہی مشاغل میں وہ کچھ وقت جیسے تیسے نکال کر شعر کہتے ہیں۔ اُن کی مصروفیات اور شعر کہنے میں عجلت اُن کے کلام سے نمایاں ہوتی ہے۔ دوسری کمی یہ ہے کہ انھیں غالباً شعر و سخن کے مذاکرے اور شاعرانہ محفلوں بھی میسّر نہیں آتا۔ اس لئے وہ چیز جسے حافظ شیرازی نے "آنے دارد" کہا ہے، نعیم کے کلام میں کہیں آتی ہے، کہیں مشکل نہیں آتی اور کہیں آتے آتے رہ جاتی ہے!

ادب و انشاء اور خطابت و تقریر کے معاملہ میں جناب نعیم صدیقی چُن چُن کر اور چھانٹ چھانٹ کر موتی پروتے ہیں۔ شعر و سخن کی منزل میں وہ جہاں کبھی "خاطب دلیل" بن جاتے ہیں۔ اُن کے عقیدت مندوں کو دُکھ ہوتا ہے۔ مگر اس پر بھی

"شعلۂ خیال" کی گرمی اور تابندگی کو ہماری اس تنقید کے چھینٹے دبا نہیں سکتے!

میراں سید محمد مہدی اور اُن کی جماعت علماء کی نظر میں

"میراں سید محمد مہدی اور اُن کی جماعت علماء کی نظر میں"۔ مرتبہ۔ عبد العزیز جاگیوار
ضخامت بتیس صفحے (ٹائپ پر) قیمت آٹھ آنے۔
ملنے کا پتہ۔ ذکری (مہدوی) انجمن شہداد پور (سندھ)

اس کتابچہ میں حضرت سید محمد مہدی جون پوری رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کی جماعت کے بارے میں بعض اہلِ قلم کے مضامین اور تاریخی کتابوں کے اقتباسات درج کئے گئے ہیں۔ فاضل مُرتب نے مسٹر جی ایم سید، سید ہاشمی فرید آبادی اور شیخ محمد اکرام کو بھی "علماء" کے گروہ میں شامل کیا ہے۔ اُن کی اس فیاضی کی داد دینی چاہیئے!

سید محمد مہدی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ (پیدائش ۸۴۷ھ بمقام جونپور) وفات ۹۱۰ھ ہجری (بہ مقام فراہ افغانستان) ایک جلیل القدر عالم ہی نہیں صاحب عزیمت بزرگ بھی تھے۔ خانقاہوں کے جمود، شرک و بدعت اور فسق و فجور کے خلاف انہوں نے بڑی قوت کے ساتھ کھل کر صدائے احتجاج بلند کی۔ اُس دور میں مسلمان عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور بڑے بڑے مشائخ اور علماء طلبِ جاہ اور حُبِ دولت کے مرض میں مبتلا تھے۔ اسی لئے سید محمد مہدی صاحب جونپوری نے فقر و قناعت پر بہت زور دیا کہ دُنیا پرستی کا توڑ اسی طرح ممکن تھا۔

سید محمد مہدی علیہ الرحمہ کی دعوت نے ایک تحریک اور جماعت کی صورت اختیار کرلی۔ سید صاحب کا یہ فیض کرامت تھا کہ کتنے ہی بادشاہوں، امیروں اور عالموں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور یہ حلقہ خاصا وسیع ہو گیا۔ سید صاحب کے "دعوئ مہدئیت" کو بعض علماء نے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کی مخالفت کی۔ اس لئے "مہدوی جماعت" کو شدید مخالفت سے دوچار ہونا پڑا!

سید صاحب کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ چلتا رہا اور اس جماعت میں اچھے لوگ پیدا ہوتے رہے۔ حیرت ہے کہ جونپور جو سید محمد مہدی کا مولد و منشاء ہے وہاں مہدویوں کا نشان تک نہیں ملتا مگر گجرات، دکن اور میسور میں کئی لاکھ مہدوی آج بھی پائے جاتے ہیں!

اب مہدوی ایک مستقل فرقہ ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ جو کوئی سید محمد مہدی جون پوری کی مہدویت کو تسلیم نہیں کرتا وہ "کافر" ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ سید محمد مہدی نے عام جلسہ میں اس بات کا اعلان کیا کہ جو کوئی میرے دعوئ مہدویت کا منکر ہے وہ کافر ہے!

یہ امر مشتبہ ہے کہ حضرت سید محمد مہدی جون پوری نے واقعی ایسا اعلان کیا بھی تھا؟ ہمارے خیال میں سید محمد جونپوری نے ایسا مبالغہ آمیز اعلان نہیں کیا ہوگا۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخصیت کو چاہے وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو، یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ اُس کے نہ ماننے کی وجہ سے ایک مسلمان، ایمان و اسلام کے دائرے سے نکل کر کفر کی سرحد میں پہنچ جائے۔ یہ دعوئ سید محمد جونپوری کے معتقدین کا "اضافہ" معلوم ہوتا ہے اور اگر یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جائے کہ واقعی سید صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا تو اس کو "شطحیات" سمجھ کر نظر انداز کردینا چاہیئے!

دکن اور میسور میں جو مہدوی پائے جاتے ہیں۔ وہ عام مسلمانوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھتے، شادی بیاہ نہیں کرتے

اُن کے قبرستان علیحدہ ہیں۔ اور وہ ایک علیحدہ مستقل فرقہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو اپنے سوا دوسرے فرقوں کو عام طور پر "کافر" اور کم سے کم گمراہ سمجھتے ہیں۔ قاید ملت نواب بہادر یار جنگ مرحوم بھی نسباً مہدوی تھے۔ اُن کی ڈیوڑھی کا نام "مہدوی منزل" تھا۔ لیکن کتاب وسنت، اسلامی تاریخ کے مطالعہ اور مصر، عراق، حجاز و شام اور افغانستان و ہندوستان کے علماء سے تبادلۂ خیالات کے بعد انہوں نے مہدوی عقائد کو چھوڑ دیا۔ مرحوم عام مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھتے تھے۔ اپنی ڈیوڑھی (مہدوی منزل) کا نام بھی بدل کر "بیت الامت" کر دیا۔ اور میں نے نواب دوست محمد خاں صاحب جاگیردار (حیدر آباد دکن) کی ایک دعوت میں خود اُن کی زبان سے یہ الفاظ سُنے:۔

"مجھ میں اور مہدویوں میں یہ چیز وجہ اختلاف ہے کہ میں سیّد محمد جونپوری کے دعویٰ مہدویت کو جزوِ ایمان نہیں سمجھتا"

حیدر آباد دکن اور دوسرے خطوں سے جو مہدوی پاکستان میں آکر بس گئے ہیں۔ نہ جانے اُن کے وہی عقاید ہیں یا اُن میں ترمیم کرلی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُمتِ مُسلمہ کو گروہ بندی اور تحزب و پراگندگی سے محفوظ رکھے!

تمرین الصرف

"تمرین الصرف"۔ مؤلفہ:۔ مولانا معین اللہ ندوی۔ حجم ۱۲۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (بھارت)

"ہمارے یہاں عرصۂ دراز سے صرف ونحو کو زبان سے الگ کرکے پڑھایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شرح جامی اور شرح الفیہ تک پہنچ جانے والے اور ادھر شافیہ اور اُس کے شروح تک عبور کرلینے والے طلباء جو نحو و صرف کے دقائق اور باریکیاں جانتے ہیں۔ نہ صحیح لکھ سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں اور بعض اوقات عبارت تک غلط پڑھتے ہیں۔ یہ سب اس کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے پیراکی کا فن پانی سے باہر سیکھا ہے۔ جب اُن کو دریا میں گھسنے کا موقع ملتا ہے تو اصولِ شناوری جو انہوں نے نظری طور سے سیکھے تھے کچھ کام نہیں آتے.........."

یہ ہے مولانا سید ابوالحسن ندوی (متعنا اللہ بطول حیاتہ) کے پیش لفظ کا ایک اقتباس جو اس کتاب کی زینت ہے۔ مولانا محمد معین اللہ ندوی نے اس کتاب کو صیغوں اور مشقوں کے تنوع کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔ اور "فعل" کے بیان سے لے کر "افعال ثلاثی مزید فیہ" تک کے صرفی ابواب فصول اور گردان کو اس کتاب میں اس قدر سہل، دل نشین اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے کہ اگر عربی سے طبعی مناسبت ہو تو اُستاد کے بغیر بھی اس کتاب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا علی میاں مدظلہٗ کا یہ فرمانا:۔

"اگر اساتذہ اس کتاب کو دلچسپی، ہمدردی اور محنت سے پڑھائیں گے تو انشاء اللہ قدیم نصابی کتابوں سے کہیں زیادہ مفید پائیں گے"۔

"تمرین الصرف" کی افادیت کی سب سے بڑی تصدیق ہے۔

ختم نبوت

"ختم نبوت"۔ از:۔ مولانا محمد رفیق خاں صاحب (خطیب جامع کلاں پسرور) حجم ۷۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ شعیب بنس روڈ۔ کراچی۔

اس کتاب میں ایک دو نہیں چالیس حدیثیں ترجمہ کے ساتھ درج ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبوت و رسالت حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات گرامی پر ختم ہو گئی۔ اور اب قیامت تک کوئی نبی پیدا نہیں ہوگا۔ اور جو کوئی نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ وہ جھوٹا، مفتری اور بے دین سمجھا جائے گا۔ فاضل مؤلف نے احادیث کی تشریح عام فہم پیرایہ میں کی ہے!

طوفان

"طوفان"۔ از:۔ راجندر بہادر موج وکیل۔ ضخامت ۱۳۶ صفحات۔ قیمت مجلد دو روپے۔ سادہ ایک روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ رام کنور سکسینہ اینڈ سنس۔ تلیا لین۔ فتح گڑھ (یوپی)

جناب راجندر بہادر، موج (وکیل) کی غزلوں اور رباعیوں کا یہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ شاعر کے تخلص (موج) کی رعایت سے اُن کے دیوان کا نام (طوفان) بھی خوب ہے۔ موج صاحب خوش گو شاعر ہیں اور سیدھے سادے انداز میں اپنے جذبات کو نظم کر لیتے ہیں۔

موج صاحب کی تصویر کے نیچے خود اُنہی کا یہ شعر درج ہے ؎

وہ سینۂ پُر نور جو اس لَو سے ہے روشن
اک صبح درخشاں ہے جہاں شام نہیں ہے

اُن کا یہ رنگ خوب ہے:۔

دل کے شکستہ ساز کو جوڑ رہا ہوں تار میں
دے مجھے فرصتِ نظر دل کی طرف ابھی نہ دیکھ

وہ صبح ہوئی پیدا وہ موجِ نسیم آئی
آغوشِ محبت میں لی حُسن نے انگڑائی

غربت میں تصور کر بکھری ہوئی زلفوں کا
بھیگی ہوئی راتوں میں کر یاد یہ یاد آئی

تدبیر تو کرتا ہوں مگر خوف یہی ہے
تقدیر کہیں برسرِ پیکار نہ ہو جائے

دیوانے کی نزاکتِ احساس دیکھئے
پھولوں پہ چل رہا ہے مگر دیکھ بھال کے

پیار کے قابل نہیں تو ظلم کے قابل سہی
شکر یہ اس کا کہ سمجھا تو کسی قابل مجھے

حجابوں سے حقیقت کی درخشانی نہیں جاتی
کہ لَو فانوس کی اندر ہے تابانی نہیں جاتی

نگاہِ حُسن ہی کچھ کام کر جائے تو ممکن ہے
رفو کرنے سے ورنہ چاکِ دامانی نہیں جاتی

شمعِ ایماں ہی کی ہے کچھ روشنی
زندگی ورنہ اندھیری رات ہے

جہاں کارواں بھول جاتے ہیں رستہ
وہیں سے نکلتی ہیں منزل کی راہیں

اندھیرے راہِ غربت کے مجھے کیا آزمائیں گے
سرِ جادہ بچھا دی جائیں گی تاروں کی تنویریں

دُوسرا رُخ:۔

جب سے وہ نظریں مرے دل کی نگہباں ہو گئیں
یاس کی گھٹیاں مجھے گلشن بداماں ہو گئیں! (صفحہ ۸۳)

سپاٹ اور بے مزہ سا شعر ہے! یاس کی گھڑیوں کا "گلشن بداماں ہونا" بھی ایک تکلف آمیز اندازِ بیان ہے۔

رفتہ رفتہ کھنچ کے اک نقطے پہ دنیا آ گئی — جب قیودِ دہر سے دل کو مبرا کر دیا (صفحہ ۴۷)

"قیود سے آزاد کر دیا" کہنا چاہیے تھا - اور کہہ گئے "قیود سے مبرا کر دیا"۔

دل اُن کیواسطے ہے، باشوقِ دل میں آئیں — وہ دل کو دل سمجھ کر ہر طرح آزمائیں (صفحہ ۵۴)

"باشوق دل میں آئیں" کتنا نامانوس اندازِ بیان ہے۔

ویسے بھی کون کم تھی جنوں زائی نشاط — پھولوں نے اور آگ لگا دی بہار میں (صفحہ ۶۸)

"جنوں زائی نشاط" نے شعر کو کس قدر بوجھل بنا دیا۔

حجاب دل میں تیری یاد رہتی ہے کچھ اس ڈھب سے — بہت محسوس کرتا ہوں نہیں معلوم ہوتی ہے (صفحہ ۹۰)

"جلوے" کے لئے تو معلوم نہ ہونا اور نظر نہ آنا بولتے ہیں۔ مگر یاد کے لئے معلوم نہ ہونا عجیب سی بات ہے۔

عرصۂ سوز و ساز میں نغمۂ سرخوشی کہاں — دل ہی میں جب ہنسی نہیں، ہونٹوں پہ پھر ہنسی کہاں (صفحہ ۱۰۲)

اوّل تو دل میں ہنسی کا ہونا" ہی ایک مضحکہ سے کم نہیں۔ "پھر" ہونٹوں پہ پھر ہنسی کہاں" میں "پہ پھر" میں جو تنافر پایا جاتا ہے اس نے شعریت کو خاک میں ملا دیا۔

روزِ اوّل ہی سے دولت رنج کی — حصۂ تقدیرِ انسانات ہے (صفحہ ۱۲۳)

انسان کی جمع "انسانات" ...... اور پھر شعر کا قافیہ ...... توبہ!

موج صاحب جوان شاعر ہیں اور اس دور کے کلام میں پختگی مشکل ہی سے آتی ہے۔ مشق، تجربہ اور مطالعہ میں جیسے جیسے ترقی ہوتی جائے گی۔ موج صاحب اپنے کلام میں بھی ترقی اور پختگی محسوس کریں گے۔ موج صاحب جیسے بے تعصب وسیع الظرف اور علم دوست ہندو جب تک بھارت میں موجود ہیں "اردو" پر انشاء اللہ آنچ نہیں آسکتی۔

افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید

"افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید (ذخیرہ احادیث کی از سرِ نو جانچ) حصہ اول و دوم - مرتبہ - ڈاکٹر سید عبداللطیف - ضخامت ۹۶ صفحات۔

قیمت بارہ آنہ - ملنے کا پتہ:- کونسل اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز (۷/۴۳ آغا پورہ) حیدر آباد دکن۔

حیدر آباد دکن میں "کونسل اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز" کے نام سے ایک علمی انجمن قائم ہوئی ہے۔ جس کے دس ارکان اور ایک جنرل سیکرٹری ہیں۔ ان میں مولانا حمید الدین قمر (فاضل دیوبند) کو چھوڑ کر سب کے سب انگریزی تعلیم یافتہ اور لندن، ڈبلن، لپزگ، ماربرگ اور عثمانیہ یونیورسٹی کے فاضل علامہ یعنی "ڈاکٹر" ہیں۔ اس انجمن کے قیام کا مقصد یہ ہے:-

"علوم اسلامیہ کے مختلف شعبوں میں تحقیقاتی کام کرنا۔ افکارِ اسلامی کو جدید دنیا کے مسائل سے منطبق کرنا اور بین المذاہب و بین الثقافت مفاہمہ پیدا کرنا۔"

اس انجمن کی مرتب کی ہوئی کتاب "افکارِ اسلامی کی تشکیلِ جدید (ذخیرہ احادیث کی از سرِ نو جانچ) ہمارے پاس تبصرہ کے لئے موصول ہوئی ہے۔ جس پر ہم قدرے تفصیل کے ساتھ اظہارِ رائے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں!

اس انجمن نے احادیث کے ذخیرہ کی از سرِ نو جانچ اور احادیثِ نبوی کے ایک مستند مجموعہ کی ترتیب و تدوین کی ضرورت اور اس کی تحقیق کے سلسلہ میں ایک یادداشت مرتب کر کے مختلف اربابِ فکر کی خدمت میں روانہ کی تھی۔ جن اصحاب نے

اس یادداشت کا جواب دیا ہے۔ اُن میں حیرت ہے کہ :-

پروفیسر آصف فیضی۔ مولوی عبدالجلیل چیف سیکریٹریٹ حیدرآباد دکن۔ شیخ محمد اشرف پروپرائٹر اسلامک لٹریچر لاہور۔ مولوی غلام احمد وکیل نظام آباد۔ چودھری نذیر احمد خاں سابق وزیر صنعت وحرفت پاکستان۔ عبیدالرحمٰن خانصاحب شیروانی۔ محمد طفیل شریک اسلامک ریویو لندن۔ جیسے حضرات کے نام بھی نظر آتے ہیں !

کیا "احادیث نبوی" کی نئے سرے سے جانچ پڑتال کا معاملہ "رائے عامہ" کی صوابدید کا مقتضی ہے ؟ اور اس کیلئے کتاب وسنّت کے علم، دینی فکر اور اسلامی کردار وسیرت کی کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے ؟ شیخ محمد اشرف صاحب نے بیشک قرآن وحدیث کے انگریزی تراجم اور دوسری مذہبی کتابیں اپنے یہاں چھاپی ہیں۔ تو کیا اس خصوصیت کے سبب کہ وہ ایک پبلشنگ ہاؤس کے مالک ہیں "احادیث نبوی" کی تدوین وتحقیق پر اظہار رائے کا منصب بھی رکھتے ہیں۔ پروفیسر آصف فیضی انگریزی دور میں لاء کالج بمبئی کے پرنسپل تھے تقسیم ہند کے بعد کانگرسی حکومت میں وہ مصر میں سفیر ہو گئے اور اب یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر ہیں۔ قرآن وحدیث کا وہ علم نہیں رکھتے اور نہ اسلامی سیرت وکردار۔ چودھری نذیر احمد صاحب پاکستان میں صنعت وحرفت کے وزیر رہ چکے ہیں اور اب وکالت فرماتے ہیں۔ قرآن وحدیث کے مبادی سے بھی وہ واقف نہیں ہیں اور رہی اُن کی زندگی تو وہ پریکٹس کے ذریعہ روپیہ کماتے ہیں۔ عبیدالرحمٰن خانصاحب شیروانی "خان بہادر" ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے برسوں ٹریژرر رہے ہیں۔ کتاب وسنّت سے وہ شغف رکھتے ہیں مگر اس میں درک وبصیرت نہیں رکھتے۔ اسی طرح بعض دوسرے حضرات کا بھی حال ہے۔ تو ان حضرات کی خدمت میں "اکیڈمی" نے یادداشت بھیجکر ایک تو شخصیتوں کے بارے میں اپنی بے خبری کا ثبوت دیا ہے۔ دوسرے "احادیث کی جانچ پڑتال" کی اہمیت ونزاکت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا !

اگر انگریزی طب کی جانچ پڑتال" کے لئے کوئی کمیٹی قائم ہو جائے اور وہ کمیٹی مشہور شعراء کو، تاریخ وادب کے پروفیسرں کو، طبی کتابیں چھاپنے والے پبلشروں کو۔ وزیروں اور ایڈووکیٹوں اور پبلک سروس کمیشن کے ممبروں کو اور اسی قبیل کے بعض مشہور اصحاب کو اظہار رائے کے لئے یادداشت بھیجے تو اس کمیٹی کے متعلق ماہرین طب کیا رائے قائم کریں گے ؟

قادیانی جماعت کے امیر مرزا محمود بشیرالدین احمد صاحب کو اس اکیڈمی نے "مولانا" کا خطاب دیا ہے ہے کے نام یہ یادداشت کس حیثیت سے بھیجی گئی ہے ؟ کیا یہ اکیڈمی مرزا بشیرالدین محمود کو مسلمان سمجھتی ہے۔ اگر سمجھتی ہے تو پھر اس اکیڈمی کی دینی اساس ہی میں کجی اور غلط اندیشی شامل ہے اور اگر اکیڈمی مرزا بشیرالدین محمود کو مسلمان نہیں سمجھتی تو کیا وہ مستشرقین و مستغربین علماء کی صف میں شامل کئے جا سکتے ہیں ؟

حافظ اسلم جیراجپوری "اطاعت رسولؐ" ہی کے سرے سے قائل نہیں ہیں۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ حضورؐ کی زندگی تک بس آپؐ کی اطاعت فرض تھی۔ مسٹر پرویز انہی اسلم صاحب جیراجپوری کے شاگرد ہیں اور احادیث کی مخالفت اور تکذیب اُن کا مشن ہے ان حضرات کے پاس یادداشت آخر کس غرض کے لئے بھیجی گئی۔ جبکہ اُن کا مسلک معلوم تھا ! اگر کوئی انجمن "علم قرآن" پر کام کرنا چاہے اور اپنے پروگرام کے سلسلہ میں مسٹر ٹنڈن، مسٹر سمپورنانند اور دوسرے مہاسبھائی لیڈروں سے رائے معلوم کرے تو وہاں سے کس قسم کے جواب کی توقع ہے ؟

وزیر تعلیم حکومت ہند کے پرائیویٹ سیکرٹری محمد اجمل خانصاحب کو "مولانا" شاید اس لئے لکھا گیا ہے کہ "عصمت انبیاء"

کو مجروح کرنے اور داغدار بنانے کے لئے انہوں نے ایک کتاب لکھ ماری ہے۔ اور شاید اسی تصنیف سے مرعوب ہو کر اُن کی خدمت میں یادداشت روانہ کی گئی ہے!

گلاسگو، لندن، اڈنبرگ، کناڈا اور امریکہ کے عیسائی مستشرقین کے پاس یادداشت بھیجنے کی کوئی تک ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ "احادیث کی جانچ پڑتال" کیا صرف ایک "علمی" مسئلہ ہے یا اس کا دین و ایمان سے بھی کوئی تعلق ہے۔ رواداری اور علمی وسیع النظری کی بھی کچھ حدود اور شرائط ہیں!

حیرت ہے کہ مصر کے ڈاکٹر طٰہٰ حسین۔ ہز ہائینس آغا خاں اور بہائی فرقہ کے کسی عالم کی خدمت میں یادداشت بھیجنے کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اور ان مفکرین کی قیمتی آراء سے محرومی کس طرح گوارا کر لی گئی؟

کونسل اکیڈیمی آف اسلامک اسٹیڈیز کے ارکان خود اپنے بارے میں پہلے غور کریں کہ "ذخیرۂ احادیث کی جانچ پڑتال" کا خیال اُن کے دل میں کیوں پیدا ہوا؟ لوگوں کی زبانی کچھ باتیں سن سنا کر اور بعض لوگوں کی چند تحریریں پڑھ کر۔ یا انہوں نے قرآن سامنے رکھ کر احادیث کے کسی مجموعہ کا، یا کسی ایک باب کا مطالعہ اور مقابلہ کیا ہے؟ اور جو حدیثیں انھیں بادی النظر میں قرآن کی مخالف نظر آئی ہیں۔ اُن کے بارے میں انہوں نے اہل علم سے تحقیق بھی کی ہے۔ اور ان میں سے کتنے ہیں جو قرآن و حدیث کے فن تطبیق و تاویل سے واقف ہیں؟

اگر ان حضرات نے چھوٹے سے چھوٹے پیمانہ پر بھی یہ کام کر لیا ہے تو پھر اس کام کو وہ نمونہ کے طور پر اہل علم اور اہل ذکر کے سامنے پیش کریں تاکہ اس پر گفتگو ہو سکے اور کام کی نہج، احادیث کی جانچ پڑتال کی نوعیت، رد و قبول کے اسلوب، اور جرح و تعدیل کے طریق کار کا تعین کیا جا سکے۔ اگر یہ کام انہوں نے نہیں کیا تو اس طرح "رائے عامہ" کو "احادیث کی جانچ" کے لئے دعوت دے کر اختلافِ رائے اور اُس "خواب" کا دروازہ کھول دیا ہے جو کثرتِ تعبیر سے پریشان ہی ہو کر رہتا ہے!

آخری بات ہم یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی سربلندی نہ تو مصطفٰے کمال پاشا کی "جدتوں" کے ذریعہ ہو گی اور نہ ایمان، فیضی، پرویز اور پروفیسر محمد اجمل خاں کے گمراہ کن افکار سے اسلام کو کسی قسم کا فائدہ پہنچ سکے گا۔ مسلمانوں کا آخر بھی اُسی سے درست ہو گا جس سے اُن کا آغاز درست ہوا تھا اور وہ ہے اللہ اور رسُول کی اطاعت! تقویٰ۔ نیکوکاری، آخرت کا خوف۔ حُبِ رسُول اور خشیتِ الٰہی! جن خدا کے نیک بندوں نے جَو کے ستو پھانک کر اور پھٹی ہوئی زرہیں پہن کر قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے تھے۔ اُن کی پیشانیوں میں سجدوں کے نشان چمکتے تھے۔ اُن کے دل خدا کے خوف سے لرزتے تھے۔ اُن کی آنکھوں کی پاکیزگی کا یہ عالم تھا کہ نامحرم عورت کی طرف اُٹھتی ہی نہ تھیں۔ اللہ کے اور بندوں کے وہ حقوق ادا کرتے تھے۔ آج جو لوگ مسلمانوں کی اصلاح اور اسلام کی سربلندی کے لئے انجمنیں بناتے ہیں۔ انھیں خود اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہیئے کہ اُن میں تقوے اور خشیت الٰہی کی کتنی مقدار پائی جاتی ہے؟ اور اُن کی زندگیاں کتاب و سنت سے کس حد تک مطابق ہیں؟

ہدایت النبی "نماز کی کتاب" مترجم:۔ المعروف ہدایت النبی۔ "لمختار"۔ ضخامت ۲۵۶ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ شعیب آرٹ طبری میدان نزد بس روڈ۔ کراچی۔

اس کتاب میں "اہلِ حدیث" کے مسلک کے مطابق نماز کی ترکیب پوری شرح و بسط کے ساتھ درج کی گئی ہے۔

جگہ جگہ شرک و بدعت کا رد بھی ملتا ہے۔ اور ساتھ ہی احناف کے فقہی مذہب پر خوب خوب چوٹیں بھی کی گئی ہیں۔ فقہی مسائل میں یہ درشتی اہلِ حدیث کا مزاج بن گئی ہے۔

بخاری شریف کا اشتہار اس انداز میں:۔

"پچاس روپے کا مال صرف سات روپے میں"

بہت کھٹکا۔ اس "بازاری انداز" کی رکاکت کا محسوس نہ ہونا اپنی جگہ افسوسناک ہے!

نماز

"نماز" از۔ سید محمد حسنی۔ حجم ۳۲ صفحات۔ قیمت تین آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ ۳۷ گوئن روڈ۔ لکھنؤ۔

یہ کتاب جدید اصولوں کی روشنی میں مرتب کی گئی ہے۔ جو لوگ عربی سے ناواقف ہیں۔ اُن کے لئے یہ کتاب بہت فائدہ مند ثابت ہوگی۔ نماز کو بے سمجھے پڑھنے کی رسم آخر کب تک جاری رہیگی۔ اُسے ختم ہوجانا چاہیئے۔ "نماز" کے مُرتب اور ناشر دونوں اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر کے مستحق ہیں!

ڈاکٹر زور

"ڈاکٹر زور"۔ مؤلفہ۔ محمد بن عمر (ایم اے) ضخامت ۲۰۰ صفحات (مجلد گردپوش کیساتھ۔ قیمت بلا جلد دو روپے۔ مجلد تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ ادبیات اُردو خیریت آباد۔ حیدر آباد (دکن)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا نام اور کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ موصوف نے اُردو ادب کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اور اُردو دُشمنی کے اس طوفانی ماحول میں بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر زور کی شخصیت پر پیام۔ مقالے، مضامین، نظمیں اور رباعیات ہیں۔ جنہیں محمد بن عمر صاحب نے ترتیب دے کر "اعترافِ خدمات" کی ایک محسوس شکل پیدا کردی ہے!

"اہلِ علم و فضل حضرات علمی دُنیا میں عام طور پر کورے اور نکمے ہوتے ہیں اور جو دُنیوی معاملات میں چالاک اور ہوشیار ہوتے ہیں۔ بسا اوقات علم کی دولت سے محروم رہتے ہیں۔ نہ تونگر ایک لافانی شعر سیدھا کرسکے اور نہ دو سطریں مستقبل کے لئے چھوڑ سکے۔" (صفحہ ۱۴)

یہ نمونہ ہے اس کتاب کے مؤلف جناب محمد بن عمر کی تحریر کا جو انگریزی کے ساتھ خیر سے اُردو کے بھی ایم اے ہیں۔
ایم اسلم کا تعارف مؤلف کے قلم سے:۔

"ایم اسلم صاحب پنجاب کے نہایت مشہور اور صاحب ذوق ادیب ہیں۔ علامہ اقبال کے اُن سے بہت گہرے تعلقات رہے ہیں۔...... ڈاکٹر زور صاحب سے اور ان سے بہت عرصہ سے روابط رہے ہیں اور اُن کی اور ادارۂ ادبیات اُردو کی جملہ مصروفیتوں سے کلی طور پر آگاہ ہیں۔......" (صفحہ ۲۳)

اس کتاب کے ذریعہ یہ پہلی بار انکشاف ہوا کہ ایم اسلم صاحب سے علامہ اقبال مرحوم کے گہرے تعلقات رہے ہیں۔ خوب!
آخری جملہ کس قدر بے ربط اور غیر ادیبانہ ہے:۔

"جمعہ کی نماز کو مسجد جاتے ہوئے ہم نے انھیں نہیں دیکھا۔ لیکن خانہ باغ کے پھول روزانہ والد کے مزار پر چڑھانے ضرور جایا کرتے ہیں۔" (صفحہ ۹۳)

یہ تو ڈاکٹر زور صاحب کی "ہجو" ہوئی کہ وہ جمعہ کی نماز تک نہیں پڑھتے۔ مگر اپنے والد کی قبر پر پھول روزانہ چڑھاتے ہیں۔ جو اپنی جگہ ایک فعل عبث اور بدعت ہے!

"اس ڈانٹ سے ڈانٹ کھانے والا روٹھے گا نہیں"۔ (صفحہ ۱۱۶)

کیا اندازِ بیان ہے۔ لاحول ولاقوۃ!

"مجھ بے لاگ لکھنا ہی جگر گردہ ہی کا کام تھا"۔ (صفحہ ۱۴۴)

"دل گردہ" روزمرہ ہے۔

"پھر ڈاکٹر صاحب کا قہقہہ ہوا"۔ (صفحہ ۱۴۶)

"قہقہہ ہوا" یہ کیا زبان ہے؟

وزیر حسن دہلوی کے چند فقرے آخر کس لئے نقل کئے گئے ہیں۔ تبرک کے طور پر!

اس کتاب میں سب سے اچھا مضمون خواجہ حمید الدین صاحب شاہد کا ہے۔ جو انہوں نے بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ لکھا ہے۔ تحریر کے نوک پلک بھی درست ہیں۔ نظموں کا حصہ اور زیادہ کمزور ہے!

بلوغ المرام

"بلوغ المرام" (مترجم) از:- علامہ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ - ترجمہ:- مولانا امجد المعلیٰ - ضخامت ۴۰۳ صفحات (مجلد - گردپوش کیساتھ) قیمت درج نہیں۔

ملنے کا پتہ:- نور محمد کارخانہ تجارت کتب (آرام باغ) کراچی۔

علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (پیدائش ۷۷۳ھ - وفات ۸۵۲ ہجری) کی مشہور تالیف "بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام" کا اردو ترجمہ "نور محمد کارخانہ تجارت کتب" نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ سولہ سو احادیث فقہی ابواب کیساتھ اس کتاب میں جمع ہیں۔ جس حدیث میں کوئی علت پائی گئی ہے۔ جامع احادیث رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا اظہار کردیا ہے۔

کتاب کے شروع میں (فہرست کے بعد) حافظ ابن حجر عسقلانی علیہ الرحمہ کے مختصر حالات مولانا عبدالرشید نعمانی نے لکھے ہیں جو معلومات آفریں ہیں، ان حالات سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ ابن حجرؒ مشاہیر ائمہ احناف پر جرح و قدح کرنے میں بہت بیباک تھے۔ اسی لئے اُن کے قلم کو "حجاج کی تلوار" کہا جاتا ہے!

اس کے بعد پانچ صفحات پر احادیث کی اقسام کی تعریف اور بیان ہے۔ یہ باب مولانا خیر محمد صاحب جالندھری کا مرتبہ ہے - جو بہت کام کی چیز ہے۔ اور اردو داں طبقہ کیلئے تو نعمت غیر مترقبہ ہے۔

ترجمہ سلیس اور رواں ہے۔ مگر کہیں کہیں مترجم سے بھول چوک بھی ہو گئی ہے۔ صفحہ ۱۴۶ (سترھویں سطر) پر "ثما قام مفصلی العصر" کا ترجمہ چھوٹ گیا۔ صفحہ ۱۴۷ (گیارھویں سطر) "فافاض الی البیت ...." کے ترجمہ "بیت المقدس میں تشریف لاکر طواف افاضہ فرمایا"۔ میں "بیت اللہ" کی جگہ "بیت المقدس" لکھ دیا جو غلط ہے۔ صفحہ ۲۵۰ (تیسری سطر) پر "فان دمہا ھدر" کا ترجمہ "اس باندی کا خون لغو ہے" بامحاورہ نہیں ہے۔ "ہدر" خون کے مباح ہونے کو کہتے ہیں۔ یعنی ایسا "خون" جس کے کرنے والے پر شرعاً کوئی تاوان نہ ہو۔ صفحہ ۳۱۰ (فٹ نوٹ - پہلی سطر) پر "شماتۃ الاعداء" کا ترجمہ "دشمنوں کی بدبختی کیا ہے"۔ حالانکہ "شماتۃ الاعداء" کسی مصیبت پر دشمن کے خوش ہونے کو کہتے ہیں۔

"بلوغ المرام" احادیث رسولؐ کا مجموعہ ہے اس کی افادیت اور حجیت دینی میں کوئی دشمن اسلام ہی شک کرسکتا ہے۔

دو قیمتی رائیں

(۱)

نارتھ ویسٹرن ریلوے کے ۱۹۵۵ء کے تفریح پسندوں کی جانب سے میں اس طریقۂ کار، تنظیم اور عدیم المثال معیار کا پُرجوش ترین اعتراف کرنا اپنا خوشگوار فرض سمجھتا ہوں جو اس فیکٹری یعقوب بسکٹ فیکٹری سکھر نے دوسرے صنعت کاروں کے لئے بطور مثال قائم کیا ہے۔ میرے ساتھ دو سو تفریح پسند اصحاب ہیں۔ وہ اس کارخانہ کی مصنوعات کے بہترین ہونیکا بہ بانگ دہل اعتراف کرتے ہیں۔ مسٹر یعقوب کی ذہانت نے کارخانہ کی تنظیم کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں رکھا ہم انکی مہمان نوازی کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں

(دستخط) ملک حبیب احمد۔ ہیلاک ہیلتھ آفیسر

۱۸۔ مارچ ۱۹۵۵ء

(۲)

میں نے اس فیکٹری یعقوب بسکٹ فیکٹری سکھر میں جو کچھ دیکھا اُسے بے حد پسند کیا۔ اور میں مصنوعات کی تیاری میں بروقت عمل اور صحت و صفائی کے خیال سے بہت متاثر ہوا۔

دستخط:۔

اونالڈ اوکڈن۔ آئی۔ ایل۔ او

آپرینٹس شپ ٹریننگ کے ماہر جو پاکستانی وزارت محنت کراچی سے منسلک ہیں۔ مورخہ ۱۶۔ مارچ ۱۹۵۵ء

جاری کردہ:۔ یعقوب بسکٹ فیکٹری سکھر
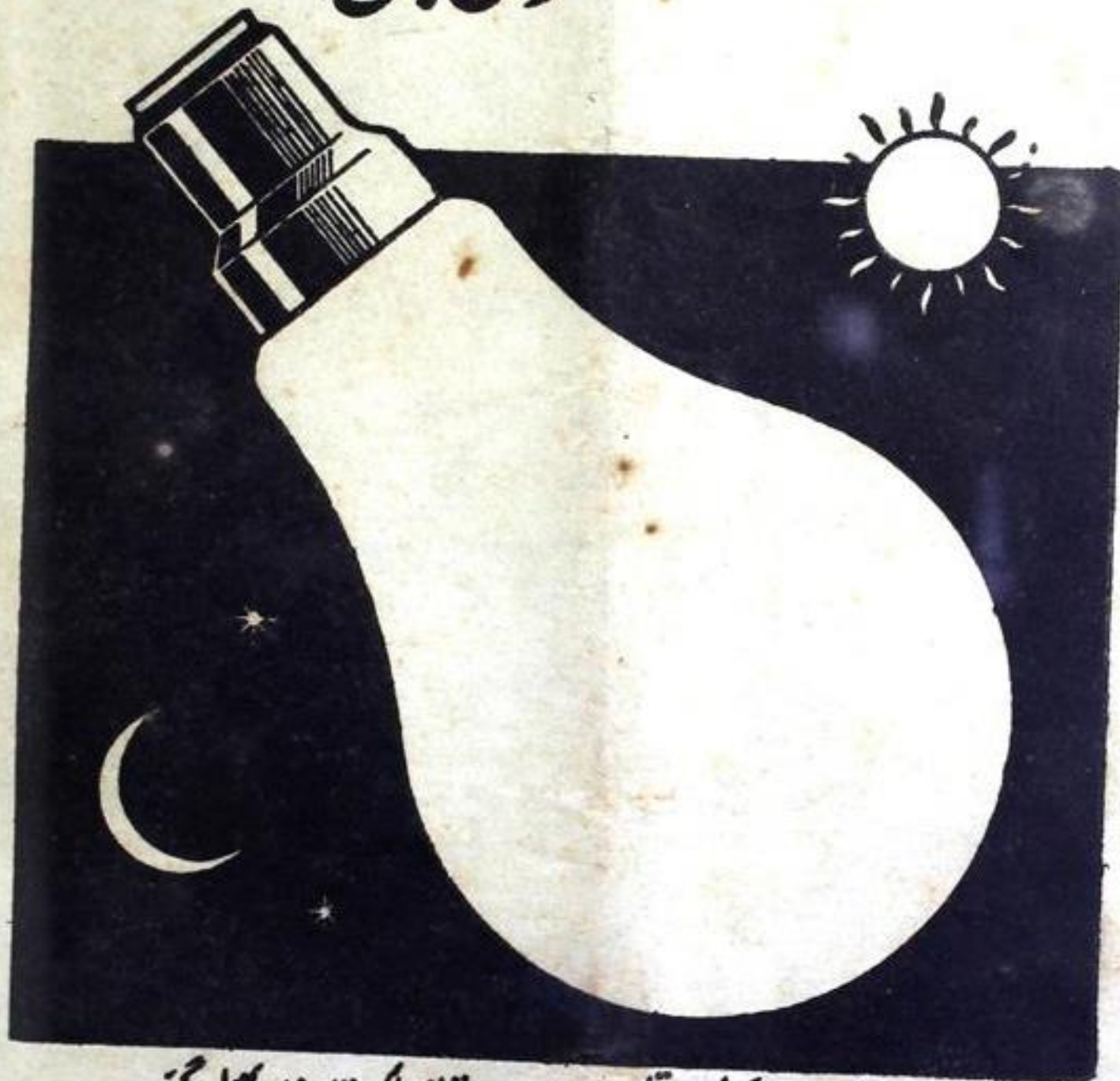
فاران

کراچی

پاکستان

جلد ۷ نمبر ۳

ماہنامہ

فاران

جون سنہ ۱۹۵۵ء
ایڈیٹر
ماہر القادری

چندہ سالانہ
چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/
آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت
دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

پاکستان اور ہندوستان دونوں ملک ساتھ ساتھ آزاد ہوئے تھے۔ اُن کی آزادی کی تاریخ مدت کے ذرا سے تفاوت کے بغیر ایک ساتھ شروع ہوتی ہے۔ دونوں ملکوں کو آزاد ہوئے آٹھ سال ہونے کو آئے ان مسافروں کے سفر کا آغاز ایک دن اور ایک ہی ساعت میں ہوا تھا۔ مگر اس مدت میں ہندوستان کہاں سے کہاں پہنچ گیا، اور ہم ....! یہ نہ پوچھیے کہ کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں؟ یہ داستان بڑی دلخراش اور یہ کہانی انتہائی دردناک ہے!

ہندوستان کو بھی غذا کی نازک صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ وہاں بھی سیاسی خلفشار کے بگولے اُٹھے اور اختلافات کے گرداب پیدا ہوئے۔ شرنارتھیوں کے بسانے اور آباد کرنے کی مشکلات اُن کے سامنے بھی آئیں۔ مگر ہندوستانی رہنماؤں کا عزم اور اخلاص ہر مشکل پر قابو پاتا چلا گیا اور آج ہندوستان مشکلات کے حل کرنے کے دَور سے نکل کر ترقی و تعمیر کی منزل میں پہنچ چکا ہے۔ صنعت میں، تجارت میں، زراعت میں وہاں ترقیاں ہی نہیں نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ بین الاقوامی سیاسیات میں ہندوستان کا ایک وقار ہے، ساکھ ہے، عزت ہے۔ اُس کی قوت کا دوسری حکومتیں دباؤ محسوس کرتی ہیں۔ ہندوستان امریکہ اور روس دونوں حکومتوں کا حلیف ہے اور یہ دونوں مملکتیں اپنی اپنی جھولیاں پھیلائے ہوئے ہیں۔ مگر ہندوستانی سیاست کے پکتے ہوئے پھل خود اپنی ہی جھولی میں گرتے ہیں۔ کسی دوسرے کی جھولی کا رُخ نہیں کرتے۔

ہندوستان اپنا دستور بنا کر کبھی کا نافذ بھی کر چکا۔ اُس کی سیاسیات کا ایک مزاج بن چکا ہے۔

اُس کے مسائل ایک مُتعین رُخ اختیار کر چکے ہیں۔ وہاں کرسیاں کبھی کبھار ہل تو جاتی ہیں مگر ایک دُوسرے سے جنگ نہیں کرتیں۔ ذاتی اور شخصی مفاد وہاں بھی ہیں لیکن قومی مفاد سے دبے ہوئے! ہندوستان کے سیاسی مؤقف کا یہ عالم ہے کہ ایک طرف اُس نے طاقت کے بَل پر کشمیر کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اور یہ گرفت روز بروز مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اور دُوسری طرف فرانسیسی حکومت کو اُس نے اپنے ملک سے نکال باہر کیا اور بین الاقوامی دُنیا نے چُوں بھی نہیں کی۔

جنوبی ہند میں کمیونزم کا طوفان کس زور سے اُٹھا تھا۔ مگر راج گوپال آچاریہ کی فراست کو داد دیجئے کہ کسی ٹکراؤ اور تلخی کے بغیر اس بوڑھے سیاست داں نے اس میں تھماؤ پیدا کر دیا۔ آندھرا ہی کمیونسٹوں کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔ اور اُن کے گڑھ ہی میں اُنھیں شکست اُٹھانی پڑی!

بھارت میں آکاش سے ہُن نہیں برسا اور نہ وہاں ہنومان جی اور گنیش جی نے پھر سے جنم لیا ہے اور نہ وہاں الٰہ دین کا چراغ کسی کے ہاتھ آ گیا ہے۔ وہاں کوئی معجزہ ظہور میں نہیں آیا۔ ہندوستان نے اصولِ فطرت کے مطابق جدوجہد کی ہے اور قانونِ قدرت ہے کہ جو کوئی جدوجہد کرتا ہے، قدرت اُس کی مساعدت اور رفاقت میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں کرتی۔ یہ وہ قانون ہے جس میں کافر اور مسلمان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا!

یہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے عوام تقسیم ہند کے بعد ایکا ایکی بدل کر بڑے دھرماتما اور سَو فیصدی مخلص اور نیک بن گئے ہیں۔ بُرائیاں اُن میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہاں بھی چھُوت چھات، زبان اور اقلیت و اکثریت کی کشمکش موجود ہے، اُس جگہ بھی سیاسی پارٹیاں ایک دُوسرے کی حریف بنی ہوئی ہیں۔ حکومت کے خلاف وہاں بھی احتجاج ہی نہیں ستیہ گرہ تک کی نوبت آجاتی ہے اور پنڈت نہرو جیسے ہر دلعزیز رہنما کو کالی جھنڈیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے "حکومت مردہ باد" کے نعرے وہاں بھی سُنے گئے ہیں۔ لیکن وہاں یہ اختلافات ایک حد کے اندر ہیں۔

وہاں عام انتشار اور ملک گیر بے چینی نہیں پائی جاتی۔ ہندوستان کے عوام اس بے اطمینانی کے عالم میں نہیں ہیں کہ نہ جانے کل کیا سیاسی انقلاب ظہور میں آجائے اور "مزاجِ شاہانہ" کیا خبر کہ حکومت کے کل پُرزوں کو اچانک طور پر کس طرف گھما دے!

بات یہ ہے کہ ہندوستان کے اربابِ اقتدار کے اخلاص اور وطن دوستی نے ملک کی شیرازہ بندی کر رکھی ہے۔ وہاں کے نیتا اور رہنما ملک کے مسائل کو اپنے ذاتی مفاد اور شخصی جاہ و اقتدار کے نقطۂ نگاہ سے نہیں سوچتے کہ ملک چاہے تباہ ہو جائے مگر اُن کی کرسیاں محفوظ رہیں۔ اُن کے سامنے پہلے ملک کا مفاد ہے اُس کے بعد دُوسرے مسائل ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کو اپنی ذاتی جاگیر نہیں سمجھ رکھا کہ جان نکلے گی تو تختِ حکومت ہی پر نکلے گی۔ جو کوئی اقتدار کی جس کُرسی پر بیٹھ گیا بس وہ اُس کی ذاتی ملکیت ہو گئی۔ اب وہ اس کرسی سے ہٹ ہی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں فوجی انقلاب کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آتا۔

وہاں کے عوام کسی تذبذب، بے اطمینانی اور بدگمانی میں مبتلا نہیں ہیں۔

ارباب اقتدار کی زندگی، طرزِ فکر اور اصول و روش کے اثرات بڑے دُور رس اور ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ اُوپر کے لوگ مخلص اور اصول پسند ہوں تو عوام کو بھی اپنی تمام برائیوں کے باوجود حکومت کی روش کا ساتھ دینا پڑتا ہے جس نے بھی کہا بہت ٹھیک کہا:۔

الناس علیٰ دین ملوکھم۔

(عوام اپنے حاکموں کی روش پر ہوا کرتے ہیں)

حکومتوں اور ملکوں میں بگاڑ کا سلسلہ اُوپر سے چلتا ہے۔ حاکموں کی بدمزاجی، بے اصولاپن، مفاد پرستی اور خود غرضی عوام سے ایثار اور خلوص کی اسپرٹ ہی چھین لیتی ہے اور پھر رفتہ رفتہ عوام و خواص ایک سٹہ کھیلنے والے کی سطح تک اُتر آتے ہیں۔ ملک کے بننے بگڑنے سے انھیں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہتی، ہر بات میں اپنا فائدہ دیکھا اور سوچا جاتا ہے۔ پھر یہی چیز ملک کو شدید بحران، انتشار اور پراگندگی میں مبتلا کر دیتی ہے!

یہ امر واقعہ ہے کہ ہندوستان کے ارباب اقتدار کا یہ خلوص، اصول پسندی اور وطن دوستی ہے۔ جس نے ملک کے شیرازے کو یکجا کر رکھا ہے۔ اور ہندوستان ترقی کی منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ ان اطمینان بخش حالات نے بین الاقوامی سیاست کے بازار میں ہندوستان کی ساکھ قائم کر دی ہے اور ہر مملکت اس سے دوستانہ روابط پیدا کرنا چاہتی ہے!

اور۔ پاکستان؟؟

پاکستان کے حالات ہندوستان سے بالکل دگرگوں رہے ہیں، وہاں ترقی یہاں تنزل، وہاں تعمیر یہاں تخریب۔ اُس جگہ اطمینان و اعتماد۔ اِس جگہ انتشار و بے اعتمادی! ہندوستان میں ملک کا مفاد سب سے مقدم اور پاکستان میں اپنے ذاتی مفاد کے آگے ملک و قوم کی ہر ترقی اور ہر تعمیر پرکاہ کے برابر بھی قدر و قیمت نہیں رکھتی!

داخلی اور خارجی کوئی مسئلہ بھی ایسا ہے جو اَب تک حل ہوا ہے۔ کوئی ایک گتھی بھی ایسی ہے جو سُلجھ سکی ہے۔ اور سُلجھانے کی کوشش بھی فرمائی گئی ہے تو اس انداز میں کہ سلجھنے کے بجائے اور پیچ پڑ گئے ہیں۔! یہ لوگ اور تو کیا کریں گے اپنے دارالخلافہ کے چند لاکھ مہاجرین تک کو ٹھکانے سے آباد نہیں کر سکے۔ بس منصوبے ہی منصوبے۔ وعدے ہی وعدے! تقریریں ہی تقریریں!

بیچارے کسان اور محنت کش طبقہ اپنی جگہ پریشان حال، اور تاجر ارباب کار کی جان کو الگ رو رہے ہیں۔ جب بھی کسی تجارتی پالیسی کا اعلان ہوتا ہے۔ تجارت پیشہ طبقہ سر پکڑ کر اور کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہے۔ کہ یہ تو اور نئی مصیبت آن پڑی۔ سرکاری محکموں میں رشوت کی وہ گرم بازاری کہ خدا کی پناہ! مٹھی گرم کیجیے تو کشودِ کار ہوگا ورنہ دفتروں کے بس طواف ہی کرتے رہیے!

ہاں پاکستان کے ارباب حکومت کا ایک کارنامہ ایسا ضرور ہے جس میں اُن کا دُنیا بھر میں کوئی حریف ہی نہیں ہے۔ بادشاہوں اور دُوسرے ملکوں کے بڑے آدمیوں کا "خیر مقدم" کرنا اُن سے خوب آتا ہے۔ بلکہ اس فن کے یہ حضرات ایکسپرٹ ہیں! یہ چاہیں تو کسی بادشاہ اور حاکم کے استقبال کے لئے سارے شہر کراچی کو

راتوں رات دلہن بنا دیں! سواری بادِ بہاری کس تزک و احتشام سے گزرنی چاہیئے۔ گارڈ آف آنر کس طرح پیش کیا جائے دعوتوں میں قصر و ایوان کو کس انداز پر سجایا جائے۔ کونسی بیگم صاحبہ کی نشست باہر سے آئے ہوئے مہمانوں میں سے کس مہمان کے قریب موزوں رہے گی۔ ان انتظامات میں ہماری حکومت کے عمال اپنا آپ جواب ہیں! یورپ بھر میں اٹلی کے لوگ کھانا پکانے میں سب سے آگے ہیں تو اُس "باورچی ملک" کی طرح پاکستان بھی "استقبالچی" ملک بن کر رہ گیا ہے!

دُوسرے ملکوں کے اکابر کا خیر مقدم اور اُن کی شایانِ شان تواضع یقیناً کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے۔ مگر ہر چیز کی کوئی حد ہوتی ہے۔ شہنشاہ ایران کے خیر مقدم سے جو اس کا آغاز ہوا ہے تو یہ سلسلہ ختم ہی نہیں ہو پاتا۔! ایک طرف ہماری حکومت نے "اخوان" کے قاتل جمال ناصر کا خیر مقدم کیا ہے اور دوسری طرف شرقِ اُردن کے بادشاہ اور ملکہ کے استقبال پر لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے اور یہ وہ "شرقِ اُردن" ہے۔ جس کی بالشت بھر زمین بھی انگریز کے غلبۂ اقتدار سے پاک نہیں ہے۔ ایسے "غلام بادشاہوں" کی غلامی کے بندھن ہم توڑ چیلے کرتے رہے۔ اندیشہ اس کا ہے کہ کہیں اُن کی "نیاز مندی" کی خوبُو ہم میں نہ سما جائے کہ انگریز کا رعب ابھی دلوں سے گیا نہیں ہے!

جہاں سے چلے تھے!

پچھلے دو سال کے عرصہ میں جتنے جلد جلد انقلاب آئے ہیں۔ مرکز اور صوبوں میں جیسی ردوبدل ہوئی ہے۔ حکومت کی مشنری کے کل پُرزوں کو جس جس طرح بدلا گیا ہے۔ اور شاہانہ اختیارات کا اقتدار جس انداز میں استعمال فرمایا گیا ہے۔ اُس نے پاکستان کو اُس سطح پر پہنچا دیا ہے جہاں کے اربابِ اقتدار عوام کو ڈھوروں کے گلہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔

جس طرح آگ اور پانی کا ایک جگہ اکٹھا ہونا محال ہے۔ اسی طرح "آرڈی ننس" اور "جمہوریت" کسی ایک ملک میں یکجا نہیں ہو سکتے۔ یا تو "جمہوریت" ہی رہے گی یا "آرڈی ننس"! ان میں سے کسی ایک کو جگہ چھوڑنی ہوگی۔ اور پاکستان میں "آرڈی ننسوں" کی جو بھرمار رہی ہے۔ وہ سب پر ظاہر ہے۔ اور پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ جمہوریت اور ملک و عوام کی فلاح و بہبود کے نام پر یہ سب کچھ ہوتا رہا ہے!

دُنیا نے اس منظر کو بھی دیکھ لیا کہ گورنر جنرل بہادر نے دستور ساز اسمبلی کو اُس وقت توڑا جبکہ وہ اپنی سات سالہ غفلت کے بعد دستور قریب قریب تیار کر چکی تھی اور ایک مہینے کے اندر اندر اسے منظرِ عام پر لانے والی تھی۔ اس کے بعد سابق دستور ساز اسمبلی کے صدر اور فیڈرل حکومت کے درمیان مقدمہ بازی شروع ہوتی ہے۔ طرفین کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کے لئے انگلستان سے وکلاء آتے ہیں اور خوب خوب بحث کرتے ہیں۔ ایک طرف پرٹ اور ڈپلاک کی بحث۔ دُوسری طرف فیڈرل کورٹ کے ججوں کے ریمارکس، پھر فیڈرل حکومت کی طرف سے حلف نامہ عدالت میں داخل ہوتا ہے۔ اس کے بعد مولوی تمیز الدین صاحب کا جوابی حلف نامہ پیش ہوتا ہے۔ ایک دُوسرے کو ملزم گردانتا اور قصوروار ٹھہراتا ہے۔ اور پھر فیڈرل کورٹ فیصلہ دیتی ہے کہ گورنر جنرل بہادر کو دستور ساز اسمبلی کو توڑنے کا بھی اختیار ہے اور دستور ساز اسمبلی کے فیصلے بھی گورنر جنرل کی منظوری کے محتاج ہیں!

اس فیصلے کے بعد اب ہم پاکستانیوں کی پوزیشن یہ ہے کہ ملکہ معظمہ کا نمائندہ ہمارا مطلق العنان حاکم اور ملک کے

سارے سپید و سیاہ کا مالک ہے! اگر ملک کے ایک ہزار منتخب نمائندے بھی اپنی فہم و رائے کے مطابق ملک کی بہتری کے لئے کوئی قانون بنائیں تو ملکہ معظمہ کا یہ نمائندہ تنہا اپنے حکم سے ملک کے ایک ہزار نمائندوں کے متفقہ فیصلے کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اور جب بھی وہ ضروری اور مناسب سمجھے دستور ساز اسمبلی کو توڑ سکتا ہے! ملکہ معظمہ کا یہ نمائندہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اُس سے کوئی یہ تک نہیں پوچھ سکتا کہ حضور! اس برہمی کا سبب کیا ہے؟ بس نطق ہمایونی سے جو بات اور خامہ تقدیر رقم سے جو حکم نکل گیا سو نکل گیا۔ ملک کے ایک ایک فرد کا فرض ہے کہ اس حکم کے سامنے بلا چون و چرا سر تسلیم خم کر دے...... ورنہ......

تو!

۱۹۴۷ء میں پاکستان کی جو آئینی پوزیشن تھی۔ ۱۹۵۵ء میں بھی وہی پوزیشن ہے۔ پاکستان کی قسمت کے مالک و مختار پاکستان کے نہ عوام ہیں اور نہ خواص ہیں بلکہ ملکہ معظمہ (خلد اللہ ملکہا) کا نمائندہ (دام اقبالہ) ہے۔ اور اس طرح "شاہی در شاہی" ہم پر مسلط ہے! اس آٹھ سال کے سفر کے بعد ہم بدنصیب پاکستانی جہاں سے چلے تھے پھر وہیں آ گئے!

ایک طرف عوام کی بے اختیاری کا یہ عالم ہے۔ دوسری طرف اِن "بڑے آدمیوں" میں اقتدار کی رسہ کشی ہو رہی ہے حالات یہ لوگ خراب کرتے ہیں اور آرڈی ننسوں کا خمیازہ عوام کو بھگتنا پڑتا ہے!

دستور سازی کا کام پھر نئے سرے سے شروع ہوگا اور ابھی تک دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کا آغاز ہی نہیں ہوا ہے کہ بنگال اور پنجاب میں کشمکش شروع ہو گئی ہے۔ پنجاب کے گورنر اور وہاں کے وزیر اعظم کی ٹولیوں میں کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ اب اس رسہ کشی کا جو بھی نتیجہ ہو۔ ایک دوسرے کے مفادات کے درمیان سمجھوتہ نہ ہو سکا تو اس گتھی کو سلجھانے کے لئے اختیارات شاہانہ کے ناخنِ عقدہ کشا کو زحمت کرنی پڑے گی!

ان بڑے لوگوں سے ہم نے بہت کچھ عرض معروض کر کے دیکھ لی مگر ان تلوں میں تیل ہی نہیں۔ یہاں تو "گنبد و گردگاں" کا سا معاملہ ہے۔ جب تک ان "عزت مآبوں" کے ہاتھ میں اختیار رہے۔ یہ وہی سب کچھ کرتے رہیں گے جو اَب تک کرتے رہے ہیں۔ جب ذاتی مفاد ہی مقصود ٹھہرا تو پھر اپنے مفاد کی خاطر یہ لوگ جہاں تک چلے جائیں تھوڑا ہے!

پاکستان کی کشتی چند بڑے لوگوں کے شخصی مفادات کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ یہ حضرات جب چاہتے ہیں کشتی کی پتواروں کو توڑ دیتے ہیں۔ اور جدھر کو چاہتے ہیں بادبان کا رُخ پھیر دیتے ہیں۔ کشتی کے مسافروں کو ان ملاحوں نے سہما دیا ہے۔ وہ بیچارے ان تمام کارستانیوں کو دیکھتے ہیں۔ مگر ڈر کے مارے دم نہیں مار سکتے۔ شبِ تاریک، مخالفت ہوا، اُس پر ملاحوں کی آپس میں کش مکش، کون کہہ سکتا ہے کہ اس بدنصیب کشتی کا کیا حشر ہوگا؟

مگر پاکستان کو ان چند "بڑے لوگوں" کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جن کو اپنی راحت و آرام عزیز ہے۔ وہ اپنے شبستانوں میں رنگ رلیاں کرتے رہیں۔ لیکن جن کو اللہ سے، رسول سے، کتاب و سنت سے، اسلامی نظام سے، شرافت و انسانیت سے اور پاکستان سے محبت ہے، جو آخرت کی جوابدہی سے

ڈرتے ہیں اور اپنے فرض اور ذمہ داری کو پہچانتے ہیں۔ اُن کا یہ کام ہے کہ میدانِ عمل میں آکر حالات کو سدھارنے کے لئے جدوجہد کریں!

انگلستان والوں کا یہ عقیدہ ہو تو ہو کہ:۔

"بادشاہ غلطی نہیں کر سکتا"

مگر ہم تو "بادشاہ پرستی" کی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے تو دُنیا کی تاریخ ہے جو ہمیں بتاتی ہے۔ کہ "بادشاہ عوام سے زیادہ غلطی کرتا ہے"۔ پس پاکستان میں اختیاراتِ ملوکانہ اور مطلق العنانی کو جمہوریت کی راہ پر ڈال دینا ہمارا انسانی فرض ہے اور یہ کفایہ نہیں فرضِ عین ہے۔ آئینی جدوجہد کا حق کوئی ہم سے نہیں چھین سکتا۔ پاکستان میں آئینی جدوجہد ہی اچھے ثمرات لاسکتی ہے! آئینی انقلاب کا راستہ بیشک بہت طویل و صبر آزما اور دیر طلب ہے۔ مگر ضبط و آئین کے جلو میں جو انقلاب آئے گا وہ ملک و ملت کے لئے ہر اعتبار سے فائدہ مند ثابت ہوگا!

ملکہ معظمہ کے شاہانہ اختیارات اور اُن کے حلول و تناسخ، نمائندگی اور تفویض و سپردگی کی نزاکتیں تو قانون داں حضرات جانیں، ہم تو اُس نظامِ حکومت کی دعوت لے کر اٹھے ہیں۔ جس میں ایک بڑھیا خلیفہ کا گریبان تھام کر اپنا حق طلب کر سکتی ہے! پاکستان اسی عدل و مساوات کے نظام کے لئے دراصل وجود میں آیا ہے!

ہم جانتے ہیں کہ پاکستان میں کچھ لوگ نظامِ اسلامی کے نام سے چڑتے ہیں۔ اور بعض لوگ جب اپنے کردار اور افعال کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو اسلامی نظام میں انھیں خطرہ نظر آتا ہے۔ زوالِ نعمت کا خطرہ۔ اپنے جرائم کی باز پُرس کا دھڑکا۔ رنگ رلیوں سے محروم ہو جانے کا اندیشہ ــــ مگر ان لوگوں کی خوشی اور عیش سامانی کے لئے سعادت و فلاح کے آفتاب کو طلوع ہونے سے تو نہیں روکا جا سکتا!

پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے۔ اسلام کے لئے بنا ہے۔ جو لوگ اسلام کی راہ روکنا چاہتے ہیں۔ وہ پاکستان کے مقصدِ وجود کی نفی کرتے ہیں۔ مگر اللہ نے چاہا تو اُن کی مزاحمتوں کے علی الرغم پاکستان میں اسلام ہی آکر رہے گا۔ یہ روشنی تو ایک نہ ایک دن پھیل کر رہے گی۔ یہ ابرِ نیساں تو پاکستان کے طول و عرض میں انشاء اللہ برس کر رہیگا۔ اندھیرے اُجالے کا راستہ آخر کب تک روکے رہیں گے۔ سچائی زیادہ دن تک مظلوم نہیں رہ سکتی۔ پاکستان کو اپنی منزلِ مقصود پر بہرحال پہنچنا ہے اور جس نام پر پاکستان وجود میں آیا ہے اسی نام کو یہاں سربلند ہونا ہے!

جو لوگ "اسلام" کو گوارا نہیں کر سکتے اور اسلامی مساوات جن کے مزاجِ شاہانہ پر بار ہے اُن کو چاہیے کہ کوئی ایسا ٹھکانا ڈھونڈ لیں جہاں کفر و بے دینی کا دور دورہ ہو، پاکستان میں جس کسی کو بھی رہنا ہے اسلام کے سایہ میں رہنا ہے۔ یہاں اللہ اور رسُول کے سوا کسی کا شخصی حکم نہیں چل سکتا۔ یہاں کا "اولوالامر" وہ ہوگا۔ جس کے کردار میں اسلام کی پاکیزگی جھلکتی ہوئی نظر آئے گی۔ یہاں کی کرسیوں کو آقاؤں اور خداوندوں کی نہیں اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندوں اور ملک و ملت کے خادموں کی ضرورت ہے۔ جو بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے

ہوں وہ کوئی ایسا خطہ تلاش کریں جہاں غلام بستے ہوں۔ پاکستان، تو آزاد انسانوں کی سرزمین ہے!

ہندوستان کو کوئی طاقت تقسیم نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اسلام کی طاقت نے تقسیم کیا ہے۔ اور یہی طاقت پاکستان کا اقتدارِ اعلیٰ بن کر رہے گی۔ مانا کہ سیاسی جوڑ توڑ کے بل پر حالات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مگر کب تک؟ کاغذ کی ناؤ زیادہ دن تک تو نہیں چل سکتی!

پاکستانی عوام کی موجودہ بے اختیاری اور بے بسی کو دیکھ کر کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق پاکستانی سیاست کو جس راہ پر چاہے لے جا سکتا ہے۔ تو یہ منتقین کا غلط اندازہ ہے ــــ عوام کا خونِ تمنّا جب اپنا حق طلب کرے گا تو پھر یہ آواز کسی کے دبائے دب نہ سکے گی۔ اور اس وقت "خداوندانِ نعمت" کو محسوس ہوگا کہ اُن کی کرسیاں فولادی چبوترے پر نہیں ریت کی دیواروں پر بچھی تھیں!

اسلام کی راہ میں جو طاقت بھی مزاحم ہوگی اُسے نیچا دیکھنا ہوگا۔ "طلوعِ اسلام" اور "پاکستان اسٹینڈرڈ" کی کاغذی دیواریں اسلامی نظام کے سیلاب کو نہیں روک سکیں۔ یہ بدلیاں انشاءاللہ چھٹ کر رہیں گی اور پاکستان میں کتاب و سنّت کا آفتاب اس طرح طلوع ہوگا کہ مادر زاد اندھے بھی اُس کی روشنی کو محسوس کریں گے!
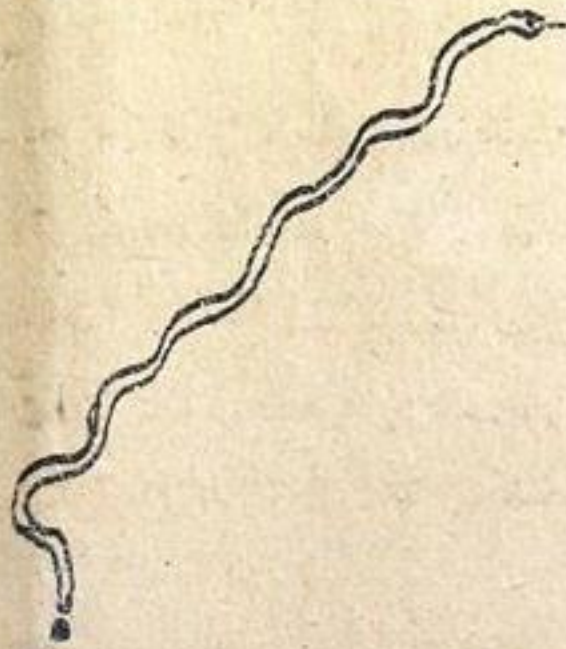
یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ پنجاب سے نون وزارت کے ٹوٹ جانے کی خبر آج کے اخبارات میں نظر سے گزری۔ یہ خبر غیر متوقع نہیں ہے۔ پاکستان کے مرکز اور صوبوں پر جب تک مفاد پرست ٹولیوں کا تسلط ہے یہاں یہی ہوتا رہے گا اور قوم کو اسی طرح کی وحشت ناک خبریں سننی پڑیں گی اور پاکستان کے سیاسی اسٹیج پر اسی انداز کے ڈرامے کھیلے جاتے رہیں گے!

اگر ان حالات و واقعات کے بعد بھی عوام کی آنکھیں نہ کھلیں اور قوم کو ملک کے بننے بگڑنے کا احساس نہ ہوا ــــ تو پھر اللہ کا عذاب سیاسی خلفشار کی صورت میں نہ جانے کب تک مسلط رہے گا۔ اور پاکستان کی کشتی اسی طرح ڈانواڈول رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں فراست و دانش اور جرأت و عزیمت عطا فرمائے!

ماہر القادری
[illegible]

افتخار احمد بلخی

فتنۂ انکارِ حدیث

فتنۂ انکارِ حدیث دراصل قرآنِ کریم کے خلاف خطرناک سازش ہے۔ جسے اس زمانہ میں "مغرب زدگی" نے سہارا دیا ہے اور یہ سازش پاکستان میں بدقسمتی سے پرپرُزے نکال رہی ہے۔ یہ گروہ ابھی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ چند کم سواد، بے ضمیر اور زمانہ ساز اہلِ قلم نے یہ ہنگامہ کھڑا کردیا ہے۔ مگر اس فتنہ کو معمولی اور غیر اہم سمجھ کر نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ چنگاری دیکھنے میں کتنی حقیر اور بے مایہ ہوتی ہے لیکن اسے بھڑکنے کا پورا موقع مل جائے تو وہ آگے چل کر شعلۂ جوالہ بن سکتی ہے اور بڑے سے بڑے خرمن کو جلاسکتی ہے!

خصوصاً اس زمانے میں جبکہ لوگ دینی پابندیوں اور اخلاقی حدبندیوں کے مقابلہ میں رُخصت، فرار اور اباحت پسندی کی طرف مائل ہیں فتنۂ انکارِ حدیث کے مقبول ہونے کے مواقع حاصل ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر وہ اہلِ قلم اور اربابِ فکر ونظر جو اپنے اندر دینی غیرت کا احساس رکھتے ہیں اور "اطاعتِ رسُول" جن کا دین وایمان ہے اور جو کتاب اللہ اور سنّتِ رسُول کو دین کے دو ستون سمجھتے ہیں۔ انہوں نے اس فتنہ کی روک تھام کے لئے مدافعت شروع کردی ہے!

یہ مضمون جناب مولانا افتخار احمد بلخی کی زیرِ اشاعت معرکہ آرا کتاب "فتنۂ انکارِ حدیث" کا ایک حصّہ ہے۔ اس سے موصوف کی کاوشِ تحقیق اور فکری صلاحیتوں کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کتاب میں "فتنۂ انکارِ حدیث" کے ساتھ دُوسرے عجمی فتنوں کی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے اس کتاب کی غالباً تین جلدیں ہوں گی اور اہلِ نظر مطالعہ کے بعد اُن کی افادیت کا صحیح اندازہ کرسکیں گے (م۔ق)

خارجیت اور مجوسیت کے مناقشات ہوں یا جبر واختیار کی بحثیں۔ مرتکب کبائر کے کفر وفسق کا قضیہ ہو یا خلق قرآن کا فتنہ۔ ارادۂ الٰہی، رحمتِ عامہ، ہیولیٰ وصورۃ، جوہرِ فرد۔ قدم وحدوث وغیرہ کے مباحث۔ یہ سب دراصل تقسیمِ کار کے اصول پر ایک نصب العین اور ایک مطمحِ نظر کے حصول کے مختلف پروگرام تھے۔ راہیں جدا جُدا تھیں۔ مگر منزل ایک ہی تھی۔ سب کا ہدف اسلام کے اندر غیر اسلام کو لاکر نصب کردینا تھا۔ اس مشترکہ مقصد کے حصول کیلئے

طریقِ کار مختلف اختیار کئے گئے۔ ان مختلف پروگراموں میں سب سے اہم، سب سے زیادہ زہریلے جراثیم پر مشتمل اور انتہائی مخدوش و تباہ کن بلکہ حصولِ مقصد کا ذریعہ بننے کے بجائے خود ایک مقصد بن جانے والا پروگرام قرآن کو مشکوک بنا دینے کا تھا۔ اور یہ کام پوری جانفشانی و ہوشیاری کے ساتھ کرنے کا تھا۔ اس لئے خفیہ طور پر یہ مہم چلانے کی ہدایات جاری کی گئیں۔ چنانچہ عبد اللہ بن الحسین القیروانی اپنے ایک مکتوب میں سلیمان بن الحسن القرمطی کو لکھتا ہے کہ:۔

اوصیک بتشکیک الناس فی التوراۃ والانجیل والقران فانہ اعظم عون لک علی القول بقدم العالم۔

میں تم کو تاکید ہدایت کرتا ہوں کہ لوگوں کے دلوں میں توراۃ و انجیل اور قرآن کے باب میں شکوک ڈالتے چلے جاؤ۔ اسلئے کہ قدامت عالم کے ثبوت کے لئے یہی تشکیک سب سے بڑا حربہ ہے۔

یہ تشکیک فی القرآن، ظاہر ہے کہ الفاظ قرآنیہ میں تحریف سے ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے کہ حفاظتِ قرآن کے وعدۂ الٰہی میں کسی کا چابکدستی اپنا کوئی اثر نہیں دکھا سکتی تھی۔ لہٰذا اس تشکیک کی شکل لازمی طور پر یہ ٹھہرتی ہے کہ معانی میں تحریف کی جائے۔ الفاظ وہی قرآن کے رہیں اور کہا جائے کہ اس آیت کا مفہوم و مدعا اور منشاء یہ ہے!

انکارِ حدیث

اس تشکیک میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ راہ کے سب سے بڑے "پتھر" کو ہٹایا جائے اور وہ "پتھر" حدیث و سنت تھا۔ اس لئے کہ جب تک قرآن کے منشار کو متعین کرنے والا یہ "حربہ" لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ تشکیک فی القرآن میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ جعلی احادیث کو فروغ دینے والوں کے پیش نظر آیا محض یہ تھا کہ اسلام میں خلط و التباس پیدا کر کے اسلام کے چہرے کو ناقابلِ شناخت بنا دیا جائے۔ یا اسی کے ساتھ ان کی یہ دور بینی بھی تھی کہ بعد میں آنے والے ان کے جانشینوں کی "مشکلات" (انکارِ حدیث) اس سرگرمی سے بڑی حد تک حل ہو سکیں گی؟ مگر وضع حدیث کے وسیع پیمانہ پر کاروبار سے انکارِ حدیث کی راہ بڑی حد تک ہموار ضرور ہوئی۔ چنانچہ چند حضرات نے انکارِ حدیث کی جسارت کر ہی ڈالی۔ اور اپنی اس "جرأتِ منکرانہ" کے جواز میں ان حضرت کے پتے دلائل و براہین کی جو بضاعت تھی وہ یہ کہ:۔

- قرآن اپنے آپ کو تبیاناً لکل شئ کہتا ہے اور لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین نص قرآنی ہے۔ پھر قرآن سے باہر کسی دینی معاملہ کی تلاش کا موقع کیا رہ جاتا ہے؟
- روایات کا معاملہ شہادت در شہادت ہے۔ اور ان واسطوں میں سے اکثر کی عدالت و ثقاہت کے باوجود ان کی غلطی اور خطا و نسیان کا امکان قوی ہے۔ لہٰذا عقلاً، عرفاً یا قانوناً یہ صورتِ حال ظنی ہونے کے باعث قابلِ اعتماد نہیں ٹھہرتی اور چونکہ:۔
- احادیث کی حیثیت ظنی ہے وان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔
- احادیث میں اختلافات بے شمار ہیں اور ان اختلافات کی خلیج کا پاٹنا ناممکن ہے۔
- موضوع روایات کا ایک بحر مواج ہے جو ناقابلِ عبور ہے۔

لہٰذا عمل بالحدیث ایک درد سر ہے۔ پس حدیث کو سرے سے واجب الاطاعت قرار نہ دینے ہی میں امن و عافیت ہے۔ یہ فتنہ اگرچہ بہار آفریں ہو نہیں سکتا تھا تا وقتیکہ قرآن سے رسولؐ کے لفظ کو کھرچ کر نہ پھینک دیا جائے اور اطاعت

واتباع رسول کے احکام قرآنیہ محو نہ کر دیئے جائیں اور یہ کام کسی کے بس کا روگ نہیں تھا۔ پھر بھی امام شافعیؒ نے " گرپہ کشتن روز اول " کے خیال سے اس مفسدانہ فکر و عقیدہ کا پورے دلائل کے ساتھ اپنی مشہور کتاب " الام " میں ابطال فرما دیا۔

دوسری سازش

اسلام میں فساد و اختلال ڈالنے کی خاطر ایک طرح کی سازش اور کی گئی۔ وہ یہ کہ اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے اور قرآن کا تورات و انجیل وغیرہ کتب سابقہ کے مصدق ہونے کے مفہوم کو بدل دیا جائے اور کہا جائے کہ تمام اقوام و ملل کی نیکیوں اور دانش کا مجموعہ اسلام ہے اور ہر مذہب کے منجانب اللہ ہونے اور ہر مذہب رکھنے والے کی حقانیت کا اعتراف و تصدیق قرآن کا مدعا ہے بلکہ قرآن نازل ہی اس لئے ہوا ہے کہ ہر مذہب کے حق ہونے کا اقرار لوگوں سے کرائے اور ہر مذہب کے نیکوکاروں کی نجات کا اعلان کرے۔ چنانچہ اس " فکر و تحقیق " کا پروپیگنڈہ کرنے اور اسی سازش کے بروئے کار لانے کی خاطر دو کام کئے گئے۔

جمعیۃ اخوان الصفاء

ایک تو یہ کہ بصرہ میں " جمعیۃ اخوان الصفاء " کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جس کے ارکان کا کام یہ تھا کہ وہ تمام اقوام و مذاہب کی دانش جمع کریں۔ حضرت نوحؑ۔ حضرت ابراہیم۔ حضرت عیسیٰ، سقراط، افلاطون۔ زرتشت اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات و ہدایات کا ایک مخلوطہ تیار کر کے لوگوں میں پھیلائیں۔ چنانچہ اس تنظیم کے ارباب حل و عقد کی جانب سے " اخوان الصفاء " کے منسلکین کے نام وقتاً فوقتاً جو رسائل و ہدایات، تعلیمات و براہین اور کام کے جو نقشے جاری کئے جا رہے ہیں۔ ان رسائل میں اپنے مذہب و مسلک کا بیان اور اسے رواج دینے کی ہدایات اور اپنے سرچشمہ ہدایت کا تعین اس طرح کیا گیا ہے :-

وبالجملۃ ینبغی لاخواننا ایدھم اللہ تعالیٰ ان لایعادوا علماً من العلوم او یھجروا کتاباً من الکتب ولا یتعصبوا علیٰ مذھب من المذاھب لان رأینا و مذھبنا یستغرق المذاھب کلھا و یجمع العلوم جمیعھا۔

" الغرض ہمارے اخوان کو چاہیئے کہ علوم میں سے کسی علم سے بیر نہ رکھیں اور نہ کسی کتاب کو پس پشت ڈالیں اور نہ کسی مذہب سے تعصب برتیں۔ اس لئے کہ ہمارا عقیدہ اور ہمارا مذہب تمام مذاہب کو محیط ہے اور تمام علوم پر حاوی ہے "

وقد ذکرنا فی الرسالۃ الثانیۃ ان علومنا ماخوذۃ من اربع کتب، احدھا الکتب المصنفۃ علی السنۃ الحکماء والفلاسفۃ ــــ والآخر الکتب المنزلۃ التی جاءت بھا الانبیاء صلوٰۃ اللہ علیھم مثل التوراۃ والانجیل والقرآن وغیرھا ــــ والثالث الکتب الطبیعیۃ وھی صور اشکال الموجودات بما ھی علیہ الآن من ترکیب الافلاک (وغیرہ وغیرہ) والنوع الرابع الکتب الالٰھیۃ التی لایمسہ الا المطھرون الملائکۃ التی ھی بایدی سفرۃ کرام بررۃ وھی جواھر النفوس واجناسھا وانواعھا ......

" اور ہم بتا چکے ہیں کہ ہمارے علوم چار قسم کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اول وہ کتب جو حکماء و فلاسفہ کے آراء و نتائج فکر کی ترجمان ہیں۔ دوسرے وہ آسمانی کتب ہیں جن کو انبیاء علیہم السلام نے پیش کیا۔ مثلاً تورات و انجیل اور قرآن حکیم وغیرہ تیسرے علوم طبیعیہ کی وہ کتب جن میں موجودات کے واقعی کوائف بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً ترکیب افلاک وغیرہ اور چوتھی قسم الکتب الٰہیہ کی ہے جن تک رسائی صرف پاکیزہ ترین ہستیوں یعنی فرشتوں ہی کو حاصل ہے۔ اور جو ان بزرگ و برتر

کاتبانِ فطرت کے ہاتھوں میں ہیں۔ جو نفوس اور کائنات کے انواع و اجناس کی اصل حقیقتیں ہیں۔

تحریک شعوبیہ

دوسرا کام یہ ہوا کہ "شعوبیہ" کے نام سے ایک مدرسۂ فکر کی بناء ڈالی گئی۔ جس کا مقصد "رواداری" کے تصورات کا پھیلانا اور اسلام کی عالمگیر برادری کا پرچار کرنا ظاہر کیا گیا تھا۔

علماءِ حق غافل نہ رہے

مفسدین کی ریشہ دوانیوں کا قلع قمع کرنے۔ سازشوں کے ناکام بنانے اور فریب کاریوں کا پردہ چاک کرنے سے علماءِ حق کبھی بھی غافل نہ رہے۔ ہر وہ حملہ جو اسلام کو مسخ کرنے کے لئے کیا گیا اور علمی میدان کے جس محاذ سے کیا گیا۔ علماءِ حق نے اس کا اس طرح مُنہ توڑ جواب دیا ہے کہ پھر اس محاذ کی طرف مفسدین کو پیش قدمی کی ہمت نہ ہو سکی۔ کذابین کی وہ ساری کائنات جو احادیث کی وضع و اختراع کے باب میں وہ رکھتے تھے۔ اسماء الرجال کی تدوین اور جرح و تعدیل کے فن نے اسے ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ اسماء الرجال اور جرح و تعدیل کے یہ فنون امت مسلمہ کی وہ بے بہا متاع ہے جس کی نظیر دنیا کی دیگر اقوام و ملل کی تاریخ، علم و تحقیق آج تک پیش کرنے سے عاجز رہی ہے۔ وقت کے وہ علوم و نظریات جو مادّی طاقتوں اور قوّت و اقتدار کے بل بُوتے پر اپنا زور دکھاتے رہتے ہیں اور جن کی "چکا چوند" سے مفسدین کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اور بعض مرتبہ تو اچھے خاصے اسلام دوست عناصر ذہنی مرعوبیت شکار ہو جاتے ہیں۔ علماءِ حق نے ان افکار و نظریات کے پرستاروں کو اُنہی کے حربوں سے شکست دی ہے۔ اور فریب خوردگان عقلیت و مادیت کی ساری چالیں خود اُنہی پر پلٹ پڑی ہیں۔ اسی کشمکش میں علماءِ حق نے مصائب و آلام کی انتہائی دردناک اذیتیں بھی برداشت کی ہیں۔ اور جب "عنایاتِ خسروانہ" نے انھیں فتنہ و آزمائش میں ڈالنا چاہا ہے تو اُن کی زبانوں سے چیخ بھی نکل پڑی ہے۔ کہ کہیں اس ابتلاء میں قدم نہ ڈگمگا جائیں!

یہ علماءِ سوء

اسلام میں غیر اسلام کو لا کر نصب کرنے کا مشترک مقصد رکھنے والے حضرات کی چند واضح خصوصیات اور ممیزات و علامات یہ ہیں۔ پردۂ عالم پر اُن حضرات نے اپنے پارٹ جس طرح ادا کئے ہیں۔ اُن تمام سرگرمیوں میں یہ خصوصیات و علامات نہایت نمایاں طور پر آشکارا رہی ہیں۔

چونکہ ان حضرات کا حاصلِ زندگی شکم پروری، مفاد طلبی اور خود غرضی ہوتی ہے۔ اس لئے اقتدارِ وقت کی خوشامد و تملق ان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہے۔ حسن و تقبیح کا معیار قوّت و طاقت کے تیور قرار پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں یہ حضرات گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہے ہیں۔ مثلاً وہی لوگ جو بنو امیہ کے دور میں حضرت علیؓ کو زیادہ خاطی سمجھتے تھے اور حضرت معاویہؓ کو کم۔ اور جنہوں نے حضرت علیؓ کے اقدامات در دیہ کی کبھی تصویب نہ کی اور اس کے برخلاف حضرت معاویہؓ کی تصویب کرتے رہے۔ دورِ عباسی میں انہی لوگوں کا ایک سرغنہ ثمامۃ بن الاشرس مامون کو ترغیب دیتا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ پر لعنت کا چلن جاری کرے۔ وہی لوگ جو کل تک جبر و تشدد کو "مشیت ایزدی" بتا کر "جباروں" کو اُن کے قہر و ستم سے بری الذمہ قرار دیتے اور وہ لوگ جو کل تک یہ تبلیغ فرما رہے تھے کہ ایمان کے ساتھ کوئی معصیت ضرر رساں نہیں اور کفر کے ساتھ کوئی طاعت و نیکی نفع بخش نہیں۔ زمانہ کے کروٹ لیتے ہی وہ فتویٰ دیتے ہیں کہ کافر سلطانِ عادل افضل ہے مسلم سلطانِ ظالم سے۔ اس لئے کہ مستفتی ہلاکو خاں تھا!

اقتدارِ وقت کے ہر مشغلۂ محبوب کو کار دین بنانا ان حضرات کے نزدیک بڑی سعادت مآبی ہے۔ اسی جذبۂ سعادت مندی کا وہ مظاہرہ تھا جو غیاث بن ابراہیم نے مہدی کے شغلِ محبوب (کبوتر بازی) کو ایک حدیث گڑھ کر کار دین بنانا چاہا۔

جن کا جذبۂ اطاعت وعقیدت جس قدر مخلصانہ اور گہرا رہا اسی لحاظ سے اقتدار کے مقام عظمت وجلالت کی تعیین وتخصیص اور اس کی تشہیر میں سرگرمی دکھائی گئی۔ "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"۔ کچھ افکار وہمم ایسے تھے جن کی پرواز "السلطان ظل اللہ" سے زیادہ بلند نہ ہو سکی۔ انہوں نے اپنی عقیدت وسعادت مندی کی معراج یہی سمجھی۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو ایورسٹ کی مہم سر کرنے کی ہمت رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ببانگ دہل اکبر بن ہمایوں کے لئے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر اسے الوہیت کا مرتبہ عطا فرمایا۔ "جمعیۃ اخوان الصفار" اور "تحریک شعوبیہ" اپنی ارتقا کی منازل طے کرتی ہوئی پختہ کار ہو ہی چکی تھی۔ چنانچہ حق اور عالمگیر سچائیاں جو تمام مذاہب میں موجود ہیں۔ انہیں لے کر ایک جامع طریقہ بنایا گیا اور اس عالمگیر سچائیوں کے مجموعہ پر مشتمل ایک دین کی ایجاد بنام "دین الٰہی" (اکبر شاہی) کی گئی۔ اور اس طرح حق سعادت ادا کیا گیا اور آخر ایسا کیوں نہ کیا جاتا؟ اطیعو اللہ واطیعو الرسول کے یہ حضرات رمز آشنا جو تھے؟

مرعوبیت ذہن

یہ حضرات چونکہ چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں اس لئے باطل نظام وقوت کی پشت پناہی رکھنے والے رائج الوقت علوم وفنون اور فلسفوں اور نظریوں سے اتنے مرعوب ہوتے ہیں کہ ان کی جانب سے ریب وشک کی ادنیٰ سی بھی کوئی خلش اپنے قلب میں آنے دینا کفر سمجھتے ہیں۔ ساتھ ہی اسلام کے اندر رہ کر اسلام پر تیشہ چلانا بھی مدنظر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اسلام کو ان نظریات وخیالات پر ڈھالنے کی خدمت اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اور اس معاملہ میں ایک حد تک یہ بیچارے معذور بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں افکار و نظریات کے مدارس میں تعلیم اور انہی کی گودوں میں پرورش پائے ہوئے ہوتے ہیں۔ فکر ونظر کے بننے، ڈھلنے اور پختہ ہونے کا پورا دور انہی افکار ونظریات کے زیر تربیت بسر ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے سوچنے اور سمجھنے کا انداز، اُن کا طرز تصور اور اسلوب فہم وتدبر سب کچھ ان افکار ونظریات کے قالب میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلام کا فہم یا تو واجبی سا ہوتا ہے یا انہی مروجہ نظریات وافکار کی زبان وتلقین کے ذریعہ اسلام کو سمجھایا گیا ہوتا ہے۔ ذہنیت کے اس طرح منقلب ہو جانے اور اسی مرعوبیت فکر کا یہ کرشمہ تھا کہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت بخیال خویش یہ تصور کی جانے لگی تھی کہ یونان اور عجم کے فلسفوں اور نظریات کے ہر ارشاد کے آگے سر تسلیم خم کر کے کہا جانے لگا کہ یہی تو اسلام بھی کہتا ہے۔

مثلاً فلسفۂ یونان کو اپنے ایک کلیہ سے مجبور ہو کر عقول عشرہ ماننے پڑے تھے۔ ان درسگاہوں کے تعلیم یافتہ حضرات نے فرمایا کہ ہمارے یہاں بھی یہی ہے۔ پوچھا گیا کہ کیسے؟ اور کہاں؟ جواب دیا گیا کہ فرشتے جو ہیں! فلسفۂ یونان نے کہا کہ آسمان حرکت کرتا ہے۔ ان حضرات نے فرمایا۔ آمنا وصدقنا! قرآن خود یہی کہتا ہے۔ فلسفۂ یونان نے اعلان کیا کہ آسمان نو ہیں۔ ارشاد ہوا۔ لاریب، اسلام کا بھی یہی انکشاف ہے۔ سوال کیا گیا کہ قرآن میں تو سبع سماوات ہے۔ پلٹ کر جواب مرحمت ہوا۔ سبحان اللہ۔ عرش وکرسی جو دو اور ہیں!

محاذِ جنگ

ان حضرات نے ہمیشہ علماء حق کے خلاف مورچہ بنایا ہے۔ ان کی زبان وقلم کی ساری صلاحیتیں اور قوتیں وقف رہی ہیں علماء حق پر طعن وتشنیع۔ ان کے خلاف افتراء اور ان کی اصلاحی مساعی کو ناکام بنانے کے لئے۔ معاشرے میں باطل اقتدار کی پھیلائی ہوئی بد سے بدتر فحاشی وعریانی کو نہ صرف یہ کہ یہ حضرات گوارا کرتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ اُن کے خلاف لب کشائی نہیں کرتے بلکہ اسلام کو تاراج کرنے والے ایسے اقتدار کے یہ حضرات بالعموم نمک خوار ہوتے ہیں اور اُن کے سارے معارف وحقائق علماء حق کو متہم اور انھیں مطعون کرنے کی مہم میں لگے رہتے ہیں جس کی مثال کیلئے

ساتویں صدی کی اُس مسلم سلطنت کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے، جس کے حدود میں باضابطہ لائسنس یافتہ قحبہ خانے قائم تھے۔ زنانِ بازاری پر ایک ٹیکس لگا ہوا تھا۔ جس کی آمدنی "دولت اسلامیہ" کے خزانۂ عامرہ میں داخل کی جاتی اور اُن ارباب فضل و کمال اور صاحبانِ معارف قرآنیہ کے قلوب میں جو اس خزانۂ عامرہ کے وظیفہ خوار تھے۔ اسلام کی یہ خانہ ویرانی و بیچارگی اور دین کے ساتھ یہ استہزاء، اور اس کی مظلومی ایک لمحہ کیلئے بھی بےچینی پیدا نہ کرسکی۔ لیکن جب ابن تیمیہؒ کی صدائے دعوت بلند ہوئی اور اصلاحی قدم اُٹھا تو یکایک ان حضرات کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور اسلام کے درد سے یہ لوگ تڑپ اُٹھے۔ ابن تیمیہؒ کے "ضال ومضل" ہونے کی حقیقت کا ایک دم ان حضرات پر انکشاف ہوا اور اپنا یہ انکشاف دوسروں پر آشکارا کیا جانے لگا۔ ان حضرات کی زبان وقلم سے ابن تیمیہؒ کا "دین سے برگشتہ ہونا" دیکھا نہ گیا۔ چنانچہ اُس مصلح کے "فاسد عقائد وافکار" اور "مفسدانہ تحریک" کو کچلنے کے لئے زبان کی طاقتیں اور تحریر کی قوتیں مصروفِ جہاد ہوگئیں[1]

یہ محاذِ جنگ کیوں؟ علمارِ حق کے خلاف اس نبرد آزمائی کی ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ باطل اقتدار وقت کی نظر میں علمارِ حق ہمیشہ مبغوض رہا کرتے ہیں اور اس اقتدار کی خوشامد و تملق ان (علمارِ سوء) کا سرمایۂ زیست رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تملق اور خوشنودیِ اقتدار کے حصول کی خاطر زبان وقلم کی خدمات پیش کرنے میں ایک دُوسرے سے بازی لے جانے کی کوششیں کی گئیں۔ مثلاً ابن تیمیہؒ کو ایک گروہ نے "ضال ومضل" کہا تو دُوسرے گروہ نے ایک قدم آگے بڑھ کر انھیں گردن زدنی قرار دیا۔ مجدد الف ثانیؒ کو ایک گروہ نے قابلِ تعزیر ٹھہرایا۔ تو دُوسرے نے انھیں واجب القتل ہی گردانا۔ اور یہ سب محض اس وجہ سے کہ اقتدارِ وقت کے نزدیک یہ مصلحین ملک و ملت کے لئے "خطرناک" تھے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ملک کے استحکام وسالمیت کو نقصان پہنچانے والی اور "اسلام سے منحرف" ایسی شخصیتوں کی "تخریبی سرگرمیوں" سے پبلک کو اچھی طرح واقف کرادیا جائے۔ اس لئے حق نمک ادا کرتے ہوئے حکومتِ وقت کا ہاتھ بٹایا گیا۔ تاکہ رائے عامہ ہموار ہو اور ایسے "خطرناک" افراد اور "اسلام کو رُسوا کرنے والے ایسے عناصر" کی سرگرمی کی راہ سے مشکلات دُور ہوں!

دُوسری اور سب سے بڑی وجہ علمارِ حق کے مقابلہ میں اس معاندانہ طرزِ عمل کی یہ ہوتی ہے کہ علمارِ حق کا نصب العین اقامتِ حق ہوتا ہے۔ اور حق کا بنام اسلام کے ان دوست نما دشمنوں کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہوا کرتا ہے، باطل اقتدار کے وجود ہی پر تو اُن کی زندگی اور اُن کے پھلنے پھولنے کا دارومدار ہوتا ہے۔ پھر بھلا یہ لوگ علمارِ حق اور اُن کی سرگرمیوں کو برداشت کس طرح کرسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنی ساری قوتِ کارکردگی اور ساری صلاحیتیں اس کام میں صرف کردیتے ہیں کہ کسی طرح علمارِ حق کا نام ونشان مٹادیا جائے۔ ہر دور میں علمارِ حق کے خلاف عوام فریب پروپگنڈے کئے گئے۔ پبلک کے جذبات اُبھارے گئے۔ بہتان تراشیاں کی گئیں۔ اقتدارِ وقت کے کان بھرے گئے۔ تاکہ علمارِ حق کو ایذائیں پہنچائی جائیں۔ جس سوسائٹی میں بیٹھے اس کی نفسیات کے مطابق ایسی بات کہی گئی کہ علمارِ حق کے خلاف بدظنی، جذبۂ عناد اور اشتعال پیدا ہو۔ چنانچہ امام ابوحنیفہؒ کی زبان بندی میں اسی قسم کی ذہنیت کی لگائی بجھائی نظر آتی ہے۔

---

[1] ماخوذ از "تجدید واحیائے دین" بحوالہ المقریزی۔

مسئلہ خلق قرآن اور اس سلسلہ میں امام احمد بن حنبلؒ اور دیگر علماء حق کے مصائب و آلام کے موجب بھی ایسے ہی "صاحبانِ فضل و کمال" اور "معدلت گستر قاضیانِ عظام" کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ جو مامون و معتصم کو اکسا کر کی جاتی رہیں۔ امام شافعیؒ کو یمن سے بغداد تک قید کر کے پاپیادہ لانے اور اس حال میں راستہ بھر امام موصوف پر گالیوں کی بوچھار کرنے کی تحریک بھی یہی چیز تھی۔ جبری طلاق کے معاملہ میں امام مالکؒ کے فتوے پر جو سزا کے تازیانہ دی گئی اور اُن کے ہاتھ جوڑ شانوں سے اکھڑوائے گئے۔ اس کی تحریک بھی ان علماء سوء ہی نے کی تھی۔ جنہوں نے خلیفہ کو یہ خوف دلایا کہ اگر جبری طلاق جائز نہیں تو پھر وہ جبری بیعت کیسے جائز ہوگی جس کے ذریعہ خود خلیفہ برسرِ اقتدار آیا ہے!

امام اشعریؒ پر خطبوں میں الپ ارسلان سلجوقی کی جانب سے لعنت کا حکم جاری کرانے میں بھی ایسے ہی حضرات کی تحریک کو دخل تھا۔ یہی لوگ تھے جن کے اکسانے پر ابن تیمیہؒ کی طرف چند عقائد منسوب کر کے سارے علاقہ میں ان کی خوب تشہیر کرائی گئی۔ تاکہ عوام میں بے چینی و ناراضگی پھیلے اور عامۃ المسلمین کے قلوب میں اُن کی جانب سے نفرت و اشتعال پیدا ہو۔ کبھی کہا کہ یہ شخص تجسیم و تشبیہ[1] کا قائل ہے۔ کہیں یہ بات پھیلائی گئی کہ یہ شخص ائمہ دین بلکہ صحابہؓ تک کی شان میں سوء ادبی کرتا ہے۔ کسی موقع پر یہ نشر کیا گیا کہ یہ شخص سلف صالحین کے طریق سے منحرف ہو گیا ہے۔ اور کبھی یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ یہ شخص اسلام کو رسوا اور بدنام کر رہا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ کا دربار جہانگیری میں آنا جب طے ہو گیا تو اس خیال سے کہ مبادا اُن کا "جادو" سلطان وقت پر نہ چل جائے۔ جہانگیر کو سمجھایا گیا کہ اُن کے آنے پر اُن سے "سجدہ تعظیمی" کے لئے کہا جائے۔ نتیجہ معلوم تھا۔ مجدد صاحب نے انکار فرمایا۔ عتابِ شاہی نازل ہوا اور قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیے گئے۔

ذوق دشنام طرازی

ایک طرف تو ان معاندین میں اتنی اخلاقی جرأت ہوتی نہیں کہ بے نقاب ہو کر میدان میں آئیں اور صاف کھُل کر دین اور شریعتِ اسلامیہ کی مخالفت، توہین اور تضحیک و استہزاء کریں۔ پھر یہ کہ اسلام کا نام لے کر اسلام میں اختلال و فتور ڈالنے کی پالیسی جو اثرات رکھتی ہے وہ مخالف بن کر اعتراضات کرنے سے حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ اس لئے اس مصلحت سے بھی کھلے بندوں یہ حضرات سامنے آنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ حضرات اسلام پر تیشہ چلا کر اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر جدوجہد کرنے والوں پر سب و شتم کر کے دل کی بھڑاس بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے کبھی کوئی اصطلاح وضع کر لی جاتی ہے اور کبھی کسی لفظ کا انتخاب کر لیا جاتا ہے۔ تاکہ دین و شریعت کے مخلصین کو بطورِ خطاب دے کر پھبتی کسنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اکبری دور میں اکبر اور اس کے حواریوں کی لائی ہوئی ضلالتوں کے خلاف آواز بلند کرنے والے علماء حق کو "فقیہ" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس وضع اصطلاح اور اسطرح کے خطاب کی تشہیر سے اسلام پسند عناصر اور اسلام کو سربلند کرنے کی جدوجہد کرنے والوں کی سُبکی و بے وقعتی اور پبلک میں انھیں بدنام کر کے اُن کے مشن کو فیل کرنے کا داعیہ بھی شامل ہوتا ہے!

ماحصل

یہ تھا خلافتِ راشدہ کے بعد سے لے کر دورِ مغلیہ تک علمبردارانِ باطل کی اُن تدریجی و اتفاقی مساعی کا خاکہ۔ جو مسلمانوں اور مسلم معاشرے کے عقائد، اعمال اور افکار و اخلاق کے اندر فساد و اختلال پیدا کرنے کے لئے کی جاتی رہیں۔ اب اس سلسلۂ کلام کو ختم کرنے سے پہلے اس کے خاص خاص نکات کو ذہن میں تازہ کر لینا مناسب ہے۔

---

[1] یعنی اللہ تعالیٰ کو انسانوں کی طرح ایک جسمانی وجود قرار دینا۔

تاکہ آنے والے مباحث و مضامین کے فہم و انطباق کے وقت یہ اصولی نکات ذہن میں حاضر رہیں اور سارے گوشوں کا بآسانی ادراک ہوتا چلا جائے :-

۱ - فساد و اختلال کی جو بھی نوع ہو - اُسے خلافتِ راشدہ کے بعد معاشرے میں پیر جمانے اور جڑ پکڑنے کا موقع ملا -

۲ - اس لئے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد اقتدار و حکومت کا اسلامی مطمعِ نظر - امر بالمعروف و نہی عن المنکر - کارفرما نہ رہا -

۳ - ہر طرح کے فتنہ و فساد اور رخنہ و اختلال کے استقلال و استحکام کا سبب دُنیا پرستانہ نظامِ حکومت اور دین سے برگشتہ سیاست تھی -

۴ - خلافتِ راشدہ کے عہد تک علمار کی صرف ایک قسم پائی جاتی تھی - یعنی علمارِ حق -

۵ - علمارِ سوء کے وجود میں آنے کا واحد سبب یہ ہے کہ سیاسی اقتدار اُن لوگوں کے قبضہ میں چلا گیا جو دین کے بجائے دُنیوی مقاصد کے لئے حکومت کرنے لگے -

۶ - علمارِ سوء کی ساری سرگرمیوں کا محور یہ رہا ہے کہ حق کسی طرح غالب نہ ہونے پائے - اقامتِ دین کو علمارِ سوء نے ہمیشہ اپنے لئے پیغامِ موت سمجھا ہے - اس لئے باطل کی کارفرمائیوں کے لئے انہوں نے اپنی ساری طاقتیں اور خدمات وقف رکھی ہیں -

۷ - اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے یہ حضرات مختلف پروگرام بناتے رہے - مختلف طریق کار اختیار کرتے رہے - تقسیمِ کار کے اصول پر ان لوگوں میں سے مختلف لوگوں نے مختلف کام اپنے اپنے ذمہ لے لئے -

۸ - انہی مختلف پروگراموں میں سے خطرناک ترین پروگرام قرآن کو مشکوک کر ڈالنے کا بنایا گیا -

۹ - تشکیک فی القرآن میں کامیابی ہو نہیں سکتی تھی - تاوقتیکہ انکارِ حدیث نہ کیا جاتا - یا یوں سمجھیے کہ ایک زمانہ میں اس گروہ کے معدودے چند افراد نے انکارِ حدیث کا وبال اسی لئے مول لیا - کیونکہ آگے چل کر قرآن کو مشکوک بنا دینے کا عندیہ تھا !

۱۰ - موضوع احادیث کی اشاعت میں غیر معمولی سرگرمیاں جاری رہیں - تاکہ اسلام کو مسخ کر ڈالنے میں سہولت ہو - اور بہت ممکن ہے کہ یہ سرگرمی اس پیش بینی کی خاطر بھی ہو کہ آئندہ چل کر انکارِ حدیث کی راہ آسان ہو جائے گی -

۱۱ - باطل کی چاکری - قوت و اقتدار کی خوشامد - ابن الوقتی - رائج الوقت افکار و نظریات سے مرعوبیت اور اسلامی تعلیمات و ہدایات کو باطل قوت اور حاکمانہ حیثیت رکھنے والے افکار و نظریات کی غلامی میں دینے کی کوشش ان حضرات کے امتیازی اوصاف و علائم ہوتے ہیں !

۱۲ - احیائے دین کی مساعی کو ناکام بنانا اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے جد و جہد کرنے والوں کو بدنام کرنا اور اُن کی راہ میں کانٹے بچھانا - ان پر بہتان اور افترا پردازی ان حضرات کے خصائص و ممیزات ہوتے ہیں !

اس طرح یہ باطل نظریات و افکار رفتارِ زمانہ کے ساتھ بڑھتے اور پھیلتے گئے - اور دوسرے باطل نظریات کے ساتھ ساتھ انکارِ حدیث کی "امانت" بھی خلفاً عن سلفٍ اُن جانشینوں کو منتقل ہوتی رہی جو ہر عہد کی مروجہ تہذیب باطل کے دلدادہ اور اقتدارِ باطل کے رائج کردہ علوم و فنون پر "مخلصانہ ایمان" رکھنے والے تھے - جن کے فکر و تدبر کی ساری کائنات بس یہ تھی کہ انہی علوم و فنون کی عینک سے ہر چیز کو دیکھتے رہیں - اور انہوں نے اپنے طرزِ فکر اور جاہلیت زدہ

علوم و فنون میں اس طرح ڈھال لیا تھا کہ ہر نظریہ کے فہم و ادراک کے لئے اپنے اسی طرزِ فکر کو کام میں لانے پر مجبور تھے۔ اس لئے کہ ان کے اذہان پورے طور پر اقتدارِ باطل کے رائج کردہ فلسفہ و نظریات سے مرعوب و متاثر ہو چکے تھے۔ اس طرح دین باطل کی سربلندی اور دین حق سے برگشتگی کی مساعی جاری رہیں اور "اضلال" کا کام ہوتا رہا۔ اور یہ فتنہ تدریجاً ایسے لوگوں کو اپنے دام میں گرفتار کرتا رہا جو اسلامی بصیرت سے یا تو بالکل تہی دامن ہوتے یا جو محض سطحی ہوتے۔ یا پھر اُن کے لاشعور میں اسلامی حدود و قیود سے آزادی کی "تڑپ" ہوتی۔ تا آنکہ دورِ مغلیہ کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار آیا۔

انگریزی اقتدار میں انکارِ حدیث کی پہلی آواز

انگریزوں کے لائے ہوئے ملحدانہ فلسفہ و نظریات کے دور میں انکارِ حدیث کی سب سے پہلی آواز والبستگانِ علی گڑھ کی جانب سے بلند ہوئی۔ اور اس لئے بلند ہوئی کہ ایک طرف تو اسلامی درک و بصیرت کے ساتھ خیر سے واجبی سا تعلق تھا اور دوسری طرف اپنے زمانے کی طبعی تحقیقات اور ان کے قیاسی نتائج کو یقینی و قطعی تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اسلامی تعلیمات اور مسائلِ شرعیہ کو اُن کے مطابق ڈھالا جائے۔ اور یہ کام ہو نہیں سکتا تھا تاوقتیکہ قرآنی آیات کی تعبیر و تاویل کے لئے کُھلی چھٹی حاصل نہ کر لی جائے۔ قرآن کے الفاظ اور مضامین کا مسئلہ اس وقت تک نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ درمیان سے اُن تشریحات و تفاسیر کو ہٹا نہ دیا جائے جو قرآن کے منشار کو متعین کرنے والی ہیں۔ اور وہ تشریحات و توضیحات رسُول کی ہیں۔ اس لئے حدیث کی حُجیت سے قطعی انکار کر دیا گیا۔ تاکہ قرآنی آیات کو توڑ مروڑ کر حسب خواہش ہر قالب میں ڈھالا جا سکے۔ ۔۔۔ العلوم علی گڑھ کے سرکاری آرگن "تہذیب الاخلاق" کے ایک روحِ رواں نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی ارشاد فرماتے ہیں:-

> "فقہار یہ کہتے ہیں کہ گو احادیث مثل اخبارِ آحاد کے مستند نہ ہوں لیکن عملی طور پر اُن کی پیروی کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ بہرحال ہمیں احادیث کی پیروی کرنی چاہیئے۔ خواہ ہماری عقل اور کانشیس (ایمان) ہم کو اس پر مجبور کرے یا نہ کرے۔ جن محققین نے احادیث کو جمع کیا اور ان کی چھان بین کی ہے۔ اُن کا یہ قول ہے کہ عموماً کیسی ہی مضبوط اور محکم اسناد کیوں نہ ہوں۔ احادیث پر اعتبار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ جو شئے اس میں بیان کی گئی ہے اس کا یقینی علم اس سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس قول پر اگر خیال کیا جائے تو احادیث کے لئے معیار صداقت اور اصولِ عقلی کے قائم کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ بذاتِ خود بالکل ناقابلِ اعتبار ہیں۔"
>
> (اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام صفحہ ۲ ج ۱)

اس آواز کا محرک

قطع نظر اس سے کہ احادیث کو جمع کرنے والے محققین کی جانب جو بات منسوب کی گئی ہے وہ فی نفسہٖ واقعہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ جذبہ دیکھنے کے لائق ہے۔ جس نے یہ رجحان پیدا کیا۔ اور جس نے اس ادعائے فاسد، احادیث کے بذاتِ خود ناقابلِ اعتبار ہونے کے ارتکاب پر مجبور کیا۔ ملاحظہ ہو:-

> "دُنیا بھر میں سلطنت انگریزی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے
>
> یعنی ملکہ انگلستان و قیصرہ ہند کی عملداری سب بادشاہوں سے

زیادہ خصوصاً اعلیٰ حضرت سلطانِ روم سے بھی زیادہ مسلمانوں پر ہے"

(اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام طبع ۱)

چنانچہ "قیصرۂ ہند" کی سلطنت کو "اسلامی" ثابت کرنے اور "قیصرۂ ہند" کے زیر سایہ پروان چڑھنے والے مغربی افکار و فلسفہ کو عین تعلیم "قرآن" قرار دینے کے لئے قرآن کو پورے طور پر استعمال کیا گیا۔ اور قرآن کے مدعا و منشاء کو متعین کرنے والی جو چیز (حدیث) تھی وہ اسی لئے بذاتِ خود ناقابلِ اعتبار قرار دی گئی!

ادارۂ "فاران"۔

مظلوم اقبال!

علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم اللہ کی کتاب ـ قرآن پاک ہے! مگر آج وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ خود اُن کے کلام پر، عقیدت و محبت کے نام پر وہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں کہ خدا کی پناہ! اقبال نے کہا تھا ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بو لہبی است

اقبال نے جس ذاتِ گرامی کو "دیں ہمہ اوست" کہا ہے۔ آج اُس مقدس ترین شخصیت کے قول و عمل کو بے اعتبار ٹھہرانے کے لئے باقاعدہ مہم چلائی جا رہی ہے اور اس مہم کو وہ لوگ چلا رہے ہیں جو اقبال کو اپنا روحانی مُرشد اور دینی امام سمجھتے ہیں اور پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ اپنے ان مفروضہ عقائد اور گمراہ کن افکار و تصورات پر خود اقبال ہی کے کلام سے دلیلیں لاتے ہیں! اس بُت پرست کو کیا کہیئے جو قرآن کی آیات بُت پرستی کے جواز میں پیش کرنے کی جسارت کرے اور ذرہ برابر نہ شرمائے کہ علمی دنیا اس کے ان ہفوات کو سُن کر اور پڑھ کر کیا کہے گی!

رسالہ "طلوعِ اسلام" جس پر برسوں علامہ اقبال کی تصویر چھپتی رہی ہے۔ آج اُس نے باقاعدہ ایک ادارے کی صورت اختیار کرلی ہے اور اس ادارے کا مشن ہی یہ ہے کہ علامہ اقبال نے جس عظیم المرتبت شخصیت (فداہ ابی و امی) کو "دیں ہمہ اوست" کہا ہے، اس کے قول و عمل اور حدیث و سنّت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا کر مسلمانوں کو "اسوۂ رسولؐ" سے بیزار بنا دے۔ اور اہلِ ایمان کے دلوں میں یہ بات اُتار دے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و عمل نہ صرف یہ کہ دین میں حُجت نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو قرآن کے خلاف ایک عجمی سازش ہے (خاک بدہن گستاخ)

علامہ اقبال کے شاگرد، ہم نشین اور اُن کے دیکھنے والے آج موجود ہیں۔ اور وہ اس کے گواہ ہیں کہ اقبال نے احادیث رسولؐ سے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ وہ حدیث کو "تاریخ" نہیں دین میں حجت سمجھتے تھے۔ اپنی عمر کے آخری حصہ میں تو اقبال احادیث نبوی پڑھوا کر سُنا کرتے تھے۔ اور حضورؐ کے ارشادات پر فرطِ محبّت و عقیدت سے اُن کی آنکھیں اشکبار ہو ہو جاتی تھیں۔ اقبال کے مکاتیب اس کی شہادت دے رہے ہیں کہ حضور رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ گرامی تو تمام اہلِ ایمان کے نزدیک متفق طور پر واجب الاطاعت ہے ہی۔ اس میں تو کوئی زندیق اور بے دین ہی شک کر سکتا ہے مگر اقبال تو ائمہ دین کے اقوال سے بھی سند لیتے ہیں اور ان بزرگوں کی دینی فکر کے بھی معترف ہیں۔

علامہ اقبال تقلید جامد کے قائل نہ تھے۔ ان کے کلام میں زیادہ سے زیادہ حُریتِ فکر پائی جاتی ہے۔ اُن کا کلام پڑھ کر عقل اس نتیجہ پر پہنچتی ہے کہ شاعر نے قرآن و حدیث پر برسوں غور و تدبّر کیا ہے۔ اقبال کے یہاں سطحی جذباتیت نہیں ملتی۔ فکر کی پختگی اور رائے کی اصابت اُن کے کلام کی ممتاز خصوصیت ہے! یہ بات کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے کہ عارف رومیؒ سے اقبال بہت زیادہ متاثر ہوا اور اُن کے روحانی شاگرد ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ اور اس بات کو

ہر کوئی جانتا ہے کہ مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ عام مسلمانوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو دین میں حجت سمجھتے تھے۔ اگر عارف رومیؒ کے اس مسلک سے اقبال کو اختلاف ہوتا تو وہ اپنے کلام میں اس کا ضرور اظہار کرتے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ اقبال حدیث کو دین میں حجت سمجھنے میں مولانا رومؒ کے ہم عقیدہ تھے۔

ہم چیلنج کرتے ہیں اگر کوئی یہ ثابت کر دے کہ اقبال نے احادیث اور سنتِ رسولؐ پر اشارتاً اور کنایتہً کبھی طنز کی ہو۔ نہیں کی۔ اقبال ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ کہ "اطیعوا اللہ" کے ساتھ "واطیعوا الرسول" کی نص قطعی پر بھی اُن کا ایمان تھا۔ اقبال اُن منافقین میں نہ تھے جو دین کی کچھ باتوں کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ اقبال دین کامل پر ایمان رکھتے تھے، محبتِ رسولؐ تو اقبال کا دین و ایمان تھی۔ حضورؐ کی ذات سے اقبال کی محبت اس طرح نہ تھی جیسے مشاہیر شاعروں، نامور فلسفیوں، کشور کشا سپہ سالاروں اور تاریخ کی مشہور شخصیتوں (Heroes) سے لوگوں کو محبت اور عقیدت ہوا کرتی ہے۔ اقبال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، عقیدت اور اطاعت کو دین و ایمان کا لازمہ سمجھتے تھے۔ سکندر یونانی سے چاہے کوئی عقیدت رکھے یا نہ رکھے، فردوسی کے کمال شاعری کا کوئی قائل ہو یا نہ ہو، افلاطون اور ارسطو کے حکیمانہ اقوال کو چاہے کوئی مانے یا نہ مانے۔ مگر محمد عربی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تاریخ کے ہیرو نہیں بلکہ واجب الاطاعت رسول ہیں۔ ایک مسلمان پر حضورؐ کی اطاعت فرض ہے۔ سنتِ رسولؐ سے بے نیازی اور بیزاری نفاق اور بے دینی کی علامت ہے۔ ایک شخص اپنے کو مسلمان بھی کہے اور حضورؐ کی سنت کو دین میں حجت نہ سمجھے تو ایسے شخص کا اسلام اور ایمان نقش برآب سے زیادہ نہیں ہے۔ مسلمان ہونا ہی اُس وقت ہے جب "لا الٰہ الا اللہ" کے ساتھ "محمد الرسول اللہ" کا بھی اقرار کرے اور "محمد الرسول اللہ" کے اقرار کے معنی ہی یہ ہیں کہ حضورؐ کے قول و عمل کی اطاعت کی جائے۔

اگر اس دُنیا کے احوال و واقعات کا عالمِ برزخ سے کوئی تعلق اور ربط ہے تو اقبال کی روح کو سب سے زیادہ اذیت اُن کا نام نہاد روحانی شاگرد پرویز پہنچا رہا ہے۔ جس کا مشن ہی:-

"بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست"

کی تردید اور تکذیب ہے!

اقبال نے اپنے کلام میں بیشک "ملّا" پر طنز کی ہے اور اس کا یہ مصرعہ ؏

دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

تو ضرب المثل بن چکا ہے! مگر وہ لوگ جو منکرات و فواحش میں "اباحت" کے پہلو نکالتے ہیں اور فسق و فجور میں "رخصتیں" پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے اقبال کے وہ تمام اشعار جن میں "ملّا" پر طنز کی گئی ہے۔ اُن کا علمائے حق سے جوڑ ملا دیا ہے۔ اُن علماء حق سے جو منکرات پر احتساب کرتے ہیں اور فسق و فجور پر ٹوکتے رہتے ہیں!

وہ لوگ جو نہ صرف یہ کہ فسق و فجور کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بلکہ چاہتے بھی یہی ہیں کہ دُنیا میں فسق و فجور کا رواج ہو، اقبال کے "ملّا" کی آڑ لے کر معروف و تقویٰ کے داعیوں پر طنز کرتے ہیں۔ اور دینی روایات کا طرح طرح سے مذاق اُڑاتے ہیں!

اقبال نے جس "ملّا" پر طنز کی ہے۔ وہ ابو حنیفہ۔ مالک۔ احمد بن حنبل۔ شافعی۔ غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم۔

شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید (رحمہم اللہ تعالیٰ) اور ان سے ملتے جلتے علماء حق ہرگز نہیں ہو سکتے۔ اقبال نے اس "ملا" پر طنز کی ہے جو "مرغ باد نما" ہوتا ہے۔ ہوا کا ساتھی۔ زر و مال کا بندہ، جابروں اور ظالموں کو "نجات دہندہ" کہنے والا۔ فاسق و فاجر حاکموں کی تعریف کرنے والا۔ شریعت کی چھوٹی چھوٹی جزئیات پر لڑنے والا۔ ارباب اقتدار کے چشم و ابرو کا اشارہ پاکر اقامتِ دین کے داعیوں کی مخالفت کرنے والا۔ نفس کا بندہ اور خواہشوں کا غلام! حق و باطل کی جنگ جاری ہو اور وہ آمین اور رفع یدین کی نزاع چھیڑ کر اہلِ حق کی صفوں میں انتشار پھیلا دے! اس ذہنیت و کردار کے "علماء سوء" بیشک "ملا" ہیں اور اقبال نے انہی پر طنز کی ہے!

مگر وہ عالمِ حق جو تصویر کشی اور مجسمہ سازی پر اس لئے روک ٹوک کرے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی ہے۔ رقص و سرود پر اس لئے احتساب کرے کہ خود مہبطِ وحی نے ایسی باتوں کو برا سمجھا ہے۔ کلب گھروں کی بے قید زندگی، مرد و زن کے بیباکانہ اختلاط۔ گھوڑ دوڑ کی قمار بازی۔ سودی لین دین۔ بے حیائی۔ فحاشی کو گناہ بتائے کہ کتاب و سنت کا یہی منشا ہے تو ایسا حق شناس عالم "ملا" نہیں ہے۔ اقبال کے نزدیک ایسا عالم تو لائقِ احترام ہے۔ اس قسم کے حق گو علماء تو ہر زمانے میں رہنے چاہئیں۔ ایسے پاک نظر اور پاک باطن محتسبوں کی تو ہر دور میں ضرورت ہے۔ جو عوام و خواص کو ان کی غلطیوں پر ٹوکیں اور حق و باطل جب مل جل کر سامنے آئیں تو انگلی رکھ کر بتا دیں کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے!

آج کی مادیت زدہ دنیا کی تہذیب تو یہ ہے کہ عورتوں کے حسن کے دھڑلے کے ساتھ مقابلے ہوتے ہیں۔ جوان لڑکیاں اسٹیج پر ناچتی ہیں۔ عورتیں ہاکی اور کرکٹ کے میچ کھیلتی ہیں۔ تہذیب و تمدن کی نگاہ میں یہ باتیں چاہے کتنی ہی پسندیدہ اور ترقی کی نشانیاں کیوں نہ ہوں۔ مگر ایک عالمِ حق تو وہی کہیگا جو خدا اور رسول کا حکم اور منشا رہے، تہذیب و تمدن کی معصیتوں کی خاطر شریعت میں تو لچک پیدا نہیں کی جاسکتی ہاں! "ماڈرن ملا" پیدا کرسکتا ہے مگر عالمِ حق ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ تو ان تمام باتوں کو فحش و گناہ ہی بتائے گا۔ مگر وہ نفس کے بندے اور خواہشوں کے پجاری جن کے افکار و اعمال گروِ غیر ہو چکے ہیں، ان کی بارگاہ سے اس عالمِ حق کے خلاف "ملائیت" کا فتویٰ صادر ہوگا۔ اور اس فتوے پر جواز اقبال کے شعروں سے لایا جائے گا۔ اقبال کے کلام کے ساتھ یہ کتنا دردناک مذاق ہے جو ہو رہا ہے۔ مذاق ہی نہیں۔ ظلم بھی!

اقبال تو یہ چاہتا ہے کہ مسلمان عورتوں کے کردار میں خدیجہ۔ فاطمہ، عائشہ اور رابعہ بصری (اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمتیں ہوں) کی سیرت و کردار کی جھلک پیدا ہو اور "ماڈرن ملا" اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مسلمان عورتیں "گریٹا گاربو" "ریٹا ہیورتھ" اور "دیوکا رانی" بن جائیں۔ عالمِ حق اس پر ٹوکتا ہے تو یہ لوگ شرمندہ اور قائل ہونے کے بجائے الٹی اسی پر "ملا" کی پھبتی چست کرتے ہیں۔ اور اقبال کے اشعار دلیل میں لاتے ہیں۔ حالانکہ اقبال کے شعروں کا ان کی طنز سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ عوام کو دھوکا دیتے ہیں۔ اور لفظ "ملا" سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

آج کی دنیا تو اس سطح پر آگئی ہے کہ ایک شخص مسلسل نو گھنٹے سائیکل چلاتا ہے اور لوگ اسے مبارکباد دیتے ہیں اخبارات میں اس کے فوٹو اور تعریفیں چھپتی ہیں مگر دینی نقطہ نگاہ سے ایسا شخص گنہگار اور مجرم ہے کہ اس طرح

اس کی بیس بائیس وقت کی نمازیں قضا ہو گئیں اور شارع علیہ السلام نے دیدہ و دانستہ ایک وقت کی نماز کے ترک کو "کفر" قرار دیا ہے۔ تو ایک عالم حق سائیکل چلانے کے اس ریکارڈ کو "گناہ" کہیگا کہ اس بد توفیق نے صرف شہرت حاصل کرنے کے شوق میں اتنی بہت سی نمازیں قضا کر دیں۔ "مغرب زدہ طبقہ" عالم حق کے اس فتوے کو "ملائیت" سے تعبیر کرے گا اور اپنی اس رائے کے بعد اقبال کے چند شعر جن میں "ملا" پر طنز ہوگی، درج کر دے گا!

یوم اقبال زیادہ تر وہ لوگ مناتے ہیں جو بے عملی میں اپنی آپ مثال ہیں اور جن کی زندگیاں اسلام و اخلاق سے بہت دور ہیں۔ "یوم اقبال" کے جلسوں کے لئے وہ "بڑے لوگ" اپنے رسمی پیغام بھیجتے ہیں۔ جن کا وجود ملک و ملت کے لئے "بری مثال" ہے۔ ہائے! "یوم اقبال" کے اجتماعات کے یہ مقرر اور مقالہ نگار ــــ اگر علامہ اقبال زندہ ہوتے تو انھیں دیکھ کر چیخ اٹھتے کہ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" اقبال کے فلسفۂ خودی کی شرح وہ کر رہے ہیں جو اپنی خودداری کو سستی سے سستی قیمت پر بیچتے رہتے ہیں۔ اقبال کے پیام کے وہ لوگ علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ جو زمانہ ساز، مصلحت شناس اور ابن الوقت ہیں۔ زاغ و کرگس اس کے مدعی ہیں کہ ہم اقبال کے "شاہین" کے ترجمان ہیں۔ اہل نفاق اس کے دعویدار ہیں کہ اقبال کے "مردِ مومن" کو ہم پہچانتے ہیں!

اقبال نے کہا تھا ؎

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

مگر آج کلام اقبال کے شارحین وہ لوگ ہیں جو نہ تو "دلِ بینا" کی تمنا رکھتے ہیں اور نہ "نورِ دل" کے قائل ہیں۔ یہ حضرات دل کی روشنی اور بینائی ہی کے سرے سے منکر ہیں۔

اقبال کہتا ہے۔ ع

عشق با نانِ جویں خیبر کشاد

اور یہ "عقیدت مندانِ اقبال" جوانانِ نبرد آزما کو بادہ و شاہد کا چسکا لگانا چاہتے ہیں اور ان کی یہ کوشش رہتی ہے کہ چھاؤنیوں اور سرکاری دفتروں میں ایسا لٹریچر کہیں نہ پہنچ جائے جو اخلاق و پاکیزگی کے احساس کو بیدار کر دے!

اقبال نے "پاک نگاہی" کا درس دیا ہے اور یہ "اقبالئین" دنیا میں سب سے زیادہ دشمن "پاک نگاہی" ہی کے ہیں۔ ان کے جلسوں میں کنواری لڑکیاں تھرک تھرک کر اور دیدے مٹکا مٹکا کر اقبال کے شعر گاتی ہیں۔ اور مرد ان کی بے حجابی سے، جلوہ آرائی سے، ترنت اور ناز و انداز سے اپنی نگاہوں کی ہوس پوری کرتے ہیں! ہوس جن کا اوڑھنا بچھونا اور نفس کی پوجا جن کا مشغلہ ہو وہ اقبال کے کلام کے سب سے زیادہ دلدادہ ہیں۔ اس کلام کے جس میں تقویٰ، پاکبازی اور نکوکاری کے دریا موج زن ہیں!

اقبال "کم آمیزی" کا مبلغ تھا اور یہ اقبال کے عقیدت کیش ہر تہذیب اور ہر تمدن میں گم ہو جانے کے لئے ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ اپنی اسلامی روایات کے علاوہ ہر ملک اور ہر تہذیب کی روایات سے ان کو دلچسپی ہے!

اقبال نے مغربی تہذیب و تمدن پر کتنی چوٹیں کی ہیں اور اسے دنیا کے لئے لعنت بتایا ہے۔ مگر اقبال کی بارگاہ میں یہ خراج عقیدت پیش کرنے والے مغربی تہذیب کے رسیا بنے ہوئے ہیں۔ ان کا ظاہر ہی نہیں باطن بھی

مغرب زدہ ہوکر رہ گیا ہے۔ اُن کے فکر و نظر "گرد غیر" ہو گئے ہیں۔ دل سے نگاہ تک "افرنگی" ! جیسے اُن کا نسب نامہ کسی "سائمن" یا "ویکفیلڈ" سے جا کر ملتا ہے۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن (اقبال)

مگر اقبال کے یہ شیدائی یا تو "مستبار نظر پر کاش" بنے ہوئے ہیں یا "مثنوی زہر عشق" ۔۔ بہرحال قرآن کی تو ان کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اس عالمِ قدس سے تو وہ دور ہی رہنا چاہتے ہیں۔ اسلام اور قرآن کے نام سے تو انھیں چڑھ ہے۔ "جمہوریت، انسانیت، صحت مند تمدن" اس قسم کی اصطلاحیں وہ بولتے رہتے ہیں۔ مگر اسلام کا نام اُن کی زبانوں سے نہیں نکلتا!

دوسری طرف یہ "سُرخے" ہیں کہ اقبال کے اس شعر کو ۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

چیخ چیخ کر سناتے ہیں کہ اقبال تو اشتراکیت سے متاثر تھا۔ حالانکہ اقبال اسلام کے سوا اور کسی نظام حیات کا سرے سے قائل ہی نہ تھا۔ اور ان اشتراکیوں کو تو وہ "کوچہ گرد" سمجھتا تھا!

اقبال کے کلام کے ساتھ یہ ظلم ہو رہا ہے اور ڈنکے کی چوٹ کھلے خزانے ہو رہا ہے اور جب تک صالح افکار کو پوری طرح اُبھرنے کا موقع نہ ملے گا۔ یہ ظلم ہوتا رہے گا اور اقبال کے پیام کی مظلومیت کم نہ ہوگی!
اقبال کا سب سے بڑا عقیدت مند، قدر شناس اور خیر خواہ وہ ہے جو اقبال کے کلام کو اس مظلومیت سے چھڑا دے!!

ملّا واحدی

سرورِ کائنات کی معاشرت

روزمرہ کے جستہ جستہ واقعات، اخلاق، عادات اور معمولات!

(جناب ملّا واحدی کی زیرِ ترتیب کتاب "سرورِ کائنات" کے چند ورق)

ایک مرتبہ حضرت امام حسینؓ نے حضرت علی مرتضےٰؓ سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عادات و خصائل دریافت کیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:۔

"حضورؐ خندہ جبیں، نرم خُو اور مہربان طبع اور فیاض تھے۔ کبھی کوئی بُرا کلمہ حضورؐ کی زبان پر نہیں آتا تھا۔ نتیجہ خیز اور کار آمد باتیں کیا کرتے تھے۔ فضول بولنا اور ضرورت سے زیادہ بولنا یا بحث مباحثے میں پڑنا حضورؐ سے ہمیشہ بعید رہا۔ کبھی کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتے تھے۔ کبھی کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ نہیں لگاتے تھے۔ دوسرا بولنے لگتا تو اُسے دل کھول کر بولنے دیتے تھے۔ اُس کی بات درمیان میں نہیں کاٹتے تھے۔ کوئی بیباک گستاخانہ گفتگو کرتا تو حضورؐ کا تحمل دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ کوئی کسی احسان کا شکریہ ادا کرتا تو سُن لیتے لیکن اپنی تعریفیں سننی پسند نہیں فرماتے تھے۔ لوگ باتیں کرتے کرتے ہنستے تو حضورؐ بھی مسکرا دیتے تھے۔ اور لوگ کسی امر پر حیرت کا اظہار کرتے تو حضورؐ اُن کے ساتھ اظہارِ حیرت میں شریک ہوجاتے تھے۔ کسی کی کوئی درخواست نامنظور کرنی چاہتے تو حتی المقدور زبان سے نامنظوری کے الفاظ نہیں نکالتے تھے۔ خاموش رہتے تھے۔ یا اغماض برتتے تھے۔ مزاج شناس اصحاب حضورؐ کے تیور سے سمجھ جاتے تھے۔ [illegible] حضورؐ کو کبھی نہیں دیکھا گیا۔"

حضورؐ کے عادات و خصائل کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ہند بن ابی ہالہؓ کی روایتیں بھی ہیں —

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ:۔

"درگزر کرنا اور معاف فرما دینا حضورؐ کا شیوہ تھا۔ حضورؐ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔ کبھی کسی خادم کو یا کسی جانور کو زدو کوب نہیں کیا۔ حضورؐ دوستوں میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے کہ وہ حافظوں میں محفوظ ہوجاتی تھیں۔ گھر میں تشریف لاتے تو چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔"

حضرت علیؓ اپنے بچپن سے حضورؐ کی وفات تک حضورؐ کے ساتھ رہے۔ حضرت عائشہؓ بیوی تھیں۔ حضرت ہند بن ابی ہالہؓ بھی بالکل قریبی آدمی تھے۔ حضورؐ کی گودیوں کے کھلائے ہوئے۔ وہ کہتے ہیں:۔

"حضورؐ انسان تو انسان کسی چیز کو بھی بُرا نہیں کہتے تھے۔ مثلاً کھانا جیسا سامنے آجاتا بغیر ناک بھوں چڑھائے

نوش فرما لیتے تھے۔ ذاتی معاملات میں حضورؐ نے کبھی غصہ نہیں کیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار شکر فرماتے تھے۔"

حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا وہ فقرہ بھی یہاں دہرانے کے قابل ہے جو انہوں نے اس وقت فرمایا تھا جب حضرت جبریل علیہ السلام حضورؐ کو پہلی دفعہ دکھائی دیئے ہیں۔ اور حضورؐ گھبرائے ہوئے غار حرا سے جلدی جلدی گھر پہنچے ہیں۔ حضورؐ نے کہا کہ خدیجہ! مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے۔ تو حضرت خدیجہؓ نے جواب دیا:-

"اللہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ آپ صلہ رحم کرتے ہیں۔ غربا کو مدد دیتے ہیں۔
مقروضوں کے قرض چکاتے ہیں۔ مصیبت زدوں کے کام آتے ہیں۔"

حضرت خدیجہؓ کی یہ رائے حضورؐ کے بارے میں نبوت سے قبل تھی۔ پندرہ برس حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی قبل نبوت بیوی رہیں اور دس برس بعد نبوت۔ نبوت کے بعد حضرت خدیجہؓ کی جو رائے ہوگی وہ اس سے ظاہر ہے کہ ادھر حضورؐ نے فرمایا کہ "مجھے اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔" ادھر حضرت خدیجہؓ نے کہا "تم سچے ہو۔ میں تم پر ایمان لاتی ہوں۔" اور پھر اسلام کی خاطر اپنے آپ کو امیر سے غریب بنا لیا۔ حضورؐ کی کچھ ایسی ہی عادات و خصائل تھیں۔ جنہوں نے حضرت خدیجہؓ پر حضورؐ کی حقانیت کا سکہ بٹھا رکھا تھا۔

حضرت عائشہؓ نے ایک اور موقع پر فرمایا "کان خلقہ القرآن" حضورؐ کے عادات و خصائل قرآن مجید کے مطابق تھے۔

قرآن کہتا ہے۔ "لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ" جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہو۔ حضورؐ جو کہتے تھے وہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا بھی حضورؐ کی نسبت ارشاد ہے۔ "اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ" اے محمدؐ! تمہارا اخلاق بہت اعلیٰ ہے۔

اسلام متوازن دین ہے۔ اسلام اعتدال سکھاتا ہے۔ اسلام غلو پسند نہیں کرتا۔ حضورؐ کا ہر عمل متوازن، معتدل اور غلو سے پاک تھا۔ حضورؐ قرآنی تعلیم کا نمونہ تھے۔

حضورؐ جو عمل جس طرح اختیار کر لیتے تھے پھر اسے اسی طرح کئے جاتے تھے۔ موسلا دھار بارش وہ اثر نہیں چھوڑتی جو مستقل تقاطر کا ہوتا ہے۔ موسلا دھار بارش کا پانی بہہ جاتا ہے اور مستقل تقاطر پتھر میں گڑھا ڈال دیتا ہے۔ استقلال بڑی صفت ہے۔ استقلال سے کام بوجھ نہیں رہتا۔ طبیعت کا جزو بن جاتا ہے۔ انسان پھر اس کے برعکس کام کر ہی نہیں سکتا۔

حضورؐ دن رات نمازیں نہیں پڑھتے تھے۔ بارہ مہینے روزے نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جتنی عبادت کرتے تھے پابندی سے کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:-

"حضورؐ رات کے ایک حصے میں نفل پڑھنے کے عادی تھے۔ اُن نفلوں کی مقررہ تعداد حضورؐ نے بیماری کی وجہ سے کبھی ناغہ نہیں کی۔"

حضورؐ کے ہر عمل میں استقلال تھا۔ ایک صحابی ہیں۔ حضرت جریر بن عبداللہؓ۔ انہیں حضورؐ جب دیکھتے تھے تو از راہ شفقت مسکرا دیتے تھے۔ اس مسکراہٹ میں عمر بھر فرق نہیں آیا۔ حضورؐ کی حدیث ہے "اِنَّ اَحَبَّ الْعَمَلِ اِلَی اللّٰہِ اَدْوَمُہٗ" اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل وہ ہے جسے پابندی سے کیا جائے۔ حضورؐ سونے جاگنے کے اوقات اور ملنے جلنے کے انداز تک میں پابندی کرتے تھے۔ جس کام کے کرنے کا جو وقت مقرر کر لیا تھا وہ اسی وقت کیا جاتا تھا۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے دن کے تین حصّے کر رکھے تھے۔ ایک حصّہ خاص اللہ کے لئے تھا۔ ایک اللہ کے بندوں کے لئے اور ایک اپنی ذات کے لئے۔

سورہ مزمّل کا نزول شروع ہونے کے بعد بارہ مہینے تک قیام لیل حضورؐ پر فرض ہوگیا تھا۔ سورہ مزمّل کی باقی آیتیں، جن سے قیام لیل میں تعدیل آئی اور فرض نفل سے بدلے۔ بارہ مہینے رکی رہی تھیں۔ بارہ مہینے حضورؐ نے اس قدر شب بیداری کی اور اتنی نمازیں پڑھیں کہ پاؤوں پر ورم آگیا۔ نفل قرار پانے کے بعد معمول یہ تھا کہ نماز عشاء سے فراغت پاکر حضورؐ فوراً سو جاتے تھے۔ سوتے وقت قرآن مجید کی کوئی سورۃ ضرور تلاوت کرتے تھے۔ سونے لگتے تو کہتے "اللّٰھم باسمک اموت واحییٰ" یا اللہ! تیرا نام لے کر میں مرتا ہوںؔ اور جیتا ہوں۔ جب جاگتے تو فرماتے۔ "الحمد للہ الذی احیانا بعد اذا اماتنا والیہ النشور" اس اللہ کا شکر ہے جس نے موت کے بعد زندہ کیا۔ بالآخر تو اسی کے پاس جانا ہے۔

سرہانے مسواک رکھی رہتی تھی اور وضو کے لئے پانی موجود ہوتا تھا۔ اٹھتے ہی مسواک فرماتے۔ پھر وضو کر کے نماز میں مشغول ہو جاتے۔ بستر ایسے رُخ بچھتا تھا کہ نماز بستر کے سرہانے کھڑے ہوکر پڑھتے تھے۔

داہنی کروٹ سے سونے کی عادت تھی اور سوتے میں دایاں ہاتھ رخسار کے نیچے رہتا تھا۔

اپنے پھٹے کپڑے خود سی لیتے تھے، اپنے ٹوٹے جوتے خود گانٹھ لیتے تھے۔ دودھ بھی دوہ لیتے تھے۔

نماز فجر کے بعد جو نشست ہوتی تھی اس میں لوگوں کو بولنے کی آزادی تھی۔ لوگ کوئی ہنسی کی بات کرتے تو حضورؐ بھی مسکرا دیتے تھے۔ لیکن نماز عشاء کے بعد بات چیت نہیں کرتے تھے۔ نماز عشاء کے بعد گھر میں آکر بھی چار رکعتیں پڑھتے تھے۔ عبادتِ شبانہ رات کے دُوسرے حصّہ میں کی جاتی تھی۔ نوافل اور فرضوں سے پہلے کی سنتیں عموماً گھر ہی میں پڑھی جاتی تھیں۔ فجر کی سنتوں میں دیر نہیں لگاتے تھے۔ فجر کے فرض طویل ہوتے تھے۔ ان میں سو سو آیتیں تک حضورؐ نے تلاوت کی ہیں۔ ظہر اور عصر کے فرضوں میں نسبتاً چھوٹی سورتیں تلاوت کرتے تھے۔ مغرب کے فرضوں میں سورہ طور اور والمرسلات بہت پڑھتے تھے۔ اور عشاء کے فرضوں میں "والتین والزیتون" اور اس کے برابر کی سورتیں۔ جمعہ کی پہلی رکعت میں یسبح اللہ مافی السموات اور دوسری رکعت میں اذا جاءک المنٰفقون۔ اور عیدین کی پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں ھل اتاک حدیث الغاشیہ۔

جمعہ کا خطبہ حضورؐ کا مختصر ہوتا تھا۔ حضورؐ فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار، انسان کی سمجھداری اور تفقہ کی دلیل ہے۔

جمعہ اور عیدین کے خطبوں کے وقت ہاتھ میں عصا ہوتا تھا۔ منبر پر بیٹھتے تھے تو عصا ہٹا دیتے تھے۔

میدانِ جہاد کا خطبہ کمان پر ٹیک لگا کر دیا جاتا تھا۔

سفر عموماً صبح شروع کیا کرتے تھے۔ فوجوں کی روانگی کے واسطے بھی صبح ہی کا وقت تھا۔ رکاب میں پیر ڈالتے تو بسم اللہ کہتے اور قرآن مجید کی وہ آیت پڑھتے جس میں اللہ کی اس عنایت کا ذکر ہے کہ اس نے گھوڑے وغیرہ جانوروں کو

ؔ سونا بھی ایک قسم کا مرنا ہے۔ النوم اخ الموت۔ نیند موت کی بہن ہے۔

انسان کا تابع فرمان بنا دیا ہے۔ "سبحٰن الذی سخر لنا ھذا" الخ یعنی قابل تسبیح و تہلیل ہے وہ ذات جس نے ہمارے لئے اس جانور کو مسخر کر دیا ہے۔

سفر کے مصائب سے بچنے، سفر آسانی سے طے ہونے اور سفر میں اعمال پسندیدہ کرنے کی دعائیں مانگتے تھے اور بیوی بچوں کو اللہ کی حفاظت میں دیتے تھے۔

واپسی پر اوّل مسجد میں دو رکعت نماز پڑھتے اور نماز پڑھ کر گھر جاتے تھے۔

سفر میں تکبیر اور تسبیح و تہلیل اور دعاؤں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کسی اونچائی پر چڑھتے تو۔ کسی نیچائی میں اُترتے تو۔ کسی آبادی میں داخل ہوتے تو۔

بیماروں کی عیادت حضورؐ ضرور ضرور فرماتے تھے۔ دُوسروں کو بھی تاکید کیا کرتے تھے کہ عیادت ضرور کرنی چاہیئے۔ عیادت مسلمان کے لئے مثل فرض ہے۔

حضورؐ بیمار کو دلاسا دیتے۔ اُس کی صحت کی دعا کرتے۔ بیمار زبان سے مایوسی کا کلمہ نکالتا تو منغّض ہو جاتے۔ مایوسی اور بدفالی کی باتیں حضورؐ پسند نہیں فرماتے تھے۔ عیادت میں مسلم و غیر مسلم کی قید نہیں تھی۔ حضورؐ غیر مسلموں کی عیادت بھی کرنے جاتے تھے۔

حضورؐ سلام میں سبقت کیا کرتے تھے۔ راستہ میں خاموش چلتے تھے۔ لیکن سلام کرتے جاتے تھے۔

مصافحہ کے واسطے بھی دُوسرے کے ہاتھ بڑھانے کا انتظار نہیں ہوتا تھا۔ خود ہاتھ بڑھا دیتے تھے۔ اور پھر ہاتھ نہیں چھڑاتے تھے جب تک دُوسرا نہیں چھوڑتا تھا۔ ہاں یہ ہدایت تھی کہ جو صاحب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوں وہ اندر آنے کی اجازت بعد میں مانگیں پہلے سلام علیکم کہیں۔ حضورؐ کسی کے ہاں جاتے تو وہاں حضورؐ اوّل سلام کرتے اور پھر پُوچھتے کہ اندر آ سکتا ہوں۔ یونہی گھروں میں گھسے نہیں چلے جاتے تھے۔ اور اوروں کو بھی بتاتے تھے کہ سلام کرکے اور اجازت لے کر دوسرے کے گھر میں قدم رکھا کرو۔ اجازت مانگتے وقت اپنا نام بتایا کرو۔ صرف "میں ہوں" نہ کہا کرو۔ تین دفعہ دستک دینے کے باوجود جواب نہ ملتا تو حضورؐ واپس لوٹ جاتے تھے۔ دستک نہیں دیئے جاتے تھے۔

حضورؐ ہر شخص کی بات کامل یکسوئی کے ساتھ سنتے تھے۔ بات کرنے والا بات کر چکتا اور مُنہ ہٹا لیتا تب حضورؐ بھی دُوسری طرف متوجہ ہوتے تھے۔

حضورؐ اپنے گھر میں بھی نمایاں ہو کر نہیں بیٹھتے تھے اور دوسروں کے ہاں بھی ممتاز جگہ بیٹھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

سب مل کر کام کرتے تو حضورؐ اُن کے ساتھ مساویانہ شریک رہتے تھے۔ یہ بھی حضورؐ کو ناپسند تھا کہ خود سوار ہوں اور لوگ ہمراہ پیدل چلیں۔

غزوۂ بدر میں سواریوں کی قلت تھی۔ طے پایا کہ تین تین آدمی باری باری ایک اونٹ کی سواری لیں۔ حضورؐ نے اپنے ساتھ بھی دو آدمیوں کو شریک کیا۔ انہوں نے جب اُن کی باری آئی تو اپنی باری چھوڑنی چاہی۔ حضورؐ نے فرمایا:۔

"تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا نہیں چل سکتے۔ اور ثواب کا بھی میں تم سے کم حاجتمند نہیں ہوں۔ اللہ کو وہ بندہ بُرا لگتا ہے جو ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے"

حضورؐ اپنے کاموں کا اجر اللہ سے لینا چاہتے تھے۔ بندوں سے لینا نہیں چاہتے تھے۔

ایک دفعہ حضورؐ کے وضو کا پانی چند اصحاب نے زمین پر نہیں گرنے دیا۔ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور منہ پر مل لیا۔ حضورؐ نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے کہا۔ "اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کے لئے ہم یہ کر رہے ہیں۔" حضورؐ نے فرمایا۔ "اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ سچ بولا کرو۔ امین بنو اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرو۔" اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ ہے۔

حضورؐ ہر کام سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے۔ ہر کام داہنے ہاتھ، داہنے پاؤں اور داہنی رُخ سے شروع فرماتے تھے۔ مثلاً کچھ تقسیم کرنا ہوتا تو داہنے ہاتھ اور داہنی رُخ سے تقسیم کرتے تھے۔ بلا لحاظ شخصیت[1]۔ یا مسجد میں جاتے تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھتے۔

کوئی مسلمانوں پر احسان کرتا اور نہ مدینہ میں مہمان بن کر آتا تو اس کی مہمانداری کے کام حضورؐ خود انجام دیتے تھے۔ اوروں سے اس کی خدمت نہیں کراتے تھے۔

بُروں کو بُرا کہنے، حتیٰ کہ منافقوں کو منافق کہنے میں حضورؐ کو تامل ہوتا تھا۔ اور بُرا کہہ دینے کی بے دھڑک جرأت حضورؐ کے نزدیک مستحسن نہیں تھی۔ کسی کی کوئی بات ناپسند آتی تھی تو اُسے حضورؐ اول تو برداشت کر لیتے تھے یا چہرے پر اثر دیکھ کر ناپسندیدہ حرکت کرنے والا سمجھ جاتا تھا۔ یا دوسرے اس کو سمجھا دیتے تھے۔ یا بعض اوقات حضورؐ دوسروں سے کہہ دیا کرتے تھے کہ فلاں شخص کو سمجھا دو کہ ایسی حرکت نہ کیا کرے۔ بعض اوقات خود بھی سمجھایا ہے مگر اس طرح کہ غلط کار کی ذلت نہیں ہوئی۔ وقت ٹال کر عام خطاب کر دیا کہ فلاں حرکت نامناسب و ناشائستہ ہے۔

حضورؐ نے مدت العمر کسی سے بدزبانی نہیں کی۔ مدت العمر کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا۔

حضورؐ کسی سے کوئی چیز لیتے تھے تو اُس سے بہتر اُسے واپس کرتے تھے۔ فیاضِ طبعی کے سبب اکثر قرض لینا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ وفات کے وقت بھی حضورؐ کی زرہ رہن تھی۔ لیکن قرض کی ادائیگی کا اتنا خیال تھا کہ مقروض کے جنازے کی نماز جب پڑھاتے تھے جب اس کا قرض ادا کرا دیتے تھے۔ قرض دینے والا عموماً یہودی ہوتا تھا۔ یہودی قرض کے تقاضے کرتا اور مزاج دکھاتا تو فرماتے قرض خواہ کو ان باتوں کا حق ہے۔

ایک دفعہ کہا:۔ "میں تین دن سے زیادہ روپیہ اپنے پاس نہیں روکتا۔ لیکن اگر میرے ذمہ قرض ہوتا ہے تو اُس کی ادائیگی کے انتظار میں روپیہ تین دن سے زیادہ رکھے رہتا ہوں۔"

ایک دفعہ فرمایا۔ "وہ بہترین انسان ہے جو خندہ پیشانی اور خوش معاملگی سے قرض ادا کر دیتا ہے۔"

فیاضِ طبعی کا یہ حال تھا کہ "نہیں" کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ مدد مانگنے والا خالی نہیں جاتا تھا۔ کچھ موجود نہ ہوتا اور قرض بھی نہ مل سکتا تو فرماتے کہ دوں گا ضرور۔ پھر آنا۔ انکار نہیں کرتے تھے۔ حضورؐ کا قول تھا۔ میں تو بانٹنے والا اور خزانچی ہوں۔ دینے والا اللہ ہے۔ إِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَخَازِنٌ وَاللّٰهُ يُعْطِي۔ (بخاری)

---

[1] حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورؐ میرے مکان میں تشریف فرما تھے۔ میں نے دودھ سامنے رکھا۔ حضورؐ کے دائیں جانب ایک بدوی بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ بائیں جانب تھے اور حضرت عمرؓ بالکل مقابل۔ حضورؐ نے دودھ پیا اور بچا ہوا دودھ بدوی صحابی کی جانب بڑھا دیا۔

معمولی سی چیز بھی کھانے بیٹھتے تو تمام حاضرین کو ساتھ بٹھا لیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوتا تھا کہ گھر میں کھانے کا جتنا سامان ہے دے دیا اور سارے گھر نے فاقہ کرلیا۔

فیاضی میں بھی مسلم وغیر مسلم کی قید نہیں تھی۔ سب فائدہ اٹھاتے تھے۔

لیکن سوال رد نہ کرنے کے ساتھ ساتھ حضورؐ سوال کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا پیٹھ پر لا دلائے اور اُسے بیچکر پیٹ پالے تو لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی نے حضورؐ سے سوال کیا تو حضورؐ نے پوچھا۔ "کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔ ایک چادر ہے جسے آدھا بچھاتا ہوں اور آدھا اوڑھتا ہوں۔ اور ایک پیالہ ہے پانی پینے کے لئے۔ حضورؐ نے فرمایا "دونوں چیزیں لے آؤ۔" وہ لے آئے تو حاضرین سے کہا۔ "کتنے میں خریدتے ہو؟" غرض دو درہم وصول ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا "ایک درہم کا کھانے پینے کا سامان گھر پہنچا دو اور ایک درہم کی رسّی خریدو اور جنگل سے لکڑیاں باندھ کر لاؤ اور انہیں بیچو۔"

پندرہ دن بعد وہ صاحب پھر حاضر ہوئے اور بولے اب میرے پاس دس درہم ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا "یہ اچھا ہے۔ یا یہ اچھا تھا کہ قیامت کے دن اُٹھتے تو گدائی کا داغ چہرے پر لگا ہوتا۔"

گدائی کے متعلق حضورؐ نے فرمایا ہے۔ "سواد الوجہ فی الدارین"۔ "دنیا اور عقبیٰ میں موجب روسیاہی۔"

حضورؐ جب کسی سے بیعت لیتے تھے تو اور باتوں کے ساتھ یہ بھی فرماتے تھے کہ "لا تسئلوا الناس شیئاً" لوگوں کے آگے ہاتھ مت پھیلانا۔

حضرت حکیم بن حزامؓ سے ایک دفعہ فرمایا۔

"اے حکیم! استغنا میں برکت ہے اور حرص وطمع میں محرومی۔ حرص وطمع کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھائے چلا جائے اور اس کا پیٹ کسی طرح نہ بھرے۔ یاد رکھو۔ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے افضل ہے۔"

ایک دفعہ فرمایا۔ "جو شخص بغیر حقیقی مجبوری کے مانگ کر کھاتا ہے وہ حرام کھاتا ہے۔"

حضورؐ نے اپنے اوپر اور اپنے اہل وعیال کے اُوپر صدقہ وزکوٰۃ کو حرام قرار دیا تھا۔ حضورؐ کی آل تا قیام قیامت صدقہ وزکوٰۃ نہیں لے سکتی۔

حضورؐ ہدیہ قبول فرمالیتے تھے۔ لیکن صدقہ وزکوٰۃ کی ایک کھجور بھی اپنے اہل وعیال کو نہیں کھانے دیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام حسنؓ نے صدقے کی کھجور کھالی تھی۔ حضورؐ نے انھیں ڈانٹا اور کھجور اگلوادی۔

ہدیوں اور تحفوں کے مبادلے کو حضورؐ نے ازدیادِ محبت کا ذریعہ بتایا ہے۔ "تھادُوا تحابّوا"۔ ایک دُوسرے کو ہدیہ بھیجو اور محبت کو بڑھاؤ۔

جن کے ہدیے اور تحفے حضورؐ قبول فرماتے تھے اُن کا بدلہ ضرور کرتے تھے۔ ایک دفعہ قیصر روم نے حضورؐ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی۔ حضورؐ نے اُسے پہن کر دیکھا اور پھر حضرت جعفر طیارؓ کو دیدیا اور کہا نجاشی (شاہ حبش) کو بھیج دو[1]۔

---

[1] مسلمانوں نے حبش ہجرت کی ہے تو شاہ حبش نجاشی نے عیسائی ہوتے ہوئے انھیں اماں دی ہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نجاشی کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہا۔ حضرت جعفر طیارؓ کا نجاشی سے زیادہ سابقہ پڑا تھا۔ اس لئے اُن سے کہا گیا کہ پوستین تم بھیجو۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ جن کے ہاں مدینہ پہنچکر حضورؐ نے چھ مہینے قیام فرمایا تھا - انھیں حضور بہت تحفے
بھیجا کرتے تھے - تحفہ کا مطلب پوستین جیسی قیمتی چیزیں ہی نہیں ہے - جو بھی بھیجا جا سکتا تھا بھیج دیا جاتا تھا - حضورؐ اپنے
اُوپر کسی کا احسان نہیں رکھتے تھے -

ہجرت کے وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے سواری کے لئے اُونٹ پیش کیا تھا - حضورؐ نے اس کی قیمت ادا کر دی
مدینہ میں مسجد کے لئے زمین قیمت ادا کر کے لی -

حضورؐ لوگوں کو اپنے سے اُچاٹنے والے انسان نہیں تھے اور اشاعتِ اسلام کی خاطر تو تالیفِ قلوب کا بہت
خیال رکھتے تھے - لیکن تالیفِ قلوب اپنی جگہ تھی اور عدل و انصاف اپنی جگہ -

سارے عرب میں صرف طائف وہ خطہ تھا جو فتح مکہ کے بعد بھی سرکشی سے باز نہیں آ رہا تھا - حضرت صخرؓ نے
طائف کا محاصرہ کیا اور تسخیر کر لیا - اہلِ طائف حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے :-

"صخر نے ہمیں اب کیوں ستا رکھا ہے - اطاعت سے پہلے اُن کا جو رویہ تھا وہ فلاں معاملہ میں اطاعت کے
بعد بھی باقی ہے"

حضورؐ نے حضرت صخر سے جواب طلب فرمایا - اور اُن کے خلاف فیصلہ دیا -

حضورؐ کی امانت داری اور حضورؐ کا انصاف - دو وصف ایسے ہیں جن پر غیر مسلموں نے بھی کسی آن انگلی نہیں اٹھائی
مکہ کے غیر مسلم شدید مخالفت کے زمانے میں بھی امانتیں حضورؐ ہی کے پاس رکھواتے تھے اور مدینہ میں یہودی اپنے
مقدمے حضورؐ کے پاس لاتے تھے - اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے - حضرت معاذ بن جبلؓ اپنے
محلہ میں نماز پڑھایا کرتے تھے - کسی نے حضورؐ سے شکایت کی کہ معاذ لمبی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں - حضورؐ نے اس شکایت
کے سننے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اُس میں ارشاد فرمایا :-

" اماموں کو چاہیئے کہ لوگوں کو اُچاٹائیں نہیں - مقتدیوں میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں - کم طاقت بھی - اور کام والے
بھی - لہٰذا نمازوں کو طول نہ دیا جائے "

حضورؐ سزائیں دینے کے شائق نہیں تھے - حضورؐ چاہتے تھے کہ لوگوں کو سزا کا خوف رہے اور لوگ جرم نہ کریں
لیکن جرم کا اظہار ہونے لگتا تھا تو حضورؐ چاہتے تھے کہ جرم ڈھکا رہے تو اچھا ہے - خصوصاً جب کوئی خود آ کر کہتا تھا
کہ میں نے فلاں جرم کیا ہے - مثلاً ایک صحابی سے زنا سرزد ہو گیا - کسی کو اُس کی خبر نہیں تھی - لیکن انہوں نے
سوچا کہ آخرت کے عذاب سے یہیں کی سزا بھگت لی جائے - وہ آئے اور کہنے لگے - یا رسول اللہ ! مجھ سے زنا کا
ارتکاب ہوا ہے - حضورؐ نے سُنی اَن سُنی کر دی - اور دوسری طرف مُنہ پھیر لیا - وہ دوسری طرف جا بیٹھے اور پھر بو
ارسول اللہ ! میں زنا کا مجرم ہوں - حضورؐ نے پھر رُخ بدل لیا - حضورؐ بار بار رُخ بدلتے تھے اور وہ بار بار اقرار
گناہ کرتے تھے - آخر حضورؐ نے پوچھا - تم دیوانے تو نہیں ہو - انہوں نے عرض کیا - حضورؐ ! میرا دماغ بالکل ٹھیک
ہے - حضورؐ نے پوچھا - تمہاری شادی ہو چکی ہے - انہوں نے عرض کیا - جی ہاں - بیوی ہے - حضورؐ نے فرمایا -
غیر عورت کو تم نے فقط ہاتھ لگایا ہو گا - انہوں نے عرض کیا - نہیں میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں - اس کے بعد حد
جاری کرنے کے سوا چارہ کیا تھا - حد جاری کر دی گئی -

ایک دفعہ ایک صاحب نے صرف اتنا عرض کیا کہ مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ گناہ کا نام نہیں لیا۔ حضورؐ اموش رہے۔ یہاں تک کہ نماز کا وقت آپہنچا۔ نماز کے بعد اُن صاحب نے پھر اپنے گناہ کی طرف توجہ دلائی۔ اور ہا۔ مجھے سزا دیجئے۔ اتفاق سے گناہ کا نام اب بھی اُن کی زبان پر نہیں آیا۔ حضورؐ نے پوچھا۔ کیا تم نے نماز ہیں پڑھی؟ وہ صاحب بولے۔ نماز پڑھ لی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ تو جاؤ غفورؐ رحیم نے تمہارا گناہ معاف کردیا ہے [1]

ایک دفعہ ایک صاحب نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! میں نے روزے میں اپنی بیوی سے مجامعت کرلی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ ایک غلام آزاد کردو۔ انہوں نے عرض کیا۔ غلام میرے پاس نہیں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ دو مہینے مسلسل روزے رکھ لو۔ انہوں نے عرض کیا۔ ایک روزے میں تو یہ ہوا۔ دو مہینے کیسے ضبط کروں گا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اچھا ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلاؤ۔ انہوں نے عرض کیا۔ اس کی بھی مقدرت نہیں ہے۔ اتنے میں کسی نے کھجوروں کی ٹوکری حضورؐ کی خدمت میں پیش کی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ لو یہ لے جاؤ اور غریبوں میں بانٹ دو۔ انہوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھ سے بڑا غریب مدینہ میں اور کون ہے۔ حضورؐ نے مسکرا کر فرمایا۔ جاؤ اپنے گھر والوں کو کھلاؤ۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔

تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک پیغمبر آیا۔ اُسے بہت شاق گزرتا ہے کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے۔ تمہاری بھلائی کا وہ بھوکا ہے۔ اور اہلِ ایمان کے ساتھ تو وہ نہایت نرم اور مہربان ہے۔

لیکن نرمی اور مہربانی اسی وقت تک کی جاتی تھی جب تک جرم ضابطہ میں نہیں آجاتا تھا۔ ضابطہ میں جانے کے بعد اللہ کے حکم کی تعمیل قطعی ہوتی تھی۔

ایک دفعہ ایک بڑی خاندانی عورت پر چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ حضورؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ لوگ چاہتے تھے کہ حضورؐ سزا میں تخفیف کریں۔ اور سفارشیں لاتے تھے۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ حدود اللہ کی زد میں تو میری بیٹی فاطمہ بھی آجاتی تو میں اسے معاف نہ کرتا۔ قانون محض غربا کے لئے نہیں ہے۔ امرا کے لئے بھی ہے۔ پچھلی اُمتیں تباہ اسی وجہ سے ہو گئیں کہ غریبوں کو سزائیں دیتی تھیں اور امیروں سے درگزر کرتی تھیں۔

حضورؐ جرموں اور عیبوں کی ٹوہ لگانے یا جرموں اور عیبوں کے اُچھالنے کو بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ اور کوئی

---

[1] ۔حضورؐ کی پردہ پوشی اور درگزر کے ساتھ اس پر بھی غور کیجئے کہ حضورؐ نے صحابہ کی ذہنیت کیسی پاکیزہ بنا دی تھی۔ غلطی کر بیٹھتے تھے تو غلطی کی سزا کے خود طلبگار ہوتے تھے۔ تاکہ اللہ کے ہاں پہنچیں تو پاک صاف پہنچیں۔ اُن کی توبہ کا کچھ ٹھکانا ہے۔

[2] ۔حضورؐ قہقہہ کبھی نہیں لگاتے تھے۔ بس مسکرا دیتے تھے۔

کسی کی زیادہ مدح کرتا تو اُسے بھی ٹوک دیتے تھے۔ کہ ممدوح سُن لے گا تو اس کا نفس موٹا ہو جائے گا۔ حضورؐ کی ہدایت تھی کہ مدح ہی کرنی ہو تو کہو میرا ایسا ایسا خیال ہے۔

اپنی بابت بھی کہتے رہتے تھے کہ مجھے میرے درجے سے مت بڑھاؤ۔ میں بس اللہ کا بندہ اور اللہ کا فرستادہ ہوں۔ مجھے دُوسرے انبیاء پر فضیلت مت دو۔ میرے لئے وہ الفاظ نہ استعمال کرو۔ جو اللہ تعالیٰ نے دُوسرے انبیاء کے لئے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ایک دفعہ کسی نے یا خیر البریہ کہہ کر حضورؐ سے گفتگو شروع کی۔ حضورؐ نے فرمایا خیر البریہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔

ایک دفعہ ایک صاحب کی زبان سے نکل گیا" جو اللہ چاہے اور جو اللہ کا رسول چاہے" حضورؐ نے کہا۔ تم نے مجھے اللہ کا ہمسر بنا دیا۔ صرف اللہ کا نام لو۔ کہو جو اللہ چاہے۔

حضورؐ ایک دفعہ کسی شادی کے گھر میں پہنچے۔ تو وہاں لڑکیاں گیت گا رہی تھیں۔ حضورؐ کو دیکھ کر انہوں نے گانا شروع کیا" فینا رسولٌ یعلم ما فی غداً" ہم میں وہ رسول تشریف فرما ہیں جو مستقبل کا حال جانتے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ یہ کیا گانے لگیں۔ وہی گائے جاؤ جو گا رہی تھیں۔

کسی صاحب کی کچھ کھجوریں حضورؐ پر قرض تھیں۔ حضورؐ نے وہ قرض ادا کیا تو اُن صاحب نے کہا۔ یہ ویسی کھجوریں نہیں ہیں جیسی میری تھیں۔ یہ گھٹیا کھجوریں ہیں۔ میں اچھی کھجوریں لوں گا۔ حاضرین نے انھیں متنبہ کیا کہ تمہارے مخاطب رسول اللہ ہیں۔ رسول اللہ سے ایسی باتیں کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ رسول اللہ عدل نہیں کریں گے تو پھر اور کون عدل کرے گا۔ میں عدل طلب کر رہا ہوں۔ حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ فرمایا۔ یہ سچ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو عزم و استقلال کا پیکر بنایا تھا۔ قرآن مجید میں تمام انبیاء کبار کے لئے اولوا العزم من الرسل کہا گیا ہے۔ حضورؐ اس وصف کے کامل مظہر تھے۔

مکہ کا یاس انگیز دور تھا۔ متواتر ناکامیوں سے متاثر ہو کر صحابہ کی زبان پر کچھ مایوسانہ الفاظ آ گئے۔ حضورؐ کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا۔ فرمایا:۔

"کیا کہتے ہو۔ تم سے قبل مسلمان آروں سے چیرے جا چکے ہیں۔ اُن کی کھالیں نوچی جاتی تھیں۔ واللہ اسلام ایک دن کامیاب ہو گا۔ صنعا اور حضرموت کے درمیان کا سا خطرناک راستہ اکیلا انسان طے کرے گا اور اسے خشیت اللہ کے سوا اور کسی بات کا کھٹکا نہیں رہے گا"

غزوہ احد میں حضورؐ نے صحابہ سے مشورۃً پوچھا کہ حملہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ صحابہ نے رائے دی کہ حملہ کیا جائے لیکن حضورؐ جب زرہ پہن کر تیار ہو گئے تو صحابہ کی رائے ہوئی کہ ابھی حملہ کا موقع نہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ نبی زرہ پہن کر اُتارا نہیں کرتا۔ اب حملہ ہو گا۔

حضورؐ شجاعت اور عزم و استقلال میں بھی اپنی آپ مثال تھے۔ حنین و احد میں بڑے بڑے بہادروں کے پیر اکھڑ گئے۔ مگر حضورؐ کوہ وقار کی طرح جمے رہے۔

حضورؐ ایفائے عہد کے سخت پابند تھے۔ نبوت سے قبل کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب سے حضورؐ نے کہہ دیا کہ تم گھر ہو آؤ۔ میں یہاں تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ وہ گھر جا کر ایسے پھنسے کہ تین دن میں پلٹے۔ دیکھا کہ حضورؐ موجود ہیں۔

حضرت ابو رافعؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ کفار مکہ کے سفیر بن کر آئے تھے۔ مگر مدینہ میں حضورؐ سے اتنے متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کر لیا۔ اور کہا۔ اب میں مکہ واپس نہیں جاؤں گا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ سفیر کو واپس ضرور جانا چاہیے۔ وہاں پہنچکر تمہارے دل کی یہی حالت رہے تو پھر آجانا۔ چنانچہ حضرت ابو رافعؓ واپس گئے اور دوبارہ تشریف لائے۔

کفار کے ساتھ عجیب و غریب برتاؤ تھا۔ وہ آتے تھے تو اُن کی مہمان داری بھی اس طرح کی جاتی تھی جس طرح دوستوں کی کرتے ہیں۔ وہ جان جان کر اتنا کھا جاتے تھے کہ حضورؐ کو اور حضورؐ کے اہل و عیال کو فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن حضورؐ اُن کی خاطر تواضع نہیں چھوڑتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی والدہ مسلمان نہیں ہوئی تھیں اور حضرت ابو ہریرہؓ کے گھر میں بیٹھ کر حضرت ابو ہریرہؓ کے مُنہ در مُنہ حضورؐ کو گالیاں کو سنے دیتی رہتی تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضورؐ سے اس کا ذکر کیا۔ حضورؐ نے بجائے اظہار ملال کے ہاتھ اُٹھا کر دعا فرمائی کہ یا اللہ! ابو ہریرہؓ کی ماں کو ہدایت دیدے۔ چنانچہ دعا قبول ہوئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ گھر لوٹے تو والدہ مسلمان ہونے کے لئے غسل کر رہی تھیں۔

اہلِ طائف کے لئے صحابہ نے بددعا کی درخواست کی۔ حضورؐ نے دعا فرمائی۔ الٰہی اہلِ طائف کو مسلمان کر کے انھیں دوست بنا کر مدینہ لا۔ چنانچہ وہ مدینہ آکر مسلمان ہوئے۔

صحابہ نے عرض کیا۔ اور صحابہ نے کیا خاص قبیلہ دوس کے سردار حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ نے عرض کیا کہ میرے قبیلہ کی سرکشی حد سے بڑھ گئی ہے۔ آپ اس کے حق میں بددعا کیجئے۔ حضورؐ نے ہاتھ اُٹھائے اور کہا۔ اللھم اھد دوساً وائت بھم۔ الٰہی! قبیلہ دوس کی آنکھیں کھول اور انھیں یہاں لا۔

حضورؐ کا قول تھا کہ میں رحمت بن کر آیا ہوں۔ بددعائیں دینے نہیں آیا ہوں۔

کفار سے بدتر منافقین تھے۔ حضورؐ اُن تک سے اخلاق برتتے تھے۔ اور اُن کی غلطیاں نظر انداز کر دیتے تھے۔ عبد اللہ بن ابی جیسے منافق کی بابت ایک دفعہ فرمایا کہ یہ بہرحال کہلاتا تو مسلمان ہے۔ اسے گزند پہنچاؤں گا تو ناواقف لوگ سمجھیں گے کہ اپنوں کے ساتھ محمدؐ کا بُرا سلوک ہے۔

عبد اللہ بن ابی نے حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کو اُس وقت جبکہ حضرت عباسؓ مسلمان نہیں تھے۔ ایک کرتہ دیا تھا۔ عبد اللہ بن ابی مرا تو حضورؐ نے مسلمانوں کے روکنے کے باوجود اسے اپنا کرتہ پہنا کر دفن کرایا۔

جنازہ جس کا بھی سامنے سے گزرتا حضورؐ کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ کافر ہے۔ کافر کی تعظیم کیوں کروں۔

یہود و نصاریٰ کے ساتھ تو مسلمانوں کو کھانے پینے اور رشتے جوڑنے کی آج بھی اجازت ہے۔ کافر جس کافر نہیں تھے، مار ڈالنے کی فکر میں تھے، حضورؐ نے انھیں معاف فرما دیا۔

جس رات حضورؐ مکہ سے مدینہ چلے ہیں۔ اس کی صبح کا پروگرام کفار مکہ نے یہ طے کر رکھا تھا کہ حضورؐ باہر نکلیں تو دھاوا بول دو۔ ہر قبیلے میں سے ایک ایک نمائندہ چُن لیا گیا تھا۔ تا کہ حملہ کسی ایک قبیلہ کا نہ خیال کیا جائے اور حضورؐ کا قبیلہ بدلہ لینا چاہے تو اتنے قبیلوں سے بدلہ نہ لے سکے۔ یہ نمائندے جو ساری رات حضورؐ کے مکان کو گھیرے رہے تھے اور صبح حضورؐ کے برآمد ہونے کے منتظر تھے۔ فتح مکہ کے وقت اُن کی جان حضورؐ کے قبضہ میں تھی۔ لیکن ان میں سے ایک نے بھی

اُس جُرم کی سزا نہیں پائی۔ دوسرے قصوروں کی طرح یہ قصور بھی معاف کر دیا گیا۔

رواداری اور عفو و درگزر کے یہ واقعات قوت و اقتدار کے زمانے کے ہیں۔ لاچاری اور بےبسی کے زمانے کا میں نے ابھی تک ایک واقعہ بھی نہیں لکھا ہے۔ اور شاید آگے بھی نہ لکھوں۔ زمانۂ قوت و اقتدار ہی کے واقعاتِ درگزر و عفو اس مختصر کتاب میں نہیں سما سکتے۔ بےشمار واقعات ہیں۔

خیبر میں ایک یہودی عورت نے حضورؐ کی دعوت کی اور کھانے میں زہر ملا دیا۔ حضورؐ نے نوالہ منہ میں رکھتے ہی محسوس کر لیا کہ زہر ہے۔ کھانا نہیں کھایا۔ لیکن زہر کھلانے والی سے اپنا انتقام نہیں لیا۔

حضورؐ کے پاس کفار کی تمام زیادتیوں کا ایک ہی جواب تھا۔ اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ الٰہی! انہیں ہدایت دے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں بےخبری میں کرتے ہیں۔

حضرت عائشہؓ کو جن لوگوں نے متہم کیا تھا۔ اُن میں ایک صاحب حضرت ابوبکرؓ کے پروردہ بھی تھے۔ اُن کی حضرت ابوبکرؓ اُس زمانے میں بھی کفالت کر رہے تھے۔ جس زمانے میں وہ بہتان باندھا گیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُن صاحب کی کفالت سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی اور معاملہ صاف ہو گیا۔ اور اتہام لگانے والوں نے بھی معذرت کی تو اللہ اور اللہ کے رسولؐ نے انہیں معاف فرما دیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کو حکم کیا کہ جن کی کفالت کرتے تھے اُنکی کفالت جاری رکھیں۔

۱؎ حضورؐ کی سادگی اور فروتنی کے متعلق بھی غلط فہمی میں نہ پڑیئے گا۔ حضورؐ کی سادگی اور فروتنی کسی زبوں حال کی سادگی و فروتنی نہیں تھی۔ ایک سلطنت کے فرمانروا اور لاکھوں قلوب کے حاکم کی سادگی و فروتنی تھی۔ "گدا اگر تواضع کند خوئے اوست" گدا کی سادگی اور فروتنی کونسی قابلِ تعریف چیز اور قابلِ ذکر بات ہے۔

فاقے بھی حضورؐ نے مکہ میں نہیں کئے تھے، مدینہ میں کئے تھے۔ وفات کے وقت جبکہ مسلمانوں پر پیسے کا مینہ برس رہا تھا حضورؐ کے ہاں کچھ نہیں تھا۔ حضورؐ دوسروں کو کھلاتے تھے، اپنے کھانے کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وفات کے وقت اسلام ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ اور عمان تک چھا چکا تھا اور دوسری طرف عراق و شام تک۔ لیکن حضورؐ نے جن کپڑوں میں وفات پائی اُن میں پیوند ہی پیوند تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ حضورؐ نے آخر وقت تک تہ کیا ہوا کپڑا نہیں پہنا۔ لا یطوی لہ ثوب۔ تہ کرنے کی نوبت جب آتی جب کم از کم دو جوڑے ہوتے۔ ایک جوڑا تھا۔ اُسے دھوتے تھے اور پہن لیتے تھے۔

حضرت عائشہؓ ہی کی یہ بھی روایت ہے کہ مدینہ پہنچکر وفات تک حضورؐ نے کبھی متواتر دو وقت پیٹ نہیں بھرا۔ حضورؐ نے اپنے واسطے جو معمولی سی رقم مقرر کر رکھی تھی، اُس سے زیادہ کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ اور معمولی سی رقم پر بھی حضورؐ اپنا حق نہیں سمجھتے تھے۔ اُسے اہلِ حاجت لے جاتے تھے۔ حضورؐ کی سادگی و فروتنی اور حضورؐ کا فقر و فاقہ رہبانیت بھی نہیں ہے۔ ایک دفعہ دو صحابی حاضرِ خدمت ہوئے اور بولے۔ "ہم میں سے ایک نے نکاح نہ کرنے کا عہد کیا ہے اور دوسرے نے ترکِ حیوانات کا۔" حضورؐ نے فرمایا۔ "یہ میرا عمل نہیں ہے۔" ہر دو صحابیوں نے اپنے عہد سے توبہ کی۔ ایک صحابی کوئی سال بھر بعد دکھائی دیئے۔ اُن کی صورت اس قدر بدل گئی تھی کہ حضورؐ کو نام دریافت کرنا پڑا۔ حضورؐ نے کہا تمہاری صورت تو بھلی چنگی تھی۔ بگڑ کیوں گئی۔ انہوں نے عرض کیا۔ مسلسل روزے رکھ رہا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اپنی جان پر مصیبت ڈالنا کس خدا نے بتایا ہے۔ ایک اور صحابی سے جو غار میں بیٹھ کر باقی عمر گزارنی چاہتے تھے۔ فرمایا۔ "یہ مسخ شدہ یہودیت و نصرانیت ہے۔ میں تو آسان اور سہل دین لایا ہوں۔"

حضرت زینبؓ، حضورؐ کی بیٹی، مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے لگیں - تو ہبار بن اسود نے اُن پر حملہ کیا اور انھیں اونٹ پر سے گرا دیا - حضرت زینبؓ حاملہ تھیں - حمل ساقط ہو گیا - فتح مکہ کے بعد ہبار پہلے تو چھپتا پھرا - لیکن جب کہیں پناہ نہ ملی تو حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ کا ذاتی گناہگار ہوں اور بہت شرمسار ہوں - اتنی زیادتی کی ہے کہ معافی مانگنے کی ہمت نہیں ہے - حضورؐ نے فرمایا - جاؤ معاف کیا -

قریش مکہ حضورؐ کو جب گالیاں دیتے تھے - تو محمدؐ کی بجائے مذمّم نام لیتے تھے - محمد کے معنی ہیں تعریف کیا گیا اور مذمم کے معنی ہیں مذمت کیا گیا - حضورؐ صحابہ سے فرماتے :-

"دیکھو اللہ نے مجھے گالیوں سے کیسا بچالیا - میں تو محمد ہوں اور یہ مذمم کو گالیاں دے رہے ہیں"

مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا - یمامہ کے سردار قبیلہ بنو حنیفہ ثمامہ بن آثال مسلمان ہوئے تو اہل مکہ نے انھیں طعنہ دیا - وہ بگڑ گئے اور انہوں نے یمامہ میں ڈھونڈی پٹوادی کہ مکہ غلہ کوئی نہ بھیجے - مکہ چیخ اٹھا - یہ اُس ظلم کے انتقام کا اچھا موقع تھا جو کفار مکہ نے حضورؐ پر اور حضورؐ کے پورے خاندان پر شعب ابی طالب میں مسلسل تین سال محصور رکھ کر کیا تھا - کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھوک کی وجہ سے بلکتے تھے اور ظالم کفار مکہ ان کا تماشہ دیکھتے تھے - اور کھانے پینے کی کوئی شئے شعب ابی طالب میں نہیں جانے دیتے تھے - تین سال حضورؐ نے اور حضورؐ کے خاندان نے درختوں کے پتے اور سوکھے چمڑے کھا کھا کر گزارے - لیکن جب وہی ظالم حضورؐ کی خدمت میں سفارش کی درخواست لے کر حاضر ہوئے تو حضورؐ نے ثمامہ کو کہلا بھیجا کہ کسی کا رزق مت روکو - اور غلہ مکہ پہنچنے لگا -

عفو و درگزر کا ایک واقعہ بے حد عجیب و غریب ہے - حضورؐ فتح مکہ سے قبل مکہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے - حضرت حاطب بن بلتعہؓ میں کچھ نفسانیت آگئی - انہوں نے اپنے مکی رشتہ داروں کا خیال کر کے مکہ اطلاع دے دی کہ حملہ ہونے والا ہے - ہوشیار رہنا - خط لکھا اور ایک عورت کے ہاتھ روانہ کیا - یہ بڑی خطرناک بات تھی - حضورؐ کو خبر لگ گئی - حضورؐ نے حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا - تم تعاقب کرو - عورت مکہ پہنچنے نہ پائے - عورت گرفتار ہو کر آئی تو حاطب بن بلتعہ بلائے گئے - وہ جھوٹ نہیں بولے اور معذرت خواہ ہوئے - ایسے قصور معاف نہیں کئے جاتے ہیں - لیکن حضورؐ نے معاف کر دیا - اور کہا - یہ غزوہ بدر میں شریک تھے - عورت سے بھی تعرض نہیں کیا -

یہ واقعہ بھی معمولی نہیں ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت عباسؓ، ابو سفیان کو لے کر آئے - ابو سفیان وہ بزرگ ہیں کہ ہجرت کے بعد اہل مکہ نے حضورؐ کو جتنا ستایا اور حضورؐ سے جتنی لڑائیاں لڑیں اُن میں ابو سفیان کا ہاتھ تھا - حضرت عمرؓ ابو سفیان کو قتل کر دینا چاہتے تھے - لیکن حضورؐ نے روکا اور فرمایا کہ ابو سفیانؓ ہی کا نہیں جو مجرم ابو سفیان کے گھر میں پہنچ جائے اُس کا قصور معاف ہے -

عفو و درگزر کے واقعات حد و شمار سے باہر ہیں - سب کے اندراج کی گنجائش نہیں ہے - دوسرے اخلاق، عادات اور معمولات کی مثالیں بھی میں جستہ جستہ ہی دے رہا ہوں - سب اس مختصر کتاب میں کہاں سما سکتی ہیں -

حضورؐ کی مجلس سراپا سنجیدگی اور متانت تھی - حضورؐ بولتے تھے تو حاضرین اتنی توجہ سے سنتے تھے کہ ہلتے جلتے نہیں تھے - لیکن سنجیدگی اور متانت سے مراد خشکی اور افسردگی نہیں ہے -

ایک دفعہ حضورؐ صحابہ کے ساتھ بیٹھے کھجوریں کھا رہے تھے - حضرت علیؓ برابر تشریف فرما تھے - حضرت علیؓ کھجوریں

کھاتے جاتے تھے اور گٹھلیاں حضورؐ کی گٹھلیوں میں ملاتے جاتے تھے۔ جب کھجوریں کھائی جا چکیں تو حضرت علیؓ نے کہا۔ "بتاؤ کھجوریں کس نے زیادہ کھائی ہیں؟" حضورؐ نے فرمایا۔ "ذرا یہ بھی دیکھنا کہ گٹھلیوں سمیت کھجوریں کون کھا گیا"۔

ایک دفعہ ایک ضعیف العمر صحابیہ حاضرِ خدمت ہوئیں اور کہنے لگیں۔ میرے لئے دعائے مغفرت کیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "بڑھیا کوئی جنت میں نہیں جا سکتی"۔ وہ گھبرائیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "مطلب یہ ہے کہ بڑھیا میں بھی جوان ہو کر جنت میں جائینگی"۔

حضورؐ امیر اور غریب میں فرق نہیں کرتے تھے۔ صرف ایک دفعہ اس خیال سے کہ امراء کی تتبع کی جاتی ہے۔ جو امیر مسلمان ہوگا اپنے ساتھ بہت سے غریبوں کو کھینچ لائے گا۔ حضورؐ نے امراء کی طرف توجہ رکھی تھی۔ اور حضرت عبداللہ ابن ام مکتومؓ کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہ فرمائی اور وحی بھیجی کہ:-

عَبَسَ وَتَوَلّٰی۔ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی۔ وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّهٗ یَزَّکّٰی اَوْ یَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّکْرٰی۔ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی۔ وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی۔ وَاَمَّا مَنْ جَآءَکَ یَسْعٰی وَهُوَ یَخْشٰی فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی۔ کَلَّآ اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَکَرَهٗ۔

"رسول نے تیوری چڑھالی اور رُخ پھیر لیا۔ اس لئے کہ ایک اندھا (محتاج) آدمی اُن کے پاس آیا تھا (اے رسول) تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری باتوں سے وہ پاک ہو جاتا یا نصیحت حاصل کرتا تو نصیحت سے فائدہ اُٹھاتا۔ لیکن تم اس کی طرف متوجہ ہو جو بے پروائی برتتا ہے۔ تمہارا کیا بگڑتا ہے اگر کوئی (وہ بے پروائی برتنے والا) پاک نہ بنے۔ مگر جو دوڑا دوڑا آتا ہے۔ وہ (کھلی بات ہے کہ) اللہ سے ڈرتا ہے۔ (تب ہی تو آتا ہے) اور تم اسی سے بے اعتنائی کرتے ہو۔ یہ ہرگز مناسب نہیں ہے۔ یہ عام نصیحت ہے۔ جو چاہے اسے قبول کرے"۔

ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت سلمانؓ اور حضرت بلالؓ کو کسی بات پر ڈانٹا۔ حضورؐ نے اس کی خبر سُنی تو حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا۔ "وہ آزردہ تو نہیں ہو گئے"۔ حضرت ابوبکرؓ فوراً حضرت سلمانؓ اور حضرت بلالؓ کے پاس پہنچے اور اُس وقت تک اطمینان سے نہیں بیٹھے۔ جب تک دونوں کا دل صاف نہ کر لیا۔ دونوں سے معافی مانگی اور دونوں نے معافی دی۔

ایک بہت غریب صحابی مسجد میں جھاڑو دینے پر متعین تھے۔ اُن کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے حضورؐ کو اطلاع نہیں دی۔ عرصے کے بعد حضورؐ نے خود پوچھا۔ وہ صاحب کہاں ہیں۔ دکھائی نہیں دیتے۔ عرض کیا گیا کہ وفات پا گئے۔ کہا۔ مجھے کیوں اطلاع نہیں دی۔ لوگوں نے اس طرح جواب دیا جیسے کہتے ہیں کہ معمولی آدمی تھے۔ کیا اطلاع کرتے۔ حضورؐ نے اُن کی قبر کا پتہ دریافت فرمایا اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی۔

بچوں پر حضورؐ خاص طور سے شفقت فرماتے تھے۔ حضورؐ کہیں باہر سے تشریف لاتے اور سواری پر سوار ہوتے تو راستہ میں جو بچے مل جاتے انھیں اپنے ساتھ آگے پیچھے بٹھا لیتے تھے، راستہ چلتے بچوں کو خود سلام کرتے تھے۔

حضورؐ کی مُہرِ نبوت پشت مبارک پر ابھری ہوئی تھی۔ بچے غیر معمولی شئے سمجھ کر اُس سے کھیلنے لگتے تھے۔ حضورؐ کھیلنے دیتے۔ بچوں کے ماں باپ بچوں کو روکتے تو کہتے۔ روکو نہیں، کھیلنے دو۔

ایک غزوے میں چند بچے جھپیٹ میں آ کر مر گئے۔ حضورؐ نے اُن کا بڑا غم کیا۔ کسی صحابی نے کہا۔ وہ مشرکوں کے

بچے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ بچے مشرکوں کے بھی تم سے بہتر ہیں۔ خبردار بچوں کو قتل مت کرنا۔ خبردار بچوں کو قتل مت کرنا۔ دو دفعہ فرمایا۔ پھر کہا۔ ہر بچہ اللہ کی فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے۔

حضورؐ کسی ماں کو دیکھتے کہ اپنے بچے سے محبت کر رہی ہے۔ تو بہت متاثر ہوتے۔ ماؤں اور بچوں کی محبت کے قصے سنتے تو فرماتے۔ "جسے اللہ اولاد کی محبت دے اور وہ اولاد کا حق بجا لائے وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہیگا۔

حضرت انس رضؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ نماز کے وقت مقتدی عورتوں میں سے کسی کا بچہ روتا ہے تو میں نماز مختصر کر دیتا ہوں تاکہ بچے کی ماں بے چین نہ ہو۔

بچوں سے چہل کی باتیں کرتے تھے۔ ام خالد چھوٹی سی تھیں۔ ایک دفعہ وہ سُرخ رنگ کا کُرتا پہنے نظر آئیں۔ اُن سے فرمایا۔ سنہ سنہ۔ حبشی زبان میں سنہ کے معنی ہیں خوشنما۔ حضرت ام خالد کی پیدائش اتفاق سے حبش کی تھی۔ اور اُن کا کچھ وقت وہاں گزرا تھا۔ اس مناسبت سے حضورؐ نے حبشی زبان کا لفظ استعمال کیا۔

کوئی شخص فصل کا میوہ نذر کرتا تو حضورؐ حاضرین میں سب سے پہلے بچوں کو بانٹتے تھے۔

ایک دفعہ حضورؐ بچوں سے پیار و محبت کا اظہار کر رہے تھے۔ کسی کی زبان سے نکلا۔ میرے دس بچے ہیں۔ میں تو اپنے بچوں کو بھی نہیں چومتا چاٹتا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ تمہارے دل سے اللہ محبت سلب کرے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔

عورتوں کو تو حضورؐ نے انسانیت کا مرتبہ عطا فرمایا ہے۔ اور مردوں کے برابر لا بٹھایا ہے۔ اسلام سے پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ عورتیں بے روح ہوتی ہیں۔ انھیں مویشیوں سے بدتر حالت میں رکھا جاتا تھا۔ وہ بچپن میں باپ دادا کی کنیز بنتی تھیں۔ جوانی میں شوہر کی۔ اور بڑھاپے میں بیٹوں کی۔ بیٹیوں کی پیدائش ناگوار گزرتی تھی۔ انھیں زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ زندہ رہتی تھیں تو جائداد کی طرح ورثہ میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ سوتیلے بیٹے باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماؤں سے تعلق زن و شو کر لیتے تھے!

حضورؐ نے جس طرح ارشادوں احکام سے عورتوں کے حقوق قائم کئے اور عورتوں کی منزلت بڑھائی اسی طرح عملی برتاؤ بھی حضورؐ کا عورتوں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر اپنا پچھلا طریقہ عورتوں کے معاملہ میں دوبارہ اختیار نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت اسماءؓ بنت عمیس ایک صحابیہ ہیں۔ جب مسلمانوں نے حبش ہجرت کی ہے تو وہ بھی حبش گئی تھیں۔ اور مدینہ منورہ فتح خیبر کے بعد پہنچی تھیں۔ ایک دن حضرت عمرؓ اپنی بیٹی حضرت حفصہؓ (ام المومنین) کے ہاں بیٹھے تھے کہ حضرت اسماءؓ بنت عمیس آگئیں۔ حضرت عمرؓ نے حضرت حفصہؓ سے پوچھا۔ یہ کون ہیں؟ انہوں نے نام بتایا۔ حضرت عمرؓ بولے۔ وہ حبش والی۔ حضرت اسماءؓ نے کہا۔ جی، میں وہی ہوں۔ حضرت عمرؓ نے ازراہ تفاخر فرمایا۔ ہم نے تم لوگوں سے پہلے ہجرت کی تھی۔ حضرت اسماءؓ کو یہ فقرہ ناگوار گزرا۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ حضورؐ تشریف لائے۔ حضرت اسماءؓ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! عمرؓ نے اس وقت یہ بات کہی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ تم نے کیا جواب دیا۔ تم کہو کہ عمرؓ نے اور تمہارے ساتھیوں نے ایک ہجرت کی ہے۔ اور میں نے اور میرے ساتھیوں نے دو ہجرتیں کی ہیں۔

حضورؐ نے مویشیوں تک کو بہت سی مصیبتوں سے چھڑا دیا۔ عرب اونٹ کے گلے میں قلادہ لٹکایا کرتے تھے۔ حضورؐ نے منع کیا کہ خواہ مخواہ ایک جاندار کو تکلیف میں ڈالتے ہو۔ زندہ دُنبے کی چکتی کاٹ لیتے تھے۔ اُسے روکا۔ دُم اور ایال

کاٹنے کی بھی ممانعت فرمائی۔ کہا۔ دُم جانور کا مورچھل ہے اور بال لحاف۔ جانوروں کو ساز پہنا کر رکھنے کی ممانعت کی۔ نیز فرمایا۔ جانوروں کو اپنی کرسی اور نشست گاہ نہ بناؤ۔

عرب جانوروں کو باندھ کر اُن پر نشانہ بازی کیا کرتے تھے۔ اُسے ناجائز قرار دیا۔ جانوروں کو لڑوانا بھی ناجائز بتایا۔

ایک دفعہ ایک گدھا حضورؐ کے سامنے سے گزرا۔ جس کا چہرہ کسی نے داغ رکھا تھا۔ حضورؐ نے اس حرکت کی سخت مذمت فرمائی اور کہا۔ علامت کے واسطے داغنا ہو تو نازک اعضاء نہ داغے جائیں۔ بُری طرح داغنے پر اللہ کی لعنت نازل ہوتی ہے۔

ایک دفعہ کسی نے چڑیا کا انڈا اُٹھا لیا۔ چڑیا بے قرار ہوگئی۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ انڈا چڑیا کو واپس کرو۔

ایک صحابی جنگل میں سے کچھ پرند پکڑ لائے۔ اور بیان کیا کہ میں نے انھیں پکڑا تو اُن کی ماں دیر تک میرے سر پر منڈلاتی رہی۔ حضورؐ نے فرمایا۔ واپس جاؤ اور پرندوں کو اُن کی جگہ چھوڑ آؤ۔

حضورؐ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جانوروں کے معاملہ میں بھی اللہ سے ڈرنا چاہیے۔

اللہ کا ارشاد ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْن۔ اے محمدؐ! ہم نے تمہیں ساری دُنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے لہٰذا اس خزانہ رحمت سے انسان، حیوان، دوست، دشمن، مسلم، غیر مسلم۔ عورت، مرد، بوڑھے۔ بچے سب کو حصّہ ملتا تھا۔

ایک حدیث ہے۔ لایومن احدکم حتیٰ یحب للناس ما یحب لنفسہ۔ کوئی اُس وقت تک کامل مسلمان ہی نہیں ہوتا جب تک وہ دُوسروں کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔

ایک دفعہ کسی نے دعا مانگی کہ الٰہی! مجھ کو اور محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بخش دے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اللہ کی رحمت کو تم نے اپنے لئے اور میرے لئے محدود کر لیا۔

ایک دفعہ ایک بدو اُونٹ پر چڑھنے لگا تو اُس کی زبان سے نکلا۔ یا اللہ! مجھ پر اور محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحمت بلا شرکت غیرے نازل کر۔ حضورؐ نے صحابہ سے کہا۔ "بتاؤ۔ راہ یہ زیادہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اُونٹ"۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں حضورؐ ہی "انسانِ کامل" گزرے ہیں اور حضورؐ ہی کا اسوۂ حسنہ انسانیت کے لئے آخری معیار ہے۔ آپؐ پر درود و سلام ہوں۔

قید میں مجاہدینِ مصر (اخوان) کا ترانہ

(جمال ناصر کے وحشیانہ مظالم حق کی آواز کو نہ دبا سکے)

ہم خدا کے سپاہی ہیں اور قید خانوں کو آباد کرنے والے ہیں — جب اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہے تو ہم قید خانوں سے راضی ہیں
قید خانہ کی تنہائی میں ہمارے لئے بڑی لذتیں ہیں — جن کو قید خانوں کے سپاہیوں کی آنکھیں نہیں دیکھ پاتیں

ہم ہیں خدا کے سپاہی قید خانوں کو آباد کرنیوالے

اگر لوگ ہم کو قید خانہ کی کوٹھڑیوں کی روشنی میں دیکھ لیں — جب ہم خدا کا ذکر کرتے ہوں، ہماری آنکھیں اشکبار ہوں
تو وہ حیرت میں رہ جائیں کہ جو قلب خدا کے ساتھ ہے — وہ تنہائی میں پُرنور ہے اور دوسرے لوگوں کی راتیں تاریک ہیں

ہم ہیں خدا کے سپاہی قید خانوں کے آباد کرنیوالے

جو کوئی یہ خیال کرے کہ ہم قید و بند میں ہیں وہ مبتلائے وہم ہے — قید میں تو دوسرے لوگ ہیں، ہماری نگہبانی تو اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے
ہمارا حق آج اور کل ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے — ہم قید و بند کی سختیوں کے باوجود زندہ رہیں گے

ہم ہیں خدا کے سپاہی قید خانوں کے آباد کرنیوالے

جنت بہت ہی مرغوب شے ہے — اور وہ اہلِ تقویٰ و طہارت کے لئے ہے
اے فرعونو! تمہاری دنیا سراب ہے — جو تم کو عنقریب رسوا کرے گی اور خدا کی کتاب سربلند ہو گی

ہم ہیں خدا کے سپاہی قید خانوں کے آباد کرنیوالے

دنیا نے ابوجہل اور عتبہ کو رسوا کیا! — اور اُن کو دنیا میں ننگ و عار کا ہدف بنایا
لیکن خدائے واحد کی سنت ہے کہ وہ اپنی جماعت (حزب اللہ) سے کنارہ کش نہیں ہوتی۔ اور اللہ تعالیٰ کے نوجوانوں کو کبھی بڑھاپا نہیں آتا

ہم ہیں خدا کے سپاہی قید خانوں کے آباد کرنے والے

حسن البنا شہید اور صالح گزر گئے — اور ہضیبی ایک ایسا عزم ہے جس سے فولاد پگھل جائے
یہ قافلہ اپنے سردار اور سپاہیوں کیساتھ سربلند رہیگا — اللہ تعالیٰ حق کیلئے اپنے شیروں کی نگہبانی فرمائے

ہم ہیں خدا کے سپاہی قید خانوں کے آباد کرنیوالے

اسلام کی حکومت اور عدل کامل، یہ ساری امیدوں کی امید ہے — جس سے ہم بال برابر بھی نہ ہٹیں گے
ہم اس کو عنقریب خدائے رحمٰن کے سایۂ ربوبیت میں قائم کرینگے — چاہے اس کے لئے ہم مریں یا زندہ رہیں

ہم ہیں خدا کے سپاہی قید خانوں کے آباد کرنیوالے

(اخوان المسلمین زندہ باد)

قابل اجمیری

غزل

حیرتوں کے سلسلے سوزِ نہاں تک آ گئے
ہم نظر تک چاہتے تھے تم تو جاں تک آ گئے

نامرادی اپنی قسمت گمرہی اپنا نصیب
کاروانِ کی خیر ہو ہم کارواں تک آ گئے

اُن کی پلکوں پر ستارے اپنے ہونٹوں پر ہنسی
قصۂ غم کہتے کہتے ہم کہاں تک آ گئے

خود محبت کا تقاضا ہے بغاوت کیجیے
تیرے فیضانِ ستم سے ہم یہاں تک آ گئے

اپنی اپنی جستجو ہے اپنا اپنا شوق ہے
تم ہنسی تک بھی نہ پہنچے ہم فغاں تک آ گئے

زلف میں خوشبو نہ تھی یا رنگ عارض میں نہ تھا
آپ کس کی آرزو میں گلستاں تک آ گئے

رفتہ رفتہ رنگ لایا جذبۂ خاموشِ عشق
وہ تغافل کرتے کرتے امتحاں تک آ گئے

تم کو بھی شاید ہماری جستجو کرنی پڑے
ہم تمہاری جستجو میں اب یہاں تک آ گئے

موت خشررائی ہوئی ہے وقت گھبرایا ہوا
تیرے دیوانے حیاتِ جاوداں تک آ گئے

خود تمہیں چاکِ گریباں کا شعور آ جائے گا
تم وہاں تک آ تو جاؤ ہم جہاں تک آ گئے

یہ گلستاں کی فضا یہ ہمنواؤں کا سلوک
سوچنا پڑتا ہے قابلؔ کیوں یہاں تک آ گئے

عبدالکریم ثمر

تین شعر

۱۔ وہی نغمہ ہے وہی ساز ہے وہی میکدے کا نظام ہے
نئے مغ بچے ہیں تو کیا ہوا وہی دورِ بادہ و جام ہے

۲۔ ہے خزاں نصیبِ چمن مگر ترے رنگ و بُو کے لباس میں
کہیں بجلیوں کے ہیں آشیاں کہیں گُل کا حُسن تمام ہے

۳۔ یہ بجا کہ ہم بھی رہا ہوئے مگر اس رہائی کو کیا کہیں
کہ وہی قفس کی ہیں تیلیاں وہی دانہ ہے وہی دام ہے

سید رضوان بریلوی

بکھرے تارے

نہ ہو ہوائے گلستاں جو سازگار نہیں
تری نگاہ سلامت، غمِ بہار نہیں

•

دل میں درد، آنکھوں میں آنسو، لب پہ مہرِ خامشی
زندگانی نقش بر دیوار ہے تیرے بغیر

•

زندگی کہتے ہیں جس کو سوز بھی ہے ساز بھی
اک مسلسل خامشی ایک مستقل آواز بھی

•

نظر ہر نقش سے مجھ کو وہی مستِ حجاب آیا
مصوّر خود پسِ تصویر شاید بے نقاب آیا

روحِ انتخاب

آپ کسی انگریزی تعلیم یافتہ شخص سے کسی مذہبی مسئلہ پر گفتگو کیجئے - اور اس کی ذہنی کیفیت کا امتحان لینے کے لئے پہلے اُس سے مسلمان ہونے کا اقرار کرا لیجئے - پھر اس کے سامنے مجرد حکم شریعت بیان کر کے سند پیش کیجئے - وہ فوراً اپنے شانے ہلائے گا - اور بڑے عقل پرستانہ انداز میں کہیگا کہ یہ مُلّائیت ہے - میرے سامنے عقلی دلیل لاؤ - اگر تمہارے پاس معقولات نہیں صرف منقولات ہی منقولات ہیں تو میں تمہاری بات نہیں مان سکتا - بس انہی چند فقروں سے یہ راز فاش ہو جائے گا کہ اس شخص کو عقلیت کی ہوا بھی چھو کر نہیں گزری ہے - اس غریب کو برسوں کی تعلیم و تربیت علمی کے بعد اتنا بھی معلوم نہ ہو سکا کہ طلب حجت کے عقلی لوازم کیا ہیں - اور طالب حجت کی صحیح پوزیشن کیا ہوتی ہے اسلام کی نسبت سے عقلاً انسان کی دو ہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں - یا تو وہ مسلمان ہوگا - یا کافر ہوگا - اگر مسلمان ہے تو مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کو خدا اور رسولؐ کو خدا کا رسول تسلیم کر چکا ہے - اور یہ بھی اقرار کر چکا ہے کہ خدا کی طرف سے اس کا رسولؐ جو کچھ حکم پہنچائے گا - اس کی اطاعت وہ بے چون و چرا کرے گا - اب فرداً فرداً ایک ایک حکم پر حجتِ عقلی طلب کرنے کا اسے حق ہی نہیں رہا -

مسلم ہونے کی حیثیت سے اس کا کام صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ کوئی خاص حکم رسولؐ خدا نے دیا ہے یا نہیں - جب حجت نقلی سے یہ حکم ثابت کر دیا گیا تو اس کو فوراً اطاعت کرنی چاہیئے - وہ اپنے اطمینانِ قلب اور حصولِ بصیرت کے لئے حجتِ عقلی دریافت کر سکتا ہے - مگر اس وقت جبکہ وہ اطاعتِ حکم کے لئے سر جھکا چکا ہو - اطاعت کے لئے حجتِ عقلی کو شرط قرار دینا اور حجت نہ ملنے یا اطمینانِ قلب نہ ہونے پر اطاعت سے انکار کر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل رسولؐ خدا کی حاکمیت (اتھارٹی) کا انکار کر رہا ہے - اور یہ انکار مستلزم کفر ہے - حالانکہ ابتدا میں اس نے خود مسلم ہونے کا اقرار کیا تھا -

اب اگر وہ کافر کی حیثیت اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے صحیح جائے قیام دائرہ اسلام کے اندر نہیں - بلکہ اُس کے باہر ہے - سب سے پہلے اُس میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیئے کہ جس مذہب پر درحقیقت وہ ایمان نہیں رکھتا اُس سے نکل جائے - اس کے بعد وہ اس لائق سمجھا جائے گا کہ حجتِ عقلی طلب کرے اور اس کی طلب کا جواب دیا جائے -

یہ قاعدہ عقلِ سلیم کے مقتضیات میں سے ہے اور دُنیا میں کوئی نظم اور کوئی ضابطہ اس کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا - کوئی حکومت ایک لمحہ کیلئے بھی قائم نہیں رہ سکتی - جس کی رعایا کا ہر فرد اس کے حکم پر حجتِ عقلی کا مطالبہ کرے اور حجت کے بغیر اطاعتِ امر سے انکار کر دے - کوئی فوج درحقیقت ایک فوج ہی نہیں بن سکتی اگر اُس کا ہر سپاہی جنرل کے حکم کی وجہ دریافت کرے اور ہر معاملہ میں اپنے اطمینانِ قلب کو اطاعت کے لئے شرط قرار دے - کوئی مدرسہ - کوئی کالج، کوئی انجمن غرض کوئی اجتماعی نظام اس اصول پر نہیں بن سکتا کہ ہر ہر فرد کو مطمئن

کرنے کی کوشش کی جائے اور جب تک ایک ایک شخص کو اطمینان حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک کسی حکم کی اطاعت نہ کی جائے!

انسان جس نظام میں داخل ہوتا ہے۔ اس ابتدائی اور بنیادی مفروضہ کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ وہ اس انتظام کے اقتدار اعلیٰ پر کلی حیثیت سے اعتقاد رکھتا ہے۔ اور اس کی حکمرانی کو تسلیم کرتا ہے۔ اب جس وقت تک وہ اس نظام کا جزو ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی اطاعت کرے۔ خواہ کسی جزئی حکم پر اس کو اطمینان ہو یا نہ ہو۔

مجرمانہ حیثیت سے کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا امر دیگر ہے۔ ایک شخص جزئیات میں نافرمانی کر کے بھی ایک نظام میں شامل رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے جزو میں بھی اپنے ذاتی اطمینان کو اطاعت کے لئے شرط قرار دیتا ہے تو در اصل وہ اقتدار اعلیٰ کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اور یہ صریح بغاوت ہے۔

حکومت میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا تو اس پر بغاوت کا مقدمہ قائم کر دیا جائے گا۔ فوج میں اس کا کورٹ مارشل ہوگا۔ مدرسہ اور کالج میں فوری اخراج کی کارروائی کی جائے گی۔ مذہب میں اس پر کفر کا حکم جاری ہوگا۔ اس لئے کہ اس نوع کے طلبِ حجت کا حق کسی نظام کے اندر رہ کر کسی شخص کو نہیں دیا جا سکتا۔ ایسے طالبِ حجت کا صحیح مقام اندر نہیں۔ باہر ہے۔ پہلے وہ باہر نکل جائے۔ پھر جو چاہے اعتراض کرے۔

(تنقیحات۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

حیدر آباد دکن "اسلامی ریاست" نہ تھی بلکہ وہاں ایک مسلمان خاندان حکمران تھا۔ تو وہاں رمضان کے رمضان "حضور نظام خلد اللہ ملکہ" کی طرف سے "احترام رمضان" کے لئے فرمان صادر ہوا کرتا تھا اور اس فرمان کی تعمیل اس طرح ہوتی تھی کہ ہوٹلوں اور ریسٹورانوں پر پردے لٹکا دیئے جاتے تھے کہ رمضان کا "احترام" بھی اپنی جگہ باقی رہے اور "روزہ خوروں" کو بھی کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔۔۔ پاکستان خیر سے "اسلامی ریاست" ہے۔ مگر یہاں بھی حیدر آباد دکن کی "سنت" کی ہو بہو پیروی کی جا رہی ہے۔ ایک سرکاری اپیل کے ذریعہ مسلمانوں سے "احترام ماہ صیام" کی درخواست کی گئی ہے اور ہوٹل اور ریسٹوران اس اپیل کے بعد "پردہ نشین" اور "نقاب پوش" بن گئے ہیں۔

ان "پردوں" کے پیچھے وہ سب کچھ ہوتا ہے۔ جو رمضان سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ دن میں ہر لمحہ "افطار" اور "سحری" کا لطف! "روزہ خوروں" کی پردہ پوشی کے یہ سامان بھی خوب ہیں۔ تماشائی کہتا ہے کہ یہ "پردے" بھی اس دور میں غنیمت ہیں۔ اگر کل کلاں کو یہ پردے بھی خدانخواستہ نوچ کر پھینک دیئے گئے تو کوئی کیا کرلے گا۔ جب تک یہ "پردہ" پڑا ہے اچھا ہی ہے!

مسٹر محمد علی وزیر اعظم کی دوسری شادی نے "اپوا" کی لیڈرانیوں میں خاصہ جوش پیدا کر دیا ہے۔ کیا دم خم ہیں۔ کیا شان جلال اور ادائے مردافگنی ہے کہ بڑے بڑے مردوں کے دل دہل گئے! تماشائی کہتا ہے کہ اگر "اپوا" کو فعال جماعت بنانا ہے اور ان "بیگمات" میں عمل و حرکت کی روح پیدا کرنی ہے تو اس کی سب سے زیادہ مؤثر تدبیر یہ ہے کہ "عقد ثانی" کے زیادہ سے زیادہ "سانحے" دقوع میں آئیں تاکہ "اپوا" کی کارکنوں میں اور زیادہ جوش پیدا ہو اور جب یہ جوش اپنے شباب پر پہنچ جائے تو ایک "آرڈی نینس" کے ذریعہ اس جوش کا رخ کسی طرف پھیر دیا جائے! مثلاً بلبل چودھری اور استاد بندو خاں کی یادگار قائم کرنے کیلئے کسی فنڈ کی فراہمی کی طرف!

ایک تو مصر میں "اخوان المسلمین" کی جماعت ہے جو ان دنوں حق گوئی کے جرم میں قید و بند کی مصیبتوں میں مبتلا ہے اور طرح طرح کے مظالم کا شکار ہے اور ایک پاکستان کے "اخوان" ہیں۔ جس کے لیڈر نے سنا ہے کہ مصر کے "اخوان" کے قاتل جمال ناصر کو پھولوں کے ہار پہنائے۔۔۔ نام ایک سا اور مقاصد کا اتنا بڑا اختلاف! ع

بر عکس نہند نام زنگی کافور!

خدا کے نیک بندو! جب تمہیں کوئی "سوانگ" ہی بھرنا تھا تو "اخوان" کے مقدس نام کو بدنام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔! بے ضمیری اور زمانہ سازی کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے!

"اوپر والوں" کے بس اشارے کی دیر ہے کراچی میں ہر روز ایک نئی پارٹی بن سکتی ہے اور بن ہی رہی ہیں ع

ہم چو سبزہ بار ہا روئیدہ ام ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

کا مفہوم اب سمجھ میں آیا کہ "سازش" کیسے کیسے روپ دھارتی اور کیسے کیسے قالب بدلتی ہے! "مرغان بادنما زندہ باد"!

ہماری نظر میں

عقائد الاسلام

"عقائد الاسلام"۔ از:- مولانا محمد ادریس کاندھلوی۔ ضخامت ۲۶۵ صفحات۔ قیمت مجلد ڈھائی روپے۔ غیر مجلد دو روپے۔ ملنے کا پتہ:- ادارۂ تبلیغ اسلام میکلوڈ روڈ۔ نمائش گراؤنڈ۔ لاہور۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی جامعہ اشرفیہ لاہور کے شیخ الحدیث والتفسیر ہیں اور عالم باعمل ہیں۔ وہ نام نہاد علماء جن کا دربارداری پیشہ اور حکام رسی مقصود ہے اور جن پر دنیا کی حرص غالب ہے اُن کے مقابلہ میں مولانا محمد ادریس حقیقت میں اسلاف کا نمونہ ہیں اور "صلحاء امت" میں شمار رہنے کے قابل ہیں۔ آنے والا زمانہ ایسے نیک اور بے نفس عالموں کے لئے بھی ترسے گا اور حسرت و افسوس کرے گا!

"عقائد الاسلام" اپنے موضوع پر بڑی جامع اور مفید کتاب ہے۔ فاضل مؤلف نے آزاد خیالی اور بے راہ روی کے اس تاریک دور میں یہ کتاب لکھ کر دین و اخلاق کی قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

"...... بغیر اعتقاد کے عذابِ آخرت سے نجات متصور نہیں اور جس شخص میں اعتقاد موجود ہو مگر عمل مفقود ہو اُس کے لئے نجات کی امید ہے......" (صفحہ ۹)

بے عملی کے اس دور میں یہ جملہ "مگر عمل مفقود ہو" لوگوں کو بے عملی پر اور جری بنائے گا۔ "مگر عمل کی کمی ہو" اگر لکھا جاتا تو یہ کھٹک دور ہو جاتی۔ پھر "محض اعتقاد" اور "عمل کا کلیتہً سرے سے فقدان"[1] اس کے بعد بس قانونی اور لغوی ایمان ہی باقی رہ جاتا ہے!

قرآن مجید کے مخلوق اور غیر مخلوق ہونے کے عقیدے کا ذکر اس زمانے میں زاید از ضرورت ہی ہے کہ اس دور کے عام مسلمانوں کو اس اختلاف کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس سلسلہ میں امام بخاری اور امام ذہلی کے اختلافات کا فاضل مؤلف نے ذکر چھیڑ کر لوگوں کی توجہ کو خواہ مخواہ چونکا دیا ہے۔

"اور یہ نہ کہنا چاہیئے کہ "ید" سے اللہ کی قدرت یا نعمت مراد ہے۔ اس لئے کہ اس طور سے اللہ کی صفات کو باطل کرنا لازم آتا ہے اور یہ قول معتزلہ کا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ "ید" اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جو کم اور کیف سے پاک ہے۔" (صفحہ ۶۲)

"ید" سے اللہ کی قدرت یا نعمت مراد لینا، اللہ کی صفت کو باطل کہاں کرتا ہے بلکہ یہ تو اللہ کی صفت کا اقرار ہے۔ جبکہ خود مؤلف نے "ید" کو اللہ تعالیٰ کی صفت مانا ہے — "ید سے اللہ کی قدرت یا نعمت مراد ہے" یا "ید اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے"۔

---

[1] چنانچہ صفحہ ۲۰۶ پر خود فاضل مؤلف نے لکھا ہے "ایمان اگرچہ تصدیق قلبی کا نام ہے مگر ایمان کے لئے اسلام یعنی عملی اطاعت اور فرمانبرداری لازم اور ضروری ہے......"

ان دونوں میں لفظی ہیر پھیر تو ہے مگر مفہوم ایک ہی ہے۔

"...... اور صحابہ سے بغض اور نفرت کفر اور نفاق اور فسوق اور عصیان ہے۔" (صفحہ ۱۵۶)

بیشک صحابہ کرام سے بغض و نفرت "نفاق" کی نشانی ہے اور فسوق و عصیان ہے۔ مگر "کفر" نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائکہ اور انبیاء کے علاوہ کسی انسان کے انکار اور تردید و تنقید پر کفر کا حکم نہیں لگ سکتے۔

"ولی سے جو خوارق عادات ظاہر ہوتے ہیں وہ نبی ہی کا فیض اور اُس کے کمال اطاعت اور کمالِ متابعت کی برکت ہوتی ہے ......" (صفحہ ۱۹۶)

"نبی کے فیض (اور تصرف)" کا مسئلہ ایک غلجان میں ڈالنے والی چیز ہے۔ کسی ولی سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے تو اُسے اللہ تعالیٰ کا عطیہ ماننا چاہیئے کہ کائنات کے تکوینی امور میں اللہ کے سوا کسی بندے کا چاہے وہ نبی ہی کیوں نہ ہو فیض و تصرف نہیں چلتا۔

"انعقاد امارت کا چوتھا طریقہ ——— استیلاء یعنی غلبہ اور تسلط ہے یعنی بغیر اہل حل وعقد کے بیعت کے ہو یا بغیر کسی بادشاہ یا بغیر مجلس شوریٰ کے انتخاب کے امیر بن جائے اور تالیف قلوب یا اپنی شوکت و ہیبت سے یا کسی حیلہ اور تدبیر سے لوگوں کو اپنے ساتھ ملالے تو یہ شخص بھی مسلمانوں کا امیر ہو جائے گا۔ ایسے امیر کی اطاعت بھی مسلمانوں پر واجب ہے۔" (صفحہ ۲۵۱)

مسلمانوں کی "امارت" کے لئے "بادشاہ" کے انتخاب کی شرط عجیب ہے کہ اسلام میں خلافت و امارت تو ہے مگر "بادشاہت" نہیں ہے۔ پھر "انعقاد امارت" کا یہ چوتھا طریقہ کتاب و سنت سے مستنبط نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی تاریخ کے بعض واقعات سے مستنبط اور مستخرج ہے۔ اس لئے یہ چند لوگوں کی رائے ہو سکتی ہے کوئی دینی حجت نہیں ہے۔ اگر اس نازک بحث کا ذکر نہ آتا تو اچھا تھا۔ کہ جمال ناصر جیسے غاصب، ظالم، فاسق اور مفاد پرست "امراء" اس مسئلہ کو اپنی اطاعت پر دلیل لائیں گے!

"اپنی گردن میں مذہبی طوق و سلاسل کو پھانسیں (صفحہ ۱۵) ——— اور "عناصر اسی قادر مختار کی ایجاد سے عدم کی پوشیدگی سے وجود میں آئی ہیں۔" (صفحہ ۳۲)

جہاں عبارت میں یہ رنگ آگیا ہے، بیان میں کمزوری اور جھول پیدا ہو گیا ہے۔ پھر "عنصر" بالاتفاق "مذکر" ہے اور یہاں تو اس کی جمع کو بھی مؤنث استعمال کیا گیا ہے!

"حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کی دعوت جب افلاطون کو پہنچی۔ جو اُن بدبختوں کا رئیس تھا۔ تو جواب میں یہ کہا۔ نحن قوم مھتدون لاحاجۃ بنا الی من یھدینا۔ ہم ہدایت یافتہ اور تعلیم یافتہ قوم ہیں۔ ہمیں کسی ہادی او معلم کی حاجت نہیں۔ اس بیوقوف کو چاہیئے تھا کہ اس شخص کو جا کر دیکھتا جو مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو بینا اور تندرست کرتا ہے۔ جو اُن کی حکمت سے کہیں بالا اور برتر ہے۔ افلاطون کو چاہیئے تھا کہ خود حاضر ہو کر عیسیٰ علیہ السلام کے حالات کا مشاہدہ کرتا اور جواب دیتا ......" (صفحہ ۳۰)

فاضل مؤلف سے یہ عجیب تاریخی غلطی ہو گئی ہے۔ افلاطون کا زمانہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً چار سو سال پہلے کا ہے۔ اس صورت میں حضرت عیسیٰؑ کی دعوت اس تک پہنچانا اور افلاطون کا جواب دینا ایک مضحکہ سے کم نہیں! آئندہ ایڈیشن میں اس تاریخی غلطی کی تصحیح بہت ضروری ہے۔

مولانا محمد ادریس کے نام کے ساتھ "الحاج" کا لقب و خطاب پسند نہیں آیا کہ یہ عجمی تکلفات ہیں۔ صحابہ کرام، تابعین اور

اور اُن کے بہت بعد کے زمانہ تک حج کرنے والوں کے نام کے ساتھ "حاجی" یا "الحاج" لکھنے کا رواج نہ تھا۔ یہ ہندوستان والوں کی ایجاد معلوم ہوتی ہے۔

تحفۂ حرم

"تحفۂ حرم"۔ از۔ اسد ملتانی۔ ضخامت ۵۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارہ روزنامہ شمس ملتان شہر

جناب اسد ملتانی کو گزشتہ سال زیارت حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ یہ کتاب اسی مقدس سفر کے تاثرات کا نقش منظوم ہے اور خوب ہے!

در بارگاہِ شاہ چو درویش می روم — نازم بہ ایں نیاز کہ از خویش می روم
یا جذبِ التفات کسے می بَرد مرا — یا از وفورِ جوشِ طلب پیش می روم
از خویشتن بر بود مرا رنگ و بوئے دہر — در بزمِ حُسن در طلبِ خویش می روم
اندر[1] سفر نظر ز قدم پیشتر فتد — ایں راہ من بہ دل ز نظر پیش می روم

تا پرتو جمال فتد بر دلم اسد
ہمراہ دوستانِ صفا کیش می روم

عجیب کیف کے عالم میں کر رہے ہیں طواف — سیاہ شمع کے لاکھوں سفید پروانے

"ملتانی مُصلّے[2]" کتنی رواں اور سادہ و پُرکار نظم ہے ؎

حرم کا جب بھی ہوتا ہے تصور — تو یاد آتا ہے ملتانی مُصلّےٰ
اِدھر وہ سامنے میزابِ رحمت — اُدھر پیشِ نظر بابِ معلّےٰ
حطیمِ پاک بالکل بالمقابل — تو بائیں کو براہیمی مُصلّےٰ
بہت پیچھے کو وہ میدان جس میں — پڑی رہتی ہے بجری اور غلّہ
سدا آنکھوں کے آگے سنگِ اسود — اور اُس پر چُمنے والوں کا ہلّہ
نظر کے سامنے رہتی ہمیشہ — غلافِ کعبہ کی سمتِ مُرطلّا
یہاں ملتانی اکثر آکے ملتے — کہ ہو معلوم سب کی خیر سلاّ
یہیں ہم نے بہت مانگیں دعائیں — پکڑ کر دامنِ رحمت کا پلّہ
تھے محو اتنے نہ تھی کچھ فکر اس کی — وطن میں امن ہے یا مارشل لار
غلافِ کعبہ کی گہری سیاہی — ہے یہ بھی اک عجب رنگِ تجلّی
حرم کے فرش پر سجدے کیے ہیں — کہ پہنچے ہیں سرِ عرشِ مُعلّی

---

[1] "اندر سفر" کھٹکتا ہے۔ کاش! اس کی جگہ موزوں تر لفظ ہوتے تو شعریت میں اور اضافہ ہوجاتا۔ (م۔ق)

[2] حرم کعبہ میں احباب سے ملنے کے لئے ایک مستقل نشست گاہ مقرر کرلی گئی تھی جسے تخصیص و تعارف کے لئے ہم آپس میں یہ نام دے دیا تھا۔ (اسد ملتانی)

گرانباری گناہوں کی بہت تھی   مگر بھاری رہا رحمت کا پلّہ

مسلمانوں کو یارب کر منظّم

ابھی تو ہے فقط ڈھوروں کا گلّہ

"اچھا سمجھ کر اُس میں ہو جاتے ہیں مُسلم مشتغل" (صفحہ ۱۰)

"مشتغل" بڑا بوجھل لفظ ہے۔

جام میں روئے دلِ آرام نظر آتا ہے   جاں سے بڑھ کر مجھے یہ جام نظر آتا ہے (صفحہ ۱۳)

"جام در روئے دل آرام" کا ذکر آنے کے باوجود شعر بے کیف ہے!

"علالت" جس نظم کا عنوان ہے وہ اس مجموعہ میں شامل نہ کی جاتی تو اچھا تھا۔

کتاب کے آخر میں ملتانی زبان میں ایک طویل نظم ہے جو بیچارے اُردو جاننے والوں کیلئے ایک "اعجوبہ" ہے!

حقیقت قوم کمبوہ

"حقیقت قوم کمبوہ اور خاندان زبیری کمبوہی"۔ مؤلفہ۔ محمود احمد عباسی امروہوی۔ ضخامت ۱۷۰ صفحات۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ سبط محمد فاروقی ۲۲ ماچکوٹ والا بلڈنگ۔ ونشو ناتھ پاٹل روڈ۔ عیدگاہ میدان۔ کراچی۔

اسلام نے نسل و رنگ کے مفاخر کو مٹا کر انسانی برادری میں مساوات قائم کردی اور عزت کا معیار "تقویٰ" تجویز کیا۔ مگر عجمیت کا بُرا ہو کہ خاندانی فخر کا جذبہ دبتا اور اُبھرتا رہا۔ خاص طور سے ہندوستان میں کچھ لوگ مخصوص پیشوں کی بنا پر کمین سمجھے جانے لگے اور کچھ لوگ نسبی طور پر شریف کہلانے لگے۔ پچھلے تیس چالیس سال کے عرصہ میں ہندوستان کے مسلمانوں میں خاندانی نسبت و تفاخر نے ایک عجیب رُخ اختیار کیا کہ وہ لوگ جو کپڑا بُننے کا پیشہ کرتے تھے اور جو گاؤ قصاب یا چمڑے کے تاجر تھے۔ اُن کے ناموں کے ساتھ "انصاری" اور "قریشی" کے اضافے نظر آنے لگے! یہاں تک کہ انصار اور قریش کی مستقل برادریاں بن گئیں۔

ان برادریوں کے "انصار" اور "قریش" کہلائے جانے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے اور نہ اُن کے اس دعوے کی تردید یا تائید کی ذمہ داری ہم پر عاید ہوتی ہے۔ مگر کہنا یہ ہے کہ ہندوستان میں جہاں بھی کوئی کپڑے بُننے والا مسلمان پایا جاتا ہے کیا وہ محض اس پیشہ کی بناء پر واقعی "انصاری" ہے؟ کیا مدینہ کے انصار نے پارچہ بافی کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ان مسلمان جولاہوں میں بہت سے خاندان نو مسلم ہوں۔ یا کسی پٹھان اور مغل نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہو۔ اور اُن کی اولاد نسلاً بعد نسل یہی کاروبار کرتی چلی آرہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ قصابوں اور نوربافوں میں کچھ خاندان نو مسلم ہوں اور انہی کے بعض گھرانے نسباً سادات بھی ہوں!

یو۔پی میں میرٹھ، امروہہ، مارہرہ، مرادآباد اور بریلی وغیرہ مقامات پر کمبوہ مسلمانوں کے محلّے پائے جاتے ہیں۔ میرٹھ میں تو

---

* ایک صاحب نے ہم سے کہا ہے کہ یو۔پی کے بعض شہروں میں سقّے اپنے کو "عباسی" کہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ حضرت عباسؓ ابن عبدالمطلب کی اولاد ہیں بلکہ اس نسبت سے کہ کربلا میں حضرت سکینہ بنت حسینؓ کے لئے نہر فرات سے پانی لینے کے لئے حضرت عباس تشریف لے گئے تھے۔ تو یہ لوگ اپنے کو "سقائے سکینہ حضرت عباسؓ کی اولاد بتلاتے ہیں۔ (م۔ق)

"کمبوہ دروازہ" شہر کا سب سے زیادہ مشہور گیٹ ہے! انیسویں صدی کے آخر تک سرکاری کاغذوں اور مردم شماری کے رجسٹروں میں کمبوہ صاحبان اپنے کو "کمبوہ" ہی لکھواتے تھے۔ مگر غالباً بیسویں صدی کے آغاز میں بعض کمبوہوں نے اپنے کو "زبیری" لکھنا شروع کیا۔ اور پھر یہ "خاندانی نسبت" چل پڑی۔ مگر اس دور میں بھی نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین نے اپنے نام کے ساتھ "زبیری" نہیں لکھا اور ہمارے زمانے میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے بھی اس لقب کو اختیار نہیں کیا۔

غالباً سب سے پہلے مارہرہ (ضلع ایٹہ) کے طبیب حکیم عنایت حسین نے اپنی تالیف "سلسلہ عالیہ" میں کمبوہ صاحبان کو "زبیری" یعنی حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی اولاد ہونے کا احساس دلایا۔ اور یہ احساس ذرا سی کوشش میں بیدار ہو گیا۔

جناب مولوی محمود احمد عباسی امروہوی نے "سلسلہ عالیہ"۔ "المشاہیر" اور "خاندان زبیری کمبوی" وغیرہ کتابوں کے رد میں یہ کتاب (حقیقت کمبوہ) لکھی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ تحقیق و تفحص کا حق ادا کر دیا ہے! ایسی تحقیق ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جب تک کہ محقق کا مطالعہ وسیع نہ ہو۔ ژرف بیں نگاہ نہ پائی ہو۔ اور ساتھ ہی مقصد سے لگن نہ ہو۔ انہوں نے پوری امت کی طرف سے فرض کفایہ سمجھ کر اس کام کو انجام دیا ہے۔

خاندان کمبوہ کی کوئی تاریخ ہماری نگاہ سے نہیں گزری۔ یہ پہلی تاریخ جو ایک "تردیدی بیان" ہے ہمارے سامنے آئی ہے لہذا اس کے مضامین، دلائل اور حوالوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ "سلسلہ عالیہ" اور "خاندان زبیری کمبوی" کے لکھنے والوں نے اپنی کتابوں میں بعض بڑی انمل بے جوڑ باتیں لکھ دی ہیں۔ جناب محمود عباسی صاحب نے اُن کی تحریف و تدلیس کی دھجیاں بکھیری ہیں۔ اور واقعات کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ نہ جانے اس کتاب کی تالیف و ترتیب میں عباسی صاحب کے کتنے سال صرف ہوئے ہیں!

طعن و طنز سے تو پوری کتاب ہی بھری ہوئی ہے۔ مگر بعض جگہ مصنف کا لہجہ ضرورت سے زیادہ درشت ہو گیا ہے۔۔۔ "چھیڑ، ہومت کہ بھرے بیٹھے ہیں"۔ جیسی کیفیت! بعض شخصیتوں کی مدح و ذم کے پہلو بھی محل غور ہیں۔ دیکھئے "زبیریوں" کی طرف سے اس کا جواب کب اور کیا ملتا ہے؟

اگر کمبوہ صاحبان واقعی نسلاً "زبیری" ہیں تو اس میں ہمارا کیا جاتا ہے۔ "چشم روشن دل ماشاد"۔ مگر اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث نہیں یاد آ رہی ہے۔ جس میں حضورؐ نے آباؤ اجداد کے غلط اور جعلی انتساب پر ناخوشی کا اظہار فرمایا ہے۔ لہذا دینی نقطۂ نگاہ سے خاندانوں کا غلط انتساب ایک طرح کا وبال ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں "تقویٰ" کی کیفیت عام کر دے کہ یہی سب سے بڑا شرف ہے۔ باقی نسل و رنگ کے امتیازات و مفاخر جھوٹے اور بناوٹی ہیں۔

داعی امن

"داعی امن"۔ از: مولانا عبدالسلام قدوائی۔ ضخامت ۱۶ صفحات۔
ملنے کا پتہ:۔ مجلس سیرت بمبئی ۱۳۸۔ زکریا اسٹریٹ بمبئی ۹۔

اس کتابچہ میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی سیرت اور تعلیمات پر ایک مفید اور دل نشین مضمون ہے۔ جسے مجلس سیرت بمبئی نے شائع کیا ہے اور غالباً اس کی کوئی قیمت نہیں رکھی۔ افادۂ عام کے لئے مفت تقسیم کیا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام۔ غیر مسلموں کی نظر میں

"پیغمبر اسلام غیر مسلموں کی نظر میں" مرتبہ۔ ظلی عباس عباسی۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات
ملنے کا پتہ۔ ادارہ نئی راہ۔ ۹۔ بی میرجی گوندجی بلاکس ناگپاڑہ بمبئی (بھارت)

حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت و شخصیت پر غیر مسلم (عیسائی۔ ہندو۔ سکھ) مشاہیر کے عقیدت آمیز آراء

اور اقوال جمع کئے گئے ہیں۔ فضل و صداقت کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ دشمن اُس کی گواہی دیں اور اس کتاب میں ایسی شہادتیں بکثرت ملیں گی۔

کشمکش

"کشمکش"۔ از:۔ سید رفیع الدین اشفاق۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ بیت الاشاعت۔ چھاؤنی ناگپور (ایم۔پی۔ بھارت)

جناب سید رفیع الدین اشفاق نے یہ ایک اصلاحی ڈرامہ لکھا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ لکھنے والے کا جذبہ نیک، نیت بخیر اور مقصد پاکیزہ ہے۔ کہیں کہیں فلسفیانہ رنگ بھی آ گیا ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ اُن کی تحریر کا یہ رنگ ہے:۔

"اس ماتما کی غلط بینی کو جہنم میں ڈالئے (صفحہ ۳)" "نفس کی سرگوشیاں متنفس کے لئے قیامت کا سامان کر دیتی ہیں" (صفحہ ۱۴)۔ "اور زندگی کے جمودی سکون کی خاطر......" (صفحہ ۱۵) "...... وجدانی کیفیت کی سرمستیوں سے رندانہ بے لگامیاں نا آشنا ہیں"۔ (صفحہ ۲۲)

کب ہوا وجہ تسلی لطف بے پایاں مجھے ہر تجلی دے رہی تھی گرچہ اک پیماں مجھے (صفحہ ۲۶)
پھر فروزاں کر رہا ہوں شمع بزم بے خودی آپ کی چشم عنایت دے گئی ساماں مجھے (صفحہ ۲۷)

دونوں شعروں کے آخری مصرعے بے ربط اور غیر شاعرانہ ہیں۔ ان شعروں کو مکالمہ میں درج کر کے مصنف نے اپنے ذوقِ شعری کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔

"عیسائی تعلیم صفحاتِ قرطاس میں بند ہو کر سسکیاں لے رہی ہے۔" (صفحہ ۶۷)۔ "زندگی کی یہ خوں آشام کیفیت الفاظ کے جامے کو جہنم کی آگ سے سلگا رہی ہے۔" (صفحہ ۸۹)

آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے۔ اس طرزِ نگارش کا پڑھنے والوں پر کیا اثر ہو گا؟

بنگال میں اُردو

"بنگال میں اُردو"۔ از:۔ وفا راشدی۔ ضخامت ۳۳۰ صفحات (مجلد گرد پوش اور متعدد تصویروں کے ساتھ)، قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اشاعت اُردو ۲۴۴ جیل روڈ، حیدرآباد سندھ (پاکستان)

جناب وفا راشدی نے اس کتاب میں مشرقی و مغربی بنگال میں اُردو زبان و ادب کی ابتدا سے لے کر ۱۹۵۴ء تک کی مکمل تاریخ پیش کی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ کتاب وفا راشدی کی برسوں کی محنت کا حاصل ہے کتاب چار ادوار میں تقسیم کی گئی ہے:۔

پہلا دور:۔ فورٹ ولیم کالج اور اس عہد کے دیگر مصنفین ــــ ۱۸۰۰ء تا ۱۸۲۵ء
دوسرا دور:۔ بنگال میں اُردو شاعری کا عروج ــــ ۱۸۲۵ء تا ۱۸۷۵ء
تیسرا دور:۔ شمس الشیخ اور خالد کا زمانہ ــــ ۱۸۷۵ء تا ۱۹۱۰ء
چوتھا دور:۔ آزاد، وحشت، ناطق اور آرزو کا زمانہ ــــ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۵۴ء

(صفحہ ۲) "۵۸۶ھ مطابق ۱۱۹۱ء میں جب راجہ بکرماجیت کے سر پر تاجِ شاہی رکھا گیا......" سنین لکھنے میں نہ جانے مصنف سے یہ فاش غلطی ہوئی ہے یا کاتب صاحب کی یہ نوازش ہے۔

صفحہ ۲۹ پر "تقویتہ الایمان" کا املا "تقویط الایمان" دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔

"بنگال میں اُردو" آنے والے تذکرہ نگاروں کے لئے ایک ڈائرکٹری کا کام دے گی اور لوگ اس سے فائدہ اُٹھائیں گے۔

ماہنامہ البلاغ کا تعلیمی نمبر

"ماہنامہ البلاغ" کا تعلیمی نمبر" مدیر مسئول - محی الدین نیری - قیمت فی پرچہ تین روپے (ماہنامہ البلاغ کا سالانہ چندہ پانچ روپے - ضخامت ۲۴۴ صفحات -

ملنے کا پتہ :- ماہنامہ "البلاغ" دفتر انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ کرنا روڈ بمبئی ۳ (بھارت)

اس معرکہ آرا تعلیمی نمبر کو مولانا حامد الانصاری غازی - مولانا قاضی اطہر مبارک پوری - اور مولانا عبدالرشید ندوی نے مرتب فرمایا ہے - جس میں دار العلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور سے لے کر مالاباد کے یتیم خانوں تک کے تاریخی حالات درج ہیں - ایک حصہ مشاہیر علماء کی سوانح کیلئے وقف ہے - اس کے علاوہ تعلیم و تربیت پر مفید مقالے ہیں -

صفحہ (ل) پر مجاہدین و شہدا میں جہاں حضرت سید احمد شہیدؒ کا ذکر ہے - وہاں بریگیڈیر عثمان کا نام درمیان میں لے آنا ذہنی مرعوبیت کی افسوسناک مثال ہے — صفحہ ۳۲ پر جو تاریخی قصیدہ درج ہے - اس کے اس قسم کے مصرعوں میں

"تو معاون اس کا وجود حاجی احمد غریب"

میں "شعریت" کی جگہ مضحکہ کا رنگ آگیا ہے - صفحہ ۲۰۴ پر "صاحب فتح الملہم" کی جگہ "صاحب فتح الہلم" لکھا ہوا پایا -

مجلہ البلاغ کا "تعلیمی نمبر" اپنی نوعیت اور جامعیت کے اعتبار سے بڑے کام کی چیز ہے - جس کی اشاعت پر ہم ادارہ "البلاغ" کو مبارکباد دیتے ہیں -

رسالہ بے نماز

"رسالہ بے نماز" - مرتبہ :- حافظ مولانا عبدالستار دہلوی - ضخامت ۲۴ صفحات - رسالہ مفت تقسیم ہوتا ہے - (اشاعت فنڈ کا ایک آنہ فی رسالہ تبلیغی سلسلہ کی امداد کے لئے مقرر ہے)

ملنے کا پتہ :- دفتر جمعیت تبلیغ غرباء اہل حدیث مدرسہ دار السلام محمدی مسجد، بنس روڈ - کراچی -

اس رسالہ میں قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ کے ذریعہ نماز کی فرضیت اور اہمیت دکھائی گئی ہے - اور اس پر زور دیا گیا ہے کہ تارکِ صلوٰۃ، صحابہ کرام، تابعین اور علماء امت کے نزدیک کافر ہے - اور غنیۃ الطالبین کی ایک عبارت سے سند لی گئی ہے کہ بے نماز پر نہ جنازے کی نماز پڑھی جائے نہ اُس کو مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن کیا جائے -

ہم کسی آدمی کو دیکھتے ہیں تو اس کے متعلق یہ تصور تک نہیں کر سکتے کہ یہ پانی نہیں پیتا اور کھانا نہیں کھاتا کہ اس کے بغیر تو آدمی زندہ رہ ہی نہیں سکتا - اسی طرح قرنِ اوّل میں ایک مسلمان کے بارے میں یہ بدگمانی کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ وہ نماز نہیں پڑھتا کہ ترکِ صلوٰۃ کے بعد دین و ایمان کا ٹھکانا کہاں رہتا ہے؟ مگر اب ایسا دور آگیا ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت ترکِ صلوٰۃ کی لعنت میں مبتلا ہے!

اس رسالہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے :-

"آپ کے علاقہ میں یا علم میں اگر کوئی دار المطالعہ ہو تو یہ رسالہ ایک عدد ہم سے منگوا کر وہاں داخل کرا دیجئے تاکہ ہر مسلمان وہاں اس کا مطالعہ کر کے نمازی بن جائے ......"

تو "بے نمازی" کو اس رسالہ کے ناشر نے بھی "مسلمانوں ہی میں شمار کیا ہے اور ٹھیک کیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی دانستہ اور عمداً مسلسل ترکِ صلوٰۃ کرتا ہے - وہ کلمہ پڑھنے کی بناء پر قانونی مسلمان تو ہے مگر اس کے دین و ایمان کا اللہ ہی حافظ ہے - نماز دین کا ستون ہے، جس نے نماز چھوڑ دی اس نے اس ستون ہی کو گرا دیا - یہ رسالہ بے نمازی مسلمانوں کی غفلت کے لئے کارگر تازیانہ ہے!

معلم الانشاء | "معلم الانشاء" (حصہ دوم) از:- مولانا عبدالماجد ندوی- ضخامت ۲۳۲ صفحات- قیمت دو روپے
ملنے کا پتہ:- مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یو-پی)

اس کتاب پر حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی کا مقدمہ اس کی افادیت کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ مولانا موصوف ہندوستان اور پاکستان میں عربی ادب کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ "معلم الانشاء" عربی انشاء پردازی پر بہترین کتاب ہے۔ صرف و نحو کے ضروری قواعد انتہائی آسان انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ اُردو سے عربی اور عربی سے اُردو ترجمہ کے لئے جو "تمرین" (Excercise) دی ہیں وہ ترجمہ و انشاء کے نفسیاتی اسلوب پر ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملوں سے تدریجاً ترقی ہوتی گئی ہے۔ یہاں تک کہ پھر یہ سلسلہ (تمرین) عربی کے ادبی مضامین تک جا پہنچا ہے۔ اصل مرتب کا مقصد صرف عربی سکھانا نہیں ہے ادبی شغف پیدا کرنا اُن کا اصل مقصود ہے اور موصوف ابھی اس کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔

مولانا عبدالماجد ندوی اُردو داں طبقہ کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اس پُر آشوب دور میں جبکہ ہندوستان میں "اُردو" کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ "عربی" کی مشعل ان خوفناک آندھیوں میں وہ روشن کئے ہوئے ہیں ـــــ!
(ایدہ اللہ بنصرہ العزیز)

راہ رَو اور کارواں | "راہ رو اور کارواں" مرتبہ:- حفیظ قتیل۔ ضخامت ۸۴ صفحات۔ قیمت دو روپے۔
ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیات اُردو۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں دکن کے چونسٹھ ادیبوں اور شاعروں کے مختصر سوانح حیات درج ہیں۔ دیباچہ میں ڈاکٹر حفیظ قتیل صاحب کی تحریر کا یہ انداز دیکھ کر حیرت ہوئی:-

"کتنے ہی ایسے بڈھے ادیب ہیں جنہوں نے غم روزگار کے پیچھے غم جاناں کو بھلا رکھا تھا
مگر ڈاکٹر صاحب کے آنکس نے اُن کے قلم کو بھی چلنے پر مجبور کر دیا"

"آنکس" کا یہاں استعمال ایک مضحکہ سے کم نہیں۔

"اور میں ہوں کہ پینترے بدل بدل کر وارخالی کرتا جا رہا ہوں ......"

"وارخالی کرنا" یہ کس زبان کا محاورہ ہے؟ اسی طرح تحریر میں اور بھی کئی جگہ جھول نظر آیا۔ صفحہ ۳ پر "ابن حجر عسقلانی" کی جگہ "ابن حجر عقسلانی" چھپ گیا۔ اس غلطی کا ذمہ دار کون ہے۔ کاتب یا مرتب؟

پیامِ انسانیت | "پیام انسانیت" از:- سید ابوالحسن علی ندوی ضخامت ۳۰ صفحات۔ قیمت دس آنہ۔
ملنے کا پتہ:- دفتر الفرقان۔ گوئن روڈ۔ لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی پانچ پبلک تقریروں کا یہ مجموعہ ہے۔ جن میں زندگی کے مسائل پر نئے طرز سے سوچنے اور نئے طریقے پر جد و جہد کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ہر تقریر اپنی جگہ ادب و اخلاق کا شاہکار ہے۔ معیشت و سیاست کے مسائل کو کس قدر سادگی کیساتھ بیان کیا ہے اور اثر انگیزی کا یہ عالم کہ ہر بات دل میں اُترتی اور گھر کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ دنیا کی زیادہ سے زیادہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو اور ایک ایک گھر میں اُسے پہنچایا جانا چاہیئے۔ ایک نمونہ:-

---

۵ (صفحہ ۲۲) "شوکے واحد بادشاہ تھے" یہ جملہ البتہ کھٹکا۔ اگرچہ "دونوں بھائی ان کی بادشاہی تھی" اس فوراً بعد کے جملے نے بات کو سنبھال لیا

"یورپ کے اخلاق میں توازن نہیں۔ ان کی مثال وہی ہے کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز! افراد کے چھوٹے چھوٹے معاملوں میں وہ بڑی ایمانداری سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جب اپنی قوم کی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایسے ایماندار افراد قوموں کو نگل جاتے ہیں۔ انفرادی زندگی میں ان کا یہ حال ہے کہ اگر ۹ بجکر ۱۲ منٹ پر آنے کا وعدہ کریں تو ٹھیک اسی وقت پہنچیں۔ لیکن قومی معاملات میں دوسری قوموں کو دھوکا دینے میں انھیں ذرا تامل نہیں۔ عربوں کے ساتھ ان کی عہد شکنی ضرب المثل ہے۔ ہم خود ان کا یہاں تجربہ کر چکے ہیں۔ ان میں اخلاق، خدا پرستی اور آخرت کی جواب دہی کی بنیاد پر نہیں آئے بلکہ نفع اندوزی اور مصلحت کیلئے انھیں اخلاقی ذہن بنانا پڑا۔ جب مصلحت کا تقاضا ہو تو بڑے با اخلاق، وعدے کے پکے اور جہاں ان کی مصلحت کا تقاضا کچھ اور ہو تو بڑی سے بڑی بداخلاقی میں ان کو باک نہیں......"

اخلاق و حکمت کے یہ موتی کتاب کے ایک ایک صفحہ پر بکھرے ہوئے ہیں۔

رسالہ حرمتِ نکاح شغار

"رسالہ حرمت نکاح شغار" از۔ مولانا عبد القادر۔ ضخامت ۳۱ صفحات۔ قیمت تین آنہ۔ ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ شعیب۔ آرٹلری میدان ہاؤنس روڈ۔ کراچی۔

"ایک لڑکی کو دوسری لڑکی کے بدلہ میں دے کر نکاح کرنے" کو "شغار" کہتے ہیں۔ اس رسالہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ اس قسم کا ادلا بدلی کا نکاح (شغار) شرعاً درست نہیں ہے۔ بہرحال ایسا نکاح جس کے درمیان مہر بھی ہو مگر "شغار" کی شرط ہو شرعاً مبغوض اور مکروہ تو ضرور ہے!

اسلامی حکومت

"کیا یہ صحیح ہے کہ اسلامی حکومت تیس سال سے زیادہ نہ چل سکی؟" از مولانا فضل احمد غزنوی بی اے (مولوی فاضل) ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت دو آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ ادارۂ تبلیغ الاسلام گاڑی خانہ احاطہ حیدر آباد سندھ۔

اس کتابچہ میں ثابت کیا گیا ہے کہ خلافتِ راشدہ تو خالص اسلامی حکومت تھی ہی مگر بنوامیہ۔ بنو عباس اور آلِ عثمان کی حکومتوں میں بھی اسلامی قانون مؤثر اور غالب عنصر کی حیثیت رکھتا تھا۔ (صفحہ ۶) "اور لالچ کے لئے منافقی کے طور پر مسلمان ہو گئے تھے" اس میں "منافقی کے طور پر" وجدان پر کس قدر گراں گزرتا ہے۔

فضائل رمضان

"فضائل رمضان" مرتبہ :۔ عبد الحلیم قاسمی ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت چار آنہ۔ ملنے کا پتہ :۔ ۱۲۸ ٹمپل روڈ لاہور۔

مولانا محمد عبد الحلیم قاسمی صاحب نے رمضان المبارک کے فضائل و مسائل اور عید الفطر کے مسائل اس کتابچے میں جمع کئے ہیں۔ جن کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے فائدہ مند ہے۔ آیات و احادیث کے متن کا سلیس ترجمہ بھی فاضل مرتب نے درج کر دیا ہے۔

رفیق حج

"رفیق حج" از :۔ مولوی محمد ظفر (ایم اے۔ ایل ایل بی) ضخامت ۴۸ صفحات۔ پاکٹ ایڈیشن۔ (کتاب مصارف ڈاک بھیجکر مفت منگائی جاسکتی ہے) ملنے کا پتہ :۔ محمد ظفر ایم اے۔ ایل ایل بی وکیل۔ مہتمم سلسلہ رفیق الاسلام بلاک ۲۳ مکان ۱۲ سرگودھا۔

مولوی محمد ظفر صاحب نے حج کے مسائل آسان انداز میں بیان کئے ہیں۔ مکالمہ نے کتاب کو اور دلنشین بنا دیا ہے۔ صاحب موصوف کی دوسری کتاب "آداب والدین" (ضخامت ۱۱۲ صفحات) بھی اسی سائز اور اسی انداز پر ہے۔ اس کا مطالعہ بچوں کے اخلاق سنوارنے میں مدد دے گا۔ مولوی محمد ظفر صاحب کے لکھنے کا انداز انتہائی سادہ اور عام فہم ہے۔

گلشن غفاری

"گلشن غفاری" مرتبہ:۔ ابو محمد عبدالغفار دہلوی۔ ضخامت ۱۲۰ صفحات۔ قیمت بارہ آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ ابو محمد عبدالغفار۔ محمدی مسجد آرٹلری میدان ۱/۲ بنس روڈ کراچی۔

اس کتاب میں اخلاق و عبادات پر ڈیڑھ سو نظمیں درج ہیں۔ بعض نظمیں سیدھی سادی ہیں مگر ان میں شعریت اور دلکشی کا دور دور پتہ نہیں۔ دو چار نظمیں البتہ جاندار ہیں:۔

فرنگی کی آنکھوں میں خون آرہا ہے — نگہ دار مسلم کہ یوں آرہا ہے (صفحہ ۲)

ہم نے جانچا ہے انھیں پرکھا بھی ان کو بارہا — چندے والے ہیں جو اکثر چار سو اور بیس ہیں (صفحہ ۴۸)

جیسے موزوں جملے "تک بندی" سے زیادہ اور کیا ہیں؟ ان کو بھی کسی نہ کسی طرح گوارا کر لیا جائے۔ مگر ؎

طلوع آسماں پر جب ہوا ماہ قمر — سجن میں آگئی جان جرگۂ شیطان کی
صحابہ سے حضرت نے فرمایا جب کہ — آئی اخیر تاریخ عشرۂ شعبان کی
کرو اب عزیز و سعی فی العبادت — کہ آئی جوش میں موج بحر غفران کی (صفحہ ۶۷)

عبدالغفار تم بھی پڑھ لو اب جلدی جلدی سے — کرو تیاریاں حج کی چلو، حج کو چلو، حج کو چلو (صفحہ ۶۹)

دین احمد کا جگا ہی دیا صدر کے دہلی والے نے — دین احمد کا سکھا ہی دیا صدر کے دہلی والے نے (صفحہ ۷۵)

بس کر نصیحت ہو چکی اے عبدالغفار — اب تو دعا کر کہ دنیا ماسوا اللہ پوچھا چھوڑ دے (صفحہ ۸۲)

جیسے ناموزوں جملے مولوی عبدالغفار صاحب نے درج کر کے اپنے ذوق کی رسوائی کا سامان خود ہی فراہم کر لیا ہے۔ جب ان کو شاعری سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے تو ان سے کس عقلمند نے نظموں کے مجموعہ کی ترتیب کے لئے اصرار کیا تھا۔ یہی وہ باتیں ہیں جنہیں دیکھ کر مغرب زدہ گروہ مذہبی لوگوں پر سادہ لوحی اور بدمذاقی کی پھبتیاں چست کرتا ہے ——
لاحول ولا قوۃ! توبہ!

جوار غوث الوریٰ

"جوارِ غوث الوریٰ" از:۔ ضیاء القادری بدایونی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
ملنے کا پتہ:۔ اصغر حسین قادری ۲۲ جٹ لینڈ لائن۔ صدر کراچی (۱)

مولانا ضیاء القادری بدایونی کا موضوع سخن ہمیشہ سے "نعت و منقبت" ہی رہا ہے۔ "لسان الحسان" ان کا خطاب ہے۔ دہلی کے مشہور رسالہ "آستانہ" کے ذریعہ موصوف مشہور سے مشہور تر ہو گئے۔ زود گوئی اور قدرت کلام میں وہ اپنا آپ جواب ہیں!

مولانا ضیاء القادری نے گزشتہ سال عراق کا سفر کیا اور وہاں کے مقدس مقامات کی زیارت سے مشرف ہوئے یہ کتاب اسی سفر کی منظوم داستان ہے۔ منقبت کی غزلیں اور سلام تو رواں اور شگفتہ ہیں مگر منظوم سفرنامہ میں آمد کم اور آورد زیادہ ہے۔ شاید اس کا سبب ان کی علالت اور سفر کی مشکلات ہیں کہ طبیعت کو یکسوئی اور نشاط و شگفتگی میسر نہ آسکی اور شاعری میں سارا کھیل شگفتہ خاطری ہی کا ہے!

یہاں بھی پیر و مرشد کا اثر ہی محض کام آیا ہوا ہر کام فوراً غوث کا جب لب پہ نام آیا

پوری کتاب اسی قسم کے معتقدات اور تصورات سے بھری ہوئی ہے۔ حالانکہ خدا کے سوا کسی کو فریاد رس اور مشکل کشا سمجھنا اور کسی قبر، روح یا صاحبِ قبر سے استغاثہ کرنا اور مدد چاہنا اسلامی نقطۂ نگاہ سے قطعاً ناجائز ہے۔ جس کی ذرا سی بھی اصل کتاب و سنّت میں نہیں ملتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی قسم کے منتشر کانہ عقائد کو مٹانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ مگر ان امتیوں کے جذبۂ عقیدت کو کیا کہیے؟ یہ حضرات اپنے عقائد میں اتنے پختہ ہوگئے ہیں کہ کوئی انہیں ٹوکتا ہے تو اسے الٹا وہابی اور بے دین سمجھتے ہیں!

نوائے وقت

"نوائے وقت" از:- نظام الدین، ایس گوریکر ضخامت ۱۰۴ صفحات (مجلد) قیمت دو روپے۔

ملنے کا پتہ:- رائٹرس ایمپوریم لمیٹڈ پیلس بلڈنگ سر فیروز شاہ مہتہ روڈ بمبئی ۱

بمبئی کے مشہور سینٹ زیویرس کالج میں "بزم اردو و ادب" کے زیرِ اہتمام ادبی جلسے منعقد ہوتے رہتے ہیں، اور ان میں پروفیسر نظام الدین ایس گوریکر ایم اے نے جو مختصر مقالے پڑھے ہیں۔ "نوائے وقت" انہی کا مجموعہ ہے۔ یہ مقالے مختصر ہیں۔ ہلکے پھلکے ہیں اور مفید ہیں!

"جج (اقبال) کی شاعری تسخیرِ قلوب کا ایک ضروری جزو تھی .... اور ایک بے کس کی آہ کی طرح جگر کو چھلنی کر دیا .... (صفحہ ۳۱)۔" علامہ اقبال سا بلند پایہ شاعر اگر عالمِ موجودات کے مختلف حصوں پر خیال آرائیاں کرے" (صفحہ ۴۴) "گاندھی جی کے سیاسی تدبّر کا ادنیٰ ثبوت اس بات میں پنہاں ہے" (صفحہ ۳۸) "شاعری حقیقت میں انسانی آفرینش کی ودیعت اور وہ مقدس و مستحسن فن ہے" (صفحہ ۶۸)

یہ رنگ کتاب میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ جو مقالہ نگار کی ناپختگی اور نومشقی کی غمازی کرتا ہے۔

لعل و دُرِ گراں بہا کہ سفتہ است چوں نظام موجِ زناں شدہ ہر طرف بحارِ خرمی

یہ تاریخی قطعہ کا پہلا شعر ہے۔ مہمل و بے ربط تک بندی ہے۔ پروفیسر نظام الدین صاحب کے ذوقِ شاعرانہ کو کیا کہیے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں اس قسم کے قطعہ کو جگہ دی!

تقویم ہجری و عیسوی

"تقویم ہجری و عیسوی" مرتبہ:- ابوالنصر محمد خالدی ایم اے (عثمانیہ) اور بہ نظرِ ثانی:- مولوی محمد احمد خاں، پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ ضخامت ۷۵ صفحات۔ (بڑا سائز) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ملنے کا پتہ:- انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی۔

سنہ ہجری سے لے کر سنہ ۱۵۰۰ ہجری تک کی یہ تقویم بڑی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہجری سنہ کی کس تاریخ کو دن کونسا تھا یا ہوگا۔ اور عیسوی سنہ کی تاریخ کیا تھی؟ یہ جنتری بڑے کام کی چیز ہے اور مرتب کرنے والے کی محنت قابلِ داد ہے۔ مولوی نظام الدین حسن مرحوم اس فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اس کام کو ابوالنصر محمد خالدی صاحب نے اور آگے بڑھا دیا۔

تحفہ عید رمضان

"تحفہ عید رمضان" از:- خان صاحب مولوی محمد ظفر بی اے، ایل ایل بی وکیل۔ ضخامت ۸۰ صفحات مفت۔ ملنے کا پتہ:- مہتمم سلک مروارید۔ سرگودھا۔

اس کتابچے میں روزہ، تراویح اور عیدالفطر کے مسائل نہایت ہی سلیس زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔ باتوں باتوں میں

فقہی مسائل سمجھا دیئے ہیں کہ طبیعت ذرا سا بھی بار محسوس نہیں کرتی۔ مؤلف کی کوشش یقیناً مفید اور مستحسن ہے۔

محنت کاروں کے مسائل اور اُن کا حل

"محنت کاروں کے مسائل اور اُن کا حل"۔ از:۔ عبدالمجید قریشی۔ ضخامت ۴۳ صفحات قیمت دس آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۃ الحبیب ۴۹ مین بازار، اچھرہ لاہور۔

نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب کتنی کار آمد، مفید اور وقت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ فاضل مصنّف نے اشتراکی نقطۂ نگاہ سے ہٹ کر بلکہ اُس کی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے "محنت کاروں کے مسائل کا حل" پیش کیا ہے۔

"اشتراکی لیڈر تو سرے سے مزدوروں کے مسائل حل کرنے ہی کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ مسائل کے حل ہونے یا سہولت بہم پہنچنے سے مزدوروں میں طبقاتی احساس باقی نہیں رہتا۔ وہ تو چاہتے یہ ہیں کہ مزدور بدحال اور غیر مطمئن رہے تاکہ انتقامی جذبات بڑھانا ہر وقت ممکن ہو۔"

"انتظامیہ اجیر سے ہمدردی کا سلوک کرنے اور مطمئن کرنے کے بجائے ڈرا دھمکا کر اور اپنی قوت سے خوفزدہ رکھنے کو صحیح سمجھتی ہے۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرض کے علاج کی فکر کرنے کے بجائے درد کے احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ علالت کے وجوہ اگر رفع نہ ہوں تو یہ ہلاکت کا موجب بن سکتی ہے۔"

ان اقتباسات سے کتاب کی افادیت اور مصنّف کی اصابتِ فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مکتبۃ الحبیب اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔

سچّی باتیں

"سچّی باتیں"۔ (حصہ اوّل) ضخامت ۶۸ صفحات۔ قیمت ۹ر۔ از:۔ انوار الحسن ایم۔ اے۔ ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ ۱۵۔ لیک روڈ۔ لاہور۔
سچّی باتیں (حصہ دوم) ضخامت ۴۲ صفحات۔ قیمت ۵ر۔

یہ دونوں کتابیں بچّوں کے لئے انتہائی، سادہ، سلیس اور سہل زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں خدا و رسولؐ اور اخلاق و تہذیب کی باتیں ملتی ہیں۔ "مکتبۂ علمیہ" نے یہ بڑا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنّف اور ناشر دونوں کو اجر دارین عطا فرمائے۔

سونے کا دریا اور......

(۱) سونے کا دریا۔ ضخامت ۴۰ صفحات قیمت پانچ آنہ۔ (۲) محل زر ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔ (۳) بھٹکا ہوا شکاری۔ ضخامت ۴۶ صفحات۔ قیمت ۷ر۔ (۴) سفید پرندے۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔ مترجم۔ عبید الحق۔ ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ۔ ۵ الیک روڈ۔ لاہور۔

"دار المعارف" مصر نے القصص المدرسیہ کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ جسے مصر کے تین نامور ادیبوں (سعید العریان۔ امین دویدار۔ محمود زہران) نے تالیف کیا ہے۔ میں نے ان قصوں کو پڑھا اور انھیں ازحد دلچسپ اور نہایت مفید پا کر اردو میں ترجمہ کر دیا۔"

یہ فاضل مترجم کا بیان ہے اور ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ بچّے ان کہانیوں کو بڑے شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ترجمہ آسان اور سہل ہے۔ کتابت اور طباعت میں بھی بچّوں کی نفسیات کی رعایت رکھی گئی ہے۔

"سونے کا دریا" (صفحہ ۱۹) "وہ اپنی انہی نیک خوابوں میں تیر رہا تھا"۔ "خواب" مذکر ہے۔ شرکتہ (کمپنی) غزل دکا تنا) نسیج (سنائی) اور شہادت ثانویہ (دسویں سند) کے معنی فٹ نوٹ میں دیئے گئے ہیں۔ مگر متن میں بچّوں پر ان کا پڑھنا

گراں گزرے گا۔ "محلِ زر" میں (صفحہ ۳۶) "سیبی" کو "صیبی" لکھا ہے۔ "سفید پرندے" (صفحہ ۱۷) "عساکرِ دا عوان"۔ بھی بچّوں کے لئے مشکل الفاظ ہیں۔ اُردو میں کیا ان لفظوں کا بدل نہیں ملتا۔ "بھٹکا ہوا شکاری" (صفحہ ۹) "مشاہدِ عظیمہ" سے بھی بچّوں کو وحشت ہوگی۔ (صفحہ ۱۸) "اس طرح اُن کے مُنہ میں لعاب چل پڑتا ہے"۔ محلِ غور ہے اور (صفحہ ۲۶) "وہ خون سے لتھڑا ہوا تھا"۔ یہاں "سے" کا نہیں "میں" کا محل تھا۔

سچّی باتیں

"سچّی باتیں" (حصّہ سوم) از:- انوار الحسن ایم اے۔ ضخامت ۷۰ صفحات۔ قیمت نو آنہ۔

ملنے کا پتہ:- المکتبۃ العلمیہ، ۱۵ لیک روڈ۔ لاہور۔

اس کتاب میں اذان، تکبیر، وضو۔ تیمم اور نماز کی ترکیب اس قدر آسان انداز میں بیان کی گئی ہے کہ معمولی فہم کا بچّہ بھی اُسے سمجھ سکتا ہے۔ یہ کتاب بچّوں کے لئے لکھی گئی ہے مگر بڑے لوگوں کے بھی فائدے کی ہے۔ جمعہ، عید، بقر عید اور جنازے کی نماز کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک اس کتاب کی ہر سطر مفید ہے۔

معراجِ نبوی

"معراجِ نبوی اور رجب کی رجبی"۔ مرتبہ:- ابو محمد عبد الغفار دہلوی۔ ضخامت ۲۴ صفحات۔

ملنے کا پتہ:- امام محمدی مسجد۔ آرٹلری میدان ۲۔ بنس روڈ۔ کراچی۔

اس کتابچہ میں حضورؐ کی معراج جسمانی کے عقلی اور نقلی ثبوت دیئے گئے ہیں اور ماہ رجب کی بدعات کا زور شور کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ مولوی عبد الغفار صاحب کا دوسرا رسالہ "حرمتِ زنا" (ضخامت ۲۴ صفحات۔ قیمت چار آنہ) ہے۔ جس میں زنا کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ اس میں "تنذیر" کا پہلو غالب ہے جس کی ضرورت بھی تھی۔

علمِ غیب

"علمِ غیب" از:- مولانا عبد الستار کلانوری۔ ضخامت ۱۶ صفحات۔ قیمت تین آنہ۔

ملنے کا پتہ:- مکتبہ دینیات۔ محمدی مسجد۔ بنس روڈ۔ کراچی۔

اس کتابچہ میں قرآنی آیتوں کے حوالہ سے ثابت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو علمِ غیب نہیں ہے۔

رفع الیدین

"رفع الیدین" از:- ابو محمد عبد الغفار دہلوی۔ ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔

ملنے کا پتہ:- منیجر مکتبۂ دینیات۔ محمدی مسجد۔ بنس روڈ۔ کراچی۔

"رفع یدین" کے ثبوت میں احادیث اور ائمہ کے اقوال جمع کئے گئے ہیں۔ دیکھئے احناف ان کا کیا جواب دیتے ہیں؟ حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ پر جو جرح کی گئی ہے وہ ناپسندیدہ ہے۔

آدابِ دُعا

"آدابِ دعا" از:- ابو محمد عبد الغفار نگراں صحیفہ اہلِ حدیث۔ ضخامت ۱۶ صفحات۔ قیمت دو آنہ۔

ملنے کا پتہ:- محمد عبد الغفار۔ محمدی مسجد۔ آرٹلری میدان ۲۔ بنس روڈ کراچی۔

اس کتابچہ میں دعا مانگنے کا مسنون طریقہ۔ دُعا کی قبولیت کا وعدہ۔ دُعا کی فضیلتیں۔ دُعا کے اوقات۔ دُعا کے قبول ہونے کے علامات۔ عام فہم زبان میں بیان کئے گئے ہیں۔

زکوٰۃ کا فتویٰ

"زکوٰۃ کا فتویٰ"۔ از:- مولانا عبد اللہ غازی پوری مرحوم۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت چھ آنہ۔

ملنے کا پتہ:- ادارہ دار الاشاعت۔ متصل محمدی مسجد۔ بنس روڈ۔ کراچی۔

یہ کتابچہ زکوٰۃ کے مسائل پر ہے۔ ساتھ ہی صدقات و خیرات کی فضیلت اور بُخل کی مذمت بھی اس میں ملتی ہے۔

ایک خواب اور اسکی تعبیر

"ایک خواب اور اُس کی تعبیر" ضخامت آٹھ صفحات - قیمت دو آنے -
ملنے کا پتہ :- مکتبہ دینیات - محمدی مسجد - بنس روڈ - کراچی -

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بیداری کے علاوہ خواب میں بھی (اور نبی کا خواب سچا اور واقعی ہوتا ہے) دوزخ اور جنت کے چند مناظر دکھائے تھے، جن میں گناہگاروں پر دردناک عذاب ہو رہا تھا - اور نیک لوگ خوبصورت مکانوں اور خوشنما باغیچوں میں تھے - اسی خواب کو مولوی ابو محمد عبدالغفار صاحب نے اُردو میں منتقل کیا ہے -

انتخاب کلام امیر مینائی

"انتخاب کلام امیر مینائی" مُرتب :- خالد مینائی (ایم اے) ضخامت ۹۴ صفحات - (پاکٹ سائز)
ملنے کا پتہ :- مکتبۃ الحبیب ۴۹ مین بازار - اچھرہ لاہور -

حضرت امیر مینائی کے لائق پوتے جناب خالد مینائی (ایم اے) نے یہ انتخاب پیش کیا ہے اور شروع میں صاحب کلام کے مختصر حالات بھی دے دیئے ہیں :-

جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی —— وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا
حُسن کھلتا ہے حسینوں کا جسے جتنی نگاہ —— جس قدر دیکھو اُبھرتا ہے بدن تصویر کا
دیکھ جو کچھ سامنے آجائے مُنہ سے کچھ نہ بول —— آنکھ آئینہ کی پیدا کر، دہن تصویر کا
قریب ہے یار! روزِ محشر چھپے گا کُشتوں کا خون کیونکر —— جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا
شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو —— کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شبِ جُدائی کا
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں —— سچ سچ بتا یہ لفظ اُنہی کی زباں کے ہیں
وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں، دیکھتے تو ہیں —— میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
خیال آتا ہے پیری میں جوانی خواب تھا گویا —— پلک جھپکی جھپکتی ہے یہ دن پہلے گزرتے ہیں
رہو تم شوق سے عہدِ شباب و دورِ مستی میں —— ہم اپنے سر بلائے گردشِ ایام لیتے ہیں
زاہدو! تم کو جناں ہم کو درِ یار پسند —— خیر تم جاؤ اُدھر ہم تو اِدھر جاتے ہیں
اے برق! تو کبھی تڑپی ٹھہر گئی —— یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں
رُوٹھنا روز کا ٹھہرا ہے تو یہ سُن رکھیئے —— روز کے رُوٹھنے والے کو مناتے بھی نہیں
یہ چرچے یہ صحبت یہ عالم کہاں —— خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں!
لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں —— بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں
امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے —— پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے
تم کو آتا ہے پیار پر غصہ —— مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے
مسکرایا وہ اس ادا سے امیر —— میں تو سمجھا کہ اب گری بجلی
جو ہے بہار اُس کو خزاں کا خطر بھی ہے —— اے باغباں! بسنت کی تجھ کو خبر بھی ہے

ان شعروں سے تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ انتخاب کس قدر دلکش اور دلچسپ ہے -

FARAN Karachi Regd. No. 1262

فاران کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جولائی ۱۹۵۵ء

8/-

ماہر القادری

جلد ۷ ماہنامہ نمبر ۴

فاران

جولائی سنہ ۱۹۵۵ء ———— ایڈیٹر ———— ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸/

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱/

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی نمبر ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

گورنر جنرل بہادر نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کو اپنے فرمان سے توڑ دیا اور وہ ٹوٹ گئی۔ بعض لوگوں نے اُن کے اس اقدام پر مبارکباد دی اور پھر فیڈرل کورٹ نے یہ فیصلہ بھی سُنا دیا کہ گورنر جنرل دستور یہ کے توڑنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہوا۔ جرما ہوا اور دُنیا دیکھتی رہی ــــــ مگر اس کے بعد جو کچھ ظہور میں آیا اُسے بھی دُنیا دیکھ رہی ہے!

اس ایک شاہانہ اقدام نے کتنی بہت سی پیچیدگیوں کو پیدا کر دیا۔ کتنی دوسری گتھیوں میں نئے نئے پیچ پڑ گئے۔ کیسے کیسے خطرناک اور نازک مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فرمایا گیا تھا کہ سابق دستور ساز اسمبلی نے صوبجاتی رقابتوں کو اُبھار دیا تھا۔ مگر اس کے بعد خود صوبوں میں پہلے سے ہزار درجہ زیادہ خطرناک اور شدید رقابتیں اُبھر آئیں۔ سندھ اور پنجاب میں جو کچھ اب تک ہو چکا ہے اُس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے قلم ندامت محسوس کرتا ہے۔

مرکز کا فرض تھا کہ وہ ان بے عنوانیوں کو چیک کرتا۔ دھونس اور دھاندلی کی ہت پھیریوں کو روکا جاتا اور ناروا اقدامات پر احتساب کیا جاتا۔ مگر مرکز خاموش ہے اس لئے کہ ان کارستانیوں کی زد مرکز کے اختیار و اقتدار پر آ کر نہیں پڑ رہی ہے۔ ہاں! مرکز جب محسوس کرے گا کہ اس کے شاہانہ اقتدار پر آنچ آ رہی ہے تو پھر "اختیارات خسروانہ" اپنا فرض انجام دینے میں ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی روا نہ رکھیں گے۔ اور ملک و قوم کی فلاح و نجات اور پاکستان کی وحدت و سلامتی کے نام پر ہر تغیر و انقلاب ظہور میں آ جائے گا۔ چاہے وہ عوام کیلئے کتنا ہی نامانوس، غیر متوقع اور وحشت ناک کیوں نہ ہو!

پنجاب کے گورنر نواب مشتاق احمد خاں گورمانی جوڑ توڑ کے جس "فنِ خاص" میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ اس مہارت سے مرکز میں انہوں نے خوب خوب کام لیا اور اب پنجاب میں تو صاحب موصوف نے اپنے اس مہارت اور استعدادِ خاص کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ملک کا دردمند طبقہ چیخ اُٹھا کہ ؎

یہ کیا کر رہے ہو، یہ کیا ہو رہا ہے!

مگر اختیار و اقتدار کے نقار خانے میں طوطیوں کی نواؤں کو سُنتا کون ہے؟ جہاں طاقت ہی سب کچھ ہو دلیل بھی اور فیصلہ بھی! وہاں کوئی انصاف چاہے تو کس سے چاہے!

ہمارے ارباب اقتدار کے پاس سب سے زیادہ کارگر حربہ بلکہ یوں کہئیے چلتا ہوا جادو جاہ و منصب کا لالچ ہے۔ یہ جال جہاں بچھا بس پھر ہر سیاسی طائر کو پھنسا ہوا ہی سمجھو۔ پنجاب میں اس آزمودہ نسخہ کو استعمال کیا گیا۔ وہاں کے بعض بڑے لوگوں سے حقیقت میں پیمانِ وفا اور عہدِ مروت کے "معجزے" (؟) ظاہر ہوئے ہیں۔ ایسے مُرغانِ باد نُما کم ہی دیکھنے میں آئے ہیں۔ ضمیر بکنے کو بک تو جاتے ہیں مگر چوراہوں پر ضمیروں کا نیلام پنجاب ہی میں دیکھنے میں آیا ـــ اقتدار کی کرسی چھنی تو مسٹر نون نے جمہوریت و انصاف کی دُہائی دینی شروع کی۔ جمہوریت کے تقاضوں کا احساس اُنھیں بے اختیار ہونے کے بعد ہوا۔ جب تک اُن کے قبضہ میں اقتدار تھا اُس وقت تک جمہوری مطالبہ کا ہر خونِ ناحق اُن کے لئے روا تھا۔ چرخ نیلوفری کی ایک ہی گردش نے اُنھیں جمہوریت پسند مظلوموں کی صف میں کھڑا کر دیا!

مسٹر گورمانی کی سیاست پنجاب میں مصروفِ شیشہ بازی تھی ہی کہ پاکستان کے وزیر اعظم مسٹر محمد علی نے صورت حال سے بروقت فائدہ اُٹھایا اور بنگال میں گورنری راج کو ختم کر کے وزارت کو بحال کر دیا۔ یہ اقدام کوئی شک نہیں کہ مبارک تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ وزیر اعظم کے اخلاص سے زیادہ اُن کے سیاسی اغراض بھی اس میں کار فرما تھی۔ مسٹر شہید سہروردی جیسے سیاسی شاطر کو اس ایک چال نے کس قدر زچ کر دیا ـــ وہ بیچارے دیکھتے ہی رہ گئے کہ ہیں! یہ کیا ہوا؟ بنگال میں وزارت کی بحالی جب کبھی بھی ہوتی تو میرے مشورے سے ہوتی۔ یہ سہرا میرے سر پر بندھنا چاہئیے تھا۔ مگر بندھ گیا مسٹر محمد علی کے سر پر!

ان حالات نے پاکستان کے وزیر اعظم اور وزیر قانون کو ایک دوسرے کا کھُلا ہوا حریف بنا دیا ہے۔ اس رقابت اور رسہ کشی کے جو کچھ بھی نتائج برآمد ہوں، اس کو کیا کیا جائے کہ پاکستان کی قسمت میں شخصی مفادات کا تصادم اور اقتدار کی جنگ لکھی ہوئی ہے۔ مرکز کے دوسرے وزراء اگر مسٹر محمد علی اور سہروردی صاحب کی حریفانہ نزاع سے بالکل الگ تھلگ ہیں تو پھر یہ "عزت مآب" یا تو فرشتے ہیں یا راہب ہیں!

جمہوری حکومتوں میں وزراء عوام کے منتخب کردہ نمائندے ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے کو عوام کا خادم اور ترجمان سمجھتے ہیں۔ مگر پاکستان کے مرکزی وزراء کو یہاں کے گورنر جنرل نے اپنے خاص اختیارات سے نامزد کیا ہے۔ اس لئے اُن کی احسان شناسی کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے ولی نعمت کے نیاز مند رہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پاکستان کے عوام کی ناخوشی اُن کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی، انھیں اُس شخصیتِ اعلیٰ کو بہر حال خوش رکھنا ہے۔ جس کے قلم کی ایک جنبش وزیروں کو کرسی سے اُتار سکتی ہے اور کرسی پر بٹھا سکتی ہے۔ اس چیز نے پاکستان کے عوام اور یہاں کے اعلیٰ حاکموں کے درمیان اختیار و بیچارگی اور بلندی و پستی کی بہت بڑی خلیج حائل کر دی ہے۔ مانا کہ یہ صورت حال بہت دن تک قائم نہیں رہ سکتی۔ مگر جب تک بھی رہے گی ملک کی قسمت کا ستارہ فلاکت و ادبار کے برج ہی میں رہے گا!

پاکستان کے گورنر جنرل کی قانونی پوزیشن یہ ہے کہ صاحب موصوف ملکہ معظمہ کے "نمائندہ" ہیں۔ اس لئے وہ اختیار و مرتبت کی اُس بلندی پر براجمان ہیں۔ جہاں وہ عوام کی کسی مجلس یا ادارے کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں! اگر پاکستان میں حقیقی جمہوریت ہوتی تو اس کے حاکم اعلیٰ سے اُس کے سفرِ علاج کے مصارف، سیر و سیاحت کے پروگرام اور اس کی پالیسی

کے بارے میں پوچھ گچھ ہو سکتی تھی۔ اس مطلق العنانی اور جمہوریت کے درمیان اگر کوئی مطابقت ہوگی تو اس نازک گرہ کو فیڈرل کورٹ کے فاضل چیف جج مسٹر منیر ہی کا ناخن دانش و حکمت کھول سکتا ہے!

ارادے کیا ہیں؟

پاکستان کے عوام کے کیا مطالبات ہیں؟ پاکستان کس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ پاکستان کا معاشرہ کن خطوط پر ترقی کرے گا اور پروان چڑھے گا۔ یہاں کے عوام کے دین و ثقافت کی کیا تاریخ ہے؟ ماضی اور مستقبل کے درمیان کس طرح مطابقت پیدا کی جائے گی؟ یہ سب باتیں پاکستان کے ارباب فکر ہی جان سکتے ہیں۔ دستور و قانون کی نزاکتوں کے جاننے اور پہچاننے والے بھی یہاں موجود ہیں۔ مگر ہمارے وزیر قانون مسٹر سہروردی انگلستان تشریف لیجاکر وہاں کے ماہرین دستور سے پاکستان کی دستور سازی کے بارے میں مشورہ فرماتے ہیں۔ اور اس بات کا انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ اس طرح وہ پاکستانی عوام و خواص کی نااہلیت کو عالم آشکارا کر رہے ہیں۔ اور دنیا کو بتا رہے ہیں کہ آزاد ہو جانے کے بعد بھی ہم انگریز کی رہنمائی اور مشورت کے محتاج ہیں؟ جس زمانے میں سہروردی صاحب انگلستان کے "دستوریئن" سے مشورت کرتے ہوتے ہیں اسی اثناء میں مسٹر غلام محمد اپنے "دوستوں" سے ملنے کے لئے سوئیٹزرلینڈ سے لندن تشریف لے جاتے ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ انگریز کے موئے قلم کو اگر موقع ملا تو پاکستانی دستور کے خط و خال کو وہ کیا سے کیا بنادے گا؟

تقسیم ہند کے سلسلہ میں انگریز کا ہم تجربہ کر چکے ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈکلف کی سیاست اور ڈپلومیسی کے زخم ابھی ہمارے کلیجوں میں تازہ ہیں مگر اس پر بھی ہمارے ارباب اقتدار انگریز کی مشورت و رہنمائی پر اعتماد کرلیں تو ملک و ملت کی اس سے بڑی بد قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے!

ایک طرف وزیر قانون کی یہ "سعیٔ بے جا" اپنا کام کر رہی ہے اور دوسری طرف وزیر اعظم صاحب اعلان فرماتے ہیں کہ دو مہینے کے اندر اندر دستور سازی کا کام ختم ہو جائے گا۔ وزیر اعظم کا یہ اعلان اس حقیقت کی پردہ کشائی اور غمازی کرتا ہے کہ "عالم بالا" میں کوئی دستور تیار کر لیا گیا ہے۔ اور وہ جو عبوری دستور کا شگوفہ چھوڑا گیا تھا وہ ایک معنی خیز اعلان اور سوچی ہوئی اسکیم تھی۔ جسے شاید بار آور ہونے کا اب موقع مل رہا ہے!

دوسروں کی طرح ہم بھی سُن رہے ہیں کہ ایک دستور چھپا چھپایا تیار رکھا ہے۔ اسمبلی کا اجلاس شروع ہوتے ہی اسے پیش کر دیا جائے گا۔ اگر یہ دستور پاکستانی عوام کے لئے بنا ہے تو اسے اب تک منظر عام پر آجانا چاہیئے تھا۔ تاکہ حکومت کے بنائے ہوئے دستور کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کی جاتی اور دستور کے محاسن و معائب منظر عام پر آجاتے ۔۔۔ مگر اس مسودہ دستور کو کنز مخفی اور دُر مکنون کی طرح عوام کی نگاہ سے چھپا کر رکھنا اور ساتھ ہی یہ توقع قائم کر لینا کہ دستور ساز اسمبلی دو مہینے کے اندر اندر اسے منظور کر کے اپنا کام ختم کر دے گی ۔۔۔ دستور سازی کے معروف اصول کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے۔ جس میں آمریت کی جھلک بھی پائی جاتی ہے؟

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وزیر اعظم نے یہ توقع کس طرح قائم کر لی ہے کہ حکومت کے بنائے ہوئے دستور کو دستور ساز اسمبلی کے ارکان چار و ناچار منظور کر ہی لیں گے اور یہ مسودہ دستور ساز اسمبلی میں بہر عنوان پاس ہو کر رہے گا۔ اس توقع کی آخر بنیاد کیا ہے؟ یہ اعتماد کس بناء پر قائم کیا گیا ہے؟ اور پھر دو مہینے کی قلیل مدت میں یہ کام ہو کیسے سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ دستور یہ کے ارکان آنکھ بند کر کے مسودہ دستور کی ہر دفعہ پر انگوٹھا لگاتے ہوئے چلے جائیں اور پھر اعلان کر دیا جائے کہ دستور ساز اسمبلی میں مسودہ کی خواندگی ہو چکی اور اسے منظور کر لیا گیا!

اگر وزیر اعظم کو مسودۂ دستور کے بارے میں پورا یقین ہے کہ وہ اتنا مکمل، جامع اور عوام کی تمناؤں کے عین مطابق ہے کہ اس سے اختلاف کیا ہی نہیں جاسکتا تو اس قسم کے عوامی دستور کو وہ عوام کے سامنے اب تک کیوں نہیں لائے کہ یہ جو بیسیوں قسم کے خدشات اور شبہات پیدا ہو رہے ہیں وہ دور ہو جاتے اور ملک کی متموج فضا میں سکون پیدا ہو جاتا!

جب سے یہ اعلان ہوا ہے کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس مری میں ہوگا۔ پریس اور عوام شدت سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں کہ اس نقل مکانی کی آخر ضرورت کیا پیش آگئی ہے؟ کراچی میں اسمبلی کی عمارت ہے۔ دفتر ہے۔ عملہ ہے، ارکان کے ٹھہرنے کے لئے بھی ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ پھر کراچی میں ایسی گرمی بھی نہیں پڑتی جسے ناقابل برداشت کہا جاسکے۔ مگر عوام بیچاروں کی سنتا کون ہے۔ خداوندان نعمت جو فیصلہ کر چکے ہیں وہ قضائے مبرم ہے ٹل نہیں سکتا! اس صورت میں اگر یہ شبہات دل و دماغ میں پیدا ہوں کہ عوام سے ارکانِ دستوریہ کو دور رکھنے کے لئے جان کر یہ تدبیر اختیار کی گئی ہے۔ تو ان شبہات کو مفروضات اور توہمات کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا!

عوام سے، عوام کے مطالبات سے اور ملت کے تقاضوں سے ارباب اقتدار آخر کب تک دامن کشاں رہیں گے۔ عوام کو آخر کب تک نظر انداز کیا جاتا رہے گا۔ کیا ہمیشہ یہی حالات رہیں گے۔ کیا سدا جاہ و منصب کا ہی پلّہ بھاری رہیگا۔ اشتراکیت کتنا غلط اور غیر فطری نظام ہے جب اس کے سامنے زار کی شہنشاہیت نہ ٹھہر سکی۔ تو اسلام جیسے فطری اور بہترین نظام کے سامنے انگریزی ملوکیت کے باقی ماندہ آثار کب تک ٹھہر سکیں گے۔ قائد اعظم مرحوم نے اسلام کا نعرہ بلند کیا تھا جس کی قوت کے آگے انگریز اور ہندو دونوں طاقتوں کو سپر انداختہ ہونا پڑا۔ تو پھر اسلامی نظام کا راستہ کونسی طاقت روک سکتی ہے۔ اس دھارے کی راہ میں جو بھی مزاحم ہوگا وہ خس و خاشاک کی طرح بہ جائے گا!

جائزہ اور گزارش

مسٹر گورمانی صوبہ کے گورنر ہیں اور دستوریہ کی رکنیت کی امیدواری کے لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف انتخاب کے زمانے میں مسٹر محمد علی اور مسٹر سہروردی ڈھاکہ تشریف لے جاتے ہیں۔ بیچاری مسلم لیگ کی مجبوری اور بے دست و پائی بھی قابل رحم ہے کہ اس کے نام سے ٹکٹ اُن لوگوں کو بھی دیئے جاتے ہیں جن کا مسلم لیگ سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ مسلم لیگ کو دفنا کر پھر اس کو ایکا ایکی زندہ کر دینا ارباب اقتدار کی مسیحا نفسی کا زندہ شعبدہ ہے! —— صوبوں میں دستوریہ کے انتخابات میں حکمران طبقہ کے اثرات نے جو پارٹ انجام دیا ہے وہ کوئی راز نہیں ہے۔ بہر حال جمہوری اصولوں کو پامال کر کے جیسی بھی دستوریہ بن سکی بن گئی اور وہ بہت جلد اپنا کام شروع کرنے والی ہے!

پاکستان کی موجودہ دستور ساز اسمبلی میں جمہوریت کی جتنی رمق بھی پائی جاتی ہے اُس کا کریڈٹ پاکستان کی اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں کو ملتا ہے۔ ورنہ ارباب اقتدار جو کچھ چاہتے تھے۔ اُس کی گواہی اُن کے سابق اعلانات دے رہے ہیں! جمہوریت کی یہ چاہے کتنی ہی نیچی سطح کیوں نہ ہو پاکستان کا عدالیۂ "عزت مآبوں" کو وہاں تک کشاں کشاں لے کر آیا ہے۔ ع

میں خود آیا نہیں، لایا گیا ہوں!

پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں کچھ ارکان کوئی شک نہیں، اپنا آزاد موقف رکھتے ہیں اور اگر صوبائی سیاست کے اثرات سے وہ بچے رہے تو اُن سے خیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مرکز اور صوبہ کے وزراء عظام کی بھی خاصی تعداد اسمبلی میں شامل ہے اور یہ وہ حضرات ہیں جو کسی قیمت پر اقتدار سے دست کش ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا بس چلے تو اپنی کرسیوں کو "وقف علی الاولاد" فرما دیں! پھر کچھ ارکان اُن کے حاشیہ نشین ہیں اور جاہ و منصب کی توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں! یہ تو

اسمبلی کی ہیئتِ ترکیبی ہے! اس کے بعد وزیرقانون کا یہ بیان سامنے رکھیئے کہ پاکستان کا دستور انگریزی طرز کا ہوگا اور وزیراعظم کا یہ اعلان بھی قابلِ غور ہے کہ دو مہینے کے اندر اندر اسمبلی اپنا کام پورا کرلے گی ـــــ ان سب باتوں کو ذہن میں رکھ کر گورنر جنرل بہادر کے غیر محدود بلکہ شاہانہ اختیارات پر نظر ڈالیے کہ دستورساز اسمبلی کے پاس کئے ہوئے دستور کو جب تک وہ منظور نہ فرمادیں اس کی حیثیت ایک معمولی "مسودہ" (Draft) سے زیادہ نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گورنر جنرل جس نوبت پر چاہیں اسمبلی کو توڑ سکتے ہیں ـــــ جس اسمبلی کی یہ ہیئت ترکیبی اور یہ آئینی پوزیشن ہو تو اس سے ہزار حسنِ ظن اور لاکھ خوش گمانیاں رکھنے کے باوجود اُن اندیشوں کو کیا کریں جن کو ملک کے گزشتہ انقلابات نے جنم دیا ہے!

فٹ پاتھ پر تکیہ کی جگہ سر کے نیچے اینٹیں رکھ کر رات بسر کرنے والے غریب عوام بھی اس کو جانتے ہیں کہ پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بالشت بالشت بھر کی حکومتوں کا دنیا میں وقار اور ساکھ ہے مگر ہماری ساکھ نہیں ہے۔ اس کا اندازہ پاکستانی سکہ کی قیمت سے کیا جاسکتا ہے۔ کابل ہمارے جھنڈے کی توہین کردیتا ہے اور ہم اُس پر کوئی دباؤ ڈال نہیں سکتے ـــــ پاک و ہند کی سرحدوں پر ہندوستان کی طرف سے زیادتی ہوتی ہے مگر ہم اس کی تلافی کے لئے ہندوستانی حکومت کو آمادہ نہیں کرسکتے۔ کشمیر کا مسئلہ ایک داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔ کوئی جھوٹی تسلیاں دے کر اپنے دل کو چاہے تو خوش کرلے مگر مسئلہ کشمیر میں پاکستان جس پوزیشن میں آگیا ہے اُسے سب جانتے ہیں۔ امریکہ ہمارا حلیف ہونے کے باوجود جنگی امداد کے سلسلہ میں چلے جا رہا ہے۔ ملک کی اقتصادی اور تجارتی حالت الگ ابتر ہے۔ ان خرابیوں کی ذمہ دار ارباب اقتدار کے شخصی مفادات کی جنگ ہے۔ یہ جنگ خدانخواستہ نہ رُکی تو پھر پاکستان کی سالمیت کا خدا حافظ ہے!

پچھلے زخم کتنے ہی کاری سہی مگر اُن پر اب بھی مرہم رکھے جاسکتے ہیں۔ گزشتہ لغزشیں کتنی ہی مضرت رساں سہی لیکن اُن کی تلافی کا موقع ہاتھ آگیا ہے۔ اور وہ یہ کہ دستورساز اسمبلی کے ارکان عوام کے مطالبہ کی قدر و قیمت اور اہمیت محسوس کریں اور ایسا دستور بنائیں جو عوام کے لئے قابلِ قبول اور اُن کی تمناؤں کے عین مطابق ہو۔ گورنر جنرل بہادر کو بیشک فیڈرل کورٹ نے ملکہ معظمہ کا "نمائندہ" تسلیم کرلیا ہے۔ مگر جمہوریت کی بحالی، عوام کے مطالبات کی تکمیل اور پاکستان کو واقعی تباہی سے بچانے کے لئے انھیں اولوالعزمی اور ایثار سے کام لینا ہوگا۔ انھیں بھول جانا پڑے گا کہ وہ ملکہ معظمہ کے "نمائندے" ہیں بھی یا نہیں ہیں۔ اور یہ تصور ہر وقت سامنے رکھنا ہوگا کہ وہ ملک و ملت کے خدمت گزار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس ذمہ داری کا انھیں جواب دینا ہے!

پاکستانی عوام کا مطالبہ کیا ہے؟ یہ بات بنارس کے کسی پجاری اور متھرا بندرابن کے پنڈت کو بھی معلوم ہے۔ پاکستانی عوام کتاب و سنت کی بنیاد پر اسلامی دستور چاہتے ہیں! اللہ اور رسولؐ نے جن باتوں کو "منکر" کہا ہے اُن پر احتساب اور جن کو "معروف" فرمایا ہے اُن کا قیام۔ اخلاقی قدروں کی حفاظت ہی نہیں اشاعت بھی۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں اسلامی مساوات کی شمعیں جگمگاتی ہوں امن و سلامتی کا ماحول، خوشحالی اور اطمینان کی فضا!

پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلام کیلئے ہی بنا ہے۔ اگر یہاں اسلام کے مقابلہ میں کسی دوسرے نظریہ کو لانے کی کوشش کی گئی تو یہ پاکستان کے مقصدِ وجود کیساتھ سب سے بڑی دشمنی ہوگی۔ کچھ لوگوں کو اگر اسلامی نظام کے نام سے وحشت ہوتی ہے اور وہ امریکہ یا انگلستان کی معاشرت اور دستور و قانون کو پسند کرتے ہیں تو اُن کی پسند اور چاہت پر کروڑوں انسانوں کی پسند، تمناؤں اور نظریوں کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ طاقت کے زور سے کسی قوم کے نظریوں کو نہیں بدلا جاسکتا۔ اور اگر ایسا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ایسی کوشش ایک مستقل کشمکش کی بنیاد ڈال دے گی اور یہ کشمکش اس سے پہلے ختم ہونے والی نہیں ہے کہ یا تو وہ قوم اپنے دینی معتقدات

اور نظریوں سے دست بردار ہو کر ارتداد قبول کرے، یا پھر اس قوم کے پسندیدہ نظریوں کو نظر انداز کرنے والے اپنے موقف سے ہٹ کر عوامی مطالبات کو مان لیں!

آخر پاکستان اس طرح کی کشمکش میں مبتلا ہی کا ہے کو رہے؟ ارباب اقتدار اور عوام کے درمیان پستی و بلندی، پسند و ناپسند، گریز و فرار اور خوشی و ناخوشی کی یہ دیواریں کیوں حائل ہوں؟ پاکستان کی بھلائی تو اس میں ہے کہ چھوٹے بڑے سب مل جل کر رہیں۔ ایک دوسرے پر اعتماد کریں۔ زیادہ سے زیادہ توافق و ہم آہنگی اور کم سے کم احتجاج۔ یہ وہ چیز ہے جس سے پاکستان مضبوط ہوگا اور جس کے سایہ میں تعمیر و ترقی کی راہیں کھلیں گی۔ ایسا ملک تعمیر و ترقی کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکتا، جس کے ارباب اقتدار ملک و ملت کو اپنی پسند کی ہوئی راہ پر لے جانا چاہیں اور قوم کی منزلِ مقصود اس سے مختلف ہو!

اگر "اسلامی نظام" سے وحشت اس لئے ہے کہ اس کی ضرب "بڑے لوگوں" کے غیر محدود اختیارات پر آ کر پڑے گی اور اسلامی نظام کے سایہ میں منصب و اختیار کی کرسیوں پر بیٹھ کر بے قید زندگی گزارنے کی آزادی نہیں مل سکتی۔ تو یہ اندیشہ بالکل صحیح ہے۔ ہر نظامِ حکومت اپنے چلانے والوں کی زندگیوں پر کچھ نہ کچھ پابندیاں عاید کرتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اس کے ارباب حل و عقد اس کے مقرر کردہ معیار اور صلاحیتوں کے مالک ہوں۔ اسلام کا معیار "تقویٰ" ہے اور یہ قرآن کی وہ جامع اصطلاح ہے جس میں سیرت و کردار کی تمام خوبیاں سمٹ کر آ گئی ہیں! پاکستان میں وہی "اولوالامر" بن سکتا ہے جو اسلام کے معیارِ اخلاق پر بڑی حد تک پورا اترتا ہو اور قرآن اسی معیار کے حاکموں کی "اطاعت" کا حکم دیتا ہے۔ مگر جو لوگ کرزن، ریڈنگ، اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن بن کر قوم سے قرآنی اطاعت کی توقع رکھیں تو وہ بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں!

دستور ساز اسمبلی کے ارکان کو یہ حقیقت ذہن میں رکھ کر کام شروع کرنا چاہیئے کہ وہ اس ملک کے لئے دستور بنا رہے ہیں۔ جس کی اکثریت خدا اور رسول، کتاب و سنت اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے۔ جس قوم کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام "مذہب" نہیں ہے دین کامل ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ جس کے حدودِ عمل سے باہر نہیں ہے! پاکستان کے عوام اس نبی آخر کی امت ہیں جس نے دین و دنیا کو فطری توازن کیساتھ یکجا کیا اور اپنے بعد ایک ایسی اسٹیٹ چھوڑی جہاں اللہ کے سوا اور کسی کا حکم نہیں چلتا تھا ——— (علیہ الصلوٰۃ والتحیات)

پاکستان بھی اسی مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے۔ یہاں اللہ اور رسول کے سوا اور کسی کا حکم نہیں چل سکتا۔ پس جو کوئی اللہ اور رسول کے احکام کو نظر انداز کر کے کوئی اور دستور اور ضابطہ پیش کرے گا اسے رد کر دیا جائے گا۔ وہ قوم کتنی مبارک اور سعید ہے جو خود اچھا بننا چاہتی ہو اور ایک صالح نظامِ حیات کا قیام جس کی سب سے بڑی خواہش ہو۔ حکومتوں کو عوام کے بے جا مطالبے بھی ماننے پڑتے ہیں اور جس قوم کے عوام کا مطالبہ سراسر عدل و پاکیزگی پر مبنی ہو اسے ٹھکرانا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے!

دستور یہ کے غیر مسلم ارکان سے ہمیں یہ کہنا ہے کہ اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے۔ اس کا نظام سراسر رحمت ہی رحمت ہے۔ اسلامی نظام غیر مسلموں کے جان و مال، حقوق اور عزت و آبرو کی قابلِ اعتماد ضمانت دیتا ہے۔ اس نظام میں وہ ایک باعزت شہری بن کر زندگی بسر کر سکیں گے۔ اور یہ کوئی خیالی بات یا شاعرانہ مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ اسلام کی تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ذمیوں کے ساتھ بہترین سلوک کیا گیا ہے۔ پس غیر مسلموں کی دانش مندی اور شرافت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ نظامِ اسلامی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں اور ان منافقوں کے کہنے پر کان نہ دھریں جو اسلامی حکومت سے غلط باتیں منسوب کر کے لوگوں کو وحشت دلاتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کی نام نہاد سیکولر اسٹیٹ میں مسلمان جس ذلت و ابتری کے

دور سے گزر رہے ہیں۔ اگر پاکستان کے ہندو بھی ایسی ہی لادینی حکومت چاہتے ہیں۔ تو وہ خود اپنے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ اور اُن کی عصبیت اُنھیں خطرناک راستہ پر لے جا رہی ہے!

پاکستان کے اربابِ اقتدار اور ارکانِ دستور یہ سے ہم انتہائی خیر خواہی، دردمندی اور پورے احترام کے ساتھ یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ ٹھنڈے دل سے یہ سوچیں اور سوچ کر فیصلہ کریں کہ پاکستان کے عوام کیا چاہتے ہیں؟ یقین ہے کہ یہ غور و فکر انھیں اس نتیجہ تک لے جائے گا کہ پاکستانی عوام کا مطالبہ نظامِ اسلامی کے قیام کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جب عوامی دستور بن رہا ہے تو عوام کے مطالبہ اور نظریوں سے بے پروائی کیسے برتی جاسکتی ہے؟ اگر عوام کے مطالبہ سے بے پروا ہو کر کوئی دستور بنایا جائے گا تو لامحالہ عوام اور حکومت کے درمیان کشمکش ہو گی۔ اور غریب پاکستان میں اب مزید کشمکش اور نزاع و تصادم کے چرکے سہنے کی طاقت نہیں رہی۔ آٹھ سال سے پاکستان نزاع و کشمکش ہی کے خارزار سے گزر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا دامن تار تار اور دست و پا لہو لہان ہو چکے ہیں۔ دستور ساز اسمبلی چاہے تو پاکستان کو کشمکش سے بچا سکتی ہے۔

آؤ ہم سب شانہ بشانہ مل جل کر اسلام کے سایہ میں پاکستان کو ایک ایسی مثالی حکومت بنا دیں جو امن و سلامتی کا گہوارہ ہو۔ جہاں کسی کے انفرادی اور اجتماعی حقوق پر کوئی دست درازی نہ کرنے پائے۔ جہاں نیکی کا چلن ہو اور بُرائی کے پنپنے کے لئے فضا ذرا سی بھی سازگار نہ ہو۔ جہاں فیکٹریوں کی چمنیوں سے لے کر ایوانِ حکومت کے روشندانوں تک اخلاق و پاکیزگی کا دور دورہ ہو۔ جہاں رشوت ستانی، ناجائز استحصال، اقربا نوازی، صوبائی تعصب اور مفاد پرستی کے لئے کوئی گنجائش نہ ہو۔ جہاں حکومت بے روزگاروں کو روزگار، ننگوں بھوکوں کو روٹی اور کپڑا۔ اپاہجوں اور ناکاروں کے لئے آذوقہ مہیا کرے۔ جہاں کے حکام اور اربابِ کار اپنے کو عوام کا آقا اور خداوند نہیں بلکہ اُن کا خدمت گزار اور مخلص و دردمند بھائی سمجھیں۔ جہاں کی سوسائٹی میں عیاشوں، بدکاروں اور ہوس پرستوں کو عزت کا کوئی مقام نہ مل سکے۔ جہاں کی خواتین شرم و غیرت کی پُتلیاں اور جہاں کے نوجوان محسنِ اخلاق اور پاکیزگی کردار کے چلتے پھرتے مجسمے ہوں! جہاں ترقیوں کے چشمے اُبلتے ہوں اور اصلاح و تعمیر کے باغ لہلہاتے ہوں۔ پاکستان کسی کی امداد کا محتاج نہ ہے۔ اُس کے قشون قاہرہ اور مجاہدوں کی جرأت و عزیمت کی دھاک دُنیا کے اطراف و اکناف میں محسوس کی جائے!

پاکستان کو یہی بننا ہے اور یہی بن کر رہے گا، چاہے پاکستان کی تعمیر و ترقی سے کس کے شخصی مفادات ٹکرا کر بالکل پارہ پارہ ہی کیوں نہ ہو جائیں! جو لوگ پاکستان کے مخلص و غم خوار اور اسلام کے وفادار ہیں اُن کی یہی تمنائیں اور یہی عزائم ہیں۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اخلاص و بے غرضی کے مقابلہ میں مفاد پرستی کو شکست کھانی پڑے گی اور پاکستان میں ضبط و آئین اور شرافت و اخلاق ہی کا دور دورہ ہو گا۔ (انشاء اللہ العزیز)

ماہر القادری

۳۰ جون ۵۵ء

ادارۂ "فاران"

"طلوعِ اسلام" کی بددیانتی

"طلوعِ اسلام" پاکستان بننے سے پہلے بھی نکلتا تھا اور اس وقت بھی اُس کا مسلک "انکارِ حدیث" تھا مگر "طلوعِ اسلام" کے گزشتہ فائل اس کے گواہ ہیں کہ تقسیم ہند سے قبل اُس کے لہجہ میں شرافت کی جھلک پائی جاتی تھی اور مسلم سوسائٹی کے احتساب اور حکومت کی قانونی گرفت کا خوف لاحق تھا مگر پاکستان بننے کے بعد جب سے "طلوعِ اسلام" کا دفتر دلی سے کراچی منتقل ہوا ہے "انکارِ حدیث" کی یہ "لے" "منصبِ رسالت" پر طنز و تخفیف بلکہ تضحیک کی حد تک آ پہنچی ہے۔ اور پاکستان میں بھی "طلوعِ اسلام" کے حوصلے اور اس کی دریدہ دہنی اُس وقت سے بڑھنی شروع ہوئی ہے جب سے پاکستان میں "آرڈی ننس" کے ذریعہ حکومت کا آغاز ہوا ہے۔ یہ گزشتہ دور "طلوعِ اسلام" کو بہت راس آئے ہیں۔ انہی دنوں میں وہ "ماہنامہ" سے "ہفتہ وار" ہوا ہے۔ اور اس کا لہجہ اور اسلوبِ نگارش اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ کہیں سے اسے شہ مل رہی ہے۔ جبھی تو وہ پاکستان میں بدترین قسم کی ڈکٹیٹرشپ کا داعی بنا ہوا ہے۔

"طلوعِ اسلام" کی جرأت اور دریدہ دہنی کا یہ عالم ہے کہ پاکستان کے دستور سے وہ "سنت" کا لفظ نکلوانے کے لئے جدوجہد کر رہا ہے، عوام مسلمانوں کے دلوں میں "طلوعِ اسلام" کی تحریروں نے زخم ڈال دیئے ہیں مگر حکومتِ پاکستان کی نگاہِ احتساب اغماض برت رہی ہے بلکہ اس فتنہ کو ڈھیل دے رہی ہے۔

انگریز کے زمانہ میں گاؤں کے زمینداروں کی ہر جائز و ناجائز حرکت کی مدح سرائی کرنے کے لئے کچھ "جی حضوری" زمینداروں کے حاشیہ نشین اور مصاحب بن جایا کرتے تھے۔ تو "طلوعِ اسلام" بھی خوشامد، تملق، زمانہ سازی اور جاہ پرستی کی اسی سطح تک آ چکا ہے۔ وہ چڑھتے سورج کا پجاری، طاقت کا مراثی اور اقتدار کا نیاز مند ہو گیا ہے۔ اور پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ اس گراوٹ اور اوچھے پن پر کیا طنطنہ، کیا دعوے اور کیسی کیسی بلند بانگ تعلیاں ہیں؟

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں اسلامی نظام لانے کے لئے سب سے زیادہ منظم جدوجہد "جماعت اسلامی" کر رہی ہے اس جماعت کی تمام کوششیں اللہ کے دین کو عملاً برپا اور قائم کرنے کے لئے وقف ہیں۔ جماعت اسلامی نے اس مقدس مقصد کیلئے قربانیاں دی ہیں اور سخت سے سخت آزمائش میں بھی اُس کے پائے استقامت نے ذرا سی جنبش بھی نہیں کی۔ "طلوعِ اسلام" کو سب سے زیادہ کد، عداوت اور بیزاری اسی جماعت سے ہے۔ جماعتِ اسلامی کی مخالفت کر کے سرکار دربار میں تقرب کے جو مواقع مل سکتے ہیں "طلوعِ اسلام" اُن سے بروقت فائدہ اٹھا رہا ہے۔

ادارۂ "طلوعِ اسلام" کی اس تمام تگ و تاز اور دوڑ دھوپ کے تین عنوان ہیں:-

(۱) سنتِ رسُول کی تردید و تکذیب۔ (۲) جماعتِ اسلامی کی مخالفت اور (۳) اربابِ اقتدار کی مدح سرائی۔

وہ بیک وقت یہ تینوں فریضے انجام دے رہا ہے۔ یہ ادارہ چاہتا ہے کہ "جماعتِ اسلامی" کے ساتھ تحریر و تقریر میں

"طلوعِ اسلام" کا بھی نام لیا جائے، چند مہینے پہلے اخباروں میں بعض مضامین نظر آئے تھے۔ جن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مسٹر پرویز کے علمی افکار کا مقابلہ کیا گیا تھا۔ اسکیم یہ ہے کہ مولانا مودودی کے مقابلہ میں پرویز صاحب کا نام بار بار لانے سے ان حضرت (؟) کو شہرت مل جائے گی۔ اور پڑھنے والے یہ سمجھیں گے کہ مولانا مودودی جیسے عظیم مفکر کے مقابلہ میں جس شخص کو پیش کیا جا رہا ہے وہ ان کی ٹکر کا نہ ہو گا تو "کچھ نہ کچھ" تو ضرور ہو گا ــــ تو جماعتِ اسلامی کے شاہین کے مقابلہ میں ادارہ "طلوعِ اسلام" اپنے "کرگس" کی نمود چاہتا ہے اور یہ وہ مغربی ذہنیت ہے کہ اگر شہرت چاہتے ہو تو کسی مسلّمہ اصول کی مخالفت کرو یا کسی مشہور ترین شخصیت کے مقابلہ میں آ جاؤ۔ پس اس طرح شہرت مل کر رہے گی۔

"طلوعِ اسلام" کی علمی بد دیانتی کو بے نقاب دیکھنا ہو تو ۲۔ اپریل ۱۹۵۵ء کا "طلوعِ اسلام" پڑھیے۔ جس میں صفحہ ۱۱ پر ایک عنوان آپ کی نظر سے گزرے گا۔ جس کا عنوان ہے:۔

"قرآن اور حدیث کی صحیح پوزیشن"

(سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

"طلوعِ اسلام" والوں نے لوگوں کو دھوکے میں ڈالنے اور چکمہ دینے کے لئے بڑی چالبازی سے کام لیا ہے وہ یہ کہ مولانا مودودی کی مختلف کتابوں سے کچھ ٹکڑے نکال کر ایک جگہ جمع کر دیئے ہیں اور اس طرح ایک مسلسل مضمون تیار کر دیا ہے! علم و ادب میں اس بد دیانتی کی مثالیں کم ہی ملیں گی اور شاید نہ بھی ملیں!

مولانا مودودی کے نام سے "طلوعِ اسلام" والوں نے جو ایک مسلسل مضمون ترتیب دیا ہے۔ اُس میں کوئی ٹکڑا "تفہیمات حصہ اوّل" کا ہے، کوئی "تفہیم القرآن" کا ہے۔ کسی اقتباس کو "تنقیحات" سے لیا گیا ہے۔ کوئی "رسائل و مسائل" سے اخذ فرمایا گیا ہے۔ کسی عبارت کو رسالہ ترجمان القرآن کے طویل مضمون سے کاٹ کر علیحدہ کیا گیا ہے۔ اور پھر چوری اور سینہ زوری کا یہ عالم ہے:۔

> "ہم جماعتِ اسلامی کو چیلنج دیتے ہیں کہ وہ مذکورہ صدر مضمون کے کسی مضمون کے متعلق یہ ثابت کریں کہ اگر اسے اصل تحریر کے اندر رکھ کر پڑھا جائے تو اس کا مطلب کچھ اور ہو گا اور اگر وہ کسی ایک ٹکڑے کے متعلق بھی یہ ثابت کر دیں تو "طلوعِ اسلام" اپنی غلطی کا کھلے بندوں اعتراف کرے گا اور اُن سے اور مودودی صاحب سے اپنے قصور کی معافی مانگے گا ...." (طلوعِ اسلام۔ ۳۰۔ اپریل ۱۹۵۵ء)

اور ہم اس چیلنج کے جواب میں تمام انصاف دوست اربابِ فکر سے گزارش کرتے ہیں کہ مولانا مودودی کے جن مضامین سے "طلوعِ اسلام" نے چند "ٹکڑے" نکال کر ایک مضمون مرتب کیا ہے۔ اُن اصل مضامین کو وہ پڑھیں اور پھر فیصلہ کریں۔ بلکہ اپنے دل و دماغ کا جائزہ لیں کہ انہوں نے کیا اثر قبول کیا!

مثلاً "طلوعِ اسلام" نے یہ ٹکڑا:۔

"قرآن و سنتِ رسولؐ کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں"

مولانا مودودی کی "تنقیحات" کے ایک مضمون سے نکالا ہے۔ جو اس کتاب کے پورے ۹ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے:۔

"ہمارے نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص"

اس مضمون کا آخری حصہ بلفظہٖ درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

"اندھی تقلید اور اس کے ساتھ اجتہاد کی یہ جھوٹی نمائش کب تک؟ ایک طوفان گزر گیا۔ اب دوسرا طوفان بہت قریب ہے۔ ہندوستان میں ایک دوسرے سیاسی انقلاب کی بناء پڑ رہی ہے۔ ممالکِ عالم میں ایک اور بڑے انقلاب کے سامان ہو رہے ہیں۔ جو بہت ممکن ہے کہ ہندوستان میں متوقع انقلاب کے بجائے ایک بالکل غیر متوقع اور ہزار درجہ زیادہ خطرناک انقلاب برپا کر دیں۔ یہ آنے والے انقلابات ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی نسبت اپنی نوعیت اور اپنی شدت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اس وقت مسلمانوں کی اعتقادی و ایمانی اور اخلاقی و عملی حالت جیسی کچھ ہے اس کو دیکھتے ہوئے ہم نہیں سمجھتے کہ وہ ان آنے والے طوفانوں کی ایک ٹکر بھی خیریت کے ساتھ سہ سکیں گے۔ ان کا پرانا جہاز دورِ جدید کے کسی ہولناک طوفان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شاید ایک ہی تھپیڑے میں اس کے تختے بکھر جائیں۔ اور اس کے بادبانوں کا تار تار الگ ہو جائے۔ رہا ان کا کرایہ کا جہاز تو وہ پرانے جہاز سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جو لوگ اس پر سوار ہیں ہمیں خوف ہے کہ طوفانی دور کا پہلا ہی تھپیڑا ان کو ملّتِ اسلامیہ سے جدا کر کے شاید ہمیشہ کے لئے ضلالت کے قعرِ عمیق میں لے جائیگا لاقدّر اللہ۔ پس اب یہی وقت ہے کہ مسلمان پرانے جہاز سے بھی نکلیں اور کرایہ کے جہاز سے بھی اتریں اور خود اپنا ایک نیا جہاز بنائیں۔ جس کے آلات اور کل پرزے جدید ترین ہوں۔ مشین موجودہ دور کے تیز سے تیز جہاز کے برابر ہو۔ مگر نقشہ ٹھیٹھ "اسلامی جہاز" کا ہو اور اس کے انجینیئر اور کپتان اور دیدبان سب وہ ہوں جو منزلِ کعبہ کی راہ و رسم سے واقف ہوں۔

استعارہ کی زبان چھوڑ کر ہم کچھ صاف صاف کہیں گے۔ سرسید احمد خاں (خدا اُن کو معاف کرے) کی قیادت میں علی گڑھ سے جو تعلیمی تحریک اٹھی تھی۔ اس کا وقتی مقصد یہ تھا کہ مسلمان اس نئے دور کی ضروریات کے لحاظ سے اپنی دُنیا درست کرنے کے قابل ہو جائیں۔ تعلیم جدید سے بہرہ مند ہو کر اپنی معاشی اور سیاسی حیثیت کو تباہی سے بچالیں۔ اور ملک کے جدید نظم و نسق سے استفادہ کرنے میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اُس وقت اس سے زیادہ کچھ کرنے کا شاید موقع نہ تھا۔ اگرچہ اس تحریک میں فوائد کے ساتھ نقصانات اور خطرات بھی تھے۔ مگر اس وقت اتنی مہلت نہ تھی کہ غور و تفکر کے بعد کوئی ایسی محکم تعلیمی پالیسی متعین کی جاتی جو نقصانات سے پاک اور فوائد سے لبریز ہوتی۔ نہ اس وقت ایسے اسباب موجود تھے کہ اس نوع کی تعلیمی پالیسی کے مطابق عمل در آمد کیا جاتا۔ لہذا وقتی ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر مسلمانوں کو اسی طرزِ تعلیم کی طرف ڈھکیل دیا گیا جو ملک میں رائج ہو چکا تھا۔ اور خطرات سے بچنے کے لئے کچھ تھوڑا سا عنصر اسلامی تعلیم و تربیت کا بھی رکھ دیا گیا۔ جس کو جدید تعلیم اور جدید تربیت کے ساتھ قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی!

یہ صرف ایک وقتی تدبیر تھی۔ جو ایک آفتِ ناگہانی کا مقابلہ کرنے کے لئے فوری طور پر اختیار کر لی گئی تھی۔ اب وہ وقت گزر چکا ہے جس میں فوری تدبیر کی ضرورت تھی۔ وہ فائدہ بھی حاصل ہو چکا ہے جو اس تدبیر سے حاصل کرنا مقصود تھا۔ اور وہ خطرات بھی واقعہ کی صورت میں نمایاں ہو چکے ہیں جو اُس وقت صرف موہوم تھے۔

اس تحریک نے ایک حد تک ہماری دُنیا تو ضرور بنا دی۔ مگر جتنی دُنیا بنائی اُس سے زیادہ ہمارے دین کو بگاڑ دیا۔ اس نے ہم میں "کالے فرنگی" پیدا کئے۔ اس نے ہم میں "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" پیدا کیے اور وہ بھی ایسے جن کی نفسیات میں "محمڈن" اور "انڈین" کا تناسب بس برائے نام ہی ہے۔ اس نے ہماری قوم کے طبقۂ علیا اور طبقۂ متوسطہ کو جو در اصل قوم کے اعضائے رئیسہ ہیں۔ باطنی و ظاہری دونوں حیثیتوں سے یورپ کی مادّی تہذیب کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ صرف اتنے معاوضہ پر کہ چند عہدے، چند خطابات، چند کرسیاں ایسے لوگوں کو مل جائیں جن کے نام مسلمانوں سے ملتے جُلتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا دائماً ہماری یہی تعلیمی پالیسی رہنی چاہیے؟

اگر یہی ہماری دائمی پالیسی ہے تو اس کے لئے علی گڑھ کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ہندوستان کے ہر بڑے مقام پر ایک علی گڑھ موجود ہے۔ جہاں سے دھڑا دھڑ "اینگلو محمڈن" اور "اینگلو انڈین" نکل رہے ہیں پھر یہ پکی بھری فصل کاٹنے کے لئے ہم کو اپنا ایک مستقل مزرعہ رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر درحقیقت اس حالت کو بدلنا مقصود ہے تو ذرا ایک حکیم کی نظر سے دیکھئے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور اُن کو دور کرنے کی صحیح صورت کیا ہے۔

جدید تعلیم و تہذیب کے مزاج اور اس کی طبیعت پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت کے بالکل منافی ہے۔ اگر ہم اس کو بجنسہٖ لے کر اپنی نوخیز نسلوں میں پھیلائیں گے تو ان کو ہمیشہ کیلئے ہاتھ سے کھو دیں گے۔ آپ ان کو وہ فلسفہ پڑھاتے ہیں جو کائنات کے مسئلہ کو خدا کے بغیر حل کرنا چاہتا ہے۔ آپ ان کو وہ سائنس پڑھاتے ہیں جو معقولات سے منحرف اور محسوسات کا غلام ہے۔ آپ ان کو تاریخ، سیاسیات، معاشیات، قانون اور تمام علوم عمرانیہ کی وہ تعلیم دیتے ہیں جو اپنے اصول سے لے کر فروع تک اور نظریات سے لے کر عملیات تک اسلام کے نظریات اور اصول عمران سے یکسر مختلف ہے۔ آپ ان کی تربیت تمام تر ایسی تہذیب کے زیر اثر کرتے ہیں۔ جو اپنی روح اور اپنے مقاصد اور اپنے مناہج کے اعتبار سے کلیتہً اسلامی تہذیب کی ضد واقع ہوئی ہے۔

اس کے بعد کس بنا پر آپ یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کی نظر اسلامی نظر ہو گی؟ ان کی سیرت اسلامی سیرت ہو گی؟ ان کی زندگی اسلامی زندگی ہو گی؟ قدیم طرز پر قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم اس نئی تعلیم کے ساتھ بے جوڑ ہے۔ اس قسم کے عمل تعلیم سے کوئی خوشگوار پھل حاصل نہ ہو گا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے فرنگی اسٹیمر میں پرانے بادبان محض نمائش کے لئے لگا دیئے جائیں۔ مگر ان بادبانوں سے فرنگی اسٹیمر قیامت تک اسلامی اسٹیمر نہ بنے گا۔

اگر فی الواقع علی گڑھ یونیورسٹی کو مسلم یونیورسٹی بنانا ہے۔ تو سب سے پہلے مغربی علوم و فنون کی تعلیم پر نظر ثانی کیجئے۔ ان علوم کو جوں کا توں لینا ہی درست نہیں ہے۔ طالب علموں کی لوح سادہ پر ان کا نقش اس طرح مرتسم ہوتا ہے کہ وہ ہر مغربی چیز پر ایمان لاتے چلے جاتے ہیں۔ تنقید کی صلاحیت اُن میں پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اور اگر پیدا ہوتی بھی ہے تو فی ہزار ایک طالب علم میں۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد سالہا سال کے گہرے مطالعہ سے جبکہ وہ زندگی کے آخری مرحلوں میں پہنچ جاتا ہے۔ اور کسی عمل کام کے قابل نہیں رہتا۔ اس طرز تعلیم کو بدلنا

چاہیئے، تمام مغربی علوم کو طلبا کے سامنے تنقید کے ساتھ پیش کیجئے۔ اور یہ تنقید خالص اسلامی نظر سے ہو تاکہ ہر ہر قدم پر ان کے ناقص اجزاء کو چھوڑتے جائیں اور صرف کارآمد حصوں کو لیتے جائیں۔

اس کے ساتھ علوم اسلامیہ کو بھی قدیم کتابوں سے جوں کا توں نہ لیجئے، بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کرکے اسلام کے دائمی اصول اور حقیقی اعتقادات اور غیر متبدل قوانین لیجئے۔ ان کی اصل اسپرٹ دلوں میں اتاریئے اور ان کا صحیح تدبر دماغوں میں پیدا کیجئے۔ اس غرض کے لئے آپ کو بنا بنایا نصاب کہیں نہ ملے گا۔ ہر چیز از سر نو بنانی ہوگی۔ قرآن اور سنت رسول کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر وحدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔ ان کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہئیں جو قرآن وسنت کے مغز کو پا چکے ہوں۔ اسلامی قانون کی تعلیم بھی ضروری ہے۔ مگر یہاں کی پرانی کتابیں کام نہ دیں گی۔ آپ کو معاشیات کی تعلیم میں اسلامی نظم معیشت کے اصول، قانون کی تعلیم میں اسلامی قانون کے مبادی، فلسفہ کی کتابوں میں حکمت اسلامیہ کے نظریات، تاریخ کی تعلیم میں اسلامی فلسفہ تاریخ کے حقائق اور اسی طرح ہر علم وفن کی تعلیم میں اسلامی عنصر کو ایک غالب اور حکمران عنصر کی حیثیت سے داخل کرنا ہوگا۔

آپ کے تعلیمی اسٹاف میں جو ملاحدہ اور متفرنجین بھر گئے ہیں ان کو رخصت کیجئے۔ خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایک جماعت ایسے لوگوں کی پیدا ہو چکی ہے جو علوم جدیدہ میں بصیرت رکھنے کے ساتھ دل ودماغ اور نظر وفکر کے اعتبار سے پورے مسلمان ہیں۔ ان بکھرے ہوئے جواہر کو جمع کیجئے تاکہ وہ جدید آلات سے اسلامی نقشہ پر ایک اسکیم بنائیں۔

آپ کہیں گے کہ انگریز ایسی تعمیر کی اجازت نہ دے گا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر آپ اس سے پوچھئے کہ تو پورے مسلمان اور پورے کمیونسٹ میں سے کس کو زیادہ پسند کرتا ہے؟ ان دونوں میں سے ایک کو بہرحال تجھے قبول کرنا ہوگا۔ مئی ۱۹۴۱ء کا "اینگلو محمڈن" مسلمان اب زیادہ مدت تک نہیں پایا جا سکتا۔ اب اگر تو مسلمانوں کی نئی نسلوں کو پورا کمیونسٹ دیکھنا چاہتا ہے۔ تو اپنی قدیم اسلام دشمنی پر جما رہ۔ نتیجہ خود تیرے سامنے آجائے گا۔ اگر یہ منظور نہیں تو نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ تمام ہندوستان میں کمیونزم کی بڑھتی ہوئی وبا کا مقابلہ صحیح النسب سانڈوں اور ریڈیو کے دیہاتی پروگرام سے نہیں کیا جا سکتا۔ اس وبا کو صرف ایک طاقت روک سکتی ہے اور وہ اسلام کی طاقت ہے۔" (تنقیحات)

اس اقتباس کو پڑھ کر آپ خود فیصلہ کیجئے کہ وہ "ٹکڑا" جو "طلوع اسلام" نے اس مضمون سے نکال کر مولانا کے مختلف مضامین سے کاٹ کر نکالے ہوئے دوسرے ٹکڑوں کے ساتھ ملا دیا ہے۔ کیا اس اصل مضمون کے ساتھ اس "ٹکڑے" کو ملا کر پڑھنے سے "حدیث" اہمیت اور اس کے دین میں حجت ہونے کے عقیدے پر کوئی ضرب لگتی ہے؟ اور اس مضمون کو پڑھ کر کیا اس بات کا ذرا سا بھی شبہ گزرتا ہے کہ اس مضمون کا لکھنے والا "احادیث" کے بارے میں "طلوع اسلام" کا مسلک رکھتا ہے؟

قرآن پاک میں کہیں کہیں ایسی آیتیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں انبیاء کرام کو تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ اور کسی کسی جگہ ان کی بھول چوک پر ٹوکا بھی گیا ہے۔ اب کوئی شخص "انبیاء کی لغزشیں" عنوان قرار دے کر ان تمام آیتوں کو مسلسل ایک مضمون کی شکل

ہیں ایک جگہ جمع کردے تو وہ لوگ جنہوں نے قرآن پاک کا پورے طور پر مطالعہ نہیں کیا - وہ ان منتشر آیات کو ایک جگہ مضمون کی صورت میں پڑھ کر انبیاء کرام کے بارے میں ممکن ہے کہ "سوءظن" میں مبتلا ہو جائیں - حالانکہ قرآن پاک میں انبیاء کرام کے مناقب بھی موجود ہیں - اُن کی اتباع کا لوگوں کو حکم بھی دیا گیا ہے - اور یہی وہ نفوس قدسیہ ہیں جن کے نقش قدم صراطِ مستقیم کے آثار و نشانات ہیں —— اس مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اُس فریب دہی کا، اس طلسم سازی اور چالبازی کا جو "طلوعِ اسلام" نے اختیار کی ہے کہ کسی کے مختلف مضامین سے چند ٹکڑے نکال کر ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر دینے سے صورتِ واقعہ ہی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور اصل حقیقت ہی اُلٹ جاتی ہے -

ایک اور مثال :-

ایک مضمون نگار "اخلاق" کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اخلاقی اقدار کے تحفظ اور انہیں زندگی میں برتنے کی تبلیغ کرتا رہتا ہے - اس مضمون نگار نے تنقیدی مقالے، تاریخی مضامین اور افسانے بھی لکھے ہیں - کوئی شخص مضمون نگار کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین سے چند ٹکڑے نکال کر ایک مسلسل مضمون مرتب کر دیتا ہے - اس طرح :-

" اخلاق کی شکست "

" ہوسناکی کے مقابلہ میں اخلاق کو ہار ماننی پڑی، اخلاق سے بھوکے کا پیٹ نہ بھر سکا - پاکیزگی اور نیکی کا ملمع انقلابات و حوادث کے دو چار رگڑوں ہی میں اُتر گیا - زندگی میں اخلاق کو کبھی تہ کر کے اور لپیٹ کر بھی رکھ دینا پڑتا ہے - معاشی حالات کے مقابلہ میں شرافت اور صالحیت نہ ٹھہر سکی - اس کے ایک ہی ریلے میں سیرت و کردار کے پشتے بہہ گئے - بھوکا روٹی چاہتا ہے اور تم اُسے اخلاق دے رہے ہو - یہ کیسا مذاق ہے ؟ اخلاق کی ڈکشنری کے تمام الفاظ ختم ہو گئے - جب سچائی سے زیادہ جھوٹ انسانیت کی خدمت انجام دے رہا ہو ......"

یہ جملے جب مضمون نگار کے اصل مضامین کے ساتھ پڑھے جائیں گے تو اُن سے وہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا اور سامع و قاری کے ذہن پر یہ جملے وہ اثر نہیں قائم کر سکتے جو اثر یہ جملے اصل مضامین سے کٹ جانے کے بعد ایک مسلسل مضمون کی صورت میں ترتیب و تشکیل پانے کی صورت میں قائم کریں گے - اب وہ شخص جس نے ان جملوں کو اصل مضامین سے کاٹ کر ایک مضمون مرتب کیا ہے، لوگوں سے کہے کہ دیکھا ! یہ مضمون نگار اور میں دونوں ایک ہی جیسے خیال رکھتے ہیں - "اخلاق کی افادیت اور اہمیت کا مضمون نگار بھی قایل نہیں ہے - وہ بھی اخلاق کو معاشیات کی پیداوار سمجھتا ہے اور اخلاقی قدروں کے بدلتے رہنے کا قایل ہے —— تو اس فریب ساز کے اس دعوے کی حقیقت معلوم !

"طلوعِ اسلام" نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ ٹھیک ایسی ہی چال چلی ہے اور اُن کے مضامین کے ساتھ اسی قسم کا "فراڈ" کیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ احادیث، اسانید، رجال اور درایت و روایت کے اصولوں پر تنقید کرنے کے باوجود مولانا مودودی سنتِ رسول کو دین میں حجت تسلیم کرتے ہیں - اُن کے سینکڑوں صفحات اس کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں - مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے کے بعد ہر کوئی اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ کتاب اللہ کے ساتھ سنتِ رسول بھی دین کا ایک ستون ہے اور سنتِ رسول سے بے نیاز ہو کر دین و شریعت کی گاڑی ایک قدم بھی نہیں چل سکتی !

مولانا مودودی ائمہ حدیث کو معصوم نہیں سمجھتے - اور وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ جو احادیث کتابوں میں پائی جاتی ہیں وہ

سب کی سب قرآن پاک کی طرح یقینی اور قطعی ہیں کہ اُن کی صحت کے بارے میں کوئی دلیل ہی طلب نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس کے باوجود وہ "سنتِ رسولؐ" کو دین میں حجت سمجھتے ہیں اور "اطاعتِ رسولؐ" کو منصوص جانتے ہیں۔ تمام ائمہ حدیث کا احادیث کے معاملہ میں یہی رویہ رہا ہے جو مولانا مودودی کا ہے!

خود محدثین کرام نے احادیث پر جرح و قدح کی ہے۔ راویوں کو طرح طرح سے پرکھا اور جانچا ہے۔ بعض احادیث کی کمزوریاں اور علتیں بتائی ہیں۔ اور یہ عرق ریزی اور جانفشانی انہوں نے اس لئے نہیں کہ احادیث کا اعتبار لوگوں کے دلوں سے اُٹھ جائے بلکہ اُن کی ان تمام کوششوں کی غرض و غایت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قول و فعل منسوب ہو۔ وہ زیادہ سے زیادہ محکم، صحیح، اقرب الی الصواب اور واقعہ کے مطابق ہو!

"طلوعِ اسلام" نے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے مختلف مضامین سے "ٹکڑے" نکال کر جو مضمون ترتیب دیا ہے وہ خطرناک قسم کی چالبازی اور نہایت عیارانہ "بددیانتی" ہے۔ "منصبِ رسالت" کے مسلسل انکار نے دراصل ان لوگوں کے ضمیر کو مردہ کر دیا ہے اور وہ اب بہت ہی اوچھے واروں پر اُتر آئے ہیں۔ مگر "منکرینِ حدیث" سے خیر و صواب کی توقع کب تھی؟ اخلاق و شرافت کو رُسوا کرنے کے لئے یہ گروہ جو بھی کر گزرے تھوڑا ہے!

آج یہ لوگ جو چاہے کرلیں، قرآن پاک کو "بازیچۂ اطفال" بنادیں۔ احادیثِ رسولؐ پر تہمتیں جوڑ دیں — اطاعتِ رسولؐ کا انکار کردیں۔ صالحینِ امت پر الزام لگادیں اور فساق و فجار کو "امیرالمومنین" بنادیں۔ مگر قیامت کے دن ان کو اپنا مقام معلوم ہو جائے گا۔ اُس دن یہ گروہ اپنے کرتوتوں پر واویلا کرتا ہوگا۔ مگر میزانِ عدالت اپنا فرض ادا کئے بغیر نہ رہے گی۔ گناہ معاف کئے جاسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ مگر منصبِ رسالت سے دشمنی معاف نہیں کی جاسکتی کہ یہ "گناہ" نہیں "کفر" ہے ؏

محمد عاصم

بھائی جان[1] مرحوم کے معمولات

بھائی جان اپنی کمزوری اور خرابیٔ صحت کے باوجود تقریباً ہر موسم میں علی الصباح اُٹھنے کے عادی تھے۔ صبح کی نماز بروقت ادا کرتے طبیعت خواہ کتنی خراب ہو یا رات بھر تکلیف رہی ہو نماز کا وقت ہو جانے کے بعد بستر پر لیٹے رہنے کے کبھی عادی نہ تھے۔ کبھی ایسا ہو جاتا کہ رات کو مرض کا سخت دورہ پڑا اور جسم بالکل نڈھال ہو گیا تو نماز بروقت ادا کر کے پھر لیٹ جاتے مگر نیند پھر بھی نہ آتی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ فجر اور سورج طلوع ہونے کے درمیان مجھے کبھی نیند نہیں آسکتی۔ خواہ رات بھر نہ سوؤں!

گرمی کے موسم میں اگر طبیعت بہت اچھی ہوتی تو وضو کرتے ورنہ تیمم ہی سے نماز پڑھتے۔ سردی کے موسم میں ان کا بیدار ہونا اور بستر چھوڑنا ایک دلچسپ پروگرام ہو جاتا جس پر بھائی جان کبھی کبھی خود بھی ہنسا کرتے تھے۔ گرمیوں میں جس قدر کپڑوں سے بے نیاز اور ہلکے پھلکے رہتے، سردی میں اسی قدر اوپر نیچے کئی کپڑے پہنے رہا کرتے تھے۔ فجر سے کچھ دیر پہلے بیدار ہوتے۔ گھڑی تکیے کے نیچے ہوتی اس لئے ہمیشہ اپنے ایک مقررہ وقت پر اُٹھتے۔ وہ جس کمرے میں سوتے اسی میں اُن کا ملازم لازمی طور پر ہوتا۔ کبھی ملازم نہ سوتا تو کوئی رفیق اس کی جگہ سوتا۔ وقت ہونے پر اسے آواز دیتے۔ ہاتھ دھونے کے بعد وہ سب سے پہلے بجلی کا اسٹوو جلا کر بھائی جان کے پاس ہی ایک میز پر رکھ دیتا۔ چند منٹ کے بعد جب کمرے کی فضا کچھ کچھ گرم ہو جاتی تو بھائی جان اپنے لحاف پر ڈالے ہوئے کمبل ایک ایک کر کے اتروا تے اور پھر اُٹھ کر اسٹوو تاپنے لگتے۔ پھر گرم پانی سے ہاتھ دھو کر ایک ایک کر کے اپنا اُونی پاجامہ، قمیص، سویٹر، رومال، جرابیں اور کبھی کبھی بڑا کوٹ بھی پہننا شروع کرتے۔ بنڈی جو رات کو پہن کر سوتے وہ بھی جسم پر رہتی۔ اس عرصہ میں ملازم ایک برتن جس میں رات ہی سے چائے بنا کر رکھ دی جاتی تھی۔ لا کر اسٹوو پر رکھ دیتا۔ جتنی دیر میں بھائی جان کپڑے پہن کر فارغ ہوتے، اتنی دیر میں چائے گرم ہو جاتی۔ اُسے پیالی میں ڈال کر اور اس میں شہد ملا کر پیتے۔ کپڑے پہن کر اور چائے پی کر بیت الخلا جاتے۔ واپسی تک ملازم ان کا بستر ٹھیک کر کے رکھ دیتا۔ آکر ایک دو منٹ تک پھر اسٹوو تاپتے۔ پھر تیمم کرتے۔ اگر طبیعت اچھی نہ ہوتی یا سردی بہت زیادہ ہوتی تو بستر ہی پر بیٹھ کر سامنے والی میز پر تکیہ رکھ کر نماز ادا کر لیتے۔ ورنہ عموماً فرش پر بچھی ہوئی ایک چٹائی پر نماز پڑھتے۔ نماز نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے۔ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا جو عام رواج ہے، بھائی جان اس طریقے سے بہت کم دعا مانگا کرتے۔ وہ زیادہ تر سجدہ میں یا سجدوں کے بعد سلام سے پہلے دعا مانگنے کے عادی اور قائل تھے۔ پھر بستر میں آکر بیٹھ جاتے۔ سردی خواہ کتنی ہی زیادہ ہو یا طبیعت خواہ کتنی ہی خراب ہو۔ لیکن اب دوبارہ بستر پر نہ لیٹتے اور نہ لحاف اوڑھتے۔ جیسا کہ عام طور پر کمزور اور سست لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔ ایک کمبل اور اگر کبھی سردی زیادہ ہوتی تو دو کمبل اوڑھ کر بستر میں بیٹھ جاتے۔ اس اثناء میں یا اس کے کچھ دیر بعد اُن کے دوسرے رفقا محلہ کی مسجد سے نماز

---

[1] مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم۔

پڑھ کر واپس آجاتے۔ بھائی جان اگرچہ خود مسجد جانے سے معذور تھے اور اُن کی یہ بھی خواہش ہوتی کہ وہ گھر پر دوسروں کے ساتھ مل کر باجماعت نماز پڑھیں۔ مگر اپنے رفقاء کو مسجد جاکر جماعت سے نماز ادا کرنے پر اُبھارتے۔

اس کے بعد دو ایسے پروگرام ہوتے، جن میں بھائی جان نے شاید ہی کبھی ناغہ کیا ہو۔ ایک قرآن کا سُننا اور دوسرے بادام کھانا۔ سفر ہو یا حضر ان دونوں پروگراموں میں کبھی فرق نہیں آیا۔

اُن کا کوئی رفیق اُن کے قریب بیٹھ کر قرآن کی تلاوت کرتا اور ملازم بادام پیسنے میں لگ جاتا۔ اگر ملازم نہ ہوتا تو ایک رفیق قرآن پڑھتا اور دوسرا بادام پیستا۔ اور اگر ایک ہی رفیق ہوتا تو وہی یہ دونوں کام یکے بعد دیگرے انجام دیتا۔ قرآن سُننے سے بھائی جان کو بے حد شغف تھا۔ اس سے اُن کے رفقاء کو بھی فائدہ پہنچتا۔ اگرچہ بھائی جان مروجہ طریقہ پر تجوید سے قرآن نہ جانتے تھے اور نہ اس کے زیادہ قائل تھے۔ لیکن الفاظ کے مخارج اور تلفظ سے پوری طرح واقف تھے۔ جو رفیق بھی ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کرتا، بھائی جان اس کے تلفظ اور مخارج کی تصحیح بھی کرتے جاتے۔

بادام خوب باریک کر کے اور شہد میں ملا کر کھاتے۔ اس میں آدھ گھنٹے سے کم وقت صرف نہ ہوتا تھا۔

اس کے بعد کچھ دیر تک ناشتے کے انتظار میں خاموش بیٹھے رہتے۔ غالباً یہی وہ وقت تھا۔ جس میں وہ جو کام کرنا ہوتے ان کے متعلق سوچا کرتے۔ خواہ سردی ہو یا گرمی یہ کام یکساں طور پر جاری رہتے۔

تھوڑی دیر میں ناشتہ آجاتا۔ سردی میں عموماً اپنے بستر کے سامنے رکھی ہوئی میز پر ہی ناشتہ کرتے اور گرمی میں فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ کر۔ سردی ہو یا گرمی ناشتہ عموماً ایک ہی رہتا۔ ناشتے میں صرف ایک نصف اُبلا ہوا انڈا اور ایک پیالی چائے ہوا کرتی۔ کبھی بھوک محسوس ہوتی تو ایک کی بجائے دو انڈے ہو جاتے یا انڈے کے ساتھ ایک رسک ہو جاتا۔ لیکن چائے کی پیالی ایک سے کبھی دو نہ ہوتی۔

بھائی جان کا عموماً ناشتہ یہی ہوتا۔ لیکن ان کا سب سے مرغوب اور پسندیدہ ناشتہ انڈے کے بجائے کھجور اور مکھن تھا۔ لیکن یہاں کی دیسی کھجور انھیں پسند نہ تھی۔ عراق اور مدینہ ہی کی کھجور کے وہ دلدادہ تھے۔ اگر کبھی یہ پتہ چلتا کہ شہر میں کسی جگہ عراق یا مدینہ کی کھجور مل رہی ہے یا مل سکتی ہے تو اس کی تلاش کرتے۔ کراچی جاتے تو وہاں سے کچھ نہ کچھ عراقی کھجور خرید کر ضرور ساتھ لاتے۔ ایک مرتبہ ہلالی صاحب سے پانچ سیر کھجوروں کا پارسل بھی بغداد سے منگوایا۔ جب کبھی بھائی جان کو یہ ناشتہ میسّر آجاتا تو اسے ہر چیز پر ترجیح دیتے۔ عراق اور نجد و حجاز کے سفر میں یہی بھائی جان کا ناشتہ رہا۔ تازہ مکھن تو کبھی میسّر نہ آیا۔ بازار سے مکھن کا ڈبہ ہی خرید کر استعمال کرتے۔

چائے کے بارے میں بھائی جان کا ذوق یہ تھا کہ چائے، دودھ اور شکر الگ الگ برتنوں میں ہوں۔ اور پیتے وقت انھیں اپنی مرضی کے مطابق ملایا جائے۔ خواہ انھیں کبھی اپنے سامنے چائے بنانا ہوتی اور ان کے ساتھ چائے پینے والا بھی کوئی نہ ہوتا۔ مگر وہ اسی طریقہ سے چائے بناتے اور پیتے۔ دودھ، چائے اور شکر کو ایک ساتھ ملا کر چائے دانی میں ڈالنے کو وہ انتہائی بدذوقی خیال فرماتے تھے۔ چائے نہ بہت تیز (strong) پیتے تھے اور نہ بالکل ہلکی (light)، چائے آتی۔ تو پیالی میں گرم پانی بھی ساتھ آتا۔ اس سے پیالی اور طشتری کو گرم کر کے اسے گرا دیتے اور پھر اس میں چائے ڈالتے۔ عموماً نصف پیالی دودھ لیتے۔ اور نصف پیالی چائے۔ دودھ نصف سے زائد تو ہو جاتا بلکہ بعض اوقات دو تہائی تک پہنچ جاتا۔ مگر چائے نصف سے زیادہ کبھی استعمال نہ کرتے۔ اسی پر ایک مرتبہ مولانا مودودی نے ان سے فرمایا کہ آپ چائے میں دودھ نہیں ڈالتے

بلکہ دودھ میں چائے ڈال لیتے ہیں۔ دراصل مرض کی وجہ سے زیادہ چائے بھائی جان کے لئے نقصان دہ تھی۔ کیونکہ اس سے طبیعت میں "یبس" (خشکی) پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا تھا۔ چائے میں شکر بہت کم استعمال کرتے۔ زیادہ شکر استعمال کرنے کو وہ بدذوقی پر محمول کرتے تھے۔

ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد چند منٹ تک اپنے کمرے میں یا مکان کی چھت پر ٹہلتے۔ پھر دس منٹ تک خود قرآن کی تلاوت کرتے۔ بھائی جان بلند آواز سے تلاوت کرنے کے قائل اور عادی تھے۔ اسی میں انھیں اصل لطف آتا تھا۔ زبان میں لکنت ہونے کی وجہ سے بھائی جان کی آواز میں کشش نہ پائی جاتی تھی۔ لیکن سننے والا انتہائی متاثر ہوتا اور یہ محسوس کرتا کہ پڑھنے والا سمجھ کر قرآن پڑھ رہا ہے۔ بعض آیات کو کئی کئی مرتبہ پلٹ کر پڑھا کرتے تھے۔

تلاوت سے فارغ ہونے کے بعد تقریباً نصف گھنٹہ تک مختلف تفسیروں کے ذریعہ قرآن کا مطالعہ کرتے، ابن کثیر، کشاف اور تفہیم القرآن پابندی سے اپنے پاس رکھتے۔ اور کبھی کبھی التفسیر القیم (ابن قیم کی تفسیر کے مختلف اجزاء) تفسیر فراہی اور تفسیر مولانا ابو الکلام آزاد بھی۔ جہاں کسی تفسیر میں کوئی غلطی سمجھتے یا اس میں کوئی خاص بات زیادہ پسند آتی تو اس پر سرخ پنسل سے نشان لگاتے اور بعض اوقات کوئی خاص معنی اپنے قرآن کے نسخہ میں بھی حاشیہ پر لکھ لیتے۔ بھائی جان قرآن کا مطالعہ نہایت پابندی اور غور سے کیا کرتے تھے اور عربی زبان کا بھی ان میں اعلیٰ ذوق پایا جاتا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ہمیشہ اپنے آپ کو قرآن کا مبتدی طالب علم سمجھتے رہے اور کبھی اشارتاً بھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ قرآن بھی ان کا موضوع ہے۔ جہاں کہیں کسی آیت کے معنی میں شک ہوتا اور مختلف تفاسیر سے بھی وہ شک دور نہ ہوتا تو خط و کتابت کے ذریعہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم، مولانا مودودی یا مولانا اصلاحی سے اس کا مطلب دریافت کرتے۔ اپنی عقل، ذہانت اور زبان دانی پر کبھی اعتماد نہ کرتے۔ حتیٰ کہ اگر کبھی کسی مضمون یا عبارت میں قرآن کی کسی آیت کا ترجمہ لکھنے کی ضرورت پڑ جاتی تو خود کبھی ترجمہ نہ کرتے بلکہ شاہ عبد القادرؒ یا مولانا مودودی کا ترجمہ نقل کر دیتے۔

اس اثناء میں ملازم ان کا دفتر صاف کر دیتا اور ان کی کتابوں کو جھاڑ دیتا۔ گرمی میں تو وہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر کام کرتے۔ اور سردی میں ایک چھوٹی میز دھوپ میں رکھوا کر۔

بھائی جان میز اور کرسی پر کام کرنے کے عادی تھے۔ بلکہ ان کی یہ عادت اس حد تک پختہ ہو چکی تھی کہ اگر کبھی سفر میں ہوتے اور لکھنے کا کوئی اہم کام خواہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے کرنا ہوتا۔ تو سب سے پہلے اپنے لئے میز اور کرسی منگواتے۔ تب اپنا کام شروع کرتے۔ جیل کے زمانے میں اپنی عادت کے خلاف فرش پر بیٹھ کر لکھنے کا کام کرنا چاہا مگر کامیاب نہ ہوئے۔ سوا چار ماہ جیل میں قرآن و حدیث اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے۔ مگر چند دن کے روزنامچے اور چند خطوط کے سوا کچھ نہ لکھ سکے!

موسم گرما ہو یا موسم سرما۔ بھائی جان صبح تین گھنٹے اپنے لکھنے کا کام کیا کرتے تھے۔ کم از کم دار العروبہ کے زمانے میں لکھنے کا جو کام بھی انھوں نے کیا وہ صرف ان ہی تین گھنٹوں کا کیا ہوا ہے۔ خواہ وہ کوئی کتاب ہو یا ترجمہ یا خط اور چاہے وہ عربی میں ہو یا اردو میں۔ ان تین گھنٹوں میں یہ تو ہو جاتا کہ کبھی طبیعت لکھنے کی طرف مائل نہ ہوتی تو کوئی عربی کتاب یا رسالہ پڑھنے لگ جاتے لیکن ان کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں لکھنے کا کام کبھی نہ کرتے۔

بھائی جان اپنے لکھنے کے کام میں لغت سے کبھی بے نیازی ظاہر نہ کرتے تھے۔ لکھنے بیٹھتے تو اپنے سامنے قاموس، اساس البلاغہ اور المصباح المنیر پابندی سے رکھتے۔ اگر کسی لفظ کے متعلق شک ہوتا تو اسے قاموس سے دیکھتے اور اگر کسی استعمال میں شک ہوتا تو اسے اساس البلاغہ سے دیکھتے۔ اردو کی لغت اگرچہ ان کے پاس کوئی نہ تھی لیکن اس کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے رہے۔

چونکہ لکھنا پڑھنا تمامتر عربی ہی میں رہتا تھا اور نہ اُردو کا اچھا ماحول ہی تھا۔ اس لئے اپنے حافظہ پر بھروسہ کبھی نہ کرتے تھے۔ مولانا مودودی، مولانا دریابادی اور ماہر القادری صاحب سے اکثر خط وکتابت جاری رکھتے اور جن اردو الفاظ یا ترکیبوں کے استعمال میں انھیں شک ہوتا۔ اُن کے متعلق ان حضرات سے دریافت کرتے۔

بھائی جان کا معمول تھا کہ جب کام شروع کرتے، ایک دن پہلے جو لکھا ہوتا، اس پر غور سے نظرِ ثانی کرتے۔ اس میں کمی زیادتی یا ردوبدل کے بعد آج کا کام شروع کرتے۔ کسی تحریر کو دوبارہ کبھی نہ لکھتے تھے۔ کوئی مضمون لکھنا ہوتا تو اس کا مواد اور خاکہ پہلے سے ذہن میں تیار رہتا اور جب صبح کے وقت لکھنے بیٹھتے تو مضمون بلا تکلف لکھ دیتے۔ آخر عمر میں تحریر میں کچھ کانٹ چھانٹ ہونے لگی تھی جس کے متعلق خود فرمایا کرتے تھے کہ یہ میری دماغی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ سورۂ "الضیاء" کے زمانہ میں میری کسی تحریر میں کانٹ چھانٹ نہ ہوتی تھی۔

گرمی کے موسم میں لکھتے یا پڑھتے وقت کبھی بجلی کا پنکھا استعمال نہ کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ پنکھے کا استعمال اُن کی طبیعت کے لئے مضر تھا۔ لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ ان کا خیال تھا کہ جس چیز کے بغیر کام چل سکتا ہو اس کا بار بلا وجہ جماعت کے بیت المال پر کیوں ڈالا جائے۔

لکھنے کے ان اڑھائی تین گھنٹوں کو بھائی جان انتہائی قیمتی خیال کرتے تھے۔ اگر کوئی صاحب ان میں اُن سے ملنے آجاتے تو انھیں سخت کوفت ہوتی۔ جب بھی کوئی صاحب ملنے کے لئے وقت چاہتے۔ تو انھیں ان تین گھنٹوں کے علاوہ اوقات میں کوئی وقت دیتے۔ لیکن بعض لوگ پھر بھی ان ہی گھنٹوں میں ملنے آجاتے۔ آخر کار جب بھائی جان تنگ آگئے تو اپنے دفتر کے سامنے ایک گتے پر یہ "درخواست" لکھ کر لگوادی کہ "کوئی صاحب ملنے کے لئے صبح کے وقت تشریف لانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں"۔

اس سے فارغ ہونے کے بعد نصف گھنٹہ تک تیل سے بدن کی مالش کراتے۔ یہ ان کے معالج کی انھیں ہدایت تھی جس پر وہ سختی سے کاربند تھے۔ اور گرمی کے دو تین مہینوں کے سوا سال بھر میں کبھی اس کا ناغہ نہ ہوتا تھا۔ سردی میں مطلع صاف ہوتا تو دھوپ میں بیٹھ کر اور اگر بدلی ہوتی تو کمرہ بند کر کے اور انگیٹھی سلگا کر مالش کراتے۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد پابندی سے شہد کا ایک ڈیڑھ چمچہ کھاتے۔ پھر اگر موسم ٹھنڈا نہ ہوتا تو گرم پانی سے نہاتے۔ ورنہ سردی کے دنوں میں خوب اچھی طرح ہاتھ منہ اور پاؤں دھوتے اور مسواک کرتے۔ نہانے اور ہاتھ منہ دھونے میں ہمیشہ سنلائٹ صابن استعمال کرتے۔ خوشبودار صابن استعمال کرنے کو نزاکت خیال کرتے تھے۔ مسواک ہمیشہ پیلو کے درخت کی کرتے۔ صرف جیل کے زمانے میں برش کا استعمال کیا۔ کیونکہ وہاں چاقو نہ ملنے کی وجہ سے مسواک کا بنانا مشکل تھا۔

اس کے بعد کھانا کھاتے، کھانا ہمیشہ فرش پر بیٹھ کر اور اپنے رفقاء سے مل کر کھاتے تھے۔

کھانا کھاتے وقت ننگے سر بیٹھنے کو مجلس کے آداب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس لئے نہ خود ننگے سر بیٹھتے تھے اور نہ اپنے کسی چھوٹے کو بیٹھنے دیتے تھے۔ بعض لوگوں کو عادت ہے کہ کھانا کھانے میں خوب چپک چپک کرتے ہیں۔ اس چیز سے بھائی جان کو انتہائی نفرت تھی۔ اور بعض اوقات وہ اپنے معزز مہمانوں تک کو اس پر ٹوک دیا کرتے تھے۔

مرض کی وجہ سے بھائی جان اپنے کھانے میں نہ سُرخ مرچ استعمال کرتے تھے اور نہ کوئی بادی سبزی یا کوئی اور چیز۔ کھانا انتہائی سادہ کھاتے۔ مگر اس کے لئے خالص آٹے، گھی اور مسالوں کے مہیا کرنے کا امکانی حد تک اہتمام کرتے تھے۔ بعض اوقات دوسرے شہروں سے کرایہ خرچ کر کے خالص آٹا اور گھی منگوا لیتے۔

کھانے میں بھائی جان کے نزدیک اپنی صحت سب سے مقدم تھی۔ مجھے کوئی ایسی چیز یاد نہیں جسے بھائی جان محض مزے کی وجہ سے بہت پسند کرتے ہوں۔ اور نہ کوئی ایسی چیز جو صرف اس وجہ سے بھائی جان کو ناپسند ہو کہ اس کا مزا اچھا نہیں۔ فرماتے کہ میں بھی دوسروں کی طرح مزیدار کھانوں کا عادی تھا مگر اب کھانے میں میرا معیار صرف یہ ہے کہ کونسی چیز میرے لئے مفید ہے کہ اسے کھایا جائے اور کونسی مضر ہے کہ اس سے بچا جائے۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب کے ساتھ دسترخوان سے اُٹھتے۔ اگر کھانے سے پہلے فارغ ہو جاتے تو دوسروں کا انتظار کرتے رہتے اور اگر کسی ضروری کام سے پہلے اُٹھنا چاہتے تو دوسروں سے اجازت لے کر۔

کھانے کے بعد ایک گھنٹہ تک چارپائی پر خاموش لیٹتے۔ یہ بھی انھیں ان کے معالج کی ہدایت تھی۔ بھائی جان اپنے معالج کی ہدایات پر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے۔ ان کی ہدایت کے بغیر نہ کوئی نئی چیز کھاتے اور نہ کوئی کام کرتے۔ حتی کہ بعض اوقات خود یہ سمجھتے کہ معالج کی فلاں ہدایت یا فلاں دوا صحیح نہیں ہے۔ لیکن جب تک معالج خود ہی اسے ترک کر دینے کا مشورہ نہ دے دیتے۔ خود اسے ترک نہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ دوپہر کے کھانے کے بعد لیٹنے میں بھائی جان سختی سے اپنے معالج کی ہدایت پر عمل کرتے تھے۔ صرف لیٹتے تھے سوتے نہ تھے۔ کیونکہ سونے سے نزلہ پیدا ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ صرف خاموش لیٹے رہنا اور نہ سونا، موسم سرما میں تو زیادہ مشکل نہ ہوتا لیکن موسم گرما میں بہت مشکل تھا۔ کیونکہ راتیں بہت چھوٹی اور دن بہت لمبے ہوتے تھے اور جن دنوں طبیعت خراب ہوتی ان دنوں رات بھر تکلیف سے گزرتی۔ لیکن اس تمام دقت اور تکلیف کے باوجود بھائی جان کبھی دوپہر کو نہ سوتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں چونکہ نیند آ جانے کا بہرحال اندیشہ رہتا۔ اس لئے اپنے کسی شاگرد کے پڑھنے کا یہی وقت مقرر کر دیتے۔ تاکہ اس کا سبق بھی ہو جائے اور خود کو نیند بھی نہ آئے۔

گھڑی دیکھ کر ایک گھنٹہ لیٹتے اور پھر پوری ہمت سے اُٹھ بیٹھتے۔ فرمایا کرتے کہ اب تو میں ایک گھنٹہ لیٹتا ہوں۔ جوانی میں پندرہ منٹ سے زیادہ کبھی نہ لیٹتا تھا۔ خواہ سردی کے دن ہوں یا گرمی کے۔

اِدھر بھائی جان اُٹھتے اُدھر ملازم سبز چائے بنانے کے لئے اسٹوو سلگاتا۔ بھائی جان پہلے بیت الخلاء جاتے اور پھر آکر وضو کرتے جب تک وہ ان دونوں کاموں سے فارغ ہوتے ملازم چائے لے کر آ جاتا۔ یہ سبز چائے بغیر دودھ کے ہوا کرتی تھی جس کا مشورہ بھی انھیں ان کے معالج نے دیا تھا۔ چائے کے بعد اگر طبیعت اچھی ہوتی تو نماز پڑھنے کیلئے مسجد جاتے ورنہ گھر ہی میں نماز پڑھ لیتے۔ مسجد صرف موسم سرما میں جاتے۔ گرمی میں تو ظہر کے وقت مسجد جانا ان کیلئے قطعی ناممکن تھا۔ خواہ طبیعت کتنی اچھی ہی کیوں نہ ہوتی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد پابندی سے نصف گھنٹہ تک حدیث کا مطالعہ کرتے۔ یہ مطالعہ نہایت غور اور محنت سے کرتے۔ آخری دنوں میں نیل الاوطار پڑھ رہے تھے۔ جہاں ضروری سمجھتے کتاب پر سُرخ پنسل سے نشان بھی لگاتے جاتے۔ اور اگر کسی مسئلہ میں مزید تحقیق کی ضرورت سمجھتے تو اس کیلئے مولانا سید سلیمان ندوی یا مولانا محمد اسمٰعیل صاحب (گوجرانوالہ) کو خط لکھتے یا جب ان سے ملاقات ہوتی تو ان سے سوال کرتے۔

مسائل میں اپنی رائے قائم کرنے کے لئے بھائی جان کسی دوسرے شخص کی پیروی نہ کرتے تھے۔ اگر انھیں کسی مسئلہ میں تحقیق کرنی ہوتی تو وہ حدیث کی مختلف کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنی ایک رائے قائم کر لیتے۔ ان کا مسلک تحقیقی تھا اور محدثین کے مسلک سے بہت قریب۔ حدیث سے اسی غیر متعصبانہ اور تحقیقی مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ وہ آخری دنوں میں نماز میں رفع الیدین بھی کرنے لگے تھے۔ آمین بالجہر کے وہ پہلے ہی سے قائل تھے۔

اس کے بعد دار العروبہ میں جو عربی یا اُردو ڈاک آتی۔ ہم لوگ اس کے قابلِ جواب مقامات پر نشان لگا کر بھائی جان کے پاس پہنچ جاتے اور وہ ہمیں زبانی تمام خطوط کے جوابات بتا دیتے۔ ہم دفتر میں آکر خطوط کے جوابات لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ اور بھائی جان اخبارات، رسائل اور دوسری چیزوں کے مطالعہ میں۔ اخبارات میں سے "اسٹیٹسمین" پابندی سے پڑھتے اور شروع سے آخر تک۔ فرماتے اب میرے لئے نئے علوم پر کتابیں پڑھنا مشکل ہے۔ اس کیلئے نہ وقت ہے اور نہ صحت۔ اس لئے اس اخبار کو شروع سے آخر تک پڑھ لیتا ہوں۔ اس سے نئے علوم سے میری واقفیت قائم رہتی ہے۔ سیاسیات میں دوسری خبریں اور مضامین سرسری طور سے پڑھتے۔ لیکن جو خبریں اور مضامین عالمِ اسلامی کی سیاسیات سے متعلق ہوتے، انھیں نہایت غور اور اہتمام سے پڑھتے۔ پاکستان کے حالات سے واقفیت کے لئے کوئی ایک اُردو یا انگریزی روزنامہ کا بھی مطالعہ کرتے۔

دار العروبہ میں عربی کے جو اخبار یا رسالے آتے وہ بھی اسی وقت پڑھتے۔ اور ان میں سے کسی کو بغیر پڑھے نہ چھوڑتے۔ جن دنوں طبیعت بہت خراب ہوتی یہ اخبار اور رسالے جمع ہوتے رہتے۔ جب طبیعت سنبھلتی ایک ساتھ سب کو پڑھ ڈالتے۔ کبھی چند دن کے لئے سفر پر جاتے تو "اسٹیٹسمین" کے پرچے جمع ہوتے رہتے۔ واپسی کے بعد سب کو شروع سے آخر تک پڑھتے۔

عصر کے قریب ہم لوگ خطوط کے جوابات لکھ کر حاضر ہوتے۔ اور بھائی جان اپنا مطالعہ چھوڑ کر جوابات دیکھنے لگ جاتے۔ جوابات میں اگر ضرورت سمجھتے یا کمی یا اضافہ یا ردوبدل کر دیتے اور پھر آخر میں اپنے دستخط کر دیتے۔

عصر کی نماز اگر طبیعت اچھی ہوتی تو مسجد میں آکر ادا کرتے۔ ورنہ گھر ہی پر پڑھ لیتے۔ عصر کے بعد اپنے آپ کو آرام دینے یا احباب و رفقاء سے ملنے کا وقت ہوتا۔ شام کی چائے تقریباً ترک کر دی تھی۔ اگر سخت ضرورت محسوس کرتے تو پی لیتے۔ ورنہ کوشش یہی ہوتی کہ نہ پی جائے۔ عصر کے بعد اگر کسی دوست یا رفیق کے آنے کا پہلے سے علم ہوتا۔ تو انتظار کرتے۔ ورنہ کپڑے پہن کر گھر سے نکل جاتے۔ کبھی ٹہلنے کے خیال سے شہر سے باہر دور نکل جاتے۔ لیکن اکثر اپنے کسی دوست، عزیز یا رفیق کے ہاں ملاقات کیلئے پہنچ جاتے۔ کبھی جماعت کا اجتماع ہوتا تو اس میں چلے جاتے۔ جہاں بھی جاتے مغرب سے پہلے پہلے یا مغرب کے فوراً بعد بہرحال وہاں سے اپنے مکان پر واپس پہنچ جاتے۔

مغرب کی نماز کے بعد ناشتہ کرتے۔ یعنی بھائی جان صرف ایک وقت کھانا کھایا کرتے تھے۔ شروع میں تو ایسا تھا کہ سردیوں میں ایک وقت کھانا کھاتے تھے اور گرمیوں میں دو بار۔ لیکن ادھر تین چار سال سے مستقل طور پر ایک ہی وقت کھانا کھانے لگے تھے۔ خواہ سردی ہو یا گرمی۔ مغرب کے بعد کا یہ ناشتہ بھی تقریباً ویسا ہی ہوتا جیسا صبح کا ناشتہ۔ فرق صرف یہ ہوتا کہ صبح ایک انڈا کھایا کرتے تھے اور اس وقت دو انڈے۔ کبھی انڈوں کے بجائے دو رسک کھا لیتے۔ کبھی بھوک زیادہ محسوس ہوتی تو گھی لگوا کر ایک روٹی پکوا لیتے۔ جسے بھائی جان عموماً "روغنی ٹکیہ" کہا کرتے تھے۔ لیکن چائے کی پیالی وہی ایک رہتی۔

ناشتہ کے بعد کچھ دیر تک کمرے یا صحن میں چہل قدمی کرتے اور پھر سردی میں اپنے بستر پر اور گرمی میں ایک کرسی پر بیٹھ جاتے۔ اس وقت کوئی متعین پروگرام نہ ہوتا۔ عموماً یہ ہماری نشست کا وقت تھا۔ دن میں بھائی جان بھی کام میں مصروف رہتے اور ہم بھی۔ اس لئے مل کر بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا کوئی وقت نہ ملتا۔ ہمارے علاوہ بھائی جان کے بعض احباب اور ملنے والے بھی کبھی کبھی آجاتے۔ یہ نشست عشاء تک رہتی۔ اس میں مختلف موضوعات پر گفتگو رہتی۔ ہم لوگوں کو اپنے ذاتی معاملات کے متعلق کوئی مشورہ بھائی جان سے لینا ہوتا تو اس کا بھی یہی وقت تھا۔ بھائی جان نے جماعت اسلامی میں آنے کے بعد مغرب کے بعد کی اس نشست کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔ ورنہ فرمایا کرتے کہ ندوہ کے زمانہ میں دوستوں اور شاگردوں سے دیر تک باتیں کرتے رہنے میں میرا ریکارڈ تھا۔ تقریباً آدھی رات

گئے تک ان کا سلسلہ جاری رہا کرتا تھا۔

لیکن جن دنوں کوئی ضروری کام درپیش ہوتے۔ ان دنوں مغرب کے بعد بھی کام ہوا کرتے تھے۔ مثلاً آخری دنوں میں کئی ماہ تک مغرب کے بعد دار العروبہ کے ترجموں کی تصحیح کا سلسلہ جاری رہا۔ بھائی جان عربی یا اردو میں کوئی مضمون لکھتے تو مغرب کے بعد ہم میں سے کسی سے یہ مضمون پڑھوا کر سنا کرتے اور اس میں کوئی تبدیلی کرنی ہوتی تو کیا کرتے تھے۔

بھائی جان اپنی حد تک پوری کوشش کیا کرتے تھے کہ ہر نماز مسجد جا کر ادا کریں۔ اگر طبیعت بہت خراب ہوتی تو گرمیوں میں عشاء کی نماز مسجد جا کر ادا کرتے ورنہ گھر ہی پڑھ لیتے۔ سردی میں تو عشاء کے وقت باہر نکلنا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔

عشاء کے بعد گرمی کے دنوں میں کوئی پروگرام نہ ہوتا۔ جلد سے جلد سونے کی کوشش کرتے۔ کیونکہ دن میں تو وہ سو سکتے ہی نہیں تھے۔ اور راتیں بھی چھوٹی ہوتیں۔ اس لئے سونے کیلئے جو چند گھنٹے ملتے وہ بہت قیمتی ہوتے۔ پھر بھی سونے سے پہلے ایک کام بڑی پابندی سے کیا کرتے تھے اور وہ تھا "حساب لکھنا"۔ دن بھر میں ان کا ملازم یا ہم میں سے کوئی ان کی ذاتی ضروریات پر کچھ خرچ کرتا۔ بھائی جان کو رات کے وقت اس کا حساب دینا تھا۔ بھائی جان ایک ایک پیسے کا حساب لکھتے اور جو کچھ کسی کو دینا ہوتا، دیتے اور جو کچھ کسی سے لینا ہوتا لیتے۔ "حساب لکھنے" کی بھائی جان اس قدر سختی سے پابندی کرتے تھے کہ "پچیس" برس کے عرصہ میں کبھی دس میں ایک دن ناغہ نہ ہونے دیا۔ آج سے پندرہ پندرہ بیس بیس سال پہلے جو چیزیں انہوں نے خریدی تھیں۔ اس کی قیمت اب بھی ان کی کاپیوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔ بھائی جان اپنی آمدنی اور مصارف میں تناسب قائم رکھنے پر سختی سے پابندی کرتے تھے، خواہ کیسے ہی حالات ہوں۔ انہوں نے اپنے مصارف آمدنی سے کبھی بڑھنے نہیں دیئے۔ ہر ماہ کے معاوضہ میں سے ایک خاص رقم اپنے والد صاحب قبلہ کی خدمت کیلئے الگ کرتے۔ کچھ رقم مستقل ضروریات کیلئے۔ انہوں نے اپنا معاوضہ کبھی پیشگی نہیں لیا۔ لیکن جسے کچھ رقم مہینے کے آخر میں دینی ہوتی اسے مہینہ کے شروع ہی میں پیشگی دے دیتے۔ کسی سے قرض لے کر بر وقت ادا نہ کرنے کا تو سوال ہی کیا ہے مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی سے قرض لیا ہو۔

گرمی کے موسم میں بھی کھلی فضا میں نہ سوتے تھے۔ اگر کبھی سخت گرمی ہوتی تو مچھر دانی لگا کر سوتے ورنہ عموماً برآمدے میں یا کمرے کے اندر دروازے اور کھڑکیاں کھول کر سوتے۔ گرمی ہو یا سردی ایک تھرماس بوتل میں گرم پانی اپنے پاس لے کر سویا کرتے تھے۔ کیونکہ اگر رات میں کسی وقت کھانسی آ جائے یا مرض کا دورہ پڑے تو گرم پانی پینے سے سانس کی نالی صاف ہو جانے میں مدد ملتی تھی۔

یہ تو تھا عشاء کے بعد گرمیوں کا پروگرام۔ سردیوں میں چونکہ رات لمبی ہوتی ہے اس لئے عشاء کے بعد بھی کام کیا کرتے تھے۔ عموماً اس وقت اپنے کسی شاگرد کو درس دیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وقت بچتا تو کسی سے کوئی عربی، اردو کتاب پڑھوا کر سنا کرتے۔ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ لکھتے وقت بھائی جان لغت بہت دیکھا کرتے تھے۔ پڑھتے وقت اگرچہ خود لغت نہ دیکھتے تھے لیکن کسی کو پڑھاتے وقت شاگرد کو لغت دیکھنے کی تاکید فرماتے۔ جس سے پڑھنے والے کے ساتھ انہیں بھی کسی نہ کسی حد تک فائدہ پہنچتا تھا۔ خصوصاً مختلف افعال کے ابواب یاد رکھنے میں اس سے بڑی مدد ملتی تھی۔

رات کے وقت بھائی جان خود کبھی مطالعہ نہ کیا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "میری صحت تو خراب ہی ہے ایک نگاہ اچھی ہے اسے بجلی کی روشنی میں باریک باریک کتابیں پڑھ کر کیوں ضائع کروں۔"

سونے کا ایک وقت متعین تھا۔ نہ اس سے پہلے کبھی سوتے تھے اور نہ اس کے بعد۔ اگر طبیعت خراب ہوتی اور کوئی کام نہ کر سکتے یا اتفاق سے کوئی پڑھنے والا بھی نہ ہوتا تو تنہا بستر پر خاموش بیٹھے رہتے۔ طبیعت خراب ہونے کی صورت میں بستر پر دو تکیے ایک دوسرے پر رکھ کر ان پر اپنے گھٹنے اور کہنیاں رکھتے۔ کبھی کبھی کوئی عربی یا اردو رسالہ بھی پڑھنے کے لئے اٹھا لیتے۔ مگر ایسا بہت ہی کم ہوتا تھا۔

آخر میں وہی حساب لکھتے اور پھر سو رہتے۔

سونے کا پروگرام بھی بڑا دلچسپ ہوتا۔ پہلے کمرے کے تمام دروازے اچھی طرح بند کرتے۔ پھر اسٹوو سلگاتے۔ کچھ دیر کے بعد جب کمرہ کچھ گرم ہو جاتا تو آہستہ آہستہ کپڑے اتارنا شروع کر دیتے اور سونے کے کپڑے پہنتے۔ ایک روئی دار بنڈی جسم پر ضرور رکھتے۔ پھر گرم پانی سے دوا اور شہد ایک چمچہ کھاتے اور لیٹ جاتے۔ ملازم اوپر سے لحاف اڑھا دیتا۔ لحاف میں کم از کم چار سیر روئی ہوا کرتی۔ لیکن اس پر بھی کبھی ایک اور کبھی دو کمبل شروع رات ہی میں ڈال لیتے اور ایک اور کبھی دو کمبل نصف رات کے قریب ملازم کو جگا کر مزید اپنے اوپر ڈلواتے۔ فرماتے کہ میرا جسم تو ہیرومیٹر ہے۔ جس رات جیسی سردی ہو مجھے پتہ چل جاتا ہے۔

لیٹنے کے بعد ملازم یا جو رفیق بھی ان کے قریب ہوتا نصف گھنٹہ تک ان کا جسم دبا تا۔ اس سے انھیں نیند آنے میں مدد ملتی تھی۔ لیکن اس خیال سے کہ اس کے بالکل ہی عادی نہ ہو جائیں کبھی کبھی ملازم کو جسم دبانے سے روک بھی دیا کرتے تھے۔ رات کی نیند بہت ہی "نازک" ہوا کرتی تھی۔ اگر کہیں کمرے میں کوئی آواز یا روشنی ہو جاتی تو فوراً آنکھ کھل جاتی اور پھر دوبارہ بڑی مشکل سے لگتی تھی۔ اس لئے جس وقت بھائی جان سو رہے ہوتے تھے ہم لوگ دوسرے کمروں میں بھی بلند آواز سے نہ کوئی کتاب پڑھا کرتے اور نہ باتیں کیا کرتے۔

یہ تھے بھائی جان مرحوم کے صبح سے رات تک کے معمولات۔ مجھے افسوس ہے کہ ان میں کسی مناسبت سے ان کے لباس کا ذکر نہیں آسکا لباس میں بھائی جان کا معیار صفائی اور آرام کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ کپڑا نہ بہت اعلیٰ خرید اکرتے تھے اور نہ بالکل معمولی۔ خریدتے وقت صرف یہ دیکھا کرتے تھے کہ کونسا کپڑا مضبوط، قیمت میں مناسب اور شریف و سنجیدہ آدمیوں کے پہننے کا ہے۔ وفات سے تین چار سال پہلے تک سفید کھدر ہی کی قمیص، کرتے اور پاجامے پہنتے رہے، بلکہ بعض اوقات شیروانی اور ٹوپی تک کھدر کی ہوتی تھی۔ لیکن ادھر تین چار سال سے لٹھے کے پاجامے اور ململ کے کپڑے کی قمیص بھی پہننے لگے تھے۔

لباس اور وضع قطع کے بارے میں بھائی جان کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کو وہی لباس پہننا چاہیے جو اس کی قوم کے شریف اور سنجیدہ لوگوں کا لباس ہو۔ وہ اس چیز کے سخت مخالف تھے کہ علماء کا لباس عام لوگوں سے مختلف ہو، نام نہاد شرعی پاجامے اور ٹوپی سے وہ مانوس نہ تھے۔ علماء کے رواج کے مطابق کندھے پر رومال رکھنے کو وہ مستحسن نہ سمجھتے تھے۔ عربوں کے طریق پر سردیوں میں سر پر رومال باندھتے تھے۔ لیکن وہ کسی نیکی کے خیال سے یا اپنے کو دوسروں سے ممتاز کرنے کے لئے قطعی نہیں۔ بلکہ صرف آرام کے خیال سے ایسا کرتے تھے، ان کے ذہن میں یہ خیال ضرور رہتا تھا کہ حدیثوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس عمامہ کا ذکر آتا ہے، وہ اوّل تو اسی قسم کا ہوگا جس قسم کا عمامہ یعنی رومال آجکل کے عرب بدو پہنتے ہیں، یا کم از کم اس سے ملتا جلتا ہوگا۔ ہند اور پاکستان میں جس "عمامہ" کا رواج ہے اور جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھا جاتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عمامہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔

بھائی جان کے معمولات میں جو چیز نہایت اہم اور دوسروں کیلئے مفید ہے وہ ہے اُن کی اپنے ہر پروگرام پر سختی سے پابندی۔ اُن کی یہی پابندی اور سختی کیساتھ پابندی ہی تھی جس کی بدولت وہ اس کمزوری اور خرابیٔ صحت کیساتھ چوالیس سال کی عمر میں وہ کام کر گئے جو ہم جیسے بے اصولے اور مقصد سے عشق نہ رکھنے والے اچھی سے اچھی صحت اور ہر قسم کی خوشی و فارغ البالی کیساتھ نہیں کر پاتے۔ جدید و قدیم علوم کا کونسا شعبہ ہے جس میں بھائی جان پوری طرح دسترس یا کم از کم اپنی ایک مستقل رائے نہ رکھتے ہوں۔ یہ سب کچھ اُن کی اسی محنت، قوت ارادی اور اپنے بنائے ہوئے پروگرام پر سختی کیساتھ کاربند ہونے کا نتیجہ تھا۔ جن لوگوں کو بھائی جان کیساتھ یا قریب رہنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ رات کے وقت انھیں مرض کا چاہے کتنا ہی سخت دورہ پڑتا لیکن اگر جسم بالکل ہی چور نہ ہو جاتا۔ صبح اٹھ کر اپنے معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے۔ یہاں تک کہ دیکھنے والا بھی محسوس نہ کرتا کہ انھیں کسی قسم کی کوئی تکلیف بھی ہے۔

ملا واحدی

ایک سے زائد بیویاں

اسلام سے پہلے دنیا میں کہیں مرد کے لئے بیویاں کرنے کی حد بندی نہیں تھی۔ مرد زیادہ سے زیادہ بیویاں کر سکتا تھا۔ قید تعداد اسلام نے لگائی ہے۔ چنانچہ چار کی انتہائی تعداد مقرر ہوتے وقت مسلمانوں کے ہاں بھی زیادہ سے زیادہ بیویاں تھیں۔ اور تعداد مقرر ہوتے ہی مسلمانوں نے زائد بیویوں کو طلاقیں دے دی تھیں۔ اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی اجازت آئی تھی۔ کہ جو بیوی عیش و آرام چاہیں وہ طلاق لے کر دوسرا گھر بسا لیں۔ مگر کسی بیوی نے اسے منظور نہیں کیا تو حضورؐ سے کہا گیا کہ آپؐ موجودہ تعداد پر اضافہ نہیں کر سکتے۔ اور آپ کو یہ حق نہیں رہا کہ موجودہ بیویوں میں سے کسی بیوی کو طلاق دے دیں۔ اور اُن کے بدلے دوسری بیوی لے آئیں۔ نیز ازواج مطہرات کو اُمہات المومنین قرار دے دیا گیا۔ اور حکم ہوا کہ اب ان سے پیغمبر کی وفات کے بعد بھی نکاح نہیں کیا جا سکے گا۔

چار بیویاں کرنا فرض نہیں ہے۔ مباح ہے۔ حالات متقاضی ہوں تو زیادہ سے زیادہ چار بیویاں کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً عورتوں کی تعداد کا بڑھ جانا یا بیوی کی مستقل بیماری ایسی چیزیں ہیں کہ انسان بجائے اس کے کہ حدود اللہ کو توڑے حدود اللہ سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

یہ عورت ذات پر کچھ ظلم نہیں ہے۔ شوہر عقد ثانی کی صورت میں ناکارہ بیوی کا بار اٹھاتا ہے۔ اور بیوی ناکارہ شوہر سے بالکل چھٹکارا پا کر دوسرا شوہر کر سکتی ہے۔ رہا تعداد بڑھنے کا معاملہ۔ تو تعداد جنگوں کی وجہ سے بڑھا کرتی ہے۔ مرد مارے جاتے ہیں اور عورتیں بے سہارا رہ جاتی ہیں۔ اس صورت میں عورتوں کو نیگ لگانا عورت ذات پر ظلم کیسے ہو سکتا ہے۔

حالات کے تقاضوں کی شرط کے علاوہ ایک سے زائد بیویوں میں عدل کی بڑی سخت شرط ہے۔ ایک سے زائد بیوی کرنا کھیل نہیں ہے۔ دوسری شادی کر کے مرد اپنا سکون قلب کھو بیٹھے اور پرانی بیوی کی زندگی اجیرن بنا دے اور نئی بیوی کو محسوس کرا دے کہ میں کسی آفت میں پھنس گئی ہوں۔ یہ اسلام کے منشاء کے خلاف ہے۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ صحابہ سے فرمایا۔ "ایسی بات بتاؤں جو نماز اور روزے سے افضل ہے"۔ صحابہ نے عرض کیا۔ ضرور بتائیے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "باہمی تعلقات خوشگوار رکھو"۔ باہمی تعلقات سے مراد پڑوسیوں تک کے تعلقات ہیں اور پڑوسیوں میں مسلم و غیر مسلم کی قید نہیں ہے۔ تو جب غیر مسلم پڑوسیوں سے تعلقات خوشگوار رکھنے کی اتنی اہمیت ہے تو عزیزوں اقارب اور خصوصاً اہل و عیال سے تعلقات خوشگوار رکھنا اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو کتنا عزیز ہو گا۔ حضورؐ کی اپنی خانگی زندگی نہایت خوشگوار تھی۔ حضورؐ کی خانگی زندگی

ایک ارشاد گرامی میں سمٹ کر محفوظ ہو گئی ہے۔ خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ بِاَھْلِہٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ بِاَھْلِیْ۔ تم میں بہترین انسان وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں دوسروں پر سبقت لے جائے اور میں تم سب سے زیادہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں۔ ایک اور حدیث ہے۔ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَیْنَکُمْ۔ آپس کے تعلقات میں فیاضی برتنا مت بھولا کرو۔ دوسری شادی کے مستحسن ہونے کا معیار حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ جو مسلمان حضورؐ کے اسوۂ حسنہ اور حضورؐ کی ہدایات کی پیروی کا خیال رکھ کر دوسری شادی کرتا ہے اس کی دوسری شادی مستحسن ہے اور جس کا مسلک یہ ہو کہ جہاں اسلام کی آڑ نہ لی جاسکے وہاں برملا گناہ کرتے پھریے اور جہاں اسلام کی آڑ لی جاسکے وہاں لڑکیوں نہ لے لیجئے۔ اس کی دوسری شادی کو اسلام ناجائز تو نہیں کہتا۔ لیکن مستحسن بھی نہیں کہتا۔

اب ذرا حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ پر غور کیجئے:۔

حضورؐ نے تنہا حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ پندرہ سال پیغمبری سے قبل گزارے اور دس سال پیغمبری کے بعد گزارے۔ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے دور میں کبھی عقد ثانی کی طرف توجہ نہیں کی۔ وہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ہی کا دور تھا جب عمائدِ قریش نے کہا تھا کہ آپ ہمارے بتوں کی مخالفت ترک کر دیجئے تو ہم آپ کو بادشاہ بنالتے اور حسین لڑکیاں آپ کے نکاح میں دینے کو تیار ہیں اور حضورؐ نے جناب ابو طالب سے فرمایا تھا کہ چچا! یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں اللہ کے احکام کی تعمیل سے منہ نہیں موڑوں گا۔

حضرت خدیجہؓ کی عمر انتقال کے وقت پینسٹھ برس تھی اور حضورؐ ابھی پچاس ہی برس کے تھے۔ حضورؐ نے پورے پچیس[۲۵] سال ایک بوڑھی بیوی کے ساتھ گزار دیئے۔ اور پچاس برس کی عمر میں پینسٹھ برس کی بیوی کو نباہا۔ لیکن حضرت خدیجہؓ انتقال کر گئیں اور صاحبزادیوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک گھر والی کی ضرورت محسوس ہوئی تو حضورؐ نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔

حضرت سودہؓ معمر خاتون تھیں۔ انہوں نے اور اُن کے پہلے شوہر حضرت سکران رضی اللہ عنہ نے ابتدائے اسلام کی کھکیڑیں برداشت کی تھیں اور بالآخر دونوں میاں بیوی حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ وہیں حضرت سکرانؓ نے وفات پائی۔ ادھر حضورؐ کو صاحبزادیوں کی سنبھال کے لئے حضرت سودہؓ جیسی خاتون کی ضرورت تھی۔ اُدھر حضرت سودہؓ اپنی جگہ بے سہارا تھیں۔ حضورؐ کی زوجیت میں آجانے سے انھیں دل جمعی مل گئی۔ اور انہوں نے صاحبزادیوں کو ماں کی طرح سنبھال کر حضورؐ کا وقت بچا دیا۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بعد جو نکاح بھی کیا۔ حالات کے تقاضے سے کیا۔ پے در پے جنگوں نے کافی عورتوں اور بچوں کو لاوارث کر دیا تھا۔ حضورؐ اور دوسرے ذی استطاعت مسلمان انھیں حفاظت میں نہ لے لیتے تو کیا کرتے اور نکاحوں سے بہتر حفاظت کی شکل اور کیا تھی۔

حضرت سودہؓ سے حضورؐ کا نکاح ہجرت سے قبل مکہ میں ہوا تھا۔ اُس کی وجہ اُوپر بیان کی جاچکی ہے۔ باقی نکاح تین اور سات ہجری کے درمیان کے ہیں۔ یہ غزوات کا زمانہ تھا۔ اب یا تو ان عورتوں اور بچوں کو جنہیں غزوات نے بیوہ اور یتیم بنا دیا تھا نظر انداز کر دیا جاتا یا انھیں نکاح میں لے لیا جاتا۔ دو صورتوں کے سوا تیسری صورت نہیں تھی۔ جس دین نے جنگ کے غیر مسلم قیدیوں۔ یعنی لونڈی اور غلاموں کو بے سہارا اور کھٹکتا نہیں بھرا یا وہ اپنی بیواؤں

اور اپنے یتیموں کا مستقبل کیسے برباد کر سکتا تھا۔

فتح مکہ (۸ ہجری) کے بعد مسلمانوں میں خوش حالی اور فارغ البالی شروع ہو گئی اور بیواؤں اور یتیموں کی امداد کے پیش نظر نکاحوں کی مجبوری نہیں رہی تو پھر حضورؐ نے نکاح نہیں کیا۔

نکاحوں کی تہ میں علاوہ مندرجہ بالا مجبوری کے اسلام کی مضبوطی، اسلام کا فروغ اور اسلام کی اشاعت کا مقصد بھی کارفرما تھا۔ بنو مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی جویریہ جنگی قیدی تھیں۔ حضورؐ نے حارث کی درخواست پر انھیں آزادی دلائی اور اُن سے نکاح کر لیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کے قبیلے کے سائٹ سو عورت مرد قیدیوں کو مسلمانوں نے آزادی دے دی۔ اور پھر وہ آزاد شدہ لونڈی غلام اسلام کے لونڈی غلام ہو گئے۔ ایک نکاح نے ایک انقلاب کر دکھایا۔

اسی طرح حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے عقد فرما کر حضورؐ نے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان باہمی رابطہ کا راستہ نکال دیا۔ حضرت صفیہؓ بنی نضیر کے رئیس کی بیٹی تھیں اور بنی قریظہ کے رئیس کی نواسی۔ نضیر اور قریظہ یہودیوں کے سب سے اُونچے قبیلے تھے۔ جنگ خیبر انہی قبیلوں کی سازش کا نتیجہ تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے عقد کر کے حضورؐ نے دو انتہائی مخلص صحابیوں کو نوازا اور انھیں عزت کے آسمان پر لے جا بٹھایا۔ بادشاہوں سے رشتہ ہو جانا موجب عزت سمجھا جاتا ہے تو بادشاہوں کے آقا اور رسول خدا سے رشتہ کتنا ذی اور مؤقر ہو گا۔ دو معزز صحابیوں کی بیٹیوں سے حضورؐ نے عقد کیا۔ اور دو اہم صحابیوں سے حضورؐ نے اپنی بیٹیاں بیاہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ حضورؐ کے داماد تھے۔

تمام ازواج مطہرات میں فقط حضرت عائشہ کنواری تھیں۔ لیکن اُن کا امتیاز کنوار پنے یا حسن صورت کی وجہ سے نہیں تھا۔ حضرت عائشہ کے امتیاز کی وجہ وہی خدمت اسلام ہے جو حضرت خدیجہؓ کے امتیاز کی وجہ ہے۔ حضورؐ حضرت عائشہؓ کی فراست اور اسلام فہمی کی قدر کیا کرتے تھے۔ اسلام فہمی میں حضرت عائشہؓ بڑے بڑے صحابیوں سے بڑھی ہوئی تھیں۔ بہت سے اوّل درجہ کے صحابیوں کو وہ سبق سکھا دیتی تھیں۔ تفقہ اور اجتہاد کی اُن میں خداداد قابلیت تھی۔ ترمذی میں ہے کہ صحابہ جب کبھی کسی مسئلہ میں اُلجھ جاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ اُسے سلجھا دیتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ کو تفسیر، حدیث، اسرار شریعت اور خطابت سب میں کمال حاصل تھا۔

حضرت حفصہؓ کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت حفصہؓ کے شوہر خنیس بن حذافہ کے انتقال سے حضرت عمرؓ سخت پریشان تھے۔ حضرت عثمانؓ کی اہلیہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہ نے بھی اُن ہی دنوں رحلت کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے چاہا کہ حضرت عثمانؓ حضرت حفصہؓ سے عقد کر لیں۔ مگر وہ آمادہ نہیں ہوئے۔ پھر حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا۔ وہ بھی خاموش رہے۔ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت عمرؓ کو خیال نہیں تھا۔ ویسے ہی حضورؐ سے بیان کیا۔ کہ آج کل اس پریشانی میں مبتلا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ حفصہؓ کی شادی ابوبکرؓ و عثمانؓ سے افضل شخص سے ہو جائیگی۔

غرضکہ کوئی عقد حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایسا نہیں تھا جس میں نفسانیت کا ذرا سا بھی شائبہ ہو۔ یورپین نقاد اور مؤرخ باسورتھ اسمتھ صاحب کتاب "محمد اینڈ محمڈن ازم" میں لکھتے ہیں:-

"محمدؐ کی شادیاں اُن خواتین سے ہوئیں جو ایک کے سوا سب بیوائیں تھیں اور جن میں حُسن و جمال، یا مال و متاع کی کشش نہیں تھی۔ بلکہ صورت کچھ برعکس تھی"۔

کارلائیل صاحب "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں رقمطراز ہیں:۔

"اگر ہم محمدؐ کو ہوس کا شکار تصور کرینگے تو یہ بہت بڑی گمراہی ہوگی۔ محمدؐ حظ و کیف پر گرنے والے انسان نہیں تھے اُن کے گھر کا ساز و سامان، اُن کی خوراک، اُن کے گھر میں کئی کئی دن چولھے کا نہ سُلگنا۔ اُن کا اپنے جُوتے آپ گانٹھ لینا۔ کپڑوں میں پیوند لگا لینا اس امر کی دلیل ہے کہ ایسا انسان ہوس میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔

محمدؐ ایک غریب، محنتی اور مستغنی انسان تھے اور اُن تمام رجحانات سے بے نیاز۔ جن کی خاطر عوام جان دیدیا کرتے ہیں۔ اگر محمدؐ ایسے ہوتے تو وہ عرب جو عمر بھر انھیں قریب سے دیکھتے رہے تیئیس ۲۳ سال اُن کے اشاروں پر نہ چلتے اور ہرگز اُن کی تعظیم و تکریم نہ کرتے۔ عرب بات بات پر کٹ مرنے والے لوگ تھے۔ کوئی بندۂ ہوس عربوں سے اطاعت نہیں کرا سکتا تھا۔

محمدؐ کی زندگی بے نقاب تھی۔ عربوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ محمدؐ کس قسم کے انسان ہیں۔ وہ محمدؐ کو پیغمبر مانتے تھے اور وہ یونہی ماننے والے نہیں تھے۔

زبردست سے زبردست بادشاہ اتنی اطاعت کسی سے نہیں کرا سکتا جتنی اطاعت اُس شخص نے عربوں سے کرائی جو اپنے کپڑوں میں آپ پیوند لگا لیتا تھا"۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک شادی صحابہ کے علم میں تھی۔ صحابہ جانتے تھے کہ ایک سے زیادہ عقد کب کرنے چاہئیں انھیں اس بات کیلئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں تھی کہ دوسری بیوی لانے میں وہ حق بجانب ہیں۔ اُن کا دل خود عادل تھا۔ وہ جس طرح اور معاملوں میں حضورؐ کے اُسوہ حسنہ اور حضورؐ کے احکام اور حضورؐ کے منشاء کو ملحوظ خاطر رکھتے تھے اسی طرح شادی کے معاملہ میں بھی رکھتے تھے۔ اُن میں یہ حوصلہ تھا کہ ایک دن کی بیاہی ہوئی بیوی پر جہاد کو فوقیت دے دیتے تھے اور شہید ہو جاتے تھے۔ لیکن آجکل کے ہر ہر مسلمان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک سے زیادہ بیویاں کرتے وقت، اللہ اور رسولؐ اُس کے سامنے رہیں گے۔ لہذا آجکل ایک سے زیادہ بیویاں کرتے وقت کسی دوسرے بے لوث آدمی سے یہ فیصلہ کرا لیا جائے تو اچھا ہے۔ البتہ وہ بے لوث آدمی اللہ اور رسولؐ کا منشاء سمجھنے والا ہو۔ غیر اسلامی تصورات کا آدمی نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی احکام کا نفاذ، اسلام کے قطعی مطابق، اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے ۳۰ھ اور ۳۳ھ ہجری کے درمیان جیسا وقت آجائے تو اسلامی حکومت پوری قوم کیلئے اس پالیسی کا اعلان کر سکتی ہے کہ زیادہ بیویاں ضرور کی جائیں اور معمولی دنوں میں اسلامی حکومت افراد پر روک ٹوک رکھ سکتی ہے۔ اور اُن کی دوسری شادی کے بارے میں صحیح رہنمائی کر سکتی ہے[1]۔

---

[1] اسلامی حکومت کے حدود و اختیار اپنی جگہ مسلّم۔ مگر شادی کے مسئلہ میں درحقیقت اصل فیصلہ خود مرد کا ضمیر ہی کر سکے گا۔ نکاح و طلاق کی ضرورتوں اور اُن کی نزاکتوں سے حکومت کے محکمۂ احتساب کو وہ واقفیت نہیں ہو سکتی جو خود مرد کو ہو سکتی ہے کوئی مرد بے پرواہ اور فرض ناشناس ہو تو اپنی صرف ایک بیوی کے حقوقِ زوجیت کی ادائیگی میں بھی کوتاہی برت سکتا ہے۔ اور کوئی فرض شناس اور خدا ترس شوہر ہو تو چار بیویوں کے درمیان بھی حقوق کو نباہ سکتا ہے۔

ایک سے زائد (چار تک) شادیوں کے لئے اسلام نے حکم نہیں دیا، اجازت دی ہے اور اس اجازت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ (م۔ق)

مصطفیٰ لطفی المنفلوطیؒ ترجمہ و تلخیص۔ عطیہ خلیل عرب

خود کُشی!

صبح اخبار دیکھتے ہوئے ایک سُرخی پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ خبر تھی: "ایک مسلمان تاجر نے خودکشی کرلی" تفصیلات کے لئے آگے پڑھا تو معلوم ہوا کہ خودکشی کا سبب تنگ دستی، لاعلاج مرض یا کسی زبردست مالی نقصان کا صدمہ نہ تھا۔ بلکہ ایک عزیز دوست کے مرنے پر غم کی تاب نہ لاتے ہوئے "تاجر خود بے موت مرگیا۔

کاش اس احمق کو یہ معلوم ہوتا کہ وہ عارضی غم کے بدلے مستقل عذاب مول لے رہا ہے۔ لیکن وہ تو مسلمان تھا۔ یقیناً خودکشی کرنے والے کے ہیبت ناک انجام سے ضرور واقف ہوگا۔ نہ معلوم کس طرح اس نے یہ منظور کیا کہ دُنیا سے تو جا ہی رہا ہے آخرت بھی اپنے ہاتھوں گنوا دے۔ حالانکہ دُنیوی زندگی میں مصائب و آلام اور تنگدستی، فاقہ مستی اور مفلسی پر صبر ہی اس یقین پر کیا جاتا ہے کہ اس کا اجر آخرت میں ملے گا۔ اور یہاں کی چند روزہ تکلیفیں وہاں دائمی راحتیں ہوں گی۔

اخبار میرے ہاتھ میں تھا اور میں فکر کے عمیق سمندر میں غوطہ زن سوچ رہا تھا۔ اب تک تو ہم یہی سمجھتے تھے کہ اہلِ فرنگ کی تقلید صرف دُنیوی زندگی تک محدود ہے۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ مسلمان اہلِ مغرب سے اس قدر محبت رکھتا ہے کہ مرنے کے بعد حشر بھی ان کے ساتھ چاہتا ہے۔

دُنیا کی زندگی میں عزت جاتی ہو، جائے۔ مذہب کی خلاف ورزی ہوتی ہو، اُن کی بلا سے۔ اور اسلامی شعار پر حرف آتا ہو، کوئی پرواہ نہیں۔ مغربی تہذیب کی تقلید تو ہو ہی جائے۔ ہر میدان میں اُن کے دوش بدوش چلنا فرض مان لیا گیا ہے۔ گویا اپنے ہاتھوں جان دینا بھی ایک فیشن ہے۔ اس لئے کہ دیارِ مغرب میں بسنے والے پچاس فیصدی یونہی مرتے ہیں۔

میری نظر میں خودکشی سب سے بڑی پست ہمتی اور انتہائی بزدلی کی علامت و دلیل ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اگر کسی شخص میں ذرا بھی عقل و شعور کا مادّہ ہو تو وہ ہرگز اس جرم کا ارتکاب نہ کرے۔

اپنی جان کی محبت دراصل فطرت میں شامل ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ جذبہ ہے اور یہی "محبت" انسان کو علاج، پرہیز، تحفظ اور کسی حملہ آور سے مدافعت پر غیر ارادی طور سے مجبور کرتی ہے۔ لیکن خودکشی کرنے والا بدبخت انسان اپنی جان سے اُتنی ہی دُشمنی رکھتا ہے۔ جس قدر وہ اپنے کسی خطرناک دشمن سے رکھ سکتا ہے۔ وہ اپنی طبیعت میں علیحدہ ہی ہوتا ہے۔ اس کی فطرت بھی جدا ہوتی ہے۔ میں تو اسے بے دل و بے دماغ ہی کہوں گا بلکہ انتہائی احمق اور بے وقوف ———!

خودکشی کرنے والوں کے عقیدے ہوتے ہیں، اور بعد میں یہی وجوہات منظرِ عام پر آتے ہیں:-

رنج و غم کی تاب نہ لاسکا ——— مایوسی اور ناکامی سے جان لے لی ——— زمانے کے ستم سے بیزار ہوگیا تھا ———

غمِ دل یا غمِ روزگار نے کھا لیا ـــــ فلک کج رفتار نے کوئی محبوب و عزیز شے چھین لی ـــــ دائم المریض تھا۔ کسی سنگین جرم کا ارتکاب کر لیا تھا۔

بعض اوقات خانگی جھگڑے بھی اس کے باعث ہو جاتے ہیں۔ آئے دن اخبارات میں خودکشی کی واردات کے ساتھ اس سے بھی زیادہ معمولی اسباب و وجوہ سامنے آتے ہیں۔

ان وجوہات کی بنا پر جان دینے والے کو کاش یہ سمجھنے کی توفیق ہوتی کہ اس نے نجات کا جو ذریعہ اختیار کیا ہے وہ ان مصائب سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوگا اور ابھی تک تو وہ صرف ایک ہی عذاب میں مبتلا تھا اب اسے دوہرے عذاب میں مبتلا ہونا ہے۔

تاجر ذرا بھی عقلمند ہوتا تو اسے معلوم ہوتا جانکنی کے عالم کا ایک ایک لمحہ اس قدر تلخ اور ناقابل برداشت ہوتا ہے کہ اس کے سامنے اس حیاتِ مستعار کے تمام آلام و مصائب ہیچ ہیں۔ خداوند قدوس خودکشی کرنے والوں کو ایسا عذاب دیگا کہ اگر اس کی عمر ایک ہزار سال ہوتی اور ساری زندگی وہ مصائب و آلام ہی جھیلتا رہتا یا کسی مستقل مرض کا شکار رہتا تب بھی وہ اس عذاب کے ایک گھنٹے سے کم ہوتے۔

واقعی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دنیا میں بے شمار مصیبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ کوئی وقت مقرر نہیں۔ کوئی مدت معین نہیں کہ کب اور کس حالت میں غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے اور پھر کب اس سے نجات حاصل ہو۔ انسان ایک مصیبت سے نجات نہیں پاتا کہ دوسری آفت میں گھر جاتا ہے۔ ابھی ایک فکر سے چھٹا نہ تھا کہ دوسرا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ بے فکری سے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہا ہے کہ اچانک کسی بلائے ناگہانی نے آ لیا۔ لیکن اسکے باوجود لوگ زندہ رہتے ہیں اور آئندہ کے لئے سامان کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں ؟

قدرت کے کارخانہ میں دو باتوں کا مسلسل تضاد اور اختلاف چلا آ رہا ہے ـــــ لیکن اضداد ہی اصل وجود ہیں۔ ـــــ "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا" ـــــ اگر بیماری نہ ہو تو صحت کی اہمیت نہ رہے ـــــ فقیری نہ ہو تو دولت مندی کا امتیاز کیونکر ہو ـــــ اگر ذلت نہ ہو تو عزت دار کہاں جائیں ـــــ اگر صرف خوش قسمتی ہی مقدر ہوتی تو بدنصیبی کہاں جاتی۔ لبوں پر صرف مسکراہٹ ہی رہتی تو آنسو کہاں جاتے۔ ان اضداد کے باعث اگر ہر مصیبت زدہ انسان زندگی سے فرار کا خواہاں ہو اور ہر رنج و غم کا مارا خودکشی کر لیا کرے تو کچھ ہی دن میں یہ آباد دنیا ویران ہو جائے اور پھر تو اللہ تعالیٰ کا دستور ہی بدل جاتا۔ حالانکہ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ـــــ

قاتل کو مجرم اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بے رحم اور سنگدل اپنے مقتول کا دشمن ہوتا ہے ـــــ لیکن اپنی جان خود ہلاک کرنے والا ـــــ؟ وہ اس سے بھی زیادہ شقی القلب ـــــ ظالم اور سنگدل ہے۔ اس لئے کہ اس کے اور اس کی جان کے درمیان کوئی جھگڑا نہ تھا۔ یا کسی قسم کی دشمنی، عناد اور عداوت نہ تھی جو کسی قاتل و مقتول میں پائی جاتی ہے ـــــ اس لئے ہماری نظر میں خودکشی کرنے والا ـــــ انسانیت کا سب سے بڑا مجرم ہے۔ اس نے بے خطا اپنی جان کو ہلاک کیا۔ وہ اس کی حریف تو نہ تھی۔ اس قاتل کا مقابلہ حالات سے ہوگا۔ اس کی جنگ مصیبت یا کسی مخالف سے ہو سکتی ہے۔ لیکن جان کا کیا قصور تھا۔ وہ کس جرم کی پاداش میں فنا کی گئی ؟

خودکشی کرنے والا اپنے آپ کو خود دھوکا دیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس صورت سے وہ اپنے مصائب و آلام سے

بھری ہوئی زندگی سے جیت جائے گا - اور اس اضطراری کیفیت میں اسے موت ہی اپنی سب سے بڑی، ہمدرد، محسن، غمگسار اور آخری ذریعۂ نجات نظر آتی ہے - اس کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس طرح زندگی کے پُرخار دامن سے پیچھا چھڑا کر موت کے آغوش میں دائمی سکون اور پناہ ملے گی - لیکن اگر وہ ذرا بھی عقل سے کام لے تو ہرگز خندق سے نکل کر کنوئیں میں گرنا پسند نہ کریگا بلکہ وہ اس کے بھیانک انجام کا تصور بھی کرلے تو خود بخود اس ناپاک ارادے سے ہمیشہ کے لئے باز آجائے -

خودکشی کرنے والا جب سمندر میں چھلانگ لگاتا ہے تو خود بخود غیر شعوری طور پر وہ ہاتھ پیر مارتا ہے - گویا وہ چاہتا ہے کہ اس کا سب کچھ لٹ جاتا۔ لیکن وہ یوں سرمایۂ حیات سے محروم نہ ہوتا - اگر اس کا ارادہ گھٹ کر جان دینے کا ہوتا ہے تو وہ کسی تنگ و تاریک جگہ میں بند تو ہو جاتا ہے۔ لیکن سوچتا ہے کاش یہ چھت ہی اس پر گر پڑے - اسے کم از کم ٹھنڈی ہوا کا ایک ہی جھونکا نصیب ہو جائے --- خواہ اس کے بعد اسے ہاتھ پیر سے معذور، اندھا، محتاج ہو کر ہی کیوں نہ جینا پڑے --- یہ سب کیا ہے --- ؟ در اصل یہ جذبۂ انسانی میں اپنی جان سے پوشیدہ "محبت" کی پکار ہوتی ہے - اگرچہ وہ اس کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتا - لیکن مجبور ضمیر اور بے بس روح کی یہ فریاد اس کے کانوں کے پردے چیرتی ہوئی دل تک پہنچتی ضرور ہے !

خودکشی کرنے کا ارادہ ہی در اصل انسان کے دل میں شیطانی کارروائی اور شریر نفس کے اُبھارنے کا نتیجہ ہوتا ہے - جو بھی خودکشی کا ارادہ رکھتا ہو اسے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ تھوڑی دیر ٹھنڈے دل سے یہ غور کرے کہ جانکنی کے عالم کو کیسے برداشت کرے گا اور نزع کی سختی کیونکر اُٹھائے گا - پھر خودکشی سے مرنے کے بعد لوگ اس کے متعلق کیا چہ میگوئیاں کریں گے ؟ آیا اُن تماش بینوں میں جو بعد میں آکر جمع ہو جائیں گے - کوئی ایسا بھی ہوگا جو اُس کی اس ذلیل حرکت کی جھوٹی تعریف بھی کر سکے ، اور اس دُنیا کا کوئی بیرسٹر، مجسٹریٹ، وکیل اور قانون داں اسے کسی طرح بھی بے گناہ، معذور ثابت کر دے گا - یہ دوسری بات ہے کہ اگر بدقسمتی سے ناکام ہو جائے تو "مجنوں" بنا کر رہا کر دیا جائے - ورنہ دُنیوی قانون کی گرفت بھی اس کے لئے سخت ہی ہوگی - ناکامی کے بعد ذلت و رسوائی میں کون کمی کرے گا - اس کا مذاق اُڑانے سے کون باز آئے گا ؟ کامیابی کا یقین ہو تو ایسے شخص کو عالم تصورات ہی میں وہ ٹھکانا دیکھ لینا چاہئے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مستقل بنا رکھا ہے - اس کے بعد بھی اس جُرم کا ارتکاب کرے تو میرے خیال میں وہ انسان نما حیوان ہے۔ واللہ ولی التوفیق -

پروفیسر امان اللہ خاں ضیائی رامپوری

کچھ غزل اور غزل گوئی کے متعلق

مئی کے "فاران" میں پروفیسر خان رشید صاحب کا مضمون "غزل کی ایک بے اعتدالی" پڑھ کر کچھ تشنگی سی فہم کو محسوس ہوئی اور مضمون کے نفسِ مطلب سے اختلاف کئے بغیر یہ چند سطریں سپرد قلم کرنے کی تحریک ہوئی ہے۔

پروفیسر صاحب ابتداء کرتے ہیں "ویسے تو غزل میں ہزاروں بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں .....۔" ایک علمی مضمون میں یہ شاعرانہ مبالغہ (جس کی بناء پر خود صاحبِ مضمون نے غزل کو بھی مطعون کیا ہے) مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہزاروں کیا معنی، اگر تمام اہلِ نقد ملکر غزل کی بے اعتدالیاں گنانے بیٹھیں تو شاید دہائی بھی نہ نکل سکیں۔ اور یہ عدد بھی اس صورت کے لئے رکھا گیا ہے کہ بالفرض بعض کو غزل کی مسلّمہ خوبیاں بھی بے اعتدالیاں ہی نظر آئیں۔ ورنہ بے اعتدالیوں کا شمار اس سے بھی کہیں کم نکلے۔

بہرحال مضمون میں غزل کی ایک نہیں، چند بے اعتدالیاں گنوائی گئی ہیں۔ پہلی غلو کی حد تک مبالغہ آرائی۔ (مگر یہ متاخرین کی غزل گوئی کا شعار تھا۔ اور آج اس کا ذکر کوئی اچھے الفاظ میں نہیں کرتا) دوسری، رمزیت کی ابہام کی حد تک فراوانی۔ جس سے قدیم و جدید کوئی مکتبِ فکر خالی نہیں۔ تیسری، غزل کا مسائلِ حیات اور ان پر تبصرے سے تہی ہونا ـــــ اور یہ آخری بے اعتدالی ہی ہے۔ جس پر مضمون نگار نے سب سے زیادہ افسوس اور اعتراض کیا ہے۔

ہم یہاں ایک ایک امر کا جدا جدا تجزیہ کرکے دیکھیں گے کہ اگر ان اعتراضات میں صداقت ہے اور یقیناً بڑی حد تک ہے۔ تو اس کے اسباب کیا ہیں اور آیا وہ اسباب رفع ہو کر غزل کو بہتر بنانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔

اس کے لئے ناگزیر ہوگا کہ خود غزل کے تاریخی پس منظر اور ارتقاء پر بھی اجمالاً ایک نظر ڈال لی جائے۔

عربی قصائد کی تشبیب، جس میں محبوب سے خطاب (غزل) ہوتا تھا۔ جدا کرکے ایک مستقل صنفِ شاعری بن کر فارسی میں آئی تو اس کے مضامین قدرتاً بہت سادہ اور محدود تھے۔ "محبوب سے خطاب" (اور یہ محبوب عرب میں قطعاً صیغۂ تانیث میں تھا۔ مگر فارسی افعال و ضمائر میں امتیازِ جنس نہ ہونے کی بناء پر شاعر اپنا روئے سخن خواہ مذکر کی طرف پھیرتا خواہ مؤنث کی جانب اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو سکتا تھا) کوئی وسیع مضمون بذاتِ خود بھی نہ تھا۔ پھر قافیہ کی پابندی نے اسے اور بھی تنگ کر دیا۔ مزید برآں فارسی ادب اپنی ابتدائی شکل میں دقیق و عمیق مضامین کا متحمل بھی نہ ہو سکتا تھا۔ لہذا ابتدائی فارسی غزل میں اندازِ بیان و جذبات نگاری نہایت مختصر اور سادہ ہے۔ لیکن آگے چل کر جوں جوں زبان اور فکر میں پختگی اور گہرائی آتی گئی۔ مضامین بھی بڑھتے گئے اور اسالیب میں بھی وسعت ہوتی گئی۔ چند صدیوں کے اندر غزل میں تصوف (مع اپنی تمام خوبیوں اور خرابیوں کے) فلسفہ، اخلاق اور مسائلِ حیات کے تقریباً تمام گوشوں پر تبصرے آ گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ غزل کا یہ ارتقاء پوری طرح تمدن کے ارتقاء سے وابستہ رہا۔ اور چنانچہ فارسی شاعری میں اُس

وقت تک "مجتہد" پیدا ہوتے رہے کہ فارسی تمدّن کی ترقی شست نہ پڑی۔ سعدی، خسرو، حافظ۔ نظیری، عرفی اور صائب کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ غزل میں کوئی عبقری پیدا نہ ہوا کہ غزل کو نیا آب و رنگ دیتا۔ بعد کے سب لوگ اِن "ساطینِ غزل" کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہی نظر آتے ہیں۔ کوئی اُپج، کوئی جدّت ان کے ہاتھوں وجود میں نہیں آتی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہی وہ زمانہ تھا جب فارسی تمدّن بھی انحطاط پزیر ہونے لگا تھا۔ اس عہد میں ہمیں فارسی بولنے والے علاقوں میں کوئی شخصیت، دوسرے گوشہ ہائے زندگی میں بھی نمایاں کام کرنے والی نظر نہیں آتی۔ سب کے سب مقلّد ہیں۔ اور بزرگوں کی میراث سینہ سے لگائے رکھنے پر مُصر۔

اور یہی وہ زمانہ تھا جب "پاکھندی[1]" علاقہ میں مسلمان ایک نئی زبان کو ادب و انشا کی زبان بنا رہے تھے۔ اردو سے پہلے ہند کے مسلمان، بلکہ غیر مسلموں تک، کی ادبی زبان فارسی تھی۔ مقامی بولیاں۔ برج، اودھی، راجستھانی وغیرہ کسی زمانے میں ادبیت کے تھوڑے بہت جوہر دکھا چکی تھیں۔ مگر مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے تمدّنی استیلا کے تحت ان کی تمام سرگرمیاں ٹھنڈی پڑتی چلی گئیں۔ تا آنکہ اُن سے عام بول چال کے سوا کوئی کام نہ لیا جانے لگا۔ ہندوؤں کی مذہبی زبان سنسکرت ہی رہی۔ مسلمانوں کی عربی، ادب و سیاست میں دونوں کی ضروریات فارسی ہی پوری کرتی رہی۔ اور جب فارسی زبان پر فارسی[2] تمدّن کے ساتھ زوال آیا تو اردو نے فارسی کی تمام روایاتِ ادب ساتھ لے کر ارتقاء کے سفر پر چلنے کی کمر باندھی۔ اور یہ قدرتی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی شاعری کی خوبیوں کے ساتھ دورِ زوال کے معائب بھی اُردو میں راہ پانے لگے۔ اس کے علاوہ خود پاکھندی مسلم معاشرے میں بھی اسی زمانے سے اضمحلال کے آثار شروع ہو گئے تھے۔ خصوصاً غزلِ اُردو کا "دَورِ زریں" بد قسمتی سے وہی اٹھارھویں صدی عیسوی کا غیر یقینی اور پُر آشوب زمانہ ہے جب حملۂ نادر شاہ (۱۷۳۹ء) سے لے کر انگریزی تسلّطِ دہلی (۱۸۰۳ء) تک دہلی پر کوئی دس سال بھی امن و عافیت کے نہ گزرے۔ ایسے حالات میں غزل نے انہی جذبات۔ روایات اور اقدار کی جھلکیاں دکھائیں جو اُس وقت معاشرے میں رائج تھے۔ سودا، میر، درد، مظہر وغیرہ کون ہے۔ جس کی غزل میں حسرت، توکّل، ماضی کی یاد۔ اور فی الجملہ ہمہ گیر اُداسی اور ٹھنڈی سانسیں نہیں؟ حالانکہ ان کے پیش رو۔ خصوصاً ولی ان باتوں کا بہت کم اظہار کرتے ہیں۔

ان لوگوں کے بعد غزل گوئی کا مُستقر لکھنؤ بنا۔ یہاں سکون اور تعیش کی فراوانی غدر تک رہی۔ اور کسی تمدّن کے مٹنے سے پہلے کی تمام اخلاقی خرابیاں اپنے شباب پر پہنچ گئیں۔ شاہدانِ بازاری کی بڑھتی ہوئی اہمیت۔ دینی اقدار سے غفلت، آدابِ معاشرت میں تصنع اور تکلف۔ وہ عوامل تھے جن سے غزل میں فحاشی، دُور از کار مبالغہ۔ زبان کے تکلّف۔ اثر سے خالی جذبات اور بے مصرف مضمون آفرینی و نازک خیالی نے راہ پائی۔ لیکن چونکہ غزل اس دَور تک پہنچتے پہنچتے "قدمائی" (classical) صنفِ شعر بھی ہو چکی تھی۔ اس کے قدیم مضامین بھی روایات کے طور پر باقی رکھے گئے۔ اور ظاہر ہے کہ محض تقلیدِ سلف ہونے کی وجہ سے یہ مضامین ندرت سے عاری ہو گئے۔

---

[1] امید ہے کہ (پاک + ہند) پاکھند کی ترکیب، اختصار کی بدولت، اہلِ ذوق کو گراں نہ گزرے۔

[2] اس مضمون میں جا بجا "فارسی تمدّن" سے مراد وہ طرزِ معیشت ہے جو فارسی کو ادبی زبان بنانے والوں سے شروع ہو کر تمام وسط ایشیائی اور ہندی مسلمانوں کا صدیوں باقی رہا۔ اور جس میں فارسی فنون، زبان و افکار کو بنیادی اہمیت حاصل رہی

ادھر دہلی بھی ۱۸۰۳ء کے بعد تقریباً نصف صدی تک امن کا سانس لیتا رہا۔ لہٰذا یہاں بھی شعر و ادب کے چرچے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ لیکن یہاں رخصت مختصر تھی۔ اور "وضعداری" وقت کا معمول۔ یہاں کے شعراء اہلِ لکھنؤ کی طرح تو نہ کھل کھیلے لیکن اس زمانے میں ہمیں یہاں بھی فراغت و تعیش کی جھلکیاں نصیب۔ ذوق۔ مومن، ظفر اور عیش وغیرہ کے ہاں نظر آتی ہیں۔ غالب بھی اگرچہ اس میدان میں اوروں سے پیچھے نہیں۔ لیکن ان کے ذاتی "تاثرات" "روحِ عصر" سے کہیں بلند ہیں۔ اس لئے جب وہ حسرت یا مسرت وغیرہ اپنی غزل میں لاتے ہیں تو وہ ان کے اپنے تاثرات ہوتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں زمان و مکان سے بڑی حد تک ماورا ہیں۔ اُن کو چھوڑ کر اُس عہد کا ہر شاعر اپنے ماحول کا ترجمان نظر آتا ہے۔ اور یہ ترجمانی بھی زیادہ تر غزل، ورنہ مثنوی کے ذریعہ ہوتی ہے۔

غدر کے بعد جب "نئی روشنی" کا زمانہ آیا تو غزل پر اوس سی پڑ گئی۔ اور جذبات و ماحول کی ترجمانی عام نظموں سے ہونے لگی۔ قدیم شاعری کی صنفِ غزل کہنے والے محض روایت پرست ہو کر رہ گئے۔ مگر یہ وقفہ عارضی تھا۔ جلد ہی نئے ولولے اور قدریں لے کر کچھ پُرجوش آگے بڑھے اور نئی دُنیا کے نئے مسائل بھی غزل میں سمونے لگے۔ ان میں حالی، اکبر، مولانا محمد علی جوہر، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی سرِ فہرست ہیں۔ انہی حضرات نے سیاسیاتِ عہد سے بھی غزل کو روشناس کرایا۔ اور اپنے معاشرے کے نوجوانوں کی بہت سی دینی اور معاشرتی اُلجھنیں بھی اپنی بساط بھر صاف کرنے کی کوشش کی۔

ان کے بعد اقبال آتے ہیں۔ جو اگرچہ اپنے پیش روؤں کی طرح خالص قدمائی غزل گو نہیں (اور اپنے ابتدائی زمانۂ شاعری میں تھے بھی تو وہ شاعری چنداں درخورِ اعتنا نہیں) تاہم عام نظموں کے علاوہ اُن کے بہت سے نغمے غزل ہی کی ہیئت اور ساخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کو نئے تصورات دینے کے علاوہ اس کی روایاتی لغت میں معانی کی نئی روح بھی پھونکی اور بحیثیت مجموعی اس صنف کو رجائی مزاج بھی عطا کیا۔ اس اعتبار سے اقبال ہماری غزل کے "نوقدمائی" (Neo-classic) شاعر ہیں۔ کہ بیک وقت قدیم و جدید کا امتزاج اُن کے ہاں ملتا ہے۔

یہاں تک ہم نے دیکھا کہ غزل نے ہر زمانے کے رجحانات کا ساتھ دیا ہے۔ اور اگر بعض مسائل مثلاً مضمون نگار موصوف کے خیال میں معاشی مسئلہ، اس میں شروع سے نہیں رہے، تو صرف اس لئے کہ وہ اس عہد اور ماحول میں اتنے اہم خیال ہی نہیں کئے جاتے تھے۔ معاشی مسئلہ آج ہمارے لئے ممکن ہے۔ ہمہ گیر اور بنیادی ہو۔ اٹھارھویں اور ابتدائی انیسویں صدی کے غزل گویوں کے لئے، جو لازماً طبقۂ اشرف میں سے ہوتے تھے۔ اور جنہیں اپنی آبائی جاگیروں یا وہبی ملکۂ شاعری کے ذریعۂ معاش ہونے پر پورا اعتماد ہوتا تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ مزید برآں توکل اور قناعت صدیوں سے اہلِ خانقاہ کے غلو کی بدولت اُس معاشرے کی بنیادی قدریں قرار پا چکے تھے۔ جبکہ آج فرنگی اور اشتراکی تصورات نے ہمیں خود غرضی، بے اعتمادی اور ریاکاری سکھائی ہے۔ اور اُن کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انسان آج معاش کو ہر دوسرے مسئلہ پر مقدم سمجھنے لگا ہے اور چونکہ مشینی دَور کی بدولت مختلف طبقات کے امتیازی خصائص بڑی حد تک مٹ چکے ہیں۔ لہٰذا اُس دَور کے برخلاف آج معاشرے کے تمام افراد تقریباً یکساں ہی سوچتے اور ایک (جیسی) قدروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسی طرح اگر قدیم غزل نے فراری اخلاق کی تعلیم دی ہے تو وہ بھی اسی لئے کہ وہ عہد فراریت کا تھا۔ (اور صاحبِ مضمون بھی اس سے کسی نہ کسی طرح مقر ہیں) اسی طرح اگر صاحبِ مضمون کو قدیم غزل وطنیت سے بڑی حد تک خالی نظر آتی ہے تو اس کا بھی وہی سبب ہے۔ ایک مسلم معاشرے میں وطنیت۔ خصوصاً عہد قطر

تصورِ وطنیت کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ صاحبِ مضمون نے حالی کے چند شعر دہلی کی تعریف میں نقل کئے ہیں۔ حالانکہ حالی کا وطن دہلی
تھا۔ حالی کے علاوہ بھی قدمائے ادب میں سے بہتیوں نے دہلی یا لکھنؤ کی تعریف کی ہے اور اُن میں سے اکثر ان دونوں شہروں کے
باشندے نہ تھے۔ پس دراصل یہ لوگ دہلی یا لکھنؤ کو وطن نہیں، ادارۂ تمدن سمجھتے اور اسی بناء پر اُن کی توصیف یا ان کی بربادی
پر ماتم کرتے تھے۔ بلکہ حالی کے بعد بھی کوئی قابلِ ذکر مسلم شاعر یا انشاء پرداز نہیں۔ جس نے۔ اقبال کو چھوڑ کر۔
وطن کو یہ اہمیت دی ہو۔ اور اقبال نے بھی بعد میں اپنے اس تصور کو غلط سمجھ کر رجوع کر لیا تھا۔ چنانچہ اُن کی
نظم "وطنیت" اس کی شاہد ہے۔ وطن کا احترام کرنے والے اور اس کی توصیف کے نغمے گانے والے سب
ہندو شاعر ہی رہے ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی پوری تاریخ ادب، کیا عربی، کیا فارسی وغیرہ، وطن کے متعلق ایسے جذبات سے
خالی ہے۔

اب رہا یہ کہ آج کل غزل کیوں مسائلِ حیات پر تبصرہ اور رہنمائی نہیں کرتی۔ اس کی وجہیں کئی ہیں۔ پہلی جنگِ عالمگیر کے بعد سے
ہمارا ماحول جس بحران سے دوچار چلا آرہا ہے۔ اس میں وقتی مسائل پے در پے کثرت سے آتے رہے ہیں، اور یہ اجتہاد
فی الغزل کی راہ میں سب سے بڑی روک ہیں۔ غزل ایک عمومی صنفِ شعر ہے۔ قیدِ وقت و مقام سے آزاد۔ انسان کی
مشترک یا غیر معمولی احساسات کی ترجمان، مختصر اور جامع۔ وہ وقتی مسائل کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ایسی ہی
فراغت و سکون درکار ہے۔ جو قدما کو میسر تھی۔ دوسرے یہ کہ اس کو اپنانے اور ارتقاء کی راہ پر بڑھانے والے
میں بھی عام شاعر سے بڑھ کر احساس و واردات ہونے چاہئیں۔ عام شاعر اچھی نظمیں لکھ سکتا ہے، اچھی غزلیں نہیں
نظموں کے لئے عنوانات، اسالیب، لغات وغیرہ لامحدود ہیں۔ غزل کے لئے ہر چیز محدود۔ اگر غزل میں فکرِ عظیم
اسلوبِ بدیع اور الفاظِ لطیف نہ ہوں تو نری تقلیدِ قدما بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ اگرچہ اٹھارھویں
صدی میں بھی سیاسی حالات نہایت پُر آشوب تھے۔ ہمارے قدما میں غیر معمولی اعلیٰ شاعر پیدا ہوئے۔ کیونکہ گو اُن کی
آخر عمر پریشانیوں میں گزری۔ مگر یہ سب وہ لوگ تھے جن کا لڑکپن اور جوانی۔ جو مزاج بننے کے زمانے ہوتے ہیں
عہدِ محمد شاہی تک کی آسودگیوں اور بے فکریوں میں گزرے تھے۔ جس کے بعد وہ ہنگامی حالات کی اثر انگیزی سے تقریباً
ماوراء ہو چکے تھے۔ اسی طرح ہمارے عہد کے معمر غزل گو حسرت، فانی، اصغر، جگر اور اقبال ہیں کہ اُن کے
زمانۂ کمسنی میں نہ حالات ایسے پُر آشوب تھے، نہ قحط الرجال کا یہ عالم تھا۔ جس سے آج زوال کی انتہا کو پہنچکر ہمارا
معاشرہ دوچار ہے۔

تیسری اہم وجہ زبان سے بے پروائی ہے۔ اور معاملات کے ساتھ ساتھ غزل اپنے شاعر کی زبان بھی خوب پہچانتی ہے
اُردو غزل گوئی میں آج تک کوئی غیر اہلِ زبان۔ خواہ وہ اُردو علاقہ کا غیر مسلم ہو۔ خواہ غیر علاقہ کا مسلم، ذرا بھی قابلِ ذکر
کام نہیں کر گیا۔ غزل کے لئے، جیسی وہ خود ہے، وہ بے تکلف، فطری لسانی و معاشرتی ماحول درکار ہوتا ہے۔ جو صرف
اہلِ زبان کو میسر ہو سکتا ہے۔ اور آج کل، غیر اسلامی افکار و تعلیم کی بدولت، وہ ماحول اہلِ زبان کو بھی میسر نہیں!
پس اگر آپ غزل کو اس کے سابق مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ مسائلِ حیات کی مبصر و رہنما تھی۔
تو جدوجہد یا انتظار کیجئے۔ تا آنکہ انسانیت اطمینان و امن کا سانس لے سکے۔ اس میں عظیم مفکر پیدا ہو سکیں۔ جو
حیات کے ہر گوشے کی طرح وادیٔ تغزل میں بھی قدم بڑھائیں۔ اور اپنی بنی نوع کو اعلیٰ قدریں دے سکیں۔ اس

بغیر ممکن ہے۔ اچھے نظم گو شاعر پیدا ہوتے چلے جائیں۔ یا سرے سے شاعری ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ حقیقی غزل گو بہر حال نہ پیدا ہو سکیں گے۔

اب مبالغہ اور ابہام رہ جاتے ہیں۔ جن کی غزل میں شدت اور کثرت پر صاحب مضمون کو اعتراض ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ ان دونوں کی موجودگی کی توجیہہ اوپر کی سطور کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ بے مزہ اور دور از کار مبالغہ کورانہ تقلید کا نتیجہ ہے۔ اور آجکل یوں بھی یہ مذموم سمجھا جاتا ہے۔ اور غزل میں بہت کم برتا جاتا ہے۔ اس لئے خارج از بحث ہے۔ اور ابہام کے دو سبب ہیں۔ جو دونوں اوپر مذکور ہو چکے۔

(۱) یعنی ہمارے ماحول کا غیر یقینی ہونا اور ہمارا بلا نصب العین زندگی گزارنا۔ جس کی وجہ سے ہم خود اپنے مسائل کی علت اور نتائج سے، جن سے غزل بحث کر سکتی ہے، بے بہرہ ہیں اور:۔

(۲) دوسرے۔ ہمارا اپنی زبان و روایاتِ ادب سے ناآشنا ہونا۔ جس کی بدولت ہمارے ذہن میں کوئی نادر خیال آتا بھی ہے تو موزوں الفاظ نہ ملنے کے سبب "المعنی الشعر فی بطن الشاعر" ہو کر رہ جاتا ہے۔

اور جس دن یہ دونوں موانع دور ہوتے۔ آپ دیکھیں گے کہ غزل اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہو جائیگی۔ کیونکہ

ہنوز بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است! ؏

ساقی جاوید۔ بی اے

اخوان کا آخری گیت

تقدیس کو لے کر بڑھتے ہیں ایمان کو لیکر بڑھتے ہیں
اے وقت گزرتے ہیں تیرے دامن کو لہو سے سینچ کے ہم
ہم اہلِ جنوں سجدے میں کہیں جھکنے کیلئے تیار نہیں
ترجیح اجل کو دیتے ہیں بے سوزِ محبت جینے پر
شمشیر و سناں کے سازوں پر توحید کے نغمے گاتے ہیں
اے عدل پسندو؟ لے جاؤ انصاف کی جھوٹی میزانیں
اربابِ عدالت اٹھ جاؤ قانون تمہارے ٹوٹ گئے
اب ہم کو جہاں سے کیا نسبت، اب سر سے کفن ہم باندھ چکے
ہم نبضِ جفا کی گرمی کو اے ظلم پرکھنے آئے ہیں
آ خون لگا دیں ہم اپنا اے مصر تری پیشانی پر
مقتل کی طرف اب جاتے ہیں اے موت ترے لب چوم کے ہم
ہم شمعِ یقیں کے پروانے شعلوں سے محبت کرتے ہیں
اے موت ہمارے خون سے اب رنگین زمیں ہو جانے دے
شمعیں بھی ہزاروں جلتی ہیں غنچے بھی ہزاروں کھلتے ہیں
سطوت کے نشاں لہراتے ہیں سطوت کے نشاں لہرائینگے

ہم دار و رسن کے دیوانے قرآن کو لے کر بڑھتے ہیں
اے موت سلامی دیتے ہیں، تجھ کو بھی سنانیں کھینچ کے ہم
ہم سیل مزاج انسان کہیں رُکنے کیلئے تیار نہیں
ہم زہر کے خُم پی جاتے ہیں آتے ہیں جو کبھی پینے پر
اے نیل کے بڑھتے طوفانو! ہٹ جاؤ کہ اب ہم آتے ہیں
ہم سادہ دل انسان بھلا زرتاب سیاست کیا جانیں
اب موت ہماری منصف ہے، اب فیصلے اُس پر چھوٹ گئے
لو آخرِ شب، سامانِ سفر، یارانِ وطن ہم باندھ چکے
قانون کے سُرخ انگاروں پر ہم ہاتھ کو رکھنے آئے ہیں
تجھ کو تو ابھی رونا ہے بہت اس محفل کی ویرانی پر
لے جامِ شہادت پیتے ہیں، ساقی کی ادا پر جھوم کے ہم
اے زیست ہماری راہ سے ہٹ ہم موت کی عزت کرتے ہیں
دُنیا کو ہماری عظمت کا کچھ اور یقیں ہو جانے دے
اے مصر مگر یہ یاد رہے اربابِ وفا کم ملتے ہیں
اے ظلم پرستو۔ ہم لیکن تم کو بھی بہت یاد آئیں گے

قرآن کی عظمت یاد رکھو قرآن اصولِ ہستی ہے
کچھ اہلِ یقیں ہی سمجھے ہیں یہ باب قبولِ ہستی ہے

عبدالکریم ثمر

فتنۂ پرویز

جہاں میں زندہ ہے اب تک شقاوتِ چنگیز
قدم قدم پہ جہالت، روش روش پہ ستیز

عرب کو عشق نے بخشی ہے فطرتِ صدیقؓ
عجم کے ساز سے پیدا ہے نغمۂ پرویز

وہ اک غلام تھا احمدؐ کا جس کے مرکب نے
پہنچ کے ختمِ نبوّت پہ توڑ دی مہمیز

یہ اک غلام ہے احمدؐ کا دورِ حاضر میں
رسولِ پاک کے ارشاد سے جسے ہے گریز

تو کیوں حدیث کو سمجھا مسائلِ نظری
تری نظر میں ہے قرآں بھی ایک دستاویز

اسی کے نطق کا اُمّ الکتاب ہے نغمہ
کہ جس نبیؐ کے ہے فرمان سے تجھے پرہیز

تو کر رہا ہے حقائق قیاس پر محمول
ترے قلم کی جسارت ہے مضحکہ انگیز

اگر نہ سنت و قرآں میں ہو ہم آہنگی
تو پھر تجلّی و عرفاں بھی ہے حجاب آمیز

الٰہی! حرمتِ قرآں کے مدعی ہیں کہاں
حدیثِ پاک کا منکر ہے فتنۂ پرویز

★

کوثر نیازی

ساقی سے!

بجائے جام لے اب ہاتھ میں شمشیر اے ساقی!
فضا میں گونجتا ہے نعرۂ تکبیر اے ساقی!

بہت کی حضرتِ انسان نے تدبیر اے ساقی!
نہ بدلی جا سکی اب تک مگر تقدیر اے ساقی!

غضب ہے تیرے مستوں کے جنوں پر عقل غالب ہے
تعجب ہے کہ خود صیاد ہے نخچیر اے ساقی!

یہ میخانہ ہے اس میں ایک اک میکش کا حصّہ ہے
اسے سمجھا ہے کیوں پیرِ مغاں جاگیر اے ساقی!

کسی باطل کی طاقت سے میں دب کر رہ نہیں سکتا
کہ میرے سامنے ہے اسوۂ شبیرؓ اے ساقی!

یوگیندر پال صابر ایم اے

سائنس

یقین لطفِ خداوند و خوفِ قہرِ خدا
اگر مفید نہیں ہے تو کچھ بُرا بھی نہیں
بڑا ستم کیا سائنس نے غریبوں پر
یقیں بھی چھین لیا اور کچھ دیا بھی نہیں

تکلف

یہ کھڑے ہو کے بار بار سلام ٭ پوچھنا، کہیے، کیسے آئے ہیں؟
مجھ سے ملتے ہیں دوستوں کی طرح ٭ آپ اب کس قدر پرائے ہیں؟

روحِ انتخاب

مسلمانوں کے حاکم، اور ملت کے رکھوالے (محافظِ ملت) ایسے ہوتے ہیں!

حضرت عمرؓ کی تاریخِ زندگی میں ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ ان کو ہمیشہ بڑے اہم امور سے سابقہ رہتا تھا۔ تاہم نہایت چھوٹے چھوٹے کام بھی وہ خود انجام دیتے تھے۔ اور اس کے لئے ان کو وقت اور فرصت کی تنگی نہیں ہوتی تھی۔ ان میں ایسے کام بھی ہوتے تھے جن کا اختیار کرنا بظاہر شانِ خلافت کے خلاف تھا۔ لیکن ان کو کسی کام سے عار نہ تھا۔

روزینہ داروں کے جو روزینے مقرر تھے۔ اکثر خود جا کر تقسیم کرتے تھے۔ قدید اور عسفان مدینہ سے کئی منزل کے فاصلہ پر دو قصبے ہیں۔ جہاں قبیلہ خزاعہ کے لوگ آباد تھے۔ ان دونوں مقاموں میں خود تشریف لے جاتے تھے۔ روزینہ داروں کا دفتر ہاتھ میں ہوتا تھا۔ ان کو دیکھ کر چھوٹے بڑے سب گھروں سے نکل آتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ خود اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دارالصدقہ میں جاتے اور ایک ایک اونٹ کے پاس کھڑے ہو کر اُن کے دانت گنتے اور اُن کا حلیہ قلمبند کرتے۔

محب طبری نے ابو حذیفہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کا معمول تھا کہ مجاہدین کے گھروں پر جاتے اور عورتوں سے کہتے کہ تم کو جو کچھ بازار سے منگوانا ہو تو میں لا دوں۔ وہ لونڈیاں ساتھ کر دیتیں۔ حضرت عمرؓ خود چیزیں خریدتے اور ان کے حوالہ کرتے۔ مقامِ جنگ سے قاصد آتا اور اہلِ فوج کے خطوط لاتا تو خود اُن کے گھروں پر پہنچا آتے اور کہتے کہ فلاں تاریخ تک قاصد واپس جائے گا۔ تم جواب لکھوا رکھو کہ اس وقت تک روانہ ہو جائے۔ کاغذ، قلم، دوات خود مہیا کر دیتے اور جس کے گھر میں کوئی حرف شناس نہ ہوتا خود چوکھٹ کے پاس بیٹھ جاتے اور گھر والے جو لکھواتے لکھتے جاتے۔

اُن کی سب سے زیادہ توجہ اس بات پر مبذول رہتی تھی کہ رعایا کی کوئی شکایت اُن تک پہنچنے سے رہ نہ جائے یہ معمول رکھا تھا کہ ہر نماز کے بعد صحنِ مسجد میں بیٹھ جاتے اور جس کو جو کچھ اُن سے کہنا سننا ہوتا، کہتا۔ کوئی نہ ہوتا تو تھوڑی دیر انتظار کر کے اٹھ جاتے۔ راتوں کو دورہ کیا کرتے۔ سفر میں راہ چلتوں سے حالات پوچھتے۔ بیرونی اضلاع سے جو سرکاری قاصد آتے اُن سے ہر قسم کی پرس وجو کرتے۔

ایک بڑا عمدہ طریقہ دریافتِ حالات کا یہ تھا کہ تمام اضلاع سے ہر سال سفارتیں آتیں اور وہ ان مقامات کے متعلق ہر قسم کی ضروری باتیں پیش کرتیں۔ اس سفارت کو وفد کہتے تھے۔ اور یہ عرب کا قدیم دستور تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس سے وہ کام لیا جو آج کل جمہوری سلطنتوں میں رعایا کے قائم مقام ممبر انجام دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں۔ مختلف اضلاع سے جو سفارتیں آئیں اور جس طرح انہوں نے اپنی مقامی ضرورتیں پیش کیں۔ اس کا حال عقد الفرید وغیرہ میں بہ تفصیل ملتا ہے۔

ان تمام باتوں پر حضرت عمرؓ کو تسلی نہ تھی۔ فرماتے کہ "عمال رعایا کی پروا نہیں کرتے اور ہر شخص مجھ تک پہنچ نہیں سکتا"۔ اس بنا پر ارادہ کیا تھا کہ شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ کا دورہ کریں۔ اور ہر جگہ دو دو مہینے ٹھہریں۔ لیکن موت نے فرصت نہ دی۔ تاہم اخیر مرتبہ جب شام کا سفر کیا تو ایک ایک ضلع میں ٹھہر کر لوگوں کی شکایتیں سنیں۔ اور داد رسی کی۔ اس سفر میں ایک پُر عبرت واقعہ پیش آیا:۔

دار الخلافہ کو واپس آ رہے تھے کہ راہ میں ایک خیمہ دیکھا۔ سواری سے اُتر کر خیمہ کے قریب گئے۔ ایک بڑھیا عورت نظر آئی۔ اس سے پوچھا عمرؓ کا کچھ حال معلوم ہے۔ اس نے کہا "ہاں۔ شام سے روانہ ہو چکا۔ لیکن خدا اس کو غارت کرے آج تک مجھ کو اس کے ہاں سے ایک حبہ بھی نہیں ملا"۔ حضرت عمرؓ نے کہا "اتنی دور کا حال عمرؓ کو کیونکر معلوم ہو سکتا ہے؟" بولی "اس کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کیوں کرتا ہے؟" حضرت عمرؓ کو سخت رقت ہوئی اور بے اختیار رو پڑے۔

ہم اس موقع پر متعدد حکایتیں اور روایتیں نقل کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ ہو گا کہ رعایا کی آرام و آسائش اور خبر گیری میں ان کو کس قدر سرگرمی اور ہمدردی تھی:۔

ایک دفعہ ایک قافلہ مدینہ منورہ میں آیا اور شہر کے باہر اُترا۔ اس کی خبر گیری اور حفاظت کے لئے خود تشریف لے گئے۔ پہرہ دیتے پھرتے تھے۔ کہ ایک طرف سے رونے کی آواز آئی۔ ادھر متوجہ ہوئے۔ دیکھا تو ایک شیر خوار بچہ ماں کی گود میں رو رہا ہے۔ ماں کو تاکید کی کہ بچے کو بہلائے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اُدھر سے گزرے تو بچے کو روتا پایا۔ غیظ میں آ کر فرمایا کہ "تو بڑی بے رحم ماں ہے"۔ اس نے کہا کہ "تم کو اصل حقیقت معلوم نہیں۔ خواہ مخواہ مجھ کو دق کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا ہے کہ بچے جب تک دودھ نہ چھوڑیں بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے۔ میں اس غرض سے اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ اس وجہ سے روتا ہے"۔

حضرت عمرؓ کو رقت ہوئی اور کہا کہ "ہائے عمرؓ! تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہو گا"۔ اسی دن منادی کرا دی کہ بچے جس دن پیدا ہوں اسی تاریخ سے ان کے روزینے مقرر کر دیئے جائیں۔

اسلم (حضرت عمرؓ کا غلام تھا) کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو گشت کے لئے نکلے۔ مدینہ سے تین میل پر صرار ایک مقام ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ پاس جا کر حقیقت حال دریافت کی۔ اس نے کہا کہ کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے۔ ان کے بہلانے کے لئے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دیا ہے"۔ حضرت عمرؓ اسی وقت اٹھے۔ مدینہ میں آ کر بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلمؓ سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلمؓ نے کہا۔ میں لئے چلتا ہوں۔ فرمایا۔ ہاں۔ لیکن قیامت میں میرا بار تم نہیں اٹھاؤ گے۔ غرض سب چیزیں خود لاد کر لائے۔ اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اس نے آٹا گوندھا۔ ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمرؓ خود چولھا پھونکتے جاتے تھے۔ کھانا تیار ہوا۔ تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ عورت نے کہا:۔

"خدا تم کو جزائے خیر دے۔ سچ یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ"۔

ایک دفعہ رات کو گشت کر رہے تھے۔ ایک بدو اپنے خیمہ سے باہر زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاس جا کر بیٹھے اور ادھر اُدھر

کی باتیں شروع کیں۔ دفعتہً خیمہ سے رونے کی آواز آئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا۔ کون روتا ہے؟ اس نے کہا کہ میری بی بی دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عمرؓ گھر پر آئے اور اُم کلثوم (حضرت عمرؓ کی زوجہ تھیں) کو ساتھ لیا۔ بدّو سے اجازت لے کر اُم کلثوم کو خیمہ میں بھیجا۔ تھوڑی دیر کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ اُم کلثوم نے حضرت عمرؓ کو پکارا کہ امیر المومنین! اپنے دوست کو مبارکباد دیجئے۔ امیر المومنین کا لفظ سن کر بدّو چونک پڑا اور مودّب ہو بیٹھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ نہیں کچھ خیال نہ کرو۔ کل میرے پاس آنا۔ میں اس بچہ کی تنخواہ مقرر کر دوں گا۔"

عبدالرحمٰنؓ بن عوف کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کو میرے مکان پر آئے۔ میں نے کہا۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھ کو بلا لیا ہوتا۔ فرمایا کہ ابھی مجھ کو معلوم ہوا کہ شہر سے باہر ایک قافلہ اُترا ہے۔ لوگ تھکے ماندے ہوں گے۔ آؤ ہم تم چل کر پہرہ دیں۔ چنانچہ دونوں صاحب گئے اور رات بھر پہرہ دیتے رہے۔

جس سال عرب میں قحط پڑا حضرت عمرؓ کی عجیب حالت ہوئی۔ جب تک قحط رہا گوشت، گھی، مچھلی، غرض کوئی لذیذ چیز نہ کھائی۔ نہایت خضوع سے دعائیں مانگتے تھے۔ کہ "اے خدا! محمدؐ کی اُمت کو میری شامتِ اعمال سے تباہ نہ کرنا"۔ اسلم اُن کے غلام کا بیان ہے کہ قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ کو جو فکر و تردّد رہتا تھا۔ اس سے قیاس کیا جاتا تھا کہ اگر قحط رفع نہ ہوگا تو وہ اسی غم میں تباہ ہو جائیں گے۔ قحط کا جو انتظام حضرت عمرؓ نے کیا تھا اس کو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔

ایک دفعہ ایک بدّو اُن کے پاس آیا اور یہ اشعار پڑھے:۔

یَا عُمَرَ الْخَیْرِ الْجَنَّۃ	اے عمر! لطف اگر ہے تو جنّت کا لطف ہے
اُکْسُ بُنَیَّاتِیْ وَ اُمَّھُنَّہ	میری لڑکیوں کو کپڑے پہنا خدا کی قسم
اُقْسِمُ بِاللہِ لَتَفْعَلَنَّہ	تجھ کو یہ کرنا ہوگا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ "اور میں تمہارا کہنا نہ کروں تو کیا ہوگا؟" بدّو نے کہا:۔

تَکُوْنُ عَنْ حَالِیْ لَتُسْئَلَنَّہ	تجھ سے قیامت کے دن میری نسبت سوال
وَالْوَاقِفُ الْمَسْئُوْلُ بَیْنَھُنَّہ	ہوگا اور تو ہکا بکا رہ جائے گا۔ پھر یا دوزخ
اِمَّا اِلٰی نَارٍ وَّ اِمَّا جَنَّۃٍ	کی طرف یا بہشت کی طرف جانا ہوگا۔

حضرت عمرؓ اس قدر روئے کہ ڈاڑھی تر ہو گئی۔ پھر غلام سے کہا کہ میرا یہ کُرتا اس کو دیدے۔ اس وقت اس کے سوا اور کوئی چیز میرے پاس نہیں۔

سعیدؓ بن یربوع ایک صحابی تھے۔ جن کی آنکھیں جاتی رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اُن سے کہا کہ آپ جمعہ میں کیوں نہیں آتے۔ انہوں نے کہا۔ "میرے پاس آدمی نہیں کہ مجھ کو راستہ بتائے"۔ حضرت عمرؓ نے ایک آدمی مقرر کر دیا۔ جو ہمیشہ اُن کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ (الفاروق)

مولانا امین احسن اصلاحی کا مکتوب

مدیرِ "فاران" کے نام

رحمان پورہ - اچھرہ لاہور

مکرمی و محبی - السلام علیکم و رحمۃ اللہ - آپ کا تحفہ[1] اور آپ کا گرامی نامہ دونوں چیزیں موصول ہو گئی تھیں۔ مگر میں مختلف مصروفیتوں کے سبب سے ان کی رسید نہ بھیج سکا جس کی سخت شرمندگی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جماعت کا امیر بن کر اب میں صرف ضابطہ کا آدمی رہ گیا ہوں۔ ضابطوں کی خانہ پری سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ دوستوں اور عزیزوں سے متعلق حقوق و فرائض کو کما حقہ ادا کر سکوں۔ احباب اور اعزا کے خطوط آتے ہیں، اُن کو اہتمام سے میز پر رکھ لیتا ہوں کہ کسی اطمینان کے وقت اُن کا جواب لکھوں گا لیکن نہ وہ اطمینان کی ساعت میسر آتی اور نہ جواب لکھا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب ان احباب اور عزیزوں سے میں تقریباً بالکل ہی منقطع ہو گیا ہوں۔ جن سے تعلق کا واحد ذریعہ صرف مراسلت رہ گیا تھا۔

آپ کی کتاب کا بیشتر حصہ میں نے فاران میں پڑھ لیا تھا۔ میں ایک مدت سے ارادتاً حج میں ہوں۔ اس وجہ سے جب کوئی چیز حج اور مشاہدات حرمین شریفین سے متعلق میری نظر سے گزرتی ہے تو اس کو ضرور پڑھتا ہوں۔ اور اگر لکھنے والا اچھا ہوتا ہے جیسے کہ آپ ہیں تو گو میرا جسم پاکستان میں قید ہے لیکن میرا دل لکھنے والے کے ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ "ما سرتم مسیراً ولا قطعتم وادیاً الا کانوا معکم" کے مصداق میں اس کے پیچھے پیچھے ہر وادی سے گزرتا اور ہر خار کی خلش کی لذت محسوس کرتا ہوں۔ یہ بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ آپ کے سفر حج کے سلسلہ کے مضامین پڑھتے ہوئے میں اکثر اپنے جذبات کو ضبط میں نہیں رکھ سکا ہوں۔ بارہا اپنی بدقسمتی پر رو یا ہوں اور آپ کی خوش قسمتی پر رشک کیا ہے۔ آپ کے یہ مضامین پڑھ کر میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ اللہ نے چاہا تو بے سرو سامانی کے باوجود اس سال حج کی سعادت حاصل کر کے رہوں گا۔ لیکن اندازہ کے خلاف بعض ضروری ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل نہ ہو سکی۔ اس وجہ سے اس سال یہ ارمان پورا نہ ہو سکا حدیث میں آیا ہے کہ کسی نیکی پر اُکسانے والے کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا اُس نیکی کرنے والے کو۔ میں اپنے قلب پر اُن مضامین کا جو اثر محسوس کرتا ہوں اور میرے شوق کو اُن سے جو تحریک ہوئی ہے اگر وہی اثر اُن سے دوسروں نے بھی لیا تو انشاء اللہ اس کتاب کی بدولت آپ کو ہزاروں لاکھوں حجوں کا ثواب ملیگا۔ مجھے آپ کی وہ غزل[2] کبھی نہیں بھولتی جس کا ایک مصرعہ ہے ع

بعد مکّہ[3] کے مدینہ کا سفر کیا کہنا

میں اس مصرعہ کو تنہائی میں عالم شوق میں اکثر گنگناتا رہتا ہوں۔ اور جب گنگناتا ہوں تو اپنے آپ کو عالم تصور میں

---

[1] "کاروانِ حجاز"۔ [2] پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا ۔ بعد مکّہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا!

مکہ اور مدینہ کے درمیان کی منزلوں میں سفر کرتا ہوا پاتا ہوں۔

یہ تو آپ کی کتاب (کاروانِ حجاز) کا ذکر خیر تھا اب چند حرف ان شبہات سے متعلق عرض کروں گا جن کا آپ نے ذکر فرمایا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے کسی شخص کی خدمت میں پھولوں اور خوشبو کا تحفہ ایک بہترین تحفہ ہے۔ یہاں تک کہ بعض حدیثوں میں اس بات کی تاکید ہے کہ اگر کسی شخص کی خدمت میں پھول یا خوشبو کی پیشکش کی جائے تو اس کیلئے یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ وہ اس کو واپس کرے۔ مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ "من عرض علیہ ریحان فلا یردہ فانہ خفیف المحمل طیب الریح"۔ جس کی خدمت میں پھول پیش کئے جائیں وہ ان کو واپس نہ کرے کیونکہ یہ شئے ہلکی پھلکی ہوتی ہے اور اس کی خوشبو لطیف ہوتی ہے۔ اسی طرح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ "ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یرد الطیب" حضورؐ کی خدمت میں اگر کبھی کوئی خوشبو کی قسم کی چیز پیش کی جاتی تو حضورؐ اس کو رد نہ فرماتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی دوست یا عزیز یا مہمان کی خدمت میں پھولوں کی پیش کش ایک اچھی پیش کش ہے جو اسلام میں پسند کی گئی ہے، اگر یہ بات ثابت ہے تو پھر اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ آپ یہ پیش کش الگ الگ پھولوں کی شکل میں کرتے ہیں یا کسی گلدستہ کی شکل میں۔ یا ہاروں کی شکل میں۔ ان میں سے کوئی سی شکل بھی آپ اپنے ذاتی ذوق یا اپنے ملک کی روایات کے مطابق اختیار کر سکتے ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح اس بات میں بھی خرابی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا کہ کسی شخص کی خدمت میں یہ تحفے اس کے استقبال کے موقع پر پیش کئے جائیں۔ بلکہ میرے خیال میں تو ان چیزوں کے پیش کرنے کا بہترین موقع کسی کے استقبال ہی کا موقع ہے۔ آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ صحابہؓ اور تابعین کے زمانے میں کسی کے استقبال کے موقع پر پھولوں کے نثار کرنے یا ہار پہنانے کے رواج کا ہمیں علم نہیں ہے۔ لیکن اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ چیز شریعت میں ناجائز یا ناپسندیدہ تھی۔ بلکہ اس کا سبب محض یہ تھا کہ عرب میں اس کا رواج نہیں تھا۔ ان کے ہاں پھولوں کی نہ کثرت ہی تھی اور نہ ان کے عسکری اور بدویانہ مزاج سے اس چیز کو کچھ ایسی مناسبت ہی تھی۔ وہ ایسے مواقع پر عموماً اپنے عسکری کمال کا مظاہرہ کرتے تھے یا شعر خوانی اور رجز خوانی کرتے تھے۔ جس کی ایک پاکیزہ مثال وہ استقبال ہے، جو انصار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے موقع پر کیا۔ انصار آپؐ کو اسلحہ کے سایہ میں لے کر مدینہ میں داخل ہوئے اور بچیوں نے آپ کے استقبال میں نہایت ہی مناسب موقع اشعار پڑھے۔ اور حضورؐ نے ان چیزوں کو پسند فرمایا۔ بعد کے زمانوں میں جب اہلِ عجم سے تعلقات قائم ہوئے۔ تو اہلِ عرب کے ان سادہ طریقوں کے اندر ان کے بھی تکلفات بھی شامل ہونے شروع ہو گئے اور صحابہؓ نے ان میں سے بھی ان ساری چیزوں کو گوارا کیا جن میں کوئی شرعی یا اخلاقی خرابی نہیں تھی۔ چنانچہ سفرِ شام کے موقع پر حضرت عمرؓ جب اذرعات تشریف لے گئے ہیں تو وہاں کے غیر مسلموں نے اپنی روایات کے مطابق ان کا استقبال کرنا چاہا۔ جس میں غالباً باجہ بھی شامل تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو روکنا چاہا۔ لیکن ان کے گورنر نے جب اس کی مصلحت سمجھائی تو حضرت عمرؓ نے نہایت خوبصورت انداز میں اس کی اجازت دے دی۔

ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کسی خلاف شرع بات کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے پہلے اسلامی سادگی کے پیش نظر یا اپنے مزاج کے خلاف پا کر ایک چیز کو روکا ہوگا۔ لیکن جب دیکھا ہوگا کہ شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے اور سیاسی مصلحت اس کی متقاضی ہے تو انہوں نے اس کی اجازت دے دی ہو گی۔ یہی اصول اس قسم کے امور میں بھی ملحوظ

رکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی چیز ہماری روایات میں داخل ہے اور اس میں کوئی بات خلاف شرع نہیں ہے تو ہمیں خواہ مخواہ اس پر معترض نہیں ہونا چاہیئے۔ اور یہاں تو جو معاملہ زیر بحث ہے اُس میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ نہ صرف یہ کہ کوئی بات خلاف شرع نظر نہیں آتی بلکہ شریعت کی رُو سے پسندیدہ معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا سوال آپ نے سپاسنامہ سے متعلق کیا ہے۔ اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اگر اس سے مقصود محض کسی امیر کبیر کی مداحی ہو تو شریعت میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اگر مقصود یہ ہو کہ کسی کے سامنے اپنے مطالبات یا اپنے مقاصد یا اپنے خدمات اجتماعی طور پر پیش کئے جائیں اور اس کا ردعمل بھی پبلک طور پر معلوم کیا جائے۔ تو یہ ایک تمدنی۔ اجتماعی اور سیاسی ضرورت ہے اور میں اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ اس میں جو چیز لحاظ رکھنے کی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اگر مخاطب کی خدمات کے حوالے دینے کی ضرورت پیش آئے تو اس کی صرف اُنہی خدمات کا حوالہ دیا جائے جو واقعی خدمات ہیں اور جن کے ذکر سے توقع ہو کہ لوگوں کے اندر اُن کی اچھی مثالوں کی پیروی کا شوق پیدا ہوگا۔ خصوصیت کے ساتھ اس امر کا لحاظ ضروری ہے کہ کسی تنگ ظرف اور مدح پسند آدمی کو ہرگز اس کا اہل نہ سمجھا جائے۔ ورنہ اس سے مختلف قسم کے شخصی اور سماجی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ کسی شخص کی ان واقعی خدمات کا ذکر جو لوگوں کے سامنے موجود ہیں۔ یہ وہ مداحی نہیں ہے جو شریعت میں ممنوع ہے۔ امام نوویؒ نے مسلم کی شرح میں بھی اور ریاض الصالحین میں بھی جائز و ناجائز تعریف میں یہی فرق بیان کیا ہے۔ جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اور شخص شخص کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس کی طرف بھی انہوں نے اشارہ کیا ہے۔ میں اس فرق کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ عالی ظرف اور اولوالعزم لوگوں کی واقعی خدمات کے اعتراف میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ وہ کسی فتنہ میں پڑ جائیں گے۔ اور اس فائدہ کی توقع ہے کہ دوسروں کو اُن کی مثال کی پیروی کا شوق ہوگا۔ امام نوویؒ نے متعدد ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے صحابہ میں سے کسی کی کسی اچھی بات یا اُن کی کسی خدمت کی تعریف فرمائی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور کے بعد متعدد بار حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کی اور حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی تنہائی میں بھی اور پبلک میں بھی تعریفیں کی ہیں۔ اس سے بڑھ کر تعریف کا فقرہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ "اتعبت الخلفاء بعدک (آپ نے اپنے بعد آنے والے اپنے جانشینوں کو اپنی تقلید سے عاجز کر دیا) روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو دی۔ اور انہی الفاظ میں یہی داد حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفلہ اور دون ہمت لوگوں کی خلاف واقعہ تعریف تو بلاشبہ ایک فتنہ ہے۔ اور کسی حال میں بھی یہ چیز جائز نہیں ہے اور ممانعت کی حدیثیں اسی طرح کے لوگوں کی تعریف سے متعلق ہیں۔ لیکن اہل آدمیوں کی سچی خدمات کے اعتراف و بیان میں کوئی ہرج نہیں ہے

مولانا مودودی مدظلہ کی رہائی پر آپ نے مجھے جو مبارکباد دی ہے اس کیلئے شکریہ قبول فرمایئے۔ فی الواقع اُن کی رہائی پر ان کے اعزا، جماعت اسلامی اور ساری قوم سے زیادہ میں مبارکباد کا مستحق ہوں۔ کیونکہ اب توقع ہے کہ میں امارت کی ذمہ داریوں سے انشاء اللہ جلد سبکدوش ہو جاؤں گا۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ یہ بوجھ میرے لئے کتنا بھاری تھا۔

آپ کے سیرت نمبر کے لئے میں اپنے وعدہ پر قائم ہوں۔ آپ نکالنے سے دو مہینہ پہلے مجھے یاد دہانی کر دیجئے گا اور عنوان بھی خود ہی تجویز کر دیجئے گا۔ اس سے مجھے بڑی آسانی ہوگی۔ والسلام

امین احسن اصلاحی
۸۔ جون ۱۹۵۵ء

[فاضل مکتوب نگار نے دلائل و براہین کے ساتھ اپنی بات کو پیش فرمایا ہے - موصوف کے خیالات میں سلجھاؤ پایا جاتا ہے اور اس دور تاویل و تذبذب میں یہ بہت بڑی بات ہے - مجھے اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ کسی کے نیک کام کی واقعی تعریف کی جاسکتی ہے - تنہائی میں بھی اور مجمع میں بھی ! مگر سپاسنامہ کی صورت اس سے مختلف ہے - سپاسنامے جن جلسوں اور پارٹیوں میں دیئے جاتے ہیں - اُن میں ایک شخص کو پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خدمات کو جلسۂ عام میں سراہا جائے گا جس کے لئے "سپاسنامہ" تیار کیا جا رہا ہے - اس علم و اطلاع کے بعد اس قسم کی تقریبات میں شرکت بہرحال محلِ نظر ہے !

مولانا امین احسن اصلاحی نے فرمایا ہے کہ اولوالعزم لوگوں کیلئے اُن کی واقعی خدمات کے اعتراف سے فتنہ میں پڑجانے کا اندیشہ نہیں ہے - مگر میں عرض کرتا ہوں کہ ایک تقریب صرف اس لئے منعقد کی جائے کہ اس میں کسی شخص کی خدمات کا اعتراف کیا جائے گا - تو اس شخص کا اس علم و اطلاع کے بعد اس تقریب کی دعوت قبول کرنا اپنی تمام اولوالعزمی اور بے نفسی کے باوجود فتنہ کے اندیشہ سے خالی نہیں ہے !

تنہائی میں یا جلسہ میں کسی کی خدمات کا اعتراف اتفاقیہ طور پر اور بات ہے اور خاص طور سے اعتراف خدمات کے لئے ایک تقریب کا منعقد ہونا دوسری چیز ہے - سپاسناموں اور ایڈریسوں کی بدعت ہی تہذیب مغرب کی شوخی فکر کا مظہر ہے !

اگر اس قسم کی "تقریبوں" سے دینی تحریک کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہو تو پھر سپاسنامے انتہائی محتاط انداز میں مرتب ہونے چاہئیں کہ کسی شخص کی مدح اور اعتراف خدمات کم سے کم اور اصل تحریک کا تذکرہ زاید سے زاید ہو - مولانا موصوف کی اس رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ :-

"کسی کے سامنے اپنے مطالبات یا اپنے مقاصد یا اپنے جذبات اجتماعی طور پر پیش کئے جائیں اور اس کا ردعمل بھی پبلک طور پر معلوم کیا جائے تو یہ ایک تمدنی، اجتماعی اور سیاسی ضرورت ہے - میں اس کو جائز سمجھتا ہوں ......"]

(م - ق)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

عبدالقیوم خاں ایک زمانہ میں "مردِ آہن" کہلاتے تھے مگر اب تو انقلاب زمانہ نے انھیں برگِ گل اور قطرۂ شبنم بنا دیا ہے۔ سرحد میں جو دستور ساز اسمبلی کے انتخابات حال ہی میں ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں "سابق مردِ آہن" نے جمہوریت اور حق و انصاف کی کس مظلومانہ انداز میں دہائی دی ہے اور جب سرحد میں وہ ڈکٹیٹر بنے ہوئے تھے اُس وقت دھونس اور دھاندلی کا وہ کونسا حربہ تھا جو اس فولادی انسان نے استعمال نہیں کیا۔ پاکستان کے منصبِ اقتدار کی کرسیاں نہ جانے کس چیز کی بنی ہوئی ہیں کہ اُن پر بیٹھ کر آدمی کے حافظہ سے جمہوریت اور حق و انصاف کے تمام تقاضے اور مطالبے یکسر محو ہو جاتے ہیں۔۔۔ مگر ادھر کرسی چھنی اور اُدھر وہ مٹے ہوئے نقوش پھر اُبھر آئے!

پاکستان کے محکمۂ سائنس کو چاہیے کہ اُن کرسیوں کا جن پر ہمارے اربابِ اقتدار جلوہ افروز رہتے ہیں کیمیاوی تجزیہ کر کے دیکھے۔ شاید کوئی قابلِ قدر انکشاف ہو سکے!

پہلے مُرغی پیدا ہوئی یا انڈا؟ پہلے قوم پیدا ہوئی یا لیڈر؟ پہلے سیاست پیدا ہوئی یا چالبازی؟ پہلے "اپوا" پیدا ہوئی یا آزادی و بے حجابی؟ پہلے اخبار پیدا ہوئے یا بلیک میلنگ؟ پہلے شاعر پیدا ہوئے یا نظارہ بازی؟ پہلے اُجالا پیدا ہوا یا اندھیرا؟ پہلے پانی پیدا ہوا یا پیاس؟ جو بھی ان سوالات کا جواب دے سکے وہ میدان میں آئے۔

صوبۂ سندھ کی سیاست کے اُتار چڑھاؤ کا کیا کہنا۔ پارہ اتنا مضطرب اور بے آرام نہیں ہوتا جتنی مضطرب الحال سندھ کی پالیٹکس ہے! بڑے بڑوں کی عزت آبرو کی سندھ شریف میں خیر نہیں۔ ہر آن ایک نئی سیاسی شعبدہ گری۔ ہر لحظہ ایک نئی تجلّی کا ظہور۔ اور تجلّی بھی صوفیائے کرام کے بقول تکرار نہیں ہوتی۔ اس لئے سندھ کی سیاست کی ہر جلوہ گری اپنی جگہ اچھوتی اور بے مثل ہوتی ہے۔ کھوڑو اور راشدی جیسے جہاندیدہ لیڈر جہاں جمع ہو جائیں وہاں جو نہ ہو جائے تھوڑا ہے۔ ان دونوں میں ہر شخص اپنی جگہ آپ اپنا جواب ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں یہ جما دیں۔ رائی کا پربت یہ بنا دیں۔ آسمان سے تارے یہ حضرات توڑ لائیں۔ کونسا فن ہے جو ان بزرگوں کو نہیں آتا۔ حیرت اس پر ہے کہ اب تک کسی خانہ ساز انجمن نے لیڈر کو "ناخدائے ملت"۔ "غمخوارِ قوم"۔ "فخرِ اسلام" وغیرہ وغیرہ خطابات دینے کی نہیں سوجھی! اسے کہتے ہیں قدر ناشناسی اور شاعری کی زبان میں سکوتِ سخن شناس!

سہروردی صاحب نے سُنا ہے کہ ایک سوال کے جواب میں کسی نامہ نگار سے "شٹ اپ" فرمایا۔ صاحب! اس کو غنیمت سمجھئے اور کہیں تشریف آپ "گیٹ آؤٹ" فرما دیتے۔۔۔۔۔۔ تو۔۔۔۔۔۔ مگر سوال و جواب کے بھی تو کچھ آداب ہوتے ہیں۔ جی ہاں۔ ہوتے ہیں۔ کس کے یہاں؟ ہم تم جیسے بے ریا لوگوں کے یہاں! ان بڑے لوگوں کے آداب کچھ اور ہیں۔ حکومت کا نشہ شراب کے نشے سے تیز ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں یہ دونوں نشے مل جائیں۔ وہاں آداب و اخلاق کا اونٹ جس کروٹ بھی بیٹھ جائے!

ہماری نظر میں

سنتِ خیر الانام

"سنتِ خیر الانام" تالیف۔ صاحب زادہ محمد کرم شاہ۔ ضخامت ۲۷۸ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنہ۔
ملنے کا پتہ:- صوفی خدا بخش سیکرٹری مرکزی جند اللہ بھیرہ (پنجاب)

فتنۂ انکارِ سنت پر تحلیلی و تنقیدی نظر۔ منکرین سنت کی غلط فہمیوں کا ازالہ۔ ان کے شبہات کا رد اور اعتراضات کا جواب ۔ قرآن و سنت کا باہمی ربط ۔ اتباعِ سنت کے عقلی و نقلی دلائل ۔ تدوینِ احادیث کی تاریخ ۔ اور محدثین کرام کے مختصر سوانح حیات ۔ یہ ہے اس کتاب کے مضامین کا خلاصہ! اپنے موضوع پر "سنتِ خیر الانام" بڑے معرکہ کی کتاب ہے، فاضل مؤلف نے شائستگی، متانت اور سنجیدگی کی حدود میں رہ کر "فتنۂ انکار حدیث" کا رد فرمایا ہے۔ روایت کے ساتھ درایت اور نقل کے ساتھ عقلیات سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

صاحبزادہ محمد کرم شاہ صاحب ارشاد و تصوف اور علم و عرفان کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جامعہ آزہر کے فاضل ہیں اور ساتھ ہی گریجوایٹ بھی ہیں۔ تفسیر و حدیث اور فقہ کے ساتھ ساتھ تاریخ پر بھی اُن کی نگاہ ہے۔ فتنۂ انکار حدیث کے پس منظر سے بھی وہ اچھی طرح باخبر ہیں۔ استدلال اور علمی طور پر جرح و تعدیل کا فن بھی موصوف کو آتا ہے۔ جذبِ صادق بھی ہے اور محبتِ رسولؐ تو ایک ایک سطر سے نمایاں ہے۔ ان چیزوں نے مل جُل کر اس کتاب کو بہت مفید اور کار آمد بنا دیا ہے۔

صفحہ ۷ پر کاتب صاحب نے "لب کشائی" کو "لبکشائی" لکھا ہے۔ صفحہ ۱۲۲ "اپنے کیے پر ندامت کا احساس کیا کم ہے"۔ "کیے" کی جگہ "کتے" کتابت کی فاش غلطی ہے۔ (صفحہ ۲۲) "..... اس کے عشق و محبت اور جلال و احترام کی محرابوں کے مصنوعی صنم پاش پاش ہو جاتے ہیں"۔ تحریر میں آورد و تکلف کا یہ رنگ بھی کہیں کہیں پیدا ہو گیا ہے (صفحہ ۱۳۰) "..... پھر بدک کر اٹھتے"۔ "بدکنے" کی جگہ "چونکنے" کا یہاں محل تھا۔

منکرین حدیث جن احادیث پر اعتراضات وارد کیا کرتے ہیں۔ اُن کے جوابات بہت خوب دیئے گئے ہیں۔ مگر کسی کسی جگہ زیادہ عقلی اور مدلل جواب کی ضرورت تھی۔ کوئی شک نہیں کہ اپنے موضوع پر "سنتِ خیر الانام" قابل قدر کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے مؤلف کو دارین میں اجر عطا فرمائے۔

صحیح قرآنی فیصلے

"صحیح قرآنی فیصلے" تالیف:- مولانا فضل احمد غزنوی۔ ضخامت ۳۲۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:- ادارہ تبلیغ الاسلام فضل لیتھو اینڈ الیکٹرک پرنٹنگ پریس گاڑی احاطہ حیدر آباد سندھ

یہ کتاب پرویز صاحب کی تصنیف "قرآنی فیصلے" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ لکھنے والے کی نیت نیک ہے۔ اور مدافعتِ دین کے جذبہ نے فاضل مؤلف سے یہ کتاب لکھوائی ہے۔ مسٹر پرویز نے قرآنی آیتوں کی شرح و ترجمانی میں جو تحریف و تلبیس کی ہے۔ اس کی قلعی بھی خوب خوب کھولی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ طنز و تشنیع کی بھرمار نے کتاب کی

احادیث کو مجروح کر دیا ہے۔ اور کہیں کہیں تو زبان اتنی درشت اور لہجہ اس قدر تلخ ہو گیا ہے کہ کتاب کی سنجیدگی مجروح ہو جاتی ہے۔

مولانا فضل احمد غزنوی اگر ہمارا مشورہ قبول کر سکیں تو اُن کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اللہ کے فضل سے صاحبِ علم بھی ہیں اور صاحبِ دولت بھی۔ وہ اس کام کے لئے یا تو کوئی ادارہ قائم کریں یا کسی ایسے اہلِ قلم کی خدمات حاصل فرمائیں جس کو اظہار و بیان پر قدرت ہو۔ معلومات اور دلائل غزنوی صاحب فراہم کر کے دیں۔ اور اُن کو وہ ادیب ادب و انشار کا موزوں جامہ پہنائیں۔ یہ کام ہو جائے تو مولانا غزنوی صاحب کی دولت اپنا فرض انجام دے اور ان تالیفات اور تصنیف کو کتابت و طباعت کے حُسن و اہتمام کے ساتھ چھپوا کر منظرِ عام پر لائیں۔ اس طرح "فتنۂ انکارِ حدیث" کی روک تھام کی خدمت زیادہ مؤثر انداز میں ہو سکے گی۔

صلوٰۃ الرسول

"صلوٰۃ الرسول"۔ تالیف:۔ حکیم محمد صادق سیالکوٹی۔ ضخامت ۴۳۲ صفحات۔ قیمت مجلد تین روپے۔ غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے۔ محصول ڈاک آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ کتاب و سنت۔ سیالکوٹ شہر۔

نماز کو اچھی طرح تعدیلِ ارکان کے ساتھ پڑھنے کا حکم ــــ پانی کے احکام ــــ نجاستوں کی تطہیر کا بیان ــــ غسلِ جنابت کے احکام ــــ مسواک، وضو کا بیان ــــ موزوں پر مسح کرنے کا بیان ــــ غسل مسنون کی تفصیل ــــ نماز کے فضائل ــــ اذان کا بیان ــــ مساجد کا بیان ــــ نماز کے اوصاف و قواعد ــــ سجدۂ سہو ــــ نماز باجماعت ــــ امامت، نماز تہجد، تراویح ـ نماز جمعہ ـ صلوٰۃ قصر ـ نماز جنازہ ـ ضحیٰ، اشراق اور نمازِ استسقاء کا بیان۔ متفرق اذکار اور دعائیں۔

اس کتاب کے یہ اہم عنوانات ہیں۔ جن سے اس کتاب کی افادیت اور اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اپنے موضوع پر اتنی جامع اور مدلل یہ پہلی کتاب نگاہ سے گزری۔ حکیم مولانا محمد صادق صاحب اہلِ حدیث مسلک رکھتے ہیں۔ اس لئے مسائل میں اس مسلک کی زیادہ تر ترجمانی کی گئی ہے۔ مگر تشدّد اور خشونت کی جگہ نرمی، رفق اور وسعتِ نظر پائی جاتی ہے۔ اہلِ حدیث کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ قیاس و اجتہاد کے مقابلہ میں اصل احادیث کے ظاہر معانی کو ترجیح دیتے ہیں۔ احناف اپنے مسلک کو زیادہ صحیح اور اقرب الی السنۃ سمجھتے ہیں تو اُن کو چاہیئے کہ "صلوٰۃ الرسول" جیسی سنجیدہ اور متاثر کرنے والی کتابوں کو پڑھ کر اپنے مسلک کے مطابق پڑھی جانے والی نماز پر صحیح حدیثوں سے دلیلیں لائیں۔

"صلوٰۃ الرسول" کی تالیف میں خشیتِ الٰہی اور اطاعتِ رسُول کا جذبہ شریک کار رہا ہے۔ کتابت و طباعت کا بھی خوب اہتمام کیا گیا ہے۔ زبان بھی سادہ اور عام فہم ہے۔ صفحہ ۳۹۳ پر "معوذتین" کو "معوذات" لکھا ہے۔ قرآن کی آخری سورتیں دو ہیں۔ اس لئے جمع (معوذات) نہیں تثنیہ (معوذتین) استعمال ہونا چاہیئے۔

تازیانے۔ ترجمہ۔ المنبہات

"تازیانے" "ترجمہ" المنبہات"۔ تالیف:۔ زین القضاۃ احمد بن محمد الحجی۔ ترجمانی۔ ابوالبیان حماد۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات۔ مجلد۔ خوبصورت گرد پوش کیساتھ قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب خانہ آرام باغ۔ کراچی۔

"المنبہات" (علی الاستعداد لیوم المعاد) ہندوستان میں بارہا چھپی ہے اور "منبہات ابن حجر عسقلانی" کے

نام سے چھپی ہے۔ مگر یہ کسی کا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تالیف نہیں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کتاب کے مؤلف اور جامع شہاب الدین احمد ابن حجر مکی ہیتمی ہیں۔ مگر یہ قیاس بھی غلط نکلا۔ حقیقت میں یہ کتاب زین القضاۃ احمد بن محمد الحجی کی تالیف ہے۔ اس کتاب میں احادیث، صحابہ کرام اور بزرگان دین کے ارشادات اور حکماء کے اقوال جمع کئے گئے ہیں۔ جو حکمت و موعظت سے معمور ہیں۔ اس کتاب کے مؤلف فن حدیث کے ناقد نہیں معلوم ہوتے۔ انہوں نے عبرت و موعظت کے خیال سے احادیث، آثار و اقوال کو جمع کیا ہے اور کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر یہ نہایت کامیاب اور مفید تالیف ہے۔

جناب مولانا ابو البیان حماد صاحب نے اس کتاب کی ترجمانی کی ہے اور حقیقت میں ترجمانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ صفحہ ۲۲۰ پر "والعجب من الزہاد" کی ترجمانی "زاہدان شب زندہ دار" میں "زندہ دار" کا اضافہ کھٹکا۔ "غیظ" کا املا "غیض" دیکھ کر تعجب ہوا۔۔۔ بہرحال اس کتاب کی ایک ایک سطر مسلمانوں کی غیرت کے لئے "تازیانہ" ہے۔ کتاب کا اصل نام "منبہات" اسم بامسمیٰ ہے۔ یہ واقعی ایک چونکا دینے والی تالیف ہے۔ اس کے مطالعہ سے قلب میں خشیت الٰہی کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔

دفتر بے معنی

"دفتر بے معنی" از:۔ نعیم صدیقی۔ ضخامت ۲۴۴ صفحات۔ قیمت مجلد (رنگین گردپوش کے ساتھ) دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تعمیر انسانیت ۲۵۔ گوجر گلی۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

کتاب کا نام "دفتر بے معنی" مگر ایک ایک لفظ نہ صرف یہ کہ "بامعنی" بلکہ سیاست و تہذیب اور معاشرت و تمدن کے اسرار کا پردہ کشا۔ قصر و ایوان کی سیاست پر بھرپور طنز۔ سوسائیٹیوں کی کمزوریوں کی طرف نازک اشارے۔ رمز و اشاریت کا دفتر بے پایاں۔ شگفتہ انداز نگارش۔ دلچسپ طرز تحریر۔ نہ جانے اس ایک ہی مرقع میں کس کس کی تصویر کھینچ دی۔ اور کس کس کو آئینہ دکھا دیا۔ کتاب پڑھنے میں ہلکی پھلکی مگر معانی و مطالب کا کوہ گراں۔ ادب و انشاء کی ذہنی پیشکش!

> "ہم نے قوم کی "اسلام زدگی" کا لحاظ کرتے ہوئے یہ منصوبہ بھی اختیار کیا کہ اسلام کی نئی تعبیر کی جائے اور جو کچھ ہم چاہتے ہیں اسی کو اسلام کے لیبل سے سامنے لایا جائے۔ چنانچہ چند اخبار نویسوں، مصنفوں اور ٹوٹے پھوٹے مولویوں کی مدد سے اسلام کا ایک نیا ایڈیشن بھی تیار کر لیا گیا۔ پھر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ ملاؤں کا اسلام تو بالکل جعلی ہے۔ اصلی اسلام تو ہمارے ہی سینوں میں محفوظ تھا۔ وہ جسے لینا ہو ہم سے لے۔۔۔۔۔" (صفحہ ۱۰۰)

اس اقتباس سے اندازہ لگا ہے کہ اس کتاب میں کتنے نشتر، کتنی پھلجھڑیاں، کتنی مسکراہٹیں اور کتنی چٹکیاں سمو دی گئی ہیں۔

یاد رفتگاں

"یاد رفتگاں" از:۔ سید سلیمان ندوی مرحوم۔ ضخامت ۵۱۹ صفحات۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبۃ الشرق۔ آرام باغ۔ کراچی۔

اس کتاب میں دس بیس نہیں ایک سو سینتیس نامور شخصیتوں کی موت پر اشک فشانی کی گئی ہے۔ پہلا مضمون علامہ شبلی نعمانی کے سانحۂ رحلت پر ہے جو ۱۸۔ نومبر ۱۹۱۴ء کو لکھا گیا تھا۔ اور آخری نگارش غم کا تعلق مفتی کفایت اللہ مرحوم کی موت سے ہے۔ جو ۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۲ء کو ثبت قرطاس ہوئی ہے۔ "وفیات" سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا خاص موضوع رہا ہے۔ ذاتی اور شخصی تعلقات کی لکیروں سے سیرت و کردار کا خاکہ مرتب کرنا یہ فن اردو زبان میں غالباً سید صاحب مرحوم کی ایجاد ہے۔ یہ کتاب مرثیہ۔ نوحہ اور غم نامہ بھی ہے۔ اور ساتھ ہی علم و فضل اور سیاست و معاشرت کی چالیس سالہ تاریخ بھی ہے۔

"آہ مولانا حمید الدین!"

"الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن" (مفسرِ قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ سے بلند ہوئی تھی - حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱- نومبر ۱۹۳۰ء کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا - وہ، جس کے فضل و کمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں - جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضرہ کا معجزہ تھی - عربی کا فاضل یگانہ، انگریزی کا گریجویٹ - زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ - فارسی کا بلبل شیراز - عربی کا سوق عکاظ - ایک شخصیت منفرد - لیکن ایک جہانِ دانش - ایک دنیائے معرفت - ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین مجمع کمال - ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ - علوم عربیہ کا خزانہ - علوم عقلیہ کا ناقد - علوم دینیہ کا ماہر - علوم القرآن کا واقفِ اسرار - قرآن پاک کا دانائے رموز - دنیا کی دولت سے بے نیاز - اہل دنیا سے مستغنی - انسانوں کے رد و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا - گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ - وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآنِ پاک اور صرف قرآنِ پاک کے فہم و تدبر اور درس و تعلیم میں محو ہر شئے سے بیگانہ اور ہر شغل سے ناآشنا تھی ..... " (صفحہ ۱۲۴)

یہ ایک نمونہ ہے "یادِ رفتگان" کے اثر انگیز اندازِ نگارش کا - کتاب معلومات آفریں بھی ہے - اسی کتاب کے ذریعہ یہ بات ہمیں معلوم ہوئی کہ سید حسین مرحوم نے امریکہ سے "نوائے وطن" نام ایک اردو اخبار بھی نکالا - لفظ "نمائندہ" فارسی اخبارات سے لے کر سب سے پہلے مولوی وحید الدین سلیم نے اردو زبان کو دیا ـــــ مولانا برکات احمد ٹونکی کی تاریخ وفات کتنی برجستہ بلکہ الہامی ہے ـــ رحمۃ اللہ و برکاتہ (۱۳۴۷ھ)

مولانا سجاد (نائب امیر شریعت بہار) پر چند جملے کس قیامت کے لکھ دیئے ہیں:-

"اُن کی تواضع میں بلندی - سادگی میں بناؤ - اور خاموشی میں گویائی تھی - وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے - پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے - وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے - کہتے کم کرتے زیادہ تھے - اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ "راہ" اور "منزل" کے فرق کو کبھی فراموش نہیں کیا ......"

مولانا ابوبکر محمد شیث جون پوری کا کردار ایک جملہ میں بیان کر دیا -

"وہ اپنے علم و عمل میں پہاڑ اور اخلاق و کرم میں بہتے پانی کی طرح تھے"

صفحہ ۸۹ پر "طالع" کی جگہ "تابع" اور صفحہ ۲۷۴ پر "مباہات" کی جگہ "مباحات" چھپ گیا - یہ کتابت کی غلطی ہے - سید صاحب مرحوم نے نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل مانک پوری کی غزلوں کا جو انتخاب دیا ہے - اس میں حیرت ہے کہ یہ مطلع جو حاصلِ غزل ہے کیسے چھوٹ گیا ؎

وہ اس ادا سے آج پئے امتحاں چلے ۔۔۔ فتنوں نے پاؤں چوم کے پوچھا کہاں چلے

کتاب پر مقدمہ سید ابوعاصم صاحب ایڈوکیٹ نے لکھا ہے جو شگفتہ اور جاندار ہے - ابوعاصم صاحب نے مضمون نگاری کی مشق کو جاری رکھا تو وہ اردو ادب کو یقیناً کچھ دے سکیں گے - "افسوس ہے کہ "یادِ رفتگاں" کا مصنف بھی جلنے والوں میں جا ملا -

رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ۔ رہے نام اللہ کا۔

سلیمان نمبر معارف

"معارف۔ سلیمان نمبر"۔ مرتبہ:۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔ حجم ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے ملنے کا پتہ:۔ دار المصنفین اعظم گڑھ (یو۔پی۔ ہندوستان)

مجلہ "معارف" کا یہ خاص نمبر علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے فضائل و کمالات، سیرت و سوانح، علمی و دینی کارناموں اور دوسرے متفرق مضامین پر مشتمل ہے۔ ایک دو مضمون قدرے گنجلک اور بھرتی کے ہیں ورنہ باقی تمام مضامین ہر اعتبار سے قابل قدر اور بلند پایہ ہیں۔ اتنے مشہور، مشاق اور بلند مرتبت مضمون نگار ہر رسالہ کو کہاں میسّر آتے ہیں۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی کا مضمون کردار نگاری کا قابلِ دید مرقع ہے۔ اس مضمون میں ایک لفظ کھٹکتا ہے:۔

"پھر علماء کی رُسوائی سلاطین کے ہاتھوں تو سُنی تھی۔ طلبہ کے ہاتھوں کبھی سننے میں نہیں آئی تھی"۔ (صفحہ ۳۴۳) یہاں "رسوائی" نہیں "اہانت" کا محل تھا۔

صفحہ ۱۱۶ پر سید صاحب مرحوم کے ایک قطعہ کو مضمون نگار نے "رباعی" لکھا ہے۔ (صفحہ ۳۴۴) "..... اس کے بعد ہی ٹانڈہ میں ایک دینی درگاہ قائم ہوئی"۔ اس مقام کا صحیح نام "ٹنڈو آدم" ہے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب نے بڑے سلیقہ کے ساتھ "سلیمان نمبر" کو مرتب کیا ہے۔ یہ خاص نمبر نہ صرف اردو ادب بلکہ کردار نگاری کی صنعت میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ نظموں میں یحییٰ اعظمی کی نظم جاندار ہے۔ اس قسم کے تاریخی مصرعے۔ "جن کے غم میں ہے خلق بولائی"۔ (۱۳۷۳ھ) "تمنائے ذوسیع جنت محمد سلیمان ندوی (۱۹۵۳ء) معارف جیسے بلند پایہ علمی رسالے کے معیار سے فروتر ہیں۔

سید صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی بلند شخصیت ایک جامع سوانح حیات کی مستحق ہے۔ دیکھئے یہ سعادت کس کے حصہ میں آتی ہے ماتم گساروں اور عقیدت مندوں کی اس بزم میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو نہ پاکر بڑی حیرت ہوئی۔

علی گڑھ نمبر

"علی گڑھ نمبر۔ علی گڑھ میگزین"۔ نگران:۔ رشید احمد صدیقی۔ مینجر:۔ سید ظہیر الدین علوی۔ ایڈیٹر۔ نسیم قریشی۔ ضخامت ۵۰۶ صفحات۔ قیمت پانچ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ علی گڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

مسلم یونیورسٹی کے علمی و ادبی آرگن "علی گڑھ میگزین" کا یہ "علی گڑھ نمبر" نہ صرف کمیت و کیفیت بلکہ صورت و معنی کے لحاظ سے بھی بہت خوب ہے۔ "علی گڑھ تحریک" کو اس جامعیت کے ساتھ آج تک پیش نہیں کیا گیا۔ سر سید احمد خاں مرحوم اور اُن کے اعوان و انصار پر بڑے معرکہ کے مقالے اس شمارے کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ جن میں اعادہ کم سے کم اور جدّت و تنوع زیادہ سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ نظموں کا حصہ بھی خوب سے خوب تر ہے۔ شاعروں اور مضمون نگاروں میں زیادہ تر مشاہیر ہی مشاہیر نظر آتے ہیں۔ اقتباسات کی دو جھلکیاں:۔

"یہی جستجو اور آگے بڑھنے کی کوشش ہے جسے علی گڑھ تحریک کہا جاتا ہے۔ اس میں فتحمندی کے سنگِ میل بھی ہیں اور پسپائی کے نشانات بھی۔ مصلحت آمیز مفاہمتیں بھی ہیں اور نارو اسمجھوتے بھی۔ اور سر سید کی ہمہ گیر اور عظیم الشان شخصیت کی بڑائی اس میں ہے کہ تحریک کے سارے نشیب و فراز ان کے افکار و اعمال میں دیکھے جاسکتے ہیں"۔ (صفحہ ۲۷)

"چراغ علی کا نقطۂ نظر سر سید سے کہیں زیادہ عقلی اور تمدّنی ہے۔ وہ سر سید کے اُن پُرجوش حامیوں میں سے ہیں۔ جو

اختلافی مسائل میں اپنے پیشوا سے بھی زیادہ انتہا پسند ہوجایا کرتے ہیں۔" (صفحہ ۶۰)

صفحہ ۰،۰ پر "صحیفہ نگاری کا لامثال شاہکار" نظر سے گزرا "بے مثال" کی جگہ "لامثال" نامانوس سا معلوم ہوا۔

سرسید مرحوم کی ایک تحریر اس شمارے میں درج ہے:۔

" دینیات میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ہم مجبور ہیں اور دنیوی امور میں مجاز" (صفحہ ۹)

حیرت ہے کہ "فتنۂ انکارِ حدیث" کا سرغنہ پرویز اپنے معتقدات کا جوڑ سرسید مرحوم سے کس طرح ملاتا ہے جبکہ یہ شخص "سنتِ رسولؐ" کی اطاعت ہی کا سرے سے قائل نہیں ہے اور سرسید سنتِ نبویؐ کی اطاعت کے لئے ہر مسلمان کو مجبور سمجھتے ہیں۔

"علی گڑھ نمبر" میں متعدد تصویریں بھی ہیں۔ لکھائی چھپائی خوب سے خوب تر۔ کاغذ چکنا اور سفید ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک نادر پیشکش ہے۔ بعض مضمون نگاروں کے خیالات و عقائد سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مگر مضامین کی علمی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے ــــ!

لکھنؤ کی زبان

"لکھنؤ کی زبان" از:۔ محمد باقر شمس لکھنوی۔ حجم ۲۶۰ صفحات۔ قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ محمد مرتضیٰ منیجر دار التصنیف ۳۰۳ رضویہ کالونی۔ ناظم آباد۔ کراچی۔

جناب محمد باقر شمس لکھنوی کی یہ پہلی تصنیف ہماری نظر سے گزری۔ موصوف ایک گمنام انشاء پرداز ہیں۔ مگر زبان دانی وسعتِ معلومات اور انشاء پردازی میں بعض مشاہیر اہلِ قلم اور تنقید نگاروں سے کوسوں آگے ہیں۔ اُن کے خیالات میں سلجھاؤ، بیان میں زور اور قلم میں شگفتگی ہے ــــ دو نمونے:۔

" لفظوں کی اصلی ساخت کی بقاء لہجہ پر منحصر ہے۔ لفظوں کی تصویر میں بولنے کی طاقت کہاں سے لاؤں جو بتائے کہ لہجہ سے تلفظ کس طرح بدل جاتا ہے۔۔۔۔"

"کون شاہ جہاں آباد؟ اطباء کا یونان۔ شعراء کا اصفہان۔ فقہا کا بغداد۔ محدثین کا بخارا۔ راجگانِ ہند کی حشمت کی یادگار۔ آلِ تیمور کی عظمت کا سرمایہ دار۔ ہندوستان کا دل۔ شاہ جہاں کا بنایا ہوا ارم۔۔۔۔"

اس کتاب میں اس پر زور دیا گیا ہے بلکہ مثالوں کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہر زبان کا ایک مرکز ہوتا ہے اور دلّی اُجڑنے کے بعد لکھنؤ اُردو زبان کا مرکز بن گیا۔ اب:۔

"ہم کو چاہیئے کہ حقائق سے چشم پوشی نہ کریں۔ لکھنؤ کی زبان کو ٹکسالی سمجھیں۔ اسے سیکھیں اور لکھنؤ والوں کے برابر ہوجائیں۔ پھر اسے ترقی دے کر اپنا ایک معیار الگ قائم کردیں اور بجائے لکھنؤ کے کراچی۔ لاہور، پشاور اور ڈھاکہ کو مرکز بنادیں۔۔۔۔" (صفحہ ۹)

فاضل مصنف نے دلّی کے مقابلہ میں لکھنؤ کی زبان اور تہذیب و تمدن کی برتری ثابت کرنے میں پورا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ وہ ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ لکھنؤ زبان کا مرکز بن گیا تھا۔ جس کی تقلید دہلی والوں کو کرنی پڑی۔ انہوں نے ناسخ لکھنوی کے کارناموں کو ایک ایک کرکے گنایا ہے کہ ناسخ نے زبان کو کس کس عنوان سے سنوارا اور غزل کو ترقی دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لکھنؤ کی زبان اور شاعری پر جو اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں شمس صاحب نے تفصیل سے اُن کا جواب دیا ہے!

مثلاً لکھنوی شاعری اور اہل لکھنؤ کے لب ولہجہ پر نسائیت اور زنانہ پن کی پھبتی چست کی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں لائق مصنف نے یہ بتایا ہے کہ اہل لکھنؤ میں کس قدر سپاہیانہ اسپرٹ پائی جاتی تھی۔ اور لکھنؤ نے فنِ سپہ گری میں کتنی ترقی کی تھی ـــ تو جہاں چھوٹے بچوں کو جھنجھنوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے تیغے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کے لئے دی جاتی ہوں۔ وہاں کے لوگوں میں زنانہ پن کیسے آسکتا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ زبان کی نزاکت اور لوچ کو معترضین "نسائیت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو غزل کا خاصّہ ہے! ؂

پائے گا عامیوں کو بھی بہذب نکتہ رس واقفِ آدابِ مجلس باخبر باحس ومس (صفحہ ۳۶)

صفی لکھنوی کے اس شعر میں "باحس ومس" کی غیر شاعرانہ اور نامانوس ترکیب دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ مصنف کو یہ شعر خود حذف کر دینا چاہیئے تھا۔

"ہر باحواس اس کے جواب میں فوراً نہیں کہے گا" (صفحہ ۴۹)

"باحواس" کے مقابلہ میں "ہوشمند" موزوں تر لفظ تھا۔

"اہل دہلی کی زبان پر ہمیشہ بھونڈی لفظیں، بھدی ترکیبیں چڑھی رہیں" (صفحہ ۱۱۷)، یہ مبالغہ ہے۔ چند کرخت لفظوں پر "ہمیشہ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا!

"تمام دُنیا میں محرم کے دس دن تعزیہ داری ہوتی ہے" (صفحہ ۱۵۹) ہم پارسال محرم میں خود مدینہ منورہ میں موجود تھے اور وہاں کوئی علم اور تعزیہ نظر نہیں آیا۔ پورے نجد و حجاز میں کہیں تعزیہ داری سُننے میں نہیں آئی۔

ناسخ کے متروکات اور مستعملات کی جو فہرست دی ہے۔ اس میں "جہاں تہاں" (صفحہ ۱۹۶) کو ناسخ نے حیرت ہے کہ متروک قرار دے دیا۔ حالانکہ ان لفظوں میں بلا کی نغمگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ ناسخ کی یہ متروک ترکیب (جہاں تہاں) آج افسانوی ادب میں استعمال کی جا رہی ہے۔

لکھنؤ نے بلاشبہ زبان وادب کو سنوارا ہے۔ لکھنؤ اسکول کی خدمات آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن ہیں۔ مگر یہ مبالغہ ہے کہ اُردو زبان کی مرکزیت سمٹ سمٹا کر تنہا لکھنؤ میں آگئی تھی۔ دہلی اور لکھنؤ دونوں مقامات زبان کے مرکز رہے ہیں ـــ!

لفظ کی جمع "لفظیں" جہاں بھی کتاب میں آیا ہے۔ بس وجدان تلملا تلملا کر رہ گیا ہے۔ لکھنؤ والے بیشک "لفظیں" بولتے ہیں۔ مگر وجدان کہتا ہے کہ کاش! وہ اس طرح نہ بولتے۔

گُل نوبہار

"گل نوبہار" ۔ از:۔ اشک طہرانی ۔ ضخامت ۲۰۳ صفحات ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔
ملنے کا پتہ ۔ عبدالغفور اشک طہرانی چاہ باغ والا ڈاکخانہ بدھ سنت براستہ ملی بھائی ضلع ملتان۔

اس کتاب کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

آسمانی کتاب پر نگاہِ انتقاد ـــ احادیثِ اسلام ـــ غمِ عشق ہے پُر جوش خدا خیر کرے ـــ اور جاہلیت کے شعرائے نامور کے کلام کا نمونہ ـــ غلط فہمیاں ـــ مصنف کے اسلوبِ نگارش کا اندازہ کرنے کے لئے یہ چند جملے ملاحظہ فرما لیجئے:۔

"بعض کی طبیعت میں کچھ اس طرح کا عنصر رچ جائے گا" (صفحہ ۴) "یہ لوگ فہم و فراست کا جائز تصرف کرنا نہیں جانتے"

(صفحہ ۴) "توریت اور اس کی تعلیم کی اوٹ میں بہت سوں نے ایک دوسرے کے کام آنے کا ڈھونگ رچاکر خوراک و پوشاک کے مسئلہ
کا حل ڈھونڈ لیا ہے"۔ (صفحہ ۷) "چین کے ایک مفکر آفاق نامی نے بھی ان احباب کے خوانِ نعمت سے لقمہ اٹھایا ہے (صفحہ
کتاب میں جگہ جگہ یہی رنگ ملتا ہے۔

مصنف خیر سے شاعر بھی ہیں۔ اشک تخلص فرماتے ہیں۔ اُن کے کلام کا نمونہ یہ ہے :-

دل کے چمن کے بے نشاں ہونے کا شکریہ ۔۔۔ حاجت نہیں رہی مجھے غم میں بہار کی

"دوسرے ملکوں کے علاوہ پاکستان میں بھی ایسی آسامیاں موجود ہیں جو العلماء ورثۃ الانبیاء کی مصداق اور دشمنانِ اس
کے لئے پیغامِ موت ہیں۔ نام درج ذیل کئے دیتا ہوں۔ اس لئے کہ ناظرین کو دھوکا نہ رہے —— ماہر القادری۔ علامہ مشر
مولانا سعید انصاری۔ حفیظ جالندھری۔ خواجہ حسن نظامی۔ نیاز فتحپوری۔ مولانا عبد الماجد دریابادی۔ سید سلیمان ندوی
مولانا عبید اللہ۔ مولانا محمد شفیع اور مولانا مسعود عالم ندوی ..." (صفحہ ۲۲) اس جملہ میں "آسامیاں" اور "دھوکا نہ
کی داد نہیں دی جاسکتی۔ پھر مصنف کی باخبری کا یہ عالم ہے کہ خواجہ حسن نظامی، نیاز فتحپوری اور مولانا عبد الماجد دریاباد
کو وہ پاکستانی سمجھتے ہیں اور ماہر القادری اور حفیظ جالندھری کو علماء میں شمار کرنا ایک مضحکہ سے کم نہیں!

"کتابچہ ہٰذا اساتذہ لاکلام کی نظر میں"۔ (صفحہ ۲)

اور یہ "اساتذہ لاکلام" کون؟ رنگین غلزئی۔ زیبا حمزی۔ ذکی ہاشم۔ رفعت اللہ طاہر جیسے مشاہیر (؟) ہیں ——
"اساتذہ لاکلام" لکھتے ہیں۔

"گل نوبہار" مجموعی افادیت کے لحاظ سے صفِ اول کا معجز نما ہے۔ گلِ نوبہار سے اخلاص علم کی سرپرستی ہے۔ پنجا
یونیورسٹی کو میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اس مفید ترین کتابچہ سے امدادی نصاب کا کام لے"۔ (یہ کتاب تو نوبل پرائز
قابل ہے —— مدیر)

اشک صاحب طہرانی ہیں۔ نہ جانے "طہر" کے معنی انھیں معلوم بھی ہیں یا کسی شخص نے اُن کے ساتھ مذاق کیا ہے؟
پھر اس کتاب کے "جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ" ہیں کہ اس ادبی اور دینی شاہکار کو کوئی پبلشر چھاپ کر مالی فائدہ نہ اٹھا

مقدمۃ القرآن

"مقدمۃ القرآن" معہ توضیح القرآن"۔ از :- مولانا محمد عبد اللہ درخواستی۔ مرتبہ :- مولانا محمد عبید
درخواستی۔ ضخامت ۹۴ صفحات (بڑا سائز) ملنے کا پتہ :- عبد القدیر صدیقی۔ ایس، ڈی، ا
پاور ہاؤس۔ خان پور۔

کتاب کے شروع میں قاری کے لئے ہدایتیں ہیں۔ اور قرآن پاک کے موضوع و عنوان، تفسیر، تاویل اور تحریف
فرق۔ فضائل قرآن، حروفِ مقطعات اور ناسخ و منسوخ کی بحث ہے۔ اس کے بعد سورۂ فاتحہ کی تفسیر ہے۔ جو
انداز میں لکھی گئی ہے۔ فاضل مفسر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ جن اوراق کی چھپ
ناقص ہے۔ وہاں پڑھنے میں دقت ہوتی ہے۔

دوازدہ اذکار عبرت

"دوازدہ اذکار عبرت و مکمل مراقبہ موت"۔ از :- خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔
ضخامت آٹھ صفحات۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب مرحوم۔ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ اور شاعری میں بید

رکھتے تھے۔ اپنے انداز اور فکر کے اُردو زبان میں ایک ہی شاعر تھے۔ اُن کی شاعری حقیقت میں جذب و سوز اور اخلاص و یقین کی شاعری تھی اور اس منزل میں اُن کا کوئی حریف نہ تھا۔

جناب حاجی وجیہہ الدین صاحب رضی، ٹی آر ایس ایمپیریم الیکٹرک ہاؤس کراچی صدر (نمبر ۳) نے حضرت مجذوب کی دو نظمیں چھپوائی ہیں۔ جو موصوف کے پتہ پر مفت طلب کی جا سکتی ہیں۔

یہ دونوں نظمیں اس "آخرت فراموش" دَور میں اس قابل ہیں کہ گھر گھر ان کا چرچا ہو اور فلمی گانوں کی جگہ مسلمان بچّوں کی زبانوں پر اس نظم کے اشعار ہوں:۔

نہ دل دادۂ شعر گوئی رہے گا　　　نہ گرویدۂ شہرہ جوئی رہے گا
نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا　　　رہے گا تو ذکرِ نکوئی رہے گا
جگہ جی لگانے کی دُنیا نہیں ہے　　　یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

مجذوب صاحب کے نام کے ساتھ "خان بہادر" اور "سابق ڈپٹی کلکٹر" کا اضافہ اچھا نہیں لگتا کہ ڈپٹی کلکٹری کی اخلاقی مضرتوں کا احساس کر کے اُس سے تو وہ خود استعفاء دے کر علیحدگی اختیار فرما چکے تھے۔

فردوس کی راہ

"فردوس کی راہ" (حصہ سوم) مرتبہ:۔ رخشندہ کوکب۔ ضخامت ۲۶۲ صفحات۔ مجلد رنگین و حسین گرد پوش کے ساتھ۔ ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ خواتین اچھرہ۔ لاہور۔

کتاب کا نام ہی بتا رہا ہے کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس کتاب میں اسلام پسند خواتین کے لکھے ہوئے چونتیس (۳۴) افسانے ہیں اور ہر افسانہ با مقصد، پاکیزہ اور اخلاقی قدروں کا ترجمان ہے۔ فن اور زبان[1] کی خامیاں کہیں کہیں ملتی ہیں۔ مگر کتاب کی اخلاقی افادیت نے ان خامیوں کو دبا لیا ہے۔ پوری کتاب اخلاق و پاکیزگی کے پھولوں سے مہک رہی ہے۔ ہماری اسلام پسند مائیں اور بہنیں جب اقامتِ دین کی تحریک میں اس عزم کے ساتھ شریک ہو رہی ہیں تو پھر منزل کیا دُور ہے؟

ادارۂ خواتین اس قسم کی مفید کتابوں کی اشاعت پر مبارکباد کا مستحق ہے۔ اس لٹریچر کا مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلانا دین و اخلاق کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان نیک بی بیوں کو اجرِ دارین عطا فرمائے گا کہ وہ اس طوفانِ ہوا و ہوس میں عصمت و پاکیزگی کی شمعیں روشن کئے ہوئے ہیں۔

کمیونزم مسلمانانِ عالم کی نظر میں

"کمیونزم مسلمانانِ عالم کی نظر میں"۔ مرتبہ:۔ عبد الوہاب تسنیم۔ ضخامت سولہ (۱۶) صفحے قیمت دو آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دینی کتب خانہ نیلور (جنوبی ہندوستان)

اس کتابچہ میں مشاہیر کی آراء اور تحریروں کے اقتباس درج کئے گئے ہیں۔ جن سے کمیونزم کی تردید ہوتی ہے۔ الوپاشا مرحوم کا خط اس جملہ پر ختم ہوتا ہے:۔

" اگر تم اسلام کے سپاہی بننا چاہتے ہو تو ان کمیونسٹوں کو مادرِ وطن سے نکالنے میں ہمارا ساتھ دو۔ بس یہی

---

[1] مثلاً "ٹھنڈی ہوائیں تیر کی طرح میرے چہرے میں گھسی جا رہی تھیں" (صفحہ ۶) "یہ اسکول ایک غیر ملکی مشن نے کھولا ہوا تھا" (صفحہ ۵۷)

ہماری خواہش ہے۔"

تین نظمیں بھی اس کتابچہ میں شامل ہیں۔

"میزان"

ماہنامہ "میزان"۔ مدیر۔ عنایت اللہ ندوی۔ نائب مدیر۔ شکراللہ رحمانی۔ بدل سالانہ تین روپے۔ فی پرچہ چار آنہ
ملنے کا پتہ:۔ معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدرآباد دکن۔

یہ ایک ادبی ماہنامہ ہے۔ جس کے تین شمارے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس کے کارکن اور رفقاء مستحق تبریک و تحسین ہیں کہ انہوں نے اقامتِ دین کو اپنا موضوعِ نگارش بنا لیا ہے۔ تمام مضامین میں یہی پاکیزہ رنگ جھلکتا ہے مئی کے شمارے میں "انکارِ حدیث کا تاریخی و سیاسی پس منظر" کس قدر مفید اور جاندار اداریہ ہے۔ اللہ تعالیٰ "میزان" کے مُرتبین کو اپنے حفظ و امان میں رکھے کہ آجکل حق کی آواز بلند کرتے ہی طرح طرح کے خطرے پیدا ہو جاتے ہیں!

انتخاب کلام امیر مینائی (نعتیہ)

"انتخاب کلام امیر مینائی" (نعتیہ) مُرتب:۔ خالد مینائی (ایم اے) ضخامت ۵۷ صفحات
قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبۃ الحبیب ۷۹ مین بازار۔ اچھرہ۔ لاہور۔

یہ حضرت امیر مینائی کے نعتیہ کلام کا انتخاب ہے۔ صرف اس نظم (معراج) ہی کو پڑھیے اور جھوم جائیے:۔

مدد اے لطف کہ معلوم نہیں رسمِ ادب … عفو اے ناز کہ معلوم نہیں طرزِ نیاز!!
بزم سب غالیہ سا، پر کہیں خوشبوئے مشام … کب زمیں عطر کی رکھتی ہے نشیب اور فراز
دائرہ وہ کہ جسے دائرہ کہنا ہے خطا … نہ حد و سمت نہ انجام نہ اس میں آغاز
کچھ عجب بزم کہ تھی بزم کے اطلاق سے دور … عود بے مجمرہ و نغمہ بے پردۂ ساز
کیا گلستانِ نزاکت تھی وہ محفل کہ جہاں … گوشِ گل پر تھی گراں، طائرِ بو کی آواز

آپ کیا آپ کی اُمت بھی ہوئی اس میں شریک
واہ! کیا دستِ کرم سے درِ رحمت ہوئے باز

حیرت ہے کہ جس نعتیہ غزل کی ردیف "صلی اللہ علیہ وسلم" ہے۔ اس میں یہ شعر انتخاب میں کیسے چھوٹ گیا۔ جس کا مصرعہ ثانی ہے۔ ع

ہاتھ کا تکیہ خاک کا بستر صلی اللہ علیہ وسلم!

رسالہ تسہیل المیراث

"رسالہ تسہیل المیراث" از۔ رشید احمد لودیانوی۔ ضخامت ۴۴ صفحات قیمت دس آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ مولانا رشید احمد لودیانوی مدرس اول جامعہ دینیہ دارالہدیٰ۔ ٹھیڑھی

اسٹیٹ خیرپور میرس۔

یہ کتاب علم فرائض پر بہت ہی مفید کتاب ہے۔ شریعت میں رشتہ دار وارثوں کی قسمیں۔ اُن کی میراث کے حصے اور اس سلسلہ میں ضروری چارٹ بھی اس کتاب میں ملتے ہیں۔ ذوی الفروض، عصبات اور ذوی الارحام کسے کہتے ہیں؟ اس کا جواب یہ رسالہ دے گا۔ حجب حرمان۔ حجب نقصان۔ محجوب اور محروم علم فرائض کی اصطلاحوں کی شرح بھی "تسہیل المیراث" میں درج ہے۔ یہ رسالہ عوام سے زیادہ علماء اور فقہاء کے کام کا ہے۔

…AN Karachi Regd. No. 1262

فاران

ماہر القادری

جلد ۷ — نمبر ۵

ماہنامہ

فاران

اگست ۱۹۵۵ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ

چھ روپے (پاکستانی) فی پرچہ ۸؍

آٹھ روپے (ہندوستانی) فی پرچہ ۱۱؍

مقام اشاعت

دفتر فاران - کیمبل اسٹریٹ - کراچی (۱)

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

یہ اگست ہے۔ جشنِ آزادی کا مہینہ! اخبارات حسبِ طریق سے "آزادی نمبر" نکالیں گے۔ فوجی پریڈ ہوگی۔ چراغاں ہوگا۔ قصروں
میں دھوم دھام سے خوشی کی تقریبیں منعقد ہوں گی اور دولت مند طبقہ عیش و تفریح کے پروگراموں میں خوب دل کھول کے حصہ
لے گا! "آزادی" یقیناً بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے حدود مسرت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ہمیں اپنے حالات
کا جائزہ لینا ہے کہ آزادی کے آٹھ سال گزر جانے کے بعد ہم کہاں ہیں؟ ہم نے زندگی کے کس شعبہ میں ترقی کی اور کتنی ترقی کی؟
غیروں نے جو بگاڑ ہم میں پیدا کر دیا تھا اس کو ہم نے کہاں تک سنوارا؟ اور ہم تعمیر و ترقی کی کس منزل میں ہیں!

تتلی پھولوں کی خوشبو پاکر رقص کرتی ہے۔ بھونرا باغ کی شادابی کو دیکھ کر گونجتا ہے اور ہرن جنگل کی ہریالی سے لبریز مست
ہو کر کلیلیں کرتے ہیں — ہم بھی خوش ہونے کا حق رکھتے ہیں اور خوشیاں منانا چاہتے ہیں۔ مگر خوشی کے اسباب اور مسرت
و شادمانی کے محرکات کیا ہمارے ماحول میں پائے جاتے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم صرف رسمی طور پر خوشیاں منا رہے ہیں
اور ہماری روحیں افسردہ اور ہمارے دل بجھے ہوئے ہوں!

یہ حقیقت عالم آشکارا ہے کہ پاکستان اسلام اور صرف اسلام کے نام پر بنا ہے۔ ہمارے لیڈروں نے مطالبہ کیا تھا۔ وعدہ
کیا تھا اور اس دعوے کو بار بار دہرایا تھا کہ ہمیں ایک ایسا خطہ چاہیئے جہاں ہماری حکومت اور معاشرت دین و اخلاق کے تقاضوں
کے مطابق غیروں کے اثر سے آزاد ہو! اس دعوے میں جان تھی۔ یہ مطالبہ بڑا وزنی تھا۔ اس لئے اغیار کی انتہائی مخالفت کے باوجود
ایسا خطہ ہمیں مل گیا جس کا نام ہی کتاب و سنت کی بتائی ہوئی طہارت و پاکیزگی سے عبارت ہے — پاکستان — جہاں زندگی
کے ہر شعبہ میں پاکیزگی کا چلن ہو اور "ناپاکی" جو درحقیقت "پاکستان" کی نفی کرتی ہے۔ اس کے لئے یہ پاک سرزمین
... زیادہ سے زیادہ تنگ ہو جائے!

پاکستان بن گیا اور اب اسے بنے ہوئے آٹھ سال ہونے کو آئے مگر کوئی انصاف پسند بتا سکتا ہے کہ ہماری حکومت و معاشرت
نے کتنے قدم "پاکیزگی" کی طرف اٹھے ہیں؟ کس برائی اور ناپاکی کو مٹایا گیا ہے اور کس اچھائی اور پاکیزگی کو یہاں قائم کیا گیا ہے؟ اگر
ایسا ہوا ہے تو اس کی تفصیل پیش کی جائے اور اگر نہیں ہوا اور یہی بات صحیح و درست بھی ہے۔ تو پھر یوں سمجھیئے کہ آغازِ پاکستان کے
پر آشوب دور کو چھوڑتے ہوئے یہ سارا زمانہ پاکستان کے مقصدِ وجود کی نفی ہی میں گزرا ہے!

شراب، کلب گھر کی قمار بازی، رقص و سرود، سٹہ اور گھوڑ دوڑ کی شرطیں ـــــ یہ وہ چند سامنے کی برائیاں اور
کھلی ہوئی ناپاکیاں ہیں جو سب کو نظر آتی ہیں۔ یہ بیماریاں طاعون کی طرح پھیل کر سارے ماحول کو متاثر کر دیتی ہیں اور کر رہی ہیں!
ان میں سے ہر برائی ایک "مستقل عنوان" ہے۔ جس کی بہت سی ذیلی "سرخیاں" ہیں! پاکستان کے معاشرے کو بداخلاقیوں اور
گندگیوں سے بچانے کے لئے حکومت کا فرض تھا کہ وہ احتساب کرتی۔ ان برائیوں کی قانونی طور پر بھی روک تھام کی جاتی اور ریڈیو اور
پریس کے ذریعہ بھی عوام کے ذہن و فکر کو اخلاق و پاکیزگی کی ترغیب دی جاتی۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے ارباب اقتدار نہ صرف یہ کہ
اپنے فرض سے غافل رہے ہیں بلکہ اُن کے دانستہ اغماض نے ان فواحش و کبائر کو اور شہ دی ہے!

پاکستانی خواتین میں بے پردگی اور بیباکی کا سلسلہ اوپر سے چلا ہے۔ یہ حیا سوز چنگاریاں بنگلوں، کوٹھیوں اور قصر و ایوان
کی طرف سے آئی ہیں۔ جوان لڑکیوں اور لڑکوں کی ملی جلی تعلیم کا انتظام حکومت ہی کے حکم سے ہوا ہے۔ "اپوا" کی سرپرستی کا فخر
ہمارے ارباب اقتدار ہی کو حاصل ہے۔ شرقِ اردن کی بے حجاب ملکہ کو حکومتِ پاکستان ہی نے دعوت دے کر بلایا تھا کہ پاکستانی
عوام اپنی آنکھ سے دیکھ لیں کہ مسلمانوں کی "معیاری عورت" ایسی ہونی چاہیئے۔ بیگم لیاقت علی خاں کو سات سمندر پار نامحرموں کے
ہجوم اور رامش و رنگ کے طوفانوں میں حکومتِ پاکستان ہی نے سفیر بنا کر بھیجا ہے۔ جس کے جواز کے لئے کتاب و سنت اور اسلامی
تاریخ سے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی! شاید اس حرکت سے دنیا کو یہ جتانا مقصود تھا کہ ہم اتنے آزاد خیال اور تجدد پسند ہیں
کہ بھارت کی "وجے لکشمیوں" کے مقابلہ میں پاکستانی خواتین کو لاسکتے ہیں!

تنقید و احتساب میں عدل و انصاف کے حدود سے تجاوز ہمارا شعار نہیں ہے۔ ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ پاکستانی معاشرہ
کی تباہی کے حصہ دار یہاں کے عوام بھی ہیں۔ مگر حکومت کی ذمہ داری زیادہ شدید اس لئے ہے کہ اس کے پاس طاقت ہے اور برائیوں
کی روک تھام کے خاطر خواہ ذرائع موجود ہیں۔ پھر حکومت عوام کے مقابلہ میں جذباتی نہیں ہوا کرتی۔ اس سے معاشرہ سنجیدگی اور
اصلاح و احتساب کی توقع رکھتا ہے! مگر اس توقع کا پاکستان میں کتنا خون ہوا ہے؟ اس پیاسے کی محرومی اور بدنصیبی کو کیا کہیئے
کہ پانی کی موجیں جس کے لئے شعلہ جوالہ بن جائیں! جن آرڈی ننسوں سے وزارت کی کرسیوں کو بدلا ہے اور دستور ساز اسمبلی جیسے
عظیم الشان ادارے کو توڑا ہے۔ اگر وہی "آرڈی ننس" برائیوں کی روک تھام میں صرف ہوتے تو آج پاکستانی معاشرے کی یہ
حالت کا ہے کو ہوتی! اب تک تو یہاں کے زمین و آسمان بدل جاتے!

اسلامی دستور سازی کی راہ روکنے کے لئے یہاں جس جس عنوان سے کوشش کی گئی ہیں اور طرح طرح کی چالیں چلی گئی
ہیں۔ اُن میں سے کوئی چیز بھی راز نہیں رہی۔ ابھی پاکستان میں کرایہ کے اخبار نویسوں کو گراں قدر تنخواہیں صرف اس لئے دی گئی ہیں
کہ وہ اسلامی فرقوں کے اختلافات کو نمایاں کریں۔ اور اسلامی دستور سازی کی اہمیت کو کم کر کے دکھائیں! کوئی شک نہیں کہ پاکستان
کی سابق دستور ساز اسمبلی نے بڑی غفلت اور تساہل سے کام لیا۔ مگر جب اس کے کام کی تکمیل میں صرف ایک مہینہ کی مدت باقی رہ
گئی۔ تو اُسے توڑ دیا گیا اور اب پھر نئے سرے سے کام کا آغاز ہوگا۔ یعنی ۱۹۵۵ء دستور سازی کے اعتبار سے ۱۹۴۷ء ہے۔ گویوں کہیے

بیل کی طرح جہاں سے چلے تھے گھوم پھر کر پھر وہیں آ گئے!

دُنیا میں دُوسری حکومتیں اور سلطنتیں بھی موجود ہیں۔ وہاں بھی سیاسی بحران پیدا ہوتا رہتا ہے۔ بیرونی اور اندرونی کشمکش سے کوئی ملک خالی نہیں ہے۔ مگر پاکستان میں جتنے جلد جلد انقلاب آتے رہے ہیں اور شاہانہ اختیارات جس مطلق العنانی اور بیباکی کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کی نظیر موجودہ دَور میں کہیں مل نہیں سکتی۔ جس وزارت کو اپنے پروگرام اور پلان کے بارے میں مذبذب اور مخالف پایا۔ اُسے سبزۂ بیگانہ کی طرح نکال باہر کیا! پاکستان کا کونسا صوبہ ہے جو اس "ناگہانی حادثہ" سے محفوظ رہ سکا ہے!

حیدر آباد سندھ، کراچی سے کیا دُور ہے؟ وہاں جو جو کارستانیاں ہوئی ہیں اُن کی مرکز کو رتّی رتّی بھر خبر ہے۔ مگر اُن بے عنوانیوں کو چیک کرنے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ وہاں کی وزارت سے ہر فرمان کی تعمیل کی توقع ہے۔ پنجاب اور سرحد کی وزارتوں سے اس نیازمندی کی توقع نہیں رہی۔ اس لئے انہیں ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ ان برطرف شدہ ذوپروں کے مقابلہ میں اُن لوگوں کو نئی وزارتوں میں لیا گیا ہے جن کے بارے میں اطمینان ہو گیا ہے کہ "عالم بالا" کی پالیسی کا یہ حضرات پُوری طرح ساتھ دیں گے اور اپنے سے پہلی وزارتوں کے انجام سے ہر وقت عبرت حاصل کرتے رہیں گے!

"راج ہٹ" کی کچھ داستانیں قصہ کہانیوں کی کتابوں میں پڑھی تھیں۔ مگر پاکستان میں اُسے دیکھ بھی لیا۔ نہ جانے کس "جہاں پناہ" کی زبان سے یہ نکل گیا تھا کہ "دستور یہ کا اجلاس مری میں ہوگا"۔ عوام نے اس پر بہت کچھ شور مچایا۔ اخباروں نے احتجاج کیا۔ خود دستور یہ کے بعض ارکان نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ مگر عوام و خواص کا یہ احتجاج دھرے کا دھرا ہی رہا۔ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس "مری" ہی میں ہوا اور چندہ دن کے لئے حکومت کے خزانہ کو لاکھوں روپیوں کا زیر بار ہونا پڑا۔ یہ بادشاہوں کی طرح ضد، راجاؤں جیسی ہٹ یہ اپنی مطلق العنانی اور شانِ خسروی کا اظہار اس دورِ جمہوری میں کسی حکومت کی ساکھ کو کیا دُنیا کی نظروں میں باقی رکھ سکتا ہے! ساری دُنیا اندھی، بہری اور گونگی تو نہیں ہے۔ ہر ہوش مند حکومت دوسری حکومتوں کے حالات کی خبر رکھتی ہے کہ کہاں کیا ہو رہا ہے؟ اور کیوں ہو رہا ہے؟ یہ لاکھوں روپے کسی کی "راج ہٹ" پر اُس ملک میں بھینٹ چڑھائے گئے ہیں۔ جہاں ہزاروں مریض ایک گھونٹ دُودھ اور ایک خوراک دوا کے لئے ترستے ہیں۔ اور جہاں شہروں کے چوراہوں پر ننگے بُھوکوں اور ننگوں کے ہاتھ پیسے پیسے کے لئے پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مری کا اجلاس حقیقت میں پاکستان کا "سیاست پیما" (مقیاس السیاست) ہے۔ جس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہاں سیاسی مسائل میں شخصی رجحان، اور ذاتی وقار کا سوال کیسا پارٹ انجام دیتا ہے!

دستور یہ کا اجلاس منعقد ہونے سے پہلے سرکاری حلقہ میں کیا شور مچ رہا تھا اور کیسی مستعدی دکھائی جارہی تھی کہ بس پہلے دن ہی سے دستور سازی کا کام شروع ہو جائے گا۔ مگر اس غبارے کی بھی ہوا ذرا سی دیر میں نکل گئی۔ دستور یہ کا اجلاس اس انداز میں شروع ہوا جیسے فلموں کی "مہورت" ہوا کرتی ہے۔ دستور سازی کا وہاں کس کو ہوش تھا۔ سارا وقت توڑ جوڑ اور سودے بازی ہی میں صرف ہوا۔ اب اگست کے دُوسرے ہفتہ میں کراچی میں یہ "سبھا" جمے گی اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقفہ میں افراد اور پارٹیوں کے درمیان "داد و ستد" کی کیا شرائط طے ہو چکی ہوں گی!

اس اجلاس میں اربابِ اقتدار کی حفاظت کے لئے جو اہتمام کیا گیا تھا۔ اُس نے پرنس آف ویلز اور ڈیوک آف کناٹ کے شاہانہ سفر کی یاد تازہ کردی۔ راولپنڈی سے لے کر مری کی چوٹیوں تک پولیس کی لین ڈوری لگی ہوئی! ہر گام پر چند عقابی آنکھیں

نگراں اور ہر موڑ پر نگاہِ جستجو کے پہرے! عوام اور خواص کے درمیان اجنبیت اور بیگانگی کی جو خلیجیں حایل ہیں اس کا ذمہ دار آخر کون ہے؟؟ یہ انگریزی دَور کے "ہز ایکسی لینسیوں" اور "ہز آنروں" کا مصنوعی وقار اور بناوٹی رکھ رکھاؤ آخر کب تک "محمود و ایاز" کو ایک صف میں کھڑا نہیں ہونے دیگا۔ یہ دھڑکوں، اندیشوں اور بے اطمینانی کی فضا آخر کب تک باقی رہے گی؟ یہ دُھندلکے کب چھٹیں گے اور اُخوت و مساوات اور باہمی اعتماد کا سپیدۂ سحر کب طلوع ہوگا؟

انگریز دفتروں کو ضبط و نظم کی جس سطح پر چھوڑ کر گیا تھا۔ آج پاکستان کا دفتری نظم و نسق اُس سے پست تر ہوگیا ہے۔ رشوتوں کی وہ گرم بازاری کہ خدا کی پناہ۔ صوبجاتی تعصب دفتری معاملات میں الگ قیامت ڈھا رہا ہے۔ عمال فرض ناشناس ہوتے جارہے ہیں!

حکومت کی تجارتی پالیسی اس قدر غیر دانشمندانہ ہے کہ تاجروں کا ہر طبقہ اپنی جگہ غیر مطمئن اور شکوہ سنج ہے۔ صنعتی ترقی کی رفتار اس قدر سست ہے کہ پاکستان درآمدی چیزوں میں شاید پچیانوے فی صدی مصنوعات میں دُوسرے ملکوں کا محتاج ہے۔ "بڑے آدمیوں" کے غیر ملکی سیر و سیاحت اور بیرونی دوروں کے مصارف بے اندازہ ہیں۔ لاکھوں اسٹرلنگ انہی سیر سپاٹوں کی نذر ہوجاتے ہیں۔ باہر سے جو آلات اور مشینیں خریدی جاتی ہیں اُن کی خوبیوں کا اندازہ ریل کے اُن ڈبوں سے کیا جاسکتا ہے جو فرانس سے خریدے گئے ہیں۔ درآمد کے "معاملات" میں نہ جانے کس کس کا دامن آلودہ ہے!

مہاجرین کے ساتھ حکومت نے جو سلوک روا رکھا ہے وہ کسی حساس، اور دردمند حکومت کو زیب نہیں دیتا۔ ان غریبوں کی "آبادکاری" کم اور "بربادی" زیادہ ہوئی ہے۔ جو حکومت بادشاہوں کے استقبال کے لئے راتوں رات شہر کو سجا سکتی ہے وہ آٹھ سال کی طویل مدت میں کراچی کے چند لاکھ مہاجرین کو آباد نہیں کرسکی!

ہندوستان طاقتور ہے، متحد ہے، اُس کے اربابِ حل و عقد یک جان و یک دل ہیں۔ اس لئے کشمیر کے مسئلہ میں اُس کے ذمہ دار کئی بار اپنے عزائم اور موقف کا دوٹوک لفظوں میں اظہار کرچکے ہیں! پاکستان کمزور ہے، غیر متحد ہے اور اُس کے کرتا دھرتا آپس کی رقابتوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کے اربابِ کار احتجاج بھی کرتے ہیں تو اس میں کوئی جان نہیں ہوتی! کشمیر کے مسئلہ میں ہندوستان وہاں ہے کہ جہاں متاعِ مقصود و آرزو اس کی مٹھی میں ہے اور پاکستان اُس مقام پر ہے جہاں لفظوں اور خیالوں کے غُباروں کے سوا، اور کوئی چیز نظر نہیں آتی!

امریکہ کے گیہوں اور گھی کو پاکستان میں جس طرح تقسیم کرایا گیا ہے، اُس کو دیکھ کر دُوسرے ملکوں کے لوگوں نے اس کے سوا اور کیا تأثر قبول کیا ہوگا کہ بھک منگوں کی ایک قوم ہے جو پاکستان میں بستی ہے۔ جس کے احتیاج اور افلاس نے اُس کی خودداری کا دیوالہ نکال دیا ہے ——— اگر اندیشوں، افواہوں اور مبالغوں سے ہٹ کر نرم سے نرم اور محتاط سے محتاط الفاظ سے کام لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ لندن اور واشنگٹن کی سیادت کی پرچھائیاں پاکستانی سیاست پر پڑتی رہتی ہیں اور یہ صورتِ حال سب سے زیادہ خطرناک ہے!

ایک بھارت کے وزیر اعظم مسٹر نہرو ہیں۔ جن کی شخصیت کا وزن دُنیا کی سب سے زیادہ طاقتور حکومتیں محسوس کررہی ہیں اور ایک ہمارے وزیر اعظم مسٹر محمد علی ہیں کہ جو اپنی کشتیٔ اقتدار ہی کے سنبھالنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کہ کہیں ہوا کا رُخ بدل نہ جائے!

صوبوں سے لے کر مرکز تک رقابتوں، پارٹی بازیوں اور سیاسی نزاع کا ایک ہنگامہ برپا ہے۔ وزارتوں کے قلمدان

اور جاہ و منصب کی کرسیاں ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ مفادات کی کشمکش اور ذاتی اغراض کی معرکہ آرائی نے عجیب ابتری پیدا کر دی ہے! قصر و ایوان سے اعلان یہ کیا جاتا ہے کہ "پاکستان میں طاقت کا سررشتہ عوام کے ہاتھ میں ہے"۔ مگر پاکستان سے زیادہ مجبور اور بے بس عوام شاید ہی کسی ملک میں پائے جاتے ہوں۔ اگر پاکستان کی طاقت واقعی عوام کے ہاتھوں میں ہوتی تو پاکستان چند خاندانوں کے جاہ و منصب اور عیش و آرام کی جولاں گاہ بن کر نہ رہ جاتا۔ اگر پاکستان کا انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ "خداوندانِ نعمت" تک عوام کے خیالات ٹھیک طرح پہنچاتا رہتا ہے تو اس حقیقت سے یہ حضرات بے خبر نہ ہوں گے کہ کس "عزت مآب" کے بارے میں عوام کے جذبات کیا ہیں؟ اور ع

کہتی ہے تم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا!

جو لوگ اپنی ذاتی عیش و آرام ہی کو مقصدِ حیات سمجھے ہوئے ہیں وہ پاکستان میں دیہوں کی تگ و تاز، ہوائی جہازوں کی پرواز، ہوٹلوں اور کلب گھروں کی چمک دمک دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ "راوی چین ہی چین لکھتا ہے"۔ مگر جو پاکستان کے دردمند ہیں، جن کے سامنے زندگی کا اعلیٰ مقصد ہے، جو پاکستان کے مقصدِ وجود کا علم رکھتے ہیں، جو ارضِ پاکستان کو مسجد کی طرح مقدس اور محترم سمجھتے ہیں، وہ پاکستان کی ابتری اور زبوں حالی کو دیکھ کر تڑپ جاتے ہیں۔ اس غم میں اُن کی راتوں کی نیندیں اُڑ اُڑ جاتی ہیں! وہ اپنے خدا کے حضور پاکستان کی سلامتی اور ترقی و استحکام کے لئے عاجزانہ دعائیں کرتے ہیں!

جس ملک کے یہ کوائف و حالات ہوں، وہاں کوئی جشنِ مسرت کس منہ اور کس دل سے منائے! جس کا دل زخموں سے چور ہو، وہ لوگوں کے دکھانے کو ہنسنے لگا بھی تو اس کی ہنسی کتنی پھیکی اور مرجھائی ہوئی ہوگی۔ ع

کیا برا تھا رو لینا ایسے مسکرانے سے!

وہ عیش نصیب جن کو ہندوستان کی تقسیم کے بعد ایک پھانس کی چبھن بھی سہنی نہیں پڑی، بلکہ پاکستان نے جن کے شبستانوں کی عیش سامانیوں میں اور اضافہ کر دیا ہے، انھیں اُن بدنصیبوں کا غم کیا معلوم جن کو پاکستان کی خاطر ایسی ایسی قربانیاں دینی پڑی ہیں جن کے تصور سے آج بھی انسانیت کا جگر شق ہو جاتا ہے۔ جس کے چوٹ لگے گی وہ آہ نہ کرے گا تو کیا گیت گائے گا۔ جس کے دل و جگر زخمی ہوں گے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں تو اس پر کسی کا چیں بر جبیں ہونا کہاں تک روا ہے۔ یہی غم ہے جو ہماری اس تحریر میں "فریاد و احتجاج" بن گیا ہے۔ یہی سوز و درد ہے جو ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم صرف محوِ حیرت ہی بن کر رہ نہ جائیں۔ بلکہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اُسے لب پر بھی لے آئیں!

اگر اس فریاد کی "لے" کہیں زیادہ تیز ہو گئی ہے تو اس کے لئے ہم معذور ہیں۔ آہ و فریاد کے لئے نغمہ کے زیر و بم کی طرح کوئی ضابطہ مرتب نہیں ہوا۔ پھر جن لوگوں نے ملک کی سربراہی کی ذمہ داریاں قبول کی ہیں انھیں شکستہ دلوں کے شکوے بھی سننے پڑیں گے۔ اُن کو احتساب و تنقید بھی برداشت کرنی ہوگی۔ اگر ہماری تنقید میں "ذرہ برابر" بھی مبالغہ پایا جاتا ہے تو ہمیں آگاہ کر دیا جائے۔ ہم اپنی غلطی کا کھلے دل سے اعتراف کریں گے۔ اور اگر ہم نے واقعات کی صحیح عکاسی کی ہے تو ہم عتاب کے نہیں خوشنودی کے مستحق ہیں!

جب ۱۰۰۰۰۰۰!

پاکستان میں جشنِ مسرت حقیقت میں اُس وقت منایا جائے گا:-

جب یہاں کی زمامِ حکومت اُن لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی جن کے دل خدا کے خوف سے لبریز

ہوں گے۔ جن کو آخرت کی جوابدہی ایک لمحہ کے لئے بھی فرض ناشناس نہ ہونے دے گی۔ جو قوم کے مخدوم نہیں خادم ہوں گے۔ جن کا ذاتی مفاد اور شخصی خواہشیں اسلام اور ملت کے تقاضوں پر غالب نہ آنے پائیں گی بلکہ مغلوب رہیں گی۔ جو عہدوں اور مناصب کی خود طلب نہ کریں گے بلکہ قوم ان کو منصب تفویض کرے گی اور وہ اس بارِ گراں کو بہت بڑی امانت اور ذمہ داری سمجھ کر اٹھائیں گے۔ اور جب وہ محسوس کریں گے کہ ان سے زیادہ اہل آدمی قوم میں موجود ہیں تو وہ اپنے عہدوں سے دستکش ہونے میں تامل اور پس و پیش سے کام نہ لیں گے

جب یہاں کی سرزمین پر اللہ کا قانون چلے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ سیاست و معاشرت کی روح رواں ہوگی نیکیاں ہر طرف چلتی پھرتی دکھائی دیں گی اور برائیوں کیلئے یہاں کی زمین تنگ تر کردی جائے گی!

جب یہاں سرمایہ اور محنت میں فطری توازن قائم ہو جائے گا۔ سرمایہ، جس نے آج ظلم و لعنت کی صورت اختیار کر رکھی ہے۔ وہ عدل و رحمت بن جائے گا۔ ہر شخص کا جائز حق اور اس کی محنت کا خاطر خواہ صلہ اُسے ملے گا۔ غریب پیسہ پیسہ کے لئے در در مارے مارے نہ پھریں گے۔ اُن کے واسطے سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔

جب یہاں کے دفتروں کے عمال اپنے فرائض کو عبادت سمجھ کر انجام دیں گے اور رشوت سے لوگ نجاست سمجھ کر دامن بچائیں گے

جب یہاں تعلیم عام ہوگی اور عدالتوں میں دادرسی کے لئے لوگوں کو بھاری بھاری فیسیں ادا نہیں کرنی پڑیں گی۔

جب یہاں عوام و خواص کو ایک دوسرے پر نہ صرف یہ کہ اعتماد ہوگا بلکہ آپس میں محبت ہوگی۔ وہ سب اپنے کو ایک ہی مشین کے کل پرزے سمجھیں گے کہ جن کے باہمی تعاون کے بغیر مشین چل ہی نہیں سکتی۔

جب یہاں زیادہ سے زیادہ وحدتِ فکر نظر آئے گی۔ ہر طرف ہم آہنگی، توافق و اتحاد اور اخوت و مساوات کی فضا ——! اختلافات ہوں گے مگر ایسے نہیں جیسے دشمنوں میں ہوا کرتے ہیں۔ بھائیوں جیسے ذیلی اختلافات کہ جو ایک معانقہ اور مصافحہ میں مٹ جاتے ہیں۔

جب یہاں بڑے سے بڑے حاکم کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کی جاسکے گی۔ جب یہاں کا خزانہ بادشاہوں کا "خزانہ عامرہ" نہیں بلکہ امت کا بیت المال ہوگا۔ جس کا ایک حبہ بھی کوئی ناجائز طور پر تصرف میں لائیگا تو اس کی گردن ناپی جائے گی۔

جب یہاں علم و فن سبزے کی طرح اُگیں گے اور اکتشاف و تحقیق گھٹا بن کر برسے گی۔ سائنس کی توتوں اور کار فرمائیوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جائے گا۔ صنعت و حرفت کی وہ فراوانی ہو گی کہ "درآمد" کی کم سے کم ضرورت لاحق ہوگی اور کسی کا دست نگر بننا نہ پڑے گا۔

جب پاکستان دُنیا کے لئے ایک مثالی حکومت ہوگا۔ ہم کسی کی رہنمائی کے محتاج نہ ہوں گے بلکہ دوسرے ہماری قیادت اور رہنمائی کو اپنے لئے سرمایۂ عز و افتخار سمجھیں گے۔ تہذیب و تمدن اور سیاست و اخلاق کی مرکزیت پاکستان کو حاصل ہوگی ——!

کشمیر کا مسئلہ ہو یا کابل کا قضیہ —— جب پاکستان کا دنیا وزن محسوس کرے گی کہ یہ ملک اپنا حق لینے اور اپنے مطالبہ کو منوانے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ صبح کے وقت جو شبنم نظر آتا ہے وہ نزاع و کشمکش کے وقت شعلہ جوالہ بن سکتا ہے ؏

یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے!

مگر اس طرح کا پاکستان

آپ ہی آپ نہیں بن جائے گا۔ اُس کے لئے ہم سب کو جد و جہد کرنی ہوگی۔ بگڑتے بگڑتے حالات سنبھلتے سنبھلیں گے۔ اور

برائیاں مٹائے جانے سے مٹیں گی یہ وادی بڑی سنگلاخ اور یہ راہ بہت پُرخار ہے۔ یہاں دامن کے تار سے لے کر شہ رگ تک کی نوبت آسکتی ہے!

لیکن یہ انقلاب ضبط و آئین کی راہ سے آئے گا۔ عوام کے آئینی دباؤ کا مفاد پرستی زیادہ دن تک مقابلہ نہ کر سکے گی۔ اُسے اگر نہ ایک دن میدان چھوڑ دینا پڑے گا۔ فتح خلوص و دردمندی ہی کی ہوگی!

پاکستان کی یہ خوش نصیبی ہے کہ یہاں ایک ایسی مخلص جماعت بھی موجود ہے جو پاکستان بننے کے وقت سے اب تک اپنے مسلک پر قائم ہے اور کوئی دباؤ اور سختی جس کے عزائم کو جنبش نہیں دے سکی۔ اس جماعت کی آئین پسندی کا یہ عالم ہے کہ اُس کے امیر کو سزائے موت سُنائی جاتی ہے مگر اس کے کارکنوں کے جذبات غیر متوازن نہیں ہو پاتے۔ "اقامتِ دین" اس جماعت کا عنوانِ فکر و عمل اور رضائے الٰہی غایت و مقصود ہے۔ اس جماعت نے کالجوں ہی کو نہیں مدرسہ و خانقاہ کو بھی چونکایا ہے!

اس جماعت کی استقامت اور عزیمت کا یہ عالم ہے کہ شدید سے شدید آزمائشوں اور مخالفتوں کے طوفانوں میں بھی اس کے پیروں کو جنبش نہیں ہوئی۔ بہت کم ترکش ایسے ہوں گے جن کے تیروں نے اس جماعت کے سینہ کو نشانہ نہ بنایا ہو۔ اس نشتر زنی اور ناوک فگنی میں اُن لوگوں نے حصہ لیا ہے جن سے خواب و خیال میں بھی اس بے دادی کی توقع نہ تھی!

آپ اس جماعت کے لٹریچر کو پڑھیے۔ اس کے کارکنوں کے حالات کا جائزہ لیجیے۔ جب آپ اُن کو اچھی طرح پرکھ لیں اور آپ مطمئن ہو جائیں تو پھر "اقامتِ دین" کی جدوجہد میں اس مخلص اور بامقصد جماعت کا ساتھ دیجیے! یہ کوئی دعویٰ نہیں کرتا کہ اخلاص اور دیانت و حق ساری دُنیا سے سمٹ کر تنہا جماعتِ اسلامی ہی میں آگئے ہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کے پورے کے پورے دین کو نافذ اور برپا کرنے کا وسیع اور اجتماعی پروگرام جماعتِ اسلامی کا طغرائے امتیاز ہے!

حق آواز دے رہا ہے۔ سچائی پکار رہی ہے۔ فرض آپ کو بُلا رہا ہے۔ اقامتِ دین کا قافلہ رواں ہو چکا ہے۔ آپ کہاں ہیں؟ یہ سوچ بچار کب تک؟ یہ مصلحت اندیشیاں تا کجے! اگر دین کی مظلومیت ہی آپ کو پسند ہے۔ تو آپ سے ہم کچھ نہیں کہتے۔ اگر دین کو غالب اور سربلند کرنا مقصود ہے تو پھر اس منزل کے مسافروں کا ساتھ دیجیے! دُنیا کی عیش سامانیاں جگنو کی چمک سے بھی زیادہ کم ثبات ہیں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ ؎

عمر برف است آفتاب تموز

اندکے ماند و خواجہ غرہ ہنوز

جو کچھ کرنا ہے جلد کیجیے اور یہ سوچ کر کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایک دن آپ کو پیش ہونا ہے۔ جہاں آپ کے رتی رتی بھر عمل کا حساب لیا جائے گا اور کوتاہیٔ عمل کی کوئی معذرت قبول نہیں کی جائے گی!

ماہر القادری

۳۰ جنوری ۱۹۵۵ء

سید جلال الدین انصر عمری

شریعت میں سنّت کا مقام

ایک زمانہ تھا جبکہ خالقِ کائنات کی ہستی کے اثبات میں طرح طرح کے دلائل پیش کئے جاتے تھے۔ لیکن آج کی دنیا میں علم و دانش کی بہت فراوانی اور ارزانی ہے۔ علم اور تجربہ و شہود کے نئے نئے دریچے وا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ بات بالکل بدیہیات میں شمار کی جانے لگی ہے کہ اس دنیا کا کوئی نہ کوئی پیدا کرنے والا ضرور موجود ہے۔ اور یہ حیرت ناک مشنری از خود وجود میں نہیں آگئی بلکہ اس کا ایک موجد ہے۔

خدا کے ماننے والوں کے مختلف گروپ ہیں۔ ہم اس تفصیل میں پڑنا نہیں چاہتے کہ کون کون گروہ خدا کو کس کس حیثیت سے تسلیم کرتا ہے۔ اور نہ ہمارے موضوع کا اس سے تعلق ہے۔ صرف اس قدر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ خدا کو بالاتفاق خالق کائنات تسلیم کرنے کے باوجود دنیا دو بڑی بڑی ٹکڑیوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک بڑی جماعت فلاسفۂ مغرب اور اہلِ سائنس کی ہے۔ جو خدا پر محض جیومیٹری کے ایک فرضی نقطہ کی طرح یقین رکھتی ہے۔ جس کے ماننے یا نہ ماننے سے حیاتِ انسانی پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ اس گروہ کو خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات کی راہ میں جو ناقابلِ حل پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اُن کے حل کرنے کی کوئی صورت نکل سکے۔ کیونکہ جب تک اس کارخانۂ عالم کو ایک خالق کی تخلیق اور ایک موجد کی ایجاد نہیں تسلیم کیا جاتا۔ اس وقت تک فلسفہ اور سائنس کا کوئی ناخنِ تدبیر اس عقدہ کو کھول نہیں سکتا۔ خدا کو مانے بغیر اشہبِ فکرِ انسانی اس میدان میں دو چار قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

اس گروہ کے نزدیک خدا کا وجود تخلیقِ کائنات کے لئے ایک ذی شعور محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ آپ اسے اللہ کے نام سے موسوم کریں یا ایشور، بھگوان، خدائے خدائیگان اور "گاڈ" وغیرہ نام دے دیں۔ ان لوگوں کے پاس اس امر کا کوئی جواب نہیں اور نہ وہ اس بحث میں پڑنا چاہتے ہیں کہ اس کائنات کے ساتھ اس کے خالق کا تعلق کس نوعیت کا ہے؟ مخلوقاتِ عالم خصوصیت سے انسان اور خدا کے مابین کونسا رشتہ قائم ہے۔ اس مشنری کی حرکت کے پیچھے کیا مقاصد کام کر رہے ہیں؟ یہ گردشِ لیل و نہار کن عوامل کے تحت اپنی بہار دکھاتی رہتی ہے؟ یہ اور اسی قسم کے بے شمار سوالات ہیں۔ جنہیں ہاتھ لگائے بغیر یہ لوگ اپنے مقاصد میں آگے بڑھتے جا رہے ہیں۔

دوسرا گروہ نہ صرف خدا کا وجود ہی تسلیم کرتا ہے۔ بلکہ اسے با اختیار، صاحبِ ارادہ، ہمہ بین و ہمہ داں ذات تصور کرتا ہے۔ وہ اس عالم کو خدائے تعالیٰ کے ارادے اور مشیّت کا کرشمہ سمجھتا ہے۔ پہلے ہی قدم پر اُس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ خالقِ کائنات کے قانون کی زنجیر میں کسا ہوا ہے۔ زمین اس کے حکم سے حرکت کرتی ہے۔ آسمان اس کے فرمان کے تحت مصروفِ عمل ہے۔ سیارے اس کے حکم سے چلتے ہیں۔ شمس و قمر اس کے امر کے تابع ہیں۔ پرند اس کی ربوبیت کے نغمہ سنج ہیں۔ حیوانات اس کی غلامی میں مصروف ہیں۔ غرض کائنات کا ایک ایک ذرّہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا تابعدار اور محکوم ہے۔

اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے بہت سارے معاملات میں اُسی کے حکم کا پابند ہے۔ لہٰذا جن حدود میں اسے اختیار دیا ہے اُن میں بھی اسی کے قانون کی اتباع کرنا اُس پر فرض ہے۔ اس کے اور خدا کے درمیان حاکم و محکوم کا سا تعلق ہے۔ لہٰذا اس کی زندگی ایک غلام کی سی زندگی ہونی چاہیئے۔ وہ حکم دے یہ فوراً سر تسلیم خم کردے۔ وہ منع کردے یہ یکلخت باز آجائے۔ وہ بُلائے یہ سرپٹ دوڑے۔ وہ صدا دے اور یہ سراپا گوش بن جائے۔ الغرض اس کی نشست و برخاست، آمد و رفت، خواب و بیداری، موت و حیات سب کچھ اس مخلص اور ایماندار خادم کی طرح ہوجائے جو آقا کی ابروئے چشم کے اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ اسی میں اس کی سعادت ہے۔ یہی اس کی فوز و فلاح کا راستہ ہے۔ اسی پر چل کر وہ بامراد و بامقصد ہوسکتا ہے۔

اس یقین و ایمان کے باوجود ہم دیکھتے ہیں نہ اللہ تعالیٰ ہمارے پاس آکر ہمیں اپنا امر و نہی سُناتا ہے اور نہ ہمارے پاس اس کی جانب سے کوئی قاصد آتا ہے اور نہ ہمارا وجدان۔ ذوقِ سلیم، فہم و بصیرت اس راہ میں کچھ زیادہ مدد دیتے ہیں۔ اس لئے ہمیں لامحالہ اس معاملہ میں اُنہی بلند کردار شخصیتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو اللہ کے رسول ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جن کی تعلیمات کے متعلق عقلِ انسانی فیصلہ کرتی ہے کہ یہ خالقِ ارض و سما کی جانب سے ہوسکتی ہیں۔

عصمتِ انبیاءؑ انبیاءؑ کے متعلق یہ تصور کہ منصبِ نبوّت سے سرفراز ہونے سے قبل وہ بھی سیرت و کردار کے اعتبار سے عام آدمیوں سے بلند نہیں ہوتے۔ ایک غلط اور گمراہ کن تصوّر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نبوت کسب و محنت اور سعی و جہد سے حاصل نہیں کی جاتی بلکہ یہ سرتاسر عطیۂ الٰہی اور نوازشِ کردگار ہے۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ

یہ اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے

لیکن جس طرح قدرت اپنے ہر کام میں استعداد و صلاحیت اور استعداد و قابلیت کے مطابق تقسیم کار کرتی ہے۔ ع

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

بالکل اسی طرح عہدۂ نبوت بھی صلاحیت و کمالات سے عاری اور استعداد سے خالی راہ چلتے کے ہاتھوں میں ڈاک کے تھیلے کی طرح تھما نہیں دیا جاتا۔ بلکہ سالہا سال اور ایک لمبی چوڑی مدت اُن کی تربیت و نگرانی کی جاتی ہے۔ اور اُن کے ایک ایک پہلوئے زندگی کی اس طرح حفاظت کی جاتی ہے کہ شیطانی مکر و خدع کا کوئی داؤ اُن پر کارگر نہیں ہوتا۔

آپ انبیاءؑ کی نبوت کے بعد والی زندگیوں کو چھوڑیئے کہ وہ سرتاپا معصوم اور بے خطا ہوتی ہی ہیں۔ ذرا قبلِ نبوت کے حالات کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو صاف نظر آئے گا کہ وہ اپنے ماحول میں درخشندہ ستاروں کی طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ اُن کی سیرت اتنی بے داغ اور اس قدر بے غبار ہوتی ہے کہ دوست تو دوست دشمن بھی اُن کی طرف انگشت نمائی کا موقع نہیں پاتے۔ اُن کے گرد و پیش خواہشاتِ نفس اور ہوا و ہوس کی آندھیاں اُٹھتی ہیں۔ لیکن اُن کے دامنِ سیرت پر گرد و غبار کا معمولی سا اثر بھی نمایاں نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسے نازک اور کٹھن مراحل میں اُن کی سیرت اور نکھر کر سامنے آجاتی ہے اور دُنیا جان لیتی ہے کہ یہ وہ پاک نفوس ہیں جو دُنیا کی قیادت اور امامت کے سزاوار ہیں۔

یہی حقیقت ہے جس کی طرف حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں قرآن نے اشارہ کیا۔ "وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ" تاکہ ہماری آنکھوں کے روبرو تمہاری سیرت کے خد و خال بنا رہوں۔

اُس ذاتِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا مطالعہ کیجئے۔ جس سے بہتر انسان پر آفتاب طلوع نہیں ہوا

قرآن نے اس کے مخالفین کی یہ تصویر کھینچی :-

فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَٰكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ -

پس یقیناً وہ تجھے نہیں جھٹلا رہے ہیں۔ لیکن ظالم اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔

قرآن نے دشمنوں کے نرغہ میں اعلان کیا۔ "إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ" (بیشک تم اخلاق کے بلند مقام پر فائز ہو) اور تاریخ گواہ ہے کہ حضور کا بڑے سے بڑا دشمن بھی قرآن کے اس دعوے پر چون وچرا نہ کر سکا۔

علامہ رشید رضا لکھتے ہیں :-

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے کامل الفطرت پیدا کیا تھا تاکہ دین فطرت کا رسول بنائے۔ آپ کے اندر عقل وفہم کی کلی استعداد ودیعت فرمائی تھی۔ تاکہ آپ کو فکری وعلمی دین کا علمبردار بنائے۔ آپ کو اخلاق کے اعلیٰ ترین مقام پر فائز کیا گیا تھا۔ تاکہ مکارم اخلاق کی آپ کے ذریعہ تکمیل ہو۔ آپ کو اوائل عمر ہی سے بت پرستی اور مشرک قوم کی خرافات اور ان کی گھٹیا حرکتیں ناپسند تھیں۔ یہ جاہل قوم جن امور میں دلچسپی لیتی تھی۔ بلکہ جو چیزیں اس کے فخر ومباہات کا ذریعہ تھیں مثلاً خونریزی، انسانیت پر ظلم وتعدی۔ ایک کا دوسرے کے مال پر بلا استحقاق قبضہ وغیرہ جما لینا۔ ان سب چیزوں سے آپ بالطبع متنفر تھے اور اسی نفرت کا نتیجہ تھا کہ اس گندے ماحول سے بیزار ہو کر آپ نے گوشہ نشینی اور عزلت کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ یہ ناپسندیدگی اور نفرت اس وجہ سے آپ کے اندر دریا کے مانند موجزن تھی۔ کیونکہ آپ کو دلوں کے فساد کی اصلاح کا کام کرنا تھا اور تزکیہ وطہارت میں آپ کو ایک نمونہ بننا تھا"۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے اُمّی پیدا کیا آپ نے اپنی زندگی بھر کسی کے سامنے ایک لمحہ کیلئے بھی زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ آپ کو اپنی قوم کی مرغوب شاعری اور پسندیدہ خطابت تک سے نفرت تھی۔ اور آپ اُن میلوں میں بھی شریک نہیں ہوا کرتے تھے جن میں فخر ومباہات کے "مشاعرے" منعقد ہوا کرتے تھے۔

غور کیجئے کہ منصب نبوت کے حصول میں آپ کے کسب واختیار کو کوئی دخل تھا؟ نہیں۔ بلکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی بخشش اور نوازش تھی۔ آپ کا غار حرا میں گوشہ نشین ہونا بھی حصول نبوت کے لئے نہیں تھا۔ بلکہ ماحول کی ابتری اور اس کی گندگی سے گھبرا کر آپ تنہائی پسند ہو گئے تھے۔

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَٰكِن جَعَلْنَاهُ نُورًا نَّهْدِي بِهِ مَن نَّشَاءُ مِنْ عِبَادِنَا ۚ وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (الشوریٰ)

اور اسی طرح ہم نے وحی کی آپ کی جانب روح کو اپنے حکم سے آپ نہ کتاب سے واقف تھے اور نہ ایمان سے آشنا تھے۔ لیکن ہم نے اس وحی کو ایک نور بنایا ہے جس کے ذریعہ ہم جسے چاہتے ہیں ہدایت کرتے ہیں اپنے بندوں میں سے بیشک آپ سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

کہنے کا منشاء یہ ہے کہ جن ہستیوں کے ذریعہ نوع انسانی کو تزکیہ وطہارت، پاکیزگی کردار اور بلندیٔ اخلاق کی تعلیم دینا مقصود ہوتا ہے۔ اس منصب عظیم پر فائز المرام کرنے سے قبل بھی اُن کے اندر خیر وخوبی کی بے پایاں صلاحیت قدرت کی طرف سے

ودلیعت ہوتی ہے اور نبوت کے بعد تو اُن کے ایک ایک قدم اور ایک ایک حرکت کی کامل نگہداشت اور پوری پوری حفاظت کی جاتی ہے
کیونکہ اُن کا سراپا وجود شمع ہدایت اور آفتاب صداقت ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ تاریکیوں اور اندھیروں سے معمور کرۂ ارض کو بقعۂ نور
بنانا مقصود ہوتا ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ٥ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (احزاب ۶)

اے نبی ہم نے تمہیں حق کا گواہ بنا کر بھیجا ہے اور خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن چراغ۔

نبی کی ساری زندگی اسوہ ہے

یہ اس قدر اہتمام و انصرام کس لئے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی چشم بے خطا اُن کے ہر کام کی کیوں اس قدر سخت نگرانی کرتی ہے۔ مرضیٔ رب سے سرِ مو بھی اگر اُن کے قدم کو لغزش ہوتی ہے تو دستِ غیب کیوں انھیں تھام لیتا ہے۔ یہ اس وجہ سے اور صرف اس وجہ سے کہ انھیں دُنیا میں ایک مثالی نمونہ بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ ان کی بعثت کی غرض ہی یہ ہوتی ہے کہ خدا کے بندے ایک ایک قدم اور زندگی کے ہر موڑ پر، مسائلِ حیات کے ہر عقدہ میں اُن کے اسوۂ کامل کو نمونہ بنائیں اور بلا چون و چرا پیروی کریں۔ کیونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں مرضیٔ رب پانے کی یہی ایک سبیل ہے اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم نظر آتے ہیں وہی صراطِ مستقیم ہے۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ الرَّحِیْمٌ۔

کہہ دو اے نبی اگر تم اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کریگا اللہ زیادہ بخشنے والا اور رحم کرنیوالا ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا۔

بیشک تمہارے لئے رسول اللہ کی ذات میں عمدہ نمونہ ہے اس شخص کے لئے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور جس نے اللہ کو زیادہ یاد کیا۔

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:-

"نوعِ انسانی کیلئے رسول اور اس کی تعلیمات کی معرفت۔ اس کے ہر قول کی تصدیق اور اس کے ہر حکم کی اطاعت دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ کیونکہ دُنیا اور آخرت کی کسی بھی کامیابی کا حصول اللہ کے رسول بکار من تقاضے بغیر ناممکن ہے۔ کیونکہ بُرے بھلے کی تمیز اور حُسن و قبح کی معرفت کا وہی ایک واحد ذریعہ ہے۔ اللہ کی رضا اور خوشنودی ان ہی پاک نفوس کے نقشِ قدم پہ چل کر حاصل کی جاسکتی ہے اقوال و افعال اور اخلاق کی شستگی اور پاکیزگی اگر کہیں نظر آسکتی ہے تو ان ہی بے میل سیرتوں کے آئینہ میں۔ پس ان کی زندگیاں ایسی میزان ہوتی ہیں جن پہ کردار و اخلاق تولے جاتے ہیں۔ تاکہ امتیاز خوب و زشت ہو سکے۔ جو شخص جس قدر ان کے نقشِ قدم کا تتبع کرے گا۔ اسی قدر وہ ہدایت و کامرانی سے قریب تر ہوگا اور جس کی زندگی ان کے بتائے ہوئے طریقہ سے جس قدر دُور ہوگی اسی قدر وہ گم کردہ راہ سمجھا جائے گا۔"

اگر مزجسم کو جتنی روح کی ضرورت ہے اور آنکھ کی پتلیاں جس حد تک محتاجِ نور ہیں اس سے ہزاروں درجہ بڑھ کر انسانوں

انبیاء کی ضرورت وہی ہے۔ دُنیا کی کسی ایسی ضرورت کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس کی اہمیت انبیاءؑ کے وجود سے برتر ہو۔ اگر ایک سیکنڈ کے لئے بھی ہمیں انبیاء کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو ہمارے دل کی دُنیا تاریک ہو جائے اور انسانی زندگی ماہی بے آب کی طرح خطرے میں پڑ جائے۔"

(زاد المعاد جلد اوّل صنہ)

نبی دنیا میں ایک نظامِ حیات قائم کرتا ہے

یہ جو علامہ موصوف نے کہا کہ "اگر سیکنڈ کے لئے بھی ہمیں انبیاءؑ کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو ہمارے دل کی دُنیا تاریک ہو جائے"۔ اس میں در اصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نبی انسانوں کو پوری طرح اس رنگ میں رنگنا چاہتا ہے جس میں اللہ بندوں کو رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ انسانی گاڑی کو شیطانی سمت سے بالکلیہ پھیر کر خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پہلے جانا چاہتا ہے۔ وہ دُنیا کے روبرو خدائے تعالیٰ کا ہمہ گیر اور جامع نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور انسانوں کو زندگی کے ایک ایک شعبہ میں اللہ تعالیٰ کی خوشی و ناخوشی سے خبردار کرتا ہے۔

اگر ہم انبیاء کرام کی دینی جدوجہد کو تقسیم کرنا چاہیں تو اس کے تین عنوانات ہوں گے:-

(۱) **اصلاح و تربیت**۔ یعنی انسانوں کے دل و دماغ سے باطل کے خیالات کو کھرچ پھینکنا اور اس کی جگہ ایسے عقائد صحیحہ کو دلوں میں جاگزیں کرنا جو ہر قدم پر شمع راہ کا کام دیں اور ان عقائد کی بنیاد پر اس مطلوبہ سیرت کی تعمیر و تشکیل جس کے بغیر دعوتِ حق ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔

یہ کام فکری و عملی دونوں اصلاحات کا جامع ہوتا ہے اور تنقید و تعمیر دونوں پہلوؤں سے کیا جاتا ہے۔

(۲) **غلبۂ حق**۔ جو لوگ اس سیرتِ مطلوبہ کو اپنے اندر پیدا کر لیں انھیں باقاعدہ منظم کرنا اور اس اُمت کے ذریعہ حق کے خلاف باطل کی جتنی قوتیں ہیں انھیں پاش پاش کر دینا۔

(۳) **نظامِ حق کا نفاذ**۔ جب اقتدار اپنے ہاتھ میں آ جائے اور باطل دب جائے اس وقت نظامِ حق کو اُس کے پورے خدوخال کے ساتھ قائم کرنا اور اسلام کو اپنی صحیح صورت میں بروئے کار لانا۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام مراحل اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ اللہ کی کتاب میں نہ پائے جاتے ہیں اور نہ پائے جا سکتے ہیں۔ اگر ان تمام تفصیلات کو کتاب خود ہی حل کر دیتی تو نبی کی بعثت ہی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔

یہ تو اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا بلکہ سب سے بڑا کرم اور حکمتِ بالغہ ہے کہ اس نے کتاب کے ساتھ معلمِ کتاب کو بھی بھیجا کہ آپ اپنے قول و عمل سے کتاب اللہ کے مفہوم و منشاء کی تشریح تشکیل فرمائیں۔ کسی کتاب کی تعلیم و تشریح کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ کتاب نامکمل ہے اور تعلیم و تفسیر کی محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلمِ کتاب بنا کر بھیجا کہ فہمِ قرآن کے لئے دُنیا اُس کی محتاج تھی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتِ مطہرہ اور حضورؐ کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے نہ ہوتا تو قرآن کی تمام جامعیت اور شانِ تکمیل کے باوجود قرآن کریم کے احکام کا صحیح منشاء متعین کرنے میں بڑی دقت پیش آتی۔ رسولؐ کی سنتِ مطہرہ ان مشکلات کا حل بتاتی ہے اور کتاب و سنت کا حقیقت میں چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

نبی کو قرآن ہی نے یہ منصب عطا کیا کہ وہ اس کے مطالب و مقاصد کی تشریح و توضیح کریں اور یہ منصب صرف نبی ہی کو حاصل ہے۔ لہٰذا اس سے ہٹ کر جو بھی تشریح ہو گی وہ اللہ کے نزدیک مقبول نہیں ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ (النحل ۶)

ہم نے تمہاری طرف ذکر یعنی قرآن نازل کیا تاکہ تم لوگوں کی جانب جو چیز نازل کی گئی ہے اس کی توضیح کر دو تاکہ وہ سوچیں۔

قرآن کی اس تصریح کے مطابق نبی اپنی زندگی میں جو کچھ کرتا اور کہتا ہے اور جس عمل سے اپنی رضامندی ظاہر کرتا ہے (ان ہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام حدیث ہے) وہ سب کے سب خدا کی مرضی پر دلالت کرنے والی چیز متصور ہوگی۔ اور ایک مومن پر اس کی اطاعت واجب ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ ہمارا یقین ہے کہ زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں حق نبی سے جدا نہیں ہوا۔ ورنہ یہ بات لازم آئے گی کہ نبی راہ راست سے ہٹ بھی سکتا ہے۔ اور اس بات کا کوئی شخص مومن رہتے ہوئے تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا حضور اکرم نے اپنے تیئیس سالہ دورِ نبوت میں قرآن کے اجمال کی جو تشریح کی ہے وہ دراصل کتاب اللہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔

نبی محض پیامبر نہیں ہوتا

جو لوگ نبی کو (نعوذ باللہ) محض ہرکارہ یا ڈاکیہ سمجھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کے ذہن، دین کے اس وسیع تصور سے خالی ہیں جسے ہم نے اوپر پیش کیا ہے ورنہ وہ اس قسم کی غیر معقول بات نہیں کہہ سکتے۔

ہم یہاں احادیث کے ذخیرہ سے صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ جس سے آپ کو اس بات کا پتہ چلے گا کہ نبی کس طرح دین کی دعوت کو چلاتا ہے۔ اس کے روبرو ایک ہی سوال پیش ہوتا ہے اور وہ مناسب حال مختلف جوابات دیتا ہے۔ جس طرح ایک شفیق استاد اپنے تلامذہ کو ان کے نفسیات اور حالات کے لحاظ سے موزوں ہدایات سے نوازتا رہتا ہے۔ ایک ماں باپ کے نافرمان لڑکے کے روبرو اطاعت والدین کا درس دیتا ہے، ایک بے نمازی کو نماز کی اہمیت سمجھاتا ہے، ایک حاسد اور کینہ پرور کو محبت و اخوت کی تعلیم دیتا ہے۔ اسی طرح نبی بھی مختلف اوقات میں مختلف قسم کی ہدایات دیتا ہے۔ لیکن کوئی بھی ہدایت اس راہ راست سے ہٹی نہیں ہوتی جس کی طرف نوع انسان کو بلانا ہوتا ہے۔

آپؐ سے دریافت کیا گیا ہے کہ ایمان کی وہ کونسی صفت ہے جس کا مرتبہ سب سے بلند اور فائق ہے۔ جواب ملا:۔

۱۔ ان تحب للہ وتبغض للہ وتعمل لسانک فی ذکر اللہ (مسند احمد) افضل ترین ایمان یہ ہے کہ تمہاری دوستی اور دشمنی اللہ ہی کے لئے ہو اور اپنی زبان کو ہمیشہ اللہ کے ذکر میں مصروف رکھے۔

۲۔ ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا وبالاسلام دینا وبمحمد نبیا (صحیحین) اس شخص نے ایمان کی چاشنی پالی جس نے اللہ کی ربوبیت اور اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر بدل وجان رضامندی اختیار کی۔

۳۔ اسی سوال کے جواب میں ایک مرتبہ فرمایا "خلق حسن" یعنی ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ اچھے اخلاق ہیں۔

افسوس کہ اسی قسم کی احادیث کو منکرین حدیث تضاد بیانی سے تعبیر کرتے ہیں اور انکارِ حدیث کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ لیکن ایک سلیم الفطرت شخص بآسانی ان احادیث کو دیکھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ جائے گا کہ ایک ہی نور سے یہ سب شمعیں مستنیر ہیں۔ اور مختلف ذہنیتوں سے مخاطب کر رہی ہیں۔ ؎

این دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند

اب ذرا آپ ان آیات کا جائزہ لیجئے جس کو منکرین حدیث اپنی مطلب برآری کے لئے دلائل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

لیکن ہمیں ان دلائل کا تفصیلی مطالعہ کرنے سے پہلے کچھ اور اصولی حقائق کو بھی ذہن نشین کر لینا چاہیئے۔

ہر تحریک کے داعی کو دو مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک تو وہ گروہ ہوتا ہے جو اس کی دعوت کا مخالف و معاند ہوتا ہے۔ دوسرا طبقہ اس کے حامیوں اور مددگاروں کا ہوتا ہے اور یہ حمایت، و مخالفت اور عناد و معاونت مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ اور داعی کو ان کی اصلاح اور تربیت اور دعوت سے قریب تر لانے کے لئے مختلف انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مخالفین کے ساتھ اس کا

جو ردیہ ہوگا وہ موافقین کے ساتھ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

چونکہ نبی خدا کی جانب سے ایک حجت بن کر دنیا میں آتا ہے۔ تاکہ موافقین و مخالفین، منکرین و مومنین میں سے ہر ایک اپنے انکار و مخالفت اور تائید و اتفاق میں صاف اور واضح پوزیشن حاصل کرے۔ اس وجہ سے جس طرح نبی اپنے ماننے والوں کی تربیت و اصلاح اور نشو و نما کا سامان کرتا ہے اسی طرح اپنے مخالفین پر اس حیثیت سے حجت قائم کرتا ہے کہ تمہاری مخالفت سراسر گمراہی اور ضلالت پر مبنی ہے اور تمہاری زندگی کا ایک ایک قدم راہ راست سے ہٹا ہوا ہے۔

نبی کا کام کیا ہے؟

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا۔ (مریم ۶)

پس ہم نے قرآن کو تیری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ تو اس کے ذریعہ نیکوکاروں کو خوشخبری سنائے اور جھگڑنے والوں کو ڈرائے۔

لیکن جو لوگ دائرۂ ایمان میں داخل ہو جاتے ہیں اور دین اسلام کو اپنا آئین زندگی اور دستور حیات بنا لیتے ہیں، انہیں بھی وہ انذار و تبشیر ہر مرحلہ میں کرتا رہتا ہے۔ لیکن دونوں حیثیتوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلے وہ خیر خواہی و ہمدردی کے ساتھ محض اللہ تعالیٰ کا پیغام رساں اور نتائج بد و عواقبِ سوء سے چونکانے والا تھا۔ لیکن اب ایک استاذِ شفیق۔ مرشدِ خیر خواہ اور مہربان باپ کی طرح ہر ہر قدم پہ اس کے ماننے والے کو لغزش سے بچاتا ہے۔ اور زندگی کے تمام معاملات میں وہ راہ دکھاتا ہے جسے "سبیلِ رب" کہا گیا ہے۔ یہ فرق ہم نے از خود گھڑ نہیں لیا ہے بلکہ قرآن ہی کا قائم کردہ ہے۔

چنانچہ قرآن نے بتایا نبیؐ کی دعوت اور آپ کی انذار و تبشیر دو قسم کی تھی۔ پہلی قسم اس انذار و تبشیر سے متعلق ہے جس کی وسعت بے پایاں اور اپنے دامن میں عمومیت رکھتی ہے اور جو سارے عالم کو محیط ہے۔

ليكون للعالمين نذيرا۔ (الفرقان ۱)

تاکہ تمام عالم کے لئے ڈرانے والا ہو۔

وما هو الا ذكر للعالمين (القلم ۲)

یہ قرآن تو دنیا والوں کے لئے ذکر ہی ہے۔

انذار و تبشیر کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف ماننے والوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ جسے ہم "انذارِ خاص" کا نام دے سکتے ہیں۔

اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ۔

تم تو صرف اسی شخص کو ڈراتے ہو جو قرآن کی اتباع کرتا ہے اور رحمٰن سے بغیر دیکھے خوف کھاتا ہے۔

ان سب تفصیلات کو سورۂ اعلیٰ کی دو آیتوں میں سمیٹ دیا گیا ہے۔

فذكر ان نفعت الذكرى سيذكر من يخشىٰ ويتجنبها الاشقى .... قد افلح من تزكىٰ

پس نصیحت کیجئے اگر نصیحت فائدہ دے۔ یقیناً اس سے وہ شخص فائدہ اٹھائے گا جو خدا سے ڈرتا ہے اور بدبخت اس سے دور رہے گا ...... کامیاب ہوا وہ شخص جو پاک ہوا۔

یعنی آپ کا جو فریضۂ تذکیر ہے وہ بہرحال پورا ہو کے رہے گا۔ بدکردار و بدباطن چھٹتے چلے جائیں گے اور اس حیاتِ سرمدی عطا کرنے والے فائدہ سے محروم ہوں گے۔ لیکن جو نیکوکار ہیں جن کے دلوں میں تقویٰ و خشیت موجزن ہے۔ وہ اس نعمت سے اور سعادت دارین سے سرخرو اور بہرہ مند ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کے کام کی دو نوعیتیں ہیں ایک ذکر عمومی۔ جس سے بدبخت اور خوش بخت ممتاز ہو جاتے ہیں۔ دوسری جو خوش بخت نبی کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ ان کا "تزکیہ"! نبی کی اس روش کو صرف مجمل ہی نہیں رکھا گیا۔ بلکہ دوسرے مقامات

پر تفصیل بھی کر دی گئی۔

پہلے طبقہ سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوتی ہے:۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَا اَنْتَ بِمَلُوْمٍ۔ — پس آپ ان سے منہ موڑ لیجئے آپ ملامت کردہ نہیں ہیں

لیکن دوسرے گروہ کا ایک فرد تزکیہ کے حصول کے لئے نبیؐ کے پاس آتا ہے اور نبیؐ اس سے ذرا سی بے توجہی دکھاتا ہے تو خدائے برتر کی جانب سے سردار کونین کو ایک ہلکی سی تنبیہ فرمائی جاتی ہے۔ (سورۂ عبس)

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا:۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ۔ — اور نہ دور کیجئے اپنے پاس سے اُن لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:۔

فیکون مامورا ان یذکر المنتفعین بالذکری تذکیرا یخصھم بہ غیر التبلیغ العام الذی تقوم بہ الحجۃ (تفصیل ملاحظہ ہو مجموعہ تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہ عنہ تا ۱۲۱)۔ — آنحضرت اس بات پر مامور تھے کہ جو لوگ قرآن سے فائدہ اٹھانے والے ہوں انھیں اس عام تبلیغ کے علاوہ جس سے حجت قائم کی جاتی ہے خاص تبلیغ و تذکیر بھی فرمایا کریں۔

اسی مفہوم کو قرآن نے مختلف انداز، متنوع اسالیب اور جدا جدا طرز سے مختلف مقامات پر ادا کیا ہے۔ لیکن زیادہ تر مقامات پر روئے سخن مخالفین کی طرف ہوتا ہے اور اس سے قرآن کے دو مقصد ہیں۔ پہلا یہ کہ نبیؐ کو تسلی دی جائے۔ اور یہ حقیقت آشکارا کی جائے کہ تمہارے مخالفین کی بے خدا پرستانہ زندگی اور ایمان سے اُن کی نفرت و عداوت آپ کے رنج و ملال کا باعث نہ بنے۔ اور آپ اُن کی ہدایت کی فکر میں گھُل نہ جائیں۔ ہدایت اور راستبازی کی زندگی گزارنی آدمی کے طلب و ارادہ اور توفیقِ الٰہی پر موقوف ہے۔ پاک جذبات اور سچی تڑپ جب تک نہ پیدا ہو، یہ نعمت ہاتھ نہیں آتی۔ لہٰذا آپ ان سے صرف نظر کر کے اپنے کام "انذار و تبشیر" پر پوری طرح متوجہ ہو جائیے۔ آپؐ کی اس صریح دعوت کے مقابلہ میں مخالفین کا یہ سوال کہ جس عذاب کی تم دھمکی دے رہے ہو اسے ابھی لا دکھاؤ۔ آسمانی مملکت میں کیا کیا ہو رہا ہے اس کی خبر دو۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سراسر تمہارے منصب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ تمہارا منصب یہ ہے ہی نہیں کہ "غیب" کی باتیں بتایا کرو۔ لوگوں پر عذاب کے کوڑے برساؤ۔ یہ کام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کرتا ہے۔ تمہارا کام صرف اس عذاب الٰہی کی آمد سے چونکا دینا ہے۔ جس کے آنے کے بعد ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

اس کا دوسرا مقصد خود منکرین کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ نبی اپنا فریضہ ادا کر چکا ہے۔ اس نے انجام کی خبر دے دی ہے۔ اب اُسکی پیش کردہ راہ پر گامزن ہونا یا اس سے انحراف کرنا تمہارے اختیار میں ہے۔ اگر تم نے کجی ہی کو پسند کیا تو اس کے نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

اسی روشنی میں آپ منکرین حدیث کے دلائل کا مطالعہ کیجئے۔

سورۂ رعد میں یہ آیت آئی ہے:۔

اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (رعد۔۱) — تم تو صرف ڈرانے والے ہو اور ہر قوم میں تمہاری ہی طرح ایک ہدایت کرنے والا آچکا ہے

سورت کی ابتدا ہی سے یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ رب کائنات کی ربوبیت کے کرشمہ سے یہ نظم عالم قائم ہے۔ آسمان بغیر کسی ظاہری سہارے کے قائم ہے۔ سیارے اپنے اپنے محور میں گردش کر رہے ہیں۔ دھرتی اپنا سینہ تمہاری سکونت کے لئے کھولے ہوئے ہے اور انسانوں کی آسائش و آرام کا سامان زمین پر ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔

جس ذات نے ان سب مادی حوائج کی تکمیل کی اس نے تمہارے روحانی تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے یہ آسمانی ہدایت بھیجی ہے۔ تاکہ تمہیں تمہارے اچھے برے اعمال سے باخبر کیا جائے۔ لیکن اس خیر خواہی کے جواب میں تم خدا کے داعی اور اپنے خیر خواہ سے عذاب کا مطالبہ کرتے ہو اور اس سے عجیب و غریب نشانیاں مانگتے ہو۔ کیا تمہیں اتنی بھی عقل و ہوش نہیں کہ نبی کے منصب کو سمجھتے؟ کیا اس کی دعوت کے اجزاء میں یہ بھی شامل ہے کہ تمہارے مطالبات کو پورا کرے؟ اس کا کام صرف خدا کی جانب سے ڈرانا ہے۔

سورۂ صٓ میں قیامت میں اہل جہنم کی دردناک سزاؤں کی داستان بیان کی گئی ہے اور یہ کہ وہ کس طرح ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے۔ اس کے فوراً بعد ارشاد ہوا۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۔　　کہہ دو میں تو صرف ڈرانے والا ہوں۔

یعنی میرا کام یہ ہے کہ جس دردناک عذاب کا ذکر اوپر ہوا ہے اس سے تمہیں باخبر کر دوں۔ ان تنبیہات الٰہی کو سن کر منکرین نے آپ سے دریافت کر رہے ہیں کہ تم آئندہ عذاب کی خبر دیتے ہو اور "نرالی نرالی باتیں" سناتے ہو۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ اس عالم مادی کے پس پردہ "ملاء اعلیٰ" میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے جواب میں دوبارہ ارشاد ہوا۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۔ اِنْ يُّوْحٰى اِلَيَّ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔
(ص - ۵)

مجھے ملاء اعلیٰ کا کوئی علم نہیں ہے۔ جبکہ وہ آپس میں مباحثہ کرتے ہیں میری جانب صرف یہ وحی کی جاتی ہے کہ میں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں۔

سورۂ احقاف میں نزول قرآن کی حقیقت، منکرین کا دلیل و ملاحجت اور رد و نزاع کا ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ یہ لوگ اپنے بغض و عناد کی وجہ سے قرآن کو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساختہ پرداختہ کلام سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن کوئی نئی تعلیم نہیں پیش کر رہا ہے۔ بلکہ اس کی تعلیم وہی قدیم و ازلی تعلیم ہے۔ جسے ہر نبی نے اپنے اپنے دور میں پیش کیا۔ جس کے نتیجہ میں منکرین پر خدا کی پھٹکار ہوتی۔ اس کے جواب میں منکرین عذاب الٰہی سے تمسخر اور استہزاء کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جس عذاب کی دھمکی دے رہے ہو۔ اسے لا دکھاؤ۔

قرآن ان کے اس احمقانہ مطالبہ پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ حقیقت آشکارا کرتا ہے۔

مَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۔

میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہو گا۔ میں تو اس وحی کی اتباع کرتا ہوں جو میری جانب بھیجی جاتی ہے اور میں صرف کھلا ڈرانے والا ہوں۔

سورۂ شوریٰ میں واضح الفاظ میں اسی حقیقت کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔

فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ (۵۶)

اگر وہ انکار کریں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہم نے آپ کو نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے۔ آپ کا کام تو صرف اپنے رب کا پیغام پہنچا دینا ہے۔

یہاں ایک اور اصول بھی ذہن نشین ہو جانا چاہیئے۔ وہ یہ کہ "بلاغ" اور "تبلیغ" کا ترجمہ "پہنچا دینا" ہماری زبان میں عام ہے۔ لیکن اس ترجمہ سے اس لفظ کی پوری حقیقت واضح نہیں ہوتی۔ بلکہ اس لفظ کا لغت سے قریب تر ترجمہ یہ ہوگا۔ "کسی شے کو اُس کی غایت تک پہنچا دینا"۔ ظاہر ہے کہ نبی اپنی دعوت کو اس کی غایت تک بہرحال پہنچا دیتا ہے۔ خواہ دُنیا اُسے تسلیم کر کے اپنے آپ کو دارین کی کامیابی سے مالا مال کرلے یا انکار کر کے اپنی تباہی کا سامان پیدا کر لے۔

یہ تھی ان آیات کی حقیقت۔ جسے مسخ کر کے "فہم قرآن کے دعویداروں" نے خدا کے رسول کو محض ہرکارہ بنا دیا تھا — (اس تصور سے خدا کی ہزار بار پناہ) اور اس سے حضور سے تمام مناصب سلب کر کے اپنے ذمہ لے لئے جو اسے خدا کی جانب سے سونپے گئے تھے۔ تاکہ فہم قرآن اور شرح و تفسیر کتاب اللہ کا حق اُس طرح ادا ہو جس طرح وہ چاہتے ہیں۔

اگر یہی بات صحیح ہے کہ نبی صرف مُبشر و نذیر ہی بنا کر مبعوث کیا گیا تھا اور اس کا کام اسی میں محصور تھا تو نہیں معلوم ان مدعیان عقل و بصیرت کے پاس ان آیات کا کیا جواب ہے۔ جن میں نبی کو ان دو مناصب کے ساتھ اور مناصب پر بھی متمکن کیا گیا ہے۔ مثلاً:-

یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (الاحزاب ۶)	اے نبی ہم نے تمہیں حق کا شاہد، خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور اس کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

کیا نعوذ باللہ خدا کی آیات میں باہم تضاد ہے۔ کیا وہ ایک دوسرے سے آپس میں ٹکراتی ہیں۔ کیا اس کا ایک مقام دوسرے مقام کی شرح و تفسیر کے بجائے ایک دوسرے کی تغلیط کرتا ہے؟

مومنین مخلصین اور نبی کا باہمی رشتہ

ہم نے سطور بالا میں اس بات کو کسی حد تک واضح کر دیا ہے کہ نبی کا "انذار محض" اور "تبشیر محض" صرف منکرین سے تعلق رکھتا ہے باقی رہا مومنین مخلصین کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی تصریح قرآن نے مختلف مقامات پر کی ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ (آل عمران ۱۷)	بلاشبہ اللہ نے مومنین پر احسان کیا جبکہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول اُن کے پاس بھیجا جو اُن پر اللہ کی آیتیں پڑھتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں قرآن اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے بلاشبہ وہ اس سے پہلے صریح گمراہی میں مبتلا تھے۔

یہ آیت تین مقامات پر خفیف سے تغیر کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔ ہم اپنی سہولت کے لئے ان سب آیات کو سامنے رکھ کر اس کی مختصر سی تشریح کرتے ہیں۔

اس آیت میں نبی کے چار کام بتائے گئے ہیں۔ تلاوتِ آیات۔ تعلیم کتاب۔ تزکیۂ نفوس۔ تعلیم حکمت۔

۱۔ تلاوتِ کتاب۔ یہ آپ کے منصب رسالت کا پہلا فریضہ ہے کہ جو وحی اللہ کی جانب سے نازل ہوئی ہے اسے جُوں کا توں بلا کسی کمی بیشی کے دُنیا کے گوش گزار کر دیں۔ اور وحی کے ایک ایک حرف بلکہ ایک ایک نقطہ کو اسی طرح دلوں میں اُتارنے کی سعی کریں جس طرح وہ جبرئیل امین کی زبان سے ادا ہوا تھا۔

تلاوتِ آیات کے اس عموم میں مومنین صادقین کے ساتھ منکرین بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کارِ تبلیغ کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے اور جب تک کوئی شخص حجاباتِ نفس کو چاک کر کے دل و دماغ کے دروازوں کو اس پہلے مرحلے کے لئے کھول نہیں دیتا۔ اس وقت تک دوسرے مراحل پیش نہیں آتے۔ اور نبی کی فیض رسانی اور تربیت و تزکیہ ان ہی لوگوں کے لئے مخصوص ہو کے رہ جاتا ہے۔ جنہوں نے اس نقطۂ اولین پر اس کا ساتھ دیا ہو۔

۲۔ **تعلیم کتاب** ۔ تلاوت کتاب اور تعلیم کتاب، دو جدا جدا چیزیں ہیں اور دونوں نبی کی دو مختلف ذمہ داریوں کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اگر دونوں میں ایک ہی بات بتانی منظور ہوتی تو اس مقام پر جہاں کے کارہائے نبوت کی تقسیم کی جا رہی ہو اس طرح تعلیم کتاب کو ایک مستقل حیثیت دے کر نہیں پیش کیا جاتا۔

تلاوتِ کتاب اور تعلیم کتاب میں وہی فرق ہے جو ایک کتاب اور ایک معلم کے درمیان ہوتا ہے۔ ایک مصنف اپنی تصنیف میں بہت جائے ایسے خلا چھوڑ جاتا ہے بلکہ موجود رہتے ہیں جنہیں معلم اپنی تدریس و تفہیم کے ذریعہ پُر کرتا ہے۔ تلاوت کتاب کے بعد مختلف قسم کے شکوک و شبہات اور اعتراضات پیدا ہو سکتے ہیں اور مختلف قسم کے زاویہ ہائے خیال اُبھر کر سامنے آسکتے ہیں۔ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں یہ سب کچھ ہوا ہے) جن کو خدا کی آیات کی روشنی میں سمجھنا اور حقیقت کے چہرہ سے پردہ ہٹانا یہ آپؐ کے منصبِ تعلیم میں داخل ہے۔

کوئی کتاب ایسی ہو ہی نہیں سکتی جس میں بایں ہمہ اشکالات اور نزاکتیں پائی ہی نہ جائیں۔ آج بھی کتاب اللہ کے بہتیرے ایسے گوشے ہیں جنہیں شمع نبوت کے بغیر دیکھا نہیں جا سکتا۔

یہ کہنا کہ صحابہ کو کتاب اللہ کے سلسلہ میں کسی قسم کے اشکالات پیش ہی نہیں آتے تھے ـــ حد درجہ تاریخ و سیرت بلکہ خود قرآن سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ قرآن مجید میں ایسے بے شمار مقامات ہیں۔ جن میں منکرین کے اعتراضات کے جوابات دے کر اُن کے دلائل کی تردید کی گئی ہے۔ اسی طرح قرآن کے بہت سے اجمالات ہیں۔ جن کے بارے میں خود صحابہ کے دلوں میں خلش پیدا ہوئی۔ انہوں نے ذات رسالت مآب کی طرف رجوع کیا اور قرآن ہی نے اُن کی کھٹک اور خلش کو رفع کیا۔

"یسئلونک عن الساعۃ" (منکرین قیامت کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں) "یسئلونک عن الروح" (وہ روح کے متعلق تم سے دریافت کرتے ہیں) "یسئلونک عن ذی القرنین" (وہ ذوالقرنین کے سلسلہ میں تم سے سوال کرتے ہیں) کیا یہ اور اس قسم کے صدہا مقامات تلاوت کتاب کے بعد جو سوالات پیدا ہوئے تھے اُن کا جواب نہیں ہے؟

خود صحابہ کے متعلق کہا:۔

"یسئلونک عن الاھلۃ" (وہ تم سے ہلال کے متعلق سوال کرتے ہیں) "یستفتونک فی النساء" (وہ تجھ سے عورتوں کے بارے میں واضح بیان چاہتے ہیں) "یستفتونک فی الکلالۃ" (وہ تم سے مسئلہ کلالہ کے سلسلہ میں مزید تفصیل چاہتے ہیں)

تو خر الذکر دونوں مسائل سورۂ نساء میں اجمالی طور پر پہلے ہی سے مذکور تھے۔ لیکن ان کے سننے کے بعد صحابہ کرام کے ذہنوں میں کچھ سوالات اُبھرے۔ جن کا ان آیات میں جواب دیا گیا۔

اگر آپ سنت کی طرف رجوع کریں اور کتب حدیث کا جائزہ لیں تو بلا مبالغہ سینکڑوں مثالیں آپ کو ایسی ملیں گی جن میں قرآن اور دین و شریعت کے سلسلہ میں موافقین کے استفسارات اور مخالفین کے اعتراضات کا صاحبِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب مرحمت فرمایا ہے۔ اور موافقین کی بے کلی اور مخالفین کے شبہات کو دفع کیا ہے۔ امام ابن قیمؒ نے

اپنی کتاب "اعلام الموقعین" جلد ۴ میں ایک سو اٹھ صفحات پر کتب سیرو احادیث سے ان سوالات کو جمع فرمایا ہے جن میں صحابہ کرام نے ذاتِ رسالت کی طرف رجوع کیا ہے اور وہاں سے جواب پایا ہے۔ یہ استفسارات عقائد و ایمانیات، اخلاق و سیرت، عبادات و بندگی، معاملات اور لین دین، احکام و قوانین، غرض دین وشریعت کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

۳۔ تزکیہ ۔ اگر انبیاء کی تعلیمات کا خلاصہ ایک لفظ میں ادا کیا جا سکتا ہے تو وہ یہی لفظ "تزکیہ" ہے۔ "تزکیہ" کے لغوی معنی ہیں۔ "درخت کی اس طرح تربیت و نگہداشت کرنا کہ وہ مناسب ترقی کرے" یہی مفہوم وسیع ہوتے ہوئے انسانوں کی تربیت و اصلاح بلکہ ہر چیز کی اصلاح و درستگی کے معنی میں استعمال کیا جانے لگا۔

ایک نبی اپنے اس منصب کے تحت اپنے ماننے والوں کی زندگیوں کو تعلیمات الٰہی کے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اُن کی سیرتوں کو اس قدر آراستہ و پیراستہ کرتا ہے کہ وہ حق کی زندہ و تابندہ تصویریں کر دُنیا کے روبرو آتے ہیں۔ وہ آئینۂ قلب کو ایسی جلا، اور نور بخشتا ہے کہ اُن کا ایک ایک عمل بلکہ اُن کی ایک ایک ادا حق کی عکاسی کرنے لگتی ہے۔ تا آنکہ نبی کے متبعین اور اس کے پیروکار اس فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہوجاتے ہیں۔ جس کو نوشتۂ الٰہی نے ان کیلئے مقدر کر دیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (اعلیٰ) یقیناً اُس شخص نے کامیابی پائی جس نے اپنے نفس کی اصلاح کی اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا بہت بڑا حصّہ اسی تزکیہ سے متعلق ہے۔ آپؐ نے تزکیہ کے جن حدود و شرائط کا تعین کر دیا ہے۔ جس قسم کے اخلاق و کردار کو اس کے لئے لازم قرار دے دیا ہے آج کوئی مومن اُن سے تجاوز نہیں کر سکتا۔

تزکیہ کا یہ کام فکری اور عملی دونوں پہلوؤں سے ہوتا ہے۔ ہم ان دونوں عنوانات کے تحت دو چار حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ دیکھئے کہ یہ احادیث مبارکہ کس قدر قرآن کے مطالب و مرادسے متصل اور ہم آہنگ ہیں:۔

فکری تزکیہ:۔

۱۔ آپؐ نے مہاجرین کو ہجرت کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "انما الاعمال بالنیات" یعنی یہ تمہارا گھر بار کو چھوڑنا۔ راہ حق میں مصائب سے دوچار ہونا۔ دُنیا کی دولت و ثروت کو ٹھوکر مارنا۔ یہ ایسا کارنامہ ہے جس کے اجر کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا جس کی برکتیں اور فوائد حد شمار سے فزوں تر ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جبکہ تمہاری نیت صاف اور تمہارے اعمال محض رضائے الٰہی کی خاطر وجود پذیر ہوں۔ ورنہ دُنیا کی ہر چیز ممکن ہے مل جائے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رضا ہاتھ نہیں آسکتی کیونکہ اس کے دربار میں ان ظاہری مشقتوں اور کلفتوں کی قدر نہیں بلکہ اس جذبہ کی قدر و قیمت ہے جس کے تحت تمہارے اعمال سرزد ہو رہے ہیں۔ اگر اس میں کوئی کھوٹ اور ریاء کا شائبہ تک پیدا ہو گیا تو تمہارے سارے اعمال اکارت اور ضائع ہو جائیں گے۔

۲۔ حدیث قدسی ہے:۔ من عمل عملا اشرک فیہ معی غیری ترکتہ وشرکہ وانا منہ بری۔ (رواہ الترمذی)

وہی بات جو پہلی حدیث میں بتائی گئی ہے اس میں بھی دہرائی گئی ہے۔ اور ایک انوکھے طریقہ سے۔ گویا ریا اور دکھاوے کی جڑ کاٹ دی گئی۔ بتایا کہ عمل خدا کے دربار میں اسی وقت مقبول ہوگا جبکہ خالصۃً لوجہ اللہ کیا جائے۔ اگر کسی عمل میں ذرا بھی دکھاوے کا حصّہ شامل ہے تو وہ عامل ہی کے منہ پہ دے مارا جائے گا۔

۳۔ اتق اللہ حیث ما کنت ۔ جہاں بھی رہو اللہ کی خشیت دل میں رکھو۔

۴۔ البر ما اطمئن علیہ قلبک والاثم ما حاک فی صدرک وکرھت ان یطلع الناس۔ بھلائی نام ہے اس چیز کا جس پر تمہارا دل (یعنی ایک مومن کا دل) سکون و اطمینان محسوس کرے۔ برائی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ کام جو تمہارے دل میں کانٹے کی طرح چبھے اور تمہیں اپنے اس کام کا اظہار ناپسند ہو۔

عملی تزکیہ:۔

۱۔ کم من قائم لیس لہ من قیامہ الا السھر وکم من صائم لیس لہ من صیامہ الا الجوع۔ کتنے ہی ایسے نمازی ہیں جنہیں اپنے قیام سے سوائے شب بیداری اور کچھ پلے نہیں پڑتا۔ اور بہت سارے ایسے روزے دار بھی ہیں جنہیں سوائے بھوک پیاس کے کچھ ہاتھ نہیں آتا)

۲۔ من لم یدع قول الزور والعمل بہ فلیس للہ حاجۃ فی ان یدع طعامہ وشرابہ (جو شخص کذب بیانی اور اس پر عمل نہیں چھوڑتا اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اللہ کو اس کی دن بھر بھوک اور پیاس کے ساتھ فاقہ کرنے کی کوئی حاجت نہیں)

۳۔ احسان کی تعریف میں فرمایا۔ ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ (یعنی اللہ کی عبادت ایسی ہونی چاہیئے۔ گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے اور تمہارے دلوں کے حال سے واقف ہے)

فکری و عملی تزکیہ کے سلسلہ میں ہم نے احادیث کے چند ٹکڑے پیش کئے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک پر غور کیجئے اور بتایئے کہ کیا یہ اقوال مبارکہ قرآن اور اس کی تعلیمات سے متناقض ہیں یا ان میں تعلیمات کی تشریح و توضیح کر رہی ہیں۔

۴۔ حکمت:۔ لسان العرب میں حکمت کی تعریف یہ کی گئی ہے۔ "الحکمۃ معرفۃ افضل الاشیاء بافضل العلوم" یعنی حکمت نام ہے برتر علم کے ذریعہ اعلیٰ ترشئے کی معرفت کا۔

لہٰذا حکیم اس شخص کو کہا جائے گا جس کے پاس دو خصوصیتیں جمع ہوں۔

۱۔ ایسا علم جو اور علوم سے فائق تر ہو جس کے سامنے دیگر علوم آفتاب کے سامنے ذرّے کی سی حقیقت رکھتے ہوں۔

۲۔ وہ بصیرت و عرفان حاصل ہو جس کے ذریعہ وہ اس علم اعلیٰ کی مدد سے ایسے حقائق سربستہ کا ادراک کرے جن میں خیر و خوبی پائی جائے۔

اگر اس تعریف کے پیش نظر ہم یہ دعویٰ کریں کہ انبیاء حکمت کے اس اعلیٰ مقام پر فائز تھے جس سے بلند تر مقام کا تصور نہیں کیا جا سکتا تو ہمارا یہ دعویٰ بے جا نہ ہوگا۔

کیونکہ انبیاء کے علوم کا سرچشمہ وہ ذات ہوتی ہے جس کے علم و بصیرت کی توصیف سے الفاظ قاصر ہیں اور زبان و لغت ہی تنگ دامنی پر شکوہ سنج ہے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ ان چیدہ ہستیوں میں وہ ملکۂ خیر اور نور بصیرت پیدا کر دیتا ہے جس کے باعث ہر کسی معاملہ میں حق کا ادراک ان پر ذرا بھی دشوار نہیں ہوتا۔ اس نور معرفت اور ادراک حق کی روشنی سے ہر نبی پوری طرح بہرہ ور ہوتا ہے۔ اور اللہ کے نازل کردہ صحیفہ حیات کے ساتھ اس کے ان اسرار و رموز سربستہ کا بھی واقف کار ہوتا ہے۔ جہاں تک کسی نگاہ دور بیں کی بھی رسائی ممکن ہی نہیں ہے۔

قرآن پاک تمام انبیاء کے بارے میں کہتا ہے:۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ۔ (آل عمران ۹)

یاد کرو اس وقت کو جبکہ اللہ نے نبیوں سے کتاب و حکمت کا عہد لیا۔

غالباً اسی حقیقت کی نقاب کشائی کرنے کے لئے امام راغبؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

"الحکمۃ اصابۃ الحق"۔ حکمت حق کی یافت کا نام ہے۔

قرآن کی تصریحات کے بموجب "حق کی یافت" کا یہ ملکہ بدرجۂ اتم تمام انبیاء میں پایا جاتا ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے صاف صاف الفاظ میں اس لفظ کی پوری پوری حقیقت بیان کر دی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

الحکمۃ الفھم الذی ھو سجیۃ ونور من اللہ تعالیٰ۔ حکمت اس فہم کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے نور اور مزاج وخصلت کی شکل میں ملتا ہے۔

سنّت، حکمت ہی کا دوسرا نام ہے

اگر ہم انبیاء کے اس نورِ بصیرت اور حق کے ادراک کی بے خطا صلاحیت کو ایک لفظ میں سمیٹنا چاہیں تو وہ لفظ "سنّت" ہوگا۔ اسی وجہ سے قتادہؒ حکمت کی تعریف میں فرماتے ہیں کہ "وہ سنّت کا نام ہے"۔

امام شافعیؒ اپنی کتاب "الرسالۃ" میں ان آیات کی شرح میں جن میں ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کتاب کے ساتھ حکمت سے بھی نوازنے کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے "الکتاب" کے ذکر کے ساتھ "الحکمت" کا بھی عموماً تذکرہ فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ "الکتاب" سے قرآن مجید مراد ہے۔ "حکمت" کے سلسلہ میں ہم نے علوم قرآن کے رازداروں سے یہ بات سُنی ہے کہ اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے۔ ہمارے خیال میں یہ رائے صحیح ہے۔ اس لئے کہ قرآن کے ذکر کے بعد ہی حکمت کا ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کا شمار کرتے ہوئے فرمایا کہ "آپ انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں"۔ کتاب کے ساتھ حکمت کے اس یکجا ذکر سے سوائے سنّت کے اور کیا چیز مراد لی جا سکتی ہے؟" ۲۴

جب "سنّت" اور "حکمت" کتاب اللہ ہی کے فہم اور اس کی بصیرت کا دوسرا نام ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں باہم متضاد ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ع

اِیں دو شمع اند کہ از یک دگر افروختہ اند!

سنت کیا ہے؟ تعلیمات قرآنی کا عکس۔ روح قرآنی کا نچوڑ اور خلاصہ۔ آسمانی ہدایات کا پرتو۔ مقاصد قرآن کی تشریح۔ اس کے اجمالات کی توضیح۔ اس کے منشاء کی تفسیر۔ اس کے خیالات کی تصویر۔ دقیق ونازک حقائق کی ترجمان۔ اس کے اسرار سربستہ کا انکشاف۔

لیکن کیا خدا کا رسول (نعوذ باللہ) ہوا میں تیر تکّے چلایا کرتا تھا؟ کیا اس کی تعلیمات وارشادات کی حیثیت ظن وتخمین سے آگے کچھ نہیں ہے؟ کیا اس کا فہم وادراک بھی اسی طرح ناقص اور ادھورا ہے۔ جس طرح ہماری عقل نارسا کا حال ہے؟ (معاذ اللہ)

اس کا جواب ہر صاحب بصیرت کے پاس نفی ہی میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ نبی کی زبان سراسر گویائے حق تھی۔ اس کے اعمال سراپا ترجمانِ حق تھے۔ اس کا ہر قول صادقِ حق تھا۔ اس کا ہر عمل راہِ حق کا سنگِ میل تھا۔ اس کا ہر نقشِ قدم سالکانِ راہِ حق کے لئے سرمۂ بصیرت وہدایت تھا۔ بلکہ اس کی ذات ستودہ صفات سے ہر آن حق ہی کے سوتے پھوٹتے تھے۔ اس لئے کہ وہ چشم حق سے دیکھتا تھا گوشِ حق سے سُنتا تھا۔ وہ حق ہی کے لئے اقدام بھی کرتا اور مدافعت بھی! اس کی فکر بھی خطوطِ حق ہی پر اپنی جولانیاں دکھاتی تھی

اس کا ہمیشہ عمل بھی راہِ حق ہی میں گامزن اور محو تگ ودو تھا۔ اسی حقیقت کو صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا کیا:۔ "قسم خدا کی میری زبان سے سوائے حق کے اور کوئی بات نکل ہی نہیں سکتی۔"

وحیٔ آسمانی نے آپ کی پوزیشن کو ان الفاظ میں واضح کیا:۔

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی عَلَّمَہٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ...... فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی .... مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔

قسم ہے ثریا کی جبکہ وہ مائل ہوتی ہے تمہارا ساتھی نہ بہکا اور نہ ہی بے راہ ہوا وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا ہے یہ تو صرف وحی ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے اسے زبردست طاقت والے نے تعلیم دی ہے ...... پس اس نے اپنے بندے کی طرف وحی کی جو وحی کرنا چاہا ...... اس کی نگاہ میں نہ تو کجی پیدا ہوئی اور نہ راہ راست سے ہٹی۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ وجہ نزاع قرآن تھا۔ اس کے سلسلہ میں مشرکین کے جو خیالات تھے اُن کی تردید سورۂ نجم کی ان آیات میں کی گئی ہے اور قرآن کی حقانیت پر پُرزور دلائل پیش کئے گئے ہیں۔

لیکن بتلایئے کہ کیا مخالفین نے نبی کی اس پوری زندگی پر جو کہ قرآن اور بصیرت قرآنی پر قائم تھی۔ یہ الزام نہیں لگایا تھا کہ آپ نعوذ باللہ راہ راست سے منحرف ہوگئے ہیں؟ آپ ہدایت سے دُور اور ضلالت سے قریب ہیں؟ کیا قرآن نے مخالفین کے اس خیال کے علی الرغم یہ دعویٰ نہیں کیا۔

اِنَّکَ لَتَھْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ بیشک آپ سیدھی راہ کی طرف ہدایت کرتے ہیں۔

کیا آپ ایک لمحہ کیلئے بھی یہ تصوّر کرسکتے ہیں کہ خدا کا برگزیدہ نبی کسی بھی وقت راہ راست سے ہٹ سکتا ہے۔ کیا اس کی نگاہ میں کجی آسکتی ہے؟ کیا وہ زندگی کے کسی بھی معاملہ میں صراط مستقیم سے منحرف ہوسکتا ہے؟ کیا قرآن کی تعلیمات نے نبی پر وہ راہ واضح نہیں کردی تھی جس میں گمراہی کے خطرات اور منزلِ مقصود سے دُور ہوجانے کا شائبہ تک نہیں۔

اسی سورۂ نجم کی آیت ۲۸ میں کہا کہ:۔

"جو دشمن تمہاری پیش کردہ تعلیماتِ فطری اور حقائقِ ثابتہ کا انکار کرتے ہیں اُن کے بارے میں یہ واضح ہونا چاہیئے کہ انھیں حقیقت کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ محض اوہام و خیالات خرافات و ظنون کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی تعلیمات کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب کا سب ظن و تخمین ہے۔ اور ظن و تخمین کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہے کہ "وہ کسی بھی صورت سے حق کا فائدہ نہیں دے سکتا" پس آج جو لوگ نبی کی تعلیمات کو دیدہ و دانستہ پس پشت ڈال رہے ہیں محض اپنی خواہشات کا تتبع اور ظن و تخمین کی پیروی کر رہے ہیں۔ قرآن کا واضح اعلان ہے کہ:۔

فَاِنْ لَّمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَکَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا یَتَّبِعُوْنَ اَھْوَآءَھُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ ھَوٰہُ بِغَیْرِ ھُدًی مِّنَ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔

اگر وہ تیری پکار کا جواب نہ دیں تو جان لے کہ وہ اپنی خواہشات کی اتباع کر رہے ہیں۔ اس شخص سے زیادہ اور کون گمراہ ہوگا جس نے اللہ کی ہدایت کی بجائے اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ بیشک اللہ ظالموں کو سیدھا راستہ نہیں دکھاتا۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن قیمؒ ارقام فرماتے ہیں:-

فعل ما لم یات بہ الرسول فھو من الھوی — ہر وہ چیز جس کا ثبوت خدا کے رسولؐ کی جانب سے نہ ہو وہ ھویٰ ہے۔

معلوم ہوا کہ علم کی روشنی، ہدایت کا اجالا، کامیابی کی کرن، اگر کہیں میسر آسکتی ہے تو وہ خدا کے رسولؐ کے نقشِ قدم کی پیروی ہی میں ہے۔

حکمت و بصیرت

ہم نے سطورِ بالا میں بار بار اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رسول اللہؐ کی احادیثِ مبارکہ دراصل قرآن ہی کا پرتو ہیں۔ وہ قرآن سے الگ نہیں ہیں کہ انھیں کوئی دوسری حیثیت دے کر اُن پر بحث و تمحیص کی جائے۔ بلکہ سنت بالکلیہ قرآن ہی سے مستنبط ہے۔ لیکن نبی کے فہم اور دوسرے مجتہدین کے فہم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

یہ کیا بات ہے کہ ہما و شما کو تو رموز و اسرارِ قرآن کی نقاب کشائی کا حق حاصل ہے۔ لیکن وہ ذات جس کا علم بے پایاں ہو جس کے دل و دماغ گنجینۂ علم و معرفت ہوں۔ جس کے روبرو حقائقِ کائنات بے پردہ ہوں۔ جو چشمِ سر ہی سے نہیں چشمِ قلب سے بھی [illegible] معائنہ کرتا ہو۔ جس کی حیثیت یہ ہو۔ انی اری ما لا ترون واسمع ما لا تسمعون" یعنی میں وہ دیکھتا ہوں جسے تمہاری آنکھیں دیکھ نہیں پاتیں اور وہ سُنتا ہوں جس سے تمہارے کان آشنا نہیں ہوتے۔ (ترمذی) جس کی نگاہ عالمگیر اور مشاہدہ کا یہ عالم ہو" ما من شیٔ کنت لم ارہ الا وقد رایتہ فی مقامی ھذا حتی الجنۃ والنار" دُنیا کی وہ تمام چیزیں جنہیں میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا آج مجھے ان سب سے اس مقام پر روشناس کرادیا گیا۔ حتیٰ کہ جنت و دوزخ کا بھی مجھے معائنہ کرایا گیا (بخاری) جس کی وسعتِ نظر کا یہ عالم ہو" طویت لی الارض فرأیت مشارقھا ومغاربھا" میرے روبرو دنیا کو مختصر کر کے پیش کیا گیا۔ چنانچہ میں نے مشرق و مغرب یعنی تمام عالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا (بخاری)

غرض جس کی نگاہوں کے سامنے کائنات کی وسعتیں ہوں کیا اسے کلام اللہ سے ایسے مقاصد و مطالب کے بیان کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جہاں تک ہمارے فکر نارسا کی رسائی نہ ہوتی ہو؟

اسی فکرِ رسا اور فہمِ کامل کو اللہ تعالیٰ نے" اراءۃ اللہ" یعنی اللہ تعالیٰ کی جانب سے سوجھا نے سے تعبیر کیا ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ وَلَا تَکُنْ لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا۔ (النساء ۱۶)

ہم نے آپ پر کتاب اُتاری ہے حق کیساتھ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اس چیز سے جو کہ آپ کو اللہ نے بتایا ہے اور آپ خیانت کرنیوالوں کے حامی نہ ہو جایئے

اس وقت ہم آپ کے روبرو احادیث سے صرف چار مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جن سے آپؐ کے اجتہاد کی نوعیت کسی حد تک واضح ہو گی:-

(۱) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک مرتبہ ایک مقدمہ پیش ہوا۔ مقدمہ کے ایک فریق نے کہا کہ میرا لڑکا اس شخص (مقدمہ کا دوسرا فریق) کے گھر میں خادم تھا۔ اتفاق سے اس کی بیوی کے ساتھ زنا کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ میرے لڑکے پر رجم کی سزا عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے صلح و مصالحت کر کے سو بکریاں اور ایک خادمہ کے عوض اپنے لڑکے کی جان بچائی۔ بعد میں تحقیقِ حال سے معلوم ہوا کہ رجم کی سزا تو اس کی بیوی پر عائد ہوتی ہے۔ میرے لڑکے پر سو کوڑوں اور ایک سال کی جلا وطنی کی سزا ملنی چاہیئے۔ (دوسرے شخص نے اس تفصیل کی تصدیق کی)

یہ بیان سُن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قسم خدا کی میں تمہارے درمیان اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ تمہاری سَو بکریاں اور خادم تمہیں واپس ملنا چاہئیے۔ تمہارے لڑکے کو سَو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا دی جائے گی۔ اور اس کی بیوی پر رجم کیا جائے گا۔" چنانچہ اس کی بیوی نے اعتراف کیا اور آنحضرتؐ کے حکم سے حضرت انس رضؓ نے اس کی بیوی کو رجم کیا۔ (ترمذی کتاب الحدود باب۔ جاء فی الرجم علی الثیب جلد اول ص۱۷۲)

غور کیجئے قرآن مجید میں جلاوطنی اور رجم کی سزائیں بظاہر مذکور نہیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے فرمایا۔ "میں تمہارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔" اسی وجہ سے ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ نے یہ احکام قرآن ہی سے مستنبط فرمائے تھے (اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے)

(۲) ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جہینہ کی ایک عورت نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ میری ماں نے حج کی نذر مانی تھی۔ لیکن ایفائے نذر سے قبل ہی اس کا انتقال ہوگیا۔ کیا میں اس کی جانب سے حج کر سکتی ہوں؟ حضورؐ نے اس کا سوال سُن کر دریافت کیا کہ اگر اس کے ذمہ قرض ہوتا تو کیا تُو اسے ادا نہ کرتی؟ عورت نے اثبات میں جواب دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ "اللہ کا حق تو ادائیگی کا زیادہ مستحق ہے۔" (بخاری جلد اول ابواب العمرہ، باب الحج والنذر عن المیت)

دیکھئے یہاں بھی آپؐ نے حقوق العباد کی اہمیت پر دلالت کرنے والی نصوص سے حقوق اللہ کی اہمیت پر جو استدلال فرمایا ہے۔ وہ مہبطِ وحی کو ہی زیب دیتا ہے۔

(۳) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا۔ "گھوڑے تین قسم کے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ آدمی کے لئے موجبِ زیارتِ اجر ہوں گے، یا کم از کم گناہ کا سبب نہیں بنیں گے۔ یا سببِ معصیت ثابت ہونگے۔ موجبِ اجر اس شخص کیلئے ہوں گے جو خدا کی راہ یعنی جہاد میں انھیں استعمال کرتا ہے۔ ایسا گھوڑا اگر مرغزار میں چھلانگ لگائے پھرتا ہے تو بھی اس کے ہر ہر قدم پر مالک اجر کا مستحق ہوگا۔ حتیٰ کہ اس کی لید اور پیشاب بھی ثواب کا سبب بنیں گے۔ گھوڑا گناہ کا ذریعہ اس شخص کے لئے بھی نہیں ہے جس نے اسے اپنے دُنیوی مفاد کے لئے پالا ہو۔ لیکن اس پر خدائے تعالیٰ کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں انھیں وہ ادا کرتا ہے ہاں موجبِ معصیت اس شخص کے لئے ہوگا جو ریاکاری۔ اسلام اور اہلِ اسلام کی بیخکنی کے لئے گھوڑا استعمال کرتا ہو۔" اس کے بعد آپ سے پوچھا گیا کہ گدھے کے بارے میں آپؐ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا۔ "اس کے متعلق مجھے کوئی صریح ہدایت نہیں ملی ہے۔ البتہ اس جامع ہدایت سے استدلال کیا جاسکتا ہے۔" فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ۔
جو شخص بھی ذرہ برابر بھلائی کرے گا اسے وہ دیکھے گا اور جس نے بھی ذرہ برابر برائی کی تو اسے بھی وہ دیکھے گا۔

(یہ حدیث بالاجمال بخاری جلد اول کتاب الجہاد، باب الخیل ثلاثۃ میں مذکور ہے۔ تفصیل دوسرے مقامات پر ہے)

اس حدیث میں بھی آپؐ نے منصوص سے غیر منصوص پر استدلال کیا ہے۔ یہ سوال کہ خود گھوڑوں کے بارے میں آپؐ نے جو تفصیل کی ہے۔ وہ کہاں سے ماخوذ ہے؟ اس وقت ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔

(۴) ایک بدوی صحابی نے آپؐ سے پوچھا۔ قسم خدا کی کیا اللہ نے آپ پر پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے۔ آپؐ نے کہا بخدا ہاں۔ (صحیحین)

ہمارے اس بنیادی دعوے کی تصدیق اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ جب تک آپؐ کے نزدیک کوئی واضح دلیل نہ ہوتی یا استنباط کے لئے کوئی خاص نص پیشِ نظر نہ ہوتی۔ اس وقت تک مسائل نہیں بیان فرماتے تھے۔ مثلاً:۔

(۱) حضرت یعلیٰ فرماتے ہیں کہ حج کے موقع پر ایک شخص نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر کوئی شخص زعفران سے رنگے ہوئے کپڑوں میں احرام باندھ لے تو کیا اس کا احرام صحیح ہوگا؟ آنحضرت نے یہ سوال سُن کر سکوت اختیار کیا۔ یہاں تک کہ اللہ کی جانب (وحی) سے آپ کو جواب بتایا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد آپؐ نے سائل کا جواب دیا کہ اس رنگ کو دھودو اور کپڑا استعمال کرو۔ (بخاری کتاب المناسک)

(۲) ابن حبان اور حاکم میں ابن عمرؓ کی سند سے ایک حدیث مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ کرۂ زمین پر سب سے بہتر مقام کونسا ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا۔ "مجھے اس کا علم نہیں ہے" اتنے میں حضرت جبریل کی تشریف آوری ہوئی تو آپؐ نے اُن سے دریافت فرمایا۔ حضرت جبریل نے اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر بتایا کہ زمین پر سب سے بہتر مقام مسجد ہے۔ اور سب سے بدتر مقام بازار ہے۔ چنانچہ آپؐ نے سائل کو جواب دیا۔ (فتح الباری جلد ۱۳ ص ۲۲۲)

اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے امام بخاریؒ نے دوؔ قسم کے دوؔ باب کتاب الاعتصام میں باندھے ہیں:۔

باب ماکان النبیؐ سیال مما لم ینزل علیه الوحی فیقول لا ادری اولم یجب حتی ینزل علیه الوحی ولم یقل برای ولا قیاس لقوله تعالیٰ بما اراک اللّٰه وقال ابن مسعود سئل النبی عن الروح فسکت حتی نزلت۔

باب اس امر کے بیان میں کہ آنحضرتؐ سے اگر کوئی ایسی چیز دریافت کی جاتی جس کے متعلق وحی نازل نہ ہوئی تو آپؐ صاف فرمادیتے کہ مجھے اس کا علم نہیں یا سکوت اختیار فرماتے۔ تا آنکہ آپؐ پر وحی نازل ہوتی۔ اور آپ محض رائے اور قیاس سے (جس کی بنیاد وحی پر نہ ہو) کبھی جواب نہ دیتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ سے مشرکین نے روح کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے سکوت اختیار کیا۔ یہاں تک کہ قرآن میں روح کے متعلق آیات نازل ہوئیں اور آپ نے بیان کیا۔

آگے چل کر باب باندھتے ہیں۔

باب من شبه اصلا معلوما باصل مبین قد بین اللّٰه حکمها لیفهم السائل۔

باب اس حقیقت کے بیان میں کہ ایک واضح اصل کے ذریعہ جس کا حکم اللہ نے بیان کردیا ہو ایک اصل معلوم کی تشبیہ دی جاسکتی تاکہ سائل سمجھ سکے۔

اس نورِ بصیرت کے باوجود اگر قدم ہدایت بال برابر بھی ادھر اُدھر ہوتا تو دستِ غیب فوراً تھام لیتا۔ عام مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر آپؐ کے پانچ اجتہادات پر ٹوکا گیا ہے۔ (واقعہ اساری بدر۔ الانفال ۶ ۹۔ تبوک میں منافقین کو اُن کے جھوٹے عذروں پر اجازت دینا۔ التوبہ ۶ ۷۔ مشرکین کے لئے طلب مغفرت۔ التوبہ ۶ ۱۴۔ شہد کا خود پر ممنوع کرلینا۔ التحریم ۶ ۱۔ واقعہ عبداللہ بن مکتوم عبس)

بعض مفسرین نے تو ان میں سے صرف دوؔ یا تین کو تسلیم کیا ہے۔ ان واقعات میں سے ہر ایک واقعہ آپؐ کی رائے ہی سے متعلق ہے۔ یہ تنبیہات قرآن کے علاوہ احادیث میں بھی مذکور ہیں۔ مثلاً:۔

(۱) ایک مرتبہ آپ جہاد کی فضیلت پر خطبہ دے رہے تھے۔ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ اگر مَیں خدا کی راہ میں شہید ہوجاؤں تو کیا میرے سب کے سب گناہ معاف کردیئے جائیں گے؟ آپؐ نے جواب دیا ہاں اگر تم نے اخلاص کے ساتھ خدا کی راہ میں جنگ کی اور

نازک ترین موقع پر بھی پیٹھ نہ پھیری تو ایسا ہی ہوگا۔ صحابی نے مزید اطمینانِ خاطر کے لئے دوبارہ یہی سوال کیا۔ آپؐ نے بھی دوبارہ وہی جواب دیا۔ اس کے بعد فرمایا۔ ہاں سُن لو اگر تم پر کسی کا قرض ہو تو معاف نہیں کیا جائے گا۔ ابھی ابھی جبرئیل نے مجھے اس کی خبر دی ہے (ترمذی، کتاب الجہاد ص۲۱۲ جلد اول)

(۲) ایک مرتبہ آپؐ جوتوں کے ساتھ نماز پڑھا رہے تھے۔ اتفاق سے اس میں کچھ نجاست لگ گئی تھی۔ فوراً جبرئیل نے بتایا کہ آپ کے جوتے ناپاک ہیں انھیں نکال دیجئے۔

یہ بروقت تنبیہات محض اس وجہ سے ہوتی تھیں کہ اگر آپؐ کے ارشاد میں کوئی غلطی رہ گئی یا آپ کا کوئی فعل غلط ہوگیا تو قیامت تک اُمت اس غلطی میں مبتلا رہے گی۔

یہی معنی ہیں عصمت انبیاء کے اور یہی فرق ہے ایک نبی کی بصیرت اور دوسرے مجتہدین کے اجتہادات میں۔ ایک مجتہد خواہ اس کی نظر کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو اور اُسے اور منشائے خداوندی کے پانے میں نبی کی گردِ راہ تک بھی اس کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اس کی غلطی اور چوک پر خدا کی جانب سے بروقت تنبیہ ہوتی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ رازدارِ شریعت اور دین کے حقائق کا آگاہ کون ہو سکتا ہے۔ آپ کے متعلق ابن سیرینؒ فرماتے ہیں:-

"حضرت ابوبکرؓ کے روبرو جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو اس کا حل کتاب اللہ میں تلاش کرتے۔ اگر وہاں سے کوئی حل نہ پاتے تو سنتِ رسولؐ کو تلاش کرتے۔ لیکن اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوتی تو اپنی جانب سے اجتہاد کرتے اور فیصلہ دیتے ہوئے یہ بھی فرما دیتے کہ یہ ایک معمولی سے آدمی کی رائے ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اللہ کی توفیق اور اس کی مدد کا نتیجہ سمجھئے اور اگر غلط ہو جائے تو یہ میرے فہم ناقص کا قصور ہے۔ جس پر میں خدا سے معافی چاہتا ہوں"۔ (اعلام الموقعین جلد اول ص۵۴)

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:-

یا ایہا الناس ان الرای انما کان من رسول اللہ لان اللہ کان یریہ وانما ہو منا الظن والتکلف (ابوداؤد کتاب القضیہ)	لوگو آنحضرتؐ کی رائے درست ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ اللہ آپؐ کو حقیقتِ حال سے واقف کرا تا تھا ہم محض ظن و قیاس سے کام لے سکتے ہیں۔

یہی وہ چیز ہے جسے زبانِ رسالتؐ نے "مثل کتاب" سے تعبیر کیا ہے اور اس کی اتباع بھی امت پر لازم قرار دی ہے۔

الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم فیہ من حرام فحرموہ الا لا یحل لکم الحمار الاہلی ولا کل ذی ناب من السباع ولا لقطۃ مال معاھد۔ (رواہ ابوداؤد وروی الترمذی والبیہقی مختصراً صحاح)	سُن لو مجھے قرآن اور اسی کے ساتھ اسی جیسی ایک اور چیز بھی عطا کی گئی ہے ہو سکتا ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے جبکہ کوئی پیٹ بھرا شخص اپنے تخت پر یہ کہنے لگے کہ تم صرف کتاب اللہ کو تھامے رہو جو اس میں حلال ہے اسے حلال سمجھو اور جو حرام ہے اسے حرام۔ سُن لو تمہارے لئے گھریلو گدھا، کچلی والا کوئی درندہ اور معاہد کی گری پڑی چیز کا استعمال جائز نہیں ہے۔

کیا مسلمانوں کی شومئی بخت اور بدنصیبی سے آج انھیں وہ زمانہ بد دیکھنا نصیب نہیں ہوا ہے۔ جس کی اس صادق و مصدوقؐ نے خبر دی تھی!

خود اس حدیث کے ایک ایک حکم پر اگر آپ غور سے نگاہ ڈالنے کی زحمت گوارا کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک حکم نصوص کتاب اللہ

ہی سے ماخوذ ہے یا کم از کم قرآن کے کلی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

مثلاً پالتو گدھے کا مسئلہ لیجئے۔ ماکولات کی تحریم کے سلسلہ میں قرآن پاک میں جتنے بھی احکام وارد ہوئے ہیں ان میں اور بہت ساری علتوں کے ساتھ ایک علت اُبھری ہوئی نظر آئے گی۔ وہ ہے فطرتِ انسانی کا اس نوع کے استعمال سے انکار۔ مثلاً مُردار۔ خون وغیرہ۔ اور یہ علت پالتو گدھے میں بلاشبہ پائی جاتی ہے۔

اسی طرح "نقضِ معاہدہ" کا حکم "وَاَدُّوا الاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا" (امانتوں کو ان کے اہل تک پہنچا دو) سے صاف طور پر مستنبط معلوم ہوتا ہے۔

ہماری اس طول طویل بحث کو شاہ ولی اللہ صاحب کی کی زبان میں چند سطروں میں ملاحظہ فرما لیجئے:۔

"معلوم ہونا چاہیئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جتنی چیزیں مروی ہیں اور جنہیں کتب حدیث میں محفوظ کر لیا گیا ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کا تعلق آپ کے منصب رسالت سے ہے جس کے متعلق اللہ نے کہا

مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ — جو کچھ تم کو رسول دے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے رک جاؤ۔

اسی قسم میں علوم قیامت، عجائبات ملکوت وغیرہ شامل ہیں۔ جن کا نقط بلفظ وحی سے ماخوذ ہے۔ اسی منصب رسالت کے تحت شریعت کی تفصیلات، عبادات کی تحدید و تعیین اور تہذیب و تمدن کے اصول بھی ہیں۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ ان میں سے کچھ حصہ براہ راست وحی الٰہی سے ماخوذ ہے۔ اور کچھ حصہ آنحضرتؐ کی خدا داد بصیرت کے اجتہاد پر مبنی ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہونی چاہیئے کہ نبی کا اجتہاد بھی وحی کا قائم مقام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نبی کو اجتہادی غلطی پر بھی باقی نہیں رکھتا۔ (اللہ تعالیٰ کی جانب سے فوراً تنبیہ کی جاتی ہے) زیادہ تر ایسا ہوتا تھا کہ آپؐ کو اللہ تعالیٰ شریعت کے مقاصد تعلیم کر دیتا تھا اور وہ قوانین بتا دیتا تھا جن سے احکام شرعیہ کا استنباط اور اُن میں آسانی و سہولت اور ساتھ ہی اُن میں استحکام اور مضبوطی بآسانی آپؐ کیا کرتے تھے۔ اسی منصب رسالت سے وہ احکام اور مصالح بھی تعلق رکھتے ہیں جنہیں مطلق رکھا گیا ہے اور اس میں کسی قسم کی تحدید و تعیین نہیں کی گئی ہے۔ مثلاً اخلاق صالحہ و سیئہ کا بیان۔ ان میں سے بیشتر حصہ آپ کے اجتہاد ہی پر مبنی ہے۔ وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اصول تہذیب و تمدن سے واقف کرا دیتا ہے اور آپ ان سے کوئی حکمت اخذ کر کے اسے اصول اور اساس کی حیثیت دے دیتے ہیں۔ فضائل اعمال، نیکوکاروں کے مناقب بھی اسی منصب سے متعلق ہیں۔ ان کے بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ بعض چیزیں آپؐ کو وحی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ اور بعض چیزوں میں آپ اجتہاد فرماتے ہیں۔ ....." (حجۃ اللہ باب اقسام علوم النبی جلد اوّل)

یہ جو ہم نے دعویٰ کیا کہ سنت کتاب سے مخالف اور متبائن کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ دونوں ایک ہی حقیقت کے ترجمان ہیں۔ فرق صرف اختصار و اطناب اور اجمال و تفصیل کا ہے۔ ہمارا دعویٰ کوئی نیا دعویٰ نہیں ہے۔ بلکہ دورِ اوّل میں بھی کتاب و سنت میں صرف اسی قدر فرق سمجھا جاتا تھا بقیہ موشگافیاں بعد کی پیداوار ہیں۔ چنانچہ ہم آپ کے روبرو ایک دو واقعات رکھتے ہیں:۔

(۱) حضرت عمران بن حصینؓ سے ایک شخص نے کہا کہ قرآن کے علاوہ ہمیں کوئی اور چیز نہ سنائیے۔ یہ سن کر حضرت عمرانؓ برافروختہ ہو گئے۔ اور فرمایا کہ تم عقل سے کورے معلوم ہوتے ہو۔ کیا قرآن میں نماز کی رکعات۔ ان کی تعداد اور طریق ادا۔ زکوٰۃ کا نصاب اس کے حدود وغیرہ کا ذکر ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجمل ہے سنت اس اجمال کی تفصیل کا نام ہے۔

(۲) حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو معلوم ہوا کہ ایک عورت اپنے جسم پر گودنا لگاتی ہے۔ یہ سن کر آپ نے کہا کہ اس پر لعنت ہو۔ اس

بات کا علم اس عورت کو ہوگیا۔ چنانچہ حاضرِ خدمت ہوکر اس نے دریافت کیا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے ان اوصاف والی عورت پر لعنت کی ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ اللہ نے جس عورت پر لعنت بھیجی ہو میں کیوں اس پر لعنت نہ کروں؟ یہ سن کر عورت نے کہا۔ کہ میں نے قرآن پڑھا ہے۔ لیکن آپ کا یہ دعویٰ میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا۔ تُو نے قرآن سمجھ کر نہیں پڑھا ہے۔ کیا اللہ کا یہ فرمان نہیں ہے:۔

مَا اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔ جو اللہ کا رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کرے اس سے رُک جاؤ۔

چنانچہ حضورؐ نے زینت کے لئے پچھنا لگانے والی۔ دانتوں کی خراش تراش کرنے والی اور مصنوعی بالوں کو چوٹی میں ملاکر گوندھنے والی عورت پر لعنت کی ہے (یہ حدیث تفصیل سے مسلم اور ابوداؤد میں مذکور ہے۔ ہم نے خلاصہ پیش کیا ہے) اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ آنحضرتؐ نے جن امور سے منع کیا ہے وہ سب "تغییرِ خلق اللہ" ہی کی تفصیل ہیں۔ جسے قرآن میں شیطانی فعل کہا گیا ہے۔

(۲) عبدالرحمٰن بن یزیدؒ نے ایک محرم کو دیکھا کہ وہ احرام کے لباس کے بجائے روزمرہ کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ آپ نے اُسے منع کیا۔ اس نے جواب دیا کہ قرآن کی کوئی آیت بتلائیے تاکہ میں اپنا لباس نکال لوں۔ حضرت عبدالرحمٰنؒ نے جواب میں مذکورہ بالا آیت "مَا اٰتاکم الرسول" الخ پیش کی اور حدیث سے استدلال کیا۔

امام ابنِ قیمؒ اعلام الموقعین جلد ۲ ص۲۳۳ پر لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح اپنے کلام کی شرح و تفسیر کا حق ادا کیا ہے بالکل اسی طرح آپؐ کو منصب تشریع پر بھی فائز فرمایا ہے۔ اگر ذرا دقتِ نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کا ہر قول اور ہر کلمہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بیان ہی ہے۔ سنّت میں قرآن مجید پر جو اضافے نظر آتے ہیں وہ کسی صورت سے بھی حدودِ بیان و شرح سے زائد نہیں ہیں بلکہ سلفِ صالحین جب بھی کوئی حدیث سنتے تو اس کی تصدیق قرآن مجید میں پالیتے۔ ان میں سے کسی نے کسی بھی حدیث کے بارے میں کبھی یہ نہیں کہا کہ یہ قرآن مجید پر اضافہ اور زیادتی ہے۔ رسولؐ اکرم کی ذاتِ گرامی اور آپ کی سنتِ مطہرہ ان کے نزدیک اس تصور سے بہت ہی ارفع و اعلیٰ تھی"۔

قرآن و سنّت کا باہمی ربط

قرآن و سنّت کے باہمی ربط کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا مبلّغ بناکے بھیجا ہے جو تبلیغ وحی کے ساتھ مقاصدِ وحی اور اس کے اصول و کلیات کی تعیین و تشریح بھی کرتا ہے۔ پس آپؐ نے اپنی امت کے لئے جس چیز کو بھی مشروع کیا ہے وہ خدا کی جانب ہی سے بیان و تفسیر اور اسی کو دین و شریعت تصوّر کیا جائے گا۔ عمل اور اتباع کے لحاظ سے وحی الٰہی اور آپ کی شرح و تفسیر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ جس زبانِ مبارک سے الفاظ وحی صادر ہوئے تھے اسی بے خطا اور معصوم زبان سے اس کی شرح و تفسیر بھی ادا ہوئی تھی"۔

اللہ تعالیٰ نے قیامِ صلوٰۃ۔ ادائے زکوٰۃ۔ حج کعبہ اور رمضان کے روزے فرض کئے ہیں۔ اور حضور اکرمؐ نے ان کی مقدار کی تعیین اور آداب و شرائط کی توضیح فرمائی ہے۔ چونکہ یہ تفصیل اللہ تعالیٰ کے احکام ہی کی تفصیل ہے اس لئے جس طرح ان اجمالات پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح تفصیل پر ایمان لانا بھی ناگزیر ہے"۔

"اس حقیقت کو واضح طور پر سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ کتاب و سنت کے باہمی ربط کو آشکارا کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جو بھی کلمات صادر ہوئے ہیں۔ اُن کی کئی قسمیں ہیں۔

(۱)۔ نفسِ وحی کا اظہار کہ آپؐ کے بتانے سے قبل کوئی شخص کسی طرح اس سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔

(۲)۔ جو لوگ وحی الٰہی کے منشاء و مراد کے پانے سے قاصر ہوں انھیں اللہ تعالیٰ کا مقصود و منشاء بتانا۔ مثلاً جب یہ آیت نازل ہوئی:۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ ۔ — جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا تو اُن کیلئے امن ہی امن ہے۔

تو صحابہ کو سخت تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ اس آیت کا مطلب کیا ہے؟ کیونکہ ہم میں سے ہر شخص کبھی نہ کبھی ظلم کا کام کر ہی دیتا ہے۔ تو آپؐ نے قرآن کے دوسرے مقامات (سورۂ لقمان ۱۳) سے تشریح کرتے ہوئے بتایا کہ یہاں ظلم سے مراد شرک ہے۔

قرآن میں سحری کے اوقات بتاتے ہوئے یہ الفاظ آئے:۔

حَتّٰى یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ۔ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے ممتاز ہو جائے۔

آپؐ نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ سفید اور سیاہ دھاگے سے سپیدیٔ صبح اور تاریکیٔ شب مراد ہے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى — اور بیشک محمدؐ نے اس کو دوسری مرتبہ دیکھا۔

اس آیت کی تفسیر میں فرمایا۔ یہ رویتِ خداوندی نہیں بلکہ جبرئیل کے دیکھنے کا تذکرہ ہے۔

یا یہ کہ جب یہ آیت اُتری:۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو معبود بنا لیا۔

تو صحابہ کو اس کے سمجھنے میں اشکال پیش آیا۔ آپؐ نے بتایا کہ احبار و رہبان کو معبود بنا لینے کا مفہوم انھیں تحلیل و تحریم کے اختیارات دینا ہے۔

(۳) قرآن کے اجمالات کی اپنے عمل کے ذریعہ تفصیل کرنا۔ چنانچہ جب ایک صحابی نے آپؐ سے اوقاتِ نماز دریافت کئے تو آپ نے انھیں پنجگانہ اوقات دو دن نماز پڑھ کر بتائے۔

۴۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپؐ سے کوئی سوال کیا جاتا۔ جس کے متعلق قرآن میں کوئی تصریح نہیں ہوتی۔ اس سوال کے بعد وحی الٰہی نازل ہوتی اور آپؐ اسے بیان فرماتے۔ مثلاً آپؐ سے ایک صحابی نے دریافت کیا کہ اگر شوہر اپنی بیوی کے زانیہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا حکم کیا ہے تو آپؐ نے وحی الٰہی کے ذریعہ بتایا کہ دونوں کے درمیان ملاعنہ ہوگا (یعنی اگر بیوی شوہر کے عائد کردہ جرم کا انکار کر دے تو ہر ایک سے اپنی اپنی صداقت پر قسم لی جائے گی اس کے بعد اُن کے درمیان مفارقت کر دی جائے گی)

(۵) کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ سے سوال کیا جاتا اور آپ اشارۂ الٰہی پا کر اس کا جواب دیتے اور یہ چیز نفسِ قرآن میں داخل نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر آپ سے ایسے کپڑے میں احرام باندھنے کے بارے میں دریافت کیا گیا جسے رنگا گیا ہو۔ آپ نے فرمایا کہ جبرئیل نے مجھے بتایا ہے کہ اس رنگ کو دھو دیا جائے اور استعمال کیا جائے۔

(۶) بسا اوقات آپؐ کے پیشِ نظر کوئی سوال تو نہیں ہوتا لیکن کچھ خاص مسائل کی تعلیم دینی مقصود ہوتی۔ اس لئے آپ بیان فرما دیتے۔ مثلاً حرمتِ مدینہ۔ گھریلو گدھے اور متعین تحریم وغیرہ۔

(۷) اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو بعض چیزوں کی خاص طور پر اجازت دی تھی اور وہ اُمت کے لئے ممنوع تھیں۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی تصریح کی۔

(۸) آپؐ کے روبرو کوئی کام ہوتا۔ اس سلسلہ میں آپ کے سکوت، اظہارِ مسرت، منع، کراہت و ناپسندیدگی سے حلت و حرمت۔ استحباب و کراہت معلوم کر لی جاتی۔

(۹) آپؐ نے ایک اصول امت کو بتا دیا کہ جن چیزوں کی حلت و حرمت کا ثبوت کتاب و سنت میں موجود نہیں ہے۔ اللہ نے اس کی حلت کا فیصلہ کر دیا ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت ان مختصر سے احکام کے علاوہ جو تحریم کے سلسلہ میں وارد ہیں۔ دُنیا کی ایک ایک شے جائز قرار پاتی ہے۔

(۱۰) قرآن میں بعض چیزوں کی حرمت و حلت کا مطلق حکم لگایا گیا ہے۔ لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس کے شروط۔ موانع، قیود، اوقات مخصوصہ کی تحدید و تعیین ہوئی ہے۔

مثلاً۔ قرآن نے کہا: "احل لکم ما وراء ذالکم" مذکورہ بالا محرمات کے علاوہ سب حلال ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ محض کسی عورت کا ہاتھ پکڑ لینے سے وہ حلال نہیں ہو جاتی۔ بلکہ باقاعدہ قیدِ نکاح میں لانے کی ضرورت ہے۔ نکاح کے کچھ شرائط اور حدود ہیں۔ ان کا لحاظ کئے بغیر نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

یہ تمام قسمیں زائد علی الکتاب اور ناسخ کتاب نہیں ہیں بلکہ منشاء الٰہی کی توضیح کرتی ہیں۔

احادیث کی تین قسمیں

احادیث کے سارے ذخیرے کو اگر ہم تقسیم کرنا چاہیں تو تین قسموں[1] میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) پہلی قسم اُن احادیث کی ہے۔ جن میں آپؐ نے قرآن ہی کے مطالب کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا۔ گویا سنت قرآن ہی کے احکام کی مزید تاکید کر رہی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے:۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۔

قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تجھے اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں پھر وہ تیرے فیصلے سے دل میں کوئی تنگی نہ محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر تسلیم خم کر دیں۔

اسی بات کو زبانِ محمدی نے مختلف طریقوں سے ادا کیا ہے۔

واللہ لا یکون احد کم مومنا حتی یکون هواه تبعا لما جئت به

قسم خدا کی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشات میری تعلیمات کے نیچے دب نہ جائیں۔

واللہ لا یکون احد کم مومنا حتی اکون احب الیه من والده وولده والناس اجمعین

قسم بخدا تم میں سے کوئی شخص اسی وقت مومن ہو سکتا ہے جبکہ میں اس کے نزدیک اسکے والدین اور اسکی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔

قرآن کہتا ہے:۔

---

[1] یہ تقسیم امام شافعیؒ نے کتاب الرسالہ ص۲۸ پر اور امام ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین جلد ۲ ص۳۰۲ پر کی ہے۔ تشریح اور مثالیں ہم نے اپنی جانب سے پیش کی ہیں۔

مَن یُؤتَ الحِکمۃَ فقد اُوتِیَ خیراً کثیراً۔ جسے حکمت دی گئی ہے اسے بلاشبہ بہت بڑی بھلائی سے نوازا گیا۔

آنحضرتؐ نے ان الفاظ میں اس مضمون کو یوں ادا کیا۔

من یُرِدِ اللّٰہُ بہ خیراً یُفقِّہہُ فی الدّین۔ اللہ تعالیٰ جس شخص کیساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔

قرآن میں جا بجا نبوت اور اس کے نتائج کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح بارش کے برسنے کے بعد زمین میں روئیدگی اور لالہ و گل کی بہاریں عود کر آتی ہیں۔ اسی طرح نبوت کے ذریعہ دلوں کی دنیا میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ آنحضرتؐ نے اس تمثیل اور اس کے مختلف نتائج کو اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا:۔

"میری نبوت کی مثال بارش کی سی ہے۔ جو تین قسم کی زمینوں پر برستی ہے۔ ایک زمین تو وہ ہے جس میں پانی کے جذب کرنے کی صلاحیت ہے اور اس کی مٹی زراعت کے لئے نہایت مفید ہے۔ ایسی زمین نے اس بارش سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اپنا دامن بھی گل دیا من سے بھر لیا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا (مسلم)۔ دوسری زمین ایسی ہے جس کے سینہ میں پودوں کے نشوونما کی صلاحیت نہیں ہے۔ البتہ اس زمین میں ایسے گڑھے موجود ہیں جن میں بارش کا پانی جمع ہو جاتا ہے۔ جس سے دوسرے لوگ سیراب ہوتے ہیں (عالم بے عمل یا منافق)۔ تیسری وہ سنگریزہ اور ڈھلوان زمین ہے جس میں نہ تو پانی جذب کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ اس میں پانی جمع ہوتا ہے کہ اس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھائیں"۔

ان کے علاوہ بے شمار احادیث میں آنحضرتؐ نے اپنے بیان کے استدلال میں قرآن کی آیت تلاوت فرمائی ہے یا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر انھیں جمع کیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

(۲) احادیث کی دوسری قسم اُن امور سے متعلق ہے۔ جن میں قرآن کے اجمالات کی توضیح کی گئی ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔

(۳) احادیث کی تیسری قسم اُن احکام سے تعلق رکھتی ہے۔ جن کا احادیث میں ثبوت ہے۔ لیکن قرآن بظاہر ان کے سلسلہ میں خاموش ہے۔

تیسری قسم کی احادیث کے سلسلہ میں علماء کے درمیان یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا یہ آپ کے اتباعِ عمومی کے تحت آتی ہیں جس کی وجہ سے ہمیں آپؐ کا ہر حکم بے چون و چرا تسلیم کرنا ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر آیا آپؐ نے اپنے طور پر انھیں مشروع کیا ہے یا وہ قرآن ہی کے اجزاء ہیں۔

امام شافعیؒ لکھتے ہیں:۔

"اس آخری قسم کی احادیث کے سلسلہ میں علماء مختلف الرائے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ آپؐ کے اتباعِ عمومی کے تحت آتی ہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ حضورؐ نے کوئی بھی حکم ایسا نہیں دیا جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ملتی ہو بلکہ آپؐ کا ہر حکم کتاب اللہ سے ماخوذ ہے۔ (الرسالت ص۲۵)

ہم حد درجہ غور و فکر کے بعد اس دوسرے گروہ کی حمایت پر مجبور ہیں۔ اس موضوع پر ہم اپنی جانب سے کچھ سپردِ قلم کئے بغیر علامہ شاطبیؒ کی ایک جامع و مانع تقریر کسی قدر ترمیم و اضافہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے تشریحی اضافوں کو قوسین میں کر دیا ہے۔

اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ سنت کتاب اللہ ہی کا جزو ہے اور اس سے الگ کوئی چیز نہیں ہے تو جو لوگ سنت کو ایک ذہنی حیثیت دے کر بحث کرتے ہیں اُن کی ساری بحث بے سود اور غیر مفید ہو جاتی ہے۔

علامہ موصوف کی حسب ذیل تقریر سے ان بہت سارے اشکالات کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے جنہیں عوام کو گمراہ کرنے کے لئے منکرین حدیث نے پیدا کر رکھا ہے۔

چنانچہ علامہ موصوف فرماتے ہیں:-

"سنت اپنے مضامین و مطالب کے لحاظ سے قرآن سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ سنت کا مرجع قرآن ہی ہے۔ سنت کی تین حیثیتیں ہیں۔ وہ یا تو قرآن کے اجمال کی تفصیل ہوگی (مثلاً نماز۔ زکوٰۃ۔ حج وغیرہ) یا اس کے مشکلات کی تبیین و تشریح ہوگی (مثلاً قرآن مجید میں جب یہ آیت نازل ہوئی" والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم" جو لوگ سونے اور چاندی کا خزانہ جمع کرتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انھیں عذاب الیم کی خوشخبری سنا دیجئے۔ صحابہ سخت مضطرب ہوئے کہ نہیں معلوم ہمارے پاس جو کچھ مال ہے وہ اس وعید کی زد میں آتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے اُن کے اشکال کو رفع فرمایا اور بتایا کہ زکوٰۃ کے ادا کر دینے کے بعد آدمی اس وعید کا مستحق نہیں رہتا بلکہ اس کا مال پاک و طیب ہوجاتا ہے) یا قرآن کے مختصرات و ارشادات کی توضیح ہوگی (مثلاً کعب بن مالکؓ۔ ہلال ابن امیہؓ۔ مرارہ بن ربیعؓ کا غزوۂ تبوک سے تاخر۔ ان کا اقرار صدق اور اعتراف جرم، آنحضرتؐ کا بائیکاٹ وغیرہ کی تفصیل کتب حدیث میں موجود ہے اور قرآن نے صرف ایک آیت سے اس تفصیل کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اسی طرح عبد اللہ بن ام مکتومؓ کا واقعہ کہ وہ حضور اکرمؐ کے پاس تعلیم کی غرض سے ایسے وقت میں آتے ہیں جبکہ نبی کریمؐ صنادید قریش کی تبلیغ و تذکیر میں مصروف ہوتے ہیں، چونکہ ان کی تشریف آوری امراء قریش کی بے التفاتی اور انتشار کا باعث بن سکتی تھی۔ اس لئے اُن کی آمد آپ کے لئے بار خاطر بنی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے لطیف انداز میں سورۂ عبس میں اس کی طرف تنبیہ کی کہ اللہ تعالیٰ کی میزان میں ایک مفلس و قلاش خدا پرست، صد ہا صاحب وجاہت و متمول اشخاص پر ہزار گونہ بھاری ہے۔ لیکن قرآن نے اس واقعہ کی جانب صرف اشارہ کیا ہے) (قرآن مجید میں اس قسم کے بہتیرے واقعات پائے جاتے ہیں جن کی تشریح و تفصیل بلکہ کتب حدیث سے بے نیاز ہوکر اُن کا سمجھنا بھی ناممکن ہے)

چنانچہ قرآن پاک کے واضح نصوص اور قطعی دلائل ہمارے دعوے پر دلالت کرتے ہیں۔

ارشاد ہوا۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ہم نے تم پر قرآن مجید نازل کیا تاکہ نوع انسانی کی طرف جو ہدایات بھیجی گئی ہیں تم ان کی تشریح و تفسیر کرو۔

پس سنت کے اندر تمہیں کوئی بھی ایسا حکم نہیں ملے گا جس پر قرآن کے نصوص اجمالاً یا تفصیلاً دلالت نہ کرتے ہوں۔ نیز قرآن کی اس تصریح کی تائید ان تمام دلائل سے بھی ہوتی ہے۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن مجید ایک اصولی کتاب ہے اور سنت اس کا تفصیلی ضابطہ۔

مثال کے طور پر قرآن آنحضرتؐ کی سیرت کے متعلق فرماتا ہے۔ "وانک لعلی خلق عظیم" (آپ بلند اخلاق پر فائز ہیں)۔ حضرت عائشہؓ آنحضرتؐ کے اخلاق کے وصف میں فرماتی ہیں "کان خلقہ القرآن" (آپ کے اخلاق قرآن کی زندہ تصویر تھے) حضرت عائشہؓ کے اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا قول، فعل، اور کسی کام کو دیکھ کر سکوت اختیار کرنا یہ تینوں چیزیں قرآن ہی

ماخوذ ہوتی تھیں۔ کیونکہ دائرۂ اخلاق ان ہی تین شعبوں میں محصور ہے۔ قرآن نے اپنے وصف میں کہا کہ وہ تبیانا لکل شیٔ ہر چیز کا بیان ہے) اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کے بیان کے مطابق سنت بھی قرآن ہی میں شامل ہے (کیونکہ سنت کے بغیر بہت سارے مقاماتِ قرآن مجید غیر واضح ہیں) ایک جگہ قرآن نے اعلان کیا۔ "الیوم اکملت لکم دینکم" آج میں نے تمہارے لئے دین مکمل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ تکمیل دین سے مراد یہاں قرآن پاک کا نزول ہے (حضور اکرم اس آیت کے نازل ہونے کے بعد تقریباً تین ماہ بالاتفاق زندہ رہے۔ اور اس اثنا میں آپ کے اقوال و افعال اسی دین کی تشریح کر رہے تھے۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی تشریحات دین کے علاوہ کوئی اور چیز تھے۔ لہٰذا اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید نبی کی تشریحات کو قرآن سے الگ نہیں قرار دیتا۔ بلکہ اسی میں ضم سمجھتا ہے۔ کیونکہ اگر آپ کی تشریحات قرآن سے الگ ہوتیں اور ان کی حیثیت مستقل ہوتی تو تکمیل دین کا دعویٰ قبل از وقت ہوتا) اسی قسم کے نصوص کی وجہ سے ہم سنت کو کتاب اللہ ہی سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔"

علاوہ ازیں کتاب و سنت کے احکام کے استقراء سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سنت اپنی ساری تفصیلات کتاب اللہ ہی سے اخذ کرتی ہے۔"

ہم نے ابتداء کتاب میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ قرآن مجید سنت کا منبع ہے۔ لہٰذا وہ قرآن کے احکام صریحہ کی مخالف کس طرح ہو سکتی ہے؟ اگر ہمارے پاس سنت کا کوئی ایسا حکم منقول ہوتا ہے جو کتاب اللہ کے احکام سے صریح متضاد ہے تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں توقف کرنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا اصل الاصول ہے جس کے پیش نظر رکھنے سے اس راہ کی بہت ساری دشواریاں رفع ہو جاتی ہیں۔"

جن لوگوں نے سنت کو کتاب اللہ سے الگ ایک مستقل حیثیت دی ہے اور جن کے نزدیک اگر سنت کتاب اللہ کے صریح مخالف ہو تو بھی ہمیں قبول کرنا ضروری ہے۔ وہ ہمارے اس دعوے کو قابل تسلیم نہیں سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے دعوے کے اثبات میں کچھ دلائل بھی فراہم کئے ہیں۔ جنہیں ہم آپ کے روبرو پیش کرکے اس کا جواب دیتے رہے ہیں۔"

(۱) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ

قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہیں ہو سکتے تا آنکہ تجھے اپنے اختلافات میں حکم نہ بنائیں۔

(صحیح احادیث میں) اس آیت کا یہ شانِ نزول ثابت ہے کہ حضرت زبیرؓ اور ایک انصاری کے درمیان کھیت کے پانی کے سلسلہ میں اختلاف ہو گیا۔ جب مقدمہ نبی کریمؐ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ نے حضرت زبیرؓ کو حق بجانب پا کر ان کے موافق فیصلہ صادر فرمایا۔ جس پر انصاری چیں بجبیں ہو گئے۔ اسی سلسلہ میں مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ جس میں بتایا گیا کہ مومنوں کو بدل و جان رسول کے حکم کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اس کے فرمان کے خلاف دم مارنا بلکہ انقباض محسوس کرنا بھی روح ایمانی کے منافی ہے۔ لہٰذا ایک مومن کو نبی کے اتباع کے سلسلہ میں سر تا پا تسلیم و رضا ہونا چاہیئے۔

یہ قضیہ اور اس کا فیصلہ کتاب اللہ میں مذکور نہیں ہے۔ بلکہ یہ آنحضرتؐ نے اپنے فہم و بصیرت سے صادر فرمایا تھا۔ اللہ نے فریقین کو ہدایت کی کہ نبی کے فیصلے کو بے چون و چرا ماننا ہی کمالِ ایمانی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سنت کتاب اللہ سے الگ ایک اور چیز ہے۔ جس کی اطاعت کا مطالبہ کیا گیا ہے)

بے شمار مقامات میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول اللہ کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ جن سے اس امر کا پتہ چلتا ہے

اللہ کی اطاعت سے مراد کتاب اللہ کے احکام کی بجا آوری اور اس کی بتائی ہوئی تنبیہات و ممنوعات سے احتراز ہے اور اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کا مطلب آپؐ کے ان ارشادات کی تعمیل ہے جو قرآن سے ماسوا ہیں۔ اگر کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ دونوں ایک ہی چیز ہوتے تو ہر ایک اطاعت کو مستقل طور سے ذکر کرنے کا کوئی فائدہ ہوتا۔

ایک جگہ قرآن میں ارشاد ہوا:۔

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبہم فتنۃ او یصیبہم عذاب الیم۔

پس ان لوگوں کو ڈرتے رہنا چاہیئے جو نبی کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں کہ کہیں انھیں کوئی فتنہ یا عذاب الیم نہ پہنچ جائے۔

اس آیت میں نبیؐ کے حکم کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی اطاعت مسلمانوں پر ضروری ہے۔ بہرحال قرآن مجید کے بیشمار دلائل اس بات پر حجت قطعی ہیں کہ نبیؐ کا ہر حکم خواہ بصورت امر ہو یا بصورت نہی۔ قرآن ہی کی طرح واجب العمل ہے۔

(۲) سنت کے مستقل بالذات ہونے پر وہ بے شمار احادیث دلالت کرتی ہیں جن میں محض کتاب اللہ کی اتباع اور ترک سنت کی مذمت کی گئی ہے (گویا دین کے دو ستون ہیں۔ ایک اللہ کی کتاب۔ دوسرا اس کے رسول کی سنت) ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا:۔

"ایک زمانہ آئے گا جبکہ لوگ اپنی عیش و عشرت و دنیا پرستی میں مست ہو کر احادیث کا انکار کرنے لگیں گے (تاکہ سنت کے انکار کے بعد کتاب اللہ کی آڑ میں من مانی رنگ رلیاں منائیں) اور دعویٰ یہ کریں گے کہ ہم کتاب اللہ کی اتباع کرتے ہیں"

لہٰذا صرف اس کے حلال و حرام کے ہم پابند ہیں۔ لیکن معلوم ہونا چاہیئے کہ نبیؐ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے یا جن چیزوں کا حکم دیا ہے۔ اس کی حیثیت بھی کتاب اللہ کے احکام کی سی ہے (رواہ الترمذی و ابوداؤد مع اختلاف یسیر)

(۳) احکام شریعت کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ سنت میں بہت سارے ایسے احکام موجود ہیں جن کے بارے میں قرآن میں کوئی نص صریح نہیں ہے۔ مثلاً خالہ اور بھانجی کو یا پھوپھی اور بھتیجی کو بیک وقت قید نکاح میں لانے کی ممانعت۔ حضرت علیؓ اپنے صحیفہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس میں دیت، کافر کے عوض مسلم کے قتل کی ممانعت۔ زکوٰۃ کے سلسلہ میں اونٹوں کی عمروں کی تفصیل۔ حرمت مدینہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ احکام کتاب اللہ میں موجود نہیں ہیں اور صرف سنت سے ثابت ہیں۔

(۴) سنتِ رسولؐ سے اعراض کر کے محض کتاب اللہ پر دین کی بنیاد رکھنے والا گروہ بہت ہی مختصر گروہ ہے۔ جس نے محض اس بنیاد پر کہ کتاب اللہ میں ہر چیز کی تفصیل ہے۔ سنت کو ترک کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے انھوں نے سنت کے بے شمار احکام کو ناقابلِ التفات قرار دیا اور امتِ مسلمہ نے ایسے گروہ کو ہمیشہ اپنے سے خارج سمجھا۔ اس گروہ نے کتاب اللہ کی ایسی رکیک تاویلات کیں۔ جو منشاء الٰہی کے سراسر خلاف تھیں۔

حضرت عمرؓ اور دیگر بہت سارے صحابہ و تابعین سے اس قسم کے لوگوں کی مذمت منقول ہوئی ہے۔ جو سنت سے بے نیاز ہو کر کتاب اللہ کو اپنی تاویلات کا ہدف بناتے ہیں۔"

ان مجتہدین نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں ایک نہایت ہی سقیم اور ناقابلِ التفات حدیث پیش کی ہے۔ وہ یہ کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا:۔

"ما اتاکم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ فان وافق کتاب اللہ فانا قلتہ وان خالف کتاب اللہ فلم اقلہ انا وکیف اخالف کتاب اللہ وبہ ھدانی اللہ"

(یعنی جو حدیث بھی تمہارے پاس میری جانب سے منقول ہو۔ تو اُسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ اگر وہاں سے اس کی تصدیق ہو جائے تو سمجھو کہ مَیں نے کہا ہے۔ اگر کتاب اللہ اس حدیث کے مخالف پڑے تو اس کا انکار کر دو۔ کیونکہ میں کتاب اللہ کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ کیا مَیں ایسی کتاب کی مخالفت کر سکتا ہوں جس کے ذریعہ اللہ نے مجھے سیدھی راہ دکھائی۔)

عبد الرحمٰن بن مہدی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ زنادقہ اور خوارج نے اس حدیث کو وضع کیا ہے۔ نیز ادر محدثین نے بھی ذاتِ رسالت کی طرف ان الفاظ کی نسبت غلط قرار دی ہے۔

بعض علمائے دین نے اس حدیث کو صحیح تسلیم کر کے بھی جواب دیا ہے کہ جب ہم نے تمہارے دعوے کے مطابق اسی حدیث کو کتاب اللہ کی کسوٹی پر پرکھا تو کتاب اللہ کے صریح مخالف نظر آئی۔ اس لئے کہ کتاب اللہ نے نبیؐ کو مطاعِ مطلق قرار دیا ہے اور یہ حدیث اس کے مخالف ہے۔"

بہرحال جن لوگوں نے سُنّت کو کتاب اللہ سے الگ مستقل حیثیت نہیں دی ہے انھیں اس قسم کی غلطیوں کا شکار ہونا پڑا ہے۔"

مصنّف کا جواب

ان چاروں اعتراضات میں سے کوئی اعتراض بھی ہمارے سابقہ دعوے پر وارد نہیں ہوتا۔ اب ہم مذکورہ بالا اعتراضات کا جواب دے رہے ہیں:-

(۱) (یہ خیال کہ جب قرآن نے اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسُول کی اطاعت کا مستقل طور پر ذکر کیا ہے۔ تو ضروری ہے کہ رسُول کی اطاعت خدا کی اطاعت سے الگ ہو) صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سُنّت کتاب اللہ ہی کی شرح ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جن نصوص میں دو مختلف معانی اور دو متضاد مفہومات کے احتمالات ہوں وہاں سُنّت کسی ایک احتمال کو متعین کر دیتی ہے اور بتاتی ہے کہ ان آیات سے منشاءِ الٰہی کیا ہے۔ (بنابریں کسی شخص کو سنّت کے اس متعین کردہ معنی سے ہٹ کر کسی اور مفہوم کے پیدا کرنے کی گنجائش نہیں ہو گی) لہٰذا اگر آدمی کا عمل تشریحِ سنّت کے عین موافق ہو گا تو یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے ایک طرف مرادِ الٰہی کو پا لیا اور دوسری طرف آنحضرتؐ کے بیان و شرح پر بھی عمل کیا۔ اس طرح بیک وقت اس نے اللہ اور رسُول کی اتباع کی۔ اور اس نے رسولِ اکرم کی تشریح و تفسیر کے خلاف عمل کیا تو ایک طرف مرادِ الٰہی نہ پا کر خدا کی اطاعت بھی نہیں کی اور دوسری طرف نبیِ اکرم کی شرح کی مخالفت کر کے آنحضرتؐ کی اطاعت سے بھی روگردانی اختیار کی۔"

لہٰذا ہماری اس تقریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ اور رسُول کی اطاعت کے جدا گانہ ذکر سے یہ ضروری نہیں کہ مطاع بھی مختلف ہوں۔ جب یہ بات لازم نہیں ہے تو از خود یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ سنّت کتاب اللہ کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ بلکہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں اور ایک دُوسری نوعیت سے یہ دونوں اطاعتیں اپنی اپنی جگہ مستقل بھی ہیں۔ خدا کے رسُول کی اتباع کرنے والا خدا اور رسُول دونوں کا متبع ہے اور خدا کے رسُول کی مخالفت کرنے والا خدا اور رسُول دونوں کی مخالفت کرنے والا ہے۔ کیونکہ رسُول کی تشریح کو پسِ پشت ڈال دینے کے بعد مقصدِ الٰہی کو کسی صورت سے پایا نہیں جا سکتا۔"

جو لوگ سنّتِ رسُول میں کتاب اللہ پر اضافے دیکھ رہے ہیں۔ ہم اُن کے خیال کی تردید نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اضافہ آیا اجمال و تفصیل کا سا ہے یا سنّت میں کچھ ایسے اضافے بھی ہیں جن کی اصل کتاب اللہ میں موجود نہیں ہے۔؟ (ہم اس دوسرے پہلو کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں)

(۲) اسی اصول کے تحت ان احادیث کو بھی حل کیا جا سکتا (جن میں ترک سنت پر مذمت کی گئی ہے۔ کیونکہ اگر تشریحات سنت کو نظر انداز کرکے من مانی تعبیر و تشریح اختیار کی جائے گی تو ظاہر ہے کہ وہ ترک سنت کے حکم میں آئے گی)

علاوہ ازیں یہاں ایک نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ جب قرآن میں کوئی حکم مجمل ہے اور سنت نے اس کی تفصیل بیان کی ہے تو گویا وہ تفصیل کتاب اللہ سے الگ ہے (اسی معنی میں دونوں کو الگ سمجھا جاتا ہے) مثلاً قرآن نے کہا "اقیموا الصلوٰۃ" (نماز قائم کرو) حضور اکرم نے اس کی تشریح کی (اور عملاً اسے کرکے بتایا) جس کی وجہ سے ہمارے علم میں ہیئت صلوٰۃ کی وہ تفصیلی تصویر آگئی جو کتاب اللہ میں ہمیں نہیں ملتی تھی۔ گو کہ نبی اکرم کی جملہ تشریحات وہی ہیں جو قرآن کے اس ایک جملہ "اقیموا الصلوٰۃ" میں مضمر ہیں۔ لیکن حکماً یہ دونوں مختلف ہو گئے۔ اسی وجہ سے شریعت کا یہ ایک اصول ہے کہ جب کوئی مجمل بیان سامنے آئے تو اس میں توقف کرنا چاہیئے۔ اور اسی اجمال کی اگر تشریح مل جائے تو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔ لہٰذا جب حکماً ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے تو معنی بھی مختلف سمجھے گئے۔ اسی بنیاد پر سنت کو کتاب سے علیحدہ مستقل حیثیت دی گئی ہے۔

(۳) "یہ اعتراض کہ سنت میں بہت سارے ایسے احکام ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں پائے جاتے۔ یہ دلیل اس بات کی کہ سنت کتاب اللہ سے الگ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے) اسے ہم آگے چل کر بیان کریں گے (چنانچہ مصنف نے ص۲۷ تا ص۳۲۔ اس پر تفصیلی کلام کیا ہے جسے ہم طوالت کے خوف سے نہایت ہی مختصر الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ " کتاب اللہ نے دین و دنیا کی کامیابی کا جو نسخہ ہمارے ہاتھوں میں دیا ہے اس کی تین قسمیں ہیں (۱) ضروریات جنہیں کسی بھی وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جو دین کے اصل الاصول ہیں (۲) حاجیات جن کی بہرحال انسان کو ضرورت پڑتی ہے۔ جن سے مفر بھی بعض اوقات ناممکن ہوتا ہے (۳) تحسینیات جن سے حسن و خوبی اور کمال مقصود ہوتا ہے اور سنت کا دائرہ بھی انہی میں محدود ہے)

(۴) یہ کہنا کہ سنت کو کتاب اللہ میں ضم کر دینے کی وجہ سے بہت سارے فرقے گمراہ ہو گئے ان کی گمراہی کی وجہ یہ نہیں ہے۔ بلکہ ان کے اندر گمراہی اس طرح راہ پا گئی کہ انہوں نے کتاب اللہ کے احکام کے سلسلہ میں سنت کے بجائے اپنے خیالات کو حکم اصلی قرار دیا"

سنت دراصل قرآن کے اجمال کی تفصیل کرتی ہے اور اس کے اطلاق کی تقیید اور اس کے عموم کو خاص کرتی ہے۔ اس طرح بعض اوقات الفاظ قرآنی کا جو ظاہری مفہوم ہوتا ہے وہ مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ منشاء الٰہی وہی ہوتا ہے جو زبان وحی ورسالت سے ادا ہوتا ہے جب سنت ہی کو پھینک دیا جائے اور کتاب اللہ کو اپنی من مانی تاویلات کیلئے تختۂ مشق بنا لیا جائے تو ظاہر ہے کہ یہ راہ راست سے انحراف ہے۔ وہ شخص جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وہ کتاب اللہ کا عالم نہیں ہے بلکہ کتاب اللہ کے علم سے کورا۔ نابلد اور اندھا ہے۔ جو کسی طرح سیدھی راہ نہیں پا سکتا۔ یہ کس قدر مقام حیرت ہے کہ انسان دنیا کے معاملات تک میں اپنے علم و فہم سے سارے حقائق سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ کجا کہ وہ کارہائے آخرت کی معرفت صاحب رسالت کے دامن کو چھوڑ کر حاصل کرے۔

جو حدیث اوپر زیر بحث آئی ہے اگر اس کی سند کمزور ہے تو اس سے کسی فریق کو بھی دلیل لینا مناسب نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ حدیث کسی نہ کسی درجہ میں بھی قابل قبول ہو سکتی ہے تو اس پر غور کرنا چاہیئے۔ (سنت جسے ہم) حدیث کہتے ہیں) یا تو وہ وحی الٰہی ہو گی (یا وحی الٰہی سے ماخوذ ہو گی) اس لئے دونوں صورتوں میں کتاب اللہ اور سنت رسول میں تناقض محال ہے۔ کیونکہ ذات رسالت کی زبان کا ایک ایک لفظ وحی الٰہی ہوتا تھا جو اہواء و خواہشات کے دخل سے پاک ہوتا تھا۔ اگر آپ کے اجتہادات میں کبھی کوئی بھول چوک ہو بھی جاتی تو اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس پر بروقت تنبیہ کر دی جاتی۔ جب واقعہ یہ ہے تو ناممکن ہے کہ سنت میں کوئی ایسا حکم ہو جو قرآن کے مخالف ہو۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ سنت سے کوئی ایسا حکم ثابت ہو جس کے جواز و عدم جواز پر ہمیں قرآن پاک سے کوئی

تصریح نہ ملتی ہو (تو ایسی صورت میں اس پر عمل ضروری ہوگا) اس طرح گو کہ زیر بحث حدیث سند کے اعتبار سے کمزور ہی سہی۔ لیکن مضمون کے اعتبار سے صحیح ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے دوسرے طریقوں سے یہ حدیث ثابت بھی ہے (اس کے بعد مصنف نے اس حدیث کے مختلف طرق پر کلام کیا ہے۔ ہم نظر انداز کرتے ہیں) الموافقات جلد ۴ صـ۱۲ تا صـ۲۴۔

رسولؐ مطاع مطلق ہے

اگر ہم اپنی اس طویل بحث کا خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو صرف ایک فقرے میں بیان کر سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ رسولؐ مطاع مطلق ہے۔ کتاب و سنّت کے ایک ایک صفحہ کا مطالعہ کرتے چلے جایئے آپ کو پتہ چلے گا کہ دُنیا کی کسی شخصیت کو یہ منصب حاصل نہیں ہے، ہر شخص کی اطاعت کے خواہ وہ امیر ہو یا والدین ہوں یا اکابر و بزرگ ہوں کچھ حدود و کچھ شرائط ہیں۔ لیکن نبی دُنیا والوں سے اپنی مطلق اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے

نبی عربی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کے روبرو کیا اعلان کیا:۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔

اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

یہ حقیقت بھی تو قرآن مجید نے واضح کردی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا۔

(النساء - ۸)

اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے امراء کی۔ اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں اختلاف ہوجائے تو اللہ اور رسولؐ کی جانب اسے لوٹا دو اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو یہ بہتر ہے اور اچھا ہے انجام کے لحاظ سے۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اپنی اطاعت اور اپنے رسولؐ کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور نبیؐ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت ہی میں ضم نہیں کیا۔ بلکہ اسے ایک مستقل حیثیت دینے کے لئے فعل کی تکرار کی تاکہ یہ معلوم ہو کہ نبی جب کوئی حکم دے تو یہ دیکھنا نہیں چاہیئے کہ آیا اس کا ثبوت اللہ کی کتاب میں موجود ہے یا نہیں (کیونکہ یہ ممکن بلکہ یقینی ہے کہ نبی کی نگاہ دُوررس اللہ کی کتاب کے جن اسرار سربستہ کو پالے اسے ہمارا ذہن نارسا نہ پا سکے) بلکہ بے چون و چرا اس کی اطاعت اختیار کرنی چاہیئے۔ (کیونکہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ اس کا کوئی حکم اللہ کی کتاب اور اس کی مرضی کے خلاف ہو نہیں سکتا) لیکن اولوالامر کی اطاعت کو اس طرح الگ صیغہ سے نہیں ذکر کیا گیا بلکہ رسولؐ اللہ کی اطاعت ہی میں اسے ضم کردیا گیا۔ تاکہ یہ حقیقت واضح ہوجائے کہ امراء کی اطاعت اسی وقت واجب ہوگی جبکہ وہ رسولؐ اللہ کی اطاعت کے تحت ہوگی اور اگر ان کا کوئی حکم نبی کے حکم کے خلاف ہوگا تو کسی صورت سے بھی قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "انما الطاعة فی المعروف" (یعنی کوئی بھی حکم اسی وقت قابلِ تسلیم ہوگا جبکہ وہ معروف کے حدود میں ہو۔ معروف سے ہٹ کر دُنیا کے کسی بھی شخص کا حکم قابلِ التفات نہیں ہے) ایک اور موقع پر امراء کی حدود اطاعت متعین کرتے ہوئے زبانِ رسالت یوں گویا ہوئی۔ "من امرکم منھم بمعصیة اللّٰہ فلا سمع له ولا طاعة" (یعنی امراء میں سے جس نے بھی معصیت کا حکم دیا نہ اس کی بات قابلِ سمع ہے اور نہ قابلِ عمل"۔

ایک مرتبہ ایک کمانڈر نے کسی معاملہ میں خفا ہو کر اپنی فوج کو آگ میں کود جانے کا حکم دیا۔ لیکن فوجیوں نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی، ذاتِ رسالت مآبؐ کو جب اس کا علم ہوا تو فرمایا۔ "انھم لو دخلوا ما خرجوا منھا"۔ (یعنی اگر وہ اس آگ میں داخل ہوتے تو اس سے کبھی نہ نکلتے) اگر وہ فوج اپنے کمانڈر کی اطاعت میں تعمیلِ حکم کر بیٹھتی تو گو بظاہر اس کی اطاعت شعار قرار پاتی۔ لیکن

چونکہ یہ نبی کے حکم اطاعت کے منشاء کے خلاف ہوتا اس لئے موجب عتاب قرار پائی۔ غور کیجئے ایک غلط تاویل پر جب وہ مستحق عذاب سمجھی گئی تو جو لوگ خدا کے رسول کے صریح احکام اور واضح بیانات کو پامال کرتے ہیں۔ اُن کا کیا حشر ہوگا۔"

"آیت کے آخر میں اللہ نے مومنوں کو بتایا کہ ان کے لئے دین و دنیا کی کامیابی کی صورت یہی ہے کہ وہ اپنے سارے اختلافات کو خدا اور رسول کے احکام کی روشنی میں حل کریں"۔

آیت میں " فان تنازعتم فی شئ " (تم کسی بھی معاملہ میں اختلاف کرو) کی تعمیم بھی قابل لحاظ ہے۔ معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت کا کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جس کے لئے کتاب و سنت میں ہدایت نہ ملتی ہو۔ کیونکہ اگر وہاں ہدایت نہ ملتی تو رجوع کا حکم نہیں دیا جاتا۔" (لہذا کوئی شخص یہ عذر کر نہیں سکتا کہ اسے کتاب و سنت میں ہدایت نہیں ملی)

اسی بحث میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

لَا تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ ۔	اللہ اور اس کے رسول سے آگے سبقت نہ لے جاؤ۔

جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا کوئی فعل، تمہارا کوئی قول، تمہارا کوئی حکم، تمہارا کوئی فتویٰ اور تمہارا کوئی فیصلہ اللہ کے رسول کے حکم سے آگے نہیں نکل سکتا۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا۔" لا تقولوا خلاف الکتاب والسنۃ "۔

اللہ کا ارشاد ہے:-

لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجھروا له بالقول کجھر بعضکم لبعض ان تحبط اعمالکم وانتم لا تشعرون۔	اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو اور نہ اُسے آپس میں پکارنے کی طرح پکارو۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ تمہارے اعمال حبط ہوجائیں اور تمہیں پتہ تک نہ چلے۔

جب آواز کا بلند کرنا بھی اعمال کے رائیگاں جانے کا سبب بن سکتا ہے تو اپنے آراء و خیالات، اپنی عقل و فہم۔ اپنے ذوق و عادات، اپنی سیاست و تدابیر اور اپنے حقائق و معارف کو اللہ کے رسول کے حکم پر مقدم سمجھنا بدرجہ اولیٰ حبط اعمال کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

مومنین کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَاِذَا كَانُوا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ۔ (النور - ۹)	مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں اور جب کبھی کسی اجتماعی معاملہ میں ہوتے ہیں تو نہیں جاتے ہیں۔ جب کہ آپ سے اجازت نہ لے لیں۔

جب نبی کی صحبت میں رہتے ہوئے بلا اجازت کہیں جانا بھی ممنوع قرار پایا اور اسے ایمان کے خلاف قرار دیا گیا تو ایسی صورت میں ایک مسلمان کو از حد ضروری ہے کہ وہ جو بھی مسلک اختیار کرے اور جس روش کا بھی پابند ہو۔ خدا کے رسول کی سند کے بغیر نہ اختیار کرے اور علمی کی سند نبی کی سنت ہی کے ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔" (اعلام الموقعین جلد اول ص ۳۹ تا ص ۴۳)

رسول کی اطاعت خدا ہی کی اطاعت ہے

رسول کی اطاعت پر جو اس قدر زور دیا گیا ہے۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خدا کی طرح اس کے نمائندے کی بھی اطاعت دنیا سے کروانا چاہتا ہے؟ کیا خدا کی اطاعت الگ اور رسول کی اطاعت الگ ہے؟ نہیں بلکہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ رسول نمائندۂ حق ہے۔ تم نے اگر

اُس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا تو گویا تم نے خدا کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا" اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ (یقیناً جو لوگ تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں)۔ اس کی زندگی خدائے تعالیٰ کی مرضی و نامرضی کیلئے ایک میزان بن کر دنیا میں آتی ہے۔ اس کی ہر جنبش اور ہر طرز ادا۔ اس کا تکلم، اس کا کردار، اس کی سیرت کا ہر صفحہ حق کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا جس نے اسے پا لیا اس نے حق کو پا لیا۔ جس کا ہاتھ اس کے دامن سے چھوٹ گیا وہ ہنگامۂ زیست میں گم کردہ راہ ہو گیا۔ بامراد ہوا وہ شخص جس نے اس کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ نامراد ہوا وہ جس نے اس کی تابعداری سے انحراف کیا۔

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

شیخ محمد عبدہٗ فرماتے ہیں:۔

"اسلام دین توحید ہے۔ یہاں غیر اللہ کے لئے امر و نہی۔ شریعت سازی اور حکومت کا کسی کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ قرآن مجید ہر موقع پر غیر اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کی نفی کرتا ہے اور ایسے لوگوں پر وہ تعجب کرتا ہے جنہوں نے خدا کی اطاعت کے بجائے دوسروں کی اطاعت کو اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیا۔ نبی نے جو بھی تشریعات کی ہیں وہ من جانب اللہ ہی ہیں لہٰذا یہ دین توحید کے منافی نہیں ہے۔"

(تفسیر المنار، جلد ۵ صفحہ ۱۸۰)

یہ ہے وہ مقام رفیع اور منصب بلند جو صرف انہی برگزیدہ ہستیوں کو حاصل ہوا ہے۔ جنہیں نگاہ ایزدی نے متبوع عالم اور نوع انسان کے لئے اسوۂ صدق و صفا بنایا ہے۔ جنہوں نے حق کے نمائندے بن کر دنیا میں شمع ہدایت فروزاں کی ہے۔ یہ مرتبۂ کمال اس مقدس ترین گروہ کے علاوہ نہ کسی کو حاصل ہوا ہے اور نہ تا قیامت حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن منکرین حدیث نمائندگانِ حق کو محض ہر کارہ ثابت کر کے اُمراء اور حکام کو یہ منصب دینا چاہتے ہیں۔ لیکن منافقوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی غالب اکثریت ان واہی تباہی باتوں پر یقین نہیں لاسکتی اور کتاب و سنّت کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اطاعتِ رسول کے بغیر نہ ایمان معتبر ہے اور نہ اسلام!

حقیقت و مجاز

مرا وجود ہے خود حاصلِ جبینِ نیاز
نفس نفس ہے عبادت۔ نظر نظر ہے نماز
خرد کی راہ میں آئے بہت نشیب و فراز
رواں دواں ہی رہا میں یقیں کی عمر دراز
زہے کمالِ مشیت! خوشا! ظہورِ جمال
حقیقتوں کو دیا جس نے آب و رنگِ مجاز
دل و نظر پہ ہوئی ہیں نوازشیں کیا کیا
بہ رنگِ ذوقِ تماشا. بہ نامِ سوز و گداز
اسی کے نام سے گرتے ہوئے سنبھلتے ہیں
کہ جس نے دی ہے پتنگے کو طاقتِ پرواز
نہ جانے کیوں غلط آہنگ ہو گئے نغمے
مدد کا وقت ہے سازِ الست کی آواز!
سوائے ذاتِ خدا جو ہے قادر و خلاق
نہ کوئی عقدہ کشا ہے نہ کوئی بندہ نواز

نفس کی آمد و شد کا بھی کیا سہارا ہے / مریضِ ہجر ہے یا ڈوبتا ستارا ہے
نہ کہہ رہے ہیں نہ مانا ہے بے وفاؤں کا / خطاب اور سے میری طرف اشارا ہے
سکوں کا نام نہ لے اس جہانِ فانی میں / کسی کو غم نے کسی کو خوشی نے مارا ہے
دھڑکتے دل کو جو تھاما نکل گئی آہ / بغیر نام لیے بھی تجھے پکارا ہے
خدا کے واسطے اے دوست! عذر خواہ نہ ہو / مجھے خوشی سے شکستِ وفا گوارا ہے
نہ جانے کس کے قدم چھو کے موج آئی تھی / جو تہ نشیں تھے سفینے انھیں ابھارا ہے
کہاں وہ جائے کرم نے جسے کیا ہو تباہ / وہ کیا کرے کہ جسے زندگی نے مارا ہے

محبت اور ہوس میں ہے دشمنی ماہر
یہ راز وہ ہے کہ جو عالم آشکارا ہے

ماہر القادری

فکر و خیال

اسعد شاہجہانپوری

کہیں ظلمت شکن آثار تک پائے نہیں جاتے
کڑی دھوپیں نہ ہوں جب تک گھنے سائے نہیں جاتے

کہاں کی ٹھوکریں اے کاتبِ تقدیر لکھدی ہیں!
جہاں سنگِ نشانِ راہ تک پائے نہیں جاتے

ہنسی کیا گ[illegible] ہائے شادی و غم کے
گزرنے دو گزرتے لمحے ٹھہرائے نہیں جاتے

یہ ظاہر تاب وعدے تیرہ بختی کا نہیں درماں
ستاروں کی چمک سے رات کے سائے نہیں جاتے

ندیموں چارہ سازوں کو کوئی اتنا تو سمجھاتا
کہ ایسے جاں بلب باتوں سے بہلائے نہیں جاتے

کہاں کی عشرتیں کیسا گلہ شکوہ زمانے کا
رہِ تسلیم میں یہ پیچ و خم پائے نہیں جاتے

غرض سوزِ دروں کی انتہا ہے مرگِ نومیدی
یہ شعلے روح پھونکے آگ برسائے نہیں جاتے

دلِ اسعدؔ درد سے لبریز لب پر مہرِ خاموشی!
کہیں اس طرح کے ماتم کدے پائے نہیں جاتے

سرورؔ قدوائی

اک زمانہ کہہ رہا ہے آج دیوانہ مجھے
آپ کے جو دل میں آئے آپ بھی کہہ لیجئے

قمر جلال پوری:

عدو لا کے کلیاں چن رہے ہیں اُن کے داماں پر
اب ایسے میں کوئی بجلی نہیں گرتی گلستاں پر

افسوں بھوپالی

اُن سے رہ کر دور اُن کو بھولنا ممکن نہیں
اُن کو پا کر ساری دنیا کو بھلا سکتا ہوں میں

ہوں اگر اُن کی طرف سے حوصلہ افزائیاں
دشت کیا دریا میں بھی راہیں بنا سکتا ہوں میں

ستم تو اپنی جگہ پر ستم ہی تھا لیکن
ترے کرم نے کیا اور بدگماں مجھ کو

تری امانتِ عشق و متاعِ غم کی خیر
مرا وجود بھی ہے آج سرگراں مجھ کو

اٹھا اٹھا کے حجاباتِ دیدہ و دل کے
سکھا رہا ہے کوئی خود شناسیاں مجھ کو

روحِ انتخاب

حسانؓ کی بدیہہ گوئی اور اُن کے شاعرانہ کمال کا جوہر اُس روز کھلا جس دن دربارِ نبویؐ میں بنی تمیم کا وفد آیا۔ یہ لوگ نہایت جاہل، گنوار، بیباک اور خود پرست تھے۔ اُن کا ستر اسّی آدمیوں کا گروہ مسجدِ نبوی میں یک بیک گھس پڑا۔ آپؐ گھر کے اندر تھے۔ اُن لوگوں کے سرغناؤں نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ "محمدؐ! باہر نکلو۔ ہم اس لئے آئے ہیں کہ خود ستائی میں ہم سے تم سے مقابلہ ہو جائے۔ اسی لئے ہم اپنے خطیب اور شاعر کو بھی ساتھ لیتے آئے ہیں۔" آپؐ نکل آئے اور اُن گستاخ، بدتمیز دیہاتیوں کے مجمع میں بیٹھ گئے۔ اب اُن کا سردار اقرع اٹھا اور کہنے لگا۔ "خدا کی قسم! میری مدح انسان کو بنا دیتی ہے اور میری ہجو بگاڑ دیتی ہے۔" آپؐ نے فرمایا۔ "یہ تو خدا کا کام ہے۔" انہوں نے کہا۔ "ہم سب سے زیادہ معزز ہیں۔" آپؐ نے فرمایا۔ "تم سے زیادہ معزز یوسفؑ بن یعقوبؑ تھے!"

اب انہوں نے کہا۔ "اچھا اب ہمارے شاعر اور خطیب کو اجازت دو۔" آپؐ نے اُن کی درخواست منظور فرمائی۔ اور اُن کے خطیب عطارد نے کھڑے ہو کے یہ تقریر کی۔ "تعریف اُس خدا کی جو ہم سے افضل اور تعریف کا اہل ہے۔ وہی جس نے ہمیں بادشاہ بنایا! اہلِ مشرق میں ہمیں سب سے معزز کیا! ہمیں بے حد دولت دی جس کو ہم فیاضی سے خرچ کرتے ہیں۔ لوگوں میں ہمارا مثل و نظیر نہیں۔ کیا ہم آدمیوں کے سردار اور اُن میں صاحبِ فضل نہیں ہیں؟ الغرض جس کسی کو دعویٰ ہو ہمارے سامنے آئے اور جس طرح ہم نے اپنی فضیلتیں گنوائی ہیں وہ بھی گنوائے۔ حالانکہ ہم اگر چاہیں تو اپنی اور فضیلتیں بھی پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں لاف زنی کرتے شرم آتی ہے۔ اب مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا اور جس کسی کو یہ دعویٰ ہو ہمارے قول سے اچھا قول اور ہمارے حالات سے اچھے حالات پیش کرے۔" عطارد یہ کہہ کر بیٹھ گیا اور اس کا جواب دینے کیلئے ادھر سے ثابتؓ بن قیس کھڑے ہوئے۔

ثابتؓ بن قیس کا خطبہ یہ تھا۔ "حمد اُس خدا کی جس نے زمین و آسمان پیدا کئے۔ اُن پر اپنا حکم جاری کیا اور اپنی کرسی اور اپنے علم کو وسعت دی اور جو کچھ ہوتا ہے اُسی کی قدرت سے ہوتا ہے۔ اس کی قدرتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی مخلوق میں سے ہمارے لئے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو حسب میں اُن سے افضل، باتوں میں اُن سے سچا اور رتبے میں سب سے بہتر ہے، پھر اُس پیغمبرؐ پر ایک کتاب نازل کی اور اپنی خلقت کا اسے امانت دار قرار دیا۔ لہٰذا وہی وہ شخص (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ جسے اللہ نے سارے عالم سے برگزیدہ کیا۔ پھر اس نے لوگوں کو ایمان کی طرف بلایا ......" یہ تقریر ختم ہوئی تو بنی تمیم کا شاعر زبرقان اٹھا اور اپنی قوم کی فضیلت میں مدح خوانی کرنے لگا۔ جب وہ اپنے اشعار سنا چکا تو حضورؐ نے حسانؓ کو بلوایا اور مسجد میں ایک منبر رکھوا کے حکم دیا کہ اس پر بیٹھ کر جواب دیں۔ حسانؓ نے فی البدیہہ اسی بحر اور قافیہ میں بہت سے اشعار سنائے۔ جن کو سن کر بنی تمیم متحیر ہو گئے۔ عطارد سے نہ رہا گیا۔ اٹھ کھڑا ہوا اور ایک قطعہ اپنی فضیلت میں پڑھا۔ حسانؓ نے اُن شعروں کا برجستہ جواب دیا۔ یہ سب کارروائی دیکھ کر بنی تمیم سے اقرع کہنے لگا۔ "یہ شخص تو واللہ برگزیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا شاعر ہمارے شاعر سے زیادہ سخن آفریں ہے اور اس کے خطیب و شاعر کی آواز ہمارے خطیب و شاعر کی آواز سے زیادہ بلند ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے آنحضرتؐ کی طرف دیکھا اور کہا۔ "محمدؐ! کچھ دلواؤ۔" آپؐ نے بقدرِ حیثیت عطا کیا۔ مگر اُس نے کہا۔ "ابھی اور دو۔" آپؐ نے اور دیا۔ اقرع بولا۔ "خدا کی قسم یہ سردارِ عرب ہیں۔" اس کے بعد یہ سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ چند روز یہاں ٹھہر کر قرآن اور عقائدِ دین کی تعلیم پائی اور گھر جانے لگے تو حضورؐ نے اور زیادہ عنایت فرمائی۔ کپڑے پہنائے۔ کچھ نقد دیا اور وہ سب خوش خوش اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔

(مضامینِ شرر (سیرِ رجال) مولانا عبدالحلیم شررؔ)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

مس "ون یونٹ" کی جمال آرائیاں اور عشوہ طرازیاں ابھی تک حجاب ہی میں ہیں۔ مگر اُس کی "عصمتِ تقدیس" پر سندھ اور پنجاب کی دو وزارتیں قربان ہو چکی ہیں اور سرحد کی تیسری وزارت بھی غالباً ان "شہیدوں" میں شامل ہونے والی ہے۔ تماشائی عرض کرتا ہے کہ جب آنسہ "ون یونٹ" اپنے بہت سے حجابات میں رہ کر ہی یہ جلال دکھلا رہی ہے اور بڑے بڑے سورماؤں اور دل آزماؤں کے اُس نے کس بل نکال کر رکھ دیئے ہیں۔ تو جب یہ نازنین برسر بام آکر جلوہ آرا ہوگی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اُس وقت کیا عالم ہوگا؟ نہ جانے کس کی تقدیر کا ستارہ چمکے گا اور کس کی قسمت کے نوشتے ورق ورق ہو جائیں گے۔ یہ آشوبِ جہاں اور فتنۂ روزگار نہ جانے کتنے گھروں میں جاہ و اقتدار کے چراغ گُل کر چکی ہے اور کتنے ہاتھوں سے قلمدانِ وزارت چھین چکی ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سلسلہ کہاں تک طول کھینچے گا اور اس کے رقیبوں کی باہمی کشمکش کا ڈرامہ کیا سین دکھائے گا؟ ع

پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ!

مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم کے واقعۂ قتل کا مسٹر یورین نے سراغ لگا کر جو رپورٹ پیش فرمائی ہے۔ اس پر بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے؟ یار لوگوں نے نہ معلوم کس کس کے "دامنِ ناز" کو داغدار سمجھ لیا تھا۔ اور لوگ آس لگائے بیٹھے تھے کہ سازشیں اب بے نقاب ہوتی ہیں۔ قائدِ ملت کا خونِ ناحق اب رنگ لاتا ہے اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی اب الگ ہوا جاتا ہے۔ مگر اس رپورٹ نے کسی ایک دامن پر بھی شبہ کا ذرا سا داغ باقی نہیں رہنے دیا۔ "مکمل تطہیر"۔ "پوری صفائی"! عوام نے خیال آرائیوں اور بدگمانیوں کے کیا کیا قلعے کھڑے کر رکھے تھے۔ مسٹر یورین کی ایک ہی جنبشِ قلم میں وہ قلعے دھڑام سے زمین پر گر پڑے!

روزنامہ "ڈان" اس معاملہ میں سب سے پیش پیش تھا۔ بلکہ اس مطالبہ کی قیادت کر رہا تھا کہ مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم کے حادثۂ قتل کی کسی غیر ملکی سراغرساں سے تحقیقات کرائی جائے! یورین رپورٹ کے بعد "ڈان" کے لب گویا پر ایسی مہرِ خاموشی لگی ہے کہ وہ بالکل گم صم ہو کر رہ گیا ہے۔

واہ رے! یورین اور تیری رپورٹ کہ بڑے بڑوں کے مُنہ میں قفل ڈال دیا۔

خبر رساں ایجنسیاں اس کی ذمہ دار ہیں کہ لاہور کارپوریشن کے ایک اجلاس میں گالی گلوچ کے بعد کونسلروں کے درمیان جُوتے ہاتھا پائی تک کی نوبت آگئی! عجیب بات ہے کہ کراچی کے "سٹی فادر" کچھ دن کے لئے خاموش ہوئے تو لاہور کے "پدرانِ شہر" میں جل نکلی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کراچی کارپوریشن سے کوئی سائنس داں "جراثیم" لے کر لاہور کارپوریشن کی عمارت میں چھوڑ آیا ہو

اس واقعہ کی تحقیقات کرانی چاہئے!

اپنا گھر بار کوئی آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ جب جان ہی پر آپڑتی ہے اور امن و عافیت کی تمام راہیں بند ہوجاتی ہیں تب کہیں جاکر کوئی ترک وطن کرتا ہے! ہندوستان سے جو مسلمان کھوکھراپار کی راہ سے خاک چھانتے ہوئے پاکستان میں آتے رہتے ہیں۔ اُن کی بے بسی اور مظلومیت کی بھلا کوئی انتہا ہے۔ مگر اب "خداوندان نعمت" اس راستہ کو بھی بند کردینا چاہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مظلومیت ان "بڑے لوگوں" کے لئے دردِ سری ہوئی ہے۔ اب وہ اپنے دردسر کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ ان ناشدنی مسلمانوں کا پاکستان سے تعلق ہی کیا ہے جو ادھر کا رُخ کرتے ہیں۔ اُن کی عورتوں کی عصمت کل کے لٹتے آج ہی کیوں نہ لٹ جائے۔ وہ ایک ایک دانہ کے لئے ترساد یئے جائیں۔ اُن کے گھروں کو آگ لگادی جائے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کچھ لوگ تنگ آکر شدھی قبول کرلیں۔ لیکن پاکستان میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جو قیامت بھی ہندوستانی مسلمانوں پر گزرجائے اُسے گزرجانے دیں کہ اس کے سوا اور چارہ کار ہی کیا ہے!

مگر پاکستانی عوام کے دلوں میں تو ان مظلوموں کے لئے بہت کچھ جگہ ہے۔ وہ تو ان غریبوں کو اپنا بھائی بند بلکہ گوشت پوست سمجھتے ہیں۔ جی! اُن کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ حکومت کی باگ ڈور ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ حکومت کی ذمہ داریاں ہم سمجھتے ہیں۔ عوام کی قسمت میں تو چیخنا، چلّانا اور ماتم و فریاد لکھا ہوا ہے۔ وہ تو سدا دوتے دھوتے رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی شیون و فریاد سے متاثر ہوکر ہم اربابِ کار اگر کام کیا کریں تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ اپنے اختیار و اقتدار اور مطلق العنانی کا اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیں! یہ نہیں ہوسکتا، یہ نہیں ہونے دیا جائے گا۔

مگر حضور! اس دشواری کا کوئی نہ کوئی حل تو سوچئے! شٹ اَپ! ہم اپنی کرسیاں سنبھالنے کی تدبیر کریں کہ لوگوں کی دشواریوں کا حل سوچیں۔ ایک وقت میں ایک ہی کام ہوسکتا ہے!

جب لمبی لمبی ڈاڑھیاں جھوٹ بولنے لگیں اور نیچی نیچی عبائیں فتنہ و فساد پر آمادہ ہوجائیں۔ اور زہد و تقویٰ (؟) کھُل کھیلنے لگے تو سچائی کس کی دُہائی دے اور حق و صداقت کہاں جائیں؟ جن سے توقع ہو حق کی حمایت کی اور وہ حق ناشناسوں کا آلہ کار بن جائیں۔ تو حق پرستی کس کی پناہ ڈھونڈے؟ — شاید "طریقت" کی یہ بھی کوئی منزل ہو اور ایک "طالب" کا اس مقام سے گزرجانا ہی ضروری ہو کہ "کشفِ حقائق" میں بڑے بڑے نازک اور سخت مقام آتے ہیں — اگر یہ بات ہے تو تماشائی اپنے لبوں پر مہر خموشی لگائے لیتا ہے اور یہ مہر اس وقت ٹوٹے گی جب جھوٹ کو اس کا حق اور سچائی کو اس کا حق مل جائے گا۔

کرنل انوار السادات پاکستان تشریف لائے تھے۔ پاکستان اور افغانستان کے درمیان سمجھوتہ کرانے کے لئے! جن کی خود رائی، ناانصافی، غلط اندیشی، مفاد پرستی اور ستم رانی نے خود اپنے گھر کو جہنم بنادیا ہو۔ اور جن کے اپنے ملک میں نہ جانے کتنے مسائل سلجھائے جانے کی راہ دیکھ رہے ہوں۔ وہ دوسروں کی گتھیاں کیا سلجھائیں گے۔ ع

تو درونِ درچہ کردی کہ بروں خانہ آئی!

چھاج بولے تو بولے، چھلنی بھی بولے جس میں بہتّر چھید! فرعون کے جانشین اور مصلح کے پیامبر!! حیرت ہی حیرت اور افسوس ہی افسوس!

ہماری نظر میں

اللہ کے پیارے رسول

(۱) "اللہ کے پیارے رسول"۔ مؤلف:- انوار الحسن رؤفی (ایم اے) ضخامت ۴۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنہ

(۲) "حضرت ابوبکر صدیق"۔ مؤلف:- انوار الحسن رؤفی۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات۔ قیمت چودہ آنہ۔

(۳) "حضرت عمر فاروق رضی"۔ مؤلف انوار الحسن رؤفی۔ ضخامت ۱۱۹ صفحات قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:- المکتبۃ العلمیہ- ۱۵- لیک روڈ- لاہور۔

یہ تینوں کتابیں انتہائی آسان اور سلیس زبان میں بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی مقدس سیرت اور حضرات شیخین (رضی اللہ عنہما) کی سوانح حیات کے قریب قریب تمام اہم واقعات ان کتابوں میں یکجا ملیں گے۔ یوں سمجھیے کہ بچوں کی نفسیات اور استعداد کے مطابق اسلام کی آسان تاریخ فاضل مصنف نے مرتب کی ہے۔ یہ کتابیں مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلائے جانے کی مستحق ہیں۔ اس دورِ آخرت فراموش میں جب کہ عوام کا ذوق "فلم زدہ" ہو کر رہ گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے بچے اور بچیاں فلمی گیتوں کا ورد کرتی رہتی ہیں، اس قسم کا پاکیزہ لٹریچر حقیقت میں ایک "اذان" ہے۔ جو بت کدے میں دی جا رہی ہے۔ پروفیسر انوار الحسن رؤفی (ایم اے) کو اس کاوش پر اللہ تعالیٰ بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ توقع ہے کہ رؤفی صاحب اس مفید سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔

مکتبۃ العلمیہ (لاہور) بھی اجر و ستائش کا مستحق ہے کہ اس نے بڑے اہتمام کے ساتھ ان کتابوں کو چھاپا ہے اور عوام کے مذاق کی ہم نوائی کرنے کے بجائے، عوام کے مذاق کو بدلنے کی سعی کی ہے۔

سچے رسول کی سچی تعلیم

"سچے رسول کی سچی تعلیم"۔ مرتبہ:- ابو محمد امام الدین رام نگری۔ ضخامت ۱۲۴ صفحات۔ (مجلد) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ تحفظ اردو۔ رام نگر بنارس۔ (پاکستان میں) مکتبہ تعمیر انسانیت۔ فریئر روڈ سکھر (سندھ)

جناب مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری اپنی تصنیف و تالیف کے ذریعہ ادب میں کچھ نہ کچھ اضافہ فرماتے ہی رہتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ موصوف نے "اسلام و اخلاق" کو اپنے فکر و نظر اور بیان و اظہار کا موضوع بنا لیا ہے۔ اس کتاب میں مختلف اخلاقی عنوانات (مثلاً:- خوش خلقی۔ نرم مزاجی۔ شوہر اور بیوی کا باہمی حسن سلوک۔ کاروبار میں دیانت اور سچائی۔ مہمان نوازی۔ بیمار پرسی ......) کے تحت حضور سید الاولین والآخرین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس احادیث کا سلیس اور دلنشین ترجمہ درج کیا ہے۔ ساری کتاب میں خزف ریزہ نام کو بھی دکھائی نہیں دیا۔ ایک ایک صفحہ پر انسانیت و اخلاق کے لعل و گہر ہی بکھرے ہوئے ہیں۔ سیرت و کردار کے بنانے میں یہ کتاب انشاء اللہ تیر بہدف ثابت ہوگی۔

امام غزالیؒ کا ایک اہم مکتوب

"حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اہم مکتوب" ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- شعبۂ تبلیغ و اشاعت مدرسہ جامعہ حنفیہ لاہور (ٹیمپل روڈ)

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی ہی اس کتاب کی افادیت کی مستند ترین ضمانت ہے۔ حضرت امامؒ نے اپنے ایک شاگرد کے خط کے جواب میں وعظ و نصیحت کے دریا بہا دیئے ہیں۔ یہ مکتوب کیا ہے حکمت و اخلاق کا ایک دفتر ہے۔ اسے پڑھ کر توجہ الی اللہ پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک مسلمان سوچنے لگتا ہے کہ دین و اخلاق میں میرا کیا مقام ہے مجھے کیا ہونا چاہیئے اور میں ہوں کیا؟

"جو علم آج تم کو گناہوں سے نہیں روکتا اور عبادت کی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ یاد رکھو کہ کل وہ آتش دوزخ سے بھی تم کو نہیں بچا سکتا ...."

امام غزالیؒ کے یہ الفاظ نو سو سال کے بعد بھی کالجوں، اسکولوں اور دانش گاہوں کو آئینہ دکھا رہے ہیں! پوری کتاب کا یہی رنگ ہے۔

رسول اللہ اور شعر

"رسول اللہ اور شعر"۔ از:۔ عبدالوہاب خاں عاصم (ایم اے۔ ایم او ایل) ضخامت ۳۴ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ عبدالوہاب خاں عاصم۔ مانا وہ دہ ہاؤس۔ کراچی۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر ہونے کی بڑی شدومد سے نفی کرتا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ حضورؐ نے ایک مصرعہ بھی موزوں نہیں فرمایا۔ کہ شاعری منصب نبوت کے شایان شان نہیں ہے۔ مگر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اچھے اشعار کو پسند فرماتے تھے۔ حضرت حسانؓ بن ثابت کے لئے آپ نے خاص طور سے دعا فرمائی تھی۔ "اللھم ایدہ بروح القدس"۔

فاضل ناقد نے قرآن پاک کی بعض آیات درج کی ہیں۔ جو شعر کے وزن پر ہیں:۔

مثلاً۔ انا اعطینک الکوثر۔ بحر متقارب مثمن اثلم۔ فعلن فعلن فعلن فعلن۔

جناب عاصم صاحب کا کہنا یہ ہے کہ نفس شاعری اسلام کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے ثابت کیا ہے کہ وزن شعر کا جزو لاینفک ہے۔ جس کلام میں وزن نہیں۔ اُس پر شعر کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ اپنے موضوع پر یہ کتابچہ دلچسپ اور پُر از معلومات ہے۔

ڈاک کے ٹکٹ

"ڈاک کے ٹکٹ"۔ از:۔ مقصود اعظمی۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ شبلی اکیڈیمی اسلام آباد مارکیٹ چٹاگانگ۔ (مشرقی پاکستان)

بعض لوگ ڈاک کے ٹکٹ بڑے شوق سے جمع کرتے ہیں۔ اور اُس کے البم بناتے ہیں۔ سنتے ہیں جارج پنجم (آنجہانی) کے پاس ڈاک کے ٹکٹوں کا نادر ترین ذخیرہ تھا۔ یہ کتابچہ اسی شوق اور ضرورت کے تحت لکھا گیا ہے اور "ٹکٹوں" کی قسمیں دی گئی ہیں۔ اس موضوع پر یہ کتابچہ تھوڑی بہت معلومات فراہم کرتا ہے۔

حلقہ ہائے متفقین جماعت اسلامی کی تنظیم

"حلقہ ہائے متفقین جماعت اسلامی کی تنظیم اور اس کا تعمیری پروگرام"۔ ضخامت چوبیس صفحات۔ قیمت دو آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جماعت اسلامی سرگودھا۔

"ملک کی عام پبلک کی زندگی کو اسلامی اصولوں کے مطابق ڈھالنے اور منظم کرنے کے لئے جماعت اسلامی لٹریچر، اخبارات، رسائل، جلسوں اور تبلیغ و اشاعت کے دیگر ذرائع سے کام لے رہی ہے اور اپنے عوامی پروگرام کی توسیع کے لئے ملک کے ایسے تمام صالح اور اسلام پسند افراد کو جن میں اصلاح کا جذبہ ہو اور جو حق کو مان کر اس کے لئے وقت، مال اور محنت کی قربانی پر آمادہ ہوں، چھانٹ چھانٹ کر

ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتی ہے۔ اور پھر اُن کی تنظیم و تربیت اس طرز پر کرنا چاہتی ہے کہ وہ اپنے اندر صحیح اسلامی سیرت و کردار پیدا کرنے کی کوشش کریں اور اپنی سوسائٹی اور قوم کی اصلاح و تعمیر کے کام کو خوبی کے ساتھ چلا سکیں۔ ایسے جو افراد جماعتِ اسلامی کے مقصد، طریق کار اور نظامِ جماعت کو قبول کر لیں انھیں تو جماعت کا باقاعدہ رکن بنا لیا جاتا ہے اور جو نظامِ جماعت کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کئے بغیر جماعت کے مقاصد اور طریق کار کی تائید اور ان سے اتفاق پر اکتفا کریں تو اُن کو جماعت کے حلقۂ متفقین میں شامل کر لیا جاتا ہے۔"

اور ان حلقۂ ہائے متفقین کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اپنے قصبہ اور محلہ میں ایک اسلامی دارالمطالعہ قائم کرنے کی کوشش کریں دوسرا کام ـــ اپنے قصبہ یا محلہ میں نیکی کو قائم کرنے اور بُرائی کو مٹانے کے لئے امکانی جدوجہد کریں ـــ تیسرا کام ـــ تعلیم بالغان کے سلسلہ کا آغاز ـــ چوتھا کام ـــ خدمتِ خلق اور رفاہِ عام کے کام کئے جائیں ـــ پانچواں کام ـــ قصبہ یا محلے کے مستحق یتیموں، بیواؤں اور غریبوں کی امداد و اعانت۔

کتنے مبارک اور نیک ہیں یہ مقاصد۔ اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کیلئے کتنا ضروری ہے یہ پروگرام۔ اللہ تعالیٰ ان صاحبِ عزیمت لوگوں کی مدد فرمائے کہ ناسازگاریٔ حالات کے باوجود یہ لوگ ذرا سی بھی ہمت نہیں ہارتے اور اپنے مقصد اور نصب العین کی طرف بڑھتے جاتے ہیں۔

شبلی

"شبلی"۔ از:۔ مقصود اعظمی۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت چار آنہ۔
ملنے کا پتہ:۔ شبلی اکیڈمی اسلام آباد مارکیٹ چاٹگام۔

"عطیہ کے نام شبلی کے خطوط" کو سامنے رکھ کر بعض ناقدین نے علامہ شبلی مرحوم کے کیرکٹر پر نوکِ قلم سے کچھ چھینٹیں اڑائی ہیں۔ جناب مقصود اعظمی نے اس کتابچہ میں ان چھینٹوں کو دھونے کی کوشش کی ہے۔ اس کتابچہ کا صرف ایک اقتباس:۔

"........ شاید "شبلی نامہ" لکھ کر اکرام صاحب نے نوجوانوں کو اسی اخلاق کی طرف دعوت دی ہے۔ کاش وہ یہ کام روس میں انجام دیتے۔ یہاں تو ابھی یہ فضا اُن کے اس مشن کے لئے بڑی ہی ناسازگار ہے......"

صفحہ ۱۲ پر "اصرار" کا املا "اسرار" درج ہے اور صفحہ ۲۲ پر "استفادہ حاصل نہیں کیا" لکھا ہے۔ اس جملہ میں "حاصل" زیادہ ہے۔ شبلی کے ناقدین کے جواب کے لئے ایسے کتابچے بالکل ناکافی ہیں۔ لوہا لوہے سے ہی کاٹا جا سکتا ہے۔ بانس کی تیلیوں کی دھار چاہے کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو۔ فولاد کو تو وہ نہیں کاٹ سکتی!

اساسِ عربی

"اساسِ عربی" (یعنی عربی صرف و نحو کے قواعد) مؤلفہ:۔ محمد نعیم الرحمٰن (ایم اے) ضخامت ۳۳۰ صفحات (لانبا سائز) کاغذ، کتابت، طباعت، ہر چیز خوب سے خوب تر۔ قیمت پانچ روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ فریئر روڈ۔ کراچی۔

اس کتاب میں عربی صرف و نحو کے قواعد نہایت سلیس، آسان اور عام فہم اسلوب پر مرتب کئے گئے ہیں۔ ہر بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مبتدی شخص جسے عربی زبان سے فطری لگاؤ ہو کسی اُستاد کے بغیر اس کتاب سے بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ کتاب میں دی ہوئی مشقیں (Exercises) بہت کام کی ہیں۔ جن میں طالب علم کی تدریجی ترقی

کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

صفحہ ۳۵ پر "رمح" کا ترجمہ "تیر" کیا گیا ہے۔ حالانکہ "رمح" نیزے کو کہتے ہیں۔ (صفحہ ۳۸) "قضیب" کا ترجمہ "لاٹھی" بھی درست نہیں۔ (صفحہ ۳۸) "صندوق" کو "بالفتح" لکھا ہے۔ حالانکہ عربی میں "صُندوق" کا "ص" مضموم بولا جاتا ہے۔

کتاب کے آخر میں صرفی ونحوی اصطلاحات کے انگریزی مترادفات جو دیئے گئے ہیں۔ انھوں نے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ کر دیا ہے۔ فاضل مؤلف نے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"اس کتاب میں صرف ونحو کے مسائل کی بحث اور اُن کی ترتیب زیادہ تر انگریز نحوی تھیچر کی عربی گرامر پر مبنی ہے لیکن اس امر میں ہر جگہ اس کی پیروی نہیں کی گئی۔ بلکہ اکثر و بیشتر اُس سے بالکل قطع نظر کی گئی ہے۔ اور ائمہ فن مثلاً سیبویہ۔ ابن مالک۔ زمخشری وغیرہم کی تصانیف سے استمداد کر کے مطالب کو زیادہ واضح اور صحیح بنانے کی کوشش کی گئی ہے........"

سیّدہ فاطمہ زہرا

"سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا" از:۔ ابو محمد امام الدین رام نگری۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت چھ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ تحفظ اردو۔ رام نگر بنارس۔ (پاکستان میں) مکتبہ تعمیر انسانیت فریر روڈ سکھر سندھ

اس کتابچہ میں حضرت سیدہ فاطمہ زہرا (سلام اللہ علیہا) کی مقدس زندگی کے حالات عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں۔ کتاب مقصد کے اعتبار سے سَو فیصدی کامیاب اور مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ مُسلم خواتین کی زندگیوں میں سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مقدس سیرت کی ذرا سی بھی جھلک پیدا کر دے تو اسلامی معاشرہ کیا سے کیا ہو جائے۔

اقامتِ صلوٰۃ

"اقامتِ صلوٰۃ"۔ مرتبہ:۔ مولانا محمد عبد الحلیم صدیقی۔ ضخامت ۶۲ صفحات۔
ملنے کا پتہ:۔ شعبہ تبلیغ و اشاعت جامعہ حنفیہ۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور۔

اس کتاب میں "اقامتِ صلوٰۃ کی اہمیت۔ نماز کی شرائط۔ فرائض۔ واجبات، سُنن اور دیگر ضروری مسائل کو آسان طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔" کوئی شک نہیں اپنے موضوع پر یہ کتاب بہت مفید ہے اور فاضل مرتب کی محنت قابلِ داد ہے۔

(صفحہ ۵۸) "سجدہ سہو نکالنے کی ضرورت پیش آئے۔" "سجدہ" کے لئے نکالنا اہلِ زبان نہیں بولتے۔ ۴۸ کا تلفظ اڑتالیس نہیں اڑتالیس ہے (صفحہ ۶۰) "سبابہ" کے "س" پر پیش غالباً کاتب صاحب کی شوخیٔ قلم کا نتیجہ ہے۔ (صفحہ ۶۲) نماز کے ضروری مسائل کے تحت صفحہ ۶۰ پر جو یہ لکھا ہے۔ "(۱۲) مسجد میں نمازی اپنی نعلین، تحت العین رکھے تاکہ سارق النعلین (جوتی چور) سے محفوظ رہے۔" تو یہ نماز کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جسے یہاں بلا ضرورت درج کیا گیا ہے۔

"اقامتِ صلوٰۃ" حقیقت میں بڑے چھوٹوں سبھی کے لئے کام کی کتاب ہے۔

سچّی باتیں

"سچّی باتیں" (حصہ سوم) از:۔ انوار الحسن ایم اے۔ ضخامت ۷۰ صفحات۔ قیمت دو آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ المکتبۃ العلمیہ۔ ۱۵ لیک روڈ۔ لاہور۔

وضو، تیمم اور نماز کے مسائل کو انتہائی سلیس وسہل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ کتاب مسلمان بچّوں اور بچیوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ مگر بڑی عمر والے بھی اسے پڑھیں گے تو فائدہ ہی حاصل کریں گے۔ کیونکہ دینی معاملات میں ہمارے چھوٹے بڑے عام طور پر ایک ہی جیسے ہیں۔

(صفحہ ۱۵) "گھٹنوں تک دونوں ہاتھ دھونا" گھٹنے تو ٹانگوں میں ہوتے ہیں۔ ہاتھوں میں "گٹے" ہوتے ہیں۔

مخزن الدلائل

"مخزن الدلائل" مؤلفہ:- علامہ قاضی منتجب الدین - ضخامت ۱۵۲ صفحات - قیمت ڈیڑھ روپیہ (سکۂ ہند) ملنے کا پتہ:- دارالاشاعت کتب سلف الصالحین دائرہ زمستان پور، شیر آباد، حیدر آباد دکن -

یہ کتاب فرقہ مہدویہ کے بہت بڑے عالم قاضی منتجب الدین کی تالیف ہے - جسے جمعیۃ مہدویہ (حیدر آباد دکن) نے متن اور اُردو ترجمہ کے ساتھ شائع کیا ہے - یہ کتاب فرقہ مہدویہ کے اس عقیدہ کی ترجمانی کرتی ہے کہ حضرت سید محمد جونپوری کی مہدویت جزوِ ایمان ہے اور جو کوئی اُن کی مہدویت پر ایمان نہیں رکھتا وہ کافر ہے - یہ عقیدہ انتہائی جاہلانہ اور گمراہ کن ہے اس عقیدے کی بنا پر آج روئے زمین پر جو پچاس کروڑ مسلمان بستے ہیں وہ (معاذ اللہ) سب کے سب کافر ہیں کہ سید محمد جونپوری صاحب کو مہدی نہیں مانتے - بس مسلمان یہ ڈھائی لاکھ مہدوی ہیں - اس عقیدۂ مہدویت کی رُو سے شہنشاہ اکبر کے دور سے اب تک چند لاکھ مہدویوں کے علاوہ تمام مسلمان کافر قرار پائیں گے - جن میں علم و تقویٰ اور تزکیہ و عزیمت کے اعتبار سے ایسے صالحین بھی امّت میں گزرے ہیں جو سید محمد جونپوری مرحوم سے کسی طرح کم درجے کے نہ تھے!

مخزن الدلائل میں حضرت سید محمد جونپوری کی "مہدویت" ثابت کرنے کے لئے احادیث کی عجیب و غریب تاویلیں کی گئی ہیں - سب سے زیادہ زور اس پر دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مہدی ایک ہی زمانے میں نہیں ہوں گے - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس "مہدی" کیلئے پیشین گوئی فرمائی ہے وہ "وہی" سید محمد جون پوری "تھے" - جو ہو چکے!

"خانیہ وغیرہ فتاویٰ فقہیہ میں ذکر کیا گیا ہے دو جھگڑنے والوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا آ تا کہ عالم کے پاس جائیں اور دوسرے نے کہا کہ میں عالم کو کیا جانوں تو کافر ہوا - پس مہدی کی اطاعت اسی قبیل کی ہے ......" (صفحہ ۹۸)

اگر کسی عالم کی تردید و تکذیب اور اس کے عالم نہ ماننے سے کوئی مسلمان کافر ہو جاتا ہے اور اس فقہی فتویٰ سے سید محمد صاحب جونپوری کی "مہدویت" پر دلیل لائی جاتی ہے تو یہ بڑی کمزور دلیل اور انتہائی مضحکہ خیز بات ہے!

قال ابوھریرۃ لقد حفظت من رسول اللہ وعائین من الحدیث وعاء لقد بثثتہ ووعاء لو بثثتہ لقطع منی ھذا البلعوم ای الحلقوم۔

ابو ہریرہ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ سے یاد کیا کہ حدیث کے دو ظرف ہیں ان میں کا ایک ظرف شریعت کا ہے اس کو لوگوں پر ظاہر کرتا ہوں اور دوسرا ظرف حقیقت کا ہے - اگر اس کو ظاہر کردوں تو میرا حلق کاٹا جائے۔

"شریعت کا (ظرف) اور "حقیقت کا (ظرف)" یہ ترجمہ کس لفظ کا کیا گیا ہے؟ انسانوں میں تو آزاد ترجمے چل جاتے ہیں مگر احادیث اور اقوال صحابہؓ میں ایسی جرأت دیانت داری کے خلاف ہے۔

حضرت سید محمد جونپوری رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب عزیمت عالم دین اور مرد مجاہد تھے - ہمیں یقین نہیں آتا کہ انہوں نے اپنے دعویٰ مہدویت کے جزوِ ایمان ہونے پر اصرار کیا ہوگا - یہ اُن کے معتقدین کا مبالغہ اور حاشیہ آرائی معلوم ہوتی ہے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ انہوں نے واقعی ایسا ہی دعویٰ کیا تھا تو اُن کے اس قسم کے اقوال کو "شطحیات" سمجھ کر نظر انداز کرنا چاہیئے - قیامت میں سید محمد جون پوری کی مہدویت کے بارے میں کسی مسلمان سے کوئی سوال نہیں کیا جائیگا - کروڑوں مسلمان تو سید صاحب جون پوری کا نام تک نہیں جانتے - اور اس نہ جاننے کے سبب اُن کے ایمان میں ذرا سا بھی نقص نہیں ہے۔

فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر اور پس منظر

"فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر اور پس منظر" (حصہ اول) از:- افتخار احمد بلخی۔
ضخامت ۲۳۶ صفحات - قیمت دو روپے آٹھ آنہ - ملنے کا پتہ:- مکتبہ چراغِ راہ - کراچی۔

اس کتاب میں مولانا افتخار احمد بلخی نے فتنۂ انکارِ حدیث کے ظہور کی نشاندہی کی ہے۔ کہ یہ شجرِ خبیث کب اُگا۔ کس طرح برگ و بار لایا اور فسق و ضلالت کے کن چشموں نے اس کی آبیاری کی۔ اس موضوع پر یہ کتاب اپنا آپ جواب ہے۔ فاضل مصنف نے بڑی محنت اور سعی و کاوش کے ساتھ اس کتاب کو مرتب فرمایا ہے۔

کتاب کے آخری حصہ میں "منکرینِ حدیث" کی کتابوں کے اقتباسات دے کر بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ کے حوالوں سے کتنے غلط نتائج نکالتے ہیں اور کیسی کیسی تحریفیں اور بددیانتی کرتے ہیں۔ فاضل ناقد کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے اس فتنہ کی روک تھام کے لئے بروقت اقدام کیا۔

کتاب میں کہیں کہیں طنز میں ضرورت سے زیادہ ایجاز بلکہ ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ مگر مجموعی طور پر اس کتاب کی افادیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔ یقین ہے کہ آنے والے دونوں حصے کامیاب تر ہوں گے۔ اور منکرینِ حدیث کے چہروں پر نفاق و ریا کی کوئی نقاب بھی ثابت نہ رہے گی! ایدہ اللہ بنصرالعزیز۔

مکتبہ چراغِ راہ اس قسم کی کتابوں کی اشاعت پر تبریک و تحسین کا مستحق ہے۔ کتاب کی قیمت بھی افادۂ عام کے لحاظ سے واجبی رکھی گئی ہے۔

ترانۂ دل

"ترانۂ دل" از دل شاہجہاں پوری۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات (مصنف کی تازہ ترین تصویر کے ساتھ) لکھائی چھپائی اور کاغذ دیدہ زیب۔ قیمت غیر مجلد تین روپے آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:- شفیق حسن خاں۔ محلہ ہاتھی تھان شاہجہانپور۔ یوپی (انڈیا)

اعتبار الملک حکیم ضمیر حسن خاں دل شاہجہاں پوری (جانشین حضرت امیر مینائیؒ) کا نام اور کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ صاحب موصوف نہ صرف شاعر ہیں بلکہ شاعر گر ہیں۔ عربی کے عالم۔ فارسی کے منتہی۔ طب میں نہ صرف یہ کہ فارغ التحصیل بلکہ کامیاب طبیب بھی۔ شاعری کی مشق ساٹھ سال سے کچھ زیادہ ہی کی ہوگی۔ پھر حضرت امیر مینائی کے دامن گرفتہ اور تربیت یافتہ۔ علم و شعر میں تحصیل و مشق کے اتنے زرین مواقع ہر شخص کو کہاں حاصل ہوتے ہیں۔

حضرت دل شاہجہاں پوری کا جدید و قدیم کلام "ترانۂ دل" کے نام سے اُن کے چھوٹے صاحبزادے شفیق حسن خاں صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ کلام کے تین حصے ہیں:-

(۱) "افکارِ تازہ" (کلامِ دورِ حاضر) ۱۹۳۲ء سے اس وقت تک۔

(۲) "خواب دوشیں" (کلامِ دورِ متوسط) ۱۹۰۵ء سے ۱۹۳۲ء تک۔

(۳) "بادۂ کہن" (کلامِ دورِ قدیم، ضمیمہ دیوان نغمۂ دل) ۱۹۰۵ء سے قبل کا۔

نیاز فتحپوری کے مقدمہ کے علاوہ حضرت دل کے کلام پر کم و بیش پچاس مشاہیر کی آراء درج ہیں۔ حیرت ہے کہ دل جیسے پختہ کار اور معروف شاعر کو اتنے بہت سے "سارٹیفکٹوں" کی کیا ضرورت تھی۔ اس قسم کی دو سطری رائیں:-

"دل اپنے کو امیر کا شاگرد بتاتے ہیں مگر اُن کے یہاں جلال کی گرمی بھی مل جاتی ہے۔ اُن کی پختگی اور مشاقی میں کلام نہیں۔"
(پروفیسر آلِ احمد سرور)

کوئی وزن نہیں رکھتیں کہ اگر آج کوئی نو مشق شاعر اپنا کلام چھپوانا چاہے تو ہندوستان کے ہر ادیب و شاعر سے

اس قسم کی "آزادی" حاصل کر سکتا ہے۔

نیاز فتحپوری مدیر مجلہ "نگار" کا مقدمہ خاصہ دلچسپ اور وزنی ہے۔ مگر اس میں کہیں کہیں رنگ ابہام بھی پیدا ہو گیا ہے:۔

"اور شعر نام ہے اس قوتِ شاعرہ وحسِ مدرکات کے باہمی تفاعل کے نتیجہ کا جو ایک شاعر میں پائی جاتی ہیں (صفحہ ۲۰)

یہ خیال ابہام واجمال نہیں وضاحت چاہتا تھا"

نیاز صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے طرزِ انشاء سے خاصے متاثر ہیں۔ اس کا کوئی ثبوت چاہیے تو اسی کتاب کے مقدمہ کے یہ الفاظ اس کی گواہی دیں گے:۔

"اہتزازات۔ طامات۔ حماست و جُبن۔ اعماق فطرت، انعطافات، صور مرئیہ، کرخت نومیت، تسبیحانہ، مہلانہ، مستغفرہ۔ تموجات۔ مجاری وجود۔ اعماق تنہائی۔ جواہر فردہ۔۔۔۔۔۔"

"ایک سچے شاعر کی محبت ایک ایسی پاکیزہ و معصوم چیز ہے کہ سوائے "انفاس الوہیت" کے اسے کسی اور شے سے مَس کیا ہی نہیں جا سکتا۔" (صفحہ ۳۳)

یہ کیا بات ہوئی؟ چیستان اور کسے کہتے ہیں؟

حضرتِ دل کی اس صاف بیانی پر رشک آیا کہ "شاعر" ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انھیں آلودۂ ہوس نہیں ہونے دیا۔ فرماتے ہیں:۔

"میرے لب عارضِ محبوب تک کبھی نہیں پہنچے۔ جذباتِ محبت آستاں بوسی تک محدود ہیں۔ میرے مجموعہ کلام میں لفظ رقیب نظر نہ آئے گا۔ میرا محبوب صرف محبوب ہے یعنی حسن معصوم خلوت پسند ہے، جلوۂ سرِ بام نہیں۔۔۔۔۔۔" (صفحہ ۱۲)

دل شاہجہانپوری کے کلام میں ایک پاکباز عشق کا سوز و درد پایا جاتا ہے۔ جذبات کی غیر محتاط شدت نہیں ہے۔ اس لئے ان کے شعروں میں شعلوں کی سی جولانی نہیں بلکہ دھیمی آنچ کی گرمی ملتی ہے۔ دل نے شعر و ادب کے قدیم وجدید دونوں دور نہ صرف یہ کہ دیکھے ہیں بلکہ ان کو برتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے کلام میں قدامت وجدت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ دل انتہا پسند نہیں ہیں۔ وہ توازن واعتدال کے حدود میں رہ کر جذبات کا اظہار فرماتے ہیں۔ ان چند منتخب شعروں کے تیور دیکھئے:۔

کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخیٔ موجِ نسیم　　بے تکلف ہر کلی کو مسکرانا ہی پڑا!

یاس کی نگاہوں نے آج ترجمانی کی　　کہہ چکے جو کہنا تھا ختم ہے بیاں اپنا

اے حسن! جو سزا ہے تمنا ہو وہ قبول　　لیکن مری نظر کو پھر اک بار دیکھ کر

تم تو سکونِ خاطرِ ناشاد بن گئے　　سمجھا تھا میں کچھ اور یہ رفتار دیکھ کر

اے حسن! تری شوخی سمجھوں یا عشق کو خود جاں سوز کہوں　　جو شمع کی لَو میں شعلہ تھا پہنچا ہے وہی پروانے تک

تجلی ہے مکاں سے لامکاں تک　　تمہیں تم ہو نظر پہنچی جہاں تک

وہ دل کہاں جو خاک ہوا راہِ عشق میں　　اب جستجوئے خاکِ پریشاں ہے اور ہم

کہہ رہے ہیں سرگزشتِ عشق جلتے تا بہ ہم　　ختم ہر روداد ہم آغازِ ہر افسانہ ہم

مے کوثر ہے چھلکتے ہوئے پیمانے میں　　میں ہوں جنت میں کہ ساقی ترے میخانے میں

میری مزاج داں نگہ بے خبر کہاں ـــــ احساسِ دردِ عشق کہاں، چارہ گر کہاں

موجوں نے کشاکش کی بدلی ہیں عجب شکلیں ـــــ اب تک یہ نہیں سمجھا ڈوبا ہوں کہ ابھرا ہوں

ہنگامِ انتظار نگاہوں کا ہے یہ حال! ـــــ دیوانہ وار جانبِ در دیکھتا ہوں میں

نیازِ عشق کے جذبات پر بھی اک نظر ـــــ جبیں میں اب وہ کشش ہے جو آستاں میں نہیں

نشان دو مجھے اے خاکِ دشت کے ذرو! ـــــ نظر کو جس کی طلب ہے وہ کارواں میں نہیں

افسانۂ دل طولانی ہے آغازِ محبت سے اب تک ـــــ کچھ بھول گئے کچھ یاد رہا جو یاد رہا وہ کہنا ہے

تا بہ لب آتے ہی خود شکوے میں دل کے منفعل ـــــ کن نگاہوں سے تری چشمِ پشیماں دیکھتے

آئیں گے بہت آنے والے جائینگے بہت جانیوالے ـــــ یا نامِ خدا کا باقی ہے یا حُسنِ عمل رہ جاتا ہے

جبیں ہے اور طلب تیرے آستانے کی ـــــ انہیں حدوں میں رہیں گردشیں زمانے کی

کس ناز سے کہتا ہے کوئی چھوڑ کے ناوک ـــــ یہ اُس کے مقدر میں ہے جو دل نہیں رکھتا

بہلا رہے ہیں اپنی طبیعت خزاں نصیب ـــــ دامن پہ کھینچ کھینچ کے نقشہ بہار کا

ہاتھ رکھ کر وہ دل پہ کہتے ہیں ـــــ اب نہ کہنا کہ بے قرار کیا

ترکش ہی میں جو ناوک وجہ خلشِ دل ہے ـــــ پیوستِ جگر ہو کر کیا جانیے کیا ہوگا!

تجھ پہ او وعدہ فراموش مری جان نثار ـــــ ہاں! پھر اک بار یہ کہہ دے کہ مجھے یاد نہیں

پاک ہے ہر داغ سے دامن ترا اے مستِ ناز ـــــ ہاں! کسی حسرت زدہ کی خاکِ تربت ہو تو ہو

آپ کیا سمجھیں نگاہِ خشمگیں کیا چیز ہے ـــــ آپ کیا جانیں کسی کے دل کی حالت کیا ہوئی

برپا ہوا ہے حشر بس اتنی سی بات پر ـــــ اک نالہ کش کے بس میں طبیعت نہیں رہی

دوئی کا وہم بھی ہوتا تو جستجو کرتے ـــــ وہ کوئی غیر ہیں جن کی ہم آرزو کرتے!!

دیا تھا عشق تو ہمت بھی یہ خدا دیتا ـــــ کہ ایک وقت میں ہم ترکِ آرزو کرتے

درد کی شان یہی ہے کہ رہے مونسِ دل ـــــ دل کی تسکین یہی ہے کہ پریشاں ہو جائے

منزل کا خواب دیکھ رہے تھے سفر نصیب ـــــ چونکے تو کارواں سے بہت دور ہو گئے

وفورِ شوق میں آشفتگانِ عہدِ بہار ـــــ جنوں کی چاکِ گریباں سے ابتدا کرتے

شوق نے کھینچے بہت نقشے مگر سب بے وجود ـــــ ہم نے جب گھبرا کے دیکھا سوئے در کوئی نہ تھا

دب نہیں سکتا کسی غنچہ کا جوشِ انبساط ـــــ رک نہیں سکتی لبوں پر اب ہنسی آئی ہوئی

سچ ہے میری بات کا کیا اعتبار ـــــ سچ کہوں گا جھوٹ مانی جائے گی

کیا آشفتگانِ عشق ہی نے اس کا اندازہ ـــــ جو وسعت چاک ہونے پر گریبانوں میں ہوتی ہے

اے نگاہِ ناز کیونکر میں تجھے ظالم کہوں ـــــ اس ستم پر بھی تو ہر انداز معصومانہ ہے

دوسرا رُخ:-

اساتذۂ فن کے کلام پر تنقید بہت بڑی جسارت ہے مگر غیر جانبدار اور انصاف پسند نقاد کو یہ جسارت کرنی ہی پڑتی ہے۔

آئی ندا کہ اب تری منزل قریب ہے — جب امتیازِ دوریٔ منزل نہیں رہا (صفحہ ۳)

یہاں "امتیاز" احساس کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ "امتیاز" کے لئے دو یا چند چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً "امتیازِ بعد و قرب" "امتیازِ ناقص و کامل"

حقیقت میں وہی ساعت سکونِ دل کی ساعت تھی — مری بالیں پہ جب مایوس کوشش چارہ گر ہوتا
مرے چاکِ گریباں ہی نے اک دنیا بدل ڈالی — قیامت در قیامت تھا جو نالہ با اثر ہوتا (صفحہ ۴)

اس قسم کے بے مزہ شعر غزل میں نہ رہنے چاہیئے تھے۔

سر بہ سجدہ سوئے بزمِ ناز جانا ہی پڑا — حُسن کی تسخیر پر ایمان لانا ہی پڑا (صفحہ ۶)

"سر بہ سجدہ" "سجدہ کناں" کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو محلِ نظر ہے۔

بلند و پست کی حس ہے نفس کی آمد و شد تک — یہاں سے نشانِ جادۂ منزل نہیں ملتا (صفحہ ۷)

"احساس" کی جگہ "حس" نظم ہو جانے سے شعریت کتنی مجروح ہو گئی؟ پھر شعر کا مفہوم بھی گنجلک ہے۔ "یہاں سے" شاید "موت" کے معنی میں استعمال ہوا ہے کہ نفس کی آمد و شد بند ہونے کے بعد نہ جادۂ منزل کا نشان ملتا ہے اور نہ بلند و پست کا احساس باقی رہتا ہے۔ مگر یہ کیا بات ہوئی؟ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کیلئے پیرایۂ بیان کیا اختیار کیا گیا ہے؟

خضر و مسیح کے لئے وقفِ حیاتِ جاوداں — وقفۂ زندگی ہمیں صورتِ نقشِ پا دیا

مصرعِ ثانی میں عجیب ابہام ہے۔ شاید کہنا یہ مقصود ہے کہ جس طرح نقشِ پا بہت جلد مٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری زندگی کا وقفہ بھی بہت ہی عارضی اور مستعجل ہے۔

طرزِ روش نشاطِ جاں، زیرِ قدم سکونِ دل — فتنۂ دہر جو اٹھا اس کو وہیں دبا دیا (صفحہ ۸)

شعر سے مفہوم تو نکالا جا سکتا ہے مگر یہ بات آخر کیا ہوئی؟

لن ترانی تک کرشمے تھے بہ اندازِ حجاب — بڑھ گیا نازِ تجلی محو و حیراں دیکھ کر (صفحہ ۱۱)

یہ وہ شعر ہے جس کے معنی "بطنِ شاعر" ہی میں رہتے ہیں۔

اک محوِ آرزو کو چھائی ہوئی گھٹا میں — خاموشیٔ فضا میں وہ یاد آ رہے ہیں (صفحہ ۲۴)

شعر یُوں بھی سپاٹ تھا۔ دونوں مصرعوں کے "میں" نے اس کا حلیہ ہی بگاڑ دیا۔

پابندیٔ سلاسل یہ جھیلئے کہاں تک — زنداں کو اب تو وحشی صحرا بنا رہے ہیں (صفحہ ۲۴)

کتنا کمزور شعر اور تو مشقوں کا سا اندازِ بیان ہے۔

اب تو خزاں کا دور ہے رنگِ چمن کچھ اور ہے — جوشِ جنوں کی داستاں چھیڑیں گے پھر بہار میں (صفحہ ۲۶)

"چھیڑیں گے" صوتی طور پر کس قدر ناگوار محسوس ہوتا ہے۔

یہ کرشمۂ محبت یہ تغیرات اے دل! — کہوں کیا یہ مختصر ہے کہ وفا شعار ہوں میں (صفحہ ۳۱)

"کلامِ موزوں شعر کو کہتے ہیں" اس شعر پر بس یہی تعریف صادق آتی ہے۔

مثالِ شمع ہے بزمِ جہاں میں زندگی میری — اچھلتے ڈوبتے تارے کو اپنا دل سمجھتا ہوں (صفحہ ۳۲)

شمع اور تارے میں کیا وجہ شبہ ہے؟ پھر تارے کیلئے "نکلنا" اور "ابھرنا" بولتے ہیں "اچھلنا" نہیں بولتے!

تکمیلِ وفا سمجھیں اب کاش اِتری نظریں
مٹتا ہوا اک دل ہوں، جاتی ہوئی دنیا ہوں (صفحہ ۳۳)

مصرعہ ثانی کے لطف کو مصرعہ ثانی کے گنجلک پن نے غارت کر دیا۔

یہی شاعروں کی ہے ذہنیت، یہی زیبِ طرۂ شاعری
کبھی محوِ نرگسِ مست ہیں، کبھی قیدِ زلفِ دراز میں (صفحہ ۱۴)

یہ لفظ "ذہنیت" یہاں کتنا اکھڑا اکھڑا سا لگتا ہے۔ یوں بھی شعر میں کوئی جان نہیں۔

اے منفعل رموزِ کریمی سے بے خبر
کیا سوچتا ہے دستِ طلب تو بڑھا کے دیکھ (صفحہ ۵۳)

"رموزِ کریمی" نے شعریت کو مجروح کر دیا۔

خاک میں جب مل چکا صورتِ نقشِ پا مجھے
جوشِ طلب سمجھ لیا، حاصلِ مدعا مجھے! (صفحہ ۵۷)

"جوشِ طلب سمجھ لیا" میں "نے" چھوٹ جانے سے کتنا خلا پیدا ہو گیا۔ پھر شعر کا مفہوم بھی عجیب سے عجیب تر ہے۔

دشت و زنداں سے ہے آگے مرجعِ جوشِ جنوں
ہم کہاں پہنچیں گے آخر پا بجولاں دیکھئے (صفحہ ۶۶)

"مرجعِ جوشِ جنوں" کتنی غیر شاعرانہ ترکیب ہے۔

کاوشِ دل نے کیا افشا گدازِ دل کا راز
اشکِ خوں پہنچے ہیں ڈھل کر تابہ داماں دیکھئے (صفحہ ۶۷)

"کاوش" سے مراد شاید بے تابی اور اضطراب ہو کہ اس کے سبب دل کا راز افشا ہو جاتا ہے۔ پھر "گداز" زائد لفظ ہے۔ عاشق کے دل میں "گداز" تو ہوا ہی کرتا ہے اس میں راز کی کیا بات ہے جو افشا ہوگی۔ شاعر نے کئی جگہ "اشک ڈھلکنے" کی جگہ "اشک ڈھلنا" نظم کیا ہے!

تجھے اے نظر ہو مژدہ کہ نفس کا تار ٹوٹا
یہ حجابِ آخری تھا جو اٹھا ہے درمیاں سے (صفحہ ۷۲)

نفس کا تار ٹوٹ جانے سے تو آدمی مر جاتا ہے۔ پھر نظر کو مژدہ کیسا؟ موت کے بعد نظر کیا بیکار نہ ہو جائے گی؟

مقصدِ جوشِ محبت کا جو عرفاں ہو جائے
ایک صحرائے جنوں چاکِ گریباں ہو جائے (صفحہ ۸۲)

پورا شعر نرا "آورد" ہی "آورد" ہے۔

صبح کو دوشِ ہوا پر ہے انھیں کی تشہیر!
شمع کی لو پہ جو تابوت تھے پروانوں کے (صفحہ ۹۲)

پہلے ذہن میں یہ تصور جمائیے کہ رات میں شمع کی لو پر پروانوں کے تابوت رکھے تھے۔ جب یہ نقشہ جم جائے تو پھر سوچئے کہ صبح ہونے پر وہ "تابوت" ہوا کے دوش پر اڑتے پھر رہے ہیں۔ یہ ہے اس شعر کا اہتمامِ تکلف۔ پروانہ کی لاش تو سنا تھا۔ پروانہ کا تابوت نہ دیکھا نہ سنا! تابوت مُردے کے صندوق (coffin) کو کہتے ہیں۔

سکونِ مستقل سے لغزشوں کو جابجا بدلے
بدل کر ذہنیت ہر ذہنیت کا مدعا بدلے (صفحہ ۱۱۱)

اس نظم کا عنوان ہے "شاعر" اور شاعر کا یہ کام ہے کہ وہ لغزشوں کو جابجا سکونِ مستقل سے بدل دیا کرتا ہے۔ خوب! "لغزشوں کو استقامت سے بدل دے" اگر کہا جاتا تو ایک بات بھی تھی۔

سمجھتا ہو جو تحریرِ مقدر کو بآسانی
عیاں جس کی نگاہِ غور میں ہو نقشِ پیشانی (صفحہ ۱۱۱)

شاعر کا ایک وصف تو یہ ہوا کہ وہ تحریرِ مقدر کو آسانی سے سمجھ لے۔ یعنی نجوم و رمل جانتا ہو۔ اور دوسری تعریف اس کی یہ ہوئی کہ "نقشِ پیشانی جس کی نگاہِ غور میں عیاں ہو"۔ یہ آخر کیا اندازِ فکر و خیال اور پیرایۂ اظہار ہے؟

مٹ مٹ کے گردباد بنا عاشقی میں دل
پتھر سے خاک خاک سے نذرِ ہوا ہوا (صفحہ ۱۴۱)

شعر میں کوئی لطف نہیں۔ اس قسم کے شعر چھانٹ دینے چاہیئے تھے۔ عاشق کے دل کو "پتھر" کہنا بھی عجیب بات ہے۔ ہاں! اس کی یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ دل غم سہتے سہتے پتھر ہو گیا۔ مگر اس تاویل کا شعر میں کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا!

ہوا احساس جب رسوائی دل کا بیاباں میں — پکارا پاسِ خودداری کہ سر ڈالو گریباں میں (صفحہ ۱۶۵)

رسوائی دل کا احساس تو شہر میں ہونا چاہیئے تھا، بیاباں میں جاکر احساس کیوں ہوا؟ اور احساس ہونے کے بعد پاسِ خودداری کا یہ پکارنا کہ "سر ڈالو گریباں میں" ایک معمہ سے کم نہیں!

جب صاعقہ لہرائے حدِ جاناں منزل کی — چل دادیٔ ایمن تک سن طور کا افسانہ (صفحہ ۱۷۵)

"حدِ جاناں منزل کی" یہ الفاظ مصرعہ میں کھٹکتے ہیں۔ (کاتب صاحب نے "صاعقہ" کو "ساعقہ" لکھ مارا)

کچھ امیدیں وجہ تسکیں کا وشیں جن پر محیط — کیا کہیں اس مرحلے میں دل کی حالت کیا ہوئی (صفحہ ۱۷۹)

اس قدر مشاقی، پُرگوئی اور پختہ کاری پر کہیں کہیں مصرعہ ثانی کے مقابلہ میں مصرعہ اولیٰ کا کمزور اور غیر مربوط ہونا تعجب خیز ہے!

ہر ذرہ خاکِ دل کا اک روحِ مستقل ہے — مٹنا رہِ دفا میں ہے زندگی ہماری (صفحہ ۱۸۲)

ذرہ خاک کو "روحِ مستقل" کہنا ایک عجیب سی بات ہے۔ مصرعہ پورا کرنے کے لئے "مستقل" جیسے بھرتی کے لفظوں کا سہارا لینا اساتذہ فن کو زیب نہیں دیتا!

خموشی کب کوئی مجبورِ حال ہوتا ہے — نئی زباں میں اظہارِ حال ہوتا ہے (صفحہ ۱۹۷)

"نئی زبان" کی جگہ "زبانِ خاص" یا "زبانِ راز" ہوتا تو مفہوم زیادہ واضح اور حسین ہو جاتا۔

سنبھل لے دل کہ مرا پہنچا قریبِ آستاں پہنچا — طبیعت اب تو قابو میں نہیں معلوم ہوتی ہے (صفحہ ۲۰۷)

بالکل سپاٹ اور بے مزہ شعر ہے۔

ہر آبلہ ہوا ابھر کر دلیلِ جوشِ طلب — چلے ہیں جانبِ منزل یہی دعا کرتے (صفحہ ۲۲۲)

عجیب "تکلف آمیز" دعا ہے۔

دل کی امید بر نہیں آتی! — ہم کو آتی نظر نہیں آتی! (صفحہ ۲۶۲)

دوسرا مصرعہ "کہہ مکرنی" اور "پہیلی" سا معلوم ہوتا ہے۔

ان غلط آہنگیوں کے باوجود "ترانۂ دل" ہر بزم میں شوق و دلچسپی کے ساتھ سنا جائے گا۔

تعمیرِ انسانیت

ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت"۔ ادارہ تحریر:۔ کوثر نیازی۔ عبدالحمید۔ سالانہ چندہ چھ روپے۔ فی پرچہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر ماہنامہ تعمیرِ انسانیت۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

ماہنامہ "تعمیرِ انسانیت" کے تین شمارے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ جو باوقار اور سنجیدہ ادب کے ترجمان ہیں۔ اس رسالہ کی اشاعت کا مقصد تعمیری ادب کی ترویج و اشاعت ہے اور اس دورِ ہوا و ہوس میں یہ کوشش علم و ادب اور انسانی معاشرے کی بہت بڑی خدمت ہے۔ جناب کوثر نیازی صحافت کی دنیا میں نئے نئے آئے ہیں مگر بڑی اچھی توقعات کے ساتھ آئے ہیں۔

اس رسالہ کے "صورت و معنیٰ" میں ابھی کافی ترقی کی نہ صرف گنجائش ہے بلکہ ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مدیران و ناشرین کے نیک مقاصد کو پورا فرمائے۔

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

~~جولائی ۱۹۵۵~~

ستمبر ۱۹۵۵ء

ماہر القادری

جلد ۷ ماہنامہ نمبر ۶

فاران

ستمبر ۱۹۵۵ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ ـــــ چھ روپے
فی پرچہ ـــــ آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

وہ لوگ شدید غلط فہمی اور انتہائی جہالت میں مبتلا ہیں جو "اسلام" کو ہندومت، عیسائیت اور بدھ ازم کی طرح ایک "مذہب" سمجھتے ہیں۔ "اسلام" "مذہب نہیں" "دین" ہے۔ اس لئے عبادت، معاشرت، سیاست اور معیشت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اسلام کے حدودِ فکر و عمل سے باہر اور آزاد ہو۔ مدرسہ و خانقاہ سے لے کر دفتروں اور پارلیمانی ہاؤسوں تک، جلوت سے لے کر خلوت تک اور گھروں سے لے کر بازاروں تک۔ غرض زندگی اور معاش کی ہر منزل اور ہر مرحلے کے لئے اسلام کے پاس ضابطہ ہے، ہدایت ہے۔ منشور اور پروگرام ہے۔

اسلام دین ہے اور "دینِ فطرت" ہے اس لئے اسلام سے انحراف حقیقت میں فطرت سے انحراف ہے۔ جس کسی کی بھی زندگی میں یا جہاں کہیں بھی معاشرے میں اسلام سے دُوری اور بیزاری پائی جاتی ہے۔ وہاں فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرایا جا رہا ہے اور غیر فطری حالات پیدا کر دیئے گئے ہیں۔

جس ہمہ گیر اور جامع ترین دین نے کھانا کھانے اور پانی پینے تک کے آداب انسانوں کو بتائے ہیں، وہ عورت اور مرد کے معاشرتی تعلقات اور اُن کے حدودِ عمل سے صرفِ نظر کیسے کر سکتا ہے! حیوان نر و مادہ اور جانوروں کے جوڑوں کی طرح اگر اسلام مرد و زن کو بھی ملنے جلنے، رہنے سہنے اور آپس کے برتاؤ میں بالکل آزاد چھوڑ دیتا اور کھلی ہوئی چھٹی دے دیتا۔ تو پھر اسلام کو یہ دعویٰ زیبا نہ تھا کہ وہ فطرتِ انسانی کا مظہرِ کامل ہے اور انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی کا جامع ترین ضابطہ اور آخری دستورِ حیات ہے!

اسلام نے مرد و زن کو ہدایت کی بلکہ انھیں حکم دیا کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ مردوں سے کہا کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور عورتوں کی نظارہ بازی اور تاک جھانک سے باز رہیں۔ اس کے ساتھ عورتوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنے مقاماتِ

زینت کو چھپائے رکھیں اور اسلامی معاشرے کی آئیڈیل خاتون کو اسلام نے یہ حکم دیا کہ وہ اپنے گھر میں وقار کے ساتھ رہے اور کسی غیر مرد سے بولنے کی ضرورت پڑ جائے تو پردے کی اوٹ سے اس بے نیازانہ انداز میں گفتگو کرے کہ سننے والے کے دل میں کسی قسم کی کوئی تمنا پیدا نہ ہو سکے!

پھر اسلام نے یہ نہیں کہا کہ "بدکاری نہ کرو" بلکہ یہ حکم دیا کہ "زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو"۔ یہ حکم دے کر اسلام نے بدکاری کے تمام داعیات پر پہرے بٹھا دیئے اور فواحش کے تمام محرکات پر قدغن لگا دی۔ کسی عورت پر پہلی نگاہ اتفاقیہ طور پر پڑ جائے تو وہ معاف ہے۔ مگر اس کے بعد دوسری بار دیکھنے کے لئے نفس اکسائے تو یہیں سے بدکاری کی داغ بیل پڑنی شروع ہو جاتی ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "آنکھ کا زنا اس کا دیکھنا ہے"!

فحش و بدکاری سے قریب ہونے اور شہوانی جذبات کو ابھارنے کے جتنے اسباب، ذرائع، وسائل اور داعیات ہو سکتے ہیں اسلام نے ان سب پر پابندی لگا دی ہے! ایک عورت مقاماتِ زینت کو پوری طرح چھپائے ہوئے ہی چاہے گھر سے باہر نکلے، لیکن اگر وہ خوشبو لگائے ہوئے ہے تو مردوں کے لئے اس کے لباس و بدن کی یہ خوشبو جنسی ہیجان اور فتنہ کا باعث بن سکتی ہے۔ نفس کی اس چوری کو اسلام نے پکڑا ہے اور خدا کے آخری نبیؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔

"جو عورت خوشبو لگا کر باہر نکلتی ہے وہ زانیہ ہے"۔

"دیدار" کی طرح "گفتار" بھی مرد و زن کے معاملات میں بہت بڑا فتنہ ہے۔ آواز کی شیرینی، لہجہ کی نرمی اور باتوں کا لوچ جنسی بے راہ روی کے لئے زیادہ سے زیادہ امکانات مہیا کرتا ہے۔ اس لئے اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ نامحرم مرد و زن ناگزیر ضرورت کے علاوہ تفریح اور دل بہلانے کے لئے باتیں کریں! عورت کو نامحرم مرد سے بات کرنے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ پردے کی اوٹ سے بات چیت کر سکتی ہے۔ مگر وہ بھی اس قدر بے تعلقی کے انداز میں کہ سننے والے کے دل میں عورت کی طرف سے کوئی آرزو پیدا نہ ہونے پائے!

مرد و زن کے اختلاط کی اگر اسلام اجازت دیتا تو "نماز" سے زیادہ پاکیزہ اور بے ضرر موقع اور کوئی نہ تھا۔ مگر نماز میں بھی مسلمان مرد اور عورتیں مل جل کر شانہ بشانہ کھڑے نہیں ہو سکتے۔ یہ چیز اس بات کی کھلی ہوئی شہادت ہے کہ اسلام مرد و زن کے اختلاط، قربت اور ملنے جلنے کو نہ صرف یہ کہ پسند نہیں کرتا بلکہ اس کی اجازت نہیں دیتا۔

جس خدا نے شراب اور سود کو حرام کیا ہے۔ اسی نے مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط پر یہ پابندیاں لگائی ہیں! اور وہ خدا جو مرد و زن کے جسم، مزاج، طبیعت، داعیات اور عواطف و جذبات کا خالق ہے اسی نے نفس کی چوریوں اور جنسی میلانات کی خرابیوں کی نشاندہی فرمائی ہے اور ان امکانات سے روکا ہے جو مرد و زن کو بداخلاقی کی طرف لے جانے والے ہیں! جو لوگ تہذیب و تمدن کے تقاضوں اور مطالبوں کے سبز باغ دکھا دکھا کر مرد و زن کی طبعی خصوصیات اور فطری امتیازات کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ وہ شاید اپنے کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ حکیم اور علیم سمجھتے ہیں!

جو کوئی مسلمان ہے اور مسلمان رہنا بھی چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں کہ وہ معیشت و اخلاق اور تہذیب و معاشرت میں صرف اسی ضابطۂ اخلاق کی پیروی کرے۔ جو اسلام نے پیش کیا ہے! جو کوئی مرد و زن کی معاشرت کے معاملہ میں اسلام کی بنائی ہوئی حدود کو توڑ کر دوسری راہوں پر چل پڑتا ہے اور اس قانون شکنی پر نادم اور پشیمان ہونے کے بجائے اپنے کو متنور الفکر اور روشن خیال بھی سمجھتا ہے۔ وہ حقیقت میں منافق ہے اور آخرت میں وہ اپنا

حشر دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل اہلِ نفاق کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہے؟

جاہلیتِ جدید دورِ جاہلیت میں رقص وغنا، سود خوری، شراب نوشی، بُت گری اور مرد و زن کے بے باکانہ اختلاط کی تمام بُرائیاں پائی جاتی تھیں! کھُلی ہوئی بدکاری سے لے کر چوری چھپے کی آشنائی تک ہر طرح بے راہ روی اور بداخلاقی کا چلن تھا۔ عورت کو مرد نے اپنی ہوس کاری کا کھلونا بنا رکھا تھا۔ وہ رقاصہ بھی تھی، داشتہ بھی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ میلوں، ٹھیلوں کی سیر بھی کرتی تھی، انھیں شراب بھی پلاتی تھی اور اُن کے ساتھ مل کر ناچتی گاتی بھی تھی۔ اسلام نے ان فحش باتوں اور صنفی بے اعتدالیوں پر خوب کس کر احتساب کیا اور عورت کو ہوسناکی کی پستیوں سے اُٹھا کر عصمت و عفت کی بلندی پر بٹھا دیا۔ اسلام کے اس احسان سے صنفِ نازک کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتی کہ اسلام نے اُسے عزت دی، پاکیزگی دی اور معاشرت میں اُس کی ایک مستقل حیثیت نہ صرف یہ کہ متعین کر دی بلکہ دُنیا سے منوا بھی دی۔

اسلام نے بلاشبہ ایک طرف مرد کو "قوامیت" کا فطری منصب و اعزاز بخشا کہ عورت میں رفق و نرمی اور تاثر و انفعال کی صفت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اُسے ایک "قوام" — یعنی دیکھ بھال کرنے والے اور سرد ھرے کی ضرورت ہے۔ دوسری طرف اُس نے عورت کو نسلِ انسانی کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری سونپ کر اُس کے اس منصب اور فریضہ میں شانِ ربوبیت کی جھلک پیدا کر دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

"ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہے"

تقدیس و احترام کا یہ وہ منشور تھا جو صرف اسلام نے سب سے پہلے عورت کو عطا کیا!
اس تعلیم کی بدولت سوسائٹی میں توازن پیدا ہو گیا۔ عورت اور مرد دونوں نے اپنے اپنے حدودِ عمل کو پہچانا اور عورت نے اپنے "عورت پن" کے تمام امتیازات اور خصوصیات کے ساتھ انسانی معاشرے میں اپنے فرض کو انجام دیا۔

انسانی تاریخ میں چشمِ فلک نے ایک ایسے دَور کا بھی مشاہدہ کیا جب یورپ میں عیسائیت اور سائنس اور کلیسا اور علم و فن میں شدید کشمکش شروع ہو گئی۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں ایک ایسی تہذیب وجود میں آئی جس کی بُنیاد سرتاپا مادّی مقاصد پر تھی اور اخلاق و پاکیزگی کی اہمیت کو سرے سے نظرانداز کر دیا گیا تھا۔

یورپ کی بے قید معاشرت نے گھریلو زندگیوں پر سب سے زیادہ اثر ڈالا۔ اس خدا ناشناس تہذیب کی زد عورت کے "عورت پن" پر جا کر پڑی۔ مرد کی قوامیت کے بند رفتہ رفتہ ڈھیلے ہونے لگے۔ عورت کو گھریلو ماحول زنداں نظر آنے لگا۔ وہ دفتروں، کارخانوں، ہوٹلوں اور معیشت گاہوں میں پہنچی۔ مرد کی ہوسناکی نے ہر جگہ اس کا بڑھ کر خیرمقدم کیا۔

مزدک نے جو "زن، زمین اور زر" کی مساوات کا غیر فطری نظریہ دُنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ اشتراکیت نے صدیوں بعد جا کر اُسے اپنا لیا۔ یورپ میں صنفی بے راہ روی پہلے سے موجود ہی تھی۔ کمیونزم نے اس کو "انارکی" میں تبدیل کر دیا۔ پاکیزگی سے گریز، اخلاق سے بغاوت، عصمت و عفّت کی نفی، اس آزادی اور مساوات (؟) کے سرسام نے عورت میں مرد بننے کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ اپنے عورت پن کو بھُول گئی! اور اُس نے اپنی ایک ایک خصوصیت کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹا!

آج سارا یورپ حقیقت میں ایک چکلہ خانہ بن کر رہ گیا ہے، جاہلیت اولیٰ کی ایک ایک بُرائی اور بداخلاقی اور زیادہ قوت کے ساتھ اُبھر آئی ہے اور ستم ظریفی یہ ہے کہ جاہلیت کی طرف اس رجعتِ قہقری کو لوگ "ترقی" کے نام سے تعبیر کرتے

ہیں! جاہلیت کے دور میں عرب مرد اور عورتیں خانۂ کعبہ کا برہنہ ہو کر طواف کیا کرتے تھے۔ یورپ نے اس جذبۂ برہنگی کو ننگے کلب گھروں کی صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔ شراب، قمار بازی اور صنفی بے راہ روی کی تمام پچھلی روایتیں یورپ میں زندہ ہو گئی ہیں۔ یورپ جسے اپنی جدت طرازی پر بڑا ناز ہے، حقیقت میں جہاں تک فسق و معصیت کا تعلق ہے وہ بہت بڑا قدامت پرست ہے۔ اس نے زیادہ سے زیادہ اتنا کیا ہے کہ قدیم جاہلیت کو جدید جاہلیت کی شکل دے دی ہے!

یورپ میں اختلاط مرد و زن نے جنسی انارکی اور صنفی بے راہ روی کی وہ پست ترین صورت اختیار کر لی ہے کہ اخلاق و پاکیزگی سی مرغ اور عنقا کی طرح خیالی وجود اور افسانوی تصور بن کر رہ گئے ہیں۔ عصمت اور دوشیزگی کے لفظ وہاں بس لغت کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ آیندہ چل کر لغت سے بھی ان لفظوں کو خارج کر دیا جائے۔

معاشرے کی اس ابتری کو دیکھ کر بعض غیرت مند، ذی ہوش اور حساس مغربی مفکرین نے اس طوفانِ بدتمیزی کے خلاف صدائے احتجاج بلند بھی کی ہے۔ مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ یورپ، لذتوں اور ہوسناکیوں کی جس منزل میں پہنچ چکا ہے وہاں سے اُسے واپس لانا بہت دشوار ہے۔ انسان کا خاصہ ہے بلکہ اس کی کمزوری ہے کہ ذرا سی لذت سے بھی وہ آسانی کیساتھ دست کش نہیں ہوا کرتا۔ چہ جائیکہ عیش سامانیوں اور لذتوں کے جھرمٹ سے وہ اپنے کو محروم کرلے!

مسلم ممالک پر جب انگریز کا تسلط اور غلبہ ہوا تو اس غلبہ کے ساتھ مغربی تہذیب بھی اُن ملکوں میں آئی اور جو سیاست کے میدان میں یورپ سے شکست کھا چکے تھے اُنہوں نے معاشرت کے میدان میں بھی ہار مان لی۔ مغربی سامراج کو مسلم ممالک میں اپنی تہذیب کی نشو و نما کے لئے کسی آرڈی ننس کے جاری کرنے کی زحمت اختیار نہیں کرنی پڑی۔ اس نے ماحول ایسا پیدا کر دیا کہ یورپین تہذیب آکاس بیل کی طرح پھیلتی اور پروان چڑھتی چلی گئی!

مسلم قوم کی سب سے بڑی خصوصیت شرم و غیرت تھی۔ اور اسی جوہر نے اُسے دوسری قوموں کے مقابلہ میں کم آمیز رکھا۔ مغربی تمدن و تہذیب نے مسلمانوں کے اسی جوہر پہ ڈورے ڈالے۔ اور اسی متاع پر شب خوں مارا۔ یہاں تک کہ حریت فکر و نظر کے نام پر شرم و غیرت کے تمام بندھن دھیرے دھیرے ڈھیلے ہوتے چلے گئے۔ انسان کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ ایکبار کسی بے غیرتی کو قبول کر لیتا ہے تو پھر ان معاملات میں اس کی جھجک نکل جاتی ہے اور غیرت کی حساس رگ سُن ہونے لگتی ہے!

مغربی تہذیب نے سب سے پہلے مسلمان عورتوں میں فیشن کا بے پناہ ذوق پیدا کیا اور مغربی فیشن کی سب سے بڑی خصوصیت نمود و نمایش ہے، وہ چاہتا ہے کہ کوئی اُسے دیکھے، داد و تحسین کی نگاہ سے دیکھے۔ اس شوقِ نمود و نمائش نے شروع شروع میں دیدہ زیب بُرقعوں کی صورت اختیار کی اور بُرقعوں اور نقابوں کی اس بوقلمونی اور جدت طرازی نے "حجاب" کی غرض و غایت پر چھپ کر وار کیا!

اس فتنہ کا دوسرا قدم یہ تھا کہ مسلمان عورتیں سیرگاہوں، باغیچوں، بازاروں اور حماموں میں تنہا جانے لگیں! پھر بازاروں میں خرید و فروخت کی "لے" جو بڑھی تو شاپنگ کرنے میں چہروں کی نقابیں اُٹھنے لگیں۔ مرد گاہکوں کے شانہ بہ شانہ وہ بازاروں میں

لہ سنہ ۱۹۳۳ء میں جب میں عراق گیا تھا تو میں نے بغداد کے کلاتھ مارکیٹ میں مسلمان عورتوں کو ٹھیک اسی طرح کپڑے کا مول تول کرتے دیکھا۔ جس طرح کراچی کے بازاروں میں ان دنوں ہماری عورتیں بھاؤ تاؤ کرتی ہیں۔ (م۔ق)

چلت پھرت اور دکانداروں سے چیزوں کی خرید و فروخت میں وہ طول طویل گفتگو! یہ "لے" بڑھتی ہی چلی گئی۔

انسانی معاشرے کو پاکیزگی کا اعلیٰ ترین تصور دینے والے سب سے بڑے انسان (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا۔

"شہروں کے بدترین حصے اُن کے بازار ہیں"۔

تو شہر کے انہی بدترین حصوں میں مسلمان عورت آزادی کے ساتھ گل گشت کرنے لگی۔

اس کے بعد چہرے نقابوں سے آزاد ہوئے، پھر برقعے رخصت ہوئے، پھر عورتوں کے لباسوں میں تراش خراش ہونے لگی۔ پہونچے اور بانہیں کُھلیں، گریبان واہوئے اور پنڈلیاں عُریاں ہونے لگیں۔ ایک ایک بات میں یورپ کی نقالی۔ وہی مرد و زن کا بے باکانہ اختلاط۔ وہی آرٹ کے نام پر بے حیائی کا مظاہرہ، وہی شراب نوشی، قماربازی اور رقص و سرود کی محفلوں میں مرد کے شانہ بہ شانہ اور زانو بہ زانو عورتوں کی شرکت!

یہ خرابی اب اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ قاہرہ، طہران اور دمشق بے حجابی، بے غیرتی اور اخلاقی بے راہ روی میں قریب قریب لندن اور پیرس کی سطح تک آ چکے ہیں۔ اور یہودیوں، مجوسیوں اور عیسائیوں اور مسلمانوں کی معاشرت میں برائے نام فرق باقی رہ گیا ہے۔ سعدی نے "زوال ملک مستعصم" اور بغداد کی تباہی پر مرثیہ لکھا تھا اور آج مسلمانوں کا اخلاقی زوال اس کا سچ مچ مستحق ہے کہ آسمان زمین پر خون کے آنسو برسائے اور معاشرے کی یہ تباہی اور بربادی جس کے مقابلہ میں عباسی حکومت کی تباہی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔ شعر و ادب کا مستقل موضوع بن جائے اور اس قدر دردناک نوحے اور مرثیے لکھے جائیں کہ انھیں سُن کر در و دیوار سے ماتم و بکا کی صدائیں آنے لگیں!

جو مسلم ممالک تہذیب مغرب کی زد میں آ چکے ہیں اُن کی اخلاقی پستی کو دیکھ کر کوئی یہ باور نہیں کر سکتا کہ اس قوم میں صدیق، فاروق، عثمان، علی، سلمان و بوذر (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) جیسے باحمیت شریف مرد اور عائشہ و فاطمہ اور رابعہ بصری جیسی پاکباز، غیور اور صاحبِ تقدیس خواتین کبھی پیدا ہو چکی ہیں اور شاید مسلمانوں نے کچھ ترقی کرداروں اور خیالی شخصیتوں سے اپنی تاریخ کو شاندار بنالیا ہے!

پاکستان میں پاکستان میں بھی یہ سیلاب بڑی تیزی کے ساتھ چلا آ رہا ہے بلکہ آ چکا ہے! یہ خطرہ ہر مکان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے اور کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے۔ اس طوفان سے وہی شخص صرف نظر کر سکتا ہے۔ جس نے قومی حمیت اور ایمانی غیرت کو طلاق دے دی ہو اور جو طوائفوں کے سازندوں اور دلالوں کی صف میں آ چکا ہو۔

پاکستان میں یہ فتنہ اسی تدریج کے ساتھ آیا ہے جس کی طرف اُوپر کی سطروں میں ابھی ابھی اشارہ کیا گیا ہے! کوئی شک نہیں ہے کہ پاکستان کے اربابِ اقتدار نے نہ صرف یہ کہ اس فتنہ کو ڈھیل دی ہے بلکہ اس کے لئے مواقع فراہم کئے ہیں۔ مگر اس خرابی کی ساری ذمہ داری ان "بڑے لوگوں" ہی پر تو نہیں ڈالی جا سکتی۔ پاکستان کے عوام بھی ان برائیوں کے ذمہ دار ہیں!

تعلیمی اداروں میں مخلوط تعلیم کے لئے اپنی لڑکیوں کو عوام نے اپنی مرضی سے بھیجا ہے، برقعہ اور نقاب پر اور جلباب و خمار پر حکومت نے کب کوئی پابندی لگائی تھی۔ ہوٹلوں اور کلب گھروں میں حکومت کے پیادے اور سپاہی کب کسی عورت کو ڈنڈے کے زور سے لے گئے ہیں۔ حکومت نے کب کوئی ایسا آرڈی نینس نافذ کیا تھا کہ یورپ میں عورتوں کو تعلیم و تربیت اور سیر سپاٹے کے لئے لازماً بھیجا جائے!

پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمان عورت دو دو گھنٹے اپنے بناؤ سنگھار میں اس لئے صرف کرتی ہے کہ جسم کے وہ مقامات زینت جن کو چھپانے کا حکم دیا گیا ہے۔ خوب نمایاں ہو جائیں۔ وہ ایسا لباس پہنتی ہے اور جان بوجھ کر پہنتی ہے کہ جو دیکھنے والوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کر سکے، تمام آرائش اور زیب و زینت سے لیس ہو کر وہ گھر سے اس سج دھج اور ناز و انداز کیساتھ نکلتی ہے کہ ہر ہوسناک نگاہ سے وہ خراج تحسین وصول کر سکے۔ اور دیکھنے والے زبانِ حال سے بے اختیار پکار اٹھیں ؎

زیر قدمت ہزار جان است
آہستہ خرام بلکہ مخرام

اور مردوں کی بے حسی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ وہ اپنی بے حجاب اور فیشن زدہ ماؤں، بہنوں اور بہو بیٹیوں کو ساتھ لے کر نکلتے ہیں۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ نامحرم مرد صنف نازک کے حُسن و جمال کو کن نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں۔ مگر اُن کی غیرت اِن نظارہ بازیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیتی!

ہم مانتے ہیں کہ اس فتنۂ بے حجابی کا سلسلہ زیادہ تر اُوپر سے چلا ہے اور قصر و ایوان نے اس ہنگامۂ آزادی کی قیادت کی ہے۔ لیکن عوام کو کسی نے مجبور تو نہیں کیا تھا کہ وہ بھی پردہ نشینانِ حرم کو اسی راہ پر ڈال دیں اور ایک ایک بات میں "بیگمات" کی نقالی کریں۔ بڑے آدمی یہ معذرت کر سکتے ہیں اگرچہ یہ معذرت بالکل لغو اور بے بُنیاد (FALSE-EXCUSE) ہے کہ ہم جس سرکل میں رہتے ہیں اور جس طبقے کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں، اُن میں اس طرز معاشرت کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ لیکن متوسط طبقے نے تو کسی ضرورت کے بغیر ہی اس فتنہ کو دعوت دے کر اپنے یہاں بُلایا ہے۔ لعنت کے یہ طوق انہوں نے خود اپنی گردنوں میں پہنے ہیں۔ اور بے غیرتی کا یہ گولتار بلاوجہ اپنے چہروں پر مل کر سوسائٹی کا حلیہ بگاڑ دیا ہے!

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ بے پردہ عورت کے پردہ نشین عورت کے مقابلہ میں زندگی کی ضروریات پر زیادہ مصارف ہوتے ہیں۔ ایک پردہ نشین عورت معمولی کپڑے پہن کر بھی گھر سے باہر جا سکتی ہے کہ اس کا برقعہ اس کے لباس کی پردہ پوشی کر لیتا ہے۔ مگر ایک بے پردہ عورت کو خوشنما لباس چاہیئے۔ یعنی گھر میں وہ عام طور پر جو لباس پہنتی ہے، اس سے زیادہ اچھا لباس! زنِ بے حجاب کو دعوتوں اور پارٹیوں میں بھی جانا ہوتا ہے۔ ان عام ضرورتوں سے بڑھے ہوئے مصارف کی پابجائی کی یہی چند صورتیں ہیں کہ یا تو اس کا مالدار گھرانے سے تعلق ہو جو تمام اخراجات کا کفیل ہو سکے۔ یا پھر اُس گھر کے کمانے والوں کو معمول سے بڑھ کر زیادہ محنت کرنی پڑے کہ وہ اپنی بے پردہ عورتوں کی مالی ضرورتوں کو پورا کر سکیں۔ اگر وہ لوگ اپنی جسمانی صحت کی وجہ سے معمول سے زیادہ محنت نہیں کر سکتے یا اس کے مواقع انھیں حاصل نہیں ہیں تو پھر وہ ناجائز ذرائع سے روپیہ کمانے پر مجبور ہو جائیں۔ تجارت کرتے ہیں تو اس میں بددیانتی روا رکھیں اور کہیں ملازم ہیں تو رشوت لیں اور ناجائز استحصال کی تدبیریں اختیار کریں۔! یا پھر بے حجاب عورت اپنے مصارف اور اخراجات پورا کرنے کے لئے خود جد و جہد کرے۔ بعض مستثنٰی صورتوں کو چھوڑتے ہوئے عورت جب معیشت کی زندگی میں قدم رکھے گی تو نامحرم مردوں سے اُس کا خلط ملط ہوگا اور یہ اختلاط اُس کے دامن عصمت کو بالکل اچھوتا نہ رہنے دے گا۔ کچھ نہ کچھ بے اعتدالی ضرور واقع ہو گی۔ بدچلنی، بدکاری کی آخری عملی صورت اور فعل ہی کا تو نام نہیں ہے۔ اس منزل میں دیدار، گفتار اور چھیڑ چھاڑ کے جو مرحلے بھی پیش آتے ہیں۔ وہ سب کے سب بدچلنی کے مظاہر ہیں۔ اور ایک لڑکی چاہے طبی نقطۂ نگاہ سے دوشیزہ کہی جائے مگر وہ آزادانہ اختلاط کے ان مرحلوں میں سے جس مرحلے سے بھی گزر چکی ہے اخلاقی طور سے عصمت دوشیزگی کھو چکی ہے!

آخری اور سب سے زیادہ خطرناک صورت یہ ہے کہ بے پردہ عورت اپنے اخراجات پورا کرنے کے لئے غیر مردوں کے تحفے اور ہدیئے قبول کرنے لگے، یہ سو فیصدی خطرناک راہ ہے۔ جس سے کوئی خدا کی نیک بندی صحیح سلامت بچ جائے تو یوں سمجھیے کہ دنیا کو اس نے معجزہ دکھا دیا!

بے حجابی تھوڑی سی آزادی اور صرف چہرے کے کھلنے پر قناعت نہیں کرتی۔ بلکہ یہ شوق بڑھتا اور ترقی کرتا ہی چلا جاتا ہے! یہ کوئی نہیں کہتا کہ ہر وہ عورت جو برقعہ پوش نہیں ہے جنسی بد اخلاقی میں لازمی طور سے مبتلا ہے۔ تہمت و افترا، اور سیرت و کردار کے معاملہ میں ایسی غیر محتاط رائے اور مبالغہ آرائی کا کوئی شریف آدمی مرتکب نہیں ہو سکتا۔ عرض کرنا یہ ہے کہ وہ بے حجاب عورتیں جو نامحرم مردوں سے خلا ملا رکھتی ہیں۔ اُن کی اکثریت یقیناً طرح طرح کی بے راہ روی کا شکار رہے! وہ بے پردہ عورت جو نامحرم مردوں کے سامنے آ تو جاتی ہے مگر اُن سے خلا ملا نہیں رکھتی وہ کم سے کم یہ تو ضرور جانتی اور محسوس کرتی ہے کہ کوئی نامحرم اُسے کس نگاہ سے دیکھ رہا ہے؟ اگر وہ دیکھنے والے کی نظر بازی سے اپنے اندر نفرت اور کراہت محسوس کرے تو سمجھ لو کہ اُس کے اندر عصمت و شرافت کی حس بیدار ہے اور اگر وہ نامحرم نگاہ کی نظارگی کو خوشی سے گوارا کرلے تو علم النفس کا یہ فیصلہ ہے کہ اُس کے اندر غلط روی کے لئے گنجائش یا کم سے کم لچک پائی جاتی ہے!

ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ محض قیاس آرائیاں اور زہد خشک کی بدگمانیاں نہیں ہیں۔ پاکستان کے جن اسکولوں اور کالجوں میں مخلوط تعلیم ہوتی ہے، وہاں جاکر اس کا اتا پتا لگایا جا سکتا ہے کہ ان تعلیمی اداروں میں کیا کیا ہوتا ہے؟ اور لڑکوں اور لڑکیوں کی باہمی دلچسپیاں، بے تکلفی اور لذت اندوزی کے کیا عنوان اختیار کرتی ہیں؟ دفتروں کے اوقات کے بعد شام میں اور رات میں ٹائپسٹ گرلز کے تفریحی مشاغل کی کیا نوعیت ہوتی ہے؟ اور کوئی کھوج لگانا چاہے تو انگریزی دوا فروش اور ڈاکٹر صاحبان ہی بہت کچھ بتا دیں گے کہ نئی نسل کدھر جا رہی ہے؟ اور آزادی اور بیباکی نے نوجوان نسل کو کس منزل تک پہنچا دیا ہے؟

ہمارے کان تک یہ خبریں پہنچی ہیں کہ جب کسی فلم کمپنی کی طرف سے ایکٹرسوں کے لئے کوئی اعلان نکلا ہے تو بڑے بڑے شریف گھرانوں کی لڑکیاں ایکٹریس بننے کے شوق میں انٹرویو کے لئے آئی ہیں اور وہ ہر شرط اور ہر قیمت پر اداکار بننے کے لئے نہ صرف یہ کہ رضامند بلکہ بصد شائق پائی گئیں!

کرکٹ، ہاکی، پریڈ، اداکاری، رقص و موسیقی۔ ان میں سے کونسا شوق ایسا ہے جسے پاکستان کی عورتیں پورا نہیں کر رہی ہیں۔ اور اس پچھلے دو تین سال میں اس فتنہ نے اور زیادہ پاؤں پھیلائے ہیں۔ سڑکوں پر، ہوٹلوں اور سیرگاہوں میں مسلمان لڑکیاں جس بیباکانہ انداز میں گھومتی نظر آتی ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طوفان بے حیائی کتنا پرشور اور بیباک ہوتا جا رہا ہے! جو عورت سربازار اپنے جسمانی اعضاء کی نمائش کرتی ہوئی چل سکتی ہے۔ اُس سے ہر قسم کی بے راہ روی اور بے احتیاطی سرزد ہو سکتی ہے۔ جو کوئی یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اس حسن ظن میں مبتلا ہے کہ معاملہ زیب و زینت کے اظہار اور خرامِ ناز سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ وہ یا تو مخبوط الحواس ہے یا پھر اُس میں کسی قسم کی حمیت اور غیرت باقی نہیں رہی!

بعض لوگ اپنی عورتوں کو سینما جانے پر روک ٹوک نہیں کرتے اور وہ اسے ایک بے ضرر قسم کی تفریح سمجھتے ہیں

اس قسم کے خوش فہم حضرات سے ہم صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ فلم کے پردے پر جب عورتوں کے ناز و انداز، رقص و غنا اور اداکاری کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں تو عورت کسی مرد اداکار کے نظارے سے متاثر کیوں نہیں ہو سکتی۔ کیا عورت جب سینما ہال میں داخل ہوتی ہے تو وہ گوشت پوست کی جگہ برف کی سل بن جاتی ہے؟ یہ کیسی غلط اندیشی اور عجیب و غریب قسم کا حسن ظن ہے کہ ایک مرد جب سینما دیکھ کر گھر آتا ہے تو نہ جانے کتنی دیر تک ہیروئن کے حسن و جمال اور عشوہ و انداز کے تصور میں ڈوبا رہتا ہے۔ مگر عورت کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ سینما ہال سے گھر آ کر ہیرو کے تصور میں ایک ٹھنڈی سانس بھی نہیں لیتی۔ اور فلم کا کوئی سین اس کے دل کی دھڑکن کو تیز نہیں کرتا!

اسلام نے نامحرم مرد و زن کے اختلاط اور بے حجابی و بے حیائی پر جو پابندیاں لگائی ہیں وہ عین فطرت کے مطابق ہیں۔ اور ہر دو صنف کے جذبات، داعیات اور ان کی کمزوریوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ پس جہاں کہیں بھی اسلام کی لگائی ہوئی ان پابندیوں میں سے کسی ایک پابندی کو بھی ختم کیا جائے گا یا اس میں ڈھیل پیدا کی جائے گی تو خرابی پیدا ہوئے بغیر رہ نہیں سکتی!

فحش لٹریچر، سینما، تھیٹر اور دوسری رنگینیوں اور چٹخاروں کے ذریعہ جو معاشرے کی حالت ہو گئی ہے اس پر نظر کرتے ہوئے حجاب و عزت کی پابندیوں اور احتیاطوں کو شدید کرنے کی ضرورت ہے یا ہلکا کرنے کی۔ جب کسی شہر، بستی یا محلہ میں چوریاں زیادہ ہونے لگتی ہیں تو لوگ اپنے مال و اسباب کی پہلے کے مقابلہ میں زیادہ حفاظت کیا کرتے ہیں یا چوریوں کی کثرت دیکھ کر مکانوں کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے حالات میں عقل عمومی کا کیا فیصلہ ہے اور احتیاط و حفاظت کے کیا طریقے ہیں؟ اگر کوئی اسی نکتہ پر غور کرے تو بہت سی الجھنیں انشاء اللہ دور ہو جائیں گی!

سب کے کرنے کا کام

اس حقیقت میں ذرا سا بھی مبالغہ نہیں ہے کہ پاکستان میں فتنۂ بے حجابی جس قوت کے ساتھ سر اٹھا رہا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی گئی تو پاکستان کا معاشرہ بالکل تہ و بالا ہو جائیگا۔ اور ہم پاکستانی مسلمان اسی سطح پر آ جائیں گے جس سطح پر آج یہودی اور عیسائی ہیں!

جو جماعتیں دین کی سربلندی کے لئے تگ و دو کر رہی ہیں۔ وہ قابل مبارکباد ہیں۔ ان کی کوششیں جاری رہنی چاہئیں۔ ہم اس عقیدے پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ دین کی وحدت اسے گوارا نہیں کر سکتی کہ اس کے مجموعے سے چند اجزاء کو نکال لیا جائے کہ یہ تو اسلام ہے باقی حصے دنیا داری سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلام دین اور سیاست میں کوئی تفریق نہیں کرتا۔ اس دوعملی کو زیادہ دن تک نہیں چلنے دیا جائے گا کہ محراب و منبر اور مدرسہ و خانقاہ تو کسی ایک طبقہ کے قبضہ میں رہیں اور قصر و ایوان کسی دوسرے طبقہ کے قبضہ میں! قیصر و کلیسا کی یہ غلط تقسیم انشاء اللہ مٹ کر رہیگی۔ یہاں "مسٹروں" اور "مولاناؤں" کو ایک ہی نظام حکومت قبول کرنا ہوگا۔ پاکستان میں اللہ تعالیٰ کے پورے کے پورے دین کی اقامت ہی کی جدوجہد ہونی چاہیے اور دستور سازی کی مہم یقیناً بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس جدوجہد پر پوری توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن فتنۂ بے حجابی جو بگاڑ پیدا کر رہا ہے اس کی روک تھام بھی اقامت دین کے پروگرام کا ایک جزو بن جانا چاہیئے۔ اس کی مثال ایسی ہی جیسے ڈاکٹر کو دق کے مریض پر مرض دق ہی کے ازالہ کے لئے پوری توجہ دینی چاہیئے۔ مگر اس مریض کی انگلی میں اگر ایسا زخم ہو گیا ہے، جو سارے جسم میں خرابی پیدا کر دے گا اور اس کی سمیت جوڑ جوڑ میں سرایت کر جائے گی تو پھر مرض دق کے علاج معالجہ کے ساتھ انگلی کے زخم کی مرہم پٹی بھی بہت ضروری ہے۔ ورنہ جب تک مرض دق دور ہو اس وقت تک مریض کا سارا جسم مسموم ہو چکا ہوگا!

اور سب سے بڑا خوف تو یہ ہے کہ اربابِ اقتدار اپنی مصلحتوں کے سبب دستور سازی کے معاملہ کو اگر ٹالتے رہے۔ اور دستور نافذ ہوتے ہوتے اور کئی سال لگ گئے تو اس مدت میں پاکستان کے معاشرے کا کیا حال ہوگا ؟ اور قوم کی اکثریت جو قریب قریب بگڑ چکی ہوگی اور یہ چٹخارے اُس کی عادت اور مزاج بن چکے ہوں گے کیا اسلامی دستور کی عملی طور پر کامیابی کیلئے حالات کو ساز گار رہنے دے گی ؟

ابھی پانی زیادہ سے زیادہ گھٹنوں تک آیا ہے، سر سے اُونچا نہیں ہوا۔ اس فتنہ کی روک تھام ابھی ممکن ہے۔ بشرطیکہ پاکستان کی تمام اسلام پسند جماعتیں اس مرحلہ میں دوش بدوش جد و جہد کریں۔ اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر اس موضوع پر مسلسل لکھتے رہیں۔ وعظوں اور تقریروں میں اس ذکر کو بار بار دُہرایا جائے۔ جو گھرانے بے حجابی میں بہت دُور پہنچ چکے ہیں اُن کو چھیڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! جو لوگ اس فتنہ سے اب تک بچے ہوئے ہیں، یا جہاں اس بُرائی کا آغاز ہو رہا ہے اُن کو غیرت دلائی جائے !

مسلم قوم کی اکثریت کے اندر اللہ کے فضل سے ابھی حمیّت اور غیرت موجود ہے۔ عورت کے ناموس کو مسلمان آج بھی اپنی زندگی سے زیادہ عزیز اور قیمتی سمجھتے ہیں۔ اُن کی غیرت سے اپیل کی جائے گی تو انشاء اللہ اس کا خاطر خواہ اثر ہوگا۔

اس جد و جہد میں کسی کی قیادت کی بھی خاص ضرورت نہیں ہے۔ اس بات کا انتظار بھی تغافل کی دلیل ہے کہ پہل کون کرے اور آغاز کس طرف سے ہو۔ ایک محلّہ کے دس پانچ آدمی بھی اللہ کا نام لے کر اُٹھ کھڑے ہوں تو چند دن کے اندر اندر اس محلّہ کی حالت بہت کچھ سُدھر سکتی ہے۔ مسجد کے ائمہ اس کام کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں۔

بہرحال یہ سب کے کرنے کا کام ہے اور اتنا بڑا کام ہے کہ اس کی ہمہ گیری اور دُور رس نتائج کا عام طور پر لوگ ابھی احساس نہیں کر سکتے۔ اسلام پسند طلباء کی کوششیں اس جد و جہد کی کامیابی کی ضمانت دے سکتی ہیں۔ یہ مہم سر ہو گئی اور بے حجابی اور آزادی و بیباکی کا یہ طوفان تھم گیا تو پاکستان میں مغرب زدگی کی یہ پہلی شکست اور اسلام کی پہلی فتح ہوگی۔ یہ فتح و کامیابی دُوسرے مسائل کو بھی اسلامی طرز پر حل کرنے میں مدد دے گی اور انشاء اللہ اس طرح پُورے معاشرے کی تطہیر ہو جائے گی !

ماہر القادری

۲۷ اگست ۱۹۵۵ء

ترجمہ:- ادارۂ "فاران"

ہوا کے طوفانوں میں

علمی دُنیا اور خاص طور سے اسلامی دُنیا کے لئے محمد اسد (سابق لیوپولڈ) کی شخصیت اجنبی نہیں ہے موصوف کی معرکہ آرا کتاب "Islam at The cross-Roads" علمی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ صحیح بخاری کے انگریزی ترجمے اور مجلہ "عرفات" کی ادارت نے بھی اس مفکر ادیب کے نام اور کام کو بہت کچھ متعارف کرا دیا ہے۔ پچھلے دنوں کسی دشمن نے محمد اسد (ایدہ اللہ بنصرالعزیز) کے بارے میں نہایت ہی تکلیف دہ افواہ اُڑا دی تھی۔ مگر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ وہ افواہ بالکل بے سروپا ثابت ہوئی!

ہمارے قابلِ صد احترام دینی بھائی جناب محمد اسد اللہ کے فضل سے اشاعتِ دین کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ اُن کی کتاب "A Road To Mecca" کے چند صفحوں کا ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ کتاب ادب و انشاء کی بلندیوں کے علاوہ دینی فکر اور تاثر و مشاہدہ کی عکاسی کے اعتبار سے بھی اس دور کی عظیم الشان علمی پیشکش ہے۔

ریل گاڑی ریگستان سینا میں ہو کر مجھے لئے جا رہی تھی۔ میں تکان سے چُور ہو چکا تھا۔ ریل کی پٹری نرم (ڈھیلی) ریت پر جمی ہوئی تھی۔ اس لئے ٹرین جب اُس پر سے گزرتی تو گھڑگھڑاہٹ ہوتی۔ پھر ریگستان کی رات کی سردی اُس پر مستزاد! ان چیزوں نے میری آنکھوں کی نیند کو اُڑا دیا! میرے سامنے ایک بدوی بادامی رنگ کا ڈھیلا ڈھالا فرغل پہنے بیٹھا تھا۔ وہ بھی جاڑے کے مارے برف کی طرح جما جا رہا تھا اور اُس نے سر کے رومال سے اپنے چہرے کو لپیٹ رکھا تھا۔ وہ بنیچ پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ اُس کے گھٹنوں پر ایک خمیدہ تلوار نیام میں رکھی تھی جس پر چاندی کے نقش و نگار تھے۔ اب سپیدۂ سحر نمودار ہی ہوا چاہتا تھا۔ آپ خود بھی تصوّر کر سکتے ہیں کہ ایسے میں ساحل پر ریت کے اُونچے ٹیلوں اور ناگ پھنی کی جھاڑیوں کے بیرونی خاکے کیسے ہوں گے؟

مجھے وہ سماں اب تک یاد ہے کہ کس طرح پو پھٹی اور صبح سیاہ و سپید رنگ کی تصویریں کھینچتی اور آہستہ آہستہ خاکے بناتی ہوئی نمودار ہوئی اور اُس نے کس تدریج کے ساتھ ریت کے ساحلی ٹیلوں کو اندھیرے سے نکالا اور انھیں مربوط تودوں کی شکل میں جما دیا۔ صبح کے جھٹ پٹے میں بہت سے خیمے نظر آئے جو تیزی کے ساتھ گزر بھی گئے۔ ان خیموں کے قریب ہی مچھلی پکڑنے کے جال بلّیوں کے درمیان سوکھنے کے لئے پھیلے ہوئے تھے۔ یہ جال بھورے نقرئی رنگ کے تھے، جیسے ہوا میں کہرے کی چادریں! ریگستان میں ماہی گیروں کے یہ جال کیا تھے یوں سمجھیے کہ صبح کے نرم جھونکوں میں روز و شب کے درمیان خوابوں کے شفاف مگر مصنوعی نقاب اُڑ رہے تھے!

سیدھی جانب ریگستان تھا اور بائیں طرف سمندر تھا۔ سمندر کے کنارے یکہ و تنہا ایک شتر سوار نظر آیا۔ شاید وہ رات بھر سفر کرتا رہا تھا اب وہ سوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وہ سوار نیند کے مارے کجاوے سے اس طرح لگ گیا تھا جیسے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر رہ گئے ہیں۔ پھر وہی بدویوں کے سیاہ خیمے نگاہوں کے سامنے تھے۔ خیموں کے باہر بدوی عورتیں اپنے سروں پر مٹی کے گھڑ

اُٹھائے کنویں پر جانے کے لئے تیار کھڑی تھیں۔ دھندلکا اب اُجالے میں تبدیل ہو گیا۔ جس میں ایک جہانِ روشن و شفاف جیسے غیر مرئی نبضیں حرکت دے رہی تھیں اُبھر رہا تھا۔ اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ منظر سادہ تھا جس کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

سورج بہت پرانی وسیع سے وسیع تر کرنوں کو بکھیرتا چلا جا رہا تھا۔ اور صبح کی سپیدی نارنجی رنگ کی سنہری آتشبازی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ ہم تیزی کے ساتھ العریش کے اُس نخلستان سے گزر رہے تھے جہاں کھجور کے درختوں نے ستون دار گرجاؤں جیسی عمارتیں بنا دی تھیں۔ اور جن میں کھجور کی شاخوں کی سینکڑوں نوکدار محرابیں اور کمانیں تھیں۔ اور اُن میں روشنی اور سایہ کی سفید و سبز جالیاں نظر آتی تھیں میں نے ایک عورت کو دیکھا جو سر پر پانی کی گاگر رکھے کنویں کی طرف سے آ رہی تھی جس کا پلّو بہت لانبا تھا۔ وہ قدیم زمانے کی ایک اعلیٰ خاتون معلوم ہوتی تھی۔

العریش کے کھجور کے باغیچے جس طرح اچانک طور پر نظر آئے تھے اُسی طرح وہ نگاہوں سے اوجھل بھی ہو گئے۔ اب ہم سیپی کی رنگت کی روشنی کے دریا میں سفر کر رہے تھے۔ کھڑکی کے لرزتے ہوئے شیشوں کے باہر ایک ایسا سناٹا طاری تھا جس کا پایا جانا میرے خیال میں ممکن نہ تھا۔

یہ ایک ایسا عالم گزراں تھا جو دوش و فردا کے تصور سے بے نیاز تھا اور یہ ایک ایسا تمدن نشہ تھا جو اپنا آپ ہی جواب تھا۔

سبک اور ملائم ریت کو ہوا نے نرم پہاڑی ٹیلوں کی صورت میں تبدیل کر دیا تھا جو سورج کی روشنی میں نہایت ہی قدیم مخطوطہ کی مانند زردی مائل نارنجی رنگت کی طرح دمکتے تھے۔ ان ریتیلے ٹیلوں کے پیچ و خم بہت ہی کم بے لوچ تھے۔ جس طرح بربط کے تار مضراب کی پوری قوت سے جھنجھنا اُٹھتے ہیں۔ ان ریت کے تودوں پر توجہ لور کا ایسا ہی عالم طاری تھا۔ ریت کے اُتھلے خلاؤں میں نیم شفاف آب رنگ سائے ارغوانی، بنفشئی اور سوسنی رنگتوں کے ساتھ جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ طرح طرح کے رنگ بدلنے والے بادل، ناگ پھنی کی جہاں تہاں جھاڑیاں اور کہیں کہیں ڈنڈی دار سخت گھاس نگاہ کے سامنے تھی۔ ایک دو مرتبہ میں نے اُونٹوں کا ایک قافلہ اور چھریرے بدن والے برہنہ پا بدوؤں کو دیکھا جو اُونٹوں پر کھجور کی شاخیں لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے تھے۔ میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں خشکی کے اس عظیم الشان منظر میں لپٹ کر رہ گیا ہوں۔

ہم چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر جن کی حیثیت لکڑی اور ٹین کی چند بارکوں سے زیادہ نہ تھی متعدد بار ٹھہرے۔ اسٹیشنوں پر پھٹے لباس میں بھورے رنگ کے لڑکے اپنی چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں لئے ہوئے دوڑتے تھے اور انجیر، اُبلے ہوئے انڈے اور تازہ روٹی کے چپٹے ٹکڑے بیچنے کے لئے پیش کرتے تھے۔ میرے سامنے جو بدوی بیٹھا تھا وہ آہستہ سے اُٹھا اور اپنے سر کے رومال کو کھولا اور ڈبہ کی کھڑکی کھول دی۔ اس کا ناک نقشہ باریک اور رنگ بادامی تھا اور اس کا چہرہ اُن شاہین صفت چہروں کی مانند تھا جو سامنے کی جانب کھنچے کھنچے اور سُکڑے سُکڑے رہتے ہیں۔ اُس نے نان خریدا اور ڈبہ میں واپس آ کر بیٹھنے والا ہی تھا کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ اور اس نے ایک لفظ کہے بغیر نان کو توڑ کر دو حصے کئے۔ اور آدھا حصہ میرے سامنے پیش کر دیا۔ وہ میرے پس و پیش اور حیرت کو دیکھ کر مسکرا دیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر نرم مسکراہٹ کتنی پھبتی تھی۔ میں ابھی ایک لمحہ قبل اس کے انہماک کو بھی دیکھ چکا تھا۔ اس نے ایک لفظ کہا جسے میں اُس وقت نہیں سمجھتا تھا مگر اب سمجھتا ہوں۔ کہ وہ لفظ "تفضّل"؎ تھا۔ میں نے روٹی لے لی اور سر کو جنبش دے کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرا مسافر جو سرخ ترکی ٹوپی کے علاوہ تمام تر انگریزی لباس پہنے ہوئے تھا اور غالباً وہ ایک چھوٹا موٹا تاجر تھا۔ از خود ہمارا ترجمان بن گیا۔ اس نے رک رک کر ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔

؎ "مہربانی کیجئے"

"He say, you traveller, he traveller; your way and his way is together."

"وہ کہنا مانگتا ہے کہ تم مسافر، وہ مسافر، تمہارا اور اس کا راستہ ایک ساتھ ملا ہوا ہے!"

اب جب کبھی میں اس چھوٹے سے واقعہ پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عربی مزاج کے ساتھ جو مجھے بعد میں جا کر لگاؤ اور اُنسیت پیدا ہوئی۔ اُس پر اس واقعہ کا اثر ضرور تھا۔ تمام اجنبیتوں کے باوجود اُس بدو کے اندازِ دلجوئی میں اس دوست کی محبت پنہاں تھی جو اتفاقیہ طور پر کسی کا ہم سفر ہو جائے اور اسی محبت نے روٹی کو دو حصّوں میں تقسیم کرایا۔ میں نے ایک ایسی انسانیت کے سانس کی آواز اور قدموں کی آہٹ محسوس کی جو ہر قسم کے بار سے سبکدوش تھی!

تھوڑی دیر بعد غازہ آگیا۔ غازہ —— چکنی مٹی کی بنی ہوئی ایک گڑھی کی طرح تھا۔ جو ریتیلی پہاڑی اور ناگ پھنی کی دیواروں کے درمیان ریت پر اس طرح زندگی بسر کر رہا تھا جیسے دُنیا نے اُسے بُھلا دیا ہے۔ میرے ہم سفر بدوی نے اپنی خورجیاں اکٹھی کیں۔ سر کو جنبش دے کر بڑی سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے سلام کیا اور اپنے فرغل کے لمبے دامن سے ڈبہ کی گرد جھاڑتا ہوا چل دیا۔ دو اور بدوی پلیٹ فارم پر کھڑے تھے۔ جنہوں نے بڑھ کر اُس سے مصافحہ کیا۔ اور اُس کے دونوں رُخساروں کو بوسہ دیا!

اس انگریزی بولنے والے تاجر نے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ آؤ۔ ابھی تو پاؤ گھنٹہ وقت باقی ہے!"

اسٹیشن کی عمارت سے باہر ایک قافلہ ڈیرے لگائے پڑا تھا۔ میرے ساتھی نے مجھے بتایا کہ یہ جنوبی حجاز کے بدوی ہیں۔ اُن کے چہرے سانولے، غبار آلود اور کرخت تھے۔ ہمارا وہ دوست بھی انہی میں شامل ہو گیا۔ یہ شخص اُن لوگوں میں ایسا نظر آتا تھا جیسے وہ کچھ نہ کچھ امتیازی شخصیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ سب لوگ اسے ایک نیم دائرے کی شکل میں گھیرے کھڑے تھے۔ اور اس کے سوالوں کا جواب دیتے جاتے تھے۔ وہ تاجر اُن سے کچھ کہتا تھا اور وہ دوستانہ انداز میں ہماری طرف مُڑ جاتے تھے۔ ہماری شہری طرزِ زندگی کا خیال کرتے ہوئے شاید اُن کا یہ انداز قدرے نخوت آمیز بھی تھا۔

وہ بالکل آزادانہ ماحول میں تھے اور میرے اندر اُن کی زندگیوں کو سمجھنے اور جاننے کی زبردست خواہش اُبھر آئی تھی۔ ہوا خشک اور طوفانی تھی اور ایسا دکھائی دیتا تھا جیسے وہ جسم میں گھسی جا رہی ہے۔ ہوا نے اعصاب کی سختی میں ڈھیلا پن پیدا کر دیا تھا۔ اور خیالات کے تسلسل کو ختم کر کے انہیں سُست و جامد بنا دیا تھا —— ہوا میں ابدیت کی سی صفت پیدا ہو گئی تھی۔ جس نے ان تمام چیزوں کو جو دیکھی، سُنی اور سونگھی جا سکتی ہیں اس قابل بنا دیا تھا کہ خود اپنے لئے قدروں کو متعین کر سکیں۔

مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہوتی جا رہی تھی کہ وہ لوگ جو ریگستان کے ماحول میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے ادراک و شعور کے معاملہ میں دُنیا کے تمام دُوسرے خطّوں کے باشندوں سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو بہت سے توہمات سے آزاد ہونا چاہیئے۔ غالباً اُن بہت سے سخاوتوں اور یقیناً اُن بہت سے تکلفات اور پابندیوں سے بھی جو زیادہ زرخیز اور سرد تر خطّوں کے باشندوں کا طُرّۂ امتیاز ہیں اور وہ اس لئے کہ یہ صحرا نشین اپنی قوتِ تمیز اور احساس و ادراک پر زیادہ بے تکلفی کے ساتھ اعتماد کرتے ہیں۔ اسی سبب سے دُنیا کی چیزوں کی قدروں کے پرکھنے اور جانچنے کے لئے اُن کا پیمانہ بھی دُوسروں سے بالکل مختلف ہونا چاہیئے۔

میری خود اپنی زندگی میں آگے چل کر جو تجربات آنے والے تھے شاید یہ انہی کا قبل از وقت تصور اور پیشگی اظہار تھا۔

جس نے ایک عرب ملک میں پہلے ہی دن مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ جبکہ میں نے پہلے پہل بدویوں کو دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسی دُنیا کا پیشگی تصور تھا کہ جس میں حد بندیاں نہیں پائی جاتیں لیکن پھر بھی یہ دُنیا بے شکل و صورت نہیں ہے اور جو ہر طرف سے کھُلے ہونے کے باوجود اندرونی طور پر گھری ہوئی ہے ــــ یہ وہ عالم تھا جو بہت جلد میرا اپنا بننے والا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے اُس وقت اس کا احساس تک نہ تھا۔ مستقبل میں میری زندگی میں جو عظیم الشان تبدیلی آنے والی ہے اُس کے محرکات جمع ہوتے جا رہے تھے۔ میری اُس وقت کی کیفیت کا آپ اس طرح قیاس کر سکتے ہیں کہ جیسے آپ ایک اجنبی مکان میں پہلے پہل داخل ہوں اور بڑے کمرے کے دروازے ہی میں آپ ناقابلِ بیان بو سونگھ کر ایک دُھندلا سا تصور قائم کر لیں کہ اس مکان میں جو چیزیں آپ کے سامنے آئیں گی کہ وہ کیا کچھ ہوں گی ؟ اگر وہ چیزیں مسرت بخش ہوں تو آپ محسوس کریں گے جیسے بے اندازہ مسرت نے آپ کے دل میں نشتر چبھو دیئے ہوں۔ آپ کو یہ باتیں یاد رہیں گی اور جب ان تمام واقعات کو گزرے ہوئے ایک زمانہ بیت جائے گا تو آپ اپنے دل ہی دل میں کہیں گے۔

" یہ تو وہی سب کچھ ہے جو میں نے اس مکان کے بڑے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سب سے پہلے لمحہ ہی میں اب سے بہت دن قبل محسوس کیا تھا۔"

اس ریگ زار میں بہت تیز ہوا چل رہی ہے اور زید کچھ دیر کے لئے یہ سوچنے لگتا ہے کہ ایک اور طوفانِ گرد و غبار سے ہمارا سابقہ پڑنے والا ہے۔ حالت یہ ہے کہ ریت کا طوفان چاہے نہ بھی آئے مگر ہوا کسی طرح ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہوا مسلسل جھکڑوں کے ساتھ ہمارا تعاقب کر رہی ہے اور پھر یہ تمام تیز جھونکے مل جُل کر ایک ہو جاتے ہیں اور جب ہم ریتیلی وادی میں اُترتے ہوتے ہیں تو اس طوفانی جھکڑ کی سائیں سائیں کا سلسلہ ٹوٹنے نہیں پاتا۔ کھجوروں والا قریہ جو بہت سے چھوٹے چھوٹے کھیڑوں کا مجموعہ ہے اس وادی کے درمیان واقع ہے۔ ہر کھیڑے کو مٹی کی چہار دیواری گھیرے ہوئے ہے اور اس قریہ کو گرد و غبار کے بگولوں کی دُھند چھپائے ہوئے ہے۔

یہ علاقہ ہوا گزرنے کی نالی کی طرح ہے۔ جس میں ہر روز طلوعِ صبح سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہوا اپنے مضبوط بازوؤں کو پھڑپھڑاتی رہتی ہے۔ رات میں وہ البتہ آرام کرتی ہے مگر کس لئے ؟ اس لئے کہ دوسری صبح کو تازہ دم ہو کر پھر اُٹھ بیٹھے! کھجور کے درخت جن کو ہواؤں کے جھکڑ ہمیشہ دباتے رہتے ہیں اپنی پوری بڑھوار کو نہیں پہنچ پاتے۔ بلکہ وہ اتنے دب کر رہ جاتے ہیں کہ اُن کے چوٹے چھکے پتّے زمین سے بہت ہی قریب رہتے ہیں۔ پھر طرفہ قیامت یہ ہے کہ اُن کو پہاڑیوں کی دست درازی کا ہر آن خطرہ رہتا ہے۔ یہ قریہ ریت میں کب کا دفن ہو گیا ہوتا اگر اس کے باشندے ہر باغیچہ کے چاروں طرف تمرس[1] (Tamarisk) کی باڑھیں نہ لگاتے۔ یہ اُونچے اُونچے پیڑ کھجوروں کے درختوں کے مقابلہ میں زیادہ روک بن جاتے ہیں اور اپنے مضبوط تنوں اور سدا بہار شاخوں کے ساتھ باغیچوں کے اردگرد ایک زندہ دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اُن کی حفاظت کے لئے مُبہم ضمانت پیش کرتے ہیں۔

دوپہر کی گرمی کے دوران آرام کرنے کے خیال سے ہم قریہ کے سردار کے کچّے مکان کے سامنے اپنی سواریوں سے نیچے اُتر پڑے مہمانوں کی تواضع کے لئے ایک طرف قہوہ رکھا تھا اور پتھر کے بنے ہوئے چولھے کے سامنے صرف ایک چھوٹی سی چٹائی بچھی تھی۔ جس سے افلاس و سادگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ لیکن چونکہ حسبِ معمول عربوں کی تواضع اور مدارات اُن کے تمام غربت و افلاس پر غالب جاتی ہے

---

[1] ایک جھاڑی جس میں سفید اور گلابی پھول آتے ہیں اور جس کے پتّے نرم اور ہلکے ہوتے ہیں۔

اس لئے ہم ابھی چٹائی پر پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ چولھے میں لکڑی کی سلگتی ہوئی آگ سے چٹخنی اور پیتل کی کھرل میں قہوہ کے کوٹے جانے کی آواز آئی۔ جس نے کمرے میں رفاقت و مدارات کا ایک سماں پیدا کر دیا تھا اور ساتھ ہی لکڑی کی ایک قاب میں ہلکے بھورے رنگ کی کھجوریں مسافروں کی بھوک دور کرنے کے لئے چُنی ہوئی تھیں۔

ہمارا میزبان ایک دُبلا پتلا بوڑھا آدمی تھا۔ جس کے بدن پر روئی کا صرف ایک ڈھیلا ڈھالا چوغہ تھا اور سر پر مندیل (رومال)۔ اُس کی آنکھیں بھینگی اور نم آلود تھیں۔ اُس نے اس توشہ میں اپنے ساتھ ہم طعامی کی دعوت دی:۔

"خدا تمہیں جیتا رکھے، یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کر دو۔"

وہ اپنے ہاتھ سے معذرت آمیز انداز میں اشارہ کرتا جا رہا تھا۔ یہ ایک ایسا اشارہ تھا جس سے اس کے نوشتہ تقدیر کا پورا وزن ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کے اس انداز میں جذبات کو اُبھارنے کی طاقت پنہاں تھی جو تصنع اور خود نمائی سے پاک تھی اور یہ طاقت اُن لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جن کی زندگیاں اُن کی جبلتوں سے قریب تر ہوتی ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا:۔

"پھر بھی یہ کھجور خراب نہیں ہیں۔ اے "ابناء السبیل" ہم آپ کی کیا خاطر داری کر سکتے ہیں......"

واقعی ان سے بہتر کھجور میں نے آج تک نہیں کھائے تھے اور ہمارا مہمان خوش ہو رہا تھا کہ وہ ہمیں سیر کر سکتا ہے۔ اُس کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا:۔

"ہوا۔ یہ ہوا۔ ہماری زندگی کو دوبھر بنا دیتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی یہی مرضی ہے۔ یہ ہوا ہماری زراعت اور کاشت کو برباد کر دیتی ہے۔ ہم ہمیشہ اسی جد وجہد میں لگے رہتے ہیں کہ اپنے کو ریت میں ڈھک جانے سے بچائیں! یہ ہوا ہمیشہ سے تو ایسی نہ تھی۔ اگلے وقتوں میں ہوا اتنی زیادہ کہاں تھی۔ اس لئے گاؤں بہت آباد اور شاداب تھا۔ اب یہ پہلے کے مقابلہ میں چھوٹا ہو گیا ہے۔ ہماری نئی پود ترک وطن کرتی چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ ہر کوئی تو ایسی زندگی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ریت ہم کو روز بروز گھیرتا ہوا نزدیک تر آتا چلا جا رہا ہے۔ چند دنوں کے بعد کھجور کے درختوں کے لئے کوئی ٹھکانا ہی نہ رہے گا۔ یہ ہوا!! مگر ہم اس کا شکوہ نہیں کرتے ہیں۔ آپ خود جانتے ہیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ تقدیر کو برا بھلا نہ کہو۔ کیونکہ (اے لوگو) دیکھو! میں خود تقدیر ہوں۔"

اُس کی اس گفتگو نے مجھے چونکا سا دیا۔ بوڑھے آدمی نے اس بات چیت کو روک کر مجھے بڑی توجہ آمیز نگاہ سے دیکھا اور یہ جانتے ہوئے کہ میں چونک پڑا، اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ بالکل نسوانی تبسم سے ملتی جلتی ہوئی مسکراہٹ جو اُس کے تھکے ہوئے چہرے پر عجیب سی لگتی تھی۔ اُس نے نرمی سے پھر یہ جملہ دُہرایا۔ جیسے وہ اپنے سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہو:۔

"دیکھو! میں خود تقدیر ہوں۔"

اپنے لفظوں کے ساتھ اپنے سر کو وہ جس انداز میں جنبش دیتا جاتا تھا اُس میں تبختر پنہاں تھا۔ زندگی میں اپنے مقام کا خاموش اعتراف! میں نے خوش باش لوگوں میں بھی اظہار حقیقت کی تائید کے لئے اس قدر اطمینان اور ایقان نہیں دیکھا۔ اپنے دست و بازو کو وہ مبہم اور جذباتی انداز میں گھما کر ہوا میں ایک دائرہ سا بنا دیتا تھا۔ ایسا دائرہ جو اُس کی زندگی کے تمام متعلقات اور لوازم کا احاطہ کئے ہوئے تھا۔ وہ گھٹیا درجہ کا تاریک کمرہ۔ ہوا اور اس کا ہمیشہ کا ہنگامہ آرا شور۔ ریت کا وہ بے دردی کے ساتھ بڑھتے ہوئے چلے آنا۔ خوش اور مگن رہنے کی وہ زبردست خواہش اور جو چیز بدلی نہیں جا سکتی اس پر توکل و قناعت۔ کھجوروں سے لبالب

بھری ہوئی قاب، ترسک (Tamarisks) کے پیچھے وہ باغیچے جو ہوا اور ریت کی دست درازیوں سے بچنے کے لئے ہمیشہ مبتلائے کشمکش رہتے ہیں۔ الاؤ کی وہ آگ، مکان کی انگنائی میں کہیں ایک جوان عورت کا قہقہہ ـــــ ان تمام چیزوں کی زبان سے میں اس طاقتور روح کا ایک گیت سُن رہا تھا۔ جو حالات اور اس کے انجام سے قطعاً ناآشنا تھا اور جو خود اپنی جگہ سکون و آسودگی تھا۔

یہ ماحول مجھے دورِ گزشتہ کی طرف لے گیا۔ دس سال پہلے بیت المقدس میں خزاں کے اُس دن کی طرف جب ایک دُوسرے بوڑھے غریب آدمی نے اللہ تعالیٰ کے حضور کامل سپردگی کے لئے مجھے نصیحت کی تھی۔

یہ اُس موسمِ خزاں کا ذکر ہے جب میں بیت المقدس کے قدیم شہر میں اپنے ماموں ڈورین (Dorian) کے مکان میں رہتا تھا۔ اُس زمانے میں دن رات بارش ہوتی رہتی تھی اور چونکہ میں باہر زیادہ آجا نہیں سکتا تھا اس لئے اکثر کھڑکی کے قریب بیٹھ جاتا۔ اور مکان کے پیچھے ایک احاطہ کا نظارہ کیا کرتا۔ اس احاطہ کا مالک ایک بوڑھا عرب تھا۔ جسے لوگ حاجی کہتے تھے۔ کیونکہ اُس نے بیت اللہ کا حج کیا تھا۔ یہ شخص گدھوں کو سواری اور باربرداری کے لئے کرایہ پر چلاتا تھا۔ اس لئے یہ احاطہ اچھی خاصی کارواں سرائے بن گیا تھا۔

ہر صبح سُورج نکلنے کے تھوڑی دیر بعد ہی یہاں آس پاس کے قریوں سے ترکاری اور پھلوں کی کھیپوں پر کھیپیں اُونٹوں پر آنی شروع ہو جاتیں۔ اور پھر اُنھیں گدھوں کے ذریعہ شہر کے بازاروں کی تنگ گلیوں میں پہنچا دیا جاتا۔ دن کے وقت تھکے ہارے اُونٹ زمین پر آرام کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ اور آدمی اس وقت تک شور مچاتے ہوئے ان اونٹوں اور گدھوں کی ٹہل کرتے رہتے جب تک موسلا دھار بارش انھیں اصطبل میں پناہ لینے کے لئے مجبور نہ کر دیتی۔ یہ گدھے والے اور شتربان غریب اور شکستہ حال تھے۔ مگر اُن کے برتاؤ میں نوابوں کی سی شان پائی جاتی تھی۔ جب وہ کھانا کھانے کے لئے مل جُل کر زمین پر بیٹھتے اور گیہوں کی روٹی کے نوالے پنیر کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے یا تھوڑے سے زیتون کے ساتھ کھاتے ہوتے تو میں اُن کی شرافت، ایک دُوسرے کی خاطرداری اور باطنی اطمینان کی تعریف کئے بغیر نہ رہتا ـــــ آپ اُن کو دیکھتے تو معلوم ہوتا کہ وہ خود اپنے اور اپنی زندگیوں کے روزانہ کے معمولات کے لئے اپنے اندر عزتِ نفس کا احساس رکھتے ہیں۔

یہ حاجی جو گنٹھیا کا مریض تھا جس کے سبب اُس کے گھٹنے متورم تھے اور جو لاٹھی کے سہارے لنگڑاتا ہوا چلتا تھا۔ اُن لوگوں میں اُس کی حیثیت سردار کی سی تھی۔ یہ لوگ بے چون وچرا اُس کا حکم مانتے تھے۔ دن میں کئی بار وہ (حاجی) اُن کو نماز کے لئے اکٹھا کرتا۔ اگر بارش زیادہ تیز نہ ہوتی تو یہ لوگ کھلے ہوئے صحن ہی میں نماز ادا کرتے۔ تمام آدمی ایک لمبی صف میں ہوتے اور یہ شخص اُن سب کے آگے امام بن کر کھڑا ہوتا۔ یہ لوگ اپنی حرکتِ[1] عمل میں سپاہیوں کی طرح ضابطہ کا خیال رکھتے تھے۔ وہ سب ایک ساتھ مکہ کی طرف رکوع کرتے۔ پھر کھڑے ہوتے اور اس کے بعد گھٹنوں کے بل جھک کر سجدہ کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے قاید کے منہ سے نکلی ہوئی دھیمی آواز کے لفظوں کی اتباع کر رہے ہیں۔ جو سجدوں کے درمیان اپنے مصلّے پر ننگے پاؤں اس انداز میں کھڑا تھا کہ اس کی آنکھیں بند تھیں، ہاتھ اس کے سینہ پر بندھے تھے۔ وہ کسی آواز کے بغیر اپنے لبوں کو جنبش دیتے ہوئے عالم

---

[1] ارکانِ نماز۔

محویت میں کھو جاتا ہے ۔۔۔ آپ اُسے دیکھتے تو کہتے کہ یہ شخص تو تمام روح کے ساتھ عبادت کر رہا ہے ۔

بہر حال ایسی سچی نماز نے جس میں مشین کی طرح جسم کی حرکات بھی شامل تھیں مجھے کسی نہ کسی طرح مضطرب کر ہی دیا اور ایک دن میں حاجی سے جو تھوڑی بہت انگریزی بھی سمجھتا تھا ۔ پوچھ ہی بیٹھا :۔

"کیا سچ مچ تمہارا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے اس کی توقع رکھتا ہے کہ رکوع و سجود کی بار بار تکرار کے ساتھ تم اللہ کے حضور اپنی بندگی کا اظہار کرو ؟ کیا عبادت کا یہ طریقہ زیادہ بہتر نہ ہو گا کہ کوئی اپنی ذات کی طرف متوجہ ہو کر، دل کے گہرے سکوت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے ؟ یہ تمہاری جسمانی حرکتیں آخر کیوں ؟ ؟ ؟"

میں یہ بات کہنے کو تو کہہ گیا ۔ لیکن مجھے فوراً ہی پشیمانی ہوئی ۔ کیونکہ میں اس بوڑھے آدمی کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا ۔ مگر اس حاجی نے میری اس تنقید پر ذرا سی بھی ناگواری کا اظہار نہیں کیا ۔ وہ اپنے پوپلے مُنہ سے مسکرایا اور بولا :۔

"پھر ہم اور کس طرح اللہ کی عبادت کریں ؟ کیا روح اور جسم کو ساتھ ساتھ اس نے خلق نہیں فرمایا ؟ اور اس طرح آدمی اپنے جسم کے ساتھ ساتھ کیا اپنی روح کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کرتا ؟ سُنئے ! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہم مسلمان اس طرح عبادت کیوں کرتے ہیں ؟ ہم مسلمان چاہے دنیا کے کسی پردے پر کہیں بھی کیوں نہ ہوں ، سب کے سب نماز میں کعبہ کی طرف جو مکہ معظمہ میں اللہ کا مقدس گھر ہے ، مُنہ کر کے کھڑے ہوتے ہیں ۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ہم سب مسلمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے خیالات مرکز کی طرح جسم واحد کا تعلق رکھتے ہیں ۔ سب سے پہلے ہم نماز میں سیدھے کھڑے ہوتے ہیں اور قرآن مقدس کی کچھ آیتیں تلاوت کرتے ہیں ، اس یاد اور تصور کے ساتھ کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے ، جو انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اُسے اپنی زندگی میں راست باز اور ثابت قدم ہونا چاہیئے ۔ پھر ہم "اللہ اکبر" کہتے ہیں ، اپنے نفس کو اس کی یاد دلاتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی بندگی کئے جانے کا مستحق نہیں ہے ۔ پھر ہم جھک کر رکوع کرتے ہیں ۔ کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کو سب سے بڑھ کر عزت و عظمت والا جانتے ہیں اور اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں ۔ اس کے بعد پھر ہم اپنی پیشانی کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں ۔ کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم ذرۂ خاک کے برابر بھی نہیں ہیں ۔ بلکہ کچھ بھی نہیں ہیں اور وہی ہمارا خالق اور دستگیر ہے ۔ پھر ہم اپنے چہروں کو زمین سے اُٹھاتے ہیں اور بیٹھ کر دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے ۔ اور اپنا فضل ہم پر نازل کرے ۔ ہمیں سیدھے راستہ پر چلائے اور ہمیں صحت اور رزق عطا فرمائے ! اس کے بعد ہم پھر سجدے میں جھک جاتے ہیں اور رب واحد کے جلال و قوت کے سامنے اپنی پیشانی خاک پر رکھ دیتے ہیں ۔ اس کے بعد پھر ہم بیٹھ جاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح پچھلے پیغمبروں کو اپنے فضل و رحمت سے نوازا ۔ اسی طرح محمد رسول اللہ پر جو اللہ کا پیام ہم تک لے کر آئے ۔ اپنی رحمت نازل فرمائے اور ساتھ ہی ہم پر بھی اپنی رحمت اُتارے اور اُن سب پر بھی جو سچی ہدایت کی پیروی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور یہ بھی التجا کرتے ہیں کہ ہمیں دُنیا اور آخرت کی بھلائی عطا فرمائے ۔ آخر میں ہم "السلام علیکم و رحمۃ اللہ" کہتے ہوئے اپنے سروں کو دائیں اور بائیں جانب موڑتے ہیں ۔۔۔ اور اس طرح ہم اُن لوگوں پر سلام بھیجتے ہیں جو صالح اور راست باز ہیں ، چاہے وہ دُنیا کے کسی خطہ میں بھی ہوں "

"یہی وہ طریقہ ہے۔ جس طرح ہمارے رسولؐ نماز ادا فرماتے تھے اور آپ نے اپنے متبعین کو اسی طرح تمام اوقات میں اقامتِ صلوٰۃ کا طریقہ سکھایا تاکہ وہ رضائے قلب کے ساتھ اپنے کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت گزار بنالیں ـــــ یہی وہ چیز ہے جو اسلام چاہتا ہے ـــــ تاکہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اپنی تقدیر کے بارے میں انھیں اطمینانِ قلب حاصل رہے!"

اُس بوڑھے آدمی نے ٹھیک یہی لفظ نہیں کہے تھے۔ لیکن اس کا مفہوم یہی تھا اور اسی لئے مجھے یہ مفہوم اب تک یاد ہے۔ اس واقعہ کے برسہا برس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اس حاجی کے سادہ بیان نے میرے اوپر اسلام کا سب سے پہلا دروازہ کھول دیا۔ لیکن اس کے باوجود اس واقعہ سے بہت پہلے میں جب کبھی یہ دیکھتا اور اس کا میں نے اکثر مشاہدہ کیا کہ چاہے مسجد ہو، فٹ پاتھ ہو یا کوئی مصروف سڑک ہو، ایک آدمی بالوں کے کمبل کی بنی ہوئی جانماز پر، یا چٹائی پر، یا بغیر کسی فرش کے خالی زمین پر، اپنے سر کو جھکائے، سینہ پر ہاتھ باندھے اپنے گرد و پیش کے ہنگاموں سے بے نیاز، محویت و استغراق کے عالم میں کھڑا ہے ـــــ تو اس مشاہدے سے میں غیر معمولی عجز و انکسار محسوس کرنے لگتا ....!

ملا واحدی

اسلامی نظام معیشت

دار السلطنت امریکہ میں انتہائی دولت مندوں کا ایک محلہ ہے۔ "وال اسٹریٹ" اس کے متعلق ضرب المثل ہے کہ وال اسٹریٹ کسی کی محکوم نہیں ہے۔ وال اسٹریٹ والے امریکہ کے حاکموں کے بھی حاکم ہیں۔

گویا دُنیا آجکل وال اسٹریٹ والوں کے اشاروں پر ناچتی ہے اور وال اسٹریٹ والوں کا منشا پورا کرتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی جسم کو سر کی ضرورت ہے اور سر کو جسم کی ضرورت ہے۔ سر کو سر کی جگہ ہونا چاہیئے اور جسم کو جسم کی جگہ۔ لیکن اب سر سر بھی ٹکرانے لگے ہیں۔ دیکھئے اس کا کیا نتیجہ رہتا ہے اور تمدن کون سی کروٹ بدلتا ہے۔ ۲۴۔جون ۱۹۵۵ء کے اخباروں نے ایک خبر چھاپی ہے کہ بیس سال کے اندر اندر امریکہ ایٹمی طاقت سے چلنے والا ایسا فوجی طیارہ تیار کرلے گا جو چوبیس گھنٹے میں ساری دُنیا کا چکر لگا سکے گا۔ اور ایسے راکٹ بنا دے گا جو ملک در ملک آسانی سے پہنچ سکیں گے اور انسان اس قدر طاقتور ہو جائے گا کہ اپنی تہذیب کو برباد کر سکے گا۔ انسان کی رفتار یقیناً ترقی کی جانب ہے۔ لیکن ترقی کے ساتھ ساتھ اس کا بے آپے پن بھی بڑھتا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اسی بے آپے پن کی اصلاح کے واسطے پیغمبر بھیجا کرتا تھا۔ لوگ طاقت، عقل اور دولت کے نشے میں اللہ کو بھول جاتے تھے۔ پیغمبر انھیں یاد دلاتے تھے کہ مرنے کے بعد تمہیں اللہ کے سامنے جانا ہے اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اللہ نہیں چاہتا کہ طاقتور کمزوروں کو، عاقل کم عقلوں اور امیر غریبوں کو کچلیں۔ کوئی باپ یہ پسند نہیں کر سکتا کہ اس کے بچے ایک دوسرے پر دھونس جمائیں اور حکومت کریں۔

مسلمان ناواقفیت کے باعث کچھ سے کچھ بن جائیں۔ سرمایہ دارانہ نظام اُن کے ریشے ریشے میں پیوست ہو جائے اور رگ و پے میں سما جائے تو اسے آپ عجیب وغریب بیان کیجئے۔ مگر اسلام کو ایسے ایمان کا ذمہ دار مت ٹھہرائیے۔ اسلام نے انسان اور انسانیت کو کبھی دولت کے پیمانے سے نہیں ناپا۔ اسلام نے انسان اور انسانیت کے جانچنے کی کسوٹی صرف تقویٰ مقرر کی ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اللہ کی نظر میں اللہ کا ماننے والا اور اللہ کے احکام پر عمل کرنے والا اور قیامت کی جواب دہی سے ڈرنے والا معزز و مکرم ہے۔ جو مسلمان اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن پوری کرے۔ اسلام میں وہ عزت اور تکریم کا مستحق ہے۔ اسلام نے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا کہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام منوائے۔ حکم کرنے کا حق فقط اللہ کو ہے اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ اللہ کے احکام کی پابندی کرانے والوں کو بھی اللہ کے احکام کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ وہ قانون سے بالا نہیں ہوتے۔ اسلام نے حاکم و محکوم کا معروف تصور ختم کر دیا ہے۔ اسلام کے پیش نظر پوری قوم بلکہ پوری نوع انسان کی بہبودی و فلاح ہے۔ چند افراد کا پھلنا پھولنا اسے نہیں بھاتا۔

اسلام گوارا نہیں کرتا کہ چند آدمی تو دولت مند سے دولت مند تر ہوتے رہیں اور بے شمار آدمیوں کو روٹی، کپڑا اور مکان تک میسر نہ آئے اور اُن کی صلاحیتیں نشوونما نہ پا سکیں۔

اسلام کہتا ہے کہ زندگی کی خوشگواریوں میں سب کا حصہ ہے۔ رزق کے سرچشمے کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہیں۔

اسلام کہتا ہے۔ دُوسروں پر بوجھ مت بنو۔ جو بلا عذر شرعی دُوسروں پر بوجھ بنے گا۔ وہ نقصان اٹھائے گا۔ خوب محنت کرو اور خوب کماؤ۔ مگر کمائی کا زیادہ سے حصہ نوعِ انسان کی بہبودی و فلاح کے کاموں پر لگاؤ۔

اسلام میں دولت کا جمع رکھنا جرم عظیم ہے۔

اسلام افراد کی خاطر معاشرے کو تباہ نہیں کرتا۔ اور معاشرے کی قربان گاہ پر افراد کو نہیں چڑھاتا۔ سرمایہ داری اور اسلام دو مختلف چیزیں ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام سرمایہ داروں نے بنایا ہے اور اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے بنایا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی عینک لگا کر اسلامی نظام کا جائزہ لیجئے گا۔ تو اسلامی نظام کچھ عجیب نظر آئے گا۔

شلاً سود سرمایہ داری کی جان ہے۔ اسلام اسے حرام قرار دیتا ہے۔ سرمایہ دار سود لینے دینے سے دست بردار ہو جائے تو اس کی سرمایہ داری باقی نہیں رہتی۔ اور سود لئے اور دیئے جائے تو اسلام کا دامن چھوٹتا ہے۔ سرمایہ دار سرمایہ بڑھانے کے لئے سب کچھ کر سکتا ہے اور کرتا ہے۔ دامن امن چھوٹنے اور دُوسروں کے تباہ ہونے کی اُسے پروا نہیں ہوتی۔ اس کے نزدیک ہر طریقے سے دولت کمانی جائز ہے۔ شرائط اور حدود کا قصہ وہ نہیں پالتا۔ دُوسروں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا اس کا ہنر ہے۔ اُس نے سود کا جال ایسا بچھا دیا ہے کہ اس جال سے اللہ ہی نکلوائے گا۔ شراب خوری کی لعنت۔ قمار بازی کی وبا اور عیاشی و فحاشی سرمایہ دار نے عام کر دی ہے۔ سرمایہ دار کو نوجوان خوبصورت عورتیں فراہم کرنے اور انھیں ہیجان انگیز صورت میں مردوں کے روبرو لانے سے عار نہیں آتی۔ سرمایہ دار نے نت نئے فیشن نکال کر عورتوں کے جذبہ نمائش کو دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اور برہنہ تصویروں اور فحش مضامین کی اشاعت کر کے مردوں اور عورتوں دونوں کا جذبۂ انسانیت و شرافت خاک میں ملا دیا ہے۔ شراب بیچنے، جوئے کے گھوڑے دوڑانے، برباد کن فیشن ایجاد کرنے۔ تھیٹروں اور فلموں میں عورتوں کو نچوانے اور گندا لٹریچر پھیلانے سے روپیہ حاصل ہوتا ہے۔ روپے کے آگے سرمایہ دار اجتماعی اخلاق، سوسائٹی کے ضوابط اور دین کی ہدایتیں بے دھڑک توڑ ڈالتا ہے۔ اور حکومت کے قوانین تو اس کی ذاتی چیز ہیں۔ لیکن سرمایہ دار جائیں جہاں جانا چاہیں۔ عام مسلمانوں کو نہ معلوم کیا ہو گیا ہے کہ اُن کے ذہن بھی سرمایہ دارانہ سانچے میں ڈھلے جا رہے ہیں۔ انھیں بھی سرمایہ دارانہ نظام نے گھیر لیا ہے۔ سرمایہ دار مسلمان اس شعر کے مصداق ہیں ؎

ہم خدا خواہی و ہم دُنیائے دُوں — ایں خیال است و محال است و جنوں!

اور عام مسلمان اس مصرعہ کے مصداق ؏

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے!

سرمایہ دار مسلمانوں کو شاید یہ سمجھا دیا گیا ہے کہ نماز پڑھنے اور حج کر لینے سے ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کے گناہ دُھل سکتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے غور کے قابل بس ایک بات ہے کہ اشتراکیت کا طوفان سرمایہ داری کے خلاف بڑھتا چلا آتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی عمر زیادہ باقی نہیں ہے۔ اشتراکیت سرمایہ دارانہ نظام کا غالباً جلد خاتمہ کر دے گی۔ اسلامی نظامِ معیشت اشتراکیت کے مقابلہ میں معتدل ہے۔ سرمایہ دار اسے قبول کر لیں تو اشتراکیت کے طوفان سے بچ سکتے ہیں۔ اسلامی نظام میں وہ بُری زندگی بسر نہیں کریں گے۔ بلکہ موجودہ زندگی کی نسبت اسلامی نظامِ معیشت کی زندگی پُر اطمینان اور شریفانہ ہو گی۔ اسلامی نظامِ معیشت کسی عطائی کا تجویز کردہ نہیں ہے۔ حکیم حقیقی کا تجویز کردہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کو اسلامی نظام سے قریب اور مشابہ کہنا ایسا ہے جیسے حرام کو حلال کہنا۔ اللہ نے جسے حرام کر دیا اُسے آپ حلال کہہ کر حلال نہیں بنا سکتے۔ گناہ کو گناہ سمجھ کر کرنا بھی بُرا ہے۔ مگر گناہ کو گناہ نہ سمجھ کر کرنا بے حد بُرا ہے۔ یہ تو ممکن ہے بلکہ ممکن کیا ضروری ہے کہ اقتضاء وقت کے مطابق اسلامی نظامِ معیشت کو ڈھالا جائے۔

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی برتنی چاہتا ہے۔ سختی کرنی نہیں چاہتا۔

اجتہاد اسی کا نام ہے۔ لیکن یہ ناممکن اور محال ہے کہ اسلام کے اصول[۱] بدل دیئے جائیں۔ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور اسلامی نظامِ معیشت میں فروعی اختلاف نہیں ہے، اصولی اختلاف ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں تمام وسایل ثروت پر چالاک اور دولت مند لوگ قابض اور متصرف ہو جاتے ہیں اور کنکھجوروں کے مثل تمام وسایل ثروت میں پنجے گڑو لیتے ہیں اور اپنا اقتدار اور اپنی دولت بڑھاتے رہتے ہیں۔ دولت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اِدھر انھیں دولت کی بدہضمی ہو جاتی ہے اور اُدھر سیدھے اور غریب لوگوں میں افلاس کے معایب، بے حیائی اور جرائم پیشگی وغیرہ اُبھر آتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام عامۃ الناس کے مفاد کا خیال نہیں رکھتا بلکہ سرمایہ دار افراد اور سرمایہ دار جماعتوں پر عامۃ الناس کے فایدوں کو قربان کر دیتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام نے دُنیا کو دو طبقوں میں بانٹا ہے۔ ایک طبقہ زمینداروں، کارخانہ داروں اور ساہوکاروں کا ہے۔ اور دوسرا طبقہ کسانوں، مزدوروں اور قرضداروں کا ہے۔ یہ جو آپ دیکھتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان سے ڈرا ڈرا اور دوسرے انسان کا دشمن ہے اور ایک طبقہ دُوسرے طبقہ سے خائف اور دُوسرے طبقہ کا دشمن ہے۔ یہ کیفیت سرمایہ دارانہ نظام نے پیدا کی ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے سرمایہ دارانہ نظام کی گرفت سخت سے سخت تر ہوئی ہے۔ پچاس سال پہلے تک آج کا سا عالم نہ تھا کہ کوئی کسی کا نہیں ہے۔ ہمدردی اور امداد باہمی بے معنی الفاظ ہو کر رہ گئے ہیں۔ پچاس پہلے بلکہ اور پہلے، اور اور پہلے بھی ہمارے ملک میں خالص اسلامی نظام رائج نہیں تھا۔ لیکن فرنگیوں کا لایا ہوا نظام بھی نہیں چھایا تھا۔ پچاس سال کیا، چالیس اور تیس سال پہلے

---

[۱] اصول اللہ کے مقرر کردہ ہیں۔ اجتہاد اُن کی روشنی میں کیا جا سکتا ہے۔ بائی لاز (By-laws) یعنی عملی جزئیات وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالے جا سکتے ہیں۔ مگر laws (قوانین) تبدیل نہیں ہو سکتے۔ اجتماعی زندگی کے قوانین طبعی زندگی کے قوانین کی مثل غیر متبدل ہیں۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ۔ حکومت کا حق فقط اللہ کو ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کے بندے (اور غلام و محکوم) نہ بنو۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ ہاں مسلمانوں کے معاملات آپس کی مشاورت سے طے پائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بائی لاز تو بنا سکتے ہیں۔ لیکن بائی لاز بنانے والوں کو قانون (قرآن) سامنے رکھنا پڑے گا۔ اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قانون کا جو منشا بتایا ہے اور قانون پر جس طرح عمل کر کے دکھایا ہے اسے سامنے رکھنا پڑے گا۔ اور صحابہ و متقدمین نے قرآن و سنت کو جیسا سمجھا تھا اور قرآن و سنت سے جس طرح کام لیا تھا اسے بھی سامنے رکھنا پڑے گا۔ مثلاً شراب حرام ہے۔ لیکن فقہا نے جان بچانے کے لئے انتہائی ناگزیر صورت میں بطور دوا شراب کا عارضی استعمال جائز کر دیا ہے۔ یا چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ مگر حضرت عمرؓ نے حکم فرمایا کہ زمانہ قحط میں چور کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں۔ بائی لاز بنانے والوں کے پاس دین کا پورا علم ہونا چاہیئے۔ اور دینی احکام کا منشا سمجھنے کا دماغ ہونا چاہیئے۔ اور ان دونوں وصفوں کے ساتھ ساتھ اللہ کا خوف ہونا چاہیئے۔

روئی بھرے فرغل۔ اوورکوٹ۔ صدریاں اور سینہ بند سلوائے جاتے تھے اور ایک سال یا دو سال پہن کر گھر کے سقے۔ دھوبی اور حجام کو دے دیئے جاتے تھے۔ اب اللہ کے فضل سے روئی دار کپڑے پہننے والے درزی ہی مفقود ہیں۔

دعوتیں ہوتی تھیں تو اُن میں اپنے سے اونچے آدمیوں کا شریک کرنا خوبی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اپنے سے نیچے آدمیوں کا شریک کرنا خوبی سمجھا جاتا تھا۔ دعوتیں گھروں پر کی جاتی تھیں۔ ہوٹلوں میں نہیں کی جاتی تھیں۔ اب حال یہ ہے کہ ؏

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر

ذہنیتیں بدل گئی ہیں اور مسخ ہو گئی ہیں۔ علامہ اقبالؒ کا شعر ہے ؎

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف

اشتراکیت بظاہر سرمایہ داری کی ضد ہے۔ مگر جتنی خبریں ہمیں پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکیت نے چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں کا قلع قمع کر کے سرمایہ داری کا حق تنہا انہیں بخش دیا ہے جو حکومت کی کرسی پر آبیٹھیں[1] اور فرد کی اشتراکی نظام میں مطلق قدر و قیمت نہیں ہے۔

برخلاف سرمایہ داری اور اشتراکیت کے اسلام نے افراد میں اور جماعت میں توازن قائم کیا ہے اور افراد اور جماعت میں ایسا رشتہ جوڑا ہے کہ باہمی خوف اور باہمی عناد کی بجائے باہمی یگانگت اور باہمی الفت پیدا ہو جاتی ہے۔

جماعت اسلام کی نگاہ میں بڑی چیز ہے۔ لیکن اسلام افراد کی حیثیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ۔ (ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا) مسلمان فرداً فرداً اپنی محنت اور سوجھ بوجھ کا مناسب معاوضہ لے سکتے ہیں اور اپنے مال میں تصرف کرنے کے مجاز ہیں۔ البتہ چند پابندیوں کے ساتھ۔ کوئی مسلمان اپنا مال شراب پی کر اور جوا کھیل کر نہیں گنوا سکتا۔ اور زکوٰۃ وغیرہ کے ذریعہ اپنے مال کو متحرک رکھنا ہر صاحب نصاب مسلمان پر فرض ہے۔

اسلام نے کمانے کے بھی ضابطے مقرر کیے ہیں اور خرچ کرنے کے بھی ضابطے مقرر کیے ہیں۔ ان ضابطوں پر چلنے سے روپے کی گردش اور روپے کی تقسیم بالکل صحیح رہتی ہے۔ صاف حکم ہے کہ مال تمہارے مالداروں ہی میں گردش نہ کرتا رہے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ۔

مسلمان مضرت رساں طریقوں مثلاً رشوت، چوری بلیک مارکیٹ۔ ذخیرہ اندوزی وغیرہ کے ذریعہ روپیہ نہیں کما سکتا اور غیر معمولی نفع کے ذریعہ گاہکوں کا خون چوس کر اپنے آپ کو موٹا نہیں کر سکتا[2] اور روپے پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ سکتا۔

وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ۔ قُلِ الْعَفْوَ۔ وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں۔ کہہ دو کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو وہ بھلائی کے کاموں پر خرچ کرنے کے واسطے ہے۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ۔ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا۔

(تم بھلائی کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرنے لگتے ہو تو) شیطان تمہیں نادار ہو جانے کا خوف دلاتا ہے۔ اور بخل جیسی بیہودگی کا

---

[1] نیز کہا جاتا ہے کہ اشتراکیت مذہب کی حریف ہے۔ سرمایہ دار جھوٹ یا سچ اللہ کا نام لے لیتے ہیں۔ اشتراکیوں نے اللہ اور آخرت کا تصور ہی حذف کر دیا ہے۔ [2] ایک حدیث ہے کہ ایک درہم کو دو درہموں کے عوض مت فروخت کرو۔ اتنی نفع خوری سے سود خوری میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

مشورہ دیتا ہے۔ اور اللہ کا وعدہ ہے کہ (بھلائی کے کاموں میں خرچ کروگے تو) اللہ تمہاری مغفرت بھی فرمائے گا اور تمہاری (قومی) خوش حالی کو بھی ترقی بخشے گا۔ (بھلائی کے کاموں میں خرچ کرکے تم کھوؤ گے نہیں، کچھ پاؤ گے، خرچ کرنے سے مرنے کے بعد ہی جنت نہیں ملے گی، دنیا میں بھی لہر بہر ہوجائے گی۔ چاروں طرف خوشی ہی خوشی دکھائی دے گی۔ دولت ایک جگہ بند رہ کر بند پانی کی طرح سڑ جاتی ہے۔ دولت کو دریا کی طرح بہتا رہنا چاہیئے۔ زکوٰۃ کے ذریعہ، تقسیم وراثت[۱] کے ذریعہ، تقسیم غنایم[۲] کے ذریعہ۔ وغیرہ)

مسلمان فرد کو بتایا گیا ہے کہ تمہاری بہتری مجملہ مسلمانوں کی بہتری میں ہے اور جملہ مسلمانوں یعنی مسلمان جماعت کو بتایا ہے کہ تمہاری بہتری اس میں ہے کہ افراد مسلمین خوش حال ہوں۔ آخر جماعت افراد ہی کا تو مجموعہ ہے۔ اللہ کے اقوال کا فیضان اللہ کے افعال کی طرح عام ہے۔ یعنی ہوا اور پانی کی طرح عام۔

اسلام افراد اور جماعت کے توازن اور تعاون کو بگڑنے نہیں دیتا۔ اسلامی نظامِ معیشت میں افراد ذاتی بہبودی کی کوشش کرسکتے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ دوسرے افراد کو نقصان نہ پہنچے۔ مسلمان کی کمائی میں سب کا ساجھا[۳] ہوتا ہے اور اسلامی نظام کا بہترین وصف یہ ہے کہ زکوٰۃ دینے والے ہوں اور زکوٰۃ لینے والے نہ رہیں۔ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ[۴] کی صداقت ثابت کردی جائے۔

اسلام نے خیر سود کو تو حرام کیا ہی ہے۔ مسلمان بغیر سود کے قرض دے کر بھی قرضدار پر سختی نہیں کرسکتا۔ ارشاد ہے:۔

وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اس کی فراخ دستی کا انتظار کرو اور قرض معاف کردو۔ تو یہ تمہارے حق میں اور بہتر ہے۔ تم میں علم کا مادہ ہو تو سمجھ سکو گے کہ کیا بہتری ہے۔

زکوٰۃ جن جن کاموں میں صرف کی جاسکتی ہے اُن میں ایک کام یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ سے قرضداروں کے قرض ادا کراؤ۔

سرمایہ دارانہ نظام کا اوڑھنا بچھونا سود ہے اور اسلامی نظامِ معیشت کا اوڑھنا بچھونا دوسروں کو سہولتیں دینا ہے۔ اللہ نے سود حرام کیا تو فرمایا:۔

اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ۔

مسلمان ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود (اس وقت تک کا) لوگوں کے ذمہ ہو اُسے (بھی) چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اُس کے رسول سے لڑائی کے لئے تیار رہو۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہے کہ اگر تم نے اس حکم کی خلاف ورزی کی۔ یعنی سود

۱۔ وارث کوئی نہ رہے تو مال بیت المال میں داخل ہوگا۔ یعنی ساری قوم کو وارث بنادیا جائے گا۔

۲۔ مالِ غنیمت پانچ حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ چار حصوں کے مالک مجاہد اور ایک حصہ کی مالک پوری قوم۔ اور غنیمت کے علاوہ جہاد میں جو ہاتھ آئے وہ سارا کا سارا قوم کا۔ مثلاً اراضی اور اموال فی۔

۳۔ اس سے مطلب مفت خور بنانا نہیں ہے۔

۴۔ اللہ سود کو پھلنے پھولنے نہیں دیتا اور صدقات میں پھل پھول لاتا ہے۔

کھائے گئے تو اُس آگ سے ڈرو جو (عام گنہگاروں کے واسطے نہیں) کفّار کے واسطے تیار کی گئی ہے۔ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ۔

سرمایہ دار صرف سرمایہ کا جال بچھاتا ہے۔ محنت (جسمانی و دماغی) وہ دُوسروں سے کراتا ہے اور اُن کی محنت کے ماحصل سے اپنا خزانہ بھرتا ہے۔ دُوسروں کی کمائی پر اُس کا حق ہے۔ دُوسروں کا اس کی ملکیت پر حق نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ حکومت ٹیکس وصول کر کے مطمئن ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھنا اپنا فرض نہیں سمجھتی کہ عوام کو ضروریاتِ زندگی بھی بہم پہنچ رہی ہیں یا نہیں۔ سرمایہ دار کی نگاہ میں غیر سرمایہ دار اتنا ذلیل اور حقیر ہوتا ہے کہ وہ اُسے عزت و تکریم ہی سے محروم نہیں کر دیتا بلکہ معمولی توجہ کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔

اشتراکی نظام میں محنت چھوٹے بڑے سب کو کرنی پڑتی ہے اور سب محنت کا معاوضہ پاتے ہیں۔ اتنا معاوضہ جو اُن کی ضرورت کے لائق ہو۔ لیکن کس کی ضرورت کتنی ہے اُسے اشتراکی نظام نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ کام میں صلاحیت دیکھی جاتی ہے۔ مگر صلاحیت کو نشو و نما دینے کی ذمہ داری اشتراکی حکومت بھی اس طرح نہیں لیتی جس طرح اُس نے روٹی کپڑے اور مکان کی ذمہ داری لے لی ہے۔ اشتراکی نظام میں کام کی قیمت ہے۔ انسان کی قیمت اشتراکی نظام میں بھی نہیں ہے۔

برخلاف اس کے اسلامی نظام میں جیسا کہ آپ اُوپر پڑھ چکے ہیں۔ ہر شخص سے توقع کی جاتی ہے کہ کام کرے گا اور بے وجہ معقول اپنا بوجھ دُوسروں پر نہیں ڈالے گا۔ ہاں کسی معقول وجہ سے کوئی اپنا بوجھ خود نہ اُٹھا سکے تو اس کا بوجھ اُٹھانا معاشرے پر لازم ہے۔

افراد قوم و ملک کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینا اسلامی نظام کی ایسی ہی ذمہ داری ہے۔ جیسی افراد قوم و ملک کے لئے روٹی، کپڑے اور مکان کی فراہمی اسلامی نظام کے ذمہ ہے۔ افراد میں مسلم و غیر مسلم کی قید نہیں ہے۔

اشتراکی نظام میں فرد کچھ نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں فرد سب کچھ ہے۔ بشرطیکہ وہ سرمایہ دار ہو۔ لیکن اسلامی نظام میں انسان بحیثیت انسان معزز و مکرم ہے۔ اور جو جتنا اللہ کے اوامر و نواہی یعنی قوانین کا جتنا پابند ہے اتنا معزز و مکرم ہے۔

ڈاکٹر طہٰ حسین

ترجمہ:- سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی

شبستاں سے شہادت گاہ تک

وہ ایک چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ جس کی جوانی اٹھ رہی تھی۔ چہرے پر شگفتگی کے آثار نمایاں تھے۔ پیشانی کھلی ہوئی تھی۔ اور انداز بیان انتہائی شیریں۔ اس کی تابش حسن کے سامنے نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اس کا انداز گفتگو شیریں اور دل نواز تھا۔ وہ ایک طرف خوبصورت تھا تو دوسری طرف شکل و لباس کا ظاہری اہتمام بھی رکھتا تھا۔ دیکھنے والا اس کو دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ قدرت نے ناز و نعمت کا ایک معتد بہ حصہ اس کو عنایت کیا ہے۔ ایسا خوش مذاق اور پاکیزہ خصلت کہ اپنی قوم کی جس مجلس سے بھی گزرتا۔ اس کی طرف انگلیاں اٹھنے لگتیں۔ اشارے ہونے لگتے کہ دیکھو وہ نوجوان آرہا ہے جس کے اخلاق کی خوشبو سے فضا معطر ہو جاتی ہے۔ اس کے والدین اس کو بہت چاہتے تھے اور بڑی محبت کرتے تھے۔ بالخصوص ماں کی تو ساری محبت و شفقت اور تمام تر عنایتوں کا وہ مرکز تھا۔ جس پر اس کی ساری دولت و ثروت وقف تھی۔ اور وہی اس کی بے حساب دولت اور بے شمار املاک کا حاکم و مالک تھا۔ انہی اسباب کی بناء پر وہ قریش کی داستان اور اس کا موضوع بنا ہوا تھا۔

ایک دن مکہ میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ جسم میں زندگی کا نشاط پیدا ہو رہا تھا۔ اور دل میں ایک ایسی خواہش ابھر رہی تھی جو حقیقی نعمتوں سے محروم ہی نہیں بلکہ ایک سطحی تفکر تھی۔ ایک عارضی خواہش تھی۔ اور اس کی اہمیت اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ انسان کچھ ہنس بول کر اور کچھ سیر و تفریح کر کے دل کو بہلا لے۔ یہی دن اور چاشت کا وقت تھا کہ وہ نوجوان مسجد کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ دنیا کے رنج و غم سے فارغ البال اور ہر طرح سے خوش و خرم نظر آرہا تھا۔ کہ راستہ میں اس کو ساتھیوں اور ہم عمروں کے ایسے دو گروہوں سے سابقہ پڑا جو اسی نشاط و مسرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی عقلی اور جسمانی قوتوں کا خون کرنے نکلے تھے۔ ایک گروہ شکار کی تیاری میں مصروف تھا تو دوسرا اس "رومی" کے شراب خانہ کی طرف محو خرام تھا۔ جو مکہ میں شام کی نبیذ لاکر بیچا کرتا تھا۔ ایک گروہ نے اس سے کہا کہ آؤ ہمارے ساتھ شکار کو چلو۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا دوسرے نے شراب کی دعوت دی تو اس نے نفرت کا اظہار کیا۔ اس کو بھلا اس ناپاک لذت کی کیا ضرورت تھی جو شکاریوں کو اندھا دھند جانوروں کے خون بہانے میں ملتی ہے اور اس کے لئے ایسے مشغلہ میں کوئی سامان راحت میسر نہ تھا جس میں شراب کی بوتلوں سے عقل و خرد پر ڈاکہ زنی کی جاتی ہو۔

اس نے کسی کا ساتھ دینا گوارا نہ کیا۔ اور سیدھا مسجد کی طرف ہو لیا۔ اس لئے کہ اس کو تو قریش کی محفلوں سے دلچسپی تھی۔ جس میں وہ لوگ اپنی اپنی آپ بیتی سنایا کرتے تھے۔ لیکن ابھی وہ مسجد کی طرف بڑھ ہی رہا تھا اور وہاں تک پہنچ بھی نہ پایا تھا کہ اس کے کانوں نے کچھ لوگوں کی گفتگو کی کرخت آوازیں سنیں۔ یہ آوازیں اس کو مانوس معلوم ہوئیں۔ وہ کھل پڑا۔ اس کے دل میں ایک تمنا جاگ اٹھی۔ کہ کاش تھوڑی دیر اس کو ان خوشگوار باتوں کے سننے کا موقع مل جاتا۔ اس لئے کہ

وہ گفت گو کتنی لذیذ ہوتی تھی۔ جس میں قریش کے شیوخ حصّہ لیتے تھے۔ خواہ وہ سنجیدہ باتیں ہوتیں یا محض تفریحی۔

نوجوان بڑھتا گیا۔ بڑھتا گیا۔ اور ایک مجلس میں قریب بیٹھ کر باتیں سننے لگا۔ اس وقت وہ لوگ ایک ایسے شخص کی مخالفت میں گفت گو کر رہے تھے۔ جس نے اُن کے شہر میں ایک نت نئی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ اور ہر شخص اس سے ناخوش و ناراض ہے۔ اس لئے کہ وہ ان کے پسندیدہ اور قدیم دین کو بدلنا چاہتا ہے۔ اور ان تمام طریقوں اور رسم و رواج کا انکار کرتا ہے جن کو ان لوگوں نے اپنے باپ دادا سے وراثت میں پایا ہے۔ وہ فقیروں کو مالداروں کے خلاف اور کمزوروں کو طاقتوروں کی مخالفت پر اُبھارتا ہے۔ اس کے پاس مختلف قسم کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ جن میں آزاد بھی ہوتے ہیں اور غلام بھی۔ لیکن وہ باتیں کرتے ہی ایسا افسوں پھونکتا ہے کہ سارا اونچ نیچ یک لخت مٹ جاتا ہے۔ اور یک بیک وہ سب کے سب بھائی بھائی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اُن کا دل ہر قسم کے کینہ و عداوت سے پاک و صاف ہو جاتا ہے اور اس وقت وہ اخلاص و صداقت کے پیکر، اتحاد و اتفاق کے اعلیٰ نمونے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان کو دشمنوں کے خلاف ذرا بھی کسی تحریک بغاوت کی اجازت مل جائے تو شہر میں ایک طوفان برپا کر دیں۔

وہ شخص ان تمام لوگوں کو اکٹھا کر کے ایک ایسا عجیب و غریب وعظ سُناتا ہے۔ جو مکہ کے کاہنوں کی زبان سے کبھی نہیں سُنا گیا۔ اور نہ عرب کے بازاروں میں بڑے بڑے واعظوں نے یہ بات سُنائی۔ وہ ان کو سُناتا جاتا ہے اور یہ لوگ ایسا لطف اندوز ہو رہے ہیں جیسے ان باتوں کو پی رہے ہیں۔ کبھی سُنتے سُنتے اچانک وہ لوگ مسرتوں میں کھو جاتے ہیں اور خوشی سے ان کے چہرے دمک اُٹھتے ہیں۔ آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تو کبھی ان پر قنوطیت چھا جاتی ہے۔ چہرے کا رنگ بگڑ جاتا ہے پیشانیوں پر شکنیں اُبھر آتی ہیں۔ اور آنکھوں سے موٹے موٹے گرم آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ جن سے ڈاڑھیاں بھیگ جاتی ہیں اور ایک ایسی گھبراہٹ طاری ہوتی ہے کہ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور سینہ میں ایک اضطراب برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن کتنی حسین ہے وہ چیز جس کا وہ ان سے وعدہ کرتا ہے اور ان کو تمنائیں دلاتا ہے۔ اور کتنی ہولناک ہے وہ بات جس سے ان کو ڈراتا ہے۔

یہ شخص ان کے دلوں پر کچھ اس طرح قابض ہو چکا ہے اور ان کی عقلوں کو ایسا مسخر کر لیا ہے کہ اگر قریش کے لوگوں، ان کے ہمدردوں غلاموں اور مکہ میں اکّا دکّا آنے والوں سے اس شخص کے مقابلہ کی نوبت آ جائے تو یقیناً وہ لوگ ان پر پوری طرح ٹوٹ پڑیں گے۔ اور ہر چیز میں ایک انقلاب برپا کر دیں گے۔

اس مجلس میں لوگ اسی شخص کے بارے میں اپنے اپنے مزاجوں کے مطابق کبھی نرمی اور کبھی سختی سے مصروفِ گفتگو ہیں۔ ان میں بعض تو ایسے جوشیلے اور تیز ہیں کہ اگر قریش کی طرف سے ذرا بھی ان کو کوئی اجازت یا موقع مل جائے تو یہ ظالم اسی وقت ابن ابی الارقم کے گھر کو جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کو جمع کرتے ہیں۔ ان پر گرا دیں۔ اور اگر قبیلۂ بنی مخزوم کے کچھ نوجوان اس کام کے لئے تیار ہو جائیں تو ان کے لئے اس میں کچھ دشواری ہی نہ پیش آئے۔ لیکن ایک سنجیدہ اور متین شخص ان کے اندر موجود ہے۔ جس کی نگاہیں ماضی و مستقبل دونوں پر یکساں ہیں۔ اور اس کو یہ بات کسی طرح پسند نہیں کہ قریش کے لوگ آپس میں اختلاف پیدا کریں اور ایک دوسرے سے زور آزمائی کی نوبت آئے۔ وہ سوچتا ہے کہ عرب کی زمام قیادت ہمیشہ قریش کے ہاتھ میں رہی۔ جس نے صلاح و مشورہ کے ذریعہ ہمیشہ اپنے معاملات کو درست رکھا اور ہر قسم کی لڑائی جھگڑے میں فیصلہ کا حق مجلسِ قریش کے سرداروں کے ہاتھ میں دیا اور اس میں کبھی کسی کو کوئی خصوصیت نہیں

حاصل ہوئی۔ خواہ طاقتور افراد اور قوی تر جماعتیں رہی ہوں۔ یا اپنے دور کا کوئی صاحب رعب و تمکنت شخص رہا ہو۔ شیخ مجلس اپنی جماعت کے لوگوں کو یوں نصیحت کر رہا ہے:۔

"کسی طرح اس شخص کو راہ راست پر لانا چاہیئے اور اس کے قریش کے ساتھ جو اختلافات ہیں اُن کو مٹانا چاہیئے۔ چاہے اس سلسلہ میں قریش کو کچھ مال ہی کیوں نہ خرچ کرنا پڑے یا کسی طرح کی کچھ تکلیف کا سامنا کیوں نہ ہو"۔

یہ نوجوان قریب ہی بیٹھا ہر طرح کی نرم و سخت باتیں سُن رہا ہے اور رہ رہ کے اس کے دل میں یہ خواہش اُبھر رہی ہے کہ کاش وہ اس شخص کے متعلق اچھی طرح معلومات حاصل کر سکتا۔ چنانچہ وہ طبیعت پر ایک بوجھ رکھ کر اُٹھتا ہے اور مسجد سے نکل کر کوہ صفا کی طرف ابن ابی الارقم کے گھر کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ اور اگر اس وقت اپنے دل سے یہ سوال کرتا جبکہ وہ مسجد اور ابن ابی الارقم کے گھر کے درمیان کا راستہ طے کر رہا ہے (وہی گھر جو ایک نئی دعوت کا مرکز بنا ہوا ہے) کہ کون سی قوت اس کو چاشت کے وقت مسجد کی طرف لے گئی اور کس طاقت نے اس کو اپنے ساتھیوں کی باتیں سننے سے روکا۔ جبکہ وہ لوگ اس کو شکار کی دعوت دے رہے تھے۔ اور شراب کی بزم میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ ان تمام لذتوں کو چھوڑ کر اور ہر خواہش سے مُنہ موڑ کر کیوں قریش کی اس مجلس میں گیا۔ جہاں اس نے سخت و سُست باتیں سنیں اور انہی کی بدولت اب وہ اس راستہ کو طے کر رہا ہے جو اس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب تک پہنچائے گا۔

اگر نوجوان اپنے دل سے یہ سوال کرتا اور اپنے آپ سے پُوچھتا کہ آخر وہ کونسی ایسی عجیب و غریب طاقت ہے جو اس پر حکومت کر رہی ہے اور آج صبح سے اس پر چھائی ہوئی ہے۔ تو کبھی بھی وہ اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہ پاتا اور نہ اس کیفیت کی کوئی حقیقت اُس کی سمجھ میں آتی۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہا ہے اور نہ کسی طرح کا کوئی سوال اس کے دل میں پیدا ہوتا بلکہ وہ سیدھا اپنا راستہ طے کرتا چلا جا رہا ہے اور منزلِ مقصود پر پہنچکر نہایت سنجیدگی سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور نوجوان اندر داخل ہوتا ہے۔ سلام کرتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔

ادھر پُوری قوم اس کی حسین و جمیل شکل پر حیرت انگیز نگاہیں ڈال رہی ہے اور ہر ایک کے دل میں ایک پوشیدہ آرزو اُبھر رہی ہے، جس میں صداقت اور قوی تر اخلاص ہے۔ سب کی یہ تمنا ہے کہ کاش اللہ تعالیٰ اس صاحبِ مال و جمال نوجوان کو دولت اسلام سے سرفراز فرماتا اور کاش یہ ہمیں میں کا ایک فرد ہو جاتا اور ہماری اس خوشگوار اور عام نعمت میں وہ بھی شریک ہو کر نفع اندوز ہوتا۔ جو ایمان و اسلام کی نعمت ہے۔ تب مسلمانوں کی جماعت میں اور زینت بڑھ جاتی اور قریش کو خوب غیظ و غضب کا موقع ملتا۔ یہی ایک آرزو ہے جو ہر ایک کے دل میں پل بھر میں اس تیزی سے اُبھری جیسے وہ بجلی کا کرنٹ ہو۔ اور اُن کے قلب میں دوڑ گئی۔ یہی آرزو ایک شعلہ بن کر ان تمام آنکھوں کو روشن کر رہی ہے۔ جو نوجوان کو محبت و اخلاص سے دیکھ رہی ہیں۔ جیسے وہ آنکھیں اس کو دعوت دے رہی ہوں کہ "تم بھی ہماری بزم میں شریک ہو جاؤ"۔ نوجوان بھی ان نگاہوں کی ناوک فگنی کو محسوس کر رہا ہے۔ لیکن وہ بالکل خاموش ہے۔ کچھ کہتا ہے نہ کچھ کرتا ہے۔

ادھر دربارِ رسالت میں سلسلۂ کلام شروع ہو جاتا ہے۔ جس میں بشارت و خوشخبری بھی ہے اور خوف و اندیشہ بھی اور قرآن کریم کی تلاوت بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں شروع ہوتے ہی سب کا رُخ آپ کی طرف ہو جاتا ہے اور سب کے قلب و نگاہ نوجوان سے پھر کر ایک مرکز پر جمع ہو جاتے ہیں۔ جیسے "مصعب" کبھی اُن کے پاس آئے ہی نہیں۔ اُن سے سب نے چہرہ پھیر لیا۔

دور سب نے اُن کو بھلا دیا۔ لیکن وہ کسی سے اپنا منہ نہیں پھیر سکا۔ اور نہ کسی کو بھلا سکا۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ کس طرح قوم مجھ سے رو گرداں ہو کر صدر نشین محفل کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن ابھی تھوڑی دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ وہ خود اپنے آپ سے غافل ہو کر شریک محفل ہو گیا اور سب کے ساتھ ساتھ اس کی توجہ بھی اس بشیر و نذیر نبیٔ اُمّی کی طرف منعطف ہو گئی۔ وہ باتیں سنتا جاتا ہے اور یاد بھی کرتا جاتا ہے۔ اور پھر ایکا ایکی اُٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آ جاتا ہے اور بیعت کے لئے ہاتھ پھیلا کر ساری محفل میں اس نئے دین میں داخل ہونے کا اعلان کر دیتا ہے ــــ!

قریش کی ایذا رسانی اور اپنی مہربان و شفیق ماں کی ناراضگی کے خوف سے نوجوان نے ایک عرصہ تک اپنے اسلام کو چھپائے رکھا۔ یہ ماں اپنے عزیز بیٹے کو کسی طرح معمولی تکلیف دینے کی بھی روادار نہ تھی۔ اور نہ بیٹا یہ گوارا کر سکتا تھا کہ اس مہربان ماں کی شفقت و محبت اور اس کے پیار کا رشتہ کسی طرح اس سے ٹوٹ سکے۔ اسی ماں کے صلہ میں وہ اپنی ماں سے اتنی مدد حاصل کر لیتا تھا جس سے وہ اپنے دینی بھائیوں اور دوستوں کو کچھ نفع پہنچا سکتا۔ لیکن آخر کار عثمان بن طلحہؓ نے ایک دن اس کو نماز پڑھتے دیکھ ہی لیا۔ پھر کیا تھا۔ انہوں نے یہ خبر کتنی جلد لوگوں میں پھیلائی اور کتنی جلد قریش اس نوجوان سے متنفر ہو گئے اور اپنی خفگی کا اظہار شروع کر دیا۔ اور کتنی جلد اس کے ماں باپ اس سے ناراض ہو گئے۔ اور کتنی تیزی سے اس کو فقر و فاقہ نے آ گھیرا۔ اور زندگی کا بوجھ اس پر گراں تر بنا دیا! کل تک جو نوجوان مالدار و خوش باش تھا۔ آج وہ بھی دوسروں کی طرح فقیر و تنگدست ہو گیا۔ لیکن وہ اپنے تمام ساتھیوں کے مقابلہ میں صبر و استقامت کا پہاڑ ہے۔ وہ ہر طرح کی مصیبت کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن اس کا اسلام اس کے لئے صبر و تسلی کا سامان ہے۔

اسی طرح دن گزرتے گئے اور کفار کا معاملہ مسلمانوں کے ساتھ سخت تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو حبشہ کی ہجرت کا حکم دے دیا تو یہ نوجوان بھی اُن کے ساتھ ہجرت کر گیا اور وہاں کچھ دنوں رہنے اور زندگی کی تکلیفیں جھیلنے کے بعد پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کے ساتھ رہنے لگا۔ ابھی کچھ زیادہ دن بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ پھر مکہ کی زمین مسلمانوں کے لئے تنگ ہو گئی اور دوبارہ حبشہ کی ہجرت کا حکم آ گیا۔ نوجوان نے اس مرتبہ پھر ہجرت کی اور تقدیر الٰہی کے مطابق زندگی کے سخت دن وہاں گزارے۔ لیکن اس کو تو آپ سے قریب رہ کر ہر طرح کی تکلیف و مشقت برداشت کرنا محبوب تھا۔ اس کو آپ سے دور رہ کر امن و سلامتی کی زندگی کسی طرح پسند نہ تھی۔ اسی لئے وہ اپنی خستہ حالی اور بے سرو سامانی کے عالم میں مکہ واپس آ گیا۔ اس وقت اس کے کپڑے بالکل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ جن سے اس کا جسم بڑی مشکل اور کوشش کے بعد ڈھک سکتا تھا اور اس کے جسم کی نرم و نازک کھال موٹی اور کھردری ہو گئی تھی۔

ایک دن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت تمام صحابۂ کرام تشریف فرما تھے۔ اس کو دیکھ کر سب لوگوں کو بڑا ترس آیا اور اُن کی گردنیں شرم کے مارے جھک گئیں۔ نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ وہ سوچنے لگے کہ کیا وہ اتنے مجبور ہیں کہ اپنے ایک مصیبت زدہ بھائی کی مدد نہیں کر سکتے۔ نوجوان نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا تو آپ نے جواب دیا اور اُس کی اس طرح تعریف فرمائی:۔

> "میں نے جب اس نوجوان کو دیکھا تھا تو اس وقت مکہ میں کوئی بھی اس سے زیادہ ناز و نعمت کا پروردہ اور خوش حال نہیں تھا۔ لیکن ان تمام خوش حالیوں اور عیش و آرام کو اس نے اللہ اور رسولؐ کی محبت پر قربان کر دیا۔"

نوجوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا دل وجان سے شیدائی ہو گیا اور دیر دیر تک آپؐ کی صحبت میں رہنے لگا۔ وہ آپؐ کی تمام باتیں پوری توجہ اور حسنِ التفات سے سنتا اور ذہن نشین کر لیتا۔ اس طرح وہ تھوڑے ہی دنوں میں صحابہ کرامؓ کی صف میں ایک بہت بڑا عالمِ دین اور فقیہہ سمجھا جانے لگا۔ اِدھر انصار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسے شخص کا مطالبہ کیا جو اُن کو قرآن کی تعلیم دے سکے اور دین کو اچھی طرح سمجھا سکے۔ تو اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ انتخاب مصعبؓ بن عمیر ہی پر پڑی۔ اس طرح وہ اسلام کے پہلے مُبشّر بن کر مکہ سے باہر جاتے ہیں۔ جہاں اُن کو دین کی دعوت پھیلانے کا ذمہ دار بنایا جاتا ہے۔

حضرت مصعبؓ بن عمیر کو ذمہ داری کا بوجھ سنبھالنے کی پوری طرح توفیق نصیب ہوئی اور اس وقت انصار اسلام میں فوج در فوج داخل ہونا شروع ہوئے۔ اُن کے بلند اخلاق، اُن کے نرم کلام، اُن کے ایمان کی شیرینی اور کثرتِ صبر و قناعت نے اُن کو لوگوں کا محبوب بنا دیا اور وہ ان کی توجہ اور التفات کا مرکز بن گئے۔

حج کا موسم قریب آیا تو حضرت مصعبؓ ستر انصاریوں کو لے کر مکہ پہنچے۔ اس وقت اُن کو اپنا گھر یاد آیا نہ مہربان ماں کا خیال عناں گیر ہوا۔ وہ سیدھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے۔ بہت دیر تک آپؐ سے تنہائی میں باتیں کیں اور مدینہ کی ساری خبریں آپؐ کو سنائیں۔ آپؐ یہ تمام باتیں سُن کر خوش اور رضامند ہوئے۔ وہ بہت دیر تک آپؐ کے پاس ٹھہرے رہے اور اِدھر ان کی ماں کو بھی اُن کے مکہ آنے کی خبر ہو چکی ہے۔ لیکن جب حضرت مصعبؓ اُن سے ملنے نہیں گئے تو انہوں نے ایک ایسے شخص کو اُن کے پاس بھیجا جو اُن کو خوب ملامت کر سکے۔ مگر باوجود اس کے بھی وہ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہے۔ اُس وقت تک اُن کو اپنی ماں سے ملنے کی کوئی فکر نہ ہوئی۔

اس کے بعد جب وہ اپنی ماں کی ملاقات کو پہنچے تو انہوں نے اس تاخیر پر بہت ملامت کی اور اس نئے دین میں داخل ہونے پر بھی خوب جی بھر کے باتیں سنائیں اور رو رو کر کہا کہ وہ اس نئے دین کو چھوڑ کر اُس کے پاس آ جائے۔ اس وقت ماں کے آنسو سے بڑھ کر اُن کے دل کو پھیرنے کے لئے اور کون سی چیز محرک ہو سکتی تھی۔ لیکن جب مصعبؓ نے ہر طرح کی تکلیفوں پر صبر کر لیا تو ماں کے آنسو پر بھی صبر کر لیں گے۔ اسی لئے وہ ماں کو وعظ و نصیحت کرنے اور اسلام کی دعوت پیش کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ مگر وہ ہیں کہ برابر انکار کرتی جا رہی ہیں۔ اور ان کو اس دین کے قبول کر لینے پر طرح طرح کی سزاؤں کا خوف دلا رہی ہیں۔ لیکن نوجوان ہر بات کا جواب دے رہا ہے اور اخیر میں اعلان کر دیتا ہے کہ:۔

"اگر کسی نے اس کو کسی طرح کی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کیا اور اس سلسلہ میں اس سے کوئی چھیڑ چھاڑ کی تو وہ اس کو قتل کر دے گا"

اس پر اُس کی ماں اس کو چھوڑ دیتی ہیں اور وہ سیدھا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی خدمت میں آ کر آپؐ کے جوارِ کرم میں قیام پذیر ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ مدینہ کی ہجرت کا وقت قریب آ جاتا ہے اور حضرت مصعبؓ پہلے ہی سے مدینہ پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرنے کے لئے چشم براہ ہو جاتے ہیں۔

بدر کا میدان ہے حضرت مصعبؓ بن عمیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا لے کر آگے آگے چل رہے ہیں۔ یہاں تک کہ جنگ ہو چکی ہے اور مظفر و منصور واپس آتے ہیں۔ مدینہ آ کر حضرت مصعبؓ نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ فقر و فاقہ اور محنت و مشقت کا سامنا کیا۔ اور ہر طرح کی تکلیف نہایت خوشی خوشی برداشت کرتے رہے۔ اسی اثناء میں جنگ احد پیش آ گئی۔ اور پھر حضرت مصعبؓ

کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا لے کر آگے آگے چلنے کا شرف حاصل ہوا۔ جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے میدانِ جنگ میں اپنی جگہ حاصل کر لی اور پہاڑ کی طرح جم گئے۔ اِدھر قریش کے حملے نے مسلمانوں کو منتشر کر دیا اور تمام مسلمان جھنڈوں کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن مصعبؓ بن عمیر اسی طرح اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ نہ وہاں سے ٹلتے ہیں اور نہ اِدھر اُدھر مائل ہوتے ہیں کہ اتنے میں ابنِ قمیئہ (قریش کا ایک مشہور شہسوار) اُن کے سامنے آتا ہے اور آپ کے ہاتھ پر تلوار کی ایسی ضرب لگاتا ہے کہ جھنڈا گر جاتا ہے۔ مگر فوراً مصعبؓ بن عمیر جھنڈے کو دوسرے ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں اور اپنی مدافعت کرنا چاہتے ہیں کہ اِدھر ابنِ قمیئہ دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے اور اُن کا دوسرا ہاتھ بھی شہید کر دیتا ہے۔ لیکن مصعبؓ اسی طرح اپنی جگہ پر جمے ہوئے ہیں۔ اُن کے پائے ثبات میں ذرا بھی تزلزل نہیں آتا۔ اور اسلام کا پرچم دونوں بازوؤں میں دبائے ہوئے ہیں۔ تیسری بار ابنِ قمیئہ پھر حملہ کرتا ہے اور اس دفعہ نیزہ حضرت مصعبؓ کے سینہ میں پیوست ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے حضرت مصعبؓ شہید ہو کر گر پڑتے ہیں۔ اور جھنڈا بھی زمین بوس ہو جاتا ہے۔ لیکن اب کی دفعہ اس کو اُن کے بھائی ابو الروم اٹھا لیتے ہیں۔ اور مدینہ تک اس کو اپنے ساتھ لئے ہوئے آتے ہیں!

قریش میدانِ جنگ سے غالب ہو کر واپس آ چکے ہیں اور اُدھر مسلمان اپنے شہیدوں کی تجہیز و تکفین کی فکر میں مبتلا ہیں۔ کہ اچانک حضرت مصعبؓ بن عمیر چہرے کے بل گرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور سب کو اُن کے تجہیز و تکفین کی فکر لاحق ہو جاتی ہے۔ لیکن کفن کے لئے کوئی کپڑا نہیں مل رہا ہے۔ ایک بوسیدہ اور چھوٹی سی چادر ہے۔ جس سے سر ڈھانکا جاتا ہے تو پیر کھل جاتا ہے اور پیر ڈھانکا جاتا ہے تو سر کھل جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ منظر دیکھتے ہی فوراً یہ آیت تلاوت فرماتے ہیں:۔

مِنَ المؤمنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضیٰ نحبہٗ ومنھم من ینتظر وما بدّلوا تبدیلاً۔

مسلمانوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا اس کو سچ کر دکھایا۔ پس بعض اُن میں سے اپنی مدت پوری کر چکے اور بعض ابھی انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے وعدے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔

پھر آپؐ نے حکم دیا کہ سرِ مبارک کپڑے سے ڈھانک دیا جائے اور پاؤں کو "اذخر" گھاس سے چھپا دیا جائے۔ اور فرمایا:۔

"بیشک اللہ کا رسول گواہی دیتا ہے کہ تم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہیدوں میں ہو گے۔"

ماہر القادری

یادِ رفتگاں

خواجہ حسن نظامی مرحوم

کسی شاعر اور انشاء پرداز سے جان پہچان کا سب سے بڑا ذریعہ اُس کا کلام اور مضامین ہوتے ہیں۔ مگر یہ تعارف یک طرفہ ہوتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی سے یہ تعارف اس زمانے سے ہے جب اخبار اور رسالے پڑھنے کا مجھے نیا نیا شوق پیدا ہوا۔ اُس وقت میری عمر مشکل سے نو دس برس کی ہوگی۔ دلی کے ماہنامہ نظام المشائخ کے سرورق پر سب سے پہلے یہ عبارت نظر سے گزری۔

زیرِ سرپرستی

"سیدی و مولائی حضرت خواجہ حسن نظامی خواہرزادہ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رح"

"سیدی و مولائی" اور "خواہر زادہ" کے معنی مجھے اُس وقت کہاں معلوم تھے۔ اس کے لئے دوسروں سے پوچھنا پڑا۔ جب کہیں جا کر یہ قفلِ ابجد وا ہوا۔ حضرت سلطان جی رحمتہ اللہ علیہ کا نام نامی بچپن ہی سے سُن رکھا تھا اور نام ہی کیا سُن رکھا تھا اُن کی عقیدت دل و دماغ میں رچی ہوئی تھی۔ مگر یہ غلط فہمی کچھ دنوں کے بعد جا کر دور ہوئی کہ خواجہ حسن نظامی حضرت سلطان جی رح کے حقیقی بھانجے نہیں ہیں۔ حضرت کی بہن کی اولاد سے خاندانی نسبت رکھتے ہیں ــــ تاریخ کے زمان و مکان کے بُعد و اختلاف کا بچپن میں کسے شعور ہوتا ہے۔

خواجہ صاحب کا سب سے پہلا مضمون جس نے مجھے متاثر کیا۔ اُس کا عنوان "میرا کالا کوبلہ" تھا۔ اس تاثر کا اثر شاید سب سے بڑا سبب تحریر کی سادگی اور سلاست تھی۔ پورے مضمون میں کسی ایک لفظ کے لئے بھی مجھے کسی سے معنی پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی اسے میں نے اپنی ذہانت کی خوبی سمجھی۔ حالانکہ یہ لکھنے والے کا کمال تھا۔ پھر تو یہ عالم ہوگیا کہ رسالوں میں خواجہ صاحب کے مضامین ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا۔

زمانہ گزرتا چلا گیا۔ ذرا پلک جھپکی تھی کہ کم و بیش دس سال بیت گئے۔ ۱۹۲۴ء میں میرے والد کا انتقال ہوا جس کے بعد گھر کے حالات ہی دگر گوں ہو گئے۔ انگریزی اسکول کے پڑھے ہوئے نوجوان کے لئے شہری زندگی میں زیادہ کشش تھی۔ مگر وسیلہ اور سعی سفارش کے بغیر ملازمت کا ملنا آسان نہ تھا۔ حیدر آباد دکن میں خواجہ صاحب کے اثر و رسوخ کے افسانے سُن رکھے تھے۔ میں نے اُن کی خدمت میں کسی تعارف کے بغیر ایک طویل خط لکھا۔ غالباً ایک ہفتے کے اندر اندر تسلی آمیز جواب آگیا۔ جواب کے ملتے ہی میں دہلی کے لئے چل پڑا۔

حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے سامنے بالاخانہ پر خواجہ حسن نظامی تشریف فرما تھے۔ میں اندر پہنچا۔ بڑی شفقت سے ملے۔ میں نے اپنے خط اور اُن کے جواب کا حوالہ دیا۔ تو فرمایا کہ میں جب حیدرآباد جانے لگوں تو آپ بھی میرے ہمراہ چل سکتے ہیں۔ یہ معاملہ بس اسی مرحلہ پر ختم ہوگیا۔ اس کے بعد کسی سلسلہ جنبانی کی نوبت نہیں آئی۔

خواجہ صاحب جس کمرے میں بیٹھے تھے اس کی دیواروں پر ملنے ملانے والوں کے لئے کچھ ہدائتیں بھی لکھی ہوئی تھیں۔ ایک ہدایت تو اب تک یاد ہے۔ لفظوں کی ادل بدل ہوگئی ہو تو اسے حافظہ کا قصور سمجھئے:۔

"قرض اور خرچ نہ مانگئے۔"

خواجہ صاحب کا چھریرا بدن، اس پر نیچا کرتا۔ شانوں کو زلفوں کے پیچ چھوتے ہوئے گہرے رنگ کی سبز مخمل کی قبہ نما ٹوپی جس کی نوک خوب اونچی اٹھی ہوئی۔ ہونٹوں پہ پان کی لالی۔ ان کی خاندانی نسبت اور پیری مریدی کی شہرت کے ساتھ یہ وضع قطع یقیناً بہت سوں پر ان کے تقدس کا اثر قائم کرتی ہوگی۔ مگر مجھ پر ان کی اس سج دھج کا کچھ اور اثر ہوا۔

تھوڑی دیر بعد خواجہ صاحب "نظام الدین" سے شہر جانے لگے۔ مجھے بھی واپس جانا تھا۔ انہوں نے خود اپنے ساتھ موٹر میں بٹھا لیا۔ غالباً موٹر خواجہ صاحب نے نئی نئی خریدی تھی۔ غزالی خاں کے یہاں پہنچ کر خواجہ صاحب نے موٹر واپس کر دی۔ اور چند منٹ کے بعد گھر ٹیلیفون کر کے موٹر پہنچنے کا حال پوچھا۔ اس سے میں یہ سمجھا کہ خواجہ صاحب ان معاملات میں بنی تلی اور محتاط زندگی رکھتے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب مرحوم کے پچاس سالہ دوست اور رفیق ملا محمد واحدی صاحب سے ابھی ڈیڑھ دو مہینے پہلے اس واقعہ کا میں نے ذکر کیا تو وہ بولے کہ خواجہ صاحب تو بڑے شاہ خرچ واقع ہوئے ہیں۔

مرحوم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان سے خط و کتابت کی بھی پھر نوبت نہیں آئی۔ دوسری بار اس ملاقات کے کوئی سال ڈیڑھ سال بعد ملنا ہوا۔ میں اور میرے ہم زلف بابو محمد اسمٰعیل خاں صاحب جمعۃ الوداع پڑھنے کے لئے دہلی گئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خواجہ حسن نظامی مرحوم کے خسر کو کچھ دن پہلے کسی شخص نے قتل کر دیا تھا۔ ہم خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے واقعہ قتل کی تفصیل بتاتے ہوئے مجھ سے پوچھا:۔

"........ کہ یہ صورت حال پیش آتی تو آپ کیا کرتے ...."

اس سوال کا ایکا ایکی جواب دینا مشکل تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ میرے جواب کا آخر وہ کب تک انتظار کرتے۔ انہوں نے خود ہی اپنے خسر کی جرأت کی تعریف فرمائی اور دیر تک اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی۔

خواجہ صاحب مرحوم نے بڑی ملنسار طبیعت پائی تھی۔ ہر عقیدے، ہر مزاج اور ہر حیثیت کے آدمی کو خوش رکھنے کا فن تو ان کو اتنا آتا تھا کہ شاید ہی کسی کو آتا ہو۔ مگر رئیس الاحرار مولانا محمد علی (اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر رحمت کے پھول برسائے) سے نزاع بلکہ قرطاس و قلم کی معرکہ آرائی خواجہ صاحب کی زندگی کا انتہائی ناخوشگوار واقعہ ہے۔ ادھر سے روزنامہ "ہمدرد" میں یہ جنگ چھڑی گئی۔ اور خواجہ صاحب کی طرف سے "غریبوں کا اخبار" نکلا۔ خوب خوب چوٹیں چلیں، کیسے کیسے چھینٹے رہے۔ کس کس طرح سے ایک دوسرے کی ٹوپیاں اچھلیں۔ کچھ لوگوں نے مزے لے لے کر اس لڑائی کا تماشا دیکھا۔ کچھ نے اس آگ کو ہوا دی۔ مگر جو لوگ ملت کا درد رکھتے تھے ان کے دل پر آرے سے چلتے رہے سب سے بڑا غم اور حیرت اس پر تھی کہ مولانا محمد علی اس میں کیوں الجھ گئے اور ان کے قلم سے "ختم خواجگی" جیسا مقالہ کس طرح نکلا۔

خواجہ صاحب نے اس قلمی جنگ کو "جنگ صفین" کا نام دیا، بلکہ اسی نام سے ایک ضخیم کتاب بھی چھپوادی۔ کون جیتا؟ کون ہارا؟ اس کا فیصلہ اسی وقت نہیں ہوا تو اب تیس سال بعد کیا ہوگا؟

مسلمان نوجوانوں کی اکثریت مولانا محمد علی مرحوم کے ساتھ تھی۔ مجھے اس زمانے میں لکھنے لکھانے کی مشق ہوتی تو "سیدی و مولائی" کے مقابلہ میں "رئیس الاحرار" کا ساتھ دیتا۔ لیکن زبانی طور پر مولانا محمد علی کی طرفداری کی اور یہ سمجھ کر کی کہ حق و انصاف کا یہی تقاضا ہے

مزاج و طبیعت کے اس رجحان کے باوجود خواجہ صاحب کا کوئی مضمون یا کتاب کہیں مل جاتی تو اُسے ضرور پڑھتا اور شوق و دلچسپی کے ساتھ پڑھتا۔

غالباً [illegible]ء کا ذکر ہے۔ مولانا عبدالواحد عثمانی بدایونی جو اس زمانے میں روزنامہ "وحدت" (دہلی) کے ایڈیٹر تھے۔ اُن کے کسی عزیز رشتہ دار ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر تھے، کے یہاں میلاد شریف کی محفل تھی۔ مجھے انہوں نے زاہد القادری صاحب کو بھیجکر بلوایا۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم بھی اس محفل میں موجود تھے۔ میرے نظم (سلام) پڑھنے سے قبل واحد میاں نے مختصر سی تعارفی تقریر فرمادی اور اُس میں اس قدر مبالغہ کیا کہ مجھے "علامہ" تک کہہ دیا۔ میرا یہ حال کہ اپنی علمی تہی دامانی کے احساس سے پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ میں نظم پڑھنے کے لئے کھڑا ہوا تو مجھے اپنی صفائی میں بہت کچھ کہنا پڑا۔ میں نے جب کہا کہ "میں نہ تو "مولانا" ہوں اور نہ "علامہ" ہوں...."

اس پر خواجہ صاحب نے بلند آواز سے فرمایا۔

"مگر ہم تو سمجھتے ہیں"

یہ جملہ اُن کی عالی ظرفی اور خورد نوازی کی دلیل تھا۔ اور اگر یہ طنز تھی تو دلخراش نہیں دلنواز طنز تھی۔

خواجہ صاحب مرحوم سے آخری بار نیاز پاکستان ہی میں حاصل ہوا۔ اسے بھی کوئی چار سال ہونے کو آئے۔ روزنامہ "ڈان" (اُردو) ٹائپ پر چھپنا شروع ہوا تو اس کا افتتاحی جلسہ سینٹرل ہوٹل میں منعقد ہوا۔ عصرانہ کے بعد خواجہ صاحب نے بڑی دلچسپ تقریر فرمائی۔

وعظ و خطابت خواجہ صاحب کا فن نہ تھا مگر جب بھی بولتے خوب جم کر بولتے اور تقریر مربوط ہوتی۔ ظرافت کی چاشنی اُن کی تقریر میں ضرور رہتی۔ ایک بار دہلی میونسپل کمیٹی کے ہال میں ایک سوشل اجتماع تھا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی (سحر) جو اُس زمانہ میں دہلی کے سٹی مجسٹریٹ اور ہر طبقہ میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ انہی کی تحریک سے یہ جلسہ منعقد ہوا تھا۔ میل ملاپ کی اس سبھا میں سکھوں کے ممتاز افراد خاصی تعداد میں شریک تھے۔ اس جلسہ میں بہت سی تقریریں ہوئیں۔ خواجہ صاحب نے بھی تقریر کی۔ اُن کے اس جملہ پر جو انہوں نے اپنی ڈاڑھی کو مٹھی میں پکڑتے ہوئے کہا۔

"سکھوں سے ہم مسلمانوں کی ایک مشابہت یہ بھی ہے کہ اُن کی ڈاڑھیاں ہماری ڈاڑھیوں سے ملتی ہوئی ہیں" سارا ہال۔۔۔

خواجہ صاحب مرحوم وضع کے بڑے پابند تھے۔ اُن کے پچاس پچاس سال کے دوست آج بھی موجود ہیں۔ جن سے انہوں نے جب سے اب تک یک رنگ انداز میں دوستی نباہ دی۔ ہفتہ وار "ریاست" کے ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتوں کے ساتھ البتہ ایسا واقعہ ضرور پیش آیا کہ خواجہ صاحب کی اُن سے کھٹک گئی۔ اور کھٹکی بھی اس طرح کہ ساری دنیا نے اس شور کو سنا۔ خواجہ صاحب کی شوخیٔ تحریر کا ایڈیٹر "ریاست" بھلا کیا جواب دیتے۔ مگر سردار دیوان سنگھ نے دوستی کے زمانے میں شاید اسی دن کے لئے ایک "حربہ" سینت کر رکھ چھوڑا تھا۔ انہوں نے خواجہ صاحب کے اصل خطوط کے بلاک اپنے اخبار میں چھاپ دیئے۔ اور یہ وہ حربہ تھا جس کا توڑ ممکن نہ تھا۔

شہر جے پور کے جوہری بازار کی ایک مسجد کے سلسلہ میں ریاست سے مسلمانوں کی نزاع تھی۔ خواجہ صاحب اُن دنوں جے پور گئے ہوئے تھے اور ریاست کے مہمان تھے۔ ایک دن جمعہ کی نماز کے وقت پولیس نے مسجد میں گھس کر مسلمانوں پر بے تحاشہ فیر پر فیر کر ڈالے۔ بہت سے مسلمان شہید اور مجروح ہوئے۔ خواجہ صاحب بھی اس وقت مسجد میں موجود تھے۔ اخبارات میں اس المناک حادثہ

لہ نواب صاحب رامپور کی بہن کا یہ قضیہ تھا۔ جس کا حکومت ہند کے پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ سے تعلق تھا۔

کی خبریں چھپتی رہیں اور رائے زنی ہوتی رہی۔ ریاست جے پور کے محکمہ اطلاعات کا بیان کچھ اور تھا۔ مسلمانوں کی داستانِ غم اس سے مختلف تھی۔ خواجہ صاحب مرحوم نے بھی اپنے مشاہدات قلم بند کئے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ اصل صورتِ حال کیا تھی۔ مگر خواجہ صاحب کی روش سے جے پور کے مسلمانوں کو شکایت ہی رہی۔

خواجہ صاحب صوفی تھے مگر خانقاہ نشین نہ تھے۔ وہ ادیب تھے لیکن گوشہ نشینی انہوں نے اختیار نہ کی تھی۔ اُن کی زندگی اس قسم کے ہنگاموں سے بھی گزری ہے۔ جس کی ایک دو جھلکیاں ابھی ابھی دکھائی گئی ہیں۔ اُن کے سوانح نگار نے ان واقعات سے صرفِ نظر کر لی تو تصویر کے یہ رُخ چھپ جائیں گے اور یہ سیرت و کردار کی ادھوری عکاسی ہوگی۔ اس قسم کے معاملات میں نواب عبداللہ خاں کسمنڈوی اور ہاپوڑ کے ضیاء الحق کے ساتھ خواجہ حسن نظامی صاحب کا بھی لوگ تذکرہ کیا کرتے تھے۔

خواجہ صاحب مردم شناسی کے فن میں شاید اپنا کوئی حریف نہ رکھتے تھے۔ وہ ہر آدمی کے مزاج اور طبیعت کا اندازہ کر کے اُس کے ساتھ برتاؤ کرتے۔ اسی لئے اُن کے دوستوں، عقیدت مندوں اور جاننے پہچاننے والوں کا حلقہ بہت وسیع بلکہ غیر محدود تھا۔ راجے، مہاراجے۔ نواب، وزیر، جاگیردار، سیٹھ ساہوکار، لیڈر، مولوی، شاعر، اخبار نویس، صوفی، بدعتی۔ وہابی۔ حکیم، ڈاکٹر، ہندو، مسلمان، انگریز، سکھ، پارسی۔ غرض ہر مسلک اور ہر حیثیت کے آدمی سے اُن کے روابط تھے۔ آج مہاراجہ الور کے یہاں ہیں تو دوسرے ہفتہ نواب صاحب رام پور کے قصر — خاص باغ — میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تیسرے ہفتہ کسی درگاہ کی سجادہ نشینی کی نزاع میں ثالثی کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اُن کے مشاغل میں عجیب بوقلمونی اور رنگا رنگی پائی جاتی تھی۔

گاندھی جی اور قائد اعظم مسٹر جناح دونوں سے سیاسی اختلافات کے انتہائی طوفانی دَور میں خواجہ صاحب ملتے اور بہ یک وقت مخالف کیمپ کے ان دونوں لیڈروں سے تعلقات نباہتے۔ ہندوستان میں جب جنگ آزادی جاری تھی اور ملک کے ہر طبقہ کے بڑے لوگ اس طوفان میں کود پڑے تھے۔ خواجہ صاحب اس سے نہ صرف یہ کہ دامن کشاں بلکہ منزلوں دُور رہے۔

خواجہ صاحب پکے صوفی تھے اور اس مسلک و مشرب کے تمام ظاہری لوازم و رسوم کے حامل اور عامل تھے۔ بدعات کے معاملہ میں اتنے بڑھے ہوئے کہ سجدۂ تعظیمی کے جواز میں ایک رسالہ تصنیف کر دیا۔ اور سب سے زیادہ عجیب تر یہ کہ ہندوؤں کو مُرید کرتے تھے۔

خواجہ صاحب پروپیگنڈے کے فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ "یدِ طولیٰ" سے بھی اُن کے اس وصف کی صحیح تعریف نہیں ہوتی۔ ہندوستان میں کوئی اس فن میں مشکل ہی سے اُن کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اپنی ذات کو کس کس عنوان سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ اس منزل میں کوئی اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ حیدر آباد دکن میں ایک شخص دیوانہ نظامی خواجہ صاحب کا مرید تھا۔ شاعر کیا تُک بند تھا اور یہ تُک بندی بھی بحر اور وزن سے بے نیاز ہوتی۔ خواجہ صاحب کی تعریف میں وہ الفاظ جوڑ لیتا تو اُن تُک کو خواجہ صاحب اپنے روزنامچے میں چھاپ دیتے۔

خواجہ صاحب جدت طراز بھی تھے، مہینوں کے نام ائمہ اہلبیت کے ناموں پر رکھے۔ یہ جدت عوام میں مقبول نہ ہو سکی۔ مگر وہ انہی مہینوں کو اپنے روزنامچے میں لکھتے رہے۔ دِلّی کا املا "دل لی" انہی کی جدت ہے اور کتنی حسین جدت ہے۔ اپنے مکان کا نام "رین بسیرا" رکھا۔ اُن کی بعض کتابوں کے نام کتنے دل چسپ اور اچھوتے ہیں۔

"کم کو موت" — "پریم سندیسہ" — "مچھر کا اعلانِ جنگ" — "طمانچہ بر رخسارِ یزید" — "کرشن بیتی"۔ "چٹکیاں اور گدگدیاں" ...... "لاؤڈ اسپیکر کا ترجمہ "بڑبولا" انہی کی ایجاد ہے۔

اپنے مریدوں کو اُن کی وضع قطع اور طبیعت و مزاج کی مناسبت سے خطابات عطا فرماتے۔ بعض مریدوں کے اصل نام

اُن خطابات کی شہرت میں گم ہو کر رہ گئے۔ کشفی شاہ، عینی شاہ، خسرو شاہ، وجودی شاہ...... کو جو کوئی جانتا ہے۔ ان خطابوں ہی سے جانتا ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد بہادر یمین السلطنت کو (غالباً) "خماری شاہ" خطاب دیا مگر یہ خطاب ذرا بھی شہرت نہ پاسکا۔

حکیم اجمل خاں مرحوم نے جب انگریزی گورنمنٹ کے عطا کردہ خطاب ـــــ حاذق الملک ـــــ کو واپس کیا تو خواجہ حسن نظامی ہی نے سب سے پہلے اُن کے نام کے ساتھ "مسیح الملک" لکھنا شروع کیا اور اس خطاب کو بہت جلد قبولِ عام حاصل ہو گیا۔

حیدر آباد دکن کے علی بخش قوال کو "واعظ" کا خطاب خواجہ صاحب ہی نے دیا۔ اس خطاب نے "واعظ قوال" کو اتنا چمکایا کہ ہر طرف اُس کی مانگ ہونے لگی اور اُس کے کاروبار کو اتنی ترقی ہوئی کہ وہ خود "شیخ طریقت" بن کر لوگوں کو مُرید کرنے لگا۔

خواجہ صاحب نے مصر، شام اور حجاز کا سفر بھی کیا تھا۔ لیکن قدرت و استطاعت رکھنے کے باوجود فریضۂ حج ادا نہ کر سکے ایک وہ دور تھا کہ ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی نعمانی کو انگریزی حکومت کی طرف سے "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا۔ مگر آخر دور میں انگریز اس معاملہ میں بہت فیاض ہو گیا تھا۔

ہندوستان کے مشہور مزاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی نے ایک رباعی کہی تھی ؎

ـــ لہ

....

گرچہ فہرست اب کے چھوٹی ہے

سمجھیں اس کو غنیمت اہلِ وفا

بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہے

اسی زمانے میں خواجہ صاحب کو حکومتِ برطانیہ نے "شمس العلماء" کا خطاب عطا کیا۔ حالانکہ نہ خواجہ صاحب اپنے کو عالم سمجھتے تھے اور نہ عوام!

ہندوستان اور پاکستان میں خواجہ حسن نظامی مرحوم کی سب سے زیادہ آؤ بھگت غالباً حیدر آباد دکن میں ہوتی تھی۔ اور اس کے ساتھ مالی منفعت کے مواقع بھی حاصل تھے۔ یوں سمجھیے کہ دکن سے چاندی کی نہر نکل کر "رین بسیرے" میں جا کر گرتی تھی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر حکومتِ آصفیہ کے صدر اعظم اور بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اُن کا وقار گورنروں سے بڑھ کر تھا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا ہے کہ خواجہ صاحب کے آنے کی اطلاع پاکر اُنہوں نے حقہ کو اٹھوا دیا اور اُن کے رُو برو بڑے ادب کیساتھ گردن جھکائے بیٹھے رہے۔

خواجہ صاحب کے مشاغل گوناگوں تھے۔ اُن کی بوقلمونی کا کیا پوچھنا؟ کنگ جارج پنجم ہندوستان آئے اور دلّی میں شاہانہ دربار ہوا تو خواجہ صاحب مرحوم نے ایک مضمون چھپایا۔ جس میں کنگ جارج کو اسلام کی دعوت پیش کی۔ سوامی شردھانند کی ناپاک کوششوں سے ملکانوں میں ارتداد کی ہوا چلی تو خواجہ حسن نظامی نے اس کے توڑ کے لئے زمین آسمان ایک کر دیئے۔ اور "شیخ التبلیغ" کہلائے۔ پوسٹروں اور جھنڈیوں کی تحریک انہوں نے شروع کی۔ "حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی" کی بنا ڈالی۔ بہت سی کتابیں

لہ مصرعہ اولیٰ افسوس ہے یاد نہیں رہا۔

اس کمپنی نے چھاپیں۔ مگر یہ سلسلہ دیر تک نہ چل سکا۔ نظام حیدر آباد ۱۹۲۶ء میں دہلی آئے تو خواجہ صاحب نے "نظام گزٹ" نکالا جو نظام دکن کے دلی میں قیام کے دنوں میں پابندی کے ساتھ چھپتا رہا۔ اس میں انگریزی دور کے "ہز ایگزالٹیڈ ہائی نس حضور نظام" اور موجودہ ہندو دور کے "راج پرمکھ" کی مصروفیات کی خبریں پوری تفصیل کے ساتھ چھپتی تھیں۔ یہ بات تو شہنشاہ جارج پنجم کے شاہانہ دورے کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔

اخبار وہ نکالتے تھے۔ کتابوں کی تجارت اُن کے یہاں ہوتی تھی۔ تعویذ گنڈے وہ کرتے تھے۔ دوائوں کے وہ موجد تھے اور اُن کی تجارت فرماتے تھے۔ پیری مریدی ان سب پر مستزاد۔ خواجہ صاحب کی آمدنی کے متعدد ذرائع یا فت کی بہت سی راہیں تھیں۔

خواجہ صاحب بہت محنتی آدمی تھے۔ گھنٹوں مسلسل کام کرتے۔ مگر اُن کی طبیعت میں استقلال نہ تھا۔ کوئی کام شروع کیا کچھ دن بڑا زور شور اور ہماہمی رہی۔ مگر پھر وہ جوش سرد پڑ گیا اور اُسے چھوڑ کر کسی دوسرے کام کا آغاز فرما دیا۔

ضرورت مندوں اور پریشان حالوں کی افسروں اور عہدیداروں کے یہاں سعی سفارش کرنے میں خواجہ صاحب بڑی فراخدلی سے کام لیتے۔ اور ہمدردی کا جذبہ اُن کی شخصیت کے احساس پر غالب آجاتا۔ "Self made" کی تعریف خواجہ حسن نظامی کی ذات پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ شہرت، عزت اور دولت کی اتنی ترقی اور وہ بھی اپنی ذہانت اور محنت سے حاصل کی ہوئی ترقی کم ہی دیکھنے اور سننے میں آئی ہے۔ ایک وہ دور بھی اُن پر گزرا ہے کہ "نظام الدین" سے دلی پیدل آتے تھے۔ نان بائی کے یہاں آٹا دیکر روٹیاں پکوائیں، کھایا پیا اور سرہانے تکیہ کی جگہ پتھر رکھا اور سو گئے۔ پھر وہ زمانہ بھی آگیا کہ اُن کے گھر کا خرچ تین چار ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھا۔ روپے کی تو اُن پر سچ مچ بارش ہوتی تھی۔ ملا واحدی صاحب اس کے راوی ہیں کہ ایک بار خواجہ صاحب جہانگیر آباد کے راجہ نوشاد علی خاں اور وہ حضرت سلطان جیؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے لئے گئے۔ فاتحہ پڑھ کر واپس ہوئے تو دروازے پر جوتوں کی حفاظت کرنے والے کو کچھ دینے کیلئے خواجہ صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اتفاق سے اشرفی ہاتھ میں آگئی اور خواجہ صاحب نے وہی اشرفی جوتے والے کو دے دی — اس پر خواجہ صاحب نے کہا کہ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ میں بھی اسی طرح درگاہ شریف کے دروازے پر زائرین کی جوتیوں کی رکھوالی کر کے چند پیسے کما لیا کرتا تھا اور اب اللہ تعالیٰ کی دین کا یہ حال ہے کہ میں ایک اشرفی جوتے والے کو انعام میں دے سکتا ہوں۔

کتابوں کی تصنیف کا کام وہ زیادہ تر آخری شب میں کرتے۔ پانوں کے بہت شوقین تھے۔ پان کے بڑے بڑے خاصدان میں بھرے رکھے رہتے اور وہ لکھنے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے پان چباتے جاتے۔ کہتے تھے کہ میں اپنے جسم کی وزن سے زیادہ مقدار میں تمباکو اب تک کھا چکا ہوں۔

خواجہ صاحب کا شمار اُردو زبان کے محسنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ کم و بیش ساٹھ سال تک اُن کے قلم نے اُردو زبان کی خدمت کی ہے۔ وہ ایک صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ سلاست روانی اور سادگی تو اُن کے انداز تحریر اور اسلوب نگارش پر قربان ہو جاتی۔ بات میں بات نکالنے اور نکتہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر تحریر میں تکلف اور آورد پیدا نہ ہوتی۔ دس بیس نہیں چھوٹی ہوٹی سینکڑوں کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کے ساتھ نہ اُن کی شہرت گئی، نہ مال و دولت نے قبر میں اُن کا ساتھ دیا، نہ بڑے آدمیوں سے روابط و تعلقات اور مریدوں کی عقیدت نے اُن کی رفاقت کی۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، صرف اعمال اُن کے ساتھ گئے۔ ہر شخص کے ساتھ یہی کچھ پیش آنا ہے۔ اس قلب کی غفلت و بے حسی کو کیا کہئے جسے کسی کی موت پر بھی آخرت کی جواب دہی کا خیال نہ آئے۔

مدیر "فاران" کے نام

مکرمی! ماہر القادری صاحب! خدا مجھے اور آپ کو پھر کاروانِ حجاز کی شرکت کا موقع عطا فرمائے۔ آمین۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ! یہ کیسی وعدہ خلافی یا بلفظ دیگر مجھ پر جفا ہے کہ کاروانِ حجاز طبع بھی ہوا شائع بھی ہوگیا اخباروں میں اس پر تبصرے بھی ہونے لگے اور مجھے اب تک اس کی زیارت نہ ہوئی۔ مشرقی پاکستان اور سفر رنگون و برما سے واپسی پر ایک دوست کا خط ملا جس سے پتہ چلا کہ کاروانِ حجاز طبع ہو کر لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے اور اس میں ایک جگہ میرا بھی ذکر آگیا ہے۔ مگر جس جگہ کا پتہ دوست نے دیا ہے وہاں میرا نام شاید غلطی سے لکھا گیا ہے۔

صفحہ ۹۵ پر لکھا گیا ہے کہ:۔

"مولانا ظفر احمد عثمانی سے میں نے کہا کہ یہ حدیث "من حج البیت ولم یزرنی فقد جفانی" (جس شخص نے بیت اللہ کا حج کیا اور میری زیارت نہ کی اس نے مجھ پر ظلم کیا) درایت کی رُو سے مجھے حضور رحمۃ للعٰلمین کی شانِ مروت سے کچھ بعید سی معلوم ہوتی ہے۔ میری اس رائے سے مولانا موصوف نے اتفاق کیا بلکہ میرے مُنہ سے "مروت" کا لفظ پوری طرح نکلا بھی نہ تھا کہ اُن کی زبان نے تقدیم کی"

مجھے یہ گفتگو بالکل یاد نہیں ممکن ہے مولانا ظفر احمد انصاری سے گفتگو ہوئی ہو اور غلطی سے بجائے انصاری کے عثمانی لکھ دیا گیا ہو۔ اور اگر واقعی مجھ سے گفتگو ہوئی تھی تو غالباً جناب کو میری تقریر محفوظ نہیں رہی۔ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ میں نے یہ کہا ہو گا کہ حدیث میں جفا سے مراد ظلم نہیں بلکہ بے مروتی ہے۔ عربی میں "جفا" و "جفوۃ" کا اس معنی میں استعمال بکثرت ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت بلال رضی اللہ عنہ ملک شام میں رہنے لگے اور عرصہ تک مدینہ نہ آئے تو ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ فرما رہے ہیں ماھذہ الجفوۃ یا بلالؓ اما آن لک ان تزورنی۔ اے بلالؓ یہ کیسی بے مروتی ہے کیا اب بھی تم کو میری زیارت کی فرصت نہیں ملی؟

مطلب حدیث کا یہ ہے کہ جس نے حج کیا اور اس کو مدینہ آنے کی وسعت اور طاقت بھی تھی پھر بھی نہ آیا تو اس نے مجھ سے بے مروتی کی۔ اور اس میں کیا شبہ ہے کہ اس قدر قریب پہنچ جانے کے بعد بھی باوجود وسعت اور طاقت کے مدینہ جانے کا داعیہ پیدا نہ ہو۔ تو یہ سخت بے مروتی اور تعلق محبت کے بالکل خلاف ہے۔ بہر حال میں نے یہ کہا ہو گا کہ حدیث میں خلاف درایت کوئی بات نہیں کیونکہ یہاں جفا سے ظلم مراد نہیں بلکہ بے مروتی مراد ہے۔ اس سے تو حضورؐ کی شانِ رحمت و رافت کا ظہور ہو رہا ہے کہ تنہا عشاق ہی در دولت کی حاضری کے مشتاق نہیں بلکہ خود محبوب بھی اپنے چاہنے والوں سے ملنا اور اُن کا سلام و کلام سننا چاہتے ہیں۔

اگر میں اس حدیث کو خلافِ درایت سمجھتا تو اپنی کتاب اعلاء السنن کے باب الزیارۃ النبویہ میں یہ حدیث تاکید زیارت قبرِ نبوی کی حجت میں کیوں پیش کرتا۔ حالانکہ یہ حدیث اس کتاب میں موجود اور اس کی مفصل تقریر حاشیہ میں مذکور ہے۔ جس کا خلاصہ

بیان کر چکا ہوں۔ مہربانی فرما کر میرا یہ خط "فاران" کی کسی قریبی اشاعت میں چھاپ دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کو غلط فہمی نہ ہو۔ اور "کاروانِ حجاز" کا ایک نسخہ بھی بھیج دیا جائے۔ والسلام۔

ظفر احمد عثمانی عفی اللہ عنہ۔ ۷۔ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ
دار العلوم اشرف آباد۔ ٹنڈو اللہ یار سندھ

جواب

جناب مکرم و محترم زید مجدکم العالی۔

السلام علیکم وعلیٰ من لدیکم! گرامی نامہ نے نوازا یاد فرمائی کا شکریہ۔ "کاروانِ حجاز" کا ایک نسخہ حاضر خدمت کیا جا رہا ہے، قبول فرمائیے

چہ کند بے نوا ہمیں دارد

میں کتاب چھپنے کے بعد از خود آپ کی خدمت میں بھیج دیتا تو مسرت کا یہ موقع مجھے کہاں ملتا جواب ملا ہے کہ آپ اس علمی تبحر کے باوجود مجھ ہیچمداں کی نگارش پڑھنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرح آپ اپنے خوردوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ جزاکم اللہ خیر الجزاء۔

آپ نے کاروانِ حجاز کا جو اقتباس اپنے مکتوب میں درج فرمایا ہے اُس کا آپ ہی کی ذات سے تعلق ہے۔ ایک دن ظہر کی نماز کے بعد مدرسہ صولتیہ کے دفتر ملحقہ حرم شریف میں آپ آرام فرما رہے تھے اور وہاں میرے اور آپ کے درمیان یہ گفتگو ہوئی تھی۔ جسے میں نے اپنی کتاب (کاروانِ حجاز) میں من وعن درج کر دیا۔ میں نے اسی دن حرم شریف میں جناب ظفر احمد انصاری سے اس گفتگو کو دُہرایا بھی تھا۔

اس واقعہ میں طرفین کے بیان کی تطبیق کی یہی صورت ہے کہ میں نے جو کچھ عرض کیا اس کے بعض الفاظ آپ غالباً ٹھیک طرح سماعت نہ فرما سکے۔ اس لئے میری گفتگو سے آپ نے یہ سمجھا کہ میں "فقہ حنفی" کے صرف معنی دریافت کر رہا ہوں۔ اور میں نے آپ کے جواب سے یہ سمجھا کہ میری رائے سے آپ اتفاق فرما رہے ہیں۔

آپ کا یہ مکتوب آپ کی حسب ہدایت انشاء اللہ ستمبر کے "فاران" میں شائع کر دیا جائیگا اور "کاروانِ حجاز" کا جب کبھی دوسرا ایڈیشن چھپے گا تو یہ عبارت سرے سے حذف کر دی جائے گی!

بالکل اتفاق بلکہ توارد ہے کہ جس دن آپ کا مکتوب گرامی ملا اسی دن ماہنامہ "الصدیق" (ملتان) ڈاک سے وصول ہوا جس میں آپ کا ایک وضاحتی بیان درج تھا۔ آپ نے (غالباً) مشرقی پاکستان میں جماعتِ اسلامی کے کسی اجتماع میں تقریر فرمائی تھی۔ جو روزنامہ "تسنیم" میں شائع ہوئی تھی، جس کے بعض اجزاء کی آپ کو وضاحت اور تصحیح کرنی پڑی۔

تقریباً ایک مہینہ پہلے میرے کان تک اُڑتی اُڑتی یہ خبر پہنچی تھی کہ کراچی کے بعض حلقوں نے آپ سے اصرار کیا تھا کہ جماعت اسلامی کے خلاف آپ لب کشائی فرمائیں مگر آپ کی فراستِ ایمانی نے حقیقتِ حال کی نوعیت کو سمجھ کر اُن کی مساعی کو پروان نہ چڑھنے دیا۔

آپ کراچی تشریف لاتے ہیں مگر نیاز حاصل نہیں ہوتا۔ میرے لئے خاص اوقات میں دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ اقامتِ دین کی توفیق عطا فرمائے! اللہ کا دین آج اتنا مظلوم ہے کہ جو کوئی اسے مغلوبیت سے چھڑانے کیلئے میدان میں آئیگا اس سے قیامت کے دن باز پرس ہو گی۔ مدرسہ و خانقاہ کی دُنیا میں خاص طور سے یہ غلغلہ بلند ہونا چاہیئے کہ ہر جگہ عزیمت کی ایک لہر دوڑ جائے۔

امید کہ مزاجِ گرامی بخیر ہو گا۔ والسلام۔

طالب دعا مخلص۔ ماہر القادری
۱۳۔ ذی الحجہ ۱۳۷۴ھ

ماہر القادری

"کاروانِ حجاز" پر ایک تنقید

ہفتہ وار "صدق جدید" جو صاحب طرز نثار پرداز، مشہور اسلامی مفکر اور ہمارے واجب الاحترام بزرگ جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی ممتاز ادارت میں شائع ہوتا ہے، اس کے ۲۲- جولائی ۱۹۵۵ء کے شمارے میں میری کتاب "کاروانِ حجاز" پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ اس فاضلانہ تبصرے پر راقم الحروف کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ مقصد بحث و مناظرہ نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت ہے۔ یہ تبصرہ از اوّل تا آخر (ضروری تنقید کے ساتھ) درج ذیل کیا جاتا ہے:-

"یہ ایک شاعر کی داستانِ سفرِ حج و زیارت ہے۔ سفرِ حرمین کی روئیداد میں ہر مومن کے لئے یوں ہی جاذبیت اور دل کشی کیا کم ہے۔ چہ جائیکہ جب بیان کرنے والے کی زبان شاعرانہ ہو اور اسلوب بیان ادیبانہ اور خطیبانہ۔ کتاب کسی خشک سفرنامہ کی قسم کی نہیں۔ پُر معلومات ہونے کے ساتھ ہی سلیس، شگفتہ اور ہر طرح دل چسپ ہے۔ دینی شغف کی شہادت بھی قدم قدم پر ملتی ہے۔ گو یہ راز بھی فوراً ہی فاش ہو جاتا ہے کہ وہ دینداری عام مومن کی سی نہیں "جماعتِ اسلامی" کی مخصوص قسم کی ہے"۔

فاضل تنقید نگار نے خط کشیدہ جملہ لکھ کر کتنی خطرناک قسم کی غلط فہمیوں کا دروازہ کھول دیا ہے۔ جو لوگ "صدق جدید" کی پالیسی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی رائے پر اعتماد رکھتے ہیں وہ اس تنقید کو پڑھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے کہ "جماعتِ اسلامی" عام مسلمانوں سے الگ کوئی دینی مسلک رکھتی ہے اور "کاروانِ حجاز" کا مصنف بھی عام مسلمانوں کے مقابلہ میں کوئی "نرالا مسلمان" اور "مخصوص قسم کا دین دار" ہے۔ اور اس کتاب میں مصنف کے دینی شغف کی شہادت جو قدم قدم پر ملتی ہے وہ بھی ایک "راز" ہے جو آگے چل کر فوراً ہی فاش ہو جاتا ہے! ——— "صدق جدید" کے قلم کی ان جراحتوں کی فریاد ہم کس سے کریں ان چرکوں اور زخموں کو کس کے پاس لے کر جائیں، سوائے اس کے کہ اپنا غم اپنے اللہ کے سامنے بیان کر دیں کہ وہی نیتوں کا جاننے والا ہے اور اسی کا حکم اور فیصلہ برحق ہے۔

"کاروانِ حجاز" میں غالباً اس عبارت کو پڑھ کر فاضل ناقد کو طیش آ گیا:-

"بہاولپور کے ایک جج صاحب بھی اس جہاز میں ہیں، دینی شغف رکھتے ہیں، اہلِ خلوص اور صاحب ایثار بھی ہیں۔ چکر، متلی اور دردِ سر کا کوئی مریض آتا ہے تو خوشی سے مُفت دوا دیتے ہیں مگر افسوس ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کا شکار ہیں جو دیوبند کے بعض علماء کے فتووں اور مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق" کی تحریروں نے پھیلا رکھی ہیں۔ میں نے ان غلط فہمیوں کے دُور کرنے کی کوشش کی تو بات بڑھنے لگی۔ میں نے آخر میں عرض کیا کہ آپ ان عالموں کے فتووں پر نہ جائیے۔ اگر تحقیق مقصود ہے تو مولانا مودودی کی کتابیں خود پڑھیے اگر ان میں آپ کو بے دینی کی باتیں نظر آئیں تو ان کتابوں کو بلاتکلف جلا دیجئے۔ اور

اُن میں دین کی باتیں نظر آئیں تو پھر اپنی رائے بدل دیجئے ورنہ اس بدگمانی اور سوءِ ظن پر آپ سے مواخذہ ہوگا۔" (صفحہ ۱۵)
کوئی یہ تو کہہ سکتا ہے کہ "لکھنے" والے کی یہ رائے درست نہیں ہے۔ مگر یہ جملے مصنف کی "مخصوص دین داری" کا ماذہ ہرگز فاش نہیں کرتے۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ دارالعلوم دیوبند سے "ردِ مودودیت" کے نام سے کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں اور حضرت شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی تو کئی سال سے "جماعت اسلامی" کے استیصال ہی کے جہاد میں مصروف ہیں۔ مولانا مدنی کے نزدیک "باطل" صرف انگریز کا نام تھا، وہ ہندوستان سے رخصت ہوگیا۔ اب ہندوستان میں "حق" کا دَور دورہ ہے! اب باطل "جماعت اسلامی" کا وجود ہے جس کے مٹانے کیلئے وہ اور اُن کے معتقدین اور ہوا خواہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ انگریزی راج باطل کا صنم تھا تو ہندو راج "صنمِ اکبر" ہے۔ مگر اُس سے ٹکرانے میں تو طرح طرح کے خطرے ہیں۔ اس لئے مولانا مدنی کا جذبۂ جہاد اور باطل سے ٹکرانے کی جرأت "جماعتِ اسلامی کی طرف مڑ گئی ہو کہ اس "جہاد" میں ایک پھانس کے چبھنے کا خطرہ بھی نہیں ہے!

ہفتہ وار "صدق" کے صفحات گواہ ہیں کہ جماعتِ اسلامی کی تخفیف، تضحیک، اور اسے دوسروں کی نگاہوں میں مشتبہ اور بے وزن ٹھہرانے میں مولانا عبدالماجد دریا بادی قبلہ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ چٹکیوں سے لے کر نشتر زنی تک ہر حربہ مولانا موصوف نے استعمال کیا ہے! قادیانی جن کو وہ خود گمراہ بھی سمجھتے ہیں اُن تک کے معائب سے وہ صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ مگر جماعتِ اسلامی اور اس کے اکابر کے کسی اچھے کام کی کبھی کبھار تحسین فرماتے بھی ہیں تو چٹکی بغیر لئے رہ ہی نہیں سکتے اور اس مٹھاس میں تیزاب کی کچھ بوندیں ملا ہی دیتے ہیں۔ قادیانیوں کا کوئی رسالہ یا کتاب اُن کی نظر سے گزرتی ہو تو اس کیلئے قلم سے زبان تک ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

بن جاتے ہیں۔ قادیان کے نبیٔ کاذب کے خود ساختہ خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود نے یورپ میں جو بیان دیا تھا اُس کے اقتباس کو "صدق جدید" میں اس تحسین آمیز انداز میں نقل فرمایا گیا ہے، گویا مولانا دریا بادی قادیانیوں کی تحسین و ستائش کے موقعے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

ہندوستان میں مزارات پر جو بدعات ہوتی ہیں اسے ہر کوئی جانتا ہے اور دیوہ شریف میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ان سب سے بڑھا ہوا ہے۔ پاکستان کے گورنر جنرل مسٹر غلام محمد دیوہ جاتے ہیں اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کو یاد فرماتے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں مولانا موصوف نے جو تفصیل "صدق جدید" میں درج کی ہے۔ اُس میں یہ جملہ بھی نظر سے گزرا۔ "اور اپنے[1] عقائد کے وہ ذمہ دار ہیں"۔ ابھی حال ہی میں مولانا موصوف نے پاکستان کا جو سفر فرمایا تھا اور اس کے ڈھائی ہفتے کے سفر و قیام کی جو روداد "صدق جدید" میں چھپ رہی ہے۔ اُس سلسلہ میں گورنر جنرل ہاؤس کی ایک دعوت کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر کھوڑو کے بارے میں لکھتے ہیں"۔ "اور[2] آدمی تو وہ اچھے ہی نظر آئے"۔ اس کے عقیدے چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں، کسی کی پچھلی زندگی چاہے کیسی ہی رہی ہو اور اس کا حال بھی ماضی سے مختلف نہ ہو۔ اس کے استبداد اور سیاسی چانبازیوں کی روایتوں کو چاہے تواتر کا درجہ کیوں نہ حاصل ہو گیا ہو۔ مگر صرف اس کی ظاہری تواضع کو دیکھ کر مولانا عبدالماجد دریا بادی کو اُس میں اچھائی ہی اچھائی نظر آنے لگتی ہے۔ لیکن جماعتِ اسلامی کے اکابر کی زندگیوں کے بارے میں چاہے کیسی ہی اچھی اطلاعات سمع ہمایونی تک کیوں نہ پہنچتی ہوں مگر اُن کی کسی بھول چوک پر جاں بخشی نہیں ہو سکتی۔ اور

---

[1] لفظاً لفظاً یہ جملہ ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ قریب قریب یہی مفہوم تھا (م-ق) [2] اصل مضمون میرے سامنے نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی لفظ ادھر اُدھر ہو گیا ہو۔ (م-ق)

وہ نگاہ جو دُوسروں کے لئے اور خاص طور سے مسلمان اربابِ اقتدار کے لئے "حسن بیں" ہوتی ہے۔ جماعت اسلامی کے حق میں عیب جو بن جاتی ہے ـــــ حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی قدس سرہٗ آج زندہ ہوتے تو اُن کی خدمت میں ہم فریاد لے کر جاتے کہ حضرت! آپ کے بعض وابستگان اور تربیت پائے ہوؤں کی روش سے آپ کی تعلیم و تربیت پر حرف آ رہا ہے!

"جماعتِ اسلامی" کو "مولانا مودودی کی جماعتِ اسلامی" لکھ کر مولانا دریابادی جماعت کو بے وقار بنانے اور اُس کی ساکھ گرانے کی کیسی بھرپور کوشش فرماتے ہیں۔ اب سے تیس سال قبل اگر کوئی "خلافت کمیٹی" کو "محمد علی شوکت علی کی خلافت کمیٹی" لکھ دیتا تو مولانا دریابادی کیا اس زہر میں بجھی ہوئی طنز کو گوارا فرما لیتے!

کرنل ناصر پر گولی چلنے کے واقعہ کے بعد "اخوان المسلمین" پر مصر میں جو ظلم و ستم توڑے گئے ہیں تو صرف اس جرم میں کہ جماعت اسلامی اور اخوان المسلمین کے درمیان مسلک کی مشابہت پائی جاتی ہے۔ اخوان المسلمین کی مظلومیت بھی مولانا دریابادی کی طنز سے نہ بچ سکی۔ اور اس کے بعد راغب احسن صاحب (ایم اے) نے جب اخوان المسلمین کو سراہا اور جماعتِ اسلامی پر سب و شتم کی بوچھاڑ فرمائی اور یہ بتایا کہ "اخوان المسلمین" تو بہت بلند اور مخلص جماعت ہے، جماعتِ اسلامی جیسی دشمنِ اسلام جماعت سے اس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے ـــــ تو اس مراسلہ کو بھی "صدق جدید" میں شائع فرما دیا گیا۔ افراد اور جماعتوں سے ایسی کدبہت ہی کم دیکھنے میں آئی ہے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی کی ہر بات میں تشدد نظر آتا ہے اور اپنے "تشدد" کی طرف بھولے سے بھی نگاہ نہیں جاتی۔

جماعت اسلامی سے "خارجیت" کا انتساب بھی غالباً مولانا عبد الماجد دریابادی کی شوخیٔ فکر کا شاہکار ہے۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی مولانا موصوف اپنے ہی کو "مظلوم" سمجھتے ہیں اور یہ بھی کہ جماعت کے بارے میں اُن کی روش بہت محتاط، متوازن اور معتدل رہی ہے اور یہ تو وہ رواداری اور عالی ظرفی سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ یہ "خوارج" تو اس قابل تھے کہ ذوالفقار اُن کی خبر لیتی۔

> "کتاب شروع سے آخر تک مسلسل چلی گئی ہے، بغیر کسی باب و فصل میں تقسیم ہوئے۔ اب خدا معلوم تصنیفی اعتبار سے یہ عیب ہے یا ہنر ـــــ بہ ظاہر تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی لمبی تقریر بغیر دم لئے بے تکان کئے چلا جائے۔" (صدق جدید)

حالانکہ کتاب شروع سے آخر تک مسلسل نہیں چلی گئی۔ اس میں دو چار نہیں پچیس[۲۵] ابواب، و فصول ہیں۔ فاضل ناقد کو ہم اُن کی اس "گرفت" پر کیا کہیں، سوائے اس کے کہ اُن کے ذہول و نسیان کے دُور ہو جانے کی اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

> "کتاب کے نام پر بھی طبیعت رُکی۔ سفرِ حجاز یا سفر نامہ حجاز کیلئے "کاروانِ حجاز" کی معنویت تک ذہن کی رسائی[۱] خوب نہ ہو سکی۔" (صدق جدید)

یہ اپنے اپنے وجدان کی بات ہے۔ کتاب کے نام پر تنقید نگار کی طبیعت رُکی تو اُسے رُکنے اور غور و تامل کرنے کا حق پہنچتا ہے مگر "کاروانِ حجاز" پڑھتے اور سنتے ہی ہر قاری اور سامع کا ذہن کسی توقف کے بغیر اس معنویت تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کتاب میں "حجاز" کا تذکرہ ہو گا۔

---

[۱] "ذہن کی رسائی خوب نہ ہو سکی" ـــ "ذہن کی رسائی اچھی طرح نہ ہو سکی" لکھنا تھا۔ "خوب" یہاں کھٹکتا ہے۔ (م۔ق)

"ماہر صاحب زبان وادب کے سخت گیر نقادوں میں ہیں۔ اردو سروں کی نوک پلک تک میں اگر فتور پاتے ہیں تو اُسے بخشتا نہیں جانتے۔ لیکن خدا معلوم اپنی عبارت کی جانچ پڑتال ...... میں اس بلا کی رواداری اُن میں یہ کہاں سے آگئی۔ سوا اس کے کہ ع

بُردم گماں بہ ہر کس و بر خود گماں نہ بود

"ہر ایک" کے بجائے ہر کسی اور ہر کوئی اور "بہت" یا "زیادہ" کے معنیٰ میں "کافی" وہ برابر لکھتے گئے ہیں۔ امتلاء کو وہ "متلی" کا مرادف سمجھتے ہیں ...... الخ (صدق جدید)

فاضل ناقد نگار نے یہ تو درست لکھا ہے کہ میں (ماہر) تنقید کے معاملہ میں سخت گیر واقع ہوا ہوں اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان دنوں عام طور پر ادیب و شاعر زبان کے معاملہ میں احتیاط نہیں برتتے۔ اس لئے مرض کی شدت کو دیکھ کر اس کے ازالہ کے لئے اسی شدت کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ مگر میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مجھ سے زبان و بیان میں کوئی غلطی ہی نہیں ہوتی۔ "فاران" کے صفحات شاہد ہیں کہ میں نے کئی بار لکھا ہے۔ "غلطی کس سے نہیں ہوتی .... خود ناقد اس سے کب محفوظ ہے"۔ پھر مجھ سے جب کبھی تنقید میں بھول چوک ہوئی ہے اور مجھ پر میری یہ لغزش واضح کردی گئی ہے تو میں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے!

"ہر ایک" کے بجائے "ہر کسی" اور ہر کوئی اور "بہت" یا "زیادہ" کے معنیٰ میں "کافی" وہ برابر لکھتے گئے ہیں۔ (صدق جدید)

فاضل ناقد کو صفحہ اور سطر کا حوالہ دے کر بتانا تھا کہ کہاں کہاں "ہر کسی" اور "ہر کوئی" غلط استعمال ہوا ہے۔ عام طور پر یہ الفاظ مرادف ہی بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً:۔

"ہر کسی کے پاس تمہاری جیسی عقل کہاں پائی جاتی ہے"۔

اس جملہ میں "ہر کسی" کے بجائے "ہر ایک" رکھ دیں تو مفہوم میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح:۔

"اُن کے یہاں ہر کوئی آسکتا ہے"۔

میں "ہر کوئی" کی جگہ "ہر ایک" لکھیں اور بولیں تو جملہ میں ذرا سا بھی جھول نہیں آتا۔

اردو زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو دوسری زبانوں سے آئے ہیں یا لئے گئے ہیں۔ مگر اُن کا مفہوم بالکل بدل گیا ہے۔ مثلاً۔ ریل (Rail) انگریزی میں پٹری کو کہتے ہیں اور اردو میں "ریل" ٹرین کے معنی میں بولتے ہیں اور یہی روزمرہ ہے۔ اسی طرح "غلیظ" عربی میں گاڑھے (رقیق کی ضد) کو کہتے ہیں۔ مگر اردو میں "غلیظ" میلے (Dirty) کو کہتے ہیں۔ اسی طرح عربی تلفظ میں "سید" کی "ی" پر زیر ہے۔ مگر اردو میں اس کا تلفظ "سیّد" (بالفتح) ہے ــــ "کافی" عربی میں بیشک "کفایہ" (کسی چیز کا کافی ہونا ــــ Sufficient) سے مشتق ہے مگر اردو روزمرہ میں "کافی" بہت اور زیادہ کے معنیٰ میں بولا اور لکھا جاتا ہے۔ مثلاً۔

"حلوہ کافی گرم ہے ــــ میں کافی دیر سے بیٹھا ہوا تمہارا انتظار کر رہا ہوں ــــ یہ کُرتہ کافی ڈھیلا ہے ......"

فرہنگِ آصفیہ جو اردو زبان کی مستند ترین لغت ہے اُس میں "کافی" کے معنیٰ "وافر اور بہت" بھی لکھے ہیں۔ اور نور اللغات میں بھی جو فرہنگ آصفیہ کے بعد مدوّن ہوئی ہے اس لفظ (کافی) کے یہ معنیٰ (وافر اور بہت) بھی درج ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی یا "صدق جدید" کا ادارۂ تحریر اگر "کافی" کو ٹھیک عربی مفہوم میں بولتا اور لکھتا ہے تو اُس کی اس احتیاط پر ہم کوئی اعتراض نہیں کرتے مگر اپنی شدتِ احتیاط کی بنا پر وہ اردو کے روزمرہ کو غلط کہنے کا حق نہیں رکھتا۔

"امتلا کو وہ "متلی" کا مرادف سمجھے ہیں"۔ (صدق جدید)

اگر زبان کے معاملہ میں قیاس کے مقابلہ میں "سماع" کو فوقیت حاصل ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے "متلی" کے معنی میں "امتلاء" عوام اور پڑھے لکھے طبیبوں تک کو بولتے سنا ہے۔ عربی میں بیشک "امتلاء" کے معنی "پُر شدن" کے ہیں مگر ....

"و در عرف بسیار پُر شدن معدہ از غذا و بدہضمی" (غیاث اللغات)

کے بھی ہیں۔ متلی بدہضمی کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔ اسی نسبت سے متلی کو "امتلاء" بھی بولنے لگے۔ "فرہنگ عامرہ" (صفحہ ۵۰) میں "امتلاء" کے معنی "ابکائی" کے لکھے ہیں اور ڈپٹی نذیر احمد نے توبۃ النصوح (صفحہ ۱۷۔ سطر ۳۔ حاجی فرمان علی اینڈ سنز لاہور) میں لکھا ہے۔ "جو لوگ اس کی علالت کو سوءِ ہضم اور امتلاء کی وجہ سے تجویز کرتے تھے ...."

"استمداد و استعانت کے ساتھ فعل وہ بجائے "کی" کے "چاہی" لاتے ہیں (گویا استمداد امداد کے اور "استعانت" اعانت کے مترادف ہے)" (صدق جدید)

یہ گرفت درست ہے اور اپنی اس بھول چوک کا ہم کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔

"بہتوں" کے بجائے "بہت سوں" کا استعمال اُن کے ہاں اب بھی جائز ہے" (صدق جدید)

"بہت سوں" متروک کب ہو گیا ہے جو اس کے استعمال پر "اب بھی جائز ہے" کی طنز فرمائی گئی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ "بہتوں" کم اور "بہت سوں" کا استعمال دورِ حاضر میں زیادہ ہوتا ہے۔ غالباً فاضل تنقید نگار روزنامہ "زمیندار" کے اُس اشتہار سے متاثر معلوم ہوتے ہیں جس کا عنوان ہے:۔

"اس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا"

ہم نے کراچی میں دسیوں اہلِ زبان اور اہلِ قلم سے دریافت کیا۔ ایک دو نے قدرے تذبذب کا اظہار فرمایا باقی سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ "بہت سوں"، "بہتوں" کے مقابلہ میں فصیح تر اور کثیر الاستعمال ہے۔

"ایک جگہ لفظی ترجمہ کی حد کر دی ہے۔ مسلم لیگ کے "ارکان" کے بجائے مسلم لیگ کے "کھمبوں" کا لفظ بغیر ہنسے ہوئے استعمال کیا ہے" (صدق جدید)

تنقید نگار نے حیرت ہے "کھمبوں" کی طنز اور واقعیت کو محسوس نہیں کیا اور اس لفظ کو "ارکان" کا لفظی ترجمہ سمجھ لیا۔ اصل عبارت یہ ہے:۔

"ہندوستان اور پاکستان میں جو کچھ اس وقت تک ہوا ہے اگر اس کے سوویں حصّہ کا بھی مسلمانوں کو علم ہوتا تو مسلم لیگ کے کھمبوں کو ووٹ کون دیتا"

مسلم لیگ نے تقسیم ہند سے قبل اسمبلیوں کے لئے جب اپنے نمائندے کھڑے کئے تھے تو بعض نمائندے عوام مسلمانوں میں مقبول نہیں تھے۔ اس پر عوام نے لے دے کی تو مسٹر محمد علی جناح مرحوم نے فرمایا کہ مسلم لیگ پر عوام کو اعتماد کرنا چاہیئے۔ اور وہ کسی "Lamp-post" کو بھی کھڑا کرے تو قوم کا فرض ہے اسے ووٹ دے "کھمبا" اسی "Lamp-post" کا ترجمہ ہے۔ "رکن" کا ترجمہ نہیں ہے۔

"امیر الحج یا امیر الحجاج کے بجائے "امیر الحاج" ایک عامیانہ غلطی ہے۔ لیکن بے تکلف اس کتاب میں دُہرائی گئی ہے"

"امیر الحاج" عامیانہ غلطی نہیں ہے۔ یہ ہر اعتبار سے درست ہے بلکہ قرآنی اسلوب کے عین مطابق ہے "اجعلتم سقایۃ الحاج"

(سورۂ توبہ) "حاج" یہاں اسم جمع ہے جو "حجاج" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

"مساعدت کرنا اُردو میں اب تک "وقت" یا "حالات" یا "زمانہ" کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔
ماہر صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کے لئے دعا کے موقع پر لکھا ہے۔ "اللہ تعالیٰ اس کی مساعدت
فرمائے" (صدق جدید)

"مساعدت" اُردو میں صرف زمانہ اور وقت کے ساتھ مخصوص ہو کر نہیں رہ گیا ہے! عربی میں "مساعدت" مدد کرنے اور فارسی زبان کے "یاری کردن" کے معنی میں بولتے ہیں۔ اور اُردو میں بھی اسی معنی میں اس کا استعمال غلط تو کیا محل نظر بھی نہیں ہے۔

اصل عبارت یہ ہے:۔

"بھائی کو قوتِ بازو کہا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ ہر بھائی قوتِ بازو نہیں ہوتا۔ لیکن
اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ مسرور سچ مچ میرا "قوتِ بازو" ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی
مساعدت فرمائے"

"قوتِ بازو" کے ساتھ "مساعدت" کا استعمال یہاں کتنا موزوں بلکہ حسین تر ہے۔ چہ جائیکہ اس پر اُلٹی گرفت کی جائے۔

"اور یہ مثالیں صرف نمونہ کے طور پر درج ہیں۔" (صدق جدید)

"صدق جدید" کے ناقد نے جو مثالیں پیش کی ہیں۔ اُن کا بود اپن ناظرین نے دیکھ لیا۔ فاضل نقاد نے بڑی رواروی میں تبصرہ کیا ہے۔ اور زبان و بیان کی گرفت میں احتیاط اور غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ جو اعتراض کتاب پڑھتے میں بہ یک نظر ذہن میں آیا اُسے کسی تامل کے بغیر کاغذ پر منتقل کر دیا۔ اعتراض وارد کرنے میں یہ جذبہ بھی خامۂ احتساب کے ساتھ ساتھ رہا ہے کہ ماہر القادری چونکہ سخت گیر نقاد ہے اور دوسروں کی ذرا سی بھی بھول چوک معاف نہیں کرتا۔ اس لئے اُس کی کتاب میں زبان و بیان کی غلطیاں نہ پکڑیں تو پھر "صدق جدید" کی برتری کا نقش کیسے قائم ہو گا!

آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے:۔

"جماعت اسلامی کے ایک اوچھی ہونے کی بناء پر قدرۃً قلم کبھی تیر و نشتر میں تبدیل ہو گیا ہے"۔

مگر "صدق جدید" جماعتِ اسلامی پر یلغار کرنے والوں میں جو ہراول کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اس کے قلم کی نشتر زنی اور ناوک فگنی جماعتِ اسلامی کے اس "اوچھی" کی چاند ماری سے کہیں زیادہ شدید ہے!

مثلاً یہ گرما گرم فقرے:۔

"اس راستہ میں ابو جہل اور عتبہ ہی نہیں عبد اللہ بن ابی اور جمال ناصر بھی ملیں گے!"

اور

"ظالم ناصر کا دل نہ پسیجا۔ اُس نے اخوان کے معاملہ میں جس درندگی اور شقاوت کا ثبوت دیا وہ انسانی تاریخ کی دردناک ٹریجڈی ہے"

عبد اللہ بن ابی اور جمال ناصر کے "نفاق" اور اسلامی تحریک کے مٹانے کی کوشش اور جد و جہد میں کس حد تک مشابہت اور اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس بحث کو ہم چھیڑیں گے تو بات بہت طولانی ہو جائے گی! دوسرے جملے کے بارے میں گزارش ہے کہ "صدق جدید" کو ناصر کے ساتھ "ظالم" اور "درندگی" اور "شقاوت" کی نسبتیں نہ صرف یہ کہ کھٹکتی ہیں بلکہ تلملا دیتی ہیں۔ مگر

"اخوان" پر جمال ناصر کے حکم اور ایماء سے جو ظلم ہو رہا ہے اس پر "صدق جدید" کی نگاہ نہیں جاتی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی جو لندن کے نگار خانوں اور پیرس کے ننگے کلبوں تک کی خبر رکھتے ہیں اور وہ یہ اعداد تک فراہم کر لیتے ہیں کہ انگلستان میں عورتوں کے بناؤ سنگھار پر کتنے کروڑ ڈالر کی رقم ایک سال میں خرچ ہوتی ہے۔ حیرت ہے کہ "اخوان" پر جمال ناصر کی حکومت کے مظالم سے وہ بے خبر ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جمال ناصر نے درندگی اور سفاکی میں نیرو اور حجاج کو کوسوں پیچھے چھوڑ دیا ہے!

یہ عجیب قسم کا انصاف ہے کہ حکمران طبقہ کے مقابلہ میں مسلمان عوام کو "رحماء بینھم" کی تلقین کی جاتی ہے۔ مگر حکمران گروہ اسلام پسند افراد کے حق میں "اشداء علی الکفار" بھی بن جائے تو بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج کو "خارجیت" سے تعبیر کیا جاتا ہے! اور ان زیادتیوں پر تنقید "طبع نازک" پر گراں گزرتی ہے۔

"عبداللہ کو شرق اردن کی امارت مل مگر یہ عبداللہ! (اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اس کی ایک بھی مثال نہ پیدا کرے) مرے ہوئے کے لئے ہم اس سے زیادہ اور کیا کہیں!!"

جو لوگ شریف حسین کے بیٹے عبداللہ کی کارستانیوں سے واقف ہیں کہ تنہا اس کی ذات سے عرب دنیا کو کتنا نقصان پہنچا ہے اور اس کی ہوس اقتدار نے کیا گل کھلائے ہیں۔ ان کو تو اس جملہ کی ایجاز و اشاریت اور صاف گوئی واقعیت نگاری کی شاید تحسین کرنی چاہیئے تھی! "اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں اس کی ایک بھی مثال پیدا نہ کرے" اس جملہ میں آخر کیا چیز "صدق جدید" کے ناقد کو کھٹکی۔ کیا اس کی خدا نخواستہ یہ رائے ہے کہ عبداللہ جیسے امیر اور حاکم مسلمانوں میں پیدا ہوتے رہیں۔

"بہ حیثیت مجموعی کتاب دینی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے بلند پایہ اور قابل مطالعہ ہے۔" (صدق جدید)

اس خورد نوازی اور حوصلہ افزائی کا نا محدود شکریہ! اللہ تعالیٰ مجھے غرور نفس سے بچائے رکھے اور ان حوصلہ افزائیوں پر تحدیث نعمت کے سوا، اور کوئی جذبہ پیدا نہ ہونے پائے۔ (آمین)

عقیل خیر آبادی

فکرِ ہوش

سر سے ہو "سوا نیزہ" یہ خورشیدِ مبیں ۔ اور
فرمارہے ہوں "جوشِ میاں"[1] تاب نہیں اور

افرادِ تجدد کو یہ شاید نہیں معلوم
آتا ہے نظر فاصلہ سے جہل حسیں اور

تعلیم کے منبر سے اذاں دیتا ہے کوئی
قرآن پڑھے جتنا بڑھے اُتنا یقیں اور

تحقیق کہ اسلام ہے تصدیقِ مسلسل
ہاں ایک ہے بس ایک، نہیں جہلِ متیں اور

یہ رشتۂ الہام ہے وہ کشتۂ اوہام
مسلم کا یقیں اور ہے مشرک کا یقیں اور

یہ نقل ہے ادراک کی وہ اصل میں ادراک
مجذوب و منافق کا زماں اور زمیں اور

خورشید کو دیکھا ہے کبھی ابر کی زد میں
ایمان نظر آتا ہے ظلمت میں حسیں اور

ہاں تشنۂ تکمیل بھی "انگشتِ شہادت"
درکار تھا اک خاتمِ عالم کو نگیں اور

سب "فاعتبروا یا اولی الابصار" کے باغی
اکبار ہوں یہ برسرِ زیں، زیرِ زمیں اور

لو جھک گئی وہ گردنِ گردوں سرافراز
اب "مارکس" کا در اور ہے "لینن" کی جبیں اور

"وادیِ ہیمون" کے اے شاعرِ بدمست
ہذیان ترا اور ہے جبریلِ امیں اور

"جوش" اپنے ہی الفاظ میں کھوجاتا ہے اکثر
کہتے ہوئے یہ شعر وہ شاید تھا کہیں اور

"یہ ساجدِ ذرات وہ مسجودِ کواکب
مومن[2] کی جبیں اور ہے کافر کی جبیں اور"

نو بہ نو

ماہر القادری

میکدے بھی وہی رقص خانے بھی ہیں
کچھ نئے بُت ہیں اور کچھ پُرانے بھی ہیں

وہ یہ کہتے ہیں ہم بھی ہیں اہلِ وفا
اس حقیقت میں شامل فسانے بھی ہیں

اُن کے جور و جفا، اُن کے ظلم و ستم
یاد رکھنے بھی ہیں بھول جانے بھی ہیں

اے مرے ساتھیو! اے مرے دوستو!
راہ چلنی بھی ہے زخم کھانے بھی ہیں

بندگانِ شکم کی جبیں کے لئے
بارگاہیں بھی ہیں آستانے بھی ہیں

ہم نشینو! غنیمت ہے اس دور میں
سَو قفس ہیں تو چار آشیانے بھی ہیں

اللہ اللہ! مرے سازِ دل کی نوا
اس میں نالے بھی ہیں اور ترانے بھی ہیں

۱۔ جوش ملیح آبادی کی نظم کے جواب میں۔ ۲۔ جوش صاحب نے اپنی پیشانی پر جبینِ مومن کا قیاس کیا ہے۔ حالانکہ جو خدا کے سوا اور کسی کے آگے سجدہ گزار ہو وہ سرے سے مسلمان ہی کب ہے۔ (م۔ق)

تبرکات

نہالؔ سیوہاروی (مرحوم)

وہ اُمنگیں وہ تڑپ وہ آرزو باقی نہیں — اے دلِ بیتاب باقی ہے کہ تُو باقی نہیں
زندگی ہے دو مرے لفظوں میں سوزِ آرزو — زندگی کیا ہے جو سوزِ آرزو باقی نہیں
لاج اس جامِ تہی کی اے خدائے کائنات — دل تو باقی ہے شرابِ آرزو باقی نہیں

جذبہ پیکار آدم رہ نہیں سکتا خموش
دوستوں سے جنگ ہوگی گر عدو باقی نہیں

دریا بہ حباب اندر

جناب ہاشمی بی اے

نہیں چلے گی یہ بادشاہی جو آج زردار کر رہے ہیں — ہم اپنے نعروں سے ابنِ آدم کو آج بیدار کر رہے ہیں
مٹے گی ظلمت کی سحرکاری جہاں کو پھر روشنی ملے گی — جہاں کی تاریک وسعتوں کو ہم آج ضوبار کر رہے ہیں
کہاں ہیں رہوارِ جہل و عصیاں سبک روی دیکھنا ہے اُن کی — ہم اپنے سیدھے سادے عزائم کو برق رفتار کر رہے ہیں
جہاں کی تخریب میں ہے مضمر جہاں کی تعمیر ہیر ہمدم — اسی لئے ہم نظامِ کہنہ کو آج مسمار کر رہے ہیں
نئے ہیولائے آب و گِل میں ہمارا ذوقِ نظر تو دیکھو — خرد سے آگاہ کر رہے ہیں جنوں سے بیزار کر رہے ہیں

زکی زاکانی

کس طرح بنی آنکھ مری حُسن کی تصویر — چرچے ہیں اسی بات کے اربابِ نظر میں
تُو داغِ محبت کو جگرتاب کئے جا — شاید کہ تری شام بدل جائے سحر میں
اے اہلِ چمن! کارِ نشیمن میں کہاں لطف — تاثیر ہو برفاب کی جب برق و شرر میں
اِک اشک لرزتا سا مری نوکِ مژہ پر — اِک برق تڑپتی سی مرے دیدۂ تر میں
کب آؤ گے تم بزم میں گلزار بداماں — کب رنگ بھرو گے مری تصویرِ نظر میں

محمد علی خاں اثرؔ رامپوری

مرا دردِ دل خدارا نہ سنو مری زبانی — کہ رُلا نہ دے تمہیں بھی مری دُکھ بھری کہانی
مجھے تنگ تر نہ ہو کیوں یہ فضائے آسمانی — مری فرع ہے زمینی مری اصل لامکانی

ترے ناز پر تصدق تری مصلحت پہ قرباں
کہ بشر کی لاج رکھ لی بجوابِ لن ترانی

روحِ انتخاب

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری ایسی تعریف مبالغہ آمیز حد سے بڑھی ہوئی نہ کرو جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا۔ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس لئے مجھے اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول کہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ مریضوں کی عیادت کرتے۔ جنازوں میں شرکت فرماتے۔ گدھے پر سوار ہوجاتے۔ اور غلاموں کی دعوت قبول فرما لیتے۔ حضورؐ بنو قریظہ کی لڑائی کے دن ایک گدھے پر سوار تھے۔ جس کی لگام کھجور کی (رسّی کی) تھی اور کاٹھی بھی اسی کی تھی۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے نزدیک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبوب کوئی شخص دُنیا میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود پھر بھی وہ حضورؐ کو دیکھ کر اس لئے کھڑے نہ ہوتے تھے کہ حضورؐ اکرم کو یہ پسند نہ تھا۔

مسروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا۔ انہوں نے میرے لئے کھانا منگایا۔ اور یہ فرمانے لگیں کہ میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاتی مگر میرا رونے کو دل چاہتا ہے اور رونے لگتی ہوں۔ مسروق نے پوچھا کہ کیوں رونے کو دل چاہتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ مجھے حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی وہ حالت یاد آجاتی ہے کہ جس پر ہم سے مفارقت فرمائی ہے کہ کبھی ایک دن میں دو مرتبہ گوشت یا روٹی سے پیٹ بھرنے کی نوبت نہیں آئی۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ مردانہ خوشبو وہ ہے جس کی خوشبو پھیلتی ہو اور رنگ غیر محسوس ہو اور زنانہ خوشبو وہ ہے جس کا رنگ غالب ہو اور خوشبو مغلوب! (مطلب یہ ہے کہ مردوں کو مردانہ خوشبو استعمال کرنی چاہیئے اور رنگ اُن کی شان کے مناسب نہیں۔ اور عورتوں کو زنانہ خوشبو استعمال کرنی چاہیئے کہ دُور اجنبیوں تک اس کی خوشبو نہ پہنچے) (مترجم)

عبدؓ اللہ ابن حارث سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہنسنا تبسم سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! آپ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:۔ "ہاں، ہاں، مگر میں کبھی غلط بات نہیں کہتا"۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ سچا کلمہ جو کسی شاعر نے کہا وہ لبید بن ربیعہ کا یہ کلمہ ہے:۔

الا کل شئ ما خلا اللہ باطل

آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ جل شانہٗ کے سوا دُنیا کی ہر چیز فانی ہے —— اور امیہ بن ابی الصلت قریب تھا کہ اسلام لے آئے!

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم لوگوں (یعنی حضورؐ کے اہل و عیال) کے یہاں ایک ایک مہینہ تک آگ نہیں جلتی تھی صرف کھجور اور پانی پر گزارا ہوتا تھا!! (شمائل ترمذی۔ اردو ترجمہ)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

پاکستان دستور ساز اسمبلی کے نئے صدر ماشاء اللہ مولوی تمیز الدین خاں سے بھی زیادہ لمبی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ ہمارے مغرب زدہ بھائی ڈاڑھیوں سے بہت گھبراتے ہیں۔ مگر قدرت کا انتقام دیکھئے کہ ان لوگوں پر ڈاڑھیاں ہی مسلط کی جارہی ہیں! یہی وہ "تدبیر امر" ہے جس کے آگے بڑے بڑوں کی چالبازیاں دھری رہ جاتی ہیں۔

بیچارے سہروردی صاحب کے ساتھ تماشائی کو بڑی ہمدردی ہے کہ وہ وزارت کو کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اُن کے ساتھیوں نے انھیں اس منصب بلند سے محروم کر دیا۔ جس وقت انہوں نے وزارت سے استعفادیا ہوگا تو اُن کے دل کی دھڑکنیں داغ کا یہ شعر بصد حسرت و یاس پڑھ رہی ہوں گی ؎

داغ وارفتہ کو لوگ آج ترے کوچے سے
اس طرح کھینچ کے لائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اخوان المسلمین (کراچی) کے ایک بہت بڑے اجتماع میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ پاکستان میں کرنسی ہی ڈی ویلیو (De-value) نہیں ہوئی یہاں اخلاق سے لے کر جمہوریت تک ہر چیز ڈی ویلیو ہو چکی ہے۔!

تماشائی مولانا کے ارشاد پر اتنا اور اضافہ کرتا ہے۔ پاکستان جب سے بنا ہے، اُس وقت سے اب تک یہاں رشوت، خیانت، چھل فریب، شراب خوری، بدکاری، قمار بازی اور اسی طرح کی دوسری "بازیوں" کی قیمت البتہ نہیں گری بلکہ ان کی ویلیو (VALUE) بڑھتی ہی رہی ہے!

پاکستان کے "بڑے لوگ" سُنا ہے جوتشیوں، نجومیوں اور رمالوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اُن سے زائچے بنواتے ہیں، اور پوچھتے رہتے ہیں کہ اُن کی قسمت کے ستارے کس برج میں ہیں؟ اور فلاں معاملہ میں کیا ہونے والا ہے؟ —— جی! پاکستان کے "بڑے لوگ" راجاؤں اور بادشاہوں سے کوئی کم تھوڑی ہیں۔ اُن کے یہاں وہ سب کچھ ہوگا جو بادشاہوں کے یہاں ہوا کرتا ہے —— ہائے یہ "زوالِ نعمت" کا دھڑکا۔

سعدی نے شاہنامہ میں خوب کہا ہے ؎

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

اس پر ایک دوسرے صاحب (علامہ ابوالہول) نے بس اتنا فرمایا کہ بھئی! میرا تو اب تک یہ خیال تھا کہ یہ شعر غالب کا ہے اور ان کی کتاب سہ نثر ظہوری میں لکھا ہوا ہے۔

ہماری نظر میں

فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر

" فتنۂ انکارِ حدیث کا منظر و پس منظر" (حصہ دوم) از ۔ افتخار احمد بلخی۔
ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے۔ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ چراغ راہ۔ کراچی۔
اس معرکہ آراء کتاب کے پہلے حصہ پر "فاران" کے گزشتہ شمارے میں تبصرہ کیا جاچکا ہے۔
اب اسی کا دُوسرا حصہ منظرِ عام پر آیا ہے۔ جو حصۂ اول سے زیادہ ضخیم، مفصل اور اپنی بعض خصوصیات
کے اعتبار سے اہم تر ہے۔

اس کتاب میں "منکرینِ حدیث" کی تحریروں کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ انھیں پڑھ کر یہ راز کسی تامل کے بغیر فاش ہوجاتا ہے کہ انکارِ حدیث کا فتنہ دراصل اسلام کے خلاف بہت بڑی سازش ہے اور یہ گروہ جو قرآن کی حفاظت اور اشاعت کا پروگرام لے کر اُٹھا ہے حقیقت میں "قرآن" ہی کے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔

جب اللہ و رسول سے مرکزی حکومت اور رسول سے مرکزِ ملت، امام اور فرمانروا (صاحب امر) مراد لی جائے تو قرآن کی اس تفسیر کو " بازیچۂ اطفال" نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ پھر ان لوگوں کی عربی دانی کا یہ عالم ہے کہ " اطاعت" کو زندہ کی فرمانبرداری کے معنی پہناتے ہیں اور لغت میں یہ تصرف بلکہ تحریف اس لئے کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مطاع اور متبوع ہونے کے شرف کو چھین لیا جائے!

پرویز صاحب " ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم" کی شرح ان لفظوں میں فرماتے ہیں:۔

" تم میں جو سب سے زیادہ اپنی معاشی زندگی کو سماوی قانون سے ہم آہنگ کر کے دکھائے وہی سب سے زیادہ قابلِ عزت ہے"۔

یہ ترجمہ اور تفسیر قرآن کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے!

جب " یوم القیامہ" سے انسانیت کا مستقبل اور " الجنۃ" سے مراد ضروریاتِ زندگی اور سامان نشوو ارتقا، کی کفالت ہو تو پھر غریب و مظلوم قرآن کس کے پاس جاکر یہ فریاد کرے کہ " للہ میرے دوستوں سے مجھے بچاؤ"۔ قرآن فہمی کے چند شاہکار (؟) اور لگے ہاتھوں ملاحظہ فرمائیے:۔

" قرآن ارتقائی منازل طے کرنے والی قوم کو جنت کا مستحق قرار دیتا ہے اور ایک مقام پر رُک جانے کا نام جہنم رکھتا ہے ......" (اسبابِ زوالِ اُمت ص ۲۷)

اور

" جنت یا جہنم کسی خاص مقام کا نام نہیں۔ کیفیاتِ زندگی کی تعبیر ہے"۔ (مضمونِ نجات)

حالانکہ قرآن پاک میں جنت (حسنت مستقراً ومقاما) اور دوزخ (انہا ساءت مستقراً ومقاما) دونوں کو

مُستقر اور مقام کہا گیا ہے اور اس میں کسی قسم کا استعارہ اور ابہام نہیں ہے ۔

"مذہب میں یہی "نظام صلوٰۃ" نماز پڑھنے میں تبدیل ہو گیا "۔ (طلوعِ اسلام ۔جنوری ۱۹۵۰ء)

یہ ہے اس گروہ کے عزائم اور معتقدات کی ایک جھلک کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں ؟ اور قرآن کی آڑ میں قرآن ہی پر اس طرح ہاتھ صاف کیا جاتا ہے ۔ اور سنئے :۔

"درود بھیجنے کا یہ طریق جو کتب روایات میں مذکور ہے ۔ رسول اللہ نے ارشاد نہیں فرمایا ہوگا ۔ یہ کہیں اور سے آیا ہے ۔ (طلوعِ اسلام نومبر ۵۱ء)

تو نمازوں میں جو مسلمان درود پڑھتے ہیں ، یہ بھی طلوعِ اسلام " کے بقول " کہیں اور سے آیا ہے " ۔ بس اس کے بعد یہی کہنا اور باقی رہ گیا ہے کہ معاذ اللہ قرآن بھی کہیں اور سے آیا ہے !

" طلوعِ اسلام " میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی علمی شخصیت پر آج کیسے کیسے ناپاک حملے کئے جاتے ہیں ۔ مگر ۱۹۳۶ء میں مولانا موصوف سے " طلوعِ اسلام " کی عقیدت کا یہ عالم تھا :۔

" ترجمان القرآن ایک ماہانہ مجلہ ہے جو چھ سال سے مسلسل اسلام کی ترجمانی اور قرآن کی حکیمانہ دعوت کی نشر و تبلیغ کر رہا ہے ۔ جن لوگوں کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکری اور اسلامی صلاحیتوں کا علم ہے اُن کیلئے بس یہی کہنا کافی ہے کہ آپ ہی ترجمان القرآن کے مدیر اعلیٰ ہیں ۔ خدائے تعالیٰ نے مولانا موصوف کو اس زمانے میں اسلام کی صحیح خدمت اور ملت کی تجدید کے لئے بہرہ وافر عطا فرمایا ہے اور وہ شرحِ صدر ، وہ اسلامی بصیرت اور تفقہ فی الدین دیا ہے جو مغربی الحاد کے دور میں ہر چیز کا صحیح ادراک کر کے قرآن کریم کی روشنی میں ہر مرض کا تریاق مہیا کرتا ہے ۔ ترجمان القرآن کا موضوع قرآن حکیم ہے ۔ ایک طرف وہ کتاب الٰہی کی روشنی میں تاریک دلوں کو منور کر رہا ہے اور دوسری طرف فرنگی اور مغربی الحاد کے خلاف مسلسل جہاد کر کے مغربی فلسفہ کا رعب دلوں سے نکال رہا ہے ہندوستان میں آج کل سیاسیات کے نام پر مسلمانوں میں جو گمراہی پھیلائی جا رہی ہے ۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس سے غافل نہیں ہیں اور کتاب و سنت کی روشنی میں مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی بھی فرما رہے ہیں " ۔

کتاب میں جہاں یہ رنگ آگیا ہے ۔ وہاں طبیعت بہت اُلجھتی ہے :۔

" دوسری طرف طلوعِ اسلامی سو فسطائیت کی خوئے جدل و مبارزت طلبی کا قادیانی لٹریچر کی چلیبج بازیوں سے تشابہ و اشتراک کچھ کم معنی خیز نہیں " ۔ (صفحہ ۳۰۵)

" الزامات و مخترعات اور وساس و شطحیات کی صنعت گری اور جولانی طبع کی نقاشیوں کے لحاظ سے اُس کا کیا حال ہو گا .... " (صفحہ ۳۰۸)

" ...... اُن کی ایسی خلافِ حقیقت تصویر کھینچوں جس پر اپنی بساطِ علم کی تیر اندازی کر سکوں ... " (صفحہ ۳۰۷)

مولانا افتخار احمد بلخی کی یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت کامیاب کتاب ہے ، موصوف کی کاوش و تحقیق قابل داد و تحسین ہے کہ انہوں نے منکرین حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں میں منافقین کا یہ گروہ پیدا ہو گیا ہے جس کا مشن ہی یہ ہے کہ ایمان ، اسلام اور قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا دیا جائے ۔ اور دینِ مبین کے حلیہ کو بگاڑ دیا جائے ۔ اللہ تعالیٰ اس فتنہ سے مسلمانوں کو محفوظ رکھے !

فیصلہ کن مناظرہ

"فیصلہ کن مناظرہ" از:- مولانا محمد منظور نعمانی - ضخامت ۱۶۰ صفحات - قیمت ایک روپیہ۔
ملنے کا پتہ:- دار الاشاعت سنبھل - ضلع مراد آباد - (یو۔پی)

مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے ۱۳۲۳ ہجری میں دیوبند کے اکابر علماء کی تکفیر کا فتویٰ مرتب کیا اور جب وہ حج کرنے کے لئے حجاز مقدس گئے تو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے علماء سے اس فتویٰ کی تصدیق کرائی۔ ان فتاویٰ کو فاضل بریلوی مرحوم نے "حسام الحرمین" کے نام سے شائع کیا۔ اور دیوبند کے مخالفین کے سر فخر سے بلند ہو گئے کہ علماء دیوبند کے کفر پر مفتیانِ حرمین شریفین نے بھی مُہر تصدیق ثبت کر دی۔

دیوبندی تو خیر مولوی احمد رضا خاں صاحب کے مخالف کیمپ کے علماء تھے۔ علماء بدایوں جو اُن کے ہم مشرب اور طریقت کے اعتبار سے ہم سلسلہ تھے جمعہ کی "اذانِ ثانی" کے معاملہ میں اُن تک کی گمراہی اور ضلالت کا فتویٰ صادر کر دیا۔ یہاں تک کہ عدالت میں مقدمہ بازی کی نوبت آگئی! بہرحال ہر آدمی کی کسی نہ کسی چیز سے دلچسپی ہوتی ہے۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی یہی "hobby" تھی۔

مولانا محمد منظور صاحب نعمانی نے ۱۹۳۳ء میں "حسام الحرمین" کے جواب میں ایک بیان تیار کیا تھا۔ جس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے اور اسی پر تنقید مقصود ہے ــــ اس کتاب کو پڑھنے سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی۔ حضرت مولانا خلیل احمد اور حکیم الامت حضرت مولانا تھانوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) کی اصل تحریروں کے بعض اجزاء کو سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے عربی ترجمہ کیا گیا اور اسی ترجمہ کو "استفتاء" بنا کر علماء حجاز سے فتویٰ حاصل کر لیا۔ مفتیانِ حرمین شریفین اس باب میں کسی الزام اور اعتراض کے مورد نہیں بن سکتے کہ وہ اصل عبارت کی کتر بیونت سے بے خبر تھے۔ انہوں نے تو اسی عبارت اور اقتباسات پر فتویٰ دیا جو اُن کے سامنے پیش کئے گئے!

مولانا محمد منظور نعمانی نے اکابر دیوبند کی اصل عبارتیں لکھی ہیں اور بتایا ہے کہ سیاق و سباق سے کٹ جانے کے باعث جن عبارتوں کا "حسام الحرمین" میں عربی ترجمہ کیا گیا ہے۔ وہ کیا سے کیا ہو گئیں۔ پھر انہوں نے دلنشین مثالوں کے ذریعہ اُن شبہات کو رفع کیا ہے جو مستفتی عبارتوں کی لفظی اونچ نیچ سے پیدا ہو سکتے ہیں! جواب بہت شافی اور مدلّل ہے!

دیوبند کے یہ اکابر جن کی پوری زندگیاں کتاب و سنت کی تعلیم اور تبلیغ و اشاعت میں بسر ہو گئیں اور جو نوالہ توڑنے میں بھی سنتِ رسولؐ کا اتباع کرتے تھے۔ اگر (معاذ اللہ) کافر تھے۔ تو پھر دنیا میں اسلام کا دعویٰ کسے زیب دیتا ہے!

افسوس ہے کہ جس انداز پر "حسام الحرمین" مرتب کی گئی تھی۔ ٹھیک اُسی انداز پر آج دیوبند میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے خلاف فتاویٰ ترتیب دیئے جا رہے ہیں۔ اور اُس شخص کو گمراہ ٹھہرایا جا رہا ہے۔ جس کی ایک ایک سانس اقامتِ دین کی جدوجہد کے لئے وقف ہے۔ اور جس کی کتابوں نے ہزاروں ملحدوں اور بے دینوں کو ایمان و دین کے رستہ پر لگایا ہے ــــ "فیصلہ کن مناظرہ" کے بعد اگر مولانا نعمانی تحریف و التباس کے ان پردوں کو بھی چاک کر دیں تو وہ حقیقت میں دین کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے اور ایک داعیٔ حق کی مظلومیت کے ساتھ انصاف برتیں گے۔

FARAN Karachi
Regd. No. 1262

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

ماہر القادری

جلد ۷ نمبر ۸

ماہنامہ

فاران

نومبر ۱۹۵۵ء ایڈیٹر ماہر القادری

چندہ سالانہ ... چھ روپے
فی پرچہ ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران - کیمبل اسٹریٹ - کراچی ۱

نظم و ترتیب

★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

جماعتِ اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ کی ذات پر چاروں طرف سے جو یلغار ہو رہی ہے اُس کا ہم کئی مہینے سے خاموشی کے ساتھ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ خیال نہیں یقین تھا کہ معاملہ طنز و تنقید سے آگے نہ بڑھے گا اور معاصرانہ چشمک عدل و اخلاق کے حدود ہی میں رہے گی۔ مگر ہو یہ رہا ہے کہ عدل و اخلاق کے تقاضوں کو دیدہ و دانستہ ٹھکرایا جا رہا ہے اور افترا پردازی اور الزام تراشی کے حربے جان بوجھ کر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اب معاملہ احقاقِ حق اور دلیل و برہان کی حدوں تک محدود نہیں رہا۔ منافست، عداوت اور رشک و رقابت کے تمام بند ایک ساتھ ٹوٹ پڑے ہیں۔ جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کے مخالف ایسے اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آئے ہیں کہ جن کی کسی شریف آدمی سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور سب سے زیادہ غم تو اس کا ہے کہ علم و فضل اور زہد و تقویٰ بھی اسی سطح پر آ گئے ہیں!

ہم نے کئی مہینے صبر و ضبط سے کام لیا اور ان مباحث میں اُلجھنے سے گریز کیا اور وہ اس لئے کہ مولانا مودودی کو ہم انسان ہی سمجھتے ہیں فرشتہ نہیں سمجھتے اور دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی لغزشوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ فکر و عمل کی غلطیاں اُن سے بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جماعتِ اسلامی کروبیانِ عرش اور قدوسیانِ ملاءِ اعلیٰ کی جماعت نہیں ہے کہ جس کے ارکان سے کسی قسم کی بھول چوک ہی نہیں ہو سکتی اور نہ حق جماعتِ اسلامی میں محدود ہے اور نہ یہ جماعت سچائی اور اسلام کی اجارہ دار ہے۔ مگر مخالفین نے جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کو اس رنگ میں پیش کیا ہے کہ یہ ایک باطل اور مفسد جماعت ہے اور مودودی صاحب (معاذ اللہ) اسلام کی تخریب کے درپے ہیں اور دین کے ایک ایک ستون کو گراتے چلے جا رہے ہیں۔ ان الزامات اور تہمت تراشیوں بلکہ جارحانہ حملوں کے بعد مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی مظلومیت نے ہمیں لب کشائی پر مجبور کر دیا۔ جو لوگ جماعت اور مودودی صاحب کی مخالفت ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کر رہے ہیں، اُن سے اصلاحِ حال کی بہت ہی کم توقع ہے۔ ہماری گزارشیں شاید اُن کے جذبۂ عناد کو اور تیز تر کر دیں گی اور اُن کے قلم کی جراحتوں سے ہم بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے!

ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ اس قلمی کشمکش اور تحریری نزاع میں جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی حمایت میں بعض پرچوں کا لہجہ تند و تلخ اور قابلِ اعتراض ہو گیا ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ تندی و تلخی، کذب بیانی، افترا پردازی اور دروغ بافی سے داغدار نہیں ہوئی۔ غصہ بری چیز ہے مگر جھوٹ تو گناہ ہے۔ تو مولانا مودودی کے یہ حمایتی پرچے غصہ میں تو ضرور آگئے ہیں۔ لیکن اپنے مخالفوں کی طرح اُن پر انہوں نے جھوٹے الزامات نہیں لگائے اور بے سرو پا تہمتیں نہیں جوڑیں!

مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی پر شروع سے لے کر اب تک جو الزامات لگائے گئے ہیں اور اعتراضات کئے گئے ہیں اگر انہیں کسی تبصرے کے بغیر ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو بڑی عبرت ہو گی کہ قوم کے بعض اچھے خاصے آدمی بلکہ اہلِ علم مسائل کو کس سطح سے سوچتے ہیں اور اُن کی تنقید کا معیار کیا ہے؟ اور یہ بھی کہ کوئی خدا کا بندہ نیک کام کرنا چاہتا ہے اور کوئی مخلص جماعت پاکیزہ مقصد لے کر اُٹھتی ہے تو اس کی راہ میں کیسی کیسی رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں اور قوم کی نگاہ میں بے اعتبار ٹھہرانے کے لئے اُس پر کیا کیا تہمتیں جوڑی جاتی ہیں!

جماعتِ اسلامی پر سب سے پہلا اعتراض یہ وارد کیا گیا کہ اس کا نام "جماعتِ اسلامی" کیوں رکھا گیا ہے؟ کیا اسلام کی تنہا یہی جماعت اجارہ دار ہے؟ معترضین کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ کسی جماعت، ادارے اور آرگنائزیشن کے نام کے ساتھ اسلام یا مسلم کی لفظی نسبت سے یہ مفہوم تو نہیں پیدا کیا جا سکتا کہ بس یہی ادارہ اپنے کو "مسلم" سمجھتا ہے یا یہی "تنظیمِ اسلام" کی تنہا ٹھیکیدار ہے۔ کیا کسی تعلیمی ادارے کا "اسلامیہ اسکول" نام ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس اسکول کے علاوہ جتنے دوسرے اسکول ہیں وہ "کافرانہ ادارے" ہیں۔ جماعتوں اور اداروں کے ناموں سے اس طرح کا عجیب و غریب مفہوم کسی نے آج تک اخذ نہیں کیا اور نہ اس طرف کسی ناقد کی عقابی نگاہ گئی۔ مگر جماعتِ اسلامی کے معاملہ میں بعض ضرورت سے زیادہ تیز نگاہوں نے عیب بینی کے اس فرض کو انجام دیا!

یہ حربہ کارگر نہ ہو سکا تو معترضین نے یہ شوشہ چھوڑا کہ جماعتِ اسلامی اپنے ارکان کے سوا دوسرے مسلمانوں کو گمراہ بلکہ کافر سمجھتی ہے اس لئے اس نے اپنا نام "جماعتِ اسلامی" جان کر رکھا ہے۔ اور جماعتِ اسلامی کی رکنیت میں جو کوئی داخل ہوتا ہے اُس سے کلمہ پڑھوایا جاتا ہے۔ جواب دیا گیا کہ جماعتِ اسلامی کے ارکان اگر دوسرے مسلمانوں کو خدانخواستہ کافر سمجھتے تو اُن کے ساتھ شادی بیاہ کیوں کرتے۔ اُن کے ساتھ بلکہ اُنکی امامت میں نمازیں کاہیکو پڑھتے۔ جماعتِ اسلامی کی رکنیت میں شامل ہوتے ہی کلمہ اس تصور کے ساتھ نہیں پڑھوایا جاتا کہ جماعت میں شامل ہونے والا خدانخواستہ کفر سے اسلام میں داخل ہو رہا ہے بلکہ یہ تجدیدِ شہادت ہوتی ہے۔ جماعت کے نئے رکن کو اس بات کا احساس دلایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور حضورؐ کی رسالت کی شہادت صرف زبان ہی سے نہیں زندگی میں اپنے عمل سے بھی دینی چاہیئے۔ طریقت کے سلسلوں میں جب پیر اور مشائخ لوگوں کو مرید کرتے ہیں اور کلمہ پڑھواتے ہیں تو کیا اس تجدیدِ شہادت پر کسی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ ایک مسلمان سے بیعت لیتے وقت کلمہ کیوں پڑھوایا جاتا ہے؟ تنقید و اعتراض کے معاملہ میں یہ ژرف نگاہی اور نکتہ آفرینی بس جماعتِ اسلامی کے لئے محدود ہے۔ دوسروں کے لئے وہ چھوٹ اور جماعتِ اسلامی پر یہ احتساب! اس ذہنیت کا کوئی پس منظر بھی ضرور ہے؟

وہ بزرگ جو جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی مخالفت کو کارِ ثواب سمجھے ہوئے ہیں اور جن کا علم اور زہد و تقویٰ اس راستہ پر پڑ گیا ہے جس میں جماعتِ اسلامی کے استیصال کی کوشش ہی "جہادِ اکبر" ہے انہوں نے جماعتِ اسلامی کے منشور کی اس دفعہ سے جس کا یہ مفہوم ہے کہ:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات معیارِ حق ہے اور حضورؐ کے علاوہ کسی اور کی شخصیت تنقید سے بالاتر نہیں ہے"

یہ معنی پیدا کئے کہ جماعتِ اسلامی صحابہؓ تابعین اور ائمہ کی تنقیص کرتی ہے اور یہ گمراہ جماعت بزرگانِ دین کی دشمن ہے! حالانکہ

جماعتِ اسلامی کے منشور کی یہ دفعہ کتاب وسنّت کے عین مطابق ہے اور اس میں بال برابر صراطِ مستقیم سے انحراف نہیں ہے! جمہور مسلمین کا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام کے علاوہ کوئی اور معصوم نہیں ہے۔ تو کیا اس عقیدے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انبیاء کرام کے علاوہ چونکہ اور کوئی معصوم نہیں ہے اس لئے جو کوئی یہ عقیدہ رکھتا ہے وہ صحابہ کرام، تابعین عظام اور ائمہ دین اور اولیاء کبار کی تنقیص کرتا ہے۔ اور اُن کو غیر معصوم یعنی (معاذ اللہ) سراپا خطا ومعصیت سمجھتا ہے۔ اگر اس عقیدے سے اس نتیجہ کا استنباط نکرد ذہن کی کجی ہے تو پھر نبی کے علاوہ کسی اور کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھنے سے یہ مفہوم کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس سے صحابہ کرام اور دوسرے اکابرِ دین کی توہین ہوتی ہے!

سب سے زیادہ لے دے مولانا مودودی کی کتاب "تجدید و احیاءِ دین" پر ہوئی ہے۔ ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ کتاب اگر منظرِ عام پر نہ آتی تو اچھا تھا کہ طنز وتشنیع کا مخالفین اور معترضین کو ایک حربہ ہاتھ آگیا۔ مگر اس کتاب میں کسی مجدّدِ وقت کے کردار اور بنیادی عقیدے پر کوئی تنقید نہیں کی گئی بلکہ اُن کی تجدید واحیائے دین کی کوششوں کو سراہا گیا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ کی کوششوں کے پوری طرح کامیاب نہ ہونے کے اسباب ووجوہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ واقعات کا تاریخی تجزیہ ہے اور اس تجزیہ ومحاکمہ میں ایک سے زیادہ رائیں بھی ہو سکتی ہیں۔ خود حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہٗ سے اُن کے بعض اعوان وانصار دریافت کرتے تھے کہ سیاسی طور پر آپ اپنے پیشرؤوں کی طرح کامیاب کیوں نہیں ہیں؟ حضرت علیؓ نے اس کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ میں خلیفۂ راشد ہوں تمہیں میری حکومت کے سیاسی حالات کی کامیابی اور ناکامی پر سوچنے اور سوال کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔ آپ نے اس کا جواب یہ دیا کہ اُن کے مشیر ہم تھے اور ہمارے مشیر تم ہو! آپ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ ایک حکومت اور اس کے حاکم کی کامیابی میں مشیروں کی اصابتِ رائے اور نزاکتِ حال کے صحیح اندازے کو بہت کچھ دخل ہے! پاکستان کی صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں جماعتِ اسلامی نے جو حصّہ لیا تھا اُس کے بارے میں بعض مخلصین کی نیک نیتی کیساتھ یہ رائے ہے کہ اسمبلیوں کے انتخابات میں جماعت کو ابھی حصّہ لینا نہ چاہیئے تھا۔ فضا پوری طرح سازگار نہ تھی۔ اس رائے کے مقابلہ میں دوسری رائے بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ مگر اس تنقید سے کوئی یہ نتیجہ اخذ کرلے کہ جماعتِ اسلامی کی اس سے تنقیص ہوتی ہے اور اس تنقید نے جماعت کے سب کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ تو یہ ایک طرح کی نازک مزاجی ہے! کسی مہم کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب کا تجزیہ نہ کسی کی منقصت ہے اور نہ تخفیف ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی اس کتاب (تجدید واحیاءِ دین) میں شخصیتوں کے ادب واحترام کو پورے طور پر ملحوظ رکھا ہے۔ کسی کو اُن کی رائے سے اختلاف ہے تو وہ اُس کی تردید کر سکتا ہے اور مولانا کی غلطیوں پر اُنھیں ٹوکا جا سکتا ہے۔ خود جماعتِ اسلامی، انقلابِ اسلامی کی جس تحریک کو لے کر اٹھی ہے اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی جس کے سربراہ کار ہیں اُس پر ابھی چوتھائی صدی بھی نہیں گزری۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی کوششوں کے کیا نتائج نکلیں گے؟ اور یہ تحریک کن مرحلوں سے گزر کر کامیابی اور ناکامی کی کیا صورت اختیار کرے گی؟ آنے والے اہلِ قلم اور اربابِ فکر کو اس کا پورا حق حاصل ہوگا کہ وہ جماعتِ اسلامی کی کامیابی اور ناکامی سے بحث کریں اور اُس کے طریقِ کار کی اچھائیوں اور خامیوں کا تجزیہ کرکے دنیا کے سامنے پیش کریں!

مولانا مودودی پر ایک الزام یہ لگایا گیا کہ وہ خوارج کی طرح گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو کافر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مولانا کی تحریریں گواہ ہیں کہ انہوں نے اس عقیدے کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے ایمان کے ساتھ عمل پر تو بہت زور دیا ہے کہ قرآن پاک میں "آمنوا" کے ساتھ "اعملوا" کا جگہ جگہ حکم ہے مگر موصوف نے فاسق مسلمان کو "کافر" نہیں کہا۔ بلکہ انہوں نے "تفہیم القرآن" میں تو سرمد کی رباعی کا یہ مصرعہ تک درج کردیا ہے کہ ؏

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

کوئی شک نہیں کہ ایمان کے ساتھ عمل کا بہت ہی گہرا ربط ہے اور مولانا کی بہت سی تحریروں کا موضوع ہی یہ ہے کہ مسلمان کے قول وعمل میں توافق اور ہم آہنگی ہونی ہی چاہیئے، موصوف نے مسلمانوں کو طرح طرح سے غیرت دلائی ہے۔ انھیں عمل کیلئے اُبھارا ہے۔ اور نفسیاتی تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ ایک آدمی کا جب کسی چیز پر کامل ایمان ہوتا ہے تو اس سے اعمال کا صدور بھی اس ایمان کے تقاضوں کے مطابق ہونا ضروری ہے — اب اگر کوئی مولانا کی ان تحریروں کو پڑھتے وقت فلسفہ وکلام کی اس بحث کو — کہ عمل ایمان کا جزو ہے کہ نہیں — سامنے رکھ کر کوئی نظریہ قایم کرلے تو یہ اُس کا اپنا فیصلہ ہے۔ مولانا مودودی کو اس کلامی نزاع میں کسی ایک فریق کا موید یا مخالف ٹھہرانا بہت بڑی غلط فہمی ہے!

ایک الزام مولانا مودودی پر یہ لگایا گیا کہ وہ اپنے کو "مجدّد" کہتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اشارتاً اور کنایتہً بھی ایسا دعویٰ نہیں کیا بلکہ جب اُن سے یہ دعویٰ منسوب کیا گیا تو انہوں نے اس کی پوری قوت کے ساتھ تردید کی! ہم عرض کرتے ہیں کہ کوئی شخص بالفرض "مجددیت" کا دعویٰ لے کر اٹھے اور تجدید و اصلاح کا کام اس کا مقصود ہو تو محض مجددیت کے دعوے کی بناء پر اس کو مطعون کرنا نہ دین کا کوئی تقاضا ہے اور نہ اخلاق وشریعت کا کوئی مطالبہ ہے۔ "مجدّد" کا دعویٰ "نبوت"، "مہدویت" اور "مسیح موعود" ہونے کا دعویٰ نہیں ہے اور نہ کسی کی مجددیت کا ماننا جزو ایمان ہے۔ اگر مولانا مودودی مجدّد ہونے کا دعویٰ کر بھی دیتے تو بھی یہ کوئی گناہ کی بات نہ تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ خودستائی یا اُن کی کم ظرفی پر محمول کیا جا سکتا تھا۔ مگر انہوں نے اس قسم کا کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا۔ لیکن اُن کے معترضین نے اُن سے وہ بات منسوب کردی جو انہوں نے نہیں کہی۔ مودودی صاحب پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ وہ کسی دعوے کے بغیر تجدید و اصلاح کا کام کر رہے ہیں۔ اور اپنے کو دین کا خدمت گزار سمجھتے ہیں۔ انہوں نے خوب کھُل کر اس کا اعلان کیا ہے کہ فقہی مسائل میں میری رائے کی جماعت اسلامی کے ارکان پر پابندی قطعی ضروری نہیں ہے! اور یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کا علم وفضل اور دینی خدمات مذہبی پیشوائی کے تصور واحساس سے ناآشنا ہوں۔

بعض علمی اداروں اور مذہبی حلقوں سے مولانا مودودی کے علم وفضل پر طنز کی جاتی ہے کہ انہوں نے نہ تو کسی علمی ادارے سے باقاعدہ سند حاصل کی اور نہ کسی دارالعلوم میں اُن کی دستاربندی ہوئی۔ مولانا موصوف کے علم وفضل کی سب سے بڑی سند خود اُن کی تصنیفات ہیں۔ جو شخص جبر وقدر پر، جہاد پر، حقوق الزوجین پر، ضبط ولادت پر، سود پر، دینیات اور اخلاقیات پر۔ اسلامی دستور اور تاریخ وعمرانیات پر معرکہ آرا کتابیں لکھ سکتا ہے۔ اُس سے کسی دارالعلوم کی سند مانگنا فکر ونظر کی کتنی سطحیت کی دلیل ہے۔ تنہا "تفہیم القرآن" مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے علمی تبحر، قرآنی بصیرت، اصابت فکر، وسعت معلومات اور دینی تفقہ کا زندہ ثبوت ہے۔ دلی کے ایک مشہور اہل قلم ہیں۔ جو پچاس سال سے رسالوں اور اخباروں کی ترتیب وادارت ہی کا کام کر رہے ہیں۔ اب سے تقریباً سینتیس سال (۱۹۱۸ء، ۱۹۱۹ء) قبل اُن کے ایک اخبار میں مولانا مودودی صاحب نے کچھ دن کام کیا تھا۔ اُس وقت مولانا کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ دہلوی اہل قلم نے مولانا کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ اُن کی نگاہ میں دلّی کے کوچہ چیلان کے رہنے والے ابوالاعلیٰ مودودی نام کے ایک نوجوان کی سادہ شخصیت تھی۔ جس نے چند دن اُن کے اخبار میں صحافت کا کام کیا تھا بلکہ کام سیکھا تھا۔ میرا اُن سے ربط ضبط بڑھا اور میں نے مولانا کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے اس ذکر کو بہت زیادہ توجہ سے نہیں سنا۔ میں نے انھیں مولانا مودودی کی ایک کتاب پڑھنے کو دی۔ چند دن کے بعد اُن سے ملنے کے لئے گیا تو بولے۔ "کہ بھئی! یہ شخص (مودودی صاحب) معمولی آدمی نہیں ہے۔ یہ تو شاہ ولی اللہ صاحب کی لائن کا آدمی ہے" پھر صاحب موصوف مولانا کے زور استدلال، دینی فکر و بصیرت کی دیر تک تعریف کرتے رہے — یہ ہے اُس شخص کی کتابوں کا لکھے پڑھے لوگوں پر نقش وتاثر۔ جس سے دارالعلوم کی دی ہوئی

سند اور دستار طلب کی جاتی ہے اور جس کے بارے میں بعض اہل علم ابھی تک یہی فیصلہ نہیں کر سکے کہ یہ شخص (مودودی) دینی مسائل میں گفتگو کرنے کا حق رکھتا ہے یا نہیں ؟

مولانا مودودی انقلاب اسلامی کی جو تحریک اور دعوت لے کر اٹھے ہیں اس سے بعض معاندین نے "خارجیت" کا جوڑ ملانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ جماعتِ اسلامی کے مزاج، طریق کار اور معتقدات میں خوارج سے دور کی بھی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ خوارج تو خاک بدہن گستاخ، حضرت سیدنا علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ دونوں کو گمراہ سمجھتے تھے۔ اور دین میں کتاب اللہ کے سوا کسی انسان کو "حکم" نہیں مانتے تھے۔ پاکستان میں جماعتِ اسلامی کے اکابر نے تو بار بار یہ کہا ہے کہ اگر ہمارے موجودہ حکام ہی اللہ کا دین قائم کر دیں تو ہم ان حضرات کی رکابیں تھام کر چلیں گے۔ انہوں نے انتہائی نازک موقعوں پر بھی ملکی آئین و قانون کا احترام کیا اور اپنے امیر کی موت کی سزا کا حکم سن کر بھی وہ بے قابو نہیں ہوئے ۔۔۔ نظام اسلامی کے لئے جدوجہد، غلط کار حاکموں کو ٹوکنا ۔۔۔ فسق و فجور کے مظاہر پر نقد و احتساب اور وہ مفاد پرست ارباب اقتدار جو اللہ کے دین کو برپا کرنا نہیں چاہتے۔ آئینی طور پر اُن کے بدلنے کی کوشش۔ ان میں سے آخر کونسی بات خارجیت ہے !

کیا حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اور حضرت نفس زکیہؓ (معاذ اللہ) "خارجی" تھے اور حضرت امام احمدؒ بن حنبل۔ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ جیسے بزرگ جنہوں نے معصیت میں مسلمان بادشاہوں کی اطاعت نہیں کی تھی بلکہ اُس کے خلاف کھُل کر اعلان کیا تھا۔ کیا "خارجی تحریک" کے نمائندے تھے ؟ جماعتِ اسلامی پر خارجیت کی پھبتی چست کرنے والا "دین داروں" (؟) کا یہ وہ گروہ ہے۔ جس کے نزدیک کسی حاکم کا مسلمان جیسا نام ہونا اس کی دلیل ہو کہ وہ "اولو الامر" ہے۔ اس لئے اس کے اکرام و اعزاز کو پوری طرح ملحوظ رکھا جائے۔ اُس کی جبر و زیادتی پر صبر کیا جائے اور اگر حاکم کے کسی خلافِ شریعت فعل پر لب کشائی ناگزیر سمجھی جائے تو بارگاہِ عالی میں خانہ زاد غلاموں کی طرح عرض معروض کی جائے۔ اس غلامانہ گزارش میں فریاد و احتجاج کا رنگ پیدا نہ ہونے پائے۔ ! ع ننگ کی نا مسلمانی سے فریاد !

مسلمانوں میں ایک جماعت اُن مذہبی لوگوں کی ہے۔ جو اپنے اعمال اور فطرت کے اعتبار سے نیک ہیں۔ اور نیکی کو پھُولتے پھلتے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ سیاست و حکومت کو دُنیا داری کا کام سمجھتے ہیں اور اُن حضرات نے دین کا ایک محدود تصور قائم کر رکھا ہے مثلاً کسی ملک میں اگر یہ نزاع و کشمکش درپیش ہو کہ وہاں اسلامی دستور نافذ کیا جائے یا غیر اسلامی! اور کوئی جماعت دستورِ اسلامی کے لئے جدوجہد کر رہی ہو تو وہ اس جدوجہد کو دُنیا داری کا کام سمجھ کر اُس میں حصہ نہ لیں گے اور اس "شجرِ ممنوعہ" کے پاس بھی نہ پھٹکیں گے ! اس تصور و ذہنیت کے بعض افراد تو جماعتِ اسلامی کے بارے میں سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں اور بعض حضرات جماعت کے لئے کلمۂ خیر کہنے کے مقابلہ میں طنز ہی کو ترجیح دیتے ہیں اور مولانا مودودی کو انہوں نے ایک سیاسی لیڈر سمجھ رکھا ہے۔ جن کی کتابوں میں اُن کے نزدیک دین برائے نام ہے زیادہ تر سیاست ہی سیاست ہے ! ان میں بعض بزرگوں نے جب یہ دیکھا کہ ابو الاعلیٰ مودودی نہ تو چلہ کھینچتا ہو اور نہ "الا اللہ" کی ضربیں لگاتا ہو، نہ پاسِ انفاس کرتا ہو۔ نہ حال و مراقبہ کی کوئی کیفیت اس کے یہاں نظر آتی ہے اور نہ اس کی محفل میں کشف و وجدان کا چرچا ہوتا ہو۔ تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس شخص میں روحانیت کی بہت بڑی کمی ہے اور یہ شخص اہلِ باطن نہیں ہے۔ ان حضرات کی نگاہ اس پر نہیں گئی کہ اس شخص کی کتابوں نے کتنی زندگیوں کو دین و اخلاق کے سانچوں میں ڈھالا ہے اور فکر و نظر کے کتنے بگڑے ہوئے زاویوں کو درست کیا ہے اور جو لوگ اس سے متاثر ہیں وہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کی کتنی تڑپ اپنے اندر رکھتے ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ یہ حضرات اہل علم ہیں اور دین کی اخلاص کے ساتھ خدمت

کررہے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے کہ مولانا مودودی پر غلط الزامات لگائے جارہے ہیں اور طرح طرح کی تہمتیں جوڑی جارہی ہیں۔ اُن کی زبان و قلم ایک مظلوم داعیٔ حق کی حمایت و مدافعت کے لئے جنبش میں نہیں آتیں۔ ان حضرات کی اس بے تعلقی اور غیر جانبدارانہ روش پر کیا عجب ہو کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہو!

مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی پر ایک الزام یہ ہو کہ یہ لوگ تصوّف اور روحانیت کے مخالف ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نفسِ تصوّف کیا ہے؟ اس کا جواب خود حامیانِ تصوف کی طرف سے یہ دیا جاتا ہے کہ اس فن کا تمام تر تعلق تزکیۂ نفس سے ہے۔ مولانا مودودی کی تحریریں اس کی گواہ ہیں کہ انہوں نے تزکیۂ نفس اور احسان پر کس قدر زور دیا ہے۔ جماعتِ اسلامی کے متعدد ارکان تہجد پڑھتے ہیں۔ ماہِ صیام کے آخری حصّہ میں اعتکاف کرتے ہیں۔ رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں میں روزے رکھتے ہیں۔ نوافل ادا کرتے ہیں۔ اکلِ حلال اور صدقِ مقال پر وہ زیادہ سے زیادہ عامل ہیں۔ ان میں بعض نے جماعت اسلامی میں داخل ہوتے ہی کمائی کے ناجائز ذرائع کو چھوڑا ہو۔ اور اُن کی صحبت، تعلیم اور دعوت نے دوسروں کو بھی نیکی کی طرف راغب کیا ہو۔ اُن میں ایسے بھی ہیں کہ جن کو جماعتِ اسلامی سے تعلق رکھنے کے سبب لگے لگائے روزگار سے محروم ہونا پڑا ہے۔ کیا اس قسم کی زندگی میں تصوف، تزکیۂ نفس اور احسان کی جھلکیاں نہیں پائی جاتیں اور ایسی زندگی "تصوف" کے عین مطابق نہیں ہے!

ہاں! یہ بیشک صحیح ہے کہ جماعتِ اسلامی کے ارکان اُس لٹریچر پر توجہ نہیں دیتے جس کو تصوف کے اسرار و غوامض کے نام سے پیش کیا جاتا ہے اور جس میں اس قدر مکشوفات، مضمرات، اشاریت، راز در راز شرح، گوناگوں الجھنیں اور پیچیدگیاں ہیں۔ کہ عوام کے دین و ایمان کی بھلائی اُن سے دُور رہنے ہی میں ہو۔ جماعت اسلامی بیشک اس کی قائل نہیں ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تزکیۂ نفس اور تعلیم و حکمت کی عام دعوت پر مامور رہتے۔ تمام صحابہ سے چھپا کر کسی ایک خاص صحابی کو روحانی اور باطنی اسرار بتا دیئے تھے۔ اور وہ طریقت کے خانوادوں میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے اور جس کسی نے ان سلاسل سے وابستگی اختیار نہ کی وہ اپنے وقت کا چاہے ابو حنیفہؒ اور ابن تیمیہؒ ہی کیوں نہ ہو۔ روحانی ترقی سے محروم رہا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے کتنی دل لگتی بات کہی ہو کہ اس قسم کی رازداری علم کیمیا میں چل سکتی ہو، نبوت تو تزکیہ کا فریضہ کھُلے خزانے ادا کرتی ہو۔

بعض لوگوں کے تقشف کا یہ عالم ہو کہ انھیں مولانا مودودی کا پان کھانا، شیروانی اور بوٹ پہننا، کرسی اور میز استعمال کرنا تک پسند نہیں ہو اور بعض لوگ بدنیتی سے مولانا کی شخصی زندگی کے بارے میں شوشے چھوڑتے رہتے ہیں۔ ایک شاعر اور ادیب نے چند برس ہوئے کراچی کی ایک دعوت میں مجھ سے کہا کہ پنجاب کے ایک اخبار نویس مجھ سے ابھی ابھی یہ کہہ رہے تھے کہ مولانا مودودی نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی رچالی ہو۔ میں نے جواب دیا کہ مولانا کو ہم فرشتہ نہیں سمجھتے۔ طلاق دینا تو کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ مولانا سے معصیت بھی سرزد ہوسکتی ہے ـــ اور ایک مسلمان اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی بھی کرسکتا ہے ـــ لیکن یہ اُن صاحب کی کذب بیانی اور دروغ بافی ہے۔ مولانا کی ایک ہی شادی ہوئی ہو اور اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وہ ایک شریف انسان کی سی زندگی گزار رہے ہیں!

تنقید!

وہ شخص انتہائی بدبخت ہو جس نے اپنے اگلے پچھلے بزرگوں پر تنقید کو محبوب مشغلہ بنالیا ہو۔ مگر یہ بھی ہوتا رہا ہے کہ اخلاف نے اسلاف کی بھول چوک پر ادب کے حدود کے اندر رہ کر تنقید کی ہے۔ اگر دین میں نقد و احتساب کی یہ راہ نہ ہوتی تو پھر تفاسیر، مغازی، احادیث و سیر اور فقہ و کلام میں جو کچھ اگلے لوگ لکھ دیتے اُن کی بس نقل در نقل ہوتی چلی آتی اور کھرا کھوٹا اور حق و باطل اس قدر گڈمڈ ہوجاتے کہ آنے والی نسلیں اُن میں امتیاز ہی نہ کرسکتیں۔ اللہ تعالیٰ اُن اہل علم، ارباب سیر و تحقیق

اور ناقدین پر اپنی رحمت نازل فرمائے جنہوں نے حق کے معاملہ میں کسی شخصیت کے احترام کو حائل نہیں ہونے دیا۔ اور انہوں نے دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے دکھا دیا۔ اگر اسلام میں اسلاف پرستی (معاذ اللہ) جائز ہوتی تو امام ابویوسفؒ اور امام ابو محمدؒ اپنے مایۂ ناز استاد امام ابوحنیفہؒ سے اختلاف کی جرأت نہ کرتے اور اُن کے ہر قول کو کسی چون وچرا کے بغیر مان لیتے۔ حالانکہ اسی حق پرستی اور جرأتِ تنقید کی بدولت کتنے فقہی مسائل نکھر کر سامنے آئے ہیں اور آج تک کسی نے ابویوسفؒ اور محمدؒ (رحمہما اللہ تعالیٰ) پر یہ الزام نہیں لگایا کہ ان بزرگوں نے اپنے اُستاد سے اختلاف کرکے یا اُن کے قیاس و استنباط کو غلط ٹھہرا کر امام ابوحنیفہؒ کی توہین کی ہے۔

اگر نقد و احتساب نہ کیا جاتا تو امام بخاری، امام مسلم اور ابونعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، دیلمی، بیہقی کی محدثانہ حیثیت میں کوئی امتیاز اور فرقِ مراتب ہی قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اسی جرأتِ نقد و احتساب کے طفیل میں ہم یہ جان سکے ہیں کہ کس محدث کا کیا پایہ تھا اور احادیث کے مجموعوں میں کون سی کتاب کس درجہ کی ہے؟ کون محدث متشدد تھا اور کون متساہل تھا؟

راویوں پر ناقدین حدیث نے جرح اُن کی تنقیص کے لئے نہیں کی بلکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ قولِ رسولؐ کے جواہر میں خزف ریزے نہ ملنے پائیں۔ یکتائی بڑے درجے کے عالم ہیں لیکن امام بخاریؒ کے استاد ابن مدینی اور ابن حاتم انھیں استناد کے قابل نہیں سمجھتے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کی کتنی بلند شخصیت ہے لیکن بعد کے ناقدین نے اُن کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ وہ درایت کے مقابلہ میں روایت کی پرکھ کر جاتے ہیں!

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سیرت النبی کی جلد سوم میں علامہ سیوطیؒ کی خصائصِ کبریٰ کے بارے میں یہ لکھتے ہیں:-

"علامہ ممدوح نے .... وغیرہ کتابوں کو اپنا ماخذ بنایا، قوی اور ضعیف اور صحیح و غلط ہر قسم کے واقعات کا انبار لگا دیا......."

کیا سید صاحب مرحوم کا اس تحقیق و تنقید سے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ کی تنقیص اور اپنی بڑائی جتانا مقصود ہے؟

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے "وحدۃ الوجود" کے نظریہ کی کس شد و مد کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ اس تنقید سے یہ مفہوم نکالنا درست نہیں ہے کہ جن صوفیاء کرام کو "وحدۃ الوجود" سے شغف تھا اُن سب کی حضرت مجدد صاحب نے تنقیص اور توہین کر ڈالی۔ اسی طرح آج مجدد صاحب کے نظریہ "تصورِ شیخ" پر کوئی تنقید کرتا ہے تو اس کو منقصت و تخفیف کا جامہ پہنانا عقل و انصاف کے خلاف ہے!

تنقید و احتساب میں یقیناً حدود و ادب کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ لیکن کسی پرچہ میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ پر سخت لہجہ میں تنقید چھپ جانے سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست نہیں ہے کہ جماعتِ اسلامی کی بنیاد ہی کجی پر رکھی ہوئی ہے اور ایسی باتیں کرنے سے اولیاء اللہ کی شان نہیں گھٹ سکتی اور اولیاء اللہ کی عداوت خدا کی عداوت ہے.......!

حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کس قدر سخت الفاظ میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر تنقید کی ہے۔ اس تنقید سے یہ نتیجہ تو نہیں نکالا جاسکتا کہ جماعتِ اہلِ حدیث کی بناء ہی کجی پر رکھی ہوئی ہے یا اس طرح امام بخاری نے امام ابوحنیفہ پر تنقید کرکے (معاذ اللہ) خدا کی دشمنی مول لی ہے!

اولیاء کرام کے بعض اقوال اور طریق و رواج اگر ایسے ہوں جن کیلئے کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہ لائی جاسکے۔ تو ایک ند[illegible] کو اُن پر نقد و احتساب کا حق حاصل ہے اور اس کو اولیاء اللہ کی دشمنی قرار دینا بہت بڑی بے دانشی ہے۔ جہاں کتاب و سنت او[illegible]

دین و شریعت کا مسئلہ درپیش ہو۔ وہاں کسی کی شان اور احترام کے زاویہ نگاہ سے نفس مسئلہ پر غور و خوض ایک عجیب بات ہے!

"مولانا محمد الیاس اور اُن کی دعوت" (از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی) میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقدمہ درج ہے جس کا ایک اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:-

> "لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے ایک ہی صدی کے اندر اندر اپنے اس فرض کو بھلا دیا۔ ہمارے سلاطین اور بادشاہوں نے ملک گیری اور کشور کشائی پر قناعت کی اور عیش و آرام اور جاگیر و خراج کی دولت کو اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیا۔ علماء نے درس و تدریس اور فتنوں سے عزلت نشینی کی زندگی پر کفایت کی۔ درویشوں اور صوفیوں نے تسبیح و سجادہ کی آرائش پر بس کی اور زندگی کے کاروبار سے اپنے کو الگ کر لیا۔"

سید صاحب مرحوم کی اس تحریر سے کوئی یہ نتیجہ اخذ کر لے کہ سید صاحب نے جو علماء پر تنقید کی ہے اس کی زد امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام اوزاعی اور دوسرے اکابر علماء (رحمہا اللہ تعالیٰ) پر پڑتی ہے اور درویشوں اور صوفیوں پر اُن کی تنقید کی لپیٹ میں سفیان ثوری، جنید، شبلی اور بایزید بسطامی جیسے اکابر صوفیاء (رحمہا اللہ تعالیٰ) آ جاتے ہیں اور اس طرح انہوں نے شریعت و طریقت کے تمام ائمہ کی شان کو گھٹا دیا ہے اور وہ اپنی ذات کو ان سب سے برتر سمجھتے ہیں۔ تو اس رائے اور استنتاج پر کیا اہل دانش کو ہنسی نہ آ جائیگی!

مولانا ابوالاعلیٰ اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریروں میں بھی اسی قسم کی مثالیں ملتی ہیں اور یہ تنقید کا ایک عام رنگ ہے۔ اگر مودودی صاحب "فقہی موشگافی" کی اور مولانا امین احسن اصلاحی "خانقہی تصوف" کی طنز چست کر دیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ تمام ائمہ فقہا اور اکابر صوفیاء کی انہوں نے تنقیص کر ڈالی!

پھر شخصیتوں کے جانچنے کا یہ معیار بھی عجیب ہے کہ زمانی تقدم و تاخر کے اعتبار سے ہر بعد میں آنے والا، اگلے آدمی سے عقل و فہم اور مجدو شرف میں کمتر ہی ہوتا ہے اور جو کوئی اب سے پانسو سال پہلے پیدا ہو گیا اس کے مقابلہ میں پانسو سال بعد کا آدمی لازماً کم درجہ کا ہے۔ جو کتاب تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی، اُس کے بعد کے زمانہ میں اس کتاب کا جواب ہو ہی نہیں سکتا اور ایک شخص چونکہ اتفاق سے چودھویں صدی ہجری میں پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا وہ کتنی ہی دانائی کی بات کہے، اُس کی بات پچھلی صدی کے علماء کے مقابلہ میں کم درجہ ہی کی سمجھی جائے گی— اجتہاد و قیاس اور شرح و تفسیر جتنی ہو سکتی تھی ہو چکی۔ اب اُس میں اضافہ و ترمیم ممکن نہیں۔ اس کے خلاف جو کوئی رائے رکھتا ہے وہ "تجدد پسند" ہے— بعض لوگ منہ سے نہ کہیں مگر اُن کے دل اسی اعتقاد و تصور سے لبریز ہیں۔ عقیدت کا یہی واہمہ ہے جس نے بعض لوگوں کو عجیب خلجان میں مبتلا کر دیا ہے اور شخصیتوں کے اعتراف کمال میں وہ پوری طرح انصاف نہیں برت سکے!

محدثین کا مسلک!

ایک تو منکرین حدیث ہیں کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل ہی کو سرے سے دین میں حجت نہیں سمجھتے بلکہ وہ تو یہ کفر تک بکتے ہیں کہ حضورؐ کی اطاعت آپؐ کی زندگی تک تھی، آپؐ کی وفات کے بعد اطاعتِ رسولؐ کا سلسلہ ہی ختم ہو گیا (اس عقیدے سے کروڑ بار خدا کی پناہ — توبہ معاذ اللہ..... نقل کفر کفر نہ باشد) دوسرے وہ لوگ ہیں اور مسلمانوں کا جمہور اسی عقیدے کا حامل ہے کہ حضورؐ کی اطاعت قیامت تک کے لئے منصوص ہے اور کتاب اللہ کی طرح سنتِ رسولؐ بھی دین کا ایک ستون ہے، دین کی عمارت کتاب و سنت کے دو ستونوں پر کھڑی ہوئی ہے حضورؐ کا قول و فعل محض کوئی تاریخی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ دین میں حجت کی حیثیت رکھتا ہے— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی بھی جمہور مسلمین کی طرح یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ اُن کی تحریریں اس کی گواہ ہیں کہ فتنۂ انکار حدیث کے رد میں انہوں نے کتنے معرکہ آرا مضامین لکھے ہیں۔ اُن کی تمام کتابیں اقوالِ رسولؐ ہی سے معمور ہیں۔ اتباعِ سنت اور

اطاعتِ رسولؐ تو مودودی صاحب کا مشن ہے، پروگرام ہے۔ مقصود و غایت ہے!

مولانا موصوف نے لاہور کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے صحیح بخاری کے بارے میں جو کچھ کہا تھا اس نے ایک مستقل نزاع بلکہ جدال کی صورت اختیار کر لی اور یہاں تک کہا گیا کہ مودودی صاحب نے اس طرح "اتحاد" کو پارہ پارہ کر دیا۔

جب جماعتوں میں اتحاد کا عہد و پیمان ہو جائے تو یقیناً اختلافی مسائل پر گفتگو کرنے میں احتیاط برتنی چاہیئے۔ مگر ان حلیف جماعتوں میں سے کوئی ایک فرد اگر یہ کہے کہ فقہا معصوم نہیں ہیں اور ان سے بھی اجتہاد و قیاس میں غلطیاں ہوتی ہیں تو اس تنقید پر فقہی جماعتیں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں کہ اس تنقید نے تو "اتحاد" کا شیرازہ ہی بکھیر دیا اور اس طرح ہمارے تمام ائمہ فقہا کی جان کر تنقیص کی گئی ہے۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اس عتاب کو کس حد تک معقول قرار دیا جائے گا۔

صحیح بخاری شریف (شیعہ حضرات کو چھوڑتے ہوئے) تمام اسلامی فرقوں کے نزدیک احادیث کا مستند ترین مجموعہ ہے اور کوئی شک نہیں کہ کتاب اللہ کے بعد یہ "اصح الکتب" ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ فنِ حدیث میں سب کے نزدیک واجب الاحترام امام ہیں اور ان کا احترام کسی خاص جماعت کی میراث نہیں ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ "لاریب فیہ" صرف کتاب اللہ کی خصوصیت ہے کہ جس میں کسی قسم کا کوئی شک، بھول چوک، ظن اور قیاس نہیں پایا جاتا۔ ایک مسلمان کی سمجھ میں قرآن پاک کی کوئی آیت نہ آئے تو اپنی تسلی کیلئے "اہلِ ذکر" سے سوال تو کر سکتا ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتا کہ روایت و درایت کی رُو سے یہ آیت مجھے مشکوک معلوم ہوتی ہے۔ اگر وہ ایسا کہے تو اس کا ایمان ہی جاتا رہتا ہے کہ قرآن کے بارے میں جرح و تنقید کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دنیا کی کسی کتاب کیساتھ (اور اس میں احادیث کے تمام مجموعے یہاں تک کہ صحیح بخاری بھی اُن میں شامل ہے) بالکل قرآن جیسا سلوک نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اس کے "لاریب فیہ" ہونے پر ایمان لایا جائے اور کسی حدیث پر جرح و تنقید کرنے سے ایمان جاتا رہے!

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ صحیح بخاری کتاب اللہ کی طرح "لاریب فیہ" نہیں ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم معاذ اللہ بخاری شریف کو مشکوک مانتے ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ انبیاء کے سوا کوئی اور معصوم نہیں ہے تو اس سے یہ مفہوم ہرگز ہرگز نہیں نکالا جا سکتا کہ انبیاء کے سوا تمام انسان چاہے وہ صحابہ کرامؓ ہی کیوں نہ ہوں معاذ اللہ سراپا خطا و معصیت ہیں!

کوئی شک نہیں کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کی جانچ اور پرکھ میں تحقیق و تفحص کا حق ادا کر دیا۔ امام موصوف کا نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ تمام عالم انسانیت پر بڑا احسان ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ امام بخاری معصوم نہ تھے۔ اُن کے کام میں بھول چوک کا رہ جانا نہ تو ان کی شخصیت کے منافی ہے اور نہ اس سے بخاری شریف کی صحت مجروح ہوتی ہے!

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے حوالے سے یہ روایت بیان کی گئی کہ "مُردوں پر نوحہ کیا جائے تو اُن پر (اس نوحہ کے سبب) عذاب کیا جاتا ہے" اس پر اُم المؤمنین سیدہ صدیقہؓ نے فرمایا:

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطئ۔

"تم لوگ نہ خود کاذب ہو۔ نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں۔ لیکن کان غلطی کر جاتا ہے!"

جس کسی روایت کے بیان کرنے میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی سماعت سے کبھی کبھار بھول چوک ہو سکتی ہے تو حضرت امام بخاریؒ کی مسلمہ ثقاہت نیک نیتی اور ضبط و حفظ کی تمام صلاحیتوں کے باوجود کسی روایت میں نقل و سماعت کی غلطی مستبعد کیوں سمجھی جائے۔ جب حضرت عائشہؓ کی اس تنقید کے باوجود حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا عدل و ثقاہت اپنی جگہ قائم ہے بلکہ اس تنقید سے عبد اللہ بن عمرؓ کی تنقیص نہیں ہوتی تو صحیح بخاری کی کسی حدیث پر کوئی ایسا آدمی جو دین میں سنت رسولؐ کو حجت بھی سمجھتا ہو اگر جرح و تنقید کرے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہاں تک درست ہے کہ اس نے امام بخاریؒ اور ان کے مجموعہ احادیث کی معاذ اللہ تنقیص کر ڈالی اور اس تنقید نے اسے "منکرینِ حدیث" کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں "تین جھوٹ" کی جو روایت ملتی ہے اس کے ماننے سے امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ

نے انکار کیا ہے، امام رازی کی یہ رائے کہاں تک درست ہے، یہ جداگانہ بحث ہے مگر اُن کے اس انکار کے سبب کسی نے اُن پر امام بخاری کے مرتبہ کی تنقیص یا بخاری شریف کی صحت کو مجروح کرنے کا الزام تو نہیں لگایا۔

علامہ شبلی نعمانی سیرت النبی (حصہ اول) میں لکھتے ہیں:۔

"صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا! تُو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رُسوا نہ کرے گا۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وقد استشکل الاسماعیلی ھذا الحدیث من اصلہ وطعن فی صحتہ۔ اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے لیکن اسماعیلی کا درجہ فنِ حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہو لیکن قابلِ لحاظ ہو سکتا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔" (صفحہ ۶۷۔ طبع پنجم)

صحیح بخاری کی اس حدیث کی صحت پر اسمٰعیلی نے جو طعن کی ہے اور شبلی نعمانی نے اس کو نقل فرما کر یہ لکھ دیا ہے کہ "گو اسمٰعیلی کا اعتراض غلط ہو لیکن قابلِ لحاظ ہو سکتا ہے" اس کے بارے میں کیا یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ دونوں بزرگ "منکرِ حدیث" تھے۔ یا اس تنقید سے اُن کا مقصود امام بخاری کی منقصت اور صحیح بخاری کو مشکوک ٹھہرانا ہے ـــــ ایک اور مثال:۔

"صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ ایک دفعہ عبد اللہ بن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں جھگڑا ہوگیا۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ "وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَھُمَا۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑجائیں تو اُن میں صلح کرادو۔" روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت عبد اللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں اسلام نہ لایا تھا اس بنا پر ابن بطال نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں اور یہاں عبد اللہ بن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔ حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔

"اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلہ سند کیساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں۔" (سیرت النبی حصہ اول۔ طبع پنجم صفحہ ۷۷۔ ۷۸)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے صحیح بخاری کے بارے میں محدثین کے اسی مسلک کو بیان کیا تھا جس کی دو مثالیں اُوپر پیش کی گئی ہیں اور اسی مسلک پر بعض حضرات نے اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کردیا۔

مسلمانوں کی کوئی جمعیت اگر یہ سمجھتی ہے کہ صحیح بخاری میں جو روایات درج ہیں اُن کے بارے میں جرح و تنقید ہو ہی نہیں سکتی، مسلمانوں کو اُسے چوں کا توں قبول کرنا چاہیئے اور اس کے اس عقیدے پر کسی فرد یا جماعت کی طرف سے کوئی تنقید ہوتی ہے تو اس جمعیت کو مدافعت کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ اپنے عقیدے کی حمایت میں وہ درشتی سے بھی کام لے سکتی ہے مگر اس بحث میں اس نیچی سطح تک اُتر آنا کہ لاہور کے ایک اخبار کے ایڈیٹر کو کوئی افسر اخباری نزاع کے بارے میں تنبیہ کرتے ہیں یا ہدایت دیتے ہیں تو اس اطلاع کے ملتے ہی خبر کو اس انداز میں چھاپنا:۔

"کہ جس طرح انگریزوں نے قادیانیت کی حمایت کی تھی اسی طرح حکومتِ پاکستان جماعت اسلامی کی پشت پناہی کر رہی ہے۔"

کیا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ صحیح بخاری کی حمایت کے پردے میں جماعت اسلامی کو لوگوں کی نگاہ میں مشتبہ، ذلیل اور بے وقار ٹھہرانا مقصود ہے۔ اور یہ بحث جو للہیت سے شروع ہوئی تھی اس نے نفسانیت کی صورت اختیار کرلی!

ماہنامہ "چراغِ راہ" میں جو مضمون شائع ہوا ہے اس کی درشتی ہمیں تسلیم ہے مگر اس پر ایک پرچہ کا تنقید کرتے ہوئے یہ تک لکھ دینا:۔

"حد تو یہ ہے کہ مودودی صاحب کی بابت بھی بعض افراد کا یہ تاثر ہے کہ وہ اب حکمرانوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں اور حیل خانہ

میں حکمرانوں اور مودودی صاحب کے درمیان کچھ راز و نیاز کی باتیں ہو گئی ہیں اسی لئے وہ اپنی قوتِ تحریر و تقریر کو اسلام پسند عناصر میں انتشار پھیلانے کے لئے صرف کر رہے ہیں اور اُن کی پھانسی کا فیصلہ عوام میں محض انھیں ہیرو اور مقبول بنانے کیلئے کیا گیا تھا۔" (ماہنامہ "المومن" کراچی)

کیا اس کی دلیل نہیں ہے کہ مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کی جانب وہ وہ باتیں منسوب کی جارہی ہیں اور ایسے ایسے مفروضے، قیاسات اور اندیشے پیدا کئے جارہے ہیں جن کا منبع جذبۂ رشک و عداوت کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور جماعتِ اسلامی کے معاملہ میں افراد اور جماعتوں کی مخالفت اب اُس حد و دمیں داخل ہو گئی ہے جہاں جماعتِ اسلامی کو گرانا اور نیچا دکھانا ہی مقصود ہے۔ ایسی بہتان طرازیاں اور غلط اندیشیاں کیا مخالفین کی نفسانیت کا زندہ ثبوت نہیں ہیں؟

جماعتِ اسلامی نے جو گشتی شفاخانے قائم کئے ہیں وہ کس اخلاص کیساتھ کام کر رہے ہیں اور غریبوں کو اُس سے کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ مگر ایک پرچہ جو کی پیشانی پر "مسلکِ اہلِ حدیث کا ترجمان اور داعی" کا طغرا ثبت ہے۔ لکھتا ہے:-

"یہ گشتی شفاخانوں کو لیجئے یہ جماعتِ اسلامی نے غرباء، مساکین، محتاج، بیوگان اور نادار طلباء کے پیٹ میں چھرے گھونپ کر قائم کئے ہیں۔"

جب کسی جماعت سے مخالفت اس حد تک پہنچ جائے تو پھر اس کے سوا اور چارہ کار ہی کیا ہے کہ اس مظلوم جماعت کے ارکان اپنا دکھ درد اپنے اللہ کے سامنے پیش کر دیں کہ وہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے! افہام و تفہیم اور بحث و استدلال کی اب گنجائش ہی ان حد سے گزر جانیوالوں نے کہاں چھوڑی ہے!

جماعتِ اسلامی کے ارکان پر ایک یہ طنز بھی کی جاتی ہے کہ "مولانا مودودی کی "الجہاد فی الاسلام"، "سیاسی کشمکش"، اور "تفہیمات" اور اُن کی دوسری کتابوں سے زیادہ ان لوگوں کا مبلغ علم نہیں ہے اور ان کتابوں کو پڑھ کر وہ اپنے کو بہت بڑا ناقد سمجھنے لگے ہیں۔ ان طنز نگاروں نے شاید جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان کے علم و استعداد کا جائزہ لے کر ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ جماعتِ اسلامی کے ارکان نے مودودی صاحب کی کتابوں کے علاوہ اور کسی کتاب کو ہاتھ تک نہیں لگایا اور اُن کا سرمایہ علم و دانش صرف مولانا مودودی کی کتابوں تک محدود ہے؟ طنز و تنقید کی یہ کیسی مبالغہ آرائی ہے! اس کے بعد ہم عرض کرتے ہیں کہ کیا کسی کتاب کا اُردو میں لکھا جانا اس کی دلیل ہے کہ پیرایۂ بیان، استدلال، معلومات اور فکر و نظر کے اعتبار سے کوئی کتاب کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو مگر چونکہ وہ اُردو میں لکھی گئی ہے اس لئے اسے کم درجہ کا ہی ہونا چاہیئے اور عربی اور انگریزی کی اسی موضوع پر کوئی کتاب چھپ کر تو اظہارِ خیال کا کسی کو حق پہنچتا ہے مگر اُردو میں اس موضوع پر کتاب پڑھ کر پڑھنے والے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کچھ بول سکے!

مولانا مودودی نے بعض کتابیں یقیناً ایسی معرکے کی لکھی ہیں جنہیں دوسری زبانوں کی بلند ترین کتابوں کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے! مودودی جیسا مفکر جس قوم کو مل جائے اُس قوم کو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے! مودودی جیسے مفکر کا چودھویں صدی میں پیدا ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ اُسے اُس سے پہلے کے ہر عالم اور مفکر سے لازماً گھٹیا اور فروتر ہی سمجھا جائے!

مباش منکرِ غالب کہ در زمانہ تست!

حرفِ آخر

مولانا مودودی اگر غیر مخلص اور شہرت پسند ہوتے اور اُن کا مقصد خدمتِ دین کی بجائے اپنے کو نمایاں کرنا ہوتا تو وہ پردہ، سود، تصویر، تعددِ ازدواج، ضبطِ ولادت، ملکیتِ زمین وغیرہ مسائل کی تشریح نئی نسل کی ذہنیت اور خواہش کے مطابق کر کے بہت کچھ مقبول ہو سکتے تھے بلکہ مغرب زدہ طبقہ اُن کو اپنا "ہیرو" سمجھتا۔ مولانا نے اس کے برخلاف سب سے پہلے "پردہ" لکھ کر "ملا" کی طنزیں سُنیں۔ بنک کے سود کے مسئلہ میں مصر کے بعض علماء تک ڈگمگا گئے ہیں مگر مولانا مودودی نے پوری جرأت کے ساتھ بنک کے منافع کو "ربا" ہی کہا۔ انہوں نے احادیث کی روشنی میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے واقعہ معراج پر مضمون لکھا اور اس پر انھیں منکرینِ حدیث کی طرف سے "ماڈرن ملا" کا خطاب ملا۔ "قتلِ مرتد" پر مودودی صاحب کو مخالف کیمپ سے طنز و تشنیع کے کیا کیا تحفے دیے گئے؟

یہ کون کہتا ہے کہ مولانا مودودی کے قلم سے بھول چوک ہی نہیں ہوئی اور ہر مسئلہ میں اُن کی رائے سو فیصدی درست ہے۔ اُن کی رائے سے

غلطیاں بھی کی ہیں، اُن کے راہوار قلم نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ مگر غلطیوں سے انبیاء کرام کے سوا محفوظ کون ہے! پچھلے علماء سے بھی فکر و رائے کی غلطیاں ہوئی ہیں، ایک نہ دو سرے پر طنز بلکہ ملامت بھی کی ہے اور بعض نے بعض کی رائے کو گمراہی اور ضلالت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ مگر کسی عالم کی چند لغزشوں کو کسی نے "دین کے ستون" گرانے سے تعبیر نہیں کیا۔ یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں عالم نے دینی مسائل کی تعبیر و توضیح میں فلاں فلاں غلطی کی ہے اس لئے اس کا مشن ہی اسلام کی تخریب ہے!

عقائد کا، ارکانِ اسلام کا، دین کے بنیادی مسائل کا، کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں مولانا مودودی نے جمہور کی رائے سے اختلاف کیا ہو۔ بعض فقہی مسائل ایسے ضرور ہیں جن میں وہ اپنی ایک رائے رکھتے ہیں اور اس میں بہت ہی کم مسئلے ایسے ہوں گے جن میں کسی نہ کسی فقہی مسلک کی انھیں تائید حاصل نہ ہو۔ فقہی مسائل کا اختلاف ایسا نہیں ہے جس کو کسی کی گمراہی اور دین کی تخریب پر دلیل میں پیش کیا جا سکے!

کیا کوئی ایک مثال بھی ایسی مل سکتی ہے کہ مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے سے پہلے ایک شخص دین دار تھا مگر کتابیں پڑھنے کے بعد بے دین ہو گیا۔ جماعتِ اسلامی کے جو ارکان ہیں یا جو متفقین اور متاثرین ہیں اُن میں کتنی بہت سی مثالیں ایسے افراد کی ملیں گی جو پہلے نماز نہیں پڑھتے تھے روزہ نہیں رکھتے تھے اور دین سے عام طور پر غافل تھے مگر جماعتِ اسلامی میں شامل یا اس سے متاثر ہو کر دینی جذبہ سے سرشار ہو گئے اور اُن کی زندگیاں ہی بدل گئیں۔ ہزار دو ہزار نہیں بلکہ لاکھوں نوجوان ایسے ہیں جن کو مولانا مودودی کی کتابوں نے کمیونزم، تشکیک، معصیت اور الحاد کے چنگل سے چھڑا کر اسلام، ایمان اور پاکبازی کی آغوش میں پہنچایا ہے۔ سیرت سازی کا جو کام مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابوں نے انجام دیا ہے اُس کی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملیں گی!

جب سرکار دربار کے ساختہ پرداختہ اخبار نویسوں کے دام میں بعض اچھے خاصے معروف علماء تک گرفتار ہو جائیں اور وہ جماعتِ اسلامی پر یہ تہمت تک جوڑ دیں کہ اس جماعت کو امریکہ سے امداد ملتی ہے اور کذب بیانی، دروغ بافی اور تہمت تراشی کی ہَے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچ جائے کہ مودودی صاحب سے یہ عبارت تک منسوب کردی جائے۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی جھوٹ بھی بولتے تھے"۔ (معاذ اللہ۔ نقلِ کفر کفر نباشد) اور یہ جھوٹ بولتے ہوئے نہ خدا کا خوف ہو نہ بندوں کی شرم تو پھر کوئی کہے بھی تو کیا کہے۔ یہ تو دنائت کی آخری حد ہے۔ اس قسم کی بے سروپا باتیں وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو اپنے زہد و تقویٰ پر اتنا ناز اور اعتماد ہو کہ ہم کسی پر چاہے جیسی تہمت جوڑ دیں اُس کے کفارے کیلئے ہمارے دامن میں بہت کافی نیکیاں موجود ہیں، اوّل تو قیامت میں ہم سے ان حرکتوں پر باز پرس ہوگی ہی نہیں کہ ہم نے "جھوٹ پروف" جُبّے پہن رکھے ہیں اور ہوئی بھی تو اس کے جواب میں اپنی پیشانیوں کے گھٹے، اپنی تسبیحیں، اپنی ڈاڑھیاں اور اپنے مُریدوں کی ٹولیاں پیش کر دیں گے ــــ کسے خبر تھی کہ چودھویں صدی ہجری میں علم اور زہد و تقویٰ یہ پارٹ بھی انجام دیں گے!

ہمیں آخر میں جماعتِ اسلامی کے ارکان اور متفقین سے یہ کہنا ہے کہ اُن کیساتھ جو دردناک سلوک کیا جا رہا ہے اُس سے انھیں دُکھ ضرور ہوتا ہوگا۔ اور ہونا چاہیئے مگر جو کچھ پیش آ رہا ہے یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے حق پرستوں کا تاریخ کے ہر دور میں اسی قسم کی صورتِ حال سے واسطہ پڑا ہے۔ حق کی دعوت کوئی فرد لے کر اٹھا یا جماعت، اُس کو غیروں سے زیادہ اپنوں کے ہاتھوں صدمے اٹھانے پڑے ہیں۔ آج بھی جہاں جہاں جتنا پانی مر رہا ہے اُسی قدر وہاں سے جماعتِ اسلامی کے خلاف شعلے اٹھ رہے ہیں، مگر یہ سب تلخیاں، ناگواریاں اور ستم رانیاں اُنھیں برداشت کرنی ہوں گی اور یہ تو اس منزل کا آغاز ہے کیا خبر آگے چل کر کیا ظہور میں آئے اور کون فتنہ کس بھیس میں نمودار ہو کر اُن کی راہ کا سب سے بڑا سنگِ گراں بن جائے۔ ان حالات میں مردِ حق پرست کا سب سے بڑا ہتھیار "صبر" ہے، صبر ہی تعلق باللہ کو مضبوط تر کرتا ہے اور "جواب الجواب" کے مخمصے سے نجات مل جاتی ہے، شرارتوں اور فتنہ سامانیوں کے بادل انشاء اللہ ایک دن چھٹ کر رہیں گے اور یہ بھی چھٹیں بلکہ مطلع جاہے اور بھی زیادہ ابر آلود ہو جائے مگر انھیں تو ہر حال میں سرگرمِ عمل رہنا ہے۔ بہت سے بہت یہ ہوگا کہ وہ اس راہ میں مٹ جائیں گے مگر یہ تو اُن کی سب سے بڑی کامیابی ہے، دُنیا میں ہمیشگی اور دوام کس کو ہے، فنا ہر جان کیلئے مقدر کردی گئی ہے، اُس جان کو مژدہ اور اُس زندگی کو نوید جو حق کی راہ میں کام آئے، کوئی قربانی دُنیا میں ضائع نہیں جاتی، جو حق کی راہ میں مٹ جائیں گے اُن کی خاک سے کامیابی لالہ و گل بن کر نمودار ہوگی!

مصطفیٰ لطفی المنفلوطی۔
ترجمہ و تلخیص۔ عطیہ خلیل عرب۔

اسلام پر چند آنسو

ہر مضمون نگار اور ادیب کسی نہ کسی موضوع پر لکھتا ہے۔ اسی طرح میں بھی قلم اٹھانے سے پہلے کوئی موضوع متعین کر لیتا ہوں۔ لیکن شام کی ڈاک سے ایک ہندوستانی دوست نے اپنے خط میں میرے لئے موضوع بھیج دیا۔ اور میں انتہائی افسوس کے ساتھ لکھنے بیٹھ گیا۔ ہندوستانی دوست جو خود بہت بڑے عالم ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جنوبی مدراس ضلع ناگور کی خاص زبان میں ایک صاحب نے حیات عبد القادر جیلانیؒ لکھی ہے۔ مولف نے اس کتاب میں پیر صاحبؒ کا ان القاب و صفات سے تذکرہ کیا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے لئے بھی نہیں استعمال کئے جا سکتے۔ بلکہ یہ تعریف و ستائش صرف خدا کی ذات بے ہمتا کو زیب ہے اور ان صفات سے متصف صرف ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ اس طرح مولف نے مقام ولایت کو مقام نبوت سے بھی بڑھا کر مقام الوہیت تک پہنچا دیا ہے۔ (نعوذ باللہ من ذالک) مثلاً ارض و سموات کے مالک، نفع و نقصان دینے والے دونوں جہان کے مختار کل۔ گناہوں کے بخشنے والے۔ باعث تخلیق عالم۔ اور ان کی مرضی خدا کی مرضی ہوتی ہے۔ (معاذ اللہ) اور اسی قسم کے بے شمار القاب ہیں جو ایک مجبور انسان کے لئے ایک جاہل عالم نے استعمال کئے ہیں!

کاتب کا بیان ہے کہ مولف نے اس کتاب میں ایک خاص باب صرف ان آداب پر مشتمل لکھا ہے جو زائر قبر کے لئے ضروری ہیں۔ اس میں یہ بتایا ہے کہ زائر کو درگاہ پر کس طرح حاضری دینی چاہئے۔ لکھتے ہیں:۔

سب سے پہلے اچھی طرح وضو کرے پھر دو رکعت نماز نفل ادا کرے۔ اس کے بعد انتہائی خشوع و خضوع اور حضور قلب کے ساتھ قبلہ رو ہو کر صاحب قبر (عبد القادر جیلانیؒ) پر سلام بھیجے اور انتہائی عجز کے ساتھ کہے:۔

"اے صاحب الثقلین! فریاد ہے۔ میری فریاد رسی کیجئے۔ یا محی الدین عبد القادر! میری حاجت روائی کیجئے۔ یا خواجہ جیلانی! میری مصیبتیں دور کیجئے اور اے پیران پیر آپ ہی کا سہارا ہے۔

مدد اے غوث الاعظم مدد کو پہنچو! اے حضرت! آپ کا مرید آپ کا بندہ محتاج اور مظلوم ہے بے کس اور بے سہارا ہے۔ اس کو صرف آپ ہی کا آسرا ہے۔ آپ ہی اس کے مددگار ہیں۔ (نعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا)

ہندوستانی دوست نے آگے لکھا ہے کہ یہی نہیں بلکہ ناگور میں ایک قبر اور بھی ہے جس کو "شاہ حمید" کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق لوگوں کو یقین ہے کہ یہ عبد القادر جیلانیؒ کی کسی اولاد کی ہے۔ لہٰذا اسے سجدے کئے جاتے ہیں اور اس طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں جیسے کوئی نماز پڑھتا ہے۔

اسی طرح ہندوستان کے تقریباً ہر شہر میں کسی نہ کسی پیر کا مزار ہے۔ اور لوگوں نے اس کو اپنا قبلہ، ماویٰ اور ملجا بنا رکھا ہے۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ اور سلاطین وقت نے ان کی تعمیر، مرمت اور نقش و نگار کی سجاوٹ و آرائش میں اس قدر روپیہ صرف کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں کہ اگر یہ روپیہ جمع کر کے تمام غربا اور فقراء کو دیا جائے تو ہندوستان میں کوئی مفلس نہ رہے۔

... ہو گئی کہ خواجہ معین الدین اجمیری کے مزار کا کلس سونے کا ہو اور اسی قدر قیمتی پڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں جو مجاوروں کا حصہ ہوتا ہے۔

یہ ہے میرے ہندوستانی دوست کا خط۔ خدا جانتا ہے میں نے پورا خط پڑھا بھی نہیں تھا کہ مجھے اپنے ساتھ ساری کائنات گھومتی نظر آنے لگی اور میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں بالکل ہوش میں نہ تھا بلکہ مجھے اپنے گرد و پیش کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ اسلام کی حالتِ زار پر میرا رُواں رُواں چیخ رہا تھا۔ مسلمانوں سے فریاد کر رہا تھا۔ اُف! یہ بدنصیب مسلمان جو مذہب کے ٹھیکیدار بنتے ہیں جنہیں اسلامی عظمت کا آئینہ دار ہونا چاہیئے تھا۔ انہوں نے اسلام کو اس درجہ پر پہنچا دیا ہے۔ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنتے ہیں۔ کون کہیگا کہ مسلمان نے اسلام کا بول بالا کیا۔ جبکہ وہ خود اسی طرح دین کا مذاق اُڑاتے ہیں اور انھیں شرم نہیں آتی۔ مسلمان ہو کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں!

کونسی آنکھ ہوگی جو اس افسوسناک منظر کے سامنے اپنے آنسوؤں کا سارا خزانہ نہ بہادے؟ کیا یہی فرزندانِ توحید ہیں جو مٹی کے ڈھیروں کے سامنے سجدے اور رکوع کرتے ہیں؟

مسیحی تین خداؤں کو مانتا ہے۔ یعنی تثلیث کا قائل ہے۔ لیکن وہ خود اس کو بعید از عقل اور تعجب خیز سمجھتا ہے اور اس کو احساس ہے کہ حقیقت یہ نہیں ہے جو مان لی گئی ہے۔ اس لئے وہ یوں تاویل کرتا ہے کہ یہ تین ایک کا حکم رکھتے ہیں اور مسلمان ہاں بدنصیب مسلمان! ہزاروں کو خدا مانتا ہے۔ ان میں کچھ مُردے بھی ہیں تو کچھ مخصوص اور متبرک درخت بھی شامل ہیں۔ کسی درگاہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے تو کبھی کسی مقبرے کی خاک کو شفا سمجھ کر پھانکتا ہے۔

انسان لاشعوری طور پر بھی بہت کچھ کرتا ہے۔ مثلاً کوئی جذبہ اس کے دل میں پوشیدہ ہے لیکن وہ اس سے بے خبر ہے۔ بعض وقت خفیہ عقیدہ ہی اس کو کسی کام کا حکم دیتا ہے۔ اور وہ اسے صحیح سمجھ کر عمل کر بیٹھتا ہے۔ اپنی دانست میں وہ بالکل معصوم اور بے گناہ ہے۔ حالانکہ محض عقیدے کی خرابی نے اس کا ایمان کھو دیا۔

اس کی مثال مسلمان قوم سے زیادہ اور کہیں نہیں مل سکتی۔ جو اپنی حاجت روائی، تکمیل مقاصد اور شفاء کے لئے قبر میں مدفون اجسام سے التجا کرتی ہے اور ان مجبور بندوں کو قادر مطلق کا درجہ دیتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان پر اعتراض کیا جائے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اُن کی پرستش تھوڑی کرتے ہیں بلکہ صرف خدا تک رسائی کا وسیلہ ہیں یہ لوگ! ہم کہاں اس قابل کہ براہ راست خدا سے مانگیں۔ گویا انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ پرستش کہتے کسے ہیں۔ اور کسی معبود کی معبودیت کو تسلیم کرنے کے لئے سب سے بڑا اور بہتر طریقہ کیا نہیں کہ اس کے سامنے عاجزی سے سر جھکا کر کھڑے ہوں اور خضوع و خشوع کے ساتھ اس سے اپنی مدد کی دعا کی جائے۔ خدا کی قسم یہ غیر شعوری طور پر اُن مُردوں کی پرستش کرتے ہیں اور خدا کی عبادت سے غافل ہو کر منتیں مانتے اور چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

اسلام کی بنیاد ہی دراصل عقیدۂ توحید پر ہے اور یہ اصل عقیدۂ توحید ہی مسلمانوں کی قدر و منزلت بڑھاتا ہے اور باقی تمام انسانوں کو برابری کا درجہ دے کر مسلمانوں کے دلوں میں عزت، شرافت، انسانیت، خودداری اور محبت کا مادہ پیدا کرتا ہے۔

توحید خداوندی کا اقرار ہی ایسا طریقہ ہے جس سے بندوں کی گردنیں بندوں کی غلامی کے طوق سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ جب ایک خدا کی ذات کو قادر و عادل اور شافی مطلق مان لیا تو تمام انسان برابر ہو گئے۔ اب کوئی چھوٹا بڑا نہیں اور کمزور کو قوی کا ڈر نہیں اور کسی انسان پر انسان کے ظلم کا خوف ہوگا۔ بلکہ فرزندانِ توحید اُس وقت تک کسی انسان کو اپنا فرمانروا مان ہی نہیں سکتے جب تک کہ وہ تختِ سلطنت پر بیٹھنے کے باوجود اپنی ذات کو بساطِ انسانیت کا ایک فرد ہی نہ سمجھے اور اپنے عمل سے یہ ثابت نہ کردے کہ وہ خود بھی انہی کی طرح ایک انسان ہے۔ معبود یا اللہ نہیں۔ تیرہ سو سال پہلے کے مسلمان کو عقیدۂ توحید کے پیدا کردہ جذبات نے تقوی۔

صالحیت، غیرت، خودداری، انصاف اور رحم و شفقت کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ یہ اتنی بڑی طاقت تھی کہ اس کے زور سے وہ ظالم کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے۔ سفاک کی تلوار چھین لیتے تھے۔ چور کا ہاتھ کاٹ دیتے تھے اور اگر اُن کا بادشاہ بھی اپنے اقتدار کو حق کے خلاف استعمال کرتا یا اپنے کو اعلیٰ و ارفع سمجھتا تو وہ اس سے صاف کہہ دیتے تھے کہ تم اپنی جگہ رہو، حد سے آگے نہ بڑھنا۔ یہ سمجھ لو کہ تم صرف ایک مجبور بندے ہو۔ معبود یا رب نہیں۔ تختِ خلافت پر جو خلیفہ متمکن ہوتا اس کا خطبہ یہی ہوتا تھا۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمر فاروقؓ۔ کہ مسلمانو! مجھے تمہارا خلیفہ مقرر کیا گیا ہے۔ میں تم سے بہتر بندہ ہوں، جب تک میں حق کا حکم دوں تم میری اطاعت کرو اور جہاں میں حق کے خلاف کروں تو تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔ یہ تھے بے خوف فرزندانِ توحید۔ ان پر اسلام کو بھی ناز رہیگا اور یہ تھے نڈر اور بہادر مجاہد جو کسی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ انھیں صرف ایک خدا کا ڈر تھا۔ آج کے مسلمانوں کے عقائد خراب ہو گئے ہیں۔ اُن کے عقیدوں میں ظاہری اور باطنی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج اُن کی گردنوں میں غیروں کی غلامی کا طوق نظر آتا ہے۔ وہ ہر چیز کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں طمانیت سکون کی جگہ خوف و ہراس نے لے لی ہے۔ اُن کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہے۔ اسی لئے دُوسری قوموں کی اطاعت و فرمانبرداری کے بغیر چارہ نہیں لیکن افسوس صد افسوس کہ وہ اپنی اس حالت پر مطمئن ہیں۔ انھیں بالکل احساس نہیں کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے اور کیا ہونا چاہیئے۔ دشمنوں نے ان کی گمراہی دیکھی تو عذابِ الٰہی کی طرح اُن پر مسلط ہو گئے۔ اب مسلمانوں کے تمام کام انہی کے ہاتھوں میں ہیں، حتیٰ کہ دل و دماغ، دولت، وطن، عزت و آبرو سب غیروں کے قبضہ میں ہے۔ مسلمانوں کی ہر حرکت، ہر جنبشِ لب درپردہ ان ہی معبود قوموں کے اشارے سے ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک بے جان اور ایک بے حس پتھر اور مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کہ اپنا مصلح اور اپنا مخلص انھیں دشمن نظر آتا ہے اور وہ اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیتے ہیں!

خدا کی قسم مسلمان اس وقت تک اپنا کھویا ہوا وقار اور گمشدہ عظمت حاصل نہیں کر سکتے جس وقت تک وہ کامیاب اور زندہ قوم نہیں بن سکتے۔ جب تک وہ اپنے فراموش کردہ عقیدہ توحید کو یاد نہ کریں۔ سورج کا مغرب سے نکلنا ممکن ہے۔ لیکن جب تک مسلمان بزرگوں کے مقبروں اور مزاروں پر ہاتھ باندھے کھڑے رہیں گے۔ ان کا اس مصیبت سے بچ کر نکلنا بہت محال بلکہ غیر ممکن ہو!

جلال خداوندی ایسی گستاخی کو کبھی برداشت نہیں کرے گا۔ وہ ہرگز ایسی قوم کو ترقی اور خوشحالی نہیں بخشے گا جو اس کی کمزور بے بس مخلوق کو اس کی ذاتِ غیر فانی کا ہمسر بنائے۔ اور علی الاعلان اس کے احکام کو پس پشت ڈالتے ہوئے شریعت کی خلاف ورزی کرے۔ مصیبت یا بیماری کے وقت اس قادرِ مطلق سے پہلے پتھروں کو پکارے اور جو پریشانی میں گھبرا کر صرف پیروں کا مزار ہی دیکھتے ہوں۔

مجھے بتاؤ کہ میں کس سے فریاد کروں؟ اور کس سے مدد مانگوں؟ اور ان روح فرسا، دل خراش اور ہوش ربا مناظر کی عکاسی کس قلم سے کروں۔ میں اس ہیبت ناک مصیبت کا احساس کس طرح دلاؤں جو آج اسلام پر ٹوٹ پڑی ہے۔ اسلام کے نام لیوا عیش و عشرت میں مدہوش ہیں!

کیا عالمِ مصر کو پکاروں؟ وہ خود یوم الکنہ[1] میں اس طرح جمع ہوتے ہیں جس طرح شہد پر مکھیاں۔ یا علماء آستانہ میرے کام آئیں گے؟ جنہوں نے ابوالہدیٰ صیادی کو زندگی دینے کے لئے اسلام کے مایۂ ناز فلسفی جمال الدین افغانی کو موت کے گھاٹ اتار دیا؟ یا علماء عجم میرا ساتھ دیں گے؟ جو امام حسینؓ کی قبر کا اس طرح حج کرتے ہیں جیسے بیت اللہ الحرام کا کیا جاتا ہے؟ یا علماء ہند سے

---

[1] اس روز علماء مصر حضرت امام شافعیؒ کے مزار پر جھاڑو دینے کیلئے جمع ہوتے ہیں اور وہ خاک بطور تبرک اپنے ساتھ لاتے ہیں!

کوئی توقع رکھوں۔ جہاں اس مؤلف کتاب کی ہزارہا مثالیں موجود ہیں؟

اے امت محمدی کے پیشواؤ! ہم عوام کی بے دینی، شرک اور عقائد کی کمزوری کو انھیں معذور سمجھ کر نظرانداز کرسکتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک اَن پڑھ اپنی جہالت کے باعث دینی بصیرت رکھنے سے قاصر ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ مذہب کیا ہے۔ بلکہ وہ تو خدا کے صحیح تصور سے بھی ناآشنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خدا کو کسی نہ کسی صورت سے یاد کرنا چاہتا ہے اور اللہ تک رسائی کا کوئی ذریعہ ڈھونڈتا ہے۔ کبھی مقبروں کی خاک چھانتا ہے تو کبھی تمہارے لئے نذرانے لے کے آتا ہے اس لئے کہ خدا تک رسائی کا صحیح ذریعہ اور سیدھا راستہ نہیں جانتا!

لیکن تم ---؟ تمہارے پاس کیا عذر ہے؟ تمہارے بچاؤ کی کیا صورت ہوگی؟ تم لوگ تو قرآن کریم اور حدیث کے حافظ ہو۔ تم اپنی علمیت اور تقویٰ جتلانے کے لئے لمبی لمبی ڈاڑھیاں رکھتے ہو اور موٹی موٹی کتابیں لئے پھرتے ہو۔ تم رات دن قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہو۔ اس لئے خدا اور اس کی صفات سے بخوبی واقف ہو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن تم اپنی شکم پُری کی غرض سے حق کو چھپاتے ہو کہ ---- اذ دعان اور اقرب الیہ من حبل الورید۔ ترجمہ یہ کہ اے محمدؐ! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو (ان سے کہو کہ) میں تو اُن سے بہت قریب ہوں اور ہر پکارنے والے کی بات سُنتا ہوں۔ میں تو اُن سے اُن کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں۔

ان آیاتِ قرآنی اور سلسلۂ قرآنی رموز و نکات جاننے کے بعد اب تم لوگوں کے پاس کیا جواب ہے؟ صرف یہی نہیں بلکہ ہر منبر پر۔ ہر موقع پر، مسجد میں، ہر جلسہ میں، یہ رٹتے رٹتے تمہاری زبانیں گھس گئی ہوں گی اور چیختے چیختے تمہارے حلق بیٹھ گئے ہوں گے کہ سلف صالحین کی تقلید ہی ہدایت کا راستہ ہے اور جو اس کے خلاف عمل کرے وہ گمراہ بلکہ کافر ہے!

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ سلف صالحین نے کسی قبر کی پرستش کی تھی؟ کسی درگاہ پر جبین نیاز خم کی تھی؟ وہ کسی مزار پر اپنی مرادیں مانگنے جاتے تھے؟ تمہیں یہ علم ہے کہ ان سلف صالحین میں سے کسی بزرگ نے بھی روضۂ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام یا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، اہلبیت رسول کریمؐ کی قبروں پر مرادیں مانگنے کی غرض سے حاضری دی تھی؟ کیا تم یہ ثابت کرسکتے ہو کہ شیخ الرفاعیؒ۔ عبدالقادر جیلانی۔ نظام الدین۔ اور معین الدین چشتیؒ۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام، صحابہ کرام اور اہلِ بیت رسولؐ سے زیادہ مقرب اور افضل ہیں؟

کیا تمہارا خیال ہے کہ تصویروں، بتوں اور مجسموں کو نصب کرنے سے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مذاقاً یا بیکار منع فرمایا تھا؟ یا یہ خوف تھا کہ مسلمان پھر اپنی پہلی جہالت میں مبتلا ہو جائیں گے؟ تو پھر مجھے یہ بتاؤ کہ ان مجسموں، تصویروں، قبروں اور مزاروں میں کیا فرق ہے۔ دونوں کے ذریعہ گمراہی اور شرک ہی کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم تم سب کچھ جانتے ہو، تم کو کفر اور اسلام کا فرق معلوم ہے اور تم شرک و توحید کی حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ تم حق و باطل سے بخوبی آشنا ہو۔ لیکن تم لوگوں نے دُنیا کو آخرت پر ترجیح دے رکھی ہے۔ ان عوام کی گمراہی کا سبب صرف تمہاری خاموشی اور بے اعتنائی ہے۔ تمہارا مقصد، تمہارا نصب العین اب تبلیغ دین اور خلق خدا کی رہبری کے بجائے صرف دُنیوی عزت، شہرت اور عیش بن گیا ہے۔ اس لئے خدائے قہار نے تمہیں ان اعمال کی سزا دی اور تم سے اپنی نعمتیں چھین لیں۔ تمہارے سروں پر دشمنوں کو مسلط کردیا۔ وہ تم سے تمہارا وطن، تمہاری دولت، تمہاری عزت سب خرید کر برباد کر دیتے ہیں۔ طاغوتی طاقتوں کے ہاتھوں تم کٹھ پتلی کا ناچ ناچ رہے ہو۔ وہ طاقتیں تمہارا امن و سکون حرام کئے ہوئے ہیں۔ تمہاری معاشرت تباہ کر رہی ہیں اس لئے کہ تم اسی قابل ہو اور ساری امتِ محمدی کی گمراہی کا عذاب تمہاری گردنوں پر ہوگا اور اس قبر پرستی کی باز پرس عدالت خداوندی میں تم سے کی جائے گی!

واللہ شدید العقاب!

ابو السیف خالد

اٹھارھویں صدی میں اسلامی اتحاد کی ایک ناکام کوشش

اسلامی دُنیا کے لئے اٹھارھویں صدی ایک نہایت ہی پُر آشوب دَور تھا۔ ایک طرف مغرب میں دولت عثمانیہ رُو بہ زوال تھی تو دُوسری طرف مشرق میں ہندوستان کی وسیع سرزمین پر انگریزوں کی سامراجی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ مسلمانوں کی اکثر انقلابی تحریکیں اسی دورِ انحطاط میں پُورے زور شور سے اُٹھیں۔ لیکن اپنوں ہی کی بے التفاتیوں اور خود غرضیوں کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ مغرب کی عیاری نے وقتی طور پر ان تحریکوں کو دبا تو دیا۔ لیکن اُن کے نتیجے کے طور پر ایک عام بیداری کی جو لہر اسلامی دُنیا میں دوڑ گئی وہ وقتاً فوقتاً بغاوتوں اور مسلح کوششوں کی شکل میں ظاہر ہوتی رہی۔ چنانچہ سید احمد شہیدؒ کی عسکری تحریک اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اور پھر بیسویں صدی میں مختلف مسلم مملکتوں کا قیام انہی کوششوں کا ثمرہ ہے!

اٹھارھویں صدی میں جبکہ لاتعداد مشرقی حکمران اپنے اقتدار کو ہر طرح سے بچانے کی فکر میں لگے ہوئے تھے، افغانستان میں زمان شاہ اپنی سلطنت کے استحکام میں مصروف تھا۔ یہ زمان شاہ تیسری جنگ پانی پت کے مشہور فاتح احمد شاہ ابدالی کا پوتا اور تیمور شاہ کا بیٹا تھا۔ تیمور شاہ کی وفات پر اس کے بائیس۲۲ بیٹوں میں جنگ تخت نشینی کا آغاز ہوا۔ جس میں زمان شاہ اپنی قابلیت اور ہردلعزیزی کی بناء پر کامیاب ہوگیا۔ زمان شاہ ہر لحاظ سے اپنے دادا کا جانشین تھا۔ لیکن اس کی شجاعت میں تہوّر کا عنصر غالب تھا۔ اور یہی وہ خوبی یا خامی تھی جو اس کی تباہی کا باعث ہوئی۔ دُوسرے بدقسمتی سے اسے بھائی بھی ایسے ملے تھے جو اس کی راہ میں ہر طرح سے روڑے اٹکاتے اور اس کی مشکلات میں اضافہ کرتے تھے۔ ورنہ اگر اسے اطمینان سے کام کرنے کا موقع مل جاتا تو شاید ہندوستان کی بھی تقدیر بدل جاتی!

ایک طرف شمال میں زمان شاہ اپنے عزائم کی تکمیل میں مصروف تھا تو دوسری جانب جنوب میں ایک اولوالعزم ہستی ایک مضبوط مستحکم اسلامی سلطنت کے خواب دیکھ رہی تھی۔ یعنی ٹیپو سلطان ہندوستان کو انگریزوں اور مرہٹوں کے تسلط سے نجات دلانے کیلئے مصروفِ کار تھا۔ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے کبھی اس نے سلطان ترکی سے تعلقات استوار کئے تو کبھی نپولین سے تعاون واشتراک کے منصوبے بنائے۔ اور دوسری جانب اُن مسلمان امراء اور رؤسا کو جو انگریزوں کے ناپاک عزائم کی تکمیل کے آلۂ کار بنے ہوئے تھے ایک بلند نصب العین کے لئے متحدہ جدوجہد کی دعوت دی۔ لیکن اُس کی یہ پکار صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ سلطان ترکی اپنی مشکلات میں گرفتار تھا۔ تو نپولین ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرنے سے لاچار۔ اور ہندوستانی حکمران تو ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اپنے تخت کو بچانے کا تہیہ کرچکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیپو سلطان کے وہ عزائم جو شاید تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑنے میں کامیاب ہوجاتے۔ اپنوں کی خود غرضی اور اقتدار پرستی کے باعث سرد پڑ گئے اور زمان شاہ جیسی ہم عصر جلیل القدر ہستی اندرونی خلفشار کا شکار بن گئی۔

اتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں ٹیپو سلطان کی کوششوں کا ایک پہلو اب تک منظرِ عام پر نہیں آیا۔ یعنی زمان شاہ سے دوستانہ تعلقات کا قیام۔ یوں تو اس اتحاد کی بنیاد تیمور شاہ کے دَورِ حکومت میں ہی پڑ گئی تھی اور تیسری جنگ میسور سے قبل باہمی مراسلت کا

کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن تیمور شاہ اپنے مختصر سے دورِ حکومت میں اندرونی مشکلات کے باعث اس طرف عملی توجہ نہ دے سکا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ تیمور شاہ کے بعد اس کے لائق بیٹے نے تمام کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔

ٹیپو اور زمان شاہ کے درمیان تعلقات کا قیام ایک تاریخی حادثے کا رہینِ منت ہے۔ ہوا یوں کہ فیض اللہ خاں والی رامپور نے ۱۷۹۴ء میں وفات پائی اور اُن کی جگہ اُن کا بڑا لڑکا محمد علی خاں تخت نشین ہوا۔ لیکن اُس کے چھوٹے بھائی غلام محمد خاں نے اُسے قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت تک انگریز ہندوستانی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے۔ اور کئی امراء محض اپنے تخت و تاج کو بچانے کی خاطر اُن کے زیرِ سرپرستی آ چکے تھے۔ محمد علی خاں کا شمار بھی انہی امراء میں ہوتا تھا۔ انگریزوں کو اپنے حلیف کا یہ قتل ناگوار گزرا۔ اور ویسے بھی وہ غلام محمد خاں سے مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اسے معزول کر کے کمپنی کے علاقہ میں نظر بند کر دیا۔ وہاں سے یہ حج کے بہانے اجازت لے کر کلکتہ کی بندرگاہ سے روانہ ہوا۔ لیکن میسور کی ایک بندرگاہ پر اُتر کر ٹیپو سلطان کی پناہ میں چلا گیا۔ ٹیپو نے معزز پناہ گزین کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور پھر اس کی خواہش پر بڑے اہتمام سے کابل روانہ کر دیا۔ کابل پہنچ کر شاہ زماں کے دربار میں غلام محمد خاں نے سلطان کی بہت تعریف کی۔ اور اس کے جوشِ جہاد، حمیتِ اسلام اور عمدگیٔ عساکر کا ذکر کیا۔ سلطان کے ان جذبات نے زمان شاہ کو بہت متاثر کیا۔ اُس نے سلطان کے نام ایک خط لکھوایا جو سلطان کے وکلاء متعینہ دہلی (مول چند اور سبحان رائے) کے توسط سے سلطان تک پہنچا۔ اس طرح اپنے دور کی یہ دو عظیم شخصیتیں ایک اعلیٰ مقصد کی تکمیل کیلئے متحد ہو گئیں۔

۱۷۹۶ء میں شاہ اودھ اور انگریزوں کے مظالم سے تنگ آ کر روہیلوں نے زمان شاہ سے امداد طلب کی۔ شاہ فوراً ۲۳ ہزار جوانوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اُس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مغل بادشاہ کو مرہٹوں کے چنگل سے نجات دلائے۔ لیکن ابھی لاہور ہی پہنچا تھا اسے اطلاع ملی کہ بھائیوں نے ملک میں بغاوت کر دی ہے اور مرکزِ حکومت خطرے میں ہے۔ چنانچہ وہ واپس پلٹا اور باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔

اسلامی اُخوت کے اس پُرجوش مظاہرے نے ٹیپو کی مخلص طبیعت کو بہت متاثر کیا۔ اور اس نے خطوط کے ذریعہ قائم شدہ رابطہ کو اپنے وکیل دربار کابل میں بھیج کر مستحکم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ زمان شاہ نے اس تجویز کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ چنانچہ ۱۷۹۶ء میں میر محمد رضا اور میر حبیب اللہ منگلور سے روانہ ہوئے اور کچھ "ٹھہرتے ہوئے" کراچی سے براستہ کوئٹہ، چمن، قندھار، کابل پہنچے۔ کابل پہنچ کر وہاں کے امراء سے ملاقات اور پھر زمان شاہ کے دربار میں باریاب ہو کر نامہ و تحائف پیش کئے۔ شاہ زمان شاہ، سلطان کے بلند جذبات سے بہت متاثر ہوا اور آزادی کی جدوجہد میں اس نے سلطان کا شریکِ کار بننا منظور کر لیا۔ سلطان ٹیپو نے جو خط اپنے وکیلوں کے ہاتھ کابل روانہ کیا تھا وہ بہت ہی پُراثر اور اتحاد بین المسلمین کی مخلصانہ خواہشات کا آئینہ دار ہے۔ اس خط کے چند اقتباسات کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

"ایزد برتر و توانا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس سعید ساعت میں مجھے یہ خوش خبری ملی ہے کہ اعلیٰ حضرت اپنی تمام فرصتیں اور اپنی تمام تر صلاحیتیں دینِ متین کے استحکام و حمایت میں صرف فرما رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی خدا پرستی، انصاف دوستی، دینی حمیت و غیرت اور اولوالعزمی کی خبریں تمام مسلمانانِ دنیا کے لئے عموماً اور میرے لئے خصوصاً انتہائی خوشی کا باعث ہیں۔ یہاں کی یہ حالت ہے کہ ہر جمعہ کو دارالحکومت (سرنگا پٹم) جامع مسجدوں (مسجد اعلیٰ و مسجد اقصیٰ) میں ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان جمع ہو کر ادائے نماز کے بعد اعلیٰ حضرت کے لئے جو اسلام اور حلقہ بگوشانِ اسلام کے حامی ہیں دشمنوں پر غلبہ و نصرت کی دعا کرتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ قادر

مطلق اپنے بندوں کی دعاؤں کو ضرور سنے گا۔ اعلیٰ حضرت کو معلوم ہوا ہوگا کہ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جہاد کروں، اسی ارادے کی برکت ہے کہ کفار کی سرزمین (دکن) میں خدائے بزرگ و برتر نے اس خطۂ اسلامی (سرکارِ خداداد) کی حفاظت کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسے کہ طوفان میں کشتیٔ نوح ......"

سلطان کی تجویز یہ تھی کہ زمان شاہ شمال کی طرف سے حملہ آور ہو اور مغل سلطنت کو مرہٹوں کے پنجہ سے نجات دلاکر کسی لائق تیموری شاہزادے کے سر پر تاج رکھے۔ پھر نظم سلطنت کی بحالی کے بعد دکن کی طرف پیش قدمی کرے۔ ادھر سے وہ خود ٹیپو سلطان دکن میں علمِ جہاد بلند کرے اور پیش قدمی کرتا ہوا شاہ کی فوجوں سے جاملے۔ زمان شاہ نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ بلکہ وہ تو پہلے ہی سے اس قسم کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ چنانچہ جب سلطان کے وکیل واپس ہوئے تو زمان شاہ نے سلطان کے نام بیش قیمت تحائف کے ساتھ یہ نامہ بھیجا:۔

"آپ کے مبارک و مستقیم ارادوں کا مرجع یہ ہے کہ کافر برباد ہوں اور رسولِ پاک کے دین کا نور ہر جگہ پھیل جائے۔ اس لئے ہم اپنے عساکرِ قاہرہ کے ساتھ بہت جلد کوچ کریں گے اور کفار و مشرکین کے خلاف جنگ کر کے ان خطوں کو ضلالت کیش و بدکردار گروہوں کی لعنت سے پاک کر دیں گے تاکہ وہاں کے باشندے امن و راحت کی برکتوں سے شادکام ہوں"

سلطان کی تجویز کے مطابق زمان شاہ نے ۱۷۹۸ء میں ہندوستان پر حملہ کا ارادہ کر لیا۔ لیکن حملہ سے پہلے گورنر سر جان شور کو اس کی اطلاع دے دی۔ اور جب سر جان شور کی جگہ ویلزلی گورنر بن کر آیا تو زمان شاہ نے اس کے پاس اس مفہوم کا پیغام بھیجا:۔

"ہم شاہ عالم کو مرہٹوں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے کے لئے ہندوستان آنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں کا فرض ہے کہ ان مقاصد میں معاونت کریں۔ تاکہ مغل سلطنت کا اقتدار بحال ہو جائے"

شاہ کی طرف سے اسی مضمون کے خطوط ہندوستان کی بساطِ سیاست کے دو انگریزی مہروں (نظام اور شاہ اودھ) کے نام بھی روانہ کئے گئے۔

زمان شاہ کے ان خطوط سے ویلزلی بہت خائف ہوا۔ اس کے اضطراب میں دو واقعات نے اور بھی اضافہ کر دیا۔ ہوا یہ کہ اودھ کے معزول حکمران وزیر علی نے شاہ زمان کے پاس اپنے وکیل مع نامہ و تحائف روانہ کئے۔ ویلزلی سمجھ گیا۔ کہ وہ زمان شاہ کی مدد سے اپنی چھنی ہوئی سلطنت کے حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ دوسرے واقعہ نے اس اضطراب کا رُخ عملی اقدامات کی طرف موڑ دیا۔ نواب بنگال کے برادرِ نسبتی شمس الدولہ کے متعلق معلوم ہوا کہ اس نے زمان شاہ کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی ہے۔ اسے فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ اور اس کے پاس سے برآمد شدہ کاغذات سے بھی کسی حد تک اس اطلاع کی تصدیق ہو گئی۔

جوں جوں ویلزلی کے خدشات بڑھتے گئے اس کی سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ اس کے دفاعی منصوبوں کے دو جزو تھے۔ پہلے تو وہ یہ چاہتا تھا کہ زمان شاہ کو مکمل طور پر اندرونی مشکلات میں اُلجھا دیا جائے۔ تاکہ ہندوستان پر حملہ کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آئے۔ دوسرا منصوبہ شمال میں زمان شاہ کے خلاف سکھوں، راجپوتوں اور شجاع سے اتحاد اور جنوب میں ٹیپو کے خلاف مرہٹوں اور نظام سے اشتراک سے متعلق تھا۔ ویلزلی اپنے منصوبہ کے پہلے جزو کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ دو اولوالعزم قائدین کی

بیک وقت دو سمتوں سے یلغار کو روکنا ان تمام متحدہ طاقتوں کے بس سے باہر ہوگا۔ لیکن پھر بھی اس نے حفاظتی طور پر ان تمام طاقتوں سے تعاون و اشتراک کے معاہدے کرلئے۔ منصوبے کے پہلے جزو کی تکمیل کے لئے اسے "ایک جاں نثار قسم کا ہندوستانی" باشندہ مہدی علی خاں مل گیا۔ یہ شخص پہلے ایران گیا اور وہاں بوشہر میں ایک ایرانی کی حیثیت سے سکونت اختیار کرلی۔ پھر اسے کمپنی کا ریزیڈنٹ بنا کر سرحد ایران و افغانستان پر متعین کیا گیا۔ تاکہ فرقہ داری انتشار و افتراق کو ہوا دے۔ ابتداء میں ویلزلی، مہدی علی خاں کی وفاداری سے مطمئن نہ تھا۔ لیکن مہدی نے چند ہی دنوں میں اپنی عیارانہ چالوں سے شاہ ایران کو رام کرلیا۔ اور شاہ اس کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا۔ اب مہدی نے اپنا دوسرا حربہ استعمال کیا۔ یعنی اس دور کے حالات کی مناسبت سے شیعہ سنی تنازعات کو ہوا دی۔ اور دربار میں سنی افغانوں کے شیعوں پر ظلم وستم کے بے سروپا واقعات اس قدر رنگ آمیزی سے بیان کئے کہ شاہ کو یقین کرتے ہی بنی۔ بس پھر کیا تھا۔ کجکلاہ ایران جوش حمیت میں زمان شاہ کے باغی بھائی محمود کو امداد دینے پر آمادہ ہوگئے!

آخر وہ وقت بھی آگیا جس کے لئے سازشوں کے یہ جال بچھائے گئے تھے۔ ۱۷۹۸ء میں شاہ زمان ایک لشکر جرار کے ساتھ سرحد ہند میں داخل ہوا۔ زمان کا یہ حملہ شاید اس زمین کے مستقبل کو بدل کر رکھ دیتا۔ لیکن ابھی وہ لاہور تک ہی پہنچنے پایا تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ باغی بھائی محمود نے ایران سے نکل کر ہرات پر حملہ کردیا ہے۔ چار و ناچار واپس پلٹا۔ لیکن شکست کھائی۔ ظالم بھائی نے اس کی آنکھیں نکلوادیں۔ اور ٹیپو کی امید کی یہ آخری شمع بھی بجھ گئی اور اب وہ میدان میں تنہا رہ گیا!

ویلزلی کو اپنی اس عیارانہ چال کی کامیابی پر کتنی خوشی ہوئی۔ اس کا اندازہ اس خط سے ہوسکتا ہے جو اس نے اس موقع پر گورنر بمبئی ڈنکن کو لکھا:۔

> "زمان شاہ ہر جنوری کو لاہور سے واپس چلا گیا۔ واپسی کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس کا بھائی محمود بلخ کی سرحد پر نمودار ہوگیا تھا۔ تاریخوں کے تقابل سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ محمود کی یہ نقل و حرکت غالباً آپ کے ایجنٹ مہدی علی خاں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ کو مہدی علی خاں کی کارگزاری پر مکمل اعتماد ہو تو میں سمجھتا ہوں دو لاکھ دس ہزار روپے کا عطیہ اس خدمت کے معاوضہ میں زیادہ نہیں۔"

ابھی اس کامیابی کے فوراً بعد ہی ویلزلی نے سلطان ٹیپو کے خلاف کھلی سازشوں کا آغاز کردیا۔ ایک طرف تو نظام اور مرہٹوں سے مددلی اور دوسری طرف "امدادی نظام" (subsidiary system) کا آزمائشی حربہ استعمال کیا۔ ادھر تمام ہندوستان اور خود دار الحکومت (سرنگا پٹم) میں ٹیپو کے خلاف یہ سازشیں ہو رہی تھیں۔ امراء وزراء کی اکثریت کو خریدا جاچکا تھا۔ اور ٹیپو کو ہر ممکن ذریعہ سے بے بس اور بے دست و پا بنانے کی کوششیں کی جاچکی تھیں۔ لیکن دوسری طرف ٹیپو ان تمام سازشوں سے بے خبر زمان شاہ کے حملہ کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ اس نے آخر جنوری ۱۷۹۹ء میں حبیب اللہ اور میر محمد رضا کو نامہ دے کر دوبارہ افغانستان روانہ کیا:۔

> "دشمنوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میرے وکیل دربار افغانستان میں باریاب ہوئے ہیں تو وہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ خدا کو منظور ہے تو تمام دشمن دین حق کے مجاہدوں کی تلواروں کا شکار بن جائیں گے۔ میں خدا کا مجاہد ہوں۔ فرمان الٰہی کا فرمانبردار

ہوں - میرا باور خدا ہے - جو سب سے بڑا اور سب سے قوی ہے - میرا حامی رسولِ برحق ہے جو دین مبین کا پیشوا اور محدثات قدیمہ کا ماحی ہے اور کوئی مددگار نہیں - میرا بھروسہ اس آسمانی بشارت پر ہے - کَم مِن فِئَۃٍ قَلِیلَۃٍ غَلَبَت فِئَۃً کَثِیرَۃً باِذنِ اللّٰہ - میں اپنی ہر طاقت وقوت کو قولاً و عملاً جہادِ مقدس میں صرف کر ڈالنے کے لئے بے تاب ہوں "۔

اِدھر دونوں وکیل افغانستان روانہ ہوئے اور اُدھر انگریزوں نے ٹیپو پر امدادی نظام قبول نہ کرنے کا الزام لگاتے ہوئے اپنے حلیفوں کے ساتھ میسور پر حملہ کر دیا - سلطان تنہا تھا اور دکن کی تمام قوتیں انگریزوں کی چاکر - نتیجہ یہ ہوا کہ تین مہینے کے اندر سرنگا پٹم فتح ہوا - سلطان شہید ہو گیا - اور سلطنت خدا داد ماضی کا ایک المناک باب بن کر رہ گئی - اس طرح انگریز اپنی روایتی "ڈپلومیسی" کی مدد سے ہندوستان میں قدم جمانے میں کامیاب ہو گئے !

"فاران" کے مستقل خریدار صاحبان

کی خدمت میں گزارش ہے کہ انشاء اللہ ماہ جنوری کا شمارہ "سیرت نمبر" ہوگا - اس کی ضخامت کا ابھی صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا - مگر سرسری اندازہ یہ ہے کہ "سیرت نمبر" فاران کی عام ضخامت سے چار گنا زیادہ ضخیم ہوگا -

یہ نمبر خریدار صاحبان کی خدمت میں رجسٹری کے ذریعہ بھیجا جائے گا - دسمبر کے پرچہ میں خریدار صاحبان اس سلسلہ کے اعلان کو تلاش کر کے ضرور پڑھ لیں - اور اس اعلان کے مطابق ڈاک کے ٹکٹ دفتر "فاران" کو روانہ فرما دیں -

گوپال متل

سُرخ چین میں ادب پر احتساب

غیر ملکی اخباروں میں سُرخ چین کے مشہور ترقی پسند ادیب ہیو فینگ کی گرفتاری کے متعلق ایک مختصر سی خبر شائع ہوئی ہے اس کے پس منظر کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ اس مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہیو فینگ کی گرفتاری ایک بہت بڑی ادبی اور ثقافتی کشمکش کا نتیجہ تھی۔ اس کشمکش میں ایک طرف ادیب کی آزادی کے علمبردار تھے جو انسان دوست اور آدرش وادی تھے اور ادب کے تخلیقی عمل کو داخلی اُمنگ کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جو ادیبوں کو برسرِ اقتدار پارٹی کا حاشیہ بردار بنانے کے حامی تھے اور یہ چاہتے تھے کہ:۔

"ادب اور فنونِ لطیفہ کو سیاسی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہونا چاہیئے"

اس مشہور و مقبول ادیب کو گرفتار کرنے کے لئے چین کی برسرِ اقتدار پارٹی کو جس وسیع پیمانے پر مہم جاری کرنا پڑی وہ اس بات کی علامت ہے کہ چین کے ارباب دانش نے اپنی آزادروی کو ابھی مکمل طور پر خیرباد نہیں کہا۔ اور آمریت کے خلاف اُن کا احتجاج جاری ہے۔ دوسری طرف ہیو فینگ اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاریاں اس بات کا پتہ بھی دیتی ہیں کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہے۔ یہ گرفتاریاں ظاہر کرتی ہیں کہ چینی کمیونسٹ اپنی "نئی جمہوریت" کو بڑی تیزی کے ساتھ آمریت کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ اور ان عناصر کے خاتمہ وجود کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے جو نظریات کے جزوی اختلافوں کے باوجود انقلاب کے دوران اِن کی صفوں میں شامل ہو گئے تھے!

ہیو فینگ کے خلاف جدوجہد کا آغاز کمیونسٹ چین کے ممتاز اخبار جین من جیہہ پاؤ نے ۱۳۔ مئی ۱۹۵۵ء کو کیا۔ نیو چائنا نیوز ایجنسی کی اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ اس روز اس اخبار نے ہیو فینگ کا ایک مقالہ "میری خود تنقیدی" کے عنوان سے شائع کیا۔ اس کے ساتھ اس نے ہیو فینگ کے خلاف شو ووُ کا ایک زہریلا مقالہ بھی شائع کیا اور اپنی طرف سے بھی اس کی مذمت کی۔ اپنے ایڈیٹوریل میں اس اخبار نے لکھا:۔

"ہیو فینگ نے ایک مقالہ "میری خود تنقیدی" کے عنوان سے اس سال جنوری کے مہینے میں لکھا تھا۔ فروری میں اس نے اس مقالہ پر نظر ثانی کی اور اس میں مزید اضافہ کیا۔ اس کی اشاعت کو ہم نے روک رکھا اور اب اسے شو ووُ کے مقالہ "ہیو فینگ کی انقلاب دشمن ٹولی کے متعلق کچھ مواد" کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ ہیو فینگ کے مقالے کی اشاعت کو روکنے کی وجہ یہ تھی کہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہیو فینگ ہمارے ناظرین کو گمراہ کرنے کے لئے ہمارے پرچہ کا مسلسل استعمال کرتا رہے۔ شو ووُ کے مقالے سے ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہیو فینگ کی رہنمائی میں کام کرنے والی پارٹی دشمن اور عوام دشمن ٹولی کس طرح کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ

ترقی پسند مصنفین سے نفرت کرتی رہی ہے اور اُن کی مخالفت کرتی رہی ہے"۔

"چین من جیہہ پاؤ" کے اداریہ کے مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں ہیوفینگ اپنے خود تنقیدی کے حق سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے ادبی نظریات پر کھلے بندوں بحث کا تمنائی تھا - وہاں برسرِاقتدار پارٹی اس کے خلاف مصروف سازش تھی - اس نے اپنے مقالے کو خفیہ طور پر شائع نہیں کیا - بلکہ اس کو کمیونسٹ چین کے سرکاری اخبار میں اشاعت کے لئے بھیجا - اس اخبار کو اسے شائع کرنے کی جسارت نہیں ہوئی اور پورے پانچ ماہ تک حکمران یہ سوچتے رہے کہ اسے بدنام کرنے کے لئے کس قسم کی فردِ جرم مرتب کی جائے -

فردِ جرم پورے پانچ ماہ کے غور و خوض کا نتیجہ تھی - لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وار اوچھا پڑا - ورنہ اس اخبار کو اپنی ۲۴ - مئی کی اشاعت میں یہ شکوہ نہ کرنا پڑتا کہ :-

"ایسے کچھ لوگ اب بھی باقی ہیں جو ہیوفینگ سے ہمدردی رکھتے ہیں اور کچھ ایسے بھی جو بظاہر مذمت کرتے ہیں - لیکن بہ باطن اس کے ہمدرد ہیں"۔

ان ڈھلمل یقین لوگوں کو ہیوفینگ کی مخالفت پر اُبھارنے کے لئے اس نے مزید کچھ الزام شائع کئے اور متعدد لوگوں کے خط چھاپے جن میں یہاں تک مطالبہ کیا گیا تھا کہ :-

"ہیوفینگ اور اس کی انقلاب دشمن ٹولی کو مکمل طور پر تباہ کردیا جائے"۔

اب ذرا ان الزامات کی فہرست بھی سُن لیجئے جو اس "عوام دشمن" ادیب پر عائد کئے گئے - کمیونسٹ چین کے ایک اور اخبار "دین ہیوریج پاؤ" کی ۳۰ - مئی کی اشاعت میں درج ہے -

"ہیوفینگ ہمیشہ اپنے آپ کو ادب اور فنونِ لطیفہ کا نظریاتی ماہر سمجھتا تھا - کئی سال تک وہ مارکسزم کا لبادہ اوڑھ کر بورژوائی آدرش واد کی تبلیغ کرتا رہا اور مارکسزم کی تردید - وہ حقیقت پسندی کی تردید کے لئے حقیقت پسندی کا نقاب اوڑھتا رہا - اپنے داخلی آدرش واد اور دُنیائے ادب پر غلبہ پانے کی شخصی امنگ کی تکمیل کے لئے اس نے اپنے گروہ کی تشکیل کی - اس نے ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق چینی کمیونسٹ پارٹی کے طریق کار اور ادبی اور فنی معاملوں میں پارٹی کی لیڈرشپ کی مذمت کی اور اسے میکانکی حکمرانی قرار دیا"۔

"اس نے کہا کہ تخلیقِ ادب اور فنونِ لطیفہ کا مخزن داخلی عمل، مضبوط شخصیت اور زندگی کا داخلی پھیلاؤ ہیں - ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق یہ تمام نظریہ بنیادی طور پر بورژوا آدرش واد کے نظریات ہیں"۔

"جس زمانے میں تحریک مزاحمت جاری تھی - اس نے ایک مضمون میں مصنفوں سے کہا کہ اُن کے لئے عملی جدوجہد میں شریک ہونا ضروری نہیں - جاپان دشمن جنگ کے خاتمے کے بعد جب نجات کی جنگ آگ کی طرح ملک میں پھیلی ہوئی تھی - اس نے مصنفوں کو ایک بار اور یہ مشورہ دینا ضروری سمجھا کہ عوام کے ساتھ کوچ کرنے کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں کہ مصنف عوام کی

آدرش واد کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس نے ہمیشہ اس بات کی تبلیغ کی کہ مصنّفوں کے لئے صحیح
بین الاقوامی نظریہ کو اپنانا ضروری نہیں اور نہ عوام کو اُمنگ کا منبع سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس
کا کہنا تھا کہ اگر مصنّف اپنے فن کے وفادار ہیں اور زندگی کے تئیں داخلی رجحان رکھتے ہیں
تو اُن کے کارنامے فنونِ لطیفہ میں صداقت کے حامل بن سکتے ہیں۔"

"اب ہیو فینگ کے ارادے سب پر ظاہر ہو چکے ہیں۔ ہیو فینگ نے اس نظریہ کو اس لئے اپنایا
کہ وہ پارٹی کا دشمن تھا اور ادب اور فنونِ لطیفہ میں پارٹی کی رہنمائی کا مخالف۔"

"نجات کے بعد گو، لوگوں نے ادب اور آرٹ کے حلقوں میں ہیو فینگ کے غلط خیالات پر نکتہ چینی
کی لیکن وہ خاموش رہا۔ ۱۹۵۴ء میں البتہ اُس نے اپنے طریقِ کار میں تبدیلی کر لی۔ اس نے چین کی
کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سامنے ایک سوشلسٹ دشمن ادبی اور فنی پروگرام رکھ دیا۔ اُس نے
علانیہ اس بات کی مخالفت کی کہ مصنّف کمیونزم کے بین الاقوامی نظریہ کو اپنائیں۔ اور مزدوروں،
کسانوں، سپاہیوں کی صف میں شامل ہو جائیں۔ اس نے مصنّفوں کی نظریاتی تربیت کی مخالفت کی
اور اس بات کی بھی کہ لٹریچر اور فنونِ لطیفہ کو موجودہ سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔
یہ باتیں اس کے نزدیک مصنّف کی کھوپڑی میں چھرے گھونپنے کے مترادف تھیں۔"

مندرجہ بالا تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ ہیو فینگ نے اپنا مقالہ "جین من جیہ پاؤ" کو بھیجنے سے پہلے اپنے خیالات اور عقائد سے
چین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو آگاہ بھی کیا تھا۔ اور ان خیالات پر مبنی ایک ادبی پروگرام اسے پیش کیا تھا۔ مرکزی کمیٹی
نے اس پروگرام پر کھلی بحث کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو اس نے اخبار کے ذریعہ اپنے عقائد کو منظرِ عام پر لانا چاہا۔
جس کی پاداش میں وہ حکومتِ وقت کا معتوب بن گیا۔

بعد کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ الزاموں کی دوسری قسط شائع ہونے کے بعد بھی ہیو فینگ پوری طرح بدنام نہ ہوا اور
لوگ یہی سمجھتے رہے کہ اگر الزام صحیح بھی ہیں تو بھی "ہیو فینگ کی ٹولی پیشہ وروں اور مصلحت اندیشوں کے ایک ایسے گروہ سے
زیادہ حیثیت نہیں رکھتی جو ادب اور فنونِ لطیفہ کے شعبہ میں موجود تھا۔ اس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس گروہ کی
سرگرمیوں کا کوئی رجعت پسندانہ سیاسی پس منظر بھی تھا۔" (جین من جیہ پاؤ۔ ۱۰۔ جون ۱۹۵۵ء)

یہ اخبار اپنی اسی اشاعت میں اُن تمام لوگوں کو جو ہیو فینگ کو "ادبی جرائم" کی پاداش میں سیاسی مجرم قرار دینے کے لئے
تیار نہیں تھے۔ خوف زدہ کرنے کیلئے لکھتا ہے:۔

"جو لوگ اس قسم کی باتیں بناتے ہیں انھیں یا تو اپنی طبقاتی جبلتوں کی وجہ سے ان (ہیو فینگ
کی ٹولی) سے ہمدردی ہے اور یا سیاسی شعور کی کمی کی وجہ سے ان کا طرزِ فکر احمقانہ ہے۔ ان میں
سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو پہلے رجعت پسند تھے اور اب تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور کچھ ایسے جو
ہیو فینگ کی ٹولی میں شامل ہیں۔"

ہیو فینگ کے حق میں آواز بلند کرنے والوں کو اس طرح خوف زدہ کرنے کے بعد یہ اخبار ہیو فینگ اور اس کے ساتھیوں پر
کیومنتانگ، وحد سامراج کی ایجنسی کا الزام بھی لگا دیتا ہے اور یہ الزام بھی کہ ہیو فینگ اور اس کے ساتھی ادبی شعبوں کے علاوہ

فوجی یونٹوں، صنعتی کارخانوں اور پبلک جماعتوں میں بھی گھسے ہوئے ہیں"۔

یہ سب کچھ ہیو فینگ، اس کے ساتھیوں اور ہمدردوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے ناکافی نہیں تھا۔ لیکن حکومتِ چین نے صفائی کی مہم کو زیادہ کامیاب بنانے کے لئے تحریری جہاد کے ساتھ ساتھ "عوامی" جہاد بھی شروع کر دیا۔ صرف ادبی انجمنیں ہی نہیں بلکہ چین کی سیاسی جماعتوں اور ٹریڈ یونینوں نے بھی ہیو فینگ کے خلاف ریزولیوشن پاس کئے اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ انھیں سخت سزا دی جائے۔

خوف اور دہشت کے اس ماحول میں بھی غیر ادبی اداروں نے ہیو فینگ اور اس کے ساتھیوں کو بہ آسانی مجرم قرار نہیں دیا اور حکومت کے نمائندوں کو مذمت کے ریزولیوشن پاس کرانے کے لئے مزید تخویف اور اشتعال انگیزی سے کام لینا پڑا۔ نیو چائنا نیوز ایجنسی کے ۵ - جون کے مراسلے سے پتہ چلتا ہے کہ جب یونینوں کی کُل چین فیڈریشن کا جلسہ طلب کیا گیا تو کچھ عناصر ہیو فینگ کے معاملہ کو خالص ادبی مسئلہ سمجھ کر قرار دادِ مذمت پاس کرانے سے ہچکچا رہے تھے۔ انھیں خوفزدہ کرنے کے لئے صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہیو فینگ کی ٹولی صرف ادب اور فنونِ لطیفہ کے شعبوں میں کام کرتی تھی۔ ٹریڈ یونینوں میں نہیں۔ اس بناء پر لوگ تساہل سے کام لینا چاہتے ہیں۔ اور یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہیو فینگ کے خلاف جدوجہد صرف ادب اور فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کا کام ہے۔ ٹریڈ یونین اداروں اور مزدور طبقہ سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ یہ غلط ہے"۔

"ہیو فینگ خود کمیونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں۔ لیکن اس کے کچھ پیرو کمیونسٹ پارٹی میں گھس گئے ہیں۔ ہیو فینگ خود کسی ٹریڈ یونین کا ممبر نہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے کچھ حامی ٹریڈ یونینوں میں گھس گئے ہوں۔ کیونکہ ہمارے یہاں بھی کچھ تمدنی ادارے مثلاً اخبارات، پبلشنگ ہاؤس اور کلب موجود ہیں"۔

ان لفظوں میں جو دھمکی پوشیدہ ہے اس کا اندازہ وہ لوگ بہ آسانی لگا سکتے ہیں جو کمیونسٹ طریق کار سے تھوڑی بہت آگاہی رکھتے ہیں۔ صدر جلسہ کی اس تقریر کے بعد جو شخص بھی ہیو فینگ کے حق میں آواز بلند کرتا اسے ٹریڈ یونینوں کی صف میں ہیو فینگ کا ساتھی قرار دے دیا جاتا۔ اور خود اس کا انجام بھی ہیو فینگ سے مختلف نہ ہوتا۔ اندریں حالات اگر حاضرین نے اتفاق رائے سے قرار دادِ مذمت پاس کر دی تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔

ہیو فینگ کی گرفتاری کا یہ پس منظر ان ادیبوں کے لئے سبق آموز ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ اختلافِ عقائد کے باوجود کمیونسٹوں کے ساتھ متحدہ ادبی محاذ بنایا جا سکتا ہے۔ یا یہ کہ کمیونزم ادیبوں کی آزادی کا مخالف نہیں۔ سطور بالا میں ہم نے اس بات کی پوری پابندی کی ہے کہ تمام تر تفصیلات چین کے سرکاری اخبارات اور نیو چائنا نیوز ایجنسی کے مراسلوں سے من وعن نقل کر دی جائیں ظاہر ہے کہ ان تفصیلات کو کمیونسٹوں کے مخالفوں کا معاندانہ پروپیگنڈا قرار نہیں دیا جا سکتا!!

درست کر لیجئے

۱- جن کے پاس ماہر القادری کی تصنیف "کاروانِ حجاز" ہے۔ وہ صفحہ ۱۴۶ کی آٹھویں سطر (تاریخی مصرعہ) کو اس طرح درست فرمالیں:۔

"نعمتِ حج و زیارت مقبول"

۲- فاران ماہ اکتوبر کے صفحہ ۵۵ کی تیسری سطر میں صحیح انگریزی لفظ "TORTURING" ہے۔

مصطفےٰ لطفی المنفلوطی
ترجمہ و تلخیص:- عطیہ خلیل عرب

سیاست!

منفلوطی کے نام ایک خط اور اس کا جواب

فاضل محترم!

”کیا میں آپ سے اس سوال کی جرأت کر سکتا ہوں کہ اب تک آپ نے سیاست پر کیوں قلم نہیں اُٹھایا؟ آپ کے علمی، اخلاقی، مذہبی اور گرانقدر ادبی مضامین بے شمار اور مقبول عام ہیں۔ امید ہے کہ میری التماس پر آپ سیاست کے میدان میں بھی اپنے قلمی جوہر دکھائیں گے۔ آپ کی تحریروں کے قدردان آپ کو سیاسی دیکھنا چاہتے ہیں“۔

شکریہ! آپ کا مخلص ابن فلاں۔

میرے مخلص مشیر!

گرامی نامہ پڑھا اور اس اہم مسئلہ پر غور کیا۔ خدا جانتا ہے کہ میں سیاست اور اس کے علمبرداروں سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں جس قدر کوئی مسلمان جھوٹ، دھوکا، فریب، دغابازی، خیانت اور وعدہ خلافی سے کرتا ہے۔ بخدا کبھی بھی میری یہ خواہش یا کوشش نہیں ہوئی کہ میں سیاست کے میدان میں اپنے قلمی یا علمی گھوڑے دوڑاؤں۔ اس لئے کہ میں جلّاد نہیں بننا چاہتا۔ آپ متعجب کریں میرے نزدیک جلّاد اور سیاسی میں کوئی فرق نہیں۔ کہ انھیں افراد کی گردن زدنی پر مامور کیا گیا ہے۔ اور یہ قوموں اور جماعتوں کا خون کرتے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ سفّاک دونوں ہیں!

کیا کسی سیاسی کے متعلق ساری قوم کا متفقہ فیصلہ یہ نہیں ہوتا کہ اس لیڈر سے بڑھ کر کوئی سنگدل، چالاک، فریبی، دغا باز، ساری قوم میں کوئی نہیں۔ جو ایک خاص موسم میں بڑے بڑے زبانی دعووں اور لفظی تدبیروں اور قلمی منصوبوں۔ خیالی دھڑے بندیوں کے ساتھ بہار دکھاتا ہے۔ اور مطلب نکل جانے کے بعد ایسا غائب ہوتا ہے جیسے اس کا وجود ہی نہ تھا اور اگر ہے بھی تو اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کی ہوس سے فرصت نہیں جو وعدے پورے کرے۔ در اصل وہ تو مطلب کی دوستی تھی۔ پھر کہاں۔ اُن کے عالیشان بنگلے اور کہاں عوام کی جھونپڑیاں۔ عوام کی فریاد بنگلوں کی مضبوط دیواروں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ اس لئے کہ انھیں شنوائی کی ”فرصت“ نہیں ہوتی!

اگر آپ غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر بلند مرتبہ، کامیاب اور شہرت یافتہ سیاسی لیڈر کی تاریخ حیات انسانی اعضاء کے حروف سے لکھی جاتی ہے۔ تو اس میں نقطے ان بے گناہوں کے خون سے لگائے جاتے ہیں۔ اقوام عالم کی تاریخ سیاسی سے بڑھ کر کسی سفّاک مجرم اور ظالم و بے انصاف کو پیش کرنے سے قاصر ہے اس لئے کہ ؎

”جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!“

کیا کوئی شخص اس وقت تک سیاسی بن سکتا ہے جب تک کہ اس کی قینچی کی طرح چلنے والی زبان کا قول اور مشینی حرکت رکھنے والے جسم کے فعل میں تضاد نہ ہو۔ جھوٹ نہ ہو۔ وعدہ خلافی نہ ہو ۔۔۔ اطمینان رکھیے اس کے لئے کسی خاص قابلیت یا ڈگری کی ضرورت نہیں صرف اتنا چاہیئے کہ جس کام کو نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہو اُس کا بار بار وعدہ کرے، اور جو کرنا چاہتا ہو اُس کا نام بھی نہ لے۔ جھوٹے وعدے۔ بلند بانگ دعوے کرنا خوب جانتا ہو۔ مسکرانے کی بات پر آنسو بہا سکے اور رونے کی جگہ مسکرانے بلکہ قہقہے لگانے میں ماہر ہو!

کیا کوئی اُس وقت تک بساطِ سیاست کی بازی جیت سکتا ہے جب تک وہ یقین نہ کرلے کہ اس کے پہلو میں بجائے دل کے پتھر ہے۔ ایسا پتھر جو مِنْ خَشْیَةِ اللهِ تو جانتا ہی نہ ہو۔ مظلوموں کی آہ اور مصیبت زدہ لوگوں کی فریاد سے ذرا بھی متاثر نہ ہو سکے۔ یقین کرنا میرے دوست! اس دُنیا میں بعض چور اور گرہ کٹ ایسے بھی ہیں جو اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد (اس لئے کہ وقت اور ضرورت انہیں مجرم بناتی ہے ورنہ انسان مجرم پیدا نہیں ہوتا) وہ خدا کے حضور سچے دل سے توبہ کرتے اور دعا کے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ کہ خدایا! ۔۔۔ اب حلال کی کمائی کھلانا اور اپنی ذاتی محنت سے مجھے اتنا دیدے کہ حرام کی طرف دیکھنا بھی حرام سمجھوں۔ بعض قاتل ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں جو اپنی حرکت پہ پشیمان ہوتے ہیں اور مقتول کی لاش کے پاس بیٹھ کر روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے کسی عضو کے بدلے اس میں جان آجائے۔ کاش میری جان چلی جاتی لیکن اس کی زندگی دوبارہ لوٹ آئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ بعد میں پشیمانی بے سود ہوتی ہے لیکن اعترافِ جرم بھی تو ہمت کا کام ہے۔ اس نے ایک ہی حملہ میں مقتول کو ختم کردیا۔ زندگی کے نام سے تو موت نہیں دی ہے!

لیکن سیاسی بھیلیا آدمی کی زندگی میں سب سے بہترین دن وہ ہوتا ہے جبکہ وہ کسی قوم کی تباہی کی اسکیم میں کامیاب ہوتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ بقول اس کے اس کی فتح اور کامرانی کا دن اور بقول میرے اس کے "عظیم گناہ" کے دن جب وہ عدالت کے کمرے میں اپنا جرم اور اس کے متعلق فیصلہ انتہائی سکون، اطمینان اور ٹھنڈے دل سے سُنتا ہے اور خوشی سے باغ باغ ہو جاتا ہے ۔۔۔ یہ تو آپ کو بھی معلوم ہوگا کہ "جیل" سیاسی قیدیوں کے لئے "جنت" سے کم نہیں!

پہلے عرض کرچکا ہوں کہ سیاست کوئی ایسا علم نہیں جسے باقاعدہ کالج یا یونیورسٹی سے حاصل کیا جائے۔ اور کسی کتاب میں پڑھا جائے۔ بلکہ آجکل سیاست نام ہے صرف خیالی قانونی تجربوں اور زبانی دھڑے بندیوں یا موقع تاک کر میدان میں آنے کا ۔۔۔ معلوم ہے کیوں ہے ۔۔۔ اس لئے کہ اس معاملہ میں تجربہ کار ہونا پہلی شرط ہے۔ ان باتوں سے جو لوگ زیادہ واقف ہوں وہی سیاسیوں کے اُستاد ہوتے ہیں اور اُنہی کی ہدایات پر عمل کیا جاتا ہے۔ اور یہی لوگ اس کا حق رکھتے ہیں کہ چالبازی، حیلے سازی، اور مکر و فریب کو کتاب کی شکل دے دیں!

مدارس و دیگر تعلیم گاہوں کی بنیاد ہی چونکہ اخلاق، آداب اور تعمیری اصولوں پر ہوتی ہے اس لئے وہ ایسی تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ وہ جھوٹ، مکر، فریب اور غداری کی تعلیم کیونکر دے سکتے ہیں؟ ہاں پھر سیاسی جماعت اپنے سن رسیدہ تجربہ کار ذہین اور پختہ کار لیڈر کے احکام پر عمل کرتی ہے۔ اب جماعت کی گمراہی اور ہدایت کا انحصار صرف لیڈر پر ہوتا ہے۔ اگر وہ نیک خو، پاک باطن، خداپرست اور حق کا علمبردار ہے تو ساری قوم اور ساری جماعت کو دُنیوی اور اخروی کامیابیاں مل جائینگی اور اگر اس کے برعکس ہے تو فی النّار والسقر، نفس پرستی، حق پرستی کی جگہ لے لیتی ہے۔ اور ظلم و ستم، عدل و رحم کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ بعض لوگ محض اپنا کام بنانے کے لئے خدا کا نام لیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں غریب کے دل میں

اب بھی مذہب اور خدا و رسولؐ کا احترام ہے۔ لیکن خدا ہی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اُن کے دل میں ذرہ برابر بھی خوفِ خدا یا پاسِ ناموسِ محمدؐ و مذہب نہیں ہوتا۔ عوام کو محض اپنے اقتدار کے جال میں پھانسنے کے لئے وہ یہ حربہ اختیار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ غریب مسلمان اب بھی خدا اور رسولؐ کے نام پر دھوکا کھا سکتا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ عوام لیڈری سے محروم رہتے ہیں۔ اس لئے کہ اُن کا تو نام ہی "عوام کالانعام" پڑ گیا ہے۔ اور عہدوں کی کرسیاں، وزارتوں کی کرسیاں، صدارتوں کی کرسیاں، سب سیاسی وزیروں کیلئے وقف ہو گئی ہیں!

ہاں تو میرے دوست! یہ ہے سیاست اور یہ ہیں اُن کے علمبرداروں کے کردار و فطرت۔ کیا اب بھی آپ یہ چاہیں گے کہ ایک ایسا شخص جس نے اپنی قلمی طاقت کو اعلائے کلمۃ الحق اور ابطالِ باطل کے لئے وقف کر دیا ہو۔ جو رذالت کے مہیب پنجوں سے شرافت اور اعلیٰ انسانی قدروں کو چھڑانے کا عہد کر چکا ہو جس نے اپنی تحریری کاوش کو اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق کی اشاعت کے لئے خاص کر لیا ہو۔ جس کی تحریر نے مظلوموں، بیکسوں اور غریبوں کی حالت پر ہمیشہ آنسو بہائے ہیں۔ بلکہ جس نے رو رو کر ساری کائنات کو اپنے ساتھ رُلایا ہو۔ کیا سیاسی بن سکتا ہے؟ کیا آپ کے خیال میں وہ سیاست پر قلم اُٹھا کر لوٹے ہوئے سیاست کی طرفداری اور اشاعت کر سکے گا؟ اور وہ موجودہ سیاست کے علمبرداروں کو پسند کرے گا؟

مخلص دوست! آپ نے مشورہ دیا تھا — میں شکر گزار ہوں — میری تلخ نوائی نے آپ کو ضرور تکلیف پہنچائی ہوگی۔ لیکن تم اس تلخ حقیقت پر فریاد کو ہر حساس دل کی دھڑکنوں سے سن سکتے ہو۔ یہ صرف میری ہی آواز نہیں۔ ہر حق پرست یہی کہیگا۔ اچھا اب اجازت!!

فضا ابن فیضی

یزداں — جبرئیل — اہرمن

یزداں:-

جبریل! یہ ہنگامہ ہے بالائے زمیں کیا
قندیل دھواں دیتی ہے کیوں بزمِ فنا کی
بخشی تھی جسے ہم نے زمینوں کی خلافت
کچھ کہہ تو ہے کس حال میں وہ آدمِ خاکی

جبرئیل:-

کیا واسطہ اب سلسلۂ شام و سحر سے
مدت ہوئی آئے ہوئے دنیا کے سفر سے
وہ رنگ ہوں باقی جو نہیں لالہ و گل پر
وہ جلوہ ہوں جو روٹھ گیا ذوقِ نظر سے
اب شامِ حرا بھی مرے تاروں کو نہیں یاد
مشرق مرا محروم ہے طیبہ کی سحر سے
کیسے کہوں اس دور میں کیا حال ہے اس کا
واقف نہیں میں آدمِ خاکی کے ہنر سے
اس بات کو پوچھ اس سے کہ یہ نکتہ نہ ہوگا
پوشیدہ کچھ ابلیس کی بیتاب نظر سے

اہرمن:-

خاموش رہوں میں تو یہ سوءِ ادبی ہے
بولوں تو ٹھہرتا ہوں عقوبت کا سزاوار
یہ فرض ہے گو کہ مرے منصب کے منافی
پوچھا ہے مگر تو نے تو لازم بھی ہے اظہار
کیا تجھ سے کہوں آدمِ خاکی کی میں روداد
اے کاش! مرا ساتھ بھی دے طاقتِ گفتار
شاہیں کے پر و بال رگِ گل سے بندھے ہیں
یہ شوخ کرن ہے ابھی شبنم میں گرفتار
یہ خام و زبوں جنس نہیں اب کسی قابل
سنتا ہوں کہ اس جنس کا تو بھی ہے خریدار
ہے بند حبابوں میں حقیقت کا یہ طوفاں
نے رفعتِ کردار ہے نے جرأتِ گفتار
بت بن کے ہوں میں اسکے عقائد کے حرم میں
پھر بھی یہ نہیں میری سیاست سے خبردار
صدیوں سے ہے ٹھہری ہوئی جو اسکے بدن میں
وہ روح، ابھی ہو نہ سکی خواب سے بیدار
بے سوز خود افروز کی دولت سے ہے محروم
ہے اسکی ہر اک صبح اندھیروں سے گرانبار
لطفِ نگہِ غیر پہ قانع ہے ابھی تک
یہ ذلتِ محکومیِ جاوید کا شہکار
زرخیز مگر کر نہ سکا خاکِ چمن کو
وہ جس نے کیا آتشِ نمرود کو گلزار
تھراتے تھے طوفانِ پرآشوب سے اسکے
کاشانۂ تقدیرِ امم کے در و دیوار
کیا تیرا خلیفہ ہے، یہی بندۂ بے ذوق
تجھ سے بھی ترے دین کی عظمت سے بھی بیزار

تو دیکھ چکا جذبۂ تخلیق کا انجام
خورشید سے کہہ دے کہ ہو مغرب سے نمودار

پیام

جینے کا قصد ہے نہ سکوں کی کرنہ تلاش — یہ زندگی حوادثِ پیہم کا نام ہے
وہ حریت کہ جس میں نہ آزاد ہو ضمیر — اس حریت کو دُور سے میرا سلام ہے
مانا کہ عرش سدرہ و طوبیٰ سے ہے بلند — مومن کا اس فضا سے بھی اونچا مقام ہے
جس زہد میں ہو بوئے غلامی کا رنگ و بُو — اس پر ہو اُس نے گلشنِ جنت حرام ہے
خود حُسن کی نمود کو الفت کی ہے تلاش — یہ کس نے کہہ دیا کہ محبت غلام ہے
اوج برامکہ ہو کہ قہرِ قرامطہ — عشرت کی زندگی صفتِ دورِ جام ہے

نظریں بلند ہوں تو زمیں بھی ہے آسماں
سمعِ قبول ہو تو خموشی پیام ہے

فکر و عمل

جب تیرا اختیار ہی پابند غیر کا — قبضہ میں تیرے ملکِ سلیماں ہوا تو کیا
شاہیں کے بازوؤں کی حرارت ہو اور چیز — زاغ و زغن کی طرح پرافشاں ہوا تو کیا
دل میں ترے اُمنگ ہی باقی نہیں رہی — تجھ پر طلوعِ صبحِ بہاراں ہوا تو کیا
"لبیک" کہہ رہا ہے تو آوازِ کفر پر — کہنے کو تیرا نام مسلماں ہوا تو کیا

جب تک کہ تیرے دل میں نہ ہو دردِ کارواں
ماہرؔ بھی کارواں میں حدی خواں ہوا تو کیا

تہذیب و سیاست

نازک و رقیق گل سے ہیں سائنس کے آلات — سائنس کے قبضہ میں جمادات نباتات
کیا بات ہے اک دل کو بھی روشن نہیں کرتے — سائنس کی تہذیب کے افکار و مقالات
اُس آنکھ سے پُوچھو کہ جو تہذیب نگر ہو — اُٹھتے ہیں حجابات کہ گرتے ہیں حجابات
اللہ رے! سائنس کی دانش کے شگوفے — شرمندہ ہیں چنگیز و ہلاکو کی روایات
ہر بات میں اک پیچ، ہر اقدام میں اُلجھاؤ — گویا کہ مقرر ہیں سیاست کے اشارات

اُس دل سے یہ بہتر ہے کہ سینہ میں ہو پتھر
جس دل کی ہو معراج فرنگی کی ملاقات

(ماہر القادری)

روحِ انتخاب

پاکستان کے اربابِ اقتدار کیلئے ایک آئینہ

ہمارے زمانہ میں بادشاہ کا رات کو تنہا نکلنا ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ جب خلیفہ ہوئے تو سات مہینہ تک مقام سنح میں قیام فرمایا۔ جو مدینہ کی اصل آبادی سے دور تھا لیکن روزانہ وہاں سے کبھی پاپیادہ اور کبھی سواری پر مسجد نبوی میں آتے تھے اور عشاء کی نماز پڑھا کر واپس جاتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مدینہ کے لنگرخانہ میں مسلمانوں کو خود اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے تھے۔ ایک قاصد دربارِ خلافت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ امیر المومنین ہاتھ میں عصا لئے کر مسلمانوں کو خود کھانا کھلا رہے ہیں۔ عشاء کے بعد پھر کر مسجد میں ہر شخص کا چہرہ دیکھتے اور اس سے پوچھتے کہ کھانا کھایا ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص بھوکا ہوتا تو اس کو لیجا کر کھانا کھلاتے۔ ایک دن صدقہ کے اونٹوں کے بدن پر تیل لگا رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا۔ "اے امیر المومنین! کسی غلام کے متعلق یہ کام کردیا ہوتا؟" بولے۔ "مجھ سے بڑھ کر کون غلام ہو سکتا ہے۔ جو شخص مسلمانوں کا والی ہے وہ مسلمانوں کا غلام ہے؟" بازار کی نگرانی کا خاص اہتمام رکھتے تھے۔ اگرچہ اس کام کے لئے حضرت عبداللہؓ اور حضرت سائبؓ بن زید کو خاص طور پر مقرر کردیا تھا۔ لیکن خود بھی بازار کا گشت لگایا کرتے تھے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی ہاتھ میں دُرّہ لئے ہوئے بازاروں میں گھومتے رہتے اور لوگوں کو پرہیزگاری، سچائی، حُسنِ معاملت اور پورے پورے ناپ تول کی ترغیب دیتے۔

خلفاء کی حفاظت میں سب سے زیادہ گراں قیمت چیز بیت المال تھا۔ دنیوی بادشاہ سلطنت کا مال اپنے اوپر بے دریغ صرف کرتے ہیں۔ لیکن صحابہ کرام نے اس خزانہ الٰہی کی اس دیانت کے ساتھ حفاظت کی کہ اپنے مصارف سے ریال ایک حبہ بھی نہیں لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرائضِ خلافت کی مصروفیت کی بناء پر بیت المال سے وظیفہ لیا تو اس کے ساتھ یہ تصریح کردی کہ اس کے بعد اُن کی تجارت کی آمدنی بیت المال میں منتقل ہو جائے گی اور آلِ ابوبکر اس مال سے وجہ معاش لے گی اور مسلمانوں کے لئے کمائی کرے گی۔ لیکن انتقال کے وقت وظیفہ کی رقم بھی واپس کردی۔ حضرت عمرؓ کی حیثیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے ایک مزدور تھے۔ اس نے بیت المال سے صرف اسی قدر لیتے تھے جتنا ایک مزدور کو لینا چاہیئے۔ ایک بار حج کو گئے تو آمد و رفت میں اسّی درہم صرف ہوگئے۔ اُن کو اس پر اس قدر افسوس ہوا کہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور کہتے تھے۔ "یہ کس قدر نامناسب بات ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے مال میں فضول خرچی کی!" ایک دفعہ بیمار ہوئے اور دوا کے لئے شہد کی ضرورت پیش آئی — بیت المال میں شہد کا پیپا تھا۔ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر چڑھ کر تمام مسلمانوں کی طرف سے خطاب کرکے کہا: "اگر آپ لوگ اجازت دیں تو یہ شہد لے لوں ورنہ مجھ پر حرام ہے۔" ایک بار شاہ روم کا قاصد آیا تو اُن کی بیوی نے ایک اشرفی کا عطر خریدا اور اس کو شیشی میں بھر کر شاہ روم کی بیوی کے پاس ہدیتاً بھیجا اور اس نے شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر واپس کیا۔ جواہرات دیکھے تو ان کو فروخت کرکے ایک دینار اپنی بیوی کو واپس کردیا۔ بقیہ رقم بیت المال میں داخل کردی

حضرت علی کرم اللہ وجہ کی دیانت کا یہ حال تھا کہ ایک بار اُن کے پاس اصفہان سے کچھ مال آیا جس میں ایک روٹی بھی تھی۔ انہوں نے مال کے ساتھ روٹی کے بھی ٹکڑے کئے اور مال کے ہر حصہ پر ایک ایک ٹکڑا روٹی کا رکھا پھر قرعہ ڈالا کہ پہلے کس کو دیا جائے۔ ایک دن بیت المال کا کُل مال تقسیم کر کے اُس میں جھاڑو دلوائی پھر اُس میں نماز پڑھی تاکہ قیامت کے دن لوگ اُن کی دیانت کی شہادت دیں۔

جبکہ تمام عرب و عجم نے سیادت و حکومت کے ذریعہ دُنیا کو اپنا غلام بنا لیا تھا۔ اسلام نے صرف تقویٰ کو انسان کا اصلی شرف قرار دیا اور قرآن مجید نے دُنیا کے خلاف یہ صدا بلند کی۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ۔ تم میں سب سے زیادہ شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

ایک دن حضرت عمرؓ امورِ خلافت میں مشغول تھے کہ اسی حالت میں ایک آدمی آیا اور کہا کہ " اے امیر المومنین! مجھ پر فلاں شخص نے ظلم کیا ہے"۔ انہوں نے سر پر کوڑا مارا اور کہا " جب فصلِ مقدمات لے کر بیٹھتا ہوں تو تم لوگ نہیں آتے اور جب مسلمانوں کے دوسرے کاموں میں مشغول ہوتا ہوں تو دادرسی کے لئے آتے ہو"۔ وہ نادم ہو کر چلا تو خود اُسے بُلایا۔ اُس کے سامنے اپنا کوڑا ڈال دیا۔ اور کہا " مجھ سے قصاص لو"۔ اس نے کہا " نہیں، میں خدا کے لئے اور آپ کے لئے معاف کرتا ہوں"۔ بولے " ایسا نہیں۔ یا تو خدا کیلئے معاف کر دو یا میرے لئے"۔ اس نے کہا " نہیں صرف خدا کے لئے"۔ ایک بار حضرت عتبہؓ ابن فرقد نے اُن کی خدمت میں نہایت تکلف کے ساتھ ایک لذیذ غذا بھیجی۔ فرمایا " کُل مسلمان یہی کھاتے ہیں"؟ جواب ملا " نہیں"۔ بولے " تو پھر مجھے نہیں چاہیئے"۔ اس کے بعد اُن کو لکھا " یہ تمہاری اور تمہارے باپ کی کمائی نہیں ہے۔ تمام مسلمانوں کو وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو اور عیش پرستی سے بچو"۔ حضرت امیر معاویہؓ پہلی بار شام سے حج کو آئے تو ایک شخص نے کہا " السلام علیک ایہا الامیر و رحمتہ اللہ" اس پر تمام اہل شام بگڑ گئے اور کہا یہ منافق کون ہے جو صرف امیر المومنین کو سلام کرتا ہے!

حضرت عمرؓ قیصر و کسریٰ کے خزانے کے کلید بردار تھے لیکن زہد و تواضع کا یہ عالم تھا کہ ایک دن انہوں نے پینے کا پانی مانگا۔ لوگ شہد لائے۔ پیالے کو ہاتھ پر رکھ کر فرمایا " اگر پی لوں تو اس کی مٹھاس چلی جائے گی اور تلخی (عذاب) باقی رہ جائے گی"۔ یہ کہہ کر آدمی کو دے دیا اور وہ اس کو پی گیا۔ لباس اس سے بھی زیادہ سادہ تھا۔ انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ میں نے زمانۂ خلافت میں دیکھا کہ اُن کے دونوں شانوں کے درمیان کے کپڑوں میں تہ بہ تہ پیوند لگے ہوئے ہیں۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ بذاتِ خود دولت مند تھے۔ لیکن زمانۂ خلافت میں اس قدر سادہ زندگی بسر فرماتے تھے کہ مسجد میں سرہانے چادر رکھ کر لیٹ جاتے تھے۔ اُٹھتے تھے تو بدن میں کنکریوں کے چبھنے کے نشان نظر آتے تھے۔ لوگ دیکھتے تو کہتے۔ یہ امیر المومنین ہیں!

حضرت علی کرم اللہ وجہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو تراب کا خطاب عطا فرمایا تھا اور خاکساری نے اُن کو اِس خطاب کا صحیح مصداق بنا دیا تھا۔ تمام لوگ ان کی خدمت و اطاعت کو اپنا فخر سمجھتے تھے۔ لیکن وہ خود بازار سے سودا سلف خرید کر لاتے۔ دربان اور پہرے دار کا جھگڑا نہیں رکھا تھا۔ تنہا اُٹھتے اور مسجد کو چلے جاتے تھے!

خلافتِ الٰہی ایک خوانِ نعمت ہے جس کو اللہ تعالیٰ خود اپنے ہاتھ سے دُنیا کے سامنے چُن دیتا ہے۔ لیکن بدبخت لوگ۔ تمام دُنیا کو بھوکا رکھتے ہیں اور خود اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ مگر خدا کے برگزیدہ بندے پہلے تمام دُنیا کو کھلاتے ہیں پھر جو کچھ بچ رہتا ہے خود کھاتے ہیں۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے مدینہ کی عورتوں میں چادریں تقسیم فرمائیں۔ ایک عمدہ چادر رہ گئی تو کسی نے کہا " اپنی بیوی اُم کلثوم کو دیدیجئے"۔ بولے " ام سلیط اس کی زیادہ مستحق ہیں کیونکہ وہ غزوۂ اُحد میں مشک بھر بھر کے پانی لاتی تھیں اور ہم کو پلاتی تھیں۔ اس سے بڑھ کر کیا ایثار ہو سکتا ہے کہ اپنے بعد جن لوگوں کو خلافت کے لئے منتخب فرمایا۔ اُن میں اپنے بیٹے حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ کی نسبت

صاف تصریح کر دی کہ خلافت میں اُن کا کوئی حصّہ نہیں۔ امراء و عمال مقرر فرمائے تو اپنے خاندان کے کسی شخص کو کوئی عہدہ نہیں دیا۔

حق پسندی کا یہ عالم کہ ایک بار حضرت عمرؓ نے خزائن کعبہ کو تقسیم کرنا چاہا۔ لیکن حضرت شیبہؓ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ "آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ آپ سے زیادہ مال کے محتاج تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔" حضرت عمرؓ نے تقسیم سے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے فرمایا "بیوی کو شوہر کی دیت میں وراثت نہیں ملتی۔" حضرت ضحاک بن سفیانؓ نے کہا "نہیں، اشیم الضبابی کی بیوی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تحریری فرمان کے ذریعہ جو میرے نام تھا اُس کے شوہر کی دیت دلوائی تھی۔ حضرت عمرؓ نے (اس پر) فوراً اپنی رائے بدل دی!

حضرت ابوبکرؓ کو بچے دیکھتے تو دوڑ کر کہتے "اے باپ!" وہ محبت سے اُن کے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ چھوکریاں کہتیں "آپ ہماری بکریوں کا دودھ کیوں نہیں دوہتے؟" اُن کا دودھ دوہتے ـــ حضرت علی کرم اللہ وجہ بازاروں میں جاتے تو بھولے بھٹکے لوگوں کو راستہ دکھاتے۔ حمالوں کے سر پر بوجھ اُٹھا دیتے اگر کسی کے جوتے کا تسمہ گر جاتا تو اسے اُٹھا کر دیدیتے!

ایک بار حضرت عمرؓ نے منبر پر چڑھ کر کہا "صاحبو! اگر میں دُنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم لوگ کیا کروگے؟ ایک شخص وہیں کھڑا ہو گیا اور تلوار میان سے کھینچ کر بولا کہ "تمہارا سر اُڑا دیں گے"۔ حضرت عمرؓ نے اس کے آزمانے کو ڈانٹ کر کہا "کہ تو میری شان میں یہ لفظ کہتا ہے"؟ اس نے کہا "ہاں۔ ہاں! تمہاری شان میں!" بولے "الحمدللہ! قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں۔ کہ میں کج ہوں گا تو مجھ کو سیدھا کر دیں گے"۔

صحابہ کرام کے دل میں خدا اور رسولؐ کے سوا کسی کا خوف نہ تھا۔ اس لئے وہ ناجائز باتوں میں امراء و سلاطین کی دلیرانہ مخالفت کرتے تھے اور جو چیز اصولِ اسلام اور سنّتِ نبوی کے خلاف ہوتی تھی۔ اس سے اُن کو روکتے تھے۔ ایک بار حضرت ابوسعید خدریؓ نماز پڑھ رہے تھے کہ مروان کا لڑکا سامنے سے گزرا۔ انہوں نے پہلے اُسے ہٹایا وہ نہ ہٹا تو مارا۔ وہ روتا ہوا مروان کے پاس گیا۔ مروان نے اُن سے کہا۔ اپنے بھتیجے کو کیوں مارا؟ بولے۔ میں نے اس کو نہیں بلکہ شیطان کو مارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اگر کوئی شخص عالتِ نماز میں کسی کے سامنے سے گزر جائے تو پہلے اس کو ہٹائے۔ اگر نہ ہٹے تو اس سے لڑائی کرے کیونکہ وہ شیطان ہے!

ایک بار حضرت بلالؓ نے شکایت کی کہ امرائے شام پرند کے گوشت اور میدے کی روٹی کے سوا اور کچھ کھاتے ہی نہیں حالانکہ عام لوگوں کو یہ کھانا میسّر نہیں ہوتا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے سخت گرفت کی اور تمام عمال سے اقرار لیا کہ روزانہ فی کس دو روٹی اور زیتون کا تیل اور سرکہ تقسیم کرنا ہوگا اور مالِ غنیمت کی تقسیم بھی مساویانہ طور پر ہوگی!

ایک بار حضرت عمرؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت کے یہاں خود فریق مقدمہ بن کر آئے تو انہوں نے اُن کو اپنے پاس بٹھانا چاہا لیکن انہوں نے کہا کہ "یہ پہلا ظلم ہے جو تم نے کیا۔ میں اپنے فریق کے ساتھ بیٹھوں گا"۔

حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ کسی بوڑھے یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو پوچھا کس چیز نے تم کو گداگری پر مجبور کیا ہے؟ اُس نے کہا۔ جزیہ ادا کرنے اور ضروریات پورا کرنے کے لئے بھیک مانگتا ہوں۔ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے گھر لاکر اُس کو کچھ دیا۔ پھر بیت المال کے خزانچی کے پاس کہلا بھیجا کہ اس کا اور اسکے مثل ذمیوں کا خیال رکھو۔ خدا کی قسم یہ انصاف نہیں کہ ہم اُن کے شباب سے فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں اُن کو چھوڑ دیں۔ صدقہ فقراء و مساکین کیلئے ہے اور فقراء مسلمان ہیں اور یہ مسکین اہلِ کتاب ہے۔ غرض اس کا اور اس کے مثل اور ذمیوں کا جزیہ معاف کر دیا۔

صحابہ کرام کی موثر زندگی کے خال و خط تمہارے سامنے آ گئے۔ اگر ان اختران تابندہ کی روشنی نے تمہاری راتوں کو دن نہیں بنایا تو یہ تمہاری سیہ بختی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

(اسوۂ صحابہ حصہ اول۔ از مولانا عبدالسلام ندوی)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا گرامی نامہ

مدیر "فاران" کے نام

"سیرت نمبر" کیلئے دفتر "فاران" میں بڑے معرکہ آرا مقالے اب تک وصول ہو چکے ہیں۔ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ یہ شمارہ دین و اخلاق اور ادب و دانش کی کامیاب پیشکش ہو گا۔

مندرجہ ذیل مکتوب سے آپ "فاران" کے "سیرت نمبر" کی اہمیت کا اندازہ فرما سکتے ہیں کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی ناسازیٔ طبع اور گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس شمارے کے لئے مقالہ لکھ رہے ہیں۔! نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

(م-ق)

اچھرہ - لاہور - ۱۱ - اکتوبر ۵۵ء

برادرم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۶ ستمبر مجھے کوئٹہ میں اس وقت ملا تھا جبکہ میں لاہور کیلئے روانہ ہو رہا تھا - یہاں آتے ہی خطوط کا ایک ڈھیر میرے آگے رکھ دیا گیا جو پونے دو مہینے میں جمع ہوا تھا - سلسلہ وار سب کو جواب دینے کے بعد اب آپ کے خط کی باری آئی ہی تھی کہ آپ کا دوسرا عنایت نامہ مل گیا - آپ کے ان دونوں خطوں میں شکایت کا انداز پا کر مجھے تکلیف ہوئی، کیونکہ آپ جیسے مخلص دوست بلکہ بھائی کو میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا اس لئے دو باتیں آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں - تاکہ آپ کو یہ غلط فہمی نہ رہ جائے کہ میں نے محض تساہل کی وجہ سے آپ کی فرمائش پوری کرنے سے گریز کیا -

پہلی بات یہ ہے کہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر کچھ لکھنے کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ محض سرسری طور پر کوئی مضمون گھسیٹ دیا جائے آپ خود غور کیجئے کہ بحالتِ سفر جبکہ کوئی کتاب میرے پاس نہ تھی، حتیٰ کہ قرآن مجید کا کوئی انڈکس بھی نہ تھا کہ حسب ضرورت کوئی آیت تلاش کر لیتا، کوئی مضمون اس اہم موضوع پر میں کیسے لکھ دیتا -

دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے میری حالت کو اپنی بیماری کی کیفیت پر قیاس کر کے میری حالت کا صحیح اندازہ نہیں کیا - مجھ پر مسلسل چار مہینے یہ ظلم ہوتا رہا ہے کہ سخت خرابیٔ صحت کے باوجود مجھے دوروں اور جلسوں اور ملاقاتوں کا تختۂ مشق بنایا گیا - مجھ سے عین دورانِ سر کی حالت میں تقریریں کرائی گئیں - سخت اعصابی تکاوٹ کی حالت میں مجھ کو گھنٹوں بیٹھ بیٹھ کر لوگوں سے ملاقاتیں کرنی پڑیں - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر میرے جسم اور دماغ کی قوت بالکل جواب دے گئی - آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ جو شخص ایک دو دن نہیں بلکہ ہفتوں اور مہینوں زبردستی اپنے آپ سے کام لیتا ہے اس کا کیا حال ہوتا ہے، آپ اسے محض out of practice ہونے کی کیفیت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ دراصل nervous breakdown کی کیفیت تھی اور میں اس کا مستحق تھا کہ کم از کم اس حالت کو پہنچ جانے پر ہی میرے دوست مجھ پر کچھ رحم کھاتے -

اب خدا کا فضل ہے کہ میری صحت بہت کچھ سنبھل گئی ہے - اگرچہ اب بھی تھوڑا کام کر کے زیادہ تھک جاتا ہوں - تاہم آپ کی فرمائش پوری کر سکوں گا، اکتوبر کے اختتام تک کی مہلت دیں -

خاکسار

اسماعیل ادیب

اُس کا باغی

گولی اُس کے کولھے کے گوشت کو پھاڑتی ہوئی گزر گئی اور ایک کراہ کے ساتھ قاسم زمین پر گر پڑا۔

چاروں طرف گھُپ اندھیرا مسلّط تھا۔ اُس اندھیرے میں کہیں بارود کی چنگاریاں تھیں کہیں جگنو اُڑ رہے تھے۔ مہیب سنّاٹے کی بیکراں اُداسی میں، تھری ناٹ تھری رائفل کی ٹھائیں ٹھائیں۔ چٹانوں سے گولیوں کے ٹکرانے کی بے ہنگم آوازیں۔ چھُپے ہوئے دشمنوں کی کارستانیوں کا پتہ دے رہی تھیں۔ وہ نہیں لڑ رہے تھے، اُن کے فکری تصورات یا ذہنوں میں ہلچل مچا دینے والے خیالات نہیں لڑ رہے تھے۔ گولیاں لڑ رہی تھیں۔ بندوقیں مناظرہ کر رہی تھیں۔ وہ میدان جو دلوں کو جیت کر ہاتھ آتا ہے پیشِ نظر نہیں تھا۔ صرف تشدد، جنگ، خون کی ہولی۔ دونوں طرف۔ اونچے اونچے پتھروں کے ٹیلوں۔ خود رو پودوں کی گھنی جھاڑیوں کے پیچھے چھُپے گوریلا دستوں پر بھی اور ڈاک بنگلہ کی بوسیدہ عمارت کے پیٹ میں سمائے ہوئے بدحواس سپاہیوں پر بھی۔ جو موت کے رقص سے سہمے ہوئے تھے۔ کیونکہ اُن کا ایک بھی خاموش جواب اُن کی پسپائی کا اعلان تھا اور اگر وہ پسپا ہو گئے تو موت سے بچ نکلنا اُن کی دانست میں ممکن نہیں تھا!

موت ـــــ دونوں طرف ـــــ

اُس طرف بھی جہاں ایک بوڑھا سا کمزور برگد کا درخت ڈاک بنگلے کے صحن میں سایہ کئے تھا۔

اِس طرف بھی جہاں گہرے گہرے کھڈ ہیں۔ پُر پیچ نشیب و فراز ہے۔ گھنی جھاڑیاں ہیں۔

لیکن کہن سال دیواروں کے پیچھے چھُپے ہوئے سپاہیوں پر موت کا لرزہ طاری تھا۔ کیونکہ وہ مقصد کے لئے نہیں لڑ رہے تھے۔ زندگی کے لئے لڑ رہے تھے۔ تنخواہ کے لئے لڑ رہے تھے۔ پیٹ کی بھوک کے لئے لڑ رہے تھے۔ اپنے اور اپنے خاندانوں کی جانیں فاقہ کشی سے بچانے کے لئے لڑ رہے تھے۔ لیکن ـــــ موت کے سایہ میں!

اور اونچے نیچے پتھریلے علاقہ میں سُرخ سویرے کے نقیب: انقلاب کے داعی تھے۔ ایک سُرخ خونیں انقلاب، اُن کی نظروں کے آگے ایک مثال تھی۔ عمل۔ مسلسل عمل۔ پھر فتح۔ چاہے بے ایمانی سے۔ چاہے خون سے۔ چاہے نظریات سے۔ اُن میں ارادے کی شدّت تھی۔ لیکن وہ مقصد کے بارے میں مخلص نہ تھے۔ اُن میں مادّہ پرستی اس حد تک رچ گئی تھی کہ وہ اس کے لئے موت کی بازی لگانے کو تیار رہتے!

پولیس کے دستے کی تدبیر کامیاب رہی۔ اُن کے انسپکٹر نے حکم دیا کہ سارے سپاہی بندوقوں کے چلنے سے نکلنے والے شعلوں کو نشانہ باندھیں۔ یہ حملہ کامیاب رہا۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں کے روزنوں سے۔ کھڑکیوں کی آڑ سے اور برگد کے پیچھے سے چار گولیاں نکلیں اور چار کمیونسٹوں کو گراتی ہوئی ٹھنڈی ہو گئیں۔ تین کسان جو لاپروائی سے اندھا دھند چاند ماری کر رہے تھے بے جان ہو کر گر پڑے۔ لیکن چوتھا۔ گھبراہٹ قاسم جو ایک کامیاب نشانے کے بعد کود کر دوسری طرف کو ہو رہا تھا زخمی ہو کر گر پڑا۔ گولی سے اُس کی

ہڈی کو قطعاً ضرر نہیں پہنچا - پیٹھ کے پیچھے کا حصہ پھٹ گیا اور بہت سا خون اُبل کر بہنے لگا -

دُور کسی غار کی گہرائی سے ریڈی کی گھبرائی ہوئی آواز اُس کی طرف آئی - "تو ــ کام ــ ریڈ ــ ہو"

قاسم کے لب کانپے - اُس کے درد کے باعث پچھلے ہونٹ کو کاٹا - لیکن آواز دے نہ سکا -

اور لیٹے پڑے ہی اُس نے اپنی سیدھی ہتھیلی بندوق کے کندے پر دبائی اور دل ہی دل میں کہا "میرے ساتھی شاید میری خاموشی پر گھبرائے ہوئے ہیں - لیکن میں اپنے مقصد کی ذرا سی آزمائش پر گھبراؤں گا نہیں - آہ ! میرے ساتھی - یقیناً وہ ہر صورت میں مجھے ثابت قدم پائیں گے" لیکن زخم کے معمولی ہونے کی صحیح واقفیت نہ ہونے سے ایک خیال بھی بجلی کی طرح اُس کے ذہن میں چمکا - "کون جانے اگر وہ مجھے مردہ پائیں - کون جانے میری قبر پر سُرخ سویرا سلام کرے"

اُس کا دماغ ــ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے تارے ٹوٹنے لگے - جیسے اُس کے ہاتھ پاؤں اور کھوپڑی میں خلا سا پیدا ہو گیا - جسم کی رگیں ڈھیلی ہو گئیں - خون بہہ بہہ کر زمین پر پھیلنے لگا - مضبوط گوشت کے ہر حصہ میں شکست کے سے آثار رچا جانے لگے - نلگنڈہ[1] کا خاموش آسمان اُس کے سر پر پھیلا ہوا تھا - اُس میں ٹکے ہوئے چاندی کے پھول حیرت سے آنکھیں جھپکا رہے تھے - ہواؤں کا کیف - شب سیاہ کی اُجڑی ہوئی زلفوں میں مہک بھر رہا تھا - نیم، املی اور برگد کے بوڑھے بوڑھے قد آور درختوں کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پتوں کی دبی دبی سی زہر آلود ہنسی - زمین پر سانپوں کی طرح رینگنے والی بیلوں اور سہمی سہمی سی ننھی جھاڑیوں میں چھپے جھینگروں، کیڑوں کی کراہوں کے شور میں مدغم ہو کر - وقفہ وقفہ سے گونجنے والی بندوقوں کی آوازیں درمیان میں اُبھر آتیں - جس سے طنز و تضحیک کا تاثر ایسے ہی اچانک محسوس ہوتا جیسے کوئی بڑا، بہت بڑا حاکم ان ننھے جنگ وجدال کرنے والے بے وقوفوں کی حماقتوں پر ہنس رہا ہو - کہ یہ کیڑے مکوڑے اُس کے منضبط قوانین پر - جو کھلی کتاب کی صورت میں موجود ہیں - عمل کرنے کے بجائے ایک بیکار سی، فضول سی لڑائی میں مصروف ہیں !

موت کے تصور نے قاسم کے رگ وپے میں یاس وحسرت کی غنودگی پیدا کردی - لمحہ بھر کے لئے اُس نے سوچا - "تو پھر یہ جد وجہد - یہ خون کی ہولی کس لئے - جب انسان مرجائے گا - جب چند برسوں کے درمیان سینکڑوں آدمی مرجائیں گے" تصورِ آخرت - ایک واضح دلیل کے ساتھ اُس کے ذہن میں آیا "دائمی زندگی ــ یہ عارضی زندگی سے کیا سچ مچ حسین ہے - کیا انسان کی نیکی بدی کا بدلا کہیں اور بھی مل سکتا ہے - آہ ! کاش وہ زندگی حقیقت ہوتی"

ہر ایک کمیونسٹ کی طرح اُس نے بھی تصورِ آخرت کو ایک ناقابلِ یقین اشتباہ سمجھ رکھا تھا - لیکن ــ اب جبکہ اس کی دانست میں موت اُس کے سر پر کھڑی تھی وہ کہہ رہا تھا - "کاش وہ زندگی حقیقت ہوتی" حالانکہ یہ ایک اَمِٹ حقیقت تھی -

"ہا ــ ہو ــ ہا ــ ہو ــ ہو ــ سے" ریڈی کی آواز پھر کسی محفوظ گوشے سے لہراتی ہوئی اُس کے کان کے تھرّاتے ہوئے پردوں سے ٹکرائی - وہ پھر بھی کچھ نہ کہہ سکا - صرف اس کے کپکپاتے ہوئے لب آہستہ، بہت آہستہ ہلے - "کام ــ ریڈ ــ ہو"

غضبناک بندوق کی نالیوں نے پھنکارا - ٹھائیں ٹھائیں - ٹھک - آہ ــ دھواں، چنگاریاں اور گولیوں کے زنّاٹے - ایک دردناک چیخ کے ساتھ کسی کانسٹبل کی بیوی کا سہاگ، اُجڑ کر رہ گیا !

پھر گولیوں کی باڑھ چلی - اور ایک بیوہ ہوئی - دو - تین - چار - سارے کا سارا ڈاک بنگلہ دہشت زدہ ہو کر لرز اٹھا ــ چیخیں اُبل پڑیں - دیواروں کی مٹی جھڑ جھڑ کر گرنے لگی - پھاٹک کے دیمک زدہ تختے چرچرا اٹھے -

گوریلا انداز میں لڑنے والے کمیونسٹوں کی تین مضبوط ٹولیاں جن کے پاس حکومتی محافظوں جیسے ہتھیار تو نہیں تھے - لیکن اُن کا

---

[1] حیدرآباد دکن اسٹیٹ کا ایک ضلع -

ما نڈر ریڈی ایک نئی اسٹین گن ساتھ رکھتا تھا۔ دلیری سے آگے بڑھ کر تاک تاک کر نشانہ لیتے ہوئے جنگل کی طرف دوڑنے لگے۔
عدچہ اُن کے ہاتھ تھا سپاہیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اُن کا انسپکٹر اور سب انسپکٹر فرار ہونے کی سوچ رہے تھے!

کچھ دیر تک بے حس و حرکت رہنے کے بعد قاسم نے اپنی ٹانگ ہلانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ تو کسی وزنی شہتیر
کی طرح ہو گئی ہے۔ خون رِس رِس کر جمنے لگا ہے۔ نچلے دھڑ میں چیونٹیاں سی چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ اُسے حیرت بھی ہوئی۔ ساتھ ہی وہ فخر سے
مسکرایا بھی کہ وہ اتنے شدید زخم کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا۔

وہ شروع ہی سے اشتمالی نظریہ کا حامل تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ پیدائشی انقلابی ہے۔ عام طبقے کے لڑکوں کی طرح اُس کا بچپن آوارگی
میں بسر ہوا۔ لیکن ماں باپ کی فراست نے پھر بھی اُس کی تعلیم جاری رکھی اور اپنی آوارگی کے باوجود وہ اسکول جاتا رہا۔ اٹھارھویں
برس میں اس نے مارکس کی کوئی کتاب ریڈی کے توسط سے حاصل کی اور اس کے دو سال بعد وہ جب کالج میں داخلہ لے چکا تھا، ریڈی
اس کو پارٹی میٹنگ میں ساتھ لے گیا۔ سیکنڈ ایئر پاس کرنے کے بعد ہی فیشن کے طور پر اُسے پارٹی کا رکن بنا لیا گیا۔ اس طرح مولوی احمد خاں
شکار کا لڑکا قاسم خاں کامریڈ قاسم بن گیا۔ حالانکہ وہ کمیونزم کو پوری طرح سمجھ بھی نہ پایا تھا۔ اس تبدیلی کے بعد کالج کی پرائیویٹ
محفلوں میں مارکس کا فلسفہ اُس کا محبوب عنوان ہوتا۔ تلنگانے کے مزدور روئے سخن ہوتے۔ اور جنسیات دلچسپ موضوع ـــ
مارکس نے مذہب کو افیون کہا تھا۔ لیکن قاسم نے اور بھی بلندی پر پرواز کی۔ اُس کا خیال تھا کہ مذہب سرمایہ داروں کا تیار کردہ زہر ہے
وہ عوام کو اتنا پلا چکے ہیں کہ بیچارے تڑپ تڑپ کر موت کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ بڑے بڑے بنیادی مسائل سے لے کر طلاق
کے مسئلہ تک وہ مذہب پر کڑی تنقید کرتا تھا۔ وہ نہ ضبطِ تولید کا قائل تھا نہ نکاح کی بندش کا۔ وہ کہتا۔ نکاح بھی تو ایک ظلم ہے۔
ایک بندش ہے۔ اگر انسان آزادانہ اختلاط کو قبول کرلے تو پھر جنسی بحران پیدا ہی نہیں ہوگا۔ اور یہ چیز بھی جانوروں کی طرح
براہم اور غیر جذباتی ہو کر رہ جائے گی!

جب پارٹی غیر قانونی ہو گئی تو یہ لوگ نلگنڈہ کے قرب و جوار میں چھپ گئے۔ اُن کے ساتھ کچھ اور ایسے لوگ بھی تھے جو جذباتی
ور پر اُن کا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ انڈر گراؤنڈ زندگی بڑی گھٹی گھٹی سی تھی۔ لیکن قاسم کا دل پھر بھی بہل گیا۔ کیونکہ اُن کے ساتھ
لڑکیاں بھی تھیں۔ جن کا نظریہ بھی وہی تھا جو قاسم چاہتا تھا۔ جو ریڈی کے دل کی بات تھی۔ پھر جب ایسا ہو تو گناہ کا تصوّر بدل
جاتا ہے۔ ایک روز وہ اُداس ایک کھیت کی مینڈ پر بیٹھا شام کے پھیلتے ہوئے سایوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُسے زمیندار کی بیٹی شانتا
نظر آئی۔ سولہ سترہ برس کی معصوم لڑکی ہاتھ میں گوپھن لیے بٹیروں کی تلاش میں نکلی تھی!

دوسرے روز زمیندار کے گھر سے آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ شانتا غائب ہو گئی۔

ساتھی ریڈی نے ایک دن اس کے سامنے رحیمو پان والے کا ذکر کیا۔ جس کی بیوی کلثوم خوبصورتی میں شہزادی نظر آتی تھی۔ دوسرے
روز رحیمو پان والا دیوانہ ہو کر ہر ایک سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ "بھیا۔ تم نے میری بیوی کو کہیں دیکھا"۔

دسویں روز کلثوم کی لاش ایک باؤلی میں ملی۔ اُس نے خودکشی کی تھی۔

لوگوں کا خیال تھا کہ زمیندار نے اپنی بیٹی کا بدلہ کسانوں سے لیا۔ زمیندار کے گھر پر حملہ کیا گیا۔ زمیندار شہر بھاگ گیا۔ ایک
ل انسپکٹر پُراسرار حالات میں کھلیانوں میں مرا پڑا ہوا ملا۔ جس کے بعد پولیس کا غصّہ اُبل پڑا۔

کسانوں کی جھونپڑیوں کو پولیس کے ایک دستے نے آگ لگا دی۔ انتقام ــ انتقام۔ گاؤں کے پچیس مرد اور
جوانوں کو ایک قطار میں کھڑا کر کے فوج نے باڑھ ماردی۔ حکومت پوری طرح مسلح ہو کر ٹکرانے کے لئے تیار تھی۔ اپنی بہادری کا

شہرت دینے کے لئے انہوں نے گاؤں کی بہو بیٹیوں کو ننگا نچایا۔ کھیتوں کے مہکتے ہوئے قطعے کمینگی کے اڈے بن گئے۔

"مزدور زندہ باد ــــ کسان زمین کا مالک ہے ــــ سرخ سویرا اگر رہے گا"

ہر طرف سرخی چھا گئی۔ دھواں۔ آگ۔ خون۔ چیخیں۔ نعرے۔ گولیاں۔ جنگ۔

اسی پر آشوب دور میں اُسے عبدالکریم ملا۔ ایک پڑھا لکھا کسان۔ جس نے گریجویشن کرنے کے بعد اپنی مختصر سی زمین کو نئے طریقوں سے بونے کے متعلق تجربات کئے تھے۔

اُس نے قاسم سے پوچھا "کامریڈ! آج کل دنیا میں جنگ کے نعرے کیوں ہیں؟"

قاسم نے تمکنت سے کہا "سرمایہ دار ــــ سرمایہ دار ــــ یہ سب اُسی کا کیا دھرا ہے"

"اوہ!" کریم نے بھولپن سے کہا "تو یہ سب کچھ سرمایہ داروں کا کیا دھرا ہے۔ میں سمجھا۔ لیکن کامریڈ ہمارا زمیندار تو بڑا نیک دل ہے۔ کامریڈ! یہ بات کچھ زیادہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کل ہی کا ذکر ہے۔ ایک ننھی بچی کو بچھو نے کاٹ کھایا۔ تو کا کو بھی کہہ رہا تھا کہ یہ سرمایہ دار کی شرارت ہے۔ پرسوں بارش نہیں ہوئی تو میرا بچہ کہتا ہے کہ ابا یہ سب سرمایہ دار ڈھونگ کر رہے ہیں۔ کامریڈ! یہ سرمایہ ...."

"خدا بھی تو ایک بڑا سرمایہ دار ہے" قاسم نے سمجھاتے ہوئے کہا "اُس کو بھی تو غریبوں کے ستانے میں مزا آتا ہے"

کچھ دیر بعد عبدالکریم چلا گیا۔ اور ــــ چند ملاقاتوں کے بعد قاسم کو پتہ چلا کہ عبدالکریم وہ پہلی ملاقات والا بھولا بھالا کریم نہیں۔ ایک وسیع تجربے اور علم والا گریجوایٹ ہے۔ جس کے دلائل کے آگے قاسم کی کمزور اور بچوں کی سی گفتگو کسی طرح ٹھہر نہیں سکتی۔ صرف جذبات مسائل کا حل نہیں ہوتے!

ایک روز جبکہ سارے روپوش کمیونسٹ بھونڈی آوازوں میں گا رہے تھے۔ ناچ رہے تھے اور گوشت بھونے جانے کی خوشبو آ رہی تھی۔ مینڈھی کے مٹکے اور شراب کی بوتلیں دھری تھیں۔ ساتھی لڑکیاں قہقہے لگا رہی تھیں۔ فری لانسنگ کر رہی تھیں۔ دل بہلا رہی تھیں کہ ایک مخبر اپنی بندوق سنبھالے بھاگا بھاگا آیا۔ "کامریڈ! ایک لمبا تڑنگا آدمی بندوق لئے اس طرف آ رہا ہے۔ کہا گولی ماردوں۔ ابھی وہ میل بھر دور ہے۔ میں نے درخت سے دیکھا ہے"

سب متعجب ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ریڈی نے مخبر سے پوچھا "کوئی کسان ہے؟"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ دور سے کامریڈ قاسم کو بلا رہا ہے"

سب قاسم کی طرف پلٹے۔ قاسم بھی کھڑا ہو گیا "کیا اس کے چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی ہے؟"

"ہاں" مخبر بولا "کافی خوبصورت جوان ہے۔ اُس کی جوانی دیکھ کر میرے دل نے بھی نہ چاہا کہ گولی ماردوں"

"اسے یہاں تک مت آنے دینا" قاسم گھبرا کر بولا "میں باہر ہی ملوں گا"

ریڈی نے مسکرا کر بنی سا تھن شانتا کی طرف دیکھا "ارے آنے دے یار ــــ نوجوان ہی تو ہے۔ بھلا کیا پرہیز کریگا"

قاسم نے کہا "نہیں کامریڈ! وہ ابھی اس معاملہ پکا نہیں۔ کسانوں کا لیڈر ہے ضرور لیکن مذہباً مسلمان۔ کون جانے یہاں کی محفل دیکھ کر بھڑک اُٹھے ــــ اور ــــ کسے معلوم کہ کسان بھی سمجھ جائیں کہ ہم جنسی بھوک کی خاطر جنگ کر رہے ہیں"

ریڈی نے بات کاٹی "اور کون جانے وہ پھنس بھی جائے۔ میاں میں نے بڑے بڑے تقدس مآب دیکھے ہیں۔ جن کا تقویٰ۔ ہماری رضیہ، دفائن۔ شانتا اور کامنی کے آگے پانی پانی ہو گیا۔ تم اُس ملا جمال دین کو جانتے ہو؟"

"تو پھر" قاسم نے بیٹھے ہوئے، اطمینان سے مخبر کو کہا۔ "اُسے یہیں لے آؤ"

کریم اندر آ گیا۔ کریم پھسلا نہیں۔ کریم بھڑکا نہیں۔ کریم مسکرایا۔

اُس نے کہا: "بہنو، بھائیو! مجھے آپ تمام سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔ دراصل وہ نقشہ جس کے متعلق سُنا کرتا تھا کہ صرف رُوس میں ہے۔ جس کو آپ لوگ یہاں بنانے کی کوشش میں ہیں۔ آج میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ لیکن کامریڈ! میں ایک نہایت منحوس خبر لے کر آیا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ آپ کچھ وقت مجھے دیں گے"

"آج" اُس نے اپنی ڈائری دیکھتے ہوئے کہا "کالو چمار کو دہشت پسندی کے الزام میں شُوٹ کر دیا گیا۔ غلام مصطفےٰ کسان نے فاقوں کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لی۔ اُس کے بچّے بھوک سے بلک رہے ہیں۔ اُس کی لاش بے گور و کفن پڑی ہے۔ حکومت کے وفاداروں نے اُس کا سارا اناج اس لئے ضبط کر لیا کہ اُس نے ایک دن ریڈی صاحب کو پانی دیا تھا۔ حالانکہ اُس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ تین کمیونسٹ قیدیوں کو سزائے موت دی گئی۔ دو گاؤں جلا کر خاکستر کر دئیے گئے۔ توجیوں نے جوان عورتوں اور بن بیاہی لڑکیوں پر کمیونزم کا الزام لگا کر اُن کی عزتیں، عصمتیں چھین لیں۔ ایک دستہ نے مُرغ پلاؤ تیار کیا۔ دوسرے نے سالم بکرے بھُونے۔۔۔ کامریڈ!۔۔۔ آج۔۔۔ ہاں آج ہی۔۔۔ آج یکم مئی پر تم۔۔۔ آپ لوگ جشنِ مئی منا رہے ہوں گے"

کریم کے جواب میں کوئی نہ بولا۔ موت کا سا سکوت سب کے لبوں سے خون کی طرح چپکا ہوا تھا!

کریم پلٹا اور واپس جاتے ہوئے بولا "خدا کی قسم اگر آج مارکس بھی زندہ ہوتا تو اپنے اصولوں کو منسوخ کر دیتا۔ اُس نے تو سرمایہ دارانہ نظام کے ردِّ عمل کے طور پر دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ کم از کم اب ہی اپنا بنایا ہوا نظامِ زندگی دیکھ لے تو اپنی حماقت پر رو پڑے گا"

"کم بخت۔۔۔ حرامی" ایک منمنایا۔

"سرمایہ داروں کا پٹھو" کوئی بے وقوف آہستہ سے بول اُٹھا۔

"گولی مار دو" کسی لڑکی نے ہمت کی۔ "ہے کوئی کامریڈ۔ وہ ابھی یہیں ہوگا۔ کیا معلوم مخبری کرنے آیا ہو"

"نہیں" ریڈی بولا "ایسا نہیں ہوگا۔ اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ اگر تنقید گناہ ہے بھی تو ہمیں پولیس کا مقابلہ کرنا چاہیئے"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو" قاسم نے مری ہوئی آواز میں کہا "اُسے جانے دو۔ ہم حملہ کریں گے۔ کیوں ساتھیو"

ریڈی نے اپنی اسٹین گن کی طرف دیکھا "کچھ تو بھی۔ میں ان پولیس کے کتّوں کو سبق دے سکتا ہوں"

اور پھر یہ زبردست جھڑپ۔۔۔ جس کے نتیجہ کے طور پر ڈاک بنگلہ میں بے بسی طاری تھی۔ اور وہ زخمی ہو چکا تھا۔

خون بہہ جانے کے باعث قاسم بے ہوش ہو چکا تھا۔

برگد کا بوڑھا درخت رونے لگا تھا۔ نیم اور املی کے پتّے ہلکے ہلکے تالیاں بجا رہے تھے۔ تاروں کو بھی نیند آنے لگی تھی۔ لیکن جگنو کبھی جھاڑیوں میں اور کبھی شریفے کے پسند قد درختوں پر بدستور گھوم رہے تھے۔

چیخوں اور گولیوں کے شدید شور کے باعث قاسم جو پوری طرح بے ہوش بھی نہیں تھا جاگ گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ جس ٹیلے پر پڑا ہے اُس پر کوئی تیزی سے چڑھتا ہوا آ رہا ہے۔ اُس کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اسے دیکھ چکا ہے۔

"کوئی دشمن۔ آہ! قسمت" کسی کانسٹیبل کے ہاتھوں مارے جانے کے کربناک تصور نے اُس کو بے چین کر دیا۔ اُس نے بدقت تمام اُٹھنے کی کوشش کی۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ پیشانی کی رگیں حیرت ناک حد تک اُبھر گئیں۔ لبوں کے کناروں پر کف آ گیا۔

وہ کیا کرے۔ بھاگ جائے۔ چھپ جائے۔ لیکن آہ! وہ تو ہل بھی نہیں سکتا تھا۔

آنے والا قریب آگیا۔ اس نے پھرتی سے جھک کر قاسم کو اٹھا لیا۔ درد کے باعث قاسم کی چیخ نکل گئی۔

"ڈرو مت قاسم۔ میں ہوں کریم۔ کمیونسٹوں کا ڈاک بنگلہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔ تمہارے ساتھی واپس بھاگ رہے ہیں۔ وہ دیکھو"

کریم کے مضبوط ہاتھوں کا سہارا لے کر قاسم نے دیکھا کہ ڈاک بنگلہ سے گولیاں اندھا دھند نکل رہی تھیں اور جواب دینے والوں کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ پولیس کے سپاہی فتح کی خوشی میں چیخ رہے تھے!

"پولیس والے تمہارے زخمی ہونے کا یقین کر چکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ تم اس جنگل کے علاقہ ہی میں بے بس پڑے ہو۔ ایک مسلح گروپ اس طرف آرہا ہے۔ وہ تمہارے خون کا پیاسا ہے۔ جلدی کرو۔ میری پیٹھ پر بیٹھ جاؤ۔"

کریم کی پیٹھ پر بیٹھتے ہوئے قاسم کو یکایک اس کے کہے ہوئے چند جملے یاد آئے۔ "خدا کے انکار سے خدا مر نہیں جاتا۔ نہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ بلکہ تمہارے ذہن پر ایسی نحوست چھا جاتی ہے کہ تم انسان نہیں رہ سکتے۔ تمہارے ذہن میں نیکی کے سارے خیالات کافور بلکہ باتیں بن کر رہ جائیں گی۔ آج نہیں تو اور کسی وقت تم اپنے کئے پر ضرور پشیمان ہوگے اور تمہیں بے انتہا شرم آئے گی۔"

دوڑتے ہوئے کریم کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے قاسم نے وفور جذبات سے جھرجھری لی اور خاموش ہو گیا۔

جب یہ دونوں بہت دور نکل گئے تو کریم بوجھ کے باعث نڈھال ہو چکا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا مسلط تھا۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے سیٹیاں سی بجا رہے تھے۔ تاروں بھرا آسمان حیرت سے ان دونوں کے ملاپ کو دیکھ رہا تھا۔

اس نے پھولی ہوئی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "قاسم! کیا حال ہے؟"

قاسم نے کمزور اور مری ہوئی آواز میں کہا۔ "اچھا ہوں بھئی۔ اچھا ہوں۔ کہاں جا رہے ہو؟"

کریم نے کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ لوگ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ جہاں اس وقت ہر طرف خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔

ایک بوسیدہ مکان کے آگے رک کر کریم نے آواز لگائی۔ "نفس بھائی — او — نفس بھائی"

اندر سے کوئی اکھڑے ہوئے لہجہ میں نیند سے چونک کر بولا۔ "کون — کون ہے — کریم"

"جلدی سے میرے کمرے میں آنا — میں چلتا ہوں" اور وہ آگے بڑھ گئے۔

کریم نے گھر پہنچ کر کنڈی کھولی۔ اور قاسم کو آرام سے چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔

چند لمحوں بعد ایک دیہاتی عمر کا آدمی لالٹین لئے اندر داخل ہوا۔ اندر آکر اس نے فوراً کہا۔ "کیوں۔ کیا آج بھی کسی بیچارے کو کمیونسٹوں نے مار ڈالا — زندہ ہے؟"

کریم نے کچھ نہیں کہا۔ نفس نے لالٹین قریب کر دی۔ اور قاسم کا چہرہ دیکھ کر چیخ اٹھا۔ "کریمے! ارے یہ تو کسے اٹھا دیا۔ یہ تو قاسم ہے قاسم —"

کریم نے سرد مگر طاقتور لہجہ میں کہا۔ "نفس بھائی۔ انسان اسی وقت انسان ہے جبکہ وہ بے بس دشمن کو یہ جانتے ہوئے بھی سینے سے لگا لے کہ یہ اگر آزاد رہا تو سب سے پہلے اسے ہی مار ڈالے گا۔ تم مسلمان ہو کر ایسی بات کرتے ہو۔ بتاؤ اگر یہ مر جائے تو تم خدا کو کیا جواب دوگے۔ چلو مرہم پٹی کرو۔ میں تمہارا سامان لاتا ہوں۔"

کریم کے جانے کے بعد نفس جراح کچھ دیر تک ساکت و صامت کھڑا رہا۔ پھر اس نے جھک کر قاسم کو سینے سے لگا لیا۔ گلوگیر آواز میں بول اٹھا۔ "میرے بھائی مجھے معاف کر دو۔ مجھے دراصل تمہیں دیکھ کر کئی زخم یاد آگئے تھے۔ مجھے اپنا بھائی رحیم اور بھاوج

کلثوم یاد آ گئے۔ آہ! قسم خدائے پاک کی میں تم سے جھوٹ نہیں کہتا۔ کہ اب دیکھو پلنگ کی پٹی سے لگا زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔ وہ کلثوم کو بہت چاہتا تھا۔ بھیا تم نے کلثوم کو ـــ دیکھا ہے نا ـــ سچ کہنا کتنی نیک تھی وہ۔ تم ہی کہو "

لیکن قاسم کیا کہتا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار اپنے ماضی کو یاد کر کے شرم محسوس ہوئی تھی۔ اور نقاہت کے باعث وہ دوبارہ بیہوش ہو چکا تھا۔

تین ہفتوں کی انتھک محنت کے بعد قاسم چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ اشتہاری مجرم ہونے کے باعث وہ باہر نکل نہیں سکتا تھا۔ روپوشی کی زندگی اُس کے لئے عذاب بن گئی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے ساتھیوں کو یاد کرتا رہتا تھا۔ جن کے متعلق اُنہوں نے سُنا تھا کہ وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں!

جس روز فضل نے اُسے چلنے پھرنے کی اجازت دی۔ وہ مُنہ اندھیرے ہی باہر نکل گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ اُسی وقت اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اسی لئے مُنہ پر کپڑا باندھے لنگڑاتا لنگڑاتا تیز تیز درختوں پتھروں کی آڑ لئے چلا جا رہا تھا۔ اُسے یکے بعد دیگرے دوست اور پُرانے ساتھی یاد آ رہے تھے۔ اُسے وہ دن یاد آ رہے تھے جب فضل اور کریم اُس کی خون بھری پٹیاں بدلا کرتے تھے اور اُس کے نجاست آلود کپڑے دھوتے تھے۔ کئی وقت درد کی شدت کی وجہ سے اُس نے کریم اور فضل کو گالیاں دی تھیں۔ اور کہا تھا کہ اچھا ہونے کے ساتھ ہی وہ دونوں کو مروا ڈالے گا!

اُس کی سوچ ابھی پوری نہ ہوئی تھی کہ اُس نے سامنے ایک مسلح ٹولی کو آتا دیکھا اور چھپ گیا۔

یہ ریڈی اور اُس کے ساتھی تھے۔ جن کے لہجہ سے پتہ چلتا تھا کہ وہ ابھی کسی کو قتل کر کے آ رہے ہیں۔ ریڈی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا کہ وہ قاسم کے انتقام کی خاطر اور کئی کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے!

قاسم کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ لیکن تازہ خون کی بُو غیر شعوری طور پر اُس کی ناک میں گھُس آئی۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "جانے کون مظلوم ہو گا"

جب ریڈی وغیرہ چلے گئے تو وہ تیز تیز اُسی طرف جانے لگا۔ جدھر سے یہ آ رہے تھے۔

ایک درخت سے فضل جراح کی لاش اُلٹی لٹک رہی تھی۔ جس کو سنگینوں سے ہلاک کیا گیا تھا۔ اس کے گلے میں ایک کاغذ بندھا ہوا تھا۔ جس پر لکھا تھا۔ "قاسم کا انتقام"

کئی منٹ تک قاسم بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ سر سے پاؤں تک ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آ کر چھلک اٹھے تھے۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا انتقام خود اُس سے انتقام لے رہا ہے۔ اُس کے سارے معتقدات اُس کے سامنے عریاں ہو کر ناچ رہے تھے۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی تک جسمانی تعیش اور خواہ مخواہ کی تشدد پسند طبیعت نے اُسے اندھا کر رکھا تھا۔ اُسے بے حس بنا رکھا تھا۔ آج وہ سوچ رہا تھا کہ ہمارا مقصد کیا ہے۔ ہم کیوں لڑ رہے ہیں۔ ایک انقلاب کے لئے۔ ایک ڈکٹیٹر شپ کے لئے۔ ایسی ہی ڈکٹیٹر شپ جیسی کہ اسٹالن نے قائم کر رکھی ہے۔ ایسا ہی نظامِ حیات جیسا کہ سائبیریا کے سرد بیدحانہ اور جبری محنت کے کیمپوں میں رائج ہے۔ جس میں فرد ہر حال فرد رہتا ہے۔ کبھی انسان نہیں بنتا۔ سونے کے انسانوں کا بھائی نہیں بن سکتا۔ جہاں کسی محمود کے ساتھ ایاز کے کھڑے ہونے کی سزا موت ہی ـــ مخالفت ـــ موت ـــ انسانیت ـــ موت ـــ شرم و حیا ـــ موت ـــ

"میں زندہ رہوں گا"۔ قاسم نے کہا۔ "میں فضل بھائی کا انتقام لوں گا۔ میں اتنا کمینہ نہیں بن سکتا"

اُسی روز ایک خفیہ جلسہ بلایا گیا تھا۔ کسانوں کو خاموشی سے بتا دیا گیا تھا کہ آج فلاں جگہ جنگل کے بیچ میں قاسم کی یاد میں جلسہ ہوگا!

کریم، فضل کی موت کے بعد ہی سے غائب تھا۔ اُسے ایک غار میں قاسم کا سُراغ لگانے کی خاطر پیٹا جارہا تھا۔ چھڑیاں ٹوٹی جارہی تھیں۔ اُلٹا لٹکا کر دھواں دیا جارہا تھا۔ بار بار پوچھا جارہا تھا۔ "بتلا۔۔۔ او مُلّا ٹے۔۔۔ قاسم کہاں ہے؟"

"مجھے معلوم نہیں۔ میں کل سے گھر نہیں گیا۔"

"اس سے پہلے وہ کہاں تھا؟"

"میرے گھر میں۔ لیکن یقین مانو۔ میں نے اُسے کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ وہ اچھا ہے۔ یقین کرو۔"

"تیرا یقین کریں۔۔۔ خوب۔۔۔ اسے کھول دو۔ آج رات اس سے سارے ساتھیوں کے بیچ میں پوچھا جائیگا۔"

ریڈی کے حکم سے اُسے کھول دیا گیا۔ زدوکوب کی وجہ سے اُس کا جسم نیلا ہورہا تھا۔

رات مشعلوں کے بیچ میں وہ کھڑا تھا۔ ریڈی فرطِ غیظ سے چیخ رہا تھا۔ "اس حرامی نے قاسم کو قتل کردیا۔ بولو ساتھیو! اس کو کیا سزا دی جائے۔۔۔ یاد رکھو قاسم کو۔۔۔ آہ کامریڈ!"

"سزائے موت۔۔۔ پھانسی۔۔۔ اسے پھانسی دے دو۔" ایک کامریڈ نے کہا۔

"اس کو پتھر مارو۔۔۔ اس کو آگ میں ڈالو۔۔۔ اس پر گولیوں کی باڑھ مار دو۔" کئی آوازیں آئیں۔

"نہیں" ایک گونجتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ "اس پر پھولوں کے ہار ڈالو۔ یہ انسان ہے۔"

مجمع میں سے ایک شخص آگے آیا۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ وہ قدرے لنگڑا رہا تھا۔

"قاسم" ریڈی چیخا۔ "کامریڈ قاسم زندہ ہے۔"

"میں کامریڈ نہیں ہوں" قاسم کی آواز دوبارہ گونجی۔ "اے کسانو! تم گواہ رہنا۔ قاسم آج تمہارے سامنے اس فریب کا ساتھ دینے سے انکار کررہا ہے۔ میں نے جان لیا ہے کہ ہم اپنی جانیں قربان کرنے کے بعد بھی وہ صبح نہیں لاسکتے۔ وہ انقلاب نہیں لاسکتے جس کی تم آس لگائے بیٹھے ہو۔"

اُس نے آگے بڑھ کر کریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور پلٹ کر مبہوت کسانوں سے کہا۔

"ساتھیو! میں تم سے انصاف چاہتا ہوں۔ میں آج فضل کے خون کا بدلا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میں تم سب کو تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ فضل کوئی سرمایہ دار نہیں تھا۔ سامراجی نہیں تھا۔ تمہارا دشمن نہیں تھا۔ تم مساوات پسند کرتے ہو۔ میں دیکھوں گا کہ سُرخی نے کہیں تمہاری انسانیت کو بھی تو نہیں ختم کردیا ہے۔"

ریڈی قاسم کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے کئی مسلح ساتھی ان دو پہاڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن اُن میں ہمت نہیں تھی کہ وہ گولی چلاسکیں۔ کیونکہ اُن کی آنکھوں کے آگے کئی کسانوں کے چہرے تھے۔ جن پر رفتہ رفتہ انسانیت کا نور جاگ رہا تھا۔ وہ پہلے سے ساکت نہیں تھے۔ ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ اُن کے لہجوں میں ایک نئے تصوّر کا استقلال تھا۔

ہماری نظر میں

مختصر شعب الایمان

"مختصر شعب الایمان" (اُردو ترجمہ) تالیف: شیخ امام ابی جعفر عمر قزدینی۔ ضخامت ۴۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ۔ فریئر روڈ۔ کراچی۔

نور محمد کارخانہ تجارت کتب۔ دینی کتابوں کی اشاعت کی گرانقدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ یہ کتاب جو امام بیہقی رحمتہ اللہ علیہ کی مشہور کتاب "شعب الایمان" کا مختصر ترجمہ ہے۔ اسی کتب خانہ نے افادۂ عام کے لئے شائع کی ہے۔ کتاب شروع سے لے کر آخر تک مفید ہی مفید ہے۔ ایمان کی ستتر (۷۷) شاخوں کا تفصیل وار بیان ہے۔ اور ہر شاخ کے لئے قرآن، حدیث اور بزرگانِ دین کے اقوال سے دلیلیں فراہم کی گئی ہیں۔

حضرت ابوبکر ابن داؤدؒ کے اس قول میں کتنی حکمت اور ادبیت پائی جاتی ہے:۔

"اچھو کا علاج پانی پینا ہے۔ لیکن جب پانی سے اچھو ہو جاتا ہو اس کا کیا علاج؟"

ایک حکیم نے اپنے لڑکے سے کہا۔ "تم شراب کیوں پیتے ہو؟" جواب دیا۔ "ہاضمہ" کے لئے۔ حکیم نے کہا۔ "شراب کھانے کو ہضم کرنے سے پہلے دین کو ہضم کر لیتی ہے۔" لہ

اسی آب و تاب کے جواہر سے یہ خریطہ لبریز ہے!

اسوۂ حسینی

"اسوۂ حسینی" از:۔ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی۔ ضخامت ۱۱ صفحات۔ قیمت آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دار الاشاعت۔ مقابل مولوی مسافر خانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی ۱

غلط قسم کی عقیدت نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام اور کام کو کھیل تماشوں کے مظاہر میں تبدیل کر دیا ہے۔ پھر شاعری اور داستان سرا واعظوں کے ذریعہ کربلا کے جن واقعات کی عوام میں اشاعت ہوئی ہے۔ اُن میں حقیقت کم اور افسانویت زیادہ ہے۔ جناب مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی کو اللہ تعالیٰ دارین میں جزائے خیر عطا فرمائے کہ موصوف نے کربلا کے واقعات کو مستند تاریخوں سے چھن کر سہل اور دلنشین انداز میں یکجا کر دیا ہے!

مسلمانوں نے حضرت سیدنا حسین علیہ السلام کے اصل پیام کا رُخ بدعتوں اور کھیل تماشوں کی طرف جو پھیر دیا ہے۔ قیامت کے دن اس پر اُن سے مواخذہ ہوگا۔ آہ! حسینؓ کے پیام کی مظلومیت!!

وحدۃ الوجود اور توحید اسلامی

"وحدۃ الوجود اور توحید اسلامی" (حصہ اول) مرتبہ:۔ منشی کے عبد الرحمٰن عمری (منشی فاضل) ضخامت ۴۸ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: منشی کے عبد الرحمٰن عمری، پیام پبلی کیشنز (مدراس)

لہ (صفحہ ۵۳) "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا" کا ترجمہ "اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حکم کرتا ہے کہ امانتیں ادا کرتے رہو" ناقص ترجمہ ہے۔

اس کتاب کے عنوانات حسب ذیل ہیں:۔

اسلام اور تصوف ـــ صوفیاء کے دور ـــ اسلام کا بنیادی عقیدہ اور اس کی اہمیت ـــ نظریہ توحید اور ملل عالم ـــ الٰہیات ہنود کا فلسفہ ـــ ویدوں کی تعلیم اور اپنشدوں کا فلسفہ ـــ وحدۃ الوجود کی تاریخ ـــ توحید کا غلط تصور ـــ اللہ اور کائنات۔

یہ کتاب "وحدۃ الوجود" کے رد میں لکھی گئی ہے۔ اور اسلام کی پیش کی ہوئی توحید خالص سے بحث کی گئی ہے فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ تصوف، وجد و حال اور مراقبہ و ریاضت کی جو صورتیں بعد میں نظر آتی ہیں۔ اُن کی کوئی مثال صحابہ کرام کے دور میں نہیں ملتی۔ اور مسلمانوں کو اسوۂ حسنہ کے بعد تزکیۂ نفس اور احسان میں صحابہ کرام ہی کے طریقہ کو مشعلِ راہ بنانا چاہیے۔ کہ یہ نفوسِ قدسیہ براہ راست حضورؐ کے تربیت یافتہ تھے!

فاضل مصنف کی یہ کوشش قابل قدر اور مستحقِ ستایش ہے کہ انہوں نے کسی کی ملامت سے بے خوف ہو کر عجمی معتقدات کے ایوانوں میں توحید کا غلغلہ بلند کیا ہے۔

ابوذر غفاریؓ کا مذہب

"ابوذر غفاریؓ کا مذہب"۔ از۔ سید شہاب الدین ید اللہی۔ ضخامت ۳۰ صفحات قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ (ٹائپ پر) ملنے کا پتہ۔ بزم ادب۔ شہدادپور (سندھ)

اس کتاب میں حضرت سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی زندگی کے حالات ایک خاص نقطۂ نگاہ سے پیش کئے گئے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ پر زہد و تقشف اور دنیا سے بے رغبتی کا بہت غلبہ تھا۔ اسی لئے جہاں اُن کی زندگی اور تعلیمات میں "ترک دنیا" کی جھلک پائی جاتی ہے۔ جمہور صحابہ اُن کے ہمنوا اور ہم خیال نظر نہیں آتے۔

اس کتاب میں جو یہ رنگ پیدا کیا گیا ہے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے دولت مند صحابہ کے خلاف کوئی پارٹی بنائی تھی اور اس دور میں افلاس و سرمایہ کی باقاعدہ کشمکش جاری تھی۔ یہ نری خیال آرائی اور اس بیسویں صدی کے ماحول اور گردوپیش کی ترجمانی ہے!

"آپ بتلاتے کہ دنیا میں اسلام کے آنے کی غرض معاشی مساوات[1] کرنا تھا؟"

"معاشی مساوات" کو ظہور اسلام کی غرض و غایت بتانا شاعرانہ شوخیٔ فکر نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر اسلام میں دولت جمع کرنا ناجائز ہوتا تو "زکوٰۃ" کا حکم کیوں دیا جاتا۔ یہ اسلام ہے جس نے "دولت اور سرمایہ" کی تطہیر کی۔ ذاتی ملکیت کا بھی قرآن پاک سے ثبوت ملتا ہے۔ آج بھی کوئی شخص اپنی تمام آمدنی فقراء اور غرباء پر خرچ کردے اور ایک حبہ جمع نہ کرے اور اس کی زندگی کا سامان اتنا مختصر ہو کہ گھر میں ایک چٹائی کے سوا اور کوئی چیز نہ ہو۔ تو اس تقشف کی زندگی پر کسی کو طنز کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ بلکہ یہ صورت حال قابلِ تعریف ہی ہے۔ لیکن اس قسم کی زندگی کی تقلید پر کسی کو مجبور نہیں کیا جا سکتا!

(صفحہ) "لوٹ و غارت" واو عطف کی جگہ "اور" لکھنا تھا۔

صفحہ ۲۸ پر "زبدہ" جس مقام کا نام لکھا ہے۔ وہ غالباً "ربذہ" ہے۔

---

[1] مساوات کے بعد لفظ "قائم" شاید چھوٹ گیا ہے۔ (م۔ق)

"ابھی اسلام اپنے ابتدائی دور میں تھا۔ نہ تو اُس کے اصول اور قوانین موزوں تھے اور نہ اُس کی خوبیوں کا اندازہ کرنے، وہ تفصیلات پیدا ہوئی تھیں جن کو پیش کر کے اسلام کا دوسرے مذاہب سے تقابل کیا جا سکتا تھا۔"

عجیب مبہم اندازِ بیان ہے اور پھر یہ جملہ "نہ تو اُس کے اصول اور قوانین موزوں تھے" انتہائی لغو ہے۔ "موزوں" کے معنی اگر "مرتب" لئے جائیں تو اس جملہ کی رکاکت دور ہو سکتی ہے۔

اس مادہ پرست دور میں جب کہ تمدن و تہذیب کی بوقلمونیوں نے لوگوں کو آخرت فراموش بنا دیا ہے اور ہر کوئی دولت سمیٹنے اور عیش کرنے کی دُھن میں ڈوبا ہوا ہے، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی سادہ زندگی یقیناً اس انتہا میں اعتدال پیدا کر سکتی ہے۔

راہ حج کی آسان سمجھ

تفہیم الطریق الی بیت العتیق (یعنی راہ حج کی آسان سمجھ) مرتبہ:۔ انجمن خدام النبی۔ ضخامت ۷۲ صفحات (قیمت درج نہیں شاید مفت مل سکتی ہے) ملنے کا پتہ:۔ انجمن خدام النبی صابو صدیق مسافر خانہ کرناک روڈ بمبئی۔

اس کتاب میں سفرِ حج کے لئے ضروری ہدایات درج ہیں۔ جن کا مطالعہ ہر زائر حرم کے لئے عموماً اور ہندوستان کے حاجیوں کے لئے خصوصاً بہت مفید ہے۔ انجمن خدام النبی (بمبئی) بڑے اخلاص کے ساتھ حجاج کی خدمت کا کام انجام دے رہی ہے۔

"سیدنا آدم علی نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی عمر میں ہندوستان سے چل کر چالیس حج ادا کئے۔" (صفحہ ۲۴)

آخر اس روایت کا ماخذ کیا ہے؟

معلم الانشاء (الجزء الثالث)

"معلم الانشاء" (تیسرا حصہ) از:۔ محمد الرابع الندوی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (ہند)

معلم الانشاء کا تیسرا حصہ ندوۃ العلماء لکھنؤ نے خاص اہتمام اور دیدہ زیبی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس میں عربی انشاء و مضمون نگاری کے قواعد و ضوابط، مثالیں، مشقیں، مضامین کے تفصیلی عناصر و عنوانات درج ہیں اور آخر میں منفلوطی، سید قطب اور احمد امین جیسے بلند پایہ اور مستند انشاء پردازوں کے مضامین کے نمونے دیئے گئے ہیں۔

جناب محمد الربیع الحسنی الندوی نے اس کتاب کو بڑے سلیقہ اور دقتِ نظر کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔ عربی انشاء پردازی کی تعلیم و تمرین کے لئے یہ کتاب بڑے کام کی چیز ہے۔ اس میں مثالوں کے ذریعہ بتایا گیا ہے کہ مقالہ حسبِ ذیل اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے:۔

افتتاح ــــ موضوع ــــ عناصر الموضوع ــــ اختتام ــــ عنوان۔

مقالہ کو کس طرح پھیلایا جائے؟ اور اس پھیلاؤ اور مرکزی مضمون سے جو مقالہ کا محور ہوتا ہے کس طرح ربط قائم رکھا جائے؟

"معلم الانشاء" کے ذریعہ صرف عربی سکھانا مقصود نہیں ہے۔ اس کے مقالات میں دینی روح بھی موجود ہے کہ عربی استعداد کی ترقی کے ساتھ دینی اسپرٹ کی بھی بالیدگی ہوتی رہے۔

رنگ سحر

"رنگِ سحر" مرتبہ:۔ طالب حجازی۔ ضخامت ۱۶۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ دو آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ حلقہ ادبِ اسلامی حافظ آباد۔

حلقہ ادبِ اسلامی حافظ آباد پاکستان کا شاید سب سے زیادہ فعال اور فرض شناس حلقہ ہے۔ جو کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔

یہ کتاب اسی حلقہ کی پیشکش ہے۔ جسے جناب طالب حجازی نے مرتب کیا ہے:۔

"رنگِ سحر" نثر و نظم کے مضامین کا گلدستہ ہے۔ جس میں نئے اور پرانے باغبانوں کے گلہائے افکار یکجا کئے گئے ہیں۔ بعض مضامین خاصے ہیں۔ فاضل مرتب نے شروع میں مقامی ارکان کے تکدر و نزاع کا جو ذکر کیا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ ہر بات کے کہنے کا محل ہوتا ہے۔

دیکھتا ہوں میں جب گلستاں کو   خون روتی مری جوانی ہے   (صفحہ ۱۰۳)

اس میں شعریت کا دور دور پتہ نہیں۔ شاعر نے بس لفظ جوڑ دیئے ہیں۔

آؤ مے نوشو! محبت کے ہیں ساغر بٹ رہے   بڑھ کے لو جس نے کہ پینا ہو کہ اذنِ عام ہے   (صفحہ ۱۰۶)

"محبت کے ہیں ساغر بٹ رہے" اس میں کتنی ناگوار تعقید پائی جاتی ہے۔ پھر "جس نے کہ پینا ہو" اس نے شعر کو اچھا خاصا مضحکہ بنا دیا۔

صبح تیری ہے شام تیری ہے   بادۂ لالہ فام تیری ہے   (صفحہ ۱۰۶)

"بادہ" مؤنث نہیں مذکر ہے۔

حریت آموز انساں داستانِ کربلا   شمعِ راہ مردِ مومن ہے یہ تدریسِ جلی   (صفحہ ۱۳۵)

یہ "تدریسِ جلی" آخر کیا بات ہوئی؟

فرض ہے کریں دینِ حق کی اطاعت   جو حائل ہو رستے میں اس کو مٹا دو   (صفحہ ۱۳۶)

جو شخص "فرض" کو "فرَض (بہ وزنِ مَرض)" کہتا ہو۔ وہ بیچاری شاعری پر کرم نہ فرمائے تو اس کا احسان ہوگا۔

عشاق کے دل خالی ہیں آلامِ فنا سے   معمور ہیں ہر لحظہ وہ اللہ کی رضا سے   (صفحہ ۱۵۰)

یہ "تک بندی" کے سوا اور کیا ہے؟ کوئی شاعرانہ نزاکت کوئی جذبہ؟ تخیل نہ سہی لطفِ بیان ہی ہوتا۔

وہ جفا کرتے رہیں اور میں وفا کرتا رہوں   اُن کو اپنا کام ہے اور مجھ کو اپنا کام ہے   (صفحہ ۱۴۰)

مصرعہ ثانی کتنا بچکانہ ہے۔

بچایا چمن دیں کا ابنِ علی نے   کہ پیدا ہوئے باغباں اور بھی ہیں   (صفحہ ۱۵۷)

دوسرا مصرعہ کتنا گنجلک اور بے مزہ ہے!

کہیں نثر میں بھی یہ رنگ آگیا ہے۔

"ابنِ آدم جب شکمِ مادر سے وردو پذیر ہوتا ہے۔" (صفحہ ۱۱)

ہم پوری ذمہ داری اور اخلاص کے ساتھ اس رائے کا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ "رنگِ سحر" میں حلقہ ادبِ اسلامی حافظ آباد کے جن شاعروں کے افکار پیش کئے گئے ہیں۔ وہ کتابی صورت میں منظرِ عام پر آنے کے قابل نہ تھے۔ اُن میں ناپختگی ہے اور زبان و بیان کی غلطیاں ہیں۔ اسلامی ادب کی تحریک ابھی منزلِ آغاز میں ہے۔ اگر شروع ہی میں ایسے نمونے لوگوں کے سامنے پیش کئے گئے تو اسلامی ادب کے بارے میں عوام و خواص اچھی رائے قائم نہ کر سکیں گے!

حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور اُن کی دینی دعوت | "حضرت مولانا محمد الیاسؒ اور ان کی دینی دعوت"۔ از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی۔ ضخامت ۲۸۷ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنہ ملنے کا پتہ۔ کتب خانہ الفرقان لکھنؤ

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سوز یقین - دینی تڑپ اور خشیت الٰہی کا ایک آتش کدہ تھی - کہ جو بھی اس سے چھو گیا وہ مجسم شعلۂ بے تاب بن گیا - میوات جیسے تاریک خطہ میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی کوششوں ہی سے ایمان و یقین کے فانوس روشن کئے ہیں اور دینی اعتبار سے وہاں کی بنجر زمین کو مردم خیز بنایا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا محمد الیاس قدس سرہ کی دینی دعوت اور اُن کے سوانح حیات کو بڑے سلیقہ کے ساتھ دلنشین انداز میں مرتب فرمایا ہے - کتاب کی ایک ایک سطر گواہی دیتی ہے کہ مولانا مرحوم کے دل میں دین کی کیا لگن تھی - کس قدر اخلاص تھا - کتنی للّہیت اور بے نفسی تھی —— قومی حمیت کا یہ عالم ——

"ایک دن خاکسار راقم نے لال قلعہ کے پاس سے گزرتے ہوئے پوچھا کہ جناب نے لال قلعہ بھی دیکھا ہے؟ فرمایا میں لال قلعہ کی میہر کو بے حمیتی سمجھتا ہوں - ہاں! میں نے بچپن میں اس وقت دیکھا ہے جب دکھلانے والے رو رو کر دکھلاتے تھے" اور:-

"حاجی عبد الرحمٰن صاحب راوی ہیں کہ مولانا کے وطن کاندھلہ سے آپ کے کچھ اعزا عیادت کے لئے آئے - مولانا نے پوچھا کس لئے آئے ہو؟ کہنے لگے - آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لئے، فرمایا - جو مٹنے کے لئے بنا ہے - اُس کی خیریت پوچھنے کے لئے کاندھلہ سے یہاں تک آئے اور رسولِ کریمؐ کا دین عزیز جو مٹنے والا نہیں وہ مٹا جا رہا ہے اور تم اس کی خبر نہیں لیتے"۔

پوری کتاب کا یہی رنگ ہے - "صبغۃ اللہ"! جن کے حالات اس کتاب میں درج ہیں وہ خود اپنی جگہ ایک جہان سوز یقین تھے جنہوں نے حالات مرتب کئے ہیں - اُن کی ذات بھی دیکھئے اخلاص و عمل ہے - پھر یہ کتاب جتنی بھی مفید اور اثر انگیز ہو کم ہے -

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی دینی دعوت کا مقصود اللہ کے کلمہ کی سربلندی تھی اور اللہ کا کلمہ اسی وقت سربلند ہوتا ہے جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی بنیادوں پر نظام قائم ہو - جو کوئی کافرانہ نظام کے اندر رہ کر اس کے بدلنے کے لئے کوئی جد و جہد نہیں کرتا اور صرف نماز روزے کی تبلیغ کے لئے ہی گھر سے باہر نکلنے کو "اللہ کا راستہ" سمجھتا ہے - وہ مولانا الیاس صاحب کی دینی دعوت ہی کو نہیں سمجھا - سید حسن البنا شہید رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر اللہ کی رحمت کے پھولوں کی بارش - کتنی عزیمت کی بات کہہ گئے ہیں:-

"مسلمان دنیا کی سیادت سے کم کسی چیز پر راضی ہو ہی نہیں سکتا"۔

جواہر التصدیق اور .....

(۱) جواہر التصدیق، مولفہ - بندگی میاں شیخ مصطفےٰ گجراتی - ضخامت ۱۰۶ صفحات (اُردو ترجمہ کیساتھ)

(۲) تلطمۃ المصدقین علیٰ وجہ المکذبین - تالیف - بندگی میاں شاہ قاسم (اُردو ترجمہ کے ساتھ) ضخامت ۸۴ صفحات (۳) مجالس خمسہ - تصنیف - بندگی میاں گجراتی (اُردو ترجمہ کے ساتھ) ضخامت ۵۰ صفحات۔

(۴) مطلع الولایت - تالیف حضرت بندگی میاں سید یوسف (اُردو ترجمہ کے ساتھ) (ہدیہ غیر معاندین سے ۸؍) -

ملنے کا پتہ:- دار الاشاعت کتب سلف الصالحین المعروف بہ جمعیۃ مہدویہ دائرہ زمستان پور، مُشیر آباد، حیدر آباد دکن -

ان چاروں کتابوں میں سید محمد جون پوری صاحب کی "مہدویت" پر دلیلیں لائی گئی ہیں کہ احادیث میں جس "مہدی موعود" کی بشارت دی گئی ہے - وہ جونپور کے میراں سید محمد تھے - جو ۸۴۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۰۱ھ میں جنہوں نے مکہ معظمہ جاکر طواف بیت اللہ کیا - اور ۹۱۰ ہجری میں وفات پائی اور فرہ میں دفن ہوئے!

یہ بات عالم آشکارا ہے کہ سید محمد جون پوری کے دعوائے مہدویت کو جمہور مسلمین نے نہ اُن کے زمانے میں قبول کیا اور نہ بعد والوں نے انھیں "مہدی موعود" مانا - اس وقت ساری دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس کروڑ سے بھی زائد بتائی جاتی ہے - ان پچاس کروڑ مسلمانوں میں مہدوی جو سید محمد جون پوری کی مہدویت پر ایمان رکھتے ہیں - زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ہوں گے - کسی خبط الحواس اور فاتر العقل کے سوا کوئی صاحب عقل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ دنیا میں مسلمان بس یہی ڈیڑھ دو لاکھ مہدوی ہیں - باقی وہ کروڑوں نفوس جو نماز پڑھتے ہیں - روزہ رکھتے ہیں - زکوٰۃ دیتے ہیں - حج کرتے ہیں - اللہ پر - رسولوں پر - کتابوں پر - ملائکہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں - صرف جون پور کے سید محمد صاحب کے دعوئ مہدویت کو نہ ماننے کی وجہ سے کافر ہیں - (نعوذ باللہ من ہذہ الھفوات)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جس "فارقلیط" کا ذکر فرمایا ہے - اس سے حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذاتِ گرامی مراد ہے - اسی لئے حضورؐ کو "دعائے خلیل اور نوید مسیحا" کہا گیا ہے - مگر "جواہر التصدیق" میں بندگی میاں صاحب لکھتے ہیں کہ "فارقلیط" کی مصداق مہدی موعود کی ذات ہے" - ع

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہیئے!

"نقلیۃ المصدقین ......" میں لکھا ہے:-

اہانتِ وحقارتِ کفش و پیراہن علماء کفر است — "علماء باللہ کے کپڑوں اور جوتیوں کی توہین کرنا بھی کفر ہے۔"

حالانکہ کسی عالم کو گالی دینا بھی "کفر" نہیں ہے - ہدایہ اور فتاویٰ ناصری کے حوالے سے یہ عبارت لکھی گئی ہے - اصل عبارت ہمارے سامنے نہیں ہے - اگر ان کتابوں میں بلفظہٖ یہی کچھ لکھا ہے تو فقہا کی یہ نری مبالغہ آرائیاں ہیں!

زیر تبصرہ کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ سید محمد جون پوری اور اُن کے خلفاء بادشاہوں اور حکمرانوں کے درباروں میں جاتے ہیں اور اکابر علماء سے اُن کا مناظرہ ہوتا ہے - اور ہر مناظرہ میں انہی حضرات کی فتح ہوتی ہے - تمام علماء لاجواب ہو جاتے ہیں — یہ یک طرفہ بیان ہے -

"مطلع الولایت" میں سید محمد جون پوری کی کرامات درج ہیں - کہیں سمندر کی مچھلی سید محمد مہدی صاحب کو دیکھ کر اپنا سر جھکا لیتی ہے اور دیر تک اُن کو دیکھتی رہتی ہے - جب سید صاحب اشارہ فرماتے ہیں تو وہ مچھلی اپنے وطن کی راہ لیتی ہے — کہیں کسی بزرگ کی روح سید محمد مہدی کے استقبال کیلئے چھ میل تک آتی ہے - جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ مبارک پر مہر نبوت تھی - اسی طرح خاتم ولایت (سید محمد) کی پشت پر بھی مہر ولایت تھی - جس میں تورات کے حروف کے مانند حروف نہایت خوبصورت لکھے ہوئے تھے — کہیں یہ لکھا ہے کہ بارہ سال تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمان ہوتا رہا کہ اے سید محمد مہدی ہم نے تجھے مہدی موعود کا منصب عطا فرمایا ہے - مگر سید صاحب اس کی نفی کرتے رہے - اور بڑی تکرار اور رد و کد کے بعد کہیں انھیں اپنے مہدی ہونے کا یقین آیا — کبھی سید محمد مہدی جون پوری کی ڈاڑھی سے جو پانی وضو میں گرتا ہے - وہ "ھذا مھدی موعود ھذا خلیفۃ اللہ" پکارتا ہے — کبھی سید محمد جونپوری یہ فرماتے ہیں کہ تمام اولوالعزم رسل، تمام انبیاء اور عالی درجہ اولیاء کی ارواح اور آدم سے اب تک تمام مومنین اور مومنات کی ارواح بندہ کے حضور میں پیش ہوتی ہیں -

اس "طلسم ہوش ربا" کو برداشت بھی کر لیا جائے - مگر سید محمد جون پوری کے ساتھیوں کے ناموں کے ساتھ "صحابی" کا لقب دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی — پھر —:

"ایک روز حضرت امام نے فرمایا حق تعالیٰ کا فرمان ہوتا ہے کہ اگر میں کسی نبی اور مرسل کو نہ بھیجتا اور کسی کتاب کو نازل نہ کرتا تو ان دونوں اشخاص کے لئے ہمارے قرب میں یہی مقام ہوتا۔ یہ دونوں بے واسطہ تخصیص کئے گئے ہیں۔ یہ محض ہمارا فضل اور ہمارا احسان ہے اور ہم نے ایسے دو شخصوں کو کسی نبی اور مرسل کو نہیں دیا ہے" (صفحہ ۱۰۰ — مطلع الولایت)

سید صاحب جون پوری اپنے دو خلفاء (غالباً میراں سید محمود اور خوندمیر) کے بارے میں دون کی لے رہے ہیں۔ کہ کسی نبی اور مرسل کو بھی اس درجہ کے صحابی اور جانشین نہیں ملے — یہ خرافات اور کم ظرفی نہیں تو اور کیا ہے! ایسی واہی تباہی باتوں کو "سکر" اور "شطحیات" کہہ کر بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

سب سے زیادہ اعتراض کی بات یہ ہے کہ اس کتاب (مطلع الولایت) کے سرورق پر:-

"سیرت امام مہدی موعود خلیفۃ اللہ ہمسر رسول اللہ"

لکھا ہوا ہے۔ (معاذ اللہ! نقل کفر کفر نہ باشد) کیا کوئی مسلمان بصحت ہوش و حواس کسی ولی، قطب، ابدال، مجدد، مسیح موعود یا مہدی موعود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمسر یا ہم پایہ سمجھ سکتا ہے؟ حضورؐ کی مشابہت تو کجا سید محمد جون پوری اور اُن کے تمام خلفاء حضورؐ کے غلام سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کی نعلین سے گرے ہوئے ذرّوں کی بھی برابری نہیں کر سکتے! مہدوی گروہ کے معقولیت پسند حضرات سے ہم گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنے یہاں کے جہلاء اور سفہاء کو اس قسم کی احمقانہ حرکتوں سے روکیں۔ ایسی باتوں سے لوگ مہدویت سے قریب تو کیا ہوں گے اور متنفر اور وحشت زدہ ہو جائیں گے!

مہدوی گروہ اگر اپنے اس قول میں سچا ہو کہ واقعی سید محمد جون پوری نے یہ اعلان کیا تھا کہ جو کوئی میرے دعوائے مہدویت کی تصدیق نہیں کرتا۔ وہ کافر ہے" تو انہوں نے یہ ایک لغویات کہی تھی۔ اور کسی مسلمان کے ایمان میں سید محمد جون پوری کے مہدی نہ ماننے سے ذرا سا بھی نقصان پیدا نہیں ہو سکتا۔

ان کتابوں کا اُردو ترجمہ بہت کمزور ہے۔ جگہ جگہ زبان و بیان کی غلطیاں ہیں۔ اور جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ زیادہ تر لاطائل ہی ہیں۔ قادیانی بھی تو قرآن، احادیث اور شیخ محی الدین ابن عربی وغیرہ بزرگوں کی تحریروں ہی سے غلام احمد کی نبوت پر دلیلیں لاتے ہیں۔ مگر اُس کا وزن کیا ہے؟

حرفِ تمنّا

"حرفِ تمنّا" از۔ میکش اکبر آبادی۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ مجلد (گرد پوش کے ساتھ) قیمت تین روپے۔ ملنے کا پتہ:۔ میکش اکبر آبادی۔ میوہ کٹرہ آگرہ۔ پاکستان میں:۔ مرزا احسان علی بیگ نمبر ۱۷۴ ہی زرنکاری بازار راولپنڈی

جناب میکش اکبر آبادی ایک شریف انسان اور حساس شاعر ہیں۔ علم و ادب اور تصوف کا ذوق انھیں خاندانی طور پر ورثہ میں ملا ہے۔ اُردو ادب کی خاموشی کے ساتھ خدمت کرتے رہے ہیں اور نام و نمود کے پیچھے نہیں دوڑے۔ اس لئے اُن کی شخصیت کے مقابلے میں اُن کی شہرت بہت کم ہے!

"حرفِ تمنّا" میکش صاحب کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو خلوص اہتمام سے چھپا ہے۔ میکش صاحب فکر شاعر ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُن کے یہاں تصنع نہیں۔ جیسے وہ خود ہیں اپنی شاعری میں بھی اسی طرح نظر آتے ہیں۔ میکش کی محبت کو چہ گرد اور آوارہ نہیں رہی۔ اس میں سنجیدگی اور وقار رہا ہے اور یہی جھلک اُن کے شعروں میں دکھائی دیتی ہے۔

آپ کی میری کہانی ایک ہے ۔۔۔ کہئے اب میں کیا سناؤں کیا سنوں!

تری زلفوں کو کیا سلجھاؤں اے دوست　　مری راہوں میں پیچ و خم بہت ہیں
نہیں ہے منحصر کچھ فصلِ گُل پر　　جنوں کے اور بھی موسم بہت ہیں

ایسا بھی انقلاب جہاں میں ہوا نہیں　　دن ہو گیا ہے اور اندھیرا گیا نہیں

تجھ سے بھی دل کو زیادہ ہے تری یاد عزیز　　دیکھ آ کر مری ناکامیٔ الفت کا سرور

پہنچ ہی جائے گا یہ ہاتھ تیری زلفوں تک　　یونہی جنوں کا اگر سلسلہ دراز رہا

خوشی تو مٹ چکی لیکن نگاہِ لطف نے تیری　　دیا تھا دل کو وہ دھوکا کہ غم بھی مٹ گیا ہوتا

ساقی یہ لغزشیں ہی تو ہیں حاصلِ حیات　　ہاں !! ایک جام اور کہ ہم پھر سنبھل گئے

دل ہے اور آپ کے وعدے کا یقیں کیا کیجئے　　کوئی آشنا نہ بنائے کوئی آشنا نہ بنے

تم آ گئے تو اور خلش دل کی بڑھ گئی　　اچھے تھے ہم خلش کا مداوا کئے بغیر

تیری نظروں میں تو کچھ سحر ہے ظالم ورنہ　　اپنے قابو میں بھی مشکل ہی سے ہم آتے ہیں

لے گئی دشت میں وحشت نے یہ احسان کیا　　ورنہ ہم رہتے تو گھر اور بیاباں ہوتا

دل میں خود اُن کے بھی چُبھ کر رہ گئے　　وہ نظر کے تیر جو ہم سہ گئے
آج وہ محفل میں میکش کی طرح　　کچھ نہ بولے اور سب کچھ کہہ گئے

کیا کچھ امید تھی تری نیچی نگاہ تک　　اور تو نظر ملاتے ہی بیگانہ ہو گیا

جستجو ترکِ سکوں ہے کیا سکوں کی جستجو　　کیا سکوں کیا جستجو بھی ہے تو وہ بھی ہو تو

وصل و فرقت پھر خدا جانے ہم ہوں یا نہ ہوں　　کر بھی لوں اک نالۂ آخر تمہارے روبرو

جہاں معمورِ رشکِ غیر ہے ہر دل کو کیا کیجئے　　فسانہ اُس نگاہِ لطف کا جا کر کہاں کہیئے

تمہارا در ہے ہم بھی جانتے ہیں　　مگر اب آن بیٹھے ہیں ہم یہیں پر

یوں تری دشمنی ہے دل کو عزیز　　جیسے ہوتی ہو آگ جاڑوں میں

خدا جانے دل کو مرے کیا ہوا ہے　　تمہیں سے خفا ہے تمہیں پر فدا ہے

دیکھنے پر ترے موقوف نہیں وحشتِ دل　　تو نہ دیکھے تو یہ انداز بھی قاتل ہو جائے

مری گم گشتگی منزل ہے منزل کس کو کہتے ہیں　　خیال آ جائے منزل کا تو منزل دُور ہو جائے

برباد آرزو کو دیوانہ کہہ دیا ہے　　اک لفظ کہہ کے تم نے افسانہ کہہ دیا ہے

مرے دل کی بھی عمر اتنی ہی تھی　　ترے لب پہ جتنا تبسم رہا !!

ہمیں تو کوئی حسینوں میں باوفا نہ ملا　　تمہارا ذکر نہیں ذکر ہے زمانے کا

کھل رہی ہیں مجھ پہ وحشت کی ادائیں کس قدر　　کیا بھلا لگتا ہے دامن دھجیاں ہونے کے بعد

تم نے کیوں ناز سے مجھے دیکھا　　اب مجھی پر نظر ہے محفل کی !

شرمندۂ نگاہِ کرم ہو کے رہ گیا !　　شکوہ زباں پہ شکرِ ستم ہو کے رہ گیا

وہ اس طرح سے ہے جلوہ فرما کہ طالبِ دید ہے زمانہ　　جو ہم سے مدِ نظر تھا چھپنا ظہور کا نام کیوں کیا ہے

کیا تھا بادِ حوادث نے منتشر جن کو　　سمٹ سمٹ کے وہی ذرّے کوہسار بنے
نہیں ہے ڈر ہمیں اس دور کی تباہی سے　　ہم آفتاب بنائیں گے اس سیاہی سے
پھر بہار آئی نہایا اشکِ شبنم سے چمن　　خون سے لالہ کے ہیں نکھرے کوہ و دمن
پھول سے رُخ پر زلفیں برہم　　صبحیں دُھندلی۔ شامیں مدھم
ہے ہاتھ تیرے ہاتھ میں دل بے قرار ہے　　اس وقت میری نبض کا کیا اعتبار ہے
ہاں! میری خودی بھی فلسفی اچھی ہے　　مستوں کی بھی خوئے بیہشی اچھی ہے
عرفاں نہ ہو جس کو ذاتِ حق کا اُس کی　　اچھی ہے خودی نہ بے خودی اچھی ہے

دُوسرا رُخ:-

وہ گیسوؤں سے ہوش گنوانا ہوا تمام　　وہ آنچلوں سے ہوش میں آنا گزر گیا　　(صفحہ ۴)

یہ شعر "ترجمہ" سا معلوم ہوتا ہے۔ "تمام" کی جگہ یہاں "ختم" کا محل تھا۔

یہ کہہ جام و ساغر کیسے بدلیں ہاں! مگر ساقی　　تری محفل میں آئے انقلاب اور بار بار آئے　　(صفحہ ۶)

آخر یہ بات کیا ہوئی؟ پھر نہ تخییل نہ لطفِ بیان!

یہ جبر و اختیارِ عشق ہے تم اس کو کیا سمجھو　　رہیگا دل پہ کب قابو جو تم پر اختیار آئے　　(صفحہ ۶)

شعر سپاٹ اور بے مزہ ہے "جو تم پر اختیار آئے" بھی زبان و محاورہ کے لحاظ سے محلِ نظر ہے۔

جہاں گلشن ہو اے گلچیں! گلوں کی تاب ہی کتنی　　مگر اے کاش یہ گلشن ہی تجھ کو سازگار آئے　　(صفحہ ۶)

شعر کیا ہے اچھی خاصی چیستان ہے۔

دیکھا نہ ہوگا تم نے ہمارا مقام بھی　　گزرے کبھی تو ہو گے محبت کی راہ سے　　(صفحہ ۱۲)

مصرعِ اولیٰ میں ذم پایا جاتا ہے۔

جو ترے جمال پہ چھا سکے تجھے اس بقا کی ہے آرزو　　ترا حُسن جس میں سما سکے مجھے اُس فنا کی تلاش ہے　　(صفحہ ۱۴)

"بقا کا جمال پہ چھانا" اور "حُسن کا فنا میں سمانا" عجیب اندازِ بیان اور نرالی تخییل ہے۔ فکر کا ایسا اُلجھاؤ شعریت کو غارت کر دیتا ہے۔

نہیں وقت کے مطابق یہ مزاج منعمانہ　　تو بدل دے اپنی خُو بھی کہ بدل گیا زمانہ!
تو اگر بُرا نہ مانے تو میں تجھ سے صاف کہہ دُوں　　کہ نہیں ہے سب حقیقت مری خوئے عاشقانہ　　(صفحہ ۱۷)

ان دونوں شعروں میں کوئی لطف نہیں۔ یہ مصرع "کہ نہیں ہے سب حقیقت مری خوئے عاشقانہ" خاص طور سے کتنا بچکانہ ہے!

ہے وہ نظر نوازشِ الفت سے مطمئن　　مہماں کو نذرِ شوخیٔ مژگاں کئے ہوئے　　(صفحہ ۲۷)

شعر میں آورد ہی آورد ہے۔

اپنی نظر کو اس نے جب بے قرار دیکھا　　کر ڈالا اک نظر سے برباد مجھ کو آخر　　(صفحہ ۴۴)

یہ آخر بات کیا ہوئی؟ اگر محبوب اپنی نظر کو بے قرار نہ پاتا تو کیا عاشق کو برباد نہ کرتا؟ آخر نظر کو بے قرار پاکر برباد کرنے کا

جذبہ کیوں پیدا ہوا؟ مصرعہ ثانی کا آغاز "کر ڈالا" سے ہوتا ہے جو زبان پر کس قدر بار گزرتا ہے!

کیا قہر ہو گئی ترے رازوں کی معرفت — میں انتہائے عقل سے دیوانہ ہو گیا (صفحہ ۵۰)

راز کی جمع "رازوں" نے مصرعہ اولیٰ کو عجیب بنا دیا۔ دوسرا مصرعہ اس سے زیادہ عجیب تر ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ "ترے اسرار کی معرفت میرے حق میں قہر اور بلائے جان ہو گئی۔ اور عقل اس انتہا کو پہنچ گئی کہ میں اُسے برداشت نہ کر سکا اور مجھ پر دیوانگی طاری ہو گئی"۔ مگر اس خیال کے لئے پیرایۂ اظہار بھی تو اسی کے مناسب ہونا چاہیئے تھا۔

پانے ہیں مدعا کو عجم مدعا سے ہم — سرشار ہیں تمنئ بے التجا سے ہم (صفحہ ۵۲)

مفہوم کس قدر گنجلک ہے۔ پھر خیال میں ایسی کونسی ندرت تھی جس کے لئے "تمنا" کو "تمنی" سے بدلنا ناگزیر سمجھا گیا!

انھیں پاتا ہوں جب خالی تقاضائے محبت سے — تو بھر لیتا ہوں جام عاشقی اپنی حقیقت سے
مری خود ناشناسی سے ضرورت خلق ہوتی ہے — جہاں آباد ہے میری ہی نامعلوم حاجت سے (صفحہ ۵۴)

اس قسم کے اشعار تو کسی ناپختہ کار شاعر کو بھی زیب نہیں دیتے۔

تمہیں آمد کی حفاظتیں ہمیں بے سبب کی شکایتیں — نہ تمہارے دل کو سکون ہے نہ ہمارے دل کو قرار ہے (صفحہ ۵۸)

اول تو حفاظت کی جگہ "حفاظتیں" ہی وجدان کو کھٹکتا ہے۔ پھر شعر یوں بھی سپاٹ ہے۔

سونپ دی کس نے مجھے دیوانگی ہائے طلب — ڈھونڈتا ہوں غم تمہاری بزم فرحت خیز میں (صفحہ ۶۲)

"دیوانگی ہائے طلب کا سونپنا" ہی کم عجوبہ نہ تھا کہ مصرعہ ثانی نے شعر کو اچھا خاصہ مضحکہ بنا دیا۔

قتل کر کے بھی گماں کرتا ہے تو بسمل مجھے — اپنی صورت سے ملا کر دیکھ اب قاتل مجھے (صفحہ ۶۷)

"گمان کرتا ہے تو بسمل مجھے" یہ آخر کس خطہ کی زبان ہے؟ مصرعہ ثانی ایک بے لطف پہیلی کے سوا اور کیا ہے؟

رازِ الوہیت کو ہم جانتے ہیں لیکن — کچھ رفعتیں ہیں پنہاں آداب بندگی میں (صفحہ ۷۹)

شعر میں اہمال ہی اہمال ہے۔ کاش! اس کے ساتھ لفظوں کے دروبست ہی کا لطف ہوتا۔

بیخودیٔ شوق تو ہے اور شے مگر — رہتے ہیں ہم بھی آپ کو اکثر لئے ہوئے (صفحہ ۸۵)

"ہم بھی آپ کو اکثر لئے ہوئے رہتے ہیں"۔ یہ آخر کیا اسلوب بیان ہے؟

شادی بے معنی، بے علت نہیں — مرتا ہوں پھر کسی گلفام پر (صفحہ ۹۲)

"شادی" بھی بامعنی اور بے معنی ہوتی ہے۔ خوب! "بے علت" یہ غزل کی زبان نہیں ہے۔ شعر کا مفہوم انتہائی گنجلک ہے۔

یہ کیوں کہوں کہ نہیں آشنا زمانے میں — وہی ہے کیف ہے جس کو مرے ستانے میں (صفحہ ۹۳)

پورا شعر ہی تو منشقوں کا ساہی؛ ایسے گھٹیا شعروں پر وجدان کو جو اذیت ہوتی ہے اُس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔

عنصر یہ ہیں ہماری دیوانی زندگی کے — تخئیل فلسفے کی جذبات عاشقی کے (صفحہ ۹۶)

مصرعہ ثانی کے لطف کو مصرعہ اولیٰ نے غارت کر دیا۔

بسملوں کا دل مگر دیکھا نہیں — تیغ کو کہتے ہو خوں آشام ہے (صفحہ ۱۰۶)

فکر و بیان کے اس اُلجھاؤ سے خدا کی پناہ!

آتے ہیں مضطرب مرا نامہ لئے ہوئے — ہے ہر نظر جواب تمنا لئے ہوئے (صفحہ ۱۱۵)

شاعر آخر کہنا کیا چاہتا ہے؟ اس کا خط (نامہ) کون ہے جو یہ اندازِ اضطراب لئے ہوئے چلا آ رہا ہے۔ اور پھر کس کی نظر ہر تمنا کا جواب ہے۔ مبتدا اور خبر میں آخر ربط کیا ہے؟

آپ کا عشق وجہِ ہستی ہے — میری فطرت میں بت پرستی ہے (صفحہ ۱۱۸)

یہ شعر بھی "گورکھ دھندے" سے کم نہیں!

تیور چڑھے ہوئے ہیں نظریں جھکی ہوئی ہیں — زلفیں کھلی ہوئی ہیں آنچل ڈھلا ہوا ہے (صفحہ ۱۲۰)

"آنچل ڈھلکا ہوا" کہنا چاہیئے تھا۔

اس غزل میں "تقابلِ ردیفین" کا عیب کئی شعروں میں پایا جاتا ہے۔ جو ایک مشاق شاعر کو زیبا نہیں!

حسرتیں ہونٹوں پہ آمادۂ گستاخی ہیں — کہیئے ہم آپ کو ہشیار کریں یا نہ کریں (صفحہ ۱۲۴)

اس ژولیدگیٔ فکر کی میکش صاحب سے توقع نہ تھی۔

وہ دزدیدہ نظر اور مہرِ مخفی — ستم ہے یادِ عشقِ ناگہاں کی (صفحہ ۱۲۷)

"مہرِ مخفی" غزل کی نزاکت پر کس قدر بار ہے۔

خود بینیاں صحیح تکبر بجا درست — اچھے ہیں آپ، دل بھی ہمارا بُرا نہ تھا (صفحہ ۱۲۹)

"صحیح" کے تلفظ پر وجدان تلملا اٹھا۔

اچھا کیا تصورِ دندانِ یار نے — اُن کو ہنسایا۔ مجھ کو رُلایا تمام رات (صفحہ ۱۲۹)

خود اپنے دانتوں کے تصور میں محبوب رات بھر آخر کیوں ہنستا رہا؟ یہ عجیب معاملہ اور واردات ہے۔ "اُن" سے شاید اغیار مراد ہوں تو اس سے بھی شعر کی چول ٹھیک کہاں بیٹھی!

ہوا ہوں پیدا ہزاروں امیدیں لے کر میں — بچیں جو سینے سے ہاتھوں میں ہوں چھپائے ہوئے (صفحہ ۱۳۱)

شاعر غالباً یہ کہنا چاہتا ہے کہ جو امیدیں میرے سینے میں نہ سما سکیں انھیں میں اپنے ہاتھوں میں چھپائے ہوئے ہوں — مگر "امیدوں کا ہاتھوں میں چھپانا" ایک مہمل سی بات ہے —!
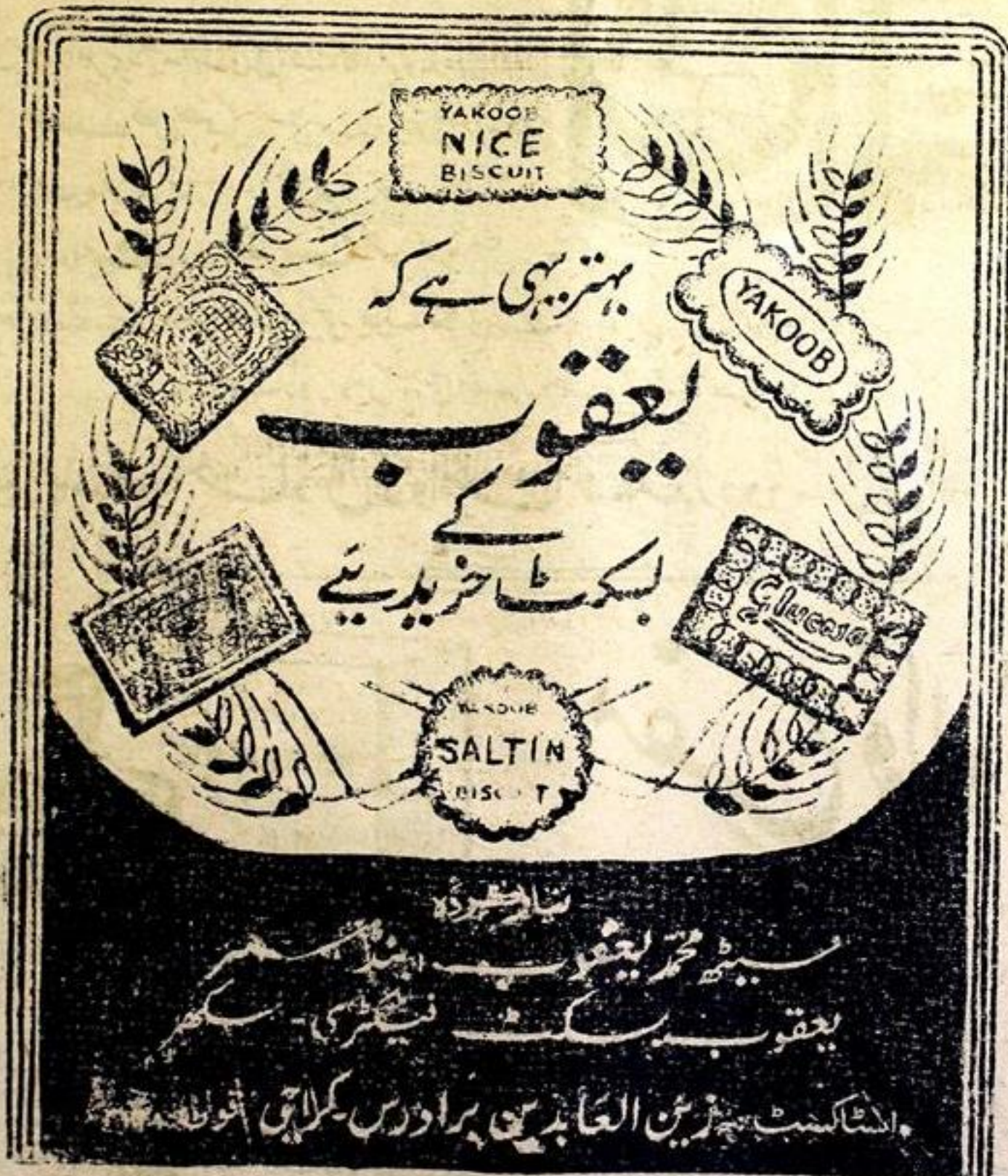
مثالِ عشق ہے وادی کا عزم و استقلال — بسانِ حسن ہے ماضی گھٹا کا استقبال (صفحہ ۱۹۷)

تشبیہ و استعارہ کی یہ "طلسم ہوش رُبا" نہیں تو اور کیا ہے۔ مصرعۂ ثانی میں "بسان" کتنا ناگوار لگتا ہے "بہ رنگ" کا محل تھا۔

"صبح" جس نظم کا عنوان ہے اُس میں یہ شعر کتنا جاندار ہے:۔

کشتیٔ گل پہ لئے کٹورا گلاب کا — شبنم چلی دُھلانے کو مُنہ آفتاب کا

مگر اس کے بعد دوسرے بند میں یہ آخری بیت:۔

ہر ذرّے کو سبق دیا اللہ نور کا — دے دے کے حس بنایا مکلف ظہور کا (صفحہ ۲۰۱)

کس قدر غیر شاعرانہ ہے۔ توبہ!

مجھے آتا نہیں ہے حال بے معنی سلاموں پر — مکیف میں نہیں محفل میں انگلی کے اشاروں پر (صفحہ ۲۰۶)

یعنی "بامعنی سلاموں" پر شاعر کو حال آیا کرتا ہے! خوب! اور "مکیف" کا بھی کوئی جواب نہیں ہے ؟؟؟

کاش احباب میکش [illegible]

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

ستمبر ۱۹۵۵ — -/۸/-

جلد ۷ — نمبر ۹

فاران

دسمبر ۱۹۵۵ء

ایڈیٹر

ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

کسی شئے کا آپ نام دُہراتے رہیں اور اُس کے محض وجود کا اقرار کرتے رہیں۔ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُس
شئے پر آپ پوری طرح ایمان بھی لے آئے ہیں۔ کسی شئے کے وجود کا اقرار و اعتراف اور اُس پر ایمان لے آنا اُسی وقت
کامل سمجھا جاتا ہے جب آپ اُس شئے کو اُسی طرح مان رہے ہوں جس طرح وہ شے واقع ہوئی ہے! اگر کوئی شخص ایک جل
ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ کہے کہ یہ چراغ اُجالا نہیں اندھیرا پھیلا رہا ہے۔ تو اُس شخص نے اگرچہ چراغ کے وجود کا اقر
کرلیا مگر اس طرح کیا کہ اُس نے چراغ کی ماہیت و غایت ہی کی سرے سے نفی کردی اور اس طرح یہ اقرار انکار سے
قریب پہنچ گیا!

اس مثال کو اچھی طرح ذہن میں رکھ کر ایمان و اقرار کی اُس فضا میں آئیے جہاں دُنیا کے تمام مذاہب اللہ تعالیٰ کے
وجود کا اقرار کرتے ہیں اور ان مذہبوں کے ماننے والوں کا نہ صرف یہ دعویٰ ہے بلکہ وہ اس پر فخر بھی کرتے ہیں کہ ہم اللہ تعا
پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے کو اس کا بندہ اور مخلوق سمجھتے ہیں۔ مگر اس ایمان و اقرار کی حقیقت یہ ہے کہ:-

ایک بہت بڑے گروہ نے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں بیٹے (عیسیٰ) اور روح القدس کو بھی شریک کرلیا ہے اور ا
کا تصورِ الٰہ "اقانیم ثلاثہ" کے سہارے قائم ہے۔ اس گروہ کے عقلاء اور مفکرین صدیوں سے اسی کوشش میں لگے ہو
ہیں کہ کسی طرح تین "کو" ایک "ثابت" کرکے اپنے عقیدۂ تثلیث (Trinity) کی چول سیدھی بٹھادیں ــــ ہندو م
میں بھی "پرمیشور" کا تصور موجود ہے۔ مگر اس طرح کہ اُن کا خدا انسانی جسموں میں حلول کرسکتا ہے۔ کچھ دھرماتما لوگ اُس
"اوتار" (مظہر) ہیں اور بہت سے دیوتا اور دیویاں ہیں جو خدائی کاروبار میں شریک ہیں۔ شرک و بدعت اور حلول و اتحا
کا یہ تصور ہندو دھرم کے ماننے والوں کو اس سطح تک لے آیا ہے کہ وہ دریاؤں، درختوں، سانپوں، بندروں اور روپے

کے ڈھیروں تک کی پوجا کرتے ہیں۔

زرتشتی دو خداؤں کو مانتے ہیں۔ ایک خدائے خیر (یزدان) کو اور دوسرے خدائے شر (اہرمن) کو۔ بودھ مت میں اوّل تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور حاکمیت کا واضح تصوّر ہی نہیں ملتا اور جو ملتا بھی ہے تو "روح" کی ازلیت و ابدیت کے ساتھ مِلا جُلا! ایک گروہ نے آفتاب کی روشنی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ اُسی کے نور سے ساری کائنات جگمگا رہی ہے۔ تو اُس نے سورج کی پوجا شروع کر دی۔ کچھ لوگ اس کے قائل ہیں کہ انسانوں کی تقدیر کے بنانے اور بگاڑنے میں "ستاروں" کو بہت کچھ دخل ہے۔ تو یہ گروہ کواکب پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ عرب کے بُت پرستوں نے اپنے ملک اور قبیلوں کے نامور بزرگوں کے نام پر کچھ بُت تراش لئے اور اُن کی پرستش کرنے لگے۔ اُن کو اس حماقت پر ٹوکا گیا تو اُن مشرکوں نے بیباکی کے ساتھ جواب دیا کہ ہم ان بتوں کو معبود نہیں سمجھتے۔ ہم تو ان کے ذریعہ اللہ کا تقرّب چاہتے ہیں!

روم و یونان کے فلسفی خدا کو مانتے تھے اور اُن میں سے بعض تو نیکی اور سچائی کے بہت بڑے مبلغ گزرے ہیں مگر اُن میں سے بہت سے تو "عقولِ عشرہ" کے چکّر میں پھنس گئے کہ عقلِ اوّل نے عقلِ ثانی کو اور عقلِ ثانی نے عقلِ ثالث کو پیدا کیا ——— وھلم جرا ——— اس طرح اُن ضرورت سے زیادہ عقلمندوں نے اللہ تعالیٰ کی صفتِ خالقیت کو مجروح کر دیا۔ اور ان میں سے بعض یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ کائنات کا خالق تو بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے مگر اس نے کائنات کا ایک طبعی نظام مقرر کر دیا ہے۔ یہ کارخانہ اُسی طبعی نظام کے تحت چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور قدرت کو اس میں اب کوئی دخل نہیں ہے!

شرک و بدعت اور کفر و نفاق کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اللہ تعالیٰ نے "سراجِ منیر" اور رحمۃ للعٰلمین کو مبعوث فرمایا۔ کوئی شک نہیں تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اللہ تعالیٰ کی توحیدِ خالص کا پیغام دیا اور ہر قسم کے مشرکانہ عقائد کی کھُل کر تردید فرمائی۔ مگر اُن کے نافرمان اُمتیوں نے توحیدِ خالص کے اس چشمے کو گدلا کر دیا۔ اور توحید کی خالص اور بے میل تعلیم پر اپنی طرف سے طرح طرح کے حاشیئے چڑھا کر توحید کے اصل عقیدے کا حلیہ ہی بگاڑ دیا!

ضرورت تھی کہ توحید کے روشن چہرے سے گرد و غُبار کو دُور کیا جائے اور جس چشمہ کو لوگوں نے گدلا کر دیا ہے۔ اُس کی ایک ایک بوند کو نتھار کر صاف اور مُطَہّر بنا دیا جائے۔ اس اہم فریضہ کو اُس ذاتِ گرامی نے انجام دیا۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر کے دین کا اتمام فرما دیا!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی ہے اُس (قرآن کریم) نے کسی استعارے اور ابہام کے بغیر دو ٹوک انداز میں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دُوسرا پرستش کا مستحق نہیں ہے، ہدایت و ضلالت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی عالم الغیب والشہادہ ہے اور دِلوں میں چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا ہے۔ وہی رازق اور مشکل کشا ہے۔ وہی ہر کسی کی پکار سُنتا ہے۔ اُس کے سامنے ہمہ شما کا کیا ذکر ہے نبی اور پیغمبر تک بے اختیار ہیں۔ مالک و مختار بس اُسی کی ذات ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اُس کے سوا ہر جان کے لئے فنا مقدّر کر دی گئی ہے۔ دُہائی اُسی کے نام کی دینی چاہیئے۔ "علیٰ کلّ شیئ قدیر" اُس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اولیاء، انبیاء، اور پیر، پیغمبر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کا بھروسہ رکھتے ہیں۔ اور اُس کی دستگیری کے محتاج ہیں۔ اُس کی ذات اور صفات میں کوئی ساجھی اور شریک نہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں اور خرقِ عادت کے واقعات کو دیکھ کر اور سُن کر اُن کی اُمّت نے انھیں

"ابن اللہ" بنا ڈالا۔ اسی طرح دوسرے لوگوں نے اپنے روحانی پیشواؤں اور دینی بزرگوں کو تصرف وقدرت کے عرش پر بٹھادیا۔ عیسائیوں کی طرح یہودیوں کے بھی ایک گمراہ فرقہ نے حضرت عزیرؑ کو "ابن اللہ" کہا۔ اور ہندوؤں نے تو ایک پرماتما کے ہزاروں پرماتما بنا ڈالے۔ گنیش جی سے لے کر رام اور کرشن تک کون ایسا ہے جسے ہندوؤں کے نزدیک خدائی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ تصرف فی الکائنات، حلول اور تجسم ان میں سے کونسا ایسا مشرکانہ عقیدہ ہے۔ جو ہندوؤں کے یہاں نہیں ملتا۔ جو قوم گنگا اور جمنا کی جے پکارتی ہو اور گائے اور بندر کو مقدس مانتی ہو۔ وہ جو بھی کر گزرے تھوڑا ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اللہ تعالیٰ نے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی طرح معجزے عطا فرمائے تھے۔ حضور نے اشارہ فرمایا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ طشت میں انگلیاں ڈال دیں تو پانی کا فوارہ سا ابلنے لگا۔ ایک پیالہ دودھ حضورؐ کے معجزۂ "خیر کثیر" کی برکت سے دسیوں بھوکے آدمیوں کی شکم سیری کے لئے کافی ہو گیا۔ غزوۂ خیبر میں حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ کی آنکھوں میں لعاب دہن لگا یا تو اس کے اثر سے فاتح خیبر کی دکھتی آنکھیں اچھی ہو گئیں۔ حضورؐ کی مٹھی میں کنکریاں کلمہ شہادت پڑھنے لگیں۔ استن حنانہ سرکارؐ کے فراق میں گریہ و بکا کرنے لگا۔ کافروں کے خفیہ مشوروں کی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ حضورؐ کو خبر فرما دی ۔۔ اس قسم کے خرق عادت کیسے واقعات سے اس کا امکان تھا کہ بعض وہ لوگ جنہوں نے یہودیت اور عیسائیت کی "پیر و پیغمبر پرست" فضاء میں پرورش پائی تھی۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کو دیکھ کر حضورؐ کی ذات میں الوہیت اور ربوبیت کی جھلکیاں تلاش کرنے لگتے!

بھارت میں زمینداروں کے کیرے، جاگیرداروں کے سپاہی پیادے اور راجاؤں کے درباری لوگ اپنے آقاؤں کو "ان داتا" کہتے ہی تھے۔ مگر قرآن پاک نے اعلان کیا:۔

اَمَّنْ ھٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُکُمْ اِنْ اَمْسَکَ رِزْقَہٗ!

بھلا وہ کون ہے جو تم کو روزی دے سکے اگر وہ اپنے رزق کو روک لے!

تقدس کے جن تصورات اور بزرگی کے جن معتقدات نے حضرت عیسیٰؑ کو "ابن اللہ" بنا دیا تھا۔ اور لوگوں نے خدا کے علاوہ اپنے پیروں اور بزرگوں کو بھی حاجت روا سمجھ رکھا تھا۔ ذاتِ رسالت مآبؐ سے ان معتقدات کا پیوند جوڑا جا سکتا تھا۔ مگر قرآن پاک نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان سے کہلوایا:۔

قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ۔

تو کہہ میں مالک نہیں اپنے واسطے برے کا نہ بھلے کا مگر جو اللہ چاہے!

اور یہ بھی کہا گیا:۔

قُلْ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ ؕ

تو کہہ میں کچھ نیا رسول نہیں ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور تمہارے ساتھ (بھی کیا ہونے والا ہے)

اور اللہ تعالیٰ نے یہ کہلوا کر:۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ۔

تو کہہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس خزانے اللہ کے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں !

"ذاتی" اور "عطائی" کی جاہلانہ اور گمراہ کن تفریق کے بُت کو بھی پاش پاش کر دیا۔ جب نبی کے پاس بھی اللہ کے دیئے ہوئے خزانے نہیں ہیں تو پھر اور کس کے پاس ہو سکتے ہیں !

پُورا قرآن شریف اسی تاکید سے معمور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی رازق ہے نہ حاجت روا ہے۔ وہی بیماروں کو شفا بخشتا ہے۔ وہی مارتا اور جلاتا ہے۔ وہی اولاد دیتا ہے۔ سب کچھ اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر ایک ذرّہ بھی جُنبش نہیں کر سکتا۔ قرآن پاک میں انبیاء کرامؑ کی زبان سے نکلی ہوئی جو دعائیں بیان کی گئی ہیں۔ اُن میں سے کسی ایک دعا میں بھی "بجاہ فلاں" یا "بحرمت فلاں" تک کا اضافہ نہیں ہے۔ یہ کہیں نہیں ملتا کہ بعد میں آنے والوں نے اپنے سے پہلے کے بزرگوں کے نام کی دہائی دی ہو۔ اور اُن سے مدد چاہی ہو۔ قرآن پاک کی دعاؤں پر ہی اگر کوئی خدا کا بندہ غور و تدبّر کرلے تو ان مسائل میں اُس کا ذہن بالکل صاف ہو جائے گا اور وہ ان مشرکانہ تصورات کی پرچھائیں سے بھی دُور رہے گا !

خود حضورؐ کے زمانے میں صحابہ کرامؓ سفر میں جاتے تھے۔ کافروں سے جنگیں بھی کرتے تھے۔ اُن کو طرح طرح کی پریشانیاں بھی لاحق ہوتی تھیں۔ کیا کوئی ضعیف سے ضعیف بلکہ میں کہوں گا شاید موضوع حدیث بھی ایسی نہیں مل سکتی۔ جس سے یہ ثابت ہو کہ سرایا میں، سفر میں، بیماری میں اور حضورؐ کی غیبت میں کسی صحابی نے حضورؐ کے نام کی دہائی دی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنی مدد کے لئے پُکارا ہو۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے جو دُعائیں منقول ہیں اُن میں بھی اللہ تعالیٰ سے براہ راست عرض و معروض ہے اور گزارش والتجا ہے۔ ان دعاؤں میں کس قدر عجز و نیاز اور انکسارِ عبدیت پایا جاتا ہے۔ کیا الحاح و تضرّع اور خشیت و ابتہال کی کیفیت ہے! حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی استمداد و استعانت اور استغاثہ و دعا میں جو سنّت اور روش رہی ہے۔ وہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے۔ ان مقدّس نفوس کے جزئی حالات تک تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جو اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ صحابہ کرام مصیبت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو مدد کے لئے نہیں پکارتے تھے۔ اور نہ اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ کسی ملک یا شہر کا انتظام کسی صاحبِ قبر کے سپرد ہے۔ اور فلاں وفات پائے ہوئے بزرگ کی توجہ و تصرّف کی بدولت کسی ملک یا آبادی کا نظام چل رہا ہے !

اس قسم کے جاہلانہ تصورات اور مشرکانہ معتقدات سے اللہ کی کتاب، احادیث کے مجموعے اور آثارِ صحابہ بلکہ تابعین کرام تک کے سوانح و حالات یکسر خالی ہیں۔ اگر کہیں اس قسم کے تصورات کی جھلک ملتی ہے تو اُس کی کتاب وسنّت کے مطابق تاویل کی جائے گی اور اس میں تاویل کی بھی گنجائش نہ نکل سکی تو اُسے کسی تامل اور معذرت کے بغیر رد کر دیا جائے گا !

اس ستم ظریفی کی بھی کوئی حد و انتہا ہے کہ جو لوگ ان معاملات میں کتاب وسنّت اور صحابہ کرام اور تابعین عظام کی روش کو نظر انداز کر کے بعد کے آنے والوں کے طریقے کی پیروی کرتے ہوں وہ تو "اہلِ سنّت" ہونے کا دعویٰ کریں۔ اور جو خدا کے بندے ہر معاملے میں کتاب وسنّت کو دلیل و حجّت مانتے ہوں اُن پر "وہابی" کی پھبتی چُست کی جائے۔ دنیا میں حقائق کو اس طرح بہت ہی کم اُلٹا گیا ہوگا !

یہ خرافات؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی قبر کے بارے میں فرمایا کہ "اسے سجدہ گاہ نہ بنا لینا"۔ حضورؐ نے قبروں پر میلے لگانے اور چراغ جلانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ مگر بعد میں جا کر خود مسلمانوں کے ایک گروہ نے وہ سب کچھ کر ڈالا جس کے کرنے سے حضورؐ نے روکا تھا۔ آج مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد کا پیروں اور بزرگوں کی قبروں کے ساتھ کیا سلوک ہے؟ قبروں پر میلے لگتے ہیں۔ چراغاں ہوتا ہے۔ گنبدوں کا طواف کیا جاتا ہے۔ آستانوں کی دہلیزوں کو چوما جاتا ہے۔ اور بعض بعض بدبخت تو قبروں کو سجدہ کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ مزاروں کی جالیوں اور ستونوں سے لپٹے ہوئے کھڑے ہیں۔ اور مرادیں مانگ رہے ہیں۔ قبروں کی چوکھٹوں پر عرضیاں لکھ لکھ کر لٹکائی جاتی ہیں۔ گاگریں اٹھتی ہیں اور بڑی دھوم دھام کے ساتھ چادروں کا جلوس نکلتا ہے۔ کسی جگہ "پنکھے" کی رسم ہے اور کہیں "صندل مبارک" کی بدعت کا رواج ہے۔ مجاور زائرین کی گردنوں میں کلاوے باندھ کر، مزار مبارک کی جلی ہوئی بتیوں کی راکھ چٹا کر اور سروں پر مور کے پروں کو گھما کر نذرانے وصول کرتے ہیں مزار کے باہر کوئی دھمال صاحب رقص فرما رہے ہیں۔ اور گنبد کی بارہ دری میں کوئی سدا سہاگن بزرگ (؟) زنانہ کپڑے اور زیور پہنے ہوئے قوالوں کی تالیوں کی آواز پر ناچ رہے ہیں۔ ؎

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

قبروں پر وہ سب کچھ ہوتا ہے جو مندروں، صومعوں اور کلیساؤں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ مسلمانوں کی ذہانت نے ایسی ایسی بدعتیں ایجاد کی ہیں کہ یہودیوں، عیسائیوں اور بت پرستوں کو شاید ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اور یہ سب خرافات دین کی عظمت اور بزرگوں کے احترام وعقیدت کے نام پر ہوتی ہے۔ اور پھر سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ توحید وسنت کیساتھ اس قدر دردناک مذاق کرنے کے بعد بھی یہ حضرات "اہل سنت" ہی ہیں اور "حامیان دین" بھی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ ہم سے بڑھ کر کوئی عاشق رسولؐ اور سنت کا متبع نہیں۔ ہم بانیان بدعت کی بدولت آج دین زندہ ہے اور حضورؐ کی سنت قائم ہے بزرگان دین اور اسلاف کی عظمتوں کا یہ محافظ گروہ نہ ہوتا تو ان "وہابیوں" نے دین کی جڑ ہی کاٹ دی ہوتی اور بزرگوں کا کوئی نام لیوا اور پانی دیوانہ رہتا!

قبروں پر جو خرافات اور بدعتیں ہوتی ہیں۔ ان میں کسی ایک بات کے لئے بھی کتاب وسنت تو کیا آثار صحابہ اور باقیات تابعین سے بھی کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک سے بڑھ کر اور کس کی قبر مقدس ہو سکتی ہے۔ اس کا کہیں ثبوت نہیں ملتا کہ کسی صحابیؓ نے حضورؐ کی قبر مبارک پر ایک پھول بھی چڑھایا ہو۔ عرس و فاتحہ اور بزرگوں کی نذر و نیاز کے نام سے آج کل جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ سب بعد والوں کی ایجاد ہے۔ شریعت میں اس کے لئے کوئی سند جواز اور دلیل اباحت موجود نہیں ہے!

یہ بدعات!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "بدعت" کو "ضلالت" کے نام سے تعبیر فرمایا ہے اور ہر ضلالت آدمی کو دوزخ کی طرف لے جانے والی ہے۔ بعض لوگوں کے ضمیر کی قساوت اور فکر و نظر کی کجی کا یہ عالم ہو گیا ہے کہ وہ اپنے کو "بدعتی" اور "قبر پرست" کہتے ہوئے کسی قسم کی شرم و ندامت محسوس نہیں کرتے "بدعت" حقیقت میں فسق سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ فاسق کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے کہ وہ فسق کو اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر بدعتی تو بدعت کا ارتکاب دین، شریعت اور احترام وعقیدت کے نام پر کرتا ہے۔ اس لئے اسے

مرتے دم تک توبہ کی توفیق میسّر نہیں آتی۔

بدعت کا یہ خاصہ ہے کہ وہ ایک حالت پر نہیں ٹھہرتی۔ اُس میں اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ گمراہی شاخ در شاخ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بدعت دلوں میں رَچ جاتی ہے۔ جس دل کو بدعت سے لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ غیر محسوس طور پر مشرکانہ تصورات سے قریب تر ہوتا جاتا ہے، اُس کے سوچنے کا انداز ہی اُن لوگوں سے مختلف ہوتا ہے جو توحیدِ خالص کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں!

مشرکینِ مکّہ کو کسی طرح یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ انسان جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ نبوّت و رسالت کے منصب سے سرفراز بھی ہو سکتا ہے۔ وہ نبی اور رسول کو انسان سے مافوق اور کم سے کم فرشتہ کے انداز کی ایک شخصیت سمجھتے تھے۔ جس میں بشریت کی ذرا سی بھی خو بُو نہ پائی جاتی ہو۔ اہلِ بدعت میں آج بھی اس ذہنیت کی جھلک ملتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو "بندہ" کہتے ہوئے اُن کا دل بھچاوٹ محسوس کرتا ہے وہ "احد" اور "احمد" کے درمیان بس ایک "میم" کے پردے کا فرق سمجھتے ہیں۔ وہ اس قسم کے شعروں کو بالطبع پسند کرتے ہیں ؎

اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے (معاذ اللہ)

اور ان شعروں پر جھومتے ہیں۔ ؎

محمدؐ سرِّ قدرت ہے کوئی رمز اسکی کیا جانے
شریعت میں تو بندہ ہے حقیقت میں خدا جانے

حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم شریعت میں بھی بندے تھے اور حقیقت میں بھی "عبد" تھے۔ حضورؐ کی عبدیت اور بشریت میں کوئی "رمز" پنہاں نہیں ہے ــــ جس طرح دُنیا کے معاملات میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ محبوب و محب میں اپنا پرایا اور دوستوں کے مال میں میرا تیرا نہیں ہوتا۔ اس مثال کو اہلِ بدعت خدا اور رسولؐ پر منطبق کرتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھی "مالک" کہتے ہیں!

حضورؐ کی معراج شریف کا اہلِ بدعت ذکر کریں گے تو اُس میں بھی عجمی تصوّف کا رنگ پیدا کر دیں گے۔ یعنی یہ کہ موج دریا سے جا ملی۔ اُس رات "میم" کا پردہ بھی اُٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ سے بھی بارِ فراق نہ اُٹھ سکا۔ اس لئے اپنے محبوب کو عرش پر بلا کر دیدار کر لیا۔ یہ نکتے میلاد شریف کی محفلوں میں، بیان کئے جاتے ہیں اور سُننے والے جھومتے رہتے ہیں کہ معراج کے کیا حقائق اور حکمتیں بیان فرمائی جا رہی ہیں۔ اور کن نزاکتوں اور اسرار و رموز کی نقاب کشائی ہو رہی ہے!

کہیں امام جعفر صادقؓ کے کونڈے ہیں، کہیں بی بی کی صحنک ہے۔ کہیں بڑے پیرؒ کی گیارھویں۔ سلطان جی کی سترھویں اور خواجہ اجمیریؒ کی "چھٹی شریف" ہے۔ ان بدعتوں کے لئے کتاب و سنّت اور آثارِ صحابہ سے کوئی سند نہیں لائی جا سکتی۔ مگر یہ سب کچھ "بے سند" اور "بے دلیل و حجت" ہوتا ہے۔ ان بدعتوں پر کوئی خدا کا بندہ ٹوکتا ہے تو اُس پر "وہابی" کی طنز کی جاتی ہے کہ اس شخص کے عقائد درست نہیں ہیں اور بزرگانِ دین کی عظمت اس کے دل سے نکل گئی ہے!

بزرگانِ دین کے نام پر جانور ذبح کئے جاتے ہیں۔ اُن کی نذر و نیاز اور عرس و فاتحہ کیلئے کھیتوں کی پیداوار میں حصے مقرر ہوتے ہیں۔ اُن کے نام کے جھنڈے نصب کئے جاتے ہیں۔ اُن کو اس عقیدے کیساتھ پکارا جاتا ہے کہ یہ بزرگ مرنے کے بعد لوگوں کی پکار سُنتے ہیں۔ دُکھ درد دُور کرتے ہیں بے اولادوں کو اولاد اور بھوکوں کو رزق دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مخلوقِ خدا کی دستگیری اور مشکل کشائی کا اختیار سونپ رکھا ہے! (معاذ اللہ)

قبروں کے مجاوروں، خادموں، وکیلوں اور سجادہ نشینوں نے مسیح پروہتوں، پنڈتوں، مہنتوں اور پجاریوں کے انداز اختیار کر رکھے ہیں۔ یہ ظالم کس کس طریقے سے زائرین کے سروں کو پکڑ پکڑ کر قبروں پر جھکاتے ہیں اور انہوں نے قبروں کی کرامات اور تصرفات کے کیسے کیسے افسانے گھڑ رکھے ہیں!

اہلِ بدعت کے علم و تحقیق کا یہ عالم ہے کہ آپ اُن کے سامنے کوئی آیت یا حدیث پڑھیے۔ وہ اُس کے جواب میں جامی یا نظامی کا کوئی شعر سنا دینگے۔ آپ کہیں گے صحیح بخاری میں یہ لکھا ہے۔ وہ جواب دینگے کہ "تذکرۂ غوثیہ" میں یہ منقول ہے۔ آپ دلیل لائیں گے حضرت عمر فاروقؓ کے قول و عمل کی اور وہ فرمائیں گے کہ فلاں قلندر اور فلاں مجذوب نے یہ کہا تھا اور ایسا کیا تھا!

آپ دریافت کرینگے کہ کھانا سامنے رکھ کر اُس پر ہاتھ اُٹھا کر فاتحہ پڑھنے اور بزرگوں کی روح کو ثواب[۱] پہنچانے کی سنّت سے دلیل لاؤ۔ وہ اس کے جواب میں جھٹ سے بول پڑینگے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں موقع پر کھجور اور کھانے کو سامنے رکھ کر ہاتھ اُٹھائے تھے اور دعا کی تھی۔ حالانکہ مروجہ فاتحہ سے اس حدیث کا دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ حضورؐ نے "تکثیرِ طعام" کیلئے ہاتھ اُٹھا کر دعا کی تھی۔ کسی بزرگ کی فاتحہ کیلئے ہاتھ نہیں اُٹھائے تھے۔ آپ پوچھیں گے قبروں پر تم پھول کس حکم اور سند کی بناء پر چڑھاتے ہو۔ جواب دیا جائیگا کہ حدیث کی کتابوں میں یہ واقعہ منقول ہے کہ حضورؐ دو قبروں کے قریب سے گزرے تو وہاں ٹھہر گئے اور فرمانے لگے ان قبروں پر عذاب ہو رہا ہے، حضورؐ نے دو ہری ٹہنیاں اُن قبروں پر گاڑ دیں اور فرمایا کہ جب تک یہ شاخیں ہری رہیں گی اِن قبروں کے مُردوں کیلئے دعاء مغفرت کرتی رہیں گی۔ حدیث اپنی جگہ ثابت ہے مگر قبروں پر پھول چڑھانے سے اس حدیث کا آخر کیا ربط ہے۔ بزرگانِ دین کی قبروں پر کوئی بھی یہ سمجھ کر پھول نہیں چڑھاتا کہ معاذ اللہ ان پر عذاب ہو رہا ہے! اہلِ بدعت آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبوی کا اسی طرح جوڑ ملاتے رہتے ہیں۔ آیت اور حدیث کا بالکل دوسرا مفہوم اور منشاء ہوتا ہے مگر یہ حضرات اپنے عقائد و اعمال پر انھیں منطبق کر دیتے ہیں۔ حقیقی مفہوم کے اُلٹ دینے کا فن انھیں خوب آتا ہے۔ بس ذرا سی لفظی مشابہت مل جائے، پھر کیا ہے، اس مشابہت کی آڑ میں لطائف و نکات کے پہاڑ کھڑے کر دیں گے!

ان حضرات سے کہیے کہ غیر اللہ سے مدد مانگنا جائز نہیں۔ وہ فوراً جواب دینگے کہ کیا ہم ایک دوسرے سے مدد طلب نہیں کرتے۔ کیا یہ شرک ہے؟ یہ وہی ذہنیت اور وہی مزاج ہے جو اُس کافر بادشاہ کا تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس قول کے جواب میں کہ میرا اللہ جِلاتا اور مارتا ہے۔ یہ جواب دیا تھا کہ "انا احی و امیت" بُرائی چاہے کسی گروہ یا فرد میں کیوں نہ ہو ہر زمانہ میں اس کا مزاج ایک ہی سا رہا ہے!

ان میں سے بعض تو گمراہی کی اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر مانتے ہیں اور وفات پائے ہوئے بزرگوں کے بارے میں اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ بزرگانِ دین اپنے ایک ایک عقیدت مند پر نظر رکھتے ہیں بلکہ اُن کیساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اس قسم کے عقائد رکھنے کے بعد کیا توحید کا دعویٰ اِن لوگوں کو کسی طرح زیب دیتا ہے؟ کیا اس قسم کے عقائد و اعمال توحیدِ خالص پر حرف نہیں آتا؟ کیا عبادت و شرک سے اتنا کچھ بدل جانے کے باوجود ایمان کا باقی بچا رہنا ممکن ہے؟ ارباب بدعت اہلِ قبور سے خوف و طمع رکھتے ہیں۔ اس لئے غیر اللہ کو اپنا حاجت روا اور اُن داتا سمجھنے سمجھانے ان لوگوں کی طبیعتوں میں پستی اور انفعالیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔ جس کے ہاتھ میں اقتدار دیکھا اُسی کے گُن گائینگے۔

---

[۱] ایصالِ ثواب جائز ہے یہاں اُس رسم کی نفی مقصود ہے جو مسلمانوں میں رائج ہے۔

اور فاسق و فاجر حاکموں کو اُن کے ناجائز سے ناجائز اور ظالمانہ سے ظالمانہ اقدام پر مبارکباد دینگے۔ ان حضرات کے اندر مذہبی جوش تو ضرور ہوتا ہی مگر اقامتِ دین کا انقلابی ولولہ نہیں ہوتا۔ اُن کے نزدیک میلاد شریف میں قیام کر لینا، حضورؐ کا نام سُن کر انگوٹھوں سے آنکھوں کو چومنا۔ عرس و فاتحہ ہوتے رہنا۔ بارھویں ربیع الاول کو چراغاں اور سلامی کی توپوں کا سَر ہونا۔ دین کے سب سے زیادہ ضروری تقاضے ہیں۔ یہ تقاضے پُورے ہوتے رہیں تو اُن کے نزدیک یہی "اقامتِ دین" ہی اور یہ اُن کے مسلک کی بہت بڑی فتح ہی!

اس قسم کے کھیل تماشوں، رسمی مظاہر اور بالکل فروعی باتوں میں اُلجھ کر دین کے حقیقی تقاضوں سے ایک مسلمان بے خبر رہتا ہی۔ اُس کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تڑپ باقی بھی رہتی ہی تو بجھی بجھی سی اور دبی دبی سی۔ ان بدعتوں کا ہوتے رہنا ہی اُس کے نزدیک دین کی کامیابی سمجھی جاتی ہی۔ یہ قریب قریب ایسی ہی بات ہی جس طرح بعض لوگوں نے کرکٹ میں پاکستانی ٹیم کی ہار جیت کو پاکستان کی فتح و شکست کا درجہ دے رکھا ہی۔ کشمیر میں اور پاکستان و افغانستان کی سرحدوں پر جو کچھ ہو رہا ہی اُس سے اُن کے دل کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی تکلیف انھیں پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے کسی کھلاڑی کے آؤٹ ہو جانے سے ہوتی ہی۔ اسی طرح اس ذہنیت کے لوگ بدکاری، سُود اور شراب کے کاروبار کو دیکھ کر اتنی اذیت محسوس نہیں کرتے جتنی اذیت انھیں اس بات سے ہوتی ہی کہ سیرت النبی کے فلاں جلسہ میں "قیام" نہیں ہوا اور فلاں بزرگ کا عرس نہیں منایا گیا!

اربابِ بدعت کے سامنے جب اقامتِ دین کا مسئلہ آتا ہی تو اُن کے شعور میں یہی رسمی مظاہر سب سے پہلے اُبھرتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے مقابلہ میں وہ بڑے بڑے مسائل کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس طرح مسائل کی قدر و قیمت اور اہمیت و ضرورت کی ترتیب ہی اُلٹ جاتی ہی۔

ان حضرات کے استدلال کا انداز اتنا عجیب و غریب ہی کہ اس پر یا تو قہقہہ لگائیے یا ماتم کیجئے! آپ اُن سے کہیں گے کہ فلاں رسم بدعت ہی، اُس کے جواب میں وہ فرمائیں گے کہ یہ تمہارا لباس، تمہارے مکان اور رہنے سہنے کا انداز تمام تر بدعت ہی، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی خاص لباس کے پہننے کا حکم نہیں دیا تھا، حضورؐ تہمد زیب تن فرماتے تھے اور حضورؐ کے زمانے میں بعض صحابہ پاجامہ پہنتے تھے ہاں! ستر عورت فرض ہی اور اس کے لئے کسی خاص طرز کے لباس کی شریعت میں قید نہیں ہی۔ البتہ یہ ضرور ہی کہ کفار کے تشبہ سے روکا گیا ہی اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن حجروں میں رہتے تھے، مدینہ کے تمام انصار و مہاجرین کے اُسی وضع قطع کے مکان نہ تھے۔ اور حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ تم اُسی انداز کے حجروں میں رہا کرو جس وضع قطع کے حجروں میں خود میں اور اہل بیت رہتے ہیں! "بدعت" تو وہ نئی رسم ہی جو دین میں ایجاد کی گئی ہو اور جس کیلئے کتاب و سنت میں کوئی دلیل نہ ملتی ہو، مثلاً مسلمان مسجدیں بناتے ہیں کتاب و سنت میں اسکی دلیل ملتی ہی، مسجدیں کس وضع کی بنائی جائیں اس پر شارع نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ مسجد کا قبلہ کی سمت میں ہونا البتہ ضروری ہی اور یہ بھی کہ مسجد کسی کی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ مگر کوئی شخص مسجد میں جب داخل ہو۔ اذان دینے لگے تو اس کی اس حرکت کو "بدعت" کہا جائیگا!

بدعت کے جواز میں سب سے بڑی دلیل یہ لائی جاتی ہی کہ حجاج ثقفی نے قرآنِ پاک کے لفظوں پر جو اعراب لگائے تھے کیا وہ بدعت نہ تھی؟ حالانکہ کتابت کیا ہوا قرآن پہلے سے موجود تھا۔ حجاج نے لوگوں کی سہولت کے خیال سے کہ تلاوت میں اعراب کی غلطی سے بچے رہیں قرآن کے لفظوں پر اعراب لگائے۔ اس میں بدعت کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟ قبروں پر چادر چڑھانا اور صندل دھو دھو کر لانا اور حجاج کا قرآن پر اعراب لگا دینا۔ کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی جیسی ہیں؟ کیا ان میں "سہولت" اور "بدعت" کا نمایاں فرق نہیں ملتا؟

عیسائی انجیل کی تلاوت کے وقت احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہی کی دیکھا دیکھی پاکستان میں بھی اس بدعت کا حال ہی میں آغاز ہوا ہی کہ قاری نے تلاوت شروع کی اور سننے والے کھڑے ہو گئے۔ چند دن کے بعد یہ بدعت چل پڑے گی اور لوگ اس کے ترک کرنے کو قرآن کے عدمِ احترام سے تعبیر کریں گے۔ بدعات یا تو عجمی اقوام سے خلط ملط اور اُن کی تقلید کا نتیجہ ہیں، یا پھر بعض لوگوں کے شخصی ذوق اور

کیف ووجدان کا سبب ظہور ہیں!

بدعت کوئی ہلکی یا معمولی برائی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "ضلالت" فرمایا ہے۔ اور ضلالت سے بیزاری اور دوری مردِ مومن کے ایمان ووجدان کا تقاضا ہونا چاہیئے۔ بدعت کی طرف میلان ہی ایمان کے کھوٹ کی دلیل ہے! پچھلے علماء اور صلحاء نے تو اہلِ بدعت کی صحبت اور مجالست اختیار کرنے سے بھی منع فرمایا ہے!

دعوتِ اصلاح!

شرکت وبدعت کے رسوم ومظاہر اختلافی مسائل نہیں ہیں۔ "شرک وبدعت" نہ کوئی فقہی مسلک ہے اور نہ دین کا کوئی اصول اور فرع ہے۔ کوئی شخص سر پر گھڑا رکھ کر "یا رسول اللہ" کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ناچنے لگے اور یہ بدعت چل پڑے اور ایک گروہ اس کو برکت وثواب کا سبب سمجھنے لگے تو اس خرافات پر احتساب کو "اختلافی مسئلہ" نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ کسی کی دل آزاری کے مصنوعی خوف سے ان لغویات پر نقد واحتساب اور روک ٹوک بند ہو سکتی ہے —!

"مستقل بالذات" اور "عطا" کی نکتہ آفرینی کی آڑ میں بزرگانِ دین کو خدائی اختیارات وقدرت کی مسند پر بٹھا دینا اور ان کو ان صفات کا مظہر سمجھنا جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے مخصوص ہیں — تو یہ کوئی اختلافی عقیدہ نہیں ہے۔ یہ عقیدہ کتاب وسنّت کی رُو سے بلا کسی اختلاف کے لغو اور بے بنیاد ہے۔ توحید کا کوئی مطالبہ اور پہلو بھی مابہ النزاع اور اختلافی نہیں ہے۔ صحابہ کرام کے درمیان ان بنیادی عقائد میں ذرا سا بھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ یہ تو وہ مُسلّمات اور بدیہیات ہیں جن میں گفتگو اور چون وچرا کی گنجائش ہی نہیں!

شرک وبدعت کے خلاف جدوجہد دین کا عین تقاضا ہے۔ ان خرافات سے جن کی ضرب ایمان پر آکر پڑتی ہو صرفِ نظر نہیں کی جا سکتی۔ دوسروں کی دل آزاری اور رواداری کے خیال سے ان لغویات پر روک ٹوک کرتے ہوئے لوگ جو ہچکچاتے رہے ہیں اُسی نے ان بدعات کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ رواداری اور دل آزاری کا یہ تصوّر ہی غلط ہے!

ان خرافات کو روکنے کی سب سے زیادہ کارگر اور موثر تدبیر یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اس کے بعد حضور کی سیرتِ مقدسہ اور صحابہ کرامؓ کے حالات کی اشاعت کی جائے۔ کتاب وسنّت سے واقف اور باخبر نہ ہونے کے سبب ہی تو مسلمانوں میں یہ غیر اسلامی شعائر رواج پا گئے ہیں اور ان بدعات نے دینی مسائل کا مقام حاصل کر لیا ہے!

قرآن پاک کو سمجھ کر پڑھنے سے عقائد کی خود بخود اصلاح ہو تی جاتی ہے اور پڑھنے والا توحید کے تقاضوں سے باخبر ہوتا چلا جاتا ہے، کتاب اللہ ایمان، اسلام اور دینی معتقدات کی بنیاد ہے۔ اس صحیفۂ مقدس کے سوا کوئی کتاب "لاریب فیہ" نہیں ہے۔ اس کتاب کی تلاوت سے دل میں خشیتِ الٰہی پیدا ہو تی ہے اور انبیاء کرام کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے یہ معزز ومقرب بندے اپنے معبود کے سامنے کس قدر عجز ونیاز پیش کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیّت کے آگے وہ بھی مجبور تھے اور اُن کو بھی ہر آن اللہ تعالیٰ کی مدد کی احتیاج رہتی تھی!

کتاب اللہ کے پڑھنے سے مشرکین اور موحدین کے مزاج، ذوق اور وجدان کے اختلاف کا پتہ چلتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے اپنے مشرکانہ اعمال کے جواز کیلئے کیسی کیسی تاویلیں کی ہیں اور کیا کیا نکتے تراشے ہیں۔ حضور کی مقدس سیرت اور صحابہ کرام کے پاک حالات کا مطالعہ فکر وعمل کی صحیح راہ متعین کرتا ہے، عرس وفاتحہ اور بزرگانِ دین کی نذر ونیاز کے نام سے جو کچھ آج ہو رہا ہے اسکی سیرت وآثار میں ذرا سی بھی جھلک نہ پاکر ضمیر مان لیتا ہے کہ یہ سب بعد والوں کے اضافے ہیں اور آدمی جان جاتا ہے کہ دینِ خالص کسے کہتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے دور میں جب مسلمانوں کا انتقال ہوتا تھا تو اُن کے حالات میں یہ تک نہیں ملتا کہ کسی صحابی کی وفات کے بعد مسلمانوں نے ایصالِ ثواب کیلئے دن متعین

کیا ہو اور ایک جگہ جمع ہو کر قرآن خوانی تک کی ہو۔ ان حالات کو پڑھ کر تیجے، دسویں اور چالیسویں کے بارے میں ذہن صاف ہو جائے گا۔ اور ان رسوم کی قلعی کھل جائے گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر سے بڑھ کر اور کس کی قبر محترم اور مقدس ہوسکتی ہے۔ مگر تاریخ وسیر اور اخبار و آثار میں اس کا کہیں آنا پتا تک نہیں ملتا کہ حضور کی قبر مبارک پر کوئی مجاور اور سجادہ نشین بن کر بیٹھا ہو اور اس پر لوگ چڑھاوے چڑھاتے اور پھولوں کی چادریں بچھاتے ہوں۔ صحابہ کرام کا عرس نہ پہلے ہوتا تھا اور نہ اب ہوتا ہے۔ حالانکہ عرس میں اگر کوئی دینی بھلائی ہوتی تو اس کے صحابہ کرامؓ سب سے زیادہ مستحق تھے!

صحابہ کرام کو اُن کے نام یا کُنیت سے پکارا جاتا تھا یا پھر اُن خطابات سے جو حضورؐ نے عطا فرمائے تھے۔ تابعین کرام نے انتہائی عقیدت کے باوجود صحابہ کرام کیلئے ایسے القاب، آداب اور خطابات نہیں تراشے جو صرف عجمی دماغوں کی پیداوار ہوسکتے ہیں مگر بعد میں جا کر عجمی مسلمانوں نے کسی کو "مشکل کشا" کہا۔ کسی کو غریب نواز اور بندہ نواز بنایا۔ اور کسی کے نام کے ساتھ داتا گنج بخش کی نسبت لگادی۔ عجمی تصرف اور شاعری کے ذریعہ عقائد کی جو خرابی مسلمانوں میں آئی ہے اس کی اصلاح صحابہ کرام کے حالات کے مطالعہ سے ہوسکتی ہے!

مسلمانوں میں عام طور پر ایسی کتابوں کا رواج ہے جن میں یہ ملتا ہے کہ فلاں بادشاہ نے فلاں بزرگ کے مزار کی زیارت کیلئے سینکڑوں میل کا پیدل سفر کیا اور فلاں فرمانروا نے اتنی دیگیں درگاہ مبارک پر پکوا کر نذر کیں۔ اور اتنا سونا اور چاندی گنبد مبارک کے دروازہ کیلئے پیش کیا۔ صحابہ کرام کے مبارک حالات پڑھ کر ذہن و فکر سے یہ نقوش مٹ جائیں گے اور بزرگوں کی قبروں کیساتھ مسلمان وہی سلوک کریگا جس کا ذکر احادیث اور آثار صحابہ میں ملتا ہے!

صحابہ کرام کے حالات کے مطالعہ سے یہ حقیقت ذہن و فکر پرروشن ہوگی کہ یہ نفوسِ قدسیہ ذرا ذرا سی بات میں سنتِ رسولؐ کا کس قدر لحاظ رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول مل جانے پر اپنی رائے کو رد کر دیتے تھے۔ کتاب وسنت اور آثار صحابہ کے مطالعہ سے ذہن و فکر میں جب سلجھاؤ اور دینی شعور پیدا ہو جائیگا تو پھر کسی کے قول وعمل، مکتوبات وملفوظات اور تذکرہ وحالات کے وہی حصے قابلِ قبول ہوں گے جو کتاب سنت اور آثار سے مطابقت رکھتے ہونگے۔ جہاں تضاد اور اختلاف ہوگا۔ وہاں "فردوا الی اللہ والرسول" کے اصول سے کام لیا جائیگا۔ کتاب سنت ہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہر کسی کے قول وعمل کو پرکھا جاسکتا ہے۔ یہ معیار سامنے رہے تو پھر کوئی خطرہ نہیں!

ضعیف تو ضعیف کوئی موضوع حدیث تک ایسی نہیں ملتی جس میں حضورؐ نے یہ فرمایا ہو کہ میری وفات کے بعد تم فلاں فلاں کھانوں پر میرے نام کی فاتحہ دینا، نہ صحابہ کرام سے ایسا کوئی قول ثابت ہے نہ تابعین، محدثین اور فقہاء نے اس قسم کی کوئی وصیت کی ہے مگر کسی عالم یا پیر کے ملفوظات میں فاتحہ کے کھانوں کی فہرست ملے تو وہ شخص جو کتاب وسنت اور آثار صحابہؓ سے واقفیت رکھتا ہے ان "ملفوظات" کو پرکاہ کی برابر بھی وقعت نہ دیگا!

دین میں عقائد کی صحت بہت ضروری ہے، یہ بنیاد استوار اور محکم ہی ہونی چاہیئے۔ اگر بنیاد ہی کج ہوئی اور پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی تو اس بنیاد پر جو عمارت بنے گی وہ چاہے ثریا تک بلند کیوں نہ ہو مگر رہے گی ٹیڑھی!

مسلمانوں کی ذلت اور ابتری کا سبب اُن کی غفلت اور بداعمالیاں ہی نہیں ہیں۔ اس کا سبب مسلمانوں کے عقائد کا فساد بھی ہے۔ شرک وبدعت کی رسموں پر کیا رحمت کے پھولوں کی بارش ہوگی یا غضبِ الٰہی کے شعلے برسیں گے۔ بس قوم کے پاس کتاب وسنت کی روشنی ہو۔ اس کا راہ راست سے بھٹک جانا اللہ تعالیٰ کے غضب کیلئے سب سے بڑی وجہ تحریک ہے۔ جو لوگ نمازوں میں "ایاک نعبد وایاک نستعین" بھی پڑھتے ہوں اور غیر اللہ کے نام کی دہائی بھی دیتے ہوں اور اہلِ قبور کو مدد کیلئے پکارتے ہوں۔ اُن پر اللہ تعالیٰ کا جو غضب وقہر بھی

نازل ہو جائے تھوڑا ہے!

یہود اور نصاریٰ تو اللہ کے دربار میں یہ عذر بھی پیش کر سکتے ہیں کہ ہم سے پہلے کے لوگوں نے مقدس صحیفوں میں تحریف کر دی تھی اور دین کو شرک و بدعت کا طومار بنا دیا تھا۔ ہم کیا کریں ہمارے پاس دین جس صورت میں بھی آیا اُسے قبول کئے بغیر چارہ کار ہی کیا تھا۔ ہم دین کا حقیقی ماخذ کہاں جا کر ڈھونڈتے۔ مگر اُمتِ محمدیہ تو اس قسم کی کوئی معذرت بھی پیش نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کے پاس اللہ کی کتاب ہے جس کا ایک ایک شوشہ محفوظ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے جسے صحابہ کرام سے لے کر محدثین تک نے کمال دیانت و احتیاط کے ساتھ جمع کیا ہے۔ مزید شرح و تفصیل کیلئے صحابہ کرام کے مستند حالات موجود ہیں۔ اس پر بھی کوئی بھٹک جائے تو یہ اُس کا اپنا قصور ہے۔ اللہ کے دربار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے کہ فلاں بزرگ کے اس قول کی بناء پر ہم نے ایسا عمل کیا تھا اور اُن "حضرت" کے معمولات کی ہم نے تقلید کی تھی۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے علاوہ اور کسی دوسرے کی زندگی کو اللہ تعالیٰ نے معیارِ حق نہیں بنایا اور بے چون و چرا اطاعت جو منصوص ہے وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ حضورؐ کی سنت کی اتباع کی جائے۔ سنت کو پس پشت ڈال کر بدعتوں کو اپنا معمول بنا لینا اور اُس پر عشقِ رسولؐ کا دعویٰ کرنا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ "اہلِ سنت" بدعت کے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے۔ قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح بزرگانِ دین بھی اپنے اُن جاہل عقیدت مندوں سے بیزاری کا اظہار کریں گے جنہوں نے ان بزرگوں کو اپنا "الٰہ" بنا رکھا ہے!

آج غیر مسلموں سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی تبلیغ و نصیحت کے محتاج ہیں۔ جو لوگ اللہ کے فضل سے توحید و رسالت کے تقاضوں کو پہچانتے ہیں اور کتاب و سنت کا علم اور دین کا صحیح فہم رکھتے ہیں اُن کا فرض ہے کہ وہ ان مسلمانوں کی اصلاح کیلئے جدوجہد کریں۔ جو دانستہ یا نادانستہ مشرکانہ رسوم اور بدعتوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اس جدوجہد کا مقصد کوئی جنگ و جدال یا پیشہ ورانہ قسم کی مناظرہ بازی نہ ہونا چاہیئے۔ ان عقائد کے لوگوں کو رفق و ہمدردی کیساتھ سمجھایا جائے۔ اُن کے سامنے کتاب و سنت کی تعلیم پیش کی جائے، اُن کو شرک و بدعت کے دینی نقصانات اور آخرت کے احتساب سے ڈرایا جائے۔ راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ اس انداز پر اصلاح کی جدوجہد برگ و بار لائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دس میں آٹھ اگر اپنی سابقہ روش پر ہی جمے رہیں گے تو دو خدا کے بندے تو انشاء اللہ ضرور قبولِ حق کے لئے آمادہ ہو جائیں گے!

اپنے مسلمان بھائیوں کی خیرخواہی کا یہ تقاضا ہے کہ اُن کے گمراہ کن عقائد کی اصلاح کی جائے اور اُن کے سامنے دینِ خالص پیش کیا جائے، کوئی مانے یا نہ مانے یہ اُس کا اپنا فعل رہا۔ آپ کی تو یہ ذمہ داری ہے کہ آپ دین کی سچی تعلیم اُن کے روبرو پیش کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر دل پر ہی مُہر نہیں کر دی ہے نہ جانے کتنے قلوب ایسے ہیں جو قبولِ حق کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں مگر ان الواح پر کوئی نقش کرنے والا نہیں ملتا۔ بعض اوقات صرف ایک آیت اور ایک حدیث فکر و نظر کے زاویوں کو بدل دیتی ہے!

ہم مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ایک یہ بھی ہے کہ جسے ہم حق سمجھتے ہیں، اُسے پھیلانے کی جدوجہد نہیں کرتے۔ اور یہ بات ہم میں نفس کی آرام طلبی نے پیدا کر دی ہے۔ تبلیغ حق میں جو دردسری کرنی پڑتی ہے اُس سے ہم پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہ راحت پسندی اس پیمانِ وفا کی ضد ہے جو ہم نے اللہ اور رسولؐ سے باندھ رکھا ہے!

بہ آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند — زما پیام رسانید ہر کجا ہستند!

ماہر القادری
۲۳ نومبر ۵۵ء

افتخار احمد بلخی

تنقید و احتساب

اور اُس کے حدود۔ حکمت مصالح اور نفسیاتی تقاضے

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تخلیق انسان کی نفع رسانی کے لئے کی ہے۔ جس طرح زمین کا فرش ہمارے لئے بچھایا گیا ہے اسی طرح ہوا کا کرّہ بھی ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ جس طرح خاک کا ہر ذرّہ ہمارے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی طرح آفتاب بھی ہمارے ہی لئے اپنی نورانی شعاعیں برسا رہا ہے۔ غرض یہ زمین اور اس زمین کے سارے ذخیرے۔ یہ آسمان اور اس آسمان کی ساری زینتیں اپنے سارے فوائد و منافع ہمارے ہی لئے تقسیم کر رہی ہیں۔ انسان پر اللہ کا یہ ایک عظیم الشان احسان ہے اور اس احسان کا اللہ نے بار بار ذکر فرمایا ہے۔ تاکہ ہم عبدِ شکور بنیں نہ کہ عبدِ کفور۔ عبدِ شکور۔ یعنی شکر گزار بندے۔ شکر نام ہے اُس چیز سے صحیح مصرف لینے کا جو چیز انعام دینے والے نے دی ہے۔ پس اس کائنات کے فوائد و منافع سے بہرہ ور ہونے کا مفہوم یہ نکلا کہ انسان اس کائنات کی ہر شئے کا صحیح مصرف لے اور صحیح مصرف لینا کام ہے اُس فطرت صالحہ کا جو خود انسان کے اندر موجود ہے۔ یہ کام اُن انسانوں کا ہے جو اپنی قوتوں کا صحیح استعمال جانتے ہوں یہ کام ہے اُن نفوس کا جو راہ ہدایت پر چلتے ہیں اور ضلالت سے کنارہ کش رہنے کی سعی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ اُن کے سامنے خیر و شر کی دونوں راہیں کھلی ہوئی ہیں اور انھیں اس کا پورا اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جس راہ کو چاہیں پسند کر کے اس پر گامزن ہوں۔

> وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا۔
>
> سورج اور اُس کی نورانیت گواہ ہے اور گواہ ہے چاند جو اس کے بعد روشن ہوتا ہے اور گواہ ہے وہ روز روشن جو رات کا پردہ چاک کر دیتا ہے اور گواہ ہے رات کی ظلمت جو دن کی روشنی کو چھپا لیتی ہے اور گواہ ہے آسمان اور اس کی عجیب و غریب بناوٹ اور گواہ ہے زمین اور اُس کا حیرت انگیز پھیلاؤ اور گواہ ہے روح انسانی اور جیسا اس کو مناسب و موزوں اور مستقیم حالت پر بنایا۔ پھر اس کے خالق نے اس کو فجور و تقویٰ کی سمجھ عطا فرمائی۔ یہ چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ کامیاب شخص وہ ہے جس نے اپنی روح و فطرت کو پاک اور بے آمیزش رکھا اور نامراد انسان وہ ہے جس نے اسے آلودہ کر دیا۔

اس سورۃ میں اللہ نے کائنات کی ساری اہم چیزوں کو شہادت میں پیش کر کے بیان فرمایا کہ فلاح و خسران اور کامیابی

و ناکامی کا معیار نفس کا تزکیہ اور عدم تزکیہ ہے۔ کائنات سے شہادت اس امر کی جانب اشارہ کرنے کی خاطر ہے کہ اس کائنات سے وہ اصل نفع حاصل کرنے کی شرط تزکیۂ نفس ہے۔ جو نفع اور مصرف اس کائنات کے خالق نے اس کی تخلیق میں پنہاں رکھا ہے اور جن سعید روحوں اور پاک نفوس نے اس کا صحیح مصرف لیا وہی فلاح یافتہ رہے اور اُن کے فوز و فلاح پر خود یہ کائنات شاہد ہے۔ اور یہی کائنات اس پر بھی شاہد ہے کہ جن نفوس نے اپنی فطرت ... کو دی اور فجور کی راہ پر چل پڑے۔ وہ بالآخر ہلاکت و ناکامی سے دوچار ہوئے۔ اسی لئے ان آیات کے بعد قوم ثمود اور ان کی سرکشی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

یہ تزکیہ حاصل ہوتا ہے احتساب سے۔ اس احتساب سے جس کا حکم ہر مومن و مسلم کو اللہ کی جانب سے دیا گیا ہے۔ یہ تزکیہ حاصل ہوتا ہے تنقید سے۔ جائزہ لینے اور اعمال کی نیکی و بدی کے لحاظ سے تجزیہ کرتے رہنے سے۔

نقد۔ عیوب و محاسن کے اظہار کا نام ہے۔ پرکھنے اور کھوٹے کو کھرے سے علیحدہ کرنے کا نام تنقید ہے۔ محاسبہ حساب کی جانچ کرنے، آزمائش کرنے کو کہتے ہیں۔ احتساب علی الامر۔ منکر اور ناحق باتوں سے منع کرنے کو کہتے ہیں۔ پس تنقید و احتساب کا مفہوم یہ نکلا کہ انسان نیکی اور المعروف کا محافظ ہو۔ اور بدی اور منکر کی ہر شکل اور ہر نمود کو فنا کرنے کا اپنے اندر ایک اَن تھک جذبہ رکھے اور ناحق باتوں سے روکتا رہے۔ حق کی تلقین کرے۔ ہدایت کو پھیلائے اور ضلالت کا استیصال کرے۔

تنقید و احتساب کی اہمیت و ضرورت

اس تنقید و احتساب کی اہمیت کیا ہے؟ یہ کیوں ضروری ہے؟ بلکہ صحیح تر الفاظ میں یہ کہ دین میں اس کا مقام کیا ہے؟ اس سلسلہ میں جب آپ غور کریں گے تو پائیں گے کہ تمدّن۔ حریّتِ فکر اور شہادتِ حق میں سے ہر ایک کا تقاضا ہے۔ جس کی بناء پر تنقید و احتساب اہم ترین شئے بنتی ہے۔ جس کی بناء پر اس کا ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے اور جس کی رُو سے دین میں اس کا مقام متعین ہو جاتا ہے۔

چنانچہ تمدّن کو لیجئے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ تمدّن کی اساس تعاون اور باہمی ہمدردی پر ہے۔ یعنی ایک دوسرے کی مدد کرتے رہنا اور اسے نقصان و خرابی سے بچانا۔ تو یہ بھی سچ ہے کہ تمدّن کی حفاظت ہو نہیں سکتی۔ اور وہ قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ تنقید و احتساب مفقود ہو جائے۔ اس لئے کہ ہر چیز میں خیر و شر کی آمیزش ہے۔ لہٰذا انسان کو ہر وقت ہوشیار کرتے اور جگاتے رہنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ شہد کے بجائے زہر نہ پی لے۔ اور تعاون و تناصر جس سے تمدّن کی تشکیل ہوتی ہے۔ چونکہ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے ہر مسلم بالطبع محتسب ہوتا ہے۔ اور اس لئے ہر مومن تمدّنِ عالم کا محافظ ہے۔ آپ نے قرآن میں مطالعہ کیا ہوگا کہ جا بجا مومن کو ایک دوسرے کا ولی کہا گیا ہے۔

وَالمومنون والمؤمنات بعضھم اولیاء بعض۔

مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں۔ ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

"ولی" کے لفظ میں تعاون و تناصر کا مفہوم شامل ہے۔ کیونکہ ولی کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ جس کا ولی ہے۔ اس کو نیک راہ بتائے۔ برائی سے روکے۔ اُس کے مصالح کا لحاظ اور اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ اور ہر طرح کے نقصان و ضرر سے اس کو بچانے کا آرزومند رہے۔ لہٰذا جب تک ایک مومن کے دل میں دوسرے مومن کے لئے جذبۂ خیرخواہی و دردمندی نہیں ہوتا۔ اس وقت تک اسے ایک دوسرے کے ولی ہونے کا مصداق نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ایک مومن کا دوسرے مومن کے حق میں ولی ہونے کی ذمہ داریوں کو اس مشہور حدیث میں نہایت خوبی و بلاغت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لئے آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔

کہ جس طرح آئینہ انسان کو اپنی صورت کے سنوارنے اور چہرے کے عیب دُور کرنے میں اس طرح مدد دیتا ہے کہ وہ اس کے خد و خال کو اس کے سامنے نہایت خاموشی سے پیش کرکے اس کے حسن و قبح کو بتا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی لغزشوں اور اس کے عیوب کو تلخی و درشتی کے بغیر باحسنِ طریق اس پر واضح کرکے اس کی اصلاح کرتا رہتا ہے۔

اب حریت فکر کے زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔ تو ہم میں سے ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اخلاق کی بنیاد پر استوار ہونے والی زندگی کی جان ایک طرف تو خشیۂ الٰہی اور خداترسی ہے۔ اور دوسری طرف حریت رائے۔ استقلالِ فکر اور آزادئ قول ہو۔ اخلاقی نظام اور نظامِ عمل کے لئے اس سے زیادہ کوئی خطرناک امر نہیں کہ موت کا خوف، شدائد کا ڈر۔ عزت کا پاس۔ تعلقات کے قیود یا قوت و جبر کا جلال و تشدد افکار کو مفلوج اور آراء کو مقید کردے۔ لوگوں کا ظاہر اُن کے باطن کا پرتو نہ ہو۔ لوگوں کے اقوال اُن کے قلوب کے اعتقادات نہ ہوں۔ اُن کی زبان اُن کے دل کی سفیر نہ ہو۔ یہ وہی چیز ہے جس کو اسلام کی اصطلاح میں نفاق اور کتمانِ حق کہتے ہیں۔ اور جس سے زیادہ مکروہ اور مبغوض شئے خدا کی نظر میں کوئی نہیں۔ تو جب حریتِ فکر اور آزادئ رائے اخلاقِ ملی کے ستون ٹھہرے تو اس حریتِ فکر اور آزادئ رائے کی جلوہ سامانیوں کا نام ہی تو تنقید و احتساب ہے۔ لہٰذا یہ تنقید و احتساب ایک طرف تو ضمیر و رائے کی حریت و آزادی کے نشان و مظاہر ہیں اور دوسری طرف نظامِ اخلاق کے نگہبان۔ تنقید و احتساب سے وحشت اور اس سے فرار کی کوششیں یا ان پر پہرے بٹھانے کے باوجود حریتِ فکر اور آزادئ رائے کے حقوق کا تسلیم کرنا ایک لغو اور بے معنی چیز ہے۔ ایک مضحکہ خیز بات ہو۔ آج "اسلامی مساوات" کے الفاظ ہر زبان پر جاری ہیں۔ مگر کتنے ہیں جنہیں اس حقیقت کا علم ہو کہ اسلام کی حریت و مساوات کی تعلیم کا مدار یہی تنقید و احتساب ہو۔ احتساب کا مفہوم پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ یعنی نیکی کا محافظ ہونا۔ بدی کی ہر نمود کو روکنا۔ معروف کی توسیع و اشاعت کرنا اور منکر کے ہر ظہور کا استیصال۔ اور چونکہ ہر مسلمان طبعاً نیکی و معروف کا مبلغ اور منکرات و سئیات سے بیزاری کا اعلان کرنے والا اور بدی کو روکنے والا ہوتا ہے اس لئے مساوات اس کا مایۂ خمیر کیوں نہ ہو؟

اور اب شہادت حق کی ذمہ داریوں کے نقطۂ نظر سے دیکھئے۔ تو آپ پائیں گے کہ قرآن کی بے شمار تصریحات نے ایک مسلم کا فریضہ یہ بتایا ہے کہ وہ دُنیا میں حق کا گواہ ہے۔ حق کی شہادت کو قرآن ایک مسلم کا فرض قرار دیتا ہے۔

یا ایہا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولو علیٰ انفسکم اوالوالدین والاقربین۔ (النساء)

مومنو! انصاف کے علمبردار اور اس پر قائم رہو۔ اور خدا کے واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین یا تمہارے عزیز و اقارب پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔

وکذٰلک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شہداء علی الناس۔ (البقرہ)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک "امت وسط" بنایا۔ تاکہ تم دُنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔

وہ کہتا ہے کہ جب حق و باطل، معروف و منکر اور خیر و شر کا مقابلہ ہو تو مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ رضائے الٰہی اور نصرتِ حق اور دعوتِ خیر کے لئے لا یخافون لومۃ لائم۔ آسمان کے نیچے کسی وجود کی پروا نہیں کرتے۔ خدا کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جو انھیں مرعوب کرسکتی ہو۔ اس لئے بلاخوف و خطر وہ حق کی شہادت دیتے ہیں۔ دولت و مال کی

حرص۔ اور عزت وجاہ کی طلب یا نقصان کا خطرہ ایک مسلم کے اس فرض اور اس کی ذات کے درمیان حائل نہ ہونا چاہیئے۔ سوسائٹی کی شرم اور احباب و اقارب کی محبت اس کی زبانِ حق گو اور اس کے دستِ صداقت شعار کو مفلوج نہ کردے۔ حق کی سربلندی کی راہ میں حائل ہر سنگِ گراں کو ہٹانے کی سعی کی جائے۔ اور اس شہادتِ حق کے لئے اغراضِ ذاتی اور ہوائے نفس کے سحر سے انسان مسحور نہ ہو۔ رضائے الٰہی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا اور کچھ مطلوب نہ ہو۔ پھر قرآن اس بات کو انتہائی بدبختی قرار دیتا ہے کہ ایک مسلمان کی زبان شہادتِ حق کے وقت خاموش رہ جائے یا اس کے اخفاء کی کوشش کرے۔ اخفا کی سعی اور کتمانِ حق کو تو نہ صرف بدبختی بلکہ ظلم سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور ظلم کہتے ہیں کسی چیز کے اس کے غیر محل میں استعمال و مصرف کو۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۔ (البقرہ۔ رکوع ۱۶)

اس شخص سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جس کے ذمہ اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اس کا اخفا کرے۔

مطلب یہ ہوا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے حق کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اگر وہ اس کا اخفاء کرتا ہے تو ایسا شخص اپنے موقف اور اپنے صحیح منصب کے خلاف ایک ایسا مقام اور ایک ایسا موقف اختیار کرتا ہے۔ جس کے لئے اس شخص کو گویا بنایا ہی نہیں گیا تھا۔ لہٰذا جب مسلمان اخفائے شہادت کرتا ہے اور جسے وہ حق سمجھتا ہو اسے ظاہر نہیں کرتا تو وہ اپنی حقیقت کا لباس اتار کر دوسری حقیقت کا جامہ پہن لیتا ہے۔

پس جو شخص حق کا کتمان نہیں کرتا اور خدا کی طرف سے جو علم اس کو ملا ہو وہ علی الاعلان اور بلاخوف لومۃ لائم بیان کرتا ہے۔ ایسا شخص ہی در اصل ایمان و اسلام کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ حق پر قائم ہے۔ حق گو ہے اور جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر تنقید و احتساب کا دین میں جو مقام ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے۔ شہادتِ حق اور اظہارِ صداقت کا کوئی مصداق باقی نہ رہے گا اور راست بازی و حق گوئی کا دروازہ بند ہوجائے گا۔ اگر تنقید و احتساب باقی نہ رہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مسلمان کی ساری زندگی تنقید و احتساب اور جائزہ و تجزیہ کے دائرہ میں محیط ہے۔ چنانچہ آپ غور فرمائیں گے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ اسلامی تعلیمات و ہدایات کے سارے شعبے اور دین کا ہر گوشہ اسی احتساب کی جلوہ گاہ ہے۔ زندگی کی ساری راہیں نقد و احتساب ہی کے مختلف خطوط ہیں۔ گویا یہ تنقید و احتساب دائرے کا وہ مرکزی نقطہ ہے۔ جس سے مختلف سمتوں میں خطوط کھینچے گئے ہیں۔ ایک اجمالی اور طائرانہ نظر سے اس کی تصدیق فرمالیجئے:۔

سب سے پہلے عبادات کو لیجئے۔ نماز بجائے خود ایک محتسبِ اعظم ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔ نماز بُری باتوں، بداخلاقیوں اور منکرات سے روکتی ہے۔ روزہ۔ تقویٰ کی صفت پیدا کرنے کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔ تقویٰ۔ خدا کی ناپسندیدہ چیزوں سے اجتناب و احتراز کو کہتے ہیں۔ اور منکرات سے بچنے بچانے ہی کی خاطر تو احتساب ہے۔ اس کے علاوہ یہ روزہ صدقہ و خیرات کی راہ بھی کھولتا ہے۔ صدقہ عید الفطر یا فدیۂ معذور کا مصرف تعاون و تناصر کے مظاہر کے سوا کیا ہے؟ زکوٰۃ سے فقراء کی اعانت ہوتی ہے۔ مساکین کو مدد ملتی ہے۔ مسافروں کی زبوں حالی دُور کی جاتی ہے اور غلامی کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائی جاتی ہے۔ تعاون و تناصر (help and cooperation) کا اس سے بہتر انتظام اور کیا ہوسکتا ہے۔ حج اس تعاون و تناصر کا ایک بہترین موقع ہے۔ تبادلۂ خیالات، افہام و تفہیم کے مواقع۔ افکار و خیالات کی تبلیغ۔ اصلاحی پروگرام کی آناً فاناً وسعت و شہرت اور وسیلۂ تجارت۔ ساری باتیں حج میں جمع ہیں۔ اس کے علاوہ حج۔ نماز۔ روزہ اور صدقہ تینوں کی راہیں بھی کھولتا ہے۔ میرے خیال میں اتنا اشارہ کافی ہے۔

یہ ہیں اسلامی عبادات کے وہ محتسب جو دن میں پانچ مرتبہ آتے ہیں۔ سال میں ایک بار اور تمام عمر میں ایک مرتبہ آتے ہیں۔ تاکہ مسلمان فرضِ احتساب سے غافل نہ ہوں۔

عبادات سے آگے بڑھ کر دوسری تعلیمات پر نظر ڈالئے۔ سب اسی احتساب کی یاددہانیاں ہیں یا جذبۂ احتساب کو تربیت دیتی ہیں۔ مثلاً میرے پاس پنسل نہیں۔ میں کسی سے مانگتا ہوں۔ وہ نہیں دیتا۔ اور اس طرح تعاون کا ایک ارزاں موقع کھو رہا ہے۔ آپ کو یہ موقع حقیر معلوم ہوتا ہے۔ مگر قرآن کی دوررس نگاہ کچھ اور اشارہ کر رہی ہے:۔

الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔

جو ریاکاری کرتے ہیں اور حقیر چیزوں کے دینے میں انہیں دریغ و تامل ہے۔

"ریاکاری کرتے ہیں" کی بلاغت و معنی خیزی پر غور فرمائیے۔ یعنی یہ اپنے آپ کو مومن کہتے ہیں۔ مسلم کہتے ہیں۔ لیکن ان کا مومن و مسلم ہونا دوسرے کے لئے ولی ہونے کو لازم تھا۔ معاون و ناصر ہونے کا متقاضی تھا۔ مگر حقیر سی چیز تک کا انکار کر کے اپنے ولی ہونے کی نفی کر دی۔ پھر ادعائے ایمان و اسلام "ریاکاری" نہیں تو اور کیا رہ جاتا ہے۔

ایک شخص سودا تولتا ہے اور اپنے ہاتھ کی صفائی سے جنس میں ایک تولہ کم کر دیتا ہے۔ یہ ایک تولہ کوئی بڑی چیز نہیں۔ واقعی کمیت (quantity) بڑی نہیں مگر کیفیت (quality) بہرحال بڑی ہے۔ تعاون میں اس سے خلل آگیا۔ جذبۂ خیرخواہی مجروح ہوگیا۔ احتساب کا اصول ٹوٹ گیا۔ اس کے ٹوٹنے کے لئے ایک رتی کا معاملہ بھی ویسا ہی ہے جیسا ایک من کا۔ اس لئے لعنت اور پھٹکار کا وہ مستوجب ٹھہرا۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ۔

کم تولنے والوں کے لئے پھٹکار ہے جو لوگوں سے لیتے ہوئے تو ناپ کے پورا لیتے ہیں اور جب ناپ یا تول کر دیتے ہیں تو کم کر کے۔

راہ میں ایک تنکا پڑا ہوا تھا۔ کانٹے کا ایک حقیر سا تنکا۔ آپ اُسے اُٹھا لیتے ہیں۔ بظاہر یہ دل بہلاؤ کا ایک مشغلہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس سے کسی زخم رسیدہ پاؤں کو بچا لیا گیا۔ اور اس پر ثواب کا ملنا اسی احتساب کا صدقہ ہے۔ ایک پاؤں کو کانٹے کی ضرر رسانی سے بچا لیا گیا۔

پھر اسلام کے سیاسی نظام پر نظر دوڑائیے۔ وہ اسی احتساب کے گرد گھومتا ہے۔ دیوانی اور فوجداری کے شعبے۔ خراج و مالگزاری کے صیغے۔ جیل خانے۔ پولیس کا تقرر۔ کونسلوں کے اجلاس۔ میونسپلٹی کا قیام۔ زراعت و حفظانِ صحت کے محکمے۔ یہ ساری تقسیمیں اسی احتساب کے مختلف چہرے ہیں۔ کیونکہ کانٹے راہ میں بچھے ہوئے ہیں۔ ہر شخص کا قدرتی فرض ہے کہ چلنے والوں کو بتائے کہ قدم سنبھال کر رکھیں۔ لیکن ایک شخص ہر جگہ موجود نہیں رہ سکتا۔ اور ہر کام نہیں کر سکتا۔ اس لئے تقسیمِ عمل کی رو سے صیغے۔ فرائض اور پیشے منقسم ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ تمدن جس قدر ترقی کرتا ہے۔ اسی قدر ان تقسیمات کو بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔

غرض اسلام نے ایک طرف تو عبادات اور اخلاقی قدروں سے لے کر معیشت و معاشرت اور سیاست کے سارے مراحل اور انسان کے ہر عمل کو محکمۂ احتساب کے ماتحت کر دیا۔ اور دوسری طرف ہر مسلمان پر احتساب فرض کر کے قوتِ محتسبہ کو بالکل عام

کردیا۔ جس طرح ایک مومن نماز پڑھتا ہے۔ روزہ رکھتا ہے۔ زکوٰۃ دیتا اور حج کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام باتیں شخصاً اُس پر فرض ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اُسے ایک محتسب بھی ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مومن وہی ہے جو نیکی اور عدالت کا علمبردار ہو اور بدی اور منکرات کا قلع قمع کرے۔

قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ اس فرض احتساب کی ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں بھی ہے:-

کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

تم میں سے ہر شخص دوسرے کا نگہبان ہے۔ اور ہر شخص سے سوال کیا جائیگا
کہ اس نے اپنی حفاظت و نگرانی کی ذمہ داری کہاں تک پوری کی۔

لیکن یہ تنقید و احتساب ایک خاص ترتیب کا پابند ہے۔ اس کے چند شرائط ہیں۔ اُس کے مخصوص اسالیب وطرق ہیں اور اُن میں خلل اندازی یا اُن کی رعایت ملحوظ نہ رکھنے کے نتائج نہ صرف یہ کہ غیر مفید نکلیں گے بلکہ ضرر رساں ہوں گے۔

ترتیب احتساب

اس سلسلہ میں سب سے مقدم اپنے نفس کی اصلاح ہے۔
انّ النفس لامّارۃٌ بالسوءِ۔ نفس انسان کو بُری بات پر اُکساتا رہتا ہے۔

اس لئے ضروری ہے کہ جب کسی دوسرے کی اخلاقی صورت پر انگشت نمائی کی جا رہی ہو تو ذرا اپنے دل کے آئینے میں بھی دیکھ لینا چاہیئے۔ کہ کہیں اپنی صورت تو ویسی نظر نہیں آتی؟ جب کسی منکر کے خلاف اظہار حق کے لئے زبان دلائل کے انبار لگا رہی ہو تو جھانک کر دیکھ لینا ضروری ہے کہ کہیں خود اپنے خرمنِ دل میں تو ناکارہ جنس چھپی ہوئی نہیں؟ اور جب خود اپنے دامن میں گرد لگی ہوئی ہو تو سب سے پہلے اس کو جھاڑنا چاہیئے۔ ورنہ اس سے دوسروں کا گرد آلود چہرہ کیونکر صاف ہو سکتا ہے؟

اس موقع پر قول و عمل کی دورنگی پر زجر و توبیخ اور تنبیہ کرنے والی قرآن کی بے شمار آیات میں سے یہ دو پیش نظر رکھیں:-

کَبُرَ مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون۔

خدا کو یہ بات نہایت ناپسند ہے کہ جو تمہارا قول ہو وہ فعل نہ ہو۔

اَتامرونَ النّاس بالبرّ وتنسون انفسکم۔

تم دوسروں کو تو نیکی کی تلقین کرتے ہو لیکن خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

ان کے علاوہ قول و فعل کے درمیان تضاد پر وعید سنانے والے بے شمار ارشادات رسولؐ میں سے ایک یہ روایت ہے شب معراج سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس رات کو میرا گزر ایک ایسی جماعت پر ہوا کہ:-

تُقرَضُ شفاھھم بمقاریض من نارٍ فقلتُ من ھؤلاءِ یا جبریل؟ قال خطباء امتک الذین یقولون مالا یفعلون ویقرؤن کتاب اللہ ولا یعملون بہ۔

(الترغیب والترہیب بحوالہ بیہقی بروایت حضرت انس بن مالکؓ)

اُن کے ہونٹوں کو آگ کی قینچیوں سے تراشا جا رہا ہے۔ تو میں نے کہا کہ اے جبرئیل یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا (عالم مثال میں باعتبار اپنے جزائے اعمال کے آپ کے روبرو) یہ آپ کی اُمت کے وہ مقررین اور خطیب ہیں جو ایسی باتیں کہتے ہیں جو خود نہیں کرتے اور قرآن پڑھتے ہیں۔ مگر اُس پر عمل نہیں کرتے۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ جب تک کوئی شخص تمام خامیوں اور ہر طرح کی کوتاہیوں اور تمام لغزشوں سے پاک نہ ہو جائے۔ اُس وقت تک تنقید و احتساب کے لئے زبان نہ کھولے۔ اسلام نے احتساب ہر مسلمان پر فرض کر دیا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان فرشتہ نہیں ہو سکتا۔ نہ نبی بن سکتا ہے اور نہ ہر مسلمان صدیقؓ اور فاروقؓ ہو سکتا ہے۔ ٹھوکریں سب کو پیش آتی ہیں۔ نفس کا فریب اور شیطانی حملوں کے چور دروازے بڑے ہی پُر پیچ ہیں۔ پس اگر تنقید و احتساب کے لئے بہمہ وجوہ کامل اور بہ ہر حیثیت اصلح ہونا شرط ہو تو نہ یہ فرض عام ہو سکتا ہے اور نہ ہر مسلمان شہادت حق کا فریضہ ادا کر سکتا ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ سب سے پہلے خود عمل صالح اختیار کرنا چاہیئے۔ ہر وقت اپنے نفس کا جائزہ لیتے رہنا چاہیئے۔ اپنی کوتاہیوں اور خامیوں اور لغزشوں پر نظر رکھنی چاہیئے۔ اور انھیں عملاً دُور کرتے رہنے کی سعی سے غفلت نہ کرنی چاہیئے۔ اس طرح جب کبھی خود اپنی کسی خامی اور اپنے کسی عیب پر مطلع ہو تو بجائے اس کے کہ اپنے ضمیر و نفس کو کسی تاویل سے مطمئن کیا جائے اس پر ندامت و پشیمانی کی کیفیت طاری ہونی چاہیئے اور اُس خامی اور عیب کو دُور کرنے کی سعی کرنی چاہیئے۔ یا اپنے کسی ہمدرد و خیر خواہ کے کہنے سے اپنی کسی غلطی اور کوتاہی پر تنبیہ ہو تو اس خیر خواہ کی بات کا بُرا مان کر توجیہ پر بحث کرنے کے بجائے کھُلے دل سے، جذبۂ ممنونیت کے ساتھ اس کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ کے لئے اس سے باز رہنے کا عزم کرنا چاہیئے۔

اصلاح نفس کے بعد خانگی زندگی اور تدبیر منزل کا نمبر آتا ہے۔ آل۔ اولاد اور اعزہ و اقارب کا درجہ ہے

یا ایھا الذین آمنوا قوا انفسکم واھلیکم نارا۔

مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

وَانذِر عشیرتک الاقربین!

اپنے اقرباء اور قبیلہ کے لوگوں کو گمراہی و ضلالت کے بُرے نتائج سے ڈراؤ۔

ان کے بعد پھر دُوسروں کی باری آتی ہے۔

یہاں چند لفظوں میں یہ بات سمجھ لینے کی ہے کہ اس ترتیب کا مدعا یہ نہیں کہ جب تک انسان مرحلۂ اوّل میں ہے۔ اس وقت تک دوسرے مرحلہ میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اور جب تک دُوسرے مرحلہ میں ہے۔ اس وقت تک گھر کے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ بلکہ مطلوب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو بھول کر یا اسے مستثنیٰ کر کے اعزہ و اقارب کی اصلاح نہ کرنے لگ جائے۔ ورنہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بجائے فائدے کے اُلٹا نقصان پہنچ جائے گا۔ اولاد اور دوسرے عزیز جب یہ دیکھیں گے کہ جس کام سے انھیں روکا جا رہا ہے۔ منع کرنے والا خود اس میں ملوث ہے اور جس عمل کے اختیار کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ خود تلقین کرنے والا اس کا پابند نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ ان پر اس وعظ و تلقین کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ نہ صرف اثر نہ ہو گا بلکہ اس شخص کی حیثیت اُن کی نگاہوں میں گر جائے گی اور اُن کی نظر میں اس شخص کا مقام ایک لغو گو اور منافق کا قرار پائے گا۔ اور اس کی اولاد اور اعزہ اس کے سامنے نمائشی احترام و لحاظ کی خاطر چاہے اس بُرائی کا ارتکاب نہ کریں۔ اور تلقین کردہ اس نیکی پر عمل کریں۔ اور چاہے جبر و اکراہ سے وہ ترک و قبول پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن ان کا یہ ترک و اختیار محض نمائشی، محض تصنع یا محض جبریہ ہو گا۔ اور قلب و ضمیر کے اطمینان و انشراح کی لذت سے محروم رہے گا۔ اس کے علاوہ خلوص، اور للّٰہیت اور محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر نہ ہو گا۔ اور جو کام اُن سے خالی ہو۔ ظاہر ہے کہ دُنیا و آخرت میں نفع بخش نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح اگر محض گھر کے باہر اصلاح و نصیحت کے دریا بہائے گئے اور گھر کی خبر نہ لی گئی تو کہنے والے یہی کہیں گے کہ

تو کارِ زمیں رانکو ساختی کہ با آسماں نیز پرداختی!

اور پھر انسان کی خلوت وجلوت اور اس کی انفرادی و منزلی زندگی کے سارے گوشوں سے اُس کے اہلِ خاندان اور اعزہ واقارب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کے راست بازی اختیار کرنے اور نہ کرنے۔ اُن کا حق کو قبول کرنے اور نہ کرنے کا اثر قدرتاً دوسروں پر پڑتا ہے۔

ان وجوہ سے احتساب کی یہ ترتیب ہے۔ ورنہ بہ یک وقت ایک شخص تینوں مراحل میں اپنی اصلاحی مساعی جاری رکھ سکتا ہے اور اس میں کوئی تضاد نہیں۔ اپنے نفس کی اصلاح اور خود اپنا احتساب کرتے رہنے کے ساتھ خانگی حالات کو درست کرنے کی سعی بھی کر سکتا ہے۔ اور گھر کے باہر بھی تنقید و احتساب کے ذریعہ اصلاح و دعوت کی مساعی بھی جاری رکھ سکتا ہے اس ترتیب کا مقصود یہ ہے کہ سلسلہ کی کوئی کڑی چھوٹنے نہ پائے۔ مقدم کو موخر نہ کیا جائے۔ یا کسی کو مستثنیٰ نہ سمجھ بیٹھا جائے۔

شرائط وطریقۂ احتساب

اب میں اُن شرائط اور اُن طریقوں کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو تنقید و احتساب کے لئے ضروری اور لازمی ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو ایک محتسب اور ناقد کے لئے ضروری ہے۔ وہ ہے علم اور قوتِ تفریق وتمیز۔ ہدایت وضلالت کا علم اور ان کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت۔ معروف ومنکر کا علم اور ان کے مابین فرق و امتیاز کرنے کی اہلیت۔ درست و نادرست کا علم۔ حسن وقبح کا علم۔ صلاح وفساد کا علم۔ اس لئے کہ جب تک انسان حق و ناحق کا علم نہ رکھے گا۔ اور جب تک اس میں اس کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی کہ وہ ان دونوں کے درمیان تفریق وتمیز کر سکے۔ اُس وقت تک وہ کسی کی خیر خواہی میں اس کے لئے بھلائی کے سامان مہیا نہیں کر سکتا۔ اور نہ اسے غلطی کے ارتکاب پر منع کر سکتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر موقع و مصلحت کا علم۔ یعنی یہ سمجھنا کہ کس موقع پر تنقید و احتساب میں مصلحت ہے تاکہ بات دل میں گھر کر جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس "حکمت" کا علم جس کا تذکرہ آگے آرہا ہے۔

علم و دانش کا اولین شرط ہونا اس لئے ہے کہ اس کے بغیر تنقید و احتساب کا جو قدم اُٹھے گا وہ رائیگاں جائے گا۔ یا غلط سمت کو اُٹھے گا۔ طبیب وہی ہے جو اشیاء کے خواص سے واقف ہو۔ اگر ایک جاہل طبیب مریض کے لئے علاج تشخیص کرتا ہے اور بعض اشیاء سے پرہیز اور بعض چیزوں کے استعمال کی ہدایت کرتا ہے۔ لیکن وہ اشیاء کے خواص وتاثیر سے نابلد ہے۔ تو یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ مریض کے لئے ہلاکت کا سامان کر رہا ہے۔ اس کو کیا خبر کہ جس چیز سے روکتا ہے وہ شہد ہے اور جس شئے کو استعمال کراتا ہے وہ زہر ہے۔ یا مرض کی جس منزل پر جو نسخہ تجویز کرنا چاہیئے۔ اگر اس سے وہ لاعلم ہے تو اس کا ہر نسخہ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

کا ایک "شاندار" صداقت نامہ ثابت ہوگا۔

علم کے بعد دعوت و عمل کی باری آتی ہے۔ مخاطبین کی حالت مختلف ہوتی ہے۔ کوئی سخت، کوئی نرم۔ کوئی معاند۔ کوئی جنگجو۔ کوئی ضدی۔ کوئی ہٹ دھرم۔ کوئی عالم۔ کوئی جاہل۔ پھر کیا ہر شخص سے لڑتے پھرنا چاہیئے۔ درشتی اور سختی سے پیش آنا چاہیئے؟ نہیں۔ بلکہ اصول اور کلیہ کے طور پر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر موقع پر نرمی اختیار کرنی چاہیئے۔

اِدْفَعْ بِالَّتِی هِیَ اَحْسَنُ ـــ بہترین طریقے سے مدافعت کرو۔

وَلَوْ کُنْتَ فَظًّا غَلِیْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِکَ ۔ (اے محمدؐ!) اگر آپ ترشرو اور تُند خو ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے بھاگ جاتے

حدیث میں آتا ہے کہ:۔

مَاکَانَ الرِّفْقُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا زَانَہٗ وَلَا کَانَ الْعُنْفُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ

نرمی ہی ہر چیز کو زینت دیتی ہے۔ اور سختی اس کو بدنما کر دیتی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ رَفِیْقٌ یُحِبُّ الرِّفْقَ فِی الْاَمْرِ کُلِّہٖ وَیُعْطِیْ مَا لَا یُعْطِیْ عَلَی الْعُنْفِ

اللہ تعالیٰ مہربان ہے اور ہر چیز میں نرمی پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ دیتا ہے۔ جو سختی پر نہیں دیتا ہے۔

یہ نرمی اور ملاطفت اس لئے کہ وحشت و نفرت پیدا کرنے کے ادنیٰ شائبہ کا بھی احتمال باقی نہ رہے۔ تُندخوئی اور درشتی سے لوگوں میں ایک طرح کا توحش اور ایک قسم کا جذبۂ فرار پیدا ہو جاتا ہے۔ بدزبانی کا زخم لوگوں کو کنارہ کشی اختیار کر لینے پر مجبور کرتا ہے اور پھر کوئی بات سننے کا روادار نہیں ہوتا۔ پھر یہ کہ یہاں جبر و اکراہ کا گزر نہیں بلکہ حق و صداقت اور المعروف کو شیشۂ دل میں عکس کی طرح قبول کرنا ہے۔ اس لئے تند و تیز آندھی اور طوفان کی طرح نہیں۔ بلکہ بجلی کی رَو کی طرح چلنا چاہیئے۔ کہ کسی کو خبر نہ ہو مگر تمام پُرزے حرکت میں آجائیں یہاں تک کہ دل کا لطیف و نازک شیشہ اس رَو کو جذب کرے۔

مانندِ سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ آئے تہِ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے

اس نرمی و ملاطفت کی جلوہ سامانی اس مشہور واقعہ میں ہے کہ مسجد نبوی میں ایک بدو آتا ہے۔ اور وہیں صحنِ مسجد میں پیشاب کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ صحابہ یہ حرکت دیکھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور اُسے سخت و سُست کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو روکتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خاموش ہو جاؤ۔ اور اس کو اپنی حاجت پُوری کر لینے دو۔ اس کو پریشان نہ کرو۔ جب وہ بدوی پیشاب کر کے فارغ ہو جاتا ہے تو حضورؐ فرماتے ہیں کہ اب اس کو میرے پاس لاؤ۔ وہ ڈرتا کانپتا حاضر ہوتا ہے۔ ابھی اس نے عذرخواہی کے لئے زبان ہی کھولی تھی کہ آپؐ محبت کے ساتھ اس کو بٹھاتے ہیں۔ اور نہایت نرمی سے فرماتے ہیں کہ مسجد خدا کی عبادت کرنے کی جگہ ہے۔ اسے نجس نہ کرنا چاہیئے۔ جاؤ۔ آئندہ سے احتیاط رکھو۔ پھر صحابہ سے فرماتے ہیں کہ ڈول لے کر اس جگہ پانی بہا دو۔

تنقید و احتساب اور مکالمہ میں نرمی و ملاطفت کی یہی وہ اہمیت تھی۔ جس کی بنا پر امام ابو حنیفہؒ (غالباً) اپنے صاحبزادے کو مناظروں سے روکا کرتے تھے۔ اُن کے لڑکے نے اُن سے ایک بار اس کی علت دریافت کی اور اعتراضاً کہا کہ آپ بھی تو مناظرے اور مباحثے کرتے رہے ہیں۔ امام صاحب نے جواب دیا کہ:۔

"ہاں! میں نے بھی یہ کام کئے ہیں۔ مگر ہم جب گفتگو ئیں اور بحثیں کرتے تو صاحبِ حق کی خاطر اور یہ دھیان رکھتے کہ مخاطب کے سر پر چڑیا بیٹھی ہوئی ہے۔ اس لئے گفتار اور بحث نہایت نرمی سے، بڑی احتیاط کے ساتھ کرتے کہ کہیں وہ چڑیا نہ اُڑ جائے مگر تم لوگ درشتی و خشونت کے ساتھ بحث و نزاع کرتے ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب بجائے قریب آنے کے، اور دُور جا پڑتا ہے"۔

پھر اسی سلسلہ میں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ آپ نرمی کے ساتھ بولیں گے۔ جواب سخت دیا جائے گا۔ آپ جھکیں گے مگر آپ کے سامنے سر اٹھایا جائے گا۔ آپ شیریں انداز اختیار کریں گے۔ جواب میں تلخی اور کڑواہٹ سے سابقہ پیش آئے گا۔ ایسی حالت میں کیا ہمیں بھی تن جانا چاہیئے؟ اسی کا جواب حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو دے دیا ہے :۔

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

المعروف کا حکم دے۔ منکر سے روک اور جو دکھ تجھ کو پہنچیں اُن پر صبر کر۔ یہ تو بڑے کٹھن کام ہیں۔

چنانچہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی فرائض رسالت کی تعلیم کے بعد حکم دیا گیا کہ :۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ — اپنے رب کے لئے صبر کر۔

دوسری جگہ فرمایا کہ :۔

فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل۔

صبر کیجئے۔ جیسا کہ آپ سے پہلے تمام اولو العزم انبیاء ورسل کرتے آئے ہیں۔

علم و رفق، عفو و درگزر اور صبر و حلم کے ساتھ مقصدِ تنقید اور جذبۂ احتساب بھی ملحوظ رہنا چاہیئے۔ یعنی تنقید برائے تنقید نہ ہو۔ احتساب برائے احتساب نہ ہو۔ اور نہ کوئی ایسی بات ظہور میں آنی چاہیئے۔ جو اس کا پتہ دیتی ہو کہ مخاطب پر اپنے علم اور معرفت حق کی دھاک بٹھائی جا رہی ہو۔ اپنی فضیلت اور اپنے مجد و شرف کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ یا مخاطب کو شرمندہ اور رسوا کرنا مدنظر ہے۔ یا لذتِ نفس حاصل کی جا رہی ہو۔ بلکہ دل سوزی و دردمندی اور خیر خواہی کے جذبات سے قلب کو لبریز ہونا چاہیئے۔ مخاطب کو یہ محسوس ہو کہ اس کی خامی و کوتاہی اور لغزش کی نشاندہی محض اس کی بھلائی کے لئے کی جا رہی ہو۔ اور ایسا کرنے والا ایک ناگوار چارہ کار کے طور پر مجبوراً ایسا کر رہا ہو۔ یہ ایک نازک ترین پہلو ہے۔ اور اس کی جانب سے پوری طرح ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ ورنہ احتساب کی افادیت کا کیا سوال۔ اور تنقید کی سود مندی تو کجا۔ خود اپنی خیر نہیں۔ ایسی تنقید اور ایسا احتساب حبط عمل اور آخرت میں رسوائی کا موجب بن جائیگا۔ جس میں خلوصِ نیت نہ ہو۔ جو خالصتہً للہ نہ ہو۔ جو جذبۂ خیر خواہی سے ہم کنار نہ ہو۔ جس کے ساتھ دل سوزی و دردمندی کی تڑپ نہ ہو۔

یہی وہ جذبۂ خیر خواہی و دردمندی اور مہر و شفقت کی کیفیت ہے۔ جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی حالت کی حکایت قرآن نے ان الفاظ میں کی ہے :۔

لقد جاء کم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم۔

تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اُس پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ تمہاری فلاح کا حریص ہے۔ مومنوں کے لئے وہ شفیق و رحیم ہے۔

انسانیت کے فوز و فلاح پر حریص ہونے اور شفقت و رافت کی یہی وہ شان تھی کہ جب مشرکین مکہ مصائب اور ایذا رسانی کے تواتر و پیہم تیر برسا رہے تھے۔ تو اس وقت بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے اس کے جواب میں کوئی سخت جملہ نہ نکلا۔ ارشاد ہوا تو یہ کہ "اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون"۔ اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے۔ اس لئے کہ یہ نہیں جانتے کہ میں کون ہوں۔

یہ تو وہ اصول و کلیات ہیں جو ہر حال میں، ہر موقع اور ہر محل پر ملحوظ رکھنے ضروری ہیں۔ ان کے علاوہ تنقید و احتساب کے

طریقوں سے متعلق ہیں جو قرآن رہنمائی دیتا ہے۔ انھیں نفس دعوتِ حق کے طریقوں کے ضمن میں اس آیت کے اندر بیان کر دیا گیا ہے۔

اُدْعُ اِلیٰ سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن۔

اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں سے مکالمہ کرو تو احسن طور پر۔

اس آیت میں تین الفاظ اور فقرے ہیں:۔

(۱) حکمت۔ (۲) موعظۂ حسنہ۔ (۳) مجادلۂ احسن۔

حکمت:۔ وہ قوتِ فیصلہ ہے جو عقل ورائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے۔ اور جس کا عمل مقتضائے حال کے ٹھیک ٹھیک مطابق ہونے اور مخاطب کے فہم اور اس کی ذہنیت و استعداد کی پوری طرح اندازہ کر لئے جانے کے سبب عقل اور دل دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جو کلام اور متکلم دونوں میں پائی جاتی ہے۔ جب کسی انسان میں اللہ کی جانب سے یہ جوہر ودیعت کیا جاتا ہے تو اس شخص کے اندر حق شناسی کا ایک ملکہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان سے جو بات نکلتی ہے۔ حق نکلتی ہے اور اس سے جو فعل صادر ہوتا ہے۔ حق کے مزاج کے مطابق صادر ہوتا ہے۔ اور جب کوئی کلام اس حکمت سے متصف ہوتا ہے۔ تو وہ عقل کی راہ سے دل میں اُتر جاتا ہے۔ وہ ہر وسوسہ کو مٹا دیتا ہے اور ہر جھوٹی منطق کو منہدم کر دیتا ہے۔

موعظۂ حسنہ:۔ یہ حکمت کی ایک شاخ ہے۔ شیریں مقالی اور دل نشیں طرز کلام کے ساتھ اس طرح اثبات مدعا کرنا کہ متعصب سے متعصب انسان چاہے وہ اعترافِ حق نہ کرے۔ لیکن اپنی درشت روی، سخت کلامی اور دل خراش طرز گفتگو کے باوجود متکلم کے حسنِ اخلاق و وقار اور ثقاہت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

مجادلۂ احسن:۔ حسنِ ادا اور حسنِ خطابت کے ساتھ متصف وہ بحث جو رشد و ہدایت پر مبنی ہو۔ اور جس کی غرض مخاطب کو مرعوب یا ساکت کر دینا نہ ہو۔ جو عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نوعیت سے جداگانہ نوعیت رکھتا ہو۔ حق کی وضاحت اور اس کا اثبات مدنظر ہو۔ جس کے مقدمات میں اُلجھاوے اور مغالطے نہ ہوں اور جس کی ترتیب علم صحیح کے عناصر سے تشکیل پذیر ہوئی ہو۔

یہ تو ہوئے مذکورہ تین الفاظ اور فقروں کے مفاہیم اور مدعا۔ اس کے بعد جو قابلِ ذکر بات رہ جاتی ہے۔ وہ مختصراً یہ ہے کہ اس آیت میں انسان کے تین طبقوں کا ذکر ہے۔

وہ اس طرح کہ گفت و شنید اور کلام و خطابت کی جب نوبت آتی ہے تو عموماً تین صورتوں سے سابقہ پیش آتا ہے:۔

یا تو ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب بالکل خالی الذہن ہوتا ہے۔ یا وہ ابھی ریب و شک کی پہلی منزل میں ہوتا ہے کہ جہاں جرح و قدح اور انکار و مخالفت کا سوال نہیں۔ اس موقع پر ضرورت صرف اس امر کی ہوتی ہے کہ مخاطب کے ذہن کو پڑھ کر اس خوش اسلوبی سے اس کے سامنے بات پیش کر دی جائے کہ وہ اسے خود اپنے دل کی بات سمجھنے لگے۔ گفتگو اور مخاطبت کا ردِ عمل کچھ اس طرح کا نقشہ پیش کرے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی خوبی، کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ تو میرے دل میں ہے

اور اگر وہ ریب و شک کی پہلی منزل میں ہے۔ تو صرف اتنا کرنا پڑے گا کہ اُس کے دل کی خلش اور اس کے شک کی خامیاں حکمت و دانائی کے حُسنِ تدبیر سے دُور کر کے اُس کی تسکینِ قلب کر دی جائے۔

دُوسری صورت یہ ہے کہ مخاطب انکار و اختلاف کی سرحد میں پہنچ چکا ہے۔ ایسے موقع پر سب سے پہلے یہ کرنا پڑے گا حکمت و

دانائی کی ترازو پر تول کر اس کا اصل مقام و موقف سمجھنا ہوگا کہ اس کا انکار محض افہام و تفہیم کا طالب ہے۔ یا عناد و نزاع کے لئے اس کا ذہن مچل رہا ہے۔ اگر بات صرف اتنی ہو کہ وہ کچھ دلیلیں ایسی اپنے پاس رکھتا ہے۔ جن کی بناء پر وہ جرح و قدح کر رہا ہے۔ مگر عناد و مخالفت کی تندی سے ابھی دُور ہے۔ تو پھر موعظۂ حسنہ کا اسلوب اختیار کرنا پڑے گا۔ حکمت آموز دلائل کو عمدہ مثالوں۔ بہترین نظائر اور دلکش پیرایۂ بیان سے مزین کر کے اس طرح سامنے لانا ہوگا کہ مخاطب کی دلیل آپ سے آپ بے وزن ہوتی چلی جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کے جرح و قدح کے ترکش میں ایک تیر بھی ایسا باقی نہ رہے گا۔ جو خود اس کی نظر میں کارگر ہو۔ اس کے لئے مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کرنا چاہیئے۔ برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ ہو۔ بلکہ انسان کی فطرت میں برائیوں اور منکرات کے لئے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اُسے بھی ابھارا جانا چاہیئے۔ اور اُن کے بُرے نتائج کا خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عملِ صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ ساتھ ہی طرزِ خطاب اور اندازِ تنقید و احتساب ایسا ہونا چاہیئے کہ مخاطب کو محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں دردمندی و دل سوزی ہے اور وہ حقیقتاً اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ لیکن نوعِ انسانی کے بہت سے افراد ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے نظریات و تصورات اس دوسری منزل سے بھی آگے بڑھ چکے ہوتے ہیں۔ ایسے اشخاص اپنے اختلاف کو ذرا شدت سے پیش کرتے ہیں۔ اور بزعم خویش اپنے دلائل کی بنیادوں کو ناقابلِ انہدام تصور کرتے ہیں۔ اور اُن کا اختلاف مخالفت کی سرحد چھو رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنے ردّ و قدح کے قلعہ کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے ہوئے بحث و مباحثہ کے خواہشمند ہوتے ہیں۔

یہ ہے وہ تیسری صورت جبکہ اتمامِ حجت کی خاطر ایک داعیِ حق کو مباحثہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن چونکہ دعوت و تبلیغ کی راہ بحث و مناظرے کی راہ سے بالکل مختلف ہے۔ ایک داعی اپنی گفتگو کا وہ اسلوب اختیار ہی نہیں کر سکتا جو ایک مناظر کا شیوہ ہوتا ہے داعی مناظر نہیں ہوتا۔ اور مناظرہ کی ذہنیت ہدایت اور توضیحِ حق کے لئے سازگار نہیں۔ دعوت کا مقصود ہدایت ہے جو صرف اذعان اور یقین سے حاصل ہو سکتی ہے۔ مناظرہ اور مباحثے کا مقصد بالعموم مخاطب کو ساکت کر دینا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدائے دعوت میں تاثیر ہوتی ہے۔ قلب میں اس سے رقت پیدا ہوتی ہے اور قبولیتِ حق کی جانب دل بے ساختہ کھنچ جاتا ہے۔ اور مناظرہ سے یہ تو ممکن ہے کہ مخاطب لاجواب ہو جائے اور اس کا دماغ مرعوب و مفلوج ہو کر رہ جائے۔ مگر اس کے دل کا کانٹا نہیں نکلتا۔ اس لئے ایک داعیِ حق اس بات کو خوب جانتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کی کامیابی بحث و نزاع کی کاوشوں میں نہیں۔ بلکہ حکمت اور موعظۂ حسنہ میں پوشیدہ ہے۔ اس بناء پر وہ مناظرے کے ہتھکنڈوں سے نہیں۔ بلکہ مجادلہ احسن کے شعار سے آراستہ ہو کر بحث و مکالمہ کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا طریقۂ دعوت حکمت اور موعظۂ حسنہ پر قائم رہا۔ وقت کے ائمۂ ضلالت اور منکرات کے علمبرداروں کے نظریات و تصورات پر انہوں نے جب کبھی تنقید و احتساب کیا ہے تو حکمت و موعظۂ حسنہ اور مجادلہ احسن کی روش ہی کو اختیار کر کے کیا ہے۔ اس کے لئے قصص القرآن کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح ہر موقع پر حکمت و موعظۂ حسنہ اور مجادلہ احسن کے اصول انبیاء علیہم السلام کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ اور اس باب میں اُن کے مکالموں سے بے شمار تعلیمات اور بصیرت حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر چند نظائر اور مثالیں ذکر کر دی جائیں:-

سورۂ طٰہٰ میں فرعون کے دو سوالوں کا تذکرہ ہے۔ جو اس نے حضرت موسیٰؑ سے کئے تھے۔ اولاً یہ کہ "مَن ربکما یا موسیٰ"؟ جس رب کا تم دونوں (موسیٰؑ و ہارونؑ) ذکر کرتے ہو۔ اے موسیٰؑ وہ کون ہے؟ جواب میں حضرت موسیٰؑ صرف اتنا فرماتے ہیں کہ الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقہٗ ثم ھدیٰ۔ ہمارا رب تو وہ ایک ہی رب ہے جس نے دنیا کی ہر چیز کو اس کا جسم و وجود بھی بخشا اور پھر ہر طرح کی ضروری توفیق اور صلاحیتیں دے کر اس پر زندگی و ہدایت کی راہ بھی کھول دی۔ کس قدر حکیمانہ جواب ہے یہ ——

فرعون کے سوال میں اس کے عقائد و تصورات کے بے شمار گوشے پنہاں تھے۔ جن کی تفصیل اس پس منظر سے معلوم ہو سکتی ہے جو اس وقت مصریوں کے عقائد میں کارفرما تھا۔ اگر حضرت موسیٰؑ کو مناظرہ اور جدل کا طریقہ مدنظر ہوتا تو سینکڑوں الجھاوے تھے۔ اور اہل مصر کا ہر تصور اچھا خاصا معرکۂ جدل و مناظرہ سے بدل سکتا تھا۔ اور لیل و نہار کی کتنی ہی گردشیں اُن کے پرخچے اڑانے کے لئے درکار تھیں۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کسی امر کی جانب توجہ نہیں فرماتے۔ صرف ایک بات کہتے ہیں۔ مگر ایسی بات جو اس کے سوال کا براہ راست جواب بھی ہے اور اس کے سارے تصورات پر بالواسطہ ضرب کاری بھی۔ نیز یہ جواب نرا دعویٰ نہیں۔ بلکہ اپنے اندر استدلال بھی رکھتا ہے۔ کہ میں تمہارے ان نام نہاد معبودانِ باطل کا قائل نہیں۔ جن میں سے کسی کو تم نے بارش برسانے والا۔ کسی کو روزی رساں اور کسی کو صحت و تندرستی عطا کرنے والا سمجھ رکھا ہے۔ میں تو صرف اس ایک ہستی کا عبادت گزار ہوں جو کائنات اور کائنات کی ہر ہر شے کو جسم بھی عطا کرتی ہے۔ اور جسم کے وہ سارے لوازم بھی دیتی ہے جو جسم کے قیام و عمل کے لئے ضروری ہیں۔ اور جب ایسا ہے تو پھر وہی خالق رب ہونے کا مستحق ہے۔ اور جب خلق و ربوبیت کا سرچشمہ تنہا وہی ذات ہے تو پھر اطاعت اور عبادت بھی اسی کی کرنی چاہیئے۔

فرعون کا اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ "فما بال القرون الاولیٰ"۔ اچھا۔ اگر حقیقت حال یہی ہے جو تم کہہ رہے ہو۔ تو پھر گزشتہ زمانے کے لوگوں کا کیا ہونا ہے؟ جن کے کان تمہاری اس صدا سے نا آشنا رہے۔ جن تک تمہاری یہ دعوت نہ پہنچی۔ آیا وہ حق پر تھے یا گمراہی پر؟

یہ سوال کسی فلسفی اور منطقی کے سامنے کیا جاتا تو وہ نہ جانے کتنی راتیں اور کتنے دن اس کے جواب کی نذر کر دیتا۔ اور بات پھر بھی وہیں رہتی جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ اس کی منطق اور اس کا فلسفیانہ استدلال اس سوال کی جراحی کر کے درجنوں شقیں نکالتا۔ اور ہر شق کے نہ جانے کتنے گوشے اور ہر گوشے کی نہ معلوم کتنی نوعیتیں سامنے آتیں۔ اور ردّ و قدح کا ایک ایسا تسلسل پیدا ہو جاتا۔ کہ اسی بھول بھلیاں میں سائل و مجیب چکر کھاتے رہتے۔ مگر مجیب حضرت موسیٰؑ تھے۔ فارابی و افلاطون نہیں۔ وہ داعی تھے نہ کہ فلسفی و مناظر۔ انہوں نے جواب میں ایک مختصر سی بات کہہ دی۔ اور ساری بحث ختم تھی۔ سائل کی ساری امنگیں، جو بحث و نزاع اور جرح و قدح کے لئے مچل رہی تھیں۔ اس کے دل ہی میں گھٹ کر رہ گئیں۔

فرمایا کہ علمہا عند ربی فی کتاب۔ اس کا علم میرے رب کو ہے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں اس کی فکر ہی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے جاننے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ "لا یضل ربی ولا ینسیٰ" میرا رب انسانوں کی طرح نہیں جو ضلالت سے آلودہ ہو سکے۔ یا کوئی بات بھول جائے۔ اُن کے اعمال کی ہم سے بازپرس نہ ہو گی اور نہ ہمارے اعمال سے انہیں کوئی واسطہ ہو گا۔ نہ اُن کا عمل پراگندہ ہو کر بے نام و نشان ہوا ہے۔ اور نہ ہمارا عمل حرف غلط کی طرح محو ہو جائے گا۔ اُن کے اعمال بھی محفوظ ہیں اور ہمارے اعمال بھی محفوظ رہیں گے۔ پھر ایک دن معاملہ ایسے محاسب کے سامنے آئے گا جو نہ غلطی کر سکتا ہے اور نہ بھول چوک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اور پھر وہ سب کو ان کے اعمال کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ دے گا۔ اس لئے ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیئے۔ دوسروں کے غم میں گھلنے کی ضرورت نہیں۔ ہم ان کاوشوں میں کیوں پڑیں کہ پچھلوں کا کیا بنے گا۔ ہم یہ جانتے ہی نہیں اور نہ ہمیں اس کا خواہشمند ہونا چاہیئے کہ اسے جانیں۔

اسی خیابال القرون الاولیٰ کی مجادلانہ روش پر بڑے بڑے فتنے اٹھے ہیں۔ حتیٰ کہ تلواریں نیام سے باہر نکلی ہیں۔ اور معرکۂ کشت وخون گرم ہوا ہے۔ اور آج بھی اس کی کار فرمائیاں ختم نہیں ہوئی ہیں۔ فلاں شخص حق پر تھا یا نہیں۔ فلاں امام افضل تھے یا فلاں۔ فلاں بزرگ کا درجہ عند اللہ بڑا تھا یا فلاں کا۔ یہ اور اسی قسم کے سوالات دراصل اسی مجادلانہ سوال کے مظاہر ہیں۔ پہلے بھی اس قسم کے سوالات کے جوابات میں جیسی کاوشیں اور عرق ریزیاں کی گئی ہیں۔ تاریخ کے صفحات میں وہ محفوظ ہیں۔ اور ان کا جو نتیجہ نکلا۔ وہ بھی ہمارے سامنے ہے۔ اور آج بھی اسی قسم کے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ اور جوابات میں کچھ اس ڈھب کی سعی کی جاتی ہے کہ جیسے مجیب ابھی ابھی خدا کے رجسٹر کا مطالعہ کرکے اٹھا ہے۔ لیکن اس طرح کے سوالات کا ایک داعی کی جانب سے جو جواب ہوگا۔ وہ اسی موسوی اسوہ سے ماخوذ۔ حکمت و موعظۂ حسنہ سے معمور ہوگا۔

دعوت و تبلیغ، تنقید و احتساب اور اقامتِ حجت کے باب میں حکمت اور موعظۂ حسنہ اور مجادلۂ احسن کے نقوش حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ میں نمایاں طور پر ابھرے ہوئے ہیں۔ اور ایک داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تبلیغی اور تنقیدی سرگرمیوں میں حجتِ ابراہیمی کے اصول کو بھی اپنا کر اسوۂ ابراہیم کے فریضۂ اتباع کی انجام دہی کرے۔

مثلاً نمرود سے حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ربی الذی یحیی ویمیت۔ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ تو نمرود نے مجادلانہ رویہ اختیار کیا اور کہا کہ انا احیی و امیت۔ جلانے اور مارنے والا تو میں ہوں۔ ظاہر ہے کہ نمرود کا یہ جواب نہایت معقول اور انتہائی مضحکہ خیز تھا۔ اس جواب پر ایک مناظر اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لے سکتا تھا کہ اس کا ناطقہ بند ہو جاتا۔ اس کی عقل و خرد اور اس کے فہم و شعور اور اس کی سخن فہمی پر طنز و استہزاد کے اتنے تیر برسائے جا سکتے کہ اسے جائے فرار نہ ملتی۔ تضحیک و تذلیل سے اس کو بوکھلایا جا سکتا تھا۔ دلیلوں کے الجھاؤ سے اسے سراسیمہ اور درماندہ کیا جا سکتا تھا۔ مگر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پیش نظر دعوت و تلقین تھی۔ نہ کہ جدل و خصومت اور داعی کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے مخاطب کے قلب و ذہن میں کسی نہ کسی طرح حق اتار دے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ کی اس بات کو نمرود کا دماغ ہضم نہ کر سکا تو وہ اپنی اس دلیل پر ایک لمحے کے لئے بھی نہ اڑے۔ فوراً دوسری بات پیش کر دی کہ۔

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بہا من المغرب۔

اچھا، اگر تیری قدرت و اختیار کی وسعت ایسی ہی ہے تو میرا رب سورج
کو مشرق سے زمین پر طلوع کرتا ہے تو ذرا مغرب سے نکال کر دکھا دے۔

تیر لٹ نہ پرنگا۔ فبہت الذی کفر۔ وہ نمرود جس نے کفر و سرکشی کی راہ اختیار کی تھی۔ یہ جواب سن کر ہکا بکّا رہ گیا۔

دوسری مثال حضرت ابراہیمؑ کے حکمت آگیں طریق دعوت کی وہ ہے۔ جبکہ حضرت ابراہیمؑ نے مندر کے سارے بتوں کو پاش پاش کیا تھا۔ اور بڑے بت کو چھوڑ دیا کہ لعلہم الیہ یرجعون۔ ممکن ہے وہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں یا انھیں رجوع کرانے کا موقع مل سکے۔ تاکہ قیام حجت کا وہ طریقہ کام میں لایا جا سکے۔ جو وجدانی مشاہدہ اور عینی محسوسات کے ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے۔ جیسا کہ خیال کیا تھا کہ عقلی دلائل و براہین کی روشنیاں ان بت پرستوں کے لئے بیکار ہو چکی ہیں۔ اس لئے انہوں نے تجویز کیا کہ اسلوب دعوت وہ اختیار کرنا چاہیئے جو ان بت پرستوں کے مشاہدہ اور احساس کو اپیل کرے۔ اور اس کے لئے بتوں کا وہ اقتدار جو ان بت پرستوں کے دلوں میں جما ہوا تھا۔ اس کی قلعی کھولنی ضروری

تھی۔ اور اصنام کے ان تصرفات کا طلسم توڑنا ضروری تھا۔ جو اِن بُت پرستوں کے قلوب میں راسخ تھے۔ اور یہ کام اس طرح کرنا مقصود تھا کہ بُت پرست بچشمِ خود اپنے معبودوں کی بے حقیقت حیثیتوں کا مشاہدہ کرلیں۔ چنانچہ ایک دن موقع پاکر حضرت ابراہیم نے بڑے بُت کو چھوڑ کر بقیہ سارے بُتوں کو پاش پاش کردیا۔ اور جب پوچھ گچھ کا موقع آیا۔ پجاریوں اور عوام کے سامنے حضرت ابراہیمؑ کو بُلایا جاتا ہے اور اُن سے ان بُتوں کے توڑنے والے کی بابت استفسار کیا جاتا ہے۔ جواب میں حضرت ابراہیم فرماتے ہیں کہ:۔

کبیرھم ھذا۔ فاسئلوھم ان کانوا ینطقون۔

"ہاں یہ کام تو کیا اور کسی نہ کسی نے تو کیا ہی ہے۔ یہ رہا تمہارا رب الارباب۔ اور یہ ابھی صحیح وسالم ہے۔ تم نے عوام میں مورتیوں کی پُراسرار آوازوں کے قصّے مشہور کر رکھے ہیں۔ عوام کے دلوں پر تم نے اس اعتقاد کا سکّہ جما رکھا ہے کہ تمہاری باتوں کا جواب یہ بُت دیتے ہیں۔ تو پھر ان بُتوں سے پوچھو۔ اگر فی الحقیقت تم سے یہ سرگوشیاں کرتے ہیں تو آج اس قدر المناک حادثے پر تمہارا جواب ضرور دیں گے۔ تم نے بتوں کے تصرفات کے افسانے پھیلاکر عوام کو خوف زدہ کر رکھا ہے تو تمہارا یہ رب الارباب خاموش دیکھتا کیوں رہا۔؟ اس نے انھیں تباہ ہونے اور مندر کے تہ وبالا ہونے سے کیوں نہ بچایا؟"

یہ جواب سُنتے ہی حاضرین پر ایک سناٹا چھا گیا۔ عوام کے سامنے پجاری یہ کہنے سے رہے کہ یہ بُت میرے سوال کا جواب نہیں اور نہ دے سکتے ہیں۔ کیونکہ پجاری بُتوں سے اپنی ہم کلامی کا پرچار کرتے رہے تھے۔ خود حقیقت جانتے تھے۔ اس لئے بُتوں سے سوال کرنے سے رہے۔ فرجعوا الی انفسھم۔ پجاریوں کی جماعت عوام سے الگ ہوکر آپس میں باتیں کرنے لگی۔ مگر بات کیا بناتے۔ بالآخر مجبوراً انھیں آپس میں ایک دوسرے سے کہنا پڑا۔ کہ انکم انتم الظالمون۔ بلاشبہ حق سے نافرمانی کرنے والے تم ہی ہو۔ ٹھیک بات وہی ہے جو ابراہیم کہہ رہے ہیں۔ اور پھر حضرت ابراہیم کے سامنے دبی زبان سے اقرار کرنا ہی پڑا کہ لقد علمت ماھولاء ینطقون۔ یہ حقیقت تو تمہیں معلوم ہی ہوچکی ہے کہ آوازوں کے افسانے کیا اصلیت رکھتے ہیں۔ یہ بُت بولا نہیں کرتے۔ پھر تمہارا یہ کہنا کہ بُتوں سے پوچھ لو۔ کیا معنی رکھتا ہے۔

پھر کیا تھا صوتِ ابراہیمی بھرے مجمع میں گونجی:۔

افتعبدون من دونِ اللّٰہ مالا ینفعکم شیئاً ولا یضرکم۔۔۔۔

کہ جب ان بتوں کے نطق والہام کے سارے افسانے من گھڑت ہیں اور ان کی بے بسی ولاچارگی کا عالم یہ ہے تو پھر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ اللہ کو چھوڑکر ان کی پرستش کرتے ہو۔ جو نہ کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ذرّہ برابر بھی نقصان۔ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی؟

یہ تو تھی بُت پرستوں کے مقابلہ میں حضرت ابراہیمؑ کی حجّت اور اس حکیمانہ طرزِ دعوت اور تنقید و احتساب کے اسلوب میں الٰہی اصول کی جلوہ فرمائی توحید الٰہی کی تبلیغ کا وہ رُخ ہے جسے حضرت ابراہیمؑ نے ستارہ پرستوں کے مقابلہ میں اختیار فرمایا تھا۔ جس کی تفصیل سورۂ انعام میں ہے۔ جس کی ابتداء فلمّا جنّ علیہ الّیل رأ کوکباً سے ہوتی ہے اور اختتام اس پر ہوا ہے کہ وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیمَ علیٰ قومہ ــ وقت اس کا متحمل نہیں۔ ورنہ یہ تفاصیل

بھی بیان کر دی جائیں۔

پس ان چند مثالوں سے دعوت و تلقین اور تنقید و مکالمہ کے جس جس سنگ میل اور جن حدود کی تعلیم و ہدایت ہمیں حاصل ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ:-

(۱) سائل کا جواب مختصر اور جامع دیا جائے۔

(۲) دوسرے یہ کہ سوال کرنے والے کے منشاءِ سوال تک پہنچنے کی سعی کی جائے۔ تاکہ غلط اندیشی کا سرچشمہ بند کیا جا سکے۔ جس کے نتیجے میں غلط فہمیاں شاخ در شاخ پھوٹتی ہیں۔ ضمنی مباحث اور فروع میں پڑ کر بحث و نزاع کے معرکے گرم نہ کئے جائیں۔

(۳) تیسرے یہ کہ جن باتوں کا ہمیں علم نہ ہو۔ اُن پر لب کشائی نہ کی جائے۔ جن امور کے حصولِ علم کا ذریعہ موجود نہ ہو۔ اور نہ ہمیں ان کے جاننے کا مکلف بنایا گیا ہو۔ اُن کے لئے کد و کاوش، زحمتِ بیجا کے ہم معنی ہے۔ اس قسم کے مسائل میں قیاس و ظن کے گھوڑے نہ دوڑائے جائیں۔

(۴) چوتھے یہ کہ مخاطب کی حالت اور اس کے ظرف کی رعایت ازبس ضروری ہو۔ دلیل معقول سے معقول ہو۔ لیکن اگر مخاطب کے فہم کی گرفت میں نہ آ رہی ہو تو اس پر اڑا نہ چاہئے۔ اور اس کی کوشش نہ کرنی چاہئے کہ اس کے دماغ میں وہ دلیل ٹھونس ہی دی جائے۔ بلکہ ایسی صورت میں دوسری کسی ایسی دلیل کو سامنے لانا چاہئے جو مخاطب کے فہم و عقل سے قریب ہو۔ اور اس کے ظرف کے مناسب!

(۵) پانچویں یہ کہ علمی اور عقلی دلائل و براہین بسا اوقات بھینس کے آگے بین ثابت ہوتے ہیں۔ بالخصوص عوام الناس کے سامنے۔ کہ ان کے روبرو محسوسات سے استدلال کا اسلوب مفید ہوتا ہو۔ اور ان کے اذہان کو حسّی اور عینی دلائل اپیل کرتے ہیں۔ لہذا موقع و محل کے مطابق استدلال کی نوعیت تجویز کرنی چاہئے۔

(۶) اور چھٹے یہ کہ بحث و مکالمہ اور تنقید و احتساب میں کج بحثی اور الزام تراشی، چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ زبان آوری اور طلاقتِ لسانی کا مظاہرہ مقصود نہ ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پیچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔ تاکہ وہ گمراہی میں اور زیادہ دور نہ نکل جائے۔ ساتھ ہی پوری طرح محتاط رہنا چاہئے کہ مخاطب کے تعصب اور درشتی و سخت کلامی کے ردِ عمل میں اپنے اندر اشتعال اور تندی و تیزی پیدا نہ ہونے دیں۔ ورنہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب کا ضمیر اس کے بخود غلط ہونے کی شہادت دیتا ہے اور عین ممکن ہوتا ہے کہ ذرا سی مزید سعی سے وہ قبولیت حق پر آمادہ ہو جائے۔ مگر اشتعال پذیری کے سبب اپنے اندر تندی و تیزی اور درشتی پیدا کر لینے سے مخاطب کا ناری عنصر بھڑک اٹھتا ہے اور پھر وہ مخالفت اور اصرار باطل کے ایسے کنارے پر چلا جاتا ہے جہاں سے اس کی واپسی بے انتہا دشوار ہوتی ہو اور اسے اب اتنا بھی قریب لانا، جتنا وہ پہلے تھا، جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا۔

آخر کوئی رمز ہی تو ہے کہ مشرکین کے معبودوں اور اصنام کو بُرا بھلا کہنے۔ انہیں ذلیل و رسوا کرنے اور انہیں سب و شتم کا ہدف بنانے سے روکا گیا ہے؟

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین!

دارالمصنفین سے سید صاحبؒ کیوں علیحدہ ہوئے

(ایک مقالہ کا وہ حصہ جسے حذف کر دیا گیا)

آج تک یہ بات ایک بہت ہی محدود حلقہ سے باہر معمہ بنی ہوئی ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی جیسی علم دوست اور علم نواز ہستی نے اپنے خونِ جگر سے سینچے ہوئے نہالِ علمی "دار المصنفین اعظم گڑھ" کو آخر عمر میں چھوڑنا کیسے گوارا کر لیا؟ وہ ڈاکٹر اقبال کی دعوت پر لاہور یا علی گڑھ یونیورسٹی کی پیش کش پر علی گڑھ جانے کیلئے کسی قیمت پر آمادہ نہ تھے۔ اور اپنے اسی محبوب ادارے کی خاطر ہر طرح کے مالی وجاہی ایثار کو خوشی خوشی گوارا کرتے رہے۔ آخر عمر میں جبکہ سکون کی دائمی نیند بھی وہیں سونا پسند کرتے تھے، کیوں بھوپال اور پھر پاکستان کی بادیہ پیمائی پر مجبور ہو گئے تھے؟ یہ مولانا مرحوم کی شرافتِ نفس کا اعلیٰ ترین ثبوت ہے کہ انہوں نے اس راز کو اس درجہ چھپایا کہ اُن سے قریبی ربط رکھنے والے تک اس کو نہ پا سکے۔ چنانچہ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے مولانا مرحوم پر جو مضمون "معارف" کے سلیمان نمبر میں لکھا ہے۔ اُس میں ایک جگہ اس استعجاب کا اظہار یوں کرتے ہیں:۔

> "سید صاحب کا تعلق دار المصنفین سے تقریباً ۳۰۔۳۴ سال تک رہا۔ اُن کی قیادت میں اس ادارہ کا یہ زمانہ کارنامی اور کارگزاری کے اعتبار سے بڑا شاندار رہا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں دار المصنفین کو یہ درجہ حاصل ہو سکیگا۔ معلوم نہیں کیوں اور کیسے سید صاحب نے کچھ دنوں کے لئے دار المصنفین سے علیحدہ ہو کر بھوپال میں ملازمت کر لی؟"

اس بھید کا کچھ کچھ پتہ اشارہ کنایہ میں مدیر معارف شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کے ان شذرات میں ملتا ہے جو موصوف نے سید صاحبؒ کی رحلت کے بعد مسلسل دو تین ماہ لکھے۔ مگر اس بات کو برملا کہنا انہوں نے بھی مصلحت کے خلاف سمجھا۔ اور یہ مصلحت اتنی غالب رہی کہ سلیمان نمبر کے سلسلہ میں مولانا عبد الباری صاحب ندوی نے جو علامہ مرحوم کے دیرینہ رفیق و ہمراز ہیں۔ جب اپنے مضمون "سیرۃ السید کے کچھ انمول سبق" میں اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالی تو ٹھیک اتنا حصہ مولانا کے مضمون سے حذف کر دیا گیا۔ ذیل میں ہم اسی محذوف حصہ کو شائع کر رہے ہیں۔ سید صاحب مرحوم کیساتھ اُن کے مخلصین اور فیض یافتگان کی یہ بڑی ناسپاسی اور تاریخی خیانت ہوگی۔ اگر وہ اس تاریخی حادثہ یعنی دار المصنفین سے اُن کی علیحدگی کے وجوہ کی پردہ پوشی کر جائیں گے اور آنے والوں کے

ذہنوں میں سید صاحب سے متعلق شکوک کا ایک دروازہ کھلا چھوڑ جائیں گے۔ خود ذیل کا مضمون بھی اس پہلو پر ناتشفی بخش ہے اور خاص اس موضوع پر صاف صاف مضمون کی ضرورت اب بھی باقی ہے! کاش وقت نے علامہ مرحوم کے شاگرد سعید مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو کچھ اور مہلت دی ہوتی تو وہ یقیناً حق و صداقت کو بے نقاب کرتے اور لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ سید عالی مقام نے اپنے محبوب ادارے سے خاموشی سے علیحدگی اختیار کر کے ایثار و تحمل کا کتنا بڑا ثبوت دیا اور اپنے زبردست مخالفین کے ساتھ بھی کس حسن سلوک سے کام لیا اور خود پر الزام گوارا کر کے اُن کی کس قدر عیب پوشی فرمائی!" (ع۔م)

معاملہ یہ ہے کہ اُن کے اور اُن کے ایک دوست و رفیق[1] (جو میرے بھی پرانے دوست تھے) کے درمیان یہ "حریف خیر خواہی" اصلاح ذات البین کا ساعی ہے۔ اس سلسلہ کی مکاتبت کا ایک مکتوب پڑھیں:۔

"بے شبہ آپ کے اخلاص و نیت خیر پر پورا بھروسہ ہے اور جس راہ میں قدم اٹھا رہے ہیں وہ تمام تر سعی مشکور ہے۔ جس تاریخ برادر موصوف[2] تھانہ بھون گئے ہیں۔ اُسی دن سے اُن کے طرز عمل سے یقین تھا کہ میری ہزار برائیوں کے باوجود میری طرف سے انھیں کوئی شکایت نہیں۔ اور ہو بھی تو وہ معافی مانگ چکے اور میں بھی مسجد میں معافی مانگ چکا۔ اب اس کے بعد کوئی حرکت ہوتی ہو تو میں ہر طرح تلافی اور طلب عفو کے لئے تیار ہوں۔ چنانچہ باوجود برادر موصوف کی خاموشی کے میں نے اُن کو تھانہ بھون خط لکھا۔ انہوں نے ویسا ہی جواب دیا جو وہ دے سکتے تھے۔ اور اس کے باوجود آج اُن کو پھر..... خط لکھ رہا ہوں۔ اور مشورے مانگ رہا ہوں۔ جیسا جواب آئے۔"

یاد رہے کہ یہ دوست و رفیق نہ صرف حضرت مرحوم کے ہر طرح چھوٹے ہی چھوٹے بلکہ بڑی حد تک اُن ہی کے زیر سایہ اپنی علمی صلاحیتوں کے پروان چڑھانے کا موقع پا سکے۔ اس کو مدنظر رکھ کر آگے کی سطریں پڑھیں۔ میرا قلم اور کلیجہ تو نقل ہی سے کانپ رہا ہے:۔

"میں اپنی ہر تقصیر کے لئے جو مجھ سے سرزد ہوتی ہو طلب عفو کا خواستگار ہوں۔ خواہ اس کی صورت یہ ہو کہ میرا ایک ایک جرم علیحدہ علیحدہ گنا دیا جائے اور میں علیحدہ علیحدہ ہر ایک کی معافی مانگ لوں۔ اور یا بالاجمالی معافی مانگوں۔ اور دل صاف ہونے اور صاف کرنے کا وعدہ کروں۔ جیسا کہ ایک دفعہ کیا جا چکا۔"

سید صاحب کے مرتبہ و مقام کا تو ذکر ہی کیا۔ اُن سے کم درجہ کا بھی کوئی بڑا اپنے کسی چھوٹے کے سامنے اس طرح گر گرا اور آنز کر دیکھے اور دکھلائے تو مرحوم محترم کے قلب و باطن کی پاکی و پاکیزگی کی قدر و قیمت معلوم ہو۔ خود اس کم ظرف و کم ہمت راقم کا تو یہ حال ہے کہ اس کے بھی یہی چالیس[3] سال پرانے دوست جب خود اس سے ناراض ہوتے تو ابتداء میں دیکھا دو چار مرتبہ اپنی ہی طرف سے مواقع نکال کر اُن کی آمادگی و عندیہ معلوم کرنے کی حد تک پیش قدمی کی۔ لیکن جب اُدھر سے بے التفاتی ہی نہیں اُس سے بھی بڑھ کر تجربات ہوتے تو پھر ایک قدم آگے نہ بڑھا سکا۔

---

[1] مولانا مسعود علی ندوی۔

اس لئے یہ بندۂ نفس تو آج حضرت مرحوم کے اس طرح کے گرامت ناموں کو اُن کے تزکیۂ نفس کی زندہ کرامت پا رہا ہے۔ بلاشبہ سید صاحب طبعاً بھی بڑے منکسر المزاج اور پاک دل تھے۔ لیکن اس طبیعت کا رُخ دینی عزیمت کی طرف جس راہ کے ارادہ و نیت نے پھیرا۔ اس کو خود اُنہی کے قلم سے اسی مکتوب بالا میں آگے پڑھئے:۔

"آپ یقین کیجئے جس راہ میں چلنے کا ارادہ کر رہا ہوں اس راہ میں کسی کی طرف سے دل کے اندر خلش ایسی فکر ہے جو سدِّ راہ ہے۔ یہ میرا خیال نہیں بلکہ حال ہے۔ اور اس لئے دل سے متمنی ہوں کہ برادر موصوف مجھ سے اسی طرح مل جائیں جیسے تھے۔ اور مجھے امید ہے کہ ان پر حال کے انقلاب طبع کا جو اثر ہے وہ روز بروز بڑھتا ہی جائے گا۔ اور کف لسان پر عمل میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں چاہتا۔ اگر یہ ہوگیا تو پھر انشاء اللہ یہ بہت بڑا باعث ہوگا تحسین احوال و اصلاح علائق کا۔"

افسوس صد افسوس کہ مرحوم کا یہ چاہا پورا نہ ہوا۔ مرحوم ہونے تک دل کی یہ تمنا "مرحوم" ہی رہی۔ ماتم پر ماتم کی بات ہے کہ اُن کی علیحدگی و دُوری کے بعد بھی تحسین احوال و صلاح علائق۔ کی یہ آرزو دُور سے دُور کو ہی ہوتی گئی جس کی بدولت مرحوم کی زندگی کی ایک بڑی زندہ یادگار ہی "مرحوم" ہو رہی ہے۔ جس کی قدرتاً اُن کو ذاتی تعلقات کی اصلاح سے زیادہ فکر تھی۔ اسی گرامی نامہ میں ارشاد ہے:۔

"دو شخصوں کے ذاتی تعلقات کو چھوڑ کر اگر آپ (ادارہ کا نام) ...... کی اصلاح کی سعی کریں تو میرے لئے مزید شکریہ کا موجب ہو۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ آپ خود آئیں۔ اور میرے پیچھے بھی اور دخلاں سے بھی پوچھیں اور برادر موصوف سے بھی دریافت کریں۔ جو اسباب ناراضی ہوں اُن کا انسداد کیجئے اور تحسین تعلقات کے اسباب فراہم فرمائیے۔ کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہم چند آدمی بھی صاف دلی کیساتھ باہم نہ رہ سکیں۔ ......
آپ جس قدر جلد اپنی تجویز کو عمل میں لائیں اسی قدر میرے لئے ذہنی راحت کا باعث ہوں گے۔"

سیّد صاحب اپنی علمی و دینی خدمت و محنت کے ایک بڑے سرمایہ کو جس طرح برباد ہوتے دیکھ رہے تھے اس کا تعلق خود اُن کو جتنا ہوگا دوسرا اندازہ بھی کیسے کرسکتا ہے۔ اور اس لئے ان کو اشخاص کے ذاتی تعلقات سے بھی کہیں زیادہ ادارہ کی اصلاح کی فکر تھی۔ لیکن کیا عرض کروں کہ اپنا تو گھر بار، دین و دُنیا، ملک و ملت سب ہی کے معاملات میں ایک ہی خیال اور ایک ہی تجربہ ہے کہ سارا فساد اشخاص و افراد ہی کا ہے۔ اور وہ بھی قالب سے بہت زیادہ قلب کا۔ اور دماغ سے بہت زیادہ دل کا۔ جب تک دلوں کی اصلاح و صفائی نہ ہو تا سعی جتنا بھی کیا جائے کہیں تعجب کی بات قطعاً نہیں کہ "چند آدمی بھی صاف دلی کے ساتھ باہم نہ رہ سکیں"۔ دل کا صاف ہونا ہی انسان اور انسانیت کے تمام دردوں کا واحد درمان ہے۔ اور دل کی صفائی یا قلب و باطن کے تزکیہ ہی کا نام تصوف ہے۔ نام کچھ رکھا جائے۔ لیکن کام سب سے اہم کرنے کرانے کا یہی ہے۔ خصوصاً اسلام کا نام لینے والوں کیلئے۔ یہ حقیقت جب سے "ایک مردِ کامل" کی جوتیوں تک پہنچکر اس ناقصوں کے ناقص کی سمجھ میں آئی تب سے جن اشخاص افراد۔ جماعات و ادارات سے تھوڑا بہت دُوری و نزدیکی کا تعلق رہا۔ سب سے کہتا ہی رہا۔ اور اپنی بساط بھری اُن چند دوستوں سے بھی عرض کرتا رہا۔ جن کا غم حضرت مرحوم کیلئے سوہانِ روح تھا کہ "چند آدمی بھی صاف دلی کیساتھ باہم نہ رہ سکیں"۔ اور بظاہر کچھ اثر بھی پڑا جس سے مرحوم کو کتنی مسرت ہوئی:۔

"آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے بڑی خوبی کیساتھ میرے رفیق قدیم کو جن کو میں اپنا قوتِ بازو سمجھتا ہوں آہستہ آہستہ ادھر سے اُدھر لگا دیا اور ان کی قوت کو راحت سے بدلنے میں کامیاب ہوئے۔ ماشاء اللہ بہت اچھا حال ہے کہ مجھے غبطہ آتا ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔"

پھر بعد مدت پورے ادارہ کی نسبت مزید مسرت کے ساتھ فرماتے ہیں کہ:۔

"بہرحال اب آپ ...... کو جو ہم لوگوں یا (فلاں) کے متعلق ہو دُور فرمائیے اور اپریل میں خود آکر ملاحظہ فرمائیے۔ ڈرتے نہیں گھبراتے ہیں[1]۔ سب لوگ یہاں خوش ہیں۔ مولوی صاحب سے بہت ہی خوشی سے ملتے ہیں۔ بیٹھتے ہیں باتیں کرتے ہیں ...... سب ہی سے تعلقات شگفتہ ہیں ...... اب آپ خوش ہو جائیے"!

اس خوشی اور خوش خبری پر اس ناکارہ کو بھی جیسی خوشی ہوئی ہوگی ظاہر ہے۔ مگر امید کی شاید یہ آخری چمک تھی کہ پھر اندھیرا ہی اندھیرا رہا۔

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود۔

میں تو خود اپنی "فضیحت" پر نظر کر کے دوسروں کی "نصیحت" ہی سے نہیں ادارہ کے تعلق سے بھی بالآخر منقطع ہو گیا اور خوش ہونے والے خوش ہوئے کہ کانٹا نکل گیا۔ سید صاحب کا دل بھی اتنا ٹوٹ چکا تھا کہ پھر ٹوٹ کر نہ جڑا۔ اور یہی دل شکنی بھوپال کے بعد کہیں پناہ نہ دیکھ کر بادل ناخواستہ پاکستان میں رہ پڑنے کا بڑا سبب ہوئی۔ ورنہ صرف جاہ و مال کی کوئی ترغیب نہ اُن کو بھوپال لے جا سکتی تھی نہ پاکستان۔ علم و دین کی خدمت اس وقت بھی ان کو وہاں ہی بناتی رہی۔ جبکہ اپنے لئے طالبعلمانہ گزر اوقات سے زیادہ قبول نہ فرماتے تھے۔

ایک موقع آیا کہ ایک بڑی ریاست نے دیکھا اچھا منصب پانسو ماہوار کے ابتدائی مشاہرہ کا پیش کرنا چاہا۔ میں نے بھی رائے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ قبول فرمانے ہی کی عرض کی ہوگی جس پر تحریر فرمایا کہ آپ اس تحریک میں حصہ نہ لیں اور آخر میں بڑی وجہ یہ لکھی کہ یہ ادارہ:-

"ایثار کے اصول پر قائم ہے۔ اگر میں آج پانسو دیکھ کر پھسل جاؤں تو کل دوسروں کو کیا کہوں گا۔

اس لئے مجھے ناکامی ہی کی زندگی بسر کرنے دیجئے"۔

یہ ایثار کا دعویٰ بھی مرحوم اپنے ساتھ لے گئے۔ کم و بیش ہمارے سارے ادارات ہی اسی طرح کے گوناگوں اخلاقی زوال و اختلافی اور باہمی کشمکش کا شکار رہیں تو کوئی ایک کیوں اور مستثنیٰ رہتا تاہم گو احقر کی نظر میں اپنے ابتدائی بلکہ درمیانی دور تک یہ ادارہ اپنی علمی خدمات اور باہمی حسن تعلقات کے اعتبار سے بڑی حد تک استثنائی نوعیت ہی کا رہا۔ لیکن حضرت مرحوم ہی کے ایک والا نامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بگاڑ پیدا اول ہی سے تھا۔ البتہ اُن کے حلم و صبر کی کرامت سے مرض کی شدت تک اُبھرنے نہ پایا۔

"برادر من! میں جس طرح بسر کر رہا ہوں میرا دعویٰ ہے کہ بہت سے احباب اس طرح چند سال بھی بسر نہیں کر سکتے۔ تاہم میں نے سترہ سال بسر کئے اور چاہتا ہوں کہ کسی دوسرے کو مجھ سے ٹھیس نہ لگے۔ اور جس طرح یہاں میں جسمانی اور روحانی آلام میں رہتا ہوں اُن سے نجات کی ہر وقت آرزو ہے ......"

"برادر من! میری حالت ہمدردی کے لائق ہے ملامت و عتاب کے لائق نہیں۔ میں اپنے رونے کا بھی آپ مالک نہیں۔ ع یاد آئے گی تمہیں میری وفا میرے بعد"

بعد کے خطوں میں اس طرح کے تاثرات برابر بڑھتے گئے جن کو پڑھ کر آج اُن کی وفا ہی بے طرح یاد نہیں آ رہی ہے بلکہ اپنی بے وفائی کی یاد اور روحانی ملامت تیر و نشتر بن رہی ہے۔ مگر کیا یہ ناکارہ اور کیا اس کی یاد! البتہ جن ہاتھوں میں مرحوم کی زندگی بھر کی علمی و دینی یادگار ہیں ہے وہ چاہیں تو ذرا وفادارانہ ایثار و اخلاص سے کام لے کر آپ سنبھال لے سکتے ہیں۔ ورنہ خود مرحوم تو الحمدللہ اپنے علم و عمل کا رُخ خدا و آخرت کی طرف پوری طرح موڑ چکے تھے۔ دُنیا اور دُنیا والوں کی رسمی یادگاروں کے بالکل محتاج نہیں رہے ہیں۔ اور قلب و نیت کے اس انقلاب کی برکت سے اُن کی علمی و عملی خدمات کا ہر حرف اور ہر قدم انشاءاللہ قیامت تک اُن کے حق میں خیر جاری کا چشمہ بنا اور اُن کے اعمال کے وزن بڑھاتا رہے گا۔

---

[1] اس کمزور کی ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ جس بگاڑ کے بناؤ پر قدرت نہ ہو اس سے دوری ہی میں عافیت دیکھتا ہے۔ قریب جاتے ڈرتا اور گھبراتا

یقین الدین احمد
(متعلم جامعہ رحمانیہ بنارس)

دربار ہرقل میں

(یہ بخاری شریف کی ایک لمبی حدیث کا ترجمہ ہے۔ اس کے راوی ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب کہ وہ ایمان نہیں لائے تھے۔ اور اسلام اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سخت دشمن تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہوں نے اس واقعہ کو بیان کیا۔)

(روم کا بادشاہ ہرقل اپنے دربار میں بیٹھا ہے۔ اُس کے درباری بھی صف باندھے کھڑے ہیں۔ بصرے کے امیر دربار میں داخل ہوتے ہیں اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط دیتے ہیں۔ ہرقل خط پڑھنے لگتا ہے۔)

ہرقل :- (خط پڑھنے کے بعد درباریوں کی طرف مخاطب ہو کر) یہاں اُس قوم کا کوئی شخص ہے جس میں یہ صاحب جو نبوت کا دعویٰ کرتے ہیں پیدا ہوئے ہیں۔

چند درباری :- (دست بستہ کھڑے ہو کر) حضور والا! اس قوم کے کچھ لوگ یہاں ہیں۔

ہرقل :- جاؤ انھیں دربار میں بلا لاؤ۔

(چند آدمی بلانے کے لئے نکلتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ابوسفیانؓ اور اُن کے ساتھیوں کو بلا کر لاتے ہیں۔ ابوسفیانؓ اور اُن کے ساتھی ہرقل کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں)

ہرقل :- تم لوگوں میں ان صاحب کا کوئی قریبی رشتہ دار ہے۔ جنہوں نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے ؟

ابوسفیان :- میں ہوں۔

ہرقل :- (ابوسفیان سے مخاطب ہو کر) تم اپنے ساتھیوں سے آگے آ کر بیٹھو۔

(ابوسفیان آگے جا کر بیٹھتے ہیں)

ہرقل :- (درباریوں سے مخاطب ہو کر) ترجمان کو بلاؤ۔

(ترجمان اندر داخل ہوتا ہے)

ہرقل :- (ترجمان سے) تم ان سے کہہ کہ میں اُن صاحب کا حال معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے خدا کے نبی ہونے کا دعویٰ کیا ہے بس یہ (ابوسفیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اگر اُن کے بارے میں کوئی جھوٹی بات کہے تو اس کے ساتھی فوراً اس کی تردید کردیں۔

ہرقل :- (ترجمان سے) اب اس سے پوچھو کہ اُن صاحب کا خاندان کیسا ہے ؟

ابوسفیان :- اُن کا خاندان نہایت اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ شریف گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔

ہرقل :- اُن کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے ؟ ابوسفیان :- نہیں۔ کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔

ہرقل :- اچھا یہ بتاؤ کہ پیغمبری کے دعوے سے قبل تم لوگوں نے انھیں کبھی جھوٹ بولتے ہوئے سُنا ؟

ابوسفیان :- نہیں، ہم نے کبھی بھی انھیں جھوٹ بولتے ہوئے نہیں دیکھا۔

ہرقل :- ان صاحب کی پیروی کرنے والے امراء اور متکبر لوگ ہیں یا مسکین اور غریب طبع ؟

ابوسفیان :- ابھی تک تو اُن کی پیروی عموماً غریبوں ہی نے کی ہے۔

ہرقل :- تابعداروں کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے ؟ ابوسفیان :- روز بروز بڑھ رہی ہے۔

ہرقل :- اُن کے دین میں آنے کے بعد پھر اُسے بُرا سمجھ کر کوئی مرتد تو نہیں ہوا ؟

ابوسفیان :- نہیں کوئی مرتد نہیں ہوا۔

ہرقل :- کبھی تم لوگوں نے اُن سے جنگ بھی کی ؟ ابوسفیان :- ہاں۔ جنگ ہوئی ہے۔

ہرقل :- جنگ کا انجام کیا ہوا ؟

ابوسفیان :- ہماری جنگوں کا حال ڈول کی طرح ہے۔ کبھی ان کی فتح ہوتی ہے اور کبھی ہماری۔

ہرقل :- وہ عہد شکنی کرتے ہیں ؟

ابوسفیان :- اب تک تو انہوں نے عہد شکنی نہیں کی ہے۔ مگر حال ہی میں ایک مدّت کے لئے ہمارے اور اُن کے درمیان صلح ہوئی ہے۔
دیکھیں اس مدّت میں وہ کیا کرتے ہیں۔

ہرقل :- اچھا اور ایک بات بتاؤ۔ اُن کے خاندان میں اُن سے قبل بھی کسی نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے ؟

ابوسفیان :- اُن کے خاندان میں اس سے قبل کسی نے پیغمبری کا دعویٰ نہیں کیا۔

ہرقل :- (ترجمان سے۔ تم اس سے۔ ابوسفیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کہو کہ میں نے اُن صاحب کا خاندان پوچھا تو تم نے بتایا کہ
"ان کا خاندان نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔" پس پیغمبروں کا ہمیشہ سے یہی حال ہے کہ وہ شریف گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔
پھر میں نے پوچھا کہ "آیا اُن کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے ؟" تو تم نے کہا "نہیں"۔ میں نے یہ سوال اس لئے
کیا تھا کہ اُن کے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ ہوا ہوتا تو میں یہ خیال کرتا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی بادشاہت کے خواستگار ہیں۔
پھر میں نے یہ سوال کیا۔ "اُن کی اتباع امراء اور متکبر لوگ کر رہے ہیں یا مسکین اور غریب طبع" ؟ تو تم نے جواب دیا۔ "غرباء
اتباع کر رہے ہیں" اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ابتداء میں رسولوں کے تابعدار غرباء ہی ہوا کرتے ہیں۔
پھر میں نے تم سے دریافت کیا۔ "تم لوگوں نے انھیں نبوّت کے دعوے سے قبل جھوٹ بولتے ہوئے بھی سنا ؟" تو تم نے
جواب دیا "نہیں"۔ اس سے میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ جو شخص لوگوں کے بارے میں جھوٹی باتیں نہیں کہتا وہ خدا کے
بارے میں کس طرح جھوٹی بات کہہ سکتا ہے۔ کہ میں خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔
پھر میں نے تم سے پوچھا "کیا اُن کے دین میں داخل ہونے کے بعد اُسے بُرا سمجھ کر کوئی مرتد ہوا ہے" تو تم نے کہا۔ "نہیں"۔
ایمان کی یہی شان ہے کہ جب وہ قلوب میں گھر بنا لیتا ہے تو پھر نکلتا نہیں۔
پھر میں نے تم سے سوال کیا۔ "اُن کے متبعین بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں ؟" تو تم نے بتایا۔ "بڑھ رہے ہیں"۔ —
ایمان کا یہی حال ہے کہ وہ بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی حد کو پہنچ جاتا ہے۔
پھر میں نے تم سے دریافت کیا۔ "تم لوگوں میں جنگ ہوئی ہے ؟" تو تم نے جواب دیا۔ "جنگ ہوئی ہے، اور نتیجہ کے

بارے میں تم نے بتایا: "کبھی ہم فتحیاب ہوئے اور کبھی وہ"۔ ہمیشہ کا یہ دستور ہے کہ رسول اسی طرح آزمائے جاتے ہیں اور آخر میں کامیابی انہی کی ہوتی ہے۔

پھر میں نے تم سے پوچھا: "انہوں نے کبھی عہد شکنی کی ہے؟" تو تم نے جواب دیا "نہیں"۔ پیغمبروں کی یہی صفت ہوتی ہے کہ وہ کبھی بھی بے وفائی نہیں کرتے۔

پھر میں نے تم سے دریافت کیا: "اُن کے خاندان میں پہلے بھی کسی نے پیغمبری کا دعویٰ کیا ہے" تو تم نے کہا "نہیں"۔ اس سوال سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس سے قبل کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ بھی اسی کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

ہرقل:- اب یہ بتاؤ کہ وہ کہتے کیا ہیں؟ کس چیز کے کرنے کا حکم دیتے ہیں؟

ابوسفیان:- وہ کہتے ہیں کہ نماز پڑھو۔ روزہ رکھو۔ صلہ رحمی کرو اور بدکاری سے بچے رہو۔

ہرقل:- اگر تم نے یہ سچی بات کہی ہے تو یقین رکھو کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس لئے کہ خدا کی کتابوں کے ذریعہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ خدا کے ایک آخری نبی آنے والے ہیں۔ مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ تم لوگوں میں پیدا ہوں گے اور عرب نسل سے ہوں گے اگر مجھے اس بات کا یقین ہوتا کہ میں اُن کے پاس پہنچ جاؤں گا اور میری رعایا میری راہ کا روڑا نہ بنے گی تو اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اُن کے پائے مبارک کو دھوتا۔ دیکھنا ایک دن آئے گا کہ یہ ملک شام بھی اُن کے زیر نگین ہو گا۔

ہرقل:- (آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط نکالتا ہے اور باآواز بلند پڑھنے لگتا ہے۔)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ خط محمد رسول اللہ کی جانب سے روم کے بادشاہ ہرقل کے نام ہے۔ جن لوگوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا اُن پر سلامتی ہو۔ بعد حمد کے اے بادشاہِ روم! میں تمہیں اسلام کے اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہوں اگر دُنیا اور آخرت کی سلامتی چاہتے ہو تو اسلام قبول کرو۔ اگر تم نے اسلام قبول کر لیا تو تمہیں دوہرا ثواب ہوگا۔ اور اگر تم نے میری بات نہ مانی تو یاد رکھو کہ تیری رعایا کے کفر کا گناہ تیرے سر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں تسلیم کی گئی ہے۔ اس کی طرف آؤ۔ وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کیساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں۔ اور ہم سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ (اے محمدؐ) اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔"

ہرقل خط پڑھ چکتا ہے تو درباری شور وغل مچانے لگتے ہیں۔ اُن کو گمان ہوتا ہے کہ ہرقل مسلمان ہوجائیگا۔ ہرقل، ابوسفیان اور اُن کے ساتھیوں کو جانے کی اجازت دیتا ہے۔ وہ لوگ جب باہر نکلتے ہیں۔ تو ابوسفیان کہتے ہیں۔ کہ "محمدؐ کا درجہ تو بہت بلند ہو گیا۔ یہاں تک کہ روم کا بادشاہ بھی اُن سے ڈرتا ہے۔"

ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ کو بیان کرتے وقت کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے ہمیشہ یہ یقین رہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم غالب ہو کر رہیں گے۔ یہاں تک کہ خدا نے مجھے توفیق دی اور میں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

ماہر القادری

کچھ اپنے بارے میں

ماہنامہ کی ادارت کا تجربہ مجھے پاکستان میں آکر ہی ہوا۔ اس سے پہلے تو میں فلمی اصطلاح میں "فری لانسر" تھا۔ مشاعرے، کتابوں کا مطالعہ۔ مضمون نگاری اور شعرگوئی۔ یہ میرے مشاغل تھے۔ پھر میں ان میں سے کسی بات کا پابند نہیں تھا۔ جس مشاعرے میں دل چاہا اور شرائط حسب مرضی طے ہوگئیں۔ تو چلا گیا ورنہ انکار کردیا۔ مضمون نگاری، شعرگوئی اور کتابوں کے مطالعہ کا بھی تعلق فرصتِ اوقات اور شوق وطبیعت سے تھا۔ کسی بات کی پابندی نہیں تھی کہ یہ کام مجھے لازماً کرنا ہی چاہیئے۔ کبھی کبھار مشاعروں کے طرحی مصرعوں پر البتہ غزلیں کہنی پڑتی تھیں اور ان کو بھی میں اکثر ٹال جاتا تھا۔

انھی زمانے میں چونکہ فرصت میسّر تھی۔ اس لئے دوست احباب کے خطوں کے جواب اچھے خاصے طویل ہوجاتے۔ مضمون نگاری کا بھی یہ عالم تھا کہ کسی ایڈیٹر کا مضمون نگاری کے لئے خط آیا اور دوسرے تیسرے دن مضمون تیار کرکے ڈاک کے حوالے کر دیا۔ پچھلے دَور میں نہ جانے کتنے بہت سے لوگوں کے کلام پر مشورہ دیا ہے اور نثر کی بڑی بڑی کتابوں پر نظرِ ثانی کی ہے۔

فاران کی ادارت سنبھالنے کے بعد مصروفیت بڑھ گئی۔ بلکہ بڑھتی ہی رہی۔ ایک ایڈیٹر جس کا کوئی قلمی معاون بھی نہ ہو۔ اس کے اوقات جتنے بھی مصروف ہوں۔ کم ہیں۔ اس لئے وہ جو لمبے لمبے خط لکھنے کی عادت تھی، اُسے چھوڑ دینا پڑا اور بعض احباب نے اس تبدیلی کو وضعداری کے خلاف سمجھا اور کسی کسی نے اثر بھی لیا۔

اب میں کس کس کو بتاؤں کہ کتنے بہت سے خطوں کا مجھے روزانہ جواب دینا پڑتا ہے اور اگر ہر خط کا پہلے کی طرح مفصل جواب دوں تو شاید سارا وقت خطوط نویسی کی ہی نذر ہوجائے۔ مجھے اب اس کا اندازہ ہوا کہ جو بات چند سطروں میں بیان کی جاسکتی ہے یار لوگ اسے صفحوں میں پھیلا دیتے ہیں۔ اور جو حضرات لمبے لمبے خط لکھنے کے عادی ہیں اُن کے پاس یقیناً بہت کچھ فاضل وقت ہوتا ہے یوں سمجھیئے کہ خطوط نویسی وقت کاٹنے اور دل بہلانے کا ایک مشغلہ ہے۔

مجھے مشاہیر میں نواب حبیب الرحمٰن شیروانی مرحوم کے خطوط سب سے زیادہ پسند آئے کہ اُن کے خط میں چند سطریں ہوتی ہیں مگر کس قدر جچی اور تُلی ہوئیں۔ صرف کام کی باتیں۔ حشو وزاید ایک حرف نہیں۔ اور سب سے بڑھکر یہ کہ ان مختصر و مفید خطوط میں شستگی اور روانی بلا کی ہوتی ہے۔

یہ خطوط ؟؟؟

اپنی تعریف سے کون خوش نہیں ہوتا۔ مجھے بھی بے نفسی اور بے نیازی کا دعویٰ نہیں ہے۔ مگر بعض تعریفی خطوط پر ضمیر چٹکی لیتا ہے کہ نفس کے لئے یہ کتنا بڑا فتنہ ہے۔ جو ڈاک کی راہ سے آرہا ہے۔ اور ان تعریفوں سے خوش ہو ہو کر کتنا اجر ہے جس کا بھگتان اسی دُنیا میں ہوجائے گا۔ اور آخرت میں کورا جواب دے دیا جائے گا کہ فلاں نیکی کا اجر تو تم نے دُنیا ہی میں وصول کرلیا۔

تعریف و توصیف کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں اور شاعروں، انشا پردازوں، لیڈروں اور فن کاروں کی عوام تعریف کرتے

ہی رہتے ہیں۔ لیکن کسی دینی رسالہ کے ایڈیٹر کی اس انداز میں تعریف جیسے وہ ایڈیٹر "عرفان وولایت" کے بلند منصب پر فائز ہے اور مسیح مع مجددین اور مصلحین کا کام انجام دے رہا ہے۔ مدح وستائش کے اس انداز میں چاہے کتنا ہی خلوص کیوں نہ شامل ہو۔ مگر نفس کے لئے یہ ہے بہت بڑا فتنہ۔ اگر اس فتنہ کا نفس خدانخواستہ شکار ہوجائے تو پھر پستی اور گراوٹ کی کوئی حد باقی نہیں رہ سکتی۔ اچھا خاصا آدمی "جہل مرکب" بن کر رہ جاتا ہے۔ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس قسم کے خطوط پر میری غیرت کو ندامت کے مارے پسینہ آجاتا ہے۔

بعض خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن میں ایڈیٹر کو تعریف کی رشوت دی جاتی ہے۔ کہ آپ کی نظم ونثر کا جواب نہیں۔ آپ یہ ہیں۔ آپ وہ ہیں۔ مگر اس "تشبیب" کے بعد "گریز" یہ کہ "اپنی ایک غزل" فاران" میں اشاعت کے لئے بھیج رہا ہوں"۔ "غزل" نہ پوچھئے کہ کیا ہوتی ہے۔ انمل بے جوڑ۔ بے ربط۔ صرف موزوں مصرعے جوڑے ہوئے۔ شعریت کا نام کبھی کہیں پتہ نہیں۔ ایسے خطوط پڑھ کر طبیعت جھنجلا جاتی ہے اور ہاتھ انھیں چاک کرنے میں ذرا سا تامّل بھی نہیں کرتے۔

بعض ایسے خطوط بھی میرے پاس آتے ہیں۔ جن میں ناموزوں مصرعے درج ہیں۔ اور ان پر اصلاح اور نظر ثانی کی اس انداز میں درخواست کی گئی ہے کہ اگر آپ نے میرے کلام کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا تو میرا شاعرانہ مستقبل ہمیشہ کے لئے تباہ ہوجائے گا۔ اور کیا عجب ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔ کیا بتاؤں کہ ایسے خطوں کے جواب میں طبیعت پر کتنا جبر کرنا پڑتا ہے!

بعض کرم فرما اپنا تعارف اس طرح کراتے ہیں کہ اب سے پندرہ سال پہلے فلاں مقام پر جو مشاعرہ ہوا تھا تو وہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اور ساتھ مل کر چائے بھی پی تھی۔ آپ کو یاد تو ہوگا۔ وہ لمحے کتنے قیمتی تھے۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ "مشاعروں اور جلسوں کی ایسی ملاقاتیں کس کو یاد رہ سکتی ہیں۔ اس قسم کے مکاتیب کے جواب میں قدرے "سیاست" سے کام لینا پڑتا ہے جواب دیتا ہوں۔ "ہاں! بھائی۔ وہ زمانہ خوب تھا۔ بڑی بے فکری اور خوشی کا دَور تھا۔ آپ کی تحریر نے دبی ہوئی چوٹوں کو اُبھار دیا۔۔۔۔۔۔" مگر میں اس قسم کے خطوط کے جواب میں یہ غلط بات کبھی نہیں لکھتا کہ آپ مجھے یاد ہیں۔ یا میں آپ کو اب تک نہیں بھولا۔ میرے اس گول مول جواب سے کوئی پھر بھی غلط فہمی میں مبتلا رہے تو یہ اُس کی ذہانت کا قصور ہے!

بعض مضمون نگار جب مضمون بھیجتے ہیں اور میں اُن کو یہ جواب دیتا ہوں کہ "آپ کا مضمون فاران کے معیار کے مطابق ہوگا تو چھپ جائے گا۔ یاددہانی کی ضرورت نہیں"۔ تو حیرت ہوتی ہے کہ میرے جواب کا اصل مفہوم اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے غبی اور کند ذہن لوگوں کی تحریر ونگارش میں ذہانت، شوخی اور اوریجنلٹی کیا ہوسکتی ہے۔؟ اب رہا لکھنے لکھانے کا سوال۔ تو جس کے ہاتھ میں قلم ہے اور لکھنے کے لئے کاغذ میسّر ہے۔ وہ جو چاہے لکھ سکتا ہے۔ اور ہمارے یہاں رسالوں اور اخباروں کی وہ بھرمار ہے کہ اس قسم کی چیزیں اُن میں چھپتی بھی رہتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے مضامین جب دُوسرے رسالوں میں شائع ہوجاتے ہیں۔ مگر فاران میں نہیں چھپتے۔ تو وہ حضرات یہ تیر تکے لڑاتے ہیں کہ "فاران" کے ایڈیٹر نے رشک ورقابت کے سبب ہمارے مضامین اپنے یہاں شائع نہیں کئے۔ وہ دُوسروں کی ترقی اور ناموری سے جلتا ہے۔ اور نئی شخصیتوں کا اُبھرنا پسند نہیں کرتا۔

بعض حضرات اپنا کلام اور مضامین بھیج کر پُوچھتے رہتے ہیں کہ ہماری شاعری اور مضمون نگاری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہ کام بھی خاصا وقت چاہتا ہے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دُوسروں کی دل شکنی کے خیال سے طبیعت میں بڑی گھٹن ہوتی ہے۔ بعض حضرات کو تو میں نے جی کڑا کر کے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ قدرت نے آپ کو شاعر پیدا ہی نہیں کیا۔ آپ کوئی اور کام کیجئے۔ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے تنہائی میں یا اپنے دوستوں کی محفل میں مجھے ملاحیاں ہی سنائی ہوں گی۔ خیر خواہی کے

مشوروں کی قدر کون کرتا ہے۔ لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں اُس کی تائید کی جائے۔ بس کسی کو ٹوکنا اور مفید مشورہ دینا غضب ہے! اس دُنیا میں ہر کوئی اپنے کو "بقراط" سمجھے ہوئے ہے۔ اقبال آج زندہ ہوتے تو لوگوں کی "اُبھری ہوئی خودی" کو دیکھ کر انھیں شاید "نفیِ خودی" پر کوئی نظم کہنی پڑتی!

بعض خطوں میں لوگ پوچھتے ہیں:-

"کاغذ کا کیا بھاؤ ہے؟ فلاں کتاب نہیں ملتی آپ خرید کر بھیج دیجئے۔ کیا آپ میرے حج کے پاسپورٹ کے لئے سفارش نہ کردیں گے؟ میرے پاس اتنے ناول لکھے ہوئے موجود ہیں۔ اُن کا کسی پبلشر سے معاملہ کرا دیجئے۔ میں ان صاحب کو بھیج رہا ہوں۔ اور .... (مکتوب نگار کا نام پڑھ کر کچھ نہیں کھلتا یہ کون صاحب ہیں؟ اُن سے کہاں کی جان پہچان ہے؟ اور اُس پر بے تکلفی کا یہ عالم جیسے ان حضرات سے بڑی گہری دوستی ہو ....)

آدمی ہر کسی کو مطمئن اور خوش کر بھی کیسے سکتا ہے۔ مجھے ان معاملات میں اپنی نا اہلیت کا اعتراف ہے؟

تھوڑا بہت تجربہ تو پہلے بھی تھا۔ مگر "فاران" کی ادارت نے معلومات میں اضافہ کر دیا۔ کہ عوام و خواص کی اکثریت "شہرت" اور نام و نمود کی ہوس میں مبتلا ہو۔ ہر کوئی مشہور ہونا اور نامور بننا چاہتا ہے۔ اور مضمون نگاری اور شاعری کو یار لوگوں نے شہرت کا سب سے زیادہ آسان اور سہل الحصول ذریعہ سمجھ رکھا ہے۔ غضب خدا کا بعض اچھے خاصے اہلِ علم نے معروف اور آسان بحروں میں ناموزوں اشعار کہے ہیں اور کتابی شکل میں چھپوائے ہیں۔

میرے پاس کبھی کبھار ایسے خطوط بھی آتے رہتے ہیں جن میں مجھ پر نقد و احتساب بھی ہوتا ہے اور کسی کسی خط میں کافی تلخ جملے بھی ہوتے ہیں۔ مدح و ستائش کے ہنگامہ میں ایسی آوازیں چاہے کتنی ہی نامانوس اور ناگوار کیوں نہ ہوں مگر وہ دماغی توازن قائم رکھنے میں بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

میں سمجھتا ہوں ہر ایڈیٹر کی ڈاک ایسی ہی رنگارنگ اور متنوع ہوتی ہوگی۔ ڈاک کا پڑھنا اور اُس کا جواب دینا اگرچہ دلچسپ مشغلہ ہے۔ مگر ساتھ ہی صبر آزما بھی ہو۔ اور یہ بھی ہے کہ جس دن طبیعت شگفتہ ہوتی ہو تو جوابات میں اختصار کے باوجود روانی پائی جاتی ہو۔ اور جس دن طبیعت میں انقباض ہوتا ہے تو خطوں کے جواب میں بھی ایک طرح کی گھٹن سی پیدا ہو جاتی ہو۔ یہ تو میں نے چند جھلکیاں پڑھنے والوں کو دکھا دی ہیں۔ ورنہ یہ داستان تو بہت طویل ہو۔ آٹھ سال کی مدت کا تجربہ چند صفحوں میں سما بھی کہاں سکتا ہے!

لختے زحالِ خویش بہ کاغذ نوشتہ ایم!

فضا ابن فیضی

کائنات

(ایک تبصرہ)

تخلیق سے پہلے:

روش روش پہ خموشی تھی، جوئبار خموش
نسیم و نکہت و نزہت کے آبشار خموش

غمِ سکوت میں ڈوبا تھا لحنِ ساز ابھی
کہ پرِ غنچاں نہ تھی روحِ نیاز و ناز ابھی

افق سے دور کہیں آفتاب سوتا تھا
اداس چاند مقدر کو اپنے روتا تھا

نہ ربطِ خاص تھا کچھ برگِ گل کو شبنم سے
یہ زخمِ دل ابھی ناآشنا تھے مرہم سے

کرن سے سینۂ شبنم میں ارتعاش نہ تھا
صدف پہ اپنے گہر کا مقام فاش نہ تھا

تھا جن کا ایک تبسم بہارِ خلدِ بریں
ہنوز وہ گل و لالہ نہاں تھے زیرِ زمیں

نگاہ فیضِ تجلی سے تھی ابھی محروم
کلی کو رازِ شگفتن ابھی نہ تھا معلوم

لہو ہنوز نہ دوڑا تھا نبضِ امکاں میں
کوئی سحر نہ تھی بیدار خاورستاں میں

نہ ایسا فرقِ مراتب دن اور رات میں تھا
بس ایک چاکِ گریبانِ کائنات میں تھا

تخلیق کے بعد:

فضائے ارض و سما جلوہ آفریں اتنی
یہ کائنات تو پہلے نہ تھی حسیں اتنی

ذرا سی بھی جو ستاروں نے آنکھ جھپکائی
خمِ افق سے نبیذِ سحر چھلک آئی

ہر ایک ڈوبی ہوئی نبض میں لہو آیا
زمیں پہ نیرِ اعظم نے نور برسایا

خود اپنے زخموں کا منہ چومنے لگے مرہم
کرن کی لَو سے دھڑکنے لگا دلِ شبنم

یہ آب و گل کے مہکتے ہوئے صنم خانے
چلی ہے موجِ ہوا نکہتوں کو بہلانے

چمن میں قافلۂ سبزہ و نسیم آئے
فروغِ نور سے نابود ہو گئے سائے

سرور و کیفیت و رنگ و بو کے میخانے
چھلک پڑے ہیں دماغ و نظر کے پیمانے

ارم طراز ہے دشت و جبل کی ویرانی
نوا فروش ہے خاموشیوں کی طغیانی

ضمیرِ کوکب و مہتاب تیرہ ناک نہیں
کہ آب و گل کے گریباں میں کوئی چاک نہیں

انسان عہد رفتہ میں:۔

وہ روحِ حکمت و رنگِ جمالِ یکتائی
حریمِ قدس میں جس کی ہوئی پذیرائی

گماں اس کی جلو میں یقین تک آئے
کہ جبرئیلِ امیں بھی زمین تک آئے

اسی کی فکر سے ٹوٹا فسونِ تیرہ شبی
بجھا اسی کے نفس سے چراغ بو لہبی

فرشتہ صید رہا یہ بغیرِ ناوک و تیر
ہیں اس کے زلہ ربا جبرئیل پاک ضمیر

کہاں یہ اور کہاں شیوۂ زبونِ حیات
اسی نے عام کیا سوزِ اندرونِ حیات

خرد پہ راز دو عالم ہے آشکار اس سے
جنوں ہی جوشِ تپیدن سے ہمکنار اس سے

یقین و علم سے عقبیٰ کو روشناس کیا
ترے وجود سے دُنیا کو روشناس کیا

ہر اک نظر تھی گہرِ سنج و کامراں اس کی
بہار چہرے پہ ملتی رہی خزاں اس کی

انسان عہد حاضر میں:۔

سحر گزر گئی خود روشنی کو ٹھکرا کر
پلی ہے رات مہ و کہکشاں کا غم کھا کر

سیاہ راتوں سے سورج ہیں مطمئن کتنے
سیاہیوں کی طرف مڑ گئے ہیں دن کتنے

جھلک رہا ہے لہو زرفشاں کُلاہوں میں
نمود فتنے کی ہوتی ہے خانقاہوں میں

خود آگہی و خودی کے ایاغ ٹوٹ گئے
ہوائے تند سے لڑ کر چراغ ٹوٹ گئے

غریقِ زہرِ ہلاہل ہوئے سفینہ نوش
خضر کے بھیس میں ہیں کس قدر ضمیر فروش

وہ جس کے دل میں چمکتے تھے معرفت کے نجوم
وہی ہے اب نفسِ جبرئیل سے محروم

نفاق و بغض و عداوت کا زہر رستا ہے
کہ آدمی ہی خود اب آدمی کو ڈستا ہے

زمیں کے دوش پہ فکر و عمل کے ہیں تابوت
یہ مقبرہ ہے الٰہی! کہ عالمِ ناسوت

نفس نفس ہے یہاں غرق عیش و مستی میں
تری زمین دھنسی جا رہی ہے پستی میں

بجائے گُل کوئی کانٹے ہی بو گیا ہے کیا؟
بتا اس عہد کے انساں کو ہو گیا ہے کیا؟

تہذیب زہراب

عاصی کرنالی

دوسری بار جو شیطاں نے لگایا دربار
یوں کیا اپنے وفا پیشہ مریدوں سے خطاب

ہم کو پھر جائزہ اعمال کا ہے مدِّ نظر
ہم کو پھر دیجئے آپ اپنی مساعی کا جواب

کس نے تخلیق کیا فتنہ و شر کا ماحول
کس سے برباد ہوئی کارگہِ خیر و ثواب

کون ہے حیلۂ تحریف میں تم پر فائق
کس کی کوشش نے کیا آدمِ خاکی کو خراب

ایک چیلے نے کہا "ایک پسر کے دل میں
اختلافات کے پیدا کئے میں نے اسباب

اپنے والد کی اطاعت سے کیا اس نے گریز
نہ وہ تعظیم رہی دل میں، نہ غیرت نہ حجاب

میری تلقین جو پہنچی تو وہ گستاخ ہوا!
مجھ سے دشنام جو سیکھی تو وہ بھولا آداب

ایک شاگرد نے کی عرض کہ اک مصلحِ قوم
جس کے اخلاص و دیانت کی نہ حد تھی نہ حساب

جس کی تدبیر سے تھا چشمۂ ایماں جاری
جس کے افکار سے تھی قوم کی کھیتی سیراب

میں نے دکھلائے اُسے مکر و ریا کے جلوے
میں نے چمکائے نمائش کے نجوم و مہتاب

ریت تعمیر کی بنیاد میں بھر دی میں نے
میں نے اک موجۂ طوفاں کو کیا موجِ سراب

ایک درباری بدکیش نے مسند چومی
اور کی عرض کہ "اے شاہِ معلّیٰ القاب

میں نے اک عابد و زاہد کو بنا کر بے ذوق
بسط کو قبض کیا اور حضوری کو غیاب

میں نے برباد کیا اس کی عبادت کا خلوص
میں نے بے آب کیا اس کی نمازوں کا شباب

نہ وہ سجدے رہے جاری، نہ وہ تکبیر و اذاں
نہ وہ مسجد رہی باقی، نہ وہ بام و محراب

میں نے دستارِ تقدّس میں نچوڑے انگور
میں نے سجّادۂ تقویٰ کو کیا غرقِ شراب

تھا بہت زود اثر پیرِ مغاں کا دارو
پیتے ہی جاگ گئے شیخِ حرم کے اعصاب

ایک مقرّب، کہ تھا غمگین و ملول و خاموش
نہ تکبّر، نہ تفاخر، نہ تکلّم، نہ جواب

سہمی سہمی سی نظر، خوف زدہ سا چہرہ
کسی احساس میں غلطاں، کسی دھن میں غرقاب

اُس نے پایا جو اشارہ تو ندامت سے کہا
اپنی کوشش کے بیاں سے مجھے آتا ہے حجاب

ایک لڑکا کہ تھا مکتب سے گریزاں، میں نے
علم کا شوق اُسے دیکے کیا محوِ کتاب

اتنا سُننا تھا کہ شیطاں نے لگایا نعرہ
زندہ باد اے مری محفل کی متاعِ نایاب

اے کہ روشن ہیں تری عقل پہ اسرارِ خفی
اے کہ حاصل ہے تجھے مرتبۂ کشفِ حجاب

تُو نے اس راز کو پایا ہے مری جانِ عزیز
ایک مدّت سے ہوں خود جس کیلئے میں بیتاب

آج کے علم سے چھا جاتی ہے دل پر ظلمت
آج کا علم ہے آدم کی نگاہوں کا حجاب

یہ خدایانِ مدارس، یہ اکابر یہ شیوخ
میرے افکار کی تعبیر ہیں یہ اہلِ کتاب

دہرِ حاضر کے علوم ان کو سکھائے جاؤ
ابنِ آدم کو پلاتے رہو شیریں زہراب!

رنگا رنگ

قمر مرادآبادی

ترا خیال مقیّد تری نظر محدود
ملے گی کیسے تجھے راہِ منزلِ مقصود

نہ رکھ نماز کو محدودِ منبر و محراب
کہ دار پر بھی ہیں ممکن یہ سب رکوع و سجود

تو فرقِ ظاہر و باطن میں کیوں الجھا ہے
ترا مقامِ محبت نہ غیب ہے، نہ شہود

نفس نفس کو تو آزادِ دو جہاں کر دے
نظر نظر کو بنا زندگی میں لامحدود

وفا کو چاہیے اب بھی وہ جذبۂ بیباک
کہ جس سے بنتی ہے گلزار آتشِ نمرود

تری چشمِ فتنہ زا کو نہ سمجھ سکا زمانہ
کہیں بن گئی حقیقت کہیں بن گئی فسانہ

مرے دل سے کھیلتے ہیں شب و روز حوادث کیسے
تری زلف سے نہ الجھی کبھی گردشِ زمانہ

ترے جور بے اماں پر کبھی اُف نہ کی کسی نے
مرے مُنہ سے آہ نکلی اُسے لے اُڑا زمانہ

ابھی سامنے نہ آؤ کہ ہیں بے شعور نظریں
مری سمت ابھی نہ دیکھو کہ ہے بدگماں زمانہ

حباب ترمذی

گریزاں جن سے راہِ زندگی میں اک زمانہ ہے
کسے معلوم اُنھیں کانٹوں میں پھولوں کا خزانہ ہے

رہائی کا زمانہ بھی اسیری کا زمانہ ہے
چمن اپنا نہ گُل اپنے نہ اپنا آشیانہ ہے

نگاہِ حُسن ہے محجوب اپنی کامرانی پر
شکستِ عشق در پردہ شکستِ فاتحانہ ہے

دلِ ناعاقبت اندیش تجھ کو کون سمجھائے
جُدائی کا زمانہ ہی محبّت کا زمانہ ہے

تمہیں بھی کیا کبھی میری وفائیں یاد آتی ہیں؟
مجھے تو آج بھی تم سے محبّت والہانہ ہے

نذیر مرادآبادی

نگاہ دیکھ تو سکتی ہے کیا نقاب میں ہے
مگر وہ حُسن کہ جو چشمِ انتخاب میں ہے

غمِ حیات غمِ آرزو نہ بن جائے
تری نگاہ کی گردش بھی انقلاب میں ہے

اس التفاتِ تبسم کا شکریہ لیکن
مرا سکون ترے دل کے اضطراب میں ہے

سعید عزمی

ترے لطیف دلاسوں کا شکریہ لیکن
حیات و موت کے مابین فاصلہ کم ہے

مزاجِ یار غضبناک ہو گیا ہو گا
کہ زلفِ دہر کا ہر پیچ آج برہم ہے

سمجھ حقیر نہ کانٹوں کو بے سبب عزمی
انہیں کے ہاتھ میں شادابیوں کا پرچم ہے

روحِ انتخاب

خواجہ نظام الملک کی طبیعت میں سوز و گداز اور خدا کا خوف بہت تھا اور آخرت کا کھٹکا اُس کو دنیا سے زیادہ رہا کرتا تھا۔ اس لئے خواجہ نے ارادہ کیا کہ ایک محضر تیار کروں جس پر تمام رعایا، اور امراء اور علماء کے دستخط ہوں اور اگر وہ تصدیق کر دیں کہ میں نے کوئی ظلم و زیادتی نہیں کی ہے تو قیامت کے دن یہ محضر میرے حق میں رہائی کا پروانہ ہوگا۔ چنانچہ اس خیال کے مطابق اُس نے دستخط ہونا شروع کئے۔ لوگوں نے بڑے لمبے چوڑے الفاظ میں خواجہ کی تعریف لکھی لیکن جب وہ محضر شیخ ابو اسحٰق کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے یہ مختصر جملہ لکھا "خیر الظلمۃِ حسنٌ" یعنی اور سب ظالموں میں حسن (خواجہ نظام الملک کا نام حسن تھا) اچھا ہے۔ جب خواجہ نے یہ فقرہ دیکھا تو اس کو نہایت رقت ہوئی اور کہنے لگا کہ ابو اسحٰق سے زیادہ کسی عالم نے صحیح نہیں لکھا ہے!

خواجہ نظام الملک کا قانونِ سلطنت

جب لوگ شریعت کی پابندی چھوڑ کر دین و مذہب کا خاکہ اڑانے لگتے ہیں اور خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے ہیں اُس وقت وہ اُن کے اعمال کی سزا دینا چاہتا ہے اور بجائے عادل اور مہربان بادشاہ کے ظالم حکمراں مسلط کرتا ہے۔ اس دورِ انقلاب میں خون کی ندیاں بہہ جاتی ہیں اور گناہگار اپنے کرتوتوں کی سزا پاتے ہیں اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ "جب نیستاں میں آگ لگتی ہے تو اول وہ خشک چیزوں کو جلاتی ہے پھر ہمسایگی کے طفیل میں تر و تازہ چیزیں بھی جل کر راکھ ہو جاتی ہیں......"

رعایا میں جو لوگ حقوقِ نعمت کو نہ پہچانیں اور پُر امن زمانے کی قدر نہ کریں بلکہ بدنیتی سے سرکشی پر آمادہ ہوں تو اُن کو سزا دی جائے لیکن سزا کا پیمانہ جرم کے مطابق رہے۔ آسمان ہمیشہ نئے رنگ لایا کرتا ہے اور سلطنت کو ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل کر دیتا ہے۔ اس دورِ انقلاب میں شریف پامال اور مفسد طاقتور ہو جاتے ہیں اور جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ امارت کا درجہ برائے نام رہ جاتا ہے کیونکہ ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ میں بادشاہ اور وزیر کا لقب اختیار کر لوں اور اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا کہ ہم اس کے مستحق بھی ہیں یا نہیں۔ جب ایسا ہنگامہ ہوتا ہے تو سلطنت اور شریعت میں ضعف آجاتا ہے اور مدتوں نظامِ سلطنت درہم برہم رہتا ہے۔

فرمانرواؤں کو خدا کی رضامندی حاصل کرنا چاہئے مگر یہ رضامندی جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ بندگانِ خدا پر عدل و احسان کیا جائے۔ عدل کا ثمرہ بادشاہ کو یہ ملتا ہے کہ رعایا ٹھنڈے دل سے دعائیں مانگتی ہے جس سے سلطنت مستحکم اور ملک میں اضافہ ہوتا ہے اور دین و دنیا کی نیکنامی حاصل ہوتی ہے اور آخرت کا حساب ہلکا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مشہور قول ہے:۔

"الملک یبقیٰ مع الکفر ولا یبقیٰ مع الظلم"

یعنی سلطنت کفر سے تو باقی رہ جاتی ہے مگر ظلم و ستم سے نہیں رہتی!

ہر شہر میں بادشاہ کو اول ایسا دیندار اور خدا ترس آدمی تلاش کرنا چاہئے جو صاحبِ غرض نہ ہو اور جب ایسا آدمی مل جائے تو شہر کی امانت اُس کے سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ امیر عبد اللہ بن طاہر کا دستور تھا کہ ہر کام دیندار اور پارسا لوگوں کے سپرد کیا کرتا تھا جس کا یہ اثر تھا کہ مالِ طیب خزانہ میں جمع ہوتا تھا اور رعایا پر کسی قسم کی سختی نہ ہوتی تھی۔

(مولانا عبد الرزاق کانپوری از صاحب البرامکہ)

ہماری نظر میں

شمائل ترمذی

"شمائل ترمذی" (مترجم مع اردو شرح خصائل نبوی و نبوی لیل و نہار) ترجمہ و شرح :۔ مولانا محمد زکریا۔ شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم (سہارنپور) مرتبہ :۔ مولانا سعد حسن یوسفی۔ ضخامت ۳۴۷ صفحات (مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ) قیمت آٹھ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ نور محمد اصح المطابع و کارخانہ تجارت کتب۔ آرام باغ کراچی۔

"شمائل ترمذی" (مولفہ حضرت حافظ محمد بن عیسیٰ بن سورۃ ترمذی رحمتہ اللہ علیہ) کو مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نے اردو میں منتقل کیا ہے اور جن مقامات پر شرح کی ضرورت محسوس ہوئی ہے وہاں اس ضرورت کو بھی پورا کر دیا ہے۔ خاص طور سے وہ مقامات بہت اہم ہیں جہاں احادیث میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔ فاضل مترجم اور شارح نے اس تعارض کو بڑی خوبی سے رفع فرما کر احادیث کے باہمی ربط و مطابقت کو واضح کر دیا ہے۔

شرح و فوائد کے درمیان اس قسم کے اشعار :۔

خمار آلود آنکھوں پر ہزاروں میکدے قرباں — وہ قاتل بے پیئے ہی رات دن مخمور رہتا ہے (صفحہ ۱۸)

حیا سے سر جھکا لینا ادا سے مسکرا دینا — حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا (صفحہ ۳۱)

کتنے بے جوڑ ہیں اور حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات و صفت سے ان کی نسبت کس قدر بے تکی ہے۔ فاضل شارح کو شعر ہی لکھنے تھے تو ذات گرامی کے شایان شان شعروں کا انتخاب کرنا تھا۔

"سرمہ آنکھوں میں ڈالنا مستحب ہے" (صفحہ ۵۴) "سرمہ لگانا" روزمرہ ہے۔ "نئی وضو کئے بغیر نماز پڑھی" (صفحہ ۱۲۶) "وضو" تو بالاتفاق مذکر ہے۔

اردو جاننے والوں کے لئے "شمائل ترمذی" کا ترجمہ اور شرح دین و دنیا کے فائدہ کے اعتبار سے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ حضور کا حلیہ مبارک، عادات و خصائل اور معاشرت کے طور طریق اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ ملتے ہیں۔ جن کا مطالعہ بھی ثواب اور اتباع و عمل کا تو کیا ہی کہنا۔ یہ تو مقصود ہی ہے۔

کتاب کے آخر میں مولانا سعد حسن خاں صاحب ٹونکی نے "نبوی لیل و نہار" کے عنوان سے جو صفحات مرتب کئے ہیں وہ شمائل ترمذی کا عطر اور خلاصہ ہیں۔ اس کتاب کو ناشر نے چھاپا بھی بڑے اہتمام سے ہے۔ اللہ تعالیٰ مولف، مترجم، شارح، مرتب اور ناشر سب کو اجر عطا فرمائے۔

مشاہدات وواردات

"مشاہدات وواردات"۔ از :۔ ایم، عبدالرحمٰن خاں۔ ضخامت ۲۵۵ صفحات (مجلد۔ رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ ایم ثناء اللہ خاں ۲۶ ریلوے روڈ۔ لاہور۔

جناب منشی عبدالرحمٰن خاں کا قلم دین و اخلاق کی خدمت کے لئے وقف ہے۔ موصوف کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور کئی کتابیں زیر تالیف و کتابت ہیں۔ منشی صاحب قوم کی اخلاقی اصلاح و تربیت کا بے پناہ جذبہ اپنے اندر رکھتے ہیں

اس لئے اُن کی ہر تحریر میں یہی رنگ جھلکتا ہے۔

لائق مصنف نے اس کتاب میں اپنے "مشاہدات اور واردات" بیان کئے ہیں۔ جو مفید و کار آمد ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ صرف ایک اقتباس:۔

"جاتی دفعہ آپ (یعنی قاری محمد طیب صاحب) یہ لطیفہ سُنا گئے کہ ایک دفعہ نئی جُوتی پہن کر نماز کے لئے مسجد جانا ہوا۔ واپسی پر جُوتی ندارد تھی۔ تین دن کے بعد ایک نامعلوم شخص کا خط ملا کہ میں آپ کا جُوتا تبرکاً اُٹھا کر لے گیا ہوں۔ آپ بے فکر رہیں"۔

"اُس نے اپنے مقربانِ خاص کو بھی جامہ بشریت میں ہی مستور کیا ہوا ہے"۔ (صفحہ ۳۸) زبان اور طرزِ ادا کے اعتبار سے اس جملہ میں بڑا جھول پایا جاتا ہے ——— "تو وہ ایک مشفق کی طرح طبع پُرسی کرنے لگے"۔ (صفحہ ۴۶) روزمرہ "مزاج پُرسی" ہے ——— "مگر میرے خط سے قبل وہ مولانا عثمانی کو مل چکے تھے"۔ (صفحہ ۱۷۹) یہاں "کو" کی جگہ "سے" لکھنا چاہیئے تھا۔ ورنہ اس جملہ سے تو یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ وہ صاحب کہیں کھو گئے تھے اور پھر مولانا عثمانی کو مل گئے ——— "حالانکہ انہوں نے چار بجے قلعہ پہنچنا تھا"۔ (صفحہ ۱۸۰) "نے" یہاں غلط استعمال ہوا ہے ——— "اور مولانا عثمانی کو یہاں لے آویں گے"۔ ——— (صفحہ ۱۸۰) یہ اندازِ بیان اب متروک ہے۔ "لے آئیں گے" بولا اور لکھا جاتا ہے ——— "مجھے اتنی ہوش ہی نہ رہی" (صفحہ ۲۳۷) "ہوش" مذکر ہے ——— "میرا اکثر اُن کے ہاں آنا جانا اور کھانا پینا تھا"۔ (صفحہ ۲۳۸) "کھانا پینا رہتا" لکھنا تھا۔

"حضرت آدم علیہ السلام زراعت کاری اور پارچہ بافی کا کام کرتے تھے"۔ (صفحہ ۲۶۳) زراعت کے بعد "کاری" زائد ہے ——— "قصاب یا حزار" (صفحہ ۲۷۲) یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کہ "جزار" میں "ج" کا نقطہ چھوٹ گیا۔

"محمد علی جناح نام ہے۔ قوم خوجہ مسلمان۔ مذہب شیعہ۔ سکونت بمبئی۔ پیشہ بیرسٹری۔ جناح نام کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کوئی جینا لکھتا ہے۔ کوئی "جنا" لکھ ڈالتا ہے۔ حالانکہ صحیح لفظ جناح ہے۔ حضرت امام حسینؑ کے گھوڑے کا نام "ذوالجناح" تھا۔ ماں باپ نے اسی مناسبت سے جناح نام رکھا کہ امام کی برکت حاصل ہو"۔ (صفحہ ۱۳۳-۱۳۴۔ از۔ خواجہ حسن نظامی)

یہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔ گجراتی زبان میں "جھینا" کے معنی "کمزور" کے ہیں۔ قائد اعظم مرحوم کے والد بہت دُبلے پتلے پیدا ہوئے تھے۔ اس بنا پر گھر والے انھیں "جھینا" کہہ کر پکارنے لگے۔ اور یہ پیار کا لقب اُن کے نام کا ٹکڑا بن گیا۔ یہاں تک کہ اس نام (جینا) نے "خاندانی لقب" کی حیثیت اختیار کرلی۔ تحقیق کے بغیر تیر تکے لڑانے سے ...

"چنانچہ اسی صاحبِ فراست بزرگ کی وجہ سے مجھے قائد اعظم کے مقام کا پتہ لگا کہ وہ صرف ایک کامیاب لیڈر یا وکیل ہی نہ تھے بلکہ عارف باللہ بھی تھے۔ کیونکہ عارف کی تربیت ..... ابدال کے سپرد ہوتی ہے اور وہ بزرگ درجہ میں ابدال تھے"۔ (صفحہ ۵۶)

اس انکشاف اور ریسرچ پر "مشاہدات و واردات" کے مصنف کو کوئی بڑھیا قسم کا "پرائز" ملنا چاہیئے کہ قائد اعظم "عارف باللہ" بھی تھے اور اُن کی تربیت کسی "ابدال" کے سپرد تھی۔

"چونکہ اُن کو ایک طرف قائد اعظم سے اور دُوسری طرف مجھ سے قریبی تعلق تھا اس لئے مجھے

قائد اعظم کی نہ صرف اندرونی زندگی کے بلکہ اُن کے بعض سیاسی اور دینی کارناموں کا بھی اُن کے ذریعہ علم ہوتا رہتا تھا جو آج تک منظرِ عام پر نہیں آسکے اور نہ معلوم اُن کے منظرِ عام آنے میں یا لانے میں کتنی دیر لگے گی۔" (صفحہ ۵۶)

اس کتاب کو پڑھ کر پہلی بار اس کا علم ہوا کہ مسٹر محمد علی جناح مرحوم کے کچھ ایسے "دینی کارنامے" بھی ہیں۔ جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں اور ظاہر ہے کہ ان پردوں کو وہی شخص اُٹھا بھی سکتا ہے جس نے عرفان و تصدیق کی منزل میں اُن کا مقام معلوم کر لیا ہو۔ اور جو قائد اعظم کو "عارف باللہ" ثابت کرنے کے لئے ریسرچ کر رہا ہو۔

"انہی کے ذریعہ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُن کی (یعنی قائد اعظم کی) دینی تربیت حضرت مجدد الملت مولانا اشرف علی تھانویؒ مختلف ذرائع سے فرما رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔" (صفحہ ۵۶)

عجیب سے عجیب تر انکشاف اور نادر سے نادر تر تحقیق۔

"دراصل وہ حضرت قائد اعظم کی روحانی تربیت کیلئے اس طرح مامور من اللہ تھے جس طرح ملتان کے "چپ سائیں" وردی والے انگریزوں کی حکومت کے تکوینی محافظ تھے۔" (صفحہ ۵۵)

شہر ملتان کے مناقب میں ایک اور "شرف" کا اضافہ ہو گیا کہ انگریزی حکومت کے تکوینی محافظ "چپ سائیں" جی ملتان ہی کے رہنے والے تھے۔ نہ جانے روس اور امریکہ کی حکومتوں کی تکوینی محافظت ان دنوں کن "بزرگوں" کے سپرد ہے۔ اگر اس کا کسی طرح اتا پتا لگ جائے تو یہ ایٹم اور ہائیڈروجن بموں سے زیادہ انقلابی انکشاف ہوگا اور یہ انکشاف "مشاہدات و واردات" کے صاحبِ نسبت مصنّف ہی فرما سکتے ہیں!

قائد اعظم مرحوم کی زندگی میں اگر اُن سے اس قسم کی باتیں منسوب کی جاتیں تو وہ قہقہہ لگا کر کہتے کہ "خدا کے لئے مجھے وہی رہنے دو جو میں ہوں"۔ ۔ ۔ جب واقعات مشاہدات اور سیرت نگاری اس سطح پر آجائیں تو پھر ہر وقت ایک "طلسم ہوش ربا" تیار ہو سکتی ہے!

"تیسری بڑی "جماعتِ اسلامی" ہے۔ جس سے مجھ سمیت سب کو امید تھی کہ وہ جنگِ اقتدار سے الگ تھلگ رہ کر لوگوں کی دینی خدمت و تربیت کرے گی۔ مگر وہ جلد ہی سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے شوق میں سیاست کی نجاست میں ایسی پھنسی کہ اسے اپنے بھی پرائے نظر آنے لگے" (صفحہ ۳۴۴)

یہ وہ مخصوص مذہبی ذہنیت ہے جس نے دین و سیاست میں تفریق پیدا کر رکھی ہے اور "سیاست و حکومت" جس کے نزدیک شجرِ ممنوعہ ہے اور جو فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں میں زمامِ حکومت دیکھ کر ذرا سی بھی خلش محسوس نہیں کرتی اور دین کی مظلومیت ہی پر ہمیشہ قناعت کئے رہتی ہے۔ جماعتِ اسلامی کا اس کے سوا اور کیا قصور ہے کہ اس نے اسلامی دستور سازی کے لئے فضا کو ہموار کیا۔ اور صالح قیادت لانے کے لئے جد و جہد کی! کسی ملک میں انقلاب لانے کے دو ہی ذریعے ہیں۔ "آئینی اور غیر آئینی"۔ جماعتِ اسلامی کے پیشِ نظر "آئینی انقلاب" ہے اور اس انقلاب کا اس کے سوا کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے کہ یہاں کا دستور کتاب و سنت کی بنیاد پر ترتیب پائے اور اسمبلیوں کے جو انتخابات ہوں اُن میں زیادہ سے زیادہ اچھی سیرتوں کے لوگ چن کر آئیں۔ اور یہی لوگ مل جل کر حکومت کو چلائیں اور اللہ کے دین کو قائم کریں۔ جو کوئی اس جد و جہد پر "سیاست کی نجاست" کی پھبتی چست کرتا ہے۔ وہ "اقامتِ دین" کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر نہیں ہے!

"اگر اقتدار کی گدیوں سے اسلام نے پھیلنا ہوتا تو مقتدر ائمہ اسلام جلیل القدر مناصب کی پیشکش پر لات کیوں مارتے ....." (صفحہ ۳۴۸)

ان بزرگوں نے بادشاہوں کی حکومتوں کا کل پرزہ بننا گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کی احتیاط تقویٰ اور بے نفسی کا تقاضا تھا۔ مگر حضرت عمر ابن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو حکومت ملی تو آپ نے اس کے زمین و آسمان ہی بدل ڈالے اور خلافت راشدہ کی یاد تازہ کردی۔ خلافت راشدہ کے دور میں حکومت کے مناصب کو صحابہ کرام نے عبادت سمجھ کر قبول کیا تھا!

اس کتاب میں کہیں کہیں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات پر بھی طنز و تشنیع ہے۔ اس کا جواب مولانا مودودی کی تصنیفات میں مل سکتا ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ مولانا موصوف کی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ کر خود فیصلہ کریں کہ حقیقت حال کیا ہے؟ جن ارباب تحقیق نے مودودی صاحب کی تصنیفات خالی الذہن ہو کر پڑھی ہیں۔ وہ پھر دوسروں کے پیدا کئے ہوئے شبہات میں گرفتار نہیں ہے!

ایک صاحب کے بارے میں لکھا ہے:۔

"خدا دوست سے زیادہ فقیر دوست تھے"۔ (صفحہ ۴۵)

حالانکہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے محبت اور خشیت کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے زیادہ اور کوئی مستحق نہیں ہے!

بعض سرکاری عہدیداروں کی ظاہری تواضع اور ان کے چند وقتی کلمات سے متاثر ہو کر ان کو ایک "مثالی کردار" سمجھ لینا یہ بصیرت و کردار کے مطالعہ (Character reading) کی کوئی اچھی مثال نہیں ہے!

جب کوئی مصنف بہت زیادہ لکھتا ہو اور اس کی کتابیں جلد جلد چھپنے لگتی ہیں۔ تو اس بسیار نویسی کے سبب اس کی تحریر میں جو فکر و اظہار کی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں وہ اس کتاب میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مصنف کی اس سے بلند تر کتابیں ہماری نگاہ سے گزر چکی ہیں اور ہماری تمنا ہے کہ وہ اپنی اس سطح کو قائم رہنے دیں!

ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ

"ہمارے نبیؐ کے صحابہؓ" از۔ اعجاز الحق قدوسی۔ ضخامت ۸۰ صفحات (رنگین سرورق کیساتھ) قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ فلاح انسانیت۔ آرام باغ روڈ۔ کراچی۔

مولانا اعجاز الحق صاحب قدوسی نے مسلمان بچوں اور بچیوں کی ذہنی تربیت اور دینی معلومات کیلئے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جو کافی مقبول ہو چکی ہیں۔ اس کتاب میں صاحب موصوف نے صحابہ کرام کے جستہ جستہ حالات سلیس اور عام فہم زبان میں قلم بند کئے ہیں۔

(صفحہ ۷) "چوری میں انھیں کوئی عیب نہ تھا" یہاں "عار" کی جگہ "عیب" استعمال کیا گیا ہے۔

(صفحہ ۷) "آپ کے دستر خوان پر ایسے موٹے جھوٹے کھانے ہوتے ہیں"۔ "موٹے جھوٹے" پہننے کے کپڑوں کے لئے عام طور پر بولتے ہیں۔

یہ کتاب مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ پھیلائے جانے کی مستحق ہے۔ کہ اس میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پاک زندگیوں کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جو ہمارے لئے شمع راہ ہیں۔ کتاب کے آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ دے دی گئی ہے!

لے۔ اس "نے" سے وحیدان تنگ آ چکا ہے۔

تاریخ ادبیات عربی

"تاریخ ادبیات عربی" از - سید ابوالفضل ایم اے (عثمانیہ) ضخامت ۲۰۸ صفحات - قیمت تین روپے - ملنے کا پتہ :- سب رس کتاب گھر، رفعت منزل، خیرت آباد - حیدرآباد دکن -

کتاب کا نام ہی بتارہا ہے کہ اس میں کیا ہوگا ؟ اُردو ادب میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے جس میں ادبیات عرب پر اتنی معلومات فراہم و یکجا کی گئی ہیں - اس کتاب کے سات ابواب ہیں پہلے باب میں قس بن ساعدہ سے لے کر تابط شرا تک - دوسرے باب میں زیاد بن ابیہ سے لے کر فرزدق و طرماح تک - تیسرے باب میں الکندی سے لے کر زہیر تک - چوتھے باب میں ابن منظور سے لے کر صفی الدین الحلی تک - پانچویں باب میں حاجی خلیفہ سے لے کر عائشۃ الباعونیہ تک - چھٹے باب میں مارون النقاش سے لے کر منفلوطی، شوقی اور المطران تک کے مختصر حالات اور اُن کی علمی، ادبی اور شاعرانہ خصوصیات درج ہیں - آخری باب (ہفتم) میں عصر جدید کے شعراء کے ساتھ اس دور کی نثر نگاری، افسانوی ادب اور جدید تحریکات کا تذکرہ ہے !

فاضل مصنف شعر و ادب میں بصیرت رکھتے ہیں - اس لئے اُن کی تنقید عمیق ہی نہیں وزنی بھی ہے - یہ کتاب بلا مبالغہ تاریخ و ادب کے ہزاروں صفحات کا نچوڑ ہے - اندازِ بیان بھی دلچسپ اور باوقار ہے !

(صفحہ ۱۰۸) "اصمعی کی طرح یہ بھی غیر معمولی ذہانت اور حافظہ پایا تھا" "یہ" کی جگہ "اس نے" لکھنا تھا -

(صفحہ ۱۷۵) "کڈھب قوافی کا استعمال" - "کڈھب" غلط نہیں ہے مگر "قوافی" کے ساتھ اس لفظ کا استعمال کس قدر اکھڑا اکھڑا لگتا ہے - "نامانوس قوافی" - یا "مشکل قوافی" لکھنا چاہیئے تھا — صفحہ ۳۲ پر "پیریڈائز لاسٹ" کو "پیراڈائیز لاسٹ" لکھا ہے - یہ دکن کا اندازِ لہجہ و نگارش ہے کہ وہاں "ہیٹ" (Hat) کو "ہیاٹ" لکھتے اور بولتے ہیں -

یہ کتاب اُردو ادب میں کوئی شک نہیں گرانقدر اضافہ ہے اور اُردو جاننے والوں کیلئے تو نعمت غیر مترقبہ ہے - مصنف نے سچ مچ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے -

گنج طلسم

"گنج طلسم" - از :- شاہ نعمت اللہ ولی - مرتبہ و مترجمہ - ڈاکٹر ایم حفیظ سید - ضخامت ۳۳ صفحات (بڑا سائز) قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ - سب رس کتاب گھر - خیرت آباد - حیدرآباد دکن -

حضرت شاہ نعیم الدین نعمت ولی اللہ گولکنڈہ (دکن) کے ایک مشہور عالم اور صاحب معرفت بزرگ گزرے ہیں - اُن کی فارسی مثنوی "گنج طلسم" کو ڈاکٹر ایم حفیظ سید صاحب نے صرف ایڈٹ ہی نہیں کیا بلکہ سلیس اُردو میں ترجمہ بھی فرمادیا ہے - اس کتاب کا دیباچہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے لکھا ہے اور صاحب مثنوی کے مختصر حالات فاضل مرتب اور مترجم نے قلمبند کئے ہیں - ڈاکٹر ایم حفیظ سید[1] کی علمی تحقیقات پر رشید قریشی (ایم اے) کا ایک مختصر سا تعارف بھی ہے !

مثنوی "گنج طلسم" میں بڑی روانی اور زورِ بیان پایا جاتا ہے - چند شعر (ترجمہ کے ساتھ) :-

اے دادہ بجسم آدمی جاں ۔۔۔ گنج بہ طلسم کردہ پنہاں

اے وہ ذات جس نے آدمی کے جسم میں جان ڈال کر طلسم کا ایک خزانہ پوشیدہ کر دیا -

دیدیم ہزار بلبل مست ۔۔۔ صد دیدۂ آرزو بہ گل بست

ہزاروں مست بلبلوں کو ہم نے دیکھا - جنہوں نے سو طرح کی امیدیں پھول سے وابستہ کیں -

---

[1] یہ نام اپنی لفظی ترکیب کے اعتبار سے زبانوں پر ذرا دیر میں چڑھے گا - (م - ق)

شب تا بسحر فغاں کشیدہ — یک چشم زدن نیارمیدہ

رات سے صبح تک آہ و نالہ کرتی رہی۔ ایک لحظہ بھی انہوں نے آرام نہیں کیا!

بے باک مرو ادب نگہدار — تا گل دہدت سنان ہر خار

بے دھڑک نہ چل، ادب ملحوظ رکھ — تاکہ ہر خار کی نوک تجھے پھول دے۔

اخلاص گزیں، بناز میش آر — تسبیح ہزار دانہ بگذار

خلوص اختیار کر، اظہارِ محبت سے پیش آ — ہزار دانے کی تسبیح چھوڑ دے

ساقی نظرے کہ بیقرارم — از چشم تو چشم بادہ دارم

ساقی ایک نظر! میں بیقرار ہوں — تیری چشمِ کرم سے شراب کی امید رکھتا ہوں۔

اے ذاتِ تو بے جہات پیدا — بر نورِ تو کائنات شیدا

اے خدا! تیری ذات بے جہات ہے — تیرے نور پر کائنات (مخلوق) شیفتہ ہے

نے روئے ستائش تو داریم — از تست ہر آنچہ بر تو آریم

تیری تعریف کرنے کا ہم منہ نہیں رکھتے — تجھی سے ہے جو کچھ تیری تعریف میں کہتے ہیں۔

حیوانات قرآنی

"الحیوانات فی القرآن" یا حیوانات قرآنی۔ از :- مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات - قیمت دو روپے ملنے کا پتہ :- مکتبہ ندوۃ العلماء بنارس (بھارت) اور صدق جدید بک ایجنسی۔ کچہری روڈ لکھنو۔

قرآن پاک میں جن حیوانات کا ذکر آیا ہے اُن کے اسماء صفات اور افعال و متعلقات کا یہ ایک جامع لغت ہے۔ عربی میں ہو تو ہو مگر اردو زبان میں تو یہ پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر مُرتب کی گئی ہے۔

مثلاً — قرآن پاک میں "نحل" (شہد کی مکھی) آیا ہے۔ اس کتاب میں شہد کی مکھی کے متعلق معلومات ملیں گی کہ علماء حیوانیات کی شہد کی مکھی کے بارے میں جدید ترین تحقیقات کیا ہیں؟ شہد کی مکھیوں کی ملکہ کے کیا فرائض ہیں۔ وہ ایک دن میں کتنے انڈے دیتی ہے۔ ایک بڑے چھتے میں کتنی ہزار مکھیاں آرام کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ کس ملک کی مکھیاں اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں اور کن آسمانی کتابوں میں "نحل" کا ذکر آیا ہے۔

(صفحہ ۲۰) — "اور یوسفؑ کو ضائع کر کے آئے" — "ضائع" اُردو میں (کھونے کے معنی ہیں) عام طور پر بے جان چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ البتہ اس طرح تو بولتے ہیں کہ "اتنی جب نیں ضائع ہو گئیں"۔ مگر یوں نہیں بولتے کہ "احمد علی نام کا سپاہی ضائع ہو گیا"۔ (صفحہ ۱۲۸) "ظہور اسلام سے کوئی ۴۰ سال قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سالِ ولادت میں جب صوبہ یمن کے زیرِ مملکت حبشہ کے مسیحی صوبیدار الابرہہ نے خانۂ کعبہ پر چڑھائی کی ہے۔" حیرت ہے کہ مولانا عبدالماجد دریا بادی جیسے اہلِ نظر اور صاحبِ فکر و دانش بھی "ظہورِ اسلام" کی تاریخ حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت سے شروع کرتے ہیں۔

یہ کتاب اس موضوع پر چھوٹی موٹی انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس پر فاضل مصنف تحسین و تبریک کے مستحق ہیں۔

مجلۃ البعث الاسلامی

(عربی ماہنامہ) زیرِ سرپرستی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مقام اشاعت۔ ۲۴ گوئن روڈ لکھنو۔ سالانہ چندہ۔ پانچ روپے۔ فی پرچہ ۸/- پاکستان میں :- فاران، کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ا

کچھ عرصہ سے، خصوصاً تقسیم کے بعد سے۔ ہندو پاکستان کے مسلمانوں کا عربی زبان کی طرف میلان قابلِ تعریف رفتار سے

بڑھ رہا ہے۔ اس رفتار کو دیکھتے ہوئے کافی عرصہ سے اس چیز کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ خود ہمارے ہاں ایک عربی ماہنامہ جاری ہو۔ تاکہ طلبار اور عام مسلمانوں کی عربی کی طرف بڑھتی ہوئی پیاس کا سامان پیدا ہو جائے۔ عرب ممالک میں جو ادبی پرچے شائع ہوتے ہیں۔ اول تو اُن کی زبان اتنی اونچی ہوتی ہے کہ یہاں کے عام طلبار کے لئے اُن سے فائدہ اٹھانا آسان نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ پرچے بعض خاص رجحانات لے کر شائع ہوتے ہیں۔ جن کی موجودگی میں یہاں کے طلبار سوائے زبان کے کوئی خاص فائدہ اُن سے نہیں اٹھا سکتے۔ اور سب سے بڑی دقت ان پرچوں کے منگوانے کی ہے۔ اول تو ہماری مہربان حکومت نے ایسے انتظامات فرما دیئے ہیں کہ کوئی شخص اُن کا چندہ نہیں بھیج سکتا۔ اور اگر کسی طرح اسے چندہ بھیجنے کا لائسنس مل بھی جائے تو پرچہ آسے عام ڈاک سے ملتا ہے۔ جس کے پہنچتے پہنچتے کم و بیش ایک ماہ تو لگ ہی جاتا ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور اُن کے بعض عزیزوں اور شاگردوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک عربی ماہنامہ لکھنؤ سے شائع کرنے کی مہم اپنے سر لی ہے۔ گویا الضیاء مرحوم کے بعد عربی زبان کا یہ دوسرا ادبی ماہنامہ ہے۔ جو اگرچہ دارالعلوم ندوہ نے نہیں۔ لیکن ندوہ والوں نے ضرور نکالا ہے۔

اس پرچہ کا پہلا شمارہ جو ماہ اکتوبر کے شروع میں شائع ہوا ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یہ کل ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے ٹائیٹل نہایت عمدہ اور خوبصورت اور اندر کا کاغذ اوسط درجہ کا ہے۔ ہمارے دینی پرچے اسی کاغذ پر شائع ہوتے رہیں۔ تو بسا غنیمت ہے۔

کلمۂ افتتاحیہ میں اس پرچہ کے اغراض و مقاصد کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مختصر طور پر یہ مقاصد دو ہیں۔ ایک ہند و پاکستان کے عربی مدارس کے طلبار میں عربی زبان اور ادب کا اعلیٰ اور ستھرا ذوق پیدا کرنا۔ دوسرے اس ملک اور عرب ممالک کے باشندوں کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعلقات کی تجدید و احیار۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پرچہ کو اپنے مقاصد میں زیادہ سے زیادہ کامیابی عطا فرمائے۔

اس کے بعد دوسرا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی کا ہے۔ جس کا عنوان ہے الکتب التی عشت فیہا (وہ کتابیں جن میں میں نے اپنی زندگی گزاری) یہ مضمون غالباً کافی لمبا ہوگا۔ جو کئی قسطوں میں لگاتار شائع ہوگا۔ اس مضمون کی افادیت اس کے لکھنے والے کی شخصیت اور اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کا شمار نہ صرف ہند و پاکستان کے چند اونچے عربی لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ مبالغہ نہ ہوگا اگر ہم یہ کہیں کہ اس وقت عربی انشاپردازی میں اُن کا مقام پورے ہند و پاکستان میں سب سے اونچا ہے۔ اس مضمون میں مولانا ان تمام کتابوں کا بالترتیب ذکر کریں گے۔ جو شروع سے اب تک اُن کے مطالعہ میں رہیں اور جن کا اُن کی ثقافت، دینداری، مطالعہ، ادب، انشا پردازی اور تصنیف و تالیف پر نمایاں اثر پڑا ہے۔

اس کے بعد تین اور مضامین ہیں۔ جن میں سے پہلا عربی ادب کے متعلق ہے۔ دوسرا سید احمد شہیدؒ کی سیرت کے متعلق ہے اور تیسرے میں علامہ اقبال کے چند شعروں کا عربی میں ترجمہ اور شرح کی گئی ہے۔

اس کے بعد قرأت لک (میں نے تمہارے لئے پڑھا) کے عنوان سے تین صفحات میں حسن البنار شہیدؒ کی ایک تحریر دی گئی ہے۔ جو نہایت مؤثر اور جذبہ انگیز ہے۔

آخر میں "ندوۃ البعث" کے عنوان کے تحت دو عربی خطوط شائع کئے گئے ہیں۔ جن میں سے پہلا لبنان کے کسی طالب العلم کا ہے

اور دوسرا ہندوستان ہی کے کسی طالب علم کا۔

پرچے کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ "قرأت لک" اور "ندوۃ البعث" مستقل عنوانات ہیں جن کے تحت ہر ماہ مختلف اہل قلم اور ادباء کی تحریروں کے اقتباسات اور طلباء کے خطوط شائع کئے جایا کریں گے۔ حقیقت میں یہ دونوں عنوان قارئین کے لئے نہایت مفید اور ضروری ہیں۔

یہ شمارہ اگرچہ لیتھو پر شائع کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے شروع میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ یہ پرچہ ٹائپ پر شائع کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اور امید ہے کہ دو تین شماروں کے بعد پرچہ ٹائپ پر شائع ہونا شروع ہو جائے گا۔

لیکن بعض پہلوؤں سے ہمیں اس پرچے میں بعض خامیاں نظر آئیں جن کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے:۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مولانا علی میاں اور حسن البنا شہید کے مضمون کو چھوڑ کر باقی مضامین میں "ہندیت" کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ بعض مقامات پر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والے اردو میں سوچ رہے ہیں اور عربی میں لکھ رہے ہیں۔ ذیل میں ہم اس کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "لوجدنا هذه الكلمة موجودة تستعمل وتساق مع معناها الاول فی مفهوم ملكة اللسان والبيان"۔ یہ اس فقرے کا لفظی ترجمہ ہے۔ "...... تو ہم اس لفظ کو اس کے پہلے معنی کے ساتھ زبان و بیان کے ملکے کے مفہوم میں استعمال ہوتا پائیں گے"۔

ایک دوسری جگہ ہے۔ "وذالک یعرفنا بحقیقة صريحة أن اجدات ثورة ...."۔ اس جگہ "حقيقة صريحة" اور "أن" کے درمیان کسی لفظ مثلاً "هي" کا لانا ضروری تھا۔

ایک تیسری جگہ ہے۔ "ان اختار ابياتا من شعره التی يناجی فيها العرب"۔ اس جگہ "التی" کا استعمال صحیح نہیں کیا گیا۔

ایک چوتھی جگہ لکھتے ہیں۔ "وسنبذل کل ماتملک من الامکانیات والوسائل ان نقدم الاعداد المقبلة"۔ اس جگہ "ان" سے پہلے "فی" یا "لِ" کا لانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہ فقرہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اردو میں کہا جاتا ہے۔ "میں اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ ......"

دوسری چیز یہ ہے کہ ان مضامین میں ایک جملہ ختم کرنے کے بعد دوسرا جملہ شروع کرنے کے لئے حروف عطف کا استعمال بہت ہی کم کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانے کے بعض ادباء نئے جملے شروع کرتے وقت حروف عطف کا استعمال کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن یہ اس زمانے کے بعض جدید ادباء کا مسلک ہے۔ جس میں عربی زبان کا ذوق بہرحال اپنے صحیح معیار پر نہیں ہے۔ پھر یہ لوگ بھی حروف عطف کا استعمال اتنا کم نہیں کرتے کہ فقروں کے فقرے بلا ضرورت بغیر حروف عطف کے چلے جا رہے ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مبتدیوں کے لئے حروف عطف کا استعمال مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے انھیں کچھ نہ کچھ رعایت ضروری دینا پڑتی ہے۔ لیکن ایک معیاری ادبی پرچہ میں جس سے سینکڑوں طلباء عربی سیکھنے کی کوشش کریں گے۔ یہ چیز مناسب معلوم نہیں ہوتی!

تیسری چیز یہ ہے کہ ان مضامین میں ایک لفظ اور ایک جملہ کے بعد دوسرے مترادف لفظ اور جملہ کو بار بار بلا ضرورت استعمال کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عربی تحریر میں مترادف لفظ یا جملہ لائے بغیر پورا زور اور حسن پیدا نہیں ہوتا اور خود قرآن میں جگہ جگہ

مترادف الفاظ اور جملے لائے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک اور عربی کی تمام معیاری اور اعلیٰ تحریروں میں زور اور حُسن پیدا کرنے کے لئے مترادف الفاظ اور جملوں کو صرف اس وقت استعمال کیا گیا ہے جبکہ اُن کی واقعی ضرورت ہو اور اپنے مدعا کو متعین اور واضح طور پر بیان کرنا مقصود ہو!

خود مولانا علی میاں کے مضمون میں بعض ایسی چیزیں ہیں۔ جن کا اس مضمون میں موجود ہونا واقعی حیرت انگیز اور قابلِ تعجب ہے غالباً مولانا نے اپنا یہ مضمون کسی کو املا کرا یا ہے یا اگر اسے خود لکھا ہے۔ تو نہایت عجلت کی حالت میں لکھا ہے اور اسے دوبارہ دیکھنے کی انھیں فرصت نہیں مل سکی!

ایک جگہ "اَقْبَلَ" کا صلہ "اِلیٰ" استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ جس موقع پر یہ لفظ آیا ہے وہاں اس کا صلہ "علیٰ" ہونا چاہیے۔
دُوسری جگہ لکھتے ہیں۔ "لا تزال محتفظةً ببعض العادات التی کان لہا اثر طیب فی حیاتھا وکان العاصم لہا من کثیر من الانحراف"۔ اس جگہ "کان العاصم" کے بجائے "کانت عاصمةً اَو کانت العاصمة" ہونا چاہیے۔
ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ "تقبّل تلک المجالس العطرة التی تعرفت فیہا بھذا الکتاب"۔ یہاں تعرف کا استعمال صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ تعرّف کا استعمال دو شخصوں کے درمیان ہوتا ہے اور وہ بھی اس طرح۔ "تعرفتُ بفلان ای صرتُ معروفاً عندہ"۔

بہر حال پرچہ اپنی مجموعی حیثیت سے مفید اور عربی زبان کی ایک قابل قدر خدمت ہے۔ مولانا علی میاں اور اُن کے فاضل شاگردوں اور عزیزوں سے امید ہے کہ آئندہ شماروں کو زیادہ سے زیادہ معیاری بنانے کی کوشش کریں گے۔ تاکہ یہ پرچہ نہ صرف یہاں کے طلباء کے لئے مفید ہو بلکہ عرب ممالک کے اُونچے حلقوں میں بھی زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل کرے۔

ہماری ایک تجویز یہ ہے کہ پرچہ میں نئی عربی کتابوں اور رسالوں کے تعارف کے لئے ایک مستقل عنوان قائم کرایا جائے۔ جس سے یہاں کے لوگوں کو عرب ممالک کے ادبی اور علمی حالات سے باخبر رہنے میں بڑی مدد ملے گی۔ (م - م)

"فاران" کے خریدار صاحبان کی

خدمت میں

جنوری کا "فاران" سیرت نمبر ہوگا۔ جس کی ضخامت ڈھائی سو صفحات سے زائد ہوگی۔ سادہ ڈاک سے اس ضخیم نمبر کو بھیجا گیا تو اس کے ادھر اُدھر ہو جانے کا امکان ہے۔ اس لئے خریدار صاحبان کی خدمت میں یہ معروضہ ہے کہ مذکورہ شمارہ رجسٹری کے ذریعہ بھیجا جائے گا۔ رجسٹری اور پیکنگ کے مصارف کیلئے خریدار صاحبان چھ آنے کے ٹکٹ دفتر فاران کو بھیجدیں یا چھ آنے کا منی آرڈر کر دیں۔ جو صاحبان ٹکٹ یا نقدی کی صورت میں یہ رقم (۶/) نہ بھیجیں گے اُن کے نام سادہ ڈاک ہی سے "فاران" پوسٹ ہوگا اور نہ پہنچنے کی صورت میں دفتر "فاران" سیرت نمبر دوبارہ نہ بھیج سکے گا۔

(منیجر "فاران")

سیرت نمبر

فاران کراچی

پاکستان

ماہر القادری

ماہنامہ

فاران
کراچی

سیرت نمبر

ایڈیٹر
ماہر القادری

چندہ
سالانہ ... چھ روپے
فی پرچہ ... آٹھ آنے

قیمت
سیرت نمبر
ڈھائی روپے

مقام اشاعت
دفتر فاران کیمبل اسٹریٹ کراچی

جلد ۷ جنوری سنہ ۱۹۵۶ء نمبر ۱۰

نظم و ترتیب

★

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

و

نصلی علیٰ رسولہ الکریم

نقشِ اوّل

مادرِ گیتی تاریخ کے کسی دَور میں بھی عقیم نہیں رہی، اس کی آغوش میں بڑی بڑی شخصیتیں جنم لیتی رہی ہیں۔ فرمانرواؤں فاتحین۔ فلسفی، شعراء، صناعوں اور فن کاروں میں ایک سے ایک بڑا آدمی پیدا ہوا ہے۔ جن کے احترام سے آج بھی سینے معمور ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی اکابر اور دینی پیشوا ظہور میں آتے رہے ہیں۔ جن کی عقیدت کے پرچموں کو کوئی انقلاب سرنگوں نہیں کر سکا۔ ہم تاریخ کی ان تمام عظیم شخصیتوں کا احترام کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور اُن کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہیں رکھتے۔

شخصیتوں کی عظمت کے اس اعتراف کے بعد تاریخ کی یہ حقیقت بھی پوری طرح اُبھر کر ہمارے سامنے آتی ہو کہ دُنیا کے تمام اکابر اور بڑے آدمیوں کی زندگیوں کے متعلق دُنیا جو کچھ جانتی ہے، وہ بہت ہی کم جانتی ہے۔ نجانے کتنے عظیم انسان ایسے ہیں جن کے نام تک تاریخ میں محفوظ نہیں رہے اور جن بڑے آدمیوں کے جو حالات ملتے ہیں وہ کتنے مختصر، ناکافی اور ادھورے ہیں۔ کسی کسی کے تو صرف چند اقوال ہی کتابوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ اور بہت سوں کی زندگیوں کے اوراق ہی کہیں کہیں سے غائب ہیں اور یہ واقعات کی ایسی گم شدہ کڑیاں ہیں جن کو نہ قیاس مہیا کر سکتا ہے اور نہ تخیل جوڑ سکتا ہے۔ گمنامی اور بے خبری کے کتنے اندھیرے، اور ادھوری معلومات کے کتنے دھندلکے ہیں، جو بڑی بڑی شخصیتوں کے سوانح حیات پر چھائے ہوئے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ (علیہم السلام) جیسے مقدس نبیوں، بودھ، کنفیوشس اور کرشن جی جیسے دینی پیشواؤں، ہومر اور چاسر جیسے شاعروں، ہرش اور سکندر جیسے فاتحین اور فرمانرواؤں۔ مانی جیسے مصوّر، فیثا غورث جیسے

فلسفی، سولن جیسے مقنن اور اجنتا، ایلورہ جیسے حیرت انگیز غاروں کے تراشنے والے فن کاروں کی زندگیوں کے حالات کس درجہ اختصار، ابہام اور انتشار کے ساتھ ملتے ہیں!

پوری انسانی تاریخ میں اگر کوئی زندگی پوری کی پوری سینوں میں اور سفینوں میں محفوظ ہے تو وہ حضرت خاتم النبیین رحمۃ اللعالمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس زندگی ہے۔ پھر حضور کے سوانح حیات جس احتیاط، ذمہ داری اور فرض شناسی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں، اُس کی نظیر تو خیر کیا ملتی، اُس کی پرچھائیں بھی اور کہیں نظر نہیں آتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل کی صحت کو جانچنے کے لئے کہ واقعی حضور نے ایسا کہا اور کیا تھا۔ ایک پورا "فن" وجود میں آیا ہے، جس میں روایت و درایت کی گہرائیاں اور نقل و عقل کی نزاکتیں پائی جاتی ہیں۔ پھر محدثین (اللہ تعالیٰ کی اُن پر رحمت نازل ہو) کی دیانت کا یہ عالم ہے کہ جس راوی میں جو کمزوری انھیں معلوم ہوئی ہے۔ اُس کا بھی انہوں نے اظہار کر دیا ہے۔ دُنیا کی کوئی زبان اور کوئی قوم "فن حدیث" جیسا لٹریچر آج تک پیش نہیں کر سکی، اس سے پہلے دُنیا "علم رجال" سے نا آشنا تھی اور اس انداز تحقیق کی بڑے بڑے اہل علم کو ہوا تک نہیں لگی تھی!

اور یہ بھی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے صرف اہم واقعات کو محفوظ کیا گیا ہو اور جزئیات کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ حضور کی سیرت کے ایک ایک جزئیہ کو حرزِ جان بنایا گیا ہے، تاریخ و سیر کی کتابیں یہ تک بتاتی ہیں کہ آپ کی دُودھ پلانے والی حلیمہ سعدیہؓ کس قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اُن کے شوہر کا اور حضور کے رضاعی بھائی بہنوں کے کیا نام تھے؟ حضور کے طفیل بنی سعد (ہوازن) کو بھی تاریخ میں نقشِ دوام حاصل ہو گیا۔

بعض جلیل القدر انبیاء کرام علیہم السلام تک کے بارے میں یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان نفوس قدسیہ نے کن مقامات پر داعی اجل کو لبیک کہا۔ مگر تاریخ یہ بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا کس مقام پر انتقال ہوا اور وہ مقام (ابواء) فلاں مشہور مقام (جحفہ) سے کتنے میل کی مسافت پر واقع ہے۔ اور حضور بچپن میں مدینہ کے کس تالاب میں تیرا کرتے تھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سیرت کے صدقہ میں آپؐ کے اجداد قصی اور ہاشم کا مفصل ذکر تاریخوں میں ملتا ہے اور قیدار و عدنان کے نسب نامہ کو لوگوں نے محفوظ کیا ہے۔ صرف اس لئے کہ حضور قریش کے گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اہل علم اور ارباب خیر نے "قریش" کی وجہ تسمیہ تک کا پتہ لگایا ہے!

سیرت نبوی میں حضور کے سفرِ طائف، ہجرت، غزواتِ بدر و اُحد اور فتح مکہ جیسے مہتم بالشان واقعات ہی محفوظ نہیں ہیں، حدیث کی کتابوں میں یہ تک ملتا ہے کہ حضور کی ریش مبارک میں کتنے بال سفید تھے۔ سرکار کے نعلین مبارک میں کتنے تسمے ہوتے تھے۔ آپؐ پانی کتنے گھونٹوں میں پیتے تھے۔ اور کس کروٹ سوتے تھے۔ حضور کی تلواروں، زرہوں اور سواریوں کے کیا نام تھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بات کرنے، کھانا کھانے کی ایک ایک ادا کو اُمت نے محفوظ رکھا ہے۔ صوم و صلوٰۃ سے لے کر میدانِ جنگ تک، حضور کے ہر قول و فعل اور گفتار و کردار کو صحابہ کرامؓ نے لوحِ قلب و دماغ پر منقوش کیا ہے اور دُوسروں تک کمال احتیاط و دیانت کے ساتھ اس یادداشت کو پہنچایا ہے۔

احادیث و سیر کے مجموعے بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس نماز (جہری) میں کونسی سورت تلاوت فرماتے

تھے، روزہ افطار کرتے وقت، نئے کپڑے پہن کر، آئینہ میں چہرہ دیکھ کر، سواری پر سوار ہوتے ہوئے، سونے سے پہلے۔ نیند سے جاگنے کے بعد، طعام کے آغاز و اختتام پر۔ کیا دعائیں پڑھتے تھے؟

کسی صحابی کے نام کو بدلا ہے، کوئی بات کہہ کر حضورؐ مسکرائے ہیں۔ کسی کو دعا دی ہے۔ دین کے معاملہ میں کسی پر خفگی کا اظہار فرمایا ہے۔ غرض جلوت و خلوت کے ایک ایک جزئیہ کی حفاظت کا اہتمام کیا گیا ہے۔

پھر سب سے زیادہ اہم اور قابلِ غور و توجہ بات یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ حضورؐ کے اقوال کے صرف ناقل ہی نہیں تھے۔ کہ گراموفون کی طرح انہیں دُہرا دینے کے بعد معاملہ ختم ہو گیا۔ بلکہ انہوں نے حضورؐ کی ایک ایک سُنّت پر عمل کر کے دکھایا ہے۔ اور اپنی زندگیوں میں سیرتِ رسولؐ کو جذب کرنے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔ انہوں نے جب کوئی رائے دی ہے اور کسی معاملہ میں فیصلہ کیا ہے اور اُس کی مُطابقت میں حضورؐ کا کوئی قول و فعل مل گیا ہے تو اُن کو اس پر بے اندازہ مسرت ہوئی ہے۔ اُن کی زندگیوں کا موضوع اور عنوان ہی "اطاعتِ رسولؐ" تھا۔ صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں اخلاقِ محمدیؐ چلتا پھرتا اور بولتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ دُنیا کے کسی بڑے آدمی اور عظیم شخصیت کو اتنے اطاعت گزار، عقیدت مند اور جان نثار پیرو اور رفقاء میسّر نہیں ہوئے۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے خدا نخواستہ کوئی داستان یا افسانہ نہیں ہے۔ نہ یہ کوئی خیالی باتیں اور شاعرانہ مبالغہ آرائیاں ہیں۔ یہ واقعات ہیں۔ حقائق ہیں۔ وقائع اور سوانح ہیں۔ اگر کوئی ان واقعات کو غلط سمجھتا ہے یا شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دُنیا کا کوئی تاریخی واقعہ بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ سرے سے تاریخ ہی من گھڑت، جعلی اور موضوع ہے ـــ یہاں تک کہ جمشید ایک درخت کا نام تھا، افلاطون ایک شراب تھی جو یونان میں پی جاتی تھی۔ سکندر و پورس کی معرکہ آرائی صرف گرمیٔ محفل کے لئے یاروں نے گھڑلی ہے، کنفیوشس ایک خیالی شخصیت ہے۔ اور شیکسپیر، گلیلیو اور کوپرنیکس یہ سب کے سب فرضی کردار ہیں۔ اور ان سے جو کارنامے منسوب ہیں وہ بھی شوخیٔ فکر و خیال کے سوا، اور کچھ نہیں ہیں۔

صرف ایک زندگی!

ایک تاریخ کے طالب علم کے لئے، ایک جویائے حق کیلئے ایک صاحبِ دانش و ہوش کے لئے یہ بات سمجھنے اور غور کرنے کی ہے کہ دُنیا کی تمام عظیم، نامور اور مشہور شخصیتوں میں صرف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی زندگی ایسی ہے جو پُوری کی پُوری محفوظ ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کے اسباب و علل کیا ہیں؟

اس کا جواب قرآن دیتا ہے:۔

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ"

پُوری انسانیت کے لئے اگر کسی کی زندگی معیار اور نمونہ ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔ اس لئے یہی اور صرف یہی مقدس زندگی اس کی مستحق تھی کہ اُسے تمام و کمال محفوظ کیا جائے، اگر یہ زندگی خدا نخواستہ گم ہو جاتی اور یہ نمونہ دُنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تو انسان زندگی کے تمام شعبوں میں عملی طور پر رہنمائی کہاں سے حاصل کرتے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنے احکام کو عملی طور پر متشکل کرنے کے لئے بندوں کے درمیان آنے سے رہا۔ کہ اُس کی ذات ہر قسم کے تجسم، تشکل اور حلول سے منزہ ہے۔ فرشتوں کے پاس انسانی جذبات اور محسوسات نہیں۔ جو وہ انسانوں میں رہ کر

زندگیاں بسر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی اس طرح بسر کی جاتی ہے اور خدا کی رضا کے حصول کے یہ ذرائع ہیں!

کوئی شک نہیں کہ تمام انبیاء و رسل ہدایت لے کر آئے تھے اور ان کی پاک زندگیوں میں انسانوں کیلئے نمونہ تھا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ ان مقدس زندگیوں کو انسانوں کے حافظہ نے محفوظ ہی نہیں رکھا۔ انسانی تاریخ میں صرف ایک زندگی ہے جو پوری کی پوری حافظہ میں، ذہن و فکر میں، کاغذ پر بلکہ اعمال و کردار میں محفوظ رکھی گئی ہے۔ اور وہ زندگی حضور خاتم النبیین کی ہے۔ (فداہ ابی و امی) اور یہ اہتمام و انتظام خود اللہ تعالیٰ کی مشیت و حکمت کا کیا ہوا ہے۔ اپنے کلام (قرآن) کی حفاظت اس نے خود کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی حفاظت صحابہؓ کرام کو سونپ دی کہ جن میں رسول اللہ نے زندگی بسر کی ہے تاکہ وہ خود بتائیں کہ رسول اللہ کیا تھے؟

تمام دنیا کے چھوٹے اور بڑے انسانوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تمام و کمال محفوظ رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ انسانوں کے لئے کامل نمونہ بس یہی زندگی ہے۔ پس جو زندگی اس کامل و مقدس نمونہ سے جتنی دور ہے، اتنی ہی وہ پست، بے وقعت اور نکمی ہے۔ اور جس فرد میں، قوم میں، ماحول اور معاشرے میں یہ مقدس زندگی جھلکتی ہے، وہاں سعادت و صلاح کی قندیلیں روشن ہیں اور نیکی کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔ انسانیت کے بگاڑ اور بناؤ کا دارومدار حضورؐ کے اسوۂ حسنہ سے دوری اور قربت پر ہے اور یہ وہ کلیہ ہے جس میں کوئی استثناء نہیں!

چند جھلکیاں

آج دنیا بداخلاقی کی چاہے کتنی ہی پستی میں کیوں نہ پہنچ گئی ہو۔ عصمت و اخلاق، اور عفت و پاکیزگی کا احترام آج بھی کیا جاتا ہے۔ ایک چور کے مقابلہ میں ایک دیانتدار آدمی کو آج بھی لوگ عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تو آج کی دنیا بھی اگر چاہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو عصمت و اخلاق اور شرافت و پاکیزگی کی کسوٹی پر جانچ کر اور پرکھ کر دیکھ سکتی ہے!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریش کی دشمنی کی کوئی حد و انتہا نہ تھی۔ دشنام و استہزاء سے لے کر بدر و احد کی خونریز جنگوں تک کونسا ایسا حربہ تھا جو حضورؐ کے خلاف استعمال نہیں کیا گیا۔ مگر اس تمام دشمنی، عداوت، سنگدلی اور دل آزاری کے باوجود صنادید قریش میں سے کسی ایک زبان نے بھی حضورؐ کی سیرت و اخلاق پر انگلی نہیں اٹھائی۔ مکہ کے اس ماحول میں جہاں قدم قدم پر ہوسناکیوں کے جال بچھے تھے اور نفس کے لئے تمام بُری رغبتیں موجود تھیں اور جہاں سفلی جذبات کی تکمیل کیلئے طرح طرح کی آسانیاں مہیا تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوانی کا زمانہ اس قدر پاکیزگی اور شرافت و احتیاط کے ساتھ گزارا کہ پاکیزگی کا زیادہ سے زیادہ تصور بھی حضورؐ کی معصوم و پاکیزہ جوانی کے مقابلہ میں فروتر ہی ٹھہرے گا۔ پھولوں کی پتیاں بہت صاف و شفاف ہیں، قوس قزح نہایت معصوم ہے اور چاندنی بہت زیادہ اجلی اور بے داغ ہے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جوانی ان سب سے زیادہ معصوم، پاکیزہ اور عفیف تھی۔ اسی زمانے میں قوم نے محمدؐ بن عبداللہ کو "صادق الامین" کا خطاب دیا اور آپؐ کی راست بازی اور امانت ضرب المثل بن گئی!

کوئی شک نہیں کہ سرداران قریش نے آپؐ کے پیام کو طرح طرح سے جھٹلایا اور آپ کے دعوئ رسالت کی تکذیب کی مگر ان کو یہ جرأت نہ ہو سکی کہ حضورؐ کے اخلاق و سیرت پر ذرا سی انگلی بھی رکھ سکتے۔ حضورؐ کے کردار کی پاکیزگی کی یہ سب سے زیادہ مستند شہادت ہے! ابو جہل کہا کرتا تھا کہ "محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا۔ ہاں! جس چیز کی تم دعوت دیتے ہو اسے درست نہیں سمجھتا!"

مکہ کے قمار خانے، بدکاری کے اڈے اور گانے بجانے کی محفلیں اس حسین وجمیل اور تندرست و توانا ہاشمی نوجوان کی راہ تکتی ہی رہیں۔ مگر وہ جسے انسانیت کے تزکیۂ نفس کا علمبردار بننا تھا اُس کی پرچھائیں بھی ان مقامات پر دکھائی نہ دی۔ اُنؐ کی فطرت شروع ہی سے نیکی اور پاکبازی پر واقع ہوئی تھی۔ اُس نے کسی بت تک کو نہیں چھوا اور نہ بتوں کے نام پر قربان کئے ہوئے ذبیحے کو کھایا۔ جس سوسائٹی میں لوگ بدکاریوں پر شرمانے کے بجائے اُلٹا فخر کرتے ہوں، اور جہاں بُرائی میں مُبتلا ہونا معاشرے میں کسی بدنامی اور عار کا باعث نہ ہو۔ وہاں کسی کا بُرائی سے کلیتہً اجتناب کرنا فطرت کے سلیم مزاج کے پاکیزہ و صحیح اور کردار کے معصوم ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے اور حضورؐ کا کردار زبانِ حال سے عفت و پاکیزگی کا اعلان کر رہا تھا کہ دوسری خوبیوں کی طرح عفت و عصمت کی خوبی بھی مجھ پر تمام کر دی گئی ہے۔

قیصر روم کے دربار میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان سے گفتگو ہوئی ہے تو ذاتِ رسالت مآبؐ کو مطعون کرنے کے لئے وہ سب سے اچھا موقع تھا۔ مگر جب قیصر نے ابوسفیان سے پوچھا کہ "کیا تم نے اس شخص (محمدؐ) کو کبھی دروغ گو بھی پایا" تو اس کے جواب میں ابوسفیان کی زبان سے "نہیں" نکلا۔ اور اس پر قیصر روم کی فراست پکار اٹھی کہ جو شخص آدمیوں کے معاملات میں جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا کی ذات پر افترا، کس طرح باندھ سکتا ہے!

قیصر روم نے بڑی سچی بات کہی ایسا عفیف و معصوم انسان جس کی امانت اور راست بازی کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ چالیس سال کی عمر انتہائی سچائی اور دیانت و شرافت سے گزارنے کے بعد ایکا ایکی خدا پر تہمت کس طرح جوڑ سکتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی ہے اور مجھے اپنا نبی اور رسول بنایا ہے۔ قریش کی سمجھ میں اگر یہ بات نہیں آتی کہ اُنہی میں کا ایک آدمی جو بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہو اور عام انسانوں کی طرح زندگی کی ضروریات بھی رکھتا اور کھاتا پیتا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا رسول بھی ہو سکتا ہے۔ تو یہ اُن کے فہم کا قصور تھا!

سچائی کے اِس اعلان کے بعد اُس پیکرِ شرافت و پاکیزگی اور مجسمۂ عصمت و طہارت کے ساتھ خود اُس کے وطن میں جو دردناک سلوک کیا گیا ہے۔ وہ انسانی تاریخ کا بہت بڑا "المیہ" ہے۔ اگر خدانخواستہ حضورؐ کے پیام میں بناوٹ ہوتی اور اس دعوت کا محرک کوئی لالچ ہوتا تو ان سختیوں، آزمائشوں اور عقوبتوں کے مقابلے میں یہ مُلمع بھلا ٹھہر سکتا تھا؟ اگر آپؐ اپنی ذات کے فائدے کیلئے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ تو اس مقصد کی تکمیل کا سب سے سنہری موقع وہ تھا جب قریش نے مال و دولت کی، قبائل کی سرداری کی اور عورتوں کے حُسن و جمال کی پیشکش کی تھی۔ مگر حضورؐ نے اس پیشکش کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا اور آپؐ دامن جھٹک کر کھڑے ہو گئے۔ قریش کی آنکھیں کھولنے کے لئے تنہا یہی واقعہ بہت کافی تھا۔ مگر اُن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹیاں اتنی کس کر بندھی ہوئی تھیں کہ ہٹنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ صداقت کا آفتاب خود اُن کے وطن میں طلوع ہو رہا تھا اور وہ بدبخت اُس کی روشنی سے محروم تھے۔ ابرِ رحمت اُن کے گھروں پر برس رہا تھا اور وہ اُس سے اس طرح دامن بچا رہے تھے جیسے اُن پر انگارے برس رہے ہیں۔ اُس انسان کی صداقت و استقامت، صبر و ضبط کی قوت اور کردار و سیرت کی بلندی کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے کہ جو لوگوں کے سامنے اخلاق کے پھول پیش کرے مگر اس کے جواب میں اُس پر پتھروں کی بارش کی جائے۔ وہ لوگوں کی زندگیوں کو سنوارنا چاہتا ہو مگر اس خیرخواہی کا صلہ شعبِ ابی طالب کی سختیوں اور طائف کی جراحتوں کی شکل میں اُس کو دیا جائے!

مکہ کی زمین کو حق کی تخم ریزی کے لئے ابھی تیار نہ پاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کا رُخ فرماتے ہیں۔ مگر اس طرح

کہ حضرت علیؓ کو لوگوں کی امانتیں سونپ دیتے ہیں کہ انھیں واپس کر دینا۔ یہ موقع تو خون کے پیاسے دشمنوں کو چکمہ دے کر مالی دولت اینٹھ لینے کا تھا۔ مگر یہاں اس کے برخلاف ان کی امانتیں لوٹائی جا رہی ہیں۔ ہے تاریخ میں اس امانت اور ایفائے عہد کی کوئی مثال؟ دنیا میں جہاں کہیں بھی امانت کا تصور پایا جاتا ہے وہ اسی "صادق الامین" کی سیرت و کردار کا صدقہ ہے!

ہجرت کے بعد مظلومیت کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ مدینہ کی زندگی آزاد اور با اختیار زندگی ہے۔ مکہ کی زندگی کا ایک وہ دورِ مظلومیت کہ دارِ ارقم میں چھپ کر تحریکِ اسلامی کو آگے بڑھانے کے لئے مشورت ہوتی تھی اور مدینہ میں قوت کا یہ عالم کہ بادشاہوں اور حاکموں کے نام حضورؐ فرمان بھیجتے ہیں۔ مگر عفت و عصمت، زہد و عبادت، شرافت، مروت، خدا ترسی، خشیتِ الٰہی اور بے نفسی کی جو روش مکہ میں تھی۔ مدینہ کی فضا میں اس میں ذرہ برابر تغیر پیدا نہیں ہوتا۔

قیصر و کسریٰ کے نام فرمان بھیجنے والا، مملکتِ اسلامی کا صدر کئی کئی وقت فاقے کرتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے اپنے جوتے گانٹھتا ہے۔ اور اس وقت جبکہ وہ دوسروں کو مالِ غنیمت تقسیم کرتا ہوتا ہے، خود اس کی چہیتی بیٹی فاطمہؓ کے سر پر ثابت چادر نہیں ہوتی۔ دوسروں کو غلام اور کنیزیں بانٹی جا رہی ہیں اور فاطمہؓ بنتِ محمدؐ چکی کی مشقت برداشت فرما رہی ہیں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی آل پر صدقہ کو حرام فرما کر "پاپائیت" کے لئے اسلام میں ذرہ برابر گنجائش نہیں رکھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور منہ میں رکھ لی۔ اس پر حضورؐ نے سختی کے انداز میں فرمایا: "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا" پھر حسنؓ کے منہ سے کھجور اگلوا دی۔

"تاریخ کے سیاہ اوراق بتائیں گے کہ دنیا کے نامور فاتحین نے شہروں اور ملکوں کو فتح کرنے کے بعد وہاں کے باشندے والوں کے ساتھ کس قدر دردناک اور کتنا ذلت آمیز سلوک روا رکھا ہے۔ دوسری طرف مکہ کا فاتح ہے کہ جس نے خون کے پیاسے دشمنوں کو ادنیٰ سی باز پرس کے بغیر عام معافی دے دی۔ یہاں تک کہ اپنے سب سے بڑے دشمن ابوسفیان کے مکان کو دار الامن قرار دے دیا۔ فتحِ مکہ صلح و جنگ اور فتح و پسپائی کے اصول کا وہ درخشاں باب ہے جس پر انسانیت رہتی دنیا تک فخر کرے گی!

ایک بار ابو رافع قریش کے سفیر بن کر مدینہ منورہ میں آتے ہیں اور حضورؐ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر ہی ان کے دل کی گرہ کھل جاتی ہے۔ عرض کرتے ہیں کہ یا رسول اللہ! اب میں کافروں کے پاس واپس نہ جاؤں گا۔ حضورؐ نے فرمایا کہ نہ میں عہد شکنی کر سکتا ہوں اور نہ قاصدوں کو اپنے پاس روک سکتا ہوں۔ تم اب تو لوٹ کر مکہ ہی کے چلے جاؤ۔ اگر وہاں جا کر بھی تمہارے دل کا یہی حال رہے تو پھر تم مدینہ آ جانا۔" چنانچہ ابو رافع اس وقت تو مکہ کو لوٹ گئے مگر وہاں جا کر واپس آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس ایفائے عہد کی مثال تاریخ میں کہیں مل سکتی ہے؟ ایسی روشن مثال وہی انسان قائم کر سکتا ہے۔ جو عدل و خیر سے دنیا کو معمور کرنے کے لئے مبعوث ہوا ہو۔ اور جسے کوئی لالچ، کسی قسم کا خوف، کوئی سنہری موقع اور کوئی انفرادی اور اجتماعی فائدہ صراطِ مستقیم سے بال برابر بھی ادھر سے ادھر نہ کر سکے!

ایک ملازم حضورؐ کی خدمت میں بارہ سال تک رہتا ہے۔ مگر کسی ناگوار امر اور خلافِ طبیعت بات پر ملازم اپنے آقا کی زبان سے جھڑکی تک نہیں سنتا۔ ضبطِ نفس، عالی ظرفی اور طبیعت و مزاج کا یہ وہ اعتدالِ کامل ہے — جو

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کسی انسان کو نصیب نہیں ہوا۔

جود وسخا اور ایثار کا یہ عالم کہ آٹے کی پوری ٹوکری سائل کو دے دی۔ حالانکہ گھر میں اس آٹے کے سوا اور کوئی چیز کھانے کے لئے نہ تھی۔ بکری کا سارا دودھ مہمان کی نذر کر دیا۔ اور کاشانۂ نبوت میں یہ رات فاقہ سے گزری!

علیؓ چچا زاد بھائی تھے، بہترین رفیق تھے اور حضورؐ کے تربیت یافتہ تھے۔ ایک بار انہوں نے کسی چیز کا سوال کیا۔ تو فرمایا "یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اہلِ صفہ کو چھوڑ کر تم کو دوں اور وہ بھوک کے مارے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں"۔ بحرین سے خراج کی کثیر رقم آتی ہے۔ مگر حضورؐ اسے دوسروں کو بانٹ دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب کچھ باقی نہیں رہتا تو دامن جھاڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کسی سائل نے "نہیں" زبانِ مبارک سے نہیں سنا۔ ایک بار کوئی چیز دینے کے لئے گھر میں نہ تھی۔ تو مانگنے والے سے فرمایا کہ "تم میرے نام پر قرض لے لینا۔ میں اسے چکا دوں گا"۔ عام اعلان تھا کہ جو مسلمان قرض چھوڑ کر مرجائے اس کا قرضہ میں ادا کروں گا۔ اور اس کا ترکہ اس کے وارثوں کو ملے گا!

نجاشی نے مہاجرین کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا۔ جب حبش کا وفد آیا تو اس کے انتظام کے لئے حضورؐ خود دوڑتے پھرتے تھے۔ حضرت عباسؓ جب بدر میں قید ہو کر آئے تو عبداللہ بن ابی نے اپنا کرتہ ان کو دیا تھا۔ منافقوں کا یہ سردار جب مرا تو حضورؐ نے اس احسان کے بدلے میں اپنا کرتہ عنایت فرمایا۔ اس سے بہتر کفن دنیا میں کسی میت کو نصیب نہیں ہوا۔

شجاعت کا یہ عالم کہ جب گھمسان کا رن پڑتا تو بڑے بڑے بہادر حضورؐ ہی کی پناہ ڈھونڈتے۔ اُحد میں جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور اسلامی لشکر تتر بتر ہو گیا تو حضورؐ ایک کوہِ وقار کی طرح اپنی جگہ جمے ہوئے تھے!

خشیتِ الٰہی کی یہ کیفیت کہ تیز ہوا چلتی تو چہرۂ مبارک فق ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ کے حضور دعا اس خشوع و خضوع کے ساتھ مانگتے جیسے کوئی بھکاری ہاتھ پھیلا رہا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سے ہر وقت زبانِ مبارک تر رہتی۔ اس زہد و تقویٰ کے ساتھ حضورؐ خوش طبع اور نرم خو تھے۔ اکثر متبسم رہتے۔ صحابہ سے کبھی کبھی مزاح بھی فرما لیا کرتے۔ ازواجِ مطہرات کی دل دہی فرماتے۔ خوشبو لگاتے، بالوں میں کنگھی کرتے۔ صاف کپڑے پہنتے۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے اور رہنے سہنے میں سلیقہ، صفائی اور وقار و سنجیدگی کی کوئی حد نہ تھی۔ صحابہ کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے اور دین کے اجتماعی کام میں ان کا ہاتھ بٹاتے!

قرب کا یہ عالم کہ صاحبِ قاب قوسین، بلندی کی وہ کیفیت کہ سدرۃ المنتہیٰ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ مشاہدہ کی وہ وسعت کہ آیاتِ الٰہی کو صورتِ مثال میں دیکھا۔ سماعت وہ معجز نما کہ لوحِ محفوظ پر چلتے ہوئے قلموں کی آواز کو سنا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوبیت اور مقبولیت کی یہ حد و نہایت کہ مشیّتِ الٰہی نے آپؐ کی مرضی کے تیور دیکھ کر قبلہ کی سمت بدل دی۔ انگلی کا اشارہ کیا اور چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ فاتحِ خیبر علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی دکھتی ہوئی آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا اور آنکھیں اچھی ہو گئیں۔ دستِ مبارک میں کنکریاں رسالت کی شہادت دینے لگیں —— ایک طرف معجزات کا یہ عالم اور دوسری طرف صحابہ آپ کو دیکھ کر کھڑے ہوتے ہیں تو حضورؐ اسے پسند نہیں فرماتے۔ کہ یہ عجمی لوگوں کا شعار ہے۔ سلام و مصافحہ میں خود ہی سبقت کرتے۔ بیماروں کے پاس عیادت کے لئے تشریف لے جاتے اور تسکین آمیز جملے ارشاد فرماتے۔ کسی کے گھر جاتے تو ممتاز مقام پر نہ بیٹھتے۔ خود اپنی قبر مبارک کے بارے میں وصیت کی کہ اسے سجدہ گاہ نہ بنا لینا اور وفات سے قبل حضرت عائشہؓ نے یہ الفاظ سنے۔

لعنة الله على اليهود والنصارى اتخذوا قبور انبيائهم مساجد۔

یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔

ایک شخص نے کہا۔ "جو آپ چاہیں اور خدا چاہے"۔ اس کو ناپسند فرمایا اور کہا یوں کہو کہ "جو (تنہا) خدا چاہے"۔ "یہ بی وہ ہیں کُل (غیب) کی باتیں جانتے ہیں"۔ اس کے کہنے سے کمسن لڑکیوں کو روک دیا۔ "بدعت" کو حضورؐ نے "ضلالت" فرما کر دین میں ایجاد و اختراع کی راہ بند کر دی کہ اللہ کا دین نئی نئی باتوں کے سبب کھیل بن کر نہ رہ جائے۔ کبھی ایسی بات زبانِ مبارک سے نہیں فرمائی جو اللہ اور بندے کے فرق کو مشتبہ کرنے والی ہو!

اسوۂ رسولؐ ہی سب کچھ ہے!

"آدمی اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے" جس نے بھی یہ کہا سچ کہا۔ بُرے آدمی کے بھلے ساتھی ہو ہی نہیں سکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی زندگیاں آپؐ کی راست بازی اور داعیٔ حق و صداقت ہونے کی سب سے بڑی دلیل نہیں دلیلیں ہیں۔ ان میں کا ہر فرد اپنی جگہ آسمانِ ہدایت کا روشن ستارہ اور انسانی معاشرے کا گوہرِ شب چراغ تھا۔ انبیاء کے بعد اس بلند سیرت و کردار کے انسان دُنیا میں پیدا ہی نہیں ہوئے۔ سیاست و معاشرت کے چہرے کو اُنہوں نے دھویا۔ تہذیب و تمدن کی زلفوں کو انہوں نے سنوارا۔ خدا ترسی اور انسان دوستی کی مثالیں اُن نیک انسانوں نے قائم کیں اور نیکی کی بنیاد اور کتاب و سنّت کی اساس پر اپنے دَور کی سب سے بڑی حکومت کو چلا کر انہوں نے دکھا دیا۔ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم

سیرت و کردار کا، سیاست و معاشرت کا اور دُنیا کے جغرافیہ کا یہ بے نظیر انقلاب صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کو دلیلِ راہ بنانے کے سبب ظہور میں آیا۔ اور آج بھی دُنیا میں تعمیری انقلاب اُسی وقت آئے گا جب انسانِ کامل "کا پیش کیا ہوا نقشہ عُنوانِ عمل اور موضوعِ فکر و نظر ہوگا!

جو کوئی حیوان رہنا چاہتا ہے تو وہ شوق سے اس گندگی میں مُبتلا رہے مگر جسے انسان بننا مطلوب ہو تو اس کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے ہدایت اور روشنی حاصل کرے!

دُنیا اگر فوز و فلاح اور سکون و اطمینان چاہتی ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات کے مطابق اپنے کو بدلے، چاہے اس تبدیلی میں معاشرے کی ایک ایک اینٹ کو کیوں نہ اُکھیڑنا پڑے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ تمدن و تہذیب اور معاشرے کی غلط کاریوں سے نباہ کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں ایک شوشہ کی بھی تبدیلی گوارا کر لی جائے۔ زندگی اور ترقی نام ہی اسوۂ حسنہ کے اتباع کا ہے۔ جہاں یہ اتباع نہیں وہاں رجعت ہے، زوال ہے اور موت ہے!

اسی انسانِ کامل اور پیغمبرِ خاتمؐ کی سیرت "فاران" کے اس خاص شمارے کا موضوع ہے۔ لکھنے والوں نے اپنی استعداد اور علم و بصیرت کے مطابق خوب خوب لکھا ہے مگر اتنا کچھ لکھنے کے بعد حضورؐ کی سیرت کے کسی ایک نقش کا تھوڑا سا بھی حق ادا نہیں ہو سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں جو کوئی بھی نذرِ عقیدت پیش کرتا ہے تو یہ چیز خود اس کیلئے باعثِ افتخار اور موجبِ سعادت ہے۔ کسی کی تعریف و منقبت حضورؐ کے اوصاف میں اضافہ نہیں کر سکتی؟

آؤ ہم سب مِل جُل کر شہادت دیں کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں"۔ یہ شہادت ہم اپنی زبان سے بھی دیں اور عمل و کردار سے بھی۔ اپنی زندگیوں سے اس دو رنگی کو دُور کر دیں کہ زبان تو گواہی دیتی ہے مگر زندگی اسے جھٹلاتی ہے۔ یہ نفاق کی حالت کب تک؟ یہ پیمان شکنی تا کجا؟

دُنیا جن پُر آشوب حالات سے گزر رہی ہے اُس کیلئے انقلاب ناگزیر ہے۔ دُنیا میں انقلاب آ کر رہیگا۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ انقلاب کس راہ سے آتا ہے۔ نیکی کی راہ سے یا بُرائی کی راہ سے! ہم جو "خیرِ امم" کہلاتے ہیں، ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ اس انقلاب کی زمام کار ہمارے ہاتھ میں ہو اور تمام دُنیا کو ہم خیر و سعادت سے معمور کر دیں۔ یہاں تک کہ اسوۂ رسولؐ کے سایۂ دامن سے کوئی زندگی اور کوئی خطۂ ارض باہر نہ رہے!

امیدوارِ شفاعت — ماہر القادری ۲۹

سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

بارگاہِ رسالتؐ کے عقیدتمندوں سے

ربیع الاول کے مہینے میں دُنیا بھر کے مسلمان خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک یاد تازہ کرتے ہیں۔ آپؐ پر درود و سلام بھیجتے ہیں، آپؐ کی سیرت پاک کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ اور بے شمار طریقوں سے روحِ اقدس کے حضور اُس عقیدت کا خراج پیش کرتے ہیں جس سے ہر مسلمان کا دل لبریز ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ قابلِ قدر ہے۔ مگر ایک چیز ایسی ہے جس کی طرف سے بالعموم غفلت برتی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے بھیجنے والے نے صرف خراجِ عقیدت وصول کرنے نہیں بھیجا تھا۔ بلکہ خراجِ اطاعت اور خراجِ اتباع وصول کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ یہ خراج اگر ادا کیا جائے تو اس کے ساتھ عقیدت کا خراج جتنا بھی ادا ہو۔ اُس بارگاہ میں قابلِ قبول ہے۔ ورنہ اندیشہ اور نہایت قوی اندیشہ ہے کہ اطاعت و اتباع سے عاری اور نافرمانی سے آلودہ عقیدت نہ خدا ہی کی بارگاہ میں قبول ہوگی نہ حضورؐ کے بھیجنے والے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں!

کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس موقع پر جبکہ ہر طرف حضورؐ کا ذکرِ خیر ہو رہا ہے اور ہر مومن کا دل اس طرف متوجہ ہے۔ میں اپنے دینی بھائیوں کو وہ تنبیہات یاد دلاؤں جو اس معاملہ میں اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں اور خود سرکارِ رسالت مآبؐ نے احادیث میں فرمائی ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب - رکوع ۵)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اُس کا رسولؐ کسی معاملہ کا فیصلہ کردے تو پھر اُن کو خود اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ یقیناً کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

یہ آیت ہر مسلمان کو فرداً فرداً اور پوری اُمّت کو مجتمعاً اس بات پر متنبہ کرتی ہے کہ ایمان اور خود مختاری ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے ہو تو پھر آزاد و خود مختار نہ بنو۔ تمہارے اختیارات کی آخری حد اُس جگہ ختم ہو جاتی ہے جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کا کوئی فیصلہ کسی معاملہ میں بھی مل جائے۔ اس کے بعد ہدایت کی راہ یہ ہے کہ تم اس فیصلے کی اطاعت کرو۔ اور ضلالت کی راہ یہ ہے کہ تم اس کی خلاف ورزی کرو۔ دُوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:-

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (النساء - رکوع ۹)

پس نہیں۔ تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اے رسولؐ، تم کو اس معاملہ میں حَکَم نہ بنائیں جس میں اُن کے درمیان اختلاف ہوا ہو۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے اپنے دل میں کوئی تنگی تک محسوس نہ کریں بلکہ سربسر تسلیم کرلیں!

اس آیت میں اوپر کی حقیقت کو اور زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی رُو سے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تمام معاملات میں رسولِ پاک کو حاکم تسلیم کیا جائے اور آپؐ کے فیصلے کو بسر و چشم مان لیا جائے۔ آیت صاف الفاظ میں تنبیہ کر رہی ہے کہ آنحضورؐ کے فیصلے پر دل میں انقباض تک محسوس کرنا ایمان کے منافی ہے۔ کجا کہ کھلم کھلا آدمی آپؐ کے فیصلوں کو ٹھکرا دے اور پھر عقیدت و محبت کا دعویٰ بھی کرے!

آخری اور شدید تر تنبیہ یہ ہے کہ:۔

فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (النور۔ رکوع ۹)

پس ڈرنا چاہیئے اُن لوگوں کو جو رسولؐ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں کہ وہ کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں یا اُن پر دردناک عذاب نازل ہو جائے!

"فتنے" اور "عذاب" کے الفاظ وسیع مفہوم کے حامل ہیں۔ آپس کے تفرقے اور خانہ جنگیاں، نظامِ جماعت کی پراگندگی۔ داخلی انتشار، دلوں کا بگاڑ۔ نیتوں کا فساد، اخلاق کا زوال۔ سیاسی و مادی طاقت کا سقوط۔ جابر و ظالم حاکموں کا تسلط، غیروں کی غلامی، یہ سب اور نہ معلوم اور کیا کیا کچھ فتنے اور عذاب کی وہ صورتیں ہیں جو اللہ کے بھیجے ہوئے نبیؐ رحمت کی نافرمانی کے باعث اس دُنیا میں رونما ہو سکتی ہیں اور ہو چکی ہیں اور آخرت کی باز پرس اس سے مہیب تر ہے۔ جس سے آگے دوچار ہونا ہے۔

یہ تو ہیں اللہ تعالیٰ کے ارشادات۔ اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان یہ ہے کہ:۔

لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ (مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام)

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہشِ نفس اُس چیز کی تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں"۔

اِن ارشادات کی روشنی میں ہر شخص کو سوچنا چاہیئے کہ اتباع و اطاعت کے بغیر نری محبت و عقیدت جس کا ہم لوگ مظاہرہ کیا کرتے ہیں۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی نگاہ میں کیا قدر و قیمت رکھتی ہے!

میری اس گزارش کا مدعا یہ نہیں ہے کہ جو اتباع و اطاعت نہیں کرتے وہ عقیدت و محبت بھی نہ رکھیں۔ بلکہ اس کے برعکس میرا مدعا یہ ہے کہ جو عقیدت و محبت رکھتے ہیں وہ اتباع و اطاعت بھی کریں۔ فی الواقع یہ عجیب حالت ہے کہ ہم میں سے ایک ایک بڑھ چڑھ کر دُنیا کے سامنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دکھائی ہوئی راہ کے واحد صراطِ مستقیم ہونے کا اعلان کرتا ہے اور پھر وہی دُنیا ہم کو صریح طور پر اس صراطِ مستقیم سے منحرف دیکھتی ہے۔ سوچنے والے دل ضرور سوچیں گے اور پُوچھنے والی زبانیں یہ پوچھیں گی بھی کہ اللہ کے بندو! جب تمہارے نزدیک واقعی یہ صراطِ مستقیم ہے تو اسے چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلنے کے لئے تمہیں کس نے مجبور کیا ہے؟ تمہاری زبانیں کہتی ہیں کہ رسولِ خدا کا طریقہ برحق ہے۔ اُن کی زندگی مثالی زندگی ہے۔ اُن کا حکم واجب الاطاعت ہے۔ اور ساری دُنیا کی فلاح صرف اُن کے اتباع میں ہے۔ مگر تمہارا عمل کہتا ہے کہ اُنؐ کا بتایا ہوا کوئی طریقہ تمہیں پسند نہیں۔ اُنؐ کے کسی حکم کی اطاعت پر تم راضی نہیں۔ اور فلاح تمہیں ہر راستہ میں نظر آتی ہے۔ مگر نہیں نظر آتی تو اسی ایک رسولؐ کے راستہ میں جس کے اتباع کی دوسروں کو دعوت دیتے ہو۔ اس روش کو اگر ایک غیر مسلم مضحکہ انگیز قرار دے تو آخر ہم کیا جواب دے کر اسے مطمئن کر سکتے ہیں؟ اور جو چیز معمولی انسانوں کو کھٹکتی ہو کیا ہم توقع رکھتے ہیں کہ اللہ کی نگاہِ حقیقت بیں اسے پسند کرے گی؟

ڈاکٹر حامد حسن بلگرامی

سیرتِ پاک کی چند جھلکیاں

یہ مختصر تقریر میلاد النبیؐ کے مبارک موقع پر پاکستان سفارت خانہ لندن میں ۱۹۵۵ء میں مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت کے سامنے کی گئی۔ جس میں چند وزرائے پاکستان، ہائی کمشنر۔ فوجی افسر۔ تاجر۔ طالب علم اور مختلف پیشہ کے پاکستانی مسلمان شریک تھے۔

میرے بزرگو۔ عزیزو اور بہنو!

آج اس ذاتِ اقدس کی سیرت کا ذکر ہے۔ جس کو رب العالمین نے رحمت اللعٰلمین کے لقب سے نوازا۔ آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو تخلیق فرما کر انسان پر اس احسان کا ذکر نہ کیا۔ لیکن جس ذات کو اس مبارک مہینہ میں مبعوث فرمایا۔ اس کے متعلق یوں ارشاد ہوتا ہے:۔

لقد من اللہ علی المومنین و بعث فیہم رسولاً من انفسھم یتلو علیہم آیٰتہ و یزکیہم و یعلمہم الکتٰب والحکمۃ۔ وان کانو من قبل لفی ضللٍ مبین۔

اللہ نے واقعی ایمان والوں پر احسان کیا۔ جب اُن ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ جو اُن کو اُس کے احکام سُناتا ہے اور اُن کے نفوس کو پاک کرتا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور یقیناً اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔

میرے بزرگو! گو یہ ذات تمام کائنات کے لئے رحمت تھی۔ لیکن اس آیت کا خطاب ایمان والوں سے ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ جو اس کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کے لئے بیتاب ہیں، وہی اس احسان کی قدر کر سکتے ہیں اور وہی کلام اللہ میں اس احسان کے مستحق پائے۔

میرے عزیزو!

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا صفات تھے جس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مراتب پر فائز کیا۔ بے شک اللہ کے برگزیدہ رسول اور اس کے محبوب بندے تھے۔ لیکن نبیوں کا سلسلہ اُن سے پہلے سے بھی قائم تھا۔ اور ہر نبی اپنے اپنے زمانے میں خدا کے بتائے ہوئے راستے پر شمعیں روشن کرتا چلا جاتا تھا۔ کسی نے صبر کی تلقین کی۔ کسی نے شجاعت اور عزم کا راستہ دکھایا۔ کسی نے اللہ سے محبت کے انداز بتائے۔ کسی نے تواضع اور خاکساری سکھائی۔ مگر بیشک اسلام کی راہوں کو اجاگر کرنے میں اُن سب کا حصہ ہے۔ لیکن جس ذات کو خاتم النبیین کہہ کر مبعوث کیا گیا۔ یہ وہ ذات ہے جو

اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے آئی تھی۔ جس کے لئے خود انسان کو پیدا کیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وما خلقت الجن والانس الا یعبدون!

ہم نے انسان اور جنوں کو نہیں پیدا کیا۔ مگر اس لئے کہ وہ عبادت کریں!

یہ وہ ذاتِ اقدس ہے جو انسان کو یہ بتانے کے لئے آئی تھی کہ تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی رہتی دنیا تک کس طرح عین عبادت بن سکتی ہے۔ کن اصولوں کے پیشِ نظر زندگی بسر کرنی ہے اور کس طرح اپنے فرائض اور حقوق کی ادائیگی سے زندگی کا ہر لمحہ اور ہر سانس عبادت بن جایا کرتی ہے۔

یہ ذات خود انسانیت کو مقام انسانیت سے آشنا کرنے آئی تھی۔ وہ مقام جو مرتبہ میں فرشتوں سے بھی بلند ہے۔ یہی وہ ذات ہے جو انسان کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص یہ سمجھانے کے لئے آئی تھی کہ اسلام تمہاری مکمل زندگی کا نام ہے۔ یہی وہ ذات ہے جو اہلِ دنیا کے سامنے شہادت دینے آئی تھی، جو فاران کی چوٹیوں سے ایسے کامل یقین اور ایمان کے ساتھ دی گئی کہ کائناتِ عالم اس شہادت سے گونج اٹھی۔ اور جس کی صدائے بازگشت آج بھی ہر مومن کے قلب میں سنائی دیتی ہے۔ اور یہی وہ ذات ہے جس نے اپنے ہر عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ جو شہادت زبان سے دی جاتی ہے وہی شہادت زندگی کے ہر فعل اور ہر عمل سے کیونکر دی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

اور مومنوں کو یہ بشارت دی:۔

وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔　اور تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن ہو۔

آج میٹھے میٹھے الفاظ اور عمدہ عمدہ تقریروں کی کمی نہیں۔ آج جس چیز کی کمی ہے وہ ان تقریروں پر ایمان اور اس پر عمل کی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس سراج منیر، ہادی برحق اور رحمۃ للعالمین کے اس عملی پہلو پر نظر ڈالیں۔ جس نے کلام اللہ کے ایک ایک لفظ کی تفسیر اپنے عمل سے کر دکھائی اور جو خود سرچشمۂ ایمان و عمل تھا۔ جانتے ہو تمہارا رسول بزبانِ الٰہی کیا کہتا ہے:۔

اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب افلا تعقلون۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

لِمَ تقولون ما لا تفعلون۔　کیوں تم کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

انسان کی عملی سیرت کا نام خُلق ہے۔ قرآن نے اپنے شارح کی نسبت کھُلی گواہی دی ہے:۔

وان لک لاجراً غیر ممنون وانک لعلیٰ خلق عظیم۔

اے محمدؐ بیشک آپ کی مزدوری نہ ختم ہونے والی ہے اور بیشک آپ اخلاق کے بڑے درجہ پر ہیں۔

اس سیرت کی تشریح کلام اللہ کے اوراق کرتے ہیں۔ ایک بار حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک شخص نے رسول اکرمؐ کی سیرت کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم نے کلام اللہ نہیں پڑھا۔ منشا یہ تھا کہ جو خلق و سیرت کلامِ الٰہی میں ہے وہ سب مجسم ہو کر آپ کی زندگی میں نظر آتا تھا۔ یا اسی کی ترجمانی یوں کرو کہ آپ کا اخلاق ہمہ تن قرآن تھا۔ جس کا اخلاق ہمہ تن قرآن ہو۔ اس کی تفصیل کون ہے جو بیان کر سکے۔ عام سیرت کے متعلق احادیث سے چند ان نفوس کی

شہادتیں عرض کرنے کو جی چاہتا ہے۔ جو اس ذات اقدس سے واقف تھے۔

انسان کے اخلاق، عادات اور اعمال کا بیوی سے بڑھ کر واقف کار کون ہو سکتا ہے۔ آنحضرتؐ نے جب نبوت کا دعویٰ کیا تو اس وقت حضرت خدیجہؓ سے نکاح کو پندرہ سال ہو چکے تھے۔ یہ مدت آپؐ کی سیرت سے متاثر ہونے کے لئے کافی بڑی مدت ہے۔ اِدھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کلمۂ شہادت نکلتا ہے۔ اُدھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا صدق دل سے اس کی تصدیق فرماتی ہیں:۔

"یا رسول اللہ خدا آپ کو ہرگز تنہا نہیں چھوڑے گا۔ کیونکہ آپ قرابت والوں کا حق پورا کرتے ہیں۔ مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں۔ غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ حق کی طرفداری کرتے ہیں۔ مصیبتوں میں آپؐ لوگوں کے کام آتے ہیں"۔

یاد رہے کہ یہ تصدیق نبوت سے قبل کی زندگی کی ہے۔ عورتوں کے لئے یہ بات ہمیشہ باعث فخر رہے گی کہ رسولؐ کے فرمان پر وحدت اور رسالت کی سب سے پہلے زبان و عمل سے تصدیق کرنے والی ایک خاتون ہی تھی۔

حضرت علیؓ سے بڑھ کر رشتہ داروں میں کوئی آپؐ کے دن رات کے حالات اور اخلاق سے واقف نہ تھا۔ وہ بچپن سے جوانی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ وہ گواہی دیتے ہیں کہ:۔

"آپؐ ہنس مکھ، طبیعت کے نرم۔ اخلاق کے نیک تھے۔ طبیعت میں مہربانی تھی۔ سخت مزاج نہ تھے۔ کوئی برا کلمہ کبھی منہ سے نہ نکالتے۔ لوگوں کے عیب اور کمزوری کو نہ ڈھونڈتے کسی کی کوئی فرمائش اگر مزاج کے خلاف ہوتی تو خاموش رہ جاتے۔ نہ اس کو صاف جواب دے کر مایوس کرتے اور نہ "ہاں" فرماتے۔ واقف کار اس انداز خاص سے سمجھ جاتے کہ آپؐ کا منشاء کیا ہے۔ یہ اس لئے تھا کہ آپؐ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ دلوں پر مرہم رکھتے کہ آپؐ رؤف و رحیم تھے"۔

صحابہؓ نے آپؐ کی فیاضی۔ راست گوئی۔ نرم طبعی۔ خنداں پیشانی کا اکثر ذکر کیا ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ حضورؐ کو جب کوئی پہلے پہل دیکھتا تو مرعوب ہوتا۔ لیکن جیسے جیسے وہ آپؐ سے ملتا تو آپؐ سے محبت کرنے لگتا"۔

آپؐ نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کی نصیحت کی تو خود یہ نمونہ پیش کیا کہ زندگی کا کوئی لمحہ نہ تھا کہ دل یاد الٰہی سے غافل ہو۔ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے۔ غرض ہر حال میں اور ہر وقت خدا کی یاد ہے اور اس کی حمد زبان پر جاری ہے۔

نماز کی تلقین کی تو خود اس طرح نماز پڑھی کہ رات رات بھر نماز میں کھڑے رہتے۔ یہ وہ نماز تھی جو خوف سے نہیں بلکہ اللہ کی محبت کے جذبہ سے ادا ہوئی۔ یہی حال روزوں کا تھا۔ رمضان اور دیگر روزوں کے علاوہ۔ کبھی کبھی کھائے پئے بغیر متصل روزے رکھتے تھے اور اس عرصہ میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا۔ صحابہ اس کی تقلید کرنا چاہتے تو فرماتے:۔

"تم میں سے کون میرے مانند ہے مجھ کو تو میرا آقا کھلاتا اور پلاتا ہے"۔

زکوٰۃ وخیرات کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ ہوتا وہ تقسیم ہو جاتا اور اکثر فاقوں پر فاقے ہوئے۔ فرمایا کرتے کہ اصل دینے والا تو خدا ہی ہے۔ میں تو خزانچی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ تواضع کا یہ حال کہ چیز کتنی ہی تھوڑی ہو۔ تنہا نہ کھاتے۔ جب تک کہ سب

حاضرین کو اس میں شریک نہ فرما لیتے۔ غریب نوازی کا یہ عالم تھا کہ جب عرب کے اطراف سے آ کر صحن مسجد میں مال و اسباب کا انبار لگا ہوتا اور خود اُس کے گھر میں فاقے کی تیاری ہوتی۔

عدل کی یہ حالت کہ جب لڑائیوں کے قیدی مسلمانوں کے گھروں میں لونڈی اور غلام بنا کر بھیجے جا رہے ہیں۔ حضرت فاطمۃ زہرا، رسول کی جگر گوشہ تشریف لاتی ہیں اور ہاتھوں کے چھالے اور سینہ کے داغ باپ کو دکھاتی ہیں۔ جو چکی پیستے پیستے اور مشکیزہ بھرتے بھرتے ہاتھ اور سینہ میں پڑ گئے تھے۔ ایک لونڈی کا مطالبہ فرماتی ہیں۔ کاشانۂ نبوت سے جواب ملتا ہے۔

"اے جگر گوشۂ رسول ابھی اصحاب صفہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں"

عزم و اعتماد الٰہی کا یہ عالم کہ احد میں بہت سے مسلمانوں کے قدم پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن رسولِ عربی ہیں کہ پتھر کھا رہے ہیں۔ نیزوں، تلواروں اور تیروں کے حملے ہو رہے ہیں۔ لیکن میدان میں ایک آواز ہے کہ لوگوں کو پھر جمع کر رہی ہے:۔

"میں پیغمبر ہوں۔ جھوٹ نہیں ہے۔ میں عبد المطلب کا پوتا ہوں"

تلوار پر ہاتھ نہیں اٹھتا۔ دعا کے لئے ہاتھ بلند ہیں۔

عفو و درگزر کا ذکر کرتے وقت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد کے نمونے لئے جائیں۔ جب مسلمانوں کو قدرت حاصل تھی۔ مجبوری ولاچاری کی زندگی نہ تھی۔

جو شخص بدر۔ احد۔ خندق وغیرہ لڑائیوں میں دشمنوں کا سردار تھا۔ جس نے نہ جانے کتنے مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا جب رسول کے سامنے لایا جاتا ہے تو آپ نہ صرف اُسے معافی دیتے ہیں بلکہ فرماتے ہیں:۔

"جو ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے گا۔ اس کو بھی امن ہے"

ہندہ۔ ابو سفیان کی بیوی۔ وہ ہندہ جو احد کے معرکہ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی ہے۔ جو حضور کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی لاش کے ساتھ بے ادبی کرتی ہے۔ اُن کے سینہ کو چاک کرتی ہے۔ اُن کے کان ناک کاٹ کر ہار بناتی ہے۔ کلیجہ کو نکال کر چبانا چاہتی ہے۔ فتح مکہ کے بعد نقاب ڈالے ہوئے سامنے آتی ہے اور اُس وقت بھی گستاخی سے باز نہیں آتی۔ آپ اس پر بھی تعرض نہیں فرماتے۔ اور ہندہ اس عفو و کرم۔ تحمل و درگزر اور وسعتِ ظرف کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھتی ہے:۔

"اے محمدؐ! آج سے پہلے تمہارے خیمہ سے زیادہ کسی خیمہ سے مجھے نفرت نہ تھی۔ لیکن آج تمہارے خیمہ سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں"

یہی نمونۂ زندگی تھا جس نے بیس سال کے اندر سوا لاکھ سے زیادہ جان نثاروں کی تعداد گرد جمع کر دی۔ یہ وہ زندگی تھی جس نے انہی وحشیوں میں سے وہ لوگ پیدا کر دیئے جن کے نمونے دنیا میں ڈھونڈے نہیں ملتے۔

اسی ذاتِ اقدس کی نگاہ کیمیا اثر اور فیض صحبت نے ابوبکرؓ و عمرؓ۔ عثمانؓ و حیدرؓ پیدا کئے۔ اسی کی تلقین نے خالد بن ولید اور عمرو بن عاصؓ جیسے جنرل پیدا کئے۔ ابو ہریرہؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ جیسے محدث۔ ابوذرؓ جیسے صاحب فقر و توکل اور بلالؓ جیسے محبت کرنے والے ہزاروں کی تعداد میں پیدا کر دیئے۔

آج بھی یہ کامل اور جامع ذات بزبانِ الٰہی اعلان کر رہی ہے:۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ!

اگر تم کو خدا کی محبت کا دعویٰ ہے تو آؤ میری پیروی کرو۔ اگر تم حاکم ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر تم رعایا ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر تم سپہ سالار ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر تم سپاہی ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر تم دولتمند ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر تم غریب ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر بے کس و مظلوم ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر خدا کے عابد ہو تو میری پیروی کرو۔ اگر قوم کے خادم ہو تو میری پیروی کرو۔ غرض زندگی و آخرت کی جس نیک راہ پر بھی ہو اس کے لئے بلند سے بلند اور عمدہ سے عمدہ نمونہ چاہتے ہو تو میری پیروی کرو۔

صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین!

آؤ خدا سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس نبی برحق کی سیرت پر چلنے کی سعادت اور توفیق عطا فرمائے!

پروردگارِ عالم ہم گنہگار ہیں۔ لیکن تیرے اور تیرے رسولؐ کے نام لیوا ہیں۔ ہم تیرے دربار میں حاضر ہیں۔ اور صدقِ دل سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ پروردگار عالم! تُونے جس مقصد کے لئے مسلمانوں کو پیدا کیا تھا ہم اُس مقصد سے کوسوں دُور ہو گئے۔ خود غرضی، دولت پرستی، خوشامد، ذہنی اور روحانی غلامی، جس سے تُونے ہمیں آزاد فرمایا تھا۔ آج اُس نے پھر ہماری زندگی پر تسلط پا لیا ہے۔ ہمارے قول و فعل میں کوئی ربط نہیں رہا۔ اور ہم راہ سے بے راہ ہو گئے۔ پروردگار! ہماری دستگیری فرما اور ہمیں زندگی کی اعلیٰ قدروں سے نواز۔ ہمیں وہ علم دے جس سے قومیں ترقی کرتی ہیں۔ وہ عزم و استقلال دے جو مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے سپر بن جاتا ہے۔ وہ حوصلہ دے کہ ہم پھر دُنیا میں تیرا نام بلند کرنے اور اسلام کو ایک عملی زندگی کا بہترین نمونہ پیش کرنے میں کامیاب ہوں۔ وہ اخوت دے کہ اسلام کے ٹوٹے ہوئے تار پھر جڑ جائیں اور ان سے وہ نغمہ پیدا ہو جس میں گریۂ شب کی لذت اور عملِ پیہم کا نشہ ہو۔ (آمین)

در جہانِ ذکر و فکرِ انس و جاں
تو صلاۃِ صبح تو بانگِ اذاں
(اقبال)

سید ابوالحسن علی ندوی

دُعا

(سیرتِ نبوی کا ایک اہم باب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں جو کمالات جمع تھے اُن کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ عبدیتِ کاملہ و نبوتِ جامعہ۔

عبدیت کا ظہور اور نتیجہ دعا ہے۔ اور نبوت کا مظہر دعوت ہے۔ یہ دونوں سیرتِ محمدی کے اہم اور نمایاں عنوان اور اس صحیفۂ اعجاز کے دو مستقل باب ہیں۔ دعوت پر سیرتِ محمدی کے ہر طالب علم اور ہر مصنف کی نظر پڑتی ہے۔ اس کی تفصیلات سے کتابیں بھری ہیں اور اس کے آثار و نتائج تمام دُنیا میں درخشاں و تاباں ہیں۔ دعوت جلوت کی چیز ہے اس لئے سب کو بے پردہ و بے نقاب نظر آئی۔ لیکن (میری کوتاہ نظر میں) اس حقیقت پر بہت کم لوگوں کی نظر پڑی کہ دعا کو سیرتِ نبوی میں کیا مقام حاصل ہے۔ اور خود دعوتِ نبوی کی تاثیر و تسخیر میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہے۔ اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عبدیت کے اس شعبہ کو عروج و ترقی کی کس حد تک پہنچایا۔ کس طرح آپ نے اس شعبہ کا (جو عبدیت و عبادت کے تمام شعبوں اور مظاہر کی طرح مردہ و افسردہ ہو چکا تھا) احیاء اور اس کی تجدید فرمائی پھر اس کی تکمیل اور تعمیم فرما کر دُنیا سے تشریف لے گئے۔

جن لوگوں کی مذاہب و عقائد کی تاریخ پر گہری اور تفصیلی نظر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس دَور میں جو جاہلیت کے نام سے موسوم ہے عبد و معبود کے تعلق میں اتنا اضمحلال پیدا ہو گیا تھا کہ دعا کا سرچشمہ (جو یقین اور محبت و خوف کے بغیر جاری نہیں ہو سکتا) اندر ہی اندر خشک ہو گیا تھا۔ عبد اپنے اور معبود کے متعلق اتنی غلط فہمیوں اور اتنی جہالتوں کا شکار تھا کہ اس کے اندر دعا کا جذبہ اور تقاضا پیدا ہونا ہی مشکل تھا۔ دعا کے لئے اس ہستی کے یقین کی ضرورت ہے جس سے دعا کی جائے۔ پھر اس یقین کی کہ اس کو ہر طرح کی قدرت ہے۔ اور دینے کے لئے اس کے پاس سب کچھ ہے۔ پھر اس یقین کی کہ اس کے در کے سوا کوئی اور در نہیں۔ پھر اس یقین کی کہ وہ خود بھی دینا چاہتا ہے۔ اور محبت و رحمت، بخشش و عطاء اور احسان و انعام اس کی خاص صفت ہے۔ اور کوئی لے کر اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا وہ دے کر خوش ہوتا ہے۔ پھر اس یقین کی کہ مخلوق محتاجِ محض اور سر تا پا کشکولِ گدائی ہے۔ پھر اس یقین کی کہ وہ معبود اپنی ہر مخلوق سے دُنیا کی ہر چیز سے۔ یہاں تک کہ اس کی شہ رگ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہے۔ وہ ہر ایک کی سنتا ہے اور ہر ایک کی ہر حال میں مدد کر سکتا ہے۔

جاہلیت کی تاریخ پر نظر ڈالئے۔ اُن میں سے ہر یقین کتنا نایاب اور مضمحل ہو چکا تھا۔ اور ان حقائق میں سے ہر حقیقت کے بارے میں کتنے شبہات و حجابات اور کتنے توہمات اور مغالطے پیدا ہو چکے تھے۔ یونانی فلسفہ کو "واجب الوجود" یا "مبداءِ اوّل" کی صفات سے جتنا گریز و انکار اور صفات کی نفی اور مجرد و بلا صفت ذات کے اثبات پر جتنا اصرار تھا۔

اس کے بعد اس کے حلقۂ اثر میں دعاء والتجا کا کیا امکان باقی رہ جاتا تھا! جس ذات کے متعلق کسی صفت کا علم نہیں بلکہ اس سے ہر صفتِ کمال کی نفی کی جارہی ہے۔ اس سے سوال کرنے کا اور مدد چاہنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ جس کو کارخانۂ قدرت میں کوئی دخل نہیں۔ جو "عقل اوّل" کو پیدا کرکے "معطل" ہو گیا۔ جس "واحد" سے ایک ہی "واحد" کا صدور ممکن تھا ہے[1] اور وہ ہو چکا۔ اس سے ہر دم اور ہر آن مئے نئے افعال و احکام کے صدور کی توقع کب حق بجانب ہو سکتی ہے؟

اس کے مقابلہ میں مشرکانہ جاہلیت اور "وثنیت" نے صفاتِ الٰہیہ میں سے تقریباً ہر صفت کو کسی نہ کسی مخلوق کی طرف منسوب کر رکھا تھا۔ کوئی احیاء پر قادر تھا۔ کسی کے ہاتھ میں رزق تھا۔ کسی کا علم محیط و ہمہ گیر تھا۔ اور ہر "غیب" اس کے لئے "شہود" تھا۔ کسی کے لئے زمان و مکان کے حجابات اُٹھ چکے تھے اور وہ اپنے پرستاروں کی ہر جگہ اور بیک وقت سب کی مدد کر سکتا تھا اور ہر جگہ پہنچ سکتا تھا۔ وقس علیٰ ھذا۔ ایسی حالت میں "اِلٰہ واحد" کی طرف رجوع کرنے اور اس کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے کا کیا امکان تھا۔ خصوصاً جبکہ وہ نظر سے اوجھل ہو اور مقامی اِلٰہ نظر کے سامنے اور دسترس کے اندر ہوں۔ اسی کے ساتھ اس کو بھی ذہن میں رکھئے کہ جاہلیت کے اس دور میں صفات و افعالِ الٰہیہ کا ذکر و تذکرہ بھی مفقود اور اُن کا علم صحیح تقریباً معدوم ہو چکا تھا اور "الٰہ کثیرہ" کی کارفرمائیوں اور کارسازیوں کی داستانوں سے مجلسیں معمور اور قلب و دماغ مسحور تھے۔ ایسی حالت میں وہ "ذہنی کیفیت" بالکل قدرتی اور طبعی تھی۔ جس کا قرآن مجید نے نقشہ کھینچا ہے کہ:۔

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ

وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۔ (الزمر ع)

اور جبکہ ایک اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اُن کے دل نفرت کرتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو فوراً خوش ہو جاتے ہیں۔

بہرحال یونانی فلسفہ نے (اس مسلک کی بناء پر جو اس نے صفات کے بارے میں اختیار کیا تھا) دعاء والتجاء کا دروازہ ہی بند کر دیا تھا اور مشرکانہ جاہلیت نے (صفاتِ الٰہیہ کو مخلوقات کی طرف منسوب کر کے) دعاء والتجاء کا رُخ خدا سے موڑ کر بندوں کی طرف تبدیل کر دیا تھا۔ دونوں کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ براہ راست خدا سے طلب و سوال اور دعا والتجا کا رواج ہی تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ زمانہ بعثت میں پورے پورے ملک اور وسیع علاقوں میں ایسے چند آدمی بھی ملنے مشکل تھے جن کو خدا سے دعا کرنے کی عادت اور اس کا سلیقہ ہو۔ اور جو اس سے تسکین حاصل کرتے ہوں اور اسی کی دعوت دیتے ہوں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ارواحنا و نفوسنا فداہ) نے محروم و محجوب انسانیت کو دوبارہ دعا کی دولت عطا فرمائی اور بندوں کو خدا سے ہم کلام کر دیا۔ اور دعا کی کیا دولت عطا فرمائی۔ بندگی کی بلکہ زندگی کی لذت اور عزت عطا فرمائی۔ اس مطرود انسانیت کو پھر اذن باریابی ملا اور آدم کا بھاگا ہوا فرزند پھر اپنے خالق و مالک کے آستانے

---

[1] یہ سب یونانی فلسفہ کے عقائد و مسلمات ہیں۔

کی طرف یہ کہتا ہوا واپس ہوا ؎

بندہ آمد بردرت بگریختہ　　آبروئے خود بعصیاں ریختہ!

دعا سے محرومی کا ایک بڑا سبب جاہلیت کا یہ غلط تخیل تھا کہ خدا ہم سے بہت دُور ہے۔ ہماری آواز وہاں کہاں پہنچ سکتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان فرمایا اور یہ مژدہ سنایا کہ:۔

وإذا سألك عبادي عني فإني قريب أجيب دعوة الداع إذا دعان۔ (البقرہ۔ ۲۳)

اور جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق سوال کریں تو میں نزدیک ہوں دعا کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہوں۔

دُوسرا یہ غلط عقیدہ تھا کہ خدا کے سوا کوئی اور بھی نفع و ضرر کا مالک اور انسانوں کی امداد و اعانت پر قادر ہے۔ اس عقیدے نے دعا و استعانت کو "حقیقی نافع و ضار" سے ہٹا کر خیالی معاونوں اور دادرسوں کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ اور عالم کا عالم شرک و بُت پرستی کا شکار تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پُوری قوت اور وضاحت کے ساتھ اس فرمان کا اعلان کیا۔ جس میں آپؐ ہی کو خطاب تھا:۔

قل يا أيها الناس إن كنتم في شك من ديني فلا أعبد الذين تعبدون من دون الله ولكن أعبد الله الذي يتوفاكم وأمرت أن أكون من المؤمنين۔ وأن أقم وجهك للدين حنيفا ولا تكونن من المشركين۔ ولا تدع من دون الله ما لا ينفعك ولا يضرك فإن فعلت فإنك إذا من الظالمين۔ وإن يمسسك الله بضر فلا كاشف له إلا هو وإن يردك بخير فلا راد لفضله يصيب به من يشاء من عباده وهو الغفور الرحيم۔ (یونس ۱۰۴-۱۰۷)

"کہہ دو۔ اے لوگو اگر تمہیں میرے دین میں شک ہے تو اللہ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو میں اُن کی عبادت نہیں کرتا بلکہ میں اللہ کی عبادت کرتا ہوں۔ جو تمہیں وفات دیتا ہے۔ اور مجھے حکم ہوا ہے کہ ایمان والوں میں رہوں۔ اور یہ بھی کہ یکسو ہو کر دین کی طرف رُخ کئے رہو۔ اور مشرکوں میں نہ ہو۔ اور اللہ کے سوا ایسی چیز کو نہ پکارو جو نہ تیرا بھلا کرے اور نہ بُرا۔ پھر اگر تُو نے ایسا کیا تو بیشک ظالموں میں سے ہو جائے گا۔ اور اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اس کو کوئی ہٹانے والا نہیں اور اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچانا ہے تو کوئی اس کے فضل کو پھیرنے والا نہیں۔ اپنے بندوں میں جسے چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے اور وہی بخشنے والا مہربان ہے۔

پھر آپؐ نے صرف اسی کو واضح نہیں کیا کہ بندہ اپنے مالک سے دعا کر سکتا ہے اور وہ اس کی سُنتا ہے اور اُس کی مدد کر سکتا ہے۔ بلکہ آپؐ نے ثابت کیا کہ خدا کو دعا مطلوب ہے اور وہ اس سے خوش اور راضی ہوتا ہے بلکہ دعا نہ کرنے سے ناراض ہوتا ہے۔ دعا بندگی کا نہایت واضح اور موثر مظاہرہ اور عدم دعا بندگی سے گریز اور استکبار و سرکشی کی علامت ہے۔ آپ کے اس اعلان نے دعا کا پایہ کہیں سے کہیں پہنچا دیا اور اس کو بندگی کے نفل اضطراری کے درجہ سے اعلیٰ عبادت اور تقرب کے مقام تک پہنچا دیا۔

وقال ربكم ادعوني أستجب لكم إن الذين يستكبرون عن عبادتي

سیدخلون جہنم داخرین۔ (المومنون۔ ۶۶)

"اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو۔ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔
بیشک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں۔ عنقریب ہے وہ ذلیل ہو کر
جہنم میں داخل ہوں گے"

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا نہ کرنا محض محرومی کا باعث نہیں اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا بھی باعث ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں۔

من لم یسئال اللہ یغضب علیہ۔ جو اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس سے ناراض ہوتا ہے۔

پھر آپ نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ دعا کو مغز عبادت قرار دیا۔ الدعاء مخ العبادۃ۔ دعا کو رحمت و برکت کے دروازے کی کلید قرار دیا گیا اور فرمایا گیا۔

من فتح لہ منکم باب الدعاء فتحت لہ ابواب الرحمۃ۔

جس کے لئے دعا کا دروازہ کھل گیا، اس کے لئے رحمت کے دروازے کھل گئے۔

اس طرح دعا کا شعبہ جس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں رہی تھی، عبادات اور معابد بھی اس کے نور سے خالی ہو چکے تھے۔ اور جاہلیت کے ساکنین و مرتاض اور عبادو زہاد بھی اس دولت سے محروم تھے۔ دوبارہ زندہ اور تازہ ہوا اور یہ دولت اتنی عام ہوئی کہ۔ ع

رہے اس سے محروم آبی رسا کی!

نبوت محمدی کی تجدید اور اس کا عمل تکمیل اسی پر ختم نہیں ہوتا۔ آپ نے ہمیں دعا کرنا بھی سکھایا۔ آپ نے انسانیت کے خزانے کو اور دنیا کے ادب کو دعاؤں کے ان جواہرات سے مالا مال کیا۔ جن کی نظیر اپنی آبداری و درخشانی میں صحف سماوی کے بعد مل نہیں سکتی۔ آپ نے اپنے مالک سے ان الفاظ میں دعا کی جن سے زیادہ موثر اور بلیغ الفاظ۔ جن سے زیادہ موزوں و مناسب الفاظ انسان لا نہیں سکتا۔ یہ دعائیں مستقل معجزات اور دلائل نبوت ہیں۔ ان کے الفاظ شہادت دیتے ہیں کہ یہ ایک پیغمبر ہی کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان میں نبوت کا نور ہے۔ پیغمبر کا یقین ہے۔ "عبد کامل" کا نیاز ہے۔ محبوب رب العالمین کا اعتماد و ناز ہے۔ فطرت نبوت کی معصومیت و سادگی ہے۔ دل دردمند و قلب مضطر کی بے تکلفی و بے ساختگی ہے۔ صاحب غرض و حاجت مند[1] کا اصرار و اضطرار بھی ہے۔ اور بارگاہ الوہیت کے ادب شناس کی احتیاط بھی۔ دل کی جراحت اور درد کی کسک بھی ہے۔ اور بیچارہ ساز کی چارہ سازی اور دل نوازی کا یقین و سرور بھی۔ درد کا اظہار بھی ہے اور اس حقیقت کا اعلان بھی کہ ؎

درد ما داری و درمانی ہنوز!

یہ دعائیں اپنی روحانی و معنوی قدر و قیمت کے علاوہ اعلیٰ ادبی قدر و قیمت کی حامل ہیں، اور دنیا کے ادبی ذخیرے کے وہ نوادر اور شہ پارے ہیں جن کی نظیر انسانی لٹریچر میں نہیں مل سکتی۔ بہت سے ناقدین ادب نے نجی خطوط کو اس وجہ سے ادب میں اعلیٰ مقام دیا ہے کہ وہ بے ساختہ اور تکلفات سے دور ہوتے ہیں اور ان میں دلی جذبات کی بے تکلف ترجمانی

---

[1] یہ غرض اور حاجت اگر اپنے مالک اور آقا سے ہو تو اس میں مقام نبوت کیلئے کوئی سوء ادب نہیں بلکہ فخر و مباہات ہے۔

ہوتی ہے۔ لیکن ان کو معلوم نہیں کہ۔ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!

ادب کی ایک صنف اور بھی ہے۔ جس میں خطوط سے زیادہ بے تکلفی اور بے ساختگی پائی جاتی ہے۔ جس میں سارے حجابات اور اصطلاحات اٹھ جاتے ہیں۔ جس میں صاحبِ کلام اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے اور اس کی زبان اس کے دل کی حقیقی ترجمان بن جاتی ہے۔ جب متکلم داد و تحسین سے بے پروا ہوتا ہے۔ سامعین کی خاطر بات نہیں کرتا بلکہ اپنے دل کے تقاضے سے گویا ہوتا ہے۔ ادبِ عالی کی یہ صنف "دعا و مناجات" ہے۔

ادب کا ایک اہم عنصر (جس کو اکثر ناقدینِ فن نے نظر انداز کیا ہے اور جو ادب میں حقیقی روح اور طاقت پیدا کرتا ہے اور اس کو بقائے دوام بخشتا ہے) صداقت اور خلوص ہے۔ اس عنصر کی جیسی نمود "دعا و مناجات" میں پائی جاتی ہے۔ ادب کی کسی اور صنف میں نہیں پائی جا سکتی۔ پھر جب صاحبِ دعا صاحبِ درد بھی ہو اور اس کو اپنے دردِ دل کے اظہار پر اعلیٰ درجہ کی قدرت بھی ہو۔ تو پھر اس کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ ادب کا معجزہ بن جاتے ہیں۔ اور وہ الفاظ نہیں ہوتے بلکہ دل کے ٹکڑے اور آنکھ کے آنسو ہوتے ہیں۔ اور وہ صدیوں تک ہزاروں انسانوں کو تڑپاتے رہتے ہیں۔ پھر جب ان مطالب کو ادا کرنے والی زبان وہ ہو جو وحی کی گزرگاہ اور فصاحت و بلاغت کی بادشاہ ہو تو پھر ان کی تاثیر و اعجاز کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

حدیث و سیرت کے دفتر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو دعائیں منقول ہیں۔ ان پر نظر ڈالیے۔ کیا کوئی بڑے سے بڑا ادیب اپنی بے بسی و کمزوری کا نقشہ کھینچنے کے لئے۔ اپنا فقر و احتیاج بیان کرنے کے لئے اور دریائے رحمت کو جوش میں لانے کے لئے اس سے زیادہ موثر، اس سے زیادہ دل آویز اور اس سے زیادہ جامع الفاظ لا سکتا ہے۔ ایک بار سفرِ طائف کا نقشہ سامنے لایئے اور سفرِ طائف کے شکستہ دل اور خون آلود پاؤں پر نظر ڈالیے۔ پھر غربت و مظلومیت کی اس فضا میں ان الفاظ کو پڑھیے۔

اللّٰھمّ الیک اشکو ضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی الناس ربّ المستضعفین الیٰ من تکلنی الیٰ بعید یتجھمنی او الیٰ عدو ملکتہ امری ان لم یکن بک علیّ غضبٌ فلا ابالی غیر ان عافیتک ھی اوسع لی۔ اعوذ بنور وجھک الذی اشرقت لہ الظلمات وصلح علیہ امر الدنیا والاٰخرۃ من ان یحل بی غضبک او ینزل علی سخطک لک العتبیٰ حتیٰ ترضیٰ ولا حول ولا قوۃ الا بک[1]

الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کے بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے اور میرا مالک بھی تو ہی ہے مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ کیا بیگانہ ترش رو کے یا اس دشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے۔ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی کچھ پروا نہیں۔ لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نور سے پناہ چاہتا ہوں۔ جس سے سب تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و دین کے کام اس سے

---

[1] یہ الفاظ تاریخ طبری کے ہیں۔ الفاظ کے ذرا فرق کے ساتھ یہ دعا کنز العمال میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے۔

ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر مُترے یا تیری نارضامندی مجھ پر وارد ہو۔ مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے۔"

کیا کبھی جب آپ کو ایسا وقت پیش آئے اور آپ کے دل کی کیفیت بھی یہی ہو تو آپ ان سے بہتر اور ان سے زیادہ مؤثر الفاظ لا سکتے ہیں۔ یا آپ کو دُنیا کے ادبی ذخیرے میں اپنے دل کی ترجمانی کے لئے اس سے بہتر لفظ مل سکتے ہیں؟

اسی طرح میدان عرفات کا تصور کیجئے۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار کفن بردوش انسانوں کا مجمع ہے۔ لبیک کی صداؤں اور حجاج کی دعاؤں سے فضا گونج رہی ہے۔ خدا کی شان بے نیازی اور عظمت و جبروت کا نقشہ سامنے ہے۔ انسانوں کے اس جنگل میں ایک برہنہ سر احرام پوش ایسا بھی ہے (فداہ ابی و امی) جس کے کاندھوں پر ساری انسانیت کا بار ہے۔ جو ہر دیکھنے والے سے زیادہ خدا کی عظمت و جلال کا مشاہدہ کر رہا ہے اور ہر جاننے والے سے زیادہ انسان کی درماندگی۔ بے حقیقتی اور بے بسی سے واقف ہے۔ اس پُر تاثیر اور پُر ہیبت فضا میں اس کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اور سننے والے سنتے ہیں۔

اللھمّ انک تسمع کلامی وتریٰ مکانی وتعلم سرّی وعلانیتی لایخفی علیک شیٔ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقرّ المعترف بذنبہ، اسالک مسئلۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء الخائف الضریر، دعاء من خضعت لک رقبتہ وفاضت لک عبرتہ وذلّ لک جسمہ ورغم لک انفہ، اللھمّ لا تجعلنی بدعائک شقیّا وکن بی رؤفا رحیما یا خیر المسئولین ویا خیر المعطین[1]

اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے۔ تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ مَیں مصیبت زدہ ہوں۔ محتاج ہوں۔ فریادی ہوں۔ پناہ جُو ہوں۔ پریشان ہوں، ہراساں ہوں۔ اپنے گناہوں کا اقرار کرنے والا ہوں۔ اعتراف کرنے والا ہوں۔ تیرے آگے سوال کرتا ہوں۔ جیسے بیکس سوال کرتے ہیں۔ تیرے آگے گڑگڑاتا ہوں۔ جیسے گنہگار ذلیل و خوار گڑگڑاتا ہے۔ اور تجھ سے طلب کرتا ہوں۔ جیسے خوف زدہ آفت رسیدہ طلب کرتا ہے۔ اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے۔ جس کی گردن تیرے سامنے جھکی ہو۔ اور اس کے آنسو بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ تیرے آگے فروتنی کئے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہو جا۔ اے سب مانگے جانے والوں سے بہتر اور سب دینے والوں سے اچھے!

کیا خدا کی عظمت و کبریائی اور اپنی ناتوانی و بے نوائی۔ فقر و احتیاج، عجز و مسکنت کے اظہار و اقرار کے لئے اور رحمت خداوندی کو جنبش میں لانے کے لئے ان سے زیادہ پُر تاثیر، پُر خلوص اور دل نشین الفاظ انسانی کلام میں مل سکتے ہیں اور

---

[1] کنز العمال عن ابن عباسؓ۔ اس مقالہ کی اکثر ادعیہ کا ترجمہ مناجات مقبول سے ماخوذ ہے جو مولانا عبدالماجد دریابادی کے ترجمہ و شرح کیساتھ شائع ہوئی ہے۔

اپنی دل کی کیفیت اور عجز و مسکنت کا نقشہ الفاظ میں اس سے بہتر کھینچا جا سکتا ہے؟ یہ الفاظ تو دریائے رحمت میں تلاطم پیدا کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ آج بھی ان لفظوں کو ادا کرتے ہوئے دل امنڈ آتا ہے۔ آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں اور رحمتِ خداوندی صاف متوجہ معلوم ہوتی ہے۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی ہزاروں رحمتیں کہ ایسی پُر کیف اور اثر آفریں دعا امت کو سکھا گئے اور "بابِ رحمت" پر اس طرح دستک دینا بتا گئے:-

اللّٰھم صلّ وسلم علیہ وعلیٰ عترتہ بعدد کل معلوم لک!

سب جانتے ہیں کہ ایک قوی اور غنی ذات، قادرِ مطلق، سلطان برحق، مالک الملک کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور اس کی رحمت کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے اپنی عجز و درماندگی اور اپنی بندگی و بیچارگی کے زیادہ سے زیادہ اور مؤثر سے مؤثر اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس اعتراف کی کہ ہم خاندانی و نسلی غلام، مملوک ابن مملوک اور اس در دولت اور آستانۂ شاہی کے قدیمی نمک خوار و پروردۂ نعمت ہیں۔ جان و مال ہر چیز کے آپ مالک ہیں۔ کوئی چیز آپ کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں۔ ایسی حالت میں آپ ہی رحم نہ فرمائیں گے اور آپ ہی خبر نہ لیں گے تو کون لے گا۔ دیکھئے کسی دعا کے لئے اس سے بہتر تمہید اور مقصد کی کشائش کے لئے اس سے بہتر کلید کیا ہو سکتی ہے؟

اللّٰھم انی عبدک وابن عبدک وابن امتک ناصیتی بیدک ماضٍ فی حکمک عدل فی قضاءک اسالک بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او علمتہ احداً من خلقک او استاثرت بہ فی علم الغیب عندک ان تجعل القرآن العظیم ربیع قلبی ونور بصری وجلاء حزنی وذھاب ھمی[1]

اے اللہ میں بندہ ہوں تیرا اور بیٹا ہوں تیرے بندے کا اور بیٹا ہوں تیری بندی کا۔ ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں۔ نافذ ہے میرے بارے میں تیرا حکم اور عین عدل ہے میرے باب میں تیرا فیصلہ میں تجھے ہر اسم کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذات کو موصوف کیا ہے یا اس کو اپنی کتاب میں اتارا ہو یا اُسے اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا ہے۔ یا اپنے پاس اسے غیب ہی میں رہنے دیا ہے درخواست کرتا ہوں کہ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار بنا دے اور میری آنکھ کا نور اور میرے غم کی کشائش اور میری تشویش کا دفعیہ۔

انسان کی ضروریات بے انتہا ہیں۔ ان میں انتخاب نہایت مشکل۔ اُن سب کا سمیٹنا ناممکن۔ ایسی حالت میں انسان اپنی کیا ضرورت بیان کرے کیا نہ بیان کرے۔ ہم اپنے ہی حال پر غور کریں کہ اگر عرضِ مدعا کا موقع آئے تو ہمیں کیسی پریشانی پیش آئے اور بعد میں کیسی کیسی حسرت ہو کہ۔ ؎

بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے!

لیکن دیکھئے پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کی (بشرطیکہ وہ فطرتِ صحیحہ پر ہو) اور انسانی ضروریات کی کیسی جامع نمائندگی کی ہے۔

---

[1] ۔ طبرانی عن ابن مسعودؓ۔

لا اِلٰہ الا اللہ الحلیم الکریم۔ سبحان اللہ رب العرش العظیم والحمد للہ رب العالمین۔ اسئالک موجبات رحمتک وعزائم مغفرتک والغنیمۃ من کل برّ والسلامۃ من کل اثم لا تدع لی ذنبا اِلا غفرتہ ولا ھمًّا اِلّا فرّجتہ ولا حاجۃ ھی لک رضی اللہ الا قضیتھا یا ارحم الراحمین۔[1]

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ حلیم وکریم ہے۔ پاکی ہے اللہ کی جو عرش عظیم کا مالک ہے سب تعریف اللہ کی ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ میں تجھ سے وہ اعمال وخصائل مانگتا ہوں جو تیری رحمت کو واجب کرنے والی ہیں اور مغفرت کے یقینی اسباب اور ہر نیکی کی لوٹ اور ہر معصیت سے حفاظت۔ کوئی گناہ نہ چھوڑ جسے تو بخش نہ دے نہ کوئی تشویش جسے تو دُور نہ فرما دے۔ نہ کوئی ایسی ضرورت جو تیری رضی کے مطابق ہے جس کو پُورا نہ فرمائے۔ اے ارحم الراحمین!

ایک دوسری دعا میں فرماتے ہیں:-

اللّٰھمّ اصلح لی دینی الذی ھو عصمۃ امری واصلح لی دنیای التی فیھا معاشی واصلح لی آخرتی التی فیھا معادی، واجعل الحیاۃ زیادۃ لی فی کل خیر واجعل الموت راحۃ لی من کل شر۔[2]

اے اللہ میرا دین درست رکھ جو میرے حق میں بچاؤ ہے اور میری دُنیا درست رکھ جس میں میری معاش ہے اور میری آخرت درست رکھ جہاں مجھے لوٹنا ہے اور زندگی کو میرے حق میں۔ ہر بھلائی میں ترقی اور موت کو میرے حق میں ہر بُرائی سے امن بنا دے۔

انسان لطف ومسرّت کا کتنا حریص ہے۔ لیکن اس کی نگاہ محدود اور کوتاہ۔ وہ فانی لذت کا جویا اور ختم ہوجانے والی مسرت کا طالب ہے۔ آپ دعا فرماتے ہیں اور دعا ہی دعا میں اس نکتہ کی تعلیم دے جاتے ہیں کہ اصل مانگنے کی چیز غیرفانی عیش اور غیرمختتم مسرت ہے اور اصل مطلوب شئے دوسری زندگی کی راحت اور دیدار الٰہی کی لذت ہے!

اللّٰھمّ اِنی اسئالک نعیما لا ینفد وقرۃ عین لا تنقطع واسئلک الرضاء بالقضاء وبرد العیش بعد الموت ولذۃ النظر الی وجھک والشوق الی لقاءک۔[3]

اے اللہ تجھ سے ایسی نعمت مانگتا ہوں جو ختم نہ ہو اور ایسی آنکھوں کی ٹھنڈک جو جاتی نہ رہے اور میں تجھ سے مانگتا ہوں تیرے حکم (تکوینی) پر رضامند رہنا اور موت کے بعد خوش عیشی اور تیرے دیدار کی لذت اور تیری دید کا شوق۔

ایمان کی دولت کے بعد اخلاق حسنہ بڑی نعمت ہیں۔ جس نے اپنے متعلق خبر دی ہے کہ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔

[1] ترمذی وابن ماجہ عن عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ۔ [2] مسلم عن ابی ہریرہؓ۔ [3] مستدرک عن عامر بن یاسرؓ

میری بعثت کی (ایک اہم) غرض مکارم اخلاق کی تکمیل ہے۔ وہ مکارم اخلاق کی اہمیت کیسے محسوس نہ کرے گا اور اس کی باریکیوں اور نزاکتوں پر اس کی نظر کیسے نہ ہوگی؟ ماثورہ دعاؤں کا ایک بڑا حصہ اخلاق و صفات حسنہ سے متعلق ہے۔ اور ان دعاؤں میں ایسی اخلاقی حقیقتیں اور ایسی نفسیاتی نکتے بیان کئے گئے ہیں جو علمائے اخلاق و علم النفس کے لئے مستقل موضوع مطالعہ ہیں۔

پہلے تو آپ کی ایک جامع دعا پڑھیے۔ پھر مختلف اخلاق انسانی پر ادعیہ ماثورہ کا مطالعہ کیجئے۔ تہجد کی ایک دعا میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

اللھم اھدنی لاحسن الاعمال واحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت وقنی سیئ الاعمال وسیئ الاخلاق لا یقی سیئھا الا انت [۱]

اے اللہ مجھے بہترین اعمال اور بہترین اخلاق کی توفیق و رہنمائی فرما۔ بہترین اعمال و اخلاق کی توفیق و رہنمائی تو ہی فرما سکتا ہے اور مجھے برے اعمال و اخلاق سے بچا۔ برے اعمال و اخلاق سے تو ہی بچا سکتا ہے۔

آئینہ دیکھ کر انسان کو اپنے اعضاء کے تناسب اور "احسن تقویم" کی صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ اس موقع پر بھی اخلاق کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے۔ اور حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کی دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔ کہ ان دونوں کی جامعیت کے ساتھ انسان خلیفۃ اللہ ہے۔ آئینہ دیکھ کر ارشاد ہوتا ہے:۔

الحمد للہ اللھم کما حسنت خلقی فحسن خلقی [۲]

اللہ تعالیٰ کا شکر اور تعریف ہے۔ اے اللہ تو نے میری صورت اچھی بنائی تو میری سیرت بھی اچھی کر دے۔

کامل زندگی اور "حیات طیبہ" کی تکمیل ایمان۔ صحت اور حسن اخلاق کے مجموعہ سے ہوتی ہے۔ ایک دعا میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اللھم انی اسئلک صحۃ فی ایمان وایمانا فی حسن خلق [۳]

اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں تندرستی ایمان کے ساتھ اور ایمان حسن اخلاق کیساتھ۔

ایک دوسری دعا میں ہے:۔

واسئالک لسانا صادقا وقلبا سلیما وخلقا مستقیما [۴]

تجھ سے مانگتا ہوں سچی زبان اور قلب سلیم اور اخلاق صحیح۔

اخلاق کی ان عمومی اور اجمالی دعاؤں کے ساتھ بعض ایسے محاسن اخلاق کی دعا کی گئی ہے (اور اس کے ذریعہ امت کو ان کی اہمیت اور اہتمام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے) جو بڑے لطیف اور باریک بین اور کمال اخلاق کے لئے معیار کا درجہ رکھتے ہیں۔ تکمیل ایمان اور کمال انسانیت و شرافت و تقویٰ کی ایک علامت یہ ہے کہ خدا کے عاجز و مسکین بندوں سے محبت ہو۔ اہل دولت و قوت کی توقیر اور ان سے محبت کرنے والے تو عام ہیں مگر فقراء و مساکین سے

---

[۱] النسائی عن جابرؓ۔ [۲] مسند احمد عن ام سلمہؓ۔ [۳] مستدرک حاکم عن ابی ہریرہؓ۔ [۴] ترمذی عن شداد بن اوسؓ۔

محبت کرنے والے بہت کمیاب ہیں۔ یہ اخلاق کا اعلیٰ درجہ ہے اور محض توفیق الٰہی پر منحصر ہے۔ ایک دعا میں ارشاد ہوتا ہے:۔

اللھم انی اسئالک فعل الخیرات وترک المنکرات وحب المساکین [۱]

اے اللہ میں تجھ سے توفیق چاہتا ہوں نیکیوں کے کرنے کی اور برائیوں کے چھوڑنے کی اور غریبوں کے ساتھ محبت کی۔

دنیا میں رواج دوسروں کو چھوٹا اور اپنے کو بڑا سمجھنے کا ہے۔ اس مرض سے صرف وہی برگزیدہ نفوس بچ سکتے ہیں جن کا تزکیہ ہو چکا ہو اور ان پر فضل الٰہی ہو۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو بہت کم نفوس اس خود پرستی و خود بینی سے بچتے ہیں۔ ؎

ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں!

اس کے لئے اہتمام سے دعا کی ضرورت ہے۔ کہ یہ مرض مشکل سے نظر آتا ہے اور مشکل سے اس سے چھٹکارا حاصل ہوتا ہے۔ سید المخلصین خود اپنے حق میں اس طرح دعا فرماتے ہیں۔ اور گویا امت کو تعلیم دیتے ہیں:۔

اللھم اجعلنی صبوراً واجعلنی شکوراً واجعلنی فی عینی صغیراً وفی اعین الناس کبیراً۔ [۲]

اے اللہ مجھے بڑا صبر کرنے والا بنادے اور مجھے بڑا شکر کرنے والا بنادے اور مجھے میری نظر میں چھوٹا بنادے اور دوسروں کی نظر میں بڑا بنادے۔

ظاہر و باطن کی مطابقت اور دونوں کا جمال و صلاح نعمتِ خداوندی ہے اور وہ دولت خاص ہے۔ جس کیلئے اہتمام سے دعا کی ضرورت ہے۔ معلمِ اخلاق فرماتے ہیں۔

اللھم اجعل سریرتی خیراً من علانیتی واجعل علانیتی صالحۃ۔ [۳]

اے میرے اللہ میرے ظاہر کو میرے باطن سے بہتر کردے اور میرے ظاہر کو صالح بنادے۔

اس کی مزید تفصیل اس دعا میں ملاحظہ فرمائیے:۔

اللھم طھر قلبی من النفاق وعملی من الریاء ولسانی من الکذب وعینی من الخیانۃ فانک تعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور [۴]

اے اللہ میرے دل کو نفاق سے پاک کردے اور میرے عمل کو ریا سے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے۔ تجھ پر تو روشن ہیں آنکھوں کی چوریاں بھی اور دل جو کچھ چھپائے رکھتے ہیں۔

پیغمبر انسانیت نے دعا میں انسانوں کی طرف سے انسانی ضروریات کی بھی ایسی مکمل نیابت کی ہے۔ کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کو ہر زمان و مکان میں ان دعاؤں میں اپنے دل کی ترجمانی، اپنے حالات کی

۱؎ مستدرک حاکم عن ثوبانؓ۔ ۲؎ کنز العمال عن بریدہؓ۔ ۳؎ ترمذی عن عمرؓ۔ ۴؎ کنز العمال عن ام سعیدؓ۔

نمائندگی اور اپنے اطمینان کا سامان ملے گا۔ اور بہت سی وہ ضرورتیں ملیں گی جن کی طرف آسانی سے ہر ایک انسان کا ذہن جانا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل دعا پڑھیے:۔

اللھم انی اعوذبک من منکرات الاخلاق والاعمال والاھواء والادواء نعوذبک من شر ما استعاذمنہ نبیک محمد صلی اللہ علیہ وسلم[1] ومن جار السوء فی دار المقامۃ فان جار البادیۃ یتحول، وغلبۃ العدو وشماتۃ الاعداء ومن الجوع فانہ بئس الضجیع ومن الخیانۃ فبئست البطانۃ وان نرجع علی اعقابنا او نفتن عن دیننا ومن الفتن ما ظہر منہا وما بطن ومن یوم السوء ومن لیلۃ السوء ومن ساعۃ السوء ومن صاحب السوء۔[2]

اے اللہ میں تیری پناہ میں آتا ہوں ناپسندیدہ اخلاق اور اعمال اور نفسانی خواہشوں اور بیماریوں سے۔ اور ہم تیری پناہ میں آتے ہیں ہر اس چیز سے جس سے تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ مانگی ہے۔ اور مستقل قیام گاہ میں بُرے پڑوسی سے (اس لئے کہ سفر کا ساتھی تو چل ہی دیتا ہی) اور دشمن کے غلبہ سے اور دشمنوں کے طعنہ سے اور بھوک سے کہ وہ بُری ہم خواب ہے اور خیانت سے کہ وہ بُری ہمراز ہی اور اس سے کہ ہم پچھلے پیروں پر لوٹ جائیں یا فتنہ میں پڑ کر دین سے الگ ہو جائیں اور سارے فتنوں سے جو ظاہری ہوں یا باطنی اور بُرے دن سے اور بُری رات سے اور بُری گھڑی سے اور بُرے ساتھی سے۔

رزق کس کو مطلوب نہیں مگر کتنے آدمیوں کی اس حقیقت پر نظر ہے کہ فراخ روزی کی سب سے زیادہ ضرورت عمر کے اس مرحلہ میں ہے جب مشکلات وتنگی کا تحمل کم۔ محنت اور کسب معاش کی قوت مفقود اور قوی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اور قدرتی طور پر راحت اور فراخ دستی کی طلب زیادہ ہوتی ہے۔ معلم حکمت نے کیا حکمت کی بات فرمائی:۔

اللھم اجعل اوسع رزقک علی عند کبر سنی وانقطاع عمری۔[3]

اے اللہ میری سب سے زیادہ کشادہ روزی میرے بڑھاپے اور میرے خاتمہ کے وقت کر۔

صرف رزق ہی پر اکتفا نہیں۔ عمر کا یہ آخری حصہ ہر اعتبار سے بہتر اور کامیاب تر ہونا چاہیئے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

واجعل خیر عمری آخرہ وخیر عملی خواتیمہ وخیر ایامی یوم القاک فیہ۔[4]

میری عمر کا بہترین اس کا آخری حصہ کرنا۔ اور میرا بہترین عمل میرا آخرترین عمل کرنا اور میرا بہترین دن وہ کرنا جس میں تجھ سے ملوں۔

نعمت ومسرت بڑی مسرت کی چیز ہے۔ لیکن جو نعمت ومسرت بے سان گمان اور اچانک ملے۔ اس کی مسرت ہی کچھ اور ہی۔ اسی طرح مصیبت اگر ایک بار پناہ مانگنے کی چیز ہے تو جو مصیبت اچانک اور ناگہاں پیش آئے وہ

---

[1] یہ جملہ اُمت کے ان افراد کی طرف سے ہی جو دعا کریں۔ [2] ترمذی عن ابی امامۃ وغیرہ۔ [3] مستدرک عن عائشہؓ۔ [4] طبرانی عن انسؓ

تو بار پناہ مانگنے کی چیز ہے۔ جن لوگوں کو کبھی اس سے سابقہ پڑا ہے۔ وہ اس کی چوٹ کو جانتے ہیں۔ لیکن کتنے آدمیوں کو اس سے پناہ مانگنے کا خیال اور توفیق ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو بھی اپنی جامع و مانع دعاؤں میں فراموش نہیں فرمایا۔ اول الذکر کی دعا کی اور ثانی الذکر سے پناہ مانگی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اللھم انی اسئالک من فجأۃ الخیر واعوذبک من فجاءۃ الشر[1]

اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں بھلائی غیر متوقع اور ناگہانی برائی سے تیری پناہ۔

اسی طرح عیش و فراخی اور خوشی و خرمی کے بعد فقر و فاقہ اور تنگ دستی و پریشان حالی پناہ مانگنے کی چیز اور ایک بڑی ابتلاء ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام کے ساتھ اس سے پناہ مانگی۔

اللھم انی اعوذبک من زوال نعمتک وتحوّل عافیتک وفجاءۃ نقمتک[2]

اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں تیری نعمت کے چھٹ جانے سے اور تیری سلامتی کے ہٹ جانے سے اور تیرے انتقام کی ناگہانی سے۔

درازی عمر ہمیشہ سے انسانوں کی خواہش رہی ہے اور لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے دعا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن ایسی عمر کہ قوی جواب دے جائیں اور انسان مفلوج و معذور اور دوسروں کا دست نگر ہو کر رہ جائے۔ اللہ سے پناہ مانگنے کی چیز ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اللھم انی اعوذبک من العجز والکسل والجبن الھرم .... ومن ان اُرَدَّ الی ارذل العمر[3]

اے اللہ میں تیری پناہ پکڑتا ہوں کم ہمتی سے اور سستی سے اور بزدلی سے اور انتہائی کبرسنی سے .... اور اس سے ناکارہ عمر تک پہنچوں۔

لوگ دولت و رزق کو منتہی سمجھتے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ نفسِ حریص کے ساتھ دولت و رزق کی بڑی سے بڑی مقدار ناکافی ہے۔ وہ نفس جو کبھی قانع و آسودہ نہ ہو۔ انسان اور تمام دنیا کے لئے ایک بلا ہے۔ حکیمِ ربانی نے اس سے پناہ مانگی ہے۔ اور ہمیں اس سے پناہ مانگنے کی تلقین کی ہے۔ اسی طرح علم جو انسان میں خشیت و تقویٰ نہ پیدا کرے اور لوگ اس سے کچھ فیض نہ پائیں۔ نیز وہ دلِ بیباک بھی جو خدا کے خوف سے خالی ہو پناہ مانگنے کی چیزیں ہیں۔ کہ انہوں نے انسان کے ساتھ وہ کیا ہے جو دشمن بھی نہیں کرتا۔ ایک ہی دعا میں ان کو جمع فرمایا جاتا ہے:۔

اللّھمّ انی اعوذبک من قلب لا یخشع ودعاء لا یُسمع ومن نفس لا تشبع ومن علم لا ینفع۔ اعوذبک من ھؤلاء الاربع[4]

اے اللہ! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔ ایسے دل سے جو ڈر نا نہ جانے۔ اور ایسی دعا سے جو سنی نہ جائے۔ اور ایسے نفس سے جو آسودہ ہونا نہ جانے۔ اور ایسے علم سے جو نفع نہ دے۔ میں تجھ سے ان چاروں (بلاؤں) سے پناہ چاہتا ہوں۔

---

[1] کتاب الاذکار للنووی عن انس۔ [2] مسلم وابوداؤد عن عبداللہ بن عمرو بن العاص۔ [3] بخاری۔ مسلم۔
[4] ترمذی [illegible]

انسان کی بنیادی اور واقعی ضرورتوں میں سے جیسے فراخ روزی ہے ویسے ہی وسیع گھر ہے۔ کسی زمانے میں بھی اس کی اہمیت کم نہ ہوئی۔ اور اس زمانے میں تو اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اور وہ زندگی کا ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے۔ لیکن اس کیساتھ یہ حقیقت بھی نظر کے سامنے ہے کہ اصل مسئلہ گھر کا وسیع ہونا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ گھر کا کافی ہونا اور اس میں وسعت محسوس کرنا ہے۔ اگر وسعت کا احساس نہیں ہے تو وسیع سے وسیع گھر طبع حوصلہ مند کے لئے تنگ اور ناکافی معلوم ہوگا۔ اور یہی احساسِ حقارت وعدم کفایت اس زمانے میں تمدن اور اقتصادی نظام کے لئے ایک لاینحل مسئلہ بن گیا ہے۔ پیغمبر حکیم فراخ روزی اور وسیع گھر کے بجائے اس کی دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق میں فراخی اور گھر میں وسعت عطا فرمائے۔ دونوں میں جو فرق ہے وہ نگاہِ نکتہ شناس سے مخفی نہ ہوگا۔ ارشاد ہے:-

اللّٰهمّ اغفرلی ذنبی ووسع لی فی داری وبارک لی فی رزقی [1]

اے اللہ مجھے میرے گناہ بخش دے اور مجھے میرے گھر میں وسعت دے اور مجھے میرے رزق میں برکت دے۔

سفر زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مسلمان کا کوئی اہم قدم اور اہم حرکت بھی دعا اور خیر طلبی سے خالی نہیں ہونی چاہیئے۔ سفر تو ایسا اقدام ہے جس کے لئے بہت زیادہ خیر طلبی اور دعا کی ضرورت ہے۔ مسافر گھر اور گھر والوں کو چھوڑتا ہے۔ طویل سفر، نئے مقامات، نئے لوگوں سے اس کو سابقہ پڑتا ہے۔ ایک مدت تک اپنے گھر اور گھر والوں سے جدا رہتا ہے۔ اس کا دل فکروں اور تمناؤں سے معمور ہوتا ہے۔ پیچھے کی فکر، آگے کی تمنا۔ سفر کا اہتمام۔ راستہ کا تکان۔ منزل کی دوری۔ مقاصد کی فکر۔ اس کے دل ودماغ کو مشغول رکھتی ہے۔ ان میں سے ہر مرحلے کے لئے اللہ تعالیٰ کی اعانت اور حفاظت کی ضرورت ہے۔ دیکھئے اس مختصر سی دعا میں کس طرح ان سب ضروریات واحساسات کی نمائندگی کی گئی ہے۔ بڑے غور وفکر اور اعلیٰ ذہانت سے بھی اس سے زیادہ جامع دعا ترتیب دینی مشکل ہے:-

اللّٰهمّ انا نسالک فی سفرنا هذا البر والتقوی ومن العمل ما ترضی۔ اللّٰهمّ هوّن علینا سفرنا هذا واطوعنا بعد الارض اللّٰهمّ انت الصاحب فی السفر والخلیفة فی الاهل۔ اللّٰهمّ انی اعوذبک من وعثاء السفر وکآبة المنظر وسوء المنقلب فی الاهل والمال [2]

اے اللہ! ہم تجھ سے اپنے اس سفر میں نیکی اور تقویٰ اور تیری خوشنودی کے کام چاہتے ہیں۔ اے اللہ! ہم پر یہ سفر آسان کردے اور زمین کا فاصلہ طے کردے۔ اے اللہ! تو سفر میں رفیق اور گھر والوں میں نائب ہے۔ اے اللہ! میں سفر کی مشقت، ناگوار منظر اور مال واہل میں بری واپسی سے پناہ چاہتا ہوں۔

لیکن صرف سفر ہی اہتمام اور دعا کا مستحق نہیں۔ جس نئی بستی میں انسان داخل ہو وہاں کی خیر طلب کرنے کی ضرورت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ جب کبھی کسی نئی بستی میں داخل ہوتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے۔ اللّٰهمّ بارک لنا فیها۔ پھر فرماتے

---

[1] نسائی عن ابوموسیٰ الاشعری۔ [2] مسلم، ترمذی، ابوداؤد۔ عن عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ۔

اللھم ارزقنا جناھا۔ (اے اللہ ہمیں اس کا رزق عطا فرما) مسافر کو (اور پھر جب مسافر داعی اور صاحب پیغام بھی ہو) خاص طور پر اس کی ضرورت ہے کہ اس کو بستی کے سب رہنے والوں کی محبت حاصل ہو تاکہ وہ پوری راحت پائے اور اس کا پیغام سب کے دل میں گھر کرے۔ لیکن ایک صاحب عقیدہ اور دین دار مسلمان کو اپنے دین و اعتقاد کی رو سے انہی کی محبت کو اپنے دل میں جگہ دینی چاہیئے جو اہل صلاح اور اہل دین ہوں۔ اس لئے اسی دعا میں فرمایا گیا:۔

وحببنا الی اھلھا وحبب صالحی اھلھا الینا۔[1]

اے اللہ ہمیں اس کے رہنے والوں کی نگاہ میں محبوب کردے اور اس کے باشندوں میں سے جو نیک لوگ ہوں۔ اُن کو ہماری نگاہ میں محبوب بنادے۔

صرف سفر یا کوئی اہم منزل ہی اس کی مستحق نہیں کہ مومن اس کے لئے دعا کرے۔ اور اپنے مالک سے خیر طلب کرے۔ زندگی کا ہر نیا دن اور ہر نئی رات اس کی مستحق ہے کہ بندہ اس دن کے خیر کی طلب اور اس دن یا رات کے شر سے پناہ مانگے اور اس کی دعا کرے کہ اس دن یا رات کی برکتوں اور نورانیوں اور کامیابیوں سے اس کو حصہ وافر ملے۔ اور اس کی شہادت دے کہ ملک اللہ کا ہے۔ ہر تغیر اور ہر تجدد کے موقع پر اس حقیقت کا استحضار کرے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ شام کو یہ دعا فرماتے تھے:۔

امسینا وامسی الملک للہ والحمد للہ لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر۔ رب اسالک خیر ما فی ھذہ اللیلۃ وخیر ما بعدھا واعوذ بک من شر ما فی ھذہ اللیلۃ وشر ما بعدھا رب اعوذ بک من الکسل وسوء الکبر، رب اعوذ بک من عذاب فی النار وعذاب فی القبر[2]

یہ شام اس حالت میں ہو رہی ہے کہ ہم اور یہ ساری کائنات اللہ کی سلطنت ہے۔ سب تعریف اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی کی سلطنت ہے۔ اسی کی تعریف ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے۔ میرے پروردگار میں تجھ سے اس رات اور اس کے بعد کی رات کی خیر طلب کرتا ہوں اور اس رات اور اس کے بعد کی رات کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ پروردگار! تیری پناہ سستی سے اور کبر سنی کی برائی سے۔ تیری پناہ جہنم کے عذاب سے اور قبر کے عذاب سے!

اسی طرح صبح کو الفاظ کے تغیر کے ساتھ فرماتے۔ اصبحنا واصبح الملک للہ ..... الخ

ایک دوسری حدیث میں صبح کے وقت ان الفاظ کی تعلیم دی گئی ہے:۔

"اصبحنا واصبح الملک للہ رب العالمین۔ اللھم انی اسالک خیر ھذا الیوم فتحہ ونصرہ ونورہ وبرکتہ وھداہ واعوذ بک من شر ما فیہ ومن شر ما بعدہ"[3]

---

[1] طبرانی فی الاوسط عن ابن عمرؓ - [2] جمع الفوائد عن ابی مالکؓ - [3] مسلم، ترمذی - ابوداؤد - عن ابن مسعودؓ -

صبح اس حالت میں ہوئی کہ ہم اور سارا عالم اللہ کی سلطنت ہے - اے اللہ میں تجھ سے اس دن
کی خیر وفتح نصرت، نور و برکت وہدایت مانگتا ہوں - اور اس دن کے شر اور اس کے بعد کے
شر سے پناہ مانگتا ہوں -

لیکن سب سے زیادہ ڈرنے اور پناہ مانگنے کی چیز اپنے نفس کا شر ہے اور اپنا شر ہے - دنیا میں بڑی بڑی تباہیاں انسان ہی کے شر سے آئی ہیں اور دین و دنیا کا نقصان اسی "شر نفس" کا نتیجہ ہے - آپ نے بار بار اس سے پناہ مانگی ہے - صبح کی دعاؤں میں ہے :-

اللّٰھم فاطر السموات والارض عالم الغیب والشھادۃ انت رب کل شیٔ والملائکۃ یشھدون انک لا الٰہ الا انت فانا نعوذ بک من شر انفسنا ومن شر الشیطان الرجیم وشرکہ، وان نقترف سوءاً او نجرہ الی مسلم[1]

اے اللہ آسمانوں اور زمینوں کے خالق - غیب و شہود کے جاننے والے! تو ہر چیز کا مالک ہے اور فرشتے بھی شہادت دیتے ہیں کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں - ہم تجھ سے اپنے نفس کی برائی سے اور شیطان کی برائی سے اور شیطان رجیم کے شر اور شرکت سے پناہ چاہتے ہیں - اور اس سے کہ ہم اپنے حق میں کسی شر کا ارتکاب کریں یا کسی مسلمان تک پہنچائیں -

ایک دوسری دعا کے الفاظ ہیں :-

اللّٰھم قنی شر نفسی واعزم لی علی رشد امری[2]

اے اللہ مجھے میرے نفس کی برائی سے محفوظ رکھ اور مجھے میرے امور کی اصلاح کی ہمت دے -

ایک دوسری دعا کے الفاظ ہیں :-

یا حی یا قیوم برحمتک استغیث اصلح لی شانی کلہ ولا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین[3]

اے حی اے قیوم میں تیری رحمت کے واسطے سے تجھ سے فریاد کرتا ہوں کہ میرے سارے حال کو درست کر دے اور مجھے ایک لحظہ کیلئے بھی میرے نفس کے حوالہ نہ کر -

اس شر سے اور معصیت سے پناہ اور حفاظت کیلئے سب سے بڑا حصار خشیت الٰہی ہے - اسی طرح مصائب کے اثر کو کم کرنے والی چیز صرف یقین ہے - چنانچہ فرمایا گیا :-

اللّٰھم اقسم لنا من خشیتک ما تحول بہ بیننا وبین معاصیک ومن طاعتک ما تبلغنا بہ جنتک، ومن الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا[4]

اے اللہ ! ہمیں اپنی خشیت سے اتنا حصہ دے کہ ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہو جائے اور اپنی طاعت سے اتنا حصہ کہ تو ہمیں اس کے ذریعہ سے جنت میں پہنچا دے اور یقین سے اتنا حصہ کہ اس سے تو ہم پر دنیا کی مصیبتیں آسان کر دے -

---

[1] جمع الفوائد - عن ابی مالکؓ - [2] ابو داؤد عن ابن عمرؓ - [3] ترمذی عن انسؓ - [4] ترمذی عن ابن عمرؓ -

ان شرور و معاصی کا سرچشمہ اور ان کا ایک اہم اور قوی سبب دُنیا کی محبت اور اس کا مقصودِ اعظم ہونا ہے۔
حب الدنیا راس کل خطیئۃ۔ مزاج و مذاق نبوی یہ ہے کہ اللھم لا عیش الا عیش الاخرۃ (اے اللہ زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے) وان الدار الاخرۃ لھی الحیوان۔ اسی دعا کے آخر میں فرمایا گیا ہے:۔

ولا تجعل الدنیا اکبر ھمنا ولا مبلغ علمنا ولا غایۃ رغبتنا ولا تسلط علینا
من لا یرحمنا[1]

اور دُنیا کو نہ ہمارا مقصودِ اعظم بنا، اور نہ ہمارے معلومات کی انتہا اور نہ ہماری رغبت کی منزل مقصود۔ اور ہم پر اس کو حاکم نہ کر جو ہم پر نا مہربان ہو۔

دین کو جو چیز آسان۔ مرغوب و محبوب بناتی ہے۔ معصیتوں سے طبعی نفرت پیدا کرتی ہے۔ دُنیا کی محبت کو ریشہ ریشہ سے نکالتی اور اس کی بڑی سے بڑی عظمت کو دل و نگاہ سے گراتی۔ بڑے بڑے امتحانوں میں قدم کو جماتی اور دل کو تھامتی ہے وہ حقیقی محبتِ الٰہی ہے۔ جس کا دل اس محبت کا لذت آشنا ہو گیا۔ اس کے دل کو نہ کوئی جلال مرعوب کر سکا، نہ کوئی جمال مسحور کر سکا۔ ؎

عجب چیز ہے لذت آشنائی   وہ عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

ضابطہ کا تعلق یا قانونی اطاعت اس محبت کا قائم مقام نہیں ہو سکتا کہ ضابطہ چور دروازے بھی پیدا کر لیتا ہے۔ تاویلیں اور قانونی موشگافیاں بھی جانتا ہے۔ اُکتاتا بھی ہے۔ تھک بھی جاتا ہے۔ لیکن محبت تاویل سے ناآشنا اور تکان اور اکتاہٹ سے بیگانہ ہے۔ کہ وہ زخم بھی ہے اور مرہم بھی۔ راہ بھی ہے اور منزل بھی۔

عاشقاں را خستگی راہ نیست !   عشق خود راہ است و ہم خود منزل است !

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے اہتمام سے اس محبتِ الٰہی کی دعا فرمائی ہے۔ ایک دعا کے الفاظ ہیں:۔

اللھم اجعل حبک احب الیّ من نفسی واھلی ومن الماء البارد[2]

اے اللہ اپنی محبت مجھے پیاری کر دے میری جان سے اور میرے گھر والوں سے اور سرد پانی سے بھی بڑھ کر۔

ایک دوسری دعا کے الفاظ ہیں:۔

اللھم اجعل حبک احب الاشیاء الیّ واجعل خشیتک اخوف الاشیاء عندی واقطع عنّی حاجات الدنیا بالشوق الی لقائک واذا اقررت اعین اھل الدنیا من دنیاھم فاقرر عینی من عبادتک[3]

اے اللہ اپنی محبت کو میرے لئے تمام چیزوں سے محبوب تر اور اپنے ڈر کو میرے لئے تمام چیزوں سے خوفناک تر بنا دے اور مجھے اپنی ملاقات کا شوق دے کر دُنیا کی حاجتیں مجھ سے قطع کر دے اور جہاں تو نے دُنیا والوں کی آنکھیں اُن کی دُنیا سے ٹھنڈی کر رکھی ہیں۔ میری آنکھ اپنی عبادت سے ٹھنڈی رکھ۔

---

[1] ترمذی۔ نسائی عن ابن عمرؓ۔ [2] ترمذی، عن ابی الدرداء عن معاذ۔ [3] کنز العمال عن ابی بن مالکؓ۔

ایک اور دعا کے الفاظ ہیں:۔

اللھم ارزقنی حبک وحب من ینفعنی حبہ عندک، اللھم فکما رزقتنی مما احب فاجعلہ قوۃ لی فیما تحب، اللھم وما زویت عنی مما احب فاجعلہ فراغاً لی فیما تحب[۱]

اے اللہ مجھے اپنی محبت نصیب کر اور اس شخص کی بھی محبت جس کی محبت تیرے نزدیک میرے حق میں نافع ہو۔ یا اللہ جس طرح تُو نے مجھے وہ دیا جو مجھے پسند ہے۔ اسے میرا معین بھی اس کام میں بنادے جو تجھے پسند ہو۔ اے اللہ تُو نے جو دُور رکھا ہے مجھ سے ان چیزوں میں سے جو مجھ کو پسند ہیں تو اسے میرے حق میں ان چیزوں کیلئے موجب فراغ بنادے جو تجھے پسند ہیں۔

لیکن یہ محبت، یہ اطاعت، یہ توفیق عبادت، یہ ذکر و شکر کی دولت۔ سب اُس کی اعانت و عنایت پر منحصر ہے اس لئے محبوبِ خدا نے اپنے ایک محبوب صحابی کو پُر محبت الفاظ میں تاکید فرمائی:۔

یا معاذ واللہ لاحبک، اوصیک یا معاذ لا تدعن فی کل صلاۃ ان تقول، اللھم اعنی علی ذکرک و شکرک وحسن عبادتک[۲]۔

اے معاذ! واللہ مجھے تم سے محبت ہے میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ یہ دعا کسی نماز میں ترک نہ ہو۔ کہ اے اللہ میری اپنے ذکر، اپنے شکر اور اپنی اچھی عبادت پر مدد فرما۔

یہ ہیں حدیث کی وہ دعائیں جن میں نبوت کا نور و یقین، انبیاء کا علم و حکمت اور اس معرفت و محبت کی پوری تجلیات ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی خصوصیت اور سید الانبیاء علیہ السلام کا امتیاز خاص ہے۔ جس طرح چہرۂ نبوی پر نظر پڑتے ہی عبد اللہ بن سلام کی طبع سلیم نے شہادت دی تھی۔ واللہ ھذا لیس بوجہ کذاب (بخدا یہ سی دروغگو کا چہرہ نہیں ہوسکتا) اسی طرح ان دعاؤں کو پڑھ کر قلب سلیم شہادت دیتا ہے کہ یہ نبی معصوم کے سوا کسی کا کلام نہیں ہوسکتا۔

عارف رومیؒ نے دونوں کے متعلق شہادت دی ہے۔

در دلِ ہر کس کہ دانش را مزہ است   رُو و آوازِ پیمبر معجزہ است!

کمالات نبوت اور علوم نبوت کی معرفت و شناخت کیلئے جس طرح سیرت کے ابواب اور اعمال و اخلاق و عبادات ہیں۔ اسی طرح ایک دلیل نبوت اور معجزۂ نبوی یہ ادعیۂ ماثورہ ہیں۔

کتنی خوش قسمت ہے وہ امت جس کو نبوت کی وراثت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں دین و دُنیا کا خزانہ اور غیب کی نعمتوں اور دولتوں کی یہ کنجیاں ملیں۔ اور کتنی بدقسمتی اور پست ہمتی ہے اگر اس سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے[۳]۔

---

[۱] ترمذی، عن عبد اللہ بن یزید الانصاری۔ [۲] ابو داؤد، والنسائی۔ عن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔

[۳] یہاں یہ بات بے تکلف زبان قلم پر آتی ہے کہ منکرین حدیث کی بہت سی محرومیوں میں سے ایک بڑی محرومی یہ بھی ہے کہ وہ ان مسنون دعاؤں اور الفاظ نبوی سے محروم ہیں۔ جو حدیث میں وارد ہوئے ہیں۔ حدیث کی صحت و ثبوت میں ان کو جو شبہات ہیں وہ قدرتی طور پر اس بیش بہا ذخیرہ سے فائدہ اٹھانے اور اس کو دعا و اظہار مدعا کا ذریعہ بنانے سے مانع ہیں۔ وکفیٰ بہٖ خسارًا

امین احسن اصلاحی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں

ایک شخص کی گھریلو زندگی اس کی سیرت و کردار کا حقیقی آئینہ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے باہر کی زندگی میں ظاہرداری کی چادر اوڑھ کر نکلتا ہو۔ اور جو کچھ حقیقت میں وہ ہے اُس سے بالکل مختلف شکل و صورت میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہو۔ لیکن گھر کی زندگی میں وہ اپنے اُوپر اس قسم کا کوئی پردہ ڈالے رکھنے میں زیادہ دنوں تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اوّل تو کوئی شخص اس قسم کی کوشش کرتا ہی نہیں اور اگر وہ کرے تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے کسی شخص کو جانچنے کے لئے بہترین کسوٹی اُس کے گھر کی زندگی ہے۔ وہاں اس کو دیکھنا چاہیئے کہ اس کی سیرت کیا ہے؟ جس خدا ترسی اور تقوے کا درس وہ باہر دے رہا ہے اس پر وہ اپنے گھر کے اندر کتنا عامل ہے؟ جس اتباع کتاب و سنّت کا وعظ وہ دُوسروں کو سُنا رہا ہے اُس پر وہ خود کس قدر عمل کرتا ہے اور اپنے بیوی بچّوں سے کس قدر اُن پر عمل کراتا ہے؟ جس دین کی اقامت کے لئے وہ خدائی فوجدار بنا ہوا سارے جہان سے لڑ رہا ہے۔ اس دین کو وہ اپنے گھر کے اندر کس حد تک قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے؟ جس سادگی، جس ایثار، جس قناعت، جس صبر اور جس اخلاص و دیانت کا وہ دُوسروں سے مطالبہ کر رہا ہے۔ اُس کا جمال خود اس کی گھریلو زندگی میں کتنا جھلک رہا ہے؟ اگر فی الواقعہ کوئی شخص اس کسوٹی پر پُورا اُترتا ہے تو بلاشبہ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر پُورے اُترنے والے کی اخلاقی عظمت کا اور اُس کی سچّائی کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک ایسے شخص کے اصولوں اور نظریات سے تو آپ اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ اس کو محض ایک مصنوعی یا ایک بے کردار آدمی نہیں قرار دے سکتے!

آیئے اسی کسوٹی پر ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانچیں۔ اور یہ دیکھیں کہ آپؐ کی باہر کی دعوت اور گھر کی زندگی میں کس حد تک مطابقت ہے۔ خوش قسمتی سے صرف آپؐ ہی کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے بھی جس کا ہر حصّہ دُنیا کے سامنے ہے۔ ہم نہایت مستند معلومات کی بناء پر جس طرح یہ جانتے ہیں کہ آپؐ مسجد نبوی کے اندر صحابہ کی موجودگی میں کیا کچھ فرماتے تھے اور کیا کچھ کرتے تھے۔ اسی طرح ہم نہایت مستند معلومات کی روشنی میں یہ بھی جانتے ہیں کہ آپؐ اپنی بیوی بچّوں کے اندر کس طرح رہتے سہتے تھے۔

آپؐ نے اپنی زندگی پرائیویٹ اور پبلک کے دو حصوں میں تقسیم نہیں کی تھی۔ بلکہ آپ کی زندگی کا ہر حصّہ پبلک کے لئے کھلا ہوا تھا کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ آپؐ نے لوگوں سے یہ مطالبہ کبھی نہیں کیا کہ لوگ صرف آپؐ کی پبلک زندگی ہی کو دیکھیں۔ آپ کی نجی زندگی کا تجسس نہ کریں۔ بلکہ آپؐ نے اپنی پبلک اور اپنی نجی دونوں زندگیاں ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح نہ صرف اپنے دوستوں کے سامنے بلکہ اپنے دشمنوں کے سامنے بھی

رکھ دیں کہ لوگ چاہیں تو اُن کو اسوۂ حسنہ بنائیں اور چاہیں تو بے خوف وخطر اُس پر حرف گیری کریں۔ اگر حرف گیری کی گنجائش پائیں۔

دُنیا میں دوسروں کی بیویاں ان کی گھریلو زندگی کے رازوں کی امین ہوتی ہیں۔ لیکن صرف حضُور کی ازواج مطہرات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پبلک کے نمائندہ کی حیثیت سے آپ کی گھریلو زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ رکھتی تھیں اور پُوری دیانت وامانت کے ساتھ اس کو پبلک تک پہنچاتی تھیں۔ ایک ایسی زندگی جس کی جلوت وخلوت سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ بہترین چیز اس مقصد کے لئے ہوسکتی ہے کہ ہم اس میں یہ دیکھ سکیں کہ اُس کے دونوں پہلوؤں میں کس حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔!

اسی مقصد کو سامنے رکھ کر میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میری کوشش یہ ہوگی کہ میں جس پہلو کو بھی نمایاں کروں اس کے لئے مواد استدلال اصلاً قرآن مجید سے اخذ کروں تاکہ آپ کی سیرت طیبہ کا مستند ترین حصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے اس کا ایک جزو آپ کے سامنے آئے۔ اور اگر کہیں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو حدیث اور سیرت کے بیان کردہ واقعات سے بھی مدد لوں گا۔

اہلِ بیت کا مشغلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپؐ کے اہلبیت کا رات دن کا مشغلہ بھی وہی تھا جو خود حضُور کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ یہ صورت نہیں تھی کہ آپؐ خود تو لوگوں کو بندگیٔ رب اور اطاعت الٰہی کا وعظ سناتے رہیں اور آپ کے اہل بیت دُنیا کی دلچسپیوں اور مادی زندگی کی لذتوں میں منہمک ہوں۔ یا آپ باہر تو لوگوں کو زہد وقناعت کی تعلیم اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کی تلقین فرماتے ہوں اور گھر میں آکر اس تلقین کو بھول کر گھر کی دلچسپیوں اور راحتوں میں کھو جاتے ہوں۔ بلکہ آپ کا جو مشن باہر ہوتا تھا آپ اسی مشن کو لے کر گھر میں داخل ہوتے تھے۔ اور جس مبارک شغل میں خود اپنا وقت صرف فرماتے تھے۔ اسی مبارک شغل میں آپؐ کے گھر والے بھی اپنا وقت بسر کرتے تھے!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک مشن سورۂ جمعہ میں یہ بیان ہوا ہے:-

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

وہی ہے جس نے بھیجا اُمیوں میں ایک رسول اُنہی میں سے، جو اُن کو سناتا ہے اللہ کی آیتیں
اور اُن کو پاک کرتا ہے اور اُن کو سکھاتا ہے کتاب اور حکمت!

بعینہ اسی مشن کی یاد دہانی اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو اس وقت فرمائی ہے جبکہ منافقین اور منافقات اس غرض کے لئے رات دن ایک کئے ہوئے تھے کہ کسی طرح آپؐ کی ازواج مطہرات کو اس اعلیٰ نصب العین سے ہٹا کر دُنیوی زخارف اور مادی زندگی کی لذتوں کی طرف مائل کردیں۔ چنانچہ منافقوں کی بیویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے کانوں میں یہ پھونکنا شروع کیا کہ آپ معزز اور امیر گھرانوں کی بیٹیاں ہیں۔ آپ لوگوں کی پرورش سرداروں کے گھروں میں عیش وآرام کے گہواروں میں ہوئی تھی۔ لیکن اس شخص نے آپ کو غربت وفلاکت کی زندگی میں لاکر ڈال دیا ہے۔

اگر آپ ان کی قید سے آزاد ہوتیں تو بڑے بڑے سرداران قبائل آپ کو نکاح کے پیغام دیتے - اور آپ کی زندگیاں بڑے عیش و آرام سے گزرتیں - اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات اس سے بالاتر تھیں کہ اس قسم کے شیطانی پروپیگنڈہ سے متاثر ہوں - تاہم طبائع انسانی کی عام کمزوری کو سامنے رکھ کر اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو یاد دلایا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک عظیم منصب پر سرفراز ہیں - اسی منصب کی ذمہ داریوں کے لئے اللہ نے اُن کو چنا ہے اور اس دنیا کی کوئی عزت و شوکت بھی اس منصب کی عزت و شوکت کا مقابلہ نہیں کر سکتی - چنانچہ فرمایا :-

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ کَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا - وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا وَاذْكُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِكُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا ۔ (احزاب - ۳۲-۳۴)

اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو تو تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو - پس تم اپنے لہجہ میں ایسی نرمی نہ اختیار کرو کہ جس کے دل میں روگ ہو وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو اور اپنے گھروں میں ٹِک کر رہو - اور گزرے ہوئے زمانہ جاہلیت کی سی نمائش نہ کرو اور اس کے رسُول کی اطاعت کرتی رہو - اللہ تو بس یہ چاہتا ہے کہ تم سے دُنیا کی آلائشیں دُور رکھے - اے نبی کے گھر والو! اور تم کو اچھی طرح پاک کرے اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں سُنائی جاتی ہیں اُن کا چرچا کرو - اللہ لطیف و خبیر ہے!

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو سنوارنے اور سدھارنے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا - اسی طرح آپؐ کے گھر والوں کو بھی اس لئے چُنا تھا کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں آپ کا ہاتھ بٹائیں - جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے اُونچا بنایا تاکہ سب لوگ ہادی و مرشد اور پیغمبر و امام کی حیثیت سے آپؐ کی پیروی کریں - اسی طرح آپ کی ازواج کا درجہ بھی تمام اُمت کے مردوں اور عورتوں کے لئے اُمہات کا رکھا - تاکہ سب لوگ اُن کو اپنے لئے نمونہ مان کر اُن سے زندگی کے وہ طریقے سیکھیں جو اُن کو نبی صلعم سے معلوم ہوئے ہیں -

جس طرح اُن تعلیمات پر سب سے زیادہ اہتمام سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرماتے تھے جو آپؐ دُوسروں کو دیتے تھے - اسی طرح ازواج مطہرات اور اہلِ بیتِ نبوّت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اپنے گھر سے پھیلنے والے چشمۂ نور سے خود پہلے اچھی طرح منور ہوں - پھر اس روشنی سے دُوسروں کو منوّر کریں - جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ کے لئے یہ پسند نہیں فرمایا کہ دُنیا کے زخارف اس کو اپنی طرف مائل کریں - اسی طرح آپ کے اہلِ بیت کے لئے بھی یہ بات پسند نہیں کی گئی کہ آلائشِ دُنیا کے چھینٹوں سے اُن کے دامن آلودہ ہوں - اندر اور باہر دونوں جگہ کامل یکسانی اور کامل مشابہت تھی - جس اعلیٰ مقصد کے لئے حضورؐ نے اپنے دن رات ایک کر رکھے تھے - اسی اعلیٰ مقصد میں آپؐ کی ازواج بھی دل و جان سے منہمک تھیں --- !

شریر اور دُنیا پرست لوگ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یکسوئی کو درہم برہم کرنے کے لئے طرح طرح کے فتنے اُٹھاتے رہتے تھے۔ لیکن اللہ کی تائید اور رہنمائی سے آپ ہمیشہ ان فتنوں سے محفوظ رہ کر اپنے کام میں لگے رہے۔ اسی طرح منافقین اور منافقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی یکسوئی میں بھی خلل انداز ہونے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اُن کو ہر فتنہ سے محفوظ رکھا اور دُنیا کی دلفریبیاں اُن کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

آزادانہ انتخاب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج نے دُنیا طلبی کی تمام رغبتوں اور سرگرمیوں سے الگ تھلگ ہو کر محض اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت، اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت اور کتاب سنت کی تعلیم و دعوت کے لئے اپنے آپ کو جو وقف کر دیا تھا تو یہ کوئی مجبوری کا سودا نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کے مقدس شوہر چونکہ ایک خاص طرح کی زندگی اور ایک خاص قسم کے مشن پر مامور کر دیئے گئے تھے اس وجہ سے اُن کے لئے اب اس کے سوا کوئی راہ باقی ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ چار و ناچار اسی کام میں اپنے آپ کو بھی لگائیں اور طوعاً وکرہاً دُنیا کی لذتوں اور راحتوں کے ارمانوں سے اپنے دل خالی کریں۔ بلکہ یہ پاکیزہ زندگی انہوں نے آزادانہ انتخاب سے اختیار کی تھی۔ اُن کے سامنے دُنیا پیش کی گئی۔ لیکن انہوں نے اُس کو ٹھکرا دیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو پوری آزادی دی کہ وہ اپنے لئے جو زندگی پسند کریں اس کا انتخاب کر لیں۔ انہوں نے ہر قیمت پر آپؐ کی رفاقت کو منتخب کیا۔

شریروں اور منافقوں نے اُن کو طرح طرح سے غیر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اُن کے اس اطمینان اور اس سکونِ خاطر میں جو اُن کو نبیؐ کی صحبت میں حاصل تھا۔ کوئی فرق نہ آیا۔ جس زمانے میں منافقین کی ریشہ دوانیاں ازواجِ مطہرات کو غیر مطمئن کرنے کے لئے غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں۔ آپؐ نے حجت تمام کرنے کے لئے اپنی ازواج کو اس بات کا پورا پورا اختیار دے دیا کہ وہ اللہ اور اُس کے رسُول اور زخارفِ دُنیا میں سے کسی ایک چیز کا پوری یکسوئی اور دل جمعی سے انتخاب کر لیں۔ اگر اُنھیں دُنیا اور دُنیا کی راحتوں اور لذّتوں کی خواہش ہے تو اللہ کا رسُول اس بات کے لئے تیار ہے کہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ اُن کو اُن کے حقوق دے دلا کر رخصت کر دے۔ اور اگر وہ دُنیا پر لات مار کر رسُول کی صحبت و معیت اور اقامتِ دین کے اس جہاد کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتی ہیں تو پھر اس زہد و قناعت کی زندگی پر ان کو قانع ہونا پڑے گا۔ جو وہ گزار رہی ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا۔ وَإِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (احزاب ۲۸-۲۹)

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دُنیا کی زندگی اور اُس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ میں تمہیں تمہارے حقوق دے دلا دوں اور خوبصورتی کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسُول کی اور آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم میں سے خوبی طلب کرنے والیوں کے لئے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو یہ اختیار دے کر ایک طرف تو اُن کے لئے اس بات کا موقع بہم پہنچایا

کہ اگر وہ اقامت دین اور اعلائے کلمتہ اللہ کے اس جہاد اور زہد و نفس کشی کی اس ریاضت میں آپ کی شریک سفر رہنا چاہتی ہیں تو اپنے آزادانہ انتخاب و اختیار سے رہیں تاکہ اس جہاد و ریاضت کا جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ملنے والا ہے۔ اُس میں پُوری پُوری حصہ دار بن سکیں۔

دُوسری طرف آپ نے ان منافقین کے لئے بھی اُن کی کوششوں کا نتیجہ دیکھ لینے کا ایک موقع بہم پہنچایا۔ جو ایک عرصہ سے اس مہم میں لگے ہوئے تھے کہ آپ کی گھریلو زندگی میں کوئی بے اطمینانی اور انتشار پیدا کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کے بعد قدرتی طور پر اُن کو دلی خوشی ہوئی ہوگی کہ ایک لمبے عرصہ تک فساد کی جو فصل وہ بوتے اور جس کو سینچتے رہے ہیں اب اُس کے بار آور ہونے کا وقت آیا ہے۔ وہ متوقع ہوئے ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو اُکسانے اور اُن کی موجودہ زندگی سے اُن کو بیزار کرنے کی جو جدوجہد وہ کرتے رہے ہیں اب اُس کے نتائج کچھ نہ کچھ ضرور نکلیں گے۔ آپ کی ازواج میں سے سب نہیں تو بعض تو ضرور ہی اس اختیار کے بعد آپ کی رفاقت سے انکار کر دیں گی اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور آپ کو ایذا پہنچانے کا نیا مواد اُن کو ہاتھ آئے گا۔ لیکن اُن کے چھکے چھوٹ گئے ہوں گے جب انہوں نے دیکھا ہوگا کہ اس اختیار کے پالنے کے بعد آپ کی ازواج کا جذبۂ اطاعت و انقیاد اور جوش محبت و وفاداری اور بڑھ گیا اور اُن میں سے ایک ایک نے صاف صاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کہ:-

"آپ کی غلامی کے آگے تمام دُنیا کی سلطنت اور سارے کون و مکان کی سروری و سرداری بھی ہیچ ہے۔"

اس طرح یہ حقیقت مخالفین اور موافقین دونوں پر واضح ہو گئی کہ حضورؐ کی ازواج کی زندگیاں اس مقدس مشن کے ساتھ صرف اس لئے نہیں بندھی ہوئی تھیں کہ وہ حضورؐ کے رشتۂ ازدواج میں منسلک تھیں۔ بلکہ ان میں سے خود ہر ایک کا مطلوب حقیقی بھی یہی مشن بن گیا تھا۔

بخاری میں ابو سلمہ بن عبدالرحمان سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بتایا کہ جب مذکورہ آیت تخییر اتری تو حضورؐ نے اپنی ازواج میں سے ایک ایک کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا اور اس کا آغاز مجھ سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات کہہ رہا ہوں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تم اس کے جواب کے لئے جلدی کرو۔ اس کا جواب تم اپنے والدین سے مشورہ کے بعد مجھے دو۔ اس کے بعد آپؐ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی۔ میں نے عرض کی کہ اس میں ایسی کیا بات ہے جس کے بارے میں مجھے اپنے والدین سے مشورہ کی ضرورت ہو۔ میں دُنیا اور اس کی زینتوں کے مقابل میں اللہ اور اس کے رسُول اور آخرت کی زندگی کو اختیار کرتی ہوں۔

بولائے تو کہ گر بستہ گر خویشتم خوانی
از سر خواجگیٔ کون و مکاں برخیزم

پھر یہی سوال حضورؐ نے یکے بعد دیگرے اپنی تمام ازواج کے سامنے رکھا اور سب کا جواب وہی تھا جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا تھا، اور اس کے سوا جواب اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ سن و سال کے لحاظ سے اگر دُنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کا ارمان ہو سکتا تھا تو حضرت عائشہ رضؓ کے دل میں ہو سکتا تھا۔ لیکن جب عشق حق نے اُن کو اس قدر

دُنیا سے بے نیاز اور آخرت کا طالب بنا دیا تھا کہ اللہ کی محبت اور رسُول کی اطاعت پر سب کچھ قربان کر دینے میں زندگی کی حقیقی لذت محسوس کر رہی تھیں تو دوسروں کا جواب اُن کے جواب سے کس طرح مختلف ہو سکتا تھا؟

بعض مستشرقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت پر "حرم" کی پھبتی چست کرتے ہیں۔ بعض آپؐ کی ازواج مطہرات کو قیدیوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں یہ "گرفتارانِ بلا" تھیں۔ جو صرف اس لئے آپ کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں کہ اُن کے لئے کوئی راہ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن کیا پوری تاریخ انسانی میں ایک مثال بھی اس امر کی پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی نے اپنے قیدیوں کے سامنے آزادی کا یہ اختیار نامہ رکھا ہو۔ جو حضورؐ نے رکھا۔ لیکن قیدیوں نے اس آزادی پر اُس کی غلامی ہی کو ترجیح دی ہو؟

محبّت، اعتماد اور خودداری کی فضا

لیکن کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اگر حضورؐ اور حضورؐ کے اہلِ بیت نے دُنیا کی جگہ آخرت، ثروت، امارت کی جگہ فقر اور خدمتِ نفس کی جگہ خدمتِ انسانیت کے اس نصب العین کو اپنے لئے پسند فرمایا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کی گھریلو زندگی میں کوئی لذت و کیفیت، کوئی چہل پہل اور سرگرمی اور اُتار چڑھاؤ کی کوئی نرمی و گرمی سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک ہموار زندگی تھی۔ ہر قسم کے نشیب و فراز سے خالی۔ ایک پُرسکون ماحول تھا ہر قسم کے جذبات کی مداخلت سے پاک اور محفوظ۔ ایک بہتا ہوا دریا تھا ہر قسم کے تلاطم اور تموج سے یکسر نا آشنا۔ حضورؐ کی گھریلو زندگی کے متعلق جن لوگوں کا تصور یہ ہے اُن کا تصور نہایت غلط ہے۔ آپؐ کی باہر کی زندگی کی طرح آپؐ کی گھر کی زندگی بھی اُن تمام کیفیات سے معمور اور پُر رونق تھی جن سے انسانی زندگی کو معمور اور پُر رونق ہونا چاہیئے۔ البتہ اس میں افراط و تفریط کی بے اعتدالیاں یا عیشِ دُنیا کی خود فراموشیاں نہیں تھیں۔ آپؐ سوتے بھی تھے۔ جاگتے بھی تھے۔ آپؐ کھاتے بھی تھے اور بھوکے بھی رہتے تھے۔ آپؐ خوش بھی ہوتے تھے اور ناخوش بھی ہوتے تھے۔ آپؐ پیار بھی کرتے تھے اور سرزنش بھی فرماتے تھے۔ غرض زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں آپؐ کی گھریلو زندگی میں بھی وہ سارے پہلو پائے جاتے تھے۔ بس دوسروں کی زندگی سے اگر کوئی فرق تھا تو جیسا کہ عرض کیا گیا۔ یہ فرق تھا کہ یہ زندگی ایک مثالی زندگی تھی۔ اس وجہ سے اس میں کوئی شے نہ اپنے فطری حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی اور نہ اس سے پیچھے ہٹی ہوئی تھی۔ اگر کوئی چیز ذرا بھی آگے پیچھے ہٹتی تو ہمیشہ معلم الغیب کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی۔

آپ اپنی ازواج پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات آپ اُن کی دلداری کے خیال سے کوئی ایسی چیز کھانی چھوڑ دیتے جو خود آپؐ کو تو مرغوب ہوتی لیکن آپؐ کی ازواج میں سے کسی کے مذاق کے خلاف ہوتی۔ آپؐ کی یہ شفقت و دلداری اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی۔ لیکن ساتھ ہی اس امر سے آگاہ فرما دیا کہ یہ چیز اس حد تک نہیں بڑھنی چاہیئے کہ اُس کے سبب سے کوئی جائز چیز ناجائز بن جائے۔ آپؐ اپنی ازواج مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے۔ اُن کو اپنے رازوں میں شریک کرتے تھے۔ اس لئے کہ اگر بیوی محرم راز نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر بیویوں کی طرف سے ان رازوں کی حفاظت میں کوئی کوتاہی ہوتی تو اس پر آپؐ اُن کو سرزنش بھی فرماتے۔ کیونکہ جس طرح شوہر کے لئے یہ بات پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی بیوی پر اعتماد کرے۔ اسی طرح بیوی کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امین بنے اور اس میں کوئی خیانت نہ کرے۔

آپؐ اپنی بیویوں پر [illegible] سرزنش بھی فرماتے تھے۔ لیکن سرزنش کرنے کے معاملہ میں بھی حضورؐ کا ایک خاص انداز تھا۔ آپؐ اگر کسی بات پر سرزنش فرماتے تو اس طرح نہیں کہ جس کو سرزنش کی اس کے لتّے لے ڈالے۔ بلکہ ایسی طرح کہ مخاطب بات سمجھ بھی

جائے اور اس پر کچھ زیادہ گراں بھی نہ گزرے۔ آپ کی ازواج کے باہمی تعلقات (معمولی فطری نسوانی جذباتِ رقابت کے وقتی ظہور کے سوا) نہایت خوشگوار تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے راز کی باتیں بھی ایک دوسرے پر ظاہر کر دیا کرتی تھیں۔ اس چیز پر بھی حضور نگاہ رکھتے تھے کہ نہ تو غیر معمولی اعتماد کسی بے راہ روی میں مبتلا کرے اور نہ بلاوجہ کی بے اعتمادی کسی خرابی کا باعث بنے۔ حضور کی ازواج کبھی کبھی خود حضور کے مقابل میں بھی اپنی خودداری کا اظہار کرتی تھیں اور حضور اس کو بھی پسند فرماتے تھے بشرطیکہ یہ اپنی جائز حدود سے آگے نہ بڑھے۔

زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز جو حضور کی گھریلو زندگی میں موجود تھے۔ ایک ایسی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس کو انسانی زندگی کا بہترین مظہر کہا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں قرآن مجید کی چند آیتیں نقل کرتے ہیں۔ جن میں آپ کی گھریلو زندگی کے بعض مخفی گوشوں کی طرف اشارات کئے گئے ہیں۔ اگر آپ اُن کی تہ میں اُتر کر غور کریں گے تو وہ ساری جھلکیاں آپ دیکھ لینگے جو اُوپر کی سطروں میں نمایاں ہوئی ہیں:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۔ قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ۔ وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَن بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ۔ إِن تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ۔ (تحریم ۱-۴)

اے نبی! جو چیز اللہ نے تمہارے لئے جائز ٹھہرائی ہے اُس کو اپنی بیویوں کی دلداری کے خیال سے اپنے لئے حرام کیوں ٹھہراتے ہو؟ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے تمہاری خلاف شرع قسموں کا توڑنا فرض ٹھہرایا ہے اور اللہ ہی تمہارا آقا و مولیٰ ہے اور وہ علم و حکمت والا ہے اور جب کہ پیغمبر نے اپنی کسی بیوی سے کوئی راز کی بات کہی۔ تو جب اُن بیوی نے وہ بات دُوسری بیوی کو بتادی اور اللہ نے اس امر سے آپ کو آگاہ کر دیا تو کچھ حصّہ کا آپ نے ذکر کیا اور کچھ حصّہ کو حذف کر دیا۔ تو جب آپ نے اُن بیوی پر ظاہر کیا تو وہ بولیں کہ آپ کو اس چیز سے کس نے آگاہ کیا؟ آپ نے کہا مجھے خدائے علیم و خبیر نے آگاہ کیا۔ اگر تم دونوں بیویاں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمہارے شایانِ شان ہے۔ کیونکہ تمہارے دل پہلے ہی اللہ کی طرف مائل ہیں اور اگر تم پیغمبر کے خلاف ایکا کروگی تو یاد رکھو کہ اللہ اس کا مالک ہے اور جبریل اور تمام نیک مسلمان اور ملائکہ اس کے ساتھی ہیں۔

ان آیات میں جس چیز کی تحریم کا ذکر ہے یا جس راز کی طرف اشارہ ہے اُن کے درپے ہونے کی تو ضرورت نہیں ہے۔ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے راز رکھیں اُن کی کھوج کرید کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج کے درمیان کے کسی راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا تو ہمارے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن ان آیات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے جو پہلو بالکل نمایاں ہو کر سامنے آرہے ہیں۔ انھیں ہمیں ضرور سمجھنا چاہئیے۔ اُن سے اس

بات کا ثبوت فراہم ہوگا کہ حضورؐ کی گھر کی زندگی کوئی بے رنگ، سپاٹ اور بے نشیب و فراز زندگی نہیں تھی۔ بلکہ انسانی فطرت جن پاکیزہ تقاضوں اور جن خوبصورت داعیات سے مرکب ہے۔ اُن کی دھوپ چھاؤں یہاں بھی موجود ہے۔ مثلاً ان آیات کے عمق میں اُتر کر غور کیجئے تو مندرجہ ذیل باتیں نہایت واضح طور پر آپ کے سامنے آئیں گی:-

(۱) ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جائز حدود کے اندر اپنی ازواج کی دلداری فرماتے تھے۔ اُن کے مذاق کا لحاظ رکھتے تھے۔ اور اُن کے جو شوق بے ضرر ہوتے حتی الامکان وہ پورے کردیتے۔

(۲) دوسری یہ کہ آپؐ کی بیویاں آپؐ کی شریک رنج و راحت تھیں۔ آپؐ اُن سے ہر طرح کی باتیں کرتے تھے۔ یہاں تک آپؐ اُن کو اپنے رازوں کا امین بھی بناتے تھے۔

(۳) تیسری یہ کہ آپؐ کی بیویوں کے آپس کے تعلقات نہایت محبّت اور اخلاص کے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی تقاضائے فطرتِ انسانی اُن میں سوکنوں کے سے جذبات بھی اُبھر آتے تھے۔ لیکن یہ عام حالت نہیں تھی۔ عام حالت اس قدر اعتماد و محبت کی تھی کہ ایک دوسرے کو شوہر کے راز سے بھی آگاہ کردیتی تھیں۔ حالانکہ سوکنوں میں یہ اخلاق بہت کم پایا جاتا ہے۔

(۴) چوتھی یہ کہ آپؐ کی ازواج کو اپنے گھروں میں جائز حد تک اپنی خودداری کے اظہار کا پورا پورا موقع حاصل تھا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف ایکا بھی کرلیتی تھیں۔ چونکہ یہ چیز محض بربنائے محبّت و اعتماد ہوتی تھی اس وجہ سے اس کو ہمیشہ حضورؐ نے گوارا فرمایا۔ صرف اس وقت اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو روکا جب یہ اپنے فطری حدود سے بڑھتی نظر آئی۔

حضورؐ کی گھریلو زندگی کی یہ جھلکیاں ہمیں قرآن مجید میں نظر آتی ہیں۔ اگر اس کو ہم سیرت کی کتابوں میں دیکھیں تو وہاں ہر پہلو سے متعلق ہمیں پوری تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن ان تفصیلات کے لئے اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اس وجہ سے ہم صرف زاد المعاد کی مندرجہ ذیل چند سطروں پر قناعت کرتے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:-

"نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی ازواج کیساتھ نہایت محبّت اور حُسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس انصار کی لڑکیاں جمع ہوجاتیں اور آپؐ اُن کو اُن کیساتھ کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی تو آپ اُن کی خواہش پوری کردیتے۔ وہ جس برتن سے پانی پیتیں آپؐ بھی اس برتن سے اُن کے مُنہ لگانے کی جگہ مُنہ لگا کر پانی پی لیتے۔ جس ہڈی کو وہ چوستیں اُس ہڈی کو آپ بھی لے کر چوستے۔

ایک مرتبہ اہلِ حبشہ مسجد نبویؐ میں اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے لئے اس کا موقع پیدا فرمایا کہ وہ آپؐ کے کندھے کی اوٹ سے اُن کے کرتب دیکھ لیں۔ دو مرتبہ آپؐ سفر کے موقع پر اُن کے ساتھ دوڑے بھی۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔

نماز عصر پڑھ کر آپؐ کا معمول تھا کہ آپ تمام ازواج کے ہاں تشریف لے جاتے اور اُن کی

خیر خیریت دریافت فرماتے۔ پھر شب میں جس کی باری ہوتی اُن کے یہاں قیام فرماتے۔

(زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۶)

محاسبہ لیکن اس تمام اعتماد و محبت کے باوجود حضور اپنے اہلِ بیت کے محاسبہ سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ ایک طرف شفقت و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ آپ کے خادمِ خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال مسلسل خدمت کی (دوسری روایت میں نو سال کے الفاظ ہیں) لیکن حضور نے میری کسی بات پر اُف تک نہیں کہا۔ اگر میں نے کوئی کام کر ڈالا تو یہ نہیں فرمایا کہ کیوں کیا؟ اور اگر کوئی کام میں نے نہیں کیا تو یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہیں کیا؟ لیکن دوسری طرف محاسبہ کا یہ اہتمام تھا کہ دینی معاملات میں اگر ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے صادر ہوتی تو ناممکن تھا کہ وہ آپ کی گرفت سے بچ سکے۔ اُمہات المومنین کی یہ شہادت ہے کہ آپ اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے کبھی کوئی باز پرس نہیں فرماتے تھے۔ لیکن خدا اور دین کے معاملہ میں ہر کوتاہی پر ضرور باز پرس فرماتے۔ اور اس احتساب سے کوئی محبوب سے محبوب شخصیت بھی نہیں بچ سکتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ آپ کو اور کون محبوب ہو سکتا تھا؟ ایک مرتبہ اُن کی زبان سے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں یہ الفاظ نکل گئے کہ "حسبک من صفية كذا كذا" (صفیہ میں یہ عیب کیا کم ہے کہ اُن کا قد چھوٹا ہے) یہ بات اُن کی زبان سے نکلنی تھی کہ آپ نے فوراً اُن کو تنبیہ فرمائی۔ اور جن الفاظ میں فرمائی ذرا اُن کے تیور ملاحظہ ہوں:۔ ارشاد ہوا:۔

لقد قلت كلمة لو مزجت بماء البحر لمزجته

عائشہ! تم نے ایک ایسی بات زبان سے نکال دی ہے کہ اگر وہ سمندر میں بھی ملا دی جائے تو اس کی کڑواہٹ اس کو بھی تلخ کر کے رکھ دے۔

حضور کا یہ محاسبہ بھی درحقیقت آپ کی محبت ہی کا ایک پہلو تھا۔ جو لوگ اپنے گھر والوں سے محض مادی قسم کی محبت رکھتے ہیں وہ اپنے ذاتی عیش و آرام سے تعلق رکھنے والی باتوں میں تو بڑے سخت گیر اور تنک مزاج ہوتے ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے صادر ہو جائے اور وہ اس کو نظر انداز کر جائیں۔ لیکن خدا اور شریعت کے معاملات میں وہ بڑے روادار اور فیاض ہوتے ہیں۔ بیوی بچوں میں سے جس کا جی چاہے اپنی آخرت کی بربادی کے لئے جو چاہے کر گزرے۔ انہیں کبھی اُن کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ حالانکہ حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کوتاہیوں کو تو نظر انداز کریں جو اُن کی اپنی ذات کے معاملہ میں ہوں اور ان باتوں پر گرفت کریں جن کا تعلق خود ان کی اپنی آخرت سے ہو۔ حضور کا طریقہ یہی تھا۔ آپ اپنے ذاتی آرام سے زیادہ اس بات کے لئے فکر مند رہتے کہ گھر والے اپنی آخرت کی ذمہ داریوں کی طرف سے غافل نہ ہونے پائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اُونچا بنایا تھا۔ اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بھاری تھیں۔ دوسروں کے مقابل میں اُن کا اجر بھی دُگنا تھا اور اگر اُن سے کوئی جرم سرزد ہو تو اُس کی سزا بھی دُگنی تھی۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَنْ يَأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ

وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا وَمَنْ يَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلَّهِ وَرَسُولِهِ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُؤْتِهَا

أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا۔ (احزاب۔ ۳۰-۳۱)

اے پیغمبرؐ کی بیویو! جو تم میں سے کسی کھلی ہوئی بُرائی کی مرتکب ہوگی تو اس کو دُہری سزا دی جائے گی اور یہ اللہ کے لئے سہل بات ہے اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتی رہیں گی اور بھلے کام کرتی رہیں گی۔ ہم اُن کو اُن کا اجر بھی دُہرا دیں گے اور اُن کے لئے ہم نے رزق کریم تیار کر رکھا ہے

حضورؐ اپنے اہل بیت کی ان ذمہ داریوں کے احساس سے ہمیشہ گرانبار رہتے اور ہر وقت اُن کو دُنیا کے بجائے آخرت کی کامیابیوں کے لئے اُبھارتے رہتے۔ آپؐ جب شب کی نمازوں کے لئے اُٹھتے تو آپؐ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپؐ کی بیویاں بھی اس سعادت میں حصہ لیں اور بسا اوقات آپ اس کے لئے نہایت نرمی اور محبت سے اُن کو شوق بھی دلاتے۔ دروازے پہ کوئی سائل آتا تو گھر والوں کو اس کے حقوق یاد دلاتے۔ کوئی مہمان آتا تو اُس کی خدمت پر سب کو اُبھارتے۔ اور کبھی کبھی سب کو جمع کر کے نام لے لے کر مخاطب فرماتے۔ اور بتاتے کہ اپنی آخرت کے لئے جو کچھ کر سکتی ہو کر لو۔ میں وہاں تمہارے کچھ کام نہ آ سکوں گا۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر

نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

(عزت بخاری)

ڈاکٹر محمد حمید اللہ -
(از پیرس)

جہاد و غزوات

انبیاء سلف علیہم السلام کے حالات کا ہمیں بہت کم علم ہے۔ قرآن مجید میں مثلاً حضرت آدمؑ و ادریسؑ و نوحؑ کی حد تک کسی جنگی تبلیغ کا پتہ نہیں چلتا۔ اور شاید چلنا بھی نہیں چاہیئے۔ کہ یہ انبیاء اپنے خاندان یا قبیلے ہی کی اصلاح چاہتے تھے اور اُن کے نیز بعد کے زمانے میں نافرمان خدائی عذاب اور آفاتِ سماوی کا شکار ہو کر کیفر کردار کو پہنچتے رہے۔ ابراہیمؑ و موسیٰؑ مایوسی کے عالم میں محض ہجرت کرتے ہیں۔ انہوں نے بھی تبلیغ کی کشمکش میں شمشیر کی صورت نہ دیکھی۔ عملی اور حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے جانچو تو ان انبیاء کو اتنے پیرو ہی نہ ملے جو مخالفوں سے کشمکش میں سینہ سپر ہو سکیں۔ حضرت موسیٰؑ کے نافرمان ساتھی تو "اِذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا" کا ضرب المثل جملہ کہنے سے باک نہ کرتے تھے۔ بہ ظاہر جس واحد نبیؑ کو ہم قرآنی شہادت میں قتال فی سبیل اللہ کرتے دیکھتے ہیں۔ وہ حضرت اشمویلؑ ہیں جن کا ذکر پارہ سیقول کے آخر میں ہے۔ اُن سے بنی اسرائیل کہتے ہیں:-

"ہمارے لئے ایک بادشاہ برپا کر تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اور اللہ کی راہ میں ہم کیوں نہ لڑیں گے۔ جبکہ ہمیں اپنے گھروں اور بال بچوں سے نکال باہر کیا ہو"

اسے زیادہ سے زیادہ انتقامی اور دفاعی جنگ کہہ سکتے ہیں۔ وہ بے غرضانہ اور بے نفسانہ جنگ جس کا منشاء نہ اہل و عیال ہو نہ مال و منال اور نہ ہی شہرت یا حمیت۔ بلکہ صرف اعلاءِ کلمۃ اللہ یا ایثار جس میں جان و مال و آبرو ہر چیز اللہ کے لئے اور اللہ کے حکم سے قربان کر دی جائے۔ اس کا پتہ رسولِ عربی سے پہلے نہیں چلتا۔

انسانی تاریخ جنگوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن وہ جنگ جس کا مقصد نہ جہانگیری ہو اور نہ اقتدار کی ہوس۔ بڑا دل گردہ چاہتی ہے۔ رسولِ اکرم نے صرف ایک جنگ کی اجازت دی۔ وہ جو اللہ کی راہ میں ہو۔ کسی صحابی نے پوچھا۔

من فی سبیل اللہ؟ قال، من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا!

اللہ کی راہ میں کون ہے؟ فرمایا۔ صرف وہ جو اس لئے لڑائی کرے کہ اللہ ہی کا بول بالا ہو۔

یہ صحیح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم جو مروجہ انجیل میں ملتی ہے۔ وہ انسانی مطمعیت کا اعلیٰ نمونہ ہے کہ ایک گال پر بے قصور طمانچہ مارنے والے کو دوسرا گال پیش کر دو۔ لیکن اگر وہ حضرت داؤدؑ یا سلیمانؑ کی [illegible] ہوئے ہوتے تو کیا کرتے؟

زمانہ حال میں بھی بعض "بزرگ" "عدم تشدد" کا پرچار کرتے رہے۔ لیکن صرف اُس وقت تک جب تک قوی تر سے مقابلہ تھا۔ اور ہاتھ میں فوج اور ہتھیار نہ تھے۔

اللہ کی راہ میں لڑائی یہ نہیں ہے کہ کمزور کو حریف دیکھ کر جی للچائے اور اُسے دبوچ لیں۔ بھیڑیا بھی یہی کرتا ہے!

رسولؐ عربی کا قول و فعل

اسلام نے اپنے پیروؤں پر جہاد فرض کیا ہے۔ اس اصطلاح کے لفظی معنی کشمکش کے ہیں۔ جو بہت وسیع مفہوم ہے اور جس میں بزور بازو اصلاح کرنا۔ زبان سے کلمۂ حق کہنا۔ بے بسی کے عالم میں کم از کم دل ہی سے برائی کو برائی سمجھنا۔ سب داخل ہیں۔ ہر چیز کا وقت ہوتا ہے اور ہر شخص کو موقع و حالات کے لحاظ سے کبھی کچھ اور کبھی کچھ کئے بغیر چارہ بھی نہیں۔ آدمی حقیقت پسند نہ ہو تو مقصد کو حاصل بھی نہ کر سکے۔

رسولِ اکرمؐ اور آپؐ کے پیروؤں کو ہجرت سے قبل مکہ میں کیا کچھ اذیت نہ دی گئی۔ اور جیسے جیسے یہ ہجرت کرتے جاتے تھے، ان کی جائیداد۔ منقولہ ہو کہ غیر منقولہ۔ کس طرح قرق نہ ہوتی گئی۔ جب خود آنحضرتؐ ہجرت فرماتے ہیں تو آپؐ کے پاس جو کثیر رقمیں امانت تھیں۔ اُن کو آپ انتقاماً ہی ساتھ لے کر مدینہ "فرار" ہو سکتے تھے۔ مگر آپؐ نے جو کیا اُس سے خود بیسویں صدی کے "مہذب" انسان کو (چاہے گورا ہو یا کالا) شرمانا پڑتا ہے!

آپؐ بدر میں تشریف فرما ہیں۔ ابو جہل کی سرداری میں تعداد میں تگنا۔ ساز و سامان میں دس گنا دشمن لشکر چڑھائی کرتا ہے۔ مورخ بلاذری نے "انساب الاشراف" میں ایک کم معروف مگر اہم تفصیل درج کی ہے۔ اور لکھا ہے:

> "آنحضرتؐ نے قریش کے لشکر کو کہلا بھیجا کہ مکہ واپس چلے جائیں۔ کیونکہ آپؐ اُن سے لڑنا نہیں چاہتے۔ جب اُدھر سے انکار رہا تو مجبوراً لڑائی کرنی ہی پڑی۔ تگنے دشمن کو شکست فاش دینے کے بعد جب ستر اسی آدمی گرفتار ہوئے تو ان سب کو تلوار کے گھاٹ اتارنے میں کوئی امر مانع نہ تھا۔ اور شاید مسلمان حق بجانب بھی ہوتے۔ مگر مقصد نہ انتقام تھا اور نہ درندگی و خونخواری۔ اگر ان سب کو یونہی چھوڑ دیا جاتا تو شاید وہ بھی افراد کی فطرتوں میں تفاوت کے باعث مقصد کو فوت کر دیتا۔ اس لئے قیدیوں سے برتاؤ بھی مختلف رہا۔ شریفوں کو محض اس وعدے پر چھوڑ دیا کہ آئندہ آپؐ کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں گے۔ اسلحہ فروش مالداروں سے فدیہ میں ہتھیار مانگے گئے۔ سرمایہ داروں سے رقم مانگی گئی۔ پڑھے لکھوں سے کہا گیا کہ ہر شخص دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ صرف دو قیدیوں کو جو بدر کی چڑھائی کے اصل ذمہ دار تھے اور ہر طرح کے جبر اور طنز وغیرہ کے ذریعہ سے، ہچکچانے والوں کو بھی ورغلا کر لائے تھے۔ اور جن کی افتادِ طبع سے اس کی توقع ہی نہ تھی کہ کسی نرمی یا رعایت سے وہ کچھ بھی متاثر ہوں گے۔ صرف ایسے دو آدمیوں کو مستقبل کے خوف سے سزائے موت دی گئی۔"

بنو النضیر کے یہودیوں نے بد عہدی سے گزر کر غداری کا اقدام کیا تھا۔ آنحضرتؐ کو انہوں نے ہجرت پر راضی خوشی اپنی شہری مملکت کا سردار تسلیم کیا تھا۔ لیکن جب ایک مرتبہ آپؐ اُن کے محلے میں گئے اور دھوپ سے بچنے کے لئے ایک برج کے سائے میں تشریف فرما ہوئے (ان اللہ کے بندوں کو اس کی بھی توفیق نہ ہوئی کہ اپنے صدر مملکت کو کسی گھر میں بٹھا کر گفتگو کریں) تو برج پر سے ایک بڑا پتھر گرا کر آپؐ کو قتل کرنے کی تدبیر ہوئی۔ جب ہر طرح

کی سرزوری اور جنگی مقاومت کے باوجود اُن کو صرف یہ سزا ملی کہ کہیں اور چلے جائیں (اور پورا مال و متاع ساتھ لے جائیں حتیٰ کہ مسلمانوں کو دیئے ہوئے قرضے بھی واپس حاصل کرلیں) تو اس رعایت کا بدلا یوں دیا کہ سارے عرب کو مدینے پر چڑھالائے اور معرکۂ خندق میں مسلمانوں کے "کلیجے منہ کو آ گئے"۔ اس انتہائی نازک اور زندگی و موت کی کشمکش میں اندرون مدینہ کے بنو قریظہ نے عین دمِ آخر غداری کی اور چاہا کہ مسلمانوں پر اندر سے ٹوٹ پڑیں (اور خندق وغیرہ کا سارا دفاعی نظام بیکار کردیں) انھیں بڑی فراست سے ایک دن روکا گیا۔ دُوسرے دن یوم سَبت (سنیچر) تھا جس میں یہودی اس زمانے میں جنگ نہ کرتے تھے۔ تیسرے دن عربوں کے حرام مہینے (ذیقعدہ تا محرم) شروع ہو رہے تھے۔ اس طرح لڑائی ختم ہو گئی۔

پروفیسر ونینسنگ نے (جو غالباً یہودی تھا) یہ معقول سوال کیا ہے کہ بنو النضیر کے ساتھ رعایت کے تلخ تجربہ کے بعد کیا بنو قریظہ کی قوت بھی اپنی مخالفوں کی طاقت میں اضافے کے لئے چھوڑ دی جا سکتی؟ مگر آنحضرت نے پھر بھی نرمی دکھائی۔ اور فرمایا کہ:۔

"ان یہودیوں ہی کے ایک سابق دوست اور حلیف کو پنچ ٹھہرایا جائے اور وہ جو بھی فیصلہ کرے وہ نافذ کیا جائے"۔

اگر بنو قریظہ خود آنحضرت کو حَکَم بناتے تو شاید رحمۃ للعالمین کا مظاہرہ ہوتا۔ بہرحال اس پنچ نے بھی کوئی خاص سختی نہ کی اور صرف یہ حکم دیا کہ:۔

"توریت میں حضرت موسیٰ کو مغلوب دشمن سے برتاؤ کا جو حکم دیا گیا ہے۔ (دیکھو توریت کتاب تثنیہ Deutronomy فصل ۲۰، فقرہ ۱۰ تا ۱۴) وہی عمل میں لایا جائے"۔

گویا یہودی اپنے دشمنوں سے جو برتاؤ کرتے ہیں۔ وہی برتاؤ ان سے کیا جائے۔

فتح مکہ شاید انسانی جہاد کا کمال ہے۔ اکیس سال سے مسلسل اہلِ مکہ مسلمانوں کو روز افزوں بے وجہ ستاتے چلے آرہے تھے۔ اس کی داستان سے سب واقف ہیں۔ جب آنحضرت نے اپنے وطن کو۔ جہاں سے جلاوطنی پر آپ کو مجبور کیا گیا تھا۔ فاتحانہ واپس آئے تو جو برتاؤ عمل میں آیا۔ اس کا بیسویں صدی کا "مہذب" انسان تصور بھی نہیں کرسکتا۔ فوجی دستے شہر کی طرف بڑھے تو اس منادی کے ساتھ کہ:۔

"جو اپنے گھر میں بیٹھ رہے اُسے امان ہے۔ جو ہتھیار ڈال دے اُسے امان ہے۔ جو حرم کعبہ میں چلا جائے اُسے امان ہے۔ جو سردار شہر ابو سفیان کے گھر[1] میں چلا جائے اُسے امان ہے"۔

شہر پر قبضہ مکمل ہو جانے کے بعد بستی کی ساری آبادی بُلائی گئی اور آنحضرت نے اس سے پُوچھا کہ وہ کس برتاؤ

---

[1] مشہور تابعی ثابت البُنانی نے لکھا ہے کہ قبل ہجرت گلی کے لونڈے آنحضرت کا پیچھا کرتے اور آپ پر سنگباری کرتے اور آپ ابو سفیان کے گھر میں گھس جاتے تو وہاں آپ کو امن مل جاتا۔ فتح مکہ کے وقت کا یہ اعلان اسی کی شکر گزاری میں تھا۔

کی توقع کرتی ہے؟ آنحضرت سب کے قتلِ عام کا حکم دے سکتے۔ ساری جائیداد لوٹ لے سکتے۔ سارے لوگوں کو غلام بنانے کا بھی فیصلہ فرما سکتے تھے۔ مگر آپؐ نے صرف یہ فرمایا کہ:-

"جاؤ، تم پر کوئی گرفت نہیں۔ تمہیں چھوڑ دیا جاتا ہے"

اس نفسیاتی لمحہ میں فوراً ہی بہ کثرت لوگ مسلمان ہوگئے۔ اُن میں سب سے پہلے ایک مشہور متمرد سردار عتّاب تھا۔ آنحضرتؐ کے اس ارشاد سے چند لمحہ پہلے جب حضرت بلالؓ نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی تو عتّاب نے کہا تھا:-

"خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ آج زندہ نہیں ہے ورنہ وہ اس نہیقِ حمار (یعنی حضرت بلالؓ کی اذان) کو برداشت نہ کر سکتا"

جب عفو عام کے اعلان پر سب سے پہلے عتّاب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا اور اپنے اسلام کا اعلان کیا تو اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے فرمایا:-

"اچھا۔ میں تمہیں مکہ کا گورنر مامور کرتا ہوں"

تو مفتوحہ شہر وہیں کے ایک نو مسلم کٹر دشمن کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور چند دن بعد مدینہ واپسی ہوتی ہے تو مدینہ کا ایک، واحد سپاہی تک وہاں احتیاطاً چھوڑنا غیر ضروری خیال کیا جاتا ہے۔

وَلِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ

طاقت کے وقت نرمی۔ کمزوری کے وقت ہمت وایثار۔ یہ ہے اسلامی جہاد!

ظہورِ قدسی

چمنستانِ دہر میں بارہا روح پرور بہاریں آچکی ہیں۔ چرخِ نادرہ کار نے کبھی کبھی بزمِ عالم اس سروسامان سے سجائی کہ نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئیں۔

لیکن آج کی تاریخ وہ تاریخ ہے جس کے انتظار میں پیرِ کہن سالِ دہر نے کروڑوں برس صرف کر دیئے۔ سیارگانِ فلک، اسی دن کے شوق میں ازل سے چشم براہ تھے۔ چرخِ کہن مدت ہائے دراز سے اسی صبحِ جاں نواز کے لئے لیل و نہار کی کروٹیں بدل رہا تھا۔ کارکنانِ قضا و قدر کی بزم آرائیاں۔ عناصر کی جدت طرازیاں، ماہ و خورشید کی فروغ انگیزیاں۔ ابر و باد کی تردستیاں۔ عالمِ قدس کے انفاسِ پاک۔ توحیدِ ابراہیمؑ۔ جمالِ یوسفؑ۔ معجز طرازی موسٰیؑ۔ جاں نوازی مسیحؑ۔ سب اسی لئے تھے کہ یہ متاعِ ہائے گراں شہنشاہِ کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دربار میں کام آئیں گے۔

آج کی صبح وہی صبحِ جاں نواز۔ وہی ساعتِ ہمایوں۔ وہی دورِ فرخ فال ہے۔ اربابِ سیر اپنے محدود پیرایۂ بیان میں لکھتے ہیں۔ "آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ آتشکدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔"

لیکن سچ یہ ہے کہ ایوانِ کسریٰ نہیں۔ بلکہ شانِ عجم۔ شوکتِ روم۔ اوجِ چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتشِ فارس نہیں بلکہ جحیمِ شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراقِ خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔

توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستانِ سعادت میں بہار آگئی۔ آفتابِ ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاقِ انسانی کا آئینہ پرتوِ اقدس سے چمک اٹھا۔

یعنی یتیمِ عبداللہ۔ جگر گوشۂ آمنہ۔ شاہِ حرم۔ حکمرانِ عرب۔ فرمانروائے عالم۔ شہنشاہِ کونین۔

شمسۂ نہ مسندِ ہفت اختراں ختمِ رسل خاتمِ پیغمبراں
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
اُمّی و گویا بہ زبانِ فصیح از الفِ آدم و میمِ مسیح

عالمِ قدس سے عالمِ امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

(علامہ شبلی نعمانی)

نعیم صدیقی

سب سے بڑا تاریخ ساز صلی اللہ علیہ وسلم

مخالفتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

(۱)

ہمارے گرد و پیش پھیلی ہوئی دُنیا حرکت اور گردش کی دُنیا ہے۔ تغیر اور تنوع کی دُنیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسابقت اور کشمکش اور جہاد اور معرکہ کی دُنیا ہے۔ اس میں کشش بھی کام کرتی ہے، مزاحمت بھی۔ اس میں عمل بھی پایا جاتا ہے۔ ردِّ عمل بھی۔ اس میں تخریب بھی ہے، تعمیر بھی۔ اس میں روشنی اور ظلمت ایک دوسرے کے درپے ہیں۔ اس میں رات اور دن ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہیں۔ اس میں موت اور زندگی دست و گریباں ہیں۔ اس میں آگ اور پانی باہم دگر آویزاں ہیں۔ اس میں خزاں اور بہار ایک دوسرے کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ غرضکہ اس دُنیا کے کسی بھی عالم اور کسی بھی گوشہ پر نظر ڈالئے۔ اضداد کے جوڑے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر مصروف جہاد دکھائی دیتے ہیں۔ اس کائنات کے ایک حقیر سے مکانی گوشہ میں انسانی زندگی کی سب سے زیادہ پُرہنگامہ رزم گاہ واقع ہے۔ ہمارا نظام تمدّن و معاشرت ایک طوفانی سمندر ہے۔ جس میں موجوں سے موجیں۔ حبابوں سے حباب اور قطروں سے قطرے ہر ہر آن ٹکرا رہے ہیں۔ یہاں حق اور باطل، خیر و شر، سچ اور جھوٹ۔ انصاف اور ظلم۔ نیکی اور بدی کے درمیان از آدم تا ایندم ایک لمبا معرکہ لڑا جا رہا ہے۔ اس معرکہ کی باگ ڈور انسانی روح و نفس کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے سرچشموں سے گوناگوں خیال اور عقیدے اور نظریے پے بہ پے اُمڈ رہے ہیں۔ متنوع کردار نمودار ہو رہے ہیں۔ اور متضاد فطرت کے اجتماعی نظام ظہور کر رہے ہیں۔ ہر خیال، عقیدہ، نظریہ، کردار اور نظام اپنی ضد ایک ہمزاد کی طرح ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور ہر طاقت جو اُبھرتی ہے اپنی حزبِ اختلاف کو جلو میں لے کر آتی ہے۔ اس اختلاف و تضاد سے وہ ہر جہتی اور ہمہ گیر تصادم پیدا ہوتے ہیں۔ جنہوں نے ہماری ساری تاریخ کو ایک داستانِ جہاد بنا دیا ہے۔ اور آج یہ داستانِ جہاد ہمارے اپنے ہی خون کی روشنائی سے باب در باب اور فصل در فصل لکھی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہے!

تمدّنِ انسانی کی باہم ترکیب یافتہ دُنیاؤں میں جو ہر آنی اور ہر جہتی جہاد کہیں دلائل اور کہیں تلواروں سے لڑا جا رہا ہے اس میں انسان کے دو ہی پارٹ رہے ہیں۔ ایک طرف سے وہ شر و فساد کا علمبردار بن کے اُٹھتا ہے۔ دوسری طرف سے وہ خیر و فلاح کا داعی بن کر میدان میں اُترتا ہے۔ کبھی وہ تخریب اور بگاڑ کی قوتوں کا سرگرم آلہ کار بنتا ہے۔ کبھی تعمیر اور بناؤ کے داعیات پر لبیک کہتا ہوا سامنے آتا ہے۔ انسانیت کے کچھ شیطانی پیکر وہ ہیں جو زندگی کو دکھوں اور مصیبتوں سے بھر دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں۔ دُوسری طرف کچھ پیکر وہ بھی ہوتے ہیں۔ جو امن و مسرت کی ایک ارضی جنّت تعمیر کر دینے کے لئے اپنا سارا سرمایۂ حیات کھپا دیتے ہیں۔ معرکۂ حیات کے کچھ وہ جانباز ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں بدی اور جھوٹ اور ظلم کا

ہر طرف دور دورہ ہو جاتا ہے۔ اور جادۂ ہستی کے کچھ وہ سپاہی ہوتے ہیں جو نیکی اور سچائی اور انصاف کا سکہ چلا کے دُنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

یہی نیکی اور سچائی اور انصاف کے سپاہی ہیں کہ جنہوں نے زندگی کو وہ کچھ دیا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے یہ بسر کئے جانے کے کچھ قابل ہوئی ہے۔ تمدّن میں آج جو جو پہلو بھی کسی قدر و قیمت سے مالا مال دکھائی دیتے ہیں۔ وہ انہی مایۂ ناز ہستیوں کا فیضان ہیں۔ انہوں نے انسان کے سامنے نمونہ کی زندگی پیش کی ہے۔ انہوں نے تمدّن و معاشرت کا ایک معیار اور آئیڈیل ہمارے سامنے رکھا ہے۔ انہوں نے ہمیں زریں اصول اور مقاصد دیئے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کی رگوں میں زندہ و پائیدار روایت کا خون دوڑا دیا ہے۔ انہوں نے اخلاقی اقدار کے تارے آسمانِ تہذیب پر جگمگا دیئے ہیں۔ انہوں نے آدمی کو حوصلے اور ارمان اور امیدیں اور ولولے دیئے ہیں۔ انہوں نے اصول و مقاصد کے لئے قربانی اور جد و جہد کا درس دیا ہے۔ یہی ہستیاں ہیں کہ جن کے روشن کارناموں کے طفیل تاریخ اس قابل ہوئی کہ اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے اور اس سے قیامت تک نوعِ انسانی نت نئی روحِ عمل اخذ کرتی رہے!

پھر جب کبھی بدی اور جھوٹ اور ظلم کی طاقتوں نے ایک سنگین نظام اور ایک آہنی ماحول بن کر زندگی کو خوب اچھی طرح گھیر اور بھینچ لیا ہے اور آدمی ہمت ہار کر مایوسی کے گڑھوں میں جا گرا ہے۔ تو ایسے موقعوں پر تاریخ کے یہی ہیرو نوعِ انسانی کے کام آئے ہیں اور انہوں نے سوتوں کو جگایا۔ گرتوں کو اٹھایا۔ بزدلوں کو شجاعت کا آبحیات پلایا اور ہتھیار ڈال دینے والوں کو از سرِ نو میدانِ کارزار کی اگلی صفوں میں کھڑا کر کے شر و فساد کی قوتوں سے لڑایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان مایۂ ناز ہستیوں نے تاریخ کے جمود کو توڑا ہے۔ تمدّن کے یخ بستہ سمندر میں پھر حرکت پیدا کی ہے۔ فکر و عمل کی رکی ہوئی ندیوں کو نئے سرے سے بہا دیا ہے اور تغیر کی رَو اٹھا کر سنگین نظام اور آہنی ماحول کو اُلٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ کاروانِ انسانیت اپنے ارتقاء کے صراطِ مستقیم پر بے روک ٹوک رواں دواں ہو گیا!

خیر و فلاح اور تعمیر اور بناؤ کی مہم میں حصہ لینے والے تاریخی ہیروز کی صفوں کا جب بھی جائزہ لیا جائے۔ اُن میں خدا کے انبیاء و رسل کی صفِ اوّل اپنی امتیازی شان کی وجہ سے ہم سے بیش از بیش خراجِ عقیدت حاصل کرتی ہے۔ باقی جتنی بھی صفیں صدیقین اور شہداء اور صالحین کی آراستہ نظر آتی ہیں۔ وہ سب کی سب اسی صفِ اوّل کے کارناموں کی خوشہ چین اور اسی کی کمانڈ میں کام کرنے والی ہیں۔ اور انبیاء و رسل کی صفِ مقدس میں نگاہ بے اختیار جس ہستی پر سب سے پہلے جا کر ٹکتی ہے وہ سیدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے۔ یہ ہے تاریخ کا سب سے بڑا محسنِ انسانیت! اس ہستی کو جس پہلو سے دیکھئے۔ اس کی گوناگوں عظمتیں درخشاں نظر آتی ہیں۔ اور ان عظمتوں کی قصیدہ خوانی کرتے کرتے گزشتہ پونے چودہ صدیوں میں نہ جانے نسلاً بعد نسل کتنے عقیدت مندانِ رسالت دُنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو سکا! اور آئندہ بھی یہ حق کس سے ادا ہو گا؟ محض ایک جذبۂ شوق کا تقاضا ہے کہ جس سے پہلے بھی سرشار رہے اور پچھلے بھی سرشار رہیں گے۔ جناب ماہرؔ کی اکساہٹ سے اسی جذبۂ شوق کے تحت راقم الحروف کے جی میں آئی کہ آنحضور کی سیرت کے اس عظیم پہلو کو اجمالاً نمایاں کیا جائے کہ آپ نے اپنی قوم اور انسانیت کی تعمیر و فلاح کے لئے جب میدان میں قدم رکھا تو کس ظلم و تشدد سے آپ کا خیر مقدم کیا گیا اور کس طرح ساری عمر ایک بے مثال محسن کے احسان کا جواب اندھی مخالفتوں اور ذلیل قسم کی شرارتوں سے دیا جاتا رہا اور دوسری طرف اس ظلم و تشدد اور ان مخالفتوں اور شرارتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے رسولِ پاک نے

کس سیرت وکردار کا مظاہرہ کیا! حدیث دلبر کے اس درد بھرے پہلو میں اُن کے لئے بھی ایک سبق ہے جو نیکی کا راج قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں اور اُن کے لئے بھی ایک سبق ہے جو ایسی کسی جدوجہد کی مزاحمت کرنے کے لئے اٹھیں!

(۲)

تاریخ کا یہ ایک عبرت ناک تجربہ ہے اور بار بار کا تجربہ ہے کہ انسان نے بُرائی کی کبھی اتنی مزاحمت نہیں کی جتنی کہ نیکی کے مقابلہ میں کی ہے۔ کھُلے کھُلے فریب کاروں اور چالبازوں اور کھیلے لوگوں کے سامنے آدمی ہمیشہ بھولا بھالا شکار بن کر آیا ہے اور دو چار چکنی چُپڑی باتوں اور عمل و کردار کے دو چار شعبدوں پر آمنّا وصدقنا کہہ کر اس نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ لیکن دوسری طرف اوّل درجہ کی مخلص، شریف اور پاکباز ہستیوں کے مقابلہ میں وہ بڑا کائیاں بن کر آیا ہے۔ اور اس لئے اُن کی بات بات پر شکوک وشبہات ظاہر کئے ہیں۔ ان کے ایک ایک عمل پر اعتراض کی انگلی اٹھائی ہے۔ اُن سے بڑی بڑی دلیل بازیاں کی ہیں۔ بڑی منطقیں چھانٹی ہیں۔ بڑے نکتے نکال کر دکھائے ہیں۔ اور ساری ساری عمر اُن کے اخلاص کے دامن پر الزامات کے گھناؤنے چھینٹے ڈالنے میں کھپا دی ہے!

جب کبھی بندگانِ اغراض رہزن اور جیب تراش بن کر اس کی طرف بڑھے ہیں۔ تو انہوں نے ہمیشہ اُسے اپنے لئے تر نوالہ اور آسان شکار پایا ہے۔ لیکن ان بندگانِ اغراض کے نرغہ سے نکال کر امن وسلامتی کی منزل تک پہنچانے کے لئے جب کبھی کوئی ایماندار رہبر اس بندۂ خاکی کی طرف بڑھا ہے تو اس نے رہزنوں اور جیب تراشوں کا ساتھ دے کر پوری ہوشیاری وچالاکی سے اپنے حقیقی محسن کا مقابلہ کیا ہے۔ لفظ بندی کرنے والے مداری آتے رہے اور انہوں نے آناً فاناً ہزاروں دل موہ لئے۔ لیکن حقیقت کو اپنی اصلی شکل میں دکھانے والا کوئی خادمِ انسانیت جب بھی اسٹیج پر آیا تو تماشائیوں نے اسے ایک دھوکہ باز مداری کی حیثیت سے لیا۔ اور مدتوں اُس کی شُن کر نہیں دی۔

بازارِ حیات میں ملمع کاروں کے ہاٹ ہمیشہ لگے رہے اور پیتل اور سیسہ سونے کے نام سے پوری گرمی بازار کے ساتھ بکتے رہے۔ اور خریداروں نے کبھی کاوش نہ کی کہ یہ سونے کے بھاؤ اور سونے کے نام سے جس مال کو ہم خرید رہے ہیں وہ ملمع کے پردے کے پیچھے درحقیقت کیا ہے۔ لیکن اس صرافہ میں جب کبھی کھرا سونا لایا گیا ہے تو اس پر پہلی نگاہ شک کی پڑی ہے۔ اور کھرے سونے کا نام پیتل اور سیسہ دھرا گیا ہے۔ پھر اس کھرے سونے کو بار بار ہتھوڑے کی ضربوں سے گزارا گیا ہے۔ بار بار کسوٹیوں پر گھسا گیا ہے۔ بار بار کٹھالیوں میں تپایا گیا ہے۔ اور ہر جانچ سے کندن ہو کر نکلنے کے باوجود صرافوں اور گاہکوں کا شک جوں کا توں قائم رہا ہے۔ کہ ہو نہ ہو یہ ملمع کا مال ہے اور بڑا ہی کامیاب قسم کا ملمع ہے۔

انسانی زندگی کو بگاڑنے کے لئے جو ظالم، جفاکار، بدکردار اور دنیا پرست لوگ میدان میں اترتے رہے ہیں۔ دنیا نے اُن سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے کبھی سرگرمی نہیں دکھائی۔ بلکہ آگے بڑھ کر اپنے آپ کو پورے اعتماد کے ساتھ اُن کے حوالے کر دیا ہے۔ لیکن جب کبھی تہذیب وتمدن کو سنوارنے کے لئے نوعِ انسانی کا کوئی بے لوث اور مخلص خادم اپنا سب کچھ قربان کرتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ تو اُس کو تشویش کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اُس سے برسوں کٹ حجتیاں کی گئی ہیں۔ اُس کے راستہ میں برسوں روڑے اٹکائے گئے ہیں۔ اُس پر کیچڑ اچھالی گئی ہے اور انجام کار استبداد کے آخری ہتھیار اُس پر استعمال کر ڈالے گئے ہیں!

حضرت نوح علیہ السلام جیسا رقیق القلب آدمی سالہاسال دلسوزی کے ساتھ اپنی قوم کو نئی زندگی کا پیغام سُناتا ہے۔ مگر اوّل تا آخر طعنے سُنتا ہے۔ پتھر کھاتا ہے اور اُس پر ٹھٹھے مارے جاتے ہیں۔ حضرت ہُود۔ حضرت صالح اور حضرت شعیب علیہم السلام

سچائی اور نیکی کی دعوت لے کے اُٹھتے ہیں تو کہیں کہا جاتا ہے کہ اگر تمہارے قبیلہ کا لحاظ نہ ہوتا۔ تو ہم تمہارا کام تمام کر چکتے۔ کہیں طعنہ دیا جاتا ہے کہ رذیلوں اور کمینوں کے ٹولے میں ہم شریک ہونے پر تیار نہیں ہیں۔ کہیں تنبیہ کی جاتی ہے کہ دیکھو میاں! یہ تمہاری نماز اب اپنے حدود سے پاؤں پھیلا کر ہمارے کاروبار میں مداخلت کرنے لگی ہے۔ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ جیسا شگفتہ مزاج اور بیدار مغز نوجوان میدان میں آتا ہے تو اُسے قومی غدار اور دینی مجرم بنا کر عدالت میں کھڑا کیا جاتا ہے۔ اور زندہ جلانے کی سزا تجویز کی جاتی ہے۔ حضرت لوطؑ جیسی ہمہ تن شفقت شخصیت قوم کو اخلاقی تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لئے تڑپتی ہے۔ تو دل چھیدنے والے اس طعنہ سے خیر مقدم کیا جاتا ہے کہ بڑے آئے ہیں یہ پاکباز! لوگو! انھیں نکال باہر کرو۔ یہاں ایسے متقیوں اور صالحین کی جگہ نہیں ہے۔ حضرت یحیٰؑ جیسا جیتی ستی اسٹیج پر آتا ہے تو اس کا سر کاٹ کر ایک شاہی رقاصہ کی نگاہِ ناز پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ حضرت زکریاؑ جیسا پاکباز دعوتِ حق کی شمع روشن کرتا ہے تو آرے کے دندانوں تلے سے گزار دیا جاتا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھیں تو حضرت موسیٰؑ کی با حمیت ہستی ایک طرف فرعونی اقتدار کا تشدد سہتی اور دوسری طرف خود بنی اسرائیل کے ہاتھوں ذہنی و روحانی ایذائیں بھگتتی دکھائی دیتی ہے۔ یوسفؑ جیسے صدیقِ صالح کو خود اپنے بھائیوں کی عنایت سے اندھے کنوئیں کی تاریکی، غلامی کی مظلومیت اور قید و بند کی عقوبتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور آخر کی طرف آئیں تو عیسیٰ علیہ السلام جیسا مقدس معلّم یہود کے قسی القلب مولویوں، ریاکار فقیہوں اور بہروپئے فریسیوں کے نرغے میں دل ہلا دینے والے فرضی ابتلاء سے گزرتا ہے۔ جبکہ یہ حضرات بچّوں کی سی نکتہ چینیاں اور حرف گیریاں کرتے ہیں۔ پھر اپنی مجلسوں میں دعوتِ عیسوی کا توڑ بیٹھ بیٹھ کر سوچتے ہیں۔ پھر کفر اور بے دینی کے فتوے لگاتے ہیں۔ پھر ایک غیر حکومت کے سامنے جا جا کر چغلیاں کھاتے ہیں۔ اور سی آئی ڈی کا کام کرتے ہیں۔ پھر زور ڈال ڈال کر مقدمہ چلواتے ہیں اور اپنے فتووں کی روشنی میں سُولی کی سزا تجویز کراتے ہیں۔ انسانی فلاح و بہبود کے سب سے بڑے اسی کام کو کرنے کے لئے جب حضرت خاتم النبیینؐ تشریف فرما ہوئے تو محسن کش انسانیت اپنے سارے کرتوتوں کے ساتھ خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی اور وقت کے اشرار کو جھاڑ کا کانٹا بنا کر ایسا پیچھے لگا یا کہ اوائلِ دعوت سے لے کر قبر میں جا اُترنے تک آپؐ کو سُکھ چین کی سانس لینے کا موقع نصیب نہ ہو سکا! وہ ساری عقوبتیں اور ایذائیں جو جملہ انبیاء و رسل پر مختلف زمانوں میں آزمائی گئی تھیں۔ شیطان بہ یک دم ان سب کو جمع کر کے لایا اور ایک یکہ و تنہا یتیم نوجوان کو چومکھی لڑتے رہنے پر مجبور کر دیا!

سیرتِ نبوی کا منظر کچھ ایسا ہے، جیسے تاریکی کے طوفانی سمندر میں بغیر کشتی اور پتوار کے کوئی پیراک موجوں، گردابوں، اور نہنگوں سے لڑ رہا ہو۔ زنجیریں بجاتی ہوئی تند ہوائیں چل رہی ہوں۔ کالی گھٹاؤں کا غیظ و غضب، برق و رعد کی چمک اور کڑک بن کر اُمڈ پڑتا ہو۔ اولوں کی بوچھاریں پڑ رہی ہوں۔ لیکن شناور پھر بھی اپنا راستہ نکالتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ کیا تاریخ کے پاس ایسی رقت انگیز مظلومیت اور ایسے عزم آموز استقلال کی کوئی مساویانہ مثال ہے؟

(۳)

معرکۂ خیر و شر کا ڈرامہ جب بھی اسٹیج ہوتا ہے۔ اُس کے بنیادی کردار ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے۔ جغرافی ماحول نیا پیدا ہو جاتا ہے۔ اشخاص کے نام بدل جاتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقررہ پارٹ نہیں بدلتا۔ ایک کردار صاحبِ دعوت کا کردار ہوتا ہے۔ دوسرا کردار سوسائٹی کے اُس جوہرِ خالص کا ہوتا ہے کہ سچائی اور نیکی کی پکار سُنتے ہی آوازکو اپنے فطری ذوق سے

کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ جو بات کو سنتے ہیں، سوچتے ہیں۔ مگر علم و شعور کی کوتاہی اور بعض ذہنی و نفسیاتی رکاوٹوں کی وجہ سے حقیقت کو پوری طرح سمجھنے میں دیر لگاتے ہیں۔ چوتھا نہایت ہی سرگرم اور ہنگامہ آرا کردار دشمنانِ حق کا ہوتا ہے۔ جو اپنے مفاد اور اپنے مناصب اور اپنے مرتبے اور اپنی بگڑی ہوئی عادات کی وجہ سے اوّل روز سے جانتے بوجھتے ضدّم ضدّا کے اسلوب پر مخالفت کی مہم چلاتا ہے اور روز بروز اس رَو میں بہکتا ہی چلا جاتا ہے۔ پانچواں کردار کمزور عوام کا ہوتا ہے۔ جو معاشرے کے اونچے طبقوں کے زیر دست ہونے کی وجہ سے کوئی جراٴت مندانہ اور فعّالانہ اقدام نہیں کر سکتے۔ اور نہ ذہنی طور پر آسانی سے کسی دعوت کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ بالعموم داعیٔ حق اور دشمنانِ حق کی کشمکش کو سالہاسال تک تربص کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں اور جب آخر کار پانسہ کسی ایک طرف پلٹ جاتا ہے تو پھر یہ سیلاب نخوت بھی حرکت میں آتا ہے اور اسی رُخ بہہ نکلتا ہے۔

پس معرکۂ خیر و شر کے ڈرامے کی گرماگرمی دو ہی کرداروں کی مرہونِ منت ہوتی ہے! یعنی داعیٔ حق اور اس کے رفقاء کا کردار۔ اور جوابی اور منفی طوفان اٹھانے والے فعّال مخالفین کا کردار! ناممکن ہے کہ دعوتِ حق کا کھیل کھیلا جائے اور یہ دونوں کردار آمنے سامنے نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ سچائی اور نیکی کی آواز اٹھائی جائے تو اس کے جواب میں جھوٹ اور بُرائی کی ساری طاقتیں اُمڈ کر نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ انسانیت کی بھلائی اور خدمت کے لئے کام شروع کیا جائے۔ تو دُنیا گالیوں اور الزامات اور پروپیگنڈوں اور سازشوں اور تشدّد کے مختلف ہتھیاروں کے ساتھ ہجوم کر کے نہ آجائے!

یوں تو جھوٹ اور ظلم اور بدی کے ماحول میں ایک ایک فرد کی زندگی کا لمحہ دُکھ اور کرب اور اضطراب میں گزرتا ہے۔! ہر متنفس کے اندر وقت کے نظام کے خلاف شکایت، نفرت اور احتجاج پیدا ہوتا ہے۔ جذبوں کو پے درپے چوٹیں لگتی ہیں۔ ضمیروں میں بار بار کانٹے چبھتے ہیں۔ ارادوں میں ہیجان پیدا ہوتے ہیں۔ اور کہیں اطمینان کی کیفیت کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔ لیکن یہ بھی ایک ناقابلِ انکار تاریخی تجربہ ہے کہ جب جھوٹ اور ظلم اور بدی کی طاقتیں ایک بار اپنے ڈھب کا نظام تہذیب و تمدّن مسلّط کر لیتی اور اس کے اوپر ایک طاقتور اور بالادست طبقہ کا کڑا پہرہ بٹھا دیتی ہیں۔ تو دن رات اس نظام کے ڈنک کھانے اور مارے درد کے تڑپنے کے باوجود افراد اس نظام کو چیلنج کرنے کی جراٴت نہیں کر سکتے۔ سالہاسال تک وہ اس ظلم مسلسل کو بھیڑ بکریوں کی سی بے شعوری اور بے بسی کے ساتھ بُھگتتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ جراٴت مند اور فرض شناس لوگ حالات کا رونا ذرا کُھل کر رو لیتے ہیں۔ بُرائی کو کبھی کبھا ر بُرا کہہ لیتے ہیں، اور کچھ اچھی باتیں سنا دیتے ہیں اور انفرادی اور نجی حد تک نیکی اور بھلائی کے کچھ کام بھی کر لیتے ہیں۔ اور آگے بڑھے تو کچھ تعلیمی و تبلیغی قسم کی مجلسیں اور ادارے بھی قائم کر لیتے ہیں۔

یہاں تک تو ایک غلط نظام افراد کی رسّی ڈھیلی چھوڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس رسّی کو تڑا کر کوئی شخص پورے نظام کو بنیادوں سے بدل ڈالنے کی دعوت لے کر اُٹھ کھڑا ہو اور لوگوں کو ہمہ گیر تبدیلی کی ایک منظم جدوجہد کے لئے پکارنے لگے یا دوسرے لفظوں میں ایک سیاسی و تمدّنی تحریک اُٹھا کھڑی کرے تو پھر ایک نظام باطل کی نگراں طاقتیں خطرے کا بگل بجا کر متحرک ہو جاتی ہیں۔ کسی کی سچائی اور کسی کی نیکی حدِ معین سے آگے نکلتے ہی ناقابلِ برداشت بن جاتی ہے۔ وہ کل اگر شریف ترین فرد تھا تو آج یکایک وہ ارذل الخلائق ہو جائے گا۔ کل اگر وہ پیکرِ دانش و حکمت اور عالمِ اجل تھا تو آج اسے جہالت اور حماقت ... کر طعنے دیئے جانے لگیں گے۔ کل اگر وہ قوم کا سچا خادم مانا جاتا تھا تو آج آناً فاناً وہ غدار اور منافق

گنا جائے گا - کل اُس کو القاب و آداب کے ساتھ پکارا جاتا تھا - تو آج اُس کی تو منع گالیوں سے ہونے لگے گی - کل اگر وہ دین کی بنائیں مستحکم کرنے والا تھا تو آج وہ بادمِ دین بنادیا جائیگا - کل اگر وہ دوسروں کے ایمان تازہ کرنے والا گنا جاتا تھا - تو آج معاً خود اس کے ایمان میں سے کفر کے کیڑے نکل آئیں گے - کل اگر وہ تعمیرِ نو کا علمبردار تسلیم کیا جاتا تھا تو آج ایکا ایکی وہ تخریب کا مجرم ہو جائے گا - کل اگر اُس کی زندگی قوم کے لئے سرمایۂ افتخار رہتی - تو آج اس کا وجود اس حد تک ناقابلِ برداشت، بن جائے گا کہ اُسے کسی حیلے سے موت کے گھاٹ اُتارنے کی سازشیں ہونے لگیں گی -

بدی کے نظام کے نیچے اچھی سے اچھی باتیں کہتے اور لکھتے رہیئے - ارباب شر کوئی تعرض نہیں کریں گے - لیکن اگر آپ نے تبدیلی کے لئے کوئی تحریک اُٹھا کھڑی کردی تو اس جرم کے مجرموں کے لئے کبھی گنجائشِ عفو نہ ہوگی !

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر محض کچھ اچھی باتیں سوچتے اور کہتے رہتے، اپنے پسندیدہ طریقہ پر خدا کی رکوع و سجود کیساتھ صرف عبادت کرتے رہتے - کسی خلوت میں بیٹھے ذکر اذکار فرماتے رہتے - بلکہ اچھے اچھے وعظ بھی فرماتے رہتے اور مریدوں کا ایک حلقہ یا اپنے متبعین کی ایک بے ضرر سی انجمن بھی بناڈالتے تو زمانہ یہ سب کچھ برداشت کرلیتا - لیکن آپ ساری زندگی کو بدلنے چلے تھے - آپ تمدن کی ساری عمارت کی تعمیر نو چاہتے تھے - آپ نظامِ اجتماعی کو اُدھیڑ کر بہترین نقشے پر از سرِ نو بنانے پر مامور تھے - آپ مفاد اور حقوق کے اس سارے توازن کو درہم برہم کردینے کے درپے تھے - جو آہنی مضبوطی کے ساتھ قائم تھا - آپ انسان کو ایک مِنئے اعتقادی و اخلاقی سانچے میں ڈھالنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے - پہلے دن سے آپ نے اسی چیز کی دعوت دی اور پہلے دن سے تو ہم نے آپ کی دعوت کا یہی مفہوم سمجھا - چنانچہ سارے کا سارا جوابی رویہ اسی مفہوم کے فطری ردِّ عمل سے پیدا ہوا !

نیکی اور سچائی کی ہمہ گیر تحریک کے مخالفین کا کسی بھی دور میں جائزہ لیجئے - تو دیکھئے گا کہ اُن کے منفی ہنگاموں کی تدریج اور تکنیک ہمیشہ ایک ہی رہی ہے - سب سے پہلے ہمیشہ معمولی سی استہزا و تضحیک سے کام لیا گیا - پھر اگلے مرحلے میں گالیوں اور طعنوں، جھوٹ، افترا اور تہمت فریبیوں اور بدنام کن اتہامات کا طوفان اٹھایا گیا - پھر عوام میں غلط فہمیاں پھیلانے کے لئے جھوٹے پروپیگنڈے کا زور باندھا گیا - معاملہ اور آگے بڑھا تو ایک طرف قومی مفاد اور اتحاد کے خطرے میں پڑنے کا واسطہ دلایا گیا اور دوسری طرف مذہبی بنیادوں پر جاہل عامی طبقہ میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی - بیچ بیچ میں عقلی دلائل کے تیر تکے لڑائے جاتے رہے - اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی - جب محسوس ہوا کہ ایک خطرناک دعوت زور پکڑ رہی ہے - تو سودا بازی کی کوششیں کی گئیں - سارے حربے ناکام دیکھ کر تشدد کے نہایت ذلیل طریقے اختیار کئے گئے - اور معاشی اور سوشل بائیکاٹ کا دباؤ ڈالا گیا - قید و بند اور جلا وطنی کے منصوبے عمل میں لائے گئے - یہاں تک کہ بالآخر داعئ حق کے قتل کے ارادے کئے گئے - اگر معاملہ اس مرحلے سے بھی آگے نکل گیا تو معرکۂ کارزار گرم کرکے دعوتِ مبارزت دی گئی -

یہ سارے مراحل حضرت سیدنا خاتم المرسلین کو یکے بعد دیگرے پیش آئے - لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر مرحلے سے شاندار کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا - اور وہ دن آیا کہ سارا عرب حضور کے قدموں میں تھا !

(۴)

حضور کی سیرت طیبہ کا یہ پہلو چند وجوہ سے اپنے اندر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ایک ایک مسلمان کے لئے لازم ہے کہ

وہ اس پہلو کا گہری نظر سے مطالعہ کرے۔

(۱) ایک یہ کہ اس کے مطالعہ سے عزیمت و استقلال کا مؤثر ترین درس ملتا ہے اور آدمی کے اندر مشکل ترین حالات میں ادائے فرض کی ہمت پیدا ہوتی ہے۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس کے مطالعہ سے اپنے سب سے بڑے محسن کی صحیح قدر دلوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک گہرا جذبۂ سپاس ابھرتا ہے۔ ایک والہیت وعقیدت آپ کی ذات کے لئے پیدا ہوتی ہے۔ جو مطلوب دین ہے۔ سیرت کا یہ پہلو ہمیں بتاتا ہے کہ آج جس نورِ حق سے ہمارے سینے روشن ہیں۔ اُس کو لانے والا کیسی کیسی آزمائشوں سے گزر کر۔ کیسی کیسی مخالفتوں کا مقابلہ کرکے، کیسے کیسے رہزنوں کے حملوں کی زد پر آ کر اور کیسے کیسے خون اور آنسوؤں کے سمندروں کو پار کرکے اُسے ہم تک پہنچا سکا ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ اس احوال واقعی کو پڑھ کر یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ سچائی اور نیکی کے علمبرداروں کی راہ پُر آشوب گھاٹیوں سے ہو کر نکلی ہے۔ اور اس راہ کو جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی یکتائے روزگار اور مقبول بارگاہ ہستی کے لئے کانٹوں اور انگاروں سے صاف کرکے اس پر پھولوں کے فرش نہیں بچھائے گئے تو اب اور کس کے لئے اسلام کا کوئی ایسا خفیہ شارٹ کٹ نکال دیا جائیگا کہ آدمی اپنے گوشۂ عافیت سے جو اٹھے تو بغیر پاؤں پر گرد پڑے سیدھا جنت میں جا پہنچے سوانح رسالت مآبؐ کی دُکھ بھری کہانی پڑھنے سے وہ سارے مغالطے اور وہ سمجھوتے کافور ہو جاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے آدمی "عافیت" اور "رواداری" کو جمع کئے امن چین سے پڑا رہتا ہے۔ آدمی کو سیرتِ نبوی کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے کہ اگر اُسے وہ سنگِ میل کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ وہ نشانات راہ سامنے نہیں آتے۔ وہ موڑ اور نشیب و فراز پیش نہیں آتے۔ وہ کانٹے اور وہ پتھر راستے میں نہیں پڑتے۔ وہ رہزن اور غولِ بیابانی حملہ آور نہیں ہوتے۔ وہ ٹھوکریں نہیں لگتیں۔ وہ زخم اور چرکے نہیں آتے۔ جن کے تذکرے سے قرآن کے صفحات اور سیرتِ نبوی کے ابواب بھرے پڑے ہیں۔ تو اسے اپنی سمتِ سفر پر۔ اپنی منزلِ مقصود پر۔ اپنی اختیار کردہ راہِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیئے۔ کہیں ایسا نہیں کہ ؎

کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان است!

(۴) چوتھے یہ کہ ہر مسلمان سیرت کے اس پہلو کا مطالعہ کرنے کے بعد پیشتر سے خبردار رہ سکتا ہے کہ اس امت میں جب کبھی بھی کوئی شخص یا گروہ دعوتِ نبوی اور تحریکِ نبوی کو لے کے اُٹھے گا اور اسی طریقہ پر کام کرنا چاہے گا تو اُس کے خلاف استہزاء، تحقیر، دشنام طرازی، الزام تراشی، نکتہ آفرینی، مذہبی اشتعال انگیزی، تکفیر و تفسیق جھوٹے پروپیگنڈے، سازش اور شرارت، ظلم اور تشدد کے وہ سارے طوفان اُٹھ کھڑے ہوں گے جو اس کام کے لئے مقدر ہیں۔

ان طوفانوں میں گھرے ہوئے کسی بھی دور میں اُٹھنے والے داعیِ حق کو پہچاننا اور اس کی بات کو سمجھنا اور اس کی پکار پر لبیک کہنا صرف ایسے ہی لوگوں کے لئے آسان ہو سکتا ہے جو قرآن اور سیرتِ نبوی کے مطالعہ سے معرکۂ خیر و شر کے ڈرامہ کے پیش آمند پلاٹ اور منظر کا صحیح تصور پہلے سے رکھتے ہوں۔ ہر مسلمان کو یہ جاننا چاہیئے کہ باطل کی وہ طاقتیں جنہوں نے نبی اکرم جیسی بے داغ شخصیت کو نہ بخشا۔ اور جنہوں نے بعد میں آنحضورؐ کی پیرو کار ہستیوں، امام حسینؓ۔ امام مالکؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ

امام حنیفہ ۔ حضرت مجدد الف ثانی ۔ شاہ ولی اللہ ۔ کو بچ کے نہ جانے دیا ۔ وہ کسی اور کو کہاں اپنی کرم فرمائیوں سے مستثنیٰ رکھنے پر تیار ہو سکتی ہیں ۔ سیرت نبوی ہمیں ہر دور میں داعیٔ حق اور دشمنانِ حق کے کردار میں تمیز کرنا سکھاتی ہے !

انہی افادات کو سامنے رکھ کر یہ مضمون مرتب کیا گیا ہے ۔ اس میں ایک ایک عنوان کے تحت سلسلہ وار واقعات کو زیر بحث لایا گیا ہے ۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی پورے مقالہ میں واقعاتی تسلسل تاریخ وار نہیں ہے !

(۵)

ہر آدمی کو اس بات کا تجربہ ہوگا کہ امتحان کے لمحات جب سر سے گزرتے ہیں تو اعصاب کا پورا نظام تھرتھرا اُٹھتا ہے ۔ جذبات میں ہل چل مچ جاتی ہے ۔ رگ رگ میں تپک محسوس ہوتی ہے ۔ سینہ چھدتا ہے ۔ جگر میں جلن ہوتی ہے ۔ مساموں سے چنگاریاں سی جھڑنے لگتی ہیں ۔ احساس کی آنچ میں روح گھلتی معلوم ہوتی ہے ۔ سینہ پر پہاڑ جتنا بوجھ محسوس ہوتا ہے ۔ تفکّر جیسے گھن بن کر دماغ کو چاٹنے لگتا ہے ۔ بیماریوں کے طویل دَور ۔ احتیاج و فقر کی حالتیں ۔ اعزہ و احباب کی زیادتیاں ۔ دشمنوں اور حاسدوں کی چیرہ دستیاں ، بے گناہی کی حالت میں الزامِ گناہ کا آ چپکنا ۔ لوگوں کی بدمعاملگی ۔ اور بدتمیزی سے سابقہ ۔ جان ، مال ، عزت یا آزادی کا بلاوجہ خطرے میں پڑنا ۔ کاروبار اور معاش کی تباہیاں ، بدنی حادثات اور مقدمات کی آفتیں ۔ ان میں سے کسی بھی قسم کے امتحان سے گزر دیکھیے ۔ تو ایک ایک گھڑی میں جو کچھ تن من پر گزرتی ہے ۔ اسے کوئی دوسرا تو کجا ۔ خود مظلوم اپنی زبان اور اپنے قلم سے من وعن بیان نہیں کر سکتے ۔ زندگی کے ان تلخ تجربات و تاثرات کا بڑا حصہ ہمیشہ ناگفتنی ہوتا ہے ۔ وہ عذاب جو ایک ایک رگ و ریشہ کو ہلا ڈالتا ہے ۔ ہم اسے چند الفاظ میں یوں بیان کر دیتے ہیں کہ " قرض نے بہت پریشان کر رکھا ہے ! " یا " بیماری کا ایسا دور دورہ ہے کہ نہ دن کا آرام رہا ، نہ رات کی نیند " یا یہ کہ " مقدمات کے چکر نے تو مار ڈالا " ! یا یہ کہ " مخالفتوں اور شرارتوں نے جینا حرام کر دیا ہے " ! ۔ مگر کیا یہ بیچارے چند الفاظ آدمی کی آپ بیتی کو دوسروں کے سامنے لانے میں کبھی بھی کامیاب ہو سکتے ہیں !

پھر جبکہ معاملہ عظیم ترین تاریخی ہستی کے تیئیس ۲۳ برس کے لمبے امتحان کا ہو اور اس امتحان کی لپیٹ میں ایک جماعت کی جماعت اور تحریک کی تحریک آ رہی ہو اُسے کسی لغت کے چند الفاظ کہاں پورے کا پورا ہمارے سامنے لا سکتے ہیں ۔ پھر بیچ کا واسطہ تاریخ ہے ۔ جو ایک شخص یا جماعت یا تحریک کی زندگی سے خاص خاص واقعات کو لے کر اُن کو بر سبیل اجمال ریکارڈ کرتی ہے اور برسوں کے واقعات کو ڈیڑھ چار صفحوں میں سمیٹ دیتی ہے ۔ یہ تاریخ آج جب ہمارے سامنے یہ بیان کرتی ہے کہ آنحضور صلعم کی دعوت پر قریش کی طرف سے مذاق اُڑایا جاتا رہا ۔ یا تشدد کیا جاتا رہا ۔ تو اس بیان میں واقعہ کی تصویر اتنی چھوٹی ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہم ان صبحوں اور شاموں اور ان دنوں اور راتوں کے کرب کا کوئی اندازہ کر ہی نہیں سکتے ۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء پر پے در پے گزرتی رہی تھیں ۔ ہم قریش کی ایک ایک طنز کو براہِ راست نہیں سُن سکتے ۔ ہم طنز کی چبھن کو جوں کا توں محسوس نہیں کر سکتے ۔ ہم اس کے ردِ عمل کا اندازہ نہیں کر سکتے جو دنوں اور ہفتوں صحابہ کرام کی روحوں میں کام کرتا ہوگا ۔ اسی طرح اُن کے تشدد کا ایسا تصور نہیں پا سکتے کہ وہی چوٹیں ہمیں خود محسوس ہوں اور اُن کے دُور رس ذہنی اثرات ہم پر لمبی مدت تک طاری رہ سکیں ۔

تاریخ چند اشارات ہم پہنچا سکتی ہے ۔ چند جھلکیاں دکھا سکتی ہے ۔ چند ایسے فقرے پیش کر سکتی ہے ۔ جن میں واقعات و حوادث کے ایک لمبے سلسلہ کا مجموعی تاثر جذب کر لیا گیا ہو ۔ لیکن تاریخ اور سیرت کی کتابیں کبھی بھی پورے کا پورا جیتا جاگتا

ماحول، اُٹھا کر ہمارے سامنے نہیں لا سکتیں۔

پس آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگزشت تاریخ کی زبانی سُنیے تو ایک ایک واقعہ کو بے شمار واقعات کا نمائندہ اور ایک ایک کلمہ کو بہت سے امور کا خلاصہ مان لیجئے۔ تاریخ کے مختصر الفاظ کی مدد سے اپنے ذہن میں وہ پورا ماحول خود برپا کیجئے کہ جس میں ایک واقعاتی تاریخ تشکیل پاتی رہی۔ تصور اور تخیل کی طاقت سے اس جیتی جاگتی فضا کو نیا وجود دیجئے۔ جس میں آنحضور صلعم اپنے مشن کا جھنڈا اُٹھائے مصروف جہاد تھے۔ کاغذ کے اوراق پر سانس لیتی ہوئی متحرک زندگی کو دیکھنا اگر نہ آتا ہو تو مطالعہ تاریخ سے کبھی صحیح استفادہ نہیں کیا جا سکتا!

پس اس تحریر کو دیکھتے ہوئے بھی پردۂ الفاظ کو اُٹھا دیجئے اور پونے چودہ سو برس پہلے کی عربی فضاؤں میں خود جا کر کھو جائیے واقعات کی گنتی نہ کیجئے۔ اُن کے وسیع پس منظر کو اُن سے اخذ کیجئے اور اس پس منظر کے ہر جزو کو انگلیوں سے چُھو کر خود دیکھئے۔ جب کہیں جا کر اندازہ ہوگا کہ آنحضورؐ نے فلاحِ انسانیت کے لئے کیا قربانی دی؟

اور پھر یہ کہ سیرتِ نبویؐ کے مطالعہ کا صحیح فیضان اسی وقت ہوتا ہے۔ جبکہ آدمی دعوت و تحریک کی اسی شاہراہ پر چل کر دیکھے کہ جس کے ہر ہر چپہ پر سیرتِ نبوی کے نقوش مرتسم ہیں۔ ذرا چھوٹے پیمانے پر سہی۔ لیکن اسی تجربے میں اپنی زندگی کو ڈالئے کہ جس میں تپ کر آنحضور صلعم نے ایک تاریخ بنائی! اس کے بغیر نہ کوئی مؤرخ اور سیرت نگار آپؐ کی زندگی کی تصویر سامنے لا سکتا ہے اور نہ کوئی کتاب خواں لفظوں کی دُنیا میں محسنِ انسانیت کے کارنامہ کا پُورا پُورا مطالعہ کر سکتا ہے!

(۶)

آئیے ذرا صورتِ واقعہ پر غور کیجئے۔ اس شاخِ گل کی اُٹھان دیکھئے جس کی تواضع کانٹوں سے کی گئی!

عرب کے ایک ممتاز، مہذب اور اعلیٰ روایات رکھنے والے خاندان میں، سلیم الفطرت والدین کے قران السعدین سے ایک انوکھا سا بچہ یتیمی کے سایہ میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک غریب مگر شریف ذات کی دایہ کا دُودھ پی کر دیہات کے صحت بخش ماحول کے اندر فطرت کی گود میں پلتا ہے۔ وہ خاص الٰہی انتظام سے صحرا میں تگ و دو کرتے کرتے زندگی کی جولانگاہ میں مشقتوں کا مقابلہ کرنے کی تیاری کرتا ہے اور بکریاں چرا کر گلہ بانیٔ اقوام کے لئے تیاری کرتا ہے۔ بچپن کی پُوری مسافت طے کرنے سے پہلے یہ انوکھا بچہ ماں کے سایۂ شفقت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ دادا کی ذات کسی حد تک والدین کے اس خلاء کو پُر کرنے والی تھی۔ لیکن یہ سہارا بھی چھین لیا جاتا ہے۔ بالآخر چچا کفیل بنتے ہیں۔ یہ گویا مادّی سہاروں سے بے نیاز ہو کر ایک آقائے حقیقی کے سہارے گراں بہا فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری ہو رہی ہے!

جوانی کے دائرے میں قدم رکھنے تک یہ انوکھا بچہ عام بچوں کی طرح کھلنڈرا اور شریر بن کر سامنے نہیں آتا۔ بلکہ بوڑھوں کی سی سنجیدگی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو انتہائی فاسد ماحول میں پلنے کے باوجود اپنی جوانی کو بے داغ رکھتا ہے۔ عشق، نظر بازی اور بدکاری جہاں نوجوانوں کے لئے سرمایۂ افتخار بنے ہوئے ہوں وہاں وہ اپنے دامنِ نظر تک کو ایک آن بھی میلا نہیں ہونے دیتا۔ جہاں گلی گلی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی ہوں اور گھر گھر شراب خانے کھلے ہوں اور جہاں مجلس مجلس دخترِ رز کے قدموں میں ایمان و اخلاق نچھاور کئے جاتے ہوں اور پھر جہاں اپنی بلانوشیوں کے چرچے فخریہ قصیدوں اور شعروں میں کئے جاتے ہوں۔ وہاں یہ جداگانہ فطرت کا نوجوان کبھی قسم کھانے کو بھی شراب کا ایک قطرہ تک اپنی زبان پر نہیں رکھتا۔ جہاں قمار قومی مشغلہ بنا چلا آ رہا تھا۔ وہاں ایک یہ مجسمۂ پاکیزگی تھا کہ جس نے کبھی

پانسوں کو ہاتھ سے نہ چھوا۔ جہاں داستان گوئی اور موسیقی کلچر کا لازمہ بنے ہوئے تھے۔ وہاں کسی اور ہی عالم کا یہ نوجوان لہو و لعب سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اور دو مرتبہ ایسے مواقع پیدا ہوئے بھی کہ یہ نوجوان ایسی مجالسِ تفریح میں جا پہنچا۔ لیکن جاتے ہی ایسی نیند طاری ہوئی کہ سمع و بصر کا دامن پاک رہا۔ جہاں بتوں کے سامنے سجدہ پاشی عین دین و مذہب قرار پا چکی تھی۔ وہاں خانوادہ براہیمی کے اس پاکیزہ مزاج نوجوان نے نہ غیر اللہ کے سامنے کبھی اپنا سر جھکایا، نہ اعتقاد' کوئی مشرکانہ تصور اپنے اندر جذب کیا۔ بلکہ ایک مرتبہ بتوں کے چڑھاوے کا جانور پکا کر کھانے پر لایا گیا۔ تو آپ نے وہ کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ جہاں قریش نے زمانۂ حج میں اپنے آپ کو عرفات جانے سے مستثنیٰ کر لیا تھا۔ وہاں اس ممتاز ترین قریشی نے کبھی اس من گھڑت استثنیٰ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ جہاں اولادِ ابراہیمؑ نے مسلکِ ابراہیمی کو بگاڑ کر دوسری خرابیوں کے ساتھ کعبہ کا طواف حالتِ عریانی میں کرنے کی ایک گندی بدعت پیدا کر لی تھی۔ وہاں اس حیادار نوجوان نے کبھی اس بدعت کو اختیار نہ کیا۔ جہاں جنگ ایک کھیل تھی اور انسانی خون بہانا ایک تماشا تھا۔ وہاں احترامِ انسانیت کا علمبردار یہ نوجوان ایسا تھا کہ جس کے دامن پر خون کی ایک چھینٹ بھی نہ پڑی تھی۔ نوعمری میں اس نوجوان کو حربِ فجار نامی جنگِ عظیم میں شرکت کا موقع پیش آیا اور اگرچہ اس نے قریش کے برسرِ حق ہونے کی بناء پر اس میں حصہ لیا تھا۔ لیکن پھر بھی کسی انسانی جان پر خود ہاتھ نہیں اٹھایا۔

ولیم میور کا یہ قول علامہ شبلی نعمانی نے نقل کیا ہے :-

"ہماری تمام تصنیفات محمد صلعم کے بارے میں اُن کے چال چلن کی عصمت اور اُن کے اطوار کی پاکیزگی پر، جو اہلِ مکہ میں کمیاب تھی، متفق ہیں۔"

پھر اس پاکباز و عفیف نوجوان کی دلچسپیاں دیکھئے کہ عین بہک جانے والی عمر میں وہ اپنی خدمات اپنے ہم خیال نوجوانوں کی ایک اصلاح پسند انجمن کے حوالے کرتا ہے۔ جو "حلف الفضول" کے نام سے غریبوں اور مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی چیرہ دستیوں کے استیصال کے لئے قائم ہوئی تھی۔ اس کے شرکاء نے اس مقصد کے لئے حلفیہ عہد باندھا تھا۔

آپؐ دورِ نبوت میں اس کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ :-

"اُس معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سُرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں اُس سے نہ پھرتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لئے کوئی بلائے تو میں حاضر ہوں۔"

پھر اس نوجوان کی صفات اور صلاحیتوں کا اندازہ اس سے کیجئے کہ تعمیرِ کعبہ کے موقع پر حجرِ اسود نصب کرنے کے معاملہ میں قریش میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور تلواریں میانوں سے نکل آتی ہیں۔ لیکن تقدیر کے اشارے سے اس قضیہ کو چکانے کا شرف اس نوجوان کے حصے میں آتا ہے۔ انتہائی جذباتی تناؤ کی اس فضا میں یہ جج اور صلح کا علمبردار ایک چادر بچھاتا ہے۔ اور اس پر پتھر کو اٹھا کر رکھ دیتا ہے اور پھر دعوت دیتا ہے کہ تمام قبیلوں کے لوگ مل کر اس چادر کو اٹھائیں۔ چادر پتھر سمیت متحرک ہو جاتی ہے اور جب موقع پر جا پہنچتی ہے تو وہ نوجوان اس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیتا ہے۔ جھگڑے کا سارا یلغار چھٹ جاتا ہے اور چہرے خوشی اور اطمینان سے چمک اٹھتے ہیں!

یہ نوجوان میدانِ معاش میں قدم رکھتا ہے تو تجارت جیسا پاکیزہ اور معزز مشغلہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ کوئی بات تو اس نوجوان میں تھی کہ اچھے اچھے اہلِ سرمایہ نے یہ پسند کیا کہ یہ نوجوان اُن کا سرمایہ اپنے ہاتھ میں لے اور کاروبار کرے۔ پھر سائب، قیس بن سائب مخزومی، حضرت خدیجہ اور جن دوسرے لوگوں کو اس نوجوان کے حُسنِ معاملت کا عملی تجربہ ہوا۔ اُن سب نے

اسے "تاجرامین" کا لقب دیا - عبد اللہ بن ابی الحساء کی گواہی آج بھی محفوظ ہے کہ بعثت سے قبل خرید و فروخت کے معاملہ میں اس "تاجرامین" سے طے ہوا کہ "آپ ٹھہریں ابھی پھر آؤں گا" لیکن بات آئی گئی ہو گئی - تیسرے دن اتفاقاً صحابیٔ مذکور کا گزر اسی مقام سے ہوا تو دیکھا کہ وہ تاجرامین وعدہ کی ڈوری سے بندھا اُسی جگہ کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ "تم نے مجھے زحمت دی - میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں" (ابو داؤد)

پھر دیکھئے کہ یہ نوجوان رفیقۂ حیات کا جب انتخاب کرتا ہے تو مکہ کی نوعمر، شوخ و شنگ لڑکیوں کو ایک ذرا سا خراج نگاہ تک دیئے بغیر ایک ایسی خاتون سے رشتۂ مناکحت استوار ہوتا ہے - جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاندان اور ذاتی سیرت و کردار کے لحاظ سے نہایت اشرف خاتون ہے - اس کا یہ ذوقِ انتخاب اس کے ذہن، اس کی روح، اس کے مزاج اور اس کی سیرت کی گہرائیوں کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے - پیغام خود وہی خاتون ــ حضرت خدیجہؓ ــ بھیجتی ہیں - جو اس یکتائے روزگار نوجوان کے کردار سے متاثر ہوتی ہیں - اور یہ نوجوان اس پیغام کو شرحِ صدر کے ساتھ قبول کرتا ہے !

پھر کسی شخص کے ذہن و سیرت کو اگر اس کے حلقۂ احباب کا جائزہ لینے سے جانچا جا سکتا ہے تو آئیے دیکھئے کہ اس عربی نوجوان کے دوست کیسے لوگ تھے - غالباً سب سے گہری دوستی اور سب سے زیادہ بے تکلفانہ رابطہ حضرت ابوبکرؓ سے تھا - ایک تو ہم عمری، اُوپر سے ہم مذاقی - اس نوجوان کے دوستوں میں ایک شخصیت حکیم بن حزام کی تھی - جو حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی تھے - اور حرم کے منصبِ رفادہ پر فائز تھے - پھر حلقۂ احباب کے ایک رکن ضماد بن ثعلبہ اُزدی تھے - جو طبابت و جراحی کا کام کرتے تھے - اس نوجوان کے حلقۂ احباب میں کیا کوئی ایک بھی دوں فطرت، پست ذوق اور کمینہ مزاج آدمی دکھائی دیتا ہے ؟ مکہ کے اشرار میں سے کسی کا نام اس فہرست میں ملتا ہے ؟ ظالموں اور فاسقوں میں سے کوئی اس دائرے میں سامنے آتا ہے ؟

پھر دیکھئے کہ یکتائے زمانہ نوجوان گھر بار کی دیکھ بھال، تجارت اور دُنیوی معاملات کی گوناگوں مصروفیات سے فارغ ہو کر جب کبھی کوئی فرصت کا وقت نکالتا ہے - تو اسے تفریحات و تعیشات میں صرف نہیں کرتا - اسے کوچہ گردی میں اور مجلس آرائیوں اور گپوں میں نہیں کھپاتا - اسے سو سو کر اور غفلت میں بیکار پڑے رہ رہ کر بھی نہیں گزارتا - بلکہ سارے ہنگاموں سے کنارہ کر کے اور سارے مشغلوں کو تج کر حرا کی خلوتوں میں خدائے واحد کی عبادت اور اس کا ذکر اپنی فطرتِ مطہرہ کی رہنمائی کے مطابق کرتا ہے - کائنات کی گہری حقیقتوں کو اخذ کرنے کے لئے اور انسانی زندگی کے غیبی رازوں کو پا لینے کے لئے عالمِ انفس و آفاق میں غور و فکر کرتا ہے - اور اپنی قوم اور اپنے ابنائے نوع کو اخلاقی پستیوں سے نکال کر مرتبۂ ملکوتی پر لانے کی تدبیریں سوچتا ہے - جس جوان کی جوانی کی فرصتیں اس تحنث میں صرف ہو رہی ہیں، کیا اُس کی فطرت کے بارے میں انسانی بصیرت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی ؟

ہونے والا آخری نبی اس نقشۂ زندگی کے ساتھ قریش کی آنکھوں کے سامنے اور اُن کے اپنے ہی مکی معاشرے کی گود میں پلتا ہے - جوان ہوتا ہے - اور پختگی کے مرتبہ کو پہنچتا ہے - کیا یہ نقشۂ زندگی بول بول کر نہیں بتا رہا تھا کہ ایک نہایت

ؔ ہجرت کے آٹھویں برس تک یہ ایمان نہیں لائے - لیکن پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت رکھتے تھے اور اسی محبت کے تحت ایک مرتبہ پچاس اشرفیوں کا ایک قیمتی حلہ خرید کر مدینہ میں آ پیش کیا - مگر آنحضورؐ نے باصرار قیمت ادا کر دی !

ہی غیر معمولی عظمت رکھنے والا انسان ہے؟ کیا اس اٹھان اٹھنے والی شخصیت کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کی بھی گنجائش کسی پہلو سے ملتی ہے کہ نعوذ باللہ یہ کسی جھوٹے اور فریبی آدمی کا نقشہ ہوگا؟ یہ کوئی مرد جاہ طلب ہوگا؟ یہ کوئی بندۂ مفاد و اغراض ہوگا؟ یہ خدا کے نام کو متاع کاروبار بنا کر اپنی دکان چمکانے والا کوئی سوداگر ہوگا؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! خود قریش نے اسے صادق و امین، دانا و حکیم اور پاک نفس و بلند کردار تسلیم کیا۔ اور بار بار تسلیم کیا! اس کے دشمنوں نے اس کی ذہنی و اخلاقی عظمت کی گواہی دی اور سخت ترین کشمکش کرتے ہوئے دی! داعیٔ برحق کے نقشۂ زندگی کو خود قرآن نے دلیل بنا کے پیش کیا:-

وَلَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ؟ (یونس۔۱۶)

لیکن اپنی قوم کا یہ چمکتا ہوا ہیرا جب نبوت کے منصب سے کلمۂ حق پکارتا ہے۔ تو زمانہ کی آنکھوں کا رنگ معاً بدل جاتا ہے اور اس کی صداقت و دیانت اور اس کی شرافت و نجابت کی قدر و قیمت بازار وقت میں یکایک گرادی جاتی ہے۔ کل تک جو شخص قوم کا مایۂ ناز فرزند تھا۔ آج وہ اس کا دشمن اور مخالف اور اس کے لئے باعث ننگ گردانا جاتا ہے۔ کل تک جس کا احترام بچہ بچہ کرتا تھا۔ آج وہ ایک ایک قدر دان کی نگاہوں میں مبغوض ٹھہرتا ہے! وہ شخص جس نے چالیس سال تک اپنے آپ کو ساری کسوٹیوں پر کھرا ثابت کرکے دکھایا تھا۔ توحید اور نیکی اور سچائی کا پیغام سناتے ہی صیر فیان قریش کی نگاہوں میں کھوٹا سکہ بن جاتا ہے۔ کھوٹا وہ نہ تھا بلکہ صرافوں کی اپنی نگاہوں میں ٹیڑھ تھی اور ان کے اپنے معیار غلط تھے!

کیا قریش کی آنکھیں واقعی اتنی اندھی تھیں کہ وہ ماحول کی تاریک رات میں جگمگاتے ہوئے ایک چاند کی شان نہیں دیکھ سکتی تھیں؟ کیا بالشتیوں کی محفل میں وہ اونچے اخلاقی قد و قامت رکھنے والے ایک زعیم کو نہیں پہچان سکتی تھیں؟ کیا کوڑے کے انبار میں پڑا ہوا موتیوں کا ایک ہار ان کو الگ محسوس نہیں ہوتا ہوگا؟ کیا خار و خس کے ہجوم میں ایک گلدستۂ شرافت و عظمت ان سے اپنی قدر و قیمت نہیں منوا سکا ہوگا؟ نہیں نہیں! قریش خوب پہچانتے تھے کہ محمدؐ کیا ہے! مگر انہوں نے جان بوجھ کر آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی۔ عناد اور تعصبات نے ان کو مجبور کیا کہ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا! اور جب کوئی آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا بن جاتا ہے تو اس سے بڑی بڑی مصیبتیں اور تباہیاں رونما ہوتی ہیں!

(۷)

آج اگر کسی طرح ہم مشرکین مکہ سے بات کر سکتے۔ تو ان سے پوچھتے کہ تمہارے خاندان کے اس چشم و چراغ نے جو دعوت دی تھی وہ فی نفسہٖ کیا برائی کی دعوت تھی؟ کیا اس نے تم کو چوری اور ڈاکے کے لئے بلایا تھا؟ کیا اس نے تمہیں ظلم اور قتل کے لئے پکارا تھا؟ کیا اس نے یتیموں اور بیواؤں اور کمزوروں پر جفائیں ڈھانے کی کوئی اسکیم پیش کی تھی؟ کیا اس نے تم کو باہم گر لڑانے اور قبیلہ قبیلہ میں فساد ڈلوانے کی تحریک چلائی تھی؟ کیا اس نے مال سمیٹنے اور جائداد بنانے کے لئے ایک جماعت کھڑی کی تھی؟ آخر تم نے اس کے پیغام میں کیا کجی دیکھی؟ اس کے پروگرام میں کونسا فساد محسوس کیا؟ کیوں تم کمر باندھ کر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے؟

قریش کو جس چیز نے جاہلیت کے فاسد نظام کے تحفظ اور تبدیلی کی رو کی مزاحمت پر اندھے جنون کے ساتھ اٹھا کھڑا کیا۔ وہ یہ ہرگز نہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر و کردار میں کوئی رخنہ تھا۔ یا آپ کی دعوت میں کوئی خطرناک

مفسدہ تھا یا آپؐ کی تحریک جاہلی تمدن کو پستی کی طرف لے جانے کا موجب بنتی دکھائی دیتی تھی۔ بلکہ وہ چیز صرف مفاد پرستی تھی! قریش سالہا سال کے جمے ہوئے عربی معاشرہ کے ڈھانچے میں اپنے لئے ایک اونچا مقام قیادت حاصل کر چکے تھے۔ تمام سیاسی اور مذہبی مناصب اُن کے ہاتھ میں تھے۔ اقتصادی اور کاروباری لحاظ سے اُن کی سیادت کا سکہ رواں تھا۔ پوری قوم کی چودھراہٹ انھیں حاصل تھی۔ اُن کی یہ چودھراہٹ اسی مذہبی و تمدنی و معاشرتی ڈھانچے میں چل سکتی تھی جو جاہلی دور میں استوار تھا۔ اگر وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر مجبور تھے کہ اپنی چودھراہٹ کا تحفظ کریں تو پھر وہ اس پر بھی مجبور تھے کہ جاہلی نظام کو بھی ہر حملے اور ہر تزلزل سے بچائیں۔!

قریش جہاں سیاسی و معاشرتی لحاظ سے چودھری تھے۔ وہاں وہ عرب کے مشرکانہ مذہب کے پروہت۔ مذہبی استھانوں کے مہنت اور مجاور اور تمام امورِ مذہبی کے ٹھیکیدار بھی تھے۔ یہ مذہبی ٹھیکیداری سیاسی و معاشرتی چودھراہٹ کی بھی پشتی بان تھی۔ اور بجائے خود ایک بڑا کاروبار بھی تھی۔ اس کے ذریعہ سارے عرب سے نذریں اور نیازیں اور چڑھاوے کھنچے چلے آتے تھے۔ اس کی وجہ سے اُن کی دامن بوسیاں ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ سے اُن کے قدموں کو چھوا جاتا تھا۔

مذہب جب ایک طبقہ کا کاروبار بن جاتا ہے تو اس کی اصل روح اور مقصدیت کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ اور گوناگوں رسمیات کا ایک نمائشی طلسم قائم ہو جاتا ہے۔ اصولی تقاضے فراموش ہو جاتے ہیں اور من گھڑت روایات اور شعائر بنیادی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خدا کا دیا ہوا علم و قانون گم ہو جاتا ہے اور مذہبی کاروباریوں کی اپنی بنائی ہوئی ایک شریعت آہستہ آہستہ نشو و نما پا جاتی ہے۔ معقولیت ختم ہو جاتی ہے۔ اندھی عقیدتیں اور فضول اوہام ہر طرف چھا جاتے ہیں۔ استدلال غائب ہو جاتا ہے۔ اور جذباتی ہیجانات عقل کا گلا گھونٹ دیتے ہیں۔ مذہب کا عوامی و جمہوری مزاج کافور ہو جاتا ہے۔ اور ٹھیکیدار طبقہ کا تحکم معاشرہ کے سینہ پر سوار ہو جاتا ہے۔ حقیقی علم مٹ جاتا ہے۔ بات بات میں بڑے اینچ پینچ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اختلافِ رائے کا حق قطعی طور پر سلب کر لیا جاتا ہے۔ اور ایک طبقہ کی اتھارٹی بے روک ٹوک نافذ ہوتی ہے۔ حق اور نیکی اور شرافت اور تقویٰ کا نام و نشان مٹ جاتا ہے اور مذہبیت ایک فریب کارانہ بہروپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

جب کبھی مذاہب میں بگاڑ پیدا ہوا ہے تو ہمیشہ وہ اسی نہج پر ہوا ہے۔ جاہلی عرب میں یہ بگاڑ بالکل اپنی انتہائی شکل پر پہنچا ہوا تھا۔ اسی بگاڑ پر قریش کی مہنت گری اور مجاوری کی ساری گدیاں قائم تھیں۔ یہ زرخیز گدیاں اپنی بقاء کے لئے اس بات کی محتاج تھیں کہ فاسد مذہبیت کے ڈھانچے کو جوں کا توں قائم رکھا جائے اور اس کے خلاف نہ کوئی صدائے احتجاج و اختلاف اُٹھنے دی جائے اور نہ کسی دعوتِ تغیر و اصلاح کو برپا ہونے دیا جائے۔ پس قریش اگر دعوتِ محمدیؐ جیسی خطرناک رَو کے خلاف تلملا کر نہ اُٹھ کھڑے ہوتے تو اور کیا کرتے!

اور پھر حال یہ تھا کہ قریش کا کلچر نہایت فاسقانہ کلچر تھا۔ شراب اور بدکاری۔ جوا اور سود خواری، عورتوں کی تحقیر و تذلیل اور بیٹیوں کا زندہ دفن کرنا، آزادوں کو غلام بنانا اور کمزوروں پر ظلم ڈھانا۔ یہ سب اس کلچر کے لوازم تھے۔ یہ کلچر قرنوں کی راسخ شدہ عاداتِ بد اور فخر آمیز قومی روایات بن جانے والی رسوم قبیحہ سے ترکیب پایا ہوا تھا۔ قریش کے لئے آسان نہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے اس آہنی تہذیبی قفس کو توڑ کر ایک نئی فضا میں پرواز کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ انھیں فوراً محسوس ہو گیا کہ دعوتِ محمدیؐ ان کی عادات، اُن کی خواہشات، اُن کے فنونِ لطیفہ اور اُن کے محبوب کلچر کی دشمن ہے۔

چنانچہ وہ جذباتی ہیجان کے ساتھ اس کی دشمنی کیلئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

درحقیقت یہی وجوہ و اسباب ہمیشہ دعوتِ حق کے خلاف کسی بگڑے ہوئے سماج کے اربابِ اقتدار اور مذہبی ٹھیکیداروں اور خواہش پرستوں کو متحدہ محاذ بنا کر اُٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

(۸)

بعثتِ نبوی سے قبل ذہین لوگوں میں اُس مذہب، اُس معاشرے اور اُس ماحول کے بارے میں تو ایسی اُپھی کے تحت اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ اور فطرتِ انسانی اس کے خلاف جذبۂ احتجاج کے ساتھ انگڑائی لے رہی تھی۔ ابھی اُوپر جن حساس افراد کا ہم ذکر کر چکے ہیں اُن کی روحوں کے ساز سے تبدیلی کا دھیما دھیما نغمہ بلند ہونے لگا تھا۔

قریش اپنے ایک بُت کے گرد جمع ہو کر تقریبِ عید منا رہے تھے۔ اُس خداوندِ سنگی کی تعریف و تعظیم ہو رہی تھی۔ اُس پر چڑھاوے چڑھائے جا رہے تھے۔ اُسی کا طواف ہو رہا تھا۔ اور عین اس عالم میں چار آدمی یعنی ورقہ بن نوفل، عبیداللہ بن جحش، عثمان بن الحویرث، زید بن عمر بن نفیل اس ہنگامۂ لایعنی سے بیزار الگ تھلگ بیٹھے ایک خفیہ میٹنگ کر رہے تھے۔ باہم گر رازداری کا پیمان باندھنے کے بعد گفتگو ہوئی۔ ان لوگوں کے خیالات یہ تھے کہ:-

"ہماری قوم ایک بے بنیاد مسلک پر چل رہی ہے۔ اپنے دادا ابراہیم کے دین کو انہوں نے گنوا دیا ہے۔ یہ جس مجسمۂ سنگی کا طواف کیا جا رہا ہے۔ یہ نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے۔ نہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ نہ نفع دے سکتا ہے۔ ساتھیو! اپنے دلوں کو ٹٹولو تو خدا کی قسم تم محسوس کرو گے کہ تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے۔ ملک ملک گھومو اور کھوج لگاؤ دینِ ابراہیم کے سچے پیروؤں کا!" (سیرت ابن ہشام جلد اوّل صفحہ ۲۴۲)

بعد میں ان میں سے ورقہ بن نوفل عیسائی ہو گیا۔ عبداللہ بن جحش عالمِ اضطراب میں پہلے اسلام لایا۔ پھر اسی اضطراب میں عیسائی ہوا۔ عثمان نے قیصرِ روم کے ہاں جا کر عیسائی اختیار کر لی اور زید نے نہ یہودیت قبول کی، نہ نصرانیت۔ لیکن اپنی قوم کا دین ترک کر دیا۔ بُت پرستی چھوڑ دی۔ مُردار اور خون اور استھانوں کے ذبیحوں سے پرہیز شروع کر دیا۔ بیٹیوں کے قتل سے لوگوں کو باز رہنے کی تلقین کرتا رہا اور کہا کرتا:-

"اَعْبُدُ رَبَّ اِبْرَاهِیْمَ"

میں تو ابراہیم کے رب کا پرستار ہوں۔ (سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۴۴)

اسماء بنت ابی بکر کا بیان ہے کہ:-

"میں نے بوڑھے سردار زید بن عمرو کو کعبہ کی طرف پیٹھ کر کے ٹیک لگائے ہوئے دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا:-

"اے قریش کے لوگو! قسم اُس ذات کی جس کے قبضہ میں زید بن عمرو کی جان ہے۔ میرے سوا تم میں سے کوئی بھی ابراہیم کے دین پر نہیں چلا!" پھر کہنے لگا: "اے خدا! اگر میں جانتا کہ تجھے کون سے طریقے پسند ہیں تو میں انہی طریقوں سے تیری عبادت کرتا۔ لیکن میں یہ نہیں جانتا۔ پھر ہتھیلیاں ٹیک کر سجدہ کرتا۔" (سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۲۴۴)

اپنے ملنے والوں کے سامنے وہ اکثر یہ اشعار الاپتا:-

أربًّا واحدًا أم ألف ربٍّ أدينُ إذا تقسّمتِ الأمورُ
عزلتُ اللاتَ والعزّى جميعًا كذلك يفعلُ الجلدُ الصبورُ

عجبتُ وفي الليالي معجباتٌ وفي الأيامِ يعرفها البصيرُ
بأنّ اللهَ قد أفنى رجالًا كثيرًا كان شأنَهمُ الفجورُ
وأبقى آخرين ببرِّ قومٍ فيَربِلُ منهمُ الطفلُ الصغيرُ
وبينَ المرءُ يعثرُ ثابَ يومًا كما يتروّحُ الغصنُ المطيرُ

ولكن أعبدُ الرحمنَ ربّي ليغفرَ ذنبيَ الربُّ الغفورُ

ترى الأبرارَ دارُهمُ الجنانُ وللكفّارِ حاميةٌ سعيرُ

وإيّاكَ لا تجعل مع اللهِ غيرَهُ فإنّ سبيلَ الرشدِ أصبحَ باديا

بیچارے زید کی بیوی صفیہ بنت الحضرمی ہمیشہ اُس کے پیچھے پڑی رہتی۔ بسا اوقات وہ خالص ابراہیمی دین کی جستجو کے لئے مکہ سے نکل کھڑے ہونے کا ارادہ کرتا۔ لیکن اس کی جورو خطاب بن نفیل کو آگاہ کر دیتی اور وہ اسے دین آبائی کے چھوڑنے پر سخت سُست کہتا۔ زید کی والہیت کا عالم یہ تھا کہ سجدہ گاہِ کعبہ میں داخل ہوتا تو پکار اُٹھتا:۔

"لبیک حقًا حقًا، تعبدًا ورقًا"

یعنی اے خدا! بر حق میں تیرے حضور اخلاص مندانہ، عبادت گزارانہ اور غلامانہ انداز سے حاضر ہوں۔

پھر کہتا:۔

"میں کعبہ کی طرف منہ کر کے اسی ذات کی پناہ طلب کرتا ہوں جس کی پناہ ابراہیم علیہ السلام نے ڈھونڈی تھی"۔[1]

خطاب بن نفیل زید کے درپے آزار رہا۔ یہاں تک کہ مکہ کے اوپر والے حصہ کی طرف شہر بدر کر دیا اور زید نے مکہ کے سامنے حرا، کے پاس جا دُھونی رمائی۔ پھر خطاب نے قریش کے چند نوجوانوں اور کچھ کمینہ خصلت افراد کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا اور اُن کو تاکید کی کہ خبردار اُسے مکہ میں داخل نہ ہونے دو۔ چنانچہ زید اگر کبھی آیا تو چھپ چھپا کر۔ اور اس پر بھی اگر پتہ چل جاتا تو خطاب اور اُس کے رضاکار اُسے کھدیڑ دیتے۔ اور اُسے دین کو بگاڑ دینے کا مجرم جانتے ہوئے نہایت نفرت کے ساتھ اُسے دُکھ دیتے۔

چنانچہ تنگ آ کر اس نے وطن چھوڑا اور موصل، الجزیرہ اور شام وغیرہ میں بے آمیز ابراہیمی دین کی جستجو میں مارا مارا

---

[1] سیرت ابن ہشام۔ جلد اول ص ٢٤٨۔

پھرتا رہا۔ آخر کار وہ دمشق کے علاقۂ بلقاء میں ایک صاحب علم راہب کے پاس پہنچا۔ اور اس سے گم گشتہ مسلکِ براہیمی کا سراغ پوچھا۔ راہب نے کہا کہ:-

"آج تجھے اس مسلک پر چلنے والا کوئی ایک متنفس بھی نہ ملے گا۔ البتہ ایک نبی کے ظہور کا وقت آ پہنچا ہے۔ جو اُسی جگہ سے اٹھے گا جہاں سے نکل کر تو آیا ہے۔ وہ دینِ ابراہیمی کا علمبردار بن کے اٹھے گا۔ جا کر اس سے مل۔ ان دنوں اس کی بعثت ہو چکی ہے"۔

زید نے یہودیت و نصرانیت کو خوب دیکھ بھال لیا اور ان کی کوئی چیز اس کے دل کو نہ لگی۔ وہ راہب کی ہدایت کے مطابق مکہ کی طرف لپکا۔ بلادِ لخم میں لوگوں نے اس کو قتل کر دیا[1] ورقہ بن نوفل نے بڑے دردناک اشعار الاپتے ہوئے اظہارِ درد کیا:-

فاصبحت فی دار کریم مقامھا ۔۔۔ تعلل فیھا بالکرامۃ لاھیا
تلاقی خلیل اللہ فیھا ولم تکن ۔۔۔ من الناس جبارا الی النار ھاویا
وقد تدرک الانسان رحمۃ ربہ ۔۔۔ ولو کان تحت الارض سبعین وادیا

(ابن ابی صلت)

اس کے بیٹے سعید اور حضرت عمرؓ بن الخطاب نے زمانۂ اسلام میں آنحضورؐ سے دریافت کیا کہ ہم زید کے لئے دعائے مغفرت کر سکتے ہیں؟ آنحضورؐ نے فرمایا: "ہاں!"

فانہ یبعث امۃ وحدہ!

"اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن ایک مستقل جُدا گانہ امّت کی حیثیت سے کھڑا کریگا"۔

مدعا یہ کہ ایک شخص کو جہاں تک اس کی فطرت سلیم سے رہنمائی مل سکتی تھی۔ اُس نے شرح صدر کے ساتھ اُسے قبول کیا۔ اور پھر وہ ہدایتِ دلی کی طلب میں مارا مارا پھرا اور بالآخر وہ سرچشمۂ رسالت کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا کہ اسی راہِ جستجو میں شہید ہوا[2]۔

اس طویل بیان سے یہ حقیقت سامنے لانا مقصود ہے کہ تاریخ ایک موڑ مڑنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ روحِ معاشرہ ایک نئی کروٹ لینا چاہتی تھی۔ انسانی ضمیر ایک شدید اضطراب سے دو چار تھا۔ مگر فطرت کی دھندلی رہنمائی کے سوا کوئی اور روشنی موجود نہ تھی۔ اُوپر سے فاسد مذہبیت اور اندھی رسمیت کا ماحول ایک آہنی خول کی طرح سے انسانی خودی کو بھینچے ہوئے تھا۔ جمود نے زندگی کے سمندر پر یخ کی ایک موٹی تہ تسلط کر دی تھی۔ کہ جس کو توڑ کر کسی موج کے لئے اوپر آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ حسّاس افراد یا تو مسلکِ نصرانیت کی منزل پر رک گئے۔ جس کے لئے ماحول میں گنجائش تھی۔ یا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اس کے خلاف جہاد کا آغاز کرنا بڑے دل گردہ کا کام تھا۔

مذکورہ بالا چار افراد میں بغاوت کی ایک لہر اٹھی تھی۔ ان میں سے صرف ایک زید نے اتنا کس بل دکھایا کہ حرم میں

---

[1] سیرت ابن ہشام ص ۲۲۵-۲۵۰ ۔ [2] قیس بن ساعدہ کا قصہ بھی کتبِ تاریخ و ادب میں اسی طرز کا مندرج ہے۔ لیکن جو اشعار اور خطبۂ عکاظ اس کے نام سے منسوب ہیں انہیں علامہ شبلی موضوع قرار دیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد ا ص ۱۴۱-۱۴۲)

بیٹھ کر خدائے واحد کو پکارا اور قریش کے سامنے بُت پرستی سے تبرّیٰ کیا۔

لیکن زید بھی ایک اظہارِ اضطراب اور ایک اعلانِ احتجاج سے زیادہ کچھ نہ کرسکا۔ کیونکہ اُس کے سامنے کوئی واضح اور مثبت اور مکمل نظریہ و مسلک نہ تھا۔ جسے وہ بنائے دعوت و تحریک بنا سکتا۔ پھر بھی مکہ نے اُس کے وجود کو برداشت کرنے سے انکار کردیا!

تاریخ جس انقلابی قوت کو مانگ رہی تھی۔ وہ اپنے ٹھیک تمدنی موسم نمو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی صورت میں کونپل نکالتی ہے۔ آپ ایک منفی صدائے احتجاج بن کر اور اپنے انفرادی ذہن و کردار کی فکر لے کر نمودار نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک جامع مثبت نظریہ و مسلک کے ساتھ ساری قوم اور سارے ماحول کی اجتماعی تبدیلی کے لئے میدان میں اُترے اس جرم کو بھلا کیسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا جاسکتا تھا!

(۹)

مقدمۂ دورِ نبوت کے طور پر اپنے زمانۂ تحنث میں آنحضورؐ رویائے صادقہ سے نوازے گئے۔ کبھی غیبی آوازیں سنائی دیتیں کبھی فرشتہ دکھائی دیتا۔ یہاں تک کہ عرشِ الٰہی سے پہلا پیغام آپہنچا۔ جبرئیل آتے ہیں اور پکارتے ہیں کہ:-

"اقراء باسم ربک الذی خلق!"

وحی الٰہی کے اوّلین تجربے میں ہیبت و جلال کا بہت سخت بوجھ آپؐ نے محسوس کیا۔ گھر آکر اپنی رفیقہ و راز داں سے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے تسلّی دی کہ آپ کا خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ ورقہ بن نوفل نے تصدیق کی کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اُترا تھا۔ بلکہ مزید یہ کہا کہ:-

"یقیناً لوگ آپ کی تکذیب کریں گے۔ آپ کو تنگ کریں گے۔ آپ کو وطن سے نکال دیں گے اور آپ سے لڑیں گے۔ اگر میں اُس وقت تک زندہ رہا تو میں خدا کے کام میں آپ کی حمایت کروں گا۔" [ل]

اب گویا آپؐ خدا کی طرف سے دعوتِ حق پر باقاعدہ مامور ہو گئے۔ اور آپؐ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دی گئی۔ یہ دعوت سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ ہی کے سامنے آئی۔ اور وہی اس پر ایمان لانے والوں میں سے پہلی ہستی قرار پائیں۔ پھر یہ کام خفیہ طور پر دھیمی دھیمی رفتار سے چلنے لگا۔ آپؐ کے بچپن کے ساتھی اور پوری طرح ہم مذاق و ہم مزاج حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔ ان کے سامنے جب پیغامِ حق آیا تو انہوں نے کسی تامل و توقف کے بغیر اس طرح لبیک کہی جیسے پہلے سے روح اسی چیز کی پیاسی تھی۔ علاوہ بریں زید رفیقِ مسلک بنے جو آپؐ کے پروردہ غلام تھے اور آپؐ کی زندگی اور کردار سے متاثر تھے۔

آپؐ پر قریب ترین لوگوں کا ایمان لانا آپؐ کے اخلاص اور آپؐ کی صداقت کا بجائے خود ایک ثبوت ہے۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جو کئی برس سے آپؐ کی پرائیویٹ اور پبلک لائف سے اور آپؐ کے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف تھیں۔ ان سے بڑھ کر آپؐ کی زندگی اور کردار اور آپ کے ذہن و فکر کو جاننے والا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ ان قریب ترین ہستیوں نے

ل Mohammad, by H. G. Sarwar. P. 93.

بالکل آغاز میں آپؐ کے بلاوے پر لبیک کہہ کر گویا ایک شہادت بہم پہنچادی دعوت کی صداقت اور داعی کے اخلاق کی!

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تحریکِ محمدیؐ کا سپاہی بنتے ہی اپنے حلقۂ اثر میں زور شور سے کام شروع کر دیا۔ اور متعدد اہم شخصیتوں۔ مثلاً حضرت عثمانؓ۔ حضرت زبیرؓ۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف۔ حضرت سعدؓ بن وقاص۔ حضرت طلحہؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس انقلابی حلقہ کا رکن بنادیا۔ بڑی خاموشی۔ رازداری اور احتیاط سے اس حلقہ کے جواں ہمت کارکن اس کو توسیع دے رہے تھے۔ عمارؓ۔ خبابؓ۔ ارقمؓ۔ سعیدؓ بن زید (انہی زیدؓ بن عمرو کے بیٹے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ یہ والد کی زندگی سے متاثر تھے) عبداللہؓ بن مسعود۔ عثمانؓ بن مظعون۔ عبیدہؓ۔ صہیبؓ رومی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) بھی اسلامی تحریک کے ابتدائی خفیہ دور میں سابقین اولین کی صف میں آچکے تھے!

نماز کا وقت آتا تو آنحضورؐ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور اپنے رفقاء کے ساتھ چھپ چھپا کر سجدۂ عبدیت بجا لاتے۔ صرف چاشت کی نماز حرم میں پڑھتے۔ کیونکہ یہ نماز خود قریش کے یہاں بھی مروّج تھی۔ ایک مرتبہ آنحضورؐ حضرت علیؓ کے ساتھ کسی درہ میں نماز ادا فرمارہے تھے۔ کہ آپؐ کے چچا ابو طالب نے دیکھ لیا۔ اس نئے انداز کی عبادت کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے اور بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد آپؐ سے پوچھا کہ یہ کیا دین ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:۔

"ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا"۔

یہ سُن کر ابو طالب نے کہا کہ:۔

"میں اُسے اختیار تو نہیں کرسکتا۔ لیکن تم کو اجازت ہے۔ اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہوسکیگا"۔[۱]

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تحریک اسلامی کے اسی خفیہ دور میں ایمان لائے اور آپ کا ترتیبی نمبر بہ تحقیق علامہ شبلی چھٹا یا ساتواں ہے۔ یہ بھی انہی مضطرب لوگوں میں تھے جو بُت پرستی چھوڑ کر محض فطرت سلیم کی رہنمائی میں خدا کا ذکر کرتے اور اس کی عبادت بجالاتے۔ اُن تک کسی ذریعہ سے آنحضورؐ کی دعوت کا آوازہ پہنچ گیا۔ انہوں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ جاکر صحیح معلومات لائیں۔ انہوں نے آنحضورؐ سے ملاقات کی۔ قرآن سنا اور بھائی کو بتایا کہ:۔

"میں نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ لوگ اسے مرتد[۲] کہتے ہیں۔ لیکن وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور ایک عجیب کلام سناتا ہے۔ جو شعر و شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ اُس کا طریقہ تمہارے طریقے سے ملتا جلتا ہے"۔

اس اطلاع پر ابوذرؓ خود آئے اور آپؐ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اخفاء کے مشکِ حق کی خوشبو کو ہوا کی لہریں لے اُڑی تھیں اور خدا کے رسولؐ کے لئے بدنام کن القاب تجویز کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی ماحول ابھی پُرسکون تھا۔ ابھی

---

[۱] سیرت النبی، علامہ شبلی جلد اول ص ۱۴۹۔

[۲] دیکھئے بگڑے ہوئے معاشرے کی شان کہ جو شخص دُنیا بھر کو ایمان سے مالا مال کرنے آیا تھا۔ اسی پر بے دینی کا ٹھپہ لگا دیا! ہر دور کے مذہبی ٹھیکیداروں کا طرزِ عمل یہی ہوتا ہے!

وہ "خطرے" کا پورا پورا اندازہ نہیں کر پایا تھا!

دیکھئے، ایک اور اہم تاریخی حقیقت، کہ تحریک کے ان اولین علمبرداروں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اعلیٰ درجہ کے مذہبی و قومی مناصب پر مامور ہو۔ یہ حضرات اغراض کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور مفاد کی ڈوریوں سے بندھے ہوئے نہ تھے۔ ہمیشہ ایسے ہی آزاد فطرت نوجوان تاریخ میں بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا کرنے کے لئے اگلی صفوں میں آیا کرتے ہیں۔ لیڈروں اور عہدہ داروں میں سے کوئی بھی ادھر نہ آیا تھا۔

تحریک اپنے اس خفیہ دور میں قریش کی نگاہوں میں درخورِ اعتنا نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ چند نوجوانوں کا سرپھراپن ہے۔ اُلٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں۔ چار دن میں دماغوں سے یہ ہوا نکل جائے گی۔ ہمارے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔ مگر برسرِ اقتدار طبقہ تختِ قیادت پر بیٹھا اپنے زعمِ قوت میں مگن رہا اور سچائی اور نیکی کی کونپل تخت کے سائے میں آہستہ آہستہ جڑیں چھوڑتی رہی اور نئی پتیاں نکالتی رہی۔ یہاں تک کہ تاریخ کی زمین میں اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا۔ قریش کا ایک اعتقاد یہ بھی تھا کہ لات اور منات اور عزیٰ جن کے آگے ہم پیشانیاں رگڑتے اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں۔ اور جن کے ہم خدام بارگاہ ہیں۔ اپنے احترام اور مذہب بت پرستی کی خود ہی حفاظت کرینگے۔ اور اُن کی روحانی مار اس ہنگامہ کو ختم کر دے گی!

(۱۰)

تین برس اسی طرح گزر گئے۔ لیکن مشیتِ الٰہی حالات کے سمندر کو بھلا یخ بستہ کہاں رہنے دیتی۔ اس کی سنت تو ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ باطل کے خلاف حق کو اٹھا کھڑا کرتی ہے اور پھر ٹکراؤ پیدا کرتی ہے (بل نقذف بالحق علی الباطل) اسی سنت کے تحت یکایک دوسرے دور کے افتتاح کے لئے حکم دیتا ہے:۔

"فاصدع بما تؤمر!

جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اسے دانشگاف کہہ دیجئے!"

آنحضورؐ اپنی ساری ہمت و عزیمت کو سمیٹ کر، نئے مرحلے کے متوقع حالات کے لئے اپنے آپ کو تیار کر کے کوہ صفا پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور قریش کو عرب کے اس خاص اسلوب سے پکارتے ہیں۔ جس سے وہاں کسی خطرے کے نازک لمحہ قوم کو بلایا جاتا تھا۔ لوگ دوڑ کر آتے ہیں۔ جمع ہو جاتے ہیں۔ اور کان منتظر ہیں کہ کیا خبر سنائی جانے والی ہے!

آپؐ نے بآوازِ بلند پوچھا:۔

"اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک حملہ آور فوج چلی آ رہی ہے تو کیا تم اعتماد کرو گے؟"

"ہاں، کیوں نہیں؟ ہم نے تم کو ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے"

یہ جواب تھا جو بالاتفاق مجمع کی طرف سے دیا گیا!

"تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا پر ایمان لاؤ، اے بنو عبدالمطلب! اے بنو عبد مناف! اے بنو زہرا! اے بنو تیم! اے بنو مخزوم! اے بنو اسد! ورنہ تم پر سخت عذاب نازل ہوگا"

ان مختصر الفاظ میں آپؐ نے اپنی دعوت برسرِ عام پیش کر دی۔

لہب نے یہ سنا تو جل بھن کر کہا کہ:۔

"غارت ہوجاؤ تم آج ہی کے دن! کیا یہی بات تھی جس کیلئے تم نے ہم سب کو یہاں اکٹھا کیا تھا؟"[۱]

ابولہب اور دوسرے اکابر بہت برہم ہو کر چلے گئے!

دیکھئے ابولہب کے الفاظ میں دعوتِ نبوی کے صرف ناقابلِ اعتنار ہونے کا تأثر جھلک رہا ہے - ابھی کوئی دوسرا ردِعمل پیدا نہیں ہوا - شکایت صرف یہ تھی کہ تم نے ہمیں بے جا تکلیف دی اور ہمارا وقت ضائع کیا!

دعوتِ عام کی مہم کا دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ آنحضورؐ نے تمام خاندانِ عبدالمطلب کو کھانے پر بلوایا - اس مجلسِ ضیافت میں حمزہؓ اور ابوطالبؓ اور عباسؓ جیسے اہم لوگ بھی شریک تھے - کھانے کے بعد آپؐ نے مختصر سی تقریر کی اور فرمایا کہ "میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں یہ دین اور دنیا دونوں کا کفیل ہے[۲] کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے"؟

اس پر سکوت چھا گیا - اس سکوت کے اندر تیرہ برس کا ایک لڑکا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ :-

"اگرچہ میں آشوبِ چشم میں مبتلا ہوں - اگرچہ میری ٹانگیں تپلی ہیں - اگرچہ میں ایک بچہ ہوں - لیکن میں اس مہم میں آپ کا ساتھ دوں گا"

یہ حضرت علیؓ تھے جو آگے چل کر اساطینِ تحریک میں شمار ہوئے!

یہ منظر دیکھ کر حاضرین میں خوب قہقہہ پڑا ---! اس قہقہے کے ذریعہ گویا خاندانِ عبدالمطلب یہ کہہ رہا تھا کہ یہ دعوت اور یہ داعی اور یہ لبیک کہنے والا کون سا کارنامہ انجام دے لیں گے - یہ سب کچھ ایک مذاق ہے - ایک جنون ہے، اور بس! اس کا جواب تو صرف ایک خندۂ استہزاء سے دیا جاسکتا ہے!

اس دوسرے واقعہ پر ماحول کا سکون نہیں ٹوٹا - زندگی کے سمندر کے نہنگوں اور گھڑیالوں نے کوئی انگڑائی لی - لیکن اس کے بعد جو تیسرا قدم اٹھا تو اس نے معاشرے کو ہسٹیریا کے اس دورے میں مبتلا کر دیا جو آہستہ آہستہ شروع ہو کر روز بروز تند و تیز ہوتا گیا!

اس تیسرے اقدام کے بارے میں گفتگو کرنے سے قبل ایک اور واقعہ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے -

جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مخالف ماحول کی خطرناک سنگینی کی وجہ سے نماز چوری چھپے پڑھی جاتی تھی - آنحضورؐ اور رفقائے تحریک شہر سے باہر وادیوں اور گھاٹیوں میں جا جا کر نماز ادا کرتے - ایک دن ایک گھاٹی میں سعد بن ابی وقاصؓ دوسرے رفقائے نبویؐ کے ساتھ نماز میں تھے کہ مشرکین نے دیکھ لیا - عین حالتِ نماز میں ان مشرکین نے فقرے کسنے شروع کئے - برا بھلا کہا - اور نماز کی ایک ایک حرکت پر پھبتیاں چست کرتے رہے - جب ان لایعنی باتوں کا کوئی جواب نہ ملا تو زچ ہو کر لڑنے پر اتر آئے - اس دنگے میں ایک مشرک کی تلوار نے سعد بن ابی وقاصؓ کو زخمی کر ڈالا - یہ تھی خون کی سب سے پہلی دھار جو مکہ کی خاک پر خدا کی راہ میں بہی! یہ جاہلی معاشرے کا سب سے پہلا جنون آمیز خونیں ردِعمل تھا - اس ردِعمل کے تیور بتا رہے تھے کہ مخالفت اب نیزوں اور تلواروں کی منزل میں داخل ہو چکی ہے!

تحریک کی زیرِ سطح رَو نے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے چالیس[۳] موتی اکٹھے کر لئے تھے اور اب گویا اسلامی جماعت ایک محسوس

---

[۱] "Mohammad" by H.G. Sarwar P. 104 - [۲] بالکل ابتدائے دعوت میں آنحضورؐ اس حقیقت کا شعور رکھتے تھے کہ وہ دنیا سے کٹا ہوا مذہب لے کر نہیں آئے بلکہ دنیا کو سنوارنے والا دین لے کے آئے ہیں -

طاقت بن چکی تھی۔ کھلم کھلا کلمۂ حق کو پکارنے کا حکم آ ہی چکا تھا۔ اس کی تعمیل میں آنحضورؐ نے ایک دن حرم کعبہ میں کھڑے
ہو کر توحید کا اعلان کیا۔ لیکن مذہبیت جب بگڑتی ہے تو اس کی اقدار اس طرح تہ و بالا ہو جاتی ہیں کہ وہ گھر جو پیغامِ توحید
کے مرکز کی حیثیت سے استوار کیا گیا تھا۔ آج اسی کی چار دیواری کے اندر خدائے واحد کی وحدت کی پکار بلند کرنا اس مرکزِ
توحید کی توہین کا موجب ہو چکا تھا۔ بتوں کے وجود سے کعبہ کی توہین نہیں ہوتی تھی! بتوں کے آگے پیشانیاں رگڑنے سے
بھی نہیں۔ ننگے ہو کر طواف کرنے اور سیٹیاں اور تالیاں بجانے سے بھی نہیں۔ غیر اللہ کے نام پر ذبیحے پیش کرنے سے بھی نہیں!
مجاوری کی فیس اور پروہتی کا ٹیکس وصول کرنے سے بھی نہیں۔ لیکن اس گھر کے اصل مالک کا نام لیتے ہی اس کی توہین
ہو گئی تھی [۱]

کعبہ کی توہین! حرم کی بے حرمتی بات — توبہ توبہ! کیسی خون کھولا دینے والی بات ہے۔ کیسی جذبات کو مشتعل کر دینے والی
حرکت ہے! چنانچہ کھولتے ہوئے خون اور مشتعل جذبات کے ساتھ چاروں طرف سے کلمۂ توحید کو سننے والے مشرکین و کفار
امڈ آتے ہیں! ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھیرے میں آ جاتے ہیں۔ حارثؓ بن ابی ہالہ کے گھر میں تھے۔
شور و شغب سن کر آنحضورؐ کو بچانے کے لئے دوڑے۔ لیکن ہر طرف سے تلواریں ان پر ٹوٹ پڑیں اور وہ شہید ہو گئے۔ عرب کے
اندر اسلام اور جاہلیت کی کشمکش میں یہ پہلی جان تھی جو حمایت حق میں قربان ہوئی!

دیکھا آپ نے! ایک دعوت جو معقول اور پرسکون انداز سے دی جا رہی تھی۔ اس پر غور کر کے رائے قائم کرنے اور اس
کے استدلال کا جواب دلائل سے دینے کے بجائے اندھے جذباتی اشتعال سے دیا جاتا ہے۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کلمۂ
حق کو آہنی تلوار سے منوانے نہیں اٹھتے۔ لیکن مخالف طاقت معاً تلوار سونت کے آ جاتی ہے۔ یہی ایک فاسد نظام کے
مفاد پرست محافظین کی علامت ہے کہ معقولیت کے جواب میں اشتعال اور دلیل کے جواب میں تلوار لئے میدان میں اترتے
ہیں۔ مخالفین میں اتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ کم سے کم چند ہفتے، چند دن، چند لمحے حرم سے اٹھنے والی اس صدا پر پرسکون
طریقے سے غور و فکر میں صرف کر سکتے۔ یہ تسلیم کرتے کہ محمدؐ کو بھی ان کی طرح کسی نظریہ، فلسفے، عقیدے پر ایمان رکھنے، کسی مذہب
پر چلنے اور ان کی قائم کردہ صورتِ مذہب سے اختلاف کرنے کا حق ہے۔ کم سے کم امکان کی حد تک یہ گنجائش مانتے کہ ہو سکتا
ہے کہ ہمارے اندر غلطی موجود ہو اور محمدؐ ہی کی دعوت سے حقیقت کا سراغ مل سکتا ہو۔ کسی نظام فاسد کے سربراہ کاروں میں
اتنا ظرف باقی نہیں رہتا۔ ان میں اختلاف کے لئے قوتِ برداشت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ ان کی غور و فکر کی صلاحیتیں زنگ
آلود ہو جاتی ہیں!

ذرا اندازہ کیجئے کہ کیسی تھی وہ فضا۔ جس میں ہم سب انسانوں کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود کے لئے اپنی جان کی بازی
لگا دینے والا داعی حق بے سر و سامانی کے عالم میں اپنا فرض ادا کر رہا تھا!

(۱۱)

ابراہیم و اسمٰعیل علیہم السلام کے پاکیزہ جذبات اور پاکیزہ حسرتوں اور تمناؤں کے مسالے سے بنے ہوئے حرمِ پاک کے

---

[۱] یہ تو خیر مشرکین تھے دورِ جاہلیت کے۔ آج ہمارے سامنے ایک مسلمان، اور معمولی مسلمان نہیں۔ ایک مذہبی شخصیت کعبہ کے نظامِ
تولیت کی خرابیوں پر تنقید کرنے والے اپنی بھائی کو توہینِ کعبہ کا مجرم گردانتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!

اندر مکہ والوں کی اس حرکت کے وقوع نے آنے والے مستقبل کا ایک تصوّر تو ضرور دلادیا۔ اور ایک بے گناہ کے خون سے آئینہ ابواب تاریخ کی سُرخی تو جمادی۔ لیکن یہ اصل دورِ تشدّد کا افتتاح نہیں تھا۔

پہلا مرحلۂ مخالفت ہمیشہ استہزاء، تضحیک، کٹ حجتیوں کا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ غنڈہ گردی کا رنگ اختیار کرتا جاتا ہے!

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کو پایۂ اعتبار سے گرانے کے لئے گالی دینے کے کمینہ جذبہ کے ساتھ پروپیگنڈہ کے ماہر استادوں نے گوناگوں القاب گھڑنے شروع کئے!

مثلاً یہ کہا جانے لگا کہ "اس شخص کی بات کیوں سُنتے ہو۔ یہ تو (نعوذ باللہ) "مرتد" ہے۔ سکّہ بند دینِ اسلاف کہ جس کے ہم اجارہ دار ہیں۔ یہ اُس کے دائرہ سے باہر نکل گیا ہے اور اپنے پاس سے ایک انوکھا دین گھڑ لایا ہے۔ کوئی استدلال نہیں" بس اپنی گڑھیوں میں بیٹھ کر کفر کا فتویٰ صادر کردیا جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ "یہ تو "صابی" ہو گیا ہے"۔ صابئیت چونکہ اس وقت کی مشرکانہ سوسائٹی میں یہ ایک بدنام اور ناپسندیدہ مسلک تھا۔ اس لئے کسی کا نام "صابی" دھردینا ویسی ہی گالی تھی جیسے آج کسی مسلمان کو یہودی یا خارجی یا نیچری کہہ دیا جائے۔ حق کے خلاف دلائل کے لحاظ سے بودے لوگ جب منفی ہنگامے اُٹھاتے ہیں تو اُن کے پروپیگنڈے کی مہم کا ایک ہتھیار ہمیشہ اس طرح کے بدنام القاب اور ناموں اور اصطلاحوں کا چسپاں کرنا ہوتا ہے۔ گلی گلی، مجلس مجلس مکہ کے پروپیگنڈسٹ ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتے تھے کہ:-

> "دیکھو جی یہ لوگ "صابی" ہوگئے ہیں۔ بےدین ہوگئے ہیں۔ باپ دادا کا دین، دھرم انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ نئے نئے عقیدے اور نئے نئے ڈھنگ گھڑ کے لارہے ہیں۔ دیکھو جی! اَن ہونی باتیں ہورہی ہیں!"

یہ آندھی جب اُٹھ رہی ہوگی تو تصوّر کیجئے کہ اس میں راستہ دیکھنا اور سانس لینا عام لوگوں پر کتنا دوبھر ہو گیا ہوگا۔ اور داعیانِ حق کے مختصر سے قافلہ کو کس آفت کا سامنا ہوگا! مگر آندھیاں اربابِ عزیمت کے راستے کبھی نہیں روک سکتیں!

مَا يَفْتَحِ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِن رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا! (فاطر۔ ۲)

دلائل کے مقابلہ میں جب گالیاں لائی جارہی ہوں۔ تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دلائل تو اپنی جگہ جمے رہتے ہیں۔ لیکن جو گالی مقابلہ پر لائی جاتی ہے وہ جذباتی حد تک دو چار دن کام دے کر بالکل بے اثر ہوجاتی ہے اور انسانی فطرت اس سے نفور ہونے لگتی ہے۔ اس سلئے استادانِ فن کا یہ کلیہ ہے کہ نت نئی گالیاں ایجاد کرتے چلے جاؤ۔ چنانچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے لئے ایک گالی اور وضع کی گئی۔ آپ کو "ابن ابی کبشہ" کہا جاتا تھا۔ ابی کبشہ ایک معروف مگر بدنام شخصیت تھی۔ یہ تمام عرب کے دینی رجحانات کے خلاف "شعریٰ" نامی ستارے کی پرستش کرتا تھا۔ ابن ابی کبشہ کے معنی ہوئے "ابی کبشہ کا بیٹا" یا "ابی کبشہ کا پیرو۔ (نعوذ باللہ) دل کا بخار نکالنے کے لئے مکہ کے مریضانِ جذباتیت نے کیا کیا کچھ ایجادیں نہیں کیں۔[۱]

کسی صاحبِ دعوت یا کسی نقیبِ تحریک کی ذات پر جب اس طرح کے وار کئے جاتے ہیں تو اصل مطلوب اس ایک شخصیت کو کرب دینا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ درحقیقت گالی دی جاتی ہے اس نظریہ و مسلک کو اور اس کام اور اس تنظیم کو۔ جس کی روز افزوں

---

[۱]۔ ابن ہشام جلد ۲ حاشیہ صد ۱۳۲۔

بلغار سے سابقہ پڑا ہوتا ہے۔ مگر کیا ایک اُمڈتے ہوئے سیلاب کے آگے گوبر کے پشتے باندھ کر اُس کو روکا جاسکتا ہے!

مستہزئین مکہ دیکھ رہے تھے کہ وہ گندگی کے جو بند باندھ رہے تھے اُن کو دعوت بہائے لئے چلی جارہی ہے اور ہر صبح اور ہر شام کچھ نہ کچھ آگے ہی بڑھتی جاتی ہے۔ تو انہوں نے پروپیگنڈے کے دوسرے پہلو اختیار کئے۔ ایک نیا لقب یہ تراش کہ یہ شخص (نعوذ باللہ) درحقیقت پاگل ہوگیا ہے۔ بتوں کی مار پڑنے سے اس کا سر پھر گیا ہے۔ یہ جو باتیں کرتا ہے وہ ہوش و حواس اور عقل و حکمت کی باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایک مالیخولیا ہے کہ جس کے دورے پڑنے پر کبھی اُسے فرشتے نظر آتے ہیں۔ کبھی جنت اور دوزخ کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی وحی اُترتی ہے اور کبھی کوئی انوکھی بات منکشف ہوجاتی ہے۔ یہ ایک سرپھرا آدمی ہے - اس لئے اس کی باتوں پر عام لوگوں کو دھیان نہیں دینا چاہیئے۔ اور اپنا دین ایمان بچانا چاہیئے۔ ہمیشہ سے یہ ہوا ہے کہ داعیانِ حق کا زورِ استدلال توڑنے کے لئے یا تو اُن کو پاگل کہا گیا ہے یا سفیہ و احمق! ہوش مند تو بس وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی دُنیا بنانے اور زمانے کی ہاں میں ہاں ملانے اور اپنی خواہشوں کا سامانِ تسکین بہم کرنے میں منہمک رہیں۔ باقی وہ لوگ جو تجدید و اصلاح کی مہم اُٹھا کر جان جوکھوں میں ڈالیں۔ اُن کو دُنیا پرست اگر احمق اور پاگل نہ کہیں تو آخر اُن کی ڈکشنری میں اور کونسا لفظ ایسوں کے لئے ہوگا[1] پھر یہ بات کچھ پیٹھ پیچھے کہتے رہنے پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا بلکہ رُو در رُو کہا جاتا تھا کہ :-

يَا أَيُّهَا الَّذِي نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ إِنَّكَ لَمَجْنُونٌ! (الحجر - ۶)

گالی کا اصلی مزہ تو آتا ہی جب ہے کہ وہ رُو در رُو سُنائی جائے۔

لیکن کبھی پاگلوں کے گرد بھی دُنیا کسی تحریک کو چلانے کے لئے منظم ہوئی؟ کبھی احمقوں کا دامن بھی ہوشمند اور سلیم الفطرت نوجوانوں نے تھاما؟ کبھی سرپھرے لوگوں کے بلاوے پر اولوالعزم افراد نے لبیک کہی؟ اس سوال کا جواب دینے کے لئے مشرکین مکہ نے ایک اور طنز گھڑی۔ کہنے لگے کہ :-

"یہ مدعیٔ نبوت درحقیقت جادو کے فن میں بھی درک رکھتا ہے۔ یہ اس کا فنی کمال ہے کہ دو چار باتوں میں ہر ملنے والوں پر ہپناٹزم کر دیتا ہے۔ نظر بندی کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے اور ذرا کوئی اس کی باتوں میں آیا نہیں کہ جبا دو کے جال میں پھنسا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے بھلے سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ اس کا شکار ہوتے چلے جارہے ہیں!"

ہاں مگر ایک سوال یہ بھی تو پیدا ہوتا تھا کہ کبھی جادوگروں نے بھی آج تک مذہبی و تمدنی تحریکیں چلائیں اور کبھی انہوں نے خدا پرستی اور توحید اور مکارمِ اخلاق کا درس دینے کے لئے فنِ ساحری کو استعمال کیا؟ ہے کوئی مثال ایسی تاریخ میں کہ جادوگروں کی سی ذہنی سطح رکھنے والے کسی فرد نے نظامِ وقت کو بدل ڈالنے کے لئے جادو کے زور سے ایک انقلابی فورس اُٹھا کھڑی کی ہو۔؟ کبھی جادو کے زور سے دلوں اور دماغوں، روحوں اور سیرتوں کو بھی بدلنے کی کوئی مثال سامنے آئی؟ پھر یہ کیسا

---

[1] آج بھی دینی رجحانات رکھنے والوں کیلئے اہلِ مغرب نے جنونی ([illegible]) کی نفرت بھری اصطلاح اسی معنی میں اختیار کر رکھی ہے کہ یہ عقل سے بے بہرہ جذباتی لوگ ہوتے ہیں۔ خود ہمارے اپنے اندر کے بدمذہب عناصر داعیانِ حق کو جب "ملا" کہتے ہیں تو اس معنی میں کہتے ہیں کہ بس یہ لوگ سمجھ بوجھ سے کورے، حالاتِ زمانہ سے ناآشنا اور ماضی کے بوسیدہ خیالات کے کنوئیں کے مینڈک ہوتے ہیں۔ اس سے نیچے اُتر کر دینی لوگوں کو مخالف عناصر سیاست سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دینگے۔ یعنی اجتماعی معاملات کے لحاظ سے احمق!

جادوگر تھا۔ جو شعبدہ گری کرکے چار پیسے کماتے پھرنے کے بجائے ساری دُنیا کے عذاب بھگتتا ہوا سوسائٹی کے بہترین صالح عنصر کو اپنے گرد ایک بڑی اجتماعی مہم کے لئے سمیٹ رہا تھا۔ کیا یہ سب کچھ نظر بندی کا ایک شعبدہ تھا۔ جو تمہاری آنکھوں کے سامنے واقع ہو رہا تھا!

لیکن یہ سکّہ بند الزام ہے ایسا کہ ہر دور میں ہر صاحب دعوت پر لگایا گیا ہے۔ یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہو کہ خود دعوت میں صداقت نہیں کہ اس کی فطری کشش کام کرے۔ داعی کے استدلال میں کوئی وزن نہیں کہ جس سے قلوب مسخر ہو رہے ہوں۔ بلکہ سارا کھیل کسی پُر اسرار قسم کی فریب کاری اور ساحری پر مبنی ہے۔ اور یہ اسی کا اثر ہے کہ بھلے چنگے لوگ توازن کھو بیٹھتے ہیں!

لوگ اکابرِ قریش کے سامنے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی الہامی تقاریر اور آیاتِ قرآنی لے جاکر پیش بھی تو کرتے ہونگے۔ کہ یہ اور یہ باتیں کہی گئی ہیں۔ کلام کے وہ جوہر شناس آخر یہ تو محسوس کر لیتے ہوں گے کہ خود یہ کلام مؤثر طاقت ہے۔ اس پر بحثیں ہوتی ہوں گی۔ اس کلام کے اعجاز کی توجیہہ کرنے کے لئے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ:-

"اجی! کیا ہے! بس شاعری ہے! الفاظ کا ایک آرٹ ہے! ادبیانہ زور ہے! محمدؐ درجہ اول کے آرٹسٹ اور لسّان خطیب ہیں۔ اُن کی شاعری کی وجہ سے کچے ذہن کے نوجوان بہک رہے ہیں ــــ!"

اے قریش مکہ! شاعر تو دُنیا میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ کیا کوئی ایسا انوکھا شاعر کبھی پیدا ہوا۔ جو اس بے داغ سیرت اور عظیم کردار کا حامل ہو۔ جس کا مظاہرہ محمدؐ اور آپ کے رفقاء کر رہے تھے۔ کیا شاعری کے طلسم باندھنے والوں نے کبھی ایسی دینی مہمات بھی برپا کی ہیں جیسی تمہارے سامنے ہو رہی تھیں؟

قریش کے سامنے بھی یہ سوال تھا۔ اس کا جواب دینے کے لئے انہوں نے آنحضور صلعم پر کہانت کا ایک اور الزام باندھا۔ کاہن لوگ کچھ مذہبی انداز واطوار رکھتے تھے۔ ایک عجیب پُر اسرار سی فضا بناتے تھے۔ چلّوں اور اعتکافوں اور وظیفوں اور منتروں میں اُن کی زندگی گزرتی تھی۔ مراقبوں اور مکاشفوں اور فال گیریوں کے ذریعہ ایک ٹیکنیکل زبان میں غیب کے اسرار لوگوں کو بتلاتے تھے۔ عام لوگوں سے کچھ انوکھے سے انداز واطوار رکھتے تھے۔ کچھ مجذوبانہ سی شان ہوتی تھی۔ کاہن کہنے سے قریش کا مدعا یہی تھا کہ آنحضورؐ نے بھی بس اسی طرح کا ایک ڈھکوسلہ بنا رکھا ہے۔ تاکہ لوگ آئیں۔ مُرید بنیں اور پھر کہانت کا سکّہ رواں ہو۔ اور پیٹ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ (معاذ اللہ)

اور قرآن اس سارے پروپیگنڈے کی دُھواں دھاریوں کو محیط ہو کر آسمانی بلندیوں سے پکار رہا تھا کہ:-

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ! قَلِيلًا مَا تُؤْمِنُونَ ۝
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ! قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ ۝

یہ شاعری نہیں ہے، مگر اُفتاد تو یہ آپڑی کہ تم نے ایمان ویقین کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ یہ کہانت نہیں۔ مگر رکاوٹ یہ ہوئی کہ تم نے غور وفکر نہ کرنے اور کسی قسم کا سبق نہ لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔

اس طوفانِ بدتمیزی پر قرآن نے چار لفظوں میں کیا ہی شاندار تبصرہ آنحضورؐ کو مخاطب کرکے کیا کہ:-

"اُنظر! کیف ضربوا لک الامثال"! (الفرقان)

یعنی یہ لوگ کیسے کیسے محاورے اور فقرے چُست کرتے ہیں۔ کیسے کیسے نام دھرتے ہیں۔ کیا کیا تشبیہیں نکالتے ہیں اور کہاں کہاں سے اصطلاحیں ڈھونڈتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کرکے پھر نتیجہ کیا پاتے ہیں؟ "فَضَلُّوا" یعنی اپنے ہی آپ کو گمراہی میں ڈالتے ہیں۔

دیکھئے اب ایک اور شوشہ تراشا جاتا ہے۔ دین ابراہیمی کے نام لیوا فرماتے ہیں کہ:۔

"یہ کوئی جن ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آتا ہے اور وہ آکر عجیب عجیب باتیں سناتا ہے۔ یا یہ کہ وہ لکھا پڑھا جاتا ہے۔" کبھی مکہ کے ایک رومی ونصرانی غلام (جابر یا جبیر یا جبر) کا نام لیا جاتا۔ جو آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کی باتیں سُنتا۔ کہ یہ جاتا ہے اور تنہائی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ وعظ اور لیکچر نوٹ کراتا ہے۔"

ایک موقع پر وفد اکابر قریش نے خود آنحضورؐ سے کہا کہ:۔

انہ قد بلغنا انک انما یعلمک ھذا رجل بالیمامۃ یقال لہ الرحمٰن وانا واللہ لانؤمن بالرحمٰن۔ (ہشام جلد ا صفحہ ۳۱۷)

ان ہوائی شوشوں سے یہ ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ یہ کسی بیرونی طاقت اور کسی غیر شخص کی شرارت ہے جو ہمارے مذہب اور معاشرے کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ اور محمدؐ ابن عبداللہ تو محض آلہ کار ہے۔ یہ کسی طرح کی سازباز ہے۔ دُوسری طرف اس میں یہ تاثر بھی شامل تھا کہ کلام کا یہ حُسن وجمال نہ محمدؐ کا کمال ہے۔ نہ خدا کی عطا وبخشش۔ یہ تو کوئی اور ہی طاقت گُل کھلا رہی ہے۔ تیسری طرف اس کے ذریعہ کذب اور افترا علی اللہ کا الزام بھی داعئ حق پر چسپاں ہو رہا تھا۔ اس کے جواب میں قرآن نے تفصیلی استدلال کیا ہے۔ مگر اس کا چیلنج قطعی طور پر مسکت ثابت ہوا کہ انسانوں اور جنوں کی مشترکہ مدد سے تم اس طرح کی کوئی سورہ یا ایسی چند آیات ہی بنا کر لاؤ۔

ضمناً ایک دعویٰ یہ بھی سامنے آیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے۔ اصل میں پُرانے قصّے کہانیاں ہیں جن کا مواد کہیں سے جمع کرکے زوردار زبان میں ڈھالا جا رہا ہے۔ یہ ایک طرح کی افسانہ طرازی اور داستان گوئی ہے۔ اور جس طرح داستان گو محفل پر چھا جاتا ہے۔ اسی طرح محمدؐ چٹپٹے انداز سے قصّے سُنا سُنا کر داد لے رہا ہے۔ دعوتِ حق پر "اساطیر الاولین" کی پھبتی کسنے میں یہ طنز بھی شامل تھا کہ اگلے وقتوں کی ان باتوں کے ذریعہ آج کے مسائل کی عقدہ کشائی کہاں ہو سکتی ہے۔ زمانہ کہیں سے کہیں آ پہنچا! اگلے وقتوں کی کہانیاں اس میں انسان کا کیا کام بنا کے دے سکتی ہیں!

کمال یہ ہے کہ ایک طرف یہ الزام دیا جا رہا تھا کہ اسلاف کے سکّہ بند دین کے بالمقابل نئی باتیں گھڑی جا رہی ہیں۔ دوسری طرف بالکل متضاد قسم کا یہ طعنہ کہ گڑے مُردے اکھیڑ کر لائے جا رہے ہیں۔ ہمیشہ غیر مخلص اشرار کا حال یہی رہا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کبھی ایک پہلو سے آکر ایک نکتہ چھانٹتے ہیں اور کبھی دوسرے رُخ سے یورش کر کے دُوسرا برعکس قسم کا اعتراض لا چپکاتے اور نہیں دیکھتے کہ خود اپنی تردید آپ کر رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک محاذ شعراء کا قائم کیا گیا تھا۔ ابوسفیان بن حارث، عمرو بن عاص اور عبداللہ بن زبعری اس مہم پر مامور کئے گئے کہ وہ آنحضورؐ کے خلاف گندی ہجویہ نظمیں کہیں اور ان کو نشر کریں۔ واضح رہے کہ شعراء کا بڑا اثر جاہلی سوسائٹی پر تھا۔ یہ لوگ گویا ذہنی رہنمائی اور تربیت کے منصب پر فائز تھے اور ان کے مُنہ کا ایک ایک بول دلوں میں گھر کرتا تھا۔

اور اُسے یاد کر کر کے پھیلایا جاتا تھا۔ یوں سمجھئے کہ شعراء اس دور میں تقریباً آج کے صحافیوں کی پوزیشن میں تھے۔ جس طرح آج ایک ماہرِ فن صحافی اگر اپنے قلم اور اخبار کی طاقت کے بل پر کسی کے پیچھے پڑ جائے تو اپنے شذرات سے اور مذاکاہی بچو نگاری سے اور مراسلات کے کالموں کے غیر شریفانہ استعمال سے خبروں کا بلیک آؤٹ کرنے اور بیانات کی کتر بیونت کرنے اور گمراہ کُن سرخیاں جمانے سے وہ کسی دعوت اور جماعت اور تحریک کے لئے بھاری مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ ٹھیک یہی مقام شعرائے عرب کا تھا۔ وہاں ایک سے زیادہ شعراء اس کام پر لگا دیئے گئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی تحریک و دعوت کو گلی گلی بدنام کرتے پھریں اور مقفیٰ و مسجع گالیاں نشر کریں۔ بالکل یہ سماں تھا کہ جیسے ذہنی و فکری دُنیا میں ایک شریف راہ گیر کے پیچھے کتے لگا دیئے گئے ہوں۔ لیکن محسنؐ انسانیت کا پیغام اور کردار بجائے خود شاعروں کے جادو کا کامیاب توڑ تھا!

واضح رہے کہ یہ ساری مہم کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ سوچی سمجھی ہوئی شرارت کے طور پر چلائی جا رہی تھی۔ انہوں نے مل کر یہ قرار داد طے کی تھی کہ:۔

لَا تَسْمَعُوا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (حٰمٓ السجدۃ۔ ۲۶)

یعنی داعی کی بات سنو ہی نہیں۔ اس پر غور کرو ہی نہیں۔ کہیں خیالات میں تزلزل نہ آ جائے۔ کہیں ایمان نہ خراب ہو جائے۔ ہاؤ ہُو کا خوب شور مچا کر اس میں رخنہ اندازی کرو۔ اور اُس میں گڑبڑ ڈالو اور اسے مذاق پر دھر لو۔ اس طرح سے قرآن کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اور آخری فتح تمہاری ہوگی۔

اس آیت کے اندر مطالعہ کیجئے۔ حق کی مخالفت کرنے والی طاقتوں کی نفسیات کا۔ وہ بات کو سمجھنے اور سننے سے بے نیاز ہو کر اور دُوسروں کو بھی سننے سمجھنے سے روک کر ہنگامہ آرائی کرتی ہیں۔ ایسے ذہنوں سے ہمارے محسن اور محبوب رہنما کا سابقہ پڑا تھا!

عاص بن وائل السہمی نے آنحضورؐ کی دعوت و تحریک کی تحقیر کرتے ہوئے یہ زہریلے کلمات کہے:۔

دَعُوْهُ فَاِنَّمَا هُوَ رَجُلٌ اَبْتَرُ لَا عَقِبَ لَهٗ۔ لَوْمَاتَ لَانْقَطَعَ ذِكْرُهٗ وَاسْتَرَحْتُمْ مِنْهُ[لہ]

یعنی یہ کہ گیا ہے میاں! چھوڑ دو اسے اس کے حال پر۔ وہ تو ایک لنڈ منڈ آدمی ہے۔ کوئی اس کے پیچھے رہنے والا نہیں۔ اُس کے مرتے ہی اس کی یاد تک فراموش ہو جائے گی۔ اور تم اس کے جھنجھٹ سے نجات پا کر امن چین سے رہنا۔

طعنہ دیا گیا تھا آنحضورؐ کی اولادِ نرینہ نہ ہونے پر۔ اور عرب میں فی الواقع یہ طعنہ کچھ معنی رکھتا تھا۔ مگر عاص جیسوں کی نگاہیں یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ انبیاء جیسی تاریخ ساز ہستیوں کی اصل اولاد اُن کے عظیم الشان کارنامے ہوتے ہیں۔ اُن کے دماغوں سے نئے ادوار و تہذیب جنم لیتے ہیں اور اُن کی دعوت و تعلیم کی وراثت سنبھالنے اور اُن کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اُن کے رفقاء اتباع گروہ در گروہ موجود ہوتے ہیں۔ وہ جس خیر کثیر کو لے کے آتے ہیں اس کی طاقت اور اس کی قدر و قیمت

لہ ابن ہشام۔ جلد اول صفحہ ۴۲۲۔

کسی کی اولادِ نرینہ کے بڑے سے بڑے لشکر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طعنہ کے جواب میں سورۂ کوثر نازل ہوئی۔ جس میں عاص اور اس کے ہم کیشوں کو بتایا گیا کہ ہم نے اپنے نبی کو "کوثر" عطا کیا ہے۔ اُسے خیر کثیر کا سرچشمہ بنایا ہے۔ اُسے قرآن کی نعمتِ عظمیٰ دی ہے۔ اُسے ایمان لانے والوں اور اطاعت کرنے والوں اور اس کے کام کو پھیلانے اور جاری رکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت دی ہے اور اس کے لئے عالمِ آخرت میں حوضِ کوثر کا تحفہ مخصوص کر رکھا ہے۔ جس سے ایک بار اگر کسی کو اذنِ نوش مل گیا تو وہ ابد تک پیاس نہ محسوس کرے گا! پھر فرمایا کہ اے نبی! ابتر تو ہیں تمہارے دشمن کہ جن کا بہ اعتبارِ حقیقت کوئی نام لیوا اور پانی دیوا نہیں۔ اور جن کے مرجانے کے بعد کوئی بھول کے یاد بھی نہیں کرے گا کہ فلاں کون تھا اور جن کے لئے تاریخ انسانی کے ایوان میں کوئی جگہ نہیں ہے!

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرگرم ترین مستہزئین مکہ کی فہرست پیش کر دی جائے۔ بنو اسد میں سے اسود بن المطلب۔ بنو زہرا بن کلاب میں سے اسود بن عبد یغوث۔ بنی مخزوم میں سے ولید بن المغیرہ۔ بنو سہم میں سے عاص بن وائل۔ بنو خزاعہ میں سے حارث بن طلہ! یہ لوگ طنز و استہزاء اور دشنام طرازی کے محاذ کے سپہ سالار تھے!

(۱۲)

استہزاء اور تنابز بالالقاب کے ساتھ ساتھ کٹ حجتیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا۔ جو لوگ کہ آنکھوں دیکھے ایک امرِ حق کو نہیں جاننا چاہتے تو اپنے اور داعی کے درمیان طرح طرح کے "نکتے" اور لطیفے اور باتوں میں سے باتیں نکال نکال کر ایک سنگین دیوار چنتے رہتے ہیں۔ اس بودی دیوار کا ہر ردّہ رکھتے ہی گر پڑتا ہے۔ معاندین اور اینٹ گارا لاتے ہیں۔ پھر ساری مزدوری برباد جاتی ہے۔ لیکن نہ وہ اپنا کچھ بنا سکتے ہیں نہ دوسروں کی کوئی تعمیری خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ وہ سوال اور اغراض بالکل اور مزاج کا ہوتا ہے جو اخلاص کی اسپرٹ کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اور وہ سوال اور اغراض بالکل دوسری ساخت رکھتا ہے جو شرارتاً سے داعی کا راستہ روکنے کے لئے گھڑا جاتا ہے۔ اس دوسری صورت کو کٹ حجتی کہتے ہیں اور کٹ حجتی ہمیشہ بے ایمانی اور شرارت اور فتنہ پسندی کی گواہی دیتی ہے۔ اسلاف کی کٹ حجتی کرنے والے ذہن کا انداز یہ ہوتا ہے کہ دعوت سے کوئی سبق اخذ نہیں کرنا ہے۔ بلکہ کاوش کر کے کوئی نہ کوئی ٹیڑھ نکالتے رہنا ہے۔ "یبغونہا عوجاً" (ہود - ۱۹ و دیگر مقامات)

سکہ بند مذہبیت کے یہ محافظین کرام آنحضورؐ سے ایک تو بار بار یہ پوچھتے تھے کہ تم اگر نبی ہو تو آخر کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ تمہارے نبی ہونے کی کوئی واضح نشانی تمہارے ساتھ ہو۔ کوئی ایسا معجزہ ہو جسے دیکھنے والوں کے لئے نبوت ماننے بغیر چارہ ہی نہ رہے۔ لولا انزل علیہ آیۃٌ من ربہ ؟ (قصص - ۵۰ و دیگر مقامات)

پھر وہ مسمسی صورتیں بنا کر کہتے کہ:-

لولا اُنزل علینا ملٰئکۃٌ او نریٰ ربنا ؟ (الفرقان - ۲۱)

یعنی یہ بحث و استدلال کی کیا ضرورت، سیدھی طرح آسمان سے فرشتوں کے جھنڈ اتریں ہمارے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیں اور خدا تمہارے ذریعہ پیغام بھیج کر اپنے آپ کو منوانے کے بجائے خود ہی کیوں نہ ہمارے سامنے آجائے۔ اور ہم دیکھ لیں کہ یہ ہے ہمارا رب ——— جھگڑا ختم ہو جائے۔

پھر وہ یہ کہتے کہ جو کچھ تم پیش کر رہے ہو یہ اگر واقعی خدا کی طرف سے ہوتا تو چاہئیے یہ تھا کہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہمارے

دیکھتے دیکھتے آسمان سے اُترتی۔ بلکہ تم خود سیڑھی کے ذریعہ کتاب لئے ہوئے اُترتے اور ہم سر تسلیم خم کر دیتے۔ کہ تم سچے نبی ہو۔

اسی سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی اُٹھایا جاتا تھا کہ قرآن خطبہ بہ خطبہ اور قطعہ بہ قطعہ کیوں نازل ہوتا ہے۔ سیدھی طرح ایک ہی بار پوری کی پوری کتاب کیوں نہیں نازل ہو جاتی۔ در اصل انھیں یہ صورت بڑی کھلتی تھی کہ جتنے سوال وہ اٹھاتے تھے۔ جو جو شرارتیں کرتے تھے۔ جس جس پہلو سے مین میخ نکالتے تھے۔ اس پر وحی کے ذریعہ حسب موقع تبصرہ ہوتا۔ اس کا تجزیہ کیا جاتا اور پورے زورِ استدلال سے اُن کی مخالفانہ کاوشوں کی جڑیں کھود دی جاتیں!

پھر وہ یہ کٹ حجتی کرتے کہ تم جو گوشت پوست کے بنے ہوئے ہماری طرح کے ایک آدمی ہو۔ تمہیں بھوک لگتی ہے۔ معاش کے درپے ہو۔ روٹی کھاتے ہو۔ گلیوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو۔ بھٹے حالوں رہتے ہو۔ تمہارے اوپر طرح طرح کی زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ کیسے یہ بات عقل میں آئے کہ تم اللہ کے پیارے اور اس کے معتمد نمائندے اور دُنیا کی اصلاح کے ذمہ دار بنا کے بھیجے گئے ہو۔ تم واقعی اگر ایسے چیدہ روزگار ہوتے تو فرشتے تمہارے آگے آگے ہٹو بچو کی صدا لگاتے۔ باڈی گارڈ بن کر ساتھ چلتے۔ جو کوئی گستاخی کرتا لٹھ سے اس کا سر پھوڑ دیتے۔ چشم سر سے تمہاری یہ شان اور یہ ٹھاٹ دیکھ کر ہر آدمی بے چون و چرا مان لیتا کہ اللہ کا پیارا اور نبی ہے! اتنا نہیں تمہارے لئے آسمان سے خزانہ اُترتا اور اس خزانہ کے بل پر تم شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ عیش کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ تمہارے بسنے کے لئے سونے کا ایک محل ہوتا۔ تمہارے لئے کوئی چشمہ جاری ہوتا۔ کوئی نہر بہائی جاتی۔ تمہارے پاس پھلوں کا کوئی اعلیٰ درجہ کا باغ ہوتا۔ آرام سے بیٹھے اس کی کمائی کھاتے۔ اس نقشہ کے ساتھ تم نبوت دعویٰ لیکے اُٹھتے تو ہم سب بسر و چشم مانتے کہ واقعی یہ کوئی منتخب زمانہ اور مقبولِ ربانی ہستی ہے۔ برخلاف اس کے حال یہ ہے کہ ہم لوگ کیا مال کے لحاظ سے، کیا اولاد کے لحاظ سے۔ تم سے منزلوں آگے ہیں۔ اور تمہارا حال جو کچھ ہے وہ سامنے ہے۔ ایک تم ہی نہیں تمہارے ارد گرد جو ہستیاں جمع ہوتی ہیں۔ وہ سب ایسے لوگ ہیں جو ہماری سوسائٹی کے سب سے نچلے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور کوتاہ نظر اور کم علم ہیں۔ تم لوگوں کو ہمارے مقابلے میں کوئی بھی تو وجہ فضیلت حاصل نہیں۔ بتاؤ، اے محمدؐ! کہ ایسی صورت میں کوئی معقول آدمی کیسے تمہیں آدمی مان لے!

چنانچہ حال یہ تھا کہ جدھر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوتا۔ پھبتیاں کسی جاتیں کہ:-

أَهٰذَا الَّذِي بَعَثَ اللّٰهُ رَسُولًا۔ (الفرقان - ۴۱)

یعنی انگلیاں اُٹھا اُٹھا کر اور اشارے کر کر کے غنڈوں کا سا مذاق رکھنے والے اہلیانِ مکہ کہتے کہ ذرا دیکھنا ان صاحب کو یہ ہیں جن کو اللہ نے رسول مقرر فرمایا ہے! خدا کو کسی آدم زاد ہی سے رسالت کا کام لینا ہی تھا تو کیا لے دے کے یہی شخص رہ گیا تھا! کیا حسن انتخاب ہے! اسی طرح اسلامی تحریک کے علمبرداروں پر بہ حیثیت مجموعی یہ فقرہ چست کیا جاتا تھا کہ:-

"أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ مِن بَيْنِنَا؟"

یہ ہیں وہ ممتاز ہستیاں جنہیں اللہ نے مراتب خاص نوازنے کے لئے ہمارے اندر سے چھانٹ لیا ہے!

پھر کہا جاتا کہ اے محمدؐ! وہ جس عذاب کی روز روز تم دھمکیاں دیتے ہو۔ اور جس کے ذریعہ اپنا اثر جمانا چاہتے ہو۔ اُسے لے کیوں نہیں آتے؟ "مَا يَحْبِسُهُ" اُسے آخر کس چیز نے روک رکھا ہے؟ چیلنج کر کر کے کہتے کہ:-

فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَاءِ إِن كُنتَ مِنَ الصَّادِقِينَ۔ (الشعراء - ۱۸۷)

کیوں نہیں تم آسمان کا کوئی ٹکڑا توڑ گراتے ہم جیسے نافرمان کافروں پر؟ اگر تم سچے ہو تو ہمارا خاتمہ کر ڈالو بطور جنہ یہ عاکرکے

اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء
او ائتنا بعذاب الیم ۔ (الانفال - ۳۲)

پھر یہ دینِ اسلاف کے ٹھیکیدار یہ نکتہ چھانٹتے کہ :-

اے محمد! جب تم بتاتے ہو کہ خدا قادر و صاحبِ اختیار اور قاہر و جبار ہے تو کیوں نہیں وہ ہم کو اپنی طاقت کے زور سے اس ہدایت کے راستے پر چلاتا کہ جس پر چلنے کے لئے تم ہمیں کہتے ہو۔ وہ ہمیں موحد اور نیک دیکھنا چاہتا ہے تو پھر ہمیں موحد بنادے اور نیکی پر چلادے۔ اس کو کس نے روک رکھا ہے۔ وہ ہمیں بتوں کو نہ پوجنے دے۔ وہ ہمیں شرک نہ کرنے دے۔ وہ ہمیں بدعقیدہ نہ بننے دے۔ جب وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ ہمیں محجوب رکھتا ہے اور ہماری موجودہ روش اسے گوارا ہے تو پھر بیچ میں تم کون ہوتے ہو دخل دینے والے۔ مدعی سست، گواہ چست والی بات ہے!

اسی طرح وہ قیامت کا مذاق اڑاتے۔ چھوٹے بڑے ڈرامائی انداز میں دریافت کرتے کہ ذرا یہ تو فرمائیے کہ یہ حادثہ کب واقع ہونے والا ہے؟ "متیٰ ھٰذا الوعد" کچھ اتا پتا دیجئے کہ اس اعلان کو کب پورا ہونا ہے؟ "ایان مرسٰھا" قیامت کب تک آپہنچنے والی ہے؟ کیا کوئی تاریخ اور کوئی گھڑی معین نہیں ہوئی؟

ان چند مثالوں سے جن کی تفصیل قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ دنیا کے سب سے بڑے محسن اور انسانیت کے عظیم ترین خیر خواہ کو کیسی فضاء سے سابقہ آپڑا تھا۔ نہایت گھٹیا مذاق کے لوگ چاروں طرف سے طنز آمیز اسلوب کے ساتھ نکتے چھانٹ رہے ہیں۔ مناظرانہ انداز سے سوال گھڑ گھڑ کر ڈال رہے ہیں۔ اور آنحضور ہیں کہ مین میخ نکالنے والوں کے ہجوم میں نہایت ہی شریفانہ اور مہذب اور ٹھنڈے اور سنجیدہ انداز سے اپنی دعوت پر استدلال کر رہے ہیں۔ جواباً کوئی مذاق نہیں کرتے۔ طعنے نہیں دیتے۔ مناظرانہ رنگ اختیار نہیں کرتے۔ برافروختہ نہیں ہوتے۔ لیکن ایک لمحہ کے لئے استدلال کا محاذ اور دعوت کا میدان چھوڑ کر پیچھے بھی نہیں ہٹتے!

لیکن استہزاء اور کٹ حجتیوں کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے آنحضورؐ پر نفسیاتی کرب کے جو لمحہ گزرے ہیں اور جس طرح آپ کڑھے اور گھٹے ہیں۔ ان سارے احوال کا قرآن میں پورا پورا عکس ملتا ہے۔ عالمِ بالا کی طرف سے یقین دہانی کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلمات سے خود سامانِ تسکین فرماتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اس مرحلے سے گزرنے کے لئے بار بار ہدایات دی جاتی ہیں۔ مثلاً ایک جامع ہدایت یہ آئی کہ:-

خذ العفو وامر بالمعروف واعرض عن الجاھلین ۔ (الاعراف - ۱۹۹)

یعنی یہ کہ اعصاب کو جھنجھوڑ دینے والے اور دل و جگر کو چھید ڈالنے والے اس دور کے لئے آنحضورؐ کو تین تقاضوں کا پابند کر دیا گیا۔

(۱) ایک یہ کہ بدزبانیوں سے بے نیازی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ ان کا کوئی جواب نہیں دیا جائے گا۔

(۲) دوسرے یہ کہ حق بات کہنے کی ذمہ داری ہر حال میں پوری کی جائے گی۔

(۳) تیسرے یہ کہ کینہ اور بداخلاق اور جہالت زدہ اشخاص کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں!

اور قرآن اور تاریخ دونوں گواہ ہیں کہ آنحضورؐ نے ان ہدایات کی حدود سے بال برابر تجاوز کئے بغیر یہ پورا دَور گزار دیا۔ اپنی جان گھُلائی اور اپنے سینہ میں گھٹن محسوس کی۔ "فلعلک باخع نفسک"۔ ھود۔ ۱۲۔ لیکن نہ اپنی زبان میں کوئی بگاڑ آنے دیا۔ نہ اپنے داعیانہ کردار کی بلندی میں فرق آنے دیا۔ نہ استدلال کی سنجیدگی میں کمی گوارا کی۔ خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں آپؐ کی روحِ پُرانوار اور آپ کے متبعین پر! یوں ان گٹ مجبوریں ہیں جہاں کوئی استدلال ۔ خواہ وہ تیسرے درجہ کا کیوں نہ ہو۔ پایا گیا اُس کا آپ کی زبان سے ۔۔ آپ ہی نے پورا پورا قلع قمع کر کے چھوڑا۔

(۱۳)

استہزا، دشنام طرازیوں اور کٹ حجتیوں کے حملوں کے دوران میں کبھی کبھی قریش کو سوچ بچار سے کوئی عقلی قسم کی دلیل بھی ہاتھ آجاتی تھی۔ مگر ایسے عقلی استدلال کا تناسب پُورے ہنگامہ مخالفت میں آٹے میں نمک کا سا تناسب رکھتا تھا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ ہم کب بُتوں کو خداوند تعالیٰ کے مقام پر رکھتے ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہتے ہیں کہ یہ جن بزرگوں کی ارواح کے مظہر ہیں۔ وہ اللہ کے دربار میں ہمارے لئے سفارش کرنے والے ہیں۔ اور ان بتوں کے آگے سجدہ و قربانی کر کے ہم صرف اللہ کے حضور تقرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارے نزدیک زندگی صرف اسی دُنیا کی زندگی ہے۔ کوئی اور عالم پیش آنے والا نہیں ہے۔ اور نہ ہمیں دوبارہ زندہ کیا جانے والا ہے۔ پھر آخر ہم ایک ایسے دین کو کیونکر تسلیم کریں جو کسی دُوسری دُنیا کا تصوّر لاکر اس دُنیا کے مفاد اور اس کی دلچسپیوں سے ہمیں محروم کرنا چاہتا ہے!

اسی طرح ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہم دعوتِ محمدیؐ کو مان لیں اور موجودہ مذہبی و معاشرتی نظام کو ٹوٹ جانے دیں۔ اور اپنے قائم شدہ تسلط کو اُٹھا لیں تو پھر تو ہم میں سے ایک ایک شخص کو دن دہاڑے چُن چُن کر اُچک لیا جائے گا۔
نتخطف من ارضنا۔ (القصص۔ ۵۷)

یہ دو تین مثالیں اس امر واقعہ کو عرض کرنے کے لئے مجملاً لے لی گئی ہیں کہ شرارتوں اور خباثتوں کے بیچ بیچ میں وہ کچھ نہ کچھ دلیل بازی بھی کرتے جاتے تھے۔ لیکن اس دلیل بازی کا تار تار قرآن الگ کر کے رکھ دیتا تھا۔ اور اس کی ہر موقع پر دھجیاں اُڑتی رہتی تھیں!

(۱۴)

استہزا، القاب طرازی اور گالم گلوچ کی یہ مہم قریش کے جنونِ مخالفت کے تیز ہونے کے ساتھ ساتھ غنڈہ گردی کا رنگ اختیار کرتی چلی جارہی تھی۔ منفی شرارت کے علمبردار جب تضحیک و دشنام کو ناکام ہوتے دیکھتے ہیں تو پھر اُن کا اگلا قدم ہمیشہ غنڈہ گردی ہوتا ہے۔ مکہ والوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لئے وہ کمینہ حرکتیں کی ہیں کہ صاحبِ رسالت کے علاوہ کوئی اور داعی ہوتا تو بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے باوجود اس کی ہمت ٹوٹ جاتی اور وہ قوم سے مایوس ہو کر بیٹھ جاتا لیکن رسُولِ خدا کی شرافت و سنجیدگی غنڈہ گردی کے چڑھے ہوئے دریاؤں سے بھی پاکئ دامن کو کنول کی طرح صحیح سلامت لئے آگے ہی آگے بڑھتی جارہی تھی!

وہ حرکات جو بالکل روزمرہ کا معمول بن گئیں یہ تھیں کہ آپ کے محلہ دار اور پڑوسی جو بڑے بڑے سردار تھے۔ بڑے

اہتمام سے آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ نماز پڑھتے وقت شور مچاتے اور ہنسی اُڑاتے۔ عین حالتِ سجدہ میں اوجھڑیاں لا کے ڈالتے۔ چادر کو لپیٹ کر گلا گھونٹتے۔ محلے کے لونڈوں کو پیچھے لگا دیتے کہ تالیاں پیٹیں اور غوغا کریں۔ قرآن پڑھنے کی حالت میں آپؐ کو اور قرآن کو اور خدا تعالیٰ کو گالیاں دیتے!

اس معاملہ میں ابولہب کے ساتھ ساتھ بیگم ابولہب بہت پیش پیش تھی۔ وہ بلاناغہ کئی سال تک آپؐ کے راستہ میں غلاظت اور کوڑا کرکٹ اور کانٹے جمع کرکر کے ڈالا کرتی تھی۔ اور آنحضورؐ روزانہ بڑی محنت سے راستہ صاف کرتے۔ آپؐ کو اس کمبخت نے اس درجہ پریشان رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی تسکین کے لئے یہ خوشخبری سنائی کہ مخالف محاذ کی اس لیڈرہ کے شوہر نامدار کے ایذا رساں ہاتھ ٹوٹ جانے والے ہیں اور خود یہ بیگم صاحبہ بھی دوزخ کے حوالے ہونے والی ہیں!

ایک مرتبہ حرم میں خدا کا رسولؐ مصروفِ نماز تھا کہ عقبہ بن معیط نے چادر آپؐ کے گلے میں ڈالی اور اُسے خوب مروڑ کر گلا گھونٹا۔ یہاں تک کہ آپؐ گھٹنوں کے بل گر پڑے[1] اس شخص نے ایک مرتبہ حالتِ نماز میں آپؐ پر اوجھ بھی ڈالی تھی۔

ایک مرتبہ آپؐ راستہ چلتے جا رہے تھے کہ کسی شقی نے سر پر مٹی ڈال دی۔ اسی حالت میں یہ مجسمۂ صبر و استقامت چپ چاپ گھر پہنچا۔ معصوم بچی فاطمہؓ نے دیکھا تو آپؐ کا سر دھوتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ مارے غم کے روتی جاتی تھیں آپؐ نے اس ننھی سی جان کو تسلی دی کہ "جانِ پدر! رو نہیں۔ خدا تیرے باپ کو بچائے گا!"[2]

ایک مرتبہ آپؐ حرم میں مصروفِ نماز تھے کہ ابوجہل اور چند اور رؤسائے قریش کو توجہ ہوئی۔ ابوجہل کہنے لگا۔

"کاش اس وقت کوئی جاتا اور اُونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھا لاتا تاکہ جب
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدے میں جاتا تو اس کی گردن پر ڈال دیتا"۔

عقبہ نے کہا کہ یہ خدمت انجام دینے کے لئے بندہ حاضر ہے۔ اوجھ لائی گئی۔ ان بزرگوں کے ذوقِ غنڈہ گردی نے واقعی اسے آپؐ کے اوپر حالتِ سجدہ میں ڈال کر دم لیا۔ اب ٹھٹھے مار مار کر ہنسی اُڑائی جا رہی تھی۔ حضرت فاطمہؓ کو اطلاع ہوئی تو آپ دوڑی آئیں اور پاکباز باپ کی معصوم بچی نے وہ سارا بارِ غلاظت آپؐ کے اُوپر سے ہٹایا۔ ساتھ ساتھ عقبہ کو بددعائیں بھی دیتی جاتی تھیں[3]

یہ تھا جواب اس خیر خواہانہ نصیحت کا کہ ایک خدا کو مانو۔ راستی اور انصاف پر چلو۔ یتیموں اور مسافروں کی سرپرستی کرو! کانٹے بچھا کر چاہا گیا کہ تحریکِ حق کا راستہ رُک جائے۔

گندگی پھینک کر کوشش کی گئی کہ توحید اور حسنِ اخلاق کے پیغام کی پاکیزگی کو ختم کر دیا جائے۔

آنحضورؐ کو بوجھ تلے دبا کر یہ توقع کی گئی کہ بس اب سچائی سر نہ اٹھا سکے گی!

آپؐ کا گلا گھونٹ کر یہ خیال کیا گیا کہ بس اب وحیٔ الٰہی کی آواز بند ہو جائے گی!

کانٹوں سے جس کی تواضع کی گئی۔ وہ برابر پھول برساتا رہا۔ گندگی جس کے اُوپر اُچھالی گئی۔ وہ معاشرے پر مسلسل مشک و عبیر چھڑکتا رہا۔ جس پر بوجھ ڈالے گئے وہ انسانیت کے کندھے سے باطل کے بوجھ متواتر اتارتا رہا! جس کی گردن گھونٹی گئی۔ وہ تہذیب کی گردن کو رسمیات کے پھندوں سے نجات دلانے میں مصروف رہا!

---

[1] سیرت النبی۔ علامہ شبلی۔ جلد اول ص ۱۶۲۔ [2] ایضاً ص ۱۸۲۔ [3] ایضاً ص ۱۸۶۔

غنڈہ گردی ایک ثانیہ کے لئے بھی ٹھوس شرافت کا راستہ نہ روک سکی - اور شرافت اگر واقعہ میں ٹھوس عزیمت مند ہو تو تاریخ انسانی کے اٹل قوانین مقابلے میں آنے والی شدید سے شدید غنڈہ گردی کا سر نیچا دیتی ہے!

دعوتِ حق کے مخالفین جب پانی سر سے گزرتا دیکھتے ہیں تو ایک مہم یہ شروع کرتے ہیں کہ تحریک یا اس کے قائد اور علمبرداروں کو سوسائٹی میں ہر قسم کی مؤثر حمایت و ہمدردی سے محروم کر دیا جائے - براہ راست اثر نہ ڈالا جا سکے - تو بالواسطہ طریق سے دباؤ ڈال کر تبدیلی کے سپاہیوں کو بے بس کر دیا جائے!

اہلِ مکہ آنحضورؐ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے - لیکن ڈرتے اس بات سے تھے کہ قبائلی عصبیت کے تحت قتل و خونریزی کی ایسی آگ بھڑک اٹھے گی کہ کسی کے روکے نہ رکے گی - اور ماضی قریب میں ایک ہمہ گیر جنگ اُن کو ایسا جھنجھوڑ چکی تھی کہ وہ ایسی ایک اور جنگ کے لئے تیار نہ تھے - بیچ میں ایک پیچ اور بھی آپڑا تھا - بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان پرانی رقابت تھی - بنو امیہ کے سردار اور صنادید ہرگز اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ بنو ہاشم کے گھرانے کے ایک شخص کی نبوت چلے - اور اس طرح اُن کا سکہ رواں ہو جائے - چنانچہ بنو ہاشم نے ایک دو بار یہ ارادہ کیا بھی کہ محمدؐ ہمارے ہیں اور اُن کی بڑائی اور اُن کے ذہن کا فروغ ہمارے ہی لئے موجب خیر و برکت ہو گا - لہذا کیوں نہ ہم کھل کر ساتھ دیں - مگر بنو امیہ کے لیڈروں نے اُن کو اس ارادے سے ہمیشہ باز رکھنے پر زور صرف کیا - بنو ہاشم مثبت طور پر تو کچھ نہ کر سکے - لیکن اُن کے ایک فرد پر ہاتھ اٹھانا بہرحال سہل نہ تھا - تاوقتیکہ وہ اس کو اپنے دائرے سے نکال نہ دیں - ادھر داعیٔ حق اپنے چچا ابو طالب کی سرپرستی میں تھا - اور یہ سرپرستی جب تک قائم تھی - گویا پورے ہاشمی قبیلہ کی عصبیت آنحضورؐ کے ساتھ تھی - مخالفینِ دعوت نے اب پورا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ کسی طرح ابو طالب پر دباؤ ڈال کر آنحضورؐ کو اس کی سرپرستی سے محروم کرایا جائے دباؤ ڈالنے کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا - مگر مخالفین کو ہر بار ناکامی ہوئی!

ربیعہ کے دونوں بیٹے عتبہ اور شیبہ - ابو سفیان بن حرب - ابو البختری - اسود بن عبد المطلب - ابو جہل - ولید بن مغیرہ - حجاج بن عامر کے دونوں بیٹے نُبَیہ اور مُنَبہ اور عاص بن وائل جیسے اکابرین کا ایک زوردار وفد آنحضورؐ کے چچا کے پاس پہنچتا ہے - یہ لوگ اپنا مدعا یوں بیان کرتے ہیں:-

> "اے ابو طالب! تیرا بھتیجا ہمارے خداوندوں اور ٹھاکروں کو گالیاں دیتا ہے - ہمارے مذہب میں عیب چھانٹتا ہے - ہمارے بزرگوں کو احمق کہتا ہے اور ہمارے اسلاف کو گمراہ کہتا ہے - اب یا تو تم اس کو ہمارے خلاف ایسی زیادتیاں کرنے سے روکو - یا ہمارے اور اس کے درمیان سے تم نکل جاؤ - کیونکہ تم بھی عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے ہماری طرح اس کے خلاف ہو - پھر ہم اس سے نمٹ لیں گے" [1]

ابو طالب نے ساری گفتگو ٹھنڈے دل سے سُنی اور نرمی سے سمجھا بجھا کر معاملہ ٹال دیا اور وفد کو رخصت کر دیا - آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اپنے مشن کی خدمت میں لگے رہے - اور قریش پیچ و تاب کھاتے رہے - اہلِ وفد کی اس تقریر کو غور سے پڑھئے - اس میں بڑی گہری جذباتیت پائی جاتی ہے - اس میں بڑی زوردار اپیل ہے اور خاص بات

---

[1] ابن ہشام جلد اول ص ۲۷۷ -

یہ کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مخالفینِ حق نے عوامی ماحول میں اشتعال پیدا کرنے کی تدبیریں شروع کردی تھیں۔ ایسے نعرے اور الزامات بہم پہنچا لئے تھے کہ جنہیں سنتے ہی عام لوگ آپے سے باہر ہوجائیں اور رسول اللہ کے خلاف ایک حالتِ اشتعال میں مبتلا ہوجائیں۔ تاریخ مذہبیات میں جب کبھی حق کے خلاف محاذ کھڑا کیا گیا ہے تو لوگوں میں اشتعال پیدا کرنے کے لئے چند مغالطہ آمیز تاثرات اُن کو ضرور دیئے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ تمہاری عقیدتوں کو مجروح کیا جارہا ہے اور تمہارے محبوبوں کو گالیاں دی جارہی ہیں!

دُوسرے یہ کہ قدیمی اور آبائی مذہب میں نقائص چھانٹے جارہے ہیں!

تیسرے یہ کہ بزرگوں اور اسلاف کی توہین کی جارہی ہے!

اشتعال پیدا کرنے کے یہ حربے تھے جن کو کفار و مشرکین میدان میں لاچکے تھے۔ آنحضورؐ کے الہامی پیغام میں اگرچہ کبھی معبودانِ قریش کو گالی نہیں دی گئی۔ لیکن ان کو معبود بنانے کے خلاف جو کچھ استدلال کیا گیا وہ پروپیگنڈے کے رنگ میں رنگ کر گالیوں کا عنوان قرار دیا گیا۔ آنحضور صلعم نے قوم کے سامنے اُن کے بزرگوں اور اسلاف کی توہین نہیں کی۔ صرف یہ کہا کہ کسی چیز کو محض اس بناء پر سینہ سے لگائے رکھنا کہ وہ پہلے سے چلی آرہی ہے۔ کوئی معقول روش نہیں ہے۔ لیکن بدگمانی کے تیزاب میں غوطہ کھا کر یہ چیز توہینِ اسلاف کے نعرے میں ڈھل گئی۔ اسی طرح آنحضورؐ نے توحید کی صداقت اور شرک کے بُطلان میں جو جو کچھ استدلال کیا اور مخالفین ہی کی طرف سے سوالات و اعتراضات اٹھائے جانے پر مروجہ مذہبیت کے بارے میں جو جو تبصرہ کیا۔ وہ قدیمی مذہبیت میں عیب چھانٹنے کے الزام کی بنیاد تھا!

لیجئے ایک اور وفد آتا ہے۔ پھر وہی رونا رویا جاتا ہے:۔

"اے ابوطالب! تم ہمارے درمیان عمر، شرف اور قدر وقیمت کے لحاظ سے ایک بڑا درجہ رکھتے ہو۔ ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ اپنے بھتیجے سے ہمیں بچاؤ۔ لیکن تم نے یہ نہیں کیا۔ اور خدا کی قسم جس طرح ہمارے باپ دادا کو گالیاں دی جارہی ہیں۔ جس طرح ہمارے بزرگوں کو احمق قرار دیا جارہا ہے اور جس طرح ہمارے معبودوں پر حرف گیری کی جارہی ہے۔ اُسے ہم برداشت نہیں کرسکتے۔ الّا آنکہ تم اُسے باز رکھو۔ یا پھر ہم اس سے بھی اور تم سے بھی لڑ پڑیں گے۔ یہاں تک کہ ایک فریق کا خاتمہ ہوجائے۔" ۵ے

ابوطالب نے آنحضورؐ کو بلایا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ پھر لجاجت سے کہا کہ "بھتیجے مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالو۔ جس کا اُٹھانا میرے بس سے باہر ہو۔" اب ایسی صورت آگئی تھی کہ پاؤں جمانے کے لئے سہارے کا جو ایک پتھر حاصل تھا وہ بھی متزلزل ہوا جاتا ہے۔ بظاہر تحریک کے لئے انتہائی خطرناک لمحہ آگیا تھا۔ لیکن دُوسری طرف دیکھئے۔ اُس جذبۂ صادقہ اور اُس عزیمتِ مجاہدانہ کو کہ جس سے سرشار ہوکر آنحضورؐ یہ جواب دیتے ہیں:۔

"چچا جان! خدا کی قسم! یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر چاہیں کہ اس مشن کو چھوڑ دو تو میں اس سے باز نہیں آسکتا۔ یہاں تک کہ

۵ے۔ سیرت ابن ہشام جلد اوّل صفحہ ۲۷۸۔

یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے یا میں اسی جد و جہد میں ختم ہو جاؤں"۔ ؎۱

یہاں وہ اصل طاقت بول رہی ہے جو تاریخ کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیتی ہے اور مزاحمتوں اور شرارتوں کو کچلتی ہوئی اپنے نصب العین تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس کہ قریش اسی طاقت کا راز نہ پا سکے۔ ابو طالب اس طاقت کی سحر آفرینی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں کہ:۔

"بھتیجے جاؤ، جو کچھ تمہیں پسند ہے اس کی دعوت دو۔ میں کسی چیز کی وجہ سے تم کو نہیں چھوڑوں گا"۔

ایک اور وفد عمارہ بن ولید کو ساتھ لے کر پھر آتا ہے۔ ابکی یہ لوگ ایک اور ہی منصوبے کے ساتھ آتے ہیں۔ ابو طالب سے کہتے ہیں کہ:۔

"دیکھئے، یہ عمارہ بن ولید ہے۔ جو قریش میں سے ایک مضبوط اور خوبصورت ترین جوان ہے اسے لے لیجئے۔ اس کی عقل اور اس کی طاقت آپ کے کام آئے گی۔ اسے اپنا بیٹا بنا لیجئے۔ اور اس کے عوض میں محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دیجئے۔ جس نے کہ آپ کے اور آپ کے آباؤ اجداد کے دین کی مخالفت شروع کر رکھی ہے۔ اور آپ کی قوم کا شیرازہ درہم برہم کر دیا ہے اور اُن کے بزرگوں کو احمق ٹھہرایا ہے۔ اسے ہم قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ سیدھا سیدھا ایک آدمی کے بدلے میں، ہم ایک آدمی آپ کو دیتے ہیں"۔ ؎۲

دیکھئے ذرا ان لوگوں کا طرزِ فکر! گویا محمدؐ جیسی عظیم ہستی کوئی مالِ تجارت بنی رکھی تھی۔ کوئی جنس تبادلہ تھی۔ اور ابو طالب آپؐ کے چچا نہ تھے کوئی سوداگر تھے۔ وفد کی گفتگو سُن کر یقیناً ابو طالب کے جذبات پر بڑی چوٹ لگی اور کہا کہ:۔

"تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ تمہارے بیٹے کو تو میں لے کر پالوں پوسوں۔ میرے بیٹے کو تم لے کر تلوار کے نیچے سے گزار دو۔ ھذا واللہ مالا یکون ابداً"!

معاملہ بڑھ گیا۔ کشمکش کی فضا گرم تر ہو گئی اور خود وفد کے اتفاق رائے کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اب قریش نے آنحضورؐ صلعم کے رفقاء پر سختیاں کرنے کے لئے ان تمام قبائل کو اُکسانا شروع کیا۔ جن میں تحریک، اسلامی کا کوئی فرد پایا جاتا تھا۔ ظلم ڈھائے جانے لگے۔ اسلام سے ہٹانے کے لئے استبداد سے کام لیا جانے لگا۔ لیکن اللہ نے اپنے رسولؐ کو ابو طالب کی آڑ کھڑی کر کے بچا رکھا تھا۔ ابو طالب نے قریش کے بگڑے تیور دیکھ کر بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سامنے آنحضورؐ کی پشت پناہی کے لئے اپیل کی۔ لوگ جمع ہوئے اور حمایتِ محمدؐ کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر ابو لہب نے سخت مخالفت کی اور بات طے نہ ہو سکی!

آگے چل کر جب تحریکِ حق نے مخالفین کی صفوں میں سے حمزہؓ و عمرؓ جیسی دو ہستیاں چُن لیں تو پیچ و تاب کی نئی لہر اٹھی محسوس کیا گیا کہ محمدؐ کی چلائی ہوئی ہوا تو اب گھر گھر میں نکہت پاش ہو رہی ہے۔ کچھ کرنا چاہیئے۔ ابو طالب کی بیماری کی حالت میں یہ لوگ پھر پہنچے۔ ابکی اسکیم یہ تھی کہ معاہدہ ہو جائے۔ وفد نے کہا کہ:۔

"جو کچھ صورتِ حال ہے اُسے آپ جانتے ہیں۔ اپنے بھتیجے کو بلوائیے۔ اس کے بارے میں ہم سے عہد لیجئے اور ہمارے بارے میں اس کا عہد دلوائیے۔ وہ ہم سے باز رہے ہم اُس سے

؎۱ ابن ہشام۔ جلد اول صفحہ ۲۷۸۔ ؎۲ ایضاً صفحہ ۲۷۹۔

باز رہیں۔ وہ ہم سے اور ہمارے مذہب سے واسطہ نہ رکھے۔ ہم اس سے اور اس کے مذہب سے
واسطہ نہیں رکھیں گے۔"

رسولِ پاک بلوائے جاتے ہیں۔ بات ہوتی ہے اور آپ سارا مطالبہ سننے کے بعد جواب دیتے ہیں:-

"کلمۃ واحدۃ تعطونیھا، تملکون بھا العرب، وتدین لکم بھا العجم"

یعنی اے اشرافِ قریش میرے اس ایک کلمہ کو مان لو تو پھر عرب اور عجم سب تمہارے
زیرِ نگیں ہوں گے!

ذرا تصور میں لائیے جان لیوا ماحول کو۔ کلبلاتی ہوئی شرارتوں اور مخالفتوں سے بھری ہوئی فضا کو۔ اور پھر سوچئے کہ آنحضور صلعم کو اپنی دعوت کے زور اور اس کے ممکنات کا کتنا گہرا شعور و یقین تھا۔ گویا اندھیری رات میں کھڑے آپ قطعیت سے فرما رہے تھے کہ ابھی سورج نکلنے والا ہے۔ پھر یہ نوٹ کیجئے کہ اپنے کلمہ کا صرف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی و اجتماعی پہلو آپ کے سامنے تھا!

ابو جہل نے تنک کر کہا: "ہاں! تیرے باپ کی قسم! ایک کیوں۔ دس کلمے چلیں گے!"

کوئی دوسرا بولا۔ "یہ شخص تو خدا کی قسم تمہاری مرضی کی کوئی بات مان کر دینے کا نہیں ہے۔" [۱]

اس کے بعد یہ لوگ مایوس ہو کر چلے گئے۔ لیکن اس وفد کی گفتگو نے چند حقیقتوں کو نمایاں کر دیا۔ ایک یہ کہ اب وہ تحریک اسلامی کو ایک ایسی طاقت ماننے پر مجبور ہو گئے جس کو اکھیڑنے کی سعیٔ رائیگاں سے زیادہ بہتر سمجھوتہ کی کوئی راہ نکالنا تھا۔ دوسرے یہ کہ قریش ساری شرارتوں اور زیادتیوں کو آزمانے کے بعد اب اپنی بے بسی کو محسوس کر رہے تھے!

یہ تو وہ معاملہ تھا جو داعیٔ تحریک صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا۔ آپ کے رفقاء میں سے بھی جو کوئی کسی کے سایۂ حمایت میں تھا۔ اُسے بھی اس حمایت سے محروم کرانے کی مساعی اسی طرح کی گئیں!

مثلاً حضرت ابوسلمہ بھی ابو طالب کی امان میں تھے۔ بنو مخزوم کے لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ:-

"اے ابو طالب! تم نے بھتیجے کو تو ہمارے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن اب تو
معاملہ خود ہمارے اپنے آدمی کا ہے۔ اس کو روکنے کا تمہیں کیا حق ہے؟"

ابو طالب کہنے لگے کہ:-

"وہ میرا بھانجہ ہے اور اس نے میری حمایت طلب کی ہے۔ تم اس پر زیادتی کرتے ہو اور
ظلم ڈھانے سے کسی لمحہ باز نہیں آتے۔ خدا کی قسم یا تو تم لوگ اس سے باز رہو۔ ورنہ
جہاں یہ کھڑا ہوگا ہم اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔" [۲]

اسی طرح ہجرت حبشہ کے بعد ایک بار حضرت ابوبکرؓ مکہ کی گھٹن سے تنگ آ کر نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ دور پہنچے تھے کہ ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ پوچھنے پر اسے جب آپ کے ارادۂ ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اس نے کہا کہ آپ جیسے آدمی کا یوں نکل جانا مجھے گوارا نہیں۔ جو مصیبتوں میں قبیلہ کے کام آتا ہے۔ بھوکوں کو کھانا اور ننگوں کو لباس بہم پہنچاتا ہے ——

---

[۱] ابن ہشام جلد ۲۔ ص ۵۸-۵۹۔ [۲] ایضاً ص ۱۔

نیک کام کرتا ہے اور دوسروں کو کما کر دیتا ہے۔ اپنی امان میں وہ حضرت صدیقؓ کو واپس لے آیا اور قریش کے سامنے اعلان کر دیا کہ ابوبکرؓ میری حفاظت میں ہیں۔ آپ کا معمول ہو گیا کہ اپنی مسجد میں جو گھر کے دروازے کے سامنے بنا رکھی تھی۔ بڑی خوش آوازی سے قرآن پڑھا کرتے۔ اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے۔ اس سے ہر سننے والے پر اثر پڑتا۔ قریش ابن الدغنہ کے پاس پہنچے اور فریاد کی کہ:۔

"تم نے ابوبکرؓ کو پناہ کیا دی۔ ہماری تو شامت آگئی ہے۔ وہ خوش الحانی سے قرآن پڑھتے ہیں اور ہماری عورتیں اور بچے اور کمزور طبیعت کے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ تم پناہ اٹھا لو تو وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر جو چاہیں کریں۔"

ابن الدغنہ نے اس دباؤ کے زیر اثر آپ سے آکر گلہ کیا کہ میں نے پناہ اس لئے تو نہیں دی تھی کہ آپ لوگوں کو ستائیں۔ آپ نے فوراً پناہ واپس کر دی۔[1]

(۱۶)

انسانِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) اولادِ آدم کی جس سب سے بڑی خدمت میں مصروف تھا۔ اس کو ناکام بنانے کے لئے مخالفین جن مختلف تدبیروں سے کام لے رہے تھے۔ ان سب کے علی الرغم دعوت کا کام جاری تھا۔ اور کلمۂ حق کو پنپنے کا راستہ نکل رہا تھا۔ اندریں حالات مخالفانہ پروپیگنڈہ کی ایک متحرک مشینری پیدا کی گئی۔ مکہ کے بعض قائدینِ اعلیٰ آنحضور صلعم کے ساتھ لگے رہنے لگے۔ بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ مکہ مرکزِ عرب تھا۔ اور ہر طرف سے قافلے آتے جاتے اور داعیٔ حق کے لئے کام کا نت نیا میدان فراہم کرتے۔ سردارانِ مکہ کی جو دھونس خود باشندگانِ مکہ پر چلتی تھی۔ وہ باہر سے آنے والوں پر نہیں چل سکتی تھی۔ نیز نو واردوں میں ایسے ذہین اور صاف فطرت لوگ بھی ہوتے تھے جو کسی دعوت کو محض اس کی استدلالی قدر و قیمت اور کسی داعی کو محض اس کے کرداری وزن کے لحاظ سے جانچ کر بغیر کسی تعصب اور بغیر کسی تاریخ عناد کی پرچھائیں قبول کئے آزادانہ رائے قائم کر سکتے تھے۔ تحریکِ محمدی کے خلاف ان کے دلوں میں حاسدانہ چھالے موجود نہیں تھے۔ اندریں حالات مکہ کو بچا لینا بالکل بیکار تھا۔ جبکہ باہر کا عربی ماحول دعوتِ حق سے متاثر ہوتا چلا جائے۔ وہی بات جسے قرآن نے خود ہی کہہ دیا

"نحن نأتی الارض ننقصہا من اطرافہا"

چنانچہ سب سے تشویشناک موقع اس پہلو کے لحاظ سے حج کا تھا۔ قبائلِ عرب جوق در جوق مع اپنے سرداران کے مکہ میں اکٹھے ہوتے۔ اور نبی اکرمؐ اپنا پیغام پھیلانے کے لئے خیمہ بہ خیمہ گردش میں مصروف ہو جاتے۔ ردِ عمل، منفی ہنگامہ کے سربراہ اس وقت بہت سٹپٹاتے۔ چنانچہ ایک سال موسمِ حج کی آمد آمد تھی کہ ولید بن مغیرہ کے ہاں قریشیانِ کرام جمع ہوئے اور سر جوڑ کر سوچ بچار میں مصروف ہو گئے۔ ولید نے معاملہ کو یوں چھیڑا:۔

"اے گروہِ قریش! لو یہ موسم آپہنچا ہے۔ عرب کے وفود اس زمانے میں تمہارے ہاں آئیں گے۔ اور صورتِ حال یہ ہے کہ وہ سب تمہارے اس آدمی (نبی اکرمؐ) کا قصہ سن چکے ہیں۔ (اس لئے وہ ایک ذوقِ تجسس و تحقیق لے کر آئیں گے) سو اب تم

---

[1] ابن ہشام۔ جلد ۲۔ صد ۱۲-۱۳۔

اس معاملہ میں کوئی ایک بات طے کرلو۔ اور پھر باہم اختلاف نہ کرو کہ ایک دوسرے کو جھٹلاتا پھرے اور دوسرا پہلے کی بات کاٹتا رہے ۔" (ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۴۳)

حاضرین نے کہا۔

"تم ہی کہو اے ابو عبد شمس! کہو اور ہمارے لئے کوئی رائے متعین کردو۔ ہم اسی کے مطابق بات کریں گے ۔"

مگر ولید بن مغیرہ نے اصرار کیا کہ آپ لوگ خود ہی بات کریں، میں سنوں گا۔ سو سلسلۂ گفتگو چل پڑا۔

حاضرین :۔ "ہم تو کہتے ہیں کہ وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کاہن ہے!"

ولید :۔ نہیں، خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ سو اس کے ہاں نہ تو کاہنوں کا سا رمزیہ کلام ہے۔ نہ قافیہ آرائی ۔"

حاضرین :۔ "تو پھر ہم کہیں گے کہ وہ پاگل (آسیب زدہ) ہے ۔"

ولید :۔ وہ آسیب زدہ بھی نہیں ہے۔ ہم آسیب کو جانتے پہچانتے ہیں۔ مگر یہاں نہ تو اس طرح سے حلق کی گھٹن ہے، نہ اعضاء میں رعشہ۔ نہ ویسی پریشان خیالی!"

حاضرین :۔ اچھا تو پھر ہم یہ سمجھیں گے کہ وہ شاعر ہے!"

ولید :۔ "وہ شاعر بھی تو نہیں ہے! ہم شعر کو اس کی ہر قسم کے لحاظ سے جانتے ہیں۔ اس میں سے رجز کو۔ ہزج کو۔ قریض کو، مقبوض کو۔ مبسوط کو (بحروں کے لحاظ سے اقسامِ شعر) سو وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) شاعر نہیں ہے ۔"

حاضرین :۔ "تو پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ جادوگر ہے ۔"

ولید :۔ "جی نہیں۔ وہ جادوگر بھی نہیں۔ ہم نے جادوگروں کو بھی اور ان کے جادو کو بھی دیکھ رکھا ہے۔ سو اس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاں نہ گنڈے ہیں نہ پھونکیں ۔"

حاضرین :۔ "تو پھر ابو عبد شمس! تمہی بتاؤ کہ ہم اس کے خلاف (پروپیگنڈہ کا طوفان اٹھانے کے لئے) کہیں کیا؟"

ولید :۔ "خدا کی قسم! اس کی بات میں بڑی مٹھاس ہے۔ اور اس کی بات گویا جڑ کی طرح پھیلاؤ رکھتی ہے۔ اس کی شاخیں باردار ہیں۔ تم ان باتوں میں سے جو بھی کہو گے۔ لایعنی قرار دی جائیں گی۔ بس اس کے بارے میں ان میں سے لگتی ہوئی بات ایک ہی ہو سکتی ہے، اور وہ یہ کہ تم کہو کہ یہ ایک جادوگر ہے۔ جس کا کلام جادو ہے۔ اور اس نے بیٹے اور باپ میں۔ شوہر اور بیوی میں۔ بھائی اور بھائی میں۔ ایک شخص اور اس کے قبیلے میں۔ جدائی ڈالی ہے۔ (اشارہ ہے دعوتِ حق کے اثر کی طرف کہ اس کی وجہ سے ہر طرف پھوٹ پڑ گئی اور دو طاقتیں برسرِ کشمکش ہیں۔ حالانکہ اس کشمکش کا اصل محرک خود مخالفینِ حق کی شرارت تھی) اور کہو کہ لوگ اسی بنا پر اس سے کٹ گئے ہیں ۔"

دیکھئے کہ کس طرح ایک شخص کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کے لئے سازش کی جاتی ہے۔ دل جس بات کو نہیں مانتے اس کو لے کر مخالفانہ ہنگامہ جاری رکھنے کی اسکیم بنی ہے۔ چنانچہ اس مجلس میں طے ہو گیا کہ مختلف پارٹیاں مکہ کو آنے والے

راستوں پر چوکی لگادیں۔ اور آنے والے ہر وفد کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کی دعوت کے بارے میں چوکنا کردیں۔ چنانچہ اسی منصوبے پر عمل کیا گیا۔ لیکن نتیجہ اُلٹا نکلا۔ آنحضور صلعم کا چرچا عرب کے کونے کونے تک پھیل گیا۔ اور جن کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ اُن کو بھی معلوم ہوگیا۔ کہ ایک نئی دعوت اٹھی اور ایسی اٹھی ہے اور اس کی علمبردار شخصیت محمدؐ کی ہے۔

آئیے۔ ذرا تاریخ کے اسکرین پر داعئی حق اور ردّ عملی تحریک کے لیڈروں کو میدان کا کام کرتے ہوئے دیکھئے:۔

ربیعہ بن عباده کا بیان ہے کہ:۔

"میں منٰی میں اپنے باپ کے ساتھ موجود تھا۔ جبکہ میں ایک نوخیز لڑکا تھا۔ اور دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی قبیلوں کی اقامت گاہوں پر جا جا کر رکتے اور فرماتے۔ "اے بنی فلاں! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ تم سے کہتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ اور کسی کو شریک نہ گردانو اور اس کے علاوہ ان بتوں میں سے جس جس کی بھی عبادت کررہے ہو اس سے الگ ہوجاؤ۔ اور مجھ پر ایمان لاؤ۔ میری تصدیق کرو اور میری حمایت کرو۔ یہاں تک کہ میں اللہ کی طرف سے ساری بات کھول کر رکھ دوں۔ جس کے ساتھ اس نے مجھے مامور کیا ہے۔" (سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۶۴-۶۵)

واقعہ کا پرپور کہتا ہے کہ ایک شخص عدنی حلّہ اوڑھے آنحضورؐ کے ساتھ ساتھ لگا تھا۔ جب رسولؐ اللہ اپنی بات فرما چکتے تو یہ شخص اپنی ہانکنی شروع کردیتا کہ:۔

"اے بنی فلاں! یہ شخص تم کو لات وعزیٰ سے ہٹا کر بدعت و گمراہی کی دعوت کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ پس نہ اس کی سنو نہ اس کی بات مانو۔"

نوجوان یہ منظر دیکھ کر باپ سے پوچھتا ہے کہ یہ کون ہے جو آنحضورؐ کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور آپؐ کی بات کی تردید کررہا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ یہ آپؐ کا اپنا ہی چچا ابولہب ہے۔

نبی اکرمؐ حج کی طرح میلوں کے اجتماعات میں بھی تشریف لے جاتے تھے۔ تاکہ انسانی اجتماع سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک مرتبہ بازار ذوالمجاز میں پہنچے اور لوگوں کو حق کا پیغام سنا کر کلمۂ طیبہ کی دعوت دی۔ ابوجہل ساتھ لگا تھا کم بخت کو بغض و کینہ نے اتنا پست کردیا تھا کہ مٹی اٹھا اٹھا کر آپؐ پر پھینکتا۔ اور ساتھ ساتھ پکارتا کہ "لوگو! اس کے فریب میں نہ آنا یہ چاہتا ہے کہ لات وعزیٰ کی پرستش چھوڑ دو۔" (سیرت النبی۔ شبلی نعمانی۔ جلد اول صفحہ ۱۸۶)

جب کبھی کوئی اہم شخصیت مکہ میں وارد ہوتی تو تحریک اسلامی کے مخالفین اُس کو رسول اللہ کے اثر سے بچانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتے۔ اس قسم کے چند خاص واقعات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

طفیل بن عمرو دوسی ایک مرد شریف اور ایک شاعر لبیب تھا۔ ایک مرتبہ وہ آیا۔ بعض افراد قریش اُس کے پاس پہنچے۔ کہنے لگے کہ "طفیل! دیکھو تم ہمارے شہر میں آئے ہو اور یہاں محمد (صلعم) کی سرگرمیاں ہمارے لئے ناقابل برداشت ہو رہی ہیں۔ اس شخص نے ہماری وحدت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے۔ ہمارے مفاد کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے۔ اس کی باتیں جادو گروں جیسی ہیں اور یہ بیٹے اور باپ میں۔ بھائی اور بھائی میں۔ شوہر اور بیوی میں جدائی ڈلوا رہا ہے۔ ہمیں تمہارے اور تمہاری قوم کے بارے میں اندیشہ ہے کہ تم کہیں شکار نہ ہوجاؤ۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس شخص سے نہ تو بات کرنا اور نہ اس کی کوئی

بات سُننا"۔ طفیل کا اپنا بیان ہے کہ ان لوگوں نے اُس وقت تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ میں پوری طرح قائل نہ ہوگیا۔ کہ نہ بات کروں گا، نہ سُنوں گا! چنانچہ میں جب مسجد حرم کی طرف جاتا تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس عبادت میں کھڑے تھے تو میں بھی قریب جا کر کھڑا ہوا۔ میں نے بہت ہی خوب کلام سُنا۔ پھر دل ہی دل میں میں نے کہا کہ میری ماں مجھے روئے۔ خدا کی قسم میں ایک صاحب عقل آدمی ہوں۔ شاعر ہوں۔ بُرے بھلے کی پہچان کر سکتا ہوں۔ پھر کیا چیز مجھے ان باتوں کے سُننے سے روک سکتی ہے۔ جنہیں یہ کہتا ہے۔ جو پیغام یہ لایا ہے وہ اگر بھلا ہوگا تو میں قبول کروں گا۔ اگر بُرا ہوگا تو چھوڑ دوں گا۔

ابھی سوچ بچار میں کچھ وقت گزر گیا۔ اب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر کو چلے۔ طفیل ساتھ ہولیا۔ راستہ میں سارا قصہ سُنایا۔ کہ مجھے پروپیگنڈہ کے کس "چکر" میں ڈال رکھا گیا تھا۔ پھر مکان پر پہنچکر درخواست کی کہ اپنا پیغام ارشاد فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی حقیقت بیان کی اور قرآن پڑھ کر سُنایا۔ طفیل کہتا ہے کہ:۔

"فلا واللہ ما سمعت قولاً قط احسن منه ولا امرًا اعدل منه"

اور پھر وہ بتاتا ہے کہ میں اسلام لے آیا اور حق کی گواہی دی۔ (سیرت ابن ہشام۔ جلد ۲ صفحہ ۲۱-۲۳)

ان طفیل دوسی نے قبیلہ میں جا کر پُرجوش طریق سے دعوت کا کام کیا اور پورا قبیلہ متاثر ہوا۔

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔ اعشیٰ بن قیس بھی ایک ممتاز شاعر تھا۔ اس نے رسول اللہ کا چرچا سُنا اور اس ارادے سے مکہ کا رُخ کیا کہ جا کر اسلام قبول کرے۔ اُس نے آنحضورؐ کی شان میں قصیدہ بھی کہا تھا۔ اب جونہی یہ مکہ کی حدود میں پہنچا۔ ایک قریشی مشرک[۵۱] نے آگھیرا اور اس کے مقصد کے بارے میں کھوج کرید کی۔ اس نے بتایا کہ میں رسول اللہ صلعم کی خدمت میں جا کر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر بات چل پڑی۔ مشرک حیلہ طراز نے اعشیٰ کی دُکھتی رگوں کو ٹٹولنے کے لئے کہا کہ دیکھو محمدؐ تو زنا کو حرام ٹھیراتا ہے۔ یہ وار اوچھا پڑا تو پھر کہا کہ وہ تو شراب سے بھی روکتا ہے۔ یہاں تک کہ باتوں باتوں میں اعشیٰ کے ارادے کو کمزور کر دیا۔ چنانچہ اُس سے یہ منوالیا کہ اس مرتبہ تو تم واپس چلے جاؤ اور اگلے برس آکر تم اسلام قبول کر لینا۔ اعشیٰ واپس چلا گیا اور قبل اس کے کہ وہ مکہ لوٹتا۔ بدنصیب کی موت واقع ہو گئی[۵۲]۔

سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ اراشی کا ہے۔ یہ مکہ آیا۔ ساتھ اُونٹ تھے۔ جس کا سودا ابوجہل نے چکا لیا۔ مگر قیمت کی ادائی میں لیت و لعل کیا۔ اب یہ قریش کے مختلف لوگوں کے پاس گیا کہ اونٹ کی قیمت اُسے کوئی دلوادے۔ وہاں ایک مجلس آراستہ تھی۔ اراشی نے اہلِ مجلس سے اپیل کی کہ آپ میں سے کوئی میری رقم ابوجہل سے دلوادے۔ میں ایک مسافر بے وطن ہوں۔ اور میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اہل مجلس میں سے کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ ابوجہل سے جا کر ایک مسافر کا حق دلوائیں۔ اس لئے بات ٹالنے کے لئے اشارہ کر کے کہنے لگے کہ وہ دیکھتے ہو ایک شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بیٹھا ہے۔ اُس کے پاس جاؤ وہ وصول کرادے گا۔ دراصل یہ ایک طرح کا استہزاء تھا۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ابوجہل کو جو عداوت تھی وہ ظاہر تھی۔ اراشی آنحضورؐ کے پاس پہنچا۔ اپنا ماجرا بیان کر کے مدد طلب کی۔ آنحضورؐ اُٹھے اور فرمایا۔ میرے ساتھ آؤ۔ وہ لوگ دیکھنے لگے کہ اب کیا ہوتا ہے۔ رسول اللہ حرم سے نکل کر ابوجہل کے گھر پر آئے۔

۵۱۔ یہ ابوجہل ہی تھا۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲۔ صفحہ ۲۸۔ ۵۲ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۵-۲۸۔

دروازہ کھٹکھٹایا - آواز آئی۔ "کون ہے؟" فرمایا۔ "محمدؐ! باہر آؤ میرے پاس!" ابوجہل نکلا - چہرے کا رنگ بالکل اُڑا ہوا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اس شخص کا حق اسے دے دو۔" چنانچہ بے چون وچرا ابوجہل نے ادائیگی کر دی - اراشی خوش خوش وخرم اُس مجلس کی طرف پلٹا اور واقعہ سُنایا۔

یہ اثر تھا اس عظیم کیرکٹر کا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جلوہ گر تھا - اس کا اعتراف خود ابوجہل نے کیا - اور اہلِ مجلس سے آکر کہا کہ اُس (محمدؐ) نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا - میں نے اُس کی آواز سُنی اور یکایک ایک رعب مجھ پر طاری ہو گیا۔[1]

مہاجرین حبش کے ذریعہ اسلام کا پیغام ایک نئے علاقہ میں جا پہنچا - وہاں سے بیس[2] عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آیا۔ یہ لوگ مسجد حرم میں آنحضورؐ کی خدمت میں آئے - بیٹھے - بات کی اور سوالات پوچھے - آنحضورؐ نے قرآن سنایا - اور دعوتِ حق پیش کی - ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - اللہ کی پکار کو انہوں نے قبول کیا - ایمان لائے اور نبی اکرمؐ کی تصدیق کی - جب یہ اُٹھ کر نکلے تو باہر قریشی مخالفین مسجد کے گرد منڈلا رہے تھے - ابوجہل نے اس گروہ کو نشانۂ ملامت بنا لیا - کہ تم بھی کیا احمق لوگ ہو جو اپنے دین کو خیرباد کہہ دیا - وفد والوں نے جواب دیا:-

"آپ لوگوں کو ہماری طرف سے سلام عرض ہے - ہمیں آپ کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرنا - ہمارا راستہ الگ - آپ کا راستہ الگ - ہم اپنے آپ کو ایک بھلائی سے محروم نہیں رکھنا چاہتے۔"

بیعتِ عقبۂ ثانیہ کی ساری کارروائی رات کی تاریکی میں بڑے اہتمام سے رفقاء کے ساتھ اسی وجہ سے عمل میں لائی گئی تھی کہ اشرارِ مکہ کی طرف سے سخت مزاحمت تھی - اہلِ وفد جب بیعت کی مجلس سے فارغ ہو کر قیام گاہوں میں پہنچے تو سردارانِ قریش نے اُن کو وہاں جا لیا - اُن کی مخبری کا نظام ایسا مضبوط تھا کہ انہوں نے بیعت کا قصہ بیان کر کے کہا کہ تم ہمارے آدمی (محمد صلعم) کو نکال لے جانا چاہتے ہو - اور اس کے ہاتھ پر تم نے ہمارے خلاف جنگ کرنے کا پیمان باندھا ہے - خوب سمجھ لو کہ تم لوگ اگر ہمیں اور اہلِ عرب کو لڑا دو گے تو تم سے بڑھ کر قابلِ نفرت ہماری نگاہوں میں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا - انصار نے بات کو چھپانے کی کوشش کی - چنانچہ اس وقت تو بات ٹل گئی اور انصاری قافلہ روانہ ہو گیا - لیکن قریش بعد میں برابر تجسس میں لگے رہے اور پوری اطلاع پالی - انصاری قافلہ کا تعاقب کیا گیا اور سعد بن عبادہ اور منذر بن عمرو دونوں کے ہاتھ آگئے - یہ دونوں اپنے قبیلوں پر دورانِ بیعت میں نقیب مقرر ہوئے تھے - منذر تو تھے ہی کمزور آدمی - البتہ سعد بن عبادہ کو قریش نے پکڑ لیا اور اُن کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیئے - اور گرفتار کر کے مکہ لے گئے - مکہ پہنچ کر خوب مارا - اُن کے بال خوب پکڑ پکڑ کر جھنجوڑے۔

سعد بن عبادہ کا خود اپنا بیان ہے کہ اسی حالت میں قریش کا آدمی آیا - جس کا چہرہ روشن اور وجاہت دار تھا - لمبا اور خوبصورت - میں نے دل میں کہا کہ اگر اس قوم میں کوئی خیر باقی ہے تو اس کی توقع اسی شخص سے کی جا سکتی ہے - جب وہ قریب آیا تو اس نے آتے ہی ہاتھ اُٹھا کر زور سے مجھے تھپڑ لگایا - اب دل میں میں نے سمجھ لیا کہ اس گروہ میں بھلائی کی کوئی رمق باقی نہیں - آخر ایک شخص نے نرمی کے ساتھ پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی آدمی قریش میں ایسا نہیں کہ جس سے تمہارا

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۲ - صفحہ ۲۹ - ۳۰ -

بھائی چارہ یا کوئی عہد و پیمان ہو؟ میں نے جبیر بن مطعم اور حارث بن حرب کے نام لئے۔ اُس نے کہا کہ پھر پکارو اُن کے نام اور جو تعلق اُن کے ساتھ ہے اسے بیان کرو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہی شخص انھیں ڈھونڈنے نکلا۔ وہ دونوں پاس ہی مل گئے۔ اور انہوں نے آکر مجھے چھڑایا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دعوتِ حق کے خلاف ردِ عملی ہنگامہ کے علمبردار کس طرح میدانِ کشمکش میں سرگرم عمل تھے!

(۱۷)

خبّاب بن الارت تمیمی جاہلیت کے دور میں غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے تھے اور اُم انمار نے اُن کو خریدا تھا۔ یہ اس وقت ایمان لائے جبکہ خانۂ ارقم تحریکِ اسلامی کا مرکز تھا اور وہیں سے آنحضرتؐ سارا جماعتی نظم چلا رہے تھے۔ قریش نے جلتے انگارے بچھا کر اُن کو اس بسترِ آتشین پر لٹایا اور چھاتی پر ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ انگارے پیٹھ کے نیچے ہی ٹھنڈے ہو گئے۔ بعد میں خبّاب نے حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ پیٹھ دکھائی تو برص کی طرح کے سفید داغ اس پر نمایاں تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے یہ لوہار تھے۔ اسلام لانے کے بعد جب انہوں نے لوگوں سے واجب الوصول اُجرتوں کا تقاضا کیا تو جواب ملا کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہیں کرو گے۔ ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ یہ گویا معاشی چوٹ لگائی جا رہی تھی۔ مگر حق کا یہ سپاہی کہتا کہ تم لوگ جب تک مر کر زندہ نہ ہو جاؤ، ایسا نہیں ہو سکتا!

حضرت بلال حبشیؓ اُمیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب سورج ٹھیک نصف النہار پر آجاتا تو عرب کی تپتی ریت پر اُن کو لٹایا جاتا۔ اور سینہ پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا۔ تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ اُمیہ اس حالت میں ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آجاؤ۔ ورنہ اسی طرح ختم ہو جاؤ گے۔ حضرت بلالؓ جواب میں صرف "احد! احد!" پکارتے۔ اُمیہ کا غصہ اور بھڑک گیا۔ اس نے آپ کے گلے میں رسّی ڈال کر شہر کے لونڈوں کو ساتھ لگا دیا۔ وہ آپ کو گلی گلی گھسیٹتے پھرے۔ لیکن یہ عاشقِ جانباز اسی طرح "احد! احد"! پکارتا پھرتا۔

عمارؓ بن یاسر اسلام لائے تو اُن کو بھی جلتی زمین پر لٹایا جاتا۔ اور قریش اُن کو اتنا مارتے کہ بار بار بے ہوش ہو جاتے۔ اُن کے والدین پر بھی اسی طرح طبع آزمائی کی جاتی۔

سُمیہ جو حضرت عمارؓ کی والدہ تھیں۔ اُن کے اسلام لانے پر ابوجہل نے نہایت وحشیانہ طریق سے برچھی مار مار کر ہلاک کر دیا!

یاسر جو حضرت عمارؓ کے والد تھے۔ وہ بھی ظلم سہتے سہتے شہید ہو گئے۔

صہیبؓ بھی عمارؓ کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ اُن کو اس بے دردی سے مارا جاتا تھا کہ دماغی توازن بار بار درہم برہم ہو جاتا۔ دورِ ہجرت میں قریش نے اُن کو اس شرط پر مدینہ جانے کی اجازت دی کہ اپنا سارا مال و اسباب دے جائیں۔ انہوں نے بخوشی منظور کیا اور خالی ہاتھ نکل گئے!

ابو فکیہہ، صفوان بن اُمیہ کے غلام تھے اور اسلام لانے میں حضرت بلالؓ کے ہمعصر۔ اُمیہ کو اطلاع ہوئی تو پاؤں میں رسّی ڈلوا کر لوگوں سے کہا کہ تپتی ریت پر لٹانے کے لئے گھسیٹتے کرلے جاؤ۔ راستہ میں ایک گبریلا دکھائی دیا۔ تو اُمیہ نے اُن سے کہا کہ "یہی تو تیرا خدا نہیں"۔ انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ "میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے"۔

اس پر امیہ نے اس زور سے اُن کا گلا گھونٹا کہ لوگ یہ سمجھے کہ دم نکل گیا۔ مگر بچ گئے۔ ایک بار اتنا بھاری پتھر اُن کے سینہ پر لاد دیا کہ بے حال ہو جانے کی وجہ سے زبان باہر نکل آئی۔

لُبینہ ایک کنیز تھیں۔ حضرت عمرؓ اس کو نہایت ظالمانہ طریق سے مارتے۔ تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے رحم کھا کر نہیں بلکہ تھک جانے کی وجہ سے چھوڑ دیا ہے!

زنیرہ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں۔ اس لئے حضرت عمرؓ پوری بے دردی سے مارتے۔ ابوجہل نے اُن کو ایک مرتبہ اس جاہلانہ شان سے مارا کہ اُن کی آنکھیں ضائع ہو گئیں!

نہدیہ اور اُم عُبیس بھی دونوں کنیزیں تھیں اور انہوں نے بھی انتہائی سخت ظلم سہے ہیں

حضرت عثمانؓ جو عمر کے لحاظ سے بھی قابلِ احترام تھے اور مال و جاہ بھی رکھتے تھے۔ جب اسلام لائے تو اُن کے اپنے چچا نے رسّی سے باندھ کر پیٹا!

حضرت ابوذرؓ نے اسلام لاتے ہی کعبہ میں آ کر اعلان کیا۔ قریش ٹوٹ پڑے اور مارتے مارتے آپ کو زمین پر لٹا دیا۔

حضرت زبیرؓ بن العوام کو اسلام لانے کی سزا دینے کے لئے اُن کے چچا چٹائی میں اُن کو لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتے تھے!

سعید بن زید کو (یہ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے) حضرت عمرؓ نے رسیوں میں باندھ دیا۔

سعد بن وقاص کے ساتھ بھی ظالمانہ کارروائیاں روا رکھی گئیں۔

عبداللہ بن مسعود نے اسلام لانے پر حرم میں پہلی مرتبہ با آواز بلند قرآن پڑھا۔ سورۂ رحمٰن کی تلاوت آپ نے شروع ہی کی تھی کہ کفار ٹوٹ پڑے اور مُنہ پر طمانچے مارنے لگے۔ مگر پھر بھی تلاوت جاری رکھی۔ آخر زخمی چہرے کے ساتھ واپس آئے!

یہ حالات جب ناقابلِ برداشت ہو گئے تو نبیٔ اکرمؐ نے اپنے رفقاء کو حبش کی طرف ہجرت کر جانے کا اذن دے دیا۔ اوّل اوّل گیارہ مردوں اور چار عورتوں کے قافلے نے ترکِ وطن کیا۔ قریش نے تعاقب کیا۔ مگر ساحل پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ اُن کو برو قت جہاز مل گیا تھا اور وہ جا چکے ہیں۔ قابو نہ چل سکا!

اب دیکھیے کہ دشمنانِ حق کا کینہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ ان لوگوں نے عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو سفارت کے لئے مامور کیا کہ یہ شاہ حبش سے جا کر بات کریں اور مہاجرین کو واپس لائیں۔ اس مقصد کے لئے نجاشی اور اس کے درباریوں کیلئے گراں بہا تحائف تیار کئے گئے اور بڑے سروسامان کے ساتھ سفارت روانہ ہوئی۔ حبش پہنچ کر یہ لوگ درباری پادریوں سے سازش کرنے میں مصروف ہو گئے اور اُن کو رشوتیں پیش کیں کہ ہمارے شہر میں چند سر پھروں نے ایک مذہبی فتنہ اُٹھا کھڑا کیا ہے ہم نے ان کو نکال دیا تھا۔ اب یہ یہاں آپ کی پناہ میں آ پڑے ہیں۔ ان کو یہاں ٹکنے نہیں دینا چاہیئے۔ اس مقصد میں آپ ہم سے تعاون کریں!

دوسرے دن دربار میں جا کر نجاشی کے سامنے درخواست کی کہ یہ مہاجرین ہمارے بھگوڑے مجرم ہیں۔ ان کو واپس ہمارے حوالے فرمائیے۔ انہوں نے ایک نیا دین گھڑ لیا ہے اور ایک تخریبی طوفان ہمارے خلاف اُٹھا کھڑا کیا ہے۔ نجاشی نے تحقیقِ معاملہ کے لئے پوچھا کہ وہ دین کیا ہے۔ جو ان لوگوں نے پیش کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کیلئے

مہاجرین کی طرف سے حضرت جعفرؓ اٹھے۔ انہوں نے بلا جھجک اصل حقیقت جوں کی توں پیش کردی کہ:۔

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے۔ بت پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ بدکاریاں کرتے تھے۔ ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا۔ قوی لوگ، کمزوروں کو کھا جاتے تھے۔ اسی اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا۔ جس کی شرافت وصدق و دیانت سے ہم لوگ پہلے سے واقف تھے۔ اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں۔ یتیموں کا مال نہ کھائیں۔ ہمسایوں کو آرام دیں۔ عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں۔ نماز پڑھیں۔ روزے رکھیں۔ زکوٰۃ دیں۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی۔ اور تمام اعمالِ بد سے باز آئے۔ اس جرم پر ہماری قوم ہماری جانوں کی دشمن ہو گئی اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ پھر اسی گمراہی میں واپس آجائیں۔"

بات سچی ہو اور کہنے والا سچے جذبات کے ساتھ اُسے کہے تو اس کا اثر پڑتا ہے۔ نجاشی کا دل موم ہوگیا۔ اب وہ کہنے لگا کہ ذرا اس کتاب کا بھی کوئی حصہ سناؤ۔ جو تم لوگوں پر اُتری ہے۔ چنانچہ حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا ایک حصہ پڑھا۔
نجاشی پر رقت طاری ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا:۔

"خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں!"

ساتھ ہی فیصلہ سنادیا کہ مہاجرین واپس نہیں کئے جاسکتے۔

دوسرے دن عمرو بن العاص پھر دربار میں پہنچے۔ اور نجاشی کے کان بھرنے کے لئے یہ الزام تراشا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت خراب عقیدہ رکھتے ہیں۔ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو طلب کرلیا۔ ان کو جب صورت حال معلوم ہوئی تو کچھ تردد ہوا کہ عیسیٰ کے "ابن اللہ" ہونے کے انکار کرنے پر نجاشی کا ردِّ عمل نہ جانے کیا ہو۔ لیکن عزیمت نے کہا کہ جو امر حق ہے اُسے صاف صاف پیش کردو۔ حضرت جعفرؓ نے کہا کہ:۔

"ہمارے پیغمبرؐ نے بتایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں اور کلمۃ اللہ ہیں۔"

نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ "واللہ جو تم نے کہا ہے عیسیٰؑ اس سے اس تنکے بھر بھی زیادہ نہیں ہیں"۔ پادری جو سازش کا شکار اور رشوت و ہدایا سے مسخر تھے۔ دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کے نتھنوں سے سانس کی خرخراہٹ سنائی دینے لگی۔ نجاشی نے اُن کی کچھ پروا نہیں کی۔ سفارت ناکام ہوگئی!

حبش کے ایک اچھی پناہ گاہ ثابت ہونے کی وجہ سے اور مسلمان بھی وہاں جانے لگے۔ یہاں تک کہ مہاجرین کی کل تعداد تراسی تک جا پہنچی۔ اسی دوران میں ایک خبر اُڑی کہ محمد صلعم کے ساتھ قریش کی صلح ہو گئی ہے۔ اس اطلاع پر مہاجرین واپس ہونے لگے۔ مکہ آکر معلوم ہوا کہ خبر غلط ہے۔ تاہم اب جو لوگ واپس آگئے تھے ان پر پہلے سے زیادہ تشدد توڑا جانے لگا۔[1]

---

[1] اوپر سے یہ سارا بیان اُن معلومات پر مبنی ہے جو علامہ شبلی نے سیرت النبی جلد اول میں پیش کی ہیں۔ ص ۱۶۶ تا ۱۷۸۔

تشدد کی اس داستان کا وہ باب سب سے ممتاز ہے۔ جو حضرت عمرؓ کے غیظ و غضب سے مرتب ہوا تھا۔ عمر ستائیسویں سال میں تھے جبکہ نبوتِ محمدی کا علم بلند ہوا۔ اسلام جلد ہی آپ کے گھرانے میں نفوذ کر گیا۔ آپ کے بہنوئی سعید پہلے پہل اسلام لائے۔ ان کے اثر سے آپ کی بہن فاطمہ بھی مسلمان ہو گئیں۔ خاندان کی ایک اور بااثر شخصیت نعیم بن عبد اللہ نے بھی دعوتِ حق پر لبیک کہی۔ اوّل اوّل ان کو اسلام کے اس نفوذ کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ جونہی علم ہوا تو یہ آپے سے باہر ہو گئے اور اسلام لانے والوں کے دشمن بن گئے۔ لبینہ ان کے خاندان کی کنیز تھیں ان کو مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو دم لینے کے لئے الگ ہوتے۔ پھر تازہ دم ہو کر مارنا شروع کر دیتے!

آخر ایک دن تہیہ کر لیا کہ کیوں نہ اصل داعیٔ حق ہی پر ہاتھ صاف کر لیا جائے۔ تلوار لے کر چلے۔ راستہ میں نعیم بن عبد اللہ سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو اور بہن بہنوئی سے نمٹ لو۔ پھر کسی اور طرف جانا۔ فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ آہٹ ہوئی تو خاموش ہو گئیں اور قرآن کے اوراق چھپا لئے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ کیا پڑھا جا رہا تھا؟ بہن نے ٹالا۔ کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں مرتد ہو چکے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ٹوٹ پڑے۔ بہن بیچ بچاؤ کے لئے آئیں تو ان کو مارا۔ ان کا جسم لہولہان ہو گیا۔ لیکن ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ عزیمت مندانہ انداز سے کہنے لگیں:۔

"عمر! جو کچھ کر سکتے ہو۔ کرو! لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا"

ایک خاتون اور وہ بھی بہن۔ ایک پیکرِ جذبات! جسم زخمی۔ کپڑے خون آلود! آنکھوں میں آنسو! اور زبان پر یہ عزیمت مندانہ قول! عمرؓ کی قاہرانہ طاقت نے اس مظلومانہ منظر کے سامنے ہار مان لی۔ ہیرے کا جگر پھول کی پتی سے کٹ گیا۔ فرمایا۔ "جو تم پڑھ رہی تھیں۔ مجھے بھی لا کر سناؤ" وہ گئیں اور اجزائے قرآن نکال لائیں۔ جب یہ الفاظ سامنے آئے کہ "اٰمنوا باللّٰہ ورسولہ" تو بے اختیار پکار اٹھے۔ لا الٰہ الا اللّٰہ واشہد ان محمدًا عبدہٗ ورسولہٗ۔ ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر تحریکِ حق کے مرکز خانۂ ارقم کی طرف چلے۔ وہاں جا کر خدا کے رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس واقعہ پر مسلمانوں نے مارے خوشی کے ایسا نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ مکہ کا سارا ماحول گونج اٹھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لاتے ہی کعبہ میں پہلی مرتبہ علانیہ نماز باجماعت کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہوا۔

دشمنانِ حق اپنی ساری تدبیروں کے علی الرغم یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ حق کا سیلاب آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے۔ بڑی بڑی اہم شخصیتوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اس پر ان کا اضطراب اور بڑھ گیا۔ محرم ۷ نبوی میں مکہ کے تمام قبائل نے مل کر ایک معاہدہ کیا کہ "خاندان بنو ہاشم سے بائیکاٹ کیا جائے اور کوئی شخص نہ ان سے قرابت رکھے، نہ لین دین کرے۔ نہ ان سے ملے جلے۔ اور نہ کھانے پینے کا کوئی سامان ان تک پہنچنے دے۔ الّا آنکہ بنو ہاشم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے سپرد کر دیں۔ اور ان کو قتل کرنے کا ہمیں حق دے دیں"

یہ فیصلہ جناب ابو طالب سے متعدد گفتگوؤں کے بعد اس امر سے مایوس ہو کر کیا گیا تھا کہ نہ ابو طالب رسول اللہ کو اپنی سرپرستی سے نکالنے پر تیار ہیں اور نہ ان کی وجہ سے بنو ہاشم تعلق منقطع کر سکتے ہیں۔ بہر حال قبائلی دور کے لحاظ سے یہ فیصلہ انتہائی سنگین تھا اور ایک آخری کارروائی کی نوعیت رکھتا تھا۔ بنو ہاشم بے بس ہو کر شعبِ ابی طالب میں پناہ گزیں ہو گئے۔ گویا پورا خاندان تحریکِ اسلامی کے داعی کی وجہ سے ایک طرح سے قید اور نظر بندی میں ڈال دیا گیا۔

اس نظر بندی کا دور تین برس تک طویل ہوا - اور اس دور میں جو احوال گزرے ہیں - اُن کو پڑھ کر پتھر بھی پگھلنے لگتا ہے - درختوں کے پتے نگلے جاتے رہے اور سوکھے چمڑے اُبال اُبال کر اور آگ پر بھون بھون کر کھائے جاتے رہے - حالت یہ ہو گئی کہ بنو ہاشم کے مظلوم بچے جب بھوک کے مارے بلکتے تھے تو دور دور تک اُن کی درد بھری آوازیں جاتی تھیں - قریش اُن کی آوازوں کو سُنتے تو مارے خوشی کے جھوم جھوم جاتے - ناکہ بندی اتنی شدید تھی کہ ایک مرتبہ حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے) نے کچھ گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ چوری چھپے بھیجا - راستہ میں ابوجہل نے دیکھ لیا - اور گیہوں چھیننے کے درپے ہوا - اتفاق سے ابوالبختری بھی آ گیا - اس کے اندر کسی اچھے انسانی جذبے نے کروٹ لی اور اس نے ابوجہل سے کہا کہ چھوڑو بھی) ایک بھتیجا اپنی پھوپھی کے لئے کچھ بھیجتا ہے تو تم اسے بھی اب روکتے ہو - اس طرح ہشام بن عمرو چوری چھپے کچھ غلہ بھیج دیتے تھے!

یہی ہشام بن عمرو اس ظالمانہ معاہدہ کے خلاف داعئ اوّل بنا - پہلے یہ زہیر بن ابی اُمیہ کے پاس گیا اس سے بات کی کہ کیا تم اس بات پر خوش ہو کہ تم کھاؤ پیو - کپڑا پہنو - شادی بیاہ کرو - اور تمہارے چچاؤں کا یہ حال ہو کہ وہ نہ خرید و فروخت کر سکیں - نہ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر سکیں - اگر معاملہ ابی الحکم ابن ہشام کے چچاؤں کا ہوتا اور تم نے اسے ایسے معاہدے کی دعوت دی ہوتی - تو وہ کبھی قبول نہ کرتا - یہ سُن کر زہیر نے کہا :-

"میں کیا کروں - میں تو اکیلا آدمی ہوں - خدا کی قسم! اگر کوئی دوسرا میرے ساتھ ہوتا تو میں اس معاہدے کی منسوخی کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا - اور اسے ختم کر کے دم لیتا "

ہشام بن عمرو نے کہا "دوسرا ساتھی تو تمہیں مل گیا ہے"

زہیر نے پوچھا - "کون ؟"

ہشام نے کہا "میں"

پھر ہشام، مطعم بن عدی کے پاس پہنچا - اور اسی طرح تحریک کی - اس نے بھی وہی جواب دیا کہ "اکیلا ہوں - کیا کروں"

ہشام نے جواب دیا کہ دوسرا میں ہوں - مطعم نے کہا کہ اب کسی تیسرے کو ڈھونڈنا چاہیئے - ہشام نے بتایا کہ وہ تو میں نے مہیا کر لیا ہے - اس نے پوچھا - کون ؟ ہشام نے بتایا کہ زہیر بن ابی امیہ - مطعم کہنے لگا کہ پھر کسی چوتھے کو حاصل کرنا چاہیئے - اسی طرح ابوالبختری اور زمعۃ بن الاسود تک پہنچ کر ہشام نے بات کی!

غرض بائیکاٹ کے معاہدے کے خاتمہ کی تحریک اندر ہی اندر جب کام کر چکی تو ان سب لوگوں نے ایک جگہ بیٹھ کر طریق کار طے کیا - اسکیم یہ بنی کہ برسرِ عام ہشام ہی بات چھیڑے گا - چنانچہ ہشام نے بیت اللہ کا سات بار طواف کیا - پھر لوگوں کی طرف آیا اور کہا کہ :-

"مکہ والو! کیا یہ زیبا ہے کہ ہم کھانا کھائیں اور لباس پہنیں اور بنو ہاشم بھوک سے تڑپ رہے ہوں - نہ وہ کچھ خرید سکیں نہ بیچ سکیں" اور پھر اس نے اپنا عزم ان الفاظ میں پیش کر دیا - "خدا کی قسم! میں اس وقت تک نہ بیٹھوں گا جب تک کہ تعلقات کو توڑ دینے والی اس ظالمانہ تحریر کو چاک چاک نہ کر دوں"

ابوجہل بھنا کر اٹھا اور چیخ کر بولا "جھوٹے ہو تم - خدا کی قسم تم اسے چاک نہیں کر سکتے"

زمعۃ بن الاسود نے ابوجہل کو جواب دیا "تم، خدا کی قسم! سب سے بڑھ کر جھوٹے ہو - یہ معاہدہ جس ڈھب سے

لکھا گیا ہے۔ ہم اُسے پسند نہیں کرتے۔" ابوالبختری بھی بول اٹھا۔" سچ کہا زمعہ نے۔ ہم کو پسند نہیں جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے۔ اور نہ ہم اس کو مانتے ہیں۔" مطعم نے بھی تائید مزید کی۔" تم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اور غلط کہتا ہے جو اس کے علاوہ کچھ اور کہتا ہے۔" ہشام نے بھی یہی بات کہی۔ اکثریت کو یوں مخالف پاکر ابو جہل اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اور معاہدہ چاک کردیا گیا۔ لوگ جب اُسے دیوارِ کعبہ سے اُتارنے لگے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُسے دیمک چاٹ چکی تھی۔ صرف" باسمک اللھم" کے الفاظ سلامت تھے۔ (سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۴-۱۶)

یوں وہ سہ سالہ دورِ قید و بند ختم ہوا!

لیکن تشدد کی داستان کا وہ باب شاید سب سے زیادہ جگر خراش ہو جسے دشمنانِ حق نے طائف میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کی روشنائی سے لکھا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ آنحضور صلعم حسب معمول حق کا پیغام سنانے کے لئے گھر سے نکلے اور ہر طرف گھومے پھرے لیکن وہ ایک دن پورا ایسا گزرا جس دن آپؐ کو ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو بات سنتا۔ نئی اسکیم یہ اختیار کی گئی تھی کہ آپؐ کو جب آتے دیکھا جائے تو لوگوں کو چاہیئے کہ ادھر اُدھر سٹک جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو لوگ ملے بھی اُنھوں نے دعوتِ حق کا جواب استہزاء اور غنڈہ گردی سے دیا۔ اس روز آپؐ پورا دن گزار کر جب پلٹے تو اُداسی کا ایک بھاری بوجھ آپؐ کے سینہ پر لدا تھا سخت گھٹن تھی۔ ایسی گھٹن جو کسی کی خیر خواہی کرنے والے کو اُس وقت ہوتی ہے کہ جس کی وہ خیر خواہی کر رہا ہو وہی خود محسن کشی پر اُتر آئے۔ اس پر تسلی کے لئے اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوئیں۔ شاید یہی موقع تھا کہ آپؐ کے دل میں احساس پیدا ہوا ہو کہ اب مکہ کی سرزمین سے باہر نکل کر کام کرنا چاہیئے۔ یہاں جو فصل اُگنی تھی اُگ چکی۔ باقی مٹی بنجر ہے۔ بہرحال اس کے فوراً ہی بعد کا واقعہ ہو کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف کا ارادہ کرکے چلے۔ آپؐ وہاں پہنچے تو ثقیف کے تین سرداروں سے ملاقات ہوئی۔ یہ تینوں بھائی تھے۔ عبد یالیل۔ مسعود، حبیب۔ ان میں سے ایک کے گھر میں قریش (بنی جمح) کی ایک عورت تھی نبی اکرمؐ ان لوگوں کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ اور اپنی دعوت پر گفتگو کی۔ اور اُن سے اقامتِ حق کے کام میں مدد طلب کی۔ اب جواب سُنئے جو تینوں کی طرف سے ملتا ہے:-

ایک:- "اگر واقعی خدا نے تم کو بھیجا ہے تو بس پھر وہ کعبہ کا غلاف نُچوانا چاہتا ہے۔"

دوسرا:- "ارے۔ کیا خدا کو تمہارے علاوہ رسالت کے لئے کوئی اور آدمی نہ مل سکا۔"

تیسرا:- "خدا کی قسم! میں تجھ سے کبھی بات بھی نہیں کروں گا۔ اگر تو اپنے کہنے کے مطابق واقعی اللہ کا رسول ہے تو پھر تم ایسے آدمی کو جواب دینا سخت خلافِ ادب ہے۔ اور اگر تم خدا پر افتراء باندھ رہے ہو تو اس قابل نہیں ہو کہ میں تم سے بات کروں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مایوس ہو کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اب ان لوگوں نے اپنے نہایت درجے کے گھٹیا اور بازاری آدمیوں اور نوکروں غلاموں کو پیچھے لگا دیا۔ جو آنحضورؐ کو گالیاں دیتے تھے اور آپؐ کے اِردگرد شور مچاتے تھے اور پتھر مارتے تھے۔ اس "تماشے" کو دیکھنے کے لئے عام لوگوں کا بھی ہجوم ہو گیا یہاں تک کہ لوگ آپؐ کو شہر سے نکال کر ایک باغ تک لے آئے۔ جو ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ اور وہ دونوں موجود تھے۔ اب لوگ واپس چلے گئے۔ آپؐ نے نڈھال ہو کر انگور کی ایک بیل سے ٹیک لگالی۔ باغ کے مالک آپؐ کو دیکھ رہے تھے

در جو کچھ آپؐ پر بیتی اُس کا مشاہدہ بھی کر چکے تھے۔

اس موقع پر آپؐ نے بڑی دردبھری دعا فرمائی۔ جس کے الفاظ یہ تھے:-

"الٰہی اپنی کمزوری، بے سروسامانی اور لوگوں کی تحقیر کی بابت تیرے سامنے فریاد کرتا ہوں تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ درماندہ عاجزوں کا مالک تو ہی ہے۔ اور میرا مالک بھی تو ہی ہے۔ مجھے کس کے سپرد کیا جاتا ہے۔ کیا بیگانہ ترش رُو کے یا اُس دُشمن کے جو کام پر قابو رکھتا ہے۔ اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں تو مجھے اس کی کچھ پروا نہیں لیکن تیری عافیت میرے لئے زیادہ وسیع ہے۔ میں تیری ذات کے نُور سے پناہ چاہتا ہوں جس سے بہت تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں۔ اور دُنیا و دین کے کام اس سے ٹھیک ہو جاتے ہیں کہ تیرا غضب مجھ پر اُترے۔ یا تیری ناراضامندی مجھ پر وارد ہو۔ مجھے تیری ہی رضامندی اور خوشنودی درکار ہے اور نیکی کرنے یا بدی سے بچنے کی طاقت مجھے تیری ہی طرف سے ملتی ہے!"

اتنے میں باغ کے مالک بھی آپہنچے۔ اُن کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات اُمڈ آئے تھے۔ انہوں نے اپنے نصرانی غلام کو پکارا۔ اُس کا نام عدّاس تھا۔ پھر ایک طشتری میں انگوروں کا خوشہ رکھوا کر بھجوایا۔ عدّاس انگور پیش کر کے آنحضور کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپؐ نے ہاتھ انگور کی طرف بڑھاتے ہی بسم اللہ کہا۔ عدّاس کہنے لگا۔ "خدا کی قسم! اس طرح کی بات اس شہر کے لوگ تو کبھی نہیں کہتے۔" رسول اللہ صلعم نے پوچھا کہ "تم کس شہر کے آدمی ہو اور تمہارا دین کیا ہے؟" اس نے بتایا کہ نصرانی ہوں اور نینوا کا باشندہ۔ آپؐ نے فرمایا۔ "تو تم یونسؑ بن متی جیسے مردِ صالح کی بستی کے آدمی ہوئے؟" عدّاس نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم کہ یونسؑ بن متی کون ہے؟" آپؐ نے کہا "وہ میرا بھائی ہے۔ وہ بھی نبی تھا اور میں بھی نبی ہوں۔" یہ سُنتے ہی عدّاس آپؐ کے ہاتھ پاؤں کو چُومنے لگا۔ ربیعہ کے بیٹوں میں سے ایک نے یہ ماجرا دیکھا تو اُس نے عدّاس کے واپس جانے پر ملامت کی کہ یہ کیا حرکت تم کر رہے تھے۔ تم نے اپنا دھرم خراب کر لیا ہے۔ عدّاس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا۔

"میرے آقا! اس سے بڑھ کر زمین میں کوئی چیز بھلی نہیں۔ اس شخص نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی نہیں جان سکتا۔" (سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص۶۳-۶۴)

درحقیقت اب جناب ابو طالب کی وفات کے بعد مکہ میں آپؐ ظاہری لحاظ سے بالکل بے سہارا تھے اور دشمن شیر ہو گئے تھے۔ خیال فرمایا کہ طائف میں سے شاید کچھ اس کے بندے اُٹھ کھڑے ہوں۔ وہاں یہ صورت پیش آئی۔ وہاں سے پھر آپؐ نخلہ میں قیام پذیر رہے۔ وہاں سے واپس آئے اور غارِ حرا میں تشریف فرما ہوئے۔ یہاں سے مطعم بن عدی کو پیغام بھجوایا کہ "کیا تم مجھے اپنی حمایت میں لے سکتے ہو؟" عرب کے قومی کردار کی ایک اہم روایت یہ تھی کہ حمایت طلب کرنے والے کو حمایت دی جاتی تھی۔ خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ مطعم نے پیغام قبول کر لیا۔ بیٹوں کو حکم دیا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں چلو۔ خود رسول اللہ کو ساتھ لایا۔ اور مکہ میں آکر اونٹ پر سے اعلان کیا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دی ہے۔ مطعم کے بیٹے آپ کو تلواروں کے سائے میں حرم میں لائے۔ پھر گھر میں پہنچایا۔ (سیرت النبی، علامہ شبلی جلد اول ص۱۸۳-۱۸۴)

اندازہ کیجئے تشدّد بھرے سنگین ماحول کا۔ جو حق کے علمبردارِ اعظمؐ اور اُس کے ساتھیوں کیلئے مکہ کو گھیرے ہوئے تھے۔

مگر یہ ساری چالبازیاں اور چیرہ دستیاں نہ حق کے کام کو بڑھنے سے روک سکیں اور نہ اسلامی تحریک کے سایۂ رحمت میں چلے جانے والوں میں سے کسی کو واپس نکال سکیں!

تشدد کسی متزلزل نظام کا آخری ہتھیار ہوتا ہے۔ اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو پھر قاعدہ یہ ہے کہ دشمنانِ تغیر نقیبِ انقلاب کی جان لینے پر تُل جاتے ہیں۔ اور اہلِ مکہ تو پہلے سے ایسے ارمان رکھتے تھے مگر بس نہیں چلتا تھا۔ اب آخری گھڑی آگئی تھی۔ کشمکش ایک فیصلہ کن مرحلہ سے گزر رہی تھی۔ اب دو متقابل طاقتیں چھٹ کر بالکل الگ الگ ہو چکی تھیں۔ اب واضح طور پر ایک ذہنی و اعتقادی خطِ سرحد کھنچ چکا تھا۔ اور جو اُس پار تھے وہ اُس پار تھے اور جو اس طرف آگئے تھے وہ بس اسی طرف کے تھے۔ اب دعوتِ حق کی بہرحال ایک منظم طاقت تھی۔ اس کا جماعتی نظم بڑا مضبوط تھا۔ اس کا کرداری وزن بہت زیادہ تھا۔ اس کی استدلالی اپیل زیادہ زوردار تھی۔ اور اس کے خادموں کی مظلومیت دلوں کو فتح کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ اب سچائی کا ننھا سا بیج ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ اور جو خطرہ کل تک خداوندانِ جاہلیت کیلئے خیالی تھا۔ وہ اب واقعاتی صورت میں سامنے تھا۔ اب وقت اُن سے کہہ رہا تھا کہ اگر اس خطرے سے نمٹنے کی قوت رکھتے ہو تو نمٹ لو۔ ورنہ دور کا طوفان زور چلا آرہا ہے۔ جس میں تم اور تمہارے مناصب اور تمہارا مذہب اور تمہاری جاہلانہ روایات سب کچھ بہہ جانے والی ہیں۔ کل تم کو اپنی اکڑی ہوئی گردنیں محمد اور اس کے پیغام کے سامنے خم کردینی ہوں گی۔ خداوندانِ جاہلیت تاریخ کا یہ چیلنج سُن رہے تھے۔ اور برابر مضطرب ہو رہے تھے۔ چنانچہ اب وہ داعیٔ حق کے خون کے پیاسے ہو کر ایک نئی سازش کے لئے ذہنی طور پر تیار تھے۔

یوں بھی جماعتِ حق کے افراد کے لئے مکہ کی بھٹی اپنے آخری درجۂ حرارت پر آپہنچی تھی۔ مظالم انسانی برداشت سے باہر ہو گئے تھے۔ اب گویا تاریخ ایک نئی کروٹ لینے کے قریب آگئی تھی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کے لئے راہِ نجات حاصل کرنے اور تحریک کے لئے بہتر میدان پا لینے کے لئے درد و کرب کے ساتھ دعاؤں پر دعائیں فرما رہے تھے۔ یہاں تک کہ آسمانی آقا کی بارگاہ سے یہ فرمان اُترتا ہے:-

" اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ! "

کیا ہی زوردار الفاظ ہیں۔ کیا ہی ولولہ انگیز اور دل کو ہلا دینے کا انداز گفتگو ہے۔ " وان اللہ علیٰ نصرھم لقدیر" میں کتنا بڑا چیلنج دشمنانِ حق کے لئے پنہاں ہے۔ ساتھ ہی اشارۃً نظامِ حق کے قیام کا مژدہ! " الذین ان مکنّٰھم فی الارض" اور پھر " بزن" کا یہ اعلان کہ " وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃٌ ویکون الدین کلہٗ للہ!" اس نغمۂ الہام کی گونج سے مسلمانوں کی کس طرح ڈھارس بندھی ہو گی۔ کس طرح نئی امیدیں اور ولولے اُبھر آئے ہوں گے۔ کس طرح ایک روشن مستقبل آنکھوں میں پھر گیا ہو گا۔ یہ " اعلانِ جنگ" مکہ ہی میں کر دیا گیا تھا اور ہجرت کے حکم سے بھی پہلے۔ اس آیت سے آنحضور پر انکشاف ہو گیا کہ بس اب ہجرت ہونے والی ہے۔ اور قرینے سے مدینہ ہی دار الہجرت نظر آرہا تھا۔ آپ نے اپنے رفقاء کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی۔ اور یکے بعد دیگرے مختلف اصحاب جانے لگے۔ آہستہ آہستہ بہت ساری تعداد نکل گئی۔ محلے خالی ہونے لگے اور گھر سنسان ہو رہے تھے۔ ایک مرتبہ ابوجہل اور دوسرے اکابر بنی جحش کے سنسان گھروں سے گزرے تو ابوجہل نے اس منظر کو دیکھ کر یہ ریمارک پاس کیا:-

"یہ ہمارے برادر زادے کا کیا دھرا ہے۔ اس نے ہمارے اجتماع کو پارہ پارہ کر دیا۔ ہماری وحدت کا شیرازہ بکھیر دیا اور ہمیں آپس میں ایک دوسرے سے پھاڑ دیا۔"

(سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۱۱)

رفقاء کو مدینہ بھیجنے کے باوجود آنحضورؐ نے اپنے مقامِ دعوت کو نہیں چھوڑا۔ اذنِ الٰہی کے منتظر رہے۔ اب کوئی مسلمان بھی مکہ میں نہیں رہا تھا۔ سوائے ایسے لوگوں کے جنہیں قریش نے روک رکھا تھا۔ یا ابتلاء میں ڈال رکھا تھا۔ البتہ رفقائے خاص میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما باقی تھے۔ ان حالات میں قریش نے اندازہ کر لیا کہ اب جبکہ مسلمانوں کو ایک ٹھکانا مل گیا ہے اور ایک ایک کر کے سب لوگ جا چکے ہیں۔ قریب ہے کہ محمد صلعم بھی ہاتھ سے نکل جائیں اور پھر ہمارے دائرۂ اثر سے باہر رہ کر قوت پکڑیں اور سارا پچھلا حساب چکا جائے۔ یہ لوگ مکہ کے پبلک ہال دارالندوہ میں جمع ہوئے اور سوچنے لگے کہ اب محمدؐ کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔ ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ آپؐ کو کسی آہنی قید خانے میں بند کر دیا جائے اور دروازہ بند رکھا جائے۔ اس پر اعتراض ہوا کہ اس شخص کی بات بند آہنی دروازے میں سے بھی نکل جائے گی۔ اور اس کے ساتھی جب زور پکڑ لیں گے تو اس کو نکال لے جائیں گے۔ کوئی اور تدبیر سوچو۔

ایک رکن مجلس نے دوسری تجویز پیش کی کہ آپؐ کو اپنے معاشرے اور حدودِ اثر سے باہر نکال دیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں اس سے کیا مطلب کہ آپؐ پر کیا گزرتی ہے۔ اس پر پھر اعتراض ہوا کہ کیا تم اس کے حسنِ گفتار کو نہیں جانتے؟ اس کی باتوں کی مٹھاس سے واقف نہیں ہو؟ یہ چیزیں لوگوں کے دلوں پر اس کے چھا جانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ایسا کرو گے تو تم اس سے نہیں بچ سکتے۔ کہ وہ اہلِ عرب میں نفوذ کرے اور اپنی دعوت اور باتوں کے زور سے ان پر چھا جائے۔ پھر وہ ان کو لے کر تم پر دھاوا بول دے اور اقتدار کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں سے چھین لے اور پھر جو سلوک چاہے تمہارے ساتھ روا رکھے!

اب ابوجہل کی ذہانت دُور کی کوڑی لاتی ہے۔ اس نے تجویز کیا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک مضبوط اور معزز نوجوان لیا جائے اور سب کو تلواریں دی جائیں۔ پھر یہ یکبارگی اس (محمدؐ) پر حملہ کر کے کام تمام کر دیں۔ بس ہمیں اس طرح اس سے چھٹی مل سکتی ہے! اس طریقے سے محمدؐ کا خون تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے گا اور بنو عبد مناف اتنے سارے قبائل سے بدلا لینے کی جرأت نہ کر سکیں گے۔

بس اس پر اتفاق رائے ہو گیا اور یہ سازشی میٹنگ برخاست ہو گئی۔

اسی رات جبرئیل امین آئے اور ہجرت کی اجازت کا فرمان پہنچا دیا۔ آنحضورؐ کی اقامت گاہ گھیرے میں تھی۔ بلکہ پورے شہر کی ناکہ بندی کا مضبوط انتظام تھا۔ لیکن آپؐ یارِ غار سمیت ان سارے گھیروں اور پہروں میں سے صاف نکل گئے!

آج دنیا کا سب سے بڑا محسن و خیر خواہ (صلعم) بغیر کسی قصور کے بے گھر ہو رہا تھا!

آج وہ ان گلیوں کو الوداع کہہ رہا تھا۔ جن میں وہ چل پھر کر جوان ہوا۔ اور جن میں اس نے حق کا بول بالا کرنے کے لئے ہزاروں ہی پھیرے کئے تھے۔ اور جن میں اس نے گالیاں سنی تھیں اور ایذائیں سہی تھیں۔

آج وہ حرم کے مرکزِ روحانی سے جدا ہو رہا تھا۔ جس میں اس نے بارہا سجدے کئے تھے۔ بارہا قوم کی فلاح کی

دعائیں مانگی تھیں۔ بارہا قرآن پڑھا تھا۔ اور بار ہا اس مقدس چار دیواری۔ اس واحد پناہ گاہ امن و سلامتی میں بھی مخالفین کے ہاتھوں دُکھ اُٹھائے تھے اور ان کے دل چھیدنے والے بول سُنے تھے۔

آج وہ اس شہر کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔ جس میں ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے کارناموں کا ریکارڈ محفوظ تھا اور جس کی فضاؤں میں ان کی دعاؤں کی لہریں اب تک متحرک تھیں۔

کلیجہ کٹ ہوگا۔ آنکھیں ڈبڈبائی ہوں گی جذبات اُمڈے ہوں گے۔ مگر خدا کی رضا اور زندگی کا مشن چونکہ اس قربانی کا بھی طالب ہوا اس لئے انسانِ کامل نے یہ قربانی بھی دے دی!

آج مکہ کے پیکر سے اس کی روح نکل رہی تھی۔ آج اس چمن کے پھولوں سے خوشبو اُڑی جا رہی تھی۔ آج یہ چشمہ سُوکھ رہا تھا۔ آج اس کے اندر با اصول اور صاحبِ کردار ہستیوں کا آخری قافلہ روانہ ہو رہا تھا!

دعوتِ حق کا پودا مکہ کی سرزمین سے اُگا۔ لیکن اس کے پھلوں سے دامن بھرنا مکہ والوں کے نصیب میں نہ تھا۔ پھل مدینہ والوں کے حصے میں آئے۔ ساری دُنیا کے حصہ میں آئے۔ مکہ والے آج دھکیل کر پیچھے ہٹائے جا رہے تھے۔ اور مدینہ والوں کے لئے اگلی صف میں جگہ بنائی جا رہی تھی۔ جو اپنے آپ کو اُونچا سمجھتے تھے اُن کو پستی میں دھکیلنے کا فیصلہ ہوگیا۔ اور جن کو متقابلۃً نچلے درجہ پر رکھا جاتا تھا۔ وہی لوگ اُٹھا کر اُوپر لائے جا رہے تھے!

مگر تشدد کی داستان کا یہ کوئی آخری باب نہیں ہے۔ دشمنانِ حق نے مدینہ میں بھی یہودیوں کے ذریعہ سازش کے تار ہلانے شروع کردیئے اور منافقین کے ایک گروہ کو آلۂ کار بنا لیا۔ وہاں بھی استہزاء، غنڈہ گردی، دشنام طرازی۔ فتنہ پردازی اور مفسدانہ سازشوں کا ایک دور نئے سرے سے شروع ہوگیا۔ علاوہ بریں اب قریش کا ذوقِ تشدد اس بات کی تیاری میں لگ گیا کہ علانیہ میدانِ جنگ میں تحریکِ حق کی طاقت کو چیلنج کرے۔ ساری عمر قریش اور یہودیوں اور منافقوں نے نبی اکرمؐ کو امن چین کا ایک سانس بھی نہیں لینے دیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ "لوگوں نے مجھے بوڑھا کردیا" مدینہ میں واقعہ افک جیسی شرارتوں سے آپؐ کا کلیجہ چھلنی کرنے کی کوشش کی گئی انصار اور مہاجرین کو لڑانے کی تدبیریں عمل میں لائی گئیں۔ محسنِ انسانیت کو قتل کرنے کے لئے بھی متعدد بار سازشیں ہوئیں اور اقدام کئے گئے۔

آپؐ نے ساری زندگی ایک امتحانِ مسلسل میں گزاری۔ اور اس کڑی آزمائش اور سخت امتحان میں بال برابر بھی اِدھر سے اُدھر نہ ہوئے۔ حق و باطل کے اس جہاد میں میدان حضورؐ ہی کے ہاتھ رہا!

(۱۸)

آخر کیا بات ہے کہ ایک فرد تنہا اُٹھا اور چند سال میں اُس نے قوم کی کایا پلٹ دی۔ لیکن اس کے مقابلے میں مخالفین کا جو انبوہ کثیر ہر تدبیر لڑا رہا تھا اور ہر چال چل رہا تھا وہ ناکام و نامراد ہوکر رہ گیا۔ تقدیر کے اس فیصلے کے پیچھے کئی اسباب کام کرتے نظر آتے ہیں:۔

— آنحضورؐ خلوص اور بے لوثی کی شان کے ساتھ اُٹھے تھے۔ لیکن آپؐ کے مخالفین اغراض اور مفاد کے لئے سارا طوفان اُٹھا رہے تھے۔

— آنحضورؐ ایک دعوتِ خیر و فلاح کے علمبردار تھے۔ مگر مخالفین مقابلہ پر کوئی دعوتِ خیر و فلاح نہیں پیش کر رہے تھے۔

— آنحضورؐ انسانیت کو ایک جاہلی نظام سے نجات دلانے کے لئے اُٹھے تھے۔ جس کے خلاف فطرتِ انسانی خود دہائی دے رہی تھی۔ لیکن مخالفین اس ناخوشگوار نظامِ باطل کو جوں کا توں قائم رکھنے کے لئے قوت صرف کر رہے تھے۔

— آنحضورؐ کا پیغام ایک جاندار مثبت پیغام تھا۔ لیکن آپؐ کے مخالفین صرف ایک بےجان منفی بات لے کر میدان میں اُترے تھے!

— آنحضورؐ دلیل کی مکمل طاقت سے آراستہ تھے اور انسانی عقل و فکر کو خطاب فرما رہے تھے۔ مگر مخالفین کے پاس سوائے جذباتی اُبال کے اور کچھ نہ تھا۔ اور وہ عام لوگوں میں صرف ایک جذباتی ردِّ عمل پیدا کرنے کے درپے تھے!

— آنحضورؐ ایک با مقصد منظم جماعت اور معاشرے کی تاسیس فرما رہے تھے۔ لیکن دوسری طرف ایک انتشار زدہ انبوہ تھا!

— آنحضورؐ اور آپؐ کے ساتھی ایک بے مثال کردار کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور یہ مظاہرہ ایک ہی شان کے ساتھ برسوں جاری رہا۔ لیکن دوسری طرف سے ایک انتہائی گھٹیا ڈلنے اور گندے کیرکٹر کو مقابلے میں لایا گیا تھا!

— آنحضورؐ اور آپؐ کے رفقاء مظلومانہ صبر کے مقام پر تھے۔ لیکن حریف طاقت ظلم و زیادتی کا موقف اختیار کئے ہوئے تھی!

— اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضورؐ کے ساتھ حق تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید اور یقین و ایمان کی طاقت تھی اور اللہ کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن دوسری طرف باطل تھا۔ بےیقینی تھی اور اللہ کو چھوڑ کر خود اپنی طاقت پر ناز تھا!

یہ تھے وجوہ جس کا نتیجہ وہ نکلا جس پر تاریخ فخر کرتی ہے۔ حق کا بول بالا ہوا۔ اور نظامِ جاہلیت اُس کے پاسبانوں کے دیکھتے دیکھتے پاش پاش ہو گیا!

(۱۹)

اس تاریخ — اور اس کو پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے۔ مگر خدارا کبھی اس نیت سے پڑھیئے کہ اس تاریخ سے سبق لینا ہے۔ اس سے عبرت حاصل کرنی ہے۔ اس سے وہ اصول اخذ کرنے ہیں جو فلاح و کامرانی کا وسیلہ ہیں اور اس سے ان خطرات و مہالک کو جاننا ہے۔ جو انسانی زندگی کے راہزن بنے ہر ہر قدم پر سامنے آتے ہیں۔ اس تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ تو اس عزم سے کیجئے کہ وہی بازی ہم کو بھی کھیلنی ہے۔ وہی دعوت برپا کرنی ہے۔ وہی تحریک اٹھانی ہے۔ وہی نظامِ جماعت استوار کرنا ہے۔ اسی حق کا جھنڈا بلند کرنا ہے۔ اسی کردار کو پیدا کرنا ہے۔ اسی طریق کار کو اپنانا ہے۔ اور انجام کار اسی طرز کی ریاست اور اسی ڈھنگ کے نظامِ اجتماعی کو نصب کرنا ہے!

ہاں! اس تاریخ کو پڑھیئے۔ تو اس مقصد سے پڑھیئے کہ اس کی روشنی میں اپنے دور کی تاریخ کو سمجھنا ہے۔ اس کے آئینے میں گرد و پیش کے کرداروں کے چہرے پہچاننے ہیں۔ اس کے ذریعہ اس طاقت کو پہچاننا ہے جو دعوتِ محمدیؐ کی تجدید کا کام کرنے والی ہو۔ اور دوسری طرف ان طاقتوں کو بھی پہچاننا ہے جو استہزاء، دشنام طرازی، ایذادہی، مخالفانہ تحریک، اشتعال انگیزی، تکفیر و تفسیق، اور ظلم و تشدد کی ساری تاریخی تدبیروں کے ساتھ [illegible] اور ردِ عملی ہنگامے اُٹھا رہی ہیں۔ اور جس کے سامنے اصل سوال اپنے سیاسی و مذہبی مناصب، اپنی چودھرا-

اپنے معاشی مفاد، اپنے اثر و نفوذ اور اپنی بگڑی ہوئی عادات کے تحفظ کا ہے!

اگر تاریخ اسلام اور سیرت انبیاء سے یہ فائدہ اٹھانا مطلوب نہ ہو تو پھر آخر کاہے کے لئے ان موضوعات پر جلسے اور میلاد کی مجلسیں منعقد کرتے ہو۔ کاہے کے لئے صفحے کے صفحے رنگتے ہو، کس کے لئے کتابیں چھاپتے ہو۔ کاہے کے لئے رسالوں کے سیرت نمبر نکالتے ہو۔ کیا محض تفریح اور وقت گزاری کیلئے ؟

انبیاء کی ہستیوں اور اُن کے کارناموں کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ اُن کی داستانوں کو وقت گزاری کا ذریعہ بنایا جائے یہ مقدس ہستیاں ہم سب کی محسن ہیں اور ان میں سے آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے اور سارے انسانوں کے محسنِ اعظم ہیں۔ ایسی ہستیوں کی سیرت کا مطالعہ صرف طلبِ ہدایت و رہنمائی کے لئے ہونا چاہیئے اور اس سے اسوۂ حسنہ اخذ کرنا چاہیئے!

اے اللہ! ہم اپنے محسنِ اعظم کے احسانات کے بے حد زیر بار ہیں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کے کسی احسان کا بھی بدلا اپنے پاس سے دے سکیں!

اے اللہ! تو ہمارے محسنِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اپنی رحمتیں اور برکتیں نازل فرما۔ ہم سائل اور فقیر ہو کر تیرے دربار میں حاضر ہوئے ہیں۔ تو اپنے خزانۂ لازوال سے ہمارا واجب الادا حساب چکا دے!

اللّٰھم صلِّ و بارک علیٰ محمدٍ و علیٰ آلِ محمدٍ کما صلیت و بارکت علیٰ ابراھیم و علیٰ آلِ ابراھیم انک حمیدٌ مجید

(مولانا) ظفر احمد عثمانی

بارگاہِ رسالت میں

زال الظلام ولاح النور فی الافق — برق تألق فی داج من الغسق
تاریکی دور ہو گئی اور آفاق میں روشنی نمودار ہو گئی — ایک بجلی گھٹا ٹوپ اندھیری میں چمک رہی ہے

برق من الطور او بدر علی جبل؟ — ببطن مکۃ منشق علی فلق!
یہ کوہ طور کی بجلی ہے یا مکہ کی بستی کے پہاڑ پر چاند ہے؟ — جو ٹکڑے ہو کر پھٹ گیا ہے۔

واھا لہ من نبی لا مثال لہ — فاق الخلائق فی خَلق وفی خُلق
مرحبا! یہ کیسے نبی ہیں جن کی مثال نہیں مل سکتی — تمام مخلوقات سے صورت اور سیرت میں بہتر اور بڑھ کر ہیں۔

محمد خاتم الانبیاء سیدھم — حامی الحقیقۃ مفتاح لمنغلق
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)، خاتم انبیاء، سردار انبیاء — حق کے حامی، اور بند دروازوں کے کھولنے والے ہیں

اتقی الانام وازکاھم واعلمھم — باللہ احلمھم فی الرتق والفتق
تمام مخلوق میں زیادہ متقی سب سے زیادہ پاکیزہ اور سب سے — زیادہ اللہ کی معرفت والے اور صلح و جنگ میں سب سے زیادہ بردبار ہیں

زاکی النجار جمیل الوجہ احسنھم — یمحو الظلام کبدر التم فی الافق
پاکیزہ سرشت خوبصورت چہرے والے سب سے زیادہ حسین — تاریکی کو ایسا مٹاتے ہیں جیسا آفاق میں بدر کامل

قد جاء والناس فی ھرج وفی مرج — والظلم عم بسیط الارض بالقلق
آپ ایسے وقت تشریف لائے کہ لوگوں میں فساد مچا ہوا تھا — اور ظلم نے تمام روئے زمین کو ہلا ڈالا تھا

والجھل کاللیل قد ارخی ذوائبہ — فی غیھب کفر علی الآفاق منطبق
اور جہالت نے رات کی طرح (کالی) زلفیں بکھیر رکھی تھیں — کفر کے بادل کے اندر جو تمام آفاق پر چھایا ہوا تھا۔

فانشق صبح الهدیٰ من نور طلعته ... یجلو غیاهب لیل الجهل والحمق

پس آپ کے چہرۂ مبارک کے نور سے ہدایت کی صبح ... جہالت و حماقت کی رات کی تاریکیاں چھانٹتی ہوئی نمودار ہوئی

فاصبح الناس فی علم وفی حکم ... بنعمة الله بعد الضل والخرق

اب لوگ اللہ کے فضل سے علوم و حکم سے مالا مال ہو گئے ... گمراہی اور بے وقوفی کے بعد

واصبحت امة امیة عرفت ... بالجهل سابقة الاقوام والفرق

اور وہ ان پڑھ قوم جو جاہلیت کے نام سے مشہور تھی ... تمام اقوام اور تمام جماعتوں سے آگے بڑھ گئی

فالعلم والعدل سار اتحت رأیتها ... والفتح والنصر والاقبال فی الطرق

اب علم و عدل اُس کے جھنڈے کے نیچے چلتے تھے ... اور فتح و نصرت و اقبال اس کے راستے میں تھے

والصبر والصدق والاخلاص حلتها ... ورایة العز فی الآفاق بالخفق

صبر و صدق اور اخلاص اس کا لباس تھا ... اور عزت کا جھنڈا چاروانگ عالم میں لہرا رہا تھا

حب النبی وتقوی الله حلیتها ... والیمن والسعد مثل العقد فی العنق

حُب رسُول اور خوفِ خدا اُس کا زیور تھا ... اور برکت و سعادت گلے کا ہار تھی!

یا اکرم الناس عند الله منزلة ... وافضل الخلق من جمع ومفترق

اے وہ جو اللہ کے نزدیک رتبہ میں سب سے زیادہ مکرم ہے ... اور تمام مخلوق سے خواہ اجتماعی صورت میں ہو یا انفرادی حالت میں افضل ہے

قد خصک الله بالاسراء لیلة اذ ... ترقی السموٰت من طبق الی طبق

اللہ نے آپ کو معراج کیساتھ مخصوص کیا ہے ایک رات میں ... جبکہ آپ آسمانوں کو درجہ بدرجہ طے فرما رہے تھے

اوتیت علما وحلما زان خلق ... وحکمة انت فیها حائز السبق

آپ کو علم اور حلم دیا گیا جس کو خلقِ عظیم نے زینت بخشی ... اور ایسی حکمت دی گئی جس میں آپ ہی سب سے آگے ہیں

وعفة ادبا دیناً وصحبة ... للعالمین وبه[illegible] خیر ذی رنق

اور عفت و ادب، تہذیب و دیانت اور [illegible] ... والوں پر رحم دیا گیا اور ایسا انصاف جو ہر [illegible]

امانةً صلةً للرحم مكرمةً
فصلَ الخطاب ووحيا غير مختلَق
امانت، صلہ، رحمی، کرم فرمائی عطا ہوئی اور
فیصلہ کن گفتگو اور ایسی وحی جو افتراء و کذب سے پاک ہے

بلاغةً اخجلت من رامها ورمت
مبارزيها بذل الابكم الخرِق
اور ایسی بلاغت دی گئی کہ جس نے اس کا قصد کیا شرمندہ ہو کر رہ گیا
اور جس نے مقابلہ کیا اُسکو گونگے بیوقوف جیسی ذلّت کا سامنا ہوا۔

وباهرات من الآيات معجزةً
تبدو لناظرها بالليل كالشفق
اور روشن نشان دیئے گئے جن کے مقابلہ سے دُنیا عاجز ہے
وہ رات میں بھی دیکھنے والوں کیلئے ایسے چمکتے ہیں جیسے شفق کی سُرخی

شجاعة واصطبارا يوم ملحمة
اذ تطيش يد الرعديدة الفرِق
میدانِ جنگ میں بہادری و استقلال آپ ہی کا حصہ ہے
جبکہ بزدلوں، ڈرپوکوں کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں۔

كنت الغياث لايتام وارملة
امست من الجوع كالبالي من الورق
آپ یتیموں، بیواؤں کے فریادرس تھے جو
فاقہ سے اس طرح سُکڑ گئے تھے جیسے پُرانا پتہ

كنت الملاذ لمضطر ومضطرب
من المساكين للآفات معتنِق
آپ مساکین میں سے ہر بے چین بے قرار کیلئے جو آفتوں سے
گلوگیر ہو چکا تھا جائے پناہ تھے۔

طابت بغرتك الميمون طلعتها
مدينة احدقت بالبيض والدرق
آپ کے مبارک چہرہ کی روشنی سے مدینہ بارونق ہو گیا
جس کو (دشمنوں نے) تلواروں اور ڈھالوں سے گھیر لیا تھا

جاهدت كل كفور قد عصى وطغى
وزاده غيه رهقا على رهق
آپ نے ہر کافر سے جہاد کیا جو نافرمانی اور سرکشی پر
تُلا ہوا تھا اور گمراہی نے اسکے ظلم و حماقت میں اضافہ کر دیا تھا

انت النجاة لمن امسى بمرتكم
من الظلام ببحر زاخر عمِق
جو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بحر زخار عمیق کے اندر
پھنسا ہوا ہو اُس کیلئے آپ ہی ذریعۂ نجات ہیں

انت العماد لقوم لاعماد له
انت الرشاد لمن قد ضل في طرق
جس قوم کا کوئی سہارا نہ ہو اس کیلئے آپ ہی سہارا ہیں
جو مختلف راستوں میں بھٹک رہا ہو اس کیلئے آپ ہی رہنما ہیں۔

انت الحبیب لمن حلت سعادتہ　　ولیس یرغب عنہا غیر کل شقی

جس کی سعادت کا وقت آگیا ہو اُسکے محبوب آپؐ ہی ہیں　　اور اس سعادت سے بدبخت کے سوا کوئی بھی بیرخی نہیں کر سکتا

یا خاتم الرسل حب اللہ صفوتہ　　یا بکر آمنۃ الزہراء کالفلق

اے خاتم رُسل! اللہ کے محبوب! اللہ کے برگزیدہ!　　اے آمنہ کے لال! جو صبح کی طرح روشن ہیں

عسٰی اَنال غدًا منک الشفاعۃ اِذ　　قد اُلجم الناس للاٰثام بالعرق

میں امید کرتا ہوں کہ فردائے قیامت میں آپؐ کی شفاعت سے بہرہ یاب　　ہوں گا جب گناہوں کی وجہ سے لوگوں کا پسینہ مُنہ تک جائیگا

وَانت تسقی ولا ساقٍ سواک لھم　　کأسًا یطاف بماءٍ بارِدٍ غدقٍ

اُسوقت آپؐ لوگوں کو ٹھنڈے پانی کا لبریز جام پلاتے　　ہونگے جبکہ آپؐ کے سوا اور کوئی ساقی نہ ہوگا

ثم الصلوۃ صلوۃ لا انقضاء لہا　　علی النبی مع الاصحاب فی الرفق

اس کے بعد ایسا درود جو کبھی ختم نہ ہو نازل ہو　　رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے اصحاب رفقاء پر

واھل بیت رسول اللہ کلھم　　ما لاح بدر الدجی والشمس فی الافق

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اہلِ بیت پر　　جب تک چاند اور سورج آفاق میں چمکتے رہیں۔

تمت

سیرت نمبر

جنوری سنہ ۱۹۵۶ء کا شمارہ ہے۔ فروری سنہ ۱۹۵۶ء کا شمارہ
حسب سابق شائع ہوگا۔ (انشاء اللہ العزیز)

پروفیسر عبدالحمید ایم اے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند مغربی سیرت نگار

وہ شخصیت جس کے بارے میں بلاشبہ سب سے زیادہ سوچا اور کہا گیا ہے وہ حضور سرورِ کائنات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس ذات ہے۔ ایسا ہونا بالکل ایک فطری امر ہے۔ حضورؐ کی جامع شخصیت اس بات کی مقتضی ہے کہ دنیا کا ہر شخص اس پر غور و تدبر کرے۔ تاریخ کی اس سب سے بڑی شخصیت کو نظر انداز کرنا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ اگر مطالعۂ فطرت کے بعد ہم یقین رکھتے ہیں کہ دنیا انسانی مزاجوں، انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کا نام ہے۔ تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حضورؐ کے بارے میں مختلف لوگوں نے کیوں ایک سا اندازِ فکر اختیار نہیں کیا۔ جس طرح ابرِ باراں اگرچہ پہاڑ جنگل، میدان، کھیت اور ریگستان میں ایک جیسا برستا ہے۔ مگر ان میں سے ہر چیز ایک ہی طرح سیراب نہیں ہوتی۔ اسی طرح حضورؐ کے وجودِ مبارک سے انسانوں کے مختلف گروہوں نے مختلف قسم کے تاثرات لئے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ میں اس سلسلہ میں اہلِ مغرب کے خیالات پیش کردوں۔ مگر کسی تفصیلی گفتگو کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی ذہنی کیفیات کا ایک سرسری سا جائزہ لے لیا جائے!

مغرب کے بارے میں ایک بدیہی حقیقت جسے کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے کہ مذہب کے معاملہ میں پچھلے دو سو سال سے اس کا ذہن شدید تعصب میں گرفتار ہے۔ وہاں کے رہنے والوں نے غلطی سے یہ فرض کر لیا ہے کہ مذہب سے متعلق جو چیز بھی ہوگی وہ سراپا جہالت ہوگی۔ اس لئے خدا، وحی، حشر و نشر سب اوہام ہیں۔ جنہیں دنیا کی "جاہل اقوام" ابھی تک اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا اگر انہوں نے مذہب کے کسی پیشوا کا مطالعہ بھی کیا تو اس نقطۂ نظر سے نہیں کہ اس پاک ذات نے انسانوں کے اندر کس حد تک فکرِ آخرت پیدا کی۔ اُن کے اندر فسق و فجور کو ختم کیا اور انھیں صحیح معنوں میں معرفتِ الٰہی عطا کی۔ اُن کا مطالعہ ان نفوسِ قدسی کے متعلق بھی صرف اُنہی مسائل تک محدود رہا کہ انہوں نے کتنے ممالک فتح کئے، اپنی قوم کے لئے کس قدر دنیاوی ساز و سامان اکٹھا کیا۔ ابنائے وطن کو کن مادی منفعتوں سے مالا مال کیا۔ پھر ان میں سے جن مفکرین نے بھی شہرت حاصل کی۔ وہ وہی تھے جنہوں نے انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ محسوس لذائذ سے فائدہ اٹھانے [illegible] دنیا۔ اس [illegible] اندر [illegible] صحیح [illegible] کوشش کے باوجود سمجھنے سے قاصر رہے!

اس کے علاوہ دوسری چیز جو قاری کو اس سلسلہ میں ذہن نشین رکھنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اہلِ مغرب اگر کسی مذہب سے روشناس بھی ہیں تو وہ صرف عیسائیت ہی۔ مگر بدقسمتی سے اس کے متعلق بھی اُن کا تصور سخت ناقص ہے۔ اُن کے نزدیک مذہب انسان اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ ہے۔ اور اس کا دائرہ صرف پوجا پاٹ تک محدود ہے۔ اس کا کوئی تعلق بھی انسان کی مادی زندگی سے نہیں۔ اس لئے اُن کے ہاں کوئی ایسی ذات صحیح معنوں میں مقدس نہیں سمجھی جو ملک و دین کی

دُوئی کو ختم کر کے اور انسانیت کو ایک فطری وحدت کا سبق دے!

اُن کے ذہین سے ذہین افراد بھی اس حقیقت کو سمجھنے سے آج تک قاصر ہیں کہ انسان اپنے ہر دُنیاوی معاملہ میں بھی ایک روحانی اور معنوی نقطۂ نظر رکھتا ہے جو در اصل اُس عقائد کا عکس ہوتا ہے۔ اگر نیت کا روحانی سرچشمہ گدلا ہو جائے۔ تو جو اعمال بھی صادر ہوں گے وہ خلوص و حقانیت سے معرّا ہونے کی وجہ سے نہایت گھناؤنے ہوں گے۔ لہٰذا جب اُن کے سامنے کوئی ایسی ذات آتی ہے جس نے درِ دُنیا کو کلیدِ دین سے کھولنے کی کامیاب کوشش کی۔ جس نے سیاست اور معیشت کو اخلاق کے تابع کیا۔ جس نے قوت و جبروت اور فقر و انکسار کو ہمرکاب کیا۔ تو وہ نہیں سوچ سکتے کہ آخر اس کی شخصیت کو کس طرح پیش کریں اور اس کا تاریخ میں کیا مقام تعین کریں!

تیسرے بعض سیاسی وجوہ سے بھی اہلِ مغرب کا رویّہ اسلام سے شروع ہی سے معاندانہ چلا آ رہا ہے۔ صلیبی جنگوں کی تلخ یاد ابھی تک اُن کے ذہن سے محو نہیں ہوئی۔ پھر بدقسمتی سے یہ لوگ استعماری عزائم کے ساتھ مسلمان ممالک پر پچھلی صدی میں قابض ہوئے مسلمانوں پر ایک مدّت دراز تک حکمرانی کرنے کے بعد ابھی تک وہ مسلم قوم کی نفسیات نہیں سمجھ سکے۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ اُن کے یہاں جو طبقہ مذہبی کہلاتا ہے۔ وہ دُنیا اور اُس کے سارے کاروبار سے مُنہ موڑ کر جنگلوں اور ویرانوں کا رُخ کرتا ہے اور ظلم کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے ایک ایسی آزاد فضا مہیا کرتا ہے۔ جس میں وہ بلا روک ٹوک پروان چڑھے۔ مگر اس کے برعکس یہاں جو طبقہ مذہب کا پرستار ہے وہ حریت پسند ہے۔ وہ نہ تو غیر ملکی سامراج کو پسند کرتا ہے اور نہ ملکی جبر و استبداد کو گوارا کرتا ہے۔ وہ استعماری عزائم کا مخالف ہے۔ اس کشمکش میں جس میں سارا قصور غیر ملکی استعمار کا تھا۔ بیچارے اسلام کو خواہ مخواہ ہدفِ ملامت بنایا گیا۔ اہلِ فرنگ اس "انوکھے مذہب" کو دیکھ کر حیران ہوئے کہ آخر دین کی یہ کونسی قسم ہے جو اس قوم کو آزادی کے حصول کے لئے اُبھارتی ہے۔ جو قرآن اس کے اندر یہ احساس بیدار کرتی ہے کہ اُن کی اجتماعی زندگی اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی سیاست اور معیشت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و ہدایات کے مطابق ڈھال نہ لیں۔ چونکہ مسلم قوم دینی جذبہ سے سرشار ہو کر ہی غیر ملکی اقتدار کا جُوا اپنے کندھے سے اُتار پھینکنے کے لئے جدوجہد کرتی رہی اس لئے حاکم قوم کو سب سے زیادہ نفرت اسی دین کے خلاف پیدا ہوئی!

پھر اہلِ مغرب مذہب و سیاست کی تفریق کو تسلیم کر لینے کے بعد اس عقیدے کے سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کوئی شخصیت خواہ کتنی بڑی ہی کیوں نہ ہو۔ کسی فرد یا جماعت کی اس معنیٰ میں مطاع ہو سکتی ہے کہ اُس کا ہر فعل اور ہر حکم قیامت تک کے لئے واجب الاطاعت اور واجب العمل ہو۔ اُس کی حکم عدولی سے نہ صرف دُنیا برباد ہو بلکہ آخرت بھی ضائع ہو جائے۔ اُس کی بے چون و چرا اطاعت و فرمانبرداری سے ہی اس کی نجات وابستہ ہو۔ وہ ذات ہر عیب سے پاک، ہر خطا سے منزہ۔ ہر دُنیاوی خواہش سے بالا ہو۔ اُس کی محبت سب محبتوں پر غالب ہو۔ جن جن طریقوں کو اُس نے پسند کیا ہے انھیں اختیار کیا جائے۔ اور جن جن راستوں پر چلنے سے اُس نے منع فرما دیا ہے اُن سے بہ رضا و رغبت اپنے آپ کو ہٹا لیا جائے۔ پھر اُسے اللہ تعالیٰ کے منشاء کو نوعِ انسانی تک پہنچانے والا آخری پیغمبر تسلیم کیا جائے۔ اور پھر اس بات کو بھی دل میں اُتارا جائے کہ جس طرح اس نے پیغام الٰہی کو سمجھا ہے وہی اس کی صحیح ترین صورت ہے۔ جو اس سے ہٹ کر کوئی کام کرتا ہے وہ گمراہ ہے۔ جو اس پیغام کی کوئی ایسی تعبیر کرتا ہے جو اُس کی پیش کی ہوئی تعبیر کے برخلاف ہے تو وہ دُنیا اور آخرت میں سخت گھاٹے کا سودا کرتا ہے۔ اُس کے احکام زندگی کے کسی ایک شعبہ سے متعلق نہیں۔ بلکہ زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہیں۔

ان چند ابتدائی گزارشوں کے بعد اب ہم حضورؐ کے چند مغربی سیرت نگاروں کی آراء پیش کرتے ہیں۔ اُن سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان میں سے اکثر حضرات اپنی نیک نیتی کے باوجود حضورؐ کی شخصیت کا صحیح طور پر مطالعہ نہ کر سکے!

حضورؐ کے مغربی سوانح نگاروں کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ علماءِ اسلام کی وہ سعی اور جدوجہد ہے جس سے انہوں نے اپنے ہادیٔ برحق کی زندگی کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ مشہور جرمن ڈاکٹر اسپرنگر نے جو ۱۸۵۴ء اور اس کے بعد تک ہندوستان کے تعلیمی صیغہ سے متعلق تھے۔ انہوں نے "الاصابۃ فی احوال الصحابہ" (حافظ ابن حجر) کے انگریزی مقدمہ میں بالکل صحیح لکھا ہے:-

"نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے۔ جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم فن ایجاد کیا ہے۔ جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانت داری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعات آج اسلام کے مفاخر میں ہیں۔ راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امراء بھی تھے۔ جن کی تلواروں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی اور اُن کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں اُن کو مل سکتا تھا۔ امام وکیع بہت بڑے محدث تھے لیکن اُن کے باپ سرکاری خزانچی تھے۔ اس بناء پر وہ خود ان سے جب روایت کرتے تو اُن کی تائید میں کسی دوسرے راوی کو ضرور ملا لیتے۔ یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے"۔

یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ اس حقیقت کو باسورتھ نے اپنی کتاب "محمدؐ اور محمدازم" میں تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:-

"جو کچھ عام طور سے مذہب کی ابتداء نامعلوم ہونے کی نسبت صحیح ہے۔ وہی بدقسمتی سے ان تین مذہبوں اور اُن کے بانیوں کی نسبت بھی صحیح ہے جن کو ہم کسی بہتر نام موجود نہ ہونے کے سبب تاریخی کہتے ہیں۔ ہم مذہب کے اوّلین اور ابتدائی کارکنوں کی نسبت بہت کم اور اُن کی نسبت جنہوں نے اُن کی محنتوں میں بعد کو اپنی محنتیں ملائیں، شاید زیادہ جانتے ہیں۔ ہم زرتشت اور کنفیوشس کے متعلق اس سے کم جانتے ہیں جو سولن اور سقراط کے متعلق جانتے ہیں۔ موسٰیؑ اور بودھ کے متعلق اس سے کم واقف ہیں۔ جو امبروس اور سیزر کے متعلق ہمیں معلوم ہے۔ ہم درحقیقت مسیح کی زندگی کے چند حصوں میں سے صرف ایک حصہ سے آشنا ہیں۔ ان تین برسوں کی حقیقت سے کون پردہ اٹھا سکتا ہے جس نے تین سال کے لئے راستہ تیار کیا۔ ایک مثالی زندگی جو بہت دور بھی ہے اور قریب بھی ہے۔ ممکن بھی ہے اور ناممکن بھی۔ لیکن اس کا کتنا حصہ ہے جسے ہم جانتے ہی نہیں۔ ہم مسیح کی ماں، مسیح کی خانگی زندگی، اُن کے ابتدائی احباب۔ اُن کے ساتھ اُن کے تعلقات۔ اُن کے روحانی مشن کے تدریجی طلوع یا یک بہ یک ظہور کی نسبت ہم کیا جانتے ہیں ہم اُن کے

بارے میں کتنے سوالات ہم میں سے ہر ایک کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ جو ہمیشہ سوالات ہی رہیں گے۔ لیکن اسلام میں ہر چیز ممتاز ہے۔ یہاں دُھندلاپن اور راز نہیں ہے۔ ہم تاریخ رکھتے ہیں۔ ہم محمدؐ کے متعلق اس قدر جانتے ہیں جس قدر لوتھر اور ملٹن کے متعلق جانتے ہیں۔ متھالوجی، فرضی افسانے اور مافوق الفطرت واقعات ابتدائی عرب مصنفین کے یہاں نہیں ہیں۔ یا اگر ہیں تو وہ آسانی سے تاریخ سے الگ کئے جا سکتے ہیں۔ کوئی شخص یہاں نہ خود کو دھوکا دے سکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے۔ یہاں پورے دن کی روشنی ہے۔ جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک پہنچ سکتی ہے۔

اسی طور پر حضورؐ کا ایک اور وقائع نگار Jhon Derenport اپنی مشہور تصنیف Apology for Muhammad and The our an میں اس حقیقت کا نہایت واضح الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:۔

"اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقنن اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں کہ جس کی زندگی کے واقعات محمدؐ کے وقائع حیات سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں"

دوسری چیز جس نے حضورؐ کے مغربی سیرت نگاروں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاص ہے۔ اُن کی عقل یہ سمجھنے میں کافی دقت محسوس کرتی ہے کہ کوئی شخص اپنی خارجی اور داخلی زندگی میں ایک ہی طرح کا کردار پیش کرے اس کی پرائیویٹ لائف پبلک لائف سے مختلف نہ ہو۔ یہ چیز اُن لوگوں کے لئے مایۂ حیرت ہے۔ انسان کے اخلاق و عادات، اور اعمال کا بیوی سے بڑھ کر کوئی واقف کار نہیں ہو سکتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کا دعویٰ کیا۔ تو اس وقت حضرت خدیجہؓ رضی اللہ عنہا پندرہ برس آپ کی معیت میں رہ چکی تھیں۔ اور یہ مدت اتنی بڑی ہے کہ جس میں ایک انسان دوسرے کے عادات اور خصائل کو اچھی طرح جان سکتا ہے۔ اس واقفیت کا اثر حضرت خدیجہؓ پر یہ پڑتا ہے کہ ادھر آپؐ کی زبان سے اپنی نبوت کی خبر نکلتی ہے اور اُدھر حضرت خدیجہؓ کا دل اُس کی تصدیق پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

حضورؐ کی تمام بیویوں میں حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے زیادہ محبوب حضرت عائشہؓ تھیں۔ حضرت عائشہؓ نو برس متصل آپؐ کی صحبت میں رہیں۔ وہ گواہی دیتی ہیں کہ:۔

"حضورؐ کی عادت کسی کو بُرا بھلا کہنے کی نہ تھی۔ بُرائی کے بدلے میں بُرائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور معاف کر دیتے تھے۔ آپ گناہ کی باتوں سے کوسوں دُور رہتے تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام اور بدلہ نہیں لیا۔ آپنے کبھی کسی غلام، لونڈی، عورت یا خادم کو یہاں تک کہ کسی جانور کو کبھی نہیں مارا۔ آپؐ نے کبھی کسی کی جائز درخواست اور فرمائش کو رد نہیں فرمایا۔" [۱]

اسی طرح رشتہ داروں میں حضرت علیؓ سے بڑھ کر کون محرم راز ہو سکتا ہے۔ وہ گواہی دیتے ہیں:۔

"آپ ہنس مکھ، طبیعت کے نرم۔ اور اخلاق کے نیک تھے۔ طبیعت میں مہربانی تھی۔

---

[۱] بحوالہ خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم۔

سخت مزاج نہ تھے۔ کوئی بُرا کلمہ کبھی منہ سے نہیں نکالتے تھے۔ لوگوں کے عیب اور کمزوریوں کو نہیں ڈھونڈا کرتے تھے۔ کسی کی کوئی فرمائش اگر مزاج کے خلاف ہوتی تو خاموش رہ جاتے۔ نہ اُس کو صاف جواب دے کر مایوس کر دیتے اور نہ اپنی منظوری کا اظہار فرماتے۔ واقف کار اس رمز خاص سے سمجھ جاتے کہ آپؐ کا منشار کیا ہے۔ یہ اس لئے تھا کہ آپؐ کسی کا دل توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ دلوں پر مرہم رکھتے تھے۔ کہ آپ رؤف و رحیم تھے۔ آپ نہایت ہی فیاض، بہت بڑے سخی، راست گو اور نرم طبع تھے۔ لوگ آپؐ کی صحبت میں بیٹھتے تو خوش ہو جاتے۔ آپ کو پہلی دفعہ جو دیکھتا وہ دیکھ کر مرعوب ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے وہ آپؐ سے ملتا تھا۔ آپؐ سے محبت کرنے لگتا۔" (بحوالہ خطبات مدراس)

اس سلسلہ میں شاید سب سے زیادہ قابل قبول شہادت حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر کے صاحبزادہ حضرت ہندؓ کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:-

"آپؐ کی طبیعت میں نرمی تھی۔ سخت مزاج نہ تھے۔ کسی کا دل نہیں دُکھاتے تھے۔ کسی کی عزت کے خلاف کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ لوگوں کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ کسی چیز کو بُرا نہیں کہتے تھے۔ کھانا جس قسم کا سامنے آتا تھا کھا لیتے۔ اُس کو بُرا نہ کہتے۔ آپؐ کو اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا۔ اور نہ کسی سے بدلہ اور انتقام لیتے اور نہ کسی کی دل شکنی گوارا کرتے۔ لیکن اگر کوئی کسی حق بات کی مخالفت کرتا تو اس حق کی حمایت اور طرفداری میں آپؐ کو غصہ آجاتا اور اس حق کی پوری پوری حمایت فرماتے تھے۔"

گھر والوں کی ان شہادتوں کو دیکھ کر جان ڈیون پورٹ نے بصراحت اس بات کو تسلیم کیا ہے:-

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاص کی سب سے بڑی شہادت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُن پر سب سے پہلے ایمان لانے والے یا تو اُن کے جگری دوست تھے۔ یا اُن کے گھر کے افراد۔ جو اُن کی گھریلو زندگی سے پوری طرح واقف تھے۔ وہ ضرور اُن خامیوں کو جان جاتے جو عام طور پر ایک مکار کے اعمال میں پائی جاتی ہیں۔"

مشہور مؤرخ اسٹینلے لین پول نے بھی اسی چیز کو حضور سرور کائنات کے اخلاص کی سب سے بڑی شہادت خیال کیا ہے:-

"سب سے پہلے انہوں نے اپنے قریب کے رشتہ داروں اور احباب کو دعوت دی اور اس حقیقت کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کے سب سے گہرے دوست اور وہ افراد جو اُن کے ساتھ رہتے تھے، وہی سب سے پہلے ایمان لائے۔ کسی نبی پر اُس کے اپنے گھر والوں کا ایمان لے آنا۔ اُس کے اخلاص کی سب سے مضبوط دلیل ہے۔"

اسی مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہودیوں کے بارے میں طرز عمل کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہودیوں نے ہی نہایت ہی شرمناک طریقوں سے اپنے عہد و پیمان کو توڑا اور وہ ہر وقت ملّت اسلامیہ کے خلاف بغاوت پھیلانے میں مشغول رہتے۔ پروفیسر لین پول کہتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے بعض کو سخت سزا دی گئی۔ مگر ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اُن کا

جرم محاصرہ کے وقت ریاست کے خلاف بغاوت تھا۔ یہ چیز اُن لوگوں کے لئے کوئی حیرت انگیز نہیں جنہوں نے اُن ساری تفصیلات کا مطالعہ کیا ہے کہ کس طرح ولنگڈن نے فتح کے بعد مغلوب ہونے والوں پر ظلم وستم کیا۔ اُن کی لاشوں کو درختوں پر لٹکا دیا۔ اور اس طرح انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کیا"۔

ان مغربی مصنفین میں سے اکثر کو جس چیز نے متاثر کیا ہے۔ وہ مکہ میں حضورؐ اور اُن کے ساتھیوں کا داخلہ ہے۔ اُن میں سے ایک نے اس سارے واقعہ کے تاثرات کو یوں قلمبند کیا ہے:-

"یہ ایک عجیب و غریب منظر تھا۔ ایسا عجیب و غریب جس کی کوئی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ پُرانے شہر کو ہر غریب و امیر چھوڑ چکا تھا۔ اور اپنے اُن مکانوں میں جہاں سے اُنھیں چند سال پہلے قوت سے نکالا گیا تھا۔ وہاں وہ تشریف لے آئے۔ مکے کے باشندوں نے خوف کیوجہ سے پہاڑوں میں پناہ لی۔ جب تین دن گزر گئے تو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے رفقاء کار مدینہ کی طرف لوٹ گئے اور مکہ کے رہنے والے پھر اپنے گھروں کو واپس آنے گئے۔ مسلمانوں نے اس حج کو جس پُرامن طریقہ سے انجام دیا۔ جس ضبط ونظم کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے اسلام کو بہت زیادہ تقویت بخشی۔ مگر اس شرافت کی انتہا وہ تھی جب انہوں نے ۶۳۰ء میں دس ہزار سپاہ کے ساتھ مکہ فتح کیا۔ یہ وہ موقع تھا جس میں رسول اللہ علیہ وسلم اپنا انتقام لے سکتے تھے۔ اُن کے پُرانے دشمن جنہوں نے اُن پر طرح طرح کے ظلم کئے تھے۔ وہ اب اُن کے قدموں میں تھے۔ کیا وہ اب ان کو روند ڈالیں گے۔ کیا وہ ان کو دُکھ دینگے۔ کیا وہ اب اپنا بدلا لیں گے؟ یہ وقت تھا جس میں حضورؐ کی اصل سیرت بے نقاب تھی۔ ہم اُس کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں۔ مگر در اصل ہوا کیا۔ گلیوں میں خون کا کوئی قطرہ بھی نہیں گرا۔ حقائق در اصل حقائق ہیں۔ اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلم کی دشمنوں پر فتح کا دن درحقیقت حضورؐ سرور دو عالم کا اپنے نفس پر سب سے زیادہ وہ قدرت کا دن تھا۔ انہوں نے نہایت ہی فراخدلی سے قریش کے سارے مظالم کو معاف کر دیا۔ انہوں نے مکہ کی ساری آبادی کو پناہ دی۔ صرف چار آدمی جو انتہائی خبیث تھے زیر عتاب آئے۔ محمدؐ عربی کی فوج نے بھی اُنہی کی پیروی کی اور بڑے اطمینان اور امن کے ساتھ شہر کے اندر داخل ہوئی۔ نہ تو کوئی گھر لوٹا گیا۔ اور نہ کسی عورت کی بے حرمتی کی گئی۔ صرف ایک چیز تباہ کی گئی۔ یعنی کعبہ کے اندر جا کر محمدؐ تین سو ساٹھ بتوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور اپنے عصا سے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا" جاء الحق وزھق الباطل" یہ الفاظ اُن کے رفقاء کار نے بھی دُہرائے اور ان سب بتوں کو توڑ دیا گیا"۔

یہ ہے وہ انداز جس میں سارے جہان کا سپہ سالار فتح مندی کے ساتھ شہر میں داخل ہوا۔ پوری انسانی تاریخ میں کوئی فتح بھی اس کی نظیر نہیں رکھتی۔

پروفیسر لین پول سرورِ کائنات کی سیرت پر لکھتے لکھتے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے اور بڑے والہانہ انداز میں کہتا ہے:-

"اس صحرانشین کی سیرت وکردار کا صحیح صحیح اور متوازن جائزہ لینا بہت مشکل ہے۔ اُن کے اخلاق میں شرافت، متانت اور حیا، جرأت اور عزم کے ساتھ اس انداز سے ملے جلے ہیں کہ انسان کے لئے بجز اُن کے احترام کرنے کے اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ وہ مقدس ذات جس نے کئی سالوں تک اکیلے لوگوں کی نفرت و استبداد کا مقابلہ کیا۔ وہ وہی شخص تھا جس نے کسی سے مصافحہ

کرتے ہوئے کبھی بھی اپنے ہاتھ کو پہلے کھینچنے کی کوشش نہ کی- وہ بچوں کا محبوب اور منظور تھا- وہ کبھی مسکراہٹوں سے نوازے بغیر اُن کے پاس سے نہیں گزرا- وہ ہمیشہ انھیں محبت بھری نگاہوں سے دیکھتا- اور مشفقانہ انداز سے انھیں خطاب کرتا- وہ بے تکلفی، اخلاص اور ہمت کا ایک نہایت ہی حسین امتزاج تھا۔"

یہی مصنّف رسولِ اکرم پر بعض اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے:-

"حضورؐ پر اکثر ظلم، شہوت رانی، دھوکا بازی کا الزام لگایا جاتا ہے- اُن پر ظالم ہونے کا الزام اس قابل ہی نہیں کہ کوئی معقول آدمی اُس پر توجہ کرے- میں نے اس سے پیشتر یہودیوں کی سزا کا ذکر کردیا ہے- جو در اصل اس الزام کی وجہ بتائی جاتی ہے- مگر میں اُن سے عرض کرتا ہوں کہ آپ براہ کرم حضورؐ کا جنگ بدر کے قیدیوں کے ساتھ سلوک کا بھی تو مطالعہ کریں- مدینہ میں دشمنوں کے ساتھ رعایت اور برداشت کو بھی تو ذہن میں رکھیں، اُن کی بچوں سے محبت، اُن کا مکہ میں داخلہ- اور اُن سب لوگوں کو معاف کردینا جو مسلسل اٹھارہ سال سے اُن پر ظلم ڈھارہے تھے- کیا یہ سب واقعات یونہی ہیں- کیا اُن کی کوئی اہمیت نہیں- کیا یہ اس حقیقت کے شاہد نہیں کہ ظلم حضورؐ کی فطرت کا جزو نہ تھا۔"

پھر اُن پر یہ الزام کہ وہ (معاذ اللہ) شہوت پسند تھے- یہ بھی بے بنیاد ہے- اُن کا راہبانہ اور زاہدانہ اندازِ زیست، اُن کا سخت بستر پر سونا، اُن کا سخت مشقت کا کام کرنا- وہ تو انھیں ایک نہایت متقی اور پاکباز ظاہر کرتے ہیں- انھیں بیشک دو چیزوں سے محبت تھی- خوشبو اور عورت، ان میں سے پہلی چیز تو بالکل بے ضرر ہے- حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کا معاملہ بھی بالکل دوسرا ہے- اس کے متعلق مغربی سوانح نگاروں نے بہت کچھ لکھا ہے- اور یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ یہ لوگ حضورؐ کے خانگی معاملات کو بھی اس طریق سے پیش کرتے ہیں جس طرح کہ (society journals) کے ادیب بے تکی باتیں لکھتے ہیں- ان میں سے بعض ازواج وہ تھیں، جن کے خاوند جنگ میں شہید ہوئے اور جنہیں حضورؐ کی کرم نوازی سے توقع تھی کہ وہ اُن کی مدد فرمائیں گے بعض شادیاں حکمتِ عملی کے طور پر کی گئیں- تاکہ مختلف قبائل میں مؤدت اور یگانگت پیدا ہو- ان سب دلائل میں سے سب سے قوی دلیل حضورؐ سرورِ دو عالم کی اپنی پہلی بیوی سے انتہائی محبت ہے- جب وہ ابھی جوان ہی تھے تو انہوں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی- جو اُن سے پندرہ سال بڑی تھیں- اور اس ضمن میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ مشرق میں عمر کا یہ تفاوت بہت زیادہ تھا- پورے پچیس ۲۵ سال حضورؐ کے حرم میں وہ اکیلی رہیں- جبکہ اُن کی عمر ۶۵ برس کی ہوچکی تھی- اس ساری مدت میں کوئی واقعہ بھی ایسا پیش نہیں آیا جو کسی حیثیت سے بھی مشتبہ ہو- پھر خدیجہؓ وفات پا گئیں- مگر انہوں نے اُس خاتون کو کبھی بھی نہ بھلایا- اور اُن کی یاد آخر دم تک اُن کے دل میں محفوظ رہی!

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی حق و انصاف کی ایک روشن دلیل ہے- وہ اپنے ماننے والوں سے ایک ہی بات کہا کرتے تھے- "میں بھی تم میں سے ایک بشر ہوں"۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا- "کیا خدا کے رحم و کرم کے بغیر کوئی بھی جنت میں داخل نہیں ہوسکتا" حضورؐ نے فرمایا "نہیں"۔ پھر اپنے بارے میں ارشاد ہوا- "میں بھی اُس وقت تک فردوس میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ خدا کی رحمت مجھے ڈھانپ نہ لے"۔

حضورؐ کی سیرت کا یقیناً لوگوں نے غلط اندازہ لگایا ہے- وہ (معاذ اللہ) ہوس پسند اور دھوکہ باز قطعاً نہ تھے- جیسا کہ

بعض لوگوں نے اُن پر الزام لگایا ہے۔ وہ اُن معنوں میں مخلص اور پُرجوش تھے۔ جن معنوں میں کہ یہ دونوں صفات زمین کا نمک بنتی ہیں۔ اور یہ وہ دو چیزیں ایسی ہیں جو انسانی قوتوں کو بیکار ہونے سے بچاتی ہیں۔ جوش کو بعض لوگ ناپسند کرتے ہیں کیونکہ اسے غلط راستوں پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ زمین پر بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ مگر محمد عربی کے ساتھ یہ معاملہ نہ تھا۔ وہ جوشیلے تھے اور دُنیا کو اس وقت اسی چیز کی ضرورت تھی۔ اُن کا یہ جوش ایک نیک مقصد کے لئے صرف ہو رہا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے سچائی کو اپنی مشعلِ راہ بنایا۔ اسی سرچشمہ سے انہوں نے زندگی کی قوت حاصل کی۔ وہ خدا کے پیغمبر تھے اور حیات کے آخری لمحوں تک ہر چیز اُن کے سامنے رہی۔ دُنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں جسے اپنے مقصد اور مشن سے اس قدر محبت ہو جتنی کہ حضورؐ کو تھی۔ پھر صرف محبت ہی نہ تھی بلکہ اُسے عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لئے بھی انہوں نے بڑی بے جگری اور جرأت کے ساتھ جہد و سعی کی !

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

گر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

خیاباں

فارسی منتخبات

- شیخ حکیم سنائیؒ۔
- شیخ فریدالدین عطارؒ۔
- شیخ محمود شبستریؒ۔
- مولانا جلال الدین رومیؒ۔
- مولانا نظامی گنجوی۔
- سعدیؒ شیرازی۔
- امیر خسروؒ۔
- سید حسن غزنوی ملقب بہ اشرف۔
- عرفی۔
- خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ۔
- مخفی۔
- خاقانی۔
- جامی۔
- احمد جامؒ۔
- قدسی
- ظہوری
- احسان اللہ ممتاز۔
- قاآنی۔
- بابا افضل کاشی۔
- غنی۔
- فضولی بغدادی
- ناصر علی سرہندی
- فیضی۔
- نظیری نیشاپوری
- الطاف حسین حالی
- مرزا غالب۔
- غلام امام شہید۔
- اقبال۔
- جگر مراد آبادی۔
- بابو رگھنندن کشور صاحب شوق رامپوری

★

شیخ حکیم سنائی رحؒ

آمد اندر جہانِ جاں ہر کس جانِ جانہا محمد آمد و بس
آں سپہرش چو بارگاهِ ازل آفتابش که احمدِ مرسل
شرعِ او را فلک مسلّم کرد خانه بر بامِ چرخِ اعظم کرد
دیدۂ جانِ پاکِ آدم از و معنیِ بکر، لفظِ محکم از و
انبیا ریخته ہم از زرِ او ہر چه شاں نقد بود بر سرِ او
آستانِ درش بروضۂ انس بوده بستانِ روح روح القدس
جانِ او خوانده پیش از آمدِ حق ابجدِ لم یزل ز تختۂ حق
عالمِ جزو را نظام بدو غرضِ انجمنِ کل تمام بدو
قدمش در ازل نه فرسوده ندمش در ابد نیاسوده
آمد از رب سوئے زمینِ عرب چشمۂ (داشت) زندگانی اندر لب
فیضِ فضلِ خدائے دایۂ او فرّ پرِ ہمائے سایۂ او
بلکه از عقلِ پیشتر دلِ او دیده صنعِ خدائے در گِلِ او
بوده چوں نقشِ صورتِ خویشش ماجراہائے غیب در پیشش

آدم آنگه که ہمتِ جاں داشت پائے در دامنش بر گریباں داشت

دو جہاں پیشِ ہمتش بدو جو سرِّ ما زاغ و ما طغیٰ بشنو!
بنموده بدو عیاں مولیٰ آیۃ الصغریٰ و آیۃ الکبریٰ
با فترضیٰ دلِ تباه کراست! بالعمرک غمِ گناه کراست!
خُلقِ او مایۂ روحِ حیواں را خُلقِ او دایۂ نفسِ انساں را
نعتِ آں روی والضحیٰ آمد صفتِ زلف اذا سجیٰ آمد
ہمتش الرفیق الاعلیٰ جوئے عزتش لا نبی بعدی گوئے
او و را بنده بود از سر جد ہمه عالم ز پائے او مسجد
در جہانے فگنده آوازه با خود آورده سنتے تازه
تیغ و قرآں ورا شده معجز نشد و شرعِ او و خُلقش ہرگز
از پئے صورتِ دل و جانش پیشِ حکم و خطابِ (کہنه) فرمانش
غیب یزداں نہاده در دلِ او آبِ حیواں سرشته در گِلِ او
قدر شبہائے قدر از گِلِ او روز روزِ قیامت از دلِ او
شرع و دیں جا طبعِ خوش بوِ او عقل و جاں گوہر دو گیسوِ او

چوں بخندید بر سپہرِ علی آفتابِ سعادت از ل...
نامد اندر سراسرِ آفاق پا یمردِ چنوے بر میثاق...
اندر آمد ببارگاهِ خدا دامنِ خواجگی کشاں در پ...
جانِ عاقل جہاں از و بیند زانش برجانِ خویش بگزی...
تا شبِ نیست صبحِ ہستی زاد آفتابِ چنو ندارد یا...
کرده با شاہپرِ طاؤسی جلوه در بوستانِ قدو...
سرِّ او صورتِ و فا خوانده دلِ او مرکبِ صفا راند...
داده اشراف بر ہمه عالم مرورا کرد کارِ لوح و قل...
علمِ او میزبانِ عالم داد شرعِ او شحنۂ خدا آ با...
قابلے چوں نتیقش اندر بر قاتلے ہمچو حیدرش (دعالم) بر د...
جانِ او دیده ز (ابوبکرؓ) آستانِ قدم زادنِ عقل و آدم و عا...
گفته او را بوقتِ وحی و عجل جبرئیلِ امیں ولا تعجل...
مست کرده ز نورِ لطفِ (حرف) کلمش شرق و غرب ازل دردنِ...

در شب از مسجدِ حرام بکام رفته و دیده و آمده به مقا...
بر نهاده خدائے در معراج بر سرِ ذاتش ازلعمرک تا...
از پئے او زمانه ما پیوند! بسرِ او خدائے را سوگند...
شرفِ اہلِ حشر فترا کش لوحِ محفوظ ملکِ او در...
بوده مقصودِ آفرینشِ او انبیا را بیانِ بینش...
شیخ را سازِ نور داده چو شاب خاک را آبروئے داده چو آ...
ہم عرب ہم عجم مسخرِ او لقمه خواہانِ رحمت از در...
رشد قومی برائے حق جویاں ابد قومی ز خوئے خوش گو...
خاتمِ شرع و خاتمت در فم صدق اللہ نبشته بر خا...
نفس پر چشم ہمچو نرگس (دہن) تر عقل پرگوش، ہمچو سینه...
زحمتِ آب و گِل درین عالم رحمتش نام کرده فضلِ ف...
صبحِ صادق چنو ندیده براه آفتابے بزیرِ گنبد...
اندراں گیسوے سیاه و سپید دوخته عقل کیسه ہائے...

طینتش زینتِ جہاں آمد
احتش راحتِ رواں آمد

(حدیقه)

شیخ فرید الدین عطارؒ

خواجۂ دُنیا و دیں گنجِ وفا — صدر و بدرِ ہر دو عالم مصطفےٰ
آفتابِ شرع و دریائے یقیں — نورِ عالم رحمۃٌ للعالمین
جانِ پاکاں خاکِ جانِ پاکِ او — جاں رہا کن آفرینش خاکِ او
خواجۂ کونین و سلطانِ ہمہ — آفتابِ جان و ایمانِ ہمہ
صاحبِ معراج و صدرِ کائنات — سایۂ حق خواجۂ خورشید ذات
خواجۂ کز ہرچہ گویم بیش بود — در ہمہ چیز از ہمہ در پیش بود
ہیچ شبنم آمد از بحرِ جود — خلقِ عالم از طفیلش در وجود
نورِ او مقصودِ مخلوقات بود — اصلِ معدومات و موجودات بود
آفرینش را جز او مقصود نیست — پاک دامن تر از و موجود نیست
آنچہ اول شد پدید از جیبِ غیب — بود نورِ پاکِ او بے ہیچ ریب
چوں طفیلِ نورِ او آمد اُمم — سوئے کل مبعوث ازاں شد لاجرم
گشت او مبعوث تا روزِ شمار — از برائے کلِ خلقِ روزگار
روزِ حشر از بہرِ مشتے بے عمل — اُمتی او گوید و بس زیں قبل
حق برائے جانِ آں شمعِ ہدیٰ — می فرستد امتِ او را فدائے
ختم کردہ حق نبوت را بدو — معجز و خلق و فتوت را بدو
دعوتش فرمودہ بہرِ خاص و عام — نعمتِ خود را بدو کردہ تمام
کافراں را دادہ مہلت در عقاب — نا فرستادہ بعہدِ او عذاب
دین و دُنیا در پناہِ ہمتش — زندگی دادہ زبہرِ اُمتش
ہم ز حق بہتر کتابے یافتہ — ہم ز کل کلِ حسابے یافتہ
حق تعالش از کمالِ احترام — بردہ در توریت و در انجیل نام
قبلہ گشتہ خاکِ او از حرمتش — مسخ منسوخ آمدہ در امتش
بعثتِ او شد سرنگونیِ بتاں — امتِ او بہترینِ اُمتاں
خاک در عہدش قوی تر چیز یافت — سجدہ گشت و طہور نیز یافت
چوں زبانِ حق زبانِ اوست بس — بہتریں عہدے زبانِ اوست بس
روزِ محشر محو گردد سر بسر — جز زبانِ او زبانہائے دگر
نادمِ آخر کہ بری نشست حالی — شوقِ تو از حضرتِ عزت ال
چوں لش بے خود شدے در بحرِ راز — جوشِ او میلی برفتے در نماز

عقل را در خلوتِ او راہ نیست — علم نیز از وقتِ او آگاہ نیست
چوں بخلوت جشن سازد با خلیل — پر بسوزد در نگنجد جبرئیل
چوں عمر کز تاج آمد بر سرش — خلق (دیدہ) خالی با کمر شد بر درش
چوں جہاں از موئے او پر مشک شد — بحر را از تشنگی لب خشک شد
کیست کو نہ تشنۂ دیدارِ اوست — تا بچوب و سنگ غرقِ کارِ اوست
چوں بہ منبر در شد آں دریائے نور — نالۂ حنانہ می بشد دور دور
وصفِ او در گفت چوں آید مرا — چوں عرق از شرم خوں آید مرا
از فصیحِ عالم و من لالِ او — کے توانم داد شرحِ حالِ او
وصفِ او کے لائقِ ایں ناکس است — واصفِ او خالقِ عالم بس است
اے جہاں بارتبتِ خود خاکِ تو — صد جہاں جاں گردِ خاکِ پاکِ تو
انبیا در وصفِ تو حیراں شدہ — سر شناساں نیز سرگرداں شدہ
اے طفیلِ خندۂ تو آفتاب — گریۂ تو کارفرمائے سحاب
ہر دو گیتی گردِ خاکِ پائے تست — در گلیمے خفتہ چہ جائے تست
خواجگیِ ہر دو عالم تا ابد — گرد وقتِ احمدِ مرسل احد
یا رسول اللہ بس درماندہ ام — باد در کف خاک بر سر ماندہ ام
بیکساں را کس توئی در سر نفس — من ندارم در دو عالم جز تو کس
یک نظر سوئے منِ غمخوارہ کن — چارۂ کارِ منِ بیچارہ کن
گرچہ ضائع کردہ ام عمر از گناہ — توبہ کردم عذرِ من از حق بخواہ
گر زلا تا من بود ترسے مرا — ہست از لا تا لیوا دریے مرا
روز و شب بنشستہ در صد ماتمم — تا شفاعت خواہ باشی یک دلم
اے شفاعت خواہِ مشتے تیرہ روز — لطف کن شمعِ شفاعت برفروز
دیدۂ جاں را لقائے تو بس است — ہر دو عالم را رضائے تو بس است
دارُوئے دردِ دلِ من مہرِ تست — نورِ جانم آفتابِ مہرِ تست
بر درت جاں بر میاں دارم کمر — گوہرِ تیغِ زبانِ من نگر
ہر گہر کاں از زباں افشاندہ ام — در رہت از قعرِ جاں افشاندہ ام
حاجتم ایں است اے عالی گہر — گر بسرِ فضلے کنی در من نظر
زیں ہمہ سندالہ و شرک و ترہات — پاک گردانی مرا اے پاک ذات
طفلِ راہِ تو منم غرقہ شدہ — گردِ من آبِ سیہ حلقہ شدہ
چشم آں دارم کزیں آبِ سیاہ — دستِ من گیری و باز آری براہ

(منطق الطیر)

شیخ محمود شبستریؒ -

احد در میمِ احمد گشت ظاہر درین دور اوّل آمد عینِ آخر
ز احمد تا احد یک میم فرق است جہانے اندراں یک میم غرق است
برو ختم آمدہ پایانِ ایں راہ بدو منزل شدہ ادعوا الی اللہ
مقامِ دلکشایش جمعِ جمع است جمالِ جاں فزایش شمعِ جمع است
شدہ او پیش و دلہا جملہ در پے گرفتہ دستِ جانہا دامنِ وے
(مثنوی گلشنِ راز)

مولانا جلال الدین رومیؒ

بود در انجیل نامِ مصطفےٰ آن سرِ پیغمبراں بحرِ صفا
بود ذکرِ حلیہا و شکلِ او بود ذکرِ غزو و صوم و اکلِ او
طائفہ نصرانیاں بہرِ ثواب چوں رسیدندے بداں نام و خطاب
بوسہ دادندے بداں نامِ شریف رو نہادندے بداں وصفِ لطیف
اندریں فتنہ کہ گفتم آں گروہ ایمن از فتنہ بدند و از شکوہ
(شکوہ بکسرِ شین بمعنی خوف)

فساد سے نصرانیوں کا وہ قتلِ عام مراد ہے جو ایک یہودی بادشاہ نے کیا تھا جس کیلئے اس کے وزیر نے بڑا فریب کیا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس فساد میں وہ گروہ جو نامِ مصطفےٰ کی تعظیم کرتا تھا فتنے اور خوف سے امن میں رہا۔

ایمن از شرِ امیران و وزیر در پناہِ نامِ احمد مستجیر
نسلِ ایشاں نیز ہم بسیار شد نورِ احمد ناصر آمد یار شد
واں گروہ دیگر از نصرانیاں نامِ احمد داشتندے مستہاں
مستہاں و خوار گشتند از فتن از وزیرِ شوم رائے شوم فن
مستہاں و خوار گشتند آں فریق گشتہ محروم از خود و شرطِ طریق

مستہاں - ذلیل و خوار۔ ذلیل و خوار بھی ہوئے۔ اپنی ہستی سے بھی محروم ہو گئے (قتل کر دیئے گئے) اور مذہب سے بھی۔ (ایمان بھی سلامت نہ لے گئے)

ہم مخبط شاں و حکم شاں از پئے طومار ہائے کژ بیاں
نامِ احمد چوں چنیں یاری کند تا کہ نورش چوں مددگاری کند
(ر ع - ر)

مولانا نظامی گنجویؒ

تختۂ اوّل کہ قلم نقش بست بر درِ محجوبۂ احمد نشست
کنت نبیاً کہ علم پیش برد ختمِ نبوت بہ محمد سپرد
مہ کہ نگیں داں زبرجد شد است خاتمِ او مہرِ محمد شد است
گوشِ جہاں حلقہ کشِ میمِ اوست خود دو جہاں حلقۂ تسلیمِ اوست
چشمۂ خورشید کہ محتاجِ اوست نیم ہلال از شبِ معراجِ اوست

شمسۂ نہ مسند ہفت اختراں ختمِ رسل خاتمِ پیغمبراں
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست ہر دو جہاں بستۂ فتراکِ اوست
سنبلِ او سنبلۂ روزِ تاب گوہرِ او لعل گر آفتاب
خندۂ خوش زاں زدے شکرش تا زبرِ آبِ صدف گوہرش

اے تنِ تو پاک تر از جانِ پاک روحِ تو پروردۂ روحی فداک
نقطہ گہ خامۂ رحمت توئی خامہ بر نقطۂ رحمت توئی
راہ رواں عربی را تو ماہ بادیگیانِ عجمی را تو شاہ
اے شبِ گیسوئے تو روزِ نجات آتشِ سودائے تو آبِ حیات
عقل شدہ شیفتۂ روئے تو سلسلہ شیفتگان موئے تو
از اثرِ خاکِ تو مشکیں غبار پیکرِ آں قوم شدہ مشکبار
خاکِ تو از بادِ سلیماں بہ است روضہ چہ گویم کہ ز رضواں بہ است
کعبہ کہ سجادۂ تکبیرِ تست تشنۂ جلابِ بتا شیرِ تست

اے مدنی برقع و مکی نقاب سایہ نشیں چند بود آفتاب
منتظراں را بہ لب آمد نفس اے ز تو فریاد بہ فریاد رس
ملک بیارای و جہاں تازہ کن ہر دو جہاں را تو پُر آوازہ کن
سکہ تو زن تا امرا کم زنند خطبہ تو خواں تا خطبا دم زنند
از طرفے رخنۂ دیں می کنند از دگر اطراف کمیں می کنند

یا علیؓ در صفِ میداں فرست   یا عمرؓ بر سرِ شیطاں فرست
خلوتی پردۂ اسرار شو   ماہمہ خفتیم تو بیدار شو

اے گہر تاجِ فرستادگاں   تاج دہ گوہرِ آزادگاں
ہرچہ زبیگانہ و خیل تو اند   جملہ دریں خانۂ طفیلِ تو اند
تو بہ دل در چمنش بوئے تست   گل شکرش خاکِ سرِ کوئے تست
خط فلک خطۂ میدانِ تست   گوئے زمیں در خمِ چوگانِ تست
اے نفست نطق زباں بستگاں   مرہم سودائے جگر خستگاں
خاکِ تو خود روضۂ جانِ منست   روضۂ تو جانِ جہانِ من است

خاکِ تو در چشمِ نظامی کشم
غاشیہ بر صفت غلامی کشم

مولانا نظامی گنجویؒ

شمسۂ نہ مسند ہفت اختراں   ختم رسل خاتم پیغمبراں
احمد مرسل کہ خرد خاکِ اوست   ہر دو جہاں بستۂ فتراک اوست
امی گویا بزبانِ فصیح!!   از الف آدم و میم مسیح
چشمۂ خورشید کہ محتاج اوست   نیم ہلال از شب معراج اوست
اے تنِ تو پاک تر از جانِ پاک   روح ترا پروردہ روحی فداک
اے مدنی برقع و مکی نقاب   سایہ نشین چند بود آفتاب
ماہمہ جسمیم بیا جاں تو باش   ماہمہ دیویم سلیماں تو باش
اے گہر تاجِ فرستادگاں   تاج دہ گوہرِ آزادگاں
اول بیت ارچہ بنامِ تو بست   حکم تو چوں قافیہ آخر نشست
مہر شد ایں نامہ بہ عنوانِ تو   ختم شد ایں خطبہ بدورانِ تو

محمد کافرینش ہست خاکش   ہزاراں آفریں بر جانِ پاکش
چراغ افروز چشمِ اہلِ بینش   طراز کارگاہ آفرینش
سر و سرہنگ میدانِ وفا را   سپہ سالار و سرخیلِ انبیا را
یتیماں را نوازش در نسیمش   ازینجا نام شد دُرِّ یتیمش
سریر عرش را نعلینِ او تاج   امینِ وحی و صاحب سرِ معراج

بصر در خواب و دل در استقامت
زبانش امتی گو تا قیامت

سعدی شیرازیؒ

شفیع مطاع نبی کریم   قسیم جسیم نسیم وسیم

بلغ العلیٰ بکمالہٖ   کشف الدجیٰ بجمالہٖ
حسنت جمیع خصالہٖ   صلوا علیہ و آلہٖ

کریم السجایا جمیل الشیم   نبی البرایا شفیع الامم
امام رسل پیشوائے سبیل   امینِ خدا مہبطِ جبرئیل
شفیع الوریٰ خواجہ بعث و نشر   امام الہدیٰ، صدرِ دیوانِ حشر
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست   کتب خانہ چند ملت بشست
تو اصل وجود آمدی از نخست   دگر ہرچہ موجود شد فرع تست
ترا عزِ لولاک تمکیں بس است   ثنائے تو طٰہٰ و یٰسین بس است

چہ وصفت کند سعدی ناتمام
علیک الصلوٰۃ اے نبی! والسلام

نگینِ ختمِ رسالت محمدؐ عربی   شفیع روزِ قیامت محمدؐ مختار
اگر نہ واسطہ روی و موئی او بودے   خدا نخلق نہ گفتے قسم بہ لیل و نہار

اے چشم و چراغِ اہلِ بینش   مقصود وجودِ آفرینش
صاحب دل "لا ینام قلبی"   مہمان "ابیت عند ربی"

اے وصفِ تو "لا نبی بعدی"
خود وصفِ تو در زبانِ سعدی

امیر خسروؒ

احمد مرسل کہ نوشتہ قلم   حمد بنام وے و حا میم ہم
نہ فلک از نام محمدؐ مقیم   ہر دو جہاں در حد نامش دو نیم

موجِ نخستینش ز دریائے نور — شستہ بساط ابد و رفتہ دُور
زاں ازلی مکتب و اُمی لقب — عقلِ کل آموختہ لوحِ ادب
ہر سخنش کاصلِ مسلمانیست — حاشیۂ نامۂ ربانیست
درسِ شرف کردہ بخیر المآب — شیر خرد خوردہ زاُمّ الکتاب
عینِ عنایت ز عطائے کریم — دل ہدایت برہ مستقیم
عروۂ وثقیٰ کنفِ نورِ او — جلِ متین نسخۂ منشورِ او
زاں دو قدم کرد جہاں بیش رفت — گرچہ پس آمد ز ہمہ پیش رفت
از عرق افشاں بناگوشِ وے — چشمۂ خورشید یکے قطرہ خوے
از لبِ او نیم نمے سلسبیل — بر شکرِ او مگسے جبرئیل

بادہمیشہ رہِ ما سوئے اُو
سرمۂ خاکِ سرِ کوئے اُو

اے سخنت گنجِ خدا را کلید — گوہرِ آں گنج تو کردی پدید
غرۂ ما از خمِ ابروئے تست — طرۂ ما از شکنِ موئے تست
لعلِ تو گنجینۂ رحماں کشاد — چشمِ تو دروازۂ احساں کشاد
ہر قدمت عہدۂ ہر دو سرائے — ہر سخنت خازنِ وحیِ خدائے
پرتوِ تو مشعلِ راہِ ہمہ — ظلِ لوائے تو پناہِ ہمہ
فرشِ تو یزداں ز فلک ساختہ — تو ز گلیمے علم افراختہ
ہر کہ طراز تو بباز و نہاد — نقدِ دو عالم بہ ترازو نہاد

منکہ بجاں تشنۂ جوئے توام
خسروم اما سگِ کوئے توام

سید حسن غزنوی ملقب بہ اشرف

اے دلِ پُر دردِ تو ہماں سرائے جبرئیل
جز جہاں دل کے تواند بود جائے جبرئیل
آنچہ تو بے جبرئیل از راز گفتی با خدائے
کس نداند ہم تو دانی و خدائے جبرئیل

اے برگزیدہ سالکاں گرد رہِ راہِ ترا
سرکشاں گردن نہاد کوچۂ جاہِ ترا

ہر سحر گہ گنبدِ آئینہ گوں برداشتہ
صد ہزاراں صیقل پُر نور یک آہِ ترا
آفتاب از کلکِ زریں بر رخِ سیمینِ ماہ
فتح نامہ ساختہ نصرٌ مِن اللہِ ترا!
غرفہائے خلد دہلیزی است ایوانِ ترا
حلقہائے چرخ زنجیریست درگاہِ ترا

سلموا یا قوم بل صلوا علی روح الامین
مصطفیٰ ماجاء الا رحمۃ اللعٰلمین

عرفی:-

تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل
سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را
تا نام ترا افسرِ فہرست نہ کردند!
شیرازۂ مجموعہ نہ بستند کرم را
عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ ست قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

جان و دلِ من پُر از غمِ تست — بہرِ تو تہی کنم چہ جا را
آمادۂ صد سرود در دم — ناکردہ تمام یک نوا را
گر نقشِ جمالِ تو نگیرد — از سینہ بروں کنم صفا را
گنجے بکف آورم کہ شاید — سرمایۂ نعتِ مصطفیٰ را
درجِ گہر آورم کہ شاید — آویزۂ گوشِ انبیا را
دستے سخن آورم کہ شاید — مجموعۂ لطفِ اولیا را

اے جودِ تو دستِ دل سخا را
وے عزمِ تو بال و پرِ صبا را

اے [illegible] ذاتِ تو [illegible] را شرف
وے بزیر سایۂ جاہت نبوت را پناہ

بسکہ دستِ رحمتت آرائش ہر چہرہ کرد
عشق می ورزد بحسنِ یاس اُمید اشتباہ

اے مہر تو جانِ آفرینش — نعتِ تو زبانِ آفرینش
لطف تو چمن طرازِ امکاں — خشمِ تو خزانِ آفرینش
جودت ہمہ بخش عالمِ کون — علمت ہمہ دانِ آفرینش

شہنشاہ سریر قاب قوسین احمد مرسل
کہ بر پیشانی تقدیر مرقوم است فرمانش
شہنشاہے کہ فراشانِ بزمِ او بصد منت
بفرقِ عرش میریزند گردِ فرشِ ایوانش
زہے عزت کہ بے نعتِ تو لوحِ معصیت گردد
ہر آں نامہ کہ بسم اللہ بود تذہیب عنوانش

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح

اے از شعاعِ روئے تو خورشیدِ تاباں را ضیا
آنی کہ ہستی از شرف بالاتر از عرشِ علا
گرچہ بصورت آمدی بعد از ہمہ پیغمبراں
اما بہ معنی بودۂ سر خیلِ جملہ انبیا
ہرگز نخواندی یک ورق خلقے گرفت از تو سبق
انگشت مہ را کرد شق اے خواجۂ معجز نما
یارانِ تو چار آمدند پاکیزہ کردار آمدند
گل ہائے بیخار آمدند از خویش فانی باخدا

مخفی رہ

زآب و گل ایں چمن ماہمہ بستانِ او
قوتِ دل می دہد بوئے گلستانِ او

عمر تلف کردن است خوردنِ آبِ حیات
عمر ابد یافت است خضرِ بیابانِ او
روزِ قیامت چہ غم عاصی شرمندہ را
ہست شفیعِ گنہ شرمِ گناہانِ او
بر ورق سرنوشت ہر چہ رقم یافت است
لوحِ قلم انتخاب کردہ ز دیوانِ او

خاقانی

ہر ورع کہ دست کبریا بافت — خاص از پئے قدِ مصطفےٰ بافت
در دست رضائے آں مطہر — دستنبوی است خلدِ الود
بر جیبِ کمالِ آں مقدس — گو انگلہ ایست چرخِ اطلس
در دار الملک سر قرآں — خطبہ ابدی بنامِ او داں
شد غاشیہ است چرخِ اخضر — چار ارکانش نہادہ بر سر
ایزد کہ قسم بجانش خوردہ است — سجادش ادیم خاک کردہ است
لشکر گہ دیں ستانۂ او — کعبہ شدہ کوس خانۂ او
خیمہ زدہ شرع در جنابش — جبل اللہ المتین طنابش
بر نامۂ دقیقِ ایں ممالک — توقیع زدہ کہ صح ذلک
دُنیا کہ دو در دو نہ کاخ و کوخ است
در راہِ محمدی کلوخ است
دستورِ تو صدر دارِ اوّل ! — سرہنگِ تو انبیاء و مرسل
در ملکِ تو عقل پیرِ تدبیر — در بزمِ تو روح چاشنی گیر
ارواح علم بر سپاہ ہست — جبریل بریدِ بارگاہ ہست
خنِ ہم از پئے تو ساخت الحق — شب چترِ سیاہ و روز بیرق
طرف کمر تراست جب وید — پیرونہ چرخ لعل و خورشید
تا کوسِ تو صور پنجگاہ است — بر چرخ صدائے لا الٰہ است
با عین کمالت اے ملک وش — طوبےٰ خشک است دو کوثر آتش
انگشت تو گو قلم نسود است — مہ را چو سر قلم نمود است
تاریخ شرف کہ آسماں راست — از روزِ ولادتِ تو برخاست

اے نقطہ ذاتِ ہر دو عالم
قایم بدم تو ذاتِ آدم

خورشید سہیل تا بشے ہم
گلگونہ دہ ادیم آدم!

اندازہ نعل تست واللہ
محراب مسبحانِ درگاہ!

اے سبحۂ انبیار بیانت
محراب ملایک آستانت

آرے توئی احسن البرایا
روید ز ثنائے تو ثنایا

جامیؒ:- **معراجِ نبویؐ**

شبے دیباچہ صبح سعادت
ز دولت ہائے روز افزوں زیادت

سوادِ طرہ اش خجلت دہِ حور
بیاضِ غرہ اش نورٌ علیٰ نور

نسیمش جعد سنبل شانہ کردہ
ہوایش اشک شبنم دانہ کردہ

طرب راچوں سحر خنداں انارلب
گریزاں روز محنت زو شباشب

دریں شب آں چراغِ اہلِ بینش
سزائے آفریں از آفرینش

چو دولت شد ز بد خواہاں نہانی
سوئے دولت سرائے امہانی

بپہلو تکیہ بر مہر زمیں کرد
زمیں را عہد جانِ نازنیں کرد

دلش بیدار و چشمش در شکر خواب
ندیدہ چشم بخت ایں خواب در خواب

درآمد ناگہاں ناموسِ اکبر
سبک رو تر ازیں طاؤس اخضر

بمالید پر کای خواجہ برخیز
کہ امشب خواب آمد دولت انگیز

بروں بر رخت ازیں خوابگہ رخت
تو بخت عالمی بیدار بہ بخت

اناں دولت سرا چوں خواجۂ دیں
خراماں شد بہ عزم خانۂ زیں

شد از صبحیاں گردوں صدادہ
کہ سبحان الذی اسرا بعبدہ

دراں مسجد امام انبیا شد
صف پیشینیاں را پیشوا شد

دراں جا شد بریں فیروزہ خرگاہ
چو ہالہ حلقہ زد پیرامنش ماہ

وز انجا شد بہ بالا تر سبک خیز
عطارد را بفرق سر عطاریز

بقصد شستن پا زیں گلابہ
چہارم چرخ خش آورد آفتابہ

وز آنجا چوں بشاخ سدرہ رہ جست
ز پریدن پر جبریل شد شست

بنات النعش و پرویں لب گشودند
بہ نظم و نثر خود اورا ستودند

چو رفرف شد مشرف از وجودش
گرفت از دست رفرف عرش زودش

بدست عرش تن چوں خرقہ انداخت
علم بر لامکاں بے خرقہ افراشت

گلے بردند زیں دہلیزہ پست
بداں درگاہ والا دست بر دست

مکانے یافت خالی از مکاں نیز
کزو محرم نبود آنجا و جاں نیز

قدم رنگ حدوثش از جان او شست
وجوب آلایش امکان او شست

یکے ماندہ ہم از قید یکے پاک
ز بسیاری برون و ز اندکی پاک

بدید آنچہ از دیدن بروں بود
مپرس از باز کیفیت کہ چوں بود

نہ چندی گنجد آنجا و نہ چونی
فرو بند از یکے لب وز فزونی

شنید انگہ کلامے نے بہ آواز
معانی در معانی راز بہ راز

اختر برجِ شرف کائنات
گوہر درجِ صدف کائنات

جنبشِ اول ز محیط قدم
سلسلہ جنباں وجود از عدم

کلک عنایت چو رقم ساز کرد
از ہمہ پیش ایں رقم آغاز کرد

مطلع دیباچہ ایں ابجد است
پیشتریں حرف کز او احمد است

نقطۂ وحدت چو قد افراختہ
از پے احمد الفے ساختہ

صدر نشیں اوست دریں بارگاہ
کنت نبیا بود او را گواہ

بود ز رُخ شمع نبوت فروز
آب ندیدہ گل آدم ہنوز

رفعت ازو منبر افلاک را
رونق ازو خطبۂ لولاک را

جز پے آں شاہ رسالت مآب
چرخ نہ زد خیمۂ زریں طناب

خندۂ او جاں بہ جہاں در دمید
منصب احیا بہ مسیحا رسید

برق وے از وادیٔ موسیٰ بجست
لمعۂ نور آمدہ زانش بدست

قامتِ طوبیٰ ز قدش سایہ ایست
سدرہ ز شاخ شرفش پایہ ایست

رشحہ ز عام کرمش سلسبیل
مرغ ہوائے حرمش جبرئیل

نوربیں ناصیۂ پاک او
حبلِ متیں حلقۂ فتراک او

طرۂ او نافۂ دولت کشائے
غرۂ او نور سعادت فزائے

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب
خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

رفتہ ز دستیم بروں کن ز برد
دستے و بنمائے یکے دستبرد

ظلمت بدعت ہمہ عالم گرفت
بلکہ جہاں جامۂ ماتم گرفت

کاش فتد زانچ عروجت رجوع
باز کند نور جلالت طلوع

دیدۂ عالم بتو روشن شود   گلخنِ گیتی بتو گلشن شود
جامی از آنجا کہ ہوادارِ تست
روئے نادیدہ گرفتارِ تست

اے عربی نسبت و اُمّی لقب   بندۂ تو ہم عجم و ہم عرب
گرد سرت ابطحی و یثربی   خاکِ درت مشرقی و مغربی
تیغِ عرب زن کہ فصاحت تراست   صیدِ عجم کن کہ ملاحت تراست
از تو سیہ راست سپیدیٔ اُمید   بہ کہ سیاہی زہی بر سپید
طوطیٔ طبعم کہ ثنا خوانِ تست
در ہوسِ یک شکر افشانِ تست

ز مہجوری برآمد جانِ عالم   ترحم یا نبی اللہ ترحم
نہ آخر رحمۃ للعٰلمینی   ز محروماں چرا غافل نشینی
ز خاک اے لالۂ سیراب برخیز   چو نرگس خواب چند از خواب برخیز
بروں آور سر از بُردِ یمانی   کہ روئے تست صبحِ زندگانی
شبِ اندوہِ ما را روز گرداں   ز رویت روزِ ما فیروز گرداں
ادیمِ طائفی نعلینِ ما کن   شراک از رشتۂ جانہائے ما کن
جہانے دیدہ کردہ فرشِ راہند   چہ فرشِ اقبالِ پابوسِ تو خواہند
ز حجرہ پائے در صحنِ حرم نہ   بفرقِ خاکِ رہ بوساں قدم نہ
تو ابرِ رحمتی آں بہ کہ گاہے   کنی بر حالِ لب خشکاں نگاہے
بخود درماندہ ام از نفسِ خود رائے   ببیں درماندۂ چندیں بخشائے
اگر نبود چو لطفت دستیارے   ز دستِ ما نیاید ہیچ کارے
قضای افگندہ از راہ ما را   خدا را از خدا درخواہ ما را!
کہ بخشد از یقیں اول حیاتے   دہد آنگہ بکارِ دیں ثباتے
چو ہول روزِ رستاخیز خیزد   ز آتش آبروئے ما نریزد
کند با ایں ہمہ گمراہیٔ ما   ترا اذنِ شفاعت خواہیٔ ما
چو چوگاں سر فگندہ آوری روئے   بمیدانِ شفاعت اُمتی گوئے
بحسنِ اہتمامت کارِ جامی
طفیلِ دیگراں یابد تمامی

اے خاکِ رہِ تو عرش را تاج   یک پایہ ز قدرِ تست معراج
تو دُرِ یتیمی و ترا جائے   بر فرق ز تہہ چو دُرۃ التاج
فخرِ تو بہ فقر و تاجداراں   آوردہ بہ فرق بر درت باج
مشتاقِ رہِ ترا مغیلاں   در زیرِ قدم حریر و دیباج
جامی کہ زنندِ بادِ عصیاں   شد خرمنِ طاعتش بہ تاراج
اکنوں رہِ معذرت گرفتہ
مسکیں بہ شفاعتِ تو محتاج

اے بُردہ ز آفتاب بوجہِ حسن سبق   قرصِ قمر بمعجز دستِ تو گشتہ شق
تابے ز عکسِ طلعت و تارے ز طرہ اَت   صبح اذا تنفس لیل اذا غسق
در بزمِ احتشامِ تو سیارہ ہفت جام   وز مطبخِ نوالِ تو افلاک نہ طبق
بر دفترِ جمالِ تو توریت یک رقم   وز مصحفِ کمالِ تو انجیل یک ورق

سلامٌ علیک اے نبی مکرم   مکرم ترا ز آدم و نسلِ آدم
سلامٌ علیک اے ز آبائی علوی   بصورت موخر، بمعنی مقدم
سلامٌ علیک اے ز آبائی فطرت   طفیلِ وجودِ تو ایجادِ عالم
سلامٌ علیک اے ز اسمائے حسنیٰ   جمالِ تو آئینۂ اسمِ اعظم
سلامٌ علیک اے بملکِ رسالت   ترا خاتم المرسلیں نقشِ خاتم
ز سعیِ تو شد فتحِ ابوابِ مغلق   ز نطقِ تو شد کشفِ اسرارِ مبہم
جزاک الذی عم جوداً و براً   وارضاک عنا و صلی و سلم
توئی یا رسول اللہ آں بحرِ رحمت   کہ باشد محیط از عطائے تو یک نم
جگر تشنگانیم از رہ رسیدہ
ترحم علینا بمار، ترحم

اے ز قدِ تو قدرِ طوبیٰ پست   رونقِ ماہ عارضِ تو شکست
گر تو صد بار دامن افشانی   کے گزاریم دامنِ تو ز دست
من نہ تنہا اسیرِ زلفِ توام   کیست کامروز از کمندِ تو رست
ہست دل لوحِ سادہ کز براو   جز خیالِ تو ہیچ نقش نہ بست
سر ز عہدِ تو چوں توانم تافت   تنگ دل بستہ ام ز عہدِ الست
کز دو عالم ہمیں وصالِ تو بس
بلکہ یک پرتو از جمالِ تو بس

جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ — دلم زندہ شد از وصالِ محمدؐ
خوشا مسجد و منبر و خانقاہے — کہ در وے بود قیل و قالِ محمدؐ
بود در جہاں ہر کسے را خیالے — مرا از ہمہ خوش خیالِ محمدؐ
بہ صدق و صفا گشت بیچارہ جامی
غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

احمد جامؒ:-

اے شب گیسوئے تو روزِ نجات — خاک پایت چشمۂ آبِ حیات
گرد راہت توتیائے چشمِ دل — عقدۂ زلفِ تو حلِ مشکلات
لفظِ شیرین تو راحِ روحِ روح — ذاتِ تو مقصودِ جملہ کائنات
ذاتِ پاکت مطلعِ نورِ خدائے — پرتو نورت محیطِ جملہ ذات

?

یا صاحب الجمال و یا سید البشر
من وجہک المنیر لقد نور القمر
لایمکن الثناء کما کان حقہٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

قدسیؒ:-

مرحبا سید مکی مدنی العربی !!
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر
اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی
ما ہمہ تشنہ لبانیم توئی آبِ حیات
رحم فرما کہ ز حد می گزرد تشنہ لبی
شبِ معراج عروجِ تو ز افلاک گزشت
بمقامیکہ رسیدی نرسید ہیچ نبی
ذاتِ پاک تو دریں ملکِ عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بزبانِ عربی
نسبت خود بہ سگت کردم و بس منفعلم !
زانکہ نسبت بہ سگِ کوئے تو شد بے ادبی
عاصیانیم ز ما نیکیٔ اعمال مپرس
سوئے ما بروئے شفاعت بکن از بے سببی
بر در فیض تو استادہ بصد عجز و نیاز
رومی و طوسی و ہندی حلبی و عربی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی
آمدہ پیش تو قدسی پئے درماں طلبی

ظہوریؒ:-

محمدؐ شہنشاہِ خیلِ رسل — کہ خرد ند پیشش چہ جزو چہ کل
درفشاں دُرِ درجِ عبد مناف — بانگشت اعجاز مہ را شگاف
زابروش محرابِ عین الیقین — زگیسوش اسبابِ حبل المتین
فلک ہا ز دریاش در شبنمے — فصیحاں ز غافوش در ابکمے
فقیر است دریا و کاں را گہر — یتیم است پیر و جواں را پدر
کلیدِ در رحمتِ پروردگار — شد از در دندانش دندانہ دار

جامیؒ:-

اے قمر طلعت و مکی مطلع — مدنی مہد یمانی برقع !
لیلۃ القدر ز مویت مائے — وحی منزل ز لبت گفتائے

احسان اللہ ممتازؒ:-

طرہ است سودِ ہمہ سودا ہا — انتخابے ز حرفش طاہا !
قاب قوسین عیاں ز ابرویت — نقشِ حمد خمِ گیسویت

در مقامیکہ رود ذکر ز اعجاز لبش
مشود زہر بہ خاصیتِ تریاک آں جا

فائق:-

گلبنِ باغِ فاستقم سروِ ریاضِ قل کفیٰ
گوہرِ بحرِ مصطفیٰ صلی علیہ و آلہ

بابا افضل کاشی:-

اے ذاتِ تو از دو کون مقصودِ وجود
نامِ تو محمدؐ و مقامت محمود
دل بر لبِ دریائے شفاعت بستم
زانوئے رواں میکنم از دیدہ درود

لا اعلم:-

اے شاہِ رسل شمعِ سبل......
شہبازِ دنیٰ طائرِ اوجِ فتدلیٰ
یک نسخہ ز وصفِ شبِ معراجِ تو والنجم
طغرائے تو یٰس لوائے تو فتحنا
واللیل قسم بر شکنِ طرۂ مویت
والشمس بہ ماہِ رخت اے شمعِ دل آرا

غنی:-

اے جامۂ فقر زیب پیرایۂ تو — درویش و غنی توانگر از مایۂ تو
از خاتمِ صنع سرزد نقشِ دو کون — تا صرف نشد سیاہی سایۂ تو

فصولی بغدادی:-

بُراقش از الف یک برق بیش است
ہزاراں گام لیک از برق بیش است

ناصر علی سرہندی

بیش از ہمہ شاہانِ غیور آمدۂ — ہر چند کہ آخر بہ ظہور آمدۂ
اے ختمِ رسل! قربِ تو معلوم شد — دیر آمدۂ، ز راہِ دور آمدۂ

فیضی:-

آں مرکزِ دورِ ہفت جدول — گرداب نشینِ موجِ اول
چابک قدمِ بساطِ افلاک (ہفت فلک) — والا گہرِ محیطِ لولاک!
قدرش بہ زمانہ ماہ و اکلیل — نورش بہ فلک چراغ و قندیل
مشعل نہ پیش گاہِ اقرار — آتش زنِ دودمانِ انکار
با شرع و کتاب نورِ ساطع (اقرارِ توحید) — با تیغ و زباں دلیلِ قاطع (دفع)
دمساز بہ حکمِ بے دریغش — با تیغ زباں، زباں بہ تیغش
از رایتِ کبریا مؤید — سرلشکرِ انبیا محمدؐ
خاکی و براوجِ عرش منزل — اُمّی و کتاب خانہ در دل
نطقش کہ مثالِ فاستقم یافت — طغرائے جوامع الکلم یافت
با حبلِ متیں دو سوے بستہ (دنیا و آخرت) — زنجیرِ خود بموے بستہ
با بیست وجود از کتابش — اجرام و عناصر انتخابش
ہم مطلعِ اولِ سباعی — ہم مصرعِ آخرِ رباعی
صبحش چو دمید عالم افروز — دینش بصد آفتاب شد روز
دہ عقل چراغِ منظرِ او — نہ چرخ طرازِ منبرِ او
قصرِ جبروت آشیانش — بامِ ملکوت آستانش
یک تن ملک او ست شش طرف را — یکتا گہر او ست نہ صدف را
ہم از دو جہاں تہی و ہم پُر — ہم ساحل و ہم محیط و ہم دُر
اسرارِ ازل خزینۂ او — محرابِ ابد مدینۂ او
زانوئے زمانہ بر زمینش — دامانِ فلک در آستینش
دینش بہ فروغِ جاودانی — مصباحِ زجاجِ آسمانی
بر بامِ ابد صدائے کوسش — پیشانیِ عرش خاک بوسش
یک گوشۂ ابروش بدعویٰ — بر خاک فگندہ طاقِ کسریٰ
بتخانہ سپردہ پے او — آتش کدہ کشتۂ خوئے او
زاں غنچہ کہ بر گل فشاند دستاں (پامال کردہ) — ہر قطرہ بہارِ صد گلستاں
صد باغِ بہشت شد نسیمش — صد اطلسِ چرخ در گلیمش
ناموسِ سحر بہ عنبریں مو — نقاشِ چمن بہ بادِ گیسو
گیسو بہ دو سوے بر شکستہ — کونین بہ تارِ موے بستہ
صد صبحِ بہار در جبینش — صد دستِ چمن در آستینش

یک عقدہ عمامہ بر کشادہ　　صد طبلۂ صبح سر کشادہ
از یو سفیش بہفت خرگاہ　　صد تیغ و ترنج در کف ماہ
آئینۂ وحدتش جہانتاب　　خورشید شہود اسطرلاب
در صید جہاں سوار چالاک　　آویختہ نہ فلک بہ فتراک
بیرون و دروں بہ عقل منظور　　او دادہ چراغ عقل را نور
چوں بود سیاہی از خطش دور　　بزدود سواد سایہ از نور
از چرخ بلند پایۂ او　　نہ چرخ بزیر سایۂ او
نورے است ز چشم کوتہاں دور　　عالم ہمہ سایۂ ازاں نور
یک نور و دو کون روشنائی　　یک گوہر و صد جہاں ردائی
رضوان خدائے بر صحابہ　　گنجینہ کشائے نہ خرابہ
(خوشنودی)
مانند بہ پیشگاہ ایام　　بر دوش وفا لوائے اسلام
ہمدست جنود کبریا را　　بردند بر آسماں لوا را
دینش بہ فروغ بخت بنگر　　وین روز فزوں درخت بنگر
بگزشتہ ہزار سال واندش　　دارد تر و تازہ نخلبندش
بروے گزرد اگر ہزاراں　　نخلے ست بپالش بہاراں
ایں نخل کہ جنبش ثمر شد　　ہر چند کہ رفت تازہ تر شد
بر نارک عرش پائے شرعش　　بر کرسی صدق اصل و فرعش
گر ظلمت شک خرد کند دور　　شرعش برہ خرد نہد نور
علمش بحد معارج عین　　ادناش مقام قاب قوسین
(مثنوی نل دمن)

ما طائر قدسیم نوا را نشناسیم　　مرغ ملکوتیم ہوا را نشناسیم
برہان تمیزیم زما نفی نیاید　　از ما "نعم" آموز کہ "لا" را نشناسیم
در کشف حقائق سبق آموز ضمیریم　　ترتیب دلیل حکما را نشناسیم
با اہل جدل نکتۂ توحید نگوئیم　　در وحدت حق چون و چرا را نشناسیم
اصحاب یقینیم گماں را نہ پسندیم　　ارباب صوابیم خطا را نشناسیم
از قافلۂ ما نخراں یافت سنائے　　رقص جرس و بانگ درا را نشناسیم
بر دانش ما انجم و افلاک بخندند　　گر صاحب لولاک سما را نشناسیم
صد شکر کہ ما پیرو اصحاب رسولیم　　در شرع دگر راہ نما را نشناسیم

نظیری نیشاپوری :-

صفا از عقدۂ دلہاست آں زلف معقد را
بحمد اللہ کہ ربطے ہست با مطلق مقید را
کہ داۓ روح را با جسم الفت گر نہ گردیدے
محمدؐ کاروان سالار ارواح مجرد را
بیک حسن و شمائل طرح عشق افگندہ شد ورنہ
نمی دادند نقش ہستی ایں لوح زبرجد را
بہ مکتب خانۂ سر مصحف از بر داشتے آں روز
کہ عقل کل نمی کرد از الف بے فرق ابجد را
حدیث دل فروزش بسکہ شد مجموعۂ حکمت
حکیماں جزو می سازند اوراق مجلد را
وجود مرکز پرکار عالم کے شدے ثابت
احد خود قاب قوسین از نبودے میم احمد را
بہ مسکن بستر از پہلوئے گرمش سرد نا گشتہ
کند طے بر براق معرفت اقصائے مقصد را
گرامی میہمانے در رہ امشب میزباں دارد
ملائک صف بہ صف پر بست در عرش ارا مسند را
نظیری نشۂ ذوقے ز جام ہوشمنداں کش
نے و مطرب پریشاں می کند مستان سرمد را

تخمیس بر غزل نعتیہ مرزا غالب

الطاف حسین حالی

اعجاز از خواص لسان محمد است　　عین الحیات گم بدہان محمد است
گر نور وگر ہدی کہ از آن محمد است　　حق جلوہ گر ز طرز بیان محمد است
آرے کلام حق بزبان محمد است
اے خامہ وصف قامت معشوق کم نگار　　اے دل سخن ز راست قداں درمیان میار
قمری ز ذکر سرو نفس را نگاہ دار　　واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گزار
کاینجا سخن ز سرو روان محمد است

شاہدِ بعشقِ عاشق و عاشق بجانِ خود
مجنوں بپائے لیلیٰ و لیلےٰ بفرقِ خود

مومن بآلِ احمد و آلش بفرقِ جد
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد

سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است

آنجا کہ از مناقبِ عترت سخن رود
وز آل و از صحابہ و امت سخن رود

واں کا ہمہ ز ختمِ رسالت سخن رود
در خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود

آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است

حکمش پہ مہر و ماہ رواں است چوں قضا
دیدی کہ باز گشتنِ خورشید بر قفا

بودہ است بر اشارۂ ابروئے مصطفےٰ
بنگر دو نیمہ گشتنِ ماہِ تمام را

کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است

دانی ز پیشِ چشمِ تو برخیزد ار حجاب
کز نورِ شمع پردۂ فانوس راست تاب

باشد ظہورِ روشنیِ عارض از نقاب
آئینہ دارِ پرتوِ مہر است ماہتاب

شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است

بینی اگر بدیدۂ دراک وارسی
گوئی اگر بعالمِ ادراک وارسی

سنجی اگر بمرتبۂ خاک وارسی
دانی اگر بمعنیِ لولاک وارسی

خود ہر چہ از حق است از آنِ محمدؐ است

لطفِ خداست گر بسرِ کس نہاد دست
قہرِ خداست چوں ز مرِ کین بحملہ جست

وانکسے کہ شد زئے ما رمیت مست
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است

اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است

ہمت بمدحِ شۂ من و حالی گماشتیم
گفتیم و از نگاشتنی ہا نگاشتیم

چوں کامِ دل بلب فراخورِ وصفش نداشتیم
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتیم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

مرزا غالب :۔

اے کہ می گوئی توانا کردگار
چوں محمدؐ دیگرے آرد بکار

یا خداوندِ دو گیتی آفریں
ممتنع نبود ظہیرے ایں چنیں

صورتِ آرائشِ عالم نگر
یک مہ و یک مہر و یک خاتم نگر

آنکہ مہر و ماہ و اختر آفرید
می تواند مہرِ دیگر آفرید

حق دو مہر از سوئے خاور آورد
کور باد آں کو نہ باور آورد

لیک در یک عالم از روئے یقیں
خود نمی گنجد دو ختم المرسلیں

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود !
رحمۃ للعالمینے ہم بود

کثرتِ ابداعِ عالم خوب تر
یا بیک عالم دو خاتم خوب تر

در یکے عالم دو تا خاتم مجو
صد ہزاراں عالم و خاتم بگو

مرزا غالب نے یہ اشعار مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی فرمائش پر لکھے تھے۔ ان اشعار کو سُن کر مولانا بہت خوش ہوئے اور بے انتہا تعریف کی۔ مگر جو کچھ مرزا نے مسئلہ نظیرِ خاتم النبیین کے باب میں کسی قدر مولانا کی رائے کے خلاف لکھا تھا اس پر مولانا سخت ناراض ہوئے۔ مرزا نے صاف صاف تو یہ نہیں لکھا تھا کہ خدا خاتم النبیینؐ کا مثل پیدا کرنے پر قادر ہے مگر اس مضمون کو اس پیرایہ میں ظاہر کیا تھا کہ اس موجودہ عالم میں تو ایک خاتم کے سوا دوسرا خاتم پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدا قادر ہے کہ ایسا ہی ایک اور عالم پیدا کرے اور اس میں خاتم النبیینؐ کا مثل جو اس دوسرے عالم کا خاتم النبیین ہو۔ خلق فرمائے۔ ؎

یک جہاں تا ہست یک خاتم بس است
قدرتِ حق را نہ یک عالم بس است

خواہد از ہر ذرہ آرد عالمے
ہم بود ہر عالمے را خاتمے

جب مرزا اول بار مثنوی لکھ کر مولانا کے پاس لائے تو مضمونِ مذکور اس اخیر شعر پر ختم کر کے لائے تھے ؎

در یکے عالم دو تا خاتم مجوے
صد ہزاراں عالم و خاتم بگوے

مولانا نے فرمایا کہ یہ تم نے کیا بکا ہے کہ متعدد عالموں میں متعدد خاتم ہو سکتے ہیں۔ نہیں بلکہ اگر لاکھ عالم خدا پیدا کرے تو بھی خاتم النبیین ایک ہی ہو گا۔ پس اس مضمون کو مثنوی میں سے بالکل نکال ڈالو اور جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح بیان کرو۔ مرزا کو نہ وہابیوں سے کچھ خصوصیت تھی اور نہ اُن کے مخالفوں سے کچھ تعلق تھا۔ بلکہ صرف دوست کی رضا جوئی مقصود تھی۔ انہوں نے مولانا کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ جو کچھ پہلے لکھ چکے تھے اُس کو تو اسی طرح رہنے دیا مگر اس کے آگے چند اشعار اور اضافہ کر کے کلام کو اس طرح مربوط کر دیا ؎

غالب ایں اندیشہ نپذیرم ہمے
خردہ ہم بر خویش می گیرم ہمے

اے کہ ختم المرسلینش خواندۂ — دانم از روئے یقینش خواندۂ

ایں الف لامے کہ استغراق راست — حکم ناطق معنی اطلاق راست

منشاء ایجاد ہر عالم یکیست — گر دو صد عالم بود خاتم یکیست

اس کے بعد اسی مضمون کو اور زیادہ پھیلایا ہے اور پھر مثنوی کو ان دو شعروں پر۔ جن میں نظیر خاتم النبیین کے ممتنع بالذات ہونے کی تصریح ہے۔ ختم کر دیا ہے ؎

منفرد اندر کمال ذاتی است — لاجرم مثلش محال ذاتی است

زیں عقیدت برنگردم والسلام — نامہ را درمی نوردم والسلام

(ماخوذ از یادگار غالب)

عشق در من آتشے افروخت است — ز صحبتش بادا کہ جانم سوخت است

از غم پنہاں نگفتن مشکل است — بادہ در مینا نہفتن مشکل است

مسلم از سر نبی بیگانہ گشت — باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عزیٰ و ہبل — ہر یکے دارد بتے اندر بغل

شیخ ما از برہمن کافر تر است — زانکہ او را سومنات اندر سر است

رخت ہستی از عرب برچیدۂ — در خمستان عجم خوابیدۂ

شل ز برفاب عجم اعضائے او — سرد تر از اشک او صہبائے او

نعشش از پیش طبیباں بردہ ام

در حضور مصطفیٰ آوردہ ام

غلام امام شہید:-

شب میلاد سلطان است امشب — زمیں بر خویش نازاں است امشب

ز نور مصطفیٰ ہر سو کہ بینی — تجلی گاہ یزداں است امشب

سرائے او کہ از نورست معمور — تو گوئی عرش سبحان است امشب

لب حوراں ترنم ریز تسبیح — بگردوں زہرہ رقصاں است امشب

ملائک تہنیت گویاں کہ لاریب — شب قدر عزیزاں است امشب

بہر کوئے کہ می بینم بہ عالم — بہار باغ رضواں است امشب

شہید بینوائے ہم چو بلبل

دریں گلشن غزل خواں است امشب

اے بصیری را ردا بخشندۂ — بربط سلمیٰ مرا بخشندۂ

ذوق حق دہ ایں خطا اندیش را — ایں کہ نشناسد متاع خویش را

اے فروغت صبح اعصار و دہور — چشم تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموس فکرم چاک کن — ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

اے کہ از احسان تو ناکس کس است — یک دعایت مزد گفتارم بس است

عرض کن پیش خدائے عزوجل — عشق من گردد ہم آغوش عمل

دولت جان حزیں بخشیدۂ — بہرۂ از علم دیں بخشیدۂ

در عمل پایندہ تر گرداں مرا

آب نیسانم گہر گرداں مرا

رخت جاں تا در جہاں آوردہ ام — آرزوئے دیگرے پروردہ ام

ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است — محرم از صبح حیاتم بودہ است

از پدر تا نام تو آموختم — آتش ایں آرزو افروختم

مدتے با لالہ رویاں ساختم — عشق با مرغولہ مویاں باختم

برقہار قصید گرد حاصلم — رہزناں بردند کالائے دلم

سالہا بودم گرفتار شکے — از دماغ خشک من لا ینفکے

حرفے از علم الیقیں ناخواندۂ — در گماں آباد حکمت ماندۂ

ظلمتم از تاب حق بیگانہ بود — شامم از نور شفق بیگانہ بود

ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند — در صدف مثل گہر پوشیدہ ماند

آخر از پیمانۂ چشمم چکید — در ضمیرم نوا ہا آفرید

اقبال:-

اے ظہور تو شباب زندگی — جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

اے زمیں از بارگاہت ارجمند — آسماں از بوسۂ بامت بلند

شش جہت روشن ز تاب روئے تو — ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو

از تو بالا پایۂ ایں کائنات — فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

در جہاں شمع حیات افروختی — بندگاں را خواجگی آموختی

تا دم تو آتشے از گل کشود — تودہ ہائے خاک را آدم نمود

ذرہ دامن گیر مہر و ماہ شد — یعنی از نیروئے خویش آگاہ شد

تا مرا افتاد بر رویت نظر — از اب و ام گشتۂ محبوب تر

اے ز یادِ غیر تو جانم تہی　　بر لبش آرم اگر فرماں دہی
شرم از اظہارِ او آمد مرا　　شفقتِ تو جرأت افزاید مرا
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز　　آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانۂ　　تا کجا زناریِ بت خانۂ
از درت خیزد اگر اجزائے من　　وائے امروزم خوشا فردائے من
فرخا شہرے کہ تو بودی در آں　　اے خنک خاکے کہ آسودی در آں
کوکبم را دیدۂ بیدار بخش　　مرقدے در سایۂ دیوار بخش

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم انجامم نگر

طاسینِ محمدؐ

(نوحۂ روحِ ابوجہل در حرمِ کعبہ)

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ　　از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود　　نوجواناں را ز دستِ ما ربود
ساحر و اندر کلامش ساحری است　　ایں دو حرفِ لا الٰہ خود کافری است
تا بساطِ دینِ آبا در نورد　　با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد
پاش پاش از ضربتش لات و منات　　انتقام از وے بگیر اے کائنات؟
دل بغائب بست و از حاضر گسست　　نقشِ حاضر را فسونِ او شکست
دیدہ بر غائب فرو بستن خطاست　　آنچہ اندر دیدہ می ناید کجاست
پیشِ غائب سجدہ کردن کوری است　　دینِ نو کور است و کوری دوری است

خم شدن پیشِ خدائے بے جہات
بندہ را ذوقے نہ بخشد ایں صلوٰت

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب　　از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ　　با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند　　آبروئے دودمانے ریختند
ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است　　خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست　　سرورش از مئے دیرینۂ تست
جز ایں چیزے نمی دانم ز جبریل　　کہ او یک جوہر از آئینۂ تست

گہے شعرِ عراقی را بخوانم　　گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگِ عرب را　　شریکِ نغمہ ہائے ساربانم

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند　　ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند
من اے میرِ امم داد از تو خواہم　　مرا یاراں غزل خوانے شمردند

گلستانے ز خاکِ من برانگیز　　نمِ چشمم بخونِ لالہ آمیز
اگر شایاں نیم تیغِ علیؓ را　　نگاہے دہ چو شمشیرِ علیؓ تیز

از سپہرِ بارگاہت یک جہاں وافر نصیب
جلوۂ داری دریغ از وادیِ سینائے من؟
با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ! او پنہان و تو پیدائے من

امیٔ بود کہ ما از اثرِ حکمتِ او　　واقف از سرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شررِ باختہ رنگے بود است　　نظرے کرد کہ خورشیدِ جہاں گیر شدیم

جگر مرادآبادی:-

اے از لبِ صادقت شنیدہ　　نادیدہ خدا خدائے دیدہ
اے شکلِ تو در جہاں نگارے　　یزداں دگرے نہ آفریدہ
اے آنکہ بہ امتزاجِ کامل　　در جملہ صفات، برگزیدہ
تو پرتوِ حسنِ ذات و از تو　　یک شمہ بہ دیگراں رسیدہ
اے بے ہمہ خلق و با ہمہ خلق　　اے از ہمہ خلق، برگزیدہ
آں خیر کہ بود، در زمانت　　بعد از تو، زمانہ ہم ندیدہ
در عشق و وفا یکے مثالے　　نے دیدہ و نے زکس شنیدہ

امروز بہ بیں کہ مردماں را ! کارے بہ ہلاکتے رسیدہ
مشرق ہمہ پُر زفتنہ و شر مغرب ہمہ مست و سرکشیدہ

اے آنکہ زشوقِ بے نہایت حق را ہمہ آشکار دیدہ
طے کردہ مراحل و منازل تا سدرہ بہ ساعتے رسیدہ
وز سدرہ بہ منتہائے قوسین با عظمتِ خاص رہ بریدہ
اے آنکہ درونِ پردۂ راز از خویش بہ خویشتن رسیدہ

کے عقل تواں رسد بہ پایاں ہم عشق ہنوز نارسیدہ
لولاک لما خلقت الافلاک در مدحِ تو جانِ ہر قصیدہ
اے اسمِ تو حرزِ جانِ عشاق اے ذکرِ تو، نورِ قلب و دیدہ
اے بر تو نثار، شرمِ عصیاں اے بر تو فدا، دلِ تپیدہ
یک گوشۂ چشمِ التفاتے بر اُمتیاں غم رسیدہ
رحمت بہ اشارۂ تو جوشاں جنت بہ نگاہت آرمیدہ
استادہ بہ پیشِ بارگاہت پیرے بہ رُخ آستیں کشیدہ
شاید جگرِ حزیں ہمیں است از بارِ گنہ کمر خمیدہ !

بالو رگھنندن کشور صاحب شوق رامپوری

ایم اے، ایل ایل بی۔ ایڈووکیٹ رامپور یوپی

بہ یثرب شوق دیدارِ محمدؐ منم ہر لحظہ بیمارِ محمدؐ
بہ یثرب چوں رسم، مژگانِ خود را کنم جاروبِ گلزارِ محمدؐ
جبینم صرفِ سجدہ تا بہ محشر زبانم محوِ اذکارِ محمدؐ
ملایک را نیارم در نگاہے شوم گر کفش بردارِ محمدؐ
زجبریلِ امیں سبقت ربودہ شبِ معراج رفتارِ محمدؐ

منم اے شوق بیگانہ ز اسلام
مگر کفر است، انکارِ محمدؐ

سنّتِ رسولؐ شریعت کا ماخذ ہے!

شریعتِ اسلامی کے مصادر و ماخذ مسلمانوں کے ہاں مسلّم، معروف اور محفوظ ہیں۔ کتاب اللہ کے بعد شریعت کا ماخذ سنتِ مطہرہ ہی ہے۔ یہ ماخذ اپنے اندر انتہائی وسعت اور جزرسی رکھتا ہے۔ کتاب اللہ میں بیشتر عمومی و اصولی احکام و کلیات ہیں۔ اور سنت میں جیسا کہ ہر اہلِ علم کو معلوم ہے۔ ان کلیات کی تشریحات و تفصیلات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماءِ سلف میں سے جس نے بھی استنباطِ احکام و تدوینِ قانون کے سلسلہ میں کچھ خدمات سرانجام دیں۔ اسے ذخیرۂ سنت و حدیث سے لازماً ہدایت و رہنمائی حاصل کرنی پڑی ہے۔

جمہور علماء محققین کے خیال کے مطابق حکمت، قرآن کے علاوہ ایک مستقل شئے ہے۔ اور اس سے مراد قرآن کے منشاء اور دین کے نظام اور شریعت کے مقاصد کا وہ فہم ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو نوازا تھا۔ یہی فہم جب آپ کے قول و فعل میں ظاہر ہوا تو سنت کہلایا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

"اللہ نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے اُس کے بارے میں مَیں نے اپنے دیار کے اہلِ علم سے یہی سنا ہے کہ وہ سنت ہے۔ حکمت کا ذکر جگہ جگہ کتاب کے ذکر کے بعد آیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر اس احسان کو بیان فرمایا ہے کہ انھیں رسولؐ کے ذریعہ سے کتاب و حکمت سکھائی جا رہی ہے۔ یہاں حکمت سے سنتِ رسولؐ کے علاوہ کچھ اور مراد لینا ممکن نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک طرف اللہ تعالیٰ نے تعلیمِ کتاب کے ساتھ منصبِ نبوی کی تعلیم حکمت کو بھی جمع کیا ہے اور دوسری طرف نبی کی اطاعت اور اس کی اتباع کو فرض قرار دیا ہے۔ اب کتاب اللہ کے بعد جو شئے فرضیت کا مقام حاصل کر سکتی ہے وہ صرف سنتِ رسولؐ ہے اور یہی دوسرے لفظوں میں "الحکمۃ" ہے!"

اوامرِ قرآنی کے بموجب جس طرح اتباع و اطاعتِ رسولؐ آپ کی زندگی میں واجب تھی بالکل اسی طرح سنت کا اتباع مسلمانوں کیلئے آپؐ کی وفات کے بعد بھی لازم ہے۔ کیونکہ نصوصِ قرآنی نے جس چیز کو واجب ٹھہرایا ہے وہ عام اطاعت ہے۔ ان میں یہ قید نہیں ہے کہ اسوۂ نبیؐ صرف نبی کی زندگی تک ہی واجب الاطاعت ہے اور نہ یہ اطاعت کا حکم صحابہ کیلئے خاص ہے۔ نبیؐ کی سنت جیسی اسوقت موجود تھی بالکل ویسی ہی آج بھی موجود ہے۔

یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبٰت ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔

"وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے۔ اور پاکیزہ چیزوں کو اُن کے لئے حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام کرتا ہے اور اُن پر سے وہ بوجھ اور بیڑیاں اُتارتا ہے جو اُن پر تھیں۔"

اس آیت کے الفاظ بالکل عام ہیں اور اُن سے مراد حلت و حرمت کے وہ احکام بھی ہیں جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں۔ اور وہ احکام بھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد مقالات پر قرآن میں آنحضورؐ کو مقنن احکام قرار دیا گیا ہے اور آپ کے امر و نہی کی پابندی کا حکم دیا گیا ہے۔

(سنتِ رسولؐ — شیخ مصطفےٰ السباعی)

سید عبد القدوس ہاشمی

رسول اللہ کی معاشی زندگی

بعثت نبوی سے پہلے کی تاریخ اوّل تو ملتی ہی کتنی ہے۔ اور جو تھوڑی بہت مل جاتی ہے۔ اُس کی حیثیت بھی نامربوط افسانوں اور کہانیوں سے بلند نہیں۔ اور تو اور۔ خود حضرت عیسیٰ مسیح علیٰ نبینا و علیہ السلام کے متعلق آج ہمیں کیا معلوم ہے۔ اتنا بھی تو کوئی نہیں جانتا کہ حضرت نے کتنی مدت عالمِ شہادت میں بسر کی۔ حالانکہ اس وقت دُنیا میں سب سے بڑی تعداد اُن ہی کی ہے جو اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہیں۔ تحقیق و دریافت کے جو ذرائع اُنھیں حاصل ہیں کسی اور قوم کو کہاں حاصل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ حضرت عیسیٰ مسیح پر انجیل مقدس جس زبان میں نازل ہوئی تھی۔ اُس کی اصل عبارت کیا تھی۔ دس سطریں بھی تو کہیں محفوظ نہیں!

یہ حال تو حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق ہماری معلومات کا ہے۔ حالانکہ ان کا عہد حضور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ باقی تمام پیغمبروں کے زمانوں سے نسبتاً قریب تر ہے۔ پھر حضرت موسیٰ۔ حضرت یعقوبؑ۔ اور حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہمیں قرآن مجید کے بیان سے زیادہ کیا ملنے کی امید ہو سکتی ہے؟

یوں سمجھئے کہ امتدادِ زمانہ کی گہری سیاہ چادریں تاریخ کے ان زمانوں کو اس طرح ہماری نظروں اور ہمارے کانوں سے چھپائے ہوئے ہیں کہ قیاس و وہم کی جولانیاں تک کام نہیں آتیں۔ سب کچھ پردۂ خفا میں ہے۔

اس کے برخلاف پیغمبر اسلام کی زندگی۔ اُن کے کارنامے۔ اُن کی صبح و شام۔ ان کے غزوات۔ ان کی تبلیغی سرگرمیاں۔ بلکہ اُن کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک واقعہ۔ اُس وقت کے سیاسی و معاشی حالات۔ قبائل کے باہمی تعلقات۔ وہ پورا ماحول۔ صحابہ۔ تابعین اور مؤرخین کی مساعی سے آج دُنیا کے سامنے ہے۔ نہ کوئی خفا ہے اور نہ کوئی اشتباہ۔ قرآن شریف اپنے اصلی الفاظ میں موجود ہے۔ اور ہر روز لاکھوں مرتبہ پڑھا جاتا ہے۔ آپؐ نے کس ماحول میں اور کیسی زندگی بسر کی۔ پوری کی پوری ہمارے سامنے موجود ہے۔

کیسی عجیب بات ہے [illegible] سو سال پہلے کی کسی بڑی سے بڑی ہستی۔ صاحبِ دلق و سجادہ۔ صاحبِ سیف و قلم۔ یا صاحبِ دیہیم و لشکر کے متعلق ہمیں ادھوری اور نامکمل معلومات سے زیادہ کچھ میسر نہیں آتا۔ لیکن ۱۳۶۵ سال پہلے [illegible] والے رسول اللہ کے متعلق وہ تمام باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو اتباع کے لئے اور خود ہماری سیرت و کردار کی تعمیر و تزئین کے لئے ضروری ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں دوسروں کے متعلق یہ سب کچھ محفوظ نہیں۔ بیس سو، پچاس سال پہلے وفات پانے والے کسی فاتح، کسی مصلح اور کسی ولی کے متعلق بھی تو اتنی باتیں نہیں ملتی ہیں۔ کیا یہ اہمیت صرف انبیاء علیہم السلام ہی کو حاصل ہوتی ہے؟ ہوتا تو یہی چاہیئے۔ انبیاء کے علاوہ اوروں کی زندگیاں چاہے بڑے سے بڑے ولی کامل اور خادمِ قوم کی زندگی ہو۔ خود ہی غلطیوں، غفلتوں اور واماندگیوں سے خالی نہیں ہوتیں۔ انسانیت ان کو کیوں محفوظ رکھے اور کس طرح عمل نمونہ بنا کر پیش کرے۔

ہاں! دوسرے انبیاء کرام کی سیرتیں شاید محفوظ رہ جاتیں - اگر خدا نے یہ فیصلہ نہ کر دیا ہوتا کہ اسلام ناسخ الادیان ہے - اور رسول اللہ آخری نبی ہیں - ہمارے ایک بزرگ بڑے خاص انداز میں کہا کرتے ہیں :-

"آنے کو تو پیغمبر اور ہادی کہاں نہیں آئے - ہر قوم میں آئے - ہر نسل میں آئے - ہر ملک میں آئے - اور ہر زمانے میں آئے - اللہ کا سلام ہو اُن پر - لیکن یہ سب جانے کو آئے - ایک مقررہ وقت اور معین زمانے کے لئے آئے - ان کے احکام - اور ان کے نمونے وقتی نمونے تھے جانے کو آئے اور چلے گئے - قیامت تک رہنے کو ایک ہی دین آیا - اور آیا - تو آگیا - اب اسے کون مٹائے - وہ آنے والا تو آخری آنے والا تھا - وہ چلا جائے اور اس کا نمونہ مٹ جائے تو قیامت ہی آئے - اب تو کوئی آنے والا ہی نہیں - نمونہ تو یہی رہے گا - اللہ نے ازل ہی میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ آخری نمونہ ہے - اور قیامت تک یہی نمونہ رہیگا -"

کتنی سچی بات ہے - آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ اس دورِ الحاد و زندقہ میں بھی قرآن مجید یاد کرتے ہی جاتے ہیں - اور تقریباً ستر کروڑ کی مسلم آبادی میں ایک سرسری اندازہ کے مطابق ہر ایک ہزار میں ایک حافظ قرآن یعنی تقریباً ساٹھ لاکھ حافظ قرآن کریم اب بھی موجود ہیں - اور ایسا تو کوئی بالغ مسلمان موجود ہی نہیں جسے کچھ نہ کچھ قرآن یاد نہ ہو - یہی حال سیرت نبوی اور سنت رسول اللہ کی یاد کا ہے - وعظ کی محفلوں میں اور بزرگوں کی مجالس میں سیرت نبوی کا بکثرت بیان ہونے کے علاوہ دُنیا کی ہر قابلِ ذکر زبان میں ہر سال ہزاروں چھوٹی بڑی کتابیں شائع ہوتی ہیں - مضامین لکھے جاتے ہیں - رسالوں اور اخباروں کے خاص نمبر نکلتے ہیں - یہ نہیں ہوتا ہے کہ ہر سال پیدائشِ مسیح کی یاد میں کرسمس کا تہوار منایا جائے - اور اخباروں کے خاص نمبر بھی نکلیں - لیکن سارے رسالے میں کہیں سیرتِ مسیح کا عنوان ہی نہ ہو - شرابوں کے اشتہار اور نیم برہنہ تصویروں سے کرسمس کا یہ خاص نمبر بھرا ہے !

ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ اس کا عام اور سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ لوگ دنیا داری اور غفلت میں ہیں - دین کی طرف توجہ کون کرتا ہے - لیکن یہ جواب کچھ بہت زیادہ صحیح جواب نہیں - لوگ متوجہ ہیں اور شدت کے ساتھ متوجہ ہیں - عیسائی مذہب کی تبلیغ پر دُنیا بھر میں کیا کچھ ہو رہا ہے - اور سالانہ کتنی خطیر رقمیں ان مساعی پر صرف ہوتی ہیں - ذرا اندازہ تو لگایئے - پھر کون کہہ سکتا ہے کہ عیسائی دُنیا دار دین کی طرف متوجہ نہیں ہیں - رہا عملی زندگی میں عیسائیت کی تعلیم سے دوری - تو یہ صرف عیسائیوں کا عیب نہیں - مسلمان جو سب سے زیادہ سیرت نبوی کی اشاعت کرتے ہیں - وہ کب اور کس قدر سنتِ رسول کے مطابق عمل کر رہے ہیں ؟ بے عملی میں تو مسلمان عیسائیوں سے کچھ کم نہیں ہیں - مگر پھر بھی رسول اللہ کی سیرت بیان ہوتی ہی رہتی ہے -

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہی قیامت تک کے لئے اسوۂ حسنہ ہے - اور انسانیت کیلئے صرف یہی ایک نمونہ فوز و فلاح ہے - اس لئے خدائے کائنات اپنے بندوں میں اس کی اشاعت کراتا ہے - اور اس کی یاد کو مٹنے نہیں دیتا - اور اس دن تک یہی ہوتا رہیگا جبکہ نظام شمسی میں اختلال پیدا ہو کر دُنیا کی عمر ختم ہونے کو آئے گی -

اس طرح سیرت نبوی کی اشاعت منشائے ربانی کی تکمیل اور خالق کائنات کی عبادت ہے - اس عبادت میں ہماری بھی شرکت ہو جائے تو سعادت ہے !

معاشی سیرت رسول

اگرچہ اس چھوٹے سے مضمون میں ہم پوری طرح یہ حق ادا نہیں کر سکتے - لیکن نیت یہی ہے کہ مختصر طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشی زندگی اور اس کے دوسروں پر اثرات کو اس مضمون میں واضح کیا جائے - اس مقصد کے لئے

سب سے پہلے ان سیاسی، معاشی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ جو ولادتِ نبوی کے وقت جزیرہ نمائے عرب اور خصوصاً حجاز پر طاری تھے۔ اس کے بعد یہ تحریر کیا جائے گا کہ حضور انور نے اپنی ۶۳ سالہ زندگی میں کیا کیا معاشی جدوجہد کی۔ پھر یہ لکھا جائے گا کہ آپ نے عرب کی معاشی زندگی میں کیا کیا اصلاحات فرمائیں۔ اور ان کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ اس طرح یہ مضمون تین حصّوں میں منقسم ہے۔

(۱) عرب کے سیاسی و معاشی حالات۔

(۲) رسول اللہ کی معاشی زندگی۔

(۳) معاشی اصلاحات۔

تعین تاریخ

ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریبی زمانہ ماقبل و مابعد میں عرب کی سیاسی و معاشی صورتِ حال پر غور کرنے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ اس زمانے کی تعیین کر لی جائے جو مطالعہ کا مقصود ہے۔

اس وقت عام طور سے جس سنہ کے ذریعہ تعیین تاریخ کی جاتی ہے۔ اور جو یورپ کی عیسائی اقوام کے غلبۂ سیاسی کی وجہ سے رائج ہو گیا ہے وہ عیسوی سنہ ہے۔ اب زمانے کی تعیین کی صورت یہ ہے کہ زمانہ قبل المسیح و بعد المسیح سے تعیین ہوتی ہے۔ لیکن جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں لفظ "ایرا" کے ضمن میں خود اس سنہ کے ماننے والوں نے اقرار کیا ہے۔ یہ سنہ فرضی بلکہ جعلی ہے۔ حضرت عیسیٰ مسیح علیہ السلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر اس میں دوسری خوبی یہ ہے کہ موسموں کے تطابق قائم رکھنے کے لئے اس میں متعدد بار کمی اور بیشی ہوتی رہی ہے۔ اوّل تو ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تقریباً ڈھائی سو سال کے بعد یہ سنہ عیسوی فرضی طور پر بنایا گیا ہے۔ پھر کلیسائی فرامین کے ذریعہ بارہا اس میں تصحیح و ترمیم ہوتی رہی ہے۔ اب اس کے بعد ہمارے پاس کیا ذریعہ رہ جاتا ہے کہ ہم زمانۂ ولادت نبویؐ کی تعیین سنہ عیسوی سے کر سکیں۔ اور یہ کہہ سکیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کتنے دنوں کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی۔

ایک دوسرا سنہ جو آٹھویں صدی ہجری تک رائج تھا۔ مگر اب گم ہو گیا وہ تبنزر سنہ کے نام سے تاریخ میں مرقوم ہے۔ کہتے ہیں کہ اس سنہ سے ۵۸۰ء مراد تھا۔ جبکہ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ اس سنہ کی حقیقت سے صحیح واقفیت ہمیں حاصل نہیں۔

ایک تیسرا سنہ یہودی کلینڈر ہے۔ جس کی ابتدا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل کی نجات سے شمار کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بھی نہ صرف یہ کہ یقینی نہیں ہے بلکہ احبار اور حاخام کے بے جا تصرفات کی وجہ سے کب کا غلط ہو چکا ہے۔

ایک چوتھا سنہ راجہ بکرماجیت سے منسوب ہے۔ لیکن آج تک اس کی تعیین بھی ممکن نہیں ہو سکی کہ راجہ بکرماجیت سے کون سا بکرماجیت مراد ہے۔ دو سو سال کے عرصہ میں حسب روایات ہندوستان میں پانچ بکرماجیت ہوئے۔ بکرماجیت نام نہیں لقب ہے۔ متعدد علاقوں میں متعدد راجاؤں نے یہ لقب اختیار کیا تھا۔

ان سنین کے علاوہ اور بھی متعدد سنین اور درجنوں کلینڈر رائج ہوئے۔ یا رائج ہیں۔ لیکن سب میں شاہی اور کلیسائی تصرفات ہوتے رہے ہیں۔ اور کوئی یقینی نہیں رہا۔ اس لئے ہم زمانے کی تعیین ہجری سنہ اور قمری سال سے کریں گے۔

قمری سال موسم کا ساتھ نہیں دیتا۔ اور شمسی سال سے بقدر گیارہ یوم چھوٹا بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس میں تصرف اور تبدل کا راستہ قرآن مجید کی آیت "انما النسیٔ زیادۃ فی الکفر" سے بند ہو گیا ہے۔ اس لئے یہ یقینی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت جس ربیع الاول میں ہوئی۔ اسی سال کی پہلی محرم سے اس کی ابتداء ہوتی ہے۔ اور موجودہ سال اس کا تیرہ سو پچھترواں سال ہے۔ اس طرح ہمارے مطالعہ کا زمانہ پہلی صدی قبل الہجرت قرار پاتی ہے۔ حسب ذیل نقشہ قیاسی طور پر

عیسوی سنہ کا تطابق ظاہر کرتا ہے - جو قریب بصواب ہے - لیکن بالکل صحیح نہیں ہے -

- واقعہ فیل (جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ ۱۰۵ پارہ ۳۰) میں ہے - یقیناً ۵۳ سال تین ماہ قبل الہجری مطابق قیاساً ۵۰ء
- ولادتِ نبویؐ - واقعہ فیل کے ۹۳ یا ۴۴ دن کے بعد ،، ۵۳ سال قبل الہجرت ،، ۵۷۰ء
- ہجرت نبویؐ - ... ... ،، ربیع الاول سنہ ہجری ،، ۶۱۰ء
- یکم محرم سنہ ہجری ... ... ،، ۱۶ جولائی ۶۲۲ء

ان سطور کے لکھنے سے یہ وضاحت مقصود ہے کہ ہم یہ کسی طرح متعین نہیں کر سکتے جس زمانے کے متعلق ہم آئندہ سطور میں کچھ بیان کرنا چاہتے ہیں - وہ زمانہ عیسوی سنہ سے کون سا زمانہ تھا - کہا جاتا ہے کہ یہ چھٹی صدی عیسوی تھی - خود عیسائی ارباب تاریخ کے بیان کے مطابق یہ بیان یقینی نہیں - بلکہ قیاسی ہے - البتہ ہم یہ یقینی طور پر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ زمانہ پہلی صدی قبل الہجرت کا تھا - جس کے سال ۵۳ میں ولادت باسعادت ہوئی تھی - اور ابرہہ حاکم یمن کعبہ کو منہدم کرنے کے ارادے سے مکہ پر حملہ آور ہوا تھا -

جزیرۃ العرب

جزیرۂ عرب سے ہماری مراد - وہ پورا جزیرہ نما ہے جس میں آج کل سعودی عرب - عراق - اردن - شام - لبنان - اسرائیل - یمن اور ساحلی ریاستیں تنجر - مکلا - عمان وغیرہ داخل ہیں - جس کے ایک طرف خلیج فارس دوسری طرف بحر احمر - تیسری طرف - بحر روم - اور جنوب میں - بحر عرب ہے - شمال میں کردستان کی پہاڑیاں ترکی سے علیحدہ کرتی ہیں اور مغرب میں نہر سویز افریقہ سے - آج اگرچہ اس رقبہ میں متعدد حکومتیں واقع ہیں - لیکن طبعی طور پر جزیرہ نمائے عرب کے یہی حدود ہیں - اور واضح طبعی حدود ہیں - قدیم یونانی جغرافیہ نویسوں نے بھی اسی کو عرب قرار دیا تھا[1]

پہلی صدی قبل الہجرت میں جزیرۂ عرب کے سیاسی حالات یہ تھے کہ :-

شام و فلسطین پر مشرقی رومن حکومت کا قبضہ تھا - یہاں فرمانروائے قسطنطنیہ قیصر روم کا نائب السلطنت انطاکیہ اور دمشق میں رہ کر حکومت کرتا تھا - سال کے مختلف اوقات میں خود قیصر بھی شام میں آتا رہتا - اس زمانے میں دنیا کی سب سے زیادہ متمدن، ترقی یافتہ اور طاقتور حکومت یہی قسطنطنیہ کی مشرقی رومن یا بازنطینی حکومت تھی - مشرق میں اس کے حدود موجودہ حکومت سعودیہ کے تقریباً وسط میں جبال الشمر تک تھے - اگر جبال الشمر سے ایک خط مستقیم موجودہ ترکیہ، عراق اور ایران کے حدود تک کھینچ دیں تو یہ لکیر تقریباً وہ حد بنائے گی جو اس زمانے میں رومی اور ساسانی (ایران) حکومت کے مابین خط فاصل تھی[2]

اس خط کے جنوب میں آزاد قبائل حجاز تھے - اور حقیقتاً کسی کے ماتحت نہ تھے - اس کے مغرب میں رومی حکومت اور اس کی باجگذار ریاستیں تھیں - اور اس خط کے مشرق میں ایران کی ساسانی حکومت تھی - اگرچہ اس کا دارالحکومت تخت جمشید تھا مگر سال کے اکثر دنوں میں شہر مدائن جو موجودہ بغداد سے کچھ دور جنوب کی طرف واقع ہے - دارالحکومت ہوا کرتا تھا -

جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی زرخیز و سرسبز حصے میں یمن کی حکومت اور اس کے تابع چھوٹے چھوٹے قبائلی رئیسوں کے مخلاف یعنی ٹھکانے واقع تھے -

---

[1] - تاریخ الاسلام السیاسی مصنفہ ڈاکٹر ابراہیم حسن جلد اول صہ ۳۳ - کتاب عرب دیورزے - [2] طبری، و ابن عساکر -

ولادت نبوی سے تقریباً ۵۰ سال پیشتر یمن میں ایک یہودی بادشاہ ذونواس نامی حکمران تھا۔ ہمارے پاس کوئی ایسی روایت موجود نہیں کہ اس کے زمانے کی کوئی صحیح تعین کر سکیں۔ طبری۔ ابن ہشام اور ابن قتیبہ نے صرف اسی قدر بتایا ہے کہ تقریباً ۵۰ سال پیشتر اس نے نجران کے عیسائیوں پر مظالم کئے۔ اور قیصر روم نے اپنے حلیف شاہ نجاشی حبشہ کو اس کی سرکوبی کے لئے لکھا قسطنطنیہ سے فوجی کمک بھی بھیجی گئی۔ اس طرح سے حبشہ نے یمن اور اس سے ملحقہ ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔

اب صورت حال یہ ہو گئی کہ جنوبی عرب میں یمن۔ حضرموت۔ مہرہ اور نجران تک شاہ نجاشی کے ماتحت ہو گئے۔ یہاں دربار حبشہ کا مقرر کردہ گورنر حکمرانی کرتا تھا۔ ان ہی گورنروں میں سے ایک گورنر ارياطا نامی تھا۔ اس کے ایک ماتحت افسر ابرہہ نے ارياطا کو قتل کر کے زمام حکومت خود اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ شاہ نجاشی نے بھی بعض داخلی پریشانیوں اور سب سے زیادہ درازی سفر کی وجہ سے مجبوراً ابرہہ کو فرمان حکمرانی عطا کر دیا۔ (سیرت ابن ہشام ص۲۵)

ابرہہ

ابرہہ بڑا سخت عیسائی تھا۔ اُسے یہ گوارا نہ تھا کہ یمن والے حج کے لئے مکہ مکرمہ آیا کریں۔ دوسری ایک معاشی وجہ بھی تھی۔ اب رومن حکومت نے پوری توجہ کے ساتھ کشتی رانی شروع کر دی تھی۔ چین اور ہندوستان کی پیداوار کو یورپ کی منڈیوں تک پہنچانے کا پرانا خشکی کا راستہ آہستہ آہستہ چھوٹتا جا رہا تھا۔ ہندوستان سے اب کشتیاں براہ راست یمن کی بندرگاہ عدن تک آنے لگی تھیں۔ اس لئے ابرہہ کو یہ ناگوار ہو گا کہ یمن کی پیداوار کو مصر کی منڈیوں تک پہنچانے کی پرانی راہ یعنی مکہ، تبوک، دومۃ الجندل۔ ایلہ اور سینائی کا خشکی کا راستہ آباد رہے۔ بلکہ وہ چاہتا ہو گا کہ یمن کی بندرگاہ سے مال بحر احمر کے ذریعہ مصر کی بندرگاہ سویز تک پہنچ جائے۔ لیکن یمن کے باشندے سنت ابراہیمی کے بموجب سالانہ حج کے لئے مکہ آتے تھے۔ اور یہیں سے یمنی پیداوار کے عوض میں شامی، چینی اور ہندوستانی پیداوار لے جایا کرتے تھے۔

ان وجوہ کی بناء پر ابرہہ نے عربوں کو کعبہ سے بے نیاز کرنے کے لئے ایک نہایت شاندار کلیسا یمن میں تعمیر کرایا۔ اس کیلئے پوری عیسائی دنیا نے اہتمام کیا۔ قیصر روم نے قسطنطنیہ سے کاریگر بھیجے۔ شاہ حبش نے رنگین اینٹیں مہیا کیں۔ اور بڑے اہتمام سے یہ شاندار گرجا بن کر تیار ہوا۔ اسکندریہ کے بطریق اعظم نے اس کے لئے ایک مقدس اطالوی پادری گرے جن ٹیوس کو متعین کیا۔ اس پادری نے ۲۳ دفعات کا ایک دستور مملکت بھی مرتب کر کے نافذ کیا۔ جس کی ایک نقل اب تک ویانا کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔[1]

اب شاہی و کلیسائی احکام کے ذریعہ صنعا، (دارالحکومت یمن) میں اس کلیسا کا حج ہونے لگا۔ اس کا اثر حجازی قبائل کی معاشی زندگی پر بھی پڑا۔ اور اُن کی مذہبی غیرت کو ٹھیس لگی۔ چند عرب نوجوانوں نے یمن جا کر اس کلیسا میں غلاظت کر دی۔ یا بروایتے اس میں آگ لگا دی۔ اس حرکت سے برافروختہ ہو کر ابرہہ نے تقریباً ۵۷۰ء میں ولادت نبوی سے تقریباً تین ماہ پیشتر مکہ پر حملہ کر دیا۔ اس حملہ میں وہ کوہ پیکر ہاتھی بھی ساتھ لایا تھا جو افریقہ کی میمتھ نسل کا تھا۔ اور شاہ نجاشی نے ابرہہ کو بھیجا تھا۔ یہی وہ فوج ہے جسے قرآن مجید کی سورۂ فیل میں "اصحاب الفیل" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ عرب میں ہاتھی نہیں ہوتا اس لئے عربوں کے لئے یہ جانور عجیب و غریب تماشا تھا۔ اور انہوں نے اس فوج کا نام اصحاب الفیل، اور اس سال کا عام الفیل نام رکھ دیا تھا۔[2]

---

[1] ڈاکٹر حمید اللہ کا مضمون عرب اور حبشہ بحوالہ ڈیرڈ رے مندرجہ سیاسی زندگی ص۱۴۳۔ [2] تاریخ طبری ص۹۶۰۔

موجودہ دور کے یورپی مورخین کہتے ہیں کہ ابرہہ کی نیت مکہ پر حملہ کی نہ تھی۔ بلکہ ساسانیوں کے مقابلہ میں اپنے آقا قیصر کی امداد کے لئے وہ خشکی کی راہ سے شام و عراق جا رہا تھا۔ لیکن یہ نکتہ بعید از وقوع ہے اور تاریخی طور پر ناقابلِ قبول نظریہ ہے۔ جس زمانے کا یہ ذکر ہے۔ اس زمانے میں امداد دینے کی آسان اور محفوظ راہ مکہ سے ہو کر نہیں ہو سکتی تھی۔ بلکہ یمن سے بذریعہ کشتی ایلہ جانا چاہیئے تھا۔ یا یمن سے حبشہ اور وہاں سے مصر۔ عیذاب و سینائی سے ہو کر محفوظ راہ امداد کی ہو سکتی تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ حجاز و تہامہ کی خشک و دشوار گزار راہ جو جنگجو قبائل کا مسکن تھا اور جہاں قیصر کی حکومت بھی نہ تھی۔ اس امدادی فوج کے لئے اختیار کی جاتی۔ اور اگر یہ راہ اختیار کی بھی جاتی تو یقیناً اُسے مکہ سے تقریباً چالیس پینتالیس میل مغرب کی طرف جدہ۔ ینبوع اور رابغ سے گزر جانا چاہیئے۔ کوئی وجہ نہیں کہ مکہ سے گزرے۔ ان سب پر مزید یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب سے نامہ و پیام۔ الٹی میٹم۔ اور قریشیوں کے اونٹ پکڑ لینے کی ضرورت کیا تھی۔ تمام جدید و قدیم مورخین اس پر متفق ہیں کہ ابرہہ نے جب قریشیوں کے اونٹ پکڑ لئے تو عبدالمطلب اُسے چھڑانے کے لئے ابرہہ کے خیمے میں گئے تھے۔ اور اس وقت ان کی ابرہہ سے حسب ذیل گفتگو ہوئی تھی:۔

ابرہہ:۔ کیا تم اس لئے آئے ہو کہ تمہارے اس بیت اللہ کو منہدم نہ کیا جائے؟

عبدالمطلب:۔ نہیں جناب! اس گھر کا تو پروردگار ہے۔ وہ اپنے گھر کی آپ حفاظت کرے گا۔ میں تو آپ کے سامنے اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مہربانی کر کے ہمارے اونٹ ہمیں واپس کر دیں۔

قریش میں ابرہہ کی فوج سے مقابلہ کی قوت نہ تھی۔ یہ لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ ادھر بیت اللہ کے رب نے طیر ابابیل کو بھیجدیا اور ابرہہ کی ساری فوج ان طیور کی سنگباری سے عصف ماکول (بھوسے) کی طرح ہو گئی۔[1]

اس واقعہ کے بعد صنعاء کا کلیسا ویران ہو گیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد طبری کی روایت کے مطابق ایرانیوں نے یمن پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اور وہرز نامی گورنر کے ماتحت اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس طرح جنوبی عرب سے بازنطینی اثر بالکل ختم ہو گیا۔[2]

اس کے بعد سے یمن پر ایرانیوں کی حکومت کسی نہ کسی صورت میں اُس وقت تک قائم رہی جبکہ نور اسلام نے اس علاقے کو منور کر دیا۔

عراق و شام بدستور اپنے اپنے مالکوں کے قبضہ میں مذکورہ بالا خط فاصل کے ساتھ رہے۔ اگرچہ اس پوری مدت میں رومن بازنطینی حکومت اور ایران کی ساسانی حکومت کے مابین بار بار آویزش ہوتی رہی اور چھوٹے چھوٹے علاقوں پر قبضہ بدلتا رہا۔ لیکن کوئی قابلِ بیان تبدیلی ۸ھ قبل الہجرت تک نہیں ہوئی۔ عرب کے قبائلی رئیسوں کو ملانے کی کوشش ایرانی اور رومن حکومت کی طرف سے مسلسل جاری رہی۔ اور کبھی کبھی یہ ہوتا رہا کہ بعض سرحدی ریاستیں ایک فریق سے ٹوٹ کر دوسرے فریق سے ملتی رہیں۔ البتہ ۸ ق ھ میں ایک عظیم الشان تبدیلی ہوئی۔ اس سال ساسانیوں نے حملہ کر کے رومن حکومت سے عراق و شام خالی کرا لیا۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر سورہ روم میں — "غلبت الروم فی ادنی الارض" میں کیا گیا ہے۔ لیکن ایرانیوں کا یہ قبضہ بہت دنوں تک قائم نہ رہا۔ گیارہ بارہ سال کے بعد ۶ ہجری میں موصل کے قریب رومیوں نے ایرانیوں کو ایسی فیصلہ کن شکست دی کہ پھر ایران کبھی نہ سنبھل سکا۔ اور رومی اپنے کھوئے ہوئے علاقے پر بہ اضافہ مزید قابض ہو گئے۔[3]

نجد اور الحسا کا علاقہ مقامی رئیسوں کے قبضہ میں تھا۔ جو یمن سے بذریعہ معاہدات و محالفات منسلک تھے۔ اُن میں

۱؎ تاریخ طبری بحوالہ سابق۔ ۲؎ حوالہ سابق۔ ۳؎ ابن کثیر جلد ۳ ص ۸۸ و ما بعد تاریخ الاسلام السیاسی۔

کبھی کبھی آپس کے جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ اور مختلف ٹھکانوں کا رقبہ بڑھتا گھٹتا رہتا تھا۔ اُن کے عام طور پر بین الاقوامی تعلقات دُنیا کی بڑی حکومتوں سے نہ تھے۔ کبھی کبھی اُن کے وفود یمن اور دربار کسریٰ ایران میں جاتے رہتے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کے وسطی حصہ میں جہاں حجاز واقع ہے کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ تاریخ عرب سے کسی ریاست، یا خلافت کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ مختلف قبائل مختلف وادیوں میں جہاں کسی نہ کسی قدر پانی میسّر آجاتا تھا۔ آباد تھے۔ ہر قبیلہ ایک سردار کے ماتحت اور ایک مستقل و آزاد حکومت رکھتا تھا۔ نہ کوئی کسی کا باجگزار تھا اور نہ کوئی کسی کے ماتحت۔ قوت و ضعف کا دارومدار قبائل کی عددی قوت پر تھا۔ چھوٹی تعداد رکھنے والے قبیلے کسی بڑے قبیلے سے باہمی تعاون و حمایت کا معاہدہ کرکے اپنے آپ کو دوسروں کے ظلم و تعدی سے محفوظ رکھتے تھے۔ چونکہ اس قطعۂ زمین میں یمن کی سی زرخیزی نہ تھی اور نہ اسے فوجی نقطۂ نظر سے کوئی اہمیت حاصل تھی۔ اس لئے بازنطینی حکومت یا ساسانی بادشاہت کو بہت زیادہ ان سے دلچسپی بھی نہ تھی۔ یوں شمار کے لئے شاہانِ ایران اسے اپنے ماتحت شمار کرتے تھے۔ اور جبل الشمر سے ملحقہ علاقوں کو بازنطینی حکومت اپنے مقبوضہ علاقے سمجھتی تھی۔ لیکن یہ قبضہ یا ماتحتی محض لفظی تھی۔ نہ ایران کی طرف سے کوئی حاکم وہاں رہتا تھا۔ اور نہ روم کی طرف سے کوئی گورنر۔ یہ بالکل آزاد قبائل کی سرزمین بے آئین تھی![1]

اسی علاقے میں مکہ کا مقدس شہر واقع ہے۔ یہاں جو عبادت گاہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اُن کے فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے بنائی تھی۔ وہ سارے عرب میں مقدس ترین جگہ شمار ہوتی تھی اور سالانہ حج طرح طرح کی بے ہودہ رسوم کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔

مکہ کے چاروں طرف تقریباً دو سَو میل مربع کے رقبہ کو حرم یعنی قابلِ احترام علاقہ قرار دے دیا گیا تھا۔ پہلے اس علاقے پر اور ساتھ ہی خانہ کعبہ کی تولیت پر قبیلہ کنانہ قابض تھا۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے پردادا قصی بن کلاب نے بعض بیرونی امداد کے ذریعہ بنی کنانہ کو طائف چلے جانے پر مجبور کردیا۔ اور خود اپنی اولاد کے ساتھ اس علاقے پر قابض ہوگئے تھے۔ یہی قصی ہیں جن کی اولاد قریش کہلاتی ہے۔ قصی نے تقریباً مطلق العنان بادشاہ کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ اس کا بڑا اثر تھا۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں نظم و نسق کے مختلف فرائض کو اپنی اولاد میں تقسیم کرکے ایک قسم کی عیاتی حکومت قائم کردی تھی۔ اُس نے ایک مجلس شوریٰ بھی دارالندوہ کے نام سے قائم کردی تھی۔ جسے آج کی اصطلاح میں دارالشیوخ سمجھئے۔ چالیس سال سے کم عمر کا آدمی اس میں شریک نہ ہوسکتا تھا۔ اور قریش کے علاوہ دوسروں کو بھی اس میں شرکت کی اجازت نہ تھی۔ حالانکہ اس علاقے میں قریش کے علاوہ دوسرے قبائل بھی آباد تھے۔ لیکن مکہ کی اس شہری مملکت میں اُن کی کوئی آواز نہ تھی۔ اور نہ اُن کے ذمہ کوئی کام تھا۔ اُن کی حیثیت تقریباً ذمیوں کی سی تھی![2]

قصی کے پوتے ہاشم - عبد شمس [illegible] قیصر روم، ایران اور حبشہ سے تجارتی راہ داری کے اجازت نامے حاصل کرلئے۔ اس کے بعد خود حجاز کے مختلف قبائل سے بھی راہ داری کے معاہدات کرلئے۔ اس طرح قریش نے اپنے لئے ایک مزید امتیازی حیثیت حاصل کرلی۔ ان بین الاقوامی تعلقات سے قریش کو بہت سے معاشی فوائد حاصل ہوئے۔ جن کا ذکر آئندہ معاشی حالات کے سلسلہ میں آئے گا۔[3]

---

[1] قلب جزیرۃ العرب لحافظ ص ۲۴۲ و ما بعد۔ [2] اخبار مکہ للازرقی - تاریخ الاسلام السیاسی ابراہیم - [3] تاریخ مسعودی - تفسیر کبیر - تفسیر [illegible]

قریش نے مکہ کی اس شہری مملکت اور اپنے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے لئے حبشی غلاموں کی ایک مستقل فوج بھالی تھی - ازرقی نے اخبار مکہ میں اس فوج کا ذکر کیا ہے - یہ فوج اگرچہ آج کل کی طرح قواعد داں فوج نہ تھی - لیکن مستقل فوج تھی - جسے فوجی خدمات کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا -

قبیلہ قریش کے دس خانوادوں میں سپہ سالاری - ثالثی - عدالتی انصاف رسانی - سفارت وغیرہ مختلف فرائض مملکت کو تقسیم کر دیا گیا تھا - اور اس طرح مکہ کی یہ چھوٹی سی شہری مملکت اچھے خاصے بین الاقوامی تعلقات بھی رکھتی تھی۔[1]

معاشی حالات

جزیرہ نمائے عرب کے اُن حصوں میں جہاں منظم حکومتیں قائم تھیں - مثلاً عراق - شام اور یمن - معاشی حالات تقریباً ویسے ہی تھے جیسے کہ اُس زمانے کے دیگر ممالک میں تھے - شام میں غذائی اجناس ضرورت سے زیادہ پیدا ہوتی تھیں اور برآمد کی جاتی تھیں - یمن میں چمڑے کی دباغت ہوتی تھی - اس کے علاوہ پارچہ بافی کا کام ہوتا تھا - یہاں اور گوند برآمد ہوتا تھا - غذائی اجناس مقامی آبادی کے لئے کافی تھیں - عراق کے دو حصے تھے - تقریباً نصف رومی حکومت کے ماتحت اور نصف ایرانی بادشاہوں کے ماتحت - یہاں کی کسی صنعت کا پتہ نہیں چلتا - پیداوار غالباً مقامی آبادی کے لئے کافی ہو جاتی تھی -

جزیرہ نما کے وسطانی علاقے یعنی حجاز و تہامہ کی معاشی حالت سب سے خراب تھی - اور بقول حالی :-

نہ صحرا میں پانی نہ جنگل میں کھیتی !

عرب اور کُل کائنات اُس کی یہ تھی !

مکہ اور اُس کے گرد و نواح میں نہ بارش تھی - اور نہ کاریز - صحیح معنوں میں وادیٔ غیر ذرع - ایک اُجاڑ علاقہ ہے - جس میں کھیتی تو کھیتی اتنی سبزی بھی نہیں کہ سو پچاس بھیڑ بکریاں اس جلی ہوئی سیاہ رنگ کی پہاڑیوں میں پھر کر اپنے پیٹ بھر لیں - طائف نسبتاً سرسبز ہے - پہاڑی نالوں کا پانی مجتمع ہو کر کھیتی اور باغبانی کے لئے کچھ نہ کچھ کام آجاتا تھا - لیکن نہ اس قدر کہ دوسرے حصوں کے لئے غذائی اجناس یہاں سے مہیا ہو سکیں - بمشکل تمام مقامی آبادی کا گزارہ ہو جاتا تھا - یہی حال مدینہ کا تھا - مدینہ کے گرد و نواح میں چاہی آب پاشی سے کھیتی ہوتی تھی - اس پر مقامی آبادی غربت و افلاس کے ساتھ گزر بسر کرتی تھی - مدینہ کے لئے ایک مصیبت یہ تھی کہ یہاں کے کسان یہودی سُود خواروں کے زرعی قرضوں کے بارے پریشان تھے - سینکڑوں سال سے یہودی ساہوکار یہاں آباد تھے - اور یہاں مقروضیت کا وہ عالم پیدا ہو گیا تھا کہ مدینہ کا شاید ہی کوئی کاشتکار رہا ہو جو ان کا مقروض نہ ہو۔[2]

جبل الشمر کے قریب بھی کوئیں کھودنے سے میٹھا پانی کافی مقدار میں مہیا ہو جاتا تھا - یہاں یہود کاشتکار آباد تھے - اور مختلف اوقات میں یہاں انہوں نے سات قلعوں پر مشتمل ایک آبادی پیدا کر لی تھی - جسے خیبر کہتے تھے - یہ لوگ ساہوکاری بھی کرتے تھے اور یہودیوں کے مشہور طریقہ جلب منفعت کے موجب انہوں نے سارے عرب میں پھیلے ہوئے یہود کی ایک بنک کاری تنظیم بھی کر لی تھی - اور بازنطینی حکومت کی سرحد سے طائف تک کی راہ کو محفوظ رکھنے کے لئے یہودی چھاؤنیاں بھی بنائی تھیں - یہودیوں نے نفع کی امید نہ ہونے کی وجہ سے خاص شہر مکہ کو توجہ دیا تھا - کیونکہ وہاں کوئی کھیتی باڑی نہ تھی اور سود پر لگائے ہوئے روپیوں کی وصولی کے لئے ضمانت نہ تھی - باقی سارے علاقے پر اُن کی بنک کاری کا تسلط تھا۔[3]

---

[1] تاریخ طبری - [2] تاریخ الاسلام ڈاکٹر ابراہیم حسن - [3] حوالہ سابق -

مکہ اور اس کے قریب کے باشندوں کے لئے ذرائع رزق کا مسئلہ سب سے نازک تھا۔ نہ یہاں کھیتی تھی نہ کوئی صنعت۔ نہ چراگاہیں تھیں اور نہ معدنی ذخائر۔ اس لئے "تلاش معاش" میں ان قبائل کی دوسرے علاقوں کی طرف حرکت سارے عربی قبائل سے زیادہ تھی۔ چونکہ اس علاقہ کے باشندوں کے لئے کسی دوسرے پیشے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس لئے یہ لوگ تجارت پیشہ ہو گئے تھے۔ لیکن اپنے علاقہ میں تو کوئی پیداوار نہ تھی۔ وہ تجارت کرتے بھی تو کس چیز کی۔ اس لئے ان لوگوں نے عرب کے دوسرے قبائل سے بھیڑ کا گھی، شہد، گوند، خام چمڑا اور یمن سے لوبان اور عود مہیا کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ان ہی اشیاء کو لے کر وہ سال میں ایک بار یمن اور ایک بار شام کا سفر کیا کرتے۔ ان کے عوض غلّہ۔ کپڑا اور دیگر ضروری سامان حاصل کرتے۔ اس تجارتی تنظیم کے لئے انہوں نے مذکورہ بالا اجازت نامہ راہ داری حاصل کیا تھا۔ اور مختلف قبائل سے معاہدہ کر لیا تھا کہ جس قافلہ کے ساتھ قریش موجود ہوں۔ انھیں اپنے علاقوں سے مامون و محفوظ گزر جانے دیں۔ ان ہی تجارتی سفروں اور قافلوں کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ ایلاف میں رحلۃ الشتاء والصیف کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس طرح قریش کی معاشی زندگی کا انحصار صرف ان تین چیزوں پر تھا:۔

۱۔ رحلۃ الشتاء والصیف۔ یمن اور شام کی طرف تجارتی سفر۔

۲۔ مکہ کے قرب و نواح میں موقتی بازار۔ جنہیں مواسم کہا جاتا تھا۔ اور قریش اس میں مال لا کر بیچنے والوں سے چنگی لیا کرتے تھے۔

۳۔ محصول بدرقہ۔ جو قبیلہ ایک حصۂ حجاز سے دوسرے حصّہ میں یا نجد اور نجران کے میلوں میں مال بیچنے کے لئے لے جاتے تھے وہ قریش کو محصول ادا کر کے اُن سے ایک حفاظتی دستہ حاصل کرتے تھے تاکہ قریش سے کئے ہوئے معاہدوں کی وجہ سے راستے کے قبائل ان پر ڈاکے نہ ڈالیں۔ کبھی تو دو چار قریشی جوان اُن کے ساتھ ہو لیتے تھے۔ اور کبھی کسی ایک قریشی کی سرکردگی میں حبشی غلاموں کی قایمہ فوج کا کوئی دستہ ساتھ کر دیا جاتا تھا۔

حجاز میں آج بھی کوئی کان نہیں۔ اور اُس وقت بھی معدنی ذخائر کا کوئی پتہ نہ تھا۔ صنعت اس کے سوا کوئی نہ تھی کہ مٹی کے برتن بنا لئے جاتے تھے۔ طائف میں بنی ثقیف کے لوگ ہندوستان سے منگوائے ہوئے لوہے سے تیروں کے پھل۔ تلوار اور نیزے بنا لیتے تھے۔ بلکہ یہ بھی بہت کم۔ اکثر ثقفی کاریگر صرف صیقل گری اور مرمت ہی کا کام جانتے تھے۔ عربی زبان میں لفظ تثقیف بمعنی تلوار کی بانک نکالنا۔ اسی وجہ سے بن گیا ہے۔

عرب کے سوا شاید ہی دنیا کے اور کسی ملک میں پانی اتنا کمیاب ہو کہ پانی ملنے کے مقامات کا یاد رکھنا ایک فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہو۔ عرب میں جن بوڑھے آزمودہ کار لوگوں کو عرب کے مقاماتِ آب سے واقفیت ہوتی تھی۔ وہ قافلوں کی رہنمائی کر کے مزدوری حاصل کرتے تھے۔ اور اسلام کے بعد جب تصنیف و تالیف کا دور شروع ہوا تو بہت سے مصنفین نے خاص اس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں۔ اَصمعی کی کتاب میاہ العرب اور ابن حبیب کی کتاب المیاہ اب تک مل جاتی ہیں۔

دولت مندی

عرب کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ یہ لوگ غیر متمدن۔ مفلس، جھگڑالو۔ اور بڑے شراب خوار و عیاش طبع لوگ تھے۔ یہ غلط نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ تمدن سے واقف نہ تھے۔ چونکہ ان کی زندگی کسی منظم باقاعدہ حکومت کے ماتحت بسر نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے جتھہ داری اور عددی قوت بڑی فیصلہ کن چیز تھی۔ اور اس کے لئے وہ بہت خرچ کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لوگ سود خواری و نفع اندوزی کے ذریعہ اچھی خاصی دولت مندی کے مالک تھے۔ انہوں نے قیصر کے دربار دیکھے تھے۔ عیش و عشرت کے ان تمام طور طریقوں سے واقف تھے جو ان دو متمدن ترین

حکومتوں میں رائج تھے۔ اس لئے ان کے امراء جنگجوئی کے ساتھ ساتھ عیش کوش اور خاصے نفاست پسند ہو چکے تھے۔ اور اس زمانے کی کوئی تکلف پسندی ایسی نہ تھی جو امرائے طائف اور یہودیانِ مدینہ میں موجود نہ تھی۔ آج بھی اگر مدینہ منورہ کے جنوب میں دولت مند یہودی ابن ابی الحقیق کے محلات کا کھنڈر دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے۔ کیا عالیشان محل تھا۔ پانی کے نل کس طرح سارے محل میں دوڑائے گئے تھے۔ کس اہتمام کے ساتھ حماموں اور نشست گاہوں کو تعمیر کیا گیا تھا۔

ولادت باسعادت

یہ تھے وہ حالات جن میں مکہ کے سردار، کعبہ کے متولی، عبدالمطلب کے گھر میں، واقعہ فیل سے ۵۳ یا ۵۴ دن کے بعد ۵۷۰ء سیزر، اور تقریباً ۵۷۰ء میں۔ ہجرت سے ۵۳ سال قبل حضور محمد مصطفےٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے۔

پہلی کمائی

دُنیا میں بہت ہی کم بچے ہوں گے جنہیں اپنے لئے روٹی کمانے کی فکر صرف نو دس سال کی عمر ہی میں پڑ گئی ہو۔ خصوصاً وہ بچے جو کسی خوش حال سردار کے گھر میں پیدا ہوئے ہوں۔ لیکن "یتیموں کے ماویٰ غریبوں کے ملجا" محمد رسول اللہ کے لئے ضروری تھا کہ آپ، صرف نو سال کی عمر میں اپنے لئے اور اپنے مربی کے لئے روزی کمائیں۔ والد کا انتقال تو پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ چھ سال کی عمر ہوئی تو والدہ بھی وفات پا گئیں۔ نو سال کی عمر ہوئی تو شفیق دادا بھی مر گئے۔ اب آپ کی نگرانی شفیق لیکن غریب و مفلوک الحال چچا ابو طالب کے سپرد ہوئی۔ غریب ابو طالب عیالدار آدمی تھے۔ اور آمدنی کا کوئی معقول ذریعہ نہ تھا۔ نہ کوئی جائیداد تھی۔ اور نہ دکان۔ گزر بسر کا ذریعہ تجارت ہو سکتی تھی۔ سو اس کے لئے سرمایہ کہاں سے لاتے —— دوسروں کا مال عرب کے میلوں میں لے جاتے تھے اور مزدوری پاتے تھے۔ یہ مزدوری اتنی نہ ہوتی تھی کہ سال بھر خوش حالی کے ساتھ بسر ہو جاتی۔ اکثر گھر میں فقر و فاقہ کی حالت رہتی۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نو سال ہی کی عمر سے دوسروں کی بکریاں مزدوری پر چرانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ ابو طالب کی دو چار بکریاں بھی ساتھ لے لیتے۔ اس طرح آئندہ زندگی میں "المساکین لی" کہنے والے نے ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے اپنی زندگی مسکینوں کے ساتھ صحرا میں بسر کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک بار آفتاب کو غروب ہوتے ہوئے دیکھا تھا تو فاطر السمٰوات والارض کا عرفان انھیں حاصل ہو گیا تھا۔ دین ابراہیمی کے اس آخری اور کامل ترین پیغمبر کو ان مناظر سے عرفان عطا کیا جاتا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیائے انسانیت کو ایک نئی منصفانہ راہ پر کس طرح لگایا۔ اور اللہ کی زمین کو برائیوں سے پاک کرنے کے لئے کیا کیا کارنامے انجام دیئے۔ یہ بار بار پڑھیے۔ بار بار سنئے۔ اور اتباع کیجئے۔ دوسرے مضامین میں ان کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔ اور آپ آج تک ہزاروں بار سن اور پڑھ چکے ہیں۔ اس وقت ہمارے اس مختصر سے مضمون کا موضوع صرف معاشی سیرت نبوی ہے۔ اس لئے ہم اُس پر بحث کریں گے۔

محنت کشی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ترسیٹھ سالہ مشغول اور تابناک زندگی میں کس کس وقت کیا ذرائع معاش رکھتے تھے اور اس کا اثر آپ کے متبعین پر کیا پڑا۔ اس کا مطالعہ کرنے کے لئے ہم اس ترسیٹھ سال کو حسب ذیل چار زمانوں میں تقسیم کرتے ہیں:-

(۱) ولادت باسعادت سے ۹ سال کی عمر تک۔

(۲) ۹ سال کی عمر سے ۲۵ سال کی عمر تک۔

(۳) ۲۵ سال کی عمر سے ۵۳ سال کی عمر تک۔

(۴) ۵۳ " " ۶۳ " " ۔

وراثت

ولادت سے ۹ سال کی عمر تک۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار کفالت آپ کے دادا عبدالمطلب پر رہا۔ عبدالمطلب اگرچہ کوئی بڑے دولت مند آدمی نہ تھے پھر بھی ایک خوش حال سردار تھے۔ اور اتنا مال مویشی بھی رکھتے تھے کہ اپنی ایک منت پوری کرنے کے لئے انہوں نے اپنے فرزند عبداللہ (حضورؐ کے والد) پر سے سو اونٹ صدقہ میں دیے تھے۔ بڑے کثیر العیال آدمی تھے۔ اور موسم حج میں حاجیوں کی خدمت پر بھی بہت کچھ خرچ کیا کرتے تھے۔ رسولؐ اللہ کی ولادت سے کوئی تین ماہ قبل آپ کے والد کا شام کے تجارتی سفر سے واپس آتے ہوئے مدینہ کے قریب انتقال ہوچکا تھا۔ ابھی نوخیز جوان تھے۔ بعض روایتوں کے بموجب صرف انیس[19] سال عمر تھی۔ اور بعض کے بموجب صرف اٹھارہ[18] سال۔ اس لئے قیاس یہ چاہتا ہے کہ عبداللہ نے ابھی نہ اپنا گھر بنایا تھا اور نہ دولت کمائی تھی۔ تاریخوں میں کسی مال و دولت کا بطور وراثت رسولؐ اللہ کو ملنا ثابت نہیں۔ ایک باندی بی بی اُم ایمن کا ذکر آتا ہے۔ جنہوں نے آپ کو ابتداءً دودھ بھی پلایا تھا۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ یہ باندی عبداللہ سے وراثت میں آپؐ کو ملی تھیں۔

آپؐ نے چھ سال بھی پورے نہ کئے تھے کہ مدینہ سے واپسی پر مقام ابواء میں آپ کی والدہ بی بی آمنہ کا انتقال ہوگیا۔ تو یہی بی بی اُم ایمن آپؐ کو لے کر عبدالمطلب کی خدمت میں آئی تھیں۔ غالباً گھر والوں میں سے کوئی اور اس سفر میں بی بی آمنہ کے ساتھ نہ تھا۔

بہرحال کسی قابل ذکر جائداد یا زرِ نقد کا وراثتاً آپؐ کو ملنا کسی روایت میں نہیں ملتا۔ اور نہ کہیں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عبدالمطلب کے مکان کے علاوہ آپؐ کے والد عبداللہ کا کوئی گھر الگ بھی تھا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے والد سے پانچ اونٹ۔ دوچار اونٹنیاں اور کچھ بکریاں بھی وراثت میں ملی تھیں[1] لیکن ہماری تحقیق و تفحص میں یہ روایتیں بھی قابلِ وثوق نہیں ہیں۔ اور اگر بالفرض مان بھی لیا جائے تو یہ اتنی کم قیمت وراثت تھی کہ ۹ سال کی عمر تک آپؐ کی پرورش کے لئے کافی نہیں ہوسکتی تھیں۔

البتہ روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی والدہ ایک خوش حال خاندان کی بیٹی تھیں۔ لیکن عربوں کے رواج کے مطابق غالباً نانیہالی دولت سے حضورؐ کو کوئی وراثت نہیں ملی۔

گلہ بانی

اس طرح جب رسولؐ اللہ کی نگرانی کی خدمت ابوطالب کے حصہ میں آئی تو یقیناً آپؐ کے ساتھ کوئی موروثی دولت نہیں آئی۔ اور آپؐ نے ابوطالب کے گھر کی غربت سے متاثر ہوکر مزدوری پر بکریاں چرانے کا کام شروع کردیا ہوگا۔ آپ جب دائی حلیمہ سعدیہ کے پاس تھے تو آپ نے حلیمہ کے بچوں کو بکریاں چراتے دیکھا تھا۔ اور آپ نے بھی اس کام میں ان کا ساتھ دیا۔ اس لئے مکہ میں آپ نے یہی کام اپنے لئے اختیار کیا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مکہ میں ان دنوں اور کام بھی کیا ہوتا تھا۔ کوئی صنعت گاہ یا کارخانے تو موجود نہ تھے۔ جہاں آپ کام کرتے۔ نہ کان کنی: اور نہ کاشتکاری کا کام ہوتا تھا کہ آپ ان کاموں میں لگ جاتے۔ اس لئے مجبوراً یہی ایک صورت معاش کی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ یہی صورت آپ نے اختیار کرلی۔[2]

---

[1] ابن ہشام۔ [2] ابن ہشام

جب ذرا اور بڑھے تو آپ نے مکہ کے تاجروں کے ہاں مزدوری پر اور کبھی کبھی نفع میں حصّہ پر کام کرنا شروع کیا۔ مکہ میں دستور تھا کہ لوگ موسمِ حج میں مال خرید کر رکھ لیتے اور کسی دیانت دار آدمی کی معرفت نجد۔ یمن اور شام کی منڈیوں میں بھیج دیا کرتے تھے۔ اکثر تو یہ ہوتا کہ مال لے جانے والے کی اُجرت پہلے ہی طے ہو جاتی اور نفع میں اس کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا تھا۔ اور کبھی اُجرت کے علاوہ خالص نفع میں سے بھی اجیر کو کچھ حصہ دے دیا جاتا تھا۔ روایتوں میں رسول اللہ کے مختلف مواقع پر اس طرح کام کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ سہیل کے ساتھ آپ کا معاملہ شاید اسی طرح کا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے سہیل کے حسن سلوک کی اس سلسلہ میں تعریف فرمائی ہے۔ اور سہیل بھی رسول اللہ کی ایمانداری اور فرض شناسی کی ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے۔[1]

اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ۲۵ سال کی عمر تک کام کیا۔ اور شام۔ یمن۔ نجد اور غالباً حبشہ کا بھی اسی سلسلہ میں سفر فرمایا۔ آپ کا گرامی نامہ نجاشی کے نام جس میں آپؐ نے جعفر طیار کا تعارف کرایا ہے۔ یا وہ الفاظ جو آپ نے نبوت کے پانچویں سال حبشہ کی طرف مہاجرین کو رخصت کرتے وقت فرماتے ہیں۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ حبشہ اور دربارِ حبشہ سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے۔[2]

اس طرح مزدوری سے آپ کو جو کچھ ملتا تھا وہ یقیناً بہت کم ہوتا تھا۔ ابو طالب نے جو خطبۂ نکاح بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ کے ساتھ آپ کے نکاح کے موقع پر دیا تھا۔ اُس میں آپ کے اخلاقِ کریمہ اور شرافتِ نسبی کا ذکر کرنے کے بعد صریحاً اس کا ذکر کیا ہے کہ آپ کے پاس دولتِ دنیا بالکل نہیں ہے۔ پھر آپ کا ۲۵ سال کی عمر تک ناکتخدا رہنا جبکہ قریش کے لڑکے ۱۶-۱۷ سال کی عمر میں شادی کر لیتے تھے۔ آپ کے بے زر و مال ہونے کی ایک دلیل ہے۔

بی بی خدیجہ کا مال تجارت لے کر آپ دو مرتبہ شام گئے۔ اور دونوں مرتبہ آپ کی حیثیت ایک اجیر کی تھی۔ مضاربت یا شریک تجارت کی نہ تھی۔ کیونکہ روایتوں میں یہ صریحاً موجود ہے کہ بی بی خدیجۃ الکبریٰ نے ایمانداری اور فرض شناسی سے خوش ہو کر آپ کو مقررہ اُجرت سے زیادہ دیا۔[3]

اس زمانے میں آپ نے اپنی صداقت۔ دیانتداری اور فرض شناسی کا ایسا بے مثال نمونہ پیش کیا کہ سارا مکہ آپ کو "صادق الامین" کے لقب سے یاد کرنے لگا۔ آپ نے اس زمانے میں تجارتی بددیانتیوں کے خلاف زبان و عمل سے بڑی مفید اصلاحات کیں۔ مثلاً مزابنہ۔ مقابیہ اور اس قسم کے دوسرے فاسد معاملات تجارت کی اصلاح فرمائی۔ تبادلہ اشیاء بالاشیاء (بارٹر سسٹم) جو اُس زمانے میں عام طور پر رائج تھا۔ اس میں عدل و انصاف کا قاعدہ جاری کیا۔ اور سُودی لین دین سے نفرت کا اظہار فرمایا۔ تجارتی جھگڑوں میں اکثر موقعوں پر ثالث بالخیر کی خدمت انجام دی۔ محتاجوں اور مساکین کے لئے بازار میں ایک فنڈ قائم کر دیا (دیکھئے سیرت ابن ہشام اور الشرح الکامل للہیکل)

تجارت رسول اللہ کی معاشی زندگی کا تیسرا دور ام المومنین بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ سے نکاح کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اب حضورؐ بی بی خدیجۃ الکبریٰ کے گھر میں رہنے لگے تھے۔ یہ دور ۲۷ سال تک قائم رہا۔ اس میں سے دس سال تک آپ خود بازار میں تجارتی لین دین کرتے ہوئے ملتے ہیں۔ اس زمانے میں آپ نے غالباً تین سفر کئے۔ ایک یمن تک۔ دوسرا نفود (نجد) تک اور

---

[1] سیرت حلبیہ۔ [2] صبح الاعشیٰ جلد ۶۔ [3] ابن ہشام۔

تیسرا نجران تک ۔ یہ تینوں تجارتی تھے ۔ آپ بی بی خدیجہؓ کا مال اور قریش کے دوسرے تاجروں کا مال لے کر سفر کرتے اور صاحب المال سے اپنی اُجرت حاصل کر لیتے ۔ ان سفروں کے علاوہ موسم حج میں اچھا خاصا کاروبار ہو جاتا تھا ۔ باقی دنوں میں مکہ کے بازار میں بھی کچھ نہ کچھ تھوک فروشی ہوا کرتی تھی ۔ آپؐ اس میں حصّہ لیتے تھے ۔

نزولِ وحی سے تقریباً پانچ سال پہلے کاروبارِ دنیاوی سے جس میں پہلے بھی غیر معمولی انہماک نہ تھا طبیعت بہت زیادہ اُچاٹ ہو گئی تھی ۔ اور آپ نے تجارت کی طرف توجہ بہت کم کر دی تھی ۔ صرف موسم حج میں کسی قدر لین دین کر لیتے تھے ۔ جس سے گزر بسر ہو جاتی تھی ۔ باقی وقت یادِ الٰہی اور اصلاحِ عوام میں صرف ہوتا تھا ۔

نزولِ وحی سے دو سال پہلے تو یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ دو دو ہفتہ کی غذا لے کر غارِ حراء میں جا بیٹھتے اور عبادت میں مشغول رہتے ۔

چالیس سال کی عمر ہوئی تو پہلی وحی نازل ہوئی ۔ اس کے بعد تیرہ سال کی مکی زندگی اگرچہ فقر و فاقہ کی زندگی نہ تھی ۔ لیکن کوئی بہت خوش حال زندگی بھی نہ تھی ۔ قریش کی طرف سے مخالفتیں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں ۔ بازار میں سوداگری کا کام کہاں ممکن تھا ۔ تین سال تو آپؐ ہی سے نہیں بلکہ سارے مسلمانوں اور آپ کے غیر مسلم حامی ابو طالب سے بھی ترکِ موالات رہا ۔ یہ ترکِ موالات ختم ہوئی کی جدوجہد سے ٹوٹا بھی تو کاروباری زندگی ختم ہو چکی تھی ۔ نہ سرمایہ تھا اور نہ وہ تعلقات باقی رہے تھے ۔ گزر بسر کی صورت وقتی کاروبار پر تھی جو آپ کی طرف سے آپ کے جاں نثار زیدؓ مواسم حج میں کر لیا کرتے تھے ۔ یا پھر پچھلے کمائے ہوئے سرمایہ سے کام چلتا ہو گا ۔

عرب میں سکّے تین قسم کے رائج تھے ۔ ساسانی بادشاہوں کے سکّے ۔ قیصر روم کے درہم و دنانیر اور مقامی رئیسوں کے ڈھلے ہوئے طلائی سکّے ۔ زیادہ تر کام اصول مقایضہ (بارٹر سسٹم ۔ تبادلہ اشیاء بالاشیاء) پر ہوتا تھا ۔ عرب میں جو سکّے اس وقت تھے ۔ وہ قیمت فلزی پر قائم تھے ۔ فیس ویلو یا قیمت مُہر پر سکّہ ڈھالنے کا رواج نہ تھا ۔ اس لئے اہلِ دولت یہی سونے کے دینار ۔ چاندی اور تانبے کے درہم جمع کرتے تھے ۔ آپؐ کی مالی حالت کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابو بکرؓ نے اپنے گھر سے بہت سے دینار جو ایک دیوار میں محفوظ تھے ، ساتھ لئے تھے ۔ مگر رسول اللہ کے پاس ساتھ لے جانے کو کوئی قابلِ ذکر سرمایہ نہ تھا ۔ حضرت ابو بکرؓ کے یہ دینار مدینہ میں مسجد نبوی کی زمین خریدنے اور مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلہ میں دوسرے کاموں میں خرچ ہوئے ۔ ان کے متعلق روایتیں موجود ہیں ۔ لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا کہ آپؐ نے اپنے پاس سے کوئی رقم نکال کر مدینہ کے ابتدائی دنوں میں خرچ کی ہو[1]

خدیجہؓ کا گھر

اللہ کے سچے رسول ۔ اور انسانیت کے اس محسن اعظم نے جب کفارِ مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر مکہ سے یثرب کی طرف ہجرت فرمائی تو نہ کوئی سرمایہ آپ کے پاس تھا ۔ نہ زادِ سفر ۔ نہ کوئی جائیداد منقولہ یا غیر منقولہ وہ مکہ مکرمہ میں چھوڑ کر جا رہے تھے ۔ اور نہ دنیا کے اور کسی حصہ میں زمین ، باغ ۔ تجارتی کوٹھی یا کسی اور جائیداد کے مالک تھے ۔ مکہ میں بی بی خدیجہؓ کا ایک چھوٹا سا مکان ضرور تھا ۔ جس میں آپؐ رہتے تھے ۔ اور آپ کے چلے جانے کے بعد جب بی بی فاطمہؓ بھی چلی گئیں تو اپنی حقیقی بہن بی بی زینبؓ کے حوالے کر گئیں ۔ بی بی زینبؓ اور ان کے شوہر اس میں رہتے تھے ۔ جنگ بدر میں ان کے شوہر

---

[1] اصابہ فی اسماء الصحابہ ۔ استیعاب لابن عبد البر ۔

گرفتار ہو کر مدینہ میں آئے تو انھیں آپؐ نے اس شرط پر رہائی عطا کی کہ وہ مکہ جا کر زینب کو مدینہ بھیجدیں۔ چنانچہ انہوں نے وعدے کے مطابق اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ زینب کو مدینہ بھیجدیا۔ راستہ میں ایک کافر ہبار نے نیزہ مار کر انھیں سواری سے گرادیا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ بیمار رہتی تھیں۔ اور مدینہ ہی میں سنہ ۹ھ میں وفات پائی۔

ہجرت کے بعد ہجرت کے بعد تیرہ۱۳ سال ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بہت ہی مشغول زندگی تھی۔ مدینہ منورہ میں اسلامی مملکت کی ایک شہری مملکت کی صورت میں بنیاد پڑ رہی تھی۔ مکہ میں تو قرآن مجید کی صرف وہ آئتیں نازل ہوئی تھیں جن میں توحید، رسالت۔ معاملات بیع وشریٰ اور انسان کے انفرادی اخلاق کی درستگی کے متعلق احکام وہدایات ہیں۔ لیکن مدینہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں اُن میں اجتماعی معاملات، قوانین حکومت۔ جنگ وصلح کے اصول اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق ہدایات ہیں۔ مکہ میں رسولؐ اللہ کوئی سربراہ حکومت نہ تھے۔ مدینہ میں آپ ایک مملکت کے سربراہ بھی تھے۔ سپہ سالار بھی، عادل (Judge) بھی تھے۔ اور ناظم مملکت بھی۔ اور اللہ کے رسولؐ تو تھے ہی۔ اس لئے آپ کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ معاشی کاموں کے لئے وقت نکالتے۔ اگر حکومت کی کوئی باقاعدہ آمدنی ہوتی تو باقاعدہ تنخواہ مقرر ہوتی۔ لیکن ابتداء میں چونکہ مدینہ کے بیت المال میں آمدنی ہی بہت کم ہوتی تھی اور وہ بھی مفاد اُمت پر صرف ہو جاتی تھی۔ اس لئے آپ اور آپ کے اہل وعیال بڑی تنگی کے ساتھ فقر وفاقہ کے ساتھ گزارہ کرتے تھے۔ کئی کئی وقت چولھا جلنے کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ کبھی ایک پیالہ دُودھ پر سارے گھر کا گزارہ ہوتا۔ اور کبھی چند کھجوروں پر۔ اور اکثر تو تین تین چار چار وقتوں کا فاقہ ہی رہتا۔ لیکن یہ حالت صرف آپ ہی کی نہ تھی۔ بلکہ اور دوسرے بہت سے صحابہ کا بھی یہی حال تھا۔

سادگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء ہی سے اپنی زندگی بہت سادہ رکھی تھی۔ ان دنوں میں بھی جبکہ مکہ میں نبوت سے پہلے آپؐ کی مالی حالت نسبتاً اچھی تھی۔ آپؐ نے اپنی زندگی میں تکلف اور عیش پسندی کو داخل نہیں ہونے دیا تھا۔ اور اپنی آنکھوں سے یہ دیکھنے کے بعد بھی کہ مکہ میں آپ کی سی آمدنی رکھنے والے۔ اور طائف کے امراء نفیس کھانوں۔ قیمتی کپڑوں اور شاندار مکانوں کے عادی ہیں۔ آپؐ نے ہمیشہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ ایک وقت میں دو سالن بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ اپنا کام خود کرتے۔ موٹے اور بے تکلف صاف ستھرے کپڑے پہنتے اور اس طرح جو رقم بچ جاتی اُس سے غریبوں۔ بیواؤں اور مسکینوں کی امداد فرمایا کرتے تھے۔ اس لئے آپ کے صحابہ پر فقر وفاقہ کی یہ زندگی کچھ زیادہ بار نہیں گزرتی۔ وہ سب اسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ جو رسولؐ اللہ نے اپنے لئے اختیار کیا تھا۔ اسی زندگی کا اثر تھا کہ صحابہ کو دُنیاوی دولت وحشمت اور تکلف وتعیش کی زندگی سے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں بھی کبھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ نہ دربار کے ریشمی پردے، قیمتی قالین، اور منقش فرش اُن کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے۔ اور نہ دولت وجاہ کی ہوس اُن کے پاک قلوب تک راہ پاتی تھی۔

سنہ ۷ھ تک جبکہ خیبر اور فدک کی زمینیں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔ یہی صورت حال باقی رہی۔ اگرچہ مدینہ کے دولت مند یہودی قبائل بنی قریظہ اور بنی نضیر جو سرسبز زمینیں چھوڑ کر گئے تھے۔ اُن میں سے حسب قاعدہ ۱/۵ اراضی بیت المال کے قبضہ میں آچکی تھیں۔ لیکن اُن کا خراج اتنا کم ہوتا تھا کہ ضروریات کے لئے پوری طرح کافی نہیں ہوتا تھا۔ اور اب اخراجات بھی بڑھ گئے تھے۔ بکثرت مہمان آتے تھے۔ عرب قبائل کے وفود کا سلسلہ بھی غزوۂ احزاب کے بعد سے بڑھ گیا تھا۔ اصحاب صفہ کا خرچ بھی تھا۔ اس لئے رسولؐ اللہ بڑی عسرت سے بسر کرتے تھے۔

سنہ ۶ھ کے آخری ایام یا سنہ ۷ھ کے اوائل میں جب خیبر فتح ہوا تو اہل فدک نے بھی آ کر خود نصف پیداوار بطور خراج ادا کرنے پر صلح کر لی۔ خراج مقاسمہ یعنی مالگزاری میں پیداوار کا ایک حصہ لینے کا رواج عرب قبائل میں رائج تھا۔ اور عرب ہی کیا، ساری دنیا میں یہ طریقہ رائج تھا۔ انگریزوں کے ابتدائی دور حکمرانی تک ہندوستان و پاکستان میں رائج تھا۔ مرہٹوں کا چوتھ وصول کرنا تو مشہور ہے۔ اور آج تک ہمارے ملک میں ان خاندانوں کے لوگ جو سرکاری مالیہ چار دھاروں (دھارہ = ۱۰ سیر) میں سے ایک وصول کر کے سرکار میں جمع کرتے تھے۔ اسی تاریخی اعزاز کی بناء پر "چودھری" کہلاتے ہیں۔

اب فدک اور خیبر کی آمدنی سے بیت المال میں وسعت ہو گئی تو آپؐ نے یہ انتظام فرمایا کہ فدک کی زمینوں سے جو آمدنی ہوتی تھی وہ مہمانوں پر صرف فرماتے۔ بنی نضیر کی آمدنی اہل صفہ کے لئے اور دوسرے مساکین کے لئے تھی۔ اور بنی قریظہ کی آمدنی سے اپنے اہل و عیال کا خرچ پورا کرتے تھے۔ جو بڑی تنگی کے ساتھ پورا ہوتا۔ پھر اس میں سے بھی اہل ضرورت پر قم (رقم) حصہ صرف ہو جاتا تھا۔

مورخ بلاذری نے فدک کے بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مشہور خطبہ کا ایک حصہ نقل کیا ہے:-

"جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے خطبہ دیا اور اس میں کہا کہ فدک اُن زمینوں میں سے تھا جو اللہ نے اپنے رسولؐ کو عطا فرمائیں کیونکہ مسلمانوں نے اُس پر اپنے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تھے۔ جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے درخواست کی تو آپ نے فرمایا۔ کہ تمہیں یہ حق پہنچتا ہی کہ مجھ سے مانگو اور نہ مجھے حق پہنچتا ہے کہ تمہیں دوں۔ یہاں کی آمدنی آپؐ مسافروں پر خرچ فرماتے تھے۔ آپؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا یہی عمل رہا۔ لیکن جب معاویہ والی ہوئے تو انہوں نے فدک مروان بن الحکم کو دے دیا۔ اس کے بعد عبدالملک کو ہبہ کر دیا۔ پھر یہ مجھے، ولید کو اور سلیمان کو ملی۔ میں نے ولید سے اس کا حصہ مانگ لیا۔ اور پھر سلیمان سے بھی مانگ لیا۔ اس طرح فدک کے سارے حصے میں نے جمع کر لئے۔ مجھے اس سے زیادہ محبوب کوئی جائیداد نہیں۔ اب تم سب گواہ رہو کہ میں اب پھر اسے پچھلی حالت پر قایم کرتا ہوں۔ (یعنی مسافروں کے لئے مخصوص کر دیتا ہوں)" — (فتوح البلدان للبلاذری جلد اول ص ۵)

سنہ ۷ھ کے بعد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات (۱۲- ربیع الاول سنہ ۱۱ھ) تک رسول اللہ کی معاشی زندگی میں کوئی تغیر نظر نہیں آتا۔ حالانکہ اس کے بعد سے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی حکومت عطا فرمائی۔ سنہ ۷ھ، سنہ ۸ھ، سنہ ۹ھ اور سنہ ۱۰ھ میں پے در پے فتوحات ہوئیں اور مختلف قبائل مسلمان ہو کر زکوٰۃ اور ذمی رعایا بن کر خراج ادا کرنے لگے۔ مکہ۔ طایف۔ یمن۔ حضرموت سے ایلہ تک کا تقریباً دس لاکھ مربع میل رقبہ مدینہ منورہ کی اس چھوٹی سی مملکت میں داخل ہو گیا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہی خراج میں اتنے درہم و دینار آئے کہ بیت المال مدینہ کی چھوٹی سی کوٹھڑی کے علاوہ مسجد نبوی کا صحن اور دالان بھر گئے۔ لیکن کوئی واقعہ ایسا نہیں ملتا کہ آپ نے اپنے یا اپنے اہل و عیال کے لئے اس کثیر دولت میں سے کوئی حصہ حاصل کیا ہو۔

حضرت بی بی عائشہ صدیقہؓ سے بلاذری نے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ آپ اپنے لئے مکہ میں ایک مکان تو بنوالیں۔ جس میں دھوپ سے محفوظ رہ کر آپ ٹھہر سکیں۔ لیکن آپ نے اسے پسند نہیں فرمایا۔ [1]

---

[1] جلد اول ص ۶۷۔

معاشی اصلاحات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارک کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپ نے اپنی پوری زندگی میں نہ کوئی ایسی جائیداد پیدا کی جو آمدنی کا ذریعہ ہوتی - اور نہ کبھی نذرانوں پر زندگی بسر کی - وراثت میں بھی آپ کو کوئی جائیداد نہیں ملی - کسی سے زرعی یا غیر زرعی ایسی جائیداد کا ہبہ بھی قبول نہیں فرمایا - جو آمدنی کا ذریعہ ثابت ہوتی - بلکہ ساری عمر اپنی محنت و مزدوری سے زندگی بسر کرتے رہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت بی بی خدیجۃ الکبریٰ کی دولتمندی سے آپ کو یہ موقع ضرور مل گیا کہ آپ کسی دوسرے کے مالِ تجارت کو لے کر سفر کرتے اور اجرت حاصل کرنے کی بجائے خود اُم المومنین کے مال کو لے کر جاتے - اگرچہ اس زمانے میں بھی آپ نے دوسروں کا مال مقررہ اُجرت پر فروخت کرنے کی مزدوری کی ہے - لیکن یہ عموماً اسی وقت ہوا ہے جبکہ آپ اُم المومنین کا مال تجارت لے کر کہیں تجارتی سفر کو روانہ ہو رہے ہوتے تھے -

ہدایات

چونکہ اہلِ مکہ کا پیشہ تجارت تھا - اس لئے جب تک آپ مکہ میں رہے آپ کو گلہ بانی - اور تجارت ہی سے واسطہ پڑا - قرآن مجید کی مکی سورتوں میں تجارتی دیانت داری کے بہت سے احکام ملتے ہیں - آپ نے قرآن مجید کے نزول سے پہلے اور نزولِ قرآن کے بعد کئی خطرناک صورتوں کی اصلاح فرمائی - ان میں سے بعض یہ ہیں :-

اجیر و مستاجر کے معاملات -

عرب میں عام طور پر دو قسم کی مستاجری کا رواج تھا - پہلی قسم یہ کہ مقررہ وقت کی مقررہ اُجرت - دوسری مقررہ کام کی مقررہ اُجرت - مستقل طور پر کسی کو اجیر مقرر کر لینے کا طریقہ صنعتوں کے فقدان کی وجہ سے اُن میں نہ تھا -

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں جو ہدایات فرمائیں - اور مدینہ میں با اختیار حکمران کی حیثیت اختیار کر لینے کے بعد جس سختی کے ساتھ ان ہدایات پر عمل کرایا - اس کے ذکر سے کتب احادیث بھری پڑی ہیں - بعض مشہور احکام یہ ہیں :-

- اجیر کی اُجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو -
- خدا کی لعنت ہے اس مستاجر پر جو اجیر کا کوئی حق مار لے -
- کسی کو وہ کام کرنے کا حکم نہ دو جو تم خود نہ کر سکو -
- کام میں اجیر کا ہاتھ بٹاؤ - اس سے نرمی کا سلوک کرو - اور اس کی قوت سے زیادہ کام کا بوجھ نہ ڈالو -
- اجیر کو اپنی طرح کا آدمی سمجھو - اس کے اعزاز اور اس کی عافیت کا خیال رکھو -
- یہ یاد رکھو کہ اجیر، اجیر ہے اور تم مستاجر - یہ اللہ کے لئے کوئی مشکل امر نہیں کہ تم اجیر ہو جاؤ اور وہ مستاجر -
- مومن کی شناخت یہ ہے کہ مرتے وقت بھی اس کی پیشانی محنت کے پسینہ سے تر ہو -
- اللہ کی رحمت ہو اس بندہ پر جو اپنی روزی اپنی محنت سے کماتا ہے -
- غریبوں کے حق کو پہچانو - یہ تمہارا ہی کام کرتے ہیں -
- خدا اس بندہ کو کبھی نہیں بخشے گا جس نے کسی اجیر کا حق مار لیا ہو -

اسی طرح آپ نے اجیروں کو فرض شناسی، دیانت داری اور تندہی کی تعلیم دی - اور جب با اختیار ہوئے تو حکماً ان احکام کو جاری فرمایا - مستاجرین کے خلاف شکایتیں سُن کر اجیر کا حق دلوایا -

تجارتی معاملات میں عرب کے تمام غیر منصفانہ لین دین کو باطل قرار دیا - کم تولنے پر سزائیں دیں - ایفائے عہد کی

تاکید فرمائی اور تجارتی لین دین کے لئے ایک منصفانہ اصول مقرر فرمایا کہ بوقت معاملہ زر ثمن اور شئے مبیع دونوں کا متعین اور غیر مشتبہ ہونا ضروری ہے- اور یہ بھی ضروری ہو کہ ان دونوں میں کم از کم ایک موجود ہو-

عربوں میں رواج تھا کہ معمولی و متعارف طریقۂ بیع کے علاوہ تقریباً ۹ یا ۱۰ طرح کے معاملات کیا کرتے تھے- جو سب کے سب فریب کے امکانات رکھتے ہیں- مثلاً :-

المزابنہ — درخت میں پھل کو دیکھ کر مقدار متعین کر دی جائے اور اس کو فروخت کر دیا جائے-

الملامستہ- قیمت وصول کر کے یہ کہہ دیا جائے کہ جس مال کو مشتری چھو دے وہ اس کا ہو جائے گا-

المرابحۃ- اُدھار اور سودا دے کر یہ شرط کہ فلاں وقت تک اگر ادا نہ ہو تو ثمن میں یا شئے مبیع میں اضافہ ہو جائیگا-

اس قسم کے تمام معاملات کو ممنوع قرار دیا- ان کے خلاف ہدایتیں کیں اور سختی کے ساتھ انھیں بند کرا دیا-

اسی طرح پانی میں مچھلی- ہوا میں چڑیا کی بیع عام طور پر رائج تھی- اسے ممنوع قرار دیا- خیار رویتہ اور خیار عیب مشتری کو عطا کیا- قمار کی تمام صورتوں کو جرم قرار دیا- اس سے ہمیشہ منع فرماتے رہے- اور سب سے عظیم الشان اصلاح معاملات کے سلسلہ میں یہ فرمائی کہ سرمایہ کو صرف امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھنے سے روک دیا- اور یہ حقیقت بنی نوع انسان پر واضح فرما دی کہ اصل دائر ہو یا اصل قائم- کسی میں نمو ذاتی نہیں ہے- اس لئے ہر وہ نفع جو وقت کے مقابلے میں حاصل کیا جائے گا ظلم ہو گا- اس کا تدارک ہونا ضروری ہے-

اس مسئلہ پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ سوچئے اور دیکھئے کہ یہ ایک ہی معاشی اصلاح ایسی ہو کہ ظلم و تعدی اور استحصال ناجائز کے اکثر دروازوں کو بند کر دیتی ہے-

سرمایہ کی ایک شکل تو وہ ہو جو قائم ہے- مثلاً زمین- تالاب- کان وغیرہ- انھیں اصل قایم کہا جاتا ہے- تالاب یا کان وغیرہ زمین ہی کے جزو ہیں- اس لئے لفظ زمین اصل قایم کو ظاہر کرتا ہے- اب آپ غور فرمالیں- کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم اپنی ضروریات جن اشیاء سے پوری کرتے ہیں- وہ سب کی سب بالواسطہ یا بلاواسطہ زمین کی پیداوار ہیں ؟

سرمایہ کی دوسری شکل وہ ہے جو تبدل و تغیر کے ساتھ ہمارے لئے کارآمد ہوتی ہو- اور مختلف ہاتھوں میں پھرتی رہتی ہے- مثلاً زر نقد- مال تجارت اور کرایہ پر دی ہوئی عمارتیں وغیرہ- اسے تقدیم کے لئے مروجہ سکوں میں بدل کر انھیں اصل دائر کہتے ہیں-

اب فرض کر لیجئے کہ ایک لاکھ روپے بصورت نوٹ- سکہ یا زر خالص تجوری بند کر کے بحفاظت تمام رکھ دیا جائے یا ایک سو ایکڑ زمین کا ایک قطعہ پوری طرح محفوظ کر لیا گیا- پھر ایک سال یا بارہ سال کے بعد تجوری کھولی گئی- یا زمین کا معائنہ کیا گیا تو آپ اصل دائر یا اصل قائم کسی میں اضافہ پا سکتے ہیں- ؟ ایک لاکھ کی اس خطیر رقم میں کوئی ایک اکنی بھی اضافہ کی ہو سکے گی ؟ اور کیا ایک سو ایکڑ کی اس وسیع اراضی سے ایک چھٹانک بھی غلہ مل سکے گا ؟

اصل قائم ہو یا اصل دائر- کسی قسم کے اصل میں حقیقتاً کوئی نمو ذاتی موجود نہیں ہے- یہ محض اولادِ آدم کی محنت ہے- جو اضافہ کا سبب بنتی ہے- اگر یہ حقیقت ہے اور ناقابلِ انکار حقیقت تو بمقابلۂ امتداد زمانی نفع کا استحصال ظلم نہیں تو اور کیا ہے ؟

سُود یا ربٰوا اسی اضافہ کو کہتے ہیں جو صرف بمقابلہ مدّت زمانی حاصل کیا جائے۔ یہ درحقیقت محنت کش کو اس کے محنت کے پھل سے محروم کرکے استحصال بالجبر کی ناپاک ترین صورت ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اس کو چوری اور زنا جیسے سنگین جرائم سے بھی زیادہ سنگین جرم قرار دیا۔ اور فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ کا اعلان کرکے اُن کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

آپ جتنا زیادہ اس معاملۂ ربٰوا پر غور کریں گے۔ اُتنا ہی یہ حقیقت روشن ہوتی جائے گی کہ یہ معاشی بے چینی اور بدحالی کا بنیادی سبب ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح اصل قائم پر قبضہ نے حقیقتاً محنت کش کسانوں کو مجبور کردیا ہے کہ وہ اپنی محنت کا نصف نتیجہ ان زمینداروں کے حوالے کردیں۔ جن کا غلّہ کی پیدائش میں کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ خشکی و غرقی یا دوسرے آفات ارضی و سماوی سے اگر پیداوار حاصل نہ ہو تو کسان کے ساتھ بیج اور بیلوں کے نقصان میں بھی حصّہ دار نہیں ہوتے۔ اسی بے انصافی اور ظلم کا نتیجہ ہے کہ:۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ

اور

اس کی تاریخی اہمیت

یورپ کے ایک مشہور مورخ لارڈ ایکٹن نے فرانس کے "منشور حقوق انسانی" (Declaration of The Rights of Man) کے متعلق کہا تھا کہ کاغذ کا یہ ایک پرزہ دُنیا کے کتب خانوں سے زیادہ وزنی اور نپولین کی فتوحات قاہرہ سے زیادہ پُر شکوہ ہے۔ ایکٹن کی یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں۔ لیکن اگر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۃ الوداع کے متعلق یہ کہا جائے کہ آسمان نے روز وشب کی ہزاروں کروٹیں بدلی ہیں لیکن احترام انسانیت کے لئے اس سے زیادہ پُر درد اور پُر خلوص آواز نہیں سنی تو یقیناً اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

آج دُنیا میں ہر طرف انسانی حقوق کے تحفظ کا چرچا ہے۔ لیکن کون نہیں جانتا کہ یہ سب باتیں نقاب کی مانند ہیں جن کے پیچھے دُنیا کے گوشے گوشے میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی مٹی پلید ہورہی ہے۔ تہذیب حاضر نے انسانیت پر ظلم وستم کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں اور یہ طریقے ایسے ہولناک ہیں جن کی مثال تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی پیش نہیں کرسکتا۔ جو قومیں حقوق انسانی کی پاسبانی کے سب سے زیادہ بلند بانگ دعاوی کررہی ہیں۔ وہی انسانیت کا خون چوسنے میں سب سے پیش پیش ہیں۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ نہ کسی سیاسی مصلحت کا نتیجہ تھا۔ نہ کسی وقتی جذبہ کی پیداوار۔ یہ اللہ کے آخری رسولؐ کا انسان کے نام آخری پیغام تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں مضمر ہے۔

ذی الحجہ ۱۰ھ (مطابق فروری ۶۳۲ء) کو رسول اللہؐ نے اپنی زندگی کے آخری حج[1] کے ادا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ اور تمام ازواجِ

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں:- "ایں را حجت الاسلام خوانند و حجتہ الوداع گویند بجہت آنکہ بردم تعلیم احکام می نمود دلبسفر آخرت وداع کرد و فرمود بگیرید از من مناسک خود شاید کہ من سال آئندہ حج نکنم و زندہ نمانم و اطلاق حجۃ الوداع برآں واقع است در احادیث و کتب آں۔ و در مواہب می گوید کہ ابن عباسؓ مکروہ پنداشتہ است کہ حجۃ الوداع گویند۔ وجہ آں ظاہر نیست مگر آنکہ یاد از تودیع حیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم می کند و ذکر آں بر ابن عباسؓ مولم می افتاد۔"
مدارج النبوت جلد ثانی ص ۴۶۳-۴۶۴

مطہرات کو ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ عرب کے گوشہ گوشہ سے لوگ شرفِ ہمرکابی کے لئے اُمنڈ پڑے۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی انسانوں کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا[1] نظر آتا تھا۔ کم و بیش ایک لاکھ مسلمان دینی جذبہ سے سرشار سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے

لبیک اللّٰھم لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لک لاشریک لک۔

اے خدا ہم تیرے سامنے حاضر ہیں۔ اے خدا تیرا کوئی شریک نہیں۔ ہم حاضر ہیں۔ تعریف اور نعمت سب تیری ہی ہے اور سلطنت میں کوئی تیرا شریک نہیں۔

کی صدائیں بلند کرتے اللہ کے گھر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ آسمان نے انسانوں کے اس سے کہیں بڑے ہجوم دیکھے تھے لیکن آج کا ہجوم اپنی نوعیت میں عدیم المثال تھا۔ اللہ کے مقدس ترین بندوں کا یہ قافلہ کامل ترین انسان کی قیادت میں اس طرح چل رہا تھا کہ زمین سے آسمان تک قبول و اعترافِ حق کا نور برستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ عرفات میں نمرہ کے مقام پر حضورؐ نے ایک تنے ہوئے کمبل کے نیچے قیام فرمایا۔ اور دوپہر کے بعد اپنے ناقہ قصواء پر سوار ہوکر پکارا:۔

یا ایھا الناس اسمعوا قولی

اے لوگو! میری بات سنو!

پھر اس بات کو کہ "یہ میری عمر کا آخری سال ہے" اس طرح ادا کرنے کے بعد:۔

یا ایھا الناس اسمعوا فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ھذا فی موقفی ھذا، فی شھرکم ھذا فی بلدکم ھذا۔

(لوگو! سنو۔ کیونکہ شاید اس سال کے بعد اس جگہ اس مہینہ میں اس شہر میں تم سے نہ مل سکوں)

ایسا فصیح و بلیغ خطبہ[2] ارشاد فرمایا کہ عرفات کے دشت و جبل تک گونج اٹھے۔ اُس وقت اور اُس مقام کی اہمیت کا احساس دلانے کے لئے پکارا:۔

اتدرون ای یوم ھذا قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال فان ھذا یوم حرام افتدرون ای بلد ھذا، قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال بلد حرام قال اتدرون ای شھر ھذا قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال شھر حرام۔

(کیا جانتے ہو کہ یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے کہا۔ خدا اور رسول کو اس کا علم ہے۔ آپ نے فرمایا۔ یہ یوم الحرام ہے۔ کیا جانتے ہو کہ یہ کونسا شہر ہے؟ لوگوں نے کہا۔ خدا اور رسول کو اس کا

[1] ملاحظہ مدارج النبوت جلد ثانی صہ ۴۶۴۔ نیز سیرت النبی جلد ۲ صہ ۱۵۱۔ حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو آگے پیچھے۔ دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی آدمیوں کا جنگل نظر آتا تھا۔ آنحضرت جب لبیک فرماتے تھے تو ہر طرف سے اسی صدائے غلغلہ انگیز کی آواز بازگشت آتی تھی۔

[2] مدارج النبوۃ جلد ۲ صہ ۴۶۹۔ نیز سیرت النبی جلد ۲ صہ ۲۳۹۔

علم ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ بلد الحرام ہے۔ کیا جانتے ہو یہ کونسا مہینہ ہے؟ لوگوں نے کہا۔
خدا اور رسولؐ کو اس کا علم ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ شہر حرام ہے۔)

فرائض نبوت کی بجا آوری میں ۲۳ سال کی مسلسل جدوجہد کا اعتراف ایک طرف انسانی زبانوں نے اس طرح کیا:-

"ہم گواہ ہیں کہ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا"

دوسری طرف اعلانِ خداوندی ہوا:-

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی

آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمتیں پوری کر دیں۔

وحی الٰہی کا جو سلسلہ غار حرا کی تنہائیوں میں شروع ہوا تھا۔ میدان عرفات کے بھرے مجمع میں اس کی تکمیل کر دی گئی:-

رسول اللہ نے ہدایت فرمائی:-

فلیبلغ الشاھد الغائب

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ ان کو سنا دیں جو موجود نہیں۔

اس خطبہ کی تاریخی اہمیت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ چودہ سو سال پہلے کی متمدن دنیا کے حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اختصار کے پیش نظر ہم صرف روما۔ ہندوستان اور ایران کے حالات پر اکتفا کرتے ہیں۔

طبقاتی تقسیم۔ قرون وسطیٰ میں اخوت و مساوات بے معنی الفاظ تھے۔ کوئی انسانی ذہن ان کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہر جگہ سماج مختلف طبقوں میں تقسیم تھا۔ اور اس تقسیم کو قائم رکھنے کے لئے نئے نئے طریقے اور قانونی سہارے وضع کر لئے گئے تھے۔

سلطنت روما میں سماج کی تقسیم اس طرح پر تھی کہ سب سے اوپر آزاد شہری (Ingenuous Civic) تھے اور سب سے نیچے غلام۔ اور دونوں کے درمیان متعدد طبقات تھے۔ جن کے حقوق کا تعین رنگ و نسل، مذہب اور وطن، صحت و دولت وغیرہ کے لحاظ سے کیا جاتا تھا[1]۔ جسٹی نین[2] (Justinian) جس نے روما کے قانون کی تدوین کی تھی اور دنیا کو چیلنج دیا تھا کہ اس سے بہتر قانون کوئی تیار کر کے دکھائے۔ قانونی نقطۂ نگاہ سے سماج کو اس طرح تقسیم کرتا ہے:-

(۱) Honestiores یعنی ملک کا اعلیٰ ترین طبقہ۔ جو امراء پر مشتمل تھا۔ بغاوت کے علاوہ اس طبقہ کے کسی فرد کو کسی بھی جرم میں سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔

(۲) Humiliores اس طبقہ کو بعض غیر معمولی حالات میں موت کی سزا دی جا سکتی تھی۔ ورنہ عموماً قید کی سزا دی جاتی تھی۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو:-

Roman Private law, R.W. leage P.49.

The History and Principles of The Civil law of Rome Sheldon Amos. P.106

[2] جسٹی نین، حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے پانچ سال قبل مر گیا تھا۔

(۴) sudras سب سے نیچا طبقہ تھا جس کے افراد کو معمولی معمولی جرائم کی سزا میں قتل کیا جاتا تھا۔ آگ میں ڈالا جاتا تھا۔ اور وحشی جانوروں سے ہڈیاں چبائی جاتی تھیں[1]۔

تقریباً اسی طرح کی طبقاتی تقسیم ایران میں تھی۔ وہاں کی سوسائٹی چار حصوں میں منقسم تھی:۔

(۱) آذروان۔ مذہبی طبقہ۔

(۲) آرتشتیاران۔ فوجی طبقہ۔

(۳) دبیران۔ عمال حکومت۔

(۴) استریوشان و ہتخشان۔ یعنی عوام پیشہ ور لوگ اور کاشتکار[2]۔

ایرانی سماج کی یہ تقسیم مستقل تھی۔ کوئی شخص ایک طبقہ سے دوسرے طبقہ میں منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ آتش پرست حکومت میں با اثر تھے۔ اُن کو پیشہ ور قوموں سے (بالخصوص کمہاروں وغیرہ سے) خاص عداوت اور نفرت تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے عقیدے کے مطابق آگ اور پانی کو ملانے والا گناہ عظیم کا مرتکب ہوتا تھا[3]۔ ایران کا قانون اس طبقاتی تقسیم کو قائم رکھنے کی نظر سے بنایا گیا تھا۔ عوام کو حکومت کے معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ نیچی ذات کا کوئی شخص نہ سرکاری دفاتر میں ملازم ہو سکتا تھا[4] نہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی جائداد خرید سکتا تھا[5]۔

ہندوستان کی حالت ایران سے زیادہ خراب تھی۔ سماج کی سب سے اونچی منزل پر علی الترتیب مندرجہ ذیل چار ذاتوں کا شمار ہوتا تھا۔

(۱) برہمن۔ (۲) چھتری۔ (۳) ویش۔ (۴) شودر۔

ان چار ذاتوں کے بعد عوام کا شمار تھا۔ جن کو انتیجا (Antyaja) ہادی (Hadi) ڈومہ (Doma) چنڈالہ (Chandalas) بدھاتو (Badhatau) وغیرہ نام دیئے گئے تھے[6]۔ ان کو اونچی ذات کے لوگوں سے دُور شہر کے باہر رہنا پڑتا تھا۔ مقدس کتابوں کا اگر ایک لفظ ان لوگوں کے کان میں اتفاقاً پڑ جاتا تو سیسہ پگھلا کر کان میں بھر دیا جاتا تھا۔ سارا ملک چھوت چھات کی لعنت میں گرفتار تھا۔ اگر ایک شودر کے گھر میں آگ لگ جاتی اور اُس کے شعلے برہمن کے گھر تک پہنچ جاتے تو وہ اپنے گھر کو ناپاک سمجھ کر چھوڑ دیتا تھا[7]۔ انسانیت کی جو بے حرمتی ہندوستان میں روا رکھی گئی تھی۔ اس کی مثال دنیا کے کسی حصہ میں نہیں ملتی تھی۔ تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ منو اور یجنوکیہ کے قانون اس عہد کی سماجی حالت کے آئینہ دار ہیں۔

بادشاہوں کی حیثیت:۔ ایران۔ روما اور ہندوستان تینوں جگہ بادشاہوں کو عام انسانی سطح سے اٹھا کر

۱۔ Cambridge Medieval History vol II p. 106-107

۲۔ ملاحظہ ہو "ایران بعہد ساسانیان" پروفیسر آرتھر کرسٹن سین صہ ۱۲۶۔ ۳۔ ایران بعہد ساسانیان صہ ۱۵۵

۴۔ ایران بعہد ساسانیان صہ ۴۲۲۔ ۵۔ ایران بعہد ساسانیان صہ ۴۲۰۔

۶۔ تفصیل کے لئے البیرونی کی کتاب الہند کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ میرے پیش نظر زخاؤ کا انگریزی ترجمہ ہے۔ جلد ۲ صہ ۱۰۱

۷۔ کتاب الہند۔

خدا کے قریب پہنچا دیا گیا تھا۔ حد یہ ہے کہ کہا جاتا تھا کہ مختلف طبقوں کی پیدائش مختلف طریقوں اور مختلف مادّوں سے ہوتی ہے[1] ہندوستان کے راجہ چاند اور سورج سے اپنا رشتہ جوڑتے تھے۔ ایران اور روما کے شہنشاہ خالقِ کائنات سے اپنا سلسلۂ نسب ملاتے تھے۔ اُن کے سامنے سجدے کئے جاتے تھے۔ اور اُن صفاتِ خداوندی کا حامل سمجھا جاتا تھا[2] بغاوت گناہ تھی۔ اور تابعداری مذہبی فریضہ۔ فرمانروائی خاص خاندانوں کا پیدائشی حق سمجھی جاتی تھی۔

عورتوں کی حالت۔ قرونِ وسطیٰ میں عورتوں کی سماجی حالت بے حد زبوں تھی۔ ایران میں دو طرح کی بیویاں ہوتی تھیں:۔

(۱) زنِ پادشائی ھا۔

(۲) زنِ چگاری ھا۔[3]

پہلی قسم کی بیویوں اور اُن کی اولاد کو جائداد میں حصہ ملتا تھا۔ زنِ چگاری ھا اور اُن کی اولاد جائداد سے بالکل محروم رہتی تھی[4] قانون کی نظر میں عورتوں کا کوئی حق یا مرتبہ نہیں تھا[5] بیویاں آپس میں بدلی جاسکتی تھیں[6] قانون نے غلام اور بیوی کو ایک درجہ پر رکھا تھا[7]

عرب میں عورتوں کو مورث کے متروکہ میں سے کچھ نہیں ملتا تھا۔ عورت کو بدترین مخلوق سمجھا جاتا تھا۔ حد یہ ہے کہ:۔

"جب اُن میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری سنائی جاتی ہے۔ تو اُس کا مُنہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصے کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خوش خبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کرے یا زمین میں دفن کردے۔ (سورہ نحل - ۷)

عربوں میں "وأد" (یعنی دختر کشی) کی رسم عام تھی۔ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں ظاہر کیا تھا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں دفن کیں[8]

ہندوستان میں عورت کو تمام برائیوں کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا[9] قانون یہ تھا کہ جس عورت کے صرف لڑکیاں پیدا ہوں۔ اس سے ہم بستری نہ کی جائے[10] اونچی ذات کے لوگ عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ عورتیں گھر میں رکھ سکتے تھے[11]

۱؎۔ قرآن نے اس تصوّر کو اس طرح ختم کیا:۔

یا ایھا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفسٍ واحدۃٍ وخلق منہا زوجہا وبث منہما رجالاً کثیراً ونساء۔

۲؎۔ ملاحظہ ہو۔ Seventh Monarchy - Rawlinson

۳؎۔ ایران بعہد ساسانیان ص۴۲۷۔ ۴؎ ،، ص۴۲۱ ۵؎ ،، ص۴۳۷ ۶؎ ،، ص۴۳۶ ۷؎ ،، ص۴۳۷۔

۸؎۔ تفسیر ابن جریر و ابن کثیر۔ سورۂ واذا الشمس کورت، بحوالہ سیرت النبی جلد ۴ ص۲۹۶۔

۹؎۔ Manu, Chapter IX p. 330 ۱۰؎ Hindu Law and Custom Jolly p.145

۱۱؎۔ کتاب الہند جلد اوّل ص۱۵۵۔

غلاموں کی حالت: - قرونِ وسطیٰ میں غلام کی حیثیت پالتو جانور کی تھی۔[۱] آقا کو اختیار تھا کہ اس کو زندہ رکھے یا مار ڈالے۔ اگر کوئی ملازم (familiaris) یا غلام (slave) اپنے آقا کے خلاف عدالت میں شکایت لے جاتا تو اس کو جسٹی نین کے قانون کے مطابق اس جرأت پر سزائے موت دے دی جاتی تھی۔[۲] غلامی ایسی لعنت تھی جس سے پوری طرح آزاد ہونا ممکن نہ تھا۔ قانوناً غلاموں کو آزاد کرنے میں بڑی دشواریاں تھیں۔ اگر ان دشواریوں کے باوجود کوئی غلام آزادی حاصل کر بھی لیتا تو اس کا قانونی اور سماجی مرتبہ تسلیم نہیں ہوتا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد اگر آقا کی تعظیم میں کبھی کمی کا شائبہ بھی ہو جاتا تو غلامی کا طوق پھر گردن میں ڈال دیا جاتا تھا۔[۳]

قانونی سختیاں - اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ قانون طبقاتی تقسیم کو مستحکم کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے۔ ہر طبقہ کے لئے قانون علیحدہ تھا اور سزا علیحدہ۔[۴] مختلف طبقات کے افراد ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے تو اُن کو مختلف سزائیں اُن کے مرتبہ کے مطابق دی جاتی تھیں۔[۵] ایران میں یہ دستور تھا کہ جس خاندان کا فرد ارتکابِ جرم کرتا اُس کے پورے خاندان کو قتل کر دیا جاتا۔[۶]

جبریہ محنت اور سُود خواری: - قرونِ وسطیٰ کے اقتصادی نظام پر نظر ڈالئے تو دو بُرائیاں خاص طور پر نظر آئیں گی ــــ مزدوروں سے بغیر مزدوری ادا کئے جبراً کام لینا[۷] اور سُود خواری ــــ مجبور اور بے بس لوگوں پر اس سلسلہ میں جو ظلم ڈھائے جاتے تھے اُن کے تصوّر سے بھی لرزہ چڑھتا ہے۔ تفصیل کے لئے سلطنتِ روما کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔[۸]

قرونِ وسطیٰ کے سیاسی اور سماجی حالات کے اس سرسری سے خاکے کو ذہن میں رکھیئے۔ اور پھر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۃ الوداع پر غور فرمائیے کہ کس طرح اس جابرانہ نظام کے ایک ایک ستون کو گرا کر زخم خوردہ انسانیت کو نئی زندگی کا پیام دیتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے:-

"ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔" (صحیح مسلم و ابوداؤد)

"لوگو! ہاں بیشک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر۔ سُرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں۔ مگر تقویٰ کے سبب سے۔" (مسند احمد)

---

۱ - Cambridge Medieval History Vol II P. 63 - ۲ ایضاً ص۱۰۲ - ۳ ایضاً ص۱۴۲۔

۴ - ملاحظہ ہو منو دفعات ۳۵۹-۳۷۴-۳۷۵-۳۷۶-

۵ - لیکن اسلام میں ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور ساز د لعل ناب / بندۂ مسلم کم تر از احرار نیست

اس وجہ کہ ؎ پیشِ قرآں بندہ و مولا یکے است / بوریا و مسندِ دیبا یکے است

۶ - ایران بعہد ساسانیان ص۳۰۲ - ۷ اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث پیش نظر رہے:-

اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ - مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔

(السنن الکبریٰ - بیہقی - کتاب الاجارہ ص۱۲۰-

۸ The Social and Economic History of The Roman Empire, M. Rostovtzeff P.33 et seq.

- "اللہ نے تم سے جاہلیت کی جہالت اور آباد اجداد پر فخر کو مٹا دیا۔ انسان یا خدا سے ڈرنے والا مومن ہوتا ہے۔ یا اس کا نافرمان شقی۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔" (ابو داؤد)
- "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔" (مستدرک حاکم، طبری وابن اسحاق)
- "تمہارے غلام! تمہارے غلام! جو خود کھاؤ وہی اُن کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔" (ابن سعد)
- "جاہلیت کے تمام خون (انتقام) باطل کردیئے گئے اور سب سے پہلے میں (اپنے خاندان کے) ربیعہ ابن حارث کے بیٹے کا خون باطل کرتا ہوں۔" (صحیح مسلم وابوداؤد)
- "جاہلیت کے تمام سود باطل کردیے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان عباس بن مطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔" (صحیح مسلم و ابوداؤد)
- "عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔" (صحیح مسلم وابوداؤد)
- "تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔" (طبری و ابن ہشام)
- "تمہارا خون اور تمہارا مال تا قیامت اسی طرح حرام ہے۔ جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں حرام ہے۔" (بخاری ومسلم)
- "میں تم میں ایک چیز چھوڑتا ہوں۔ اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ۔" (بخاری ومسلم)
- "خدا نے ہر حقدار کو (از روئے وراثت) اس کا حق دے دیا۔ اب کسی کو وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں۔" (سنن ابن ماجہ)
- "ہاں۔ مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے۔ ہاں باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔" (ابن ماجہ وترمذی)
- "اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔" (صحیح مسلم)

صحیح مسلم میں ہے کہ یہ خطبہ بہت طویل تھا۔ قال قولاً کثیراً (آپ نے بہت سی باتیں فرمائیں) جس صحابی کو جو فقرہ یاد رہ گیا۔ وہ نقل کردیا۔ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہو کہ اس کا ایک ایک فقرہ قرونِ وسطیٰ کے سماجی اور سیاسی نظام پر ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں رنگ و نسل کے سارے امتیازات کو باطل کردینے کے بعد صرف "اتقا" کو معیارِ فضیلت بنا دینے کا اعلان ہے۔ سماج کی طبقاتی تقسیم کا تصور جڑ سے اُکھاڑ دینے کی خوش خبری ہے۔ عورتوں اور مردوں کے باہمی حقوق و فرائض کی وضاحت ہے۔ غلاموں کے لئے نوید آزادی ہے۔ "خاندانی وراثت" کی عمارت کو متزلزل کرنے کے بعد یہ انقلابی اعلان ہے کہ "اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت کرو۔" ــــ ذرا تصور کو پھیلایئے اور دیکھئے کہ ان چند فقروں میں انسان کو کتنی لعنتوں سے نجات دلائی گئی ہے۔ اور ان اعلانات کے ساتھ کتنی ظالمانہ رسوم کی عمارتیں گری ہیں۔

مسٹر ناتھ رام (ایم اے)

فصاحت و بلاغت کی معراج

ہر ایک نبی بنیادی طور پر مبلغ تھا۔ اس کا کام بلاغ یا پہنچانا تھا۔ پیغام خداوندی کو۔ وہ کسی خاص خطہ کی طرف مبعوث ہوا ہو یا کسی خاص قوم کی طرف۔ بہرحال وہ خدا کا کوئی پیغام لے کر آیا۔ جسے اس نے اس کے بندوں تک پہنچایا۔ اور اس کے بعد۔ اس کا فرض پورا ہو گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ شروع میں ہر ایک نبی اکیلا تھا۔ پھر چونکہ "مومن کبھی اکیلا نہیں رہتا"۔ اس لئے جلد ہی اس سے ملنے والے اس کے ہم خیال ہونے لگے اور زیادہ مدت نہ گزری کہ یہی اکیلا شخص، جس کی ہر طرف سے مخالفت ہو رہی تھی۔ اور جس کا لوگ مذاق اڑا رہے تھے، ایک زبردست جتھے کا مالک اور کارفرما بن گیا۔ اور پھر یہ جماعت روز بروز بڑھتی ہی گئی۔ تعداد میں اور طاقت میں اور اثر و رسوخ میں ترقی کرتی گئی اور جو بھی اس کے مقابلہ میں آیا اسے منہ کی کھانا پڑی۔

آخر یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟

بے شک صداقت میں فی نفسہٖ ایسی کشش ہوتی ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اشد ترین مخالف بھی آج نہیں تو کل اس کے فرمانبردار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن اصل چیز پیغام کی صداقت ہی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ اسے "کس طرح" پیش کیا گیا۔ یہاں بحث وحی اور کتاب سے نہیں۔ کہ وہ یقیناً "عروس جمیل" اور "لباس حریر" کا حکم رکھتی ہے یعنی مضمون و خیال بھی بے نظیر اور زبان بھی اعلیٰ ترین۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اللہ کا نبی اپنی روزمرہ کی تبلیغ اور اپنے پیغام کی تفسیر و تشریح اور اپنے پیروؤں کی تعلیم و تربیت کس زبان میں کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے نبی کو اپنی زبان پر پوری قدرت حاصل ہونا چاہیئے۔ اور اسے اس درجہ فصیح و بلیغ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو بہترین الفاظ میں اور بہترین طریقہ پر پیش کر سکے۔

ہم اس باب میں داعئ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ و السلام لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ لیکن آپ کی پرورش بنو سعد کے قبیلہ میں ہوئی، جو اپنی زبان کی صحت اور فصاحت کے لئے مشہور تھا۔ آپ چھ برس کی عمر تک اس قبیلہ میں رہے۔ یہی وہ زمانہ ہو جس میں کوئی آدمی عام طور پر زبان سیکھتا اور اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ کی زباندانی کے اصلی جوہر چالیس کی عمر کے بعد کھلے۔ جب آپ خلعتِ نبوت سے سرفراز ہوئے۔

احادیث میں ہمیں چار طرح کی چیزیں ایسی ملتی ہیں جو آپ کی ۲۳ سالہ تبلیغی زندگی کا آئینہ ہیں:۔

۱۔ بعض قانونی دستاویزیں۔ مثلاً حدیبیہ کا صلح نامہ ہے۔ یا مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ عہد نامہ۔

۲۔ تبلیغی خطوط۔ جو آپ نے مختلف ملکوں کے بادشاہوں اور عرب قبائل کے رئیسوں کو لکھے۔

۳ - بعض خطبے - جن میں حجۃ الوداع کا خطبہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔

۴ - عام روزمرہ کی باتیں - جن میں آپ نے دینی اور دُنیوی مسائل پر اظہار رائے فرمایا۔

ان میں سے پہلی قسم یعنی قانونی دستاویزیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ کیونکہ ضرورتاً موضوع کی مناسبت سے اُن کی زبان خاص نوعیت کی ہے۔ اور یہود مدینہ کے ساتھ جو عہد نامہ ہوا تھا۔ اس کے متعلق تو وثوق سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آپؐ ہی کا ارشاد فرمایا ہوا ہے۔ اس لئے ہم باقی تینوں سے متعلق گفتگو کریں گے۔

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ سنہ ۶ھ (۶۲۸ء) میں آپؐ نے جزیرۃ العرب کے ہمسایہ ملکوں کے حکمرانوں اور بادشاہوں کے نام تبلیغی خطوط لکھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے ان خطوط کے علاوہ اور مکتوب تحریر نہیں فرمائے۔ حُسن اتفاق سے آپ کے جو خطوط تلف ہونے سے بچ گئے اور تاریخ میں محفوظ ہیں۔ اُن کی تعداد بھی سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ اُن سب کا مقصود تبلیغ ہے۔ یعنی مکتوب الیہ کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس کے لئے کسی اسلامی اصول یا قانون کی وضاحت کی گئی ہے اور مکتوب الیہ کو اس پر چلنے کی ہدایت ہے۔ لیکن ہر جگہ جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ ایسی فصیح اور قلم و دل ہے۔ کہ اس میں کسی کمی بیشی کی قطعاً گنجائش نہیں۔ فصاحت کا معیار یہ ہے کہ کلام ایسا سلیس ہو کہ سامع کو اس کے سمجھنے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ نہ الفاظ مشکل اور نامانوس ہوں۔ نہ اُن کی ترکیب ہی میں کسی طرح کی تعقید ہو۔ بلاغت کا درجہ اس سے اُوپر ہے۔ بلکہ بلاغت کے لئے فصاحت پہلی شرط ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ کلام بلاغت کی کسوٹی پر پورا نہ اُترے مگر اس کے باوجود وہ فصیح ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ فصیح نہیں تو بلاغت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلاغت میں پہلی شرط یہ ہے کہ کہنے والا اپنا مدعا پورے کا پورا اپنے کلام میں منتقل کر دے۔ یہاں "المعنی فی بطن" کی نہیں چلتی۔ اگر دُور از کار مقدرات رہ جائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ سننے والا یا پڑھنے والا۔ نہ تو اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے گا۔ نہ وہ اس سے وہ اثر ہی قبول کرے گا جو کہنے والے کا مدعا اور مقصود تھا۔ ہم جب اس معیار پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطوط دیکھتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے گویا یہ الفاظ بنے ہی اس موضوع اور موقع کے لئے تھے۔ ایک خط دیکھئے۔ جو اسکندریہ (مصر) کے قبطی عیسائی بطریق کے نام لکھا گیا تھا۔ (افسوس کہ ترجمہ میں اصل کا لطف نہیں رہا۔ لیکن اس سے مفر بھی نہیں۔ عربی جاننے والے البتہ اس سے پورا لطف اٹھائیں گے)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم - من محمد عبد اللہ ورسولہ الی المقوقس عظیم القبط - سلام علی من اتبع الھدیٰ - اما بعد فانی ادعوک بدعایۃ الاسلام - فاسلم تسلم - واسلم یوتک اللہ اجرک مرتین - فان تولیت فعلیک اثم اھل القبط - یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃٍ سواءٍ بیننا و بینکم اِلّا نعبد اِلا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ - فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون - (زاد المعاد - ۳ - ۶۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم - محمد خدا کے بندے اور اُس کے رسول کی طرف سے - مقوقس قبطیوں کے سردار کے نام - سلام اُس پر جو ہدایت کی راہ پر چلا - اس کے بعد میں آپ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں - پس اسلام قبول کر لیجئے اور محفوظ ہو جائیے - اگر اسلام قبول کر لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کو دگنا

دوہرا اجر دے گا۔ اور اگر آپ نے اس سے مُنہ پھیر لیا۔ تو تمام قبطی قوم کا گناہ بھی آپ پر ہوگا۔

"اے اہلِ کتاب! آؤ (کم از کم) اس بات پر مل جائیں۔ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ یعنی ہم اللہ کے سوائے کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں۔ اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور نہ ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو اللہ کے مقابلہ میں اپنا پروردگار بنائے۔ پھر اگر اب بھی وہ روگردانی کریں۔ تو کہہ دو کہ گواہ رہنا۔ ہم تو ماننے والے ہیں۔"

اب ایک دوسرا مکتوب گرامی دیکھئے۔ جو کسریٰ ایران کے نام لکھا گیا تھا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد الرسول اللہ الیٰ کسریٰ عظیم فارس۔

سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ وآمن باللہ ورسولہ واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ وان محمد اً عبدہٗ ورسولہ۔ ادعوک بدعایۃ اللہ۔ فانی رسول اللہ الی الناس کافۃ لینذر من کان حیا ویحق القول علی الکافرین۔ اسلم تسلم۔ فان ابیت فعلیک اثم المجوس۔ (زاد المعاد۔ ۳ : ۶۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے فارس کے حکمران کسریٰ کے نام!

سلام اُس پر جو ہدایت کی راہ پر چلا اور اللہ اور اس کے رسُول پر ایمان لایا۔ اور جس نے شہادت دی کہ اللہ کے سوائے جو واحد اور لاشریک ہے۔ کوئی معبود نہیں۔ اور محمدؐ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔ میں آپ کو اللہ کی طرف بُلاتا ہوں۔ میں تمام قوموں کی طرف خدا کا رسول ہو کے آیا ہوں تاکہ جو بھی زندہ ہے اُسے خبردار کردوں اور اللہ کی بات کافروں کے بارے میں ضرور پُوری ہو کر رہے گی۔ اسلام قبول کر لیجئے اور محفوظ ہو جائیے۔ اگر آپ نے روگردانی کی تو زرتشتی قوم کا گناہ بھی آپ ہی پر ہوگا۔

پہلے خط سے اس خط کا مضمون الگ ہے اور یہ ہونا بھی چاہیئے تھا۔ کیونکہ پہلے خط کے مخاطب عیسائی حضرات تھے۔ یہاں مکتوب الیہ مجوسی (زرتشتی) تھا۔ لیکن دونوں میں ایک قدر مشترک ہے۔ مکتوب الیہ کے مخصوص غلط عقیدہ کی لطیف پیرائے میں تردید کی گئی ہے۔ مقوقس کے خط میں اپنے نام کے ساتھ عبداللہ کا اضافہ کیا۔ جس سے یہ مراد تھی کہ خدا کا ہر رسول اس کا بندہ اور مخلوق ہے۔ نہ کہ ابن اللہ۔ جیسا کہ عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق عقیدہ ہے۔ یہاں کسریٰ کے نام خدا کی توحید پر خاص زور دیا۔ کیونکہ زرتشتیوں کے یہاں یزدان اور اہرمن۔ خیر وشر کے دُو خداؤں کا عقیدہ موجود ہے۔ اس لئے انھیں یہ بتانے کی ضرورت تھی کہ خدا ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ باقی تمہاری خام خیالی ہے۔ پھر صاف لفظوں میں اسلام کے عالمگیر مذہب اور اپنے تمام اقوام عالم کی طرف مبعوث ہونے کا اعلان کیا۔ تاکہ اگر کسی جگہ یہ خیال ہو کہ اُن کے عرب میں پیدا ہونے اور قرآن کے عربی میں نازل ہونے کا یہ مطلب ہے کہ آپ صرف عربوں ہی کی اصلاح کے لئے مامور تھے۔ تو اس کی تردید ہو جائے۔ اس لئے "الناس کافۃ" فرما کر بتا دیا کہ میں عرب وعجم سب کے لئے "رسول اللہ" ہوں۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

دونوں خطوں میں ایک فقرہ مشترک بھی ہے۔ پہلے میں ہے۔ "فان تولیت فعلیک اثم اھل القبط"۔ اور دوسرے میں ہے

"فان ابیت فعلیک اثم المجوس"۔ یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ آدمی اپنے سے بڑے کی تقلید کرتا ہے۔ یہ بڑائی عمر میں ہو کہ رتبہ میں۔ علم میں ہو کہ عقل میں۔ عام لوگ اس سے متاثر ہوتے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے سے بڑے آدمی کے قول و فعل کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ دونوں خطوں کے ان فقروں میں انسانی فطرت کے اسی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ "الناس علیٰ دین ملوکھم" کی مثل اسی موقع کے لئے ہے۔ مراد یہ ہے کہ اگر سردار قوم اسلام قبول کرے گا تو اس کی رعایا یا پیرو بھی اس کے تتبع میں مسلمان بن جائیں گے۔ لیکن اگر اس نے روگردانی کی اور اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عام لوگ اس دین پر غور و فکر نہیں کریں گے اور اس طرح وہ ہدایت سے محروم رہ جائیں گے۔ دوسرے معنوں میں ان لوگوں کی گمراہی کے لئے اُن کے سردار اور حکمران ذمہ دار ہوں گے اور ان کا گناہ بھی اُنہی کے ذمہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ فرمایا کہ اگر تم اسلام قبول کر لوگے تو خدا تمہیں اس کا دوہرا اجر دے گا۔ یعنی ایک تمہارے اپنے قبولِ حق پر اور دوسرے تمہارے تتبع میں تمہاری قوم کے راہ ہدایت اختیار کر لینے پر۔

ایک بہت مختصر خط اور دیکھئے:۔

مسیلمہ بن حبیب یمامہ کے قبیلہ بنی حنیفہ کا رئیس تھا۔ اس نے یہ خط لکھا اور اپنے دو آدمیوں کے ہاتھ آپؐ کی خدمت میں بھیجا:۔

من مسیلمہ رسول اللہ الی محمد رسول اللہ۔ السلام علیک۔
اما بعد فانی قد اُشرکت فی الامر معک وان لنا نصف الارض ولقریش
نصف الارض ولکن قریشا قوم یعتدون۔ (ابن ہشام۔ ۴: ۲۴۷)

خدا کے رسول مسیلمہ کی طرف سے محمدؐ رسول اللہ کے نام۔ سلام علیکم۔ اما بعد میں بھی اس کارِ نبوت میں آپ کا شریک بنایا گیا ہوں۔ اور ہمارے (یعنی میری قوم کے) لئے آدھی زمین ہے اور باقی آدھی قریش کے لئے۔ لیکن قریش کی قوم زیادتی کر رہی ہے۔

جب مسیلمہ کے ایلچی یہ خط لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو آپ نے خط پڑھنے کے بعد اُن سے پوچھا کہ اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ وہ بولے۔ وہی جو اس خط میں لکھی ہے۔ حضور نے فرمایا۔ اگر ایلچی کے قتل کرنے کی ممانعت نہ ہوتی تو میں ابھی تمہاری گردن مار دینے کا حکم دے دیتا۔ پھر مسیلمہ کے نام یہ خط لکھوایا:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ من محمد رسول اللہ الی مسیلمہ الکذاب!
السلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ اما بعد فان الارض للہ یورثھا من یشاء
من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔ (ابن ہشام۔ ۴: ۲۴۷)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمدؐ رسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کے نام۔
سلام اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ اما بعد زمین اللہ تعالیٰ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے۔ اسے دے دیتا ہے۔ اور انجام نیک اُنہی کا ہے جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

کیا اس سے بڑھ کر ایجاز و اختصار کی مثال مل سکتی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس دو سطر کے خط میں یہ تمام ضروری

چیزیں سما کیہ نکر گئیں۔

۱- "محمد رسول اللہ" سے اپنے دعوے کا اثبات۔

۲- "الی مسیلمہ الکذاب" سے مکتوب الیہ کے دعوے کی تکذیب و تغلیط۔

۳- "الارض للہ" سے اس کے دوسرے دعوے کی تغلیط کہ زمین دونوں قوموں میں تقسیم کردی گئی ہے۔

۴- "یورثہا من یشاء من عبادہ" سے یہ کہنا مقصود ہے کہ انھیں لوگ یا قومیں آپس میں تقسیم نہیں کیا کرتیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ جو اس کا اصلی مالک ہے۔ وہی اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے اس کے قبضہ میں دے دیتا ہے۔

۵- "العاقبۃ للمتقین" کے آخری ٹکڑے سے تبلیغ کردی کہ اگر تم بھی اللہ کے نیک بندے اور متقی بن جاؤ گے تو ممکن ہے کہ تم بھی اس زمین کے وارث بن جاؤ۔

اور اس کے باوجود اس ساری عبارت میں ایک لفظ بھی مشکل یا نامانوس نہیں۔ غرض دریا کو اس طرح کوزے میں بند کردیا ہے کہ کوئی گھنتی، ناگفتہ نہیں رہ گئی۔

اور اصل بات یہ ہے کہ امابعد سے لے کر آخر تک خط قرآنی آیت کا ٹکڑا ہے۔ (الاعراف ۷: ۱۲۸) آپؐ کا کمال یہ ہے کہ اس کا استعمال ایسا برمحل کیا جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا جاتا ہے۔

خطوں کے بعد خطبے ہیں۔ خط اور خطبہ میں پہلا فرق تو یہی ہے کہ خط کا مخاطب بالعموم فرد واحد ہوتا ہے۔ اور خطبہ بڑے مجمع کے سامنے دیا جاتا ہے اور اسی لئے خطبہ بہ نسبت خط کے طویل ہوتا ہے۔ پھر اس میں ایک سے زیادہ موضوع بھی زیر بحث آجاتے ہیں۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر خطبے بھی مختصر اور کسی ایک ہی مضمون پر حاوی ہیں۔ سوائے اس خطبہ کے جو آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سنہ ۱۰ھ (۶۳۲ء) میں جبل عرفات سے دیا۔ چونکہ یہ آخری حج تھا اور آپؐ کو یقین تھا کہ اس کے بعد آپؐ کو اپنی زندگی میں مسلمانوں کے اتنے بڑے اجتماع سے ملنے اور اسے خطاب کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس لئے آپؐ نے اس خطبہ میں وصیت کے طور پر دین کے اہم مسائل کی تشریح فرمادی۔ خطبہ دیکھئے:-

خدا کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:-

ایہا الناس، اسمعوا قولی، فانی لا ادری لعلی لا القاکم بعد عامی ہذا بہذا الموقف ابداً۔

اے لوگو، میری بات سنو۔ کیونکہ میں نہیں جانتا۔ شاید میں اس سال کے بعد اس صورت میں آپ لوگوں کو نہ دیکھ سکوں۔

ایہا الناس۔ ان دماءکم و اموالکم علیکم حرام الی ان تلقوا ربکم۔ کحرمۃ یومکم ہذا۔ کحرمۃ شہرکم ہذا۔ وانکم ستلقون ربکم۔ فیسألکم عن اعمالکم وقد بلغت

اے لوگو۔ تمہارے خون اور تمہارے اموال آپس میں روز قیامت تک اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمہارا یہ دن اور تمہارا یہ مہینہ حرام ہے۔ اور تم جلد ہی اپنے رب کے حضور جاؤ گے اور تم سے تمہارے اعمال کے بارے میں پرسش ہوگی اور میں نے یہ بات تم کو پہنچادی۔

فمن کانت عندہ امانۃ فلیودہا الی من ائتمنہ علیہا وان کل ربا موضوع، ولکن لکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون۔ قضی اللہ انہ لا ربا۔

تم میں سے جس کے پاس کوئی امانت ہو چاہیے کہ وہ اسے امانت رکھنے والے کو لوٹا دے۔ اور تمام سود باطل ہے لیکن راس المال تمہارا حق ہے۔ نہ اور کسی پر ظلم کرو نہ خود کبھی کے ظلم کا نشانہ بنو۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ

وان ربا عباس بن عبد المطلب موضوع کله - وان کل دم کان فی الجاهلیه موضوع وان اول دمائکم اضع ، دم ابن ربیعه بن الحارث بن عبد المطلب وکان مسترضعاً فی بنی لیث ـ فقتلته هذیل ـ فهو اول ما ابدا به من دماء جاهلیه ـ

کردیا کہ سود نہیں ہوگا اور اسی لئے عباس بن عبد المطلب کا سارا سود منسوخ کیا جاتا ہے اور ایام جاہلیت کے تمام خون بھی منسوخ اور سب سے پہلے جس خون کو میں منسوخ کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ بن حارث بن عبد المطلب کا خون ہے۔ وہ بنو لیث میں دودھ پیتا بچہ تھا اور اسے ہذیل والوں نے قتل کر دیا تھا۔ جاہلیت میں یہ پہلا قتل تھا۔ جس سے خون کا بدلہ لینے کا سلسلہ چلا۔

امابعد ایها الناس ـ فان الشیطان قد ئیس من ان یعبد بارضکم هذه ابدا ـ ولکنه ان یطع فیما سوی ذالک ، فقد رضی به مما تحقرون من اعمالکم ـ فاحذروه علیٰ دینکم ـ

اور اس کے بعد اے لوگو! شیطان کو اس بات سے تو کامل مایوسی ہو گئی کہ اب تمہاری اس سرزمین پر قیامت تک اس کی پوجا نہیں ہو سکتی لیکن اس کے علاوہ تمہاری دوسری معمولی معمولی باتوں میں اس کی پیروی ہوگی۔ پس وہ تمہارے ان اعمال ہی سے خوش ہے۔ اپنے دین سے متعلق اس سے خبردار رہو۔

ایها الناس ـ ان النسیٔ زیادة فی الکفر یُضَلّ به ـ الذین کفروا یحلّونه عاماً ویحرّمونه عاماً ـ لیواطئوا عدة ما حرّم الله فیحلوا ما حرّم الله ویحرّموا ما اَحلّ الله ـ

اے لوگو نسی کفر میں زیادتی تھی۔ اس سے کافر لوگوں کو گمراہ کرتے تھے ایک سال اسے حلال کر دیتے اور دوسرے سال حرام کر دیتے۔ اور یہ اس لئے تاکہ خدا کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو جھٹلا سکیں۔ وہ خدا کے حرام کردہ کو حلال بنا دیتے اور حلال کردہ کو حرام۔

وان الزمان قد استدار کهیئته یوم خلق السمٰوٰت والارض وان عدة الشهور عند الله اثنا عشر شهرا ـ منها اربعه حرم ـ ثلاثه متوالیه و رجب مضر ـ الذی بین جمادی وشعبان ـ

اور زمانہ گردش کھا کے پھر اسی حالت پر پہنچ گیا جس پر شروع میں زمین و آسمان پیدا ہوئے تھے۔ اور مہینوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بارہ ہے۔ ان میں سے چار حرام ہیں۔ تین یکے بعد دیگرے (یعنی ذیقعدہ۔ ذی الحجہ۔ محرم) اور رجب مضر۔ جو جمادی الثانی اور شعبان کے درمیان ہے۔

امابعد ایها الناس ـ فان لکم علیٰ نسائکم حقا ولهن علیکم حقا ـ لکم علیهن ان لا یوطئن فرشکم احدا تکرهونه ـ وعلیهن ان لا یاتین بفاحشه مبینه فان فعلن فان الله قد اذن لکم ان تهجروهن فی المضاجع وتضربوهن ضرباً غیر مبرح فان انتهین فلهن رزقهن وکسوتهن بالمعروف ـ واستوصوا بالنساء خیرا ـ فانهن عندکم عوان ـ لا یملکن لانفسهن شیئاً ـ وانکم انما اخذتموهن بامانة الله ـ واستحللتم فروجهن بکلمات الله ـ فاعقلوا ایها الناس قولی ـ

اور اے لوگو۔ اس کے بعد سنو کہ تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور ان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے گھر میں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جسے تم نہیں چاہتے۔ اور ان کا فرض ہے کہ فحش مبین کی مرتکب نہ ہوں۔ اور اگر وہ اس کا ارتکاب کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ ان سے خواب گاہ میں علیحدگی اختیار کر لو۔ اور انہیں ایسی جسمانی سزا دو جو شدید نہ ہو۔ اور اگر وہ باز آجائیں تو ان کا حق ہے کہ مناسب طریقہ پر اپنا نان نفقہ اور لباس تم سے لے لیں۔ اور میں تمہیں عورتوں سے عمدہ سلوک کی وصیت کرتا ہوں۔ وہ تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں۔ وہ اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں۔ اور تم نے انھیں اللہ تعالیٰ سے بطور امانت لیا ہے اور تم نے اللہ تعالیٰ کے کلام سے انھیں اپنے لئے حلال کیا ہے۔ پس اے لوگو۔ میری بات پر خوب غور کرو۔

فانی قد بلغت۔
وقد ترکت فیکم ما ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا
ابداً۔ امراً بیناً۔ کتاب اللہ وسنۃ نبیہ۔

میں نے بہرحال اپنا پیغام پہنچا دیا۔
اور میں تمہارے لئے وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر اسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ صاف اور کھلی چیز۔ کتاب اللہ اور سنت نبوی۔

ایھا الناس۔ اسمعوا قولی واعقلوہ۔ تعلمن ان کل مسلم اخ المسلم وان المسلمین اخوۃ۔ فلا یحل لامرئ من اخیہ الا ما اعطاہ عن طیب نفس منہ فلا تظلمن انفسکم۔

(ابن ہشام ۴ ؛ ۲۵۰-۲۵۲)

اے لوگو! میری بات سنو اور اسے سمجھو۔ یاد رکھو کہ ہر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور سب مسلمان ایک برادری ہیں۔ پس کسی آدمی کے لئے اس کے بھائی کی کوئی چیز حلال نہیں سوائے اس کے جو وہ اپنے دل کی خوشی سے اسے دیدے پس اپنے آپ پر ظلم نہ کرو۔

یہ بڑے معرکہ کا خطبہ ہے اور اگرچہ ابن ہشام میں اس کی تصریح نہیں۔ لیکن بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آخری حج کے موقع پر آپؐ نے تین مختلف خطبے ارشاد فرمائے تھے۔ عین ممکن ہو کہ ان تینوں خطبوں کے کچھ حصے آپس میں مل گئے ہوں۔ بہرحال آپ نے دیکھا کہ سارے خطبہ میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جو متوسط علم کا عربی دان نہ سمجھ سکتا ہو۔ یہی کمال فصاحت ہے۔ اور چونکہ زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ سامع کو خطیب کا مدعا سمجھنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ پھر بلاغت کا یہ عالم ہے کہ اس میں دین کے بیشتر اہم مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں۔

جب خطبہ ختم فرمایا۔ تو لوگوں کو مخاطب کر کے حکم دیا۔

فلیبلغ الشاھد الغائب

جو لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ یہ باتیں اُن لوگوں کو پہنچا دیں جو غیر حاضر ہیں۔

اب تیسری شق عام احادیث کی ہے۔ یہ کمیت اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے اتنی متنوع ہیں کہ ان پر کسی مختصر مضمون میں اُچٹتی نگاہ ڈالنا بھی محال ہے۔ اس لئے میں صرف چند ایسی احادیث پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ جو اپنے مطلب کے لحاظ سے ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکی ہیں:۔

۱۔ انما الاعمال بالنیات۔
اعمال نیتوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

۲۔ لکل امرئ ما نوی۔
ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق پھل ملتا ہے۔

۳۔ من رای منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ۔ فان لم یستطع بلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ وذالک اضعف۔
اگر تم میں سے کوئی شخص کوئی بری بات دیکھے۔ تو اسے چاہیئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل ڈالے۔ اگر وہ اس پر قادر نہ ہو۔ تو زبان ہی سے اس کی مخالفت کرے۔ اور اگر وہ اتنا بھی نہ کر سکے تو کم از کم اسے دل ہی میں بُرا سمجھے۔ اور یہ کمزور ترین درجۂ ایمان ہے۔

۴۔ انصر اخاک ظالماً او مظلوماً۔
اپنے بھائی کی مدد کرو۔ خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

۵۔ خیرکم خیرکم لاھلہ۔
تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ بہتر سلوک کرتا ہے۔

۶- کما تکونوا، یولی علیکم۔	جیسے تم خود ہو۔ ویسے ہی تمہیں حاکم ملیں گے۔
۷- الحیا من الایمان۔	حیا جزوِ ایمان ہے۔
۸- ان من الشعر حکما ومن البیان سحراً۔	بعض شعر حکمت ہوتے ہیں اور بعض باتیں جادو۔
۹- احرث لدنیاک کانک تعیش ابداً۔ واعمل لآخرتک کانک تموت غداً	دُنیا اس محنت سے کماؤ۔ جیسے تمہیں ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اور آخرت کے لئے ایسی کوشش کرو، جیسے کل ہی مرجانا ہے۔
۱۰- لایلدغ المومن من جحر واحد مرتین۔	مومن ایک ہی سوراخ سے دو بار نہیں کاٹا (ڈسا) جاتا۔
۱۱- الید العلیا خیر من الید السفلی۔	اُوپر کا یعنی دینے والا ہاتھ، نیچے کے یعنی لینے والے ہاتھ سے اچھا ہوتا ہے۔
۱۲- کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن۔	دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے۔
۱۳- اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ	مزدور کی مزدوری، اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو

اور ان میں سینکڑوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔

غرض آپؐ کا تمام کلام فصاحت و بلاغت کا درخشاں نمونہ ہے۔ اور آپؐ کی حیرت انگیز کامیابی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے!

ڈاکٹر فواد فخر الدین
(انڈونیشیا)

ترجمہ
خلیل حامدی

حضورؐ نے انسانی معاشرت کو کیا دیا؟

۱۲۔ ربیع الاول کی تاریخ۔ وہ مبارک تاریخ ہے۔ جس میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا میں جلوہ افروز ہوئے ہم مسلمان اس ولادت باسعادت کی خوشی میں اس مبارک تاریخ کو جابجا جلسے منعقد کرتے ہیں۔ میرے لئے بھی یہ امر انتہائی مسرت کا موجب ہے کہ میں اس تقریب سعید کے موقع پر تمام عالم اسلامی کو اپنی پُرخلوص مبارکباد کا ہدیہ پیش کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ میری یہ بھی انتہائی خواہش ہے کہ امتِ اسلامیہ کی صفوں میں اتحاد و یگانگت کی روح جاری و ساری ہو۔ سعی وجہد کے میدان میں ملت محمدی کے اندر باہمی تعاون و توافق کی فضا پیدا ہو اور دین حنیف کی سربلندی کی خاطر ہر فرد ملت مشترک طور پر جہاد کرنے کے لئے کمربستہ ہوجائے۔ تاکہ اسلام اپنی مرکزی حیثیت کو پُورے استحکام کے ساتھ اپنی وحدتِ کاملہ اور اخوتِ صادقہ کی قوت کے ساتھ دُنیا کے گوشہ گوشہ میں قائم کرسکے۔ بالخصوص ان ممالک میں جن کو آزادی استقلال کے ساتھ عزت و شرف کی نعمت بھی حاصل ہے۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جس روز دین حق کا پیغام لے کر دُنیا میں تشریف لائے ہیں۔ وہ روز دُنیا کے اندر نئی روشنی کے ظہور کا روز تھا۔ اس نئی روشنی کی برکت تھی کہ اس نے انسان کو وہ عقیدہ اور تصور دیا جو سراسر مکارمِ اخلاق اور فضائل و محاسن کا مجموعہ تھا۔ اور تسامح، رواداری اور رذائل سے اجتناب کی دعوت تھی۔ اس عطیہ نے انسانیت کے وجود کو افراط و تفریط کے گرداب سے نکال کر اعتدال پر فائز کیا۔ عورت کو جو انسانی معاشرہ میں انتہائی پستی کے مقام پر گرچکی تھی عزت و تکریم کے اعلیٰ مراتب سے ہمکنار کیا۔ جمہوریت کو رواج دے کر حقوق انسانی کی حدبندی کردی۔ جو اس سنہری اصول پر قائم تھی۔ کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اولاد آدم باہم دندانہ ہائے شانہ کی طرح ہیں۔

اسلام کے ظہور نے دُنیا کے تختہ پر ایک نئے تمدن اور ایک نئی تہذیب کو جنم دیا۔ دُنیا کا فرسودہ نظام بدل کر رکھ دیا دُنیا کے اندر بہ انداز نو نظم و نسق قائم کیا۔ دستور زندگی کی طرح ڈالی۔ انسانوں کے اندر ایک ایسی روح پھونک دی جس نے فرد اور جماعت کے درمیان الفت و محبت، اخوت و تعاون کے جذبۂ مقناطیسی کو نشو و نما بخشی۔ شوریٰ فی الامر پر مملکت کی بنیادیں استوار کیں۔ اور دین میں اکراہ و اجبار کی کوئی گنجائش نہ رکھی۔ "تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین" کہہ کر گویا اس بات کا اعلان کر دیا کہ اسلام کی اطاعت کا قلادہ گلے میں ڈالنے کے لئے ہر انسان کو اختیار اور آزادی حاصل ہے۔ کسی شخص کو اس لئے نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ وہ کافر ہے۔ بلکہ اہل کتاب کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ الغرض اس طرح کے دوسرے اصول اس امر کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں کہ اسلام روادارانہ نظریات کا

حاصل رہے اور ایک ایسے جہان نو کی ایجاد اس کے پیش نظر ہے - جو بغض و عداوت کی آلودگیوں سے مبرا اور تعصب و تنگ نظری کے جذبات سے پاک ہو - اور نوع انسان کے لئے امن و سلامتی کا گہوارہ ثابت ہوسکے !

اس مبارک گھڑی میں جس چیز کا بار بار جائزہ لینے کی ضرورت ہے - وہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ اور آپ کے محامد و فضائل ہیں - یہ معلوم کیا جائے کہ دعوت دین کو پھیلانے میں آپ نے کس طرح انتھک کوششیں کیں - گھر بار کو خیرباد کہہ کر کس طرح سفر و غربت کی صعوبتوں سے دوچار رہے - دشمن جنگ و جدال پر اتر آئے تو ان کے سامنے سینہ سپر ہوگئے اور بہت سے معرکے سر کئے - قوم کی طرف سے ایذائیں دی گئیں تو صبر و شکیب کے ساتھ انہیں سہا - یہ تمام واقعات آپ کے فضائل حسنہ اور اعلیٰ کردار کی شہادت دیتے ہیں - خود ذات خداوندی نے آپ کی تعریف میں فرمایا ہے :-

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ !

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم لوگوں کے لئے بڑے نرم مزاج واقع ہوئے ہو - ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے -

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ !

بیشک آپ انسانی اخلاق کے بلند مدارج پر فائز ہیں !

اسلام دنیا کے سامنے بے شمار مفید اور گراں قدر اصول لے کر آیا ہے - اس نے انسانوں کا ایک گروہ تیار کردیا - جس کی اساس اعلیٰ انسانی اخلاقیات پر قائم تھی اور اس عقیدے پر قائم تھی جو کائنات کے فرمانروا نے اپنی بشری مخلوق کیلئے انفرادی و اجتماعی زندگی کا نظام بنا کر بھیجا ہے - اور اس میں ہر اس چیز کی وضاحت کردی جس کی انسانوں کو اس جہان بے ثبات میں بھی ضرورت لاحق ہوسکتی ہے - اور ان تمام اعمال کا نقشہ پیش کردیا ہے - جو آخرت کی زندگی میں سلامتی و نجات کے ضامن ہوسکتے ہیں -

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس یادگار دوام آثار میں ہمارے لئے جو منفعت بخش پہلو ہیں - وہ آپ کا عمل اور آپ کا اسوہ ہے - جو آپ کی ذاتی زندگی سے لے کر خاندانی اور قومی زندگی تک پھیلا ہوا ہے - آپ کا یہی اسوہ ہماری عزت و سرخروئی کے لئے اور دنیا میں ہماری قوت کی بقاء کے لئے بہت بڑا بیش قیمت اور نایاب سرمایۂ وراثت ہے - آپ کے اسوۂ حسنہ اور آپ کی تعلیم کا خلاصہ چند نقاط میں عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں :-

(۱) دعوت حق کو خلق خدا تک پہنچانے میں آپ نے کوشش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا - نہایت صبر اور بردباری کے ساتھ اس پیغام کو پہنچایا - یہ جدوجہد کسی دنیوی غرض اور ذاتی مفاد کی خاطر نہ تھی - بلکہ خالص خدا کے لئے تھی - اسی بات کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا :-

وَاللهِ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسَ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلَى أَنْ أَتْرُكَ هَٰذَا الْأَمْرَ مَا تَرَكْتُهُ حَتَّىٰ يُظْهِرَهُ اللهُ أَوْ أَهْلِكَ دُونَهُ -

بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر سورج لا رکھیں اور بائیں ہاتھ پر چاند کہ میں اس کام سے باز آجاؤں - تو میں کبھی نہیں باز آؤں گا - یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کردے یا میری جان جاتی رہے !

دُنیاوی مال و متاع سے ہمیشہ آپؐ نے بے اعتنائی اختیار فرمائی - جب آپؐ کے سامنے سونے کے پہاڑ بھی پیش کئے گئے تو آپ نے لینے سے انکار کر دیا - اور شرف و کرامت کی زندگی بسر کرنے کے لئے معمولی کفاف پر اکتفا کی -

(۲) **تواضع اور رواداری** - آپؐ کی پوری زندگی میں ہمیں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آپؐ نے کبھی اپنے آپ کو دوسروں سے برتر رکھنے کی کوشش کی ہو - بلکہ آپؐ کی مجلس غرباء و مساکین اور معمولی حیثیت کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی - اور جس طرح رؤساء اور سرداروں کے ساتھ آپؐ کا سلوک تھا - اسی طرح نچلے درجہ کے لوگوں کے ساتھ آپ کا مساویانہ طرز عمل تھا - آپؐ کی روادارانہ تعلیم کی اس سے بڑھ کر کیا مثال ہو سکتی ہے کہ وہ قریش جو ہمیشہ آپؐ کے جانی دشمن رہے، آپؐ کو ایذائیں دیتے رہے - آپ کے رفقاء اور ساتھیوں کو آپ سے توڑنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے - یہاں تک کہ ترک وطن پر انھوں نے آپؐ کو مجبور کر دیا - ان تمام سختیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود وہی **قریش فتح** مکہ کے دن جب گرفتار ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آتے ہیں - تو آپ کی زبان مبارک سے اُن کے حق میں یہ کلمات جاری ہوتے ہیں :-

اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ -

جاؤ تم آزاد ہو - آج تم پر کوئی گرفت نہیں ہے - اللہ تمہیں معاف کرے گا اور وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے !

۳ - **عام مساوات** :- آپ نے جس باہمی مساوات اور طبقاتی کشمکش کے استیصال کا درس دیا - اس کی عملداری اس قدر ہمہ گیر تھی کہ آپؐ کا اپنا گھر اور اپنا خاندان بھی اُس میں شامل تھا - آپؐ کے قبیلہ کے کسی فرد کو دوسروں پر کسی درجہ کوئی فضیلت و برتری حاصل نہ تھی - اس سلسلہ میں آپ کا وہ ارشاد مبارک بہت مشہور ہے جو آپ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا :-

يَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ، اِعْمَلِيْ فَاِنِّيْ لَا اُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا !

اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہ ! اپنے لئے نیک عمل کر لو - میں اللہ کی گرفت سے تمہیں ذرہ بھر نہیں بچا سکتا !

اسی طرح دوسرے افراد خاندان کو مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا تھا :-

يَا آلَ مُحَمَّدٍ لَا يَاْتِيْنِي النَّاسُ بِاَعْمَالِهِمْ وَتَاْتُوْنَ بِاَنْسَابِكُمْ اِعْمَلُوْا فَاِنِّيْ لَا اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا -

اے محمدؐ کی آل ! ایسا نہ ہو کہ لوگ میرے پاس نیک اعمال لے کر آئیں اور تم حسب و نسب لے کر آؤ - تم خود عمل کرو - میں تمہیں اللہ کی گرفت سے ذرہ بھر نہیں بچا سکتا -

عام انسانی مساوات کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا :-

اِجْعَلُوا النَّاسَ فِي الْحَقِّ سَوَاءً قَرِيْبُهُمْ كَبَعِيْدِهِمْ وَبَعِيْدُهُمْ كَقَرِيْبِهِمْ -

حقوق میں تمام انسانوں کو برابر رکھو - اس طرح کہ اپنے بیگانوں کی طرح اور بیگانے اپنوں کی طرح ہوں !

۴۔ اسلامی اور انسانی اخوت۔ یہ وہ تعلیم تھی جس نے قوم کی منتشر صفوں میں اتحاد و الفت کے روح پرور گلشن کھلا دیئے۔ اور مدت سے بچھڑے ہوؤں کو گلے ملا دیا۔ اخوت اسلامی کی بنیاد اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر ہے:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

تمام مومن بھائی بھائی ہیں۔ پس تم اپنے بھائیوں کے درمیان صلح رکھو اور اللہ سے ڈرو تاکہ وہ تم پر رحم کرے۔

اسی نعمت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَاذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللہِ عَلَیْکُمْ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِہٖ اِخْوَانًا۔

اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے۔ اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے!

اسی نازک آبگینہ کی حفاظت کے اصول و قواعد بیان کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(الف) وَلَا تَحَاسَدُوْا وَلَا تَنَاجَشُوْا وَلَا تَبَاغَضُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَلَا یَبِعْ بَعْضُکُمْ عَلٰی بَیْعِ بَعْضٍ وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللہِ اِخْوَانًا۔

آپس میں ایک دوسرے پر حسد نہ کرو۔ اور نہ آپس میں کسی کو دوسرے کے خلاف بھڑکاؤ۔ اور نہ آپس میں بغض رکھو۔ اور نہ آپس میں کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرو۔ اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی بیع پر بیع کرے۔ اور تم اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ!

(ب) اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ لَا یَظْلِمُہٗ وَلَا یَخْذُلُہٗ وَلَا یَکْذِبُہٗ وَلَا یَحْقِرُہٗ۔ اَلتَّقْوٰی ھٰہُنَا وَیُشِیْرُ اِلٰی صَدْرِہٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ۔ بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ اَنْ یَّحْقِرَ اَخَاہُ الْمُسْلِمَ۔

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ اور نہ اس سے جھوٹ بولتا ہے۔ اور نہ اسے حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

(ج) کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ دَمُہٗ وَمَالُہٗ وَعِرْضُہٗ۔

آپؐ اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرماتے ہیں۔ تقویٰ یہاں ہے۔ انسان کو شر سے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے۔

"ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون، مال، آبرو حرام ہے۔"

عالمگیر انسانی برادری کے قیام کی دعوت دیتے ہوئے قرآن نے بیان کیا ہے:۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَاءً۔ وَاتَّقُوا اللہَ الَّذِیْ تَسَاءَلُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ۔

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت مرد و عورت دنیا میں پھیلا دیئے۔ اُس خدا سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو۔ اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو۔

(۵) اعتماد علی النفس۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ آپؐ قوم کے اندر اعتماد علی النفس اور خودداری کی اعلیٰ صفات کو اُجاگر کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ ایک طرف ہر ہر فرد بذات خود قوت کی چٹان بن جائے اور دُوسری طرف پُوری اُمت قوت و طاقت کا ایک ایسا ہمالہ بن جائے جو حوادث کے ہجوم اور جنگوں کی شعلہ باری کے موقع پر دُوسروں کے سامنے تعاون اور امداد کی جھولی پھیلانے کے بجائے اپنی ذات پر اعتماد کرنے والی اور اپنی مدد آپ کرنے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔

جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے اُن کے (دشمن کے) مقابلے کے لئے تیار رکھو۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کرو۔

یہ ہے مختصر اور سرسری خلاصہ جو پیغمبر انسانیت کی تعلیم میں ہمیں ملتا ہے۔ اور پیغمبر انسانیت کے بزم ولادت پر اس کے اعادہ و تکرار کی ہمیں ضرورت ہے۔ یہ وہ انمٹ آثار ہیں جو اُمتوں اور قوموں کو زندگی کے میدانِ عمل میں فلاح و بہبودی سے متمتع کرتے ہیں۔ اسلام نے اس ربانی تعلیم اور صحیح فکر کی طرف تمام دُنیا کو دعوت دی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی بہتری اور سلامتی بھی اسی میں ہے کہ زمامِ حیات اسی صالح قائد کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ تاریخ ہمارے سامنے ہے کہ جس قوم نے اپنی زندگی کی گاڑی اس فکر و عقیدے کے خطوط پر چلائی ہے اور اسلام کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہے۔ وہ عزت و شوکت اور تہذیب و تمدن کے بالاترین مدارج پر جاگزیں ہوئی ہے۔

ان تمام گزارشات کے بعد ہم ملتِ اسلامیہ کو خواہ وہ مسلمان ممالک کی ہو یا غیر مسلم ممالک کی۔ دعوت دیتے ہیں کہ تعلیم نبوی کی روشنی میں وہ اپنے موجودہ نظام حیات اور طرزِ عمل پر غور و فکر کرے۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُمت اپنے اعمال میں اور زندگی کے معاملات میں عملی ربط و اتصال سے دامن کش ہے۔ اور ایمان کی دولت سے بہرہ ور دل ابھی تک گوشہ ہائے خلوت کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ اور مضبوط محاذ بنانے کے لئے اور مسلم قوم کے اندر عملی تعاون (cooperation) کی روح پھونکنے کے لئے اُن میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ حالانکہ مسلم معاشرہ، گروہ بندی اور جماعت پرستی کا شکار ہو چکا ہے۔ اور ہر گروہ کا عقیدہ مختلف اور مسلک جداگانہ ہے۔ نہ افکار و نظریات میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ اور نہ اصول و مبادی میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔ اور سب سے افسوسناک یہ بات ہے کہ اپنی اس زبوں حالی کے باوجود مسلمان بڑے تساہل پسند ہو چکے ہیں۔ مستقبل بینی اور دُور اندیشی اُن کے پاس نہیں پھٹکتی۔ اور اپنی مدد آپ کرنے کا اصول اُن کے نزدیک مضحکہ انگیز بات ہے۔ عمل و کردار کے لحاظ سے اس قدر کھوکھلے ہیں کہ موجودہ خطرناک حالات (جن میں سب مسلمان ممالک گھرے ہوئے ہیں) کی ایک ٹھوکر

کی تاب نہیں رکھتے۔

آخر میں ہم یہ گزارش کریں گے کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں پر ۔ مشرق کے رہنے والے ہوں یا مغرب کے ۔ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور کام کا ایک ایسا پروگرام بنائیں جو ملت کے لئے مفید اور نتیجہ بخش ہو ۔ اور اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے اجتماعی عمل کے لئے فضا ہموار کریں ۔ اجتماعی تعاون پیدا کرنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ چند دھواں دھار کانفرنسیں منعقد کردی جائیں ۔ اور ان میں فصیح و بلیغ لیکچر دیئے جائیں ۔ اور گھڑی دو گھڑی باغوں کی سیر کرادی جائے ۔ بلکہ اس ورطۂ ذلت سے نکلنے کے لئے ٹھوس طریقے عمل میں لائے جائیں ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس امر کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ تمام ممالک مل کر ایک اسلامی لشکر تیار کریں ۔ جو کسی بھی اسلامی ملک پر دشمن کی حملہ آوری کے وقت اس کا دنداں شکن جواب دینے کے لئے ہر وقت تیار رہے ۔ اور دوسری ناگزیر چیز یہ ہے کہ ایک ایسا فنڈ جاری کیا جائے جس کے ذریعہ اسلامی علاقوں میں جہاں جہاں دینی تحریکیں ہیں آن کی تمام اشاعت اور پبلسٹی کی جائے ۔

یہ امر مسلّمہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر مل جل کر بہت ماری کا کام کرنے کی عادت نہیں اور نہ یہ تنظیم طلب امور کو سرانجام دینے کی زحمت گوارا کرسکتے ہیں ۔ لیکن مذکورہ تجاویز پر عملدر آمد کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اوّلین فرصت میں اس پر سوچ بچار کیا جائے!

(عربی سے ترجمہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ

کا ہر نقش اتباع و عمل کا مطالبہ

کرتا ہے

مولینا محمد منظور نعمانی

عبادتِ نبوی

محب مکرم ماہر القادری مدیر فاران کراچی کی اصرار کیساتھ فرمائش ہے کہ اُن کے "سیرت نمبر" میں بنا چیز بھی شرکت کرے۔ میرے حالات اور مصروفیات سے واقفیت رکھنے والے احباب ہی جانتے ہیں کہ اب کسی مضمون کا لکھنا میرے لئے کتنا مشکل ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ برسوں سے چند آیتوں یا چند حدیثوں کے ترجمے کے سوا "الفرقان" کیلئے بھی کچھ نہیں لکھ سکتا۔ لیکن ماہر صاحب اس زمانے کی شدید ترین اور غلیظ ترین گمراہی (فتنۂ انکار حدیث) کے خلاف جس ایمانی جوش و جذبہ کے ساتھ جہاد کر رہے ہیں اُس کی وجہ سے اُن کیساتھ دل کو ایسا تعلق ہو گیا ہے کہ اُن کے اصرار کے مقابلہ میں اپنی معذرت پر اصرار کرنے کو جی نہ چاہا۔ پھر توفیقِ الٰہی سے میرے لئے انہوں نے موضوع بھی ایسا تجویز کیا ہے کہ خود اپنے ذاتی نفع کے لئے مجھے اس پر لکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بہر حال جو کچھ بن پڑے گا لکھنے کے لئے قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ایسی کچھ باتیں لکھوائے جو لکھنے والے اور پڑھنے والوں کیلئے نفع مند ہوں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم

اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنِیْ رُشْدِیْ وَقِنِیْ شَرَّ نَفْسِیْ

ناظرین کو جیسا کہ عنوان سے معلوم ہو چکا ہے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "عبادت" پر لکھنا ہے۔ اس لئے سب سے پہلے عبادت کی حقیقت کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ "عبادت" کا اصل مادہ (ع ب د) ہے اور اصل عربی زبان میں اس کے معنی تذلل، انقیاد و اطاعت اور غلامی کے ہیں۔

لیکن جو عبادت دین کی ایک خاص اصطلاح ہے اور جس معنی میں عبادت نبویؐ اس مقالہ کا عنوان ہے۔ اُس سے مُراد وہ مخصوص تعظیمی اور تعبدی اعمال ہوتے ہیں جو کسی ہستی کو انتہائی مقدس اور بالاتر اور کن فیکونی اختیار و تصرف کا مالک سمجھ کر اُس کی رضا اور عنایت حاصل کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ جن کا کرنے والا اُن کے ذریعہ اپنے اُس معبود کی انتہائی عظمت و تقدسیت اور اُس کے حضور میں اپنے جذبۂ عبدیت اور اپنے عجز و تذلل کا مظاہرہ کرتا ہے۔

اہلِ علم اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ بہت سی اصطلاحات ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کا مفہوم عام طور سے صحیح سمجھا جاتا ہے لیکن ان کی منضبط اور جامع مانع تعریف مشکل ہوتی ہے۔ "عبادت" بھی اُن ہی دینی اصطلاحات میں سے ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ عام اہلِ علم بلکہ بہت سے عوام بھی عبادت کا مطلب صحیح سمجھتے ہیں۔ اور اپنی بول چال میں اس کو صحیح معنی ہی میں

استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس کی منضبط اور جامع مانع تعریف تلاش کرنے والے کو کتابوں میں بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بہت عرصہ ہوا حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا کہ عبادت کی جیسی منضبط اور منقح تعریف حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے ایسی کسی اور مصنف کی کتاب میں نظر سے نہیں گزری۔ کچھ دن ہوئے اس عاجز کو اس کی ضرورت پیش آئی کہ عبادت کی منضبط اور جامع مانع تعریف معلوم کی جائے۔ اپنی دسترس کی حد تک بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ حجۃ اللہ البالغہ کے باب "حقیقۃ الشرک" میں حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ اس سلسلہ میں حوالہ قلم فرمایا ہے۔ اس عاجز نے بھی اسی کو سب سے زیادہ منقح اور منضبط پایا۔ اوپر کی سطروں میں عبادت کے اصطلاحی مفہوم کی وضاحت میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ گویا حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کے بیان کی ترجمانی یا تلخیص ہے۔

الغرض عبادت سے مراد وہی خاص تعظیمی اور تعبدی اعمال ہیں جن کو ہمارے عرف عام میں "عبادت" کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور جن کے ذریعہ عابد اپنے معبود کے سامنے اپنی عبدیت اور بندگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تاکہ اس کی رضا و عنایت اور اس کا قرب اس کو حاصل ہو۔

البتہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، عبادت کے معنی مطلق انقیاد و اطاعت اور غلامی کے بھی ہیں اور اس لحاظ سے جو کام بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی رضا جوئی اور اخروی ثواب کی خاطر کیا جائے۔ اس کو اللہ کی عبادت کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مذکورۂ بالا اصطلاحی معنی کے لحاظ سے وہ عبادت نہ ہو۔ لیکن یہ لفظِ عبادت کا دوسرا اطلاق اور دوسرا استعمال ہے اور دونوں کو ایک سمجھ لینا یا دونوں کے فرق کو نظر انداز کر دینا بھاری غلطی ہے۔ جس سے بہت سی غلطیاں بلکہ گمراہیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں!

ان دونوں میں ایک واضح اور عام فہم فرق یہ بھی ہے کہ فرمانبرداری اور اطاعت اللہ کے حکم کے تحت دوسروں کی بھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور اولوالامر کی اطاعت کا خود اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ اسی طرح اولاد کو ماں باپ کی فرمانبرداری کا اور بیوی کو شوہر کی اطاعت و تابعداری کا حکم ہے۔ لیکن عبادت کی جو اصطلاحی حقیقت اوپر بیان کی گئی ہے اور عرف میں جس کو عبادت کہا جاتا ہے۔ وہ کسی حال میں اور کسی نیت اور کسی تاویل سے بھی اللہ کے سوا کسی کے لئے نہیں کی جا سکتی۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اللہ کا حکم یا اس کے قرب کا وسیلہ سمجھ کر ہی غیر اللہ کی عبادت کرے (اگرچہ وہ غیر اللہ نبی و رسول ہی کیوں نہ ہوں) وہ بلاشبہ مشرک ہوگا!

اصطلاحی عبادت کی حقیقت اور عبادت و اطاعت کے فرق کو سمجھنے کے لئے اس پر بھی غور کیجئے کہ انسان کے تعلقات اور معاملات کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ ایک تعلق وہ ہے جو اولاد کو مثلاً ماں باپ سے یا ماں باپ کو اولاد سے ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو بھائی کو بھائی سے یا ایک عزیز سے دوسرے عزیز کو ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو بیوی کو شوہر سے یا شوہر کو بیوی سے ہوتا ہے۔ ایک تعلق وہ ہے جو محکوم کو حاکم سے یا رعیت کو راعی سے ہوتا ہے۔ اس طرح ایک تعلق وہ ہے جو کسی قوم کے عوام کو اپنے محبوب لیڈروں سے یا کسی مخلص مرید کو اپنے دینی محسن اور مربی یعنی اپنے شیخ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک تعلق وہ ہے جو ایک امتی کو اپنے نبی سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تعلق بھی ایک درجہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں سے بعض بعض سے اہم اور اعلیٰ ہیں۔ لیکن ان سے اعلیٰ و بالا تعلق وہ ہے جو عبد یا عابد کو اپنے الٰہ اور معبود سے ہوتا ہے۔ اور یہ دراصل خالص قلبی اور روحی تعلق ہوتا ہے۔ (اور عبدیت اسی تعلق کا عنوان ہے) پس عابد اپنے اس تعلق کو اپنے معبود کے حضور میں جن تعظیمی اور تعبدی اعمال سے ظاہر کرتا ہے۔ ان ہی کو "عبادت" کہا جاتا ہے۔ اور انسان کے تمام

اعمال میں عبادت اسی لئے اعلیٰ اور اشرف ہے کہ اس کے ذریعہ دل اور روح کے مقدس ترین جذبہ اور مقدس ترین تعلق (عبدیت) کو ظاہر کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ خصوصیت اطاعت و فرمانبرداری کو یا کسی دوسرے عمل کو حاصل نہیں ہے!

عبادت کا اسی طرح کا ایک دوسرا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے علاوہ جو دوسرے اعمال بِرّ (نیکی اور ثواب کے کام) ہیں۔ مثلاً اخلاق حسنہ اور معاشرت عادلہ یا مثلاً نبوت کی نیابت اور دین کی نصرت کے سلسلہ کے کام دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ۔ اگرچہ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کے اوامر ہیں اور اپنے اپنے درجہ میں ان سب کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کے عمل کے وقت بندہ کا رُخ غیر اللہ کی طرف ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ بس اتنا ہی تعلق ہوتا ہے کہ با توفیق بندہ ان کاموں کو بھی اللہ کے حکم سے اور اُس کی رضا جوئی میں کرتا ہے۔ لیکن عبادت میں بندہ کے ظاہر و باطن کا رُخ صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہوتا ہے۔ اور اُس میں کسی دوسرے کا کوئی حصّہ اور کسی حیثیت سے بھی کسی کی کوئی شرکت نہیں ہوتی!

عبادت کی حقیقت اور اس کے امتیاز کو سمجھنے کے لئے اُس کے موضوع و مقصد پر بھی غور کر لینا چاہیئے۔

عبادت کا موضوع و مقصد

انسان اس دُنیا میں دو مختلف حیثیتوں کا حامل ہے۔ ایک حیثیت اس کی یہ ہے کہ دوسرے حیوانوں کی طرح اس کے ساتھ بھی حیوانی تقاضے اور بہیمی خواہشات لگی ہوئی ہیں اور اس حیثیت سے وہ گویا ایک بڑھیا اور ترقی یافتہ حیوان ہے۔

اور دوسری حیثیت اُس کی یہ ہے کہ اُس میں ملکوتیت اور نورانیت کا بھی عنصر ہے۔ جو در اصل ملاء اعلیٰ کا لطیفہ ہے اور اُس کی محبت اور چاہت کا مرکز اللہ تعالیٰ کی ذات مقدس ہے۔ اور اس حیثیت سے انسان اس زمین میں گویا عالم بالا کی ایک روحانی اور نورانی مخلوق ہے۔ اب انسان کی سعادت اور فلاح کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کی دوسری حیثیت پہلی حیثیت پر غالب اور حاکم رہے۔ جس کے نتیجہ میں زمین پر رہنے، بسنے اور اپنے فطری بہیمی تقاضوں کو پورا کرتے رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے اُس کا محبت و عبدیت کا تعلق اور ملاء اعلیٰ سے اُس کی مناسبت پوری طرح قائم رہے۔ بلکہ اس جہت میں وہ برابر ترقی کرتا رہے۔ اور اس کا خاص ذریعہ عبادات ہی ہیں - اور دین میں عبادات کے ایک خاص نصاب کی لازمی تشریع اور کثرت عبادت کی ترغیب کا یہ خاص راز ہے۔ اور بلاشبہ اگر عبادت صرف رسمی اور بے روح نہ ہو تو اُس کی یہ تاثیر اور افادیت بالکل بدیہی ہے!

اسی کے قریب اور اس سے ملتی جلتی ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ انسان کی فطرت میں جو روحانیت اور ملکوتیت کا حصّہ اور خدا طلبی کا جذبہ ودیعت رکھا گیا ہے۔ اس کا قدرتی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کو ملاء اعلیٰ سے اور اپنے ربّ قدوس سے وہ قرب میسّر ہو جو اس عالم میں ممکن ہے۔ اور اُس کا ذریعہ اس دُنیا میں عبادات ہی ہیں۔ "اذا قام احدکم یصلی فانہ یناجی ربہ"[1] اور "ابیت عند ربی"[2] جیسے ارشادات نبوی اسی حقیقت کے اشارات ہیں -

---

[1] یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ "تم میں کا کوئی شخص جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے۔

[2] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حال بیان فرمایا ہے کہ روزوں میں میرا وقت اپنے پروردگار کے پاس گزرتا ہے۔

عبادات کے متعلق یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا - ناظرین نے اُس سے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی ہوگی کہ "عبادت" جو دین کی خاص اصطلاح ہے اور جس کا غیر اللہ کے لئے کسی نیت اور کسی تاویل سے کرنا بھی شرک ہے - اُس سے وہی خاص تعظیمی اور تعبدی اعمال مراد ہیں جو عابد اپنے معبود کے حضور میں اپنی عبدیت کے اظہار کے لئے کرتا ہے اور جن کو عرفِ عام میں "عبادت" کہا جاتا ہے - نیز یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ انسان کے تمام اعمال میں عبادت ہی سب سے زیادہ عظیم الشان عمل ہے - کیونکہ وہ عابد کے اس مقدس قلبی اور روحی جذبہ کی عملی شکل ہے جو سارے تعلقات اور جذبات سے بالاتر ہے - اسی لئے اس میں کسی غیر کی شرکت کی، کسی تاویل اور کسی نیت سے بھی گنجائش نہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کے دوسرے اعمال کی یہ نوعیت نہیں ہے!

اس مسئلہ کی وضاحت اور تفصیل میں اس عاجز نے یہ چند سطریں لکھنا اس لئے ضروری سمجھا کہ ہمارے اس دور میں "عبادت" کی حقیقت اور اس کے اصطلاحی مفہوم کے متعلق بعض حلقوں میں چند ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جو بعض دوسرے بنیادی مسائل پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں - بلکہ یہ ناچیز اس موقع پر یہ اعتراف اور اعلان کرنا بھی ضروری سمجھتا ہے کہ چند روز ہوئے "الفرقان" کے ایک بہت پرانے پرچہ میں خود اپنی ایک تحریر ایسی نظر پڑی جس سے اس مسئلہ میں ناظر کو غلط فہمی ہو سکتی ہے - عبادت چونکہ دین کی ایک اہم اور بنیادی اصطلاح ہے - اس لئے ہماری کسی تعبیری غلطی سے اگر اس کے متعلق غلط تصور قائم ہو جائے تو توحید جیسے دین کے مرکزی مسئلہ کے متعلق تصور غلط ہو سکتا ہے اور اس سلسلہ کی غلطیوں کے بعض بڑے عبرتناک نمونے خود اس عاجز نے دیکھے ہیں اور اسی چیز نے یہاں ان سطروں کے لکھنے پر مجبور کیا - ویتوب اللہ علی من تاب -

---

عبادت کی مذکورۂ بالا تشریح و تنقیح سے ناظرین نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ اس مقالہ کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا کونسا گوشہ ہے - اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس موضوع پر اگر تفصیل سے لکھا جائے تو خاصی ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے - لیکن اس وقت تو "فاران" کے سیرت نمبر کے لئے چند صفحہ کا ایک مضمون لکھنا ہی پیشِ نظر ہے - اور لکھنے والا اپنے لئے یہ آسان اور بہتر سمجھتا ہے کہ ایک اجمالی مقالہ کی محدود گنجائش کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت سے متعلق کچھ متفرق مرویات اور معلومات کو بس یکجا کر کے ناظرین کی خدمت میں پیش کر دے - آئیے! اب اصل موضوع شروع کریں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فطری ذوقِ عبادت

اُوپر کی تمہیدی سطروں میں جیسا کہ ایک جگہ اشارہ کیا جا چکا ہے عبادت ہر پاکیزہ روح کی غذا اور ہر قلبِ سلیم کے لئے آرام اور چین کا وسیلہ ہے - اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس باب میں جو حال تھا اس کا کچھ اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کا نزول جب شروع بھی نہیں ہوا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادت کا بلکہ کسی چیز کا بھی کوئی حکم آپؐ کو نہیں ملا تھا تو آپؐ خود اپنے اندرونی جذبے اور تقاضے سے مجبور ہو کر سب سے الگ اور یکسو ہو کر مکہ کی آبادی سے کافی فاصلہ پر جبلِ نور کی بہت اونچی ایک چوٹی کے غار میں جا جا کر عبادت کیا کرتے تھے - صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں آغازِ نبوت کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی جو مفصل روایت ہے - اس کے الفاظ ہیں "وکان یخلو بغار حراء فیتحنث فیه وهو التعبد اللیالی ذوات العدد" جس کا مطلب یہی ہے کہ آپ سب سے یکسو ہو کر غارِ حرا میں کئی کئی دن معتکف رہتے تھے - اور اس تنہائی کے عالم میں صرف اللہ کی عبادت[1] میں مصروف رہتے تھے - یہاں تک کہ گھر بھی کئی کئی دن کے بعد تشریف لاتے تھے -

---

[1] کسی روایت سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس عبادت کا طریقہ کیا تھا - شارحین حدیث نے مختلف اقوال ذکر کئے ہیں - لیکن وہ سب قیاسات ہی ہیں - کوئی واضح اطلاع کسی کے پاس نہیں ہے!

میرے نزدیک آپؐ کے ذوقِ عبادت کا اندازہ کرنے کے لئے نبوت اور نزول قرآن سے پہلے کا آپ کا یہ معمول ہی کافی ہے۔

اس کے بعد نبوت کا دور شروع ہو گیا اور رسالت کی ذمہ داریاں آپؐ پر عائد ہو گئیں۔ جن کے لئے آپؐ کو وقت کا بڑا حصہ درکار تھا۔ نیز آپؐ کی زندگی کو اب اُمت کے لئے۔ یعنی مستقبل کی پوری انسانی نسل کے لئے اسوہ اور نمونہ بھی بننا تھا۔ اس لئے اب اس کی تو گنجائش نہیں رہی کہ سب سے الگ تھلگ رہ کر حراء جیسے کسی غار میں ہمہ وقت اپنے پروردگار کی یاد اور عبادت میں آپؐ مصروف رہ سکیں۔ چنانچہ اس کے بعد وحی الٰہی کی رہنمائی میں آپؐ کی عبادت کا ایک ایسا معتدل اور متوازن نظام قائم ہو گیا جس کے ساتھ سارے پیغمبرانہ کام بھی انجام پلتے رہیں اور اُمت کے لئے اس کی تقلید اور پیروی میں زیادہ زحمت اور مشقت بھی نہ ہو۔ دیکھنے والا اگر صحیح نظر رکھتا ہو تو آپؐ کی حیاتِ طیبہ اُس کو ایک نہایت جامع اور حسین و متوازن پیغمبرانہ زندگی نظر آئے گی۔ جس میں نماز، روزہ، اعتکاف، صدقات و قربانی، عمرہ و حج اور اذکار و دعوات جیسی تمام عبادات اپنی اپنی جگہ مختلف رنگ و بو رکھنے والے نہایت حسین و جمیل پھولوں کی طرح درخشاں ہیں۔ پھر ان سب میں چونکہ نماز سب سے اہم اور اکمل ہے۔ اس لئے آیئے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازہی کی کچھ باتیں کریں۔

نماز آپؐ کی روحِ پاک کی غذا
دل کا چین اور آنکھوں کی ٹھنڈک

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک کو نماز میں جو کیفیت اور لذت حاصل ہوتی تھی اور روحِ پاک کو جو لطیف و لذیذ غذا ملتی تھی، بلاشبہ اُس کا ادراک احساس تو اُن ہی بندگانِ خدا کا حصہ ہے جنہوں نے اس دولت سے کوئی حصہ پایا ہو اور اس کا کچھ ذائقہ کبھی چکھا ہو۔ "ذوق ایں مے نشناسی بخدا تا نچشی"۔ لیکن ہم جیسے عوام بھی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اور "ارحنی یا بلال بالصلوٰۃ" جیسے آپؐ کے ارشادات سے اُس کا کچھ نہ کچھ اندازہ کر ہی سکتے ہیں۔ جو خوش نصیب بندے اس دولت سے کچھ بہرہ ور ہوئے ہیں انہوں نے اپنی یافت اور اپنے تجربے کے مطابق اس اجمال کی تفصیل بھی اپنے کلمات میں کی ہے۔ مثلاً امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:۔

> "نماز است کہ راحت دہ بیماران است" ارحنی یا بلال" رمزیست ازیں ماجرا۔ "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اشارہ ایست بایں متمنیٰ ..... مصلی کہ از حقیقت نماز آگاہ است در وقت اداء صلوٰۃ گویا از تنگنائے دنیوی مے برآید و در دائرہ اخروی مے درآید لاجرم دریں وقت دولتے کہ مخصوص بآخرت است نصیبے ازاں فرامے گیرد و حظے از اصل بے شائبہ ظلیت بدست مے آرد۔ (مکتوب ۲۶۱ جلد اول)

نماز ہی بیمارانِ عشق و محبت کا چین و آرام ہے۔ حضورؐ کے ارشاد "ارحنی یا بلال" میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اور "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" میں بھی اسی مدعا کا اظہار ہے .... جو نماز پڑھنے والا نماز کی حقیقت سے آشنا ہے وہ نماز ادا کرتے وقت گویا اس دنیا کے دائرہ سے نکل کر ایک دوسرے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ پھر اُس کو اُس دولتِ عظمیٰ میں سے کچھ حصہ مل جاتا ہے جو آخرت کے ساتھ مخصوص ہے یعنی "اصل بے شائبہ ظلیت" ایک گونہ وصال و لقا میسر ہو جاتا ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

۱؎ "نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے"۔ یہ ایک حدیث کا ٹکڑا ہے۔ ۲؎ کبھی کبھی نماز کا وقت آجانے پر آپؐ حضرت بلالؓ سے یہ فرمایا کرتے تھے۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ بلالؓ اٹھو نماز شروع کر کے میرے دل کو چین و راحت پہنچاؤ۔

ان احدکم اذا قام فی الصلوٰۃ فانما یناجی ربہ۔ الحدیث

تم میں سے کوئی جب نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو اُس وقت اللہ تعالیٰ سے وہ اپنے دل کی باتیں کرتا ہے

(جمع الفوائد بحوالہ صحیحین ونسائی عن انس)

اس حدیث میں جس کیفیت کو "یناجی ربہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یقیناً اس کا اعلیٰ ترین درجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کی حالت میں حاصل ہوتا تھا۔ اور غور کرکے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہر چیز سے زیادہ پیارے اپنے رب سے اس بلا واسطہ مخاطبہ اور مکالمہ میں آپؐ کو کیسی لذت اور حلاوت ملتی ہوگی۔ اس کیفیت کے سمجھنے میں بھی امام ربانی ہی کا ایک اشارہ ہماری کچھ رہنمائی اور مدد کر سکتا ہے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:-

"بدانند کہ رتبۂ نماز در رنگ رتبۂ رویت است در آخرت، نہایت قرب در دنیا در نماز است ونہایت قرب در آخرت در حین رویت" (مکتوب ۱۴۷ ج ۱)

معلوم ہونا چاہیئے کہ دُنیا میں نماز کا درجہ و مقام وہی ہے جو آخرت میں دیدار الٰہی کا ہے۔ اس دُنیا میں بندہ کو مولا کا انتہائی قرب نماز ہی میں حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں انتہائی قرب دیدار کے وقت نصیب ہوگا۔

نماز کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبی تعلق کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہجرت سے پہلے طائف میں اور بعد کو اُحد کے معرکہ میں دشمنوں کے ہاتھ سے سخت سے سخت تکلیفیں پہنچنے پر بھی آپؐ نے اُن موذیوں کے حق میں بددعا نہیں فرمائی۔ بلکہ اُن کی ہدایت اور انجام بخیری کی دعا کی۔ لیکن غزوۂ احزاب میں جب دشمنوں نے ایک دن آپ کو نماز عصر پڑھنے کی مہلت نہ دی اور آپؐ کی وہ نماز اُس دن قضا ہوگئی۔ تو اتنی سخت بددعا زبان مبارک سے نکلی کہ اس سے سخت بددعا کسی کے لئے شاید سوچی بھی نہیں جا سکتی۔ حدیث کی کتابوں میں آپؐ کی اس بددعا کے الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں:-

حبسونا عن صلوٰۃ الوسطیٰ صلوٰۃ العصر ملاء اللہ بیوتھم وقبورھم ناراً۔ (بخاری ومسلم)

ان لوگوں نے ہمیں آج عصر کی نماز نہیں پڑھنے دی۔ اللہ ان کے گھروں اور ان کی قبروں کو آگ سے بھر دے۔

نماز میں روح پاک کو جو لذت وحلاوت ملتی تھی۔ اس کا اندازہ کرنے کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ آپؐ کے فیض یافتہ بعض صحابہ کرام کی اس حالت سے اُس کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس سلسلہ کے بہت سے قابل ذکر واقعات میں سے صرف ایک واقعہ یہاں یاد کر لیجئے۔ جو سنن ابی داؤد اور مسند احمد میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں خطرہ کے ایک موقع پر رات کو پہرہ دینے کے واسطے دو صحابیوں کو متعین فرمایا۔ اُن میں سے ایک مہاجر تھے دوسرے انصاری۔ ان صاحبوں نے ڈیوٹی کو نصفا نصف تقسیم کر لیا۔ یعنی طے کیا کہ ہر ایک آدھی آدھی رات پہرہ دے اور دوسرا اُس وقت سوئے۔ انصاری صحابی نے رات کے پہلے حصہ میں پہرہ دینا شروع کیا اور مہاجر ساتھی قرار داد کے مطابق سو گئے۔ پھر ان انصاری بزرگ نے خالی جاگنے کے بجائے یہ بہتر سمجھا کہ نماز میں مشغول رہ کر یہ وقت گزارا جائے۔ چنانچہ انہوں نے نماز

شروع کردی۔ دشمن کی جانب سے کوئی شخص آیا اور اس نے آدمی کھڑا دیکھ کر تیر مارا اور جب یہاں کوئی حرکت نہ ہوئی اور نہ کوئی آواز نکلی تو شاید یہ سمجھ کر کہ نشانہ خطا ہو گیا دوسرا اور پھر اسی طرح تیسرا تیر مارا۔ اور یہاں ہر تیر ان کے جسم میں پیوست ہوتا رہا اور یہ اس کو جسم میں سے نکال نکال کر پھینکتے رہے اور نماز میں مشغول رہے۔ پھر اطمینان سے رکوع کیا، پھر سجدہ کیا اور نماز پوری کر کے مہاجر ساتھی کو جگایا۔ انہوں نے اٹھ کر دیکھا کہ ایک نہیں تین تین جگہ سے خون جاری ہے۔ انہوں نے ماجرا پوچھا اور کہا کہ تم نے مجھے شروع ہی میں کیوں نہیں اٹھا دیا۔ ان انصاری بزرگ نے جواب دیا کہ میں نے ایک سورۃ (سورۂ کہف) شروع کر رکھی تھی۔ میرا دل نہ چاہا کہ اس کو ختم کرنے سے پہلے رکوع کروں۔ لیکن پھر مجھے یہ خطرہ ہوا کہ اگر اسی طرح پے بہ پے تیر لگتے رہے اور میں یونہی مر گیا تو حضورؐ نے پہرہ داری کی جو خدمت ہمارے سپرد کی تھی وہ فوت ہو جائے گی۔ اس خیال سے میں نے رکوع کر دیا۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو سورۃ ختم کرنے سے پہلے رکوع نہ کرتا اگرچہ مر ہی کیوں نہ جاتا۔"

تیر پہ تیر کھانے اور تین جگہ سے خون کا فوارہ جاری ہو جانے کے باوجود ان انصاری بزرگ کا نماز میں مشغول رہنا اور نماز کو مختصر کرنے کا بھی ارادہ نہ کرنا، نماز کے اندر کی جس لذت و حلاوت کا پتہ دیتا ہے یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اس میں اپنے ان انصاری خادم سے بدرجہا زیادہ تھا۔ بلکہ جو کچھ ان کو ملا تھا یا امت میں کسی کو بھی ملا ہو وہ آپؐ ہی کے فیض اور نسبت کا ایک ذرہ تھا۔

دن رات میں آپؐ کتنی نماز پڑھتے تھے

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس کے سامنے آجانے کے بعد اس میں تو کسی کو شبہ نہیں رہ سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوقات میں آپؐ کی روح پاک کے لئے سب سے زیادہ لذت و سرور کا اور قلب مبارک کیلئے انتہائی راحت و فرحت کا وقت وہی ہوتا تھا جب آپؐ نماز میں مشغول ہوتے تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر آپؐ کے قلب و روح کی خواہش یہی ہوگی کہ ہمہ وقت یا زیادہ سے زیادہ اوقات آپ نماز ہی میں مصروف رہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر بھی عرض کیا جا چکا ہے چونکہ منصب رسالت کے فرائض و وظائف، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت وغیرہ کی انجام دہی کے لئے آپؐ کے اوقات کا خاصکر دن کے وقت کا بڑا حصہ درکار رہتا۔ نیز آپؐ کی زندگی کو امت کے لئے نمونہ بھی بننا تھا۔ اس لئے آپ کے لئے ضروری ہوگیا کہ نماز میں صرف اتنے وقت مشغول رہیں کہ فرائض رسالت بھی پوری طرح ادا ہوتے رہیں اور امت کے لئے آپؐ کی تقلید و پیروی بھی بہت مشکل نہ ہو۔

نیز اس سے ملتا جلتا ایک اور سبب نماز جیسی عبادات میں آپؐ کے زیادہ مشغول نہ رہ سکنے کا یہ بھی تھا۔ کہ اگر آپؐ ایسا کرتے یعنی اپنے اوقات کے بڑے حصہ میں نماز میں مشغول رہتے تو آپؐ کی محبت اور تقلید میں یقیناً صحابہ کرام بھی ایسا ہی کرتے اور حکمت تشریع کا یہ اصول ہے کہ اگر پیغمبر اور اس کے متبعین کوئی عبادت اہتمام اور پابندی سے کرنے لگیں تو وہ اس امت پر فرض کر دی جاتی ہے۔ پس امت پر فرض ہو جانے کے اندیشہ کی وجہ سے بھی آپؐ نے نفل نمازوں

کی کثرت اور پابندی میں احتیاط فرمائی۔
بہرحال ان وجوہ سے دل کی چاہت کے باوجود آپؐ نفل نمازیں خاصکر دن کے اوقات میں بہت زیادہ نہیں پڑھتے تھے۔ گو بایہ آپ کا نرالا مجاہدہ تھا کہ دل کی طلب اور خواہش تو زیادہ سے زیادہ وقت نماز میں مشغول رہنے کی تھی۔ لیکن مذکورہ بالا اسباب و مصالح کی وجہ سے اپنے اس شوق کو آپؐ پورا نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح آپؐ نے اپنے دل کی چاہت کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور امت کی عام مصلحت پر قربان کر دیا تھا ؎

میلِ من سوئے وصال و میلِ او سوئے فراق　　ترک کار خود گرفتم تا برآید کار او

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز چاشت کی مختلف موقعوں پر بڑی بڑی فضیلتیں بیان فرمائیں۔ لیکن خود پابندی سے آپؐ نے یہ نماز نہیں پڑھی۔ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے ایک اصولی بات فرمائی ہے۔ صحیح بخاری میں ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

ان کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لیدع العمل وھو یحب ان یعمل بہ خشیۃ ان یعمل بہ الناس فیفرض علیھم۔ (باب تحریض النبی صلی اللہ علیہ وسلم علی قیام اللیل والنوافل)

اسی کو حافظ ابن القیمؒ زاد المعاد میں لکھتے ہیں:۔

وقد کان یترک کثیراً من العمل وھو یحب ان یعمل بہ خشیۃ المشقۃ علیھم[۱]

اور آپؐ ترک فرما دیا کرتے تھے، بہت سے اعمال حالانکہ وہ اعمال آپؐ کو بہت محبوب ہوتے تھے صرف اُمت کی دقت کے خیال سے۔

بہرحال یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے آپؐ دل کی چاہت کے باوجود نفل نمازیں بہت زیادہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ محققین نے تمام روایات کی چھان بین کے بعد لکھا ہے کہ اہتمام اور پابندی سے آپ شب و روز میں صرف چالیس۴۰ رکعت نماز پڑھتے تھے۔ سترہ۱۷ رکعت فرائض پنجگانہ، اور دس۱۰ یا بارہ۱۲ رکعت رواتب (یعنی موکدہ سنتیں) جن کی تفصیل یہ ہے کہ فجر سے پہلے دو۲ رکعت، ظہر سے پہلے دو۲ رکعت یا چار رکعت (دونوں ثابت ہیں)، ظہر کے بعد دو۲ رکعت، مغرب کے بعد دو۲ رکعت۔ عشاء کے بعد دو۲ رکعت۔ یہ کل دس۱۰ یا بارہ۱۲ ہوئیں۔ اور تہجد مع تین رکعت وتر کی گیارہ۱۱ رکعت یا تیرہ۱۳ رکعت۔ (دونوں ثابت ہیں) ان کی میزان چالیس ہوئی۔ الغرض دن رات میں یہ چالیس رکعتیں تو آپؐ عموماً اہتمام اور پابندی سے ادا فرماتے تھے[۲] ان کے سوا نوافل میں نماز چاشت اور زوال آفتاب کے وقت کی چار رکعتیں پڑھنا بھی متعدد صحابہ نے روایت کیا ہے۔
ان کے علاوہ خاصکر دن میں زیادہ نوافل جیسا کہ عرض کیا گیا۔ آپؐ اسی لئے نہیں پڑھتے تھے کہ اُمت پر زیادہ بوجھ نہ پڑ جائے۔ نیز ذاتی اور خانگی ضروریات اور منصب رسالت کے دوسرے کاموں سے دن میں آپؐ کو زیادہ مہلت بھی نہیں ملتی تھی۔ اسی کو قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:۔

انّ لک فی النّھار سبحاً طویلاً ؕ

---

[۱] زاد المعاد صـ۱۹۳۔ برحاشیہ زرقانی جلد دوم۔
[۲] زاد المعاد صـ۳۱۴-۳۱۵ برحاشیہ زرقانی جلد اول۔

آپ کی رات کی نماز

رات چونکہ عام طور سے خلوت میں یعنی گھر کے اندر گزرتی تھی اور دوسرے کاموں سے رات میں فراغت و فرصت بھی ہوتی تھی۔ اس لئے رات کی نماز یعنی تہجد آپ اکثر بہت طویل پڑھتے تھے یہاں تک کہ آپ کے پاؤں پر ورم آجاتا تھا۔ صحیحین میں حضرت مغیرہ بن شعبہ سے مروی ہے۔

قام النبی صلی اللہ علیہ وسلم حتی تورمت قدماہ فقیل لہ لم تصنع ھذا وقد غفرلک ماتقدم من ذنبک وماتاخر قال افلا اکون عبداً شکوراً (جمع الفوائد و مشکوٰۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیام فرمایا۔ یہاں تک کہ آپ کے دونوں پاؤں ورم کر آئے۔ آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ اتنا قیام کیوں فرماتے ہیں درآنحالیکہ آپ کی تو اگلی پچھلی سب چیزوں کی معافی دے دی گئی ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا میں عبد شکور نہ ہوں۔

حضرت حذیفہؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کی نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ تو آپ نے چار رکعتوں میں سورۂ بقرہ۔ سورۂ آل عمران۔ سورۂ النساء۔ اور سورۂ مائدہ (یا بجائے مائدہ کے سورۂ انعام)[1] پڑھیں۔ گویا قریباً سوا چھ سپارے پڑھے۔ (ابو داؤد)

اور حضرت حذیفہ ہی کی ایک روایت میں جو صحیح مسلم میں بھی ہے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ رات کی نماز میں آپ نے یہ لمبی لمبی سورتیں اس طرح پڑھیں کہ جہاں کوئی ایسی آیت آتی جس میں اللہ کی تسبیح کا ذکر ہوتا تو وہاں آپ اللہ کی تسبیح کرتے اور جہاں سوال اور دعا کا ذکر آتا تو وہاں آپ دعا کرتے اور جہاں دنیا یا آخرت کی کسی بلا سے پناہ مانگنے کا ذکر آتا تو وہاں آپ اللہ سے پناہ مانگتے نیز اس روایت میں یہ بھی ہے کہ اس نماز میں جس قدر طویل آپ نے قیام کیا اسی کے قریب قریب آپ نے رکوع و سجود بھی کئے جب[2] غور کرکے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ نماز کتنی طویل ہوئی ہوگی۔

اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ "ایک رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ آپ نے اتنی طویل نماز پڑھی کہ میرے لئے آپ کے ساتھ کھڑا رہنا سخت مشکل ہوگیا اور میرے دل میں ایک برا خیال آنے لگا۔ کسی نے پوچھا کیا برا خیال آنے لگا تھا؟ آپ نے فرمایا۔ خیال یہ کہ میں بیٹھ جاؤں اور آپ کو کھڑا چھوڑ دوں۔"[2]

صحابہ کی ان روایات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کی رات کی نماز کس قدر طویل ہوتی تھی۔ لیکن یہ آپ کا ایسا دوامی معمول نہ تھا جس کے خلاف کبھی نہ ہوتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو امت کے لئے آپ کی تقلید و پیروی سخت مشکل ہوجاتی۔ اس لئے کبھی کبھی آپ ایسا بھی کرتے تھے کہ رات کو کافی آرام بھی فرماتے اور باقی وقت میں تہجد پڑھتے۔ کبھی صرف آخری تہائی رات ہی میں تہجد پڑھتے۔ کبھی پہلے سوتے اور آخر میں اٹھ کر تہجد پڑھتے اور کبھی اس کے برعکس بھی کرلیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی کرتے کہ اٹھے دو رکعتیں پڑھیں پھر کچھ دیر کے لئے سوگئے پھر اٹھ کر دو رکعتیں پڑھیں۔ اسی طرح بار بار سوئے اور بار بار اٹھ کر نماز پڑھی۔ ایسا آپ نے اسی لئے کیا کہ امت کے ضعفاء بھی آپ کی پیروی کرسکیں۔ ورنہ جیسا کہ عرض کیا گیا آپ کا اصل ذوق اور آپ کے دل کی چاہت یقیناً یہی ہوگی کہ ساری رات نماز ہی میں کھڑے رہیں۔ اسی میں آپ کے دل کا چین تھا۔ اور اسی میں روح کی

---

[1] سورۂ مائدہ اور سورۂ انعام کے بارے میں یہ شک حدیث کے ایک راوی شعبہ کو ہوگیا ہے۔

[2] یہ سب روایات جمع الفوائد باب صلوٰۃ اللیل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

راحت اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھی ؎

ہمارا شغل ہے راتوں کو رونا یادِ دلبر میں ہماری نیند ہے محوِ خیالِ یار ہو جانا!

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ رات کی نماز میں کسی آیت پر پہنچکر آپ پر کوئی خاص کیفیت طاری ہو گئی اور پھر ساری رات اللہ کے حضور میں کھڑے آپ وہی ایک آیت پڑھتے رہے۔ چنانچہ مسند احمد اور مسند بزار میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات کی نماز میں برابر سورۂ مائدہ کے آخری رکوع کی یہی ایک آیت پڑھتے رہے۔[1]

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (جمع الفوائد)

بعض صحابہ کرام کا بیان ہو کہ ہم نے دیکھا کہ نماز کی حالت میں گریہ و بکا کے غلبہ سے آپ کے سینۂ مبارک سے چکی چلنے کی سی ایک آواز نکلتی تھی۔ سنن ابی داؤد میں عبداللہ بن الشخیرؓ کی روایت کے الفاظ ہیں:۔

رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم يصلي وفي صدره ازيز كازيز الرحى من البكاء

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا اور اس وقت آپ کے سینۂ مبارک سے گریہ کے اثر سے چکی کی سی آواز نکلتی تھی۔ (ابوداؤد باب البکاء فی الصلوٰۃ)

(افسوس ہے کہ فاضل مقالہ نگار کی ناسازیٔ طبع)
کے سبب یہ مقالہ نامکمل رہ گیا۔
(م۔ق)

---

[1] قرآن مجید میں یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک معذرت کے ضمن میں آئی ہو۔ مطلب یہ ہو کہ اے اللہ اگر آپ میری امت کو عذاب میں ڈالنے کا فیصلہ کریں تو آپکو اس کا پورا حق ہو آپ مالک ہیں اور وہ آپکے بندے ہیں۔ اور اگر آپ اپنے کرم سے ان کو بخش دیں تو آپ ایسا بھی کر سکتے ہیں کہ آپ زبردست اور حکیم و دانا ہیں۔ آپ جو فیصلہ بھی فرمائیں گے وہ قدرت و حکمت کا آئینہ دار ہی ہوگا۔

گل ہائے تازہ

- پروفیسر ضیاء احمد بدایونی۔
- اسد ملتانی۔
- عاصی کرنالی۔
- نعیم صدیقی۔
- سیماب اکبر آبادی۔
- عاصم جے پوری۔
- علی اختر۔
- سید محمد عبدالرشید فاضل
- ضیاء القادری (بدایونی)
- فضا ابن فیضی
- شفیق جونپوری۔
- زائر حرم حمید صدیقی
- ابوالبیان حماد۔
- تاج الدین احمد رام نگری۔
- ادیب سہارنپوری۔
- منظر صدیقی اکبر آبادی۔
- محمد علی اثر رامپوری۔
- بشیشور پرشاد منور لکھنوی۔
- یوگندر پال صابر۔
- بال مکند عرش ملسیانی۔
- چاند بہاری لال صاحب صبا ماتھر جے پوری
- عبدالکریم ثمر۔
- سردار احمد سیف خیر آبادی۔
- ابوالمجاہد زاہد
- عزیز حاصل پوری
- منظر کلیمی۔

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی -

عہدِ سعادت کا ایک واقعہ

ہدیتہً کوئی خاتون لائیں ایک چادر
حبیبِ پاکِ خداوندِ ذوالمنن کے لئے

کیا قبول اُسے سرورِ دو عالم نے
کہ احتیاج تھی یاں پوششِ بدن کیلئے

غلافِ کعبہ کی صورت نہ کیوں عزیز ہو وہ
کیا پسند جسے شہ نے پیرہن کیلئے

معاً طلب پہ عطا کی وہ اک صحابی کو
کہ معذرت تھی نہ شایاں خوئے زمن کیلئے

سوال رد نہیں کرتے کسی کا اہلِ کرم
سحابِ فیض ہے اُن کا ہر اک چمن کیلئے

یہ بات سُن کے ہوئے اُن پہ طعنہ زن اصحاب
کہ ہے محل کی ضرورت ہر اک سخن کیلئے

وہ بولے خلعتِ شاہی سے بڑھ کے ہے یہ لباس
کہ لیا ہے میں نے بڑے چاؤ سے کفن کیلئے

اسد ملتانی

فیضِ رسالت

گماں پہ فتح اگر قوتِ یقیں سے ملی
یقیں کی دولتِ بیدار ہم کو دیں سے ملی

عرب کی خاک کی ممنون کیوں نہ ہو دنیا
کہ دیں کی نعمت اسی پاک سرزمیں سے ملی

ہدایت ایسی جو کافی رہے قیامت تک
خدائے پاک کے پیغامِ آخریں سے ملی

ہوئی رسول سے ملت کو زندگی حاصل
اگرچہ فرد کو جاں جان آفریں سے ملی

محمدِ عربی سے ہے آبروئے جہاں
کہ اس مکان کو عزت اسی مکیں سے ملی

نمونہ سب کیلئے ہے نبیؐ کی سیرت میں
کہ جو نظیر بھی ڈھونڈی گئی یہیں سے ملی

ذرا بھی حشر و جزا و سزا میں شبہ نہیں
کہ یہ خبر ہمیں اک صادق و امیں سے ملی

زمیں پہ جھک کے جو عرشِ بریں پہ پہنچی تھی
ہمیں بلندیٔ مقصد اسی جبیں سے ملی

خدا کے واسطے جینا بھی اور مرنا بھی
یہ تربیت عجب اندازِ دل نشیں سے ملی

اسی طرح سے رہا ہے یہ سلسلہ جاری
کہ ہم نشیں کو یہ تعلیم ہم نشیں سے ملی

بھلا کسے تھی تمیزِ حقوقِ انسانی
یہ مصطفےٰ ہی کے اعلانِ آخریں سے ملی

عطا ہوا جو نظام اب کبھی نہ بدلے گا
تسلی اس کی ہمیں ختمِ مرسلیں سے ملی

اسد فیوضِ درِ مصطفےٰ کا کیا کہنا
بشر کو جو بھی سعادت ملی یہیں سے ملی

عاصی کرنالی

فتحِ مکہ

خطبۂ فتح سے فارغ جو ہوئے سرورِ دیں
سرورِ دیں، شہِ لولاک، رسولِ دوجہاں

نگہِ پاک اُٹھی جانبِ یارانِ طریق
نگہِ پاک کہ ہے قبلۂ صاحب نظراں

قائم اس طرح تھیں اربابِ عقیدت کی صفیں
جیسے تا حدِ نظر سلسلۂ کوہِ گراں

ان میں ہر ایک تھا خورشیدِ رسالت کی کرن
آج بھی جو ہے جبینوں کے افق پر تاباں

ان میں ہر ایک تھا گلزارِ نبوت کی شمیم!
جس سے اب تک ہے معطر نفسِ کون و مکاں

یہ صحابہؓ تھے کہ تسلیم و رضا کا مظہر
یہ صحابہؓ تھے کہ ایثار و اطاعت کا نشاں

یہ مسلماں تھے کہ ایمان و یقیں کا پیکر
یہ مسلماں تھے کہ اخلاص کا دل، صدق کی جاں

صفحۂ دہر پہ آیاتِ الٰہی تھے یہ لوگ
ان کا ایک ایک عمل شرحِ حدیث و قرآں

جاں نثاروں کے پرے، اہلِ وفا کی فوجیں
بزمِ خیر و برکت، قافلۂ امن و اماں

وہیں اک گوشے میں استادہ تھے کفارِ قریش
سرنگوں، خوار، سبک سار، ہراساں، لرزاں

ان کی بے رنگ جبینیں تھیں کہ تصویرِ شکست!!
ان کے اترے ہوئے چہرے تھے کہ نکبت کا سماں

ان کی جھکتی ہوئی نظریں تھیں کہ ٹوٹے ہوئے تیر
ان کی رکتی ہوئی ابرو تھی کہ بوسیدہ کماں

ان میں سرکش بھی تھے، باغی بھی تھے، جابر بھی تھے
آتشِ شعلہ زن و صاعقۂ شعلہ فشاں

ہر کوئی کعبۂ توحید کا استادہ صنم
ہر کوئی جادۂ اسلام میں اک سنگِ گراں

تیغِ جلاد کو ہو حکم کہ سر اڑ جائے
ایک جھٹکے میں الگ جسم سے ہو رشتۂ جاں

خود ان اعدا کو یہ کھٹکا تھا کہ اب قتل ہوئے
حرفِ ارشاد ہوا [illegible]

اپنے اعمال کی پاداش پہ تھی سب کی نظر
کہ گہر بار ہوئی رحمتِ عالم کی زباں

جنبشِ لب تھی کہ اک عفو و کرم کا مژدہ
جس کا تاریخِ سیاست پہ ہے ابتک احساں

نعیم صدیقی

محسنِ انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم)

عالمِ خاک میں اک حشر اٹھانے والے
موت کی نیند سے مُردوں کو جگانے والے

آدمی زادہ درندوں کی بھری دنیا میں
آب و گِل سے نیا انسان بنانے والے

شبنمِ گریۂ پُرسوز کے چھینٹے دے کر
ریگزاروں سے گل و لالہ اگانے والے

تو نبوت کے قصیدے کا مقدس مقطع
دیں کی تکمیل کا پیغام سنانے والے

دو زمانوں کو جدا کرتی ہے تیری ہستی
آخری دور کے آغاز میں آنے والے

خاک اور نور کو پھر ربط دیا ہے تو نے
عرش سے فرش کا پھر جوڑ لگانے والے

ذکر اور فکر کو ترکیب و توازن دے کر
دین و دنیا کو پھر اک بار ملانے والے

اک طرف صبر سے ہر ظلم کو برداشت کیا
اک طرف جبر سے فتنوں کو دبانے والے

اک طرف عقل کے آئین بتائے تو نے
اک طرف عشق کے آداب سکھانے والے

سیلِ تہذیب کا رخ موڑ دکھایا تو نے
بند تاریخ کے آگے سے ہٹانے والے

ایک ہی صف میں کھڑا کر کے بڑوں چھوٹوں کو
بندہ و آقا کی تفریق مٹانے والے
پورے کونین کا خود راج دلارا ہو کر!
اپنے خادم کو بھی پہلو میں بٹھانے والے
ایک ہی سجدۂ تسلیم کی دے کر تعلیم
سینکڑوں سجدوں سے انسان کو بچانے والے
پست فطرت، کہ جو روٹی کے لئے جیتے تھے
اُن کو اِک مقصدِ اعلیٰ پہ لگانے والے
وہ جو ہر بُت کی رضا کے لئے مرمٹتے تھے
راہِ حق میں انھیں مرمٹنا سکھانے والے
حق و باطل میں گوارا نہ ہُوا سمجھوتہ
کفر و اسلام کو آپس میں لڑانے والے
بھیڑ، بکری سے بھی جو پست تھی، اس عورت کو
مجد و عزت کی بلندی پہ بٹھانے والے
وہ جو بازیچۂ تفریح تھی ہر کوچے میں
اُس کی عصمت کو درندوں سے چھڑانے والے
وہ جو اک شعلۂ عریاں رہی چوراہوں پر
اُس کو فانوس کے پردے میں سجانے والے
اہلِ محنت کے مصائب پہ پگھلنے والے
اور سرمایہ کو احسان سکھلانے والے
تُو نے آقاؤں کو احساسِ مروت بخشا
اے غلاموں کو غلامی سے چھڑانے والے
ایک اک سائل و محروم کے زخمِ دل پر
مرہمِ شفقت و احسان لگانے والے
اے جہاں بھر کے یتامیٰ و ایامیٰ کے ولی
اُن کی دل جوئی میں گھر تک کو لٹانے والے
جس کو دُنیا میں کہیں سے نہ ملے رحم کی بھیک
کام ہر بیدل و ناچار کے آنے والے
اک نئی ملتِ انسان کو برپا کر کے
اک نئی جنتِ اخلاق بنانے والے
عینِ فطرت کے تقاضوں پہ ہے جس کی بنیاد
زندگی کا وہ نظام آ کے چلانے والے
کوثرِ شوق سے پیمانوں کو لبریز کیا
خُم کے خُم بادۂ زمزم کے لُٹانے والے
نوعِ انسان کو فاقے سے بچانے کے لئے
سُوکھے ٹکڑوں کو غذا اپنی بنانے والے
قوم کو خلعتِ اعزاز پہنانے کے لئے
خرقۂ پاک میں پیوند لگانے والے
چین کی نیند زمانے کو سُلانے کے لئے
رات بھر نیند مُصلّے پہ اُڑانے والے
جو ترے قتل کے درپے رہے دشمن بن کر
زندگی کے انھیں اسرار بتانے والے
مکّہ کی گلیوں میں کانٹوں کی چُبھن سہتے ہوئے
پھول ہی پھول تکلّم میں لُٹانے والے
"یہ تو شاعر ہے!" "یہ کاہن ہے!" "یہ دیوانہ ہے!"
گالیاں سُن کے بھی قرآن سُنانے والے
اک نئے دین کے گھڑنے کا اُٹھا کر الزام
رمزِ توحیدِ براہیم بتانے والے
کلمۂ حق کا سُناتے ہوئے کھا کر پتھر
"اھدِ قومی" کی صدا پھر بھی اُٹھانے والے
ایڑیوں پر سے ٹپکتا تھا لہو ماتھے کا
پھر بھی اللہ کی رحمت کو بُلانے والے
زندگی تیری نمونہ، تری سیرت معیار
سکّۂ تہذیب و تمدّن کا چلانے والے
صاحبِ خیرِ کثیر، آیۂ حق، رحمتِ حق!
پُورے ماحول کو پاکیزہ بنانے والے
پھر ترے ابرِ کرم کی ہے یہ دُنیا پیاسی
راہ تکتے ہیں تری پھر سے زمانے والے

سیماب اکبر آبادی:-

ساقیٔ بزم کائنات، قاسم کیفِ بیخودی
آیۂ رحمت و نجات، عقدہ کشائے زندگی
غازۂ مہرِ تابناک، ہے تری رہگذر کی خاک
ذرۂ آستانِ پاک کوکبِ افسرِ شہی
کان جب آشنا نہ تھے، نغمۂ صبحِ عرش سے
ظلمتِ کفرزار میں پہلی اذان تو نے دی

ے نور کی راتوں کی ضیا احمدِ مختار
اے صبحِ درخشانِ حرا احمدِ مختار
ے طائف و بطحا کے دل افروز اجالے
اے ماہِ منیٰ، مہرِ صفا احمدِ مختار
باطن میں امیر الامرا، فخرِ سلاطیں
ظاہر میں غریب الغربا احمدِ مختار
یغمبرِ توحید و سرا پردۂ وحدت
خود قبلہ و خود قبلہ نما احمدِ مختار
ود کاشفِ اسرار، خود اسرارِ حقیقت
خود عقدہ و خود عقدہ کشا احمدِ مختار
وابستہ بہ مخلوق نظر بستہ بہ خالق
اک بام پہ موجِ دو ہوا احمدِ مختار
کثر دلِ مجبور سے آتی ہے اک آواز
جیسے کوئی کہتا ہو کہ "یا احمدِ مختار"
یماب مآلِ گنہِ زیست کا ضامن
یا "ایزدِ غفار" ہے یا احمدِ مختار

عاصم جے پوری:-

ذاتِ احد کا مظہر احمد، صلی اللہ علیہ وسلم
بے حد کی گویا اک سرحد، صلی اللہ علیہ وسلم

اُن کی صورت رحمتِ عالم، عالمِ رحمت سیرت اُن کی
اللہ اللہ شانِ محمدؐ۔ صلی اللہ علیہ وسلم

عالمِ ہُو گہوارہ اُن کا، لوح و قلم نظارہ اُن کا
کُن اُن کی تقریبِ آمد، صلی اللہ علیہ وسلم

روئے منوّر مطلعِ عرفاں، لب تفسیرِ سورۂ رحمٰن
آنکھیں چشمۂ فیضِ سرمد، صلی اللہ علیہ وسلم

طورِ تجلّی اُن کا سینہ، زنگِ دوئی سے دل آئینہ
تن سرتاپا روحِ مجرد، صلی اللہ علیہ وسلم

ابرو آیاتِ سربستہ۔ خالِ سیہ اک دلکش عقدہ
گیسو شرحِ رازِ معقد، صلی اللہ علیہ وسلم

وہ اندازِ محبت افزا، غیرتِ حسنِ خوابِ زلیخا
وہ نقشہ وہ سج دھج وہ قد، صلی اللہ علیہ وسلم

چُپ بھی اُن کی رازِ مَعَ اللہ، طرزِ سخن بھی وحیٌ یُوحیٰ
ہر بات اُن کی باید و شاید، صلی اللہ علیہ وسلم

ختمِ رسل، حامیٔ اُمّت، ساقیٔ کوثر، قاسمِ جنّت
اُن کا صدقہ عیشِ مخلّد، صلی اللہ علیہ وسلم

کنج لحد سے تا صفِ محشر، ہیں جو خطرے جو غم جو ڈر
نامِ گرامی اُن سب کا رد، صلی اللہ علیہ وسلم

اُن کا نام زباں پر آنا۔ جانِ حزیں کا تسکیں پانا
اُن کی یاد حیاتِ ممتد، صلی اللہ علیہ وسلم

غارِ حرا سے عرشِ معلّیٰ تک، حرفِ دعا انفاسِ مبارک
بخششِ اُمّت اُن کا مقصد، صلی اللہ علیہ وسلم

بندوں کو مولائی دیدی۔ لیکن اپنی حالت یہ تھی!
رہن ہے جَو کے بدلے چلقد، صلی اللہ علیہ وسلم

زیرِ قدم اقلیمِ اَسْرَا، برکفِ دست اِنَّا اَعْطَیْنَا
مالکِ مِلکِ ابیض و اسود، صلی اللہ علیہ وسلم

عاصم ایک گدا ہے اُن کا، اور گدا کا تحفہ ہی کیا
البتہ صلوٰۃِ بے حد، صلی اللہ علیہ وسلم

علی اختر:

سینۂ بحر میں ہنوز موج نہ تھی سبک خرام!
خاک کے اس کُرّے میں تھا نقشِ حیات ناتمام

عرصۂ کائنات کی آنکھ ابھی کھلی نہ تھی
شب نے ہلا رہا تھا گو بادِ سحر کا اہتمام

عارضِ صبح میں نہ تھیں حُسن کی یہ لطافتیں
ایسی حیات آفریں تھی نہ ابھی بساطِ شام

خاکِ عرب ترے نثار دونوں جہاں کی نعمتیں
تُو نے کچھ اور کر دیا بزمِ حیات کا نظام

ارض و سما کے رازِ خلق، کون و مکاں کے بادشاہ
تجھ پہ درود بے شمار، تجھ پہ ہزار ہا سلام

سیّدِ افضل الکرام جان و جہاں ترے نثار
سرورِ صاحب الجمال قیصر و جم ترے غلام

دہر کے خاکداں کو تھی جس کی ازل سے جستجو
تُو نے ہمیں عطا کیا عیشِ ابد کا وہ مقام

اے نبی العربی بادشہ کون و مکاں
تیرے صدقہ میں ہوئی خاک بھی اک جنسِ گراں

تجھ سے پہلے بھی یہی ارض و سما تھے لیکن
عقل تھی بے خبر رازِ وطرازِ عرفاں

تُو نے کھولے نگہ دہر پہ اسرارِ حیات
تُو نے بخشے دلِ انساں کو حقائق کے جہاں

تُو نے اندھوں کو بصیرت کے حقائق سمجھائے
تُو نے بوڑھوں کو دیا ولولہ عزمِ جواں

ہاں! تری ذات زمانہ کے لئے رحمت ہے
ہے ترے نام سے وابستہ سکونِ دوراں

سید محمد عبدالرشید فاضل ایم اے پروفیسر اردو کالج کراچی

اے تیری ذات مہرِ درخشانِ کائنات
جاری ہیں ذرہ ذرہ میں تیری تجلیات

پیمانہ دارِ بادۂ نیرنگیٔ ازل
سرمایہ دارِ خوبیٔ رنگِ تعلقات

جب دردِ لاعلاج نے گھیرا بُری طرح
لایا جہاں کے واسطے وہ نسخۂ حیات

جس کا ہر ایک لفظ چراغِ رہِ عمل
جس کے ہر ایک حرف میں آیاتِ بیّنات

ویراں پڑی ہوئی تھی یہ دنیا کی رہ گزار
آباد ہو گیا تھا جہانِ تخیلات

باطل کا چل رہا تھا وہ افسونِ دلفریب
حق ہو چکا تھا دہر میں از قسمِ مہملات

کایا پلٹ دی تُو نے مگر اس جہان کی
دکھلایا حق اٹھا کے حجابِ توہمات

پست و بلند یعنی زمین اور آسماں
کس واسطے بنے ہیں یہ آباد و امہات

کیوں غیب کی شہود میں ہیں جلوہ ریزیاں
کیوں عینِ حق بنا ہے حجابِ تعینات

کس کا جمال تھا شبِ معراج کی ضیا
کس نے اٹھایا بڑھ کے حجابِ حریمِ ذات

ذاتِ خدا سے کس نے کیا آشنا ہمیں
کس سے قدم مثال ہوا ممکنِ صفات

باقی رہی نہ بندہ و آقا میں کچھ تمیز
قائم رہے نہ نسل و وطن میں تخصصات

وہ شاطرِ بساطِ خودی ہو گیا جہاں
فرزیں بھی بادشاہ سے کھاتا نہیں ہے مات

ہاتھ آ گیا وہ جذبۂ کردار کا عمل
آساں تمام ہو گئیں دنیا کی مشکلات

القصہ ہو گیا یہ جہاں کلفتوں سے پاک
کیونکر نہ ہو کہ رحمتِ عالم ہے تیری ذات

ہے لازوال تیرے فرامیں کا حرف حرف
کتنے ہی انقلاب ہوں کتنے ہی حادثات

تیری نظیر ممتنع روزگار ہے
ثانی ہو تو جہان میں اوّل خدا کی ذات

ممکن نہیں نبی ہو ترے بعد حشر تک
گر ہو کوئی تو ہیں یہ زمانے کے مفسدات

فاضل مقام نعت ہے، شاعری نہیں
کم کیجئے یہاں تگ و تازِ تخیلات

ضیاء القادری (بدایونی)

محبوب الٰہی کی اُلفت جس دل میں بھی پائی جاتی ہے
ہر سانس میں اللہ اللہ کی ہر قلب سے آواز آتی ہے

خوشی کے ترانے صبا گا رہی ہے
مدینہ کی منزل قریب آ رہی ہے

مدینہ سے بادِ بہار آ رہی ہے
چمن در چمن پھول برسا رہی ہے

ہے پیشِ نظر اب جو روضہ نبی کا
نظر اپنی قسمت پہ اِترا رہی ہے

ضیاؔ کیوں نہ ہو قلب روشن کہ اس میں
شبیہِ نبی جلوہ آرا رہی ہے

فداؔ ابن فیضی:-

اے تیری بارگاہ میں روح الامیں سفیر
اے تجھ سے خود زبانِ خداوند ہم کلام

اے تیری بزم بو ذر و سلماں سے ہمکنار
اے تیرے لب پہ وشِ کناں وحی کے پیام

اے حاملِ رسالتِ محکم، تجھے سلام
اسلام کے پیمبرِ اعظم، تجھے سلام

لاسے کر دے کے ذوقِ جسنگاودئی حیات
شبنم سے تو نے رازِ گلستاں کیا ہے فاش

قرباں تری اداؤں کے، دستِ خلیلؑ سے
آذر کے آئینے کو کیا تو نے پاش پاش

اے امتزاجِ شعلہ و شبنم، تجھے سلام

ترتیب دے کے دانش و دیں کے اصول تو
اسرارِ زندگی کو نمایاں بنا دیا

پھونکی وہ روح تو نے ضمیرِ حیات میں
انساں کو اصل معنوں میں انساں بنا دیا!

تہذیبِ زندگانیٔ آدم، تجھے سلام

اے تیری ہر نگاہ ہے اک دفترِ الست
اے تیرا حرف حرف ہے توراتِ آگہی

لرزاں ترے اشارۂ ابرو پہ کائنات
اے تو نے دی جہاں کو زبورِ خدا رسی

اے کاشفِ نگارشِ مبہم، تجھے سلام

دونوں ہیں تیرے خرمنِ عرفاں کے خوشہ چیں
عقلِ ادا شناس و جنونِ زیان و سود

روشن ہے تیرے نور سے یہ بزمِ شش جہات
محکم ہے تیری ذات سے شیرازۂ وجود

اے رازِ آفرینشِ عالم، تجھے سلام

شفیق جونپوری:-

وہ خورشید و انجم تھے مگر بے نور تھی دنیا
خدائی جگمگائی جب زمیں پر آدمی آیا

تبسم کی ادا سیکھی ہے کب گلہائے ہستی نے
جب اک انسانِ کامل لے کے ہونٹوں پر ہنسی آیا

شبِ ظلمت کے ہنگاموں میں گم تھی عقلِ انسانی
یکایک طاقِ کعبہ پر چراغِ ہاشمی آیا

فرشتے جان لیں انسانیت کا مرتبہ کیا ہے
سکھانے آدمِ خاکی کو اسرارِ خودی آیا

دکھانے کے لئے وحدانیت کی شان عالم کو
مٹانے کے لئے دنیا سے رسمِ آذری آیا

بشارت انبیاء دیتے رہے آدم سے عیسیٰ تک
نبوت ناز فرماتی ہے جس پر وہ نبی آیا

ہمیشہ نور چمکا پاک صلبوں پاک رحموں میں
وہ عبد اللہ کے گھر میں بصد پاکیزگی آیا

پڑی سوتی رہی دنیا کی قومیں خوابِ غفلت میں
وہ جب آیا تو انساں کو شعورِ زندگی آیا

ذائرِ حرم حمید صدیقی —

کچھ دیارِ حرم کی بات کرو
دوستو! زندگی کی بات کرو

ہو نہ مایوس اے خطا کارو!
"سبقت رحمتی" کی بات کرو

ختم جس کا نہ سلسلہ ہو کبھی
"وسعت رحمتی" کی بات کرو

ہو کے غرقِ تصورِ طیبہ!
شوق و وارفتگی کی بات کرو

جو کھلی تھی قبا کے گلشن میں
اس شگفتہ کلی کی بات کرو

ساقیانِ حرم کی یاد کے ساتھ
لذتِ تشنگی کی بات کرو!

چھیڑ کر ذکرِ شام و صبحِ حرم
زلف و روئے نبیؐ کی بات کرو

قبۂ نور کے تصور میں
شجرِ طور ہی کی بات کرو

ماہ و انجم ہیں جس کے ذرے ہیں
اس منور گلی کی بات کرو

جو چھٹکتی ہے زیرِ قبۂ نور
ہائے اس چاندنی کی بات کرو

جس کے درباں ہیں جبرئیلِ امیں
اس حریمِ نبیؐ کی بات کرو

جالیوں سے جو چھن کے آتی ہے
بس اسی روشنی کی بات کرو

ذکر جس کا ہے زندگی دل کی
ہمدمو! صرف اسی کی بات کرو

چھوڑ کر سارے تذکروں کو حمید
بس دیارِ نبیؐ کی بات کرو

الوالبیان حماد :-

سلام آتا ہے اُن کا مجھے پیام کے بعد
مرا پیام پہنچتا ہے جب سلام کے بعد

طلوعِ صبح سے پہلے خیالِ رخ آیا
ہوا تصورِ گیسو غروبِ شام کے بعد

ہر اک نظام ہے ناکام و فتنہ در آغوش
حضورؐ آپ کے لائے ہوئے پیام کے بعد

خدا گواہ، نہیں موجبِ سعادت و امن
کوئی نظام بھی اسلام کے نظام کے بعد

تمہارا نام ہی بے اختیار آتا ہے!
خدا کے ذکر سے پہلے خدا کے نام کے بعد

حضورؐ آپ کا پیغام ہر جگہ پھیلا
عراق و پارس و مصر و حجاز و شام کے بعد

کلام ایسا کہ جس میں کوئی کلام نہ ہو
کلام آپؐ کا اللہ کے کلام کے بعد

فدا نہ کیوں ہو محمدؐ کے نام پر حماد
انھیں کا نام ہے پیارا خدا کے نام کے بعد

تاج الدین احمد رامؔ نگری

تو وہ فقیر کہ ہر شاہ ہے غلام ترا
وہ شاہ تُو کہ زمیں تا فلک نام ترا

نہ جن و انس کو حاصل نہ قدسیوں کو نصیب
بلند تر ہے تصور سے بھی مقام ترا

تُمہی تو ہے سببِ انعقادِ محفلِ دہر
عیاں ہے کلمۂ لولاک سے مقام ترا

نظامِ شمس و قمر کو دوام ہے جب تک
زبانِ خلق پہ جاری رہے گا نام ترا

نقوشِ پا پہ ترے ہوں گی جنتیں تعمیر
سمجھ تو لے یہ زمانہ ذرا مقام ترا

لگی ہوئی ہے تری مُہر قلبِ گیتی پر
رقم جریدۂ عالم پہ ہے دوام ترا

پھٹی چٹائی پہ راتیں گزارنے والے
کسے نصیب ہو عظمت تری مقام ترا

ہنوز میرے لئے جنتِ سماعت ہے
وہ تیرہ صدیوں کا بخشا ہوا کلام ترا

تری عطائے فراواں کی خیر ہو ساقی!
ادھر بھی دیر سے پیاسا ہے اک غلام ترا

ادیب سہارنپوری

شبِ معراج

کس کی آمد ہے سرِ عرشِ بریں آج کی رات
محوِ آئینہ ہے، خود عرش نشیں آج کی رات

ختم ہوتا ہی نہیں نامہ و پیغام کا دور
سخت مصروف ہیں جبریلِ امیں آج کی رات

لیلۃ القدر" بھرے کثرتِ الہام سے دل
"مطلع الفجر" ہے، ہر داغ جبیں آج کی رات

فخرِ نسبت ہے شہنشاہِ دو عالم سے اسے
اپنی تقدیر پہ نازاں ہے زمیں آج کی رات

عشق کرتا ہے کہاں دوریِ محبوب قبول
ضبط کی ساری حدیں ٹوٹ گئیں آج کی رات

فخرِ لولاک کے دیدار کی حسرت میں ادیبؔ
کس کی آنکھیں ہیں کہ بے خواب نہیں آج کی رات

منظر صدیقی اکبرآبادی

بہت تلخ ہے دورِ ایّام ساقی!
ترے نام لیوا ہیں بدنام ساقی!
پلا پھر مجھے کوثری جام ساقی!
نہ رہ جائے ذوقِ طلب خام ساقی!
ترے میکدے کا ہوں خیّام ساقی
مدینہ سے دے کوئی پیغام ساقی

تری ذات سرنامۂ بزمِ عالم
ترے نام سے آبرو اپنی قائم
مدینہ تری خواب گاہِ مکرّم
مکرّم ہی کیا، ہمسرِ عرشِ اعظم
فرشتے بھی ہیں تیرے خدّام ساقی
مدینہ سے دے کوئی پیغام ساقی

یہ سچ ہے ہوئی ختم قیدِ دوامی
مگر اب بھی باقی ہے ذہنی غلامی
میسّر کہاں ہے ابھی شادکامی
ابھی دور آیا کہاں ہے عوامی
ہے باطل پرستی ابھی عام ساقی
مدینہ سے دے کوئی پیغام ساقی

زبان و بیاں پر بھی پابندیاں ہیں
زباں کیا، فغاں پر بھی پابندیاں ہیں
ابھی گلستاں پر بھی پابندیاں ہیں
ابھی باغباں پر بھی پابندیاں ہیں
ہیں آزاد ہو کر تہِ دام ساقی!
مدینہ سے دے کوئی پیغام ساقی!

ہے فریاد اے تاجدارِ مدینہ
نہیں کوئی جینے کا اپنے قرینہ
مصائب سے اب بھی ہے صد چاک سینہ
ہے طوفاں کی زد میں اپنا سفینہ
قیامت ہے برپا بہ ہر گام ساقی
مدینے سے دے کوئی پیغام ساقی

محمد علی اثر رامپوری:-

اے کہ ترا جمال ہے زینتِ بزمِ کائنات
نور سے تیرے عرش و فرش آئینۂ تجلیات
صدقۂ حسنِ رُخ ترا، دونوں جہاں کو جب بٹا
بن گئی مہر و مہ کا نور، تیرے جمال کی زکات
شیفتگانِ حسن کے کٹتے حسیں ہیں روز و شب
چہرہ ترا ہے روزِ عید، زلف تری شبِ برات
تجھ پہ تمام ہو گیا لطفِ پیام اور کلام!
بعد ترے خدا نے کی پھر نہ کسی بشر سے بات
خاتمِ جملہ مرسلاں، شافعِ جملہ عاصیاں
تجھ پہ فدا ہوں جان و تن، تجھ پہ نثار کائنات
تھا ترا فیضِ تربیت، جانِ بہارِ کربلا
ہائے وہ سرزمینِ عشق ہائے وہ ساحلِ فرات
فرش سے تا بہ لامکاں باصفِ جملہ قدسیاں
بھیج رہا ہے ربِّ عرش تجھ پہ سلام اور صلات

بشیشور پرشاد منورؔ:-

زبانِ حال ہے شاہد، زبانِ قال گواہ
کلامِ پاکِ خدا، بات بات آپؐ کی ہے
عروج آپؐ سے تھا گو تمام راتوں کا
حقیقتاً شبِ معراج رات آپؐ کی ہے
اسی سے ہے لقبِ پاکِ سرورِ کونین
یہ عرش و فرش یہ کُل کائنات آپ کی ہے
نفس نفس سے فروزاں ہوئے حرم کے چراغ
تمام نورِ الٰہی حیات آپؐ کی ہے
اب اور اس کے سوا کارِ خیر کیا ہوگا
عطائے دولتِ ایماں زکات آپ کی ہے
ہے مرتبہ اسے دارالسلام کا حاصل
شریکِ دل نگہ التفات آپ کی ہے
نہ انبیاء کو میسّر نہ اولیا کو نصیب!
جو منزلت دمِ صوم و صلوٰۃ آپ کی ہے
اسے حدیث کہیں یا قرار دیں قرآں
یہ اہلِ دل کی نہیں واردات آپ کی ہے

یوگندر پال صابرؔ:-

مظہرِ حسنِ ذات ہیں احمدؐ
رحمتِ ہر حیات ہیں احمدؐ
اپنے اور غیر میں نہیں تفریق
سرورِ کائنات ہیں احمدؐ

گو حقیقت کے راز ہیں احمدؐ
شمعِ بزمِ مجاز ہیں احمدؐ
سخت حیرت سے سوچتا ہے جہاں
ناز ہیں یا نیاز ہیں احمدؐ

بال مکند عرش ملسیانی

زباں افسانۂ دل بود شب جائے کہ من بودم
نظر نظارۂ منزل بود شب جائے کہ من بودم

رِ محفل دیدم و لے محفل آرائے دگر دیدم
ہماں یک جانِ محفل بود شب جائے کہ من بودم

اُمید راحتِ عقبیٰ، فراغت از غمِ دنیا!
مرا ہر لطف حاصل بود شب جائے کہ من بودم

ہر آں تجمے کہ کسبِ نور کردے از نگارِ من
شبیہ ماہ کامل بود شب جائے کہ من بودم

ملائک دست بستہ عرش و کرسی لطف آمادہ
"محمدؐ صدرِ محفل بود شب جائے کہ من بودم"

چاند بہاری لال صاحب صبا ماتھر جے پوری

ہوں اگر روح الامیں بھی پاسبانِ مصطفےٰ
رُک نہیں سکتے کسی سے عاشقانِ مصطفےٰ

عیدِ میلاد النبیؐ کی بزم ہے آراستہ
آج ہونا چاہیئے اظہارِ شانِ مصطفےٰ

سادگی تو دیکھئے میری جبیں کی، جھک گئی
عرشِ اعظم کو سمجھ کر آستانِ مصطفےٰ

کوئی سمجھا ہے نہ سمجھے گا کلامِ پاک کو
جس طرح سمجھے ہوئے ہیں عاشقانِ مصطفےٰ

اب مرا دامن نہیں ہے دامنِ رحمت سے کم
آ پڑی ہے اس پہ خاکِ آستانِ مصطفےٰ

بادۂ توحید کا اک جام مجھ کو بھی تو دے
اے شبِ معراج والے میزبانِ مصطفےٰ

ہم دکھا دیں گے تمہیں کعبہ اُدھر آتا ہوا
جس طرف سجدہ کریں گے عاشقانِ مصطفےٰ

آخر انساں ہو صبا تو، یہ ملائک کہتے ہیں
ہو نہیں سکتا بیانِ عزّ و شانِ مصطفےٰ

★

عبد الکریم ثمرؔ

تنویرِ کائنات رسولِ کریمؐ ہیں
شمعِ حریمِ ذات رسولِ کریمؐ ہیں

تفسیرِ معجزات رسولِ کریمؐ ہیں
توجیہِ ممکنات رسولِ کریمؐ ہیں

قدموں پہ سرنگوں ہے شکوہِ شہنشہی
مولائے شش جہات رسولِ کریمؐ ہیں

کرتی ہے اُن پہ ناز دو عالم کی آگہی
سرچشمۂ حیات رسولِ کریمؐ ہیں

علم و نظر کی آخری حد آپؐ کا وجود
تکمیلِ کائنات رسولِ کریمؐ ہیں

نورِ نگاہ اہلِ حقیقت کے واسطے
حُسنِ تصورات رسولِ کریمؐ ہیں

جس پر نثار کوثر و تسنیم و سلسبیل
وہ ساحلِ نجات رسولِ کریمؐ ہیں

وہ ماورائے قیدِ زمان و مکاں سہی
شرحِ تعیّنات رسولِ کریمؐ ہیں

محشر کی باز پرس کا کیوں غم ہو اے ثمرؔ
جب ضامنِ نجات رسولِ کریمؐ ہیں

مسٹر ولی احمد سیف خیر آبادی

ستارے ہوں گے ذرّے بھی زمیں بھی آسماں ہوگی
مدینے کی گلی اے سیفؔ رشکِ کہکشاں ہوگی

خلش دردِ محبت کی فراقِ شاہِ والا میں
کبھی آرامِ دل ہوگی کبھی آرامِ جاں ہوگی

زمانے کی جفا نکلے دیکھے حق پرستوں سے
یہی برقِ بلا اک دن چراغِ آشیاں ہوگی

ابوالمجاہد زاہد:-

حبیبِ حق خدا کا خاص لطف بن کے آگیا
جو کل تھے خار و خس مزاج وہ گلاب بن گئے
جو بانیانِ شرک تھے وہ حق پرست ہو گئے
شرابِ معرفت کے جام پی کے مست ہو گئے
جو خود بھٹک رہے تھے ہو گئے وہ رہبرِ جہاں
سرِ نیاز جھک گئے حضورِ ربِ کن فکاں
جو کل تلک ایک ذرّہ تھے وہ آفتاب بن گئے
زمین جگمگا گئی، فلک بھی جگمگا گیا
حبیبِ حق خدا کا خاص لطف بن کے آگیا

عزیز حاصل پوری:-

وجہ نمودِ عالمِ امکاں تمہی تو ہو
افسانۂ حیات کا عنواں تمہی تو ہو
جس کی ضیا رہے ہے باعثِ تنویرِ دو جہاں
کونین کے وہ مہرِ درخشاں تمہی تو ہو
تم ہی سے ہے شگفتہ و شاداب پھول پھول
روحِ بہار و جانِ گلستاں تمہی تو ہو
"درِّ یتیم!" "خاتمِ کونین کے نگیں"
"خیر البشر" محمدِ ذیشاں تمہی تو ہو
دم ہے جو دہر میں تو تمہارے ہی دم سے ہے
روحِ روانِ عالمِ امکاں تمہی تو ہو
بخشا تمہی نے دردِ محبت عزیز کو
اور اس کے اضطراب کا درماں تمہی تو ہو

منظر کلیمی:-

جو کفر کے آغوشِ محبت میں پلی ہو
دیکھا ہی نہیں قوم وہ پھولی ہو پھلی ہو
ممکن نہیں افراد کے اخلاق سنوارے
تہذیب جو افرنگ کے سانچوں میں ڈھلی ہو
میخانہ و بت خانہ کی اب چھوڑ دو راہیں
دل اور نگاہوں میں محمدؐ کی گلی ہو
اندیشۂ دشواریِ منزل اسے کیا ہے
جو زندگی اسلام کی راہوں پہ چلی ہو
اسلام کے گلزار کی ہر چیز حسیں ہے
وہ پھول ہو کانٹا ہو کہ معصوم کلی ہو
اب وقت ہے اسلام کا ہر فرد کلیمی
بوبکرؓ و عمرؓ خالدؓ و عثمانؓ و علیؓ ہو

چاند بہاری لال صبا (جے پوری)

تصوّر باندھ کر دل میں تمہارا یا رسول اللہ
خدا کا کر لیا ہم نے نظارہ یا رسول اللہ
خدا کا وہ نہیں ہوتا خدا اُس کا نہیں ہوتا
جسے آتا نہیں ہونا تمہارا یا رسول اللہ
زمیں سے آ لگے خورشیدِ محشر میں تو اُن کو کیا
ہے جن پر سایۂ دامن تمہارا یا رسول اللہ
خدا کا بحرِ رحمت اس قدر کیوں جوش میں آیا
کسی بیکس نے کیا تم کو پکارا یا رسول اللہ
خدا حافظ خدا ناصر سہی لیکن یہ محشر ہے
یہاں تو آپ ہی دیں گے سہارا یا رسول اللہ
خدا کا نام لے کر جو بن آیا وہ لکھ لایا
مجھے کب نعت لکھنے کا ہے یارا یا رسول اللہ

★

شمائلِ نبوی

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "انسانِ کامل" بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ حضورؐ جس طرح سیرت کے اعتبار سے بے مثال تھے۔ اسی طرح صورت، ظاہری حسن و جمال اور جسمانی صحت کے لحاظ سے بھی کامل ترین تھے۔ سیرت اور صورت، روح اور جسم کا اس قدر حسین ترین امتزاج اور کسی انسان کو نصیب نہیں ہوا۔

حضورؐ کا قد درمیانہ تھا۔ نہ پست اور نہ بہت لانبا۔ اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کے قد میں یہ اعجاز رکھا تھا کہ حضور انسانوں کے جس مجمع میں بھی کھڑے ہوتے سب سے بلند و بالا نظر آتے۔ جسم مبارک انتہائی خوبصورت اور معتدل تھا۔ رنگ سفید سرخی مائل تھا۔ حضورؐ کے سر کے بال نہ بالکل پیچدار تھے اور نہ بالکل سیدھے تھے۔ چشمانِ مبارک خوب سیاہ تھیں۔ اور پلکیں دراز۔ چہرہ مبارک نہ بالکل گول تھا نہ لانبا۔ بلکہ دونوں کے درمیان تھا۔ سینۂ مبارک سے ناف تک بالوں کی ایک لکیر تھی۔ آپؐ کے دستِ اقدس اور پائے مبارک پُر گوشت تھے۔ پیشانی مبارک کشادہ، ابرو خمدار باریک اور گنجان تھے۔ بینی بلند اور اس پر چمک اور نور تھا۔ ریش مبارک بھرپور اور گنجان بالوں کی تھی۔ دندانِ مبارک آبدار تھے اور اُن میں سے سامنے کے دانتوں میں ذرا ذرا فصل بھی تھا۔ جن سے روشنی چھنتی نظر آتی۔ ہاتھ اور پاؤں کی انگلیاں جسم کے تناسب کے اعتبار سے لانبی تھیں۔ تلوے قدرے گہرے تھے۔ اور قدم ہموار تھے۔ آنکھوں کی سفیدی میں سُرخ ڈورے تھے۔ خاتمِ نبوت کا ظاہری نشان بھی اللہ نے عنایت فرمایا تھا۔ سرکار کے دونوں مونڈھوں کے درمیان مہرِ نبوت تھی۔

حضورؐ چلنے میں قوت کے ساتھ قدم اُٹھاتے اور آگے کو جھک کر چلتے۔ قدم زمین پر آہستہ پڑتا۔ حضورؐ تیز رفتار تھے۔ جب آپؐ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پستی کی طرف اُتر رہے ہیں۔ جب کسی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن سے پھر کر توجہ فرماتے۔ حضور کی نظریں نیچی رہتی تھیں۔

حضورؐ سر مبارک میں اکثر تیل کا استعمال فرماتے تھے اور سر مبارک پر کپڑا ڈال لیا کرتے تھے۔ تاکہ تیل اُس کپڑے میں جذب ہو جائے۔ ڈاڑھی مبارک میں اکثر کنگھی فرمایا کرتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفید بال بہت ہی کم تھے۔ ایک بار حضورؐ دولت کدے سے تشریف لا رہے تھے۔ اور ریش مبارک پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہ منظر دیکھ کر عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں۔ کس قدر جلدی آپؐ پر بڑھاپا آ گیا"۔ اور یہ کہہ کر رونے لگے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "سورۂ ہود جیسی سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔"

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔ "اثمد کا سرمہ آنکھوں میں لگایا کرو۔ اس لئے کہ وہ آنکھ کی روشنی کو بھی تیز کرتا ہے اور پلکیں بھی زیادہ اُگاتا ہے۔ حضورؐ کے پاس ایک سرمہ دانی تھی جس میں سے تین تین سلائی ہر رات

آنکھوں میں لگایا کرتے تھے۔

حضورؐ کو پہننے کے کپڑوں میں کُرتہ سب سے زیادہ پسند تھا۔ حضورؐ کے پاس صرف ایک ہی کُرتہ تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ ع
سے روایت ہے کہ سرکارؐ کے کُرتے، چادر، لُنگی یا جُوتے میں سے کوئی چیز دو عدد نہ تھی۔ حضورؐ یمنی منقش چادر کو بہت پسند فرما
تھے۔ حضورؐ نے رُومی جبّہ بھی پہنا ہے۔ جس کی آستینیں تنگ تھیں۔ سیاہ بالوں کی چادر۔ سبز چادر اور سُرخ حلہ بھی آپؐ
نے زیب تن فرمایا ہے۔ حضورؐ نے موزے بھی پہنے ہیں۔

حضورؐ کے نعلین مبارک میں دو دو تسمے لگے ہوتے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک جُوتی پہن کر کوئی نہ چلے۔ یا دونوں
پہن کر چلے یا دونوں نکال دے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کنگھی کرنے، جو
پہننے اور وضو کرنے میں داہنی جانب سے ابتداء فرماتے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسریٰ اور قیصر اور نجاشی کے
پاس تبلیغی خطوط لکھنے کا قصد فرمایا۔ تو لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ لوگ مُہر کے بغیر خطوط قبول نہیں کرتے۔ اس
لئے حضورؐ نے ایک مُہر بنوائی۔ جس کا حلقہ چاندی کا تھا اور اُس میں "محمد رسول اللہ" منقوش تھا۔ حضورؐ انگوٹھی دائیں
ہاتھ میں پہنا کرتے تھے۔

حضورؐ کے پاس چند تلواریں تھیں۔ اُن کے خاص خاص نام تھے۔ مثلاً ماثور۔ قضیب۔ قلعی، بتار اور ذوالفقا
حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ کی تلوار کے قبضہ کی ٹوپی چاندی کی تھی۔ یہی تلوار (ذوالفقار) فتح مک
میں حضورؐ کے پاس تھی۔ حضورؐ کے پاس سات زرہیں تھیں۔ جن میں سے ایک (ذات الفضول) تو ابوالشحم یہودی کے پاس ر
تھی۔ باقی چھ کے نام یہ ہیں۔ ذات الحوشی۔ ذات الوشاح۔ فضہ، سغدیہ۔ تبرار۔ خرنق۔

حضورؐ جب فتح مکہ کے دن شہر میں داخل ہوئے۔ تو سر مبارک پر خود تھا۔ اُحد کی جنگ میں جسم پر دو زرہیں تھیں تو ایک
ذات الفضول۔ دُوسری فضہ۔

عمرو بن حریث رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ منظر گویا اس وقت میرے سامنے ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر خطب
پڑھ رہے تھے۔ سیاہ عمامہ سر مبارک پر تھا۔ اور اُس کا شملہ دونوں شانوں کے درمیان تھا۔

سلمہ ابن اکوع کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ لُنگی نصف ساق تک رکھتے اور فرماتے کہ یہی ہیئت تھی میرے
آقا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

ابو جحیفہؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں تو ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھاتا۔ حضورؐ کی عادت تین انگلیوں سے
کھانا تناول فرمانے کی تھی۔ اور اُن کو چاٹ بھی لیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدسؐ کی وفات تک حضورؐ کے اہل وعیال نے مسلسل دو دن
کبھی جَو کی روٹی سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے کسی نے پُوچھا کہ حضورؐ نے کبھی
سفید میدہ کی روٹی بھی کھائی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضورؐ کے سامنے اخیر عمر تک میدہ کبھی آیا بھی نہیں ہوگا!

حضورؐ نے ایک بار فرمایا۔ "سرکہ بھی کیسا اچھا سالن ہے" حضورؐ کو ترکاریوں میں کدو بہت مرغوب تھا۔ حضورؐ ک
میٹھا اور شہد بہت پسند تھا۔ حضورؐ کھانوں میں ثرید اور ذراع یعنی دست کا گوشت پسند فرماتے تھے۔ حضورؐ نے بُھنا ہ

گوشت چاقو سے بھی کاٹ لیتے ہے۔

ایک مرتبہ حضورؐ نے ایک روٹی کا ٹکڑا لے کر اس پر ایک کھجور رکھی اور فرمایا یہ اس کا سالن ہے!

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ جب بیت الخلاء سے فراغت پا کر باہر تشریف لائے تو خدمت اقدس میں کھانا حاضر کیا گیا اور وضو کا پانی لانے کے لئے پوچھا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے وضو کا اسی وقت حکم ہے۔ جب میں نماز کا ارادہ کروں۔

حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی شخص کھانا کھائے اور بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو کھانے کے درمیان جس وقت یاد آئے۔ بسم اللہ اولہٗ وآخرہٗ کہہ لے۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب کھانے سے فارغ ہوتے تو یہ دعا پڑھتے:۔

الحمد للہ الذی اطعمنا وسقانا وجعلنا مسلمین۔" (تمام تعریف اس ذات پاک کے لئے ہے جس نے ہمیں کھانا کھلایا، پانی پلایا اور مسلمان بنایا)

حضورؐ ککڑی کو کھجور کے ساتھ نوش فرماتے تھے اور تربوز کو بھی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو خربوزہ اور کھجور اکٹھا کھاتے ہوئے دیکھا۔ حضورؐ کو پینے کی چیزوں میں میٹھی اور ٹھنڈی چیز مرغوب تھی۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے زمزم کا پانی کھڑے کھڑے نوش فرمایا۔ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضورؐ کو کھڑے اور بیٹھے دونوں طرح پانی پیتے دیکھا۔ حضورؐ پانی پینے میں تین سانس لیا کرتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ اس طرح سے پینا زیادہ خوشگوار اور خوب سیراب کرنے والا ہے۔ حضورؐ نے ایک بار مشکیزہ کے منہ سے پانی نوش فرمایا۔

حضورؐ خوشبو کو رد نہیں کرتے تھے۔ اور خوشبو آپؐ کو پسند تھی۔ حضورؐ نے فرمایا کہ مردانہ خوشبو وہ ہے جس کی خوشبو پھیلتی ہو۔ اور رنگ غیر محسوس ہو۔ اور زنانہ خوشبو وہ ہے جس کا رنگ غالب ہو اور خوشبو مغلوب ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو تم لوگوں کی طرح لگاتار جلدی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ صاف صاف ہر مضمون دوسرے سے جدا ہوتا تھا کہ پاس بیٹھنے والے اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے تھے۔

حضورؐ کا ہنسنا صرف تبسم ہوتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے حضورؐ سے زیادہ تبسم کرنے والا نہیں دیکھا۔

حضرت انسؓ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورؐ ہمارے ساتھ مزاح بھی فرماتے تھے۔ ابوہریرہ نے ایک بار عرض کیا کہ حضور! آپؐ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں۔ ارشاد فرمایا۔ "ہاں۔ مگر میں کبھی غلط بات نہیں کہتا"

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کبھی شعر بھی پڑھتے تھے۔ تو انہوں نے فرمایا۔ ہاں مثال کے طور پر کبھی عبداللہ بن رواحہ کا کوئی شعر بھی پڑھ لیتے تھے (اور کبھی کبھی کسی اور شاعر کا) چنانچہ کبھی طرفہ کا یہ مصرعہ بھی پڑھ دیا کرتے تھے۔ "ویاتیک بالاخبار من لم تزود"

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس نے ارشاد فرمایا کہ سب سے اچھا کلمہ جو کسی شاعر نے کہا ہے۔ وہ لبید بن ربیعہ کا یہ کلمہ ہے۔" الا کل شئی ماخلا اللہ باطل"۔ (آگاہ ہو جاؤ اللہ جل شانہ کے سوا دنیا کی ہر چیز فانی ہے)

حضرت شرید کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سواری پر آپؐ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس وقت میں نے حضورؐ کو امیہ بن الصلت کے سو شعر سنائے۔ ہر شعر پر حضورؐ ارشاد فرماتے تھے کہ اور سناؤ۔ اخیر میں حضورؐ نے ارشاد

فرمایا کہ اُس کا اسلام لے آنا بہت ہی قریب تھا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لئے حضورؐ مسجد میں منبر رکھ دیا کرتے تھے کہ اُس پر کھڑے ہو کر حضورؐ کی طرف سے مفاخرہ کریں اور کفار کے الزامات کا جواب شعروں میں دیں۔

حضورؐ جس وقت آرام فرماتے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے رکھتے تھے اور یہ دعا پڑھتے تھے۔ "رب قنی عذابک یوم تبعث عبادک" اے اللہ! قیامت کے دن مجھے اپنے عذاب سے بچائیو۔"

حضورؐ جب بستر پر لیٹتے تو: "اللھم باسمک اموت واحیا" یا اللہ! تیرے ہی نام سے مرتا (سوتا) ہوں اور تیرے ہی نام سے زندہ ہوں گا۔ (یعنی سو کر اٹھوں گا)

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر شبانہ جب بستر پر آرام فرماتے تو دونوں ہاتھوں کو دعا مانگنے کی طرح ملا کر اُن پر دم فرماتے اور سورۂ اخلاص اور معوذتین پڑھ کر تمام بدن پر سر سے پاؤں تک جہاں جہاں ہاتھ جاتا پھیر لیا کرتے۔ تین مرتبہ ایسا ہی کرتے۔ سر سے ابتداء فرماتے اور پھر منہ اور بدن کا اگلا حصہ پھر بقیہ بدن پر۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر نوافل پڑھا کرتے تھے کہ پائے مبارک پر ورم ہو جاتا تھا۔ کسی نے عرض کیا کہ آپؐ پر اگلے پچھلے سب گناہوں کی معافی کی بشارت نازل ہو چکی ہے۔ پھر آپؐ اس درجہ کیوں مشقت برداشت فرماتے ہیں۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا۔ "کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں"

حضورؐ اکرم کا ارشاد بعض احادیث میں آیا ہے کہ نماز کا کچھ حصہ گھر میں ادا کیا کرو اور گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔

حضورؐ کی عادت تھی کہ کسی مہینہ میں تو اتنی کثرت سے روزے رکھتے جس سے یہ خیال ہو جاتا کہ افطار کرنے کا ارادہ ہی نہیں ہے اور کسی ماہ میں ایسا مسلسل افطار فرماتے تھے جس سے ہم یہ سمجھتے تھے کہ اس ماہ میں آپؐ کا روزہ کا ارادہ ہی نہیں ہے۔ آپؐ کی عادتِ شریفہ یہ بھی کہ اگر تم حضورؐ کو رات کو سوتا ہوا دیکھنا چاہو تو یہ بھی مل جاتا اور اگر نماز پڑھتا ہوا دیکھنا چاہو تو یہ بھی میسّر آجاتا۔

معاذہؓ کہتی ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر ماہ میں تین روزے رکھتے تھے فرمایا۔ ہاں! رکھتے تھے۔ میں نے پھر پوچھا کہ کن ایام میں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کا اہتمام نہیں تھا۔ جن دنوں میں موقع ہوتا رکھ لیتے۔ حضورؐ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ زیادہ نفل روزے ماہ شعبان میں رکھتے تھے!

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ تشریف لائے تو میرے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ میں نے عرض کیا کہ فلانی عورت ہیں جو رات بھر نہیں سوتیں۔ حضورؐ نے اس پر فرمایا کہ نوافل اس قدر اختیار کرنے چاہئیں جن کا تحمل ہو سکے۔ حق تعالیٰ جل شانہٗ ثواب دینے سے نہیں گھبراتے۔ یہاں تک کہ تم عمل کرنے سے گھبرا جاؤ۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کو وہی عمل سب سے زیادہ پسند تھا جس پر آدمی نباہ (مداومت) کر سکے۔ (چاہے وہ کتنا ہی کم ہو)

حضورؐ اقدس قرآن شریف (گنگنانے والوں کی طرح) آواز بنا کر نہیں پڑھتے تھے۔

عبداللہ بن شخیرؓ کہتے ہیں کہ میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضورؐ نماز پڑھ رہے تھے اور رونے کی وجہ سے آپؐ کے سینے سے ایسی آواز نکل رہی تھی جیسے ہنڈیا کا جوش ہوتا ہے!

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سونے اور آرام فرمانے کا بستر چمڑے کا ہوتا تھا۔ جس میں کھجور کے درخت کی چھال بھری ہوئی تھی۔" متعدد احادیث میں وارد ہے کہ صحابہ جب نرم بستر بنانے کی درخواست کرتے تو حضورؐ ارشاد فرماتے کہ "مجھے دنیاوی راحت و آرام سے کیا کام؟ میری مثال تو اس مسافر جیسی ہے جو چلتے چلتے راستہ میں ذرا آرام لینے کے لئے کسی درخت کے سایہ کے نیچے بیٹھ گیا ہو اور تھوڑی دیر بیٹھ کر آگے چل دیا ہو۔"

حضورؐ نے فرمایا "میری ایسی مبالغہ آمیز حد سے فزوں تعریف نہ کیا کرو۔ جیسے نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعریف میں مبالغہ کیا۔ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں۔ اس لئے مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول کہو۔"

حضورؐ اقدس مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شرکت فرماتے تھے۔ گدھے پر سوار ہو جاتے اور غلاموں کی دعوت قبول فرما لیتے۔ آپؐ بنو قریظہ کی لڑائی کے دن ایک گدھے پر سوار تھے۔ جس کی لگام کھجور کی تھی اور کاٹھی بھی اسی کی تھی۔

حضرت انسؓ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک پرانے پالان پر حج کیا۔ اس پر ایک کپڑا پڑا ہوا تھا۔ جو چار درم سے زیادہ قیمت کا نہ ہو گا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہؓ کے نزدیک حضورؐ سے زیادہ محبوب کوئی شخص دنیا میں نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر اس لئے کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ حضورؐ کو یہ پسند نہیں تھا!

حضورؐ ضروری امور کے علاوہ اپنی زبان کو (غیر ضروری باتوں سے) محفوظ رکھتے۔ فضول تذکروں میں وقت ضائع نہ فرماتے۔ آنے والوں کی تالیف قلوب فرماتے۔ ان کو متوحش نہیں فرماتے تھے۔ ہر امر میں اعتدال اور میانہ روی اختیار فرماتے۔ آپ کی نشست و برخاست سب اللہ کے ذکر کے ساتھ ہوتی تھی۔ اور جب کسی جگہ تشریف لے جاتے تو جہاں جگہ ملتی، وہیں تشریف رکھتے اور اسی کا لوگوں کو حکم فرماتے کہ جہاں جگہ خالی مل جائے بیٹھ جایا کریں لوگوں کے سروں کو پھلانگ کر آگے نہ جایا کریں!

آپؐ کے پاس ہر بیٹھنے والا یہ سمجھتا کہ حضورؐ میرا سب سے زیادہ اکرام فرما رہے ہیں۔ آپؐ کی خندہ پیشانی اور خوش خلقی تمام لوگوں کے لئے عام تھی۔ آپؐ کی مجلس علم و حیا اور صبر و امانت کی تھی۔ نہ اس میں شور و شغب ہوتا تھا نہ کسی کی عزت آبرو اتاری جاتی تھی۔ ایک صحابی نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ آدمی کو سب سے بہترین چیز جو عطا ہوئی ہے وہ کیا ہے؟ فرمایا "خوش خلقی" حضورؐ اخلاق میں تمام دنیا سے بہتر تھے۔

حضورؐ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی کے ظلم کا بدلہ نہیں لیا۔ البتہ محارم اللہ میں آپؐ سے زیادہ شدید اور غصہ والا اور کوئی نہ تھا۔ حضورؐ جب کبھی دو امروں میں اختیار دیئے جاتے تو ہمیشہ سہل کو اختیار فرماتے۔ بشرطیکہ اس میں کسی قسم کی معصیت وغیرہ نہ ہو۔

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے اپنے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے اہلِ مجلس کے ساتھ برتاؤ کا حال پوچھا۔ تو حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "حضورؐ ہمیشہ خندہ پیشانی اور خوش خلقی کیساتھ پیش آتے۔ آپؐ نرم مزاج تھے۔ نہ آپ سخت گو تھے نہ سخت دل تھے۔ نہ آپ چلا کر بولتے تھے نہ فحش گوئی اور بد کلامی فرماتے تھے۔ نہ عیب گیر تھے۔ نہ زیادہ مبالغہ سے تعریف کرنے والے۔ نہ زیادہ مذاق کرنے والے۔ نہ بخیل۔ آپؐ ناپسند بات سے اعراض فرماتے تھے۔ یعنی ادھر التفات نہ فرماتے گویا سُنی ہی نہیں۔ آپؐ نے تین باتوں سے اپنے کو بالکل علیحدہ

کر رکھا تھا - جھگڑے سے - تکبر سے اور بیکار بات سے - اور تین باتوں سے لوگوں کو بچا رکھا تھا - نہ کسی کی مذمت فرماتے - نہ کسی کو عیب لگاتے - نہ کسی کے عیوب کی کرید فرماتے - آپؐ سے جب کوئی شخص بات کرتا تو اُس کے خاموش ہونے تک تمام اہلِ مجلس (یعنی صحابہ) ساکت رہتے - جس بات پر سب ہنستے آپؐ بھی تبسم فرماتے - جس سے سب لوگ تعجب کرتے آپؐ بھی تعجب میں شریک رہتے - یہ نہیں کہ سب سے الگ چپ چاپ بیٹھے رہیں بلکہ معاشرت اور کلام و گفتگو میں اہلِ مجلس کے شریکِ حال رہتے - اجنبی مسافر کی سخت گفتگو اور بدتمیزی پر صبر فرماتے - حضورؐ سخاوت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے -

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس دوسرے دن کے واسطے کسی چیز کو ذخیرہ بنا کر نہیں رکھتے تھے - حضورؐ ہدیہ قبول فرماتے تھے - اور اُس پر بدلہ بھی دیا کرتے تھے -

حضورؐ شرم و حیا میں کنواری لڑکی سے زائد بڑھے ہوئے تھے (حیا کو حضورؐ نے ایمان کی ایک شاخ فرمایا ہے -)

حضورؐ کو فاقہ ہوتا اور بھوک کی شدت سے شکم مبارک پر پتھر بندھے رہتے مگر حضورؐ کو شکوہ سنج نہیں پایا گیا،

حضورؐ نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ مکرمہ میں رونق افروز رہے - ان تیرہ برس میں حضورؐ پر وحی نازل ہوتی رہی - اُس کے بعد مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اور دس سال مدینہ منورہ میں قیام رہا - اور تریسٹھ سال کی عمر میں وصال ہوا -

حضورؐ نے فرمایا کہ ہمارا کوئی وارث نہیں ہوتا - ہم انبیاء کی جماعت جو مال چھوڑتی ہے وہ صدقہ ہوتا ہے - حضورؐ نے فرمایا کہ جس شخص نے مجھے خواب میں دیکھا اُس نے فی الحقیقت مجھی کو دیکھا اس لئے کہ شیطان میری صورت نہیں بنا سکتا

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے جس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری دیدار نصیب ہوا تو وہ وقت تھا جبکہ حضورؐ نے مرض الوفات میں دوشنبہ کے روز صبح کی نماز کے وقت دولت کدہ کا پردہ اٹھایا کہ امتیوں کی نماز کا آخری منظر دیکھ لیں - اُس وقت آپؐ کا چہرہ مبارک صفائی اور انوار میں اور چمک میں گویا مصحف شریف کا ایک روشن ورق تھا - اس وقت صحابہ کرام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز ادا کر رہے تھے - صحابہ کرام میں حضور اکرم کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے اضطراب پیدا ہوا - حضورؐ نے اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہ کھڑے رہو اور اسی دن حضور کا وصال ہو گیا - ! (صلی اللہ علیہ وسلم)

(شمائل ترمذی مترجم سے)

حق ہو اور تلخ نہ معلوم ہو اللہ اللہ !

زہے شیرینیٔ گفتارِ رسولِ عربی

(بسمل سعیدی)

غیروں کی نگاہ میں

ہیں مدح سرا جس کے اپنے بھی پرائے بھی

مہاتما گاندھی:— "مغربی دُنیا اندھیرے میں غرق تھی کہ ایک روشن ستارہ (سراج مُنیر) افقِ مشرق سے چمکا اور اُس نے بے قرار دُنیا کو روشنی اور تسلی کا پیام دیا"۔

جارج برنارڈشا:— آنے والے سو سال میں ہماری دُنیا کا مذہب اسلام ہوگا۔ مگر یہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اسلام نہ ہوگا۔ بلکہ وہ اسلام ہوگا جو محمدؐ رسول اللہ کے زمانے میں دلوں، دماغوں اور روحوں میں جاگزیں تھا۔

ڈاکٹر جی ویل:— بیشک حضرت محمدؐ صاحب نے گمراہوں کے لئے ایک بہترین راہِ ہدایت قائم کی اور یقیناً آپ کی زندگی نہایت پاک وصاف تھی۔

کاؤنٹ ٹالسٹائی:— حضرت محمدؐ کا طرزِ عمل اخلاقِ انسانی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ ہم یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ حضرت محمدؐ کی تبلیغ وہدایت خالص سچائی پر مبنی تھی۔

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور:— وہ وقت دُور نہیں جب کہ اسلام اپنی ناقابلِ انکار صداقت اور روحانیت کے ذریعہ سب کو اپنے اندر جذب کرلے گا۔ وہ زمانہ عنقریب آنے والا ہے جب اسلام ہندو مذہب پر غالب آجائے گا اور ہندوستان میں ایک ہی مذہب ہوگا۔

مسٹر کے ایم منشی: (گورنر یوپی)— نسل، رنگ، قومیت اور مذہب کے ہاتھوں مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی دُنیا کو آج بھی رسولِ کریم کی تعلیم کی ضرورت ہے۔ تمام انسانوں کو برابری کے حقوق اور مواقع حاصل ہونے چاہئیں رسولِ کریم کے اس پیغام کو ہمارے ملک کے دستورِ اساسی میں بھی جگہ دی گئی ہے۔

ٹھاکر حکم سنگھ: (وزیر صحت وحرفت یوپی)— حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بنی نوعِ انسان کو ایمان داری۔ امن۔ اتحاد اور رواداری کا پیغام دیا۔ آج جبکہ تمام دُنیا نفاق اور فسادات سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔ آنحضرتؐ کے دکھائے ہوئے راستہ پر چلنا اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

پنڈت گووند بلبھ پنت: (وزیر حکومت ہند)— "آپ کی تعلیم کسی ایک ملک یا ملت کے لئے نہیں تھی۔ آپ کا پیغام ساری دُنیا کے لئے تھا۔ آپ نے اتحاد، بھائی چارہ اور انسانی ہمدردی کے اصولوں پر زور دیا۔ میں اس عظیم الشان ہستی کو اپنا ہدیۂ عقیدت پیش کرتا ہوں"۔

مسٹر اجیت پرشاد جین:۔ وزیر آبادکاری حکومت ہند۔ —— "آنحضرتؐ نے جو پیغام دیا ہے۔ وہ تمام کائنات کے لئے ہے۔ اگر صحیح جذبہ کے ماتحت دیکھا جائے تو غیر مسلم بھی اُن کی تعلیم اور زندگی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں"

مسٹر پی ہنمنت راؤ:۔ وزیر مال حیدرآباد دکن:۔ —— "امن و سکون کی متلاشی اس دُنیا میں پیغمبر اسلام کا پیغام ایک مینارۂ نور ہے"

لالہ رام لال ورما:۔ ایڈیٹر "تیج" —— "جمہوریت، اخوت، مساوات، یہ عطیات ہیں جو حضرت محمدؐ نے بنی نوع انسان کو عنایت کئے۔ اور حقیقت میں یہی وہ اصول ہیں۔ جن کی ہر زمانہ اور ہر دور کے معلموں نے اشاعت کی ہے"

فادر و لیم:۔ (ہندوستانی چرچ بمبئی) —— "اسلام امن کا مذہب ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے اسے تلوار کے ذریعہ پھیلایا۔ اُنھیں شاید اسلام کی تاریخ سے واقفیت نہیں ہے۔ آنحضرتؐ نے دُنیا میں آکر سب سے پہلا یہ سبق دیا کہ دُنیا کی چیزیں تمہاری آقا نہیں ہیں۔ تم اُن کے آقا ہو۔ اس لئے خدا کے علاوہ تمہیں دُنیا کی کسی چیز کے سامنے نہیں جھکنا چاہیئے۔ دُوسری چیز پیغمبرؐ اسلام نے ہمیں یہ سکھائی کہ انسان اپنی فطرت (صحیحہ) پر پیدا کیا گیا ہے۔ آپؐ نے مال و دولت، حسب و نسب یا رنگ کی بنیاد پر انسانوں کے درجے قائم کرنے کی مخالفت کی اور دُنیا سے غلام، آقا اور مفلس و مالدار کے فرق کو مٹا دیا۔ عرب کو عجمی پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہ رکھی۔ لیکن آج کی نام نہاد مہذب دُنیا میں یہ امتیاز باقی ہے۔ انھیں چاہیئے کہ وہ اسلام کے بانی سے سبق سیکھیں!

دُنیا داری کو سب نے بُرا کہا۔ لیکن پیغمبرؐ اسلام نے اس فرق کو ختم کر دیا اور بتایا کہ دُنیاداری بھی دینداری ہے۔ بشرطیکہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق ہو۔

جنگ عام طور سے بری سمجھی جاتی ہے۔ مگر اسلام نے جنگ کے بھی اعلیٰ اصول پیش کئے۔ "جنگ میں ہر کام جائز ہے" کے اصول کی مخالفت کی اور جنگ کا ایک خوبصورت نقشہ پیش کیا۔ آپؐ نے جنگ میں بھی ظلم و ناشائستگی اور جھوٹ کی مخالفت کی۔ چنانچہ اسلام کے نام لیوا رات کے راہب اور دن کے شہسوار ہوا کرتے تھے!"

مہاتما گاندھی:۔ —— "سیرت النبیؐ کے مطالعہ سے میرے اس عقیدے میں مزید پختگی اور استحکام آگیا کہ اسلام نے تلوار کے بل پر کائنات میں رسوخ حاصل نہیں کیا۔ بلکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انتہائی بے نفسی، عہود و مواثیق کا انتہائی احترام اور اپنے رفقاء و متبعین کے ساتھ گہری وابستگی، جرأت، بے خوفی اللہ تعالیٰ پر کامل بھروسہ اور اپنے مقصد و نصب العین کی حقانیت پر کامل اعتماد، اسلام کی کامیابی کے حقیقی اسباب تھے۔ یہ خصائص ہر رکاوٹ اور ہر مشکل کو اپنی ہمہ گیری میں بہا کر لے گئے"

مہاتما ستیہ دھاری:۔ —— "دین اسلام چلانے والے حضرت محمدؐ صاحب کی زندگی دُنیا کو بے شمار قیمتی سبق پڑھاتی ہے۔ حضرتؐ کی ہر ایک حیثیت دُنیا کے لئے سبق دینے والی ہے۔ بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھ، سمجھنے والا دماغ اور محسوس کرنے والا دل ہو"

لالہ لیش داس :- "جس عزت و توقیر اور تعظیم و تکریم - صدق و ارادت اور پریم کے ساتھ خاتم الانبیاء کا نام لیا جاتا ہے - کسی دوسرے پیر، پیغمبر، ولی، گرو، رشی، اور نبی کا ہرگز نہیں لیا جاتا - جو اخوت پیغمبر اسلام نے قائم کی ہے کوئی نہ کر سکا"

ڈاکٹر کے ایس سیتارام :- "دنیا کی موجودہ تہذیب صرف اسلام کی بدولت ہے"
(ایم، اے، پی ایچ، ڈی)

مسٹر پیٹر گرم سینٹس :- "محمد نے عورتوں کے حقوق کی ایسی حفاظت کی کہ اس سے پہلے کسی نے نہ کی تھی - اس کی قانونی ہستی قائم ہوئی - جس کی بدولت وہ مال و وراثت میں حصہ کی حقدار ہوئی - وہ خود اقرار نامے کرنے کے قابل ہے اور برقعہ پوش مسلمان خاتون کو ہر ایک شعبۂ زندگی میں وہ حقوق حاصل ہوئے جو آج بیسویں صدی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ آزاد عیسائی عورت کو حاصل نہیں ہیں"

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق :- "میرا اٹل ایمان ہے کہ حضرت محمد پیغمبر اسلام کی ہستی بنی نوع انسان کے لئے ایک رحمت تھی - (گورکھپوری) پیغمبر اسلام نے تاریخ و تمدن، تہذیب و اخلاق کو وہ کچھ دیا ہے جو شاید ہی کوئی اور بڑی ہستی دے سکی ہو"

مؤرخ ولیم ڈاڈ :- "آپ کا وہ کمال جو آپ نے فتح (مکہ) کے بعد منافقوں کے حق میں ظاہر کیا - اخلاق انسانی کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے"

ریورنڈ آر میکو کل :- "اگر آپ کی تعلیم پر انصاف و ایمانداری سے تنقیدی نظر ڈالی جائے تو یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ وہ مرسل اور مامور من اللہ تھے"

پروفیسر باسورتھ اسمتھ :- "بلاشک حضرت محمد خدا کے رسول ہیں - اگر پوچھا جائے کہ افریقہ (بلکہ کل دنیا) کو مسیحی مذہب نے زیادہ فائدہ پہنچایا یا اسلام نے ؟ تو جواب میں کہنا پڑے گا کہ اسلام نے - اگر محمد کو قریش ہجرت سے پہلے خدانخواستہ شہید کر ڈالتے - تو مشرق و مغرب دونوں ناقص و ناکارہ رہ جاتے - اگر آپ نہ آتے تو دنیا کا ظلم بڑھتے بڑھتے اس کو تباہ کر دیتا - اگر آپ نہ ہوتے تو یورپ کے تاریک زمانے دو چند بلکہ سہ چند تاریک تر ہو جاتے - اگر آپ نہ ہوتے تو انسان ریگستانوں میں پڑے بھٹکتے پھرتے - جب میں آپ کے جملہ صفات اور تمام کارناموں پر بہ حیثیت مجموعی نظر ڈالتا ہوں کہ آپ کیا تھے اور کیا ہو گئے اور آپ کے تابعدار غلاموں نے جن میں آپ نے زندگی کی روح پھونک دی تھی - کیا کیا کارنامے دکھائے - تو آپ مجھے سب سے بزرگ تر - سب سے برتر اور بے نظیر آپ ہی دکھائی دیتے ہیں"

مسٹر سیل :- "میں نے اپنی تحقیقات میں کوئی ثبوت ایسا نہیں پایا - جس سے حضرت محمد صاحب کے دعویٰ رسالت میں شبہ ہو سکے - یا آپ کی مقدس ذات پہ مکر و فریب کا الزام لگایا جا سکے"

نبوّتِ محمدی کا عقلی ثبوت

تھوڑی دیر کیلئے جسمانی آنکھیں بند کر کے تصوّر کی آنکھیں کھول لیجئے اور ایک ہزار چار سو برس پیچھے پلٹ کر دُنیا کی حالت پر نظر ڈالئے۔ یہ کیسی دُنیا تھی؟ انسان اور انسان کے درمیان تبادلۂ خیالات کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع کتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں۔ اس کے خیالات کس قدر تنگ تھے۔ اس پر وہم اور توحش کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دھندلی تھی اور اس اندھیرے کو دھکیل دھکیل کر کتنی دقتوں کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ دُنیا میں نہ تار تھا نہ ٹیلیفون تھا۔ نہ ریڈیو تھا نہ ریل اور ہوائی جہاز تھے۔ نہ مطابع اور اشاعت خانے تھے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت تھی۔ نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے۔ نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں۔ نہ کثرت سے اُن کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بھی بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عامی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اُس زمانے کی ایک اُونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے ایک مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اُس زمانے کا ایک نہایت روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریک خیال آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و ناکس کو معلوم ہیں وہ اُس زمانے میں برسوں کی محنت اور تلاش و تحقیق کے بعد بھی مشکل معلوم ہو سکتی تھیں۔ جو معلومات آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہیں اور ہر بچّے کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں۔ اُن کے لئے اُس زمانے میں سینکڑوں میل کے سفر کئے جاتے تھے۔ اور عمریں اُن کی جستجو میں بیت جاتی تھیں۔ جن باتوں کو آج اوہام اور خرافات سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس زمانے کے "حقائق" تھے۔ جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے وہ اُس زمانے کے عام معمولات تھے۔ جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر نفرت کرتا ہے وہ اس زمانے کے اخلاقیات میں نہ صرف جائز تھے۔ بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی عجائب پرستی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ کسی چیز میں اُس وقت تک کوئی صداقت، کوئی بزرگی، کوئی پاکیزگی تسلیم ہی نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ فوق الفطرت نہ ہو۔ خلافِ عادت نہ ہو۔ غیر معمولی نہ ہو۔ حتیٰ کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا خدا رسیدہ ہونا اور کسی خدا رسیدہ ہستی کا انسان ہونا اُس کے تصوّر کی رسائی سے بہت دُور تھا!

اس تاریک دَور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا جہاں تاریکی کا تسلّط اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ جو ممالک اُس زمانے کے معیارِ تمدّن کے لحاظ سے متمدّن تھے۔ اُن کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اُس کے اِردگرد ایران، روم، اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی۔ مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو اُن سے جُدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لئے جاتے تھے۔ اور صرف اموال کا مبادلہ کر کے واپس آ جاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی اُن کے ساتھ نہ آتی تھی۔

ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا۔ نہ کتب خانہ تھا۔ نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا۔ نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنہیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اُس زمانے کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ اُن کے پاس ایک اعلیٰ درجہ کی باقاعدہ زبان ضرور تھی جس میں بلند خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اُن میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا۔ مگر اُن کے لٹریچر کے جو کچھ بھی باقیات ہم تک پہنچے ہیں۔ اُن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی معلومات کس قدر محدود تھیں۔ تہذیب و تمدّن میں اُن کا درجہ کس قدر پست تھا۔ اُن پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا۔ اُن کے خیالات اور اُن کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی۔ اُن کے اخلاقی تصورات کتنے بھدّے تھے!

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی۔ کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار رہتا۔ اور صرف "جنگل کے قانون" کی پیروی کی جاتی تھی۔ جس کا جس پر بس چلتا اُسے مار ڈالتا۔ اور اُس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدّو کے فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلہ کا نہیں ہے اُسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اُس کے مال پر کیوں نہ متصرف ہو جائے!

اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات اُن لوگوں میں تھے۔ وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ تھے۔ پاک اور ناپاک، جائز اور ناجائز، شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ اُن کی زندگی نہایت گندی تھی۔ اُن کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا، جُوا، شراب، چوری، رہزنی، اور قتل و خونریزی اُن کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے۔ اُن کی عورتیں تک ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ وہ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کر دیتے تھے۔ محض اس جاہلانہ خیال کی بناء پر کہ کوئی اُن کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انہیں کھانے اور لباس اور طہارت کے معمولی آداب تک معلوم نہ تھے!

مذہب کے باب میں وہ اُن تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصّہ دار تھے۔ جن میں اس زمانے کی دُنیا مبتلا تھی۔ بُت پرستی، ارواح پرستی، کواکب پرستی۔ غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اُس وقت دُنیا میں جتنی "پرستیاں" پائی جاتی تھیں وہ سب اُن میں رائج تھیں۔ انبیائے قدیم اور اُن کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم اُن کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اُن کے باپ ہیں۔ مگر یہ نہ جانتے تھے کہ ان دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا۔ اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے مگر اُن کی جو روایتیں عرب کے مؤرخین نے نقل کی ہیں اُن کو پڑھ جایئے۔ کہیں آپ کو صالحؑ اور ہودؑ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ اُن کو یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے انبیائے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں۔ مگر وہ جیسی کچھ تھیں اُن کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک نظر اُن اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے۔ جو مفسرین اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیاء سے واقف تھے۔ وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق اُن لوگوں کا تصوّر کس قدر گھٹیا درجہ کا تھا!

ایسے زمانے میں، ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں ماں باپ اور دادا کا سایہ اُس کے سر سے اُٹھ جاتا ہے، اس لئے اس گئی گزری حالت میں ایک عرب بچے کو جو تھوڑی بہت تربیت مل سکتی تھی وہ بھی اس کو نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے، اُٹھنا، بیٹھنا، ملنا، جلنا،

سب کچھ انہی عربوں کے ساتھ رہ۔ جن کا حال اُوپر آپ نے دیکھ لیا۔ تعلیم کا نام تک نہیں۔ حتیٰ کہ پڑھنا لکھنا تک نہیں آتا کسی عالم کی صحبت بھی میسر نہ ہوئی کہ "عالِم" کا وجود اُس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔ چند مرتبہ اُسے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا مگر یہ سفر شام کے علاقے تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے اُس زمانے میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر ان اسفار کے دوران میں اُس نے کچھ آثارِ علم وتہذیب کا مشاہدہ کیا اور کچھ اہلِ علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو ظاہر ہے کہ ایسے منتشر مشاہدات اور ایسی ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی۔ اُن کا اثر کسی شخص پر اتنا زبردست نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد، بالکل مختلف اور اتنا بلند ہوجائے کہ اُس میں اور اس کے ماحول میں کچھ نسبت ہی نہ رہے۔ اُن سے ایسا علم حاصل ہونا ممکن نہیں ہے۔ جو ایک اَن پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دُنیا کا، اور ایک زمانے کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنادے۔ اگر بہ فرضِ محال اُس نے باہر کے لوگوں سے علمی استفادہ کیا بھی ہو تو جو معلومات اُس وقت دُنیا میں کسی کو حاصل ہی نہ تھیں، مذہب، اخلاق، تہذیب اور تمدن کے جو تصورات اور اصول اُس وقت دُنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے۔ انسانی سیرت کے جو نمونے اس وقت کہیں پائے ہی نہیں جاتے تھے۔ اُن کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا تھا!

صرف عرب ہی کا نہیں تمام دُنیا کا ماحول پیشِ نظر رکھئے اور دیکھئے:۔

یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوا۔ جن میں بچپن گزارا۔ جن کے ساتھ پل کر جوان ہوا۔ جن سے اُس کا میل جول رہا۔ جن سے اُس کے معاملات رہے۔ ابتداء ہی سے عادات میں، اخلاق میں، وہ ان سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اُس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے۔ اس کے کسی بدترین دشمن نے بھی کبھی اُس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ وہ فلاں موقع پر جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا۔ کسی نے اس کی زبان سے کبھی گالی یا کوئی فحش بات نہیں سُنی وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتا ہے۔ مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور تو تو میں میں کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی زبان میں سختی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو اس سے ملتا ہے گرویدہ ہوجاتا ہے۔ وہ کسی سے بدمعاملگی نہیں کرتا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقے سے نہیں لیتا۔ جن لوگوں سے اس کے معاملات پیش آتے ہیں، وہ سب اس کی ایمانداری پر کامل بھروسہ رکھتے ہیں۔ ساری قوم اس کو امین کہتی ہے۔ دشمن تک اس کے پاس اپنے قیمتی مال رکھواتے ہیں۔ اور وہ ان کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بے حیا لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیادار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا۔ بداخلاقوں کے درمیان وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کبھی کسی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ شراب اور جُوئے کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ ناشائستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شائستہ ہے کہ ہر بدتمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے اور اس کے ہر کام میں ستھرائی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ سنگدلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔

یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے۔ مسافروں کی میزبانی کرتا ہے، کسی کو اس سے دُکھ نہیں پہنچتا اور وہ دُوسروں کی خاطر دُکھ اُٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں فساد اور خونریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اس کو اذیت ہوتی ہے۔ اپنے قبیلے کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے۔ اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بُت پرستوں کے درمیان وہ سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہے کہ زمین وآسمان میں کوئی چیز اُسے پُوجنے کے لائق نظر نہیں آتی۔

کسی مخلوق کے آگے اُس کا سر نہیں جھکتا - بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی وہ قبول نہیں کرتا - اس کا دل خود بخود شرک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے!

اس ماحول میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے یا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے!

تقریباً چالیس تک ایسی پاک، صاف، شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے - وہ اس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے جو اس کو ہر طرف سے محیط نظر آ رہی ہے - وہ جہالت، بداخلاقی، بدکرداری، بدنظمی، شرک اور بت پرستی کے اس ہولناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے، جو اس کو گھیرے ہوئے تھا - اس ماحول میں کوئی چیز بھی اس کو اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی - وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دُور پہاڑوں کی صحبت میں جا کر بیٹھنے لگتا ہے - تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزارتا ہے - روزے رکھ رکھ کر اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے - سوچتا ہے - غور و فکر کرتا ہے - کوئی ایسی روشنی ڈھونڈتا ہے جس سے وہ اس چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو دُور کر دے - ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے - جس سے اس بگڑی ہوئی دُنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے!

یکایک اس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رُونما ہوتا ہے - ایک دم سے اس کے دل میں وہ روشنی آجاتی ہے جو پہلے اس میں نہ تھی - اچانک اس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا - وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے - اپنی قوم کے پاس آتا ہے - اُس سے کہتا ہے کہ یہ بُت جن کے آگے تم جھکتے ہو - یہ سب بے حقیقت چیزیں ہیں - انھیں چھوڑ دو - کوئی انسان، کوئی درخت، کوئی پتھر - کوئی روح - کوئی سیارہ اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے سر جُھکاؤ اور اس کی بندگی و عبادت کرو اور اس کی فرمانبرداری و اطاعت کرو - یہ زمین، یہ چاند، یہ سورج، یہ ستارے، یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک خدا کی مخلوق ہیں - وہی تمہارا اور ان سب کا پیدا کرنے والا ہے - وہی رزق دینے والا ہے - وہی مارنے اور جلانے والا ہے - اُسی کی بندگی کرو - اسی کا حکم مانو اور اسی کے آگے سر جھکاؤ - یہ چوری، یہ لوٹ مار، یہ قتل و غارت، یہ ظلم و ستم، یہ بدکاریاں جو تم کرتے ہو سب گناہ ہیں - انھیں چھوڑ دو - خدا انھیں پسند نہیں کرتا - سچ بولو - انصاف کرو - نہ کسی کی جان لو - نہ کسی کا مال چھینو - جو کچھ لو حق کے ساتھ لو - جو کچھ دو حق کے ساتھ دو - تم سب انسان ہو - انسان اور انسان سب برابر ہیں - نہ کوئی ذلّت کا داغ لے کر پیدا ہوا اور نہ کوئی عزت کا تمغہ لے کر دنیا میں آیا - بزرگی اور شرف نسل اور نسب میں نہیں - صرف خدا پرستی اور نیکی اور پاکیزگی میں ہے - جو خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے وہی اعلیٰ درجہ کا انسان ہے - اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں -

مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے تم میں سے ہر ہر شخص اپنے اعمال کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ ہے - اُس خدا کے سامنے جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے - تم کوئی چیز اُس سے نہیں چھپا سکتے - تمہاری زندگی کا کارنامہ اُس کے سامنے بے کم و کاست پیش ہوگا اور اسی کارنامہ کے لحاظ سے وہ تمہارے انجام کا فیصلہ کرے گا - اُس عادل حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلے گی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائیگا - وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہوگی - جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنّت میں جائے گا - اور جس کے پاس اِن میں سے

کچھ بھی نہ ہوگا - وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا -

یہ تھا وہ پیغام جسے لے کر وہ غار سے نکلا -

جاہل قوم اس کی دشمن ہو جاتی ہے - گالیاں دیتی ہے - پتھر مارتی ہے - ایک دن دو دن نہیں اکٹھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم توڑتی ہے - یہاں تک کہ اُسے وطن سے نکال باہر کرتی ہے - اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی - جہاں وہ جاکر پناہ لیتا ہے وہاں بھی اُسے ہر طرح ستاتی ہے - تمام عرب کو اُس کے خلاف اُبھار دیتی ہے اور کامل آٹھ برس اُس کے خلاف برسرپیکار رہتی ہے - وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے مگر اپنی بات سے نہیں ٹلتا -

یہ قوم اُس کی دشمن کیوں ہوئی ؟ کیا زر اور زمین کا کوئی جھگڑا تھا ؟ کیا وہ ان سے دُنیا کی کوئی چیز بھی مانگ رہا تھا ؟ نہیں ساری دشمنی صرف اس بات پر تھی کہ وہ ایک خدا کی بندگی اور پرہیزگاری اور نیکوکاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے - بُت پرستی اور شرک اور بدعملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے - پُجاریوں اور پروہتوں کی پیشوائی پر کیوں ضرب لگاتا ہے - سرداروں کی سرداری کا طلسم کیوں توڑتا ہے - انسان اور انسان کے درمیان سے اونچ نیچ کا فرق کیوں مٹانا چاہتا ہے - قبائلی اور نسلی تعصبات کو جاہلیت کیوں قرار دیتا ہے - زمانہ قدیم سے سوسائٹی کا جو نظام بندھا چلا آرہا ہے اُسے کیوں توڑنا چاہتا ہے - قوم کہتی تھی کہ یہ باتیں جو تو کہہ رہا ہے - یہ سب خاندانی روایات اور قومی طریقے کے خلاف ہیں تو ان کو چھوڑ دے ورنہ ہم تیرا جینا مشکل کردیں گے !

اچھا تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اُٹھائیں ؟ قوم اس کو بادشاہی دینے پر آمادہ تھی - دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار تھی - بشرطیکہ وہ اپنی اس تعلیم سے باز آجائے - مگر اس نے ان سب کو ٹھکرا دیا - اور اپنی تعلیم کی خاطر پتھر کھانا اور ظلم سہنا قبول کیا - یہ آخر کیوں ؟ کیا ان کے خدا پرست اور نیکوکار بن جانے میں اس کا کوئی ذاتی فائدہ تھا ؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلہ میں ریاست اور امارت اور دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابلِ التفات تھے ؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی اذیتوں میں مبتلا ہونا اور کامل اکیس ۲۱ سال مبتلا رہنا بھی گوارا کرسکتا ہو ؟ غور کرو ! کیا نیک نفسی ایثار اور ہمدردی بنی نوع کا اس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمہارے تصور میں آسکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدہ کی خاطر نہیں ، دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھائے ؟ جن کی بھلائی اور بہتری کے لئے وہ کوشش کرتا ہے - وہی اس کو پتھر ماریں - گالیاں دیں - گھر سے بے گھر کردیں - غریب الوطنی میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے !

پھر دیکھو ! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کے پیچھے ایسی مصیبتیں برداشت کرسکتا ہے ؟ کیا کوئی تیر تکے لڑانے والا انسان محض گمان اور قیاس سے کوئی بات کہہ کر اُس پر اتنا جم سکتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اُس پر ٹوٹ جائیں زمین اُس پر تنگ کردی جائے - تمام ملک اُس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہو - بڑی بڑی فوجیں اُس پر اُمنڈ اُمنڈ کر آئیں مگر وہ اپنی بات سے یک سر مُو ہٹنے پر آمادہ نہ ہو ؟ یہ استقامت ، یہ عزم ، یہ ثبات ، خود گواہی دے رہا ہے کہ اس کو اپنی صداقت پر یقین اور کامل یقین تھا - اگر اس کے دل میں شک اور شبہ کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل اکیس سال تک مصائب کے ان پے درپے طوفانوں کے مقابلہ میں کبھی نہ ٹھہر سکتا !

یہ تو اُس شخص کے انقلاب حال کا ایک پہلو تھا - دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے !

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا - عام عربوں کی طرح - اس دوران میں کسی نے اس سوداگر کو ایک خطیب ، ایک جادو بیان مقرر کی حیثیت سے نہ جانا - کسی نے اس کو حکمت اور دانائی کی باتیں کرتے نہ سنا - کسی نے اس کو الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق اور قانون اور سیاسیات اور معاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا - کسی نے اس سے خدا اور ملائکہ اور آسمانی کتابوں اور پچھلے انبیاء اور امم قدیمہ اور قیامت اور حیات بعد الموت اور دوزخ و جنّت کے متعلق ایک لفظ بھی نہ سُنا - وہ پاکیزہ اخلاق ، شائستہ اطوار اور بہترین سیرت تو ضرور رکھتا تھا - مگر چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک اُس کی ذات میں کوئی بھی غیر معمولی بات نہ پائی گئی - جس سے لوگ متوقع ہوتے کہ یہ شخص اب کچھ بننے والا ہے - اُس وقت تک جاننے والے اُس کو محض ایک خاموش — امن پسند اور نہایت شریف انسان کی حیثیت سے جانتے تھے - مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر نکلا تو یک لخت اُس کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی !

اب وہ ایک حیرت انگیز کلام سُنا رہا تھا - جس کو سُن کر سارا عرب مبہوت ہو گیا - اس کلام کی شدّتِ تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے کٹّر دشمن بھی اُس کو سُنتے ہوئے ڈرتے تھے - کہ کہیں یہ دل میں اُتر نہ جائے - اس کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام قومِ عرب کو جس میں بڑے بڑے شاعر ، خطیب اور زبان آوری کے مدعی موجود تھے - اُس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی سورۃ اس کے مانند بنا لاؤ - مگر کوئی اس کے مقابلے کی جراُت نہ کر سکا - ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کانوں نے سُنا ہی نہ تھا !

اب یکایک وہ ایک بے مثل حکیم - ایک لاجواب مصلحِ اخلاق و تمدّن - ایک حیرت انگیز ماہرِ سیاست ، ایک زبردست مقنّن - ایک اعلیٰ درجہ کا جج - ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا - اُس نے ، اُس اَن پڑھ صحرا نشین نے حکمت اور دانائی کی وہ باتیں کہنی شروع کر دیں - جو اس سے پہلے نہ کسی نے کہی تھیں - نہ آج تک کوئی کہہ سکا - وہ اُمّی الٰہیات کے عظیم الشان مسائل پر فیصلہ کن تقریریں کرنے لگا - تاریخ اقوام سے عروج و زوالِ امم کے فلسفہ پر لیکچر دینے لگا - پُرانے مصلحین کے کارناموں پر تبصرے اور مذاہبِ عالم پر تنقید اور اختلافاتِ اقوام کے فیصلے کرنے لگا - اخلاق اور تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا !

اُس نے معاشرت اور معیشت اور اجتماعی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانے شروع کر دیئے - اور ایسے قوانین بنائے کہ بڑے بڑے علماء اور عقلاء غور و خوض اور عمر بھر کے تجربات کے بعد بمشکل ان حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں - اور دُنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں ، اُن کی حکمتیں اور زیادہ کھُلتی جاتی ہیں !

وہ خاموش پُر امن سوداگر - جس نے تمام عمر کبھی تلوار نہ چلائی تھی - کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی - حتیٰ کہ جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا - دیکھتے دیکھتے وہ ایک ایسا بہادر سپاہی بن گیا - جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا - ایسا زبردست جنرل بن گیا جس نے نو سال کے اندر تمام ملکِ عرب کو فتح کر لیا - ایسا حیرت انگیز ملٹری لیڈر بن گیا کہ اُس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی روح کے اثر سے بے سروسامان عربوں نے چند سال میں دُنیا کی دو عظیم الشان

فوجی طاقتوں کو اُلٹ کر رکھ دیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان ۔ جس کے اندر کسی نے چالیس برس تک سیاسی دلچسپی کی بو بھی ۔ پائی
یکایک اتنا زبردست ریفارمر اور مدبر بن کر ظاہر ہوا کہ ۲۳ سال کے اندر اس نے بارہ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ر
کے منتشر، جنگجو، جاہل، سرکش، غیر متمدن، اور ہمیشہ آپس میں لڑتے رہنے والے قبائل کو، ریل اور تار اور ریڈیو اور پریس
کے بغیر ۔ ایک مذہب، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظام حکومت کا تابع بنا دیا ۔ اُس نے اُن کے خیالات بدل
اُن کے خصائل بدل دیئے ۔ اُن کے اخلاق بدل دیئے ۔ اُن کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں، اُن کی وحشت کو
مدنیت میں ۔ اُن کی بدکرداری کو اور بد اخلاقی کو صلاح و تقویٰ اور مکارم اخلاق میں ۔ اُن کی سرکشی اور انارکی کو انتہا
کی پابندیٔ قانون اور اطاعتِ امر میں تبدیل کر دیا ۔ اُس بانجھ قوم کو جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابل
انسان پیدا نہ ہوا تھا ۔ اس نے ایسا مردم خیز بنایا کہ اس میں ہزاروں ہزار اعاظم رجال اٹھ کھڑے ہوئے اور دنیا کو دین
اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لئے چار دانگ عالم میں پھیل گئے!

اور یہ کام اُس نے ظلم اور جبر اور دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا ۔ بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق اور روحوں کو مسخر کر
والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعلیم سے انجام دیا ۔ اُس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنایا ۔ ر
شفقت سے دلوں کو موم کیا ۔ عدل اور انصاف سے حکومت کی ۔ حق اور صداقت سے کبھی یک سرِمُو انحراف نہ کیا ۔ ج
میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی ۔ اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا ۔ جو اُس کے خون کے پیاسے تھے ۔ جنہوں
اس کو پتھر مارے تھے ۔ اُس کو وطن سے نکالا تھا ۔ اُس کے خلاف تمام عرب کو کھڑا کر دیا تھا ۔ حتیٰ کہ جنہوں نے جوشِ
میں اس کے چچا کا کلیجہ تک نکال کر چبا ڈالا تھا ۔ اُن کو بھی اُس نے فتح پا کر بخش دیا ۔ اپنی ذات کے لئے کبھی اُس
کسی سے بدلہ نہ لیا!

ان سب باتوں کے ساتھ اس کے ضبطِ نفس بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا ۔ اُس وقت بھی
جیسا فقیر پہلے تھا ویسا ہی فقیر رہا ۔ پھونس کے چھپر میں رہتا تھا ۔ بوریئے پر سوتا تھا ۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا ۔ غریبوں کی سی
کھاتا تھا ۔ فاقے تک کر گزرتا تھا ۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا ۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خ
کرتا تھا ۔ ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں بھی اُسے تامل نہ تھا ۔ آخر وقت تک اس کے اندر شاہانہ تمکنت اور امیرانہ تر
اور بڑے آدمیوں کے سے تکبر کی ذرا سی بو بھی پیدا نہ ہوئی ۔ وہ ایک آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا تھا ۔ اُن کے دکھ درد میں شر
ہوتا تھا ۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار ۔ ملک
بادشاہ کون ہے ۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ
جیسا ایک انسان ہے ۔ تمام عمر کی جدوجہد میں اُس نے اپنی ذات کے لئے کچھ بھی نہ چھوڑا ۔ اپنا پورا ترکہ اپنی قوم پر وقف کر
اپنے پیرووں پر اُس نے اپنے یا اپنی اولاد کے کچھ بھی حقوق قائم نہ کئے ۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی
محروم کر دیا ۔ محض اس خوف سے کہ کہیں آگے چل کر اس کے پیرو اُس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگ جائیں

اس عظیم الشان انسان کے مرتبہ کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے آپ کو تاریخِ عالم پر بحیثیتِ مجموعی ایک نظر
چاہیئے ۔ آپ دیکھیں گے کہ صحرائے عرب کا یہ اَن پڑھ بادیہ نشین جو چودہ سو برس پہلے اُس تاریک دور میں پیدا ہوا

ل دَورِ جدید کا بانی اور تمام دُنیا کا لیڈر ہو۔ وہ نہ صرف اُن کا لیڈر ہے جو اُسے لیڈر مانتے ہیں۔ بلکہ اُن کا بھی لیڈر ہے
سے نہیں مانتے۔ اُن کو اس امر کا احساس تک نہیں کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں اُس کی رہنمائی کس طرح اُن کے
ت میں، اُن کے اصولِ حیات اور قوانینِ عمل میں اور اُن کے عصرِ جدید کی روح میں پیوست ہوگئی ہو!

یہی شخص ہے جس نے دُنیا کے تصورات کا رُخ دہمیت اور عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے ہٹا کر عقلیت اور
ت پسندی اور متقیانہ دُنیاداری کی طرف پھیر دیا۔ اُسی نے محسوس معجزے مانگنے والی دُنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور
کو معیارِ صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اُسی نے خرقِ عادت میں خدا کی خدائی کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں
یں اور اُنھیں آثارِ فطرت (Natural Phenomena) میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خوگر بنایا۔ اُسی نے خیالی
سے دوڑانے والوں کو قیاس آرائی (speculation) سے ہٹا کر تعقل اور تفکر اور مشاہدہ اور تحقیق کے راستہ پر
۔ اُسی نے عقل و حس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے۔ مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔
سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا رابطہ قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دُنیا میں سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک
ٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔ اُسی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا۔ اور علم کی طاقت سے توحید کا
اد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بُت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر
ر ہوگئے۔ اُسی نے اخلاق اور روحانیت کے بُنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دُنیا اور نفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے
۔ جن کے نزدیک نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے اور دُنیوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور
ت ممکن ہی نہ تھی۔ اُن کو اُسی نے تمدن اور سماج اور دُنیوی عمل کے اندر فضیلتِ اخلاق اور ارتقائے روحانی اور حصولِ
ت کا راستہ دکھایا۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان اور اوتار اور
اللہ کے سوا کسی کو ہادی و رہنما تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے۔ اُن کو اسی نے بتایا کہ انسان اور تمہارے ہی جیسا انسان آسمانی
ابت کا نمائندہ اور خداوندِ عالم کا خلیفہ ہو سکتا ہے۔ جو لوگ ہر طاقتور انسان کو اپنا خدا بناتے تھے۔ اُن کو اُسی نے
یا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدس اور حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے
نہ کسی پر ناپاکی اور محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔ اسی تعلیم نے دُنیا میں وحدتِ انسانی اور مساوات اور
یت اور آزادی کے تخیلات پیدا کئے ہیں!

تصورات سے آگے بڑھیئے۔ آپ کو اس اُمّی کی لیڈرشپ کے عملی نتائج دُنیا کے قوانین اور طریقوں اور معاملات
اس کثرت سے نظر آئیں گے کہ اُن کا شمار مشکل ہو جائے گا۔ اخلاق اور تہذیب، شائستگی اور طہارت و نظافت کے
ہی رسول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دُنیا میں پھیل گئے ہیں۔ معاشرت کے جو قوانین اُس نے بنائے تھے۔
انے کس قدر اُن کی خوشہ چینی کی اور اب تک کئے جا رہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اُس نے سکھائے تھے اُن
دُنیا میں کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں۔ اور اب تک پیدا ہوتے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اُس نے اختیار کئے تھے
سے دُنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے انقلاب برپا ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ عدل اور قانون کے جو اصول اُس نے وضع
تھے انھوں نے دُنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی افکار کو کس قدر متاثر کیا۔ اور اب تک اُن کی تاثیر خاموشی
ساتھ جاری ہی۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دُنیا میں قائم کی وہ دراصل یہی عرب

کا اُتی ہے۔ ورنہ پہلے دُنیا اس سے ناواقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہوسکتی ہے۔ اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بُنیاد پر بھی معاملات ہونے ممکن ہیں!

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند و بالا شخصیت اتنی اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتداء سے لے کر اب تک کے بڑے سے بڑے تاریخی انسان جن کو دُنیا اکابر (Heroes) میں شمار کرتی ہے۔ جب اُس کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں تو اُس کے آگے بَونے نظر آتے ہیں۔ دُنیا کے اکابر میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمال کی چمک دمک انسانی زندگی کے ایک دو شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پُتلا ہے مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبیر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے ایک پہلو پر اتنی زیادہ گہری جمی ہے کہ دُوسرے پہلو اوجھل ہوگئے ہیں۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا تو معیشت و سیاست کو بُھلا دیا۔ کسی نے معیشت و سیاست کو لیا تو اخلاق و روحانیت کو نظر انداز کردیا۔ غرض تاریخ میں ہر طرف یک رُخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔

مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی اور حکیم بھی ہے اور خود ہی اپنے فلسفہ کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مدبّر بھی ہے۔ فوجی لیڈر بھی ہے۔ واضع قانون بھی ہے۔ معلمِ اخلاق بھی ہے۔ مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پُوری زندگی پر پھیلتی ہے اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی کے طریقوں سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے۔ اپنے نظریات کے مطابق ایک مستقل تہذیب (Civilisation) وجود میں لاکر دکھا دیتا ہے۔ اور زندگی کے تمام مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن (Equilibrium) قائم کرتا ہے کہ افراط و تفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔ کیا کوئی دُوسرا شخص اس جامعیت کا تمہاری نظر میں ہے؟

دُنیا کی بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو کم و بیش اپنے ماحول کی پیداکردہ نہ ہو۔ مگر اس شخص کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا۔ اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ عرب کا ماحول اُس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر تم جو کچھ کہہ سکتے ہو۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ تاریخی اسباب، عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا تقاضا کرتے تھے جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا۔ اور ممالک کو فتح کرکے عربوں کی معاشی فلاح و بہبود کا سامان کرتا۔ یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر جو اس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا، ظلم، بے رحمی، خونریزی اور مکر و دغا۔ غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بناتا اور ایک سلطنت پیدا کرکے اپنے پس ماندوں کے لئے چھوڑ جاتا۔ اس کے سوا اس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا تم ثابت نہیں کرسکتے۔

ہیگل کے فلسفۂ تاریخ یا مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے نقطۂ نظر سے تم حد سے حد یہی حکم لگا سکتے ہو کہ اُس وقت اس ماحول میں ایک قوم اور ایک سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیئے تھا۔ یا ظاہر ہوسکتا تھا۔ مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعہ کی توجیہ کیونکر کرے گا کہ اُس وقت اُس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا جو بہترین اخلاق سکھانے والا، انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور جاہلیت کے اوہام و تعصبات کو مٹانے والا تھا۔ جس کی نظر قوم اور نسل اور

ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت پر پھیل گئی - جس نے اپنی قوم کے لئے نہیں بلکہ عالمِ انسانی کے لئے ایک اخلاقی و روحانی اور تمدنی و سیاسی نظام کی بناء ڈالی - جس نے معاشی معاملات اور سیاستِ مدن اور بین الاقوامی تعلقات کو عالمِ خیال میں نہیں بلکہ عالمِ واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھایا - اور روحانیت و مادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہکار ہے جیسا اُس وقت تھا - کیا ایسے شخص کو تم عربِ جاہلیت کے ماحول کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا - بلکہ جب ہم اس کے کارنامہ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے - اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی - صدیوں اور ہزاروں (Millenniums) کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے - وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لئے ایسی اخلاقی اور عملی ہدایات دیتا ہے جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں - وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کو تاریخ نے پُرانا کر دیا ہے - جن کی تعریف ہم صرف اس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ اپنے زمانہ کے اچھے رہنما تھے - سب سے الگ اور سب سے ممتاز - وہ انسانیت کا ایسا رہنما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت (March) کرتا ہے - اور ہر دَور میں ویسا ہی جدید (Modern) نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دَور کے لئے تھا!

تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ "تاریخ بنانے والے" (Makers of History) کا لقب دیتے ہو - وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے (Creatures of History) ہیں - دراصل تاریخ بنانے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے، دُنیا کے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کئے ہیں اُن کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو تم دیکھو گے کہ ہر ایسے موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے - اور وہ اسباب خود ہی اُس انقلاب کا رُخ اور راستہ بھی معیّن کر رہے تھے - جس کے برپا ہونے کے وہ مقتضی تھے - انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضاء کو قوت سے فعل میں لانے کے لئے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لئے اسٹیج اور کام دونوں پہلے سے معیّن ہو مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے - وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کیا - جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا وہاں اس نے خود مواد تیار کیا - جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی وہاں اُس نے خود اپنے مطلب کے آدمی تیار کئے - اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزارہا انسانوں کے قالب میں اُتار دیا - اور اُن کو ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا - اُس کی طاقت اور قوتِ ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان کیا - خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معیّن کی اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اس راستہ پر چلایا جس پر وہ اسے چلانا چاہتا تھا - اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبہ کا انقلاب انگیز تم کو اور کہاں نظر آتا ہے؟

آیئے اب اس سوال پر غور کیجئے کہ چودہ سو برس پہلے کی تاریک دُنیا میں - عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشہ میں، ایک گلہ بانی اور سوداگری کرنے والے اَن پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکایک اتنا علم، اتنی روشنی، اتنی طاقت، اتنے کمالات، اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کونسا ذریعہ تھا؟ آپ کہتے ہیں کہ یہ سب اُس کے اپنے دل و دماغ کی پیداوار تھی - میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اُس کو خدائی دعویٰ کرنا

چاہیئے تھا۔ اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دُنیا جس نے رام کو خدا بنا ڈالا۔ جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامّل نہ کیا۔ جس نے بُدھ کو خود بخود معبود بنا لیا۔ جس نے مسیح کو آپ اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا۔ جس نے آگ اور پانی اور ہوا تک کو پوج ڈالا۔ وہ ایسے زبردست باکمال شخص کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو۔ وہ خود کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں سے ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ:۔

میں ایک انسان ہوں۔ تم ہی جیسا انسان۔ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں۔ سب کچھ خدا کا ہے۔ اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوعِ انسانی عاجز ہے۔ میرا کلام نہیں ہے۔ میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے۔ لفظ بلفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے۔ اور اس کی تعریف خدا ہی کے لئے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھائے، یہ قوانین جو میں نے وضع کئے۔ یہ اصول جو میں نے تمہیں سکھائے ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے خود نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی رہنمائی کا محتاج ہوں۔ اُدھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔"

دیکھو یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے۔ کیسی امانت اور راست بازی ہے۔ جھوٹا انسان تو بڑا بننے کے لئے دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ بھی لے لینے میں تامّل نہیں کرتا۔ جن کے اصل ماخذ کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔ لیکن یہ شخص اُن کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا۔ جن کو اگر وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اُس کو جھٹلا نہ سکتا تھا۔ کیونکہ کسی کے پاس اُس کے اصلی ماخذ تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ سچائی کی اس سے زیادہ کھُلی ہوئی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس شخص سے زیادہ سچّا اور کون ہوگا جس کو ایک نہایت مخفی ذریعہ سے ایسے بے نظیر کمالات حاصل ہوں۔ اور وہ بلا تکلف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟ بتاؤ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟

(ترجمان القرآن۔ شوال ۱۳۵۱ھ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

محمد ناظم ندوی

عربی نعت کے چند منتخبات

چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں جزیرۃ العرب کے اہلِ کتاب ایک نبی کی بعثت کے منتظر تھے اور اکثر کفار و مشرکین عرب کو دھمکی دیا کرتے تھے کہ وہ آنے والے نبی کی قیادت و سیادت میں اپنی فوجی و عسکری قوت جمع کر کے انھیں شکست دیں گے کہ دیکھا یک فاران کی چوٹی سے آفتابِ رسالت طلوع ہوا۔ مگر یہودیوں کی امید و تحفظ کے برخلاف آخرالزماں نبی علیہ السلام بنی اسرائیل کے بجائے حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے۔

بعثتِ محمدیہ کی خبر بجلی کی طرح سارے عرب میں پھیل گئی۔ دور دراز سے قبائل نے تحقیق حال کے لئے آپ ہوشیار و فہیم افراد کو مکہ معظمہ بھیجنا شروع کر دیا۔ جاہلیت کی ایک روایت کے مطابق عرب کے مشہور شاعر زہیر بن سلمیٰ نے جن کو حضرت عمر فاروق تمام جاہلی شعراء پر ترجیح دیتے تھے۔ ایک خواب دیکھا تھا کہ آسمان سے ایک رسّی لٹک رہی ہے مگر وہ اتنی بلند ہے کہ اس کے سرے کو ان کا ہاتھ نہیں چھو سکتا۔ زہیر نے اپنا خواب کسی کاہن سے بیان کیا تو اس نے تعبیر دی کہ ایک نبی کی بعثت کا زمانہ بہت قریب ہے۔ مگر تم ان کے عہدِ نبوت کو نہیں پاؤ گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے کچھ قبل زہیر کا انتقال ہو گیا!

زہیر نے اپنے دونوں لڑکے کعب و بجیر کو وصیت کی کہ جب یہ نبی اپنی دعوت لوگوں کے سامنے پیش کریں تو تم ان کی تائید کرنا۔ چنانچہ کعب نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی خبر سنی تو اپنے بھائی بجیر بن زہیر کی تحقیق حال کے لئے حجاز بھیجا۔ بجیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی مسلمان ہو گئے۔ کعب کو یہ بات ناگوار گزری کہ بغیر اس سے مشورہ کئے اس نے اپنا آبائی دین کیوں چھوڑ دیا۔ کعب نے بجیر کو ان کی اس جلد بازی پر سخت ملامت شروع کر دی۔ اور دینِ اسلام اور ہادیٔ دین کی شان میں نازیبا اور گستاخانہ اشعار کہنے۔ جس کی بناء پر دربارِ رسالت سے اس کے خون کو بے قیمت اور مباح قرار دیا گیا۔ تاکہ اسلام اور ہادیٔ اسلام سے متعلق غلط خبروں اور غلط پروپیگنڈے کا سدِ باب ہو سکے۔

کعب بن زہیر کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اور غالباً اپنے والد کی وصیت بھی یاد آ گئی ہوگی۔ چنانچہ وہ ایک روز چپکے سے مسجدِ نبوی میں اس طرح داخل ہوئے کہ انھیں کوئی پہچان نہ سکا۔ اور سراپا عفو و معلم کے دامن کو تھام کر عرض کی۔ یا رسول اللہ اگر کعب اپنی غلطیوں پر نادم ہو کر عفو خواہ ہو تو کیا آپ اسے معاف کر دیں گے۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں!

ؔ زہیر بن سلمیٰ عرب کا مشہور صلح پسند بلیغ شاعر تھا۔ خانہ کعبہ میں جو سات بلیغ قصائد آویزاں کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک قصیدہ زہیر بن سلمیٰ کا تھا۔ زہیر کا ممدوح جاہلیت کا مشہور سردار ہرم بن سنان تھا۔

کعب نے کہا۔ وہ کعب خطا دار میں ہوں۔ اپنی غلطیوں پر نادم و شرمسار اور آپ کے عفو و حلم کا طلبگار حاضر دربار ہوں۔ خطاکار سے درگزر کرنے والے نبی رحمت نے اُسے معاف فرما دیا۔ کعب بن زہیر نے اسی مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ثنا اور طلب معذرت اور صحابہ کرام کی شجاعت و بہادری پر مشتمل ایک قصیدہ پڑھا۔ یہ قصیدہ جاہلی شاعری کا آئینہ دار ہے۔ اس کا آغاز حسب دستور فرضی محبوبہ کے فراق کے ذکر سے ہوا ہے۔ اس کے بعد اُس کے حسن و جمال کی تعریف کے بعد ریگستان کی کشتی یعنی اونٹنی کے اوصاف، اُس کی جسمانی ساخت اور اُس کے اعضاء کا تفصیلی بیان ہے۔ کعب کا یہ قصیدہ بانت سعاد کے نام سے مشہور ہے۔ جو پہلے شعر کا پہلا جملہ ہے۔ کعب نے جب یہ شعر پڑھا:۔

ان الرسول لنور یستضاء بہ مھند من سیوف اللہ مسلول

(بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم وہ نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ اللہ کی تلواروں سے ایک بے نیام تلوار ہیں)

تو آپ نے انھیں اپنی ردائے مبارک بطور انعام عطا فرما دی۔

قصیدہ کا پہلا شعر یہ ہے:۔

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول متیم اثرھا لم یفد مکبول

سعاد (محبوبہ کا نام) مجھ سے جدا ہو گئی ہے۔ میرا دل اُس کے فراق میں آج پابزنجیر حیران و پریشان ایسے قیدی غلام کی طرح جسے زر فدیہ ادا کر کے رہا نہ کیا گیا ہو۔ اس کے نقش قدم پر چلا جا رہا ہے۔

اس کے بعد محبوبہ کے حسن و جمال کی تعریف ہے۔ قصیدہ کا بڑا حصہ اونٹنی کے وصف پر مشتمل ہے۔

کعب نے جب یہ شعر پڑھا:۔

ان الرسول لنور یستضاء بہ مھند من سیوف الھند مسلول

تو آپ نے من سیوف اللہ فرمایا اور اس طرح شعر کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

عفو کی درخواست انھوں نے اس طرح پیش کی:۔

اُنبئتُ اَنَّ رسولَ اللہِ اَوعَدَنی والعفو عند رسول اللہ مامول

۱؎ حضرت معاویہ نے کعب سے یہ چادر بیس ہزار درہم میں خریدنا چاہی۔ مگر کعب اس متبرک اور قابل صد فخر سرمایہ کو کسی قیمت پر دینے پر راضی نہیں ہوئے۔ مگر کعب کے انتقال کے بعد حضرت معاویہ نے اُن کی کسی اولاد سے دس ہزار درہم میں حاصل کر لی۔ یہ متبرک چادر بنی امیہ کے خلفاء میں یکے بعد دیگرے منتقل ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان حمار کے قتل پر گم ہو گئی۔ اس کے بعد یہ ردائے مبارک کسی سفاح یا منصور کو مل گئی اور خلفائے عباسیہ نے بطور تبرک نبوی اسے بڑی حفاظت اور بصد احترام محفوظ رکھا۔ اور کبھی کبھی عیدین یا دوسرے اجتماع کے موقع پر وہ تبرکاً اپنے شانہ پر ڈال لیتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ ردا چنگیز و ہلاکو کی فوج کے ہاتھوں قصر خلافت کی تباہی اور آخری خلیفہ عباسی مستعصم باللہ کے قتل کے بعد لاپتہ ہو گئی۔ سُنا ہے کہ ترکوں کے اسلام لانے کے بعد یہ چادر کسی طرح انھیں مل گئی اور اب ترکی کے کسی دارالآثار میں محفوظ ہے۔ اور لوگ کبھی کبھی کسی دینی تہوار کے موقع پر اس کے دیدار سے مشرف ہوتے ہیں۔

مجھے خبر ملی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے دھمکی دی ہے۔ مگر مجھے رسول اللہ سے عفو کی امید ہے۔

فقد اتیت رسول اللہ معتذراً　　والعذر عند رسول اللہ مقبول

میں رسول اللہ کی خدمت میں معذرت خواہ بن کر آیا ہوں اور امید ہے کہ میرا عذر رسول اللہ قبول فرمائیں گے۔

مھلاً ھداک الذی اعطاک نافلۃ　　القرآن فیہ مواعیظ وتفصیل

آپ مجھے مہلت دیں وہ ذات جس نے آپ کو عطیۂ قرآن عنایت فرمایا ہے جس میں طرح طرح کے وعظ اور تفصیلی ہدایات ہیں آپ کی رہنمائی فرمائے۔

لا تاخذنی باقوال الوشاۃ ولم　　اُذنب وان کثرت فیّ الاقاویل

چغلخوروں کی باتوں پر آپ میری گرفت نہ فرمائیں۔ میں بے گناہ ہوں گرچہ میرے متعلق بہت سی باتیں کہی گئی ہیں۔

کذلک اھیب عندی اذ اکلمہ　　وقیل انک منسوب ومسئول

جس وقت کہ مجھ سے کہا گیا کہ تمہاری طرف ناکردہ گناہوں کو منسوب کیا گیا ہے اور تم سے بازپرس کی جائے گی اور جس وقت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کر رہا تھا تو آنحضرت میرے نزدیک شیر نیستاں سے بھی زیادہ بارعب اور پرہیبت تھے۔

من خادر من لیوث الاسد مسکنہ　　ببطن عثر غیل دونہ غیل!

اس شیر نیستان سے (آپ کی ذات زیادہ باہیبت اور پررعب ہے) جس کا کچھار مقام عثر کی وادی میں ہے جس کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی تعریف مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کی ہے:۔

ان الرسول لنور یستضاء بہ　　مھند من سیوف اللہ مسلول

بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نور ہیں جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ وہ اللہ کی تلواروں میں سے ایک تیغ بے نیام ہیں۔

فی فتیۃ من قریش قال قائلھم　　ببطن مکۃ لما اسلموا زولوا

جب یہ صحابہ کرام وادی مکہ میں اسلام لائے تو قریش کے جوانوں میں سے کسی نے کہا کہ (مدینہ کو) ہجرت کرو۔

زالوا فما زال انکاس ولا کشف　　عند اللقاء ولا میل معازیل

انہوں نے (مدینہ منورہ کو) ہجرت کی۔ یہ ہجرت کرنے والے نہ کمزور ہیں نہ دشمن کے مقابلہ میں بے سپر ہیں نہ اناڑی اور نہتے ہیں۔

شم العرانین ابطال لبوسھم　　من نسج داؤد فی الھیجاء سرابیل

وہ بلند بینی سورما اور بہادر ہیں۔ ان کا جنگی لباس (یعنی زرہیں) حضرت داؤد کے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے۔

لا یفرحون اذا نالت رماحھم　　قوماً ولیسوا مجازیعاً اذا نیلوا

اگر یہ کسی قوم کو اپنے نیزوں سے گزند پہنچاتے ہیں تو خوشی سے اتراتے نہیں اور جب انہیں گزند پہنچتا ہے تو آہ وبکا اور واویلا کرتے ہیں۔

لا یقع الطعن الا فی نحورھم　　ما ان لھم عن حیاض الموت تھلیل

اپنے سینوں ہی پر نیزوں کے زخم کھاتے ہیں ۔ اور موت کے حوض سے یہ منہ موڑ کر بھاگتے نہیں !

یوں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ ستودہ کے سارے قریش مداح و معترف تھے۔ لیکن آپؐ کے محبوب و جان نثار چچا ابو طالب نے اسلام نہ لانے کے باوجود آپؐ کے اخلاقِ کریمانہ۔ آپؐ کے حلم، تواضع، بردباری، بیواؤں کی امداد۔ مسافر نوازی۔ یتیموں کے ساتھ حُسنِ سلوک کو دیکھ کر ایک بلند پایہ قصیدہ کہا۔ جس کا یہ شعر اسلامی تاریخ میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے اور آپ کی تعریف میں کوئی دوسرا اس قدر جامع شعر نہیں ہے۔ اور غالباً آپؐ کی تعریف میں سب سے پہلے قصیدہ کا سب سے بہتر شعر ہے:-

وابیض یستسقی الغمام بوجہہ ثمال الیتامیٰ عصمۃ للارامل

آنحضرتؐ کا روئے منور وہ ہے جس کے توسط سے ابرِ باراں سے سیرابی کی درخواست کی جاتی ہے۔ آپ کی ذات یتیموں کا ماویٰ۔ بیواؤں کا ملجا اور بے سہاروں کا سہارا ہے !

ابو طالب نے یہ شعر مکہ میں کہا تھا۔ مکہ میں اسلام کی بے چارگی۔ مسلمانوں کی کمزوری اس درجہ پر تھی کہ ابو طالب کے انتقال کے کچھ عرصہ کے بعد خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔

کعب کا قصیدہ بانت سعاد مدنی عہد کا ہے۔ اسلام رفتہ رفتہ قوت حاصل کرنے لگا تھا۔ کی زندگی کے مقابلہ میں مدنی زندگی میں ایک حکومت و سلطنت کی داغ بیل پڑنے لگی تھی۔ مسلمانوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا تھا۔ دُور دراز کے قبائل اسلام کو قبول کرنے لگے تھے۔ چنانچہ کعب بن زہیر کے قصیدہ میں اسلام کی طاقت کا کھلا ہوا اعتراف و اقرار ہے اور رسول اللہ کی تعریف میں جہاں آپؐ کی ذات کو نور کہا گیا ہے اسی میں حق کو غالب کرنے اور باطل کو شکست دینے والی تیغِ بے نیام سے تعبیر کیا ہے۔ (ابو طالب اور کعب بن زہیر کے یہ دو شعر مکی اور مدنی زندگی کے دو مختلف پہلوؤں کو بھی واضح کرتے ہیں۔

چونکہ آخر الزماں نبیؐ کی بعثت دُکھی انسانیت کے حق میں رحمت، مظلوم کے حق میں پیامِ عدل و انصاف اور عالم کے لئے ایک ہمہ گیر روحانی و مادی انقلاب کا پیش خیمہ تھی۔ سارے عرب میں اس کی دھوم مچ گئی۔ ہر جگہ اسی کا چرچا اور ہر مجلس میں اس کا ذکر ہونے لگا۔ قضاء و قدر نے بھی اس کے نشر و اشاعت کا خصوصی انتظام و اہتمام کیا۔ انسانوں سے لے کر جنوں اور مخفی وسائل نے بعثتِ محمدیہ سے لوگوں کو باخبر و آگاہ کیا۔

ایک صحابی نے جن کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں ہے۔ خواب میں دیکھا کہ کوئی منادی دربارِ رسالت میں حاضر ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ وہ منادی غیب وجرہ (ایک مقام کا نام) کا کوئی جن ہے جو اسلام لانے اور داعیِ حق نبیِ رحمت کی خدمت میں حاضر ہونے پر اصرار کرتا ہے۔ مسلسل کئی رات دعوت دیتا رہا۔ وہ خواب و خیال کی باتیں سمجھ کر اُسے ٹالتے رہے۔ آخر میں مایوس ہو کر اس نے کہا۔ اب میں دوبارہ تمہیں دعوت نہیں دوں گا۔ اور پھر اس نے خواب میں آنا بند کر دیا۔

آخری لفظ سنتے ہی یہ حضرت بیتاب ہو گئے۔ بیدار ہوتے ہی انہوں نے اپنی سواری پر کجاوہ وغیرہ باندھا اور سیدھے مدینہ منورہ کی راہ لی۔ شاعر نے اپنی ساری داستان۔ خواب میں جن کا آنا۔ دعوتِ اسلام کا پیش کرنا۔ ندائے غیبی، مدینہ میں حاضر ہونے اور رسول اللہ کی زیارت سے مشرف ہونے کو چند اشعار میں ذکر کیا ہے۔ اور دربارِ رسالت میں حاضری کے جذبۂ بے اختیاد کو ایک مصرعہ میں بڑی بے ساختگی سے ادا کیا ہے۔ اشعار یہ ہیں:-

الیٰ اتانی فی المنام سیدی من جن وجرۃ فی الامور مواۃ

اے میرے آقا! وجرہ کے جنوں میں سے کسی ایک جن نے جو معاملات میں راستباز ہے میرے پاس خواب میں آیا۔

یدعو الیک بیاً بیاً ولیا لیاً ثم احزانٰ وقال لست باٰت

وہ مسلسل کئی راتوں کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی دعوت دیتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ میں اب نہیں آؤں گا اور اس نے آنا بند کردیا۔

فرکبت ناجیۃ اضر بمتنھا رکض الھواجر ......

پس میں ایک تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہوکر دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں اُسے دوڑاتا ہوا اس طرح روانہ ہوا کہ اونٹنی کی پیٹھ زخمی ہوگئی۔

حتیٰ وردت علی المدینۃ جاھداً کیما اراک فتفرج الکربات

تاآنکہ میں تھکا ماندہ مدینہ منورہ حاضر ہوگیا۔ میری حاضری کی غرض یہ ہے کہ میں آپ کا دیدار کرسکوں۔ اور آپ میری پریشانیوں اور بے چینیوں کو دور فرمادیں۔

"کیما اراک فتفرج الکربات" کس قدر جذبۂ شوق، اخلاص اور محبتِ رسول کو ظاہر کرتا ہے۔

یوں تو آغازِ نبوت سے اس وقت تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں کوئی ثناخوانِ رسول نہ ہوا ہو۔ خود اُردو اور فارسی میں نعت گو شعراء کی بڑی تعداد ہے۔ اور ہر زمانے میں مسلمان شعراء رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں محبت و عقیدت کے پھول پیش کرتے رہے ہیں۔ اور فارسی و اُردو کے شعراء وفورِ محبت اور شدتِ عقیدت میں شرعی حدود سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

عرب نعت گو شعراء کا مذاق فارسی شعراء کے مذاق سے بالکل مختلف ہے۔ فارسی شعراء آنحضرتؐ کی تعریف میں کاکل، گیسو، چشم و ابرو اور آپ کے حسن و جمال کے بیان میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ اُس پر کسی محبوب مجازی کی تعریف کا دھوکا ہوتا ہے۔ لیکن عرب نعت گو شعراء حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری و جسمانی حسن کو اجمالاً اور بہت اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ آپ کے علم، حلم، عفو، تواضع، شجاعت، جود و سخا اور دوسرے اخلاق حمیدہ اور سیرت کے دوسرے پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس لئے عجمی مذاق رکھنے والوں کو عربی نعت میں وہ کیف و سرور محسوس نہیں ہوتا جو انھیں فارسی و اُردو نعت گو کے کلام میں محسوس ہوتا ہے۔

عربی میں نعت کہنے والوں کی تعداد کو کوئی شمار نہیں کرسکتا۔ خود ہندوستان میں کوئی ادیب و عالم جو شعر کہہ سکتا ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ جس نے آپ کی ثناء و منقبت میں کم از کم چند اشعار نہ کہے ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر معقولات کے عالم مسجر نحوی و حافظ قاموس، فضل الحق خیرآبادی اور اُن سے قبل قاضی شہاب الدین دولت آبادی، غلام علی آزاد بلگرامی نے نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ عرب شعراء میں بڑے محبِ رسول بن نباتہ تھے۔ اُن کا دیوان مطبوعہ ہے اور عربوں میں مقبول و مشہور[۱] ہے۔

---

[۱] افسوس ہے کہ اس کا کوئی نسخہ میرے پاس موجود نہیں ہے۔ ورنہ چند منتخب اشعار پیش کرتا۔ اسی طرح غلام علی آزاد بلگرامی کا سبعہ سیارہ اور مولانا فضل حق کے کلام کا کوئی مجموعہ بہاولپور میں موجود نہیں ہے!

لیکن بوصیریؒ کے قصیدہ بردہ کو جو شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی وہ کسی عرب شاعر کے حصہ میں نہیں آئی - گو مضامین کی بلندی، ادبی اور لسانی حیثیت سے شوقی کا قصیدہ میمیہ بہت بلند ہے مگر سوزِ محبت سے خالی سینہ بوصیری کی نقالی تو کر سکتا ہے۔ مگر وہ اثر و سوز اور محبتِ رسولؐ کی حیات بخش حرارت کہاں سے لائے گا ؟

شوقی اپنے زمانے کا امیر الشعراء تھا - اس نے بوصیری کے قصیدہ بردہ کو سامنے رکھ کر اس کے ہر مضمون کے مقابلے میں بڑھ کر اور زیادہ فصیح الفاظ اور بہتر بندش پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر آمد اور آورد اور اصل و نقل اور متقدم و متاخر کا فرق نمایاں ہے - اور یہی وجہ ہے کہ شوقی جس نے آج سے تقریباً تیس برس قبل قصیدہ بردہ کہا ہے۔ اسے اب تک قبولیت عامہ کا شرف نصیب نہ ہوا - بوصیریؒ کا قصیدہ بردہ عرب و عجم میں پڑھا جاتا ہے - محفل میلاد میں تبرکاً خاص "لے" کے ساتھ اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ بعض صوفی اسے مصائب و آلام کے وقت پڑھ کر دم کرتے ہیں۔ اور علماء و صلحاء نے اس کے نظم و نثر میں ترجمے کئے ہیں۔ اس کے متعلق ایک روایت یہ ہے کہ بوصیری ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے۔ انہوں نے اسی حالتِ مرض میں یہ قصیدہ کہا۔ اور خواب میں دربارِ رسالتؐ میں اسے پیش کیا - اسے آنحضرتؐ نے پسند فرمایا - اور شرفِ قبولیت بخشا - جب اُن کی آنکھ کھلی تو صحت کے آثار شروع ہو گئے اور بہت جلد شفایاب ہو گئے ۔ !

قصیدہ کا آغاز کعب بن زہیر کے بانت سعاد کی طرح ذکر حبیب سے کیا گیا ہے - لیکن بوصیری کی آنکھیں محبت رسولؐ اور اہلِ مدینہ کی یاد میں خوں نابہ فشاں ہیں اور کعب بن زہیر جاہلی شعراء کی طرح فراقِ سعاد میں بیتاب ہے - عرب شعراء دیارِ محبوب کی تصویر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے - وہ اس کی پہاڑیوں، وادیوں، پہاڑی دروں، اس کے درخت اور ٹیلوں اور اس کے علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں جو بظاہر غیر اہم معلوم ہوتی ہیں - اُن کا تفصیلی ذکر کرتا ہے - اور ہر نقش و نگار پر اس کی یاد میں آنسو بہاتا ہے - اس طرح عربی شاعری میں عرب کے جغرافیہ کا بہت بڑا حصہ محفوظ ہو گیا ہے۔ اسی طرح بوصیری نے بھی حجاز خصوصاً مدینہ منورہ کے ارد گرد کے بہت سے مقامات کا ذکر کیا ہے اور اس طرح ان مقامات کی نشاندہی کر کے مدینہ منورہ کے گرد و نواح کا ایک ایسا دلکش نقشہ کھینچا ہے کہ زائرِ حرم کے دل میں ان مقامات کے معلوم کرنے کا اور انھیں دیکھنے کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے۔

ذی سلم کے ساکنان کی یاد میں بوصیری کی آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں - اور شاعر بے خود و وارفتہ ہو کر اپنے آپ سے دریافت کرتا ہے۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے ؟ یہ اشک گلابی آنکھوں سے کیوں رواں ہیں ؟ محبتِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا بوصیریؒ ابتدائی چند اشعار میں اپنی بے تابی، وارفتگی اور سوزِ عشق کی کیفیت کو اس طرح ادا کرتا ہے :-

امن تذکر جیران بذی سلم مزجت دمعاً جری من مقلة بدم

کیا مقام ذی سلم کے پڑوسیوں کو یاد کر کے تیری آنکھوں سے اشک گلابی رواں ہے

ام ھبت الریح من تلقاء کاظمة او اومض البرق فی الظلماء من اضم

کاظمہ کی جانب سے جب ہوا چلتی ہے یا کوہ اضم کی طرف سے شب دیجور میں بجلی کوندتی ہے (تو تیری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے)

فما لعینیک ان قلت اکففا ھمتا وما لقلبک ان قلت استفق یھم

تیری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جب تو اُن سے کہتا ہے کہ آنسو نہ بہائیں تو اور زیادہ آنسو بہانے لگتی ہیں۔ اور تیرے دل کا بھی عجب حال ہے۔ جب اس سے ہوش میں آنے کو کہا جاتا ہے تو وہ اور بے ہوش ہو جاتا ہے۔

أيحسبُ الصَّبُّ ان الحب منكتم　　　مابين منسجم منه و مضطرم

کیا عاشق زار کا خیال ہے کہ اشک رواں اور آہ سوزاں کے باوجود رازِ محبت چُھپ جائیگا؟

لولا الهوى لم ترق دمعاً على طلل　　　ولا ارقت لذكر البان والعلم

اگر عاشق نہ ہوتا تو محبوب کے آثار رخانہ پر اشک فشانی نہ کرتا نہ پہاڑی اور درختِ بان کی یاد میں تیری نیند اُچٹ جاتی۔

اسی طرح عشق کی معاملہ بندی بیان کرتا ہوا شاعر رسُول کریم کے مناقب و اوصافِ حمیدہ بیان کرنے لگتا ہے۔ لیکن محبت رسُول اور ثناء نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا آغاز کرنے سے قبل متعدد حکیمانہ اور ناصحانہ اشعار کہے ہیں۔ جو عربی زبان میں ضرب المثل کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ایک مقام پر ہوائے نفس کے اتباع سے منع کرتا ہے۔ اور آب زر سے لکھنے کے قابل اشعار کہے ہیں۔ بوصیری پر اللہ کی رحمت نازل ہو۔ کیا خوب کہا ہے:-

فلا ترم بالمعاصی كسر شهوتها　　　ان الطعام يقوي شهوة النهم

نفس کی خواہشات کو معاصی کے ذریعہ شکست دینے کی کوشش نہ کرو۔ طعام جوع البقر کو اور زیادہ تیز اور قوی کرتا ہے۔

والنفس كالطفل ان تهمله شبَّ على　　　حُبِّ الرضاع وان تفطمه ينفطم

نفس شیر خوار بچّہ کی مانند ہے۔ اگر تم اسے دُودھ پینا چھوڑ دوگے تو جوانی تک ماں کا دودھ پینا پسند کرے گا اور اگر اس کا دُودھ چھوڑا دیا جائے تو دُودھ پینا چھوڑ دے گا۔

فاصرفْ هواها وحاذر ان تولّيه　　　ان الهوى ما تولّى يصم او يصم

ہوائے نفس کو دُور کرتے رہو اور اُسے اپنے اُوپر مسلط کرنے سے ڈرتے رہو کیونکہ ہوائے نفس جس پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے اُسے یا ہلاک کر دیتا ہے یا بدنام و رسوا کر کے چھوڑتا ہے۔

كم حسّنتْ لذةً للمرأ قاتلة　　　من حيث لم يدرِ ان السّمّ في الدّسم

ہوائے نفس نے نہ معلوم کس قدر جان لیوا لذتوں کو انسان کے سامنے سنوار کر کے پیش کیا ہے اور اُسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ (چربی میں زہر ملا ہوا ہے) دال میں کالا ہے۔

اخش الدّسائس من جوعٍ ومن شبعٍ　　　فربّ مخمصةٍ شرٌّ من التخم

بھوک اور آسودگی کے پوشیدہ شروں سے ڈرتے ہو۔ کیونکہ بعض شدید بھوک تخمہ (پرخوری کے مرض) سے بھی بدتر ہے۔

واستفرغِ الدّمع من عينٍ قد امتلأتْ　　　من المحارم والزم حميةَ النّدم

اس آنکھ سے اچھی طرح آنسو بہایا کر۔ جو نظر حرام سے آلودہ رہی ہے اور پشیمانی و ندامت کے پرہیز کو بالالتزام اختیار کر۔

ان نصائح و مواعظ کے بعد بوصیری رحؒ نے اپنی عملی کوتاہیوں کا ذکر کرتے ہوئے سنتِ نبویؐ کے اتباع میں اپنی کوتاہی کا ذکر کیا ہے - اور اس طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) کا ذکرِ گرامی اور آپؐ کی عبادت کا ذکرِ جمیل چھیڑا ہے۔

ظلمت سُنّة من احییٰ الظلام الیٰ ان اشتکت قدماہ الضُرّ من وَرَم

میں نے اس ذات گرامی کے طریقِ زندگی کا حق ادا نہیں کیا - جو پردۂ شب میں یادِ خدا میں اس قدر مشغول رہے کہ آپؐ کے پاؤں سوج گئے اور اُن میں تکلیف محسوس ہونے لگی

وشدّ من سَغَب احشاءہ وطویٰ تحت الحجارۃ کشحاً مترف الاَدَم

اور انہوں نے شدید بھوک کی وجہ سے آنتوں اور پیٹ پر پتھر باندھا تھا وہ کوکھ جس کی پوست نہایت نازک تھی۔

وکیف تدعو الی الدنیا ضرورۃ من لولاہ لم تخرج الدنیا من العَدَم

ضرورتیں اس ذات والا گہر کو دُنیا کی طرف کس طرح دعوت دے کر راغب کر سکتیں جن کا وجود باعثِ تخلیقِ عالم ہو - اور اگر وہ دُنیا میں تشریف نہ لاتے تو دُنیا کتمِ عدم سے منصۂ شہود میں نہ آتی۔

محمدٌ سیّد الکونین والثقَلَین والفریقین من عرب ومن عجم

سرورِ کائناتؐ دونوں عالم کے اور انس و جن، عرب و عجم کے سردار ہیں۔

نبینا الآمر الناھی فلا احدٌ ابرّ فی قول لا منه ولا نعم

ہمارے نبی حکم دینے والے اور منع کرنے والے ہیں - نہیں اور ہاں (لا و نعم) میں آپ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہے۔

ھو الحبیب الذی ترجیٰ شفاعته لکل ھول من الاھوال مقتحم

وہی حبیبِ خدا ہیں جن کی ذات سے ہر خوف و ہراس کے موقع پر سفارش و شفاعت کی توقع کی جاتی ہے -

دعا الی اللہ فالمستمسکون به مستمسکون بحبلٍ غیرِ منفصم

آنحضرتؐ نے اللہ کی طرف آنے کی لوگوں کو دعوت دی - پس جس نے آپ کا دامن تھام لیا اُس نے ایک مضبوط نہ ٹوٹنے والی رسی کو پکڑ لیا ہے۔

فاق النبیین فی خَلْقٍ وفی خُلُقٍ ولم یدانوہ فی علم ولا کرم

صورت و سیرت میں تمام انبیاء علیہم السلام پر فوقیت رکھتے ہیں - یہ انبیاء علیہم السلام نہ علم میں نہ کرم و شرف میں آپ کے ہمسر و برابر ہیں۔

وکلھم من رسول اللہ ملتمس غرفاً من البحر او رشفاً من الدِّیَم

تمام انبیاءؑ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے طالب ہیں کہ انھیں سمندر سے ایک چلّو یا بارشِ مسلسل سے ایک گھونٹ نصیب ہو جائے!

وواقفون لدیہ عند حدھم من نقطۃ العلم او من شکلۃ الحکم

اور تمام انبیاء علیہم السلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اپنی اپنی حد پر جس کی حیثیت نقطۂ عالم یا عنوان (مقدار قلیل) حکمت کی ہے، مودب کھڑے ہیں۔

فھو الذی تم معناہ وصورتہ ثم اصطفاہ حبیباً باری النسم

لہذا آپ کی وہ ذات ہے جس کی سیرت و صورت کامل ہے۔ پھر خالق کائنات نے حبیب بنا کر آپ کا انتخاب کیا

منزہ عن شریک فی محاسنہ فجوھر الحسن فیہ غیر منقسم

آپ کی خوبیوں اور صفات ستودہ میں کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہے۔ لہذا آپ کا جوہر حسن و خوبی ناقابل تقسیم ہے۔

دع ما ادعتہ النصاری فی نبیھم واحکم بما شئت مدحاً فیہ واحتکم

عیسائیوں نے اپنے نبی (علیہ السلام) کے متعلق جو دعویٰ کیا ہے (یعنی الوہیت کا) اس کو چھوڑ کر جس قدر تمہارا جی چاہے رسول کریم کی تعریف کرو اور (علماء زمانہ کو) حکم بنا سکتے ہو۔

فانسب الی ذاتہ ماشئت من شرف وانسب الی قدرہ ماشئت من عظم

تمہارا جس قدر جی چاہے آپ کی ذات کی طرف شرف و عظمت کو منسوب کر سکتے ہو۔

فان فضل رسول اللہ لیس لہ حد فیعرب عنہ ناطق بفم!

کیونکہ رسول اللہ کے فضائل و محاسن کی کوئی حد نہیں ہے کہ انھیں کوئی ادا کرنے والا اپنی زبان و دہن سے ادا کر سکے۔

لم یمتحنا بما تعی العقول بہ حرصاً علینا فلم نرتب ولم نھم

آپ نے ہماری خیر خواہی کی وجہ سے ایسی باتوں سے جن کا عقل ادراک کرنے سے عاجز ہے امتحان نہیں لیا۔ اس لئے ہمیں آپ کی بیان کردہ باتوں میں شک و شبہ اور وہم دستو نہیں ہوا

اعیی الوری فھم معناہ فلیس یری للقرب والبعد فیہ غیر منفحم

آپ کے کمالات کی حقیقت کے ادراک سے تمام لوگ عاجز ہیں اس لئے آپ سے نزدیک اور دور رہنے والے اس حقیقت کے بیان سے خاموش و عاجز ہیں۔

کالشمس تظھر للعینین من بعد صغیرۃ وتکل الطرف من امم

جس طرح آفتاب دور سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور قریب سے آنکھوں کو چوندھیا دیتا ہے

فمبلغ العلم فیہ انہ بشر وانہ خیر خلق اللہ کلھم

لوگ زیادہ سے زیادہ یہ کہتے ہیں اور ان کا یہی مبلغ علم ہے کہ رسول اللہ انسان ہیں اور ساری مخلوقات الٰہیہ سے بہتر ہیں۔

وکل آیٍ اتی الرسل الکرام بھا فانما اتصلت من نورہ بھم!

اور تمام نشانیاں اور معجزات جنہیں انبیاء کرام علیہم السلام نے پیش کیا وہ رسول اکرم ہی کے نور سے ان تک پہنچے ہیں۔

فانہ شمس فضل ہم کواکبہا یظہرن انوارہا للناس فی الظلم

رسول اللہ کی ذات آفتاب کے مانند ہے اور تمام انبیاء علیہم السلام اس آفتاب کے سیارے ہیں جن کی روشنی لوگوں کو تاریکی ہیں (یعنی جب آفتاب طلوع نہیں ہوتا) نظر آتی ہے۔

اَکْرِمْ بخلقِ نبی زانہ خُلُقٌ بالحسن مشتملٍ بالبشر متّسم

اس نبی کریم کی صورت وشکل کے کیا کہنے؟ جس کی ذات اعلیٰ اخلاق سے مزین ہے۔ اور جو حسن وخوبی اور خندہ پیشانی کی صفت کے ساتھ متصف ہے۔

کالزّہر فی ترَفٍ والبدرِ فی شرفٍ والبحرِ فی کرمٍ والدّہرِ فی ہمم

جس کی تازگی پھول کی طرح اور جس کی بلندی چودھویں کے چاند کے مانند اور جس کا فیض وجود سمندر کی مثل اور جس کی عزیمت زمانے کے ارادہ جیسی ہے۔

کانہ وہو فرد فی جلالتہ فی عسکر حین تلقاہ وفی حشم

اگر وہ خلوت میں تنہا بھی ہوں تو اپنی بزرگی، شان اور عظمت وجلالت کی وجہ سے گویا لشکر اور خدم وحشم کے درمیان ہیں۔

کانّما اللؤلؤ المکنون فی صدف من معدنی منطق منہ ومبتسم

آنحضرتؐ کے دہن والے وہ دندان تکلم وتبسم کے وقت سیپ کے اندر دُرِ شہوار معلوم ہوتے ہیں۔

لا طیب یعدل تربا ضمّ اعظمہ طوبیٰ لمنتشق منہ وملتثم

کوئی عطر اس خاک کے برابر نہیں ہے جس میں آپ کا جسم مبارک مدفون ہے۔ مبارک ہو وہ خاک سونگھنے والوں اور بوسہ دینے والوں کو۔

ابان مولدہ عن طیب عنصرہ یا طیب مبتداء منہ ومختتم

آپ کی جائے پیدائش اور زمانۂ پیدائش نے آپ کے عنصر والا گہر کی پاکیزگی کو ظاہر کیا ہے۔ آپ کے مقام آغاز - مکہ معظمہ - اور محل انجام مدینہ منورہ کی خوبی وپاکیزگی کی کیا بات ہے؟

یوم تفرس فیہ الفرس انہم قد انذروا بحلول البؤس والنقم

یہ وہ دن تھا جب اہل ایران نے اپنی فراست سے معلوم کر لیا تھا کہ فقر وعذاب منتقمانہ کے نزول سے انھیں خبردار کر دیا گیا ہے۔

وبات ایوان کسریٰ وہو منصدع کشمل اصحاب کسریٰ غیر ملتئم

جس طرح ایوان کسریٰ کا شیرازہ منتشر ہو گیا اسی طرح ایوان کسریٰ میں بھی شگاف پڑ گئے

کانّ بالنار ما بالماء من بلل حزنا وبالماء وما بالنار من ضرم

ایسا معلوم ہونے لگا کہ غم کی وجہ سے گویا پانی کی نمی آتش مجوس تک پہنچ گئی اور پانی میں آگ کی سوزش پیدا ہو گئی یعنی آتش ایران بجھنے لگی اور دریا کا پانی خشک ہونے لگا۔

والجن تہتف والانوار ساطعۃ والحق یظہر من معنی ومن کلم

جنوں نے آوازۂ حق بلند کرنا شروع کر دیا ہے اور نور حق بلند ہونے لگا ہے اور لفظ ومعنی ظاہر وباطن سے حق کا ظہور ہونے لگا ہے۔

عموا وصموا فاعلان البشائر لم　　　تسمع وبارقة الانذار لم تُشم

یہ کفارِ عرب اندھے اور بہرے ہو گئے ہیں۔ نہ بشارت نبوت کی آواز انھیں سنائی دیتی ہے نہ تنبیہ اور چوکنا کرنے والی کوندتی ہوئی بجلی انھیں دکھائی دیتی ہے۔

من بعد ما اخبر الاقوام کاهنهم　　　بان دینهم المعوجّ لم یقم

حالانکہ اس کے قبل کاہن اپنی قوموں کو مطلع کر چکے تھے کہ اُن کے دینِ باطل کا اب قیام و ثبات ختم ہو چکا ہے۔

وبعد ما عاینوا فی الافق من شُهُب　　　منقضة وفق ما فی الارض من صنم

اور وہ افقِ آسمان سے شہابِ ثاقب کو زمین کے بتوں اور صنموں پر گرنے کا مشاہدہ کر چکے تھے۔

حتی غدا عن طریق الوحی منهزم　　　من الشیاطین یقفو اثر منهزم

یہاں تک کہ وحی کے ذریعہ شیطان کے غول شکست کھا کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے تھے۔

کانهم هربا ابطال ابرهة　　　او عسکر بالحصی من راحتیه رُمی

یہ شیاطین اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے شاہ ابرہہ کے بہادر سپاہی یا کفار کی فوج جس پر آپ نے مٹھی بھر کر کنکریاں پھینکی تھیں اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی تھی اور انھیں شکست ہوئی تھی!

نبذا به بعد تسبیح ببطنهما　　　نبذ المسبح من احشاء ملتقم

آنحضرتؐ کے کفِ دست میں یہ کنکریاں تسبیح و تقدیس کے بعد اسی طرح باہر آئیں جس طرح حضرت یونس علیہ السلام بطنِ ماہی سے اللہ کی تسبیح کے بعد باہر پھینک دیے گئے۔

وجلّ مقدار ما ولّیتَ من رُتَب　　　وعزّ ادراکُ ما اولیتَ من نِعَم

اپنے بڑے عظیم مرتبوں پر فائز ہیں اور آپ کو جو نعمتیں عطا ہوئی ہیں اُن کا ادراک کرنا مشکل ہے

بشری لنا معشر الاسلام ان لنا　　　من العنایة رُکنا غیر منهدم

ہم اسلام کے نام لیواؤں کو خوش خبری ہو کہ عنایت الٰہی کا نہ شکست ہونے والا ستون ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔

لما دعی اللہ داعینا لطاعته　　　باکرم الرسل کنا اکرم الامم!

چونکہ اشرف ترین نبی علیہ السلام کے ذریعہ ہمیں آپ کی اطاعت کی اللہ نے دعوت دی لہٰذا ہم اشرف الامم ہوئے۔

راعت قلوب العدی انباء بعثته　　　کنبأة اجفلت غُفلاً من الغنم

آنحضرتؐ کی بعثت کی خبر نے دشمنوں کے دلوں کو لرزا دیا اس طرح جیسے بھولی بھٹکی بکریوں کو غیر معمولی آواز نے تتر بتر کر دیا ہو۔

آخر میں بوصیریؔ نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں دعاء مغفرت کی ہے اور عجز و عبدیت کے اظہار کے ساتھ دستِ سوال دراز کیا ہے۔

یا نفس لا تقنطی من زلّة عظمت　　　انّ الکبائر فی الغفران کاللمم

اے نفس رحمتِ پروردگار سے اس بناء پر مایوس نہ ہو کہ بڑی لغزشیں اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوا ہے مجھے معلوم نہیں کہ کبائر بھی مغفرتِ باری کے نزدیک گناہ صغیرہ کی طرح مستحق عفو ہو سکتے ہیں۔

لعلّ رحمة ربی حین یقسمها　　　تاتی علی حسب العصیان فی القسم

امید ہے کہ میرا رب جب رحمتوں کو تقسیم فرمائے گا تو لوگوں کے گناہوں کے لحاظ سے رحمتیں اُن کے حصہ میں آئیں گی

اللهم صلّ علی محمد وعلی آل محمد وسلم

ہمہ گیر تعلیم ــــ مستشرقین کا اعتراف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لئے بھیجے گئے
نیک دل اور حقیقت شناس تو سُننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن وہ بھی جن کے دل کے آ
زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُر اثر دعوت، اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف اور شفا
ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو بر تو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز
زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت
ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام۔ ایک کامل قانون۔ ایک مکمل شریعت۔ ایک ابدی مذہب۔ ایک عملی جما
خدا پرستی، ایثار، تدین، تقویٰ، دیانتداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پید
ہو گیا۔ اور گویا یہی حقیقت تھی جس کی طرف آپؐ نے اپنی اُمت کے سب سے بڑے مجمع میں (حجتہ الوداع) اپنی وفات سے
تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:۔

الا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوات والارض۔ (بخاری)

ہاں! اب زمانے کا دور اپنی اُسی حالت پر آگیا۔ جس حالت پر اُس دن تھا جس دن خدا نے
آسمان و زمین پیدا کیا۔

اور یہی حقیقت تھی۔ جس کی نسبت آپؐ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُر درد وداعی تقریر کے آخ
میں یہ الفاظ فرمائے:۔

قد ترکتم علی البیضاء لیلھا کنھارھا!

مَیں تم کو ایک روشن راستہ چھوڑ جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہو کہ اس کی رات بھی دن
کے مانند ہے۔

اور آخری حجتہ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ۔

آج مَیں نے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔

پروفیسر مارگیولیتھ جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"محمدؐ کی وفات کے وقت اُن کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا۔ آپ ایک سلطنت جس کا
ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا۔ بنیاد ڈال چکے تھے۔ آپؐ نے عرب کے

منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا۔ آپؐ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا تھا اور
ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔"

ایک دور (یورپ) کے بیگانہ مستشرق کی بہ نسبت جس کا علم عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار [ہے]، خود ایک عرب عیسائی اہلِ قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق حاصل ہے۔ بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں [عر]ب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے؟ اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم [...]ور مجاعص) نے لکھا:۔

"دنیا میں سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس[۵] کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی۔ جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کردی۔ لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمی اور ناخواندہ تھا۔ وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی۔ عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پیدا کردیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لئے اور اس سلطنت کے لئے جس کو اس نے قائم کیا۔ ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کردیئے۔ اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں۔ جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آسکتی ہے۔ حج کو ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا۔ تاکہ اقوام انسانی میں اہلِ استطاعت ایک مرکز پر جمع ہوکر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کرسکیں اپنی اُمت پر زکوٰۃ فرض کرکے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی۔ قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالمگیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بزرگی حاصل ہے۔ اس بناء پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا۔ یہ کہہ کر کہ عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں۔ اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لئے آسان کردیا۔ نامسلموں کے لئے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اُوپر لے لی کہ "تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے۔ تو خدا کو سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے"۔ خاندانی اور ازدواجی اصلاحات بھی اُس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہیں۔ اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کئے۔ عورت کا مرتبہ بلند کیا۔ نزاعات و مقدمات کے فیصلے کے قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قائم کرکے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا۔ علم کی اشاعت اور تعلیم اُس کی کوششوں کا بڑا حصّہ رہی۔ اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا۔ اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانے میں ہر دروازے سے علم حاصل کیا۔ کیا ان کارناموں کا انسان دُنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا؟"

---

۵ مدینہ منورہ میں حضورؐ دس برس زندہ رہے!

انگلستان کے مشہور انشاء پرداز کارلائل نے اپنے "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار "محمد" آپ کی نسبت کہتا ہے:۔

"قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقاء کا پتہ چلتا ہے۔ جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔"

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیاء میں یہی برگزیدہ ہستی ہے۔ جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کئے اور اصلاحات انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا جس کی تکمیل اُس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو۔ اور یہ اس لئے کہ تمام انبیاء میں خاتم نبوت، مکمل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی۔ اگر انسان کی عملی اور اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی۔ حالانکہ آپ نے فرمادیا کہ:۔

"میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔"

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے۔ جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا۔ بعض مشرکوں نے حضرت سلمانؓ فارسی سے مذاقاً کہا کہ:۔

"تمہارے نبی تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیوں کر کرنی چاہیئے۔"

حضرت سلمانؓ نے کہا:۔

"ہاں سچ ہے۔ آپ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رُخ نہ بیٹھیں۔ نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں جن میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو۔"

نبوت محمدیؐ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پست سے پست اور غیر متمدن سے غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لئے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتی ہے عرب کے بدویوں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لئے آپ کی بعثت تھی۔ اس لئے آپ کی تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر کی ہدایات ہیں۔ آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیم کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور اُن کو متمدن اور مہذب بنانے کے لئے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ لیکن عیسوی مذہب کی چند اخلاقیات کو چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے، دعائیں اور عبادات کلیسا کے حکمرانوں سے اور تہذیب و تمدن کی تعلیمات بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کچھ نہیں۔ عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں۔ اخلاق ہوں کہ آداب تمدن۔ خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار۔ انسانوں کیساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ۔ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

(جلد چہارم سیرت النبی — علامہ سید سلیمان ندوی)

افتخار احمد بلخی

قرآن شہادت دیتا ہے
کہ
سنّت رسولؐ دین میں حجت ہے

["فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر" کے دو حصے اب تک شائع ہو چکے ہیں، یہ مضمون تیسرے حصے کے آخری باب کا ایک جزو ہے۔ م - ق]

اصل گفتگو سے بیشتر ملار بحث کا متعین طور پر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے، تاکہ کسی مرحلہ پر اصل نقطۂ نظر نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے اور بات پوری وضاحت سے سامنے آجائے۔

● حجیت حدیث و سنت پر گفتگو کے یہ مدارج پیدا ہوتے ہیں:۔

۱۔ حدیث و سنت بجائے خود دین میں حجت و سند ہے یا نہیں؟

۲۔ اگر ہے تو اس کے پرکھنے کا معیار کیا ہے؟

۳۔ حدیث اور اس کے اسناد کی تقسیموں کی تفاصیل۔

۴۔ کیا حدیث کی کوئی ایسی کتاب ہے جو اول سے آخر تک واجب التسلیم ہو؟

۵۔ اگر ہے تو وہ کونسی؟

۶۔ اگر نہیں تو وہ کون سے پیمانے ہیں، وہ کونسی میزان اور کسوٹی ہے جس پر جانچ کر اور وہ کونسا آئینہ ہے جس سے مقابلہ کر کے اس امر کا اظہار خیال کیا جائے کہ فلاں فلاں کتب کی فلاں فلاں احادیث واجب التسلیم ہیں اور فلاں فلاں مشکوک یا ساقط الاعتبار ہیں۔

● ان میں سے ہماری ساری گفتگو مرحلۂ اول میں دائرہ رہے گی۔

● کیونکہ انکار حدیث کا موجودہ موقف یہ ہے کہ حدیث و سنت کا بجائے خود دین میں کوئی مقام نہیں۔ یعنی اصولاً فی نفسہ حدیث و سنت کی حجیت و سند کا انکار ہو رہا ہے، عام ازیں کہ اس کے لئے کوئی بھی معیار ہو، عام ازیں کہ وہ کسی کتاب میں ہو، عام ازیں کہ وہ تواتر سے ہی کیوں نہ ثابت ہو اور وہ عمل متواتر ہی کیوں نہ ہو بلکہ عام ازیں کہ خود زبانِ رسالت ہی سے یہ کیوں نہ سُن لیں کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یا فعل ہے۔

● اس لئے دیگر ساری باتوں کا فیصلہ اسی بنیادی امر پر موقوف ہے اور اس کے بعد کے بقیہ درجات کے لئے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ اور انتہائی بالغ نظری اور انتہائی علم و بصیرت کے ساتھ غیر معمولی خدا ترسی و تقویٰ کی حاجت۔ اور رہنمایہ

کتاب اس کی متحمل ہو سکتی ہے اور (بلا انکسار یہ واقعہ ہے کہ) نہ اس کتاب کا مصنف اپنی علمی تنگ دامانی و عملی بے مائگی کی بنا پر اس کی اہلیت ہی رکھتا ہے کہ دیگر دفعات پر سیر حاصل بحث کر سکے۔ اس لئے بھی ہماری ساری گفتگو صرف دفعہ ۱ میں منحصر رہے گی۔

● ——— حدیث و سنت سے متعلق محدثین و فقہاء کے اصطلاحی کلمات اور تفریقوں کی بحثوں میں ہم نہ پڑھنا چاہتے ہیں اور نہ اپنے ناظرین کے ذہنوں پر یہ غیر ضروری بار ڈال کر انھیں مصطلحات کے چکر میں الجھانا چاہتے ہیں، بلکہ ان الفاظ کو سن کر ان کا سیدھا سا دا جو مفہوم ایک مسلمان کے ذہن میں آتا ہے، وہ ہے امور دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد و عمل، اور یہی عام مفہوم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا امور دین میں قول و فعل) اس عنوان میں ہمارے پیش نظر ہے۔

رہا سنت اور اسوۂ نبوی کا صرف یہ مفہوم لینا کہ رسولؐ کی طرح قرآن میں محض اجتہاد کیا جائے اور جس طرح رسول نے اپنے زمانے کے مطابق قرآن سے مسائل مستنبط کئے اُسی طرح اپنے زمانے کے مطابق مسائل کا استنباط کیا جائے۔ تو میں نہیں سمجھتا کہ اگر اسی کا نام سنت اور اسوۂ نبوی کی اتباع ہو تو پھر مرزا غلام احمد قادیانی کو متبع سنت کیوں نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لئے کہ انھوں نے بھی تو آخر و لکن رسول اللہ و خاتم النبیین میں کوئی نہ کوئی اجتہاد ہی فرمایا ہے۔ اور سارے وہ مستشرقین اسوۂ نبوی کی اتباع کرنے والے کیوں نہ ٹھہرائے جائیں جنھوں نے قرآن میں اجتہاد کیا اور دورِ حاضر کے متجددین کو اسلام سکھلایا۔ قرآن میں نفس اجتہاد کرنا ہی جب "سنت رسول" ٹھہرا، تو پھر ہر بوالہوس۔ جو قرآن کی کسی آیت کا کوئی مطلب بیان کر دے، متبعِ سنت بنے گا۔

● ——— حدیث و سنت کی حجیت کے ثبوت میں دو باتیں ہونی چاہئیں۔

اولاً نقض و معارضہ یعنی منکرین کے دلائل کا ابطال، اور یہ کام گذشتہ اوراق میں ہو چکا ہے، بالخصوص اس قبلی عنوان ——— "اور یہ حیلہ سازیاں" ——— کے ماتحت۔ "یہ حیلے" دراصل وہ اعتراضات و ایرادات اور وہ مغالطے اور تشکیکات ہی تو ہیں۔ جو انہیں "ابتدائے آفرینش" سے لے کر آج تک پیرایۂ بیان کے نئے نئے قالب بدل کر پیش کئے جاتے رہے ہیں، اور چونکہ یہ یکجائی آچکے ہیں، اور بہ اندازِ تفصیل سے ان کی حقیقت و انکشاف کی جا چکی ہے، اس لئے دلائل منکرین کے نقض کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور اگر کہیں اس کا اعادہ ہو گا تو محض ضمنی طور پر اور بالکل مختصر۔

ثانیاً حجیت کے ایجابی دلائل۔ اور انھیں ہم یہاں درج کر رہے ہیں، مگر بسط و تفصیل سے نہیں، بلکہ بنیادی نکات (Points) کے انداز سے وباللہ التوفیق۔

حجیت حدیث و سنت کے اثباتی دلائل کو ہم بآسانی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

حصۂ اوّل :- قرآن کی اندرونی شہادت

حصۂ دوم :- خارجی شہادت

اور پھر خارجی شہادت کے دو شعبے ہوتے ہیں۔

(۱) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابۂ کرامؓ کے بعد علمائے امت کی سلفاً من خلف اس کے حجت ہونے کی شہادت۔

(۲) عقلی حیثیت سے اس کی حجیت کا ثبوت۔

قرآنی تصریحات

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ قرآنی نصوص اس بارے میں کیا فیصلہ دیتی ہیں۔ اس زاویۂ نگاہ سے ہم دیکھتے ہیں تو ہمارے سامنے قرآن کی بے شمار آیات میں سے چند یہ ہیں:-

لقد مَنّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولًا　　یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا جب کہ اس نے

منھم یتلو علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ الآیہ (آل عمران)

ان میں ایک رسول بھیجا جو اُن پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور اُن کا تزکیہ کرتا ہے، اور اُنھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تین ذمہ داریوں کا تذکرہ ہے۔

(۱) خدا کی آیات کی تلاوت کر کے دوسروں کو سنانا۔

(۲) تزکیہ کرنا۔

(۳) تعلیم کتاب وحکمت۔

ظاہر ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت" کا مفہوم ومدعا اور تتلو علیھم کا معنی ومقصود ایک ہو تو یہ ایک بے سود تکرار ہوگی لہذا معلوم ہوا کہ فریضۂ رسالت نہ صرف اللہ کی آیات کا دوسروں تک پہونچا دینا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ان کی تعلیم بھی ہے، اور تعلیم الفاظ کے سنا دینے کا نام نہیں ہے بلکہ مشکل معالب کا حل کرنا اور مجمل معانی کی تفصیل وتشریح کو تعلیم کہتے ہیں اور یہی وہ "تعلیم کتاب وحکمت ہے" جو احادیث وسنن کے نام سے موسوم ہے۔ اور "تعلیم" میں زبان سے سمجھانا اور عمل کر کے دکھانا دونوں چیزیں آتی ہیں۔

اسی طرح قرآن سے نبی کے تعلق کو ظاہر کرنیوالی یہ آیتیں بھی ہیں:۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم (النحل ۴۴)

ہم نے آپ کی طرف الذکر نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے آپ اس چیز کی وضاحت کریں جو اُن کی طرف اتاری گئی ہے۔

وما انزلنا علیک الکتاب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ الآیہ (النحل)

ہم نے آپ پر الکتاب اسی لئے تو نازل کی ہے تاکہ آپ اس کو واضح کر دیں جس میں انھوں نے اختلاف کیا۔

ان آیات میں صاف طور سے دیکھا جا سکتا ہے کہ دو چیزیں ہیں۔ ایک تو وہ جو رسولؐ پر نازل ہوئی دوسرے وہ جو رسولؐ تبیین وتوضیح کے طور پر کریں یہی تبیین وتوضیح تو وہ ہے جسے احادیث وسنن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پھر قرآن نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو علم کے ساتھ "حکم" بھی عطا ہوتا ہے۔

ماکان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللہ الآیہ (آل عمران)

کسی بشر کا یہ کام نہیں کہ اللہ اس کو کتاب حکم اور نبوت دے مگر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو الخ

"حکم" فیصلہ اور حق وباطل کے درمیان امتیاز کرنے کا نام ہے عام از یں کہ اس کی پابندی دوسرے سے کرائی جا سکے یا نہ کرائی جا سکے۔ حکم سے "دنیاوی حکومت وسلطنت" کا مراد لیا جانا اہل عجم کا محاورہ ہے، خالص عربی کا نہیں۔ اس کے لئے لغات کی طرف رجوع کرنے کی چنداں حاجت نہیں خود قرآن میں ایک موقع پر اٹھارہ انبیاء یعنی حضرت ابراہیم اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، ذکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، الیسع، یونس اور لوط علیہم السلام کے اسمائے گرامی گنا کر کہا گیا ہے کہ:۔

اولئک الذین آتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ (الانعام رکوع ۱۰)

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائی تھی۔

اور ظاہر ہے کہ ان میں سے چار کو چھوڑ کر بقیہ ۱۴ نام ان انبیاءؑ کے ہیں جن کو دنیوی حکومت وسلطنت کا کوئی حصہ نہیں ملا پس "حکم"

سے مراد ہے قوتِ فیصلہ، اختیارِ فیصلہ، کتاب کا وہ فہم جس سے امورِ دینی میں فیصلہ کیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا رسول کا یہ فہم، رسول کی تعلیم کتاب وحکمۃ، رسول کی یہ تبیان وتشریح اور رسول کی یہ قوت واختیارِ فیصلہ اسی طرح کا تھا، جس طرح کسی بڑے سے بڑے مفکر وفلسفی اور "لائق ومناسب بن جانے والے" قرآن فہمی کے اجارہ داروں کا ہوا کرتا ہے یا اس باب میں رسول کا مقام ومرتبہ ان سے مختلف تھا؟ اس کے لئے یہ آیت قولِ فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰکَ اللّٰہُ (النساء ۱۶)

(اے محمد) ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ الکتاب نازل کی ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس طرح فیصلے کریں جس طرح اللہ آپ کو دکھائے۔

اس آیت میں بما اراک اللہ کا جملہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔ بما رئیت (جیسا کہ آپ دیکھیں) نہیں کہا گیا ہے، بلکہ کہا گیا ہے بما اراک اللہ جیسا "اللہ آپ کو دکھائے"۔ اراءۃ (دکھانا) اور تنزیل (نازل کرنا) استعمال، مفہوم اور معنی کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں۔ تنزیل کا تعلق اس وحی سے ہے جو الفاظ کے ساتھ نازل ہو، اور اراءۃ میں وہ الہام والقاء داخل ہے جو بذریعۂ الفاظ نہ ہو۔ اور لفظ "وحی" اپنی حقیقت کے لحاظ سے تنزیل اور اراءۃ دونوں کو شامل ہے۔ یہی وہ "بما اراک اللہ" ہے جس کو محدثین وائمۂ مجتہدین اپنی اصطلاح میں وحیِ خفی یا "وحیِ غیر متلو" سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی اللہ کی وہ "اراءۃ" جس کا اظہار وبیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ واعمال کے ذریعہ وتوسط سے کیا، اللہ کی "اراءۃ" تو ہے مگر الفاظ نہیں، جس کی تلاوت کی جائے[۱]۔ لہٰذا کسی بات سے متعلق رسول کی تعلیم کسی امر سے متعلق رسول کی تفصیل

---

[۱] خدا کی شان کہ "مثلہ معہ" اور "وحیِ خفی ووحیِ غیر متلو" کی اصطلاحات وتعبیرات کے معاملے میں مولانا تمنا عمادی مجیبی ان منکرینِ حدیث کے بالکل ہم نوا ہیں اور نہایت شدت سے ان اصطلاحوں اور تعبیروں کی مخالفت فرماتے ہیں، لیکن "مثلہ معہ" کے نفسِ مفہوم ومدعا کے صحیح اور درست ہونے کا اعتراف مولانا ممدوح کی زبان سے گذشتہ صفحات میں آپ سن چکے ہیں، اب "وحیِ خفی اور وحیِ غیر متلو" کی مولانا موصوف کی جانب سے تصدیق وحمایت ملاحظہ ہو۔

"تم قبروں کے اندر فتنے میں ڈالے جاؤ گے یعنی تم کو آزمایا جائے گا اور یہ امتحان فتنۂ دجال کے قریب قریب ہوگا۔" یہ روایت تو مجھ کو بالکل صحیح ہی معلوم ہوتی ہے، مگر افسوس کہ آپ یا دوسرے لوگ اس کا مطلب غلط سمجھے، اصل عبارت عربی یوں ہے قد اوحی الی انکم تفتنون فی القبور قریباً من فتنۃ الدجال۔ یعنی آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ میری طرف وحی کی گئی ہے یعنی میرے دل میں بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ فراستِ نبویہ ڈال دی گئی ہے کہ تم لوگ قبروں کے بارے میں فتنہ (آزمائش) میں پڑو گے فتنۂ دجال کے قریب۔ لوگوں نے فی القبور کے معنی قرار دے "قبروں کے اندر"...... حالانکہ جس طرح اہلِ عرب بولتے ہیں فتن فی دینہٖ یعنی اپنے دین کے بارے میں فتنہ میں ڈالا گیا، اسی طرح تفتنون فی القبور کے معنی ہوئے "قبروں کے بارے میں فتنہ میں ڈالے جاؤ گے۔" اور یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت قبر پرستی میں مستقل طور سے مبتلا اور فتنہ میں پڑی ہوئی ہے۔" (تحفۂ اہلِ بہار صفحہ ۶۶ از مولانا تمنا عمادی مجیبی)

اس روایت میں "اوحی الی" کا لفظ پوری صراحت سے موجود ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ قرآن اور تنزیل نہیں، اس کے باوجود مولانا تمنا اس کو صحیح تسلیم کر رہے ہیں، حالانکہ منکرین کے نقطۂ نگاہ سے اسی روایت میں لفظ وحی کا آجانا ہی اس کو "عجمی سازش" کہہ دینے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح کی روایتوں پر یہ حضرات خود کہتے ہیں کہ "سارا قرآن چھان مارئیے۔ آپ کو یہ وحی (باقی اگلے صفحہ پر)

و تشریح اور کسی معاملہ سے متعلق رسولؐ کا فیصلہ محض ایک بشر کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی ارادہ کا نتیجہ اور فراستِ نبویہ کا وہ فیصلہ ہے، جس میں کوئی دوسرا شخص رسولؐ کا شریک و سہیم نہیں اور نہ ہو سکتا ہے علم ازیں کہ وہ شخص اپنی عقل و فراست اور اپنے فہم و فکر کے لحاظ سے کتنے ہی اونچے درجہ پر فائز کیوں نہ ہو، وہ اپنے عہد کا افلاطون اور نابغۂ وقت ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن بعض مدعیانِ بصیرتِ قرآنی ایسے بھی ہیں جو چند در چند اگر پیچھے ہیں کہ اگر وحی کے علاوہ بھی حضورؐ کی باتیں بجانب اللہ ہوتی تھیں، تو "کئی ایک باتوں پر" "اللہ تعالیٰ نے کیوں" "آپ کو ٹوکا" اور پھر اس "کئی باتوں پر اللہ کے ٹوکنے" کے اظہار کے بعد "مثلاً" لکھ کر قرآن سے تین واقعات کا حوالہ دیتے ہیں، اس طرح پڑھنے والوں کے ذہنوں پر یہ تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں کہ گویا رسولؐ نے وحی (اور وحی کو یہ حضرات الفاظ کے ساتھ تنزیل میں منحصر سمجھتے ہیں) کے علاوہ جب بھی کوئی قدم اٹھایا، ٹھوکر کھائی، اور یہ تین عدد "مثلاً" تو مشتے نمونہ از خروارے ہے! حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں کل ۵ مواقع اس قسم کے ہیں جن میں سے ۳ تو یہ حضرات مثالوں میں لکھ ہی دیتے ہیں۔

یہاں ان کی تفصیلات نظر انداز کرتے ہوئے ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ قرآن اٹھا کر وہ پانچوں مقامات دیکھ جائیے اور بتائیے کہ ان میں سے کون سا واقعہ ایسا ہے جو تعلیم کتاب و حکمت سے متعلق ہے اور اس میں حضورؐ سے غلطی ہوئی اور اس پر خدا نے تنبیہ فرمائی کونسا واقعہ ایسا ہے جو تبیان و تشریح کتاب و حکم بین الناس (تحکم بین الناس) سے تعلق رکھتا تھا، جس میں حضور نے غلط مسئلہ بیان کیا۔ کوئی ہمیں بتائے کہ فلاں آیت کے جزمبہم کی تعیین اور فلاں مجمل آیت کی تفصیلات کے طے کرنے میں حضورؐ نے یہ غلطی کی اور

(بقیہ ص)

نظر نہ آئے گی۔ تعجب معاندین کی غوغا آرائی پر نہیں ہے کیونکہ ان کا تو مشن ہی یہ ہے کہ جیسے بھی ہو، حدیث و سنت سے وحشت و عداوت پیدا کرائی جائے، تعجب مولانا ممدوح پر ہے کہ وہ محدثین اور ائمہ پر آخر اس قدر کیوں برہم ہیں؟ کیا محض ایک اصطلاح مقرر کر لینے کے سبب؟ دراں حالیکہ "وحیِ خفی" یا "وحی غیر متلو" کی اصطلاح سے اسلاف کرام کا جو مقصد و مراد ہے وہ اس سے قطعاً مختلف نہیں، جو مولانا تمنا نے لکھا ہے یعنی "اللہ کی طرف سے بذریعۂ فراستِ نبویہ بات کا دل میں ڈالا جانا"۔ اور پھر مجھ سے زیادہ مولانا تمنا اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قرآن نے لفظ وحی کو الفاظ کے ساتھ تنزیل میں منحصر نہیں کیا ہے، بلکہ اس کو اسی عموم پر رکھا ہے جو اس کے وضعی معنی کی رو سے ہے، اور جس میں الفاظ کے ساتھ تنزیل اور بغیر الفاظ کے دل میں بات کا القاء دونوں شامل ہیں۔ ورنہ اگر قرآن لفظ وحی کو تنزیل کے ساتھ مخصوص سمجھتا تو ان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم (شیاطین اپنے اولیاء کی طرف وحی لاتے ہیں) میں لفظ وحی کا استعمال نہ کرتا، اور وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب الآیہ میں تو لفظ وحی کو الفاظ کے ساتھ تنزیل سے جدا، اس کے مقابل ایک مستقل حیثیت سے ذکر کیا ہے، غرض رسول کے قول و فعل کو وحی خفی یا وحی غیر متلو کی اصطلاح سے تعبیر کرنا نہ "وحی" کی حقیقت کے لحاظ سے غلط ہے اور نہ قرآن کی رو سے نادرست، لیکن مشکل یہ ہے کہ کہنے والوں نے رسولؐ کے قول و عمل کے واسطے یہ تعبیر مقرر کی تھی، مگر معاندین تو معاندین، نفس حدیث و سنت سے سرکشی کو "کفر" تعبیر کرنے والے بعض ارباب علم و فضل کی نظروں سے اس تعبیر کا یہ مرکزی نقطہ اوجھل ہو جاتا ہے، اس بنا پر ان کے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی ہے اور وہ خواہ مخواہ یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ کتب حدیث کو یہ سارٹیفکٹ دی گئی ہے اور ہر اس جملہ کو وحی خفی یا وحی غیر متلو کہا گیا ہے جس میں قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ اس بنا پر معاندین کے ساتھ یہ ارباب علم و فضل بھی شریک تبرا نگنی ہو جاتے ہیں۔

یہ غلط بات تعلیم دی جس کو بدل کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جو بہ اور یہ تفصیل بتائی گئی۔ یہ ایک صریح مغالطہ ہے کہ گنتی کے پانچ ایسے وا
دکھائے جائیں جن میں وحی کا انتظار نہ فرماتے ہوئے حضورؐ نے کوئی قدم اٹھالیا ہے اور اس پر اللہ کی طرف سے تنبیہ آئی ہے۔ اور ا
سے نتیجہ یہ نکالا جائے کہ قرآنی آیات سے متعلق حضورؐ کی متعین کردہ ساری جزئیات و تفاصیل (عام اذیں کہ وہ عبادات سے متع
ہوں یا اخلاق و معاملات سے) آپؐ کا ایک نجی کام تھا جس کا تعلق رسالت سے نہ تھا۔ آپؐ نے انہیں اپنی طرف سے انجام دیا جس طر
دوسرے صاحبانِ "معارف القرآن" انجام دیتے اور دے سکتے ہیں' یہ ساری جزئیات و تفاصیل آپؐ کی محض ایک ایسی بشری کو
تھی جو ہر صاحب بصیرت اپنے اپنے زمانے میں کر سکتا ہے' اور پھر دیکھئے کہ اس آیت میں یہ کہاں ہے کہ کسی طرح کی بشری فروگذاشت
امکان ہی نہیں اور اس کا دروازہ قطعی بند کر دیا گیا ہے کہ رسولؐ بال برابر بھی جنبش نہیں کر سکتے" اس آیت میں تو صرف اس کا اظہا
کہ آپؐ پر کتاب نازل کی گئی ہے تاکہ آپ ارادۃ الٰہی سے حکم بین الناس کریں۔ اب سوال یہ ہے کہ انا انزلنا علیک الکتاب
خارج میں مصداق تو قرآن ہے' لیکن اس کے بعد جو بما اراک اللہ ہے' اس کا بھی خارج میں کوئی مصداق و محمل موجود ہونا چاہ
یا نہیں؟ اگر نہیں تو صاف کہا جائے کہ یہ جملہ کبھی بھی شرمندۂ معنی نہ ہوا' اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا وہ حدیث و سنت کے علاوہ اور کو
چیز بھی ہو سکتی ہے؟

رہے قرآن میں وارد شدہ وہ پانچ واقعات' جن کے ذریعے صاحبانِ معارف کو رسولؐ کی غلطیاں پکڑنے میں خاص مزہ آتا ہ
تو بجائے اس کے کہ وہ واقعات مخالفین کے لئے کار آمد ہوں' خود ہمارے لئے حجت بنتے ہیں اس لئے کہ یہی تو وہ آیتیں ہیں جن سے
روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ رسولؐ پر خدا کی طرف سے شدید نگرانی قائم رہتی ہے کہ وہ خطا نہ کرنے پائے' معاملات کو بالکل رسول
بشری عقل اور اس کے انسانی اجتہاد پر نہیں چھوڑا گیا ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو غلطیوں سے بچانے کی ذمہ داری خود اپنے او
لی ہے' اور خدا کی طرف سے اس کا سخت اہتمام کیا جاتا رہا ہے کہ رسول سے اگر کوئی ایسی بات بھی ظہور پذیر ہو جائے' جو چاہے فی نفسہ
انسانوں کے اعتبار سے غلطی نہ ہو' لیکن مقام رسالت اور اس کے دُور رس نتائج کے لحاظ سے لغزش بن سکتی ہو تو فوراً اس کی اصلا
کر دی گئی ہے" اس چیز کو مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑے اچھے انداز میں واضح کیا ہے:۔

"اگر آپؐ کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی ہوتی تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ آپؐ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی
کے مطابق ہوتے تھے' مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا تھا کہ اجتہاد نبوی کے فیصلوں کی صحت و خطا کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے نہیں لی تھی' اس لئے
تنبیہ نہ فرمائی گئی' مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے' صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے' اور بعض پر نہیں'
اس سے بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد نبوی میں غلطی ہو جانا ممکن ہے' مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں' اُدھر
لغزش ہوئی اور اُدھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ (سیرۃ النبی ج ۴ ص ۱۲۴)

غرض' یہ آیت اس چیز پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ حضورؐ پر ایک تو تنزیل ہوئی (انا انزلنا) اور دوسری چیز حضو
اللہ نے اپنی ارادۃ (بما اراک اللہ) عطا فرمائی' لہٰذا اس آیت اور چار پانچ نہایت معمولی فروگذاشتوں سے متعلق تنبیہ وا
والی آیات پیش نظر رکھنے کے بعد کم از کم یہ بات پورے طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ رسولؐ کے جن کاموں اور فیصلوں اور تعلیمات
پر اللہ نے گرفت نہیں کی' وہ سب کے سب اللہ کے معیار مطلوب پر پورے اترتے ہیں اور گویا ان پر خود اللہ ہی کی مہر توثیق ثبت
اس مہر توثیق اور اس "ارادۃ" کی شہادت خود قرآن میں بکثرت ہے' چند آیات درج ذیل ہیں:۔
ان علینا جمعہ وقرآنہ .... تم اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔۔۔

ثم اِنّ علینا بیانہ (القیامۃ) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت میں تین باتیں فرمائی گئی ہیں اور ان تینوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

(۱) جمع قرآن

(۲) قرآن کا پڑھ دینا

(۳) قرآن کا بیان

جمع و ترتیب قرآن سے متعلق کوئی ایسی آیت نہیں جس سے واضح ہو کہ اللہ نے رسول کو بذریعہ تنزیل اس کی ہدایت دی کہ فلاں [فلاں] آیت کو فلاں فلاں مقام پر رکھواؤ۔ یہ کام رسول نے بغیر تنزیل کے کیا' لیکن کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ رسول کا یہ کام محض نجی حیثیت [کا] تھا اس کو رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا' یہ ترتیب آیات و سور رسول کا محض وقتی اجتہاد تھا اور چونکہ ان علینا جمعہ کے اجمال [کی] تفصیل کا تذکرہ قرآن میں نہیں اس لئے منشائے ایزدی یہ ہے کہ موجودہ ترتیب آیات و سور کی یہ تفاصیل و جزئیات قابل ترمیم اور [قابل] تغیر و تبدل ہیں۔ بعوض رسول کے اس کام کو اللہ نے اپنی طرف (علینا) منسوب فرما لیا۔ اسی طرح قرآن کا بیان اللہ نے اپنی طرف منسوب [ک]یا ہے (ثم ان علینا بیانہ[1]) اور بیان کہتے ہیں توضیح و تشریح کو' مجمل کی تفصیل اور اس کے منشا کی تعیین کو' ابہام کی وضاحت [ک]ر دینے کو۔ اب سوال یہ ہے کہ مثلاً قرآن میں اذان سے متعلق معاندین کے ایک رد یہ کی حکایت کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وَاِذَا نَادَیْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ اتَّخَذُوْھَا ھُزُوًا وَّلَعِبًا (اور جب تم لوگ نماز کے لئے اذان دیتے ہو تو یہ اعدائے دین اسے ہنسی اور [کھ]یل بناتے ہیں) مگر خود اس ندائے صلوٰۃ کا بیان اور اس کی تفصیلات قرآن میں کہاں ہے؟ اسی طرح اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ [م]یں صلوٰۃ جمعہ کا بیان اور اس کی توضیح قرآن میں نہیں۔ یعنی قرآن سے نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ حکم جمعہ کے دن کی کس نماز کے لئے ہے[2]

اسی طرح قرآن میں ہے کہ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا (اور لوگوں پر خدا کا حق ہے کہ جو اس گھر تک جانے کا مقدور رکھے وہ اس کا حج کرے) مگر قرآن سے نہیں بتایا جا سکتا کہ حج کا یہ حکم ہر سال ہے یا عمر میں ایک مرتبہ' نیز مناسکِ حج کی ساری تفاصیل و بیان کا علم محض قرآن سے نہیں ہو سکتا۔ علیٰ ہذا القیاس آتوا الزکوٰۃ کا حکم تو موجود ہے' مگر اس کا بیان اور اس کی تفصیل سے قرآن خالی ہے' پھر کیا ثم ان علینا بیانہ کی رو سے ضروری نہ تھا کہ ان امور کے بیانات و تفاصیل اور ان کی وضاحتیں اللہ تعالیٰ کرتا؟ یقیناً ضروری تھا' اور اس نے کیا' اور وہ بیانات و تفاصیل ہی حدیث و سنت ہیں' جنھیں اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا۔

ہر زمانے کے "مرکز ملت" پر قرآن کے بیان کو اٹھا رکھنا' دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اللہ نے اپنی اس ذمہ داری (علینا بیانہ) کی تکمیل نہیں فرمائی اور قرآن کو یوں ہی بلا بیان چھوڑ دیا تاکہ یہ ہر کس و ناکس کا تختۂ مشق بنتا رہے۔ اور اگر بلا بیان نہیں چھوڑا' تو بتایا جائے کہ آخر قرآن کا بیان ہے کیا؟ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو بیانہ کا مصداق و محمل ہیں' اور اگر

---

[1] ظاہر ہے کہ یہاں خود قرآن کے متعلق نہیں کہا جا رہا ہے کہ یہ قرآن بیان ہے' بلکہ بیانہ میں بیان کی اضافت قرآن کی طرف ہے' یعنی قرآن کا بیان۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہاں دو علیٰحدہ (قرآن اور اس کا بیان) دو چیزیں ہیں۔

[2] و ذروا البیع اور وابتغوا من فضل اللہ سے اگر کوئی صاحب معارف ظہر کے وقت کا استنباط کر سکتے ہیں' تو ادلاً تو یہ ان کا اپنا استنباط ہوگا' قرآن کا بیان نہیں کہا جا سکتا اور پھر اس کے مقابلہ میں دوسرا شخص انہیں جملوں سے صبح اور شام کے اوقات بآسانی نکال سکتا ہے۔

وہ امور رسول کے اقوال و افعال ہی ہیں، تو پھر یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ قرآن کا وہ بیان حجت و سند نہ بنے جسکی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے۔

اسی طرح یہ آیتیں قابلِ غور ہیں:

وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا .... الآیۃ (البقرہ ۱۷)

جس قبلہ پر تم تھے، اس کو ہم نے نہیں مقرر کیا تھا مگر اس لئے کہ .... الخ

تحویل قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھنے کا حکم قرآن میں نہیں ہے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ حکم وحی کی بناپر تھا، کیونکہ ماضی میں بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ حَدِیْثًا فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِہٖ وَاَظْھَرَہُ اللّٰہُ عَلَیْہِ .. .. .. قَالَتْ مَنْ اَنْبَاَکَ ھٰذَا، قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ (التحریم ۱)

اور جب رسول نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی، تو (انہوں نے دوسری کو بتادی) جب اس نے اس کو فاش کیا اور اللہ نے (اُن بیوی کے اس افشائے راز سے) رسول کو مطلع کردیا...... تو اُن بیوی نے پوچھا کہ یہ آپکو کس نے بتایا تو رسول نے کہا مجھ کو خدائے علیم وخبیر نے مطلع کیا ہے)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اُن بیوی نے وہ بات جو دوسری کو بتائی تو اُن کے اس افشائے راز کی خبر اللہ نے رسول کو دی، لیکن قرآن میں وہ الفاظ موجود نہیں ہیں جن سے اس افشائے راز کی رسول کو اطلاع یابی معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ رسول کو اللہ کا یہ بتانا وحی تھا، مگر چونکہ وہ آیت نہیں جس سے یہ راز بتایا گیا ہے، اس لئے یہ وحی تنزیل نہ تھی۔

اسی طرح جب بنی نضیر اپنے مکانات سے نکال دیئے گئے اور اُن کی کھجوروں کے درختوں میں سے کچھ کاٹ دیئے گئے اور کچھ چھوڑ دیئے گئے، تو اس واقعہ سے متعلق قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ:

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِّیْنَۃٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْھَا قَائِمَۃً عَلٰی اُصُوْلِھَا فَبِاِذْنِ اللّٰہِ وَلِیُخْزِیَ الْفَاسِقِیْنَ (الحشر رکوع ۱)

و مومنو) کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا اپنے جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، سو وہ خدا کے حکم سے تھا، اور مقصود یہ تھا کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس موقع پر درختوں کو کاٹ ڈالنے کا حکم دینا ازروئے وحی تھا، مگر قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں بتائی جاسکتی جو کچھ درختوں کے کاٹ دینے اور کچھ کو چھوڑ دینے کے حکم خداوندی پر دلالت کررہی ہو۔

پھر بکثرت ایسی آیات ہیں جو اس امر پر صراحتاً شہادت دیتی ہیں کہ احکام مشروع ہوچکے تھے، لیکن ان کے بارے میں قرآن کی آیت موجود نہیں، مثلاً ایک تو بیت المقدس کو قبلہ بنانے والا ہی حکم ہے، اسی طرح ندائے صلوٰۃ کا متذکرہ آیت ہے (واذا نادیتم (الآیۃ) کہ اس آیت میں ندائے صلوٰۃ کا حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس کی حکایت کرتے ہوئے ایک دوسری بات کہی جارہی ہے، اذان کے حکم سے متعلق کوئی آیت نہیں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اذان کا حکم تنزیل کے ذریعہ نہیں بلکہ اللہ کی اسی ارادۃ اسی وحی خفی (سنت) کے ذریعہ دیا گیا تھا، اسی طرح ولا تصل علی احد منھم مات ابداً[1] کی

---

[1] اور (اے رسول) ان میں سے کوئی مرجائے تو کبھی اس (کے جنازے) پر نماز نہ پڑھنا۔

آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے نماز جنازہ مشروع ہو چکی تھی، اور رسول اللہؐ جنازوں پر نماز پڑھا کرتے تھے، حالانکہ قرآن میں ایسی کوئی آیت موجود نہیں جس سے نماز جنازہ کا حکم معلوم ہوتا ہو۔ اور یہ آیت نماز جنازہ کے حکم کے لئے نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے مقصد کے لئے ہے۔ لہٰذا وہ لوگ جو قرآنی معارف "بصیرت" کی اس منزلِ عرفان پر ابھی نہیں پہنچے ہیں کہ اس آیت کی موجودگی کے باوجود "نماز جنازہ" کو محض "معاشرتی تقریبات" میں سے شمار کریں۔ بلکہ وہ نماز جنازہ کو ایک دینی فعل ہی تصور کرتے ہیں، اُنہیں غور کرنا چاہیئے کہ آخر نمازِ جنازہ کا حکم وحیِ متلو (قرآن) کے ذریعہ دیا گیا تھا یا وحیِ غیر متلو (سنت) کے ذریعہ؟

یہاں معترضین یہ فرماتے ہیں کہ قرآن نے نازل ہو کر ان اُمور کی صحت تسلیم کرلی۔ صحت تسلیم کرلی' نہ کہیئے، بلکہ یہ فرمایئے کہ تنزیل کے علاوہ بھی وحیِ خفی (یا جو بھی آپ نام رکھیں) کے ذریعہ احکام کی مشروعیت کی حکایت کرتے ہوئے کوئی اور بات کہی ہے۔ پھر یہ کہ سوال اس کا نہیں ہے کہ قرآن نے نازل ہو کر کیا کیا؟ سوال تو اس کا ہے کہ حکم کی مشروعیت بغیر تنزیل ہوئی یا نہیں؟ قرآن نے جب تک ان باتوں کا تذکرہ نہیں کیا تھا، اُس وقت تک رسولؐ کے دئے ہوئے وہ احکام منجانب اللہ تھے یا نہیں؟ اگر تھے تو قرآن کی یہ حکایت اور یہ تذکرے غلط ٹھہرتے ہیں، اور اگر تھے تو معلوم ہوا کہ قرآنی آیات کے علاوہ بھی اللہ تعالےٰ اپنے رسولؐ کو اپنے احکام و تعلیمات اور اپنی ہدایتوں سے مطلع فرمایا کرتا تھا۔

اور پھر قرآن کا "نازل ہو کر صحت تسلیم" کرلینے کے باوجود بعض آیات ہنوز مجمل ہیں، مثلاً "ندائے صلوٰۃ" والی آیت کہ باوجود قرآن میں اس کے "تذکرہ" کے اذان کے طریقہ اور اس کے کلمات کا بیان نہیں ہے، لہٰذا "قرآنی اسلام کے مجددین" کے مسلک کی رو سے مرکزِ ملت نصابِ زکوٰۃ کی طرح نمائے صلوٰۃ کے طریقہ وغیرہ میں بھی ردوبدل کرنے کا اصولاً مجاز ہوگا، تو کیا اس کو اصولاً مجاز قرار دینا خدا کے حکم میں تغیر و تبدل کرتے رہنے کا مجاز بنا دینا نہیں ہے؟

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ رسولؐ کی تعلیم کتاب و حکمت کی یہ ذمہ داری، رسولؐ کی یہ تبیین اور رسول کو "حکم" (قوتِ فیصلہ و تمیزِ حق و باطل) دیا جانا کیا رسولؐ کے محض "تفنن طبع" کے سامان تھے، یا ان اُمور سے متعلق قرآن کے کچھ تصریحی احکام بھی ہیں؟ اس سلسلہ کی بے شمار آیات میں سے چند درج ذیل ہیں:۔

وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ (النساء ۹) — ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس سے اصولی طور پر معلوم ہوا کہ رسالت اور مطاع ہونا لازم و ملزوم ہے، کسی رسولؐ کی رسالت کی تصدیق کرنا ہی اُسے واجب الاطاعت یقین کرنا ہے، عام ازیں کہ اس رسولؐ کو تمکن فی الارض اور دنیوی اقتدار بھی حاصل ہوا ہو۔

دوسری بات یہاں پیش نظر رکھنے کی ہے کہ یوں نہیں کہا گیا ہے کہ وما انزلنا من کتابٍ الا لیعمل بہ (ہم نے کسی کتاب کو نہیں نازل کیا مگر اس لئے کہ اس پر عمل کیا جائے) بلکہ فرمایا گیا ہے کہ وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کتب منزل من اللہ واجب الاتباع ہوتی ہیں اسی طرح انبیاء و رسل کی ہستیاں بھی بالاستقلال واجب الاطاعت اور واجب الاتباع ہوتی ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اس صورتِ حال اور اس واقعہ کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب کے بغیر تو انبیاء کو مبعوث فرمایا ہے، لیکن نبی کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی ہے۔ اور یہ بھی عام ازیں کہ اس پر کتاب بھی نازل کی گئی ہو یا بغیر کتاب کے اس کی بعثت ہوئی ہو اور عام ازیں کہ اس کو دنیوی اقتدار

وحکمرانی حاصل ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، چونکہ وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے اس لئے فرمایا گیا کہ وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن اللہ ہر وہ رسول جس کو ہم نے رسول بنا کر بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

لہٰذا یہ آیت اس امر پر صراحتًا دلالت کر رہی ہے کہ رسول کا رسول ہو کر مبعوث ہونا اور اس کا واجب الاتباع بننا لازم وملزوم ہیں اور اسی لئے قرآن میں درجنوں مقامات پر اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور اطیعوا اللہ ورسولہ کا حکم ہے، لہٰذا جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر "الرسول" اور "رسول اللہ" کا صدق واطلاق ہوگا اور جتنے لوگ آپ کی رسالت کی تصدیق کریں گے، اُن پر فرض ہوگا کہ آپ کی اطاعت کریں، پس اگر آج محمدؐ پر الرسول اور رسول اللہ صادق نہ آتا ہو اور اس زمانے میں محمدؐ کی رسالت باقی نہ رہی ہو تو بے شک اطیعوا الرسول اور اطیعوا رسولہ کا حکم بھی باقی نہ رہا[1]، لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور یقینًا ایسا نہیں ہے، تو پھر حیثیتوں کی تفریق پیدا کرنا اور اطاعت کو "بالمشافہ" میں منحصر کرنا قرآن کے نص صریح کا انکار ہے، بلا دلیلِ قطعی، محض جولانیٔ طبع کے بل بوتے پر اگر اطیعوا اللہ ورسولہ کی تاویل کیجا سکتی ہے تو پھر آمنوا باللہ ورسولہ میں بھی اسی قسم کی کوئی تاویل کیوں نہیں کیجا سکتی؟

اور پھر اگر رسول کی "بحیثیت مرکز ملت بالمشافہ ہی اطاعت تھی تو اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول[2] میں اطیعوا اللہ واولی الامر منکم کہدینا بالکل کافی تھا،

---

[1] اور یہی بتاؤں کہ اطاعت واتباعِ رسول کی ایسی صریح آیات کو دیکھتے ہوئے منکرین حدیث پر اپنی تاویل وتوجیہ کی عنکبوتیت خوب واضح ہے، اس لئے یہ حضرات اس بات کو کہہ بھی گئے کہ آج محمدؐ کی رسالت باقی نہیں، دبے لفظوں اور چکردار راستے سے یہ بات زبانوں سے ادا کیجا چکی ہے جسے گذشتہ صفحات میں ان حضرات کے اقوال کے اقتباسات کے ضمن میں آپ دیکھ چکے ہیں، ممکن ہے آپ کو تنبیہ نہ ہوا ہو اس لئے ان جملوں کو پھر دیکھئے:-

"سلیم کے نام" صفحہ ۲۳۵ کے طویل اقتباس میں تھا کہ "نبوت تو ختم ہو گئی مگر رسالت محمدیہ قرآن کی شکل میں قیامت تک کے لئے باقی ہے"۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج مسلمان ہونے کے لئے لا الٰہ الا اللہ والقرآن کتاب اللہ کہنا چاہیئے، یا یہ کہنا کافی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ تصریح کے ساتھ "علم حدیث" والے مضمون کی گذشتہ صفحات میں منقولہ یہ عبارت ملاحظہ ہو:-

"دین کی ضروریات قرآن کی اتباع اور امام وقت کی اطاعت سے پوری ہوتی ہیں" دیکھا آپ نے؟ یہاں ضروریاتِ دین سے رسولؐ کو درمیان سے صاف حذف کر دیا گیا، رہا یہ کہنا کہ قرآن کی اتباع اور قرآن پر ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ محمدؐ کی رسالت کا اقرار کیا جا رہا ہے، تو یہ ایسے "معارف ونوادرات" ہیں جن کا علم شاید اللہ میاں کو بھی نہ تھا ورنہ وہ قیامت تک کیلئے مومن ومسلم ہونے کیلئے اللہ، ملائکہ، کتب رسل اور آخرت ہر ایک کو مستقل مستقل کیوں بیان کرتا، محض یہ کہدینا کافی تھا کہ قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لاؤ، اور جو لوگ ایمان لاتے وہ صرف اتنا کہتے کہ آمنتُ باللہ وکتبہ۔ آخر تفصیل سے ہر ایک پر مستقل حیثیت سے ایمان لاتے ہوئے یہ کیوں کہیں آمنتُ باللہ وملائکتہ وکتبہ ورسلہ بلکہ فقط ایک ایمان یعنی محض قرآن پر ایمان لے آنے ہی میں توحید کا اقرار رسالت محمدیہ کی تصدیق، ملائکہ اور آخرت پر ایمان سب مندرج ہو جاتے۔

[2] اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر کسی معاملہ میں تمہارے درمیان تنازع ہو تو اس معاملہ کو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

(النساء ۸)

اطیعوا الرسول کا جملہ بالکل زائد اور غیر ضروری ہو کر رہ جاتا ہے" اور لغت و استعمال کی رو سے ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اولی الامر کا اطلاق "ماتحت افسران" ہی پر ہوتا ہے، اور جو لوگ یہاں اس سے "ماتحت افسران" مراد لیتے ہیں اُن کے کشکولِ برہان وحجت میں نہ کوئی قرآنی نص ہے، نہ عربی لغت اور استعمال اہلِ عرب کی شہادت ہے اور نہ آیت میں کوئی ایسا لفظ یا قرینہ ہے جو اس (اولی الامر) کو "ماتحت افسران" میں دائر رکھے یہ تاویلِ رکیک محض بات کی پچ ہے اور ہاندلی۔

پھر اولی الامر سے "ماتحت افسران" مراد ہونے کی تفسیر کرنے والے ارباب معارف کے کشف و مسلک کی رو سے جب فردوہ الی اللہ کہہ دیا گیا تو اس سے یہ مراد حاصل ہو گئی کہ "ماتحت افسران سے نزاع کی صورت میں امر متنازع فیہ کو مرکز ملت کے سامنے پیش کردو، اسے مرکزی حکومت کی طرف (REFER) کردو"۔ پھر الی اللہ کے بعد الرسول کا ایک زائد اور بے کار لفظ کیوں لایا گیا؟ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک "جب انسانی دُنیا سے متعلق ذکر ہوگا تو وہاں اللہ سے مراد ہوگا۔ ملت کا اجتماعی نظام[1]" (سلیم کے نام ص۱۵۸) اور یہ کہ "جہاں جہاں اللہ یا قرآن یا رسول کی اطاعت کا الگ الگ بھی ذکر ہے" وہاں اس سے مرکزِ ملت کی بالمشافہ اطاعت مراد ہے" (اسلامی نظام ص۱۲۴) لہٰذا کھلی ہوئی بات ہے کہ "قرآنی اصطلاح" کے اس انکشاف کے بموجب صرف فردوہ الی اللہ ہونا چاہیئے تھا، صرف یہی جملہ کافی تھا، اس کے بعد الرسول کا لفظ بالکل زائد اور غیر ضروری قرار پاتا ہے۔

یہی نہیں، بلکہ ان حضرات کے اس نقطۂ نظر سے تو ہر وہ آیت جو انسانی دنیا سے متعلق ہو، اس میں لفظ اللہ کے بعد لفظ رسول کا آنا محض ایک بے سود تکرار ہے۔ ایک تحصیل حاصل ہے، مثلاً متذکرہ بالا آیت ہی کو لے لیجئے کہ: اطیعوا اللہ سے ان ارباب معارف کے ادّعا کے بموجب یہ مراد ہوگا کہ مرکزِ ملت کی بالمشافہ اطاعت کرو۔ پھر اس کے بعد اطیعوا الرسول کہنا، کیا ایک لایعنی سی بات نہ ہوگی، ایک تحصیل حاصل نہ ہوگا جبکہ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ مرکزِ ملت کی بالمشافہ اطاعت کرو؟

پس اس آیت کی رو سے جس طرح رسولؐ کی اطاعت کا حکم معلوم ہوتا ہے اس طرح اگر فردوہ الی اللہ والرسول کا حکم قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ہے تو پھر آج اسکی عملی صورت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کرنے کی شکل یہ ہو کہ قرآن کی طرف رجوع کیا جائے، اور الرسول کی طرف رجوع کرنے کی شکل یہ ہو کہ سنت کی طرف رجوع کیا جائے لہٰذا اس آیت کی رو سے جس طرح دین میں سند کتاب اللہ ٹھہرتی ہے اسی طرح سنت رسول اللہ بھی ایک سند وحجت قرار پاتی ہے۔

---

[1]: بھولئے کہ ملت کا اجتماعی نظام، مرکزی حکومت، قرآنی حکومت، مرکز نظامِ دین اور مرکزِ ملت ایک ہی چیز کی مختلف تعبیریں ہیں، کبھی کوئی فقرہ اور کبھی کوئی فقرہ یہ حضرات استعمال کرتے ہیں۔

[2]: اس موقع پر مولانا عمادی مجیبی کا یہ ارشاد بھی پیش نظر رکھ لیجئے، جو البیان، لاہور بابت اپریل ۵۳ء کے حوالہ سے گذشتہ صفحات میں کسی مقام پر نقل کیا جا چکا ہے کہ اس آیت (اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیٔ فردوہ الی اللہ والرسول) میں "ماتحت افسران" کو نہیں بلکہ:-

"امیر اور جماعت دونوں کو کہا جا رہا ہے کہ اگر کسی چیز میں تمہارے درمیان نزاع واقع ہو جائے، یعنی جماعت

(باقی اگلے صفحہ پر)

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ۰۰۰۰۰ الآیہ (النساء ۹)

بس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اپنے اختلافات میں تمھیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں ۔۔ ۰۰۰۰۰ الخ

اس آیت میں اس کی تصریح ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا تقاضا یہ ہے کہ آپؐ کو حَکَم تسلیم کیا جائے، اور آپؐ کے ہر فیصلہ کی بے چون وچرا اطاعت کی جائے ۔ اگر آپؐ کی اطاعت "بالمشافہ" ہی ضروری تھی تو اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ پر ایمان بھی "بالمشافہ" ضروری تھا ۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم (الاحزاب ۵)

اور کسی مومن مرد اور عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا فیصلہ کردیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملہ میں (اس فیصلہ کے نامقبول کا) کوئی اختیار باقی رہے ۔

یہ آیت اس امر کے لئے نص ہے کہ جب تک محمدؐ پر رسولہٗ (اللہ کا رسول) کا اطلاق ہوگا، اُس وقت تک آپؐ کی ہر اُس بات کا بے چون وچرا تسلیم کرنا فرض ہے، جس پر ماقضیٰ رسولہٗ صادق آتا ہے ۔

بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ رسول اللہ نے جو فیصلے بحیثیت مرکزِ ملت کے" اور چلیے یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ رسول اللہ کے فیصلے اور آپؐ کی تعلیمات وہدایات ارادۂ الٰہی اور وحیِ خفی کے نتیجہ میں نہیں ہوتی تھیں ۔ تب

(بقیہ صــــ) امیر کے کسی حکم کو "معروف" نہ سمجھے" اس لئے اس کی اطاعت میں عذر ہو تو اس نزاع کو اللہ یعنی کتاب اللہ اور رسول یعنی سنت نبویہ کے سامنے پیش کرو۔"

اس آیت میں جیسا کہ آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ اولی الامر منکم کو "افسرانِ ماتحت" پر منحصر فرماتے ہوئے "ملاؤں" کی تشریح کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی تھی کہ :-

"اس کی تشریح یوں کیجاتی ہے کہ اگر قوم کو حکومت سے اختلاف ہوجائے تو اس کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن (اللہ) اور حدیث (رسول) کو سامنے رکھ کر مناظرہ کیا جائے اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہوجائے ... الخ (اسلامی نظام ص)

اس طرح کی تصویر کشی کا مدعا تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ کیا ہے ؟ ۔ تاکہ اپنی خود ساختہ "ملاؤں" کی اس مگر دہ تفسیری پوزیشن کا استہزاء اور اس پر اعتراض کیا جاسکے ۔ ورنہ ظاہر ہے کہ - "قرآن واحادیث کی کتابیں بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج" - کے بجائے اس آیت کا تشریحی نقشہ یہ کھینچا جاسکتا تھا کہ ملک کی اعلیٰ عدالتیں اختیار فریقین کے دلائل سن کر قاضی وقت کتاب وسنت کی روسے امر متنازع فیہ کا فیصلہ کرے اور یہ عملی شکل ہوگی اس آیت کی مگر جن حضرات کے نزدیک عدالت وقضا کوئی چیز ہی نہ ہو، اور جن کے نزدیک "مرکزِ ملت" صاحب لایُسئل عما یفعل کے مظہر ہوں، ایسے حضرات کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ان کے "مرکز ملت" کے کسی فیصلہ کے خلاف عدالت عالیہ میں معاملہ بھی جاسکتا ہے اس لئے بجائے کمرۂ عدالت انہیں میدان مناظرہ دکھائی دینے لگا ۔ لیکن پتہ نہیں کہ علامہ تمنا سے بھی ان حضرات نے دریافت کیا ہے یا نہیں کہ "قرآن واحادیث کی کتب بغل میں داب کر مناظرہ کا چیلنج" وغیرہ والی مضحکہ خیز تفسیر نا کردہ طلوع اسلام کے سبحان اللہ اور بارک اللہ بروح منہ پر پانی کیوں پھیر رہے ہیں ؟

بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہاں "ہر زمانے کے ہر مرکزِ ملت" کا ذکر نہیں ہے، بلکہ اس آیت میں اُس مرکزِ ملت کا ذکر ہے جسے دنیا محمدؐ کے نام سے جانتی ہے۔ لہٰذا پھر بھی اس آیت کی رو سے اس مخصوص مرکزِ ملت (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہر ماقضیٰ کو بے چون و چرا تسلیم کرنا فرض ہے، عام ازیں کہ "رسولہٗ" کا وہ "ماقضیٰ" ارادۂ الٰہی کے نتیجے میں ہو یا نہ ہو، یعنی ہر وہ بات جس پر "ماقضیٰ رسولہٗ" کا اطلاق ہو، عام ازیں کہ رسول اللہ نے کسی حیثیت سے کیا ہو، اور عام ازیں کہ وہ ماقضیٰ آپؐ کا قرآنی اصولوں کی روشنی میں بلا ارادۂ الٰہی ذاتی اجتہاد ہی کیوں نہ ہو۔ اور جب خدا ایک مخصوص مرکزِ ملت کے ہر ماقضیٰ کو تسلیم کرنا ہر اُس شخص پر بلا تعیین زمانہ کے فرض قرار دے رہا ہے، جو مومن اور مومنہ کا مصداق ہو، تو پھر کسی زمانے کے کسی مومن کی یہ مجال کب ہے کہ وہ اس کے علی الرغم یہ کہے کہ نہیں بلکہ یہ ماقضیٰ صرف اُس مومن اور اُس مومنہ پر فرض تھا جو اس "مخصوص مرکزِ ملت" کے زمانے میں تھے۔[1]

رسولؐ کی اطاعت سے وحشت کی بنا پر رسولؐ میں حیثیتوں کی تفریق پیدا کرنے والے بعض صاحبانِ معارف اپنی جولانیِ طبع پر اترا اترا کر یہ فرماتے ہیں کہ اگر رسولؐ کا ہر قول و فعل واجب الاطاعت ہے تو پھر حضرت زیدؓ سے جو رسولؐ نے امسك عليك زوجك فرمایا تھا تو حضرت زیدؓ نے اس کی تعمیل کیوں نہ کی؟ اور اپنی اس دلیل کے "عروۃ الوثقیٰ" کی بنا پر یہ طبعزاد مکالمہ سنا ڈالتے ہیں کہ رسول اللہ حضرت زیدؓ کے پاس آئے اور کہا کہ امسك عليك زوجك، اپنی بیوی کو طلاق مت دو، تو حضرت زیدؓ نے :-

"یہی پوچھا کہ یہ خدا کا حکم ہے یا حضورؐ کی ذاتی سفارش ہے، اور جب معلوم ہوا کہ یہ آپ کی ذاتی سفارش ہے تو انہوں نے یہ کہہ کر میاں بیوی کے معاملات کو میاں بیوی ہی بہتر سمجھتے ہیں، اپنے فیصلہ کو بحال رکھا اور بیوی کو طلاق دیدی"۔ (سلیم کے نام صت ۳۹۲)

میں پوچھتا ہوں کہ قرآن میں یہ کہاں ہے کہ حضرت زیدؓ نے حضورؐ سے یہ پوچھا تھا کہ "یہ خدا کا حکم ہے یا آپ کی ذاتی سفارش" اور یہ کہاں ہے کہ حضورؐ نے جواب میں "اپنی ذاتی سفارش" کا اظہار کیا تھا، اور پھر یہ کہاں ہے کہ یہ سُنکر حضرت زیدؓ نے حضورؐ کے اس ارشاد کو اس کان سُنا اور اس کان اُڑا دیا اور اسی گفتگو کے موقع پر اُسی دم یہ کہا کہ میرا فیصلہ بحال ہے اور جھٹ بیوی کو طلاق دیدی۔ سورۂ احزاب میں آپ وہ آیتیں دیکھیے جن میں امسك عليك زوجك کا جملہ ہے، اس

---

[1] سوچیے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ :-

"اگر یہ کسی طرح ثابت بھی کر دیا جائے کہ فلاں روایت یقینی طور پر سچی ہے، تو بھی اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ حضورؐ کے زمانۂ مبارک میں دین کے فلاں گوشے پر کس طرح عمل کیا گیا تھا، اگر ہمارے زمانے کا مرکزِ حکومت قرآنی سمجھے کہ اس عمل میں کسی ردوبدل کی ضرورت نہیں تو اسے علی حالہٖ رائج کر دے اور اگر سمجھے کہ ہمارے زمانے کے اقتضاءات اس میں ردوبدل چاہتے ہیں تو اس میں ردوبدل کر دے"۔ (مقام حدیث ج ا صت ۶۶ مضمون "شخصیت پرستی" از جناب پرویز) (اور اس ردوبدل کے باب میں) "اخلاق معاملات اور عبادات میں کوئی تفریق و تخصیص نہیں" (مقام حدیث ج ا صت ۲۲۹ عنوان جناب پرویز)

انکا یہ ادعا اس آیت کے علی الرغم ماقضیٰ رسولہ کے قبول و عدم قبول میں اپنا اختیار باقی رکھنا نہیں ہو؟ کیا حق استرداد (VETO PAWER) حاصل کرنا نہیں ہے کہ ردوبدل کی ضرورت نہ سمجھی جائیگی تو قضیٰ رسولہ کو قبول کر لیا جائیگا ورنہ اس ماقضیٰ الرسول کو مسترد کر دیا جائیگا؟ جو لوگ ایسا گمان کرتے ہیں انہیں اس آیت صریحہ کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے لیے کونسا مقام تجویز فرما رہے ہیں؟

جملہ کے سیاق وسباق متذکرہ مکالمہ سے قطعی بے گانہ ہیں، اس جملہ میں یا اس کے بعد کوئی ایسا لفظ اور فقرہ نہیں جو اس دلالت کرتا ہو کہ اپنی بیوی کو طلاق کبھی بھی نہ دو۔ یہ جملہ صرف اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ رسولؐ نے کسی موقع پر ایک مرتبہ حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے روکا تھا لیکن ہمیشہ کے لئے طلاق کی ممانعت اس جملہ سے کیوں کر ثابت ہو سکتی ہے، لہذا واقعہ کا یہ پہلو آخر کس بنا پر ناقابل یقین واقعہ ہوگا کہ حضرت زیدؓ سے جب حضورؐ نے امسک علیک زوجک فرمایا تو انہوں نے اُس وقت اس کی تعمیل کی، اور طلاق نہ دی، یعنی وہ طلاق پر آمادہ تھے، حضورؐ کے یہ فرمانے پر اُس وقت طلاق نہ دی، بلکہ نباہ کی مزید کوشش میں مصروف ہو گئے، اور جب کچھ دنوں تک اپنی امکانی سعی کی ساری تدبیریں آزمالیں اور سب میں ناکامی ہوئی تو پھر طلاق کی نوبت آئی، اور جب واقعہ کا یہ پہلو پورے طور پر ممکن الحمل ہے، تو پھر یہ بلا دلیل کیوں نہ کیا جائے کہ یہی صورت حال وقوع پذیر ہوئی؟ اور غیر ضروری اطناب کا خیال مانع نہ ہوتا تو ہمیں بتاتا کہ متعلقہ آیات اسی صورت حال کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔

یہ تو تھیں (اطاعت رسولؐ کے حکم سے متعلق قرآنی آیات کی دو چار مثالیں۔ اس کے علاوہ قرآن میں نہ صرف رسولؐ کی اطاعت اور رسولؐ کے ہر اقتضٰی کے واجب التسلیم ہونے کی تصریحات ہیں، بلکہ رسولؐ کی اتباع کا بھی حکم ہے[1]۔ مثلاً :۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ الآیہ (آل عمران ۴)

(اے نبی) آپ کہدیں کہ اگر تم فی الحقیقت اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو تب اللہ تم سے محبت کرے گا۔ الخ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب ۲)

تم کو رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنی چاہیئے الخ

فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الامی الذی یؤمن باللہ وکلماتہ واتبعوہ (الاعراف ۲۰)

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے اس رسولؐ نبی اُمی پر جو خدا اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور اُن کی اتباع کرو۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ اتباع جب ہوگی تو کسی روش کی ہوگی، کسی طور طریقہ کی ہوگی، سوال یہ ہے کہ وہ روش اور وہ طور طریقہ کیا ہے جو مسلمانوں کے لئے واجب الاتباع بنایا گیا ہے؟ پھر کیا یہ عقل و ہوش کی بات ہوگی کہ رسولؐ کی روش اور رسولؐ کا ہر نقش قدم واجب الاتباع تو ہو، مگر وہ روش اور وہ نقش قدم بذات خود حجت و سند نہ ہو۔

---

[1] اطاعت اور اتباع کے درمیان جو فرق ہے، وہ مولانا تمنا عمادی مجیبی کی زبانی سے گزشتہ صفحات میں آپ سن چکے ہیں، اور یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ مولانا موصوف کے نزدیک نہ صرف رسول کی اتباع کا حکم ہے، بلکہ صحابۂ کرام (بالخصوص خلفائے راشدین) رضی اللہ عنہم کی روش بھی ازروئے قرآن واجب الاتباع ہے، کیونکہ صحابہ کی اتباع نہ کرنے پر سخت وعید ہے (...... ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جہنم وساءت مصیرا) مولانا تمنا عمادی مجیبی کے اس قرآنی استدلال سے حدیث وسنت تو بڑی چیز ہے، صحابہ کی روش تک حجت اور سند بنتی ہے۔ (اور فی الواقع ایسا ہی ہے) کیونکہ جو چیز سند و حجت ہی سرے سے نہ ہو وہ بھلا واجب الاتباع کیونکر قرار دی جا سکتی ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ قرآن نے جس طرح اللہ کی معصیت کو ضلالت اور اس کے ارتکاب کرنے والوں کو وعید سنائی ے، اسی طرح رسول کی معصیت کے ارتکاب کو بھی ضلالت اور ارتکاب کرنے والوں کو وعید کا مستوجب قرار دیا ہے۔

من یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلاٰ لاً مبینا (الاحزاب)

اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول ؐ کی نا فرمانی کرے، وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

من یعص اللہ و رسولہ فان لہٗ نار جھنم الدین فیھا ابدا (الجن)

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نا فرمانی کرے گا، تو ایسے لوگوں کے لئے نار جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

مقصود محض قرآن سے انحراف کو ضلالت قرار دینا اور یہ دھمکی ہوتی، تو ومن یعص اللہ کہدینا کافی تھا، آخر اس کے رسول کی معصیت مول لینے کے ذکر کرنے کی ضرورت اور اس کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے اگر رسول ؐ کا ہر قول و فعل جب التسلیم نہیں۔

پھر قرآن میں ایک یہ آیت بھی ہے کہ:۔

مئذ یود الذین کفروا وعصوا الرسول تسوی بھم الارض ولا یکتمون اللہ حدیثا۔ (النساء ۵)

اُس دن (یعنی قیامت کے دن) وہ سب لوگ جو رسول سے سرکشی کرتے ہوئے، اس کی نا فرمانی کرتے رہے، تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جاتے اور وہ اس میں سما جائیں۔ وہاں اپنی کوئی بات اللہ سے چُھپا نہ سکیں گے[1]۔

آیت میں صرف معصیت رسول کے مرتکب ہونے (عصوا الرسول) کا تذکرہ ہے اور یوں نہیں ہے کہ عصوا اللہ سولہ (جو اللہ اور اس کے رسول کی معصیت کے مرتکب ہوئے) اس طرح اس آیت میں معصیت رسول کے ارتکاب کے ل کا مستقل تذکرہ ہے اور رسول کی نا فرمانی کرنے کا بالاستقلال ذکر کرتے ہوئے اسے کفر قرار دیا گیا ہے، ان آیات ے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح اللہ کی معصیت یعنی قرآن سے انحراف ضلالت ہے، اسی طرح رسول ؐ ہر زمانے مرکز ملت" نہیں، بلکہ الرسول یعنی وہ ایک متعین و مخصوص ہستی جس پر الرسول اور رسولہ صادق آتے ہیں، اُس ہستی کی معصیت حدیث و سنت سے اعراض بھی ضلالت ہے، اور قرآن و سنت میں سے کسی سے بھی سرکشی کا نتیجہ دردناک عذاب ہے۔

یحذر الذین یخالفون عن امرہٖ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم۔ (النور ۹)

پس ان لوگوں کو ڈرنا چاہیئے جو اس (رسول) کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں، کہیں وہ کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں یا وہ عذاب الیم میں گرفتار نہ ہو جائیں۔

---

[1] ولا یکتمون اللہ حدیثا (اور وہ لوگ خدا سے کوئی بات چھپا نہ سکیں گے) کا ترجمہ وقت کے صاحبان معارف رآنی علم الترجمہ کے "نوادرات" کی رو سے تو یہ ہونا چاہیئے اطاعت و اتباع رسول سے گریز کرنے والے لوگ قیامت کے دن) سے کوئی حدیث چھپا نہ سکیں گے"۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ان حضرات کا یہ فریب ترجمہ آپ دیکھ چکے ہیں کہ ومن اس من یشتری لھو الحدیث یضل عن سبیل اللہ الآیہ کا ترجمہ فرمایا گیا تھا کہ" بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث شغلے کے خریدار ہوتے ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں" الخ

اس آیت کی رُو سے ہر وہ بات جس پر "امرِ رسول" کا صدق و اطلاق ہو، واجب القبول ٹھہرتی ہے اور جب تک اُس بات پر "امرِ رسول" کا لفظ صادق آتا رہے گا، وہ واجب التسلیم ہو گی۔ پس اس کو "وقتی اور عہدِ نبوت" سے مخصوص قرار دینا در اصل یہ کہنا ہے کہ اب محمد صلعم کی رسالت ختم ہو گئی، ورنہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم آج کے لئے بھی رسول ہیں تو پھر اس "امرِ رسول" کے متعلق اپنا حق استرداد محفوظ کرنا اس "امرِ رسول" کی نفی لفت ہے اور اس طرح عذابِ الٰہی کو دعوت دینا اور اللہ کے وعید کا اپنے آپ کو مستوجب قرار دے لینا ہے۔

پس، اب اُس کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر ہے کہ جو چیز

- تعلیم الکتاب ہو۔
- بیان و توضیح کتاب ہو۔
- اراءتِ الٰہی کی بنا پر ہو۔
- اللہ کی طرف سے عطا کردہ حکم (قوتِ فیصلہ) کے نتیجہ میں ہو۔
- جسے قرآن نے واجب الاطاعت قرار دیا ہو۔
- جسے قرآن نے واجب الاتباع قرار دیا ہو۔
- جس کی موجودگی میں کسی مومن اور مومنہ کا اختیارِ قبول و رد باقی نہ رکھا گیا ہو۔
- جس سے انحراف ضلالت و کفر ہو۔
- اور جس سے اعراض فتنہ اور عذابِ الیم کا مستوجب ہو۔

فی نفسہٖ اس چیز کو اصولاً دین میں حجت و سند تصور نہ کرنا، وقت کے اربابِ "معارف" کی یہ "ادائے جذب" ہے یا کوئی "مرحلہ سلوک"؟

نذرِ عقیدت

(مسرور قریشی)

چہرۂ سیح مچ ماہِ منور	جیسی صورت ایسی سیرت
شانِ پیمبر اللہ اللہ	ٹوٹی چٹائی خوابِ راحت
جلوہ فگن سرکار ہوئے ہیں	چھٹنے لگی الحاد کی ظلمت
راہ میں جتنے خطرے آئے	حق نے عطا کی سب پہ نصرت

کہکشاں

(اردو منتخبات)

★

کبیر داس جی :-

نبھ[1] کا در کھلا نہیں، نبی گئے اوہ پار

جیسے چھچھ[2] اپچھ[3] ماں، نکل جات اوہ پار

(معراج کی شب، آسمانوں کے دروازے بھی نہیں کھلے

مگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آسمانوں سے اس طرح گزر گئے

جیسے نگاہ شیشہ کے پار ہو جاتی ہے۔

حالی پانی پتی :-

یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت

بڑھا جانبِ بوقبیس ابرِ رحمت

ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت

چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا

دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

ہوئے محو عالم سے آثارِ ظلمت

کہ طالع ہوا ماہِ برجِ سعادت

نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت

کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت

یہ چالیسویں سال لطفِ خدا سے

کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ

یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

خطا کار سے درگزر کرنے والا

بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا

قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا

اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

مسِ خام کو جس نے کندن بنایا

کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا

پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا

ادھر سے ادھر پھر گیا رخ ہوا کا

یا ملکی الصفات، یا بشری القوی

فیک دلیل علی انک خیر الوری

غیب سے بھیجا تجھے ٹاپتا پھرتا تھا جب

دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما

اٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت

جیسے کہ ہنگامِ قحط قبلہ سے اٹھے گھٹا

شانِ رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں

گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا

گلہ بنی سعد کا جبکہ چراتا تھا تو

گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا

راہب و قیس و جبر رہ گئے دل تھام کر

دیکھ کے تیرا قدم ہم قدمِ انبیا

خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شر و فساد

تُو نے اسی کو دیا ارضِ مقدس بنا

---

[1] نبھ:- آسمان - [2] چھچھ - نگاہ - [3] اپچھ - شیشہ -

تُو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب
جب ہوئی مغلوب قوم تُو نے ترحم کیا

چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت
تُو نے کیا دام دام قرض سب اُن کا ادا

تُو نے کیا سِرِّ حق عارف و عامی پہ فاش
ایک کو سمجھا دیا ایک کو دکھلا دیا

حجتِ حق کرچکا دین ترا جب تمام
پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما

بجھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بُت کدے
ہو گئی تثلیث مات اور ثنویت فنا

سلسلۂ انبیاء ختم نہ ہوتا، اگر
حق کی حقیقت سے تُو پردہ نہ دیتا اُٹھا

بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ
بھیج چکا تیرے ہاتھ ملّتِ بیضا خدا

تجھ پہ صلوٰۃ و سلام ربِّ سمٰوات سے
روز و شب، صبح و شام قدرِ رمال و حصیٰ

امیر مینائی:۔

اُمت کو عشق سرورِ عالی صفات کا
طوفانِ حشر میں ہے سفینہ نجات کا

حضرتؐ کی ذات ہی سبب رونقِ جہاں
دُولھا کے دم سے لطف ہے ساری برات کا

آنسو مری آنکھوں میں نہیں آئے ہوئے ہیں
دریا تری رحمت کے یہ لہرائے ہوئے ہیں!

آشیانہ ہے مدینہ کے درختوں پہ مرا
اب اگر طاقتِ پرواز نہیں ہے تو نہ ہو

یاد جب مجھ کو مدینہ کی فضا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

حقا! قسیم کوثر و باغ و جناں ہے تُو
مقصودِ آفرینشِ کون و مکاں ہے تُو
مسند نشینِ انجمنِ کن فکاں ہے تُو
مُہرِ قبول و خاتمِ پیغمبراں ہے تُو
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اے نازِ فروشِ بزمِ امکاں
اے حلقہ بگوشِ حکمِ یزداں

دیوانہ ہوائے شوق میں ہے
گُل چاک کرے نہ کیوں گریباں

لالہ کا ہے داغ داغ سینہ
سنبل کا ہے تار تار داماں

ہر گُل ہمہ تن ہے دیدۂ شوق
گلشن ہے تمام نرگستاں!

قد تیرا لوائے حُسن و خوبی
پرچم ہیں وہ گیسوئے پریشاں

جانِ دو جہاں فدا ہے تجھ پر
قرباں ہیں ملک نثار انساں!

ہے قولِ امیر کا یہ ہر دم!
تو صورتِ زلف و مثلِ مژگاں

گر بر سرِ و چشمِ من نشینی
نازت بکشم کہ نازنینی

یہ مشتِ خاک مدینہ کے گرد پھر پھر کے
کروں نثار جو قسمت ملے بگولوں کی

دامن میں ترے گُل بھی ہیں جنّت کے ثمر بھی
او قاسمِ فردوسِ بریں کچھ تو ادھر بھی

زمانہ بھر میں ہے اصحابِ پاک کی خوشبو
مہک گیا چمنِ دہر چار پھولوں میں

مدینہ جاؤں پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

تولا ہے بہت جانچ کے اربابِ نظر نے
ہیں شمس و قمر سنگِ ترازوئے محمدؐ

خالی ہاتھ آئے گی روضہ پہ حضرتؐ کے بہار
پھول فردوس کے چُن لائے گی مالن بن کر

فرماں ہوا تو بولے مٹھی میں سنگریزے
ایماء ہوا تو دوڑے اشجار کیسے کیسے

خدا کریم، محمدؐ شفیعِ روزِ جزا
امیر کیا ہے حقیقت مرے گناہوں کی

محسن کاکوروی

چراغِ کعبہ

ہے نامِ خدا سوادِ تحریر
والیل اذا سجیٰ کی تفسیر

دریائے رواں ہے درِ نظم آج
یہ بحرِ خفیف، بحرِ مواج

ساعت ہے کمالِ بدرِ شب کی
شب ہے شرفِ مہِ عرب کی

بھیگی ہوئی رات آبرو سے
داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے

اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام
شبنم کی ردا بقصدِ احرام

گویا کہ نہا کے آئی فی الحال
جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

ہر قطرہ وضو کی فکر میں گم
ہر ذرہ کئے ہوئے تیمم

کہتا ہے جھکا ہوا اندھیرا
ہو جائے قبول سجدہ میرا

ابرِ رحمت گھرے ہوئے ہیں
کیا رات کے دن پھرے ہوئے ہیں

عنوانِ کرم کے دُرِ منثور
قرآنِ شرف کے سورۂ نور

وارد ہوئے ابر ساں زمیں پر
ساتھ اُن کے براقِ برق پیکر

پہنچا ہی براق تک جو نامہ
دو ہاتھ اُچھل پڑا ہی خامہ

ہاں! اے مرے خامہ سبک گام
آہستہ خرام بلکہ مخرام

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل
کھیت اُس کا بہشت خلد جنگل

مہ پارہ فلک سے آنے والا
اطلس کو کتاں بنانے والا

صحرائے شہود میں رمِ غیب
چلتی ہوئی راہ عالمِ غیب

بالجملہ وہ دونوں محرمِ قرب
پروانہ و شمعِ عالمِ قرب

حاضر ہوئے اُس کے آستاں پر
جس کا کہ مکاں ہے لامکاں پر

محبوبِ خدائے اِنس و جاں کا
مقصود رموزِ کن فکاں کا

نور القمرین و الکواکب
خورشیدِ مشارق و مغارب

تشبیہ کے آئینہ میں تمثال
تنزیہ کی سلطنت کا اقبال

لاہوت مقام و عرش مسند
شاہنشہِ انبیاء محمدؐ

تا دورِ زمانہ بہرِ نازش
تسلیمِ خدا و احترامش

اس وقت وہ دفترِ معانی
تھا داخلِ بیتِ اُمِّ ہانی

راحت تھی نیاز مندِ سرکار
تھا خواب کا بختِ خفتہ بیدار

رحمت کی ردائے مہر گستر
گلگون و لطیف و صاف بستر

ہم غافلوں کا خیال ہر پل
آرائشِ پردہ ہائے مخمل

خضرِ رہِ حق مقیم منزل
سوتی ہوئی آنکھ جاگتا دل

آداب سے آپ کو اُٹھایا
یا اپنے نصیب کو جگایا

ہو گی نہ یہ پھر زمیں کی توقیر
مٹی ہو ہزار بار اکسیر

انوار کا ہے درود پیہم!
تاروں کی برستی ہے شبنم

جبریل ہیں اور براق بھی ہے
قاصد بھی ہے اشتیاق بھی ہے

تحریکِ نسیمِ صبحِ صادق
کشتی سبک و ہوا موافق

اٹھیے کہ ہے بابِ فیض مفتوح
ہے طالبِ جسمِ عالمِ روح

اٹھیے کہ نگاہِ چشمِ تنزیہہ
ہے منتظرِ جمالِ تشبیہ

اے محملِ شوقِ منزلِ ذوق
اے شاہدِ ذوقِ محملِ شوق

دیکھ اٹھ کے بہارِ منزلِ صدر
اے امشبِ دہر شبیتِ شبِ قدر

اٹھ کر وہ خدا کا آرزومند
لب تشنۂ شربتِ شکر خند

آیا پئے آبروئے کعبہ
مانندِ خلیلؑ سوئے کعبہ

اہلاً سہلاً کہا حرم نے
"لبیک" حریمِ محترم نے

محراب جھکی بہ ادب سے
منبر نے قدم لئے نبیؐ کے

پیشِ نظر جنابِ عالی
بیت المقدس کا بابِ عالی

وہ سرورِ انبیائے پیشیں
وہ باعثِ فخرِ شرع و آئیں

سلطانِ عرب کے مژدہ گویاں
انجیل و زبور اٹھلے قرآں

مرفوع پیمبروں کے رایات
یا سورۂ انبیاء کی آیات

پی کر وہ شیرِ صبح پیکر
خورشید رواں ہوا فلک پر

تنہائی کا قافلہ رواں تھا
تجرید کا ساتھ کارواں تھا

پہنچی جو ہوائے دامنِ پاک
کھلنے لگے غنچہ ہائے افلاک

آگے جو بڑھا وہ صاحبِ دل
حیرت کے تھے آئینے مقابل

رفرف پہ چڑھا وہ صاحبِ قدر
جس طرح کمال پر سرِ بدر

سب سرو قدانِ عرشِ اعظم
تعظیم کو اٹھے قدِ آدم

زیرِ قدم جنابِ والا
اعلیٰ سے جو تھا مقامِ اعلیٰ

آیا سوئے بزمِ لی مع اللہ
آئینے میں جیسے پرتوِ ماہ

پہنچا وہ وہاں جہاں نہ پہنچے
جبریل کی عقل کے فرشتے

نزدیکِ خدا حضور پہنچے
اللہ اللہ! دور پہنچے

ہر لحظہ زباں پر مناجات
ہر لمحہ لبوں پر التحیات

اس وقت اٹھا ہوا ہے پردا
موقع ہے رسائی دعا کا

اے پرتوِ مہرِ لایزالی
بے مثل مثالِ بے مثالی

شمعِ حرمِ خدا نمائی
قندیلِ حریمِ کبریائی

جس طرح ملا تو اپنے رب سے
انداز سے شوق سے ادب سے

یوں ہی ترے عاصیانِ مہجور
اک دن ہوں تری لقا سے مسرور

صدقے میں ترے یہ آرزو ہے
دم میں رہِ آخرت کریں طے

ہو حشر کا دن خوشی کی تمہید
جس طرح ہے صبحِ صادق عید

یوں سر پہ ہو مہرِ آتشیں خو
ٹوپی میں کسی کی جیسے جگنو

پھولے پھلے گلشنِ تمنا!
عقبیٰ مری پھل ہو، پھول دنیا

رباعی

مولا کی نوازشِ نہاں کھلتی ہے
عزت مری پیشِ قدسیاں کھلتی ہے
کہہ دو کہ ملک گوش بر آواز رہیں
مداحِ پیمبر کی زباں کھلتی ہے

صبحِ تجلی

بیضاویِ صبح کا بیاں ہے
تفسیرِ کتابِ آسماں ہے

ہے خاتمۂ شبِ دل افروز
دیباچہ نگارِ نسخۂ روز

آثارِ سحر ہوئے نمایاں
سیپارہ لئے ہوئے ہے دوراں

واللیل کو ختم کر چکا ہے
آمادۂ دورِ والضحیٰ ہے

عنوانِ فلک ہے درِ منثور
لوحِ زرّیں سورۂ نور

اطرافِ بیاضِ مطلعِ صاف
والفجر کے حاشیہ پہ کشاف

کیفیتِ وحی میں ہے بلبل
ہے وقتِ نزولِ مصحفِ گل

سبزہ ہے کنارِ آبِ جو پر
یا خضر ہے مستعدِ وضو پر

غنچہ میں ہے خامشی کا عالم
یا صوم سکوت میں ہے مریم

کیاری ہر اک اعتکاف میں ہے
اور آبِ رواں طواف میں ہے

خرقہ ہے نصیب یاسمن کو
عمامہ ملا ہے نارون کو

پیرایۂ نور میں سمن ہے
سلطانِ مشائخِ چمن ہے

عطارِ شمیمِ گلستاں کی!
ہر مرتبۂ فرید بو کی

پھولوں میں ہے یوں گلابِ خوش آب
جیسے قطبوں میں قطب الاقطاب

ہر شمع خموش فکر میں ہے
ہر طائرِ شوق ذکر میں ہے

تنزیہہ ہے مستِ نغمۂ ہُو — ہنگامۂ لا اِلٰہ ہر سُو !
مہمانِ حدوث کا قدم ہے — امکاں پہ وجوب کا کرم ہے
سرسبزی ہے باغ میں جہاں کی — آمد ہے بہارِ بے خزاں کی
ہستی و عدم میں ایک لے ہے — لاشے کے بھی لب پہ آج نے ہے
گلدستے بہشت کے بنائے — جبریل درود پڑھتے آئے
اسلام کا آفتاب چمکا — بے پردہ و بے نقاب چمکا
پیدا ہوئے سرورِ دو عالم — پیدا ہوئے فخرِ نوح و آدم
محبوبِ خدا نبیِ مُرسل — صبحِ دو یمین روزِ اوّل
شاہنشۂ انبیاء محمدؐ — تاجِ سرِ اصفیاء محمدؐ
واللیل اشارتے ز مویش — والشمس عبارتے ز رویش
خورشیدِ سپہرِ دیں محمدؐ — نورِ عینِ الیقیں محمدؐ
سلطانِ فلک حشم محمدؐ — مہرِ عرب و عجم محمدؐ
پیدا ہوئے بادشاہِ ذیجاہ — آرائشِ تختِ لی مع اللہ
عینِ عرفان و مردمِ عین — ابروئے جبینِ قاب قوسین
جان و دلِ مرسلیں محمدؐ — روحِ روحِ الامیں محمدؐ
پیدا ہوئے خاتم النبییں — مہرِ عرفانِ عز و تمکیں
گنجینۂ اصطفاء محمدؐ — آئینۂ حق نما محمدؐ

گلِ بیرنگیٔ مطلق سے لہکتے گلزار
بے نیازی کے ریاحیں سے مہکتے جنگل
باغِ تنزیہہ میں سرسبز نہالِ تشبیہہ
انبیاء جس کی ہیں شاخیں عرفا ہیں کونپل
گلِ خوش رنگ رسولِ مدنی عربی
زیبِ دامانِ ابد طرّۂ دستارِ ازل
نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل
اوجِ رفعت کا قمر نخلِ دو عالم کا ثمر
بحرِ وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول
مہرِ توحید کی ضو اوجِ شرف کا مہِ نو
شمعِ ایجاد کی لَو بزمِ رسالت کا کنول
مرجعِ روحِ امیں زیب دہِ عرش بریں
حامیٔ دینِ متیں ناسخِ ادیان و ملل
ہفت اقلیمِ ولایت میں شہِ عالی جاہ
چار اطرافِ ہدایت میں نبیٔ مرسل
منتخب نسخۂ وحدت کا یہ تھا روزِ ازل
کہ نہ احمدؐ کا ہے ثانی نہ احد کا اوّل
دورِ خورشید کی بھی حشر میں ہو جائیگی صبح
تا ابد دورِ محمدؐ کا رہے روزِ ازل
شبِ اسرا میں تجلّی سے رُخِ انور کی
پڑ گئی گردنِ رفرف میں سنہری ہیکل
لطف سے تیرے ہوئی شوکتِ ایماں محکم
قہر سے سلطنتِ کفر ہوئی مستاصل
مبحثِ جاہ میں اعلیٰ کے ہیں معنی ادنیٰ
مصرفِ جود میں اکثر کا مرادف ہے اقل
جس طرف ہاتھ بڑھیں کفر کے ہٹ جائیں قدم
جس جگہ پاؤں رکھیں سجدہ کریں لات و ہبل
بحرِ امکاں میں رسولِ عربی درِّ یتیم
رحمتِ خاصِ خداوند تعالیٰ بادل
قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ ابروئے حضورؐ
موئے سر قبلہ کو گھیرے ہوئے گویا بادل
دینِ اسلام تری تیغ دو دم سے چمکا
یا اُٹھا قبضے سے دیتا ہوا کاندھا بادل

میر حسن :-

نبی کون یعنی رسولِ کریم — نبوّت کے دریا کا درِّ یتیم
ہوا گو کہ ظاہر میں اُمّی لقب — پہ علمِ لدنی کھلا دل پہ سب
نبوّت جو کی حق نے اُس پہ تمام — لکھا اشرف الناس، خیر الانام
محمدؐ کے مانند جگ میں نہیں
ہوا ہے نہ ایسا نہ ہوگا کہیں

مولانا احمد رضا خاں بریلوی:-

لم یات نظیرک فی نظرٍ[1] مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہ ہر دوسرا جانا
یا شمس نظرتِ الیٰ لیلی[2] چو بطیبہ رسی عرضے بکنی!
توری جوت کی جھلجھل جگ میں رچی مری شب نے نہ دن ہونا جانا
انا فی عطش و سخاک اتم[3] اے گیسوئے پاک اے ابرِ کرم
برسن ہارے رم جھم رم جھم دو بوند ادھر بھی گرا جانا

اگر گلوں کو خزاں رسیدہ ہونا تھا
کنارِ خارِ مدینہ دمیدہ ہونا تھا
بجا تھا عرش پہ خاکِ مزارِ پاک کو ناز
کہ تجھ سا عرش نشیں آفریدہ ہونا تھا

اُن کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیے ہیں
جس راہ چل گئے ہیں کوچے بسا دیے ہیں
اُن کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آ گئے ہیں سب غم بھلا دیے ہیں

اللہ کیا جہنم اب بھی نہ سرد ہوگا
رو رو کے مصطفیٰ نے دریا بہا دیے ہیں

لحد میں عشقِ رُخِ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

وہ کمالِ حُسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کیلئے تھے
یہ چھوٹ پڑتی تھی اُن کے رُخ کی کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی جگہ جگہ نصب آئینے تھے
پہاڑیوں کا وہ حسنِ تزئیں وہ اونچی چوٹی وہ ناز و تمکیں
صبا سے سبزہ میں لہریں آتیں، دوپٹے دھانی چنے ہوئے تھے
نہا کے نہروں نے وہ چمکتا لباس آبِ رواں کا پہنا
کہ موجیں چھڑیاں تھیں دھار لچکا حبابِ تاباں کے تھل ٹکے تھے
وہی تو اب تک چھلک رہا ہے وہی تو جوبن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لیے تھے
تجلیِ حق کا سہرا سر پر، صلوٰۃ و تسلیم کی نچھاور
دو رویہ قدسی پرے جما کر کھڑے سلامی کیواسطے تھے
ابھی نہ آئے تھے پشتِ زیں تک کہ سر ہوئی مغفرت کی شلک
صدا شفاعت نے دی مبارک گناہ مستانہ جھومتے تھے
نمازِ اقصیٰ میں تھا یہی سر، عیاں ہوں معنیِ اوّل آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر جو سلطنت آگے کر گئے تھے
یہ اُن کی آمد کا دبدبہ تھا، نکھار ہر شے کا ہو رہا تھا!
نجوم و افلاک جام و مینا اُجالتے تھے کھنگالتے تھے
نقاب اُلٹے وہ مہرِ انور، جلالِ رخسار گرمیوں پر
فلک کو ہیبت سے تپ چڑھی تھی تپکتے انجم کے آبلے تھے
یہ جوششِ نور کا اثر تھا کہ آبِ گوہر کمر کمر تھا!
صفائے رہ سے پھسل پھسل کر ستارے قدموں پہ لوٹتے تھے
بڑھا یہ لہرا کے بحرِ وحدت کہ دھل گیا نامِ ریگِ کثرت
فلک کے ٹیلوں کی کیا حقیقت یہ عرش و کرسی دو بلبلے تھے
وہ ظلِ رحمت وہ رُخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
سنہری زربفت، اُودی اطلس، یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے

---

[1] آپ کا نظیر کسی کو نظر نہ آیا۔ [2] اے آفتاب! تو نے میری رات دیکھی۔
[3] میں پیاسا ہوں اور تیری سخاوت سب سے زیادہ کامل و تام ہے۔

چلا وہ سروِ چمن خراماں، نہ رُک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکتی رہی وہ کب کے سب این و آں سے گزر چکے تھے
تھکے تھے روح الامیں کے بازو، چھٹا وہ دامن کہاں وہ پہلو
رکاب چھوٹی، اُمید ٹوٹی، نگاہِ حسرت کے ولولے تھے
ضیائیں کچھ عرش پر یہ آئیں کہ ساری قندیلیں جھلملائیں
حضورِ خورشید کیا چمکتے، چراغ منہ اپنا دیکھتے تھے
تبارک اللہ! شان تیری تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوشِ لن ترانی، کہیں تقاضے وصال کے تھے
ادھر سے پیہم تقاضے آنا، اُدھر سے مشکل قدم بڑھانا
جلال و ہیبت کا سامنا تھا، جمال و رحمت اُبھارتے تھے
کمانِ امکاں کے جھوٹے نقطے، تم اول آخر کے پھیر میں ہو
محیط کی چال سے تو پوچھو، کدھر سے آئے کدھر گئے تھے
خدا کی قدرت کہ چاند حق کے کروروں منزل میں جلوہ کر کے
ابھی نہ تاروں کی چھاؤں بدلی کہ نور کے تڑکے آلئے تھے

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
مہرِ چرخِ نبوت پہ روشن درود
گلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام
شہریارِ ارم، تاجدارِ حرم
نو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام
فتحِ بابِ نبوت پہ بے حد درود
ختمِ دورِ رسالت پہ لاکھوں سلام
کنزِ ہر بیکس و بے نوا پہ درود
حرزِ ہر رفتہ طاقت پہ لاکھوں سلام
طائرانِ قدس جس کی ہیں قمریاں
اُس سہی سرو قامت پہ لاکھوں سلام
وہ کرم کی گھٹا گیسوئے مشک سا
لکۂ ابرِ رافت پہ لاکھوں سلام
لیلۃ القدر میں مطلعِ الفجر حق
مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام
لخت لختِ دلِ ہر جگر چاک سے
شانہ کرنے کی حالت پہ لاکھوں سلام
دور و نزدیک کے سننے والے وہ کان
کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام
چشمۂ مہر میں موجِ نورِ جلال
اُس رگِ ہاشمیت پہ لاکھوں سلام
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا
اُس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام
اُن کی آنکھوں پہ وہ سایہ افگن مژہ
ظلۂ قصرِ رحمت پہ لاکھوں سلام
اشکباریِ مژگاں پہ برسے درود
سلکِ دُرِ شفاعت پہ لاکھوں سلام
معنیٔ قد رایٰ مقصدِ ما طغیٰ
نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام
جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آگیا
اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام
نیچی آنکھوں کی شرم و حیا پر درود
اُونچی بینی کی رفعت پہ لاکھوں سلام
جن کے آگے چراغِ قمر جھلملائے
اُن عذاروں کی طلعت پہ لاکھوں سلام
اُن کے خد کی سہولت پہ بیحد درود
اُن کے قد کی رشاقت پہ لاکھوں سلام
جس سے تاریک دل جگمگانے لگے
اُس چمک والی رنگت پہ لاکھوں سلام
چاند سے منہ پہ تاباں درخشاں درود
نمک آگیں صباحت پہ لاکھوں سلام
شبنمِ باغِ حق یعنی رُخ کا عرق
اُس کی سچی براقت پہ لاکھوں سلام

خط کی گرد دہن وہ دل آرا پھبن
سبزۂ نہرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

ریش خوش معتدل مرہمِ ریشِ دل
ہالۂ ماہِ قدرت پہ لاکھوں سلام

پتلی پتلی گلِ قدس کی پتیاں
اُن لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام

وہ دہن جس کی ہر بات وحیِ خدا
چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام

جس کے پانی سے شاداب جان و جناں
اُس دہن کی طراوت پہ لاکھوں سلام

جس سے کھاری کنویں شیرۂ جاں بنے
اُس زلالِ حلاوت پہ لاکھوں سلام

اُس کی پیاری فصاحت پہ بے حد درود
اُس کی دلکش بلاغت پہ لاکھوں سلام

اُس کی باتوں کی لذت پہ لاکھوں درود
اُس کے خطبہ کی ہیبت پہ لاکھوں سلام

وہ دُعا جس کا جوبن بہارِ قبول
اُس نسیمِ اجابت پہ لاکھوں سلام

جن کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑیں
اُس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام

جس میں نہریں ہیں شیر و شکر کی رواں
اُس گلے کی نضارت پہ لاکھوں سلام

دوش بر دوش ہے جن سے شانِ شرف
ایسے شانوں کی شوکت پہ لاکھوں سلام

حجرِ اسود کعبۂ جان و دل
یعنی مہرِ نبوت پہ لاکھوں سلام

ہاتھ جس سمت اُٹھا غنی کر دیا
موجِ بحرِ سماحت پہ لاکھوں سلام

جس کو بارِ دو عالم کی پروا نہیں
ایسے بازو کی قوت پہ لاکھوں سلام

کعبۂ دین و ایماں کے دونوں ستوں
ساعدینِ رسالت پہ لاکھوں سلام

جس کے ہر خط میں ہے موجِ نورِ کرم
اُس کفِ بحرِ ہمت پہ لاکھوں سلام

نور کے چشمے لہرائیں، دریا بہیں
انگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام

عیدِ مشکل کشائی کے چمکے ہلال
ناخنوں کی بشارت پہ لاکھوں سلام

دل سمجھ سے ورا ہے مگر یوں کہوں
غنچۂ رازِ وحدت پہ لاکھوں سلام

کُل جہاں مِلک اور جَو کی روٹی غذا
اُس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام

جو کہ عزمِ شفاعت پہ کِس کر بندھی
اُس کمر کی حمایت پہ لاکھوں سلام

انبیاء تہ کریں زانو اُن کے حضور
زانوؤں کی وجاہت پہ لاکھوں سلام

ساقِ اصلِ قدم، شاخِ نخلِ کرم
شمعِ راہِ اصابت پہ لاکھوں سلام

کھائی قرآں نے خاکِ گزر کی قسم
اُس کفِ پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

پہلے سجدہ پہ روزِ ازل سے درود
یادگاریِ اُمت پہ لاکھوں سلام

بے بناوٹ ادا پر ہزاروں درود
بے تکلف ملاحت پہ لاکھوں سلام

خندۂ صبحِ عشرت پہ نوری درود
گریۂ ابرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

اُن کے ہر نام و نسبت پہ نامی درود
اُن کے ہر وقت و حالت پہ لاکھوں سلام

بادہ ہائے صحف، غنچہ ہائے قدس
اہلبیتِ نبوّت پہ لاکھوں سلام

آبِ تطہیر سے جس میں پودے جمے
اس ریاضِ نجابت پہ لاکھوں سلام

وہ بتولِ جگر پارۂ مصطفےٰ
حجلہ آرائے عفت پہ لاکھوں سلام

جس کا آنچل نہ دیکھا مہ و مہر نے
اس ردائے نزاہت پہ لاکھوں سلام

سیّدہ زاہرہ طیّبہ طاہرہ
جانِ احمد کی راحت پہ لاکھوں سلام

اہلِ اسلام کی مادرانِ شفیق
بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام

جاں نثارانِ بدر و احد پہ درود
حق گزارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام

کاش! محشر میں جب اُن کی آمد ہو اور
بھیجیں سب اُن کی شوکت پہ لاکھوں سلام

مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں! رضا
مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی:-

اے نظمِ رسالت کے چمکتے ہوئے مقطع
تُو نے ہی اُسے مطلعِ انوار بنایا

ٹوٹے ہوئے دم جوش پہ طوفانِ معاصی
دامن نہ ملے اُن کا تو کیا جانیے کیا ہو!

مٹی نہ ہو برباد پسِ مرگ الٰہی
جب خاک اُڑے میری مدینہ کی ہوا ہو

جُھک کر انھیں ملنا ہے ہر اک خاک نشیں سے
کس واسطے نیچا نہ وہ دامانِ قبا ہو

دے ڈالیے اپنے لبِ جاں بخش کا صدقہ
اے چارۂ دل دردِ حسن کی بھی دوا ہو

گُلِ خلد لے کے زاہد تمہیں خارِ طیبہ دے دوں
مرے پھول مجھ کو دیجئے بڑے ہوشیار آئے

بزم آرا ہوں اُجالے تیری زیبائی کے
کب سے مشتاق ہیں آئینے خود آرائی کے

ورفعنا لک ذکرک کے چمکتے خورشید
لامکاں تک ہیں اُجالے تیری زیبائی کے

باغِ جنت میں نرالی چمن آرائی ہے
کیا مدینہ پہ فدا ہو کے بہار آئی ہے

اُن کے گیسو نہیں رحمت کی گھٹا چھائی ہے
اُن کے ابرو نہیں دو قبلوں کی یک جائی ہے

باغِ فردوس کھلا، فرش بچھا، عرش سجا
اک ترے دم کی یہ سب انجمن آرائی ہے

چشمِ بے خواب کے صدقے میں ہیں بیدار نصیب
آپ جاگے تو ہمیں چین کی نیند آئی ہے

شادؔ عظیم آبادی:-

ظہورِ رحمت

دیباچۂ سخن ہے شہِ انبیاء کی مدح
محبوب ہے دلوں کو حبیبِ خدا کی مدح

طغرائے لوحِ عشق ہے خیر الوریٰ کی مدح
اسلام کا نشان ہے اُس پیشوا کی مدح

نعتِ رسولِ حق ہے ہماری سرشت میں
اُمت پہ اس کا راز کھُلے گا بہشت میں

اے آدلِ ربیع اس آمد پہ میں نثار
ش کبریا کی دولتِ سرمد پہ میں نثار
لطاف و فیض و رحمتِ بیحد پہ میں نثار
ی نعمتِ بہشت محمد پہ میں نثار
دوزخ کا اب نہ خوف نہ دھڑکے عذاب کے
توحید خود بتلائے گی رستے ثواب کے

کھتا ہوں وصفِ زلفِ شہنشاہِ کائنات
امہ جو مشک کا ہو تو نافہ کی ہو دوات
تا کہ اس کے آگے شبِ قدر بھی ہے مات
شاید کہ پھیل کر یہی معراج کی تھی رات
قدرت عیاں ہر اک گرہ بے بدل سے ہے
رشتہ اسی کے سایہ کو شامِ ازل سے ہے

سروِ جناں بھی ہے اسی قامت سے منفعل
مری جو ہے خموش تو شمشاد پا بہ گل
قامت سے ساقِ عرشِ بریں کیوں نہ ہو خجل
اعلا تو اس قدر ہے جو دیکھو تو معتدل
اس قد کے جاں نثار عبادت پسند ہیں
قد قامت الصلوٰۃ کے نعرے بلند ہیں

جاتے ہیں سوئے عرشِ بریں خاتمِ رسل
کتے ہیں راستہ میں ستاروں کے آج گل
حاضر ہیں انبیائے سلف آستاں پہ کل
ہے قدسیوں میں صلی علی المصطفٰے کا غل
مہتاب، رخ سوئے درِ دولت کئے ہوئے
استادہ کس ادب سے ہے مشعل لئے ہوئے

ہر دم فلک پکار رہا ہے زہے شرف
روحانیوں نے آپ جمائی ہے آ کے صف
خود کہکشاں نے رہ بنادی ہے اک طرف
زہرہ نے کھڑی ہے بجانے کو چنگ و دف
رکھا ہے زین روح امیں نے براق پر
جائیں گے آپ گنبدِ نیلی رواق پر

بے واسطہ غرض تھا وہاں وحی کا نزول
ایسا کہاں ہوا ہے مقرب کوئی رسول
اس شب فضیلتیں جو ہوئیں آپ کو حصول
لکھوں جو مختصر بھی تو ہو انتہا کا طول
ہو آئے اتنی دیر میں طے کر کے عرش کو
گرمی بدن کی باقی تھی دیکھا جو فرش کو

خلیل الدین حافظ پیلی بھیتی:-

محمد نام ہے تیرا لقب ہے مصطفٰے تیرا
لقب نامِ خدا یہ، نام وہ صل علیٰ تیرا
ہے مجھ میں بوجھ ہی کتنا، مدینہ دور ہی کیا ہے
ہے تنکے کو تو کافی ایک جھونکا اے صبا تیرا

شکر خدا کہ راہِ عرب جلد کٹ گئی
ڈوری کھنچی زمین کی، دوری سمٹ گئی
مسدود بابِ روضہ ہوا بھیڑ چھٹ گئی
پہنچا میں کب، کہ نعمتِ دیدار بٹ گئی

ابروئے نبی قبلۂ اربابِ صفا ہے
کہتے ہیں جسے کعبۂ دل، قبلہ نما ہے
دل دے کے لیا ہے سر و سامانِ محبت
جو کچھ کہ ملا ہے مجھے کچھ کھو کے ملا ہے

اکبر الہ آبادی:-

وجد میں لائے گا یہ مضمون اہلِ ذوق کو
دھوم تھی روزِ ازل اس سیدِ ذی جاہ کی

جب دُر کے آثارِ فطرت کہہ کے حرفِ لا الٰہ
نورِ احمدؐ سے اُٹھی آوازِ الا اللہ کی

دُر فشانی نے تری قطروں کو دریا کر دیا
دل کو روشن کر دیا آنکھوں کو بینا کر دیا
خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے رہبر بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مُردوں کو مسیحا کر دیا

ولی دکنی (یا گجراتی):-

بعد حمدِ خدائے بے ہمتا — یاد کر نعتِ سیدِ مرسل
جس کی ہمت کی ہے ترازو میں — دو جہاں مثلِ دانۂ خردل
اس کی محفل میں آ ہوا ہے کھڑا — صفِ آخر میں جو ہراول۔

ملک الشعراء نصرتی:-

رہے نامور سید المرسلین — کہ آخر ہوئے شافع المذنبین
حبیبِ احد تو تجھے اے مصطفیٰ[1] — ترا ناؤں لیتے ہوئے دل صفا
نہ ہے دین دنیا میں سرور ہے توں — توں محمود واں، یاں محمدؐ ہے توں
قیامت کوں تیرے طفیل آدلیں — کرے جگ جنت کوں خوانِ خلیل
تری شان سرتاج لولاک کا — ترے تخت کوں تخت افلاک کا
سخن تیں دہن کھول جب تجھ کیا[2] — سمندر کی سیپاں میں موتی بھریا
ترا خاتم اے خاتم الانبیاء
رسالت کے فرماں پہ سکہ کیا

★

عامر عثمانی:-

بڑی مشکل یہ ہے جب لب پہ تیرا ذکر آتا ہے
دماغ و دل میں اک خوابیدہ محشر جاگ جاتا ہے
اُبل پڑتے ہیں سوتے بیکراں جذبِ محبت کے
اُبھر آتے ہیں خاکے تیری صورت تیری سیرت کے
کبھی جی چاہتا ہے تیری معصومی کے گُن گاؤں
کبھی جی چاہتا ہے سادگی کا ذکر کر ڈالوں
کبھی کہتا ہے دل زہد و ورع سے ابتداء کر لوں
کبھی کہتا ہے دل دریا دلی کا تذکرہ کر لوں
کبھی ذکرِ جمالِ دل نشیں پر جی مچلتا ہے
کبھی عہدِ رسالت شوق کے سانچے میں ڈھلتا ہے
کبھی قصہ سنانا چاہتا ہوں تیرے بچپن کا
بہت سادہ بہت معصوم سنجیدہ لڑکپن کا
کبھی حیرت فزا غزوات پھر جاتے ہیں آنکھوں میں
حنین و بدر کے دن رات پھر جاتے ہیں آنکھوں میں
کبھی تیری صداقت ولولہ انگیز ہوتی ہے
کبھی تیری رواداری تحیّر خیز ہوتی ہے
کبھی تیرے کمالِ صبر پر دل وجد کرتا ہے
تخیل میں ترے اوصاف کا پرچم اُبھرتا ہے
کبھی تیری جفا کوشی پہ آنکھیں ڈبڈباتی ہیں
تصور سے ترے فاقوں کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں
کبھی جلوے اُبھرتے ہیں تری مہماں نوازی کے
یتیموں، بے سہاروں، بیکسوں کی چارہ سازی کے
مسلسل کشمکش ہوتی ہے الفاظ و معانی میں
میں بہ جاتا ہوں اک خاموش طوفاں کی روانی میں

---

[1] اے مصطفیٰ! تو حبیب احد ہے اس لئے تیرا نام لیتے ہی دل مصفا اور پاک ہو گئے۔
[2] جب آپ دہنِ مبارک کھول کر گویا ہوئے تو اس طرح گویا ہوئے کہ سمندر کی سیپیوں کو موتیوں سے پُر کر دیا۔

کہوں کیا، کس طرح؟ یہ فیصلہ مجھ سے نہیں ہوتا
خود اپنی اُلجھنوں کا تجزیہ مجھ سے نہیں ہوتا

مولانا محمد علی جوہر:-

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں، اُن سے خلوت میں ملاقاتیں
ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی، ہردم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت
اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

امجد حیدرآبادی:-

رخ مہر ہے قد خطِ شعاعی کی طرح
وہ گلۂ اُمت میں ہے راعی کی طرح
اُس خاتمِ انبیاء کا آخر میں ظہور
ہے مصرعۂ آخرِ رباعی کی طرح

اصغر گونڈوی:-

ہر موج ہوا زلفِ پریشانِ محمدؐ
ہے نورِ سحر صورتِ خندانِ محمدؐ
کچھ صبحِ ازل کی نہ خبر شامِ ابد کی
بے خود ہوں تہِ سایۂ دامانِ محمدؐ
چھٹ جائے اگر دامنِ کونین تو غم کیا
لیکن نہ چھٹے ہاتھ سے دامانِ محمدؐ
اے حسنِ ازل اپنی اداؤں کے مزے لے
ہے سامنے آئینۂ حیرانِ محمدؐ
اصغر ترے نغموں میں بھی ہے جوشِ درود آب
اے بلبلِ شوریدۂ بستانِ محمدؐ

کچھ اور عشق کا حاصل نہ عشق کا مقصود
جزایں کہ لطفِ خلش ہائے نالہ بے سود
اگر خموش رہوں میں تو تو ہی سب کچھ ہے
جو کچھ کہا تو ترا حسن ہو گیا محدود
مقامِ جہل کو پایا نہ علم و عرفاں ہی
میں بے خبر ہوں بہ اندازۂ فریبِ شہود
چلوں میں جانِ حزیں کو نثار کرڈالوں
نہ دیں جو اہلِ شریعت جبیں کو اذنِ سجود
وہ رازِ خلقتِ ہستی، وہ معنیِ کونین
وہ جانِ حسنِ ازل، وہ بہارِ صبحِ وجود
وہ آفتابِ حرم، نازنینِ کنجِ حرا
وہ دل کا نور، وہ اربابِ درد کا مقصود
وہ سرورِ دو جہاں، وہ محمدؐ عربی
بہ روحِ اعظمِ پاکش درود نامحدود
ضیائے حسن کا ادنیٰ سا یہ کرشمہ ہے
چمک گئی ہے شبستانِ غیب و بزمِ شہود
کچھ اس ادا سے مرا اُس نے مدعا پوچھا
ڈھلک پڑا مری آنکھوں سے گوہرِ مقصود

محمد یٰسین تسکین:-

اللہ اللہ شانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ہر دل ہے قربانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

رازِ حقیقت وہ کیا جانے، ذاتِ خدا وہ کیا پہچانے
جس کو نہ ہو عرفانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم
اس سے سستا کیا سودا ہے جان کے بدلے گر مل جائے
اک دردِ ہجرانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کرامت علی خاں شہیدی:-

طلوعِ روشنی جیسے نشاں ہو شہ کی آمد کا
ظہورِ حق کی حجت ہے، جہاں میں نورِ احمد کا
اُدھر اللہ سے واصل، اِدھر مخلوق میں شامل
خواص اس برزخِ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدد کا
خدا بن مانگے کیا کیا نعمتیں دیتا ہے بندوں کو
ترا دستِ دعا ضامن ہے جیسے کُل کے مقصد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا
خدا منہ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمد کا

غریب سہارنپوری:-

گلشن میں چل رہی ہیں ہوائیں درود کی
غنچوں کی ہیں چٹک میں صدائیں درود کی
گیسوئے مصطفےٰ کا جو چھیڑا ہے سلسلہ
سر پر گھری ہوئی ہیں گھٹائیں درود کی
معطر ہو گئے خوشبوؤں سے پھولوں کے پیراہن
مگر بادِ صبا چھو آئی ہے دامن محمد کا

زمزم کا کنواں، کوثر و تسنیم کی نہریں
ہیں جرعہ کشِ ساغرِ فیضانِ محمد

ہے لطف کہ ہے باعثِ جمعیتِ خاطر
آشفتگئ کاکلِ پیچانِ محمد

رضوان مرادآبادی:-

اترائیں نگاہیں جو بڑھیں سوئے محمد
دل لوٹ گیا دیکھتے ہی روئے محمد
اُستادِ ازل نے غزلِ حسن میں لکھا
کیا مطلعِ برجستہ ابروئے محمد
مٹ جائے ہمیشہ کو پریشانئ سنبل
پڑ جائے اگر سایۂ گیسوئے محمد
رضواں جو دمِ مرگ ذرا بھی ہوا شارا
اتراتی ہوئی جان چلے سوئے محمد

مولانا ظفر علیخاں:-

جو رونق عرب کی ہوئی شانِ احمد
تو زینت عجم کی ہوئی آنِ احمد
ارسطو کی حکمت ہے یثرب کی لونڈی
فلاطون ہے طفلِ دبستانِ احمد
یہ قصہ نہ ہو ختم شام ابد تک
گنانے پہ آؤں جو احسانِ احمد

اقبال سہیل:-

محمد وہ کتابِ کون کا طغرائے پیشانی
محمد وہ حریمِ قدس کا شمعِ شبستانی
محمد یعنی وہ حرفِ نخستینِ کلکِ فطرت کا
محمد یعنی وہ امضائے توقیعاتِ ربانی
وہ فاتح جس کا پرچم اطلسِ زنگاریِ گردوں
وہ اُمّی جس کے آگے عقلِ کل طفلِ دبستانی

وہ رابط عقل و مذہب کو کیا شیر و شکر جس نے
وہ فارق زہد سے جس نے مٹایا داغِ رہبانی

وہ ناطق جس کے آگے مہر بر لب بلبلِ سدرہ
وہ صادق جس کی حق گوئی کا شاہد نطقِ ربانی

وہ عادل جس کے میزانِ عدالت میں برابر ہے
غبارِ مسکنت ہو یا وقارِ تاجِ سلطانی

وہ شاہِ بوریا مسند سکھایا جس نے دُنیا کو
یہ اندازِ جہانگیری، یہ اندازِ جہاں بانی

وہ سلطان الامم، فخرِ دو عالم، برزخ کبری
رسالت جس کی تصدیقی، جلالت جس کی اذعانی

تراشا جس کے ناخن کا ہلالِ آسماں منزل
غسالہ جس کے تلووں کا زلالِ آبِ حیوانی

دعائے یونسی، خُلقِ خلیلی، صبرِ ایوبی
جلالِ موسوی، زہدِ مسیحی، حُسنِ کنعانی

کتابِ فطرت کے سرورق پر جو نامِ احمد رقم نہ ہوتا
تو نقشِ ہستی اُبھر نہ سکتا، وجودِ لوح و قلم نہ ہوتا
یہ محفلِ کن فکاں نہ ہوتی جو وہ امامِ اُمم نہ ہوتا!
زمیں نہ ہوتی، فلک نہ ہوتا، عرب نہ ہوتا، عجم نہ ہوتا
ہر اک سویدائے دل سے پیدا جھلک محمدؐ کے میم کی ہے
دل اُس کی خلوت سرا نہ بنتا تو نقشِ یہ مرتسم نہ ہوتا

شمعِ ہدایت

جوش ملیح آبادی

اے کہ ترا غبارِ راہ تابشِ روئے ماہتاب
اے کہ ترا نشانِ پا نازشِ مہرِ خاوری
اے کہ ترے بیان میں نغمۂ صلح و آشتی
اے کہ ترے سکوت میں خندۂ بندہ پروری

تیرے کرم نے ڈال دی طرحِ خلوص و بندگی
تیرے غضب نے بند کی رسمِ ورہ ستمگری
لحن سے تیرے منتظم پست و بلندِ کائنات
ساز سے تیرے منضبط گردشِ چرخِ چنبری
بھٹکے ہوؤں پہ کی نظر رشکِ خضر بنا دیا
راہزنوں کو دی ندا بن گئے شمعِ رہبری
چشمہ ترے بیان کا غارِ حرا کی خامشی
نغمہ ترے سکوت کا نعرۂ فتحِ خیبری
زمزمہ تیرے ساز کا لحنِ بلالؓ حق نوا
صاعقہ تیرے ابر کا لرزشِ روحِ بوذرؓ
شانِ ترے ثبات کی عزمِ شہیدِ کربلاؓ
شرح ترے جلال کی ضربتِ دستِ حیدریؓ
تیرا لباسِ فاخرہ چادرِ کہنۂ بتولؓ
تیری غذائے خوش مزہ نانِ شعیرِ حیدریؓ

آج ہلالِ سدہر سے اُن کے سروں پہ خاک ہے
رکھی تھی جن کے فرق پر تُو نے کلاہِ سروری
تیرے فقیر، اور دیں کوچۂ کفر میں صدا!
تیرے غلام اور کریں اہلِ جفا کی چاکری
اُٹھ کہ ترے دیار میں پرچمِ کفر کھُل گیا
دیر نہ کر کہ پڑ گئی صحنِ حرم میں ابتری
خیز و دلِ شکستہ را دولتِ سوز و ساز دہ
مسلمِ خستہ حال را رُخصتِ ترکتاز دہ

ولادتِ رسولؐ

اے مسلمانو! مبارک ہو نویدِ فتح باب
لو وہ نازل ہو رہی ہے چرخ سے اُم الکتاب

وہ اُٹھے تاریکیوں کے بامِ گردوں سے حجاب
وہ عرب کے مطلعِ روشن سے اُبھرا آفتاب
گُم ضیائے صبح میں شب کا اندھیرا ہو گیا
وہ کلی چٹکی، کرن پھوٹی، سویرا ہو گیا

خسروِ خاور نے پہنچادیں شعاعیں دُور دُور
دل کھلے، شاخیں ہلیں، شبنم اُڑی، چھایا سرور
آسماں روشن ہوا، کانپی زمیں پر موج نور
پَو پھٹی، دریا بہے، سنکی ہوا، چہکے طیور
نورِ حق فاراں کی چوٹی کو جھلکانے لگا
کس ادا سے پرچمِ اسلام لہرانے لگا

گرد بیٹھی کفر کی، اُٹھی رسالت کی نگاہ
گر گئے طاقوں سے بُت، خم ہو گئی پشتِ گناہ
چرخ سے آنے لگی پیہم صدائے لا اللہ
ناز سے کج ہو گئی آدم کے ماتھے پر کلاہ
آتے ہی ساقی کے ساغر آگیا خم آگیا
رحمتِ یزداں کے ہونٹوں پر تبسم آگیا

آگیا جس کا نہیں ہے کوئی ثانی وہ رسولؐ
روحِ فطرت پر ہے جس کی حکمرانی وہ رسولؐ
جس کا ہر تیور ہے حکمِ آسمانی وہ رسولؐ
موت کو جس نے بنایا زندگانی وہ رسولؐ
محفلِ سفاکیٔ وحشت کو برہم کر دیا
جس نے خوں آشام تلواروں کو مرہم کر دیا

فقر کو جس کے تھی حاصل کجکلاہی وہ رسولؐ
گلہ بانوں کو عطا کی جس نے شاہی وہ رسولؐ
زندگی بھر جو رہا بن کر سپاہی وہ رسولؐ
جس کی اک اک سانس قانونِ الٰہی وہ رسولؐ
جس نے قلبِ تیرگی سے نور پیدا کر دیا
جس کی جاں بخشی نے مُردوں کو مسیحا کر دیا
واہ! کیا کہنا ترا اے آخری پیغمبر

حشر تک طالع رہے گی تیرے جلووں کی سحر
تُو نے ثابت کر دیا، اے ہادیٔ نوعِ بشر
مرد یوں مہریں لگاتے ہیں جبینِ وقت پر
گردشیں دُنیا کی تیرا قصر ڈھا سکتی نہیں
آندھیاں تیرے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں

حافظ محمد عالمگیر خاں کیفؔ۔ ٹونکی:-

دونوں عالم کی ابتدا ہو تم
رحمتِ حق کی انتہا ہو تم
ہر مرض کے لئے دوا ہو تم
ہر گرہ کے گرہ کشا ہو تم
تم سلامت ہو ڈوبنا کیسا
میری کشتی کے ناخدا ہو تم

تصوّر میں درِ اقدس کے جن کی جان نکلے گی
کھلیں گی کھڑکیاں فردوس کی اُن کے مزاروں میں

سیفؔ ٹونکی:-

مدحت سے نہیں عزتِ سلطانِ مدینہ
عزت ہے مری مدحتِ سلطانِ مدینہ
نکلے گی جو دل سے تو نکل جائے گا دم بھی
ہے روحِ رواں حسرتِ سلطانِ مدینہ
جس شخص نے قرآں کو دیکھا، تجھے دیکھا
اللہ رے اے سیرتِ سلطانِ مدینہ

یہ وہ آنکھیں ہیں جن میں گنبدِ خضرا کا نقشہ ہے
تری آنکھوں کے قرباں اے مدینہ دیکھنے والے

★

کعبہ بھی سمجھتا ہے تجھے قبلۂ مقصد
اللہ رے اے روضۂ سلطانِ مدینہ

اے زائرِ طیبہ تجھے یہ رفعتِ پرواز مبارک
صدقہ ترے اے سلسلۂ جنبانِ مدینہ

اے بیخودیٔ شوق یہاں ہوش ہو لازم
جتنا بھی ہو کم ہے ادبِ شانِ مدینہ

ارمان نکلنے پہ بھی ارمان ہے دل میں
نکلا نہ مدینہ میں بھی ارمانِ مدینہ

یہ نجم ہیں یا کوچۂ طیبہ کے ہیں ذرّے
یہ بدر ہے یا شمعِ شبستانِ مدینہ

ابو الاثر حفیظ جالندھری :-

یہ کس کی جستجو میں مہرِ عالمتاب پھرتا تھا !!
ازل کے روز سے بیتاب تھا بے خواب پھرتا تھا

یہ کس کی آرزو میں چاند نے سختی سہی برسوں
زمیں پر چاندنی برباد و آوارہ رہی برسوں

یہ کس کے شوق میں پتھرا گئیں آنکھیں ستاروں کی
زمیں کو تکتے تکتے تھک گئیں آنکھیں ستاروں کی

کروڑوں رنگتیں کس کے لئے ایام نے بدلیں
پیاپے کروٹیں کس دُھن میں صبح و شام نے بدلیں

یہ کس کے واسطے مٹی نے سیکھا گل فشاں ہونا
گوارا کر لیا پھولوں نے پامالِ خزاں ہونا

یہ سب کچھ ہو رہا تھا ایک ہی امید کی خاطر
یہ ساری کاہشیں تھیں ایک صبحِ عید کی خاطر

مشیت تھی کہ یہ سب کچھ نہ افلاک ہونا تھا
کہ سب کچھ اک دن نذرِ شہِ لولاک ہونا تھا

خلیل اللہ نے جس کے لئے حق سے دعائیں کیں
ذبیح اللہ نے وقتِ ذبح جس کی التجائیں کیں

جو بن کر روشنی پھر دیدۂ یعقوبؑ میں آیا
جسے یوسفؑ نے اپنے حُسن کے نیرنگ میں پایا

کلیم اللہ کا دل روشن ہوا جس ضو فشانی سے
وہ جس کی آرزو بھڑکی جوابِ لن ترانی سے

وہ جس کے نام سے داؤدؑ نے نغمہ سرائی کی
وہ جس کی یاد میں شاہِ سلیمانؑ نے گدائی کی

دلِ یحییٰؑ میں ارماں رہ گئے جس کی زیارت کے
لبِ عیسیٰؑ پہ آئے وعظ جس کی شانِ رحمت کے

وہ دن آیا کہ پورے ہوگئے توراۃ کے وعدے
خدا نے آج ایفاء کر دیئے ہر بات کے وعدے

مرادیں بھر کے دامن میں مناجاتِ زبور آئی
امیدوں کے سحر پڑھتی ہوئی آیاتِ نور آئی

نظر آئی بالآخر معنیٔ انجیل کی صورت
ودیعت ہوگئی انساں کو تکمیل کی صورت

اندھیری رات کے پردے کی حق نے سحر پیدا
ہوا ہر بصیرت کحلِ مازاغ البصر پیدا

ربیع الاول امیدوں کی دنیا ساتھ لے آیا
دعاؤں کی قبولیت کو ہاتھوں ہاتھ لے آیا

خدا نے ناخدائی کی خود انسانی سفینے کی !-
کہ رحمت بن کے چھائی بارھویں شب اس مہینے کی

ازل کے روز جس کی دھوم تھی وہ آج کی شب تھی
جو قسمت کیلئے مقسوم تھی وہ آج کی شب تھی

صدا ہاتف نے دی اے ساکنانِ خطۂ ہستی
ہوئی جاتی ہے پھر آباد یہ اُجڑی ہوئی بستی

مبارک باد ہو اُن کے لئے جو ظلم سہتے ہیں
کہیں جن کو اماں ملتی نہیں برباد رہتے ہیں

مبارکباد بیواؤں کی حسرت زا نگاہوں کو
اثر بخشا گیا نالوں کو فریادوں کو آہوں کو

ضعیفوں بیکسوں آفت نصیبوں کو مبارک ہو
یتیموں کو غلاموں کو غریبوں کو مبارک ہو
مبارک ٹھوکریں کھا کھا کے پیہم گرنے والوں کو
مبارک دشتِ غربت میں بھٹکتے پھرنے والوں کو
مبارک ہو کہ دورِ راحت و آرام آپہنچا
نجاتِ دائمی کی شکل میں اسلام آپہنچا
مبارک ہو کہ ختم المرسلیں تشریف لے آئے
جنابِ رحمۃ اللعٰلمین تشریف لے آئے
بصد انداز یکتائی بہ غایت شانِ زیبائی
امیں بن کر امانت آمنہ کی گود میں آئی

نداِ ئے تقدس کی گونج اٹھی زمینوں آسمانوں میں
خموشی دب گئی اللہ اکبر کی اذانوں میں
حریمِ قدس سے میٹھے ترانوں کی صدا گونجی
مبارکباد بن کر شادیانوں کی صدا گونجی
بہ ہر سو نغمۂ صلِّ علیٰ گونجا فضاؤں میں
خوشی نے زندگی کی روح دوڑا دی ہواؤں میں
فرشتوں کی سلامی دینے والی فوج گاتی تھی
جنابِ آمنہ سنتی تھیں یہ آواز آتی تھی!
سلام اے آمنہ کے لال محبوبِ سبحانی
سلام اے فخرِ موجودات فخرِ نوعِ انسانی
سلام اے ظلِ رحمانی سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی
سلام اے سرِّ وحدت اے سراجِ بزمِ ایمانی
زہے یہ عزت افزائی زہے تشریف ارزانی
ترے آنے سے رونق آ گئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی
سلام اے صاحبِ خُلقِ عظیم انساں کو سکھلائے
یہی اعمالِ پاکیزہ یہی اشغالِ روحانی

تری صورت تری سیرت ترا نقشہ ترا جلوہ
تبسم گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی
اگرچہ فقر فخری رتبہ ہے تری قناعت کا
مگر قدموں تلے ہے فرِ کسرائی و خاقانی
زمانہ منتظر ہے اب نئی شیرازہ بندی کا
بہت کچھ ہو چکی اجزائے ہستی کی پریشانی
زمیں کا گوشہ گوشہ نور سے معمور ہو جائے
ترے پرتو سے مل جائے ہر اک ذرّہ کو تابانی
حفیظ بے نوا بھی ہے گدائے کوچۂ الفت
عقیدت کی جبیں تیری مروت سے ہے نورانی
سلام اے آتشیں زنجیرِ باطل توڑنے والے
سلام اے خاک کے ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے

بہزاد لکھنوی:-

عالم کے شہریار بنائے گئے ہیں آپ
کونین کا وقار بنائے گئے ہیں آپ
کیونکر اٹھے نہ سب کی نظر آپ کی طرف
ہر قلب کے قرار بنائے گئے ہیں آپ
وہ شرع کا چمن ہو کہ گلشن ہو فقر کا
ہر رنگ کی بہار بنائے گئے ہیں آپ

حاجی اصطفا خاں اصطفا لکھنوی:-

مجھے مطلق نہیں ڈر تشنگی روزِ محشر سے
غلامی کی ہے نسبت اصطفا ساقی کوثر سے

بارگاہِ حق میں تھا درکار اے صلِّ علیٰ
قدِ آدم آئینہ بھی خود نمائی کے لئے

یا محمد کہہ کے رکھ لیتے ہیں دل پر دونوں ہاتھ
ہم سوا اس کے علاجِ دردِ فرقت کیا کریں

عجب ہے فرطِ ادب سے، جبیں جھکے نہ اگر
ترے نشانِ قدم کا جہاں گماں گزرے

پھر شاہِ مدینہ کے ہیں در پر پہنچا — تھا چونکہ میں تقدیر کا یاور پہنچا
پرکار رہا مصطفیٰ کے گردش کرکے — جس جا سے چلا پھر وہیں آکر پہنچا

یہ کس کا طالبِ دیدار ہوں میں — سراپا مطلعِ انوار ہوں میں
تری جنت بھی دیکھوں گا میں رضواں — ابھی محوِ جمالِ یار ہوں میں
ہے چشمِ ساقیٔ کوثر کا صدقہ — کہ اتنی پی کے بھی ہشیار ہوں میں
مجھے کیوں فکرِ فردا مصطفیٰ ہو — غلامِ سیدِ ابرار ہوں میں

جڑے ہوئے ہیں جو دل میں بجز نگینے سے — یہ داغِ ہجر ہیں لایا ہوں جو مدینے سے
نہ کیوں لطیف ہو نورِ مجسم وہ جسمِ بے سایہ — نکال دی گئی ظلمت ہو جس کے سینے سے
مہکتی رہتی ہیں جس سے مدینہ کی گلیاں — علاقہ کیا کسی خوشبو کو اس پسینے سے
نہ رہ سکیگا مدینہ میں بے ادب گستاخ — وہی رہیگا ہے جو یہاں قرینے سے
سفر جہاں کا جب مصطفیٰ ہو آخر بار — تو جان ساتھ ہی نکلے مری مدینے سے

خدا ہی کیا ہے نبی جانے کوئی کیا جانے — جو کچھ نبی کی حقیقت ہے وہ خدا جانے
چلے مدینہ کو عشقِ نبی کے دیوانے — حضورِ شمعِ رسالت ہیں جمع پروانے
ہیں میہمانِ نبی زائرانِ خوش قسمت — ہر ایک ذرہ حرم کا لگے ہے اپنانے
ہوئے ہیں گرچہ تہی دست حاضرِ دربار
غریب لائے ہیں ٹوٹے دلوں کے نذرانے

شکیل بدایونی:-

یہ کس ذاتِ برحق کی ہے آمد آمد
فرشتوں کا پیہم سلام آرہا ہے
یہ کون آج انسانِ کامل زمیں پر
بصد عزت و احترام آرہا ہے
خوشا! بختِ آدم کہ بزمِ فنا میں
امینِ حیاتِ دوام آرہا ہے
جو والشمس چہرہ تو واللیل گیسو
جلو میں لئے صبح و شام آرہا ہے
در و بام سے پھوٹ نکلیں ضیائیں
وہ عالم کا ماہِ تمام آرہا ہے
لرزتا ہے میخانۂ کفر و باطل
صداقت کا گردش میں جام آرہا ہے
خوشا! نطقِ رنگیں، زہے خوش کلامی
زباں پر محمد کا نام آرہا ہے
زہے جلوۂ بے مثالِ محمد
جہاں روشن است از جمالِ محمد

کوثر نیازی:-

قیصر و کسریٰ و خاقان، رسولِ عربی
تیرے دربانوں کے دربان، رسولِ عربی
رات سجدے میں گزاری ہے تو دن غزوے میں
اللہ اللہ تری شان، رسولِ عربی
گالیاں کھا کے دعاؤں سے نوازا تو نے
تیری رحمت کے میں قربان، رسولِ عربی
آدمیت کو توہم سے چھڑایا تو نے
آدمیت کے دل و جان، رسولِ عربی
جن کے سینوں میں محبت تھی تو چہروں پہ جلال
اب کہاں ہیں وہ مسلمان، رسولِ عربی
دیدنی ہے یہ تماشہ کہ صنم خانوں میں
دین والے ہیں نگہبان، رسولِ عربی

آج اسلام ہے اپنوں کی نوازش کا شکار
آج مظلوم ہے قرآنِ رسولِ عربی

ایک اک کر کے فراموش کئے ہیں ہم نے
حق سے باندھے ہوئے پیمانِ رسولِ عربی

اے غریبوں کو نہیں پوچھنے والا کوئی
اے غریبوں کے نگہبان رسولِ عربی

کشمکش ایک زمانے سے کئے جاتے ہیں
تیرے کچھ بے سروسامان، رسولِ عربی

حق سے تو اس کی ہدایت کی سفارش کر دے
کہ مری قوم ہے نادان، رسولِ عربی

سننے والا نہیں کوئی بھی مگر گاتا ہوں
نغمۂ کہنہ فاراں، رسولِ عربی

ماہر القادری:-

ظہورِ قدسی

سحر کا وقت ہے معصوم کلیاں مسکراتی ہیں
ہوائیں خیر مقدم کے ترانے گنگناتی ہیں

مئے عشرت چھلکتی ہے ستاروں کے کٹوروں سے
اُبلتی ہے شرابِ خلد مٹی کے سکوروں سے

لٹاتے ہیں دُرِ خوش آب گلزاروں کے فوارے
خوشی سے جگمگاتے ہیں تو ابت ہوں کہ سیارے

بہارِ شبنمِ گل جُھومتی ہے کیفِ جوانی میں!
نہا کر جیسے آئی ہے ابھی کوثر کے پانی میں

خوشی کے گیت گائے جا رہے ہیں آسمانوں پر
درودوں کے ترانے ہیں فرشتوں کی زبانوں پر

زمیں سے آسماں تک نور کی بارش ہے
کسی کی بے نیازی آج سرگرمِ نوازش ہے

برستے ہیں گہر انوار کے میزابِ رحمت سے
کبوتر رقص میں ہیں بامِ کعبہ پر مسرت سے

مسرت کے اثر سے مثلِ صبحِ خلد ہیں خنداں
حرم کے در، منا کی وادیاں، عرفات کے میداں

ازل کی صبح آئی، جلوۂ شامِ ابد بن کر
کیا ہستی کے محور پر جہاں نے آخری چکر

ابھی جبریل اُترے بھی نہ تھے کعبہ کے منبر سے
کہ اتنے میں صدا آئی یہ عبداللہ کے گھر سے

مبارک ہو شہِ ہر دوسرا تشریف لے آئے
مبارک ہو محمد مصطفٰے تشریف لے آئے

مبارک غمگسارِ بیکساں تشریف لے آئے
مبارک ہو شفیعِ عاصیاں تشریف لے آئے

مبارک ہادیٔ دینِ مبیں تشریف لے آئے
مبارک رحمۃ للعٰلمیں تشریف لے آئے

مبارک صبح کو شمس الضحیٰ تشریف لے آئے
مبارک رات کو بدر الدجیٰ تشریف لے آئے

مبارک ہو رسولِ محتشم تشریف لے آئے
مبارک ہو نبیٔ محترم تشریف لے آئے

مبارک قاسمِ خلد و جناں تشریف لے آئے
حریمِ قدس کے ساکن کہاں تشریف لے آئے

وہ آئے جن کے آنے کی زمانہ کو ضرورت تھی
وہ آئے جن کی آمد کے لئے بے چین فطرت تھی

وہ آئے نغمۂ داؤدؑ میں جن کا ترانہ تھا
وہ آئے گریۂ یعقوبؑ میں جن کا فسانہ تھا

وہ آئے جن کے ہاتھوں سے سخا کا مینہ برستا تھا
وہ آئے جن کے سجدوں کے لئے کعبہ ترستا تھا

وہ آئے جن کا آنا باعثِ الطافِ یزداں تھا
وہ آئے جن کی پیشانی کا ہر خط شرحِ قرآں تھا

وہ آئے جن کو ابراہیمؑ کا نورِ نظر کہیئے

وہ آئے جن کو اسمٰعیلؑ کا لختِ جگر کہیے
وہ آئے جن کے آنے کو گلستاں کی سحر کہیے
وہ آئے جن کو ختم الانبیاء خیر البشر کہیے
وہ آئے جن کے ہر نقشِ قدم کو رہنما کہیے
وہ آئے جن کے فرمانے کو فرمانِ خدا کہیے
وہ آئے جن کو رازِ کن فکاں کا پردہ در کہیے
وہ آئے جن کو حق کا آخری پیغامبر کہیے
سلام اُس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی
سلام اُس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اُس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے
سلام اُس پر کہ جس نے خون کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں
سلام اُس پر کہ دشمن کو حیاتِ جاوداں دے دی
سلام اُس پر ابوسفیان کو جس نے اماں دے دی
سلام اُس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اُس پر ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں
سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا
سلام اُس پر جو اُمت کیلئے راتوں کو روتا تھا
سلام اُس پر جو فرشِ خاک پر جاڑے میں سوتا تھا
سلام اُس پر کہ جس نے جھولیاں بھر دیں فقیروں کی
سلام اُس پر کہ مشکیں کھول دیں جس نے اسیروں کی
سلام اُس پر کہ تھا "الفقر فخری" جس کا سرمایہ
سلام اُس پر کہ جس کے جسمِ اطہر کا نہ تھا سایہ
سلام اُس پر کہ جس نے فضل کے موتی بکھیرے ہیں
سلام اُس پر بُروں کو جس نے فرمایا یہ میرے ہیں
سلام اُس پر کہ جس نے زندگی کا راز سمجھایا
سلام اُس پر کہ جو خود بدر کے میدان میں آیا

سلام اُس پر کہ جس کا نام لے کر اُس کے شیدائی
اُلٹ دیتے ہیں تختِ قیصریت اوجِ دارائی
سلام اُس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے میں
سلام اُس ذات پر جس کے پریشاں حال دیوانے
سنا سکتے ہیں اب بھی خالدؓ و حیدرؓ کے افسانے
درود اُس پر کہ جس کا نام تسکینِ دل و جاں ہے
درود اُس پر کہ جس کے خُلق کی تفسیر قرآں ہے
درود اُس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی
درود اُس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی
درود اُس پر کہ جو تھا صدرِ محفل پاکبازوں میں
درود اُس پر کہ جس کا نام لیتے ہیں نمازوں میں
درود اُس پر بہارِ گلشنِ عالم جسے کہیے
درود اُس ذات پر فخرِ بنی آدم جسے کہیے
رسولِ مجتبیٰ کہیے، محمد مصطفیٰ کہیے
وہ جس کو ہادیٔ دع ما کدر، خذ ما صفا کہیے

حسن کی جاں ایمانِ محبت صلی اللہ علیہ وسلم
سرتا پا رحمت ہی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
فخرِ امم، غمخوارِ اُمت، صاحبِ عظمت، حاملِ قرآں
فرق پہ جن کے تاجِ شفاعت صلی اللہ علیہ وسلم
بندے اور اللہ میں رکھا ہر عالم میں فرقِ مراتب
شرک کے دشمن، ماحیٔ بدعت صلی اللہ علیہ وسلم
فرمایا تم قبر کو میری سجدہ گہ ہرگز نہ بنانا
اللہ اللہ پاسِ شریعت صلی اللہ علیہ وسلم
سنجیدہ سنجیدہ ادائیں، شرمیلی شرمیلی نگاہیں
فخرِ حیا اور نازِ غیرت صلی اللہ علیہ وسلم
ماتھا اُن کا نور کا تڑکا، زلفوں میں رحمت کا سویرا
اور تبسم صبحِ سعادت صلی اللہ علیہ وسلم

دین و دُنیا یکجا کر کے رازِ ترقی کے سمجھائے
یہ بھی رحمت وہ بھی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم

اُن کا گر اقرار نہ ہوگا۔ تکمیلِ توحید نہ ہو گی
عینِ ایماں اُن کی اُلفت صلی اللہ علیہ وسلم

رات کی تنہائی میں نمازیں، اُمت کی بخشش کی دعائیں
جن کے سجدے فخرِ عبادت صلی اللہ علیہ وسلم

سائل کو ناکام نہ پھیر! بخش دیا جو کچھ گھر میں تھا
بھوکا سو رہنے کی عادت صلی اللہ علیہ وسلم

صدیقؓ و فاروقؓ کی صف میں بیٹھے ہیں سلمانؓ و بوذرؓ
جن کے یہاں مفلس باعزت صلی اللہ علیہ وسلم

ماہر تو مایوس ہونا، دل اپنا تھوڑا مت کرنا
کافی ہے بس اُن سے نسبت صلی اللہ علیہ وسلم

لحنِ داؤدی کی ہر لَے تیرے نغمہ کی شہید
ہر ادائے حسنِ یوسف تیرے ابرو کی قتیل

سب کی تیرے چشمۂ رحمت ہی سے بجھتی ہے پیاس
اس میں قلزم ہو کہ دجلہ رود گنگا ہو کہ نیل

تیری سطوت کے اثر سے ریزہ ریزہ پاش پاش
خواہ خندق کی چٹانیں ہوں کہ خیبر کی فصیل

اے تعالیٰ اللہ! ترے دربار کے ادنیٰ غلام
جن کے آگے قیصر و کسریٰ گدایانِ ذلیل

ساقیٔ کوثر تری دریا دلی کا ہو بھلا
نظمِ ماہر بن گئی آبِ روانِ سلسبیل

کوئے نبی میں اس طرح جانا نہ چاہیئے
اک اک قدم پہ سجدۂ شکرانہ چاہیئے

جالی سے چھن رہا ہے وہ نورِ مزارِ پاک
ایسے میں صرف جرأتِ پروانہ چاہیئے

پی تو لیا ہے بادۂ حُبِ نبیؐ کا جام
اب اس کے بعد ہوش میں آنا نہ چاہیئے

اے کہ ترے ظہور نے دہر سے محو کر دیئے
کفر کے سب تکلفات شرک کے سب تو ہ[illegible]

عزم کا تیرے پرتوِ شانِ جلالِ حیدری
صبر کا تیرے آئینہ غربتِ تشنۂ فرات

تیرے صدقے تُو نے کی تنظیم بزمِ زندگی!
تیرے قرباں تُو نے دی ترتیب اجزائے حیات

تیری شوکت کا نچھاور شانِ بغداد و دمشق
تیری عظمت کا تصدق عظمتِ مصر و ہرات

جہاں میں کس پہ مری چشمِ انتخاب نہیں
محمدِؐ عربی کا مگر جواب نہیں

یہ بزمِ آب و گل جتنی کہ برہم ہوتی جاتی ہے
محمدؐ کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے

مری فردِ عمل پر ہے قیامت میں نظر اُن کی
طلوعِ صبح ہے خود جذبِ شبنم ہوتی جاتی ہے

زمانے کا رسالت پر تری ایمان ہے ساقی
مگر الفت تری ایمان کی بھی جان ہے ساقی

ترے کردار پر دشمن بھی انگلی رکھ نہیں سکتا
ترا اخلاق تو قرآن ہی قرآن ہے ساقی

مشیت بھی تری مرضی کے تیور دیکھ لیتی ہے
بہ ایں اقرارِ عبدیت یہ تیری شان ہے ساقی

تری آوازِ حق کا آخری پیغام ہے ساقی
کہ تیری ذات پر ہی دین کا اتمام ہے ساقی

شبِ معراج تُو اُس بارگاہِ خاص میں پہنچا
جہاں پر ختم دَورِ گردشِ ایام ہے ساقی

ے دورِ رسالت کا تعین ہو نہیں سکتا
ازل آغاز ہے ساقی، ابد انجام ہے ساقی

ان و لامکاں میں کس قدر ہے فصل کیا کہیے
مگر تجھ کو بقدرِ وسعتِ یک گام ہے ساقی

یم لی مع اللہ کے کوئی اسرار کیا جانے
جہاں تو ہے وہاں اک عالمِ بے نام ہے ساقی

سلمانوں کی وہ اقبال مندی کیا ہوئی آخر
وہی قرآن ہے ساقی وہی اسلام ہے ساقی

مانہ آ گیا تہذیبِ افرنگی کے پھندوں میں
کہ ہم رنگِ زمیں پھیلا ہوا اک دام ہے ساقی

دا والوں کی دنیا میں اندھیرا ہوتا جاتا ہے
جہاں کل صبح تاباں تھی وہاں اب شام ہے ساقی

گر اس پر بھی باطل حق پہ غالب آ نہیں سکتا
خدا کے دشمنوں کا یہ خیالِ خام ہے ساقی

ارک اہلِ دنیا کو زر و دولت کی ارزانی
مگر ماہر کو بس کافی ترا اک نام ہے ساقی

ہار اور حرم کی بہار کیا کہنا
زولِ رحمتِ پروردگار کیا کہنا

قدم قدم پہ ہدایت، روش روش پہ نجات
نفس نفس کرم بے شمار کیا کہنا

کثافتیں ہیں کہ سب دور ہوتی جاتی ہیں
رہِ حجاز کی گرد و غبار کیا کہنا

جگہ جگہ پہ کھجوروں کی دل نواز قطار
شعاعِ مہر سرِ شاخسار کیا کہنا

بس اس خیال سے پائے طلب نہ سہم جائیں
کبھی کبھی خلشِ نوکِ خار کیا کہنا

ہزار بار بھی دیکھیں تو جی نہیں بھرتا
مزارِ پاک کے نقش و نگار کیا کہنا

ادھر سے بھی ہے نوازش کا سلسلہ ماہر
مآلِ جذبۂ بے اختیار کیا کہنا

معراج کی رات

جس کا مشتاق ہے خود عرشِ بریں آج کی رات
امِ ہانی کے وہ گھر میں ہیں مکیں آج کی رات

آنکھ میں عرضِ تمنا کی جھلک، لب پہ درود
آئے اس شان سے جبریلِ امیں آج کی رات

سارے نبیوں کے ہیں جھرمٹ میں نبیٔ آخر
قابلِ دید ہے اقصیٰ کی زمیں آج کی رات

نور کی گرد اڑاتا ہوا پہنچا جو براق
رہ گزر بن گئی تاروں کی جبیں آج کی رات

اک مقام آیا کہ جبریل کا بھی ساتھ چھٹا
وہ ہیں اور سلسلۂ نورِ مبیں آج کی رات

عالمِ قدس کے اسرار کوئی کیا جانے
وہ ہی وہ ہیں نہ زماں ہے نہ زمیں آج کی رات

قابِ قوسین تو ہے قرب کی پہلی منزل
بندۂ اللہ سے اتنا ہے قریں آج کی رات

ایک ہی سطح پہ ہے مرتبۂ غیب و شہود
اٹھ گئے سارے حجاباتِ حسیں آج کی رات

یہ فضا اور یہ معراج، مگر اس پر بھی
اپنی امت کو نہ بھولے شہِ دیں آج کی رات

مسکرائے جو نبیؐ دیکھ کے جنت کی طرف
اور بھی ہو گئی فردوس حسیں آج کی رات

ہوش و ادراک کی تکمیل ہوئی جاتی ہے
اپنی معراج پہ ہیں علم و یقیں آج کی رات

در کی زنجیر بھی جنبش میں ہے بستر بھی ہے گرم
رک گئی گردشِ افلاک و زمیں آج کی رات

او کبھی ہم کو فراموش نہ کرنے والے
روحِ ماہر بھی ہے موجود یہیں آج کی رات

(پرفیسر پنڈت) آنند موہن زتشی گلزار دہلوی :-

پر توِ حسنِ ذات آپ تھے　　پیکرِ التفات آپ تھے
کذب اور کفر کے مٹانے کو　　سرورِ کائنات آئے تھے

روش صدیقی :-

صاحبِ تاجِ ختمِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلم
صدر نشین بزمِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم
خُلقِ حسن پہ کیا کیا نازاں، جود و عطا و شفقت و احساں
آیتِ رحمٰن معنیِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
اُس کی گلی کا ذرہ ذرہ مہرِ درخشاں بن کر چمکا
فرشِ قدم افلاک کی عظمت صلی اللہ علیہ وسلم
چشمِ عطا دلجوئے یتامیٰ دستِ کرم بازوئے مساکیں
سر سے قدم تک آیۂ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
زاہد و عاصی، عارف و عامی سب ہیں درِ اقدس کے سلامی
سب پہ گل افشاں دامنِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
سلطاں اور ہمدوشِ گدایاں مولیٰ اور شیدائے غریباں
خضرِ امم اور جادۂ خدمت صلی اللہ علیہ وسلم
نقشِ کدورت اس نے مٹایا غیروں کو سینے سے لگایا
سب کو دیا پیغامِ محبت صلی اللہ علیہ وسلم
درسِ مروت فرماں اس کا نوعِ بشر پر احساں اس کا
امن و محبت اس کی شریعت صلی اللہ علیہ وسلم
بغض و حسد کا نام ہوا گم، چمکا رایتِ عفو و ترحم!
جاگ اٹھی انساں کی شرافت صلی اللہ علیہ وسلم
ختم ہوا دورِ صیادی، پائی غلاموں نے آزادی
گھر گھر پہنچا مژدۂ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم
نورِ جبینِ انساں کا چمکا، فرق مٹا محتاج و غنی کا
ایک ہوئے سرمایہ و محنت صلی اللہ علیہ وسلم

دین میں فیضان ہے اس کا، ذوقِ یقیں احسان ہے اس کا
اُس کے در کی خاک میں حکمت صلی اللہ علیہ وسلم
قربِ الٰہی سنت اُس کی حُسنِ عمل ہے اطاعت اُس کی
حاصلِ ایماں اس کی محبت صلی اللہ علیہ وسلم

ناشاد فاروقی :-

وجہ نمودِ عالمِ امکاں تمہیں تو ہو
بزمِ سما کی شمعِ فروزاں تمہیں تو ہو
بکھرا پڑا تھا دفترِ گیتی کا ہر ورق
شیرازہ بندِ دہرِ پریشاں تمہیں تو ہو
جس کے بغیر لوحِ رسالت تھی ناتمام
وہ نقشِ دلپذیر وہ عنواں تمہیں تو ہو

رخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ ہماری چشمِ خیال میں، نہ دکانِ آئینہ ساز میں
(لطف بدایونی)

محمد معشوق علی ظریف (کسیر کلاں)

خزانہ نقد ہے سینہ میں جس کے نعتِ احمد کا
ظریفِ مدح خواں ہے وہ تونگر ہو تو ایسا ہو

قیصرِ روم اور ابوسفیان کا مکالمہ

قیصر روم کے دربار میں جب قاصدِ نبویؐ پہنچا تو ابوسفیان (جو اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن تھے) کو بلوا کر قیصر نے حضورؐ کے متعلق جو سوالات کئے۔ وہ حسب ذیل ہیں:۔

قیصر:۔ مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟
ابوسفیان:۔ شریف ہے۔

قیصر:۔ اس خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟
ابوسفیان:۔ نہیں۔

قیصر:۔ اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟
ابوسفیان:۔ نہیں۔

قیصر:۔ جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟
ابوسفیان:۔ کمزور لوگ ہیں۔

قیصر:۔ اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جاتے ہیں؟
ابوسفیان:۔ بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر:۔ کبھی تم لوگوں کو اس کی نسبت جھوٹ کا تجربہ بھی ہے؟
ابوسفیان:۔ نہیں۔

قیصر:۔ وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟
ابوسفیان:۔ ابھی تک تو نہیں لیکن اب جو معاہدہ ہوا ہے دیکھیں اس پر قائم رہتا ہے یا نہیں؟

قیصر:۔ تم لوگوں نے اس سے جنگ کی ہے؟
ابوسفیان:۔ ہاں۔

قیصر:۔ نتیجۂ جنگ کیا رہا؟
ابوسفیان:۔ کبھی ہم غالب رہے۔ کبھی وہ۔

قیصر:۔ وہ کیا سکھاتا ہے؟
ابوسفیان:۔ کہتا ہے ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی اور کو خدا کا شریک بناؤ۔ نماز پڑھو۔ پاکدامنی اختیار کرو۔ سچ بولو۔ صلۂ رحم کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا۔ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا۔ پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان میں کسی اور نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے؟ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے پیغمبروں کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذہب کا یہی حال ہے کہ بڑھتا جاتا ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں دیا۔ پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز و تقویٰ اور عفاف کی ہدایت کرتا ہے اور اگر یہ سچ ہے تو وہ یقیناً پیغمبر ہے۔"

(مولانا سید سلیمان ندوی۔ سیرت النبی جلد سوم)

قرآن کی جامعیت

توراۃ قانون و شریعت ہے لیکن اخلاق اور موعظت نہیں۔ انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں۔ زبور مناجات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفہ میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں۔ صحف بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائق حکمت اور اسرار ایمان و عمل سے خالی ہیں۔ دنیا میں ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق و موعظت بھی۔ مناجات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفات کی حامل بھی۔ خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی۔ اظہار غیب اور پیشگوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی۔ اور ان سب کے ساتھ عین اُس وقت جب اور کتب الٰہیہ تحریف و تغیر اور تراجم و تعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں، اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک حرف، ایک لفظ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی وہ اپنی زندگی جاوید کیلئے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں۔ کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانے کے صندوق ہیں اور وہ اسی زبان اور انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے۔ جس میں دست قدرت نے اس کو ڈھالا تھا۔ اور جبرئیل امین نے اس کو اُتارا تھا۔ اور محمد عربی نے اس کو اُمت کے ہاتھوں میں سونپا تھا۔ کیا یہ اعجاز نہیں؟

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ اور کلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں بن سکتیں۔ کیونکہ یہ دوسری کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنی کے لحاظ سے وحی ہیں۔ چنانچہ نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام و عبارت کے لحاظ سے معجزہ کہا ہے۔ چنانچہ اسی لئے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحی موسوی (توراۃ) اور عیسوی (انجیل) نے ظہور کیا مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہو گئی۔ توراۃ کی اصل عبرانی زبان جو حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلی تھی وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہو گئی۔ اور اس نے آرامی اور سریانی زبان کا قالب اختیار کر لیا۔ اور آخر صد ہا سال کے بعد حضرت عزیر نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا۔ انجیل کے متعلق ابھی تک یہی طے نہیں ہوا کہ اس کی اصل زبان کیا تھی؟ اور انجیل پہلے کس زبان میں لکھی گئی تھی؟ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں جو حضرت عیسیٰ فلسطین کے ملک میں بولتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور اس کے الفاظ کے من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ برخلاف اس کے دنیا میں "وحی محمدی" سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے۔ جس نے اس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا اور وہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے پاک ہے۔ اس لئے اس کے الفاظ۔ کلمات اور عبارات تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی!

(سیرت النبی جلد سوم - مولانا سید سلیمان ندوی)

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان کام کا اندازہ کرنے کے لئے دیکھو کہ اسلام کا بیج کیسے پاک قلوب میں بویا گیا تھا۔ جو نیک پھل لائے تھے۔ نجاشی ملک حبشہ۔ جیفر ملک عمان۔ اکیدر شاہ دومۃ الجندل۔ نجد کے وحشی۔ تہامہ کے بدو اور یمن کے مسکین دوش بدوش کھڑے ہونے پر نازاں ہو رہے ہیں۔

عبداللہ بن سلام۔ یہودیت، اور ورقہ بن نوفل۔ عیسائیت، اور عثمان بن طلحہ۔ ابراہیمیت کی مسندہائے امامت چھوڑ کر اسلام کے خادم شمار کئے جانے پر مفتخر ہیں۔

یہودیوں کا زر خرید غلام سلمان فارسی "منا اھل البیت" کے درجہ پر فائز ہو جاتا ہے اور بت پرستوں کے زر خرید غلام بلال حبشی کو فاروق اعظمؓ بھی جن کی سطوت و ہیبت سے قیصر و کسریٰ کے اندام پر لرزہ تھا سید، سید (آقا، آقا) کہہ کر پکار رہے ہیں۔

دشمن دوست بن گئے اور جاں ستاں جاں نثار ثابت ہوئے۔ وہ عمرو بن عاص جو حبشہ میں نجاشی کے پاس قریش کا سفیر بن کر گیا تھا کہ مسلمانوں کو بطور تحویلی مجرموں کے حاصل کرے۔ چند سال کے بعد وہی عمان کے بادشاہ کے پاس داعی اسلام بن کر جاتا ہے اور ہزاروں اشخاص کے مسلمان ہو جانے کی بشارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لاتا ہے۔

وہی خالد بن ولید جو جنگ احد میں بت پرستوں کے رسالہ کی کمانڈ کرتا ہوا مسلمانوں کو تباہ کرنا اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد سمجھتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد حاضر ہوتا ہے، لات و عزیٰ کے مندروں کو اپنے ہاتھوں سے گراتا اور اسلامی فتوحات میں کمانڈر جنرل کا درجہ پاتا ہے۔ وہی عروہ بن مسعود جو حدیبیہ میں آنحضرتؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روکنے کے لئے قریش کا سفیر بن کر آیا تھا۔ خود بخود مدینہ میں حاضر ہوتا ہے۔ اور اپنی قوم میں دعوت اسلام کی اجازت حاصل کرکے اسی خدمت میں اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔

وہی سہیل بن عمرو معاہدۂ حدیبیہ میں بت پرستوں کی جانب سے کمشنر مداہدہ تھا اور جس نے عہد نامہ میں اسم پاک محمدؐ کے ساتھ لفظ رسول اللہ کے لکھے جانے پر انکار کیا تھا۔ وفاتِ نبویؐ کے بعد بیت اللہ میں کھڑے ہو کر اسلام کی صداقت اور دین الٰہی کی تائید میں ایسی زبردست تقریر کرتا ہے جو سینکڑوں دلوں میں سکینت اور ایمان بھر دیتی ہے۔ وہی عمرؓ جو تلوار لے کر گھر سے آنحضرتؐ کا سر قلم کرنے کے لئے نکلا تھا۔ وفاتِ نبوی کے دن شمشیر برہنہ لے کر کہہ رہا ہے کہ جو کوئی کہیگا۔ آنحضرتؐ نے وفات پائی اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ وہی ابوسفیان بن حارث بن عبد المطلب جو حقیقی چچا کا بیٹا ہو کر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں متواتر اشعار کہا کرتا تھا۔ جذبۂ توفیق سے خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اور جنگ حنین کے میدان میں وہی اکیلا رکاب نبویؐ تھامے نظر آتا ہے۔

وہی ابوسفیان بن حرب جو سات برس تک برابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں فوجیں لاتا رہا۔ اور مسلمانوں کے خلاف سارے ملک میں آتش فساد بھڑکاتا رہا۔ اسلام لاتا اور نجران کے عیسائی علاقے پر اسلام کا حاکم

بنا کر بھیجا جاتا ہے۔ وہ طفیل دوسی جو مکہ میں روئی کی ڈاٹ کانوں میں لگا کر پھرتا تھا کہ محمدؐ کی آواز کان میں نہ پہنچے۔ بالآخر اپنے وطن میں گھر گھر پھرتا اور محمدؐ کی آواز پہنچاتا تھا۔ وہ عبد یالیل ثقفی جس نے طائف میں غلاموں اور بچوں کو پتھراؤ کرنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے لگا دیا تھا۔ آخر مدینہ حاضر ہوا اور وہاں سے اپنی قوم کے پاس جوہر ایمان و یقین لایا۔ وہی بریدہ بن الحصیب اسلمی جو قریش کے سو اشتر سرخ کے انعام کا وعدہ لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گرفتاری کے لئے ستر سواروں کا دستہ لے کر گیا تھا۔ چند گھنٹہ بعد نبیؐ عربی کا علمبردار بن گیا۔

آپؐ مسیح علیہ السلام کی طرح جھٹلائے اور ستائے گئے۔ پھر بھی صابر و شاکر ہی پائے گئے۔ آپؐ نے یحییٰ علیہ السلام کی طرح صبر و شکیبائی کے ساتھ گھاٹی میں تین سال تک محصوری کے دن کاٹے اور پھر بھی آپ کا دل خدا کی ثنا گزاری سے لبریز اور زبان ستائش گوئی سے زمزمہ سنج رہی۔

آپؐ نے نوح علیہ السلام کی طرح قوم کے برگشتہ بخت لوگوں کو خفیہ، علانیہ، خلوت اور جلوت میں میلوں اور جلسوں، گزرگاہوں اور راہوں پر، پہاڑوں اور میدانوں میں اسلام کی تبلیغ فرمائی اور لوگوں کو اُن کے افعالِ بد سے نفرت دلائی۔

آپؐ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح نافرمان قوم سے علیحدگی اختیار کی۔ مادرِ وطن کو چھوڑ کر شجرۂ طیبہ اسلام کے لگانے کے لئے پاک زمین کی تلاش میں رہ نورد اور شبِ ہجرت میں داؤدؑ کی طرح دشمنوں کے نرغہ سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔

اور یونس علیہ السلام کی طرح (جنہوں نے تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہ کر پھر نینوی میں اپنی منادی کو جاری کیا تھا) غارِ ثور کے شکم میں تین دن رہ کر پھر مدینہ طیبہ میں کلمۃ اللہ کو بلند فرمایا۔

آپؐ نے موسیٰ علیہ السلام کی طرح جنہوں نے بنی اسرائیل کو فرعونِ مصر کی غلامی سے آزاد کرایا تھا۔ شمالی عرب کو شاہ قسطنطنیہ کے بندِ ملوکیت سے اور مشرقی عرب کو کسرائے ایران کے حلقۂ غلامی سے اور جنوبی عرب کو شاہ حبش کے طوقِ بندگی سے نجات دلائی۔

آپؐ نے یوسف علیہ السلام کی طرح اپنے ایذا رسان و ستم پیشہ برادرانِ مکہ کے لئے نجد سے (بتوسط ثمامہ بن آثال) غلہ بہم پہنچایا۔ اور بالآخر فتح مکہ کے دن "لا تثریب علیکم الیوم" کا مژدہ سنا کر "انتم الطلقاء" کے ارشاد سے انہیں پابندِ منت و احسان بنایا۔!

وقتِ واحد میں آپؐ موسیٰ علیہ السلام کی طرح صاحبِ حکومت تھے اور ہارونؑ کی طرح صاحبِ امامت بھی۔

ذاتِ مبارک میں نوح علیہ السلام کی سی سرگرمی، ابراہیم جیسی نرم دلی۔ یوسف علیہ السلام کی درگزر۔ داؤد علیہ السلام کی سی فتوحات۔ ایوب علیہ السلام کا سا صبر۔ سلیمان علیہ السلام کی سی سطوت۔ عیسیٰ علیہ السلام کی سی خاکساری۔ یحییٰ علیہ السلام کا سا زہد۔ اسماعیل علیہ السلام کی سی سبک روحی کامل ظہور بخش تھی۔ ؎

اے کہ بر تختِ سیادت ز ازل جا داری
آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

(رحمۃ للعلمین۔ جلد اول۔ از قاضی محمد سلیمان منصورپوری)

رسولؐ سے مسلمانوں کا تعلق اطاعت کا ہے!

قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں۔ کہ "رسول اللہ کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے"۔ اس سے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسولؐ کا فرض صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے۔ یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے اور نہ اس کا اُس کو حق ہے۔ اُن کے نزدیک تبلیغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے۔ جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے مگر اس خط کے مفہوم و معنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا۔ اُس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے؟

شاید اُن کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ "رسول" سے بھی ہوا ہے۔ جس کے لفظی معنی پیغامبر اور قاصد کے ہیں لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اُس کو رسول کہا گیا ہے۔ "نبی" (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ "مُبَشِّر" (خوشخبری سُنانے والا) "نذیر" (ڈرانے والا) "سراجِ منیر" (روشن چراغ) صاحبِ حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم۔ صاحبِ مقامِ محمود۔ مجتبیٰ (مقبول) مصطفےٰ (برگزیدہ) مُبَیِّن (بیان اور شرح کرنے والا) مُعلّم (سکھانے والا) مُزکّی (پاک وصاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بُلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مُطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و القاب اُس کی اس حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے۔ جس کے اصل پیغام کے مفہوم و معنی کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق حاصل ہے اور اُس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے۔ مگر خود صاحب پیغام کو اپنی پیغامبری کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اُس کی تشریح کا اس کو حق تھا۔ "اِنَّ ھٰذَا الشَّیْءٌ عُجَاب"۔

جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں اُن سے رسولؐ کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے۔ لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر اُن کا تعلق رسولؐ سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسولؐ اُن کو تبلیغ ہی نہیں امر و نہی بھی کرتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی۔ لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر ضرور مجبور کیا جائے گا کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

(سیرت النبی جلد چہارم — مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم)

دنیا آخری نجات دہندے کو اللہ سے مانگ رہی تھی

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی، سخت اُمس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ روشنی کی پوری قدر شبِ تاریک میں ہوتی ہے۔ اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے۔ تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیئے کہ دُنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کیلئے پیغمبرانہ دست و بازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست و بازو کی جس کے متعلق خدا یہ فرما سکے:-

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیہم (فتح)

جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔

اسلام یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دُنیا کی ایک عظیم الشان روحانی و اخلاقی و معاشری دعوت تھی۔ اس بنا پر ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دُنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت دُنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا۔ تمام دُنیا میں سچے اور صحیح عقیدے کا کہیں وجود نہ تھا۔ توحید کی روشنی سے دُنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا۔ مصر و یونان و روم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی۔ اُن ہی کے معبد تھے۔ اور اُن ہی کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں۔ ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دُنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے۔ رواقی۔ عیسائی اور بودھ مت کے پیرو۔ اور یہ تینوں کے تینوں تجرد۔ رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضوِ معطل ہو گئے تھے کہ دُنیا کا دستِ ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مرادف سمجھ رکھا تھا کہ آج اُن کی تفصیلات سننے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ سو سال قبل تزکیۂ نفس کے کچھ درس دیئے تھے لیکن مدت ہوئی دُنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) نے اس سے بھی پیشتر ہدایت و نجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا۔ اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زرتشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دارالامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام و نشان صحراء اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم سے برسرپیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا۔ حرص و طمع اور کشت و خون کی گرم بازاری تھی۔ نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی۔ عدل و راستی اور پاکبازی و راستی کے عطرِ عنبر کی خوشبو۔ انسان کے جامۂ خاکی سے اُڑ چکی تھی۔ توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیبیوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش عالمگیر تاریکی میں چھپ گیا تھا۔ غرض دُنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی۔ بنی نوع کا نجات دہندہ، آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں جو عرصہ دراز سے پراگندہ و منتشر ہو رہا تھا۔ پھر نظم و انتظام پیدا کرے روحانیت و خدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو پُر بہار بلکہ سدا بہار اور دُنیا کے ظلمت کدے کو پھر مطلعِ انوار بنا دے۔

(سیرت النبی جلد چہارم۔ علامہ سید سلیمان ندوی)

جامعیت کبریٰ

ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفہ انسانی اور ہر حالت انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو۔ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔ اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو۔ اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو۔ اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو۔ اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔ اگر تم نے شکست کھائی ہو تو معرکۂ اُحد سے عبرت حاصل کرو۔ اگر تم اُستاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھو۔ اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ۔ اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو۔ اور تنہائی و بیکسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو۔ اگر اپنے کاروبار اور دُنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کا کاروبار اور نظم و نسق دیکھو۔ اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو۔ اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو۔ اگر تم جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو۔ اگر سفری کاروبار ہو تو بصرہ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو۔ اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نورِ آفتاب سے پہلے داخل ہونیوالے ثالث کو دیکھو۔ جو حجرِ اسود کو کعبہ کے ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے۔ مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو۔ جس کی نظرِ انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہؓ اور عائشہؓ کے مقدس شوہر کی حیاتِ پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے باپ حسنؓ و حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو۔ غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی کیلئے نمونہ۔ تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کیلئے سامان۔ تمہارے ظلمت خانہ کیلئے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانہ میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔ اس لئے طبقۂ انسانی کے ہر طالب اور نورِ ایمانی کے ہر متلاشی کیلئے صرف محمدؐ رسول اللہ کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔ جس کی نگاہ کے سامنے محمد رسول اللہ کی سیرت ہے۔ اس کے سامنے نوحؑ و ابراہیمؑ۔ ایوبؑ و یونسؑ اور موسیٰؑ و عیسیٰؑ علیہم السلام سب کی سیرتیں موجود ہیں۔ گویا تمام انبیاء کرام کی سیرتیں ایک ہی جنس کی اشیاء کی دکانیں ہیں اور محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، اخلاق و اعمال کی دُنیا کا سب سے بڑا بازار (مارکیٹ) ہے۔ جہاں ہر جنس کے خریدار اور ہر شے کے طلبگار کے لئے بہترین سامان موجود ہے۔

حضرت موسیٰؑ قانون لے کر آئے۔ حضرت داؤدؑ دعا اور مناجات لے کر اور حضرت عیسیٰؑ زہد و خلق لے کر آئے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون بھی لائے، دعا اور مناجات بھی اور زہد و اخلاق بھی۔ ان سب کا مجموعہ الفاظ و معانی میں قرآن اور عمل میں سیرت محمدی ہے۔

(خطبات مدراس۔ علامہ سید سلیمان ندوی)

اعجاز ہی اعجاز!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت تمام انبیاء علیہم السلام کے واقعاتِ زندگی کا خلاصہ۔ اُن کی تعلیمات کا عطر اور اُن کے حالات و مشاہدات کا برزخ ہے۔ آپ ایک عالمگیر اور ابدی مذہب لے کر مبعوث ہوئے۔ اس لئے آپؐ نے ایک ہی خطاب کے ساتھ اُن تمام لوگوں کو مخاطب فرمایا۔ جن کو طوفانِ نوح دفعتاً بہالے گیا تھا۔ جن کو دریائے قلزم کی نہریں نگل چکی تھیں۔ جن کو نفسِ عیسیٰؑ نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ اور ان سب سے بڑھ کر آپ کا مخاطب ایک گروہ اور بھی تھا۔ جو ان چیزوں کو صرف عجائب پرستی کی نگاہ سے نہیں بلکہ ژرف نگاہی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس بناء پر جس چشمۂ فیض نے اسباطِ موسیٰ کو سیراب کیا تھا۔ وہ ان تشنہ کامانِ روحانیت سے کیونکر بے پروا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا۔ جو علیٰ قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لئے ضروری تھے۔ آپؐ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے۔ آپؐ کی طبیعت معجزہ تھی۔ آپؐ پر جو کتاب نازل ہوئی۔ اُس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا۔ ان کے علاوہ آپؐ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا۔ اُس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لئے بستر لگایا۔ کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی۔ کبھی "مَا کَذَبَ الفُؤَاد" کے نور سے قلبِ مبارک کو منور کیا۔ اور کبھی "مَا زَاغَ البَصَرُ" کے سُرمہ سے آپؐ کی آنکھوں کو روشن کیا۔ کبھی نزولِ رحمتِ الٰہی کے لئے آسمان کے دروازے کھولے۔ کبھی وادیٔ حق کے پیاسوں کے لئے زمین کی تہ سے پانی کے چشمے اُبالے۔ کبھی سنگِ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے۔ کبھی انبیاء سابقین علیہم السلام کی زبانِ الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے۔ اور آئندہ دُنیا کے واقعاتِ غیب بتا کر رہروانِ عالم کو منزلِ حقیقت کے نشان دکھائے!

(سیرت النبی۔ جلد سوم۔ مولانا سید سلیمان ندوی)

محمد عاصم

شعر العرب

ابو طالب بن عبدالمطلب:-

(۱) وَدَعَوْتَنِي وَزَعَمْتَ اَنَّكَ نَاصِحِي
وَلَقَدْ صَدَقْتَ وَكُنْتَ ثَمَّ اَمِيْنًا

تم نے مجھے دعوت دی اور تمہارا خیال ہو کہ تم میری بھلائی کی بات کہہ رہے ہو۔ یقیناً تم صادق و امین ہو۔

(۲) وَعَرَضْتَ دِيْنًا لَا مَحَالَةَ اَنَّهُ
مِنْ خَيْرِ اَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِيْنًا

تم مجھ پر ایک ایسا دین پیش کر رہے ہو۔ جو بلا شبہ اہل زمین کے "بہترین دینوں میں سے" ہے۔

(۳) لَوْلَا الْمَلَامَةُ اَوْ حَذَارِ مَسَبَّةٍ
لَوَجَدْتَنِي سَمْحًا بِذَاكَ مُبِيْنًا

یقین کرو اگر مجھے ملامت کا خیال یا قوم کے عار دلانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو تم مجھے اس کا کھلم کھلا حامی و مددگار پاتے۔

مرثیہ حضرت ابو بکر صدیق:-

اَجِدَّكَ مَا لِعَيْنِكَ لَا تَنَامُ
كَاَنَّ جُفُوْنَهَا فِيْهَا كِلَامُ۔

اپنے آقا کی جدائی تم پر بہت شاق گزری ہو۔ تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا کہ سوتی نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی پلکوں میں زخم ہیں۔

مرثیہ حضرت عمر بن خطاب۔

مَا زِلْتُ مُذْ وَضَعُوْا فِرَاشَ مُحَمَّدٍ
كَيْمَا يُمَرَّضَ خَائِفًا اَتَوَجَّعُ

جب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر تیمارداری کے لئے رکھا گیا۔ اسی وقت سے میں خوف زدہ ہوں اور درد محسوس کر رہا ہوں!

مرثیہ حضرت عثمان:-

فَيَا عَيْنِيْ ابْكِيْ وَلَا تَسْاَمِيْ
وَحُقَّ الْبُكَاءُ عَلَى السَّيِّدِ

اے میری آنکھ اور خوب رو۔ رونے سے نہ تھک۔ اس لئے کہ آقا پر رونے کا وقت آن پہنچا ہے۔

مرثیہ حضرت علی:-

اَلَا طَرَقَ النَّاعِيْ بِلَيْلٍ فَرَاعَنِيْ
وَاَرَّقَنِيْ لَمَّا اسْتَقَلَّ مُنَادِيًا۔

اسے رات کو آنے والا مجھے جدائی کی خبر سنا کر لرزہ بر اندام نہ کرتا اور آواز دے کر ساری رات مجھے نہ جگاتا۔

مرثیہ حضرت فاطمہ:-

مَاذَا عَلٰى مَنْ شَمَّ تُرْبَةَ اَحْمَدٍ
اَنْ لَا يَشَمَّ مَدَى الدَّهْرِ غَوَالِيًا
صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا
صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ عُدْنَ لَيَالِيًا۔

جس شخص نے ایک مرتبہ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تربت کو سونگھ لیا اسے کیا ہو گیا کہ وہ مدت عمر تک اور خوشبوئیں نہیں سونگھتا۔
مجھ پر ایسی ایسی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے کہ اگر وہ دنوں پر ٹوٹ پڑتے تو دن راتوں میں تبدیل ہو جاتے!

مرثیہ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی)

أَلَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ كُنْتَ رَجَاءَنَا
وَكُنْتَ بِنَا بَرًّا وَلَمْ تَكُ جَافِيًا
وَكُنْتَ بِنَا رَؤُوفًا رَحِيمًا نَبِيَّنَا
لِيَبْكِ عَلَيْكَ الْيَوْمَ مَنْ كَانَ بَاكِيًا
صَبَرْتَ وَبَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ صَادِقًا
وَقَدْ مُتَّ صُلْبَ الدِّيْنِ أَبْلَجَ صَافِيًا
فَلَوْ أَنَّ رَبَّ الْعَرْشِ أَبْقَاكَ بَيْنَنَا
سَعِدْنَا وَلٰكِنْ أَمْرُهُ كَانَ مَاضِيًا
عَلَيْكَ مِنَ اللّٰهِ السَّلَامُ تَحِيَّةً
وَأُدْخِلْتَ جَنَّاتٍ مِنَ الْعَدْنِ رَاضِيًا

اے اللہ کے رسول! آپ ہماری امیدوں کے آماجگاہ تھے۔ آپ ہم پر حد درجہ مہربان و شفیق تھے۔ سخت دل اور سخت گیر نہ تھے۔ آپ ہم پر رؤوف و رحیم اور ہمارے نبی تھے۔ جسے رونا ہے اسے چاہیئے کہ آج دل بھر کر روئے۔ آپ نے حد درجہ صبر و شکیب سے دنیا تک اُن کے پروردگار کا پیغام پہنچایا۔ یہاں تک کہ جبکہ آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں تو اللہ کا دین اپنی مکمل اور واضح شکل میں دنیا کے سامنے ہے۔ اگر عرش کا مالک آپکو ہمارے درمیان اور زیادہ باقی رکھتا تو یہ ہماری مزید سعادتمندی ہوتی۔ لیکن اس کا فیصلہ اٹل ہے۔ آپ پر اللہ تعالیٰ کا سلام اور درود ہو اور آپ خوش و خرم جنات عدن میں داخل ہوں۔

حضرت حسانؓ بن ثابت :-

أَطَالَتْ وُقُوفًا تَذْرِفُ الْعَيْنُ جُهْدَهَا
عَلَى طَلَلِ الْقَبْرِ الَّذِي فِيهِ أَحْمَدُ
فَبُورِكْتَ يَا قَبْرَ الرَّسُولِ وَبُورِكَتْ
بِلَادٌ ثَوَى فِيهَا الرَّشِيدُ الْمُسَدَّدُ
وَهَلْ عَدَلَتْ يَوْمًا رَزِيَّةُ هَالِكٍ
رَزِيَّةَ يَوْمٍ مَاتَ فِيهِ مُحَمَّدُ
عَزِيزٌ عَلَيْهِ أَنْ يَحِيدُوا عَنِ الْهُدٰى
حَرِيصٌ عَلَى أَنْ يَسْتَقِيمُوا وَيَهْتَدُوا
عَطُوفٌ عَلَيْهِمْ لَا يُثَنِّي جَنَاحَهُ
إِلَى كَنَفٍ يَحْنُو عَلَيْهِمْ وَيُمْهِدُ
فَبَكِّي رَسُولَ اللّٰهِ يَا عَيْنُ عَبْرَةً
وَلَا أَعْرِفَنْكِ الدَّهْرَ دَمْعُكِ يَجْمُدُ
وَمَا لَكِ لَا تَبْكِينَ ذَا النِّعْمَةِ الَّتِي
عَلَى النَّاسِ مِنْهَا سَابِغٌ يَتَغَمَّدُ
فَجُودِي عَلَيْهِ بِالدُّمُوعِ وَأَعْوِلِي
لِفَقْدِ الَّذِي لَا مِثْلُهُ الدَّهْرَ يُوجَدُ
وَمَا فَقَدَ الْمَاضُونَ مِثْلَ مُحَمَّدٍ
وَلَا مِثْلُهُ حَتَّى الْقِيَامَةِ يُفْقَدُ

آنکھ اس قبر کے ٹیلے پر کھڑی ہو کر دیر تک آنسو بہاتی ہے۔ جس میں احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آرام فرما ہیں۔ اے اللہ کے رسول کی قبر! تجھ پر اللہ کی برکت و رحمت نازل ہو۔ اور اس سرزمین پر بھی اللہ کی برکت و رحمت ہو جس میں راہ یاب و راست رو ہستی آرام فرما رہی ہے۔ کیا کسی دن کی مصیبت اس دن کے برابر ہو سکتی ہے۔ جس میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جدائی کا داغ ہمارے دلوں کو لگا؟ آپ پر یہ چیز حد درجہ شاق تھی کہ آپ کی اُمت ہدایت کی راہ سے ہٹ جائے آپ اس چیز کے حد درجہ حریص تھے کہ یہ قوم استقامت اور ہدایت کی راہ پر گامزن رہے۔ آپ اپنی اُمت پر شفیق و مہربان تھے اس سے کبھی پہلو تہی نہ کرتے تھے اس پر پیار و محبت سے جھکتے تھے اور ان کی لغزشوں کو معاف کرتے اور عذروں کو قبول فرماتے تھے۔ اے آنکھ اللہ کے رسول پر آنسو بہا اور بہاتی رہ میں تیرے آنسوؤں کو زمانہ بھر میں کبھی خشک نہ پاؤں۔ ارے تجھے کیا ہو گیا تو اس نعمت والے پر نہیں روتی جس نے تمام لوگوں کو ہر طرف سے ڈھانپ لیا تھا اور ڈھانپے ہوئے ہے۔ آنسوؤں پر آنسو بہا اور خوب چیخ کر۔ کیونکہ آج تو اس ہستی سے محروم ہو گئی ہے کہ اُس جیسا زمانہ بھر میں بھی کبھی نہیں پایا جا سکتا۔ نہ پہلے لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسی کسی ہستی سے محروم ہوئے اور نہ قیامت تک لوگ آپ جیسی کسی ہستی سے محروم ہوں گے۔

لَہٗ ہِمَمٌ لَا مُنْتَھٰی لِکِبَارِھَا
وَھِمَّتُہُ الصُّغْرٰی اَجَلُّ مِنَ الدَّھْرِ
لَہٗ رَاحَۃٌ لَوْ اَنَّ مِعْشَارَ جُوْدِھَا
عَلَی الْبَرِّ کَانَ الْبَرُّ اَنْدٰی مِنَ الْبَحْرِ
وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنِیْ
وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیْبٍ
کَاَنَّکَ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

آپ کے اتنے عزائم ہیں کہ ان میں سے بڑے اور بلند عزائم کا شمار نہیں ہو سکتا
اور آپ کی معمولی ہمت و عزیمت بھی زمانہ بھر سے بلند و ارفع ہے۔
آپ کے دستِ سخا کی وہ شان ہے کہ اگر خشکی پر اس کے دسویں حصے کی بخشش
ہو جائے تو وہ سخاوت و فیضان میں سمندر سے بڑھ جائے۔
آپ سے بڑھ کر حسین و جمیل میری آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا اور
آپ سے بڑھ کر خوبصورت بچہ کسی ماں نے نہیں جنا۔
آپ ہر عیب و برائی سے مبرا پیدا ہوئے ہیں۔ گویا آپ کی پیدائش
آپ کے حسب منشاء ہوئی ہے!

حضرت عبداللہ بن رواحہ:-

رُوْحِی الْفِدَاءُ لِمَنْ اَخْلَاقُہٗ شَھِدَتْ
بِاَنَّہٗ خَیْرُ مَوْلُوْدٍ مِّنَ الْبَشَرِ
عَمَّتْ فَضَائِلُہٗ کُلَّ الْعِبَادِ کَمَا
عَمَّ الْبَرِیَّۃَ ضَوْءُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ
لَوْ لَمْ یَکُنْ فِیْہِ اٰیَاتٌ مُّبَیِّنَۃٌ
کَانَتْ بَدِیْھَتُہٗ تُغْنِیْ عَنِ الْخَبَرِ

میری روح اس ہستی پر فدا ہے جس کے اخلاق و اطوار اس بات پر
شاہد ہیں کہ وہ بنی نوع انسان میں سب سے بہتر ہے۔
اس کے فضائل و کمالات تمام بندوں میں یوں پھیل گئے ہیں جس
طرح سورج اور چاند کی روشنی صفحۂ زمین پر پھیل جاتی ہے!-
اگر اس کی صداقت کو ظاہر کرنے والی کھلی کھلی نشانیاں اور معجزات نہ
بھی ہوتے تو خود اس کی ذات ہر قسم کی خبر اور نشانی سے بے نیاز کرنے والی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبعریؓ:-

آمَنَ اللَّحْمُ وَالْعِظَامُ بِمَا قُلْ
تَ فَنَفْسِی الشَّھِیْدُ اَنْتَ النَّذِیْرُ
اِنَّ مَا جِئْتَنَا بِہٖ حَقُّ صِدْقٍ
سَاطِعٌ نُوْرُہٗ مُضِیْءٌ مُّنِیْرُ
جِئْتَنَا بِالْیَقِیْنِ وَالْبِرِّ وَالصِّدْ
قِ وَفِی الصِّدْقِ وَالْیَقِیْنِ سُرُوْرُ
اَذْھَبَ اللہُ ضِلَّۃَ الْجَھْلِ عَنَّا
وَاَتَانَا الرَّخَاءُ وَالْمَیْسُوْرُ۔

میرا گوشت پوست اور ہڈیاں آپ کے لائے ہوئے پیغام پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور
میری جان اس چیز پر گواہ ہے کہ آپ اللہ کی طرف سے ڈرانے والے بنا کر بھیجے
گئے ہیں۔ آپ ہمارے پاس جو پیغام لے کر تشریف لائے ہیں وہ سراسر
حق و صداقت ہے۔ اس کا نور روشن اور چمکنے والا ہے!
آپ ہمارے پاس یقین، نیکی، صداقت اور بھلائی کا پیغام لے کر
آئے ہیں اور یقین و صداقت ہی میں اصل خوشی اور مسرت ہے!
آپ کی بدولت اللہ تعالیٰ ہم سے ہر قسم کی جہالت لے گیا اور اس
نے ہمیں خوشحالی اور فارغ البالی کی نعمت سے سرفرازا۔

محمد بن سعید ابوصیری (ف ۶۹۶ھ)

سَلَامٌ عَلَیْکَ تَتْرٰی مِنَ اللہِ وَتَبْقٰی بِہٖ لَکَ الْبَأْوَاءُ
وَسَلَامٌ عَلَیْکَ مِنْکَ فَمَا غَیْرُکَ مِنْہُ لَکَ السَّلَامُ کِفَاءُ
وَسَلَامٌ مِنْ کُلِّ مَا خَلَقَ اللہُ لِتُحْیَا بِذِکْرِکَ الْاَمْلَاءُ
وَصَلَاۃٌ کَالْمِسْکِ تَحْمِلُہٗ مِنِّیْ شَمَالٌ اِلَیْکَ اَوْ نَکْبَاءُ

اے اللہ کے پیارے رسول! آپ پر اللہ کا سلام و درود پے درپے آتا ہے۔
اور اس کی بدولت آپ کا فخر ہمیشہ قائم رہے آپ پر خود اپنی طرف سے سلام
ہو اس لئے کہ کسی دوسرے کا سلام آپ کیلئے کافی نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی ہر مخلوق
کی طرف سے آپ پر سلام ہو تاکہ آپ کے ذکر سے مجلسیں اور محفلیں زندہ

وَسَلَامٌ عَلَى ضَرِيحِكَ تَخْصُصُ بِهِ مِنْهُ تُرْبَةٌ وَعُسَاءُ
برقرار رہیں۔ آپ پر مشک کی مانند درود ہو۔ جیسے میری طرف سے

وَسَلَامٌ تَقَدَّمَتْ بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَايَ إِذْ لَمْ يَكُنْ لَدَيَّ ثَرَاءُ
بادِ شمال آپ تک پہنچائے۔ آپ کے روضۂ مبارک پر سلام ہو

مَا أَقَامَ الصَّلَاةَ مَنْ عَبَدَ اللّٰهَ وَقَامَتْ بِرَبِّهَا الْأَشْيَاءُ
جس سے اُس کی نرم مٹی نم آلود ہو جائے۔ اور آپ پر سلام ہو
جس کو میں اپنی سرگوشی سے پہلے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں
اس لئے کہ میرے پاس اس کے سوا کوئی مالی دولت نہیں۔
اُس وقت تک جب تک اللہ کی عبادت کرنے والے بندے نماز پڑھتے رہیں اور اپنے رب کے حکم سے چیزیں قائم رہیں۔

الشہاب محمود حلبی (ف ۷۲۵ھ)

ذُو الْمُعْجِزَاتِ الْبَاهِرَاتِ تَرَفَّعَتْ
آپ کی ہستی واضح اور روشن معجزات کی حامل ہے جو اس چیز سے کہیں

عَنْ أَنْ يُمَيِّزَ وَصْفَهَا الْإِحْصَاءُ
بالا و برتر ہیں کہ ان کی خوبیاں اور کمالات شمار ہو سکیں!

مِنْهُنَّ تَسْبِيحُ الْحَصَا فِي كَفِّهِ
آپ کا معجزہ یہ ہے کہ کنکریوں نے آپ کے دستِ مبارک میں تسبیح

وَكَذَا الطَّعَامُ وَفَاضَ مِنْهُ الْمَاءُ
اسی طرح کھانے میں برکت ہوئی اور اس سے پانی بہا۔

وَسَلَامُ أَحْجَارٍ رَأَى بِطَرِيقِهِ
آپ کے راستہ میں پتھروں نے آپ کی خدمت میں سلام عرض کیا

سَمِعَتْهُ وَهِيَ الصَّلْدَةُ الصَّمَّاءُ
جامد اور بہرے ہونے کے باوجود انہوں نے آپ کے پیغام کو سنا

وَإِجَابَةُ الْأَشْجَارِ حِينَ دَعَا بِهَا
آپ نے جب درختوں کو اپنی جانب بلایا تو لبیک کہتے ہوئے دو

تَسْعَى إِلَيْهِ كَأَنَّهُنَّ إِمَاءُ
آپ کے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئے گویا کہ وہ غلام اور لونڈیاں تھیں

وَرُجُوعُهَا بِالْأَمْرِ نَحْوَ مَكَانِهَا
پھر جب آپ نے انھیں حکم دیا تو وہ اپنی جگہ پر واپس چلے گئے

سِيَّانِ مِنْهَا الْعَوْدُ وَالْإِبْدَاءُ
اُن کا آنا اور چلے جانا برابر تھا۔

وَكَذَاكَ عَيْنُ قَتَادَةٍ إِذْ رَدَّهَا
اسی طرح جب حضرت قتادہ کی آنکھ جاتی رہی اور کوئی دوا کام

مِنْ بَعْدِ مَا سَقَطَتْ وَأَعْيَا الدَّاءُ
آسکی تو آپ نے اس کو دوبارہ بینائی بخش دی۔

وَكَذَا عَلِيٌّ إِذْ دَعَاهُ بِخَيْبَرٍ
اسی طرح جب حضرت علیؓ کو آپ نے خیبر بلایا تو وہ اس حال میں آئے

فَأَتَى إِلَيْهِ وَعَيْنُهُ رَمْدَاءُ
کہ اُن کی آنکھیں دُکھ رہی تھیں۔

فَأَجَالَ فِيهَا رِيقَهُ فَغَدَا بِهَا
تو آپ نے اُن میں اپنے دہن مبارک کا لعاب پھیرا اور وہ اُسی

بُرْءٌ بِهِ فِي وَقْتِهَا وَشِفَاءُ
وقت شفایاب ہو گئیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ شارح صحیح بخاری (ف ۸۵۲ھ)

رَفِيقُ الرُّوحِ بِالْجِسْمِ ارْتَقَى فِي
روح کا ساتھی جسم کے ساتھ آسمان کے طبقات میں چڑھا

طِبَاقٍ حُفَّ فِيهَا بِالْهَنَاءِ
اور وہاں اُس پر رحمت کی بارش کی گئی۔

عَلَا وَدَنَا وَجَازَ إِلَى مَقَامٍ
چڑھا۔ قریب ہوا یہاں تک کہ ایک ایسے بلند و پاکیزہ مقام

كَرِيمٍ خُصَّ فِيهِ بِالِاصْطِفَاءِ
پر پہنچا جہاں اُسے اللہ نے اپنی برگزیدگی سے نوازا۔

وَكَلَّمَ رَبَّهُ جَهْرًا سِوَاهُ
اس کے سوا کسی نے اپنے رب کو کھلا نہیں دیکھا۔ اس میں

بِسِرٍّ فِيهِ جَلَّ عَنِ امْتِرَاءِ
وَاَخَذَ مِنْهُ الْعُيُوْنَ فَعَيْنُ مَاءٍ
جَرَتْ مِنْ كَفِّهِ لِلْاِرْتِوَاءِ
وَعَيْنُ الْمَالِ جَادَ بِهَا سَخَاءً
فَلَيْسَ يَخَافُ فَقْرًا مِنْ عَطَاءِ
نَبِيَّ اللّٰهِ يَا خَيْرَ الْبَرَايَا
بِجَاهِكَ اَتَّقِيْ فَصْلَ الْقَضَاءِ
وَاَرْجُوْ يَا كَرِيْمُ الْعَفْوَ عَمَّا
جَنَتْهُ يَدَايَ يَا رَبَّ الْحِبَاءِ
فَقُلْ يَا اَحْمَدُ بْنَ عَلِيٍّ اذْهَبْ
اِلٰى دَارِ النَّعِيْمِ بِلَا شَقَاءِ
فَاِنْ اَحْزَنْ فَمَدْحُكَ لِيْ سُرُوْرِيْ
وَاِنْ اَقْنَطْ فَمَدْحُكَ لِيْ رَجَائِيْ
عَلَيْكَ سَلَامُ رَبِّ النَّاسِ يَتْلُوْ
صَلَاةً فِي الصَّبَاحِ وَفِي الْمَسَاءِ

کوئی ایسا بھید ہے جو شک و شبہ سے برتر ہے۔
آپ کی خدمت میں چشمے پیش کئے گئے پانی کا ایک چشمہ آپ کے دستِ مبارک سے بھی لوگوں کو سیراب کرنے کیلئے جاری ہوا۔
اور ایک مال و دولت کا چشمہ آپ کو دیا گیا جسے آپ کے دستِ سخا نے لوگوں پر نچھاور کر دیا گویا جود و عطا کرتے ہوئے آپ کو اپنے فقر کا کوئی اندیشہ نہ ہوتا تھا۔
اے اللہ کے نبی! اے بہترین مخلوق! آپ کی جاہ و منزلت کے ذریعہ سے میں قضا و قدر کے فیصلوں سے پناہ لیتا ہوں۔
اے بخشنے اور سخاوت کرنے والے رب! میں تجھ سے اپنے ہاتھوں کے کمائے ہوئے گناہوں پر معافی طلب کرتا ہوں۔
آپ فرما دیجئے کہ اے احمد بن علیؒ! جاؤ اور کسی گناہ کو اپنے ساتھ لئے بغیر دار النعیم میں داخل ہو جاؤ۔
اگر کبھی مجھے غم پہنچے، تو آپ کی تعریف میرے لئے مسرت و شادمانی ہے اور اگر میں مایوس ہوں تو آپ کی مدح و ثنا میرے لئے امیدوں کی آماجگاہ ہو۔
آپ پر لوگوں کے پروردگار کا سلام ہو۔
صبح و شام ہر نماز کے بعد۔

قاضی ابوبکر بن شیرین (ف ۱۲۸۰ھ)

اَلَا يَا مُحِبَّ الْمُصْطَفٰى زِدْ صَبَابَةً
وَضَمِّخْ لِسَانَ الذِّكْرِ مِنْهُ بِطِيْبِهِ
وَلَا تَعْبَأَنْ بِالْمُبْطِلِيْنَ فَاِنَّمَا
عَلَامَةُ حُبِّ اللّٰهِ حُبُّ حَبِيْبِهِ

اے مصطفٰےؐ سے محبت کرنے والے! اپنی فریفتگی اور شیفتگی میں اور آگے بڑھ اور اپنے ذکر و ثنا کی زبان کو حضورؐ کے ذکر و ثنا سے تر کرلے۔
فضول اور بیکار لوگوں کی پروا نہ کرو۔ اس لئے کہ اللہ سے محبت کی علامت اُس کے پیارے سے محبت کرنا ہے!

شیخ حسین دجانی مفتی یافا (ف ۱۲۷۸ھ)

اِذَا هَبَّتِ الْاَرْيَاحُ مِنْ نَحْوِ طَيْبَةٍ
اَهَاجَ فُؤَادِيْ طِيْبُهَا وَهُبُوْبُهَا
فَلَا تَعْجَبُوْا مِنْ لَوْعَتِيْ وَصَبَابَتِيْ
هَوٰى كُلِّ نَفْسٍ اَيْنَ حَلَّ حَبِيْبُهَا

جب مدینہ طیبہ کی جانب سے ہوائیں چلتی ہیں، تو اُن کی خوشبو اور اُن کا چلنا میرے دل کو بے قرار کر دیتا ہے۔
میری فریفتگی اور بے چینی پر تعجب نہ کرو۔ اس لئے کہ ہر عاشق کا دل اور اس کی آرزو وہاں ہوتی ہے۔ جہاں اس کا محبوب ہوتا ہے!

حضرت کعب بن زہیر (من قصیدۃ البردۃ)[2]

اُنْبِئْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْعَدَنِيْ
وَالْعَفْوُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ مَاْمُوْلُ

مجھے یہ خبر ملی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے میرے قتل کا حکم دیا۔ لیکن میں اللہ کے رسولؐ سے عفو و درگزر کی امید کرتا ہوں۔

---

[1] حافظ ابن حجر کا نام۔ [2] کعب بن زہیر جاہلیت کے چند ممتاز شعراء میں سے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہجویہ اشعار

(باقی اگلے صفحہ پر)

فَقَدْ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ مُعْتَذِرًا
وَالْعَفْوُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ مَقْبُوْلُ

میں اپنا عذر لے کر اللہ کے رسول کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں
اور اللہ کے رسول کے ہاں عفو و درگزر مقبول ہے۔

مَہْلًا ہَدَاکَ الَّذِیْ اَعْطَاکَ نَافِلَۃَ الْـ
قُرْآنِ فِیْہَا مَوَاعِیْظُ وَتَفْصِیْلُ

اے وہ ہستی جسے اللہ نے ہدایت دی اور وہ قرآن عطا فرمایا۔
جس میں نصائح اور تفصیل ہے۔ میرے بارے میں توقف سے کام لیجئے!

لَا تَاْخُذَنِّیْ بِاَقْوَالِ الْوُشَاۃِ وَلَمْ
اُذْنِبْ وَاِنْ کَثُرَتْ فِیَّ الْاَقَاوِیْلُ

لوگوں کی لگائی ہوئی باتوں کی بنیاد پر میرا مواخذہ نہ کیجئے۔ اگرچہ میرے
متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن حقیقت میں میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَسَیْفٌ یُسْتَضَاءُ بِہٖ
مُہَنَّدٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ مَسْلُوْلُ

بیشک رسول اللہ کی تیز اور برہنہ تلواروں میں سے وہ تلوار ہے
جس سے ہدایت اور روشنی حاصل کی جاتی ہے!

امام شرف الدین ابوصیری (ف ۶۹۶)

اَلْکُتُبُ وَالرُّسُلُ مِنْ عِنْدِ الْاِلٰہِ اَتَتْ
وَمِنْہُمْ فَاضِلٌ حَقًّا وَمَفْضُوْلُ

اللہ تعالیٰ کی جانب سے بہت سے رسول آئے اور کتابیں نازل کی گئیں
اور بلاشبہ اُن میں سے بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔

مُحَمَّدٌ حُجَّۃُ اللّٰہِ عَلَی الْخَلْقِ کُلِّہِمْ
لَہٗ عَلَی الرُّسُلِ تَرْجِیْعٌ وَتَفْضِیْلُ

لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوری مخلوق کیلئے اللہ تعالیٰ کی حجت بنا
بھیجے گئے۔ انھیں تمام رسولوں اور نبیوں پر ترجیح و فضیلت حاصل ہے

نَجْلُ الْاَکَارِمِ وَالْقَوْمِ الَّذِیْنَ لَہُمْ
عَلٰی جَمِیْعِ الْاَنَامِ الطَّوْلُ وَالطُّوْلُ

شریفوں اور سخیوں کے فرزند اور اس قوم کے چشم و چراغ جس
پوری انسانیت پر بے انتہا احسانات ہیں۔

مَنْ کَمَّلَ اللّٰہُ مَعْنَاہُ وَصُوْرَتَہٗ
فَلَمْ یَفُتْہُ عَلَی الْحَالَیْنِ تَکْمِیْلُ

وہ ہستی، جس کو اللہ نے معنوی اور ظاہری طور سے مکمل کیا اور
دونوں میں کسی لحاظ سے اُس میں کمی نہ رہنے دی!

علامہ ابوالقاسم محمود زمخشری صاحب الکشاف (ف ۵۳۸)

وَالْحَقُّ فَالْحَقُّ مَا جَاءَ الرَّسُوْلُ بِہٖ
سَیْفٌ عَلٰی ہَامِ اَہْلِ الشِّرْکِ مَسْلُوْلُ

حق وہ ہے۔ حق وہ ہے۔ جسے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) لے کر آئے۔ د
گویا اہلِ شرک کے سروں پر اللہ کی سونتی ہوئی تلوار تھے۔

مُحَمَّدٌ اِنْ تَصِفْ اَدْنٰی خَصَائِصِہٖ
فَیَا لَہَا قِصَّۃٌ فِیْ شَرْحِہَا طُوْلُ

تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی معمولی سے معمولی خوبی بھی بیان کرو تو ا
کی انتہائی طویل شرح و تفصیل ہو سکتی ہے!

اَبُو الْعِبَادِ وَعَبْدُ اللّٰہِ بَیْنَہُمَا
لَہٗ مُصَاصٌ مِّنَ الْاَنْسَابِ مَنْخُوْلُ

وہ لوگوں کے سرپرست اور اللہ کے بندے تھے اور ان دونوں کے مابین
آپ نسب کے لحاظ سے بہترین مخلوق تھے۔

ہُوَ الَّذِیْ اِنْ یُخَالِجْ فِیْ نُبُوَّتِہٖ
رَیْبٌ فَمَا الْقَوْلُ بِالتَّوْحِیْدِ مَقْبُوْلُ

وہی وہ ہستی ہیں کہ اگر آپ کی نبوت کے متعلق دل میں کوئی شک پی
ہو جائے تو توحید (کا اقرار) قابلِ قبول نہیں۔

(بقیہ حاشیہ) کہا کرتے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ لیکن وہ راتوں رات چھپ چھپا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت
میں حاضر ہوئے۔ اور آپ کی شان میں یہ قصیدہ پڑھا جس کے چند اشعار ہم اوپر دے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قصیدہ سُن کر کعب بن زہیر کو اپنی چا
اُتار کر پہنا دی۔ اس لئے یہ قصیدہ "بردہ" (چادر) کے نام سے مشہور ہے۔ اسے "قصیدہ بانت سعاد" بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا پہلا شعر اسی نق
سے شروع ہوتا ہے۔

فیسر ضیاء احمد - ایم اے
(بدایونی)

فارسی شعرا اور نعتِ رسولؐ

نعتِ رسولؐ کی اہمیت سے کس مسلمان کو انکار ہو سکتا ہے - جس صنفِ سخن کا موضوع ہی سرورِ کائنات کی ذاتِ پاک ہو - اُس کی پاکیزگی
برتری مسلّم - نعت کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ رب العزّت خود اپنے حبیب کی نعت بیان فرماتا اور آپؐ کے اذکار و
قب دُنیا کو سُناتا ہے - قرآن مجید اوّل سے آخر تک پڑھ جائیے - قدم قدم پر ذکرِ رسولؐ کے ترانے فردوسِ گوش ہوں گے - کہیں
رمایا جاتا ہے :-

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم -

لوگو تمہارے پاس تم ہی میں کے ایک رسول آئے ہیں - جن پر تمہاری تکلیف شاق گزرتی ہے - جن کو تمہاری بہبود کی لگن ہے اور جو
مسلمانوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہیں -

کہیں ارشاد ہوتا ہے - وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین - اور اے پیغمبر ہم نے تو تم کو دُنیا جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے -
ک جگہ آیا ہے - یا ایہا النبی انا ارسلناک شاھداً ومبشراً ونذیراً وداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً - اے نبی ہم نے
کو گواہی دینے والا ، رحمت کی خوش خبری سُنانے والا ، خدا کے غضب سے ڈرانے والا ، اور اُس کے حکم سے اُس کی طرف لوگوں کو بُلانے والا
ور ہدایت کا روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے -

دوسری جگہ فرمایا ہے - انک لعلیٰ خلق عظیم - بیشک تمہارے اخلاق بڑے اعلیٰ درجے کے ہیں - کہیں حق سبحانہٗ رسولؐ پر اپنا
ور اپنے فرشتوں کا درود بھیجنا بیان کر کے اہلِ ایمان کو اپنی اور فرشتوں کی تاسّی کا حکم دیتا ہے - کہیں لوگوں کو آپؐ کی آواز پر آواز بلند
رنے سے روکتا اور آپؐ سے خطاب کرنے کے آداب تعلیم کرتا ہے - غرض یہ اور اسی قبیل کی بہت سی آیات کریمہ نعت نبوی کے مضامین
ے لبریز ہیں - لیکن نعت کا بیان جس قدر عظیم الشان ہے اسی قدر دشوار گزار بھی - ذرا قدم ڈگمگایا اور انسان کہیں کا نہ رہا - اس فن
ی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ افراط اور تفریط سے بچنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں - بعض نعت گو شعراء رسالت کے ڈانڈے توحید سے
لا دیتے ہیں - اور بعض وہ طرز تخاطب اختیار کرتے ہیں جو دُنیاوی حسینوں کے لئے موزوں ہو تو ہو - مگر محبوبِ خدا کی شانِ اقدس
کے سراسر منافی ہوتا ہے - دونوں صورتوں میں نتیجہ خسرانِ مبین کے سوا کچھ نہیں - ہم نے بعض نعت لکھنے والوں کو دیکھا ہے جو یا تو رنگینی
ور تغزل نگاری کی کوشش میں سوقیانہ اندازِ بیان پر اتر آتے ہیں یا پھر اُن کی شاعری خشک اور بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے —
افراط کی مثالیں درکار ہوں تو ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بہ عہدِ حکم تو امر قضا چناں منسوخ	کہ از نزولِ کلام مجید حکم زبور
تو کز وجوب مغائر شماری امکانش	زاہویست نگہ در مقام زناری

اللہ کا محبوب ہے کم پایہ نہیں ہے　　　واں مثل نہیں ہے تو یہاں سایہ نہیں ہے
اللہ کے پلّے میں وحدت کے سوا کیا ہے　　　جو کچھ مجھے لینا ہے لے لوں گا محمدؐ سے
خدا جو پوچھے گا وجہ گنہ تو کہہ دیں گے　　　ترے حبیب کا تھے آسرا لگائے ہوئے
اسی باعث تو میں دنیا میں مے سے شغل رکھتا تھا　　　غلام ساقیٔ کوثر سے کچھ پرسش نہیں ہوتی

اسی طرح حضرتؐ کی تعریف میں احمد بلا میم اور عرب بلا عین کہنا - بلکہ اُن کو حدیث نبوی قرار دینا انتہائے ضلالت وجہالت ہے - اس کے برخلاف بعض شعراء حضورؐ سے خطاب کرتے ہوئے معاذ اللہ بُت - سنگدل - قاتل - ستمگر جیسے نازیبا الفاظ استعمال کرتے اور تفریط کے مرتکب ہوتے ہیں -

یہی وجہ تھی کہ عرفیؔ نے نعت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا تھا :-

عرفیؔ مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحراست　　　آہستہ کہ رہ بردمِ تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن　　　نعتِ شہِ کونین و مدیحِ کے و جم را

نعت کے اجزائے ترکیبی میں خاص طور پر دو چیزیں داخل ہیں - مدح اور اظہارِ محبت - ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے نقطۂ نظر سے سرکارِ دو عالمؐ کی مدح اور محبت دونوں نہ صرف مرغوب و مطلوب بلکہ عین ایمان ہیں - یہ صحیح ہے کہ عموماً شرع میں مدح کو ناپسند کیا گیا ہے کہ اس سے مداح میں دناءت اور ممدوح میں نخوت پیدا ہوتی ہے - آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ جب تم مدح کرنے والوں کو دیکھو تو اُن کے منہ میں خاک جھونک دو - یعنی اُن کو کچھ نہ دو - بعض صحابہ نے اس حدیث کے الفاظ پر کاربند ہوتے ہوئے سچ مچ مدح کرنے والوں کے منہ میں خاک ڈال دی - حضورؐ نے خود اپنے متعلق ارشاد کیا کہ مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ بن مریم کے ساتھ کیا - میں تو خدا کا بندہ ہوں - اس لئے مجھے خدا کا بندہ اور رسول کہا کرو - لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مطلق مدح ناجائز ہے - سچی تعریف جو نیک مقصد سے کی جائے اور مفاسد سے خالی ہو اس کا مستحسن ہونا سب کے نزدیک مسلّم ہے - چنانچہ ایک مرتبہ ایک وفد نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی - آپ ہمارے سید ہیں - ارشاد ہوا سید تو اللہ ہے - اُن لوگوں نے کہا - وافضلنا فضلاً واعظمنا طولاً - یعنی آپ رتبے میں سب سے بڑھ کر اور درجے میں سب سے برتر ہیں - تو آپ نے اُن کو اجازت دے دی - رہا آپؐ سے محبت کرنا - تو ظاہر ہے کہ اس کے بغیر ایمان ہی ناقص ہے - صحاح میں ہے کہ جو شخص حضورؐ کو اپنے ماں باپ ، اولاد اور تمام دنیا سے زیادہ دوست نہ رکھے - وہ مومن ہی نہیں - بلکہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جس کسی کو دوسرے سے حُب فی اللہ ہو تو اس کو چاہیئے کہ اپنی محبت کا اظہار بھی کر دے -

اکابر نے لکھا ہے کہ مدح اور محبت کے محرکات اور دواعی عموماً تین ہوتے ہیں - کمال - جمال اور نوال - ہم کسی شخص کی تعریف کرتے یا اس کو دوست رکھتے ہیں تو اس لئے کہ وہ صاحبِ جمال ہے اور جمال کی تحسین تقاضائے فطرت ہے - یا باکمال ہے - اور ظاہر ہے کہ کمال کا احترام اصل آدمیت ہے - یا اس کا ہم پر احسان ہے - اور احسان کے سامنے جھکنا شانِ شرافت ہے -

یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ آنحضرتؐ کی ذاتِ اقدس جمال - کمال - نوال تمام اوصافِ حسنہ کی جامع ہے - آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری - آپ کے جمالِ ظاہر کے بارے میں صحابہ کرامؓ کی شہادت سننے کے قابل ہے - حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں :-

ما رایت احسن من النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان الشمس تجری فی وجہہ

یعنی میں نے حضورؐ سے زیادہ کوئی حسین نہیں دیکھا - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ کے چہرۂ انور میں آفتاب گردش کر رہا ہے -

حضرت حسانؓ کہتے ہیں :-

خُلقتَ مبرءً امن کلّ عیبٍ کأنّک قد خُلقتَ کما تشاءُ

آپ تمام عیبوں سے پاک کئے گئے ہیں - گویا آپ جس طرح چاہتے تھے اُسی طرح تخلیق کئے گئے

واحسن منک لم ترقط عینی واجمل منک لم تلد النساءُ

آپؐ سے زیادہ حسین میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا - اور آپؐ سے زیادہ خوبصورت فرزند کسی عورت کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔

حضرت انسؓ و جابرؓ سے بھی اسی قسم کی روایات منقول ہیں - (صحیحین و ترمذی)

آپؐ کے کمالات و فضائل کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ دوست تو دوست دشمن بھی آپؐ کو صادق اور امین مانتے تھے - اور آج بھی انصاف پسند غیر تک آپؐ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں - اسی طرح آپ کے جود و نوال کے ذکر سے کتب احادیث و سیر معمور ہیں -

یہی وجوہ تھے کہ لوگوں نے ہر زمانے میں نعت گوئی کو اپنے لئے ذریعہ مجد و شرف سمجھا - اور اس نسبت کو اپنے حق میں طغرائے امتیاز جانا - شاید نعت کا سب سے پہلا کام وہ ہے جو عمِ رسولؐ ابو طالب کی طرف منسوب ہو -

وابیض یستسقی الغمامُ بوجہہ ! ثمالُ الیتامٰی عصمۃٌ للارامل

فاصبح فینا احمد فی ارومۃ تقصّرعنہ سورۃ المتطاول

فایدہ رب العباد بنصرہ ! واظہر دیناً حقہ غیر باطل

وہ ایسے نورانی شکل والے ہیں جن کے چہرے کے وسیلے سے لوگ طلب باراں کرتے ہیں - یتیموں کے فریاد رس - بیواؤں کے محافظ - احمدؐ ہمارے اندر ایسے درخت کی جڑ سے تعلق رکھتے ہیں - جس تک درازدستوں کی درازدستی پہنچنے سے قاصر ہے - پروردگار نے اپنی نصرت سے آپؐ کی تائید فرمائی اور اس دین کو غالب کیا جس کی صداقت یقینی ہے -

اگرچہ اکثر اہل علم اس کی نسبت پر شبہ کرتے ہیں - مگر کم از کم پہلے شعر کے استناد میں کوئی شک نہیں ہے - بخاری کے باب الاستسقاء میں اس کو ابو طالب ہی سے منسوب کیا گیا ہے - یوں تو متعدد صحابہ کرام سے اشعار نعت مروی ہیں - لیکن اُن میں حضرت کعبؓ بن زہیر اور حضرت حسانؓ بن ثابت کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی - کعبؓ بن زہیر بن ابی سلمیٰ پہلے اسلام کے سخت مخالف تھے اور حضورؐ کی ہجو کرتے تھے - اُن کا خون ہدر کر دیا گیا تھا - آخر وہ اپنے بھائی بُجیر (جو مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے) کی ترغیب سے حاضر خدمت ہوئے - آپؐ نے نام پوچھا - عرض کی کعب - فرمایا - تم ہی ہو جس نے مجھے مامور (آسیب زدہ) کہا تھا - جواب دیا - میں نے مامون کہا تھا - نہ کہ مامور - اس کے بعد انھوں نے اپنا تصنیف قصیدہ " بانت سعاد " پڑھ کر سنایا اور داخلِ اسلام ہوئے -

یہ قصیدہ ہر عہد میں مقبول اور متداول رہا ہے اور اہل علم نے اس کی متعدد شروح لکھی ہیں - نمونہ کے طور پر ہم قصیدہ مذکور کے چند شعر (تمہید کو چھوڑ کر) ہدیۂ قارئین کرتے ہیں :-

اُنبئتُ انّ رسولَ اللہ اوعدنی والعفو عند رسولِ اللہ مامولُ

مجھے خبر دی گئی کہ رسولِ خدا نے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے - مگر مجھے آپؐ کی ذات سے عفو کی امید ہے -

نقد اتیتُ رسولَ اللہ معتذراً والعذر عند رسول اللہ مقبولُ

میں آپ کی خدمت میں عذر کرتا ہوں اور جانتا ہوں آپؐ کے حضور میں عذر قبول کیا جائے گا !

مهلاً هداك الذی اعطاك نافلة — القرآن فیها مواعیظ وتفصیل

ٹھہریئے۔ وہ خدا جس نے آپ کو نصیحت اور بیان والی کتاب دی عفو گناہ کی طرف آپ کی رہنمائی کرے۔

لا تاخذنّی باقوال الوشاة ولم — اذنب وان کثرت فیّ الاقاویل

آپ سخن چینوں کی بات پر میری گرفت نہ کیجئے۔ اگرچہ لوگوں نے میرے خلاف بہت کچھ کہا ہے مگر میں بے قصور ہوں۔

ان الرسول لنور یستضاء به — مهنّد من سیوف[1] الله مسلول

رسولِ خدا ایسا نور ہیں جس سے سب روشنی حاصل کرتے ہیں اور آپ خدا کی تیغوں میں سے برہنہ تیغ مہنّد ہیں۔

جب یہ شعر پڑھا تو حضورؐ نے اپنی چادر مطہر اُن کو عطا فرمائی۔

حضرت حسانؓ بن ثابت انصاری کا شمار بھی مخضرمین[2] میں ہے۔ جنہوں نے ساٹھ سال جاہلیت میں اور ساٹھ سال اسلام میں گزارے۔ ان کی وفات امیر معاویہ کے عہد حکومت میں ہوئی۔ اسلام سے پہلے وہ سلاطین کی مدح کرتے تھے۔ لیکن اسلام لانے کے بعد اپنے آپ کو نعتِ رسول اور حمایت دین کے لئے وقف کردیا۔ سرورِ عالم نے اکثر ان کی تحسین فرمائی ہے اور اللّٰھم ایّدہ بروح القدس[3] کہہ کر اُن کے لئے دعا کی ہے۔ آپؐ اُن کے لئے منبر نصب کراتے اور اُن کو قریش کے کفریہ اشعار کا جواب دینے کا حکم فرماتے تھے۔ اہلِ ادب کا اتفاق ہے کہ شہری عربوں میں سب سے زیادہ شاعر اہلِ مدینہ ہیں اور اُن میں سب سے بڑے شاعر حسانؓ ہیں۔

ان کی شاعری کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔ اس قصیدے میں وہ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب کی دریدہ دہنی کا جواب دیتے ہوئے نعت کی طرف گریز کرتے ہیں۔

هجوت محمداً فاجبت عنه — وعند الله فی ذاک الجزاء

تو نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو کی جس کا میں جواب دے رہا ہوں۔ اور خدا کے یہاں میری جزاء مقرر ہو چکی ہے۔
(جب حسان اس شعر پر پہنچے تو آپؐ نے فرمایا۔ جزاءک علی اللہ الجنۃ تمہاری جزاء خدا کے یہاں جنت ہے)

اتهجوه ولست له بکفوء — فشرّکما لخیرکما الفداء

تو آنحضرت کی کیا ہجو کرتا ہے۔ جبکہ تو اُن کی برابر کا نہیں ہے۔ تو بدکار ہے اور وہ نیکوکار۔ تجھ کو اُن پر سے قربان کردیا جائے تو روا ہے۔

هجوت مبارکاً براً حنیفاً — امین الله شیمته حیاء

تو نے ایسی ذات کی ہجو کی جو بابرکت، نیکوکار، راست باز اور خدا کی امین ہے۔ اور جس کا شعار شرم و حیا ہے۔

فمن یهجو رسول الله منکم — ویمدحه وینصره سواء

فان ابی ووالدتی وعرضی — لعرض محمد منکم وقاء

تم میں سے کوئی رسول مقبول کی منقصت کرے یا مدح و نصرت۔ کوئی پروا نہیں۔ کیونکہ میرے ماں باپ اور خود میری

---

[1] کہا جاتا ہے کہ شاعر نے پہلے سیوف الہند کہا تھا۔ حضورؐ نے اصلاح دی اور ارشاد کیا کہ سیوف اللہ کہو۔ علامہ اقبال نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ آپؐ کے فیضانِ عام نے محدود وطنیت کی قید کو پسند نہیں فرمایا۔ [2] مخضرم وہ شاعر ہے جس نے جاہلیت اور اسلام دونوں عہد دیکھے ہیں۔ [3] اے اللہ روح القدس کے ذریعہ سے حسان کی مدد فرما۔

عزت رسولِ خدا کی عزت کی حفاظت کی خاطر تمہارے مقابلہ میں سپر ہیں۔

اس شعر کو سُن کر حضورؐ نے فرمایا۔ وقاک اللہ ھولِ المُطّلع - یعنی اللہ تمہیں قیامت کے ہَول سے بچائے۔

آخر میں حضرت حسانؓ تعلی کے طور پر کہتے ہیں:-

لسانی صارمٌ لا عیب فیہا　　وبحری لا تکدّرہ الدلاء

میری زبان ایسی تیز تلوار ہے جس میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اور (میری طبیعت) ایسا سمندر ہے جو ڈولوں سے گدلا نہیں ہوتا۔

عہدِ صحابہ کے بعد بھی ہر زمانے میں اہلِ علم نعت کو سرمایۂ سعادت سمجھتے اور اس صنف میں دادِ سخن دیتے رہے ہیں۔

عربی کی طرح فارسی میں بھی اکثر شعراء نے اس محبوب مشغلے کو اختیار کیا اور عقیدت و ادب کے شاہکار پیش کئے۔ متقدمین ہوں یا متوسطین۔ متاخرین ہوں یا شعرائے حال۔ ان میں کم ایسے ہیں جنہوں نے کسی نہ کسی شکل میں دربارِ رسالت میں خراجِ ارادت ادا نہ کیا ہو۔ البتہ یہ امر موجبِ تاسف ہے کہ قدما میں بعض مشہور اور پُرگو شعراء مثلاً رودکی، عنصری، فرخی، منوچہری، انوری، ظہیر وغیرہ ایسے گزرے جن کی عمر سلاطین و امراء کی جھوٹی خوشامد اور ذلیل ہجو میں بسر ہوئی۔ مگر نعتِ رسولؐ میں دو شعر بھی لکھنے کی اُن کو توفیق نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عطائے عاجل کے جویا جزائے آجل کا انتظار دشوار سمجھتے تھے۔

شعرائے فارسی کی نعت گوئی کا مفصل جائزہ ایک مستقل دفتر اور کافی وقت چاہتا ہے۔ علاوہ بریں ہر شاعر جس نے اپنے دیوان یا مثنوی میں اعتقاداً یا رسماً چند شعر نعت کے بھی شامل کر دیئے۔ اس کا مستحق بھی نہیں کہ اس کو مشہور نعت نگاروں کی صف میں جگہ دی جائے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم صرف مشاہیر کے کلامِ نعت کے نمونے پیش کریں۔ اور ساتھ ساتھ مختصر تذکرہ و تبصرہ بھی کرتے چلیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے حکیم سنائی کا نام آتا ہے۔ پورا نام ابوالمجد مجدود بن آدم۔ سنائی تخلص۔ غزنی وطن۔ پانچویں صدی ہجری کے اواسط میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ "روزِ روشن" میں سالِ ولادت ۴۳۷ھ دیا ہوا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو ۱۰۸ برس کی عمر پائی۔ کیونکہ بقولِ اصح اُن کی وفات ۵۴۵ھ میں واقع ہوئی ہے۔ شروع میں غزنویوں کے دربار سے منسلک تھے۔ پھر جاذبۂ توفیق نے دامن کھینچا۔ اور ایک مجذوب کی ملامت سے متاثر ہو کر دربار سے قطع تعلق کیا۔ اور طریقِ فقر اختیار فرمایا۔ ایک ضخیم دیوان (مشتمل بر قصائد و غزلیات و رباعیات) اور سات مثنویاں جن میں حدیقۃ الحقیقۃ زیادہ مشہور ہے یادگار چھوڑیں۔ کلام معرفت حکمت اور اخلاق کا مخزن ہے۔ فارسی شعراء میں تین صوفی شاعر سرآمدِ روزگار مانے گئے ہیں۔ جو بہ ترتیبِ زمانی) حسبِ ذیل ہیں۔ سنائی۔ عطار۔ رومی۔ سنائی پہلے صوفی شاعر ہیں جنہوں نے مسائلِ تصوف کو نظم میں ادا کیا۔ اُن کے متعدد قصائد توحید اور زہدیات میں ہیں۔ نعت بھی خوب لکھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

اے سنائی گر ہمی جوئے زلطفِ حق سنا　　عقل را قرباں کن اندر بارگاہِ مصطفٰےؐ

ہیچ مندیش از چنیں عیاری، ایرا بس بود　　عاقلہ عقل ترا ایمان و سنت خوں بہا

مصطفٰے اندر جہاں آنگہ کسے گوید کہ عقل　　آفتاب اندر فلک آنگہ کسے گوید سُہا

آنحضرتؐ کے ہوتے ہوئے ظاہری عقل کی پیروی ایسی ہی نادانی ہے جیسے کوئی آفتاب کی موجودگی میں سُہا (ایک چھوٹا ستارہ) کا نام لے۔ آگے چل کر کہتے ہیں کہ دُنیا خدا کی بستی ہے جس میں اوامر و نواہی شریعت کا قانون چلتا ہے۔ آنحضرتؐ اُس کے بادشاہ۔

حضرت جبریل ناظر۔ جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ محافظ ہیں۔ انہوں نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ روح کی شفا فلسفیوں کے مطب میں نہیں۔ بلکہ سنت نبوی کے شفاخانہ میں ہی ممکن ہے۔

رحمۃ للعالمین آمد طبیبت زو طلب — چہ ازیں عاصی وزاں عاصی ہمی جوئے شفا
کاں نجات و آں شفا کارباب سنت جستہ اند — بو علی سینا ندارد در نجات و در شفا
ناشنا نزدیک او شوز انکہ خود نبود طبیب — مفتیٔ ذوق و دلیل نبض جز در ناشتا

نبوت کے شفاخانہ میں جاؤ تو نہار منہ جاؤ (یعنی فلسفہ کی غذا کھائے بغیر) کیونکہ نبض کی صحیح شناخت نہار منہ ہی کی جاتی ہے۔ طریقۂ استدلال کس قدر پر لطف ہے۔ دوسرے قصیدے میں کہتے ہیں:۔

خوش سخن شاہے کز اقبال کفش در پیش او — گشتۂ بریاں زباں یا بد کہ در وے سم بود
چرخ را از کاف لولاکش کمر زریں بود — خاک را باحا، حامیمش قبا معلم بود

اُس زمانے کے ایک دوسرے نامور شاعر سید حسنؒ غزنوی ہیں۔ یہ حسینی سید ہیں۔ بہرام شاہ غزنوی کے مداح تھے۔ بعد کو یہ تعلق چھوڑ کر سفر حج کو روانہ ہوئے۔ حج کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور اپنا مشہور ترجیع بند مواجہہ شریف میں پڑھا۔ تاریخ گزیدہ اور تذکرہ دولت شاہ میں ہے کہ جب یہ شعر پڑھا:۔

لاف فرزندی نیارم زد دریں حضرت ولیک — مدحتے آوردم اینک خلعتے بیروں فرست

تو قبۂ مبارک سے ایک ہاتھ برآمد ہوا جس میں خلعت تھا۔ اور آواز آئی "یا بنی خذ"۔ اے میرے فرزند لے۔ سید حسن غزنوی کی رحلت اغلباً ۵۵۶ ہجری میں ہوئی۔ جبکہ وہ عمر کی چھہتر منزلیں طے کر چکے تھے۔ ترجیع بند کے چند اشعار تبرکاً حاضر ہیں:۔

یارب ایں مائیم و ایں صدر رفیع مصطفاست — یارب ایں مائیم و ایں فرق عزیز مجتباست!
یارب ایں مائیم و ایں روئے زمین یثرب است — کآسماں را صفت پشت از رشک یک ہنرلیش دوتاست
خواب گاہ مصطفےٰ و کعبہ ماں از پیش و پس — بارگاہ و منبر حنانہ ماں از چپ و راست
یارب ایں راحت کہ ما دیدیم در دنیا کہ دید — یارب ایں دولت کہ ما داریم در عالم کراست
یارب ایں روضہ است و ایں گلہائے رنگیں لو ریست — یارب ایں مائیم و ایں دلہائے سنگیں زاں ماست
در دل سنگ آب و آتش زیں طرب رقاص گشت — اے دل ار سنگی پس آخر آتش و آبت کجاست
سرفرازی مردم دیدہ کزیں ہر ذرۂ! — سرمۂ خاک کف پائے نبیؐ الانبیا ست

سلموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الامین
مصطفےٰ ما جاء الا رحمۃ للعالمین

کلام میں جو والہانہ عقیدت اور دلکش لطافت ہے وہ تعریف سے باہر ہے۔ کس خوبی سے فرماتے ہیں کہ پتھر سے پانی اور آگ نکلتی ہے۔ اے دل مانا کہ تو پتھر ہے۔ تیرا پانی اور آگ (اشک و آہ) آخر کہاں ہے۔ بند کی بیت (سلموا یا قوم) جس قدر مقبول اور زبان زد ہے۔ ظاہر ہے۔ چند شعر اور سنئے:۔

منت ایزد را بدیں گردوں اعلا آمدیم — منت ایزد را بدیں درگاہ والا آمدیم

اشک باراں بادلے پُرآتش و چشمے پُرآب　　ہمچو ابر تیرہ از پستی بہ بالا آمدیم
صاحب لولاک شہا ! جاکہ ما را بار داد　　تا نہ پنداری کہ بے دستور ایں جا آمدیم
سلموا ....

ابر رحمت ہمرہ زاں دست چوں جیحوں فرست　　تشنگاں را شربتے گر ممکن آید اکنوں فرست
قصہ ایں خاک پا یاں را بخواں دستے برآر　　چوں پسندیدی بہ نزد خالق بیچوں فرست
لاف فرزندی نیارم زد دریں حضرت ولیک　　مدحتے آوردم اینک خلعتے بیروں فرست
سلموا ....

سرِ دفترِ مداحانِ مصطفوی اور سرآمد عاشقان نبوی خاقانی شروانی کا نام اس سلسلہ کا واسطۃ العقد اور دُرۃ التاج کہا جائے تو بے جا نہیں۔ مشہور ہے کہ عرب نے حسّان بن ثابت۔ ایران نے خاقانی شروانی اور ہند نے محسن کاکوروی کے رُتبے کا نعت گو پیدا ہی نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس وقت سے لے کر اب تک اہلِ علم اس (خاقانی) کو حسان العجم کے لقب سے یاد کرتے آئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو شروع ہی سے نعت سے شغف تھا۔ اسی لئے اس کے چچا نے اُس کو یہ لقب عطا کیا تھا۔ خود خاقانی اپنے لئے یہی لقب استعمال کرتا ہے۔

مصطفےٰ حاضر و حسّان عجم مدح سرا　　پیش سیمرغ خمش طوطی گویا بینند

خاقانی کی ولادت ۵۲۰ ہجری کے حدود میں شروان میں ہوئی۔ نام افضل الدین ابراہیم بن علی۔ شروع میں حقائقی تخلص کرتا تھا۔ پھر جب اپنے استاد ابو العلاء گنجوی کی سفارش سے خاقانِ اکبر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں رسائی ہوئی تو خاقانی تخلص اختیار کیا۔ منوچہر کے بعد اس کے بیٹے اخستان شاہ کے مقربین میں داخل ہوا۔ خاقانی تمام علوم متداولہ میں بلند پایہ رکھتا تھا۔ اس کے قصائد کا خاص وصف رفعت تخیل اور زورِ بیان ہے۔ رفعتِ تخیل کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا کلام نہایت عمیق الفہم اور دشوار ہو گیا ہے۔ زورِ بیان کا بقول علامہ شبلی یہ عالم ہے کہ کئی کئی سو شعر کے قصیدے لکھتا ہے۔ اور کہیں زور کم نہیں ہوتا۔ نعتیہ قصائد میں ان اوصاف نے جوشِ عقیدت اور رنگ متانت سے مل کر اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔

آخر عمر میں خاقانی حج و زیارت سے مشرف ہوتا ہے۔ اور واپسی میں بادشاہ کے عتاب کا شکار ہوتا ہے۔ جو اس کو قلعہ شابران میں قید کر دیتا ہے۔ اُس کے متعدد حبسیہ قصائد اسی عہد اسیری کی یادگار ہیں۔ آخر سات ماہ کے بعد رہائی ہوئی۔ خاقانی دربار کی خدمت ترک کر کے عزلت گزیں ہو گیا۔ اور ۵۹۵ ہجری کے لگ بھگ تبریز میں سفر آخرت کیا۔ نعت میں اُس کا انداز اشعار ذیل سے ظاہر ہوگا۔ قید کے مصائب بیان کرنے کے بعد کہتا ہے:-

بر آستان کعبہ مصفا کنم ضمیر　　ز و نعت مصطفےٰ نے نز کا برآوردم

کاش میری حسرت نکلے اور دوبارہ دولتِ حج نصیب ہو۔ میری آرزو ہے کہ کعبہ کے فیضان سے اپنے ضمیر کو صاف کروں۔ اور اپنے کو پاک اور برگزیدہ رسُول کی نعت کے قابل بناؤں۔

دیباچہ سراچہ کُل سرور رسل　　کز خدمتش مراد جہاں برآوردم

وہ سید انبیا جن سے تخلیق عالم کا آغاز ہوا۔ اور جن کی نعت سے میری مرادیں بر آئیں گی۔

گرد حمتش بہ خاک سراندیپ اوفگنم　　کو شرز خاک آدمؑ و حوّا برآوردم

اگر میں آپؐ کی نعت کا نغمہ سراندیپ میں گاؤں تو یقین ہو کہ میری نعت گوئی کے اثر سے حضرت آدم و حضرت حوا کی قبروں سے چشمۂ کوثر لہریں مارنے لگے۔

کے باشد آں زماں کہ برسم باز حضرتش   فریاد یا مغیثُ اَغثنا بر آورم

دیکھئے وہ دن کب آئے کہ میں پھر آپؐ کے روضے پر حاضر ہوں اور فریاد کروں۔

زاں غصہ ہا کہ دارم از آلودگانِ عصر   غلغل در آں حظیرۂ علیا بر آورم

زمانے کے ظالموں سے جو جو صدمے اٹھائے ہیں اُن کی وجہ سے اُس بارگاہِ رفیع میں نالہ و زاری کروں۔

ز اصحاب خویش چوں سگ کہف اندراں حریم   آہ از شکستگیٔ سر و پا بر آورم

جس طرح اصحابِ کہف نے اپنے کتّے کو جو محبّت سے اُن کا پیچھا کر رہا تھا افشائے راز کے خوف سے مار کر بھگانا چاہا تھا۔ میں بھی اپنے رفقاء کے مظالم پر اُس روضۂ مبارکہ میں پہنچ کر آہیں بھروں۔

دندانم ار بہ سنگ غرامت شکستہ اند   وقت ثنائے خواجہ ثنایا بر آورم

اگر سگِ کہف کی طرح میرے اصحاب (رفقاء) نے میرے دانت توڑ دیئے ہیں۔ تو کیا ہوا۔ حضورؐ کی مدح کے وقت میرے ٹوٹے ہوئے دانت پھر نکل آئیں گے۔

سوگند خورد مادر طبعم کہ در ثناش   از یک شکم دوگانہ چو جوزا بر آورم

میری مادرِ طبع نے قسم کھائی ہے کہ آپؐ کی نعت میں جوزا کی طرح ایک بطن سے دو توام بچے جنے گی۔ اشارہ ہے دوسرے[1] قصیدے کی طرف جو اسی بحر میں قافیہ و ردیف بدل کر لکھا ہے۔

اسمائے طبع من بہ نکاح ثنائے اوست   زاں فالِ سعد اختر اسما بر آورم

اسماء عرب کی ایک معشوقہ کا نام ہے جس پر سعد عاشق تھا۔ خاقانی کا مطلب یہ ہے کہ میری طبیعت کی اسماء آنحضرتؐ کی مدح کے نکاح میں ہے۔ یعنی اب میں نعت کے سوا دوسروں کی تعریف کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں گا۔ نعتِ رسولؐ کا وہ مرتبہ ہے کہ اس کی بناء پر اگر اسماء (طبیعت) کے مقدّر کے لئے فالِ نیک لوں تو بجا ہے۔ آخر میں کہتا ہے:-

امروز کز ثناش مراہست کوثرے   رخت از کُرِ ثرے بہ ثریا بر آورم

فردا من از شفاعت او کار آں سرے   در حضرت خدائے تعالا بر آورم

ایک اور قصیدے میں زنداں کے شدائد اور دوست نما دشمنوں کے مظالم کا ذکر کر کے کہتا ہے:-

از مصاف بولہب فعلاں نہ پیچانم عناں   چوں رکابِ مصطفےٰ شد مقصد و ملجائے من

قاسم رحمت ابوالقاسم رسول اللہ کہ ہست   در ولائے او خدیو عقل و جاں مولائے من

ابولہب نے رسولِ مقبولؐ کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر نتیجہ کیا ہوا۔ وہ دین و دنیا میں خائب و خاسر ہی

---

[1] اُس کا مطلع یہ ہے:-

ہر صبح پائے صبر بہ دامن در آورم   پرکار عجز گرد دل و تن در آورم

اور آنحضرتؐ کا مقدس مشن دن دُونی رات چوگنی ترقی کرتا رہا۔ جب ایسا ہے تو میں ان ابو لہب خصلت مخالفوں سے کیوں ڈروں۔ جب وہ میرے آقا کا کچھ نہ بگاڑ سکا تو یہ لوگ میرا کیا کرلیں گے۔ آخر کو مُنہ کی کھائیں گے۔

جب خاقانی ۵۵۱ ہجری میں حج و زیارت سے مشرف ہوا ہے۔ تو اُس نے کئی طویل الذیل پُرزور قصیدے کعبۂ مطہرہ کی تعریف میں کہے ہیں۔ جن میں زورِ کمال اور لطف کلام کی بڑی فراوانی ہے۔ حاجیوں کے ہجوم۔ اہلِ دل کے ذوق و شوق۔ مقاماتِ مقدسہ کی دل کشی۔ مناسکِ حج کی تفصیلات۔ کی تصویر اس خوبی سے کھینچی ہے کہ باید و شاید۔ اُس کے بعد مدینہ منورہ میں حاضر ہوا ہے۔ اور روضۂ اقدس کے مواجہہ میں ایستادہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک عاشقِ رسُول کے دل کی اُس وقت کیا کیفیت ہوگی۔

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا　　　نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

میں نے غلط کہا۔ ایسی حالت میں تماشا اور نظارہ کا کسے ہوش ہوتا ہوگا۔

غیرت از خود بہ برم روئے تو دیدن ندہم　　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

غرض جب ہمارا شاعر ذرا سنبھلتا ہے اور حواس برجا ہوتے ہیں تو پکار اُٹھتا ہے۔

مصطفےٰ پیشِ خلائق فگند خوانِ کرم　　　کہ مگس رانِ وے از شہپرِ عنقا بینند

مدینۂ رسُول کا کیا کہنا۔ یہاں سرکار کا خوانِ کرم بچھا ہوا ہے جس پر شہپرِ عنقا مگس رانی کا کام دے رہا ہے۔

مصطفےٰ حاضر و حسان عجم مدح سرا　　　پیش سیمرغ خمش طوطی گویا بینند

اللہ اللہ! میرے نصیب کہ حضورؐ کے مواجہہ میں نعت پڑھ رہا ہوں۔ ورنہ طوطی کی کہاں مجال کہ سیمرغ کے روبرو زبان کھولے۔

خاقانی رخصت ہوتے ہوئے بالینِ مرقدِ نبویؐ کی خاک ارمغاں کے طور پر لے جاتا ہے۔ اُس وقت اس کے ناز و فخر کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اربابِ اورنگ و دیہیم کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

کیوں تاجدار و اخواب میں دیکھی کبھی وہ شئے　　　جو آج جھولیوں میں گدایانِ در کی ہے

اس موقع پر وہ کہتا ہے اور کس تیور سے کہتا ہے۔ والہانہ عقیدت کے ساتھ خیال کی نزاکت۔ اور تشبیہات و استعارات کی ندرت بیان سے باہر ہے۔ خاکِ بالینِ رسُول کے لئے کیا کیا پیرائے اختیار کرتا ہے۔ سنئے:۔

صبح وارم کآفتابے در نہاں آوردہ ام　　　آفتابم کز دمِ عیسیٰ نشاں آوردہ ام

عیسیم کز بیت معمور آمدہ و ز خوان خلد　　　خوردہ قوت و ز لہ اخوان ز خوان آوردہ ام

ہیں ملائے خشک بے بیران نزد من کہ من　　　ہر دو قرص گرم و سرد آسماں آوردہ ام

طفل نذری مکتب بردناں، من ز مکتب آمدہ　　　بہر پیراں ز آفتاب و مہ دو ناں آوردہ ام

گر چہ عیسیٰ وار زنیجا با د سوزن بردہ ام　　　گنج قاروں بیں کز آنجا سوزیاں (رتحفہ) آوردہ ام

غرض کہاں تک اشعار نقل کئے جائیں۔ آگے چل کر کہتا ہے کہ میں نے خلوت سرائے دوست دیکھی۔ اور اس کی مہمان سرائے میں دل کے ساتھ تن کو بھی طفیلی بنا کر لے گیا۔ میزبان (رسُول خدا) حجرۂ خاص میں آرام فرما ہیں۔ اور باہر فیض عام کا دستر خوان بچھا ہوا ہے۔ میں بھی دل و جان نذر کے طور پر لے کر حاضر ہوگیا۔ بعد کے اشعار کا انداز نہایت ہی لطیف اور مؤثر ہوگیا ہے۔

دوست خفتہ در شبستان ست و دولت پاسباں　　　من بہ چشم و سر سجود پاسباں آوردہ ام

پاسباں گفتہ چہ داری نور ہاں، گفتم شما　　　کاں زر دارید و من جاں نور ہاں آوردہ ام

سرکار شبستان (مرقد) میں محو استراحت تھے اور اقبال در پر پاسبان کی طرح پہرہ دے رہا تھا - میں بڑھ کر آنکھوں اور سر سے پاسبان کو آداب بجالایا - اُس نے پوچھا کہ اس دربار میں آئے تو ہو - کچھ تحفہ بھی لائے - میں نے عرض کی - آپ کے پاس تو سونے کی کان (ذات اقدس) ہے - میرے پاس جان کے سوا کیا تھا - وہی تحفے میں لے آیا ہوں - نئی نئی اور نادر نادر استعاروں کے بعد صاف صاف بتاتا ہے :-

خاک مشک آلودہ بہر حرز جاں آوردہ ام　　یعنی امسال از سر بالین پاکِ مصطفےٰ

اس خاک پاک کی قیمت کیا ہے - خاقانی کی زبان سے سنئے :-

خوں بہائے جان صد خاقان و خاں آوردہ ام　　کیست خاقانی کہ گویم خوں بہائے جان اوست

خاقانی کی جان کی کیا حقیقت ہے - اس کی قیمت تو سو خاقان اور خان کی جان کے برابر ہے -

پھر کہتا ہے میں نے غلط کہا - میں تو اس قیمت پر بھی اسے دینے کو تیار نہیں ہوں -

گرچہ اوّل نام دادن بر زباں آوردہ ام　　وقف بازوئے منست ایں حرز نفروشم بکس

انتخاب بہت طویل ہوگیا - لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم - دراصل پورا فارسی قصیدہ پڑھنے کے قابل ہے - انتخاب اور ترجمہ میں وہ لطف نہیں آتا -

مولانا نظامی گنجوی کی نعتیں بھی جو اُن کے خمسہ میں پائی جاتی ہیں - فارسی زبان کا شاہکار مانی گئی ہیں - اُن کا نام الیاس بن یوسف تھا - وہ ایک علمی خاندان کے فرد تھے - جو تفرش کی سکونت ترک کرکے گنجہ میں اقامت پذیر ہوگیا تھا - مولانا یہیں پیدا ہوئے اور یہیں مدفون ہوئے - اُن کا سالِ ولادت و وفات مختلف فیہ ہے - لیکن قیاس یہ ہے کہ وہ ۵۳۵ھ اور ۵۳۹ھ کے لگ بھگ اس دارِ فنا میں آئے اور ۶۰۲ھ میں عالمِ بقا کی طرف راہی ہوئے - ڈاکٹر شفق کی تحقیق کے مطابق اُن کا سالِ رحلت ۵۹۹ھ ہے -

مولانا کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام علوم متداولہ میں کامل دستگاہ رکھتے تھے - اُن کے زہد و تقویٰ کا سب نے اعتراف کیا ہے - وہ جس طرح شعراء کی صف میں سربلند نظر آتے ہیں - عرفا کے گروہ میں بھی امتیاز رکھتے ہیں - اُن کی تصانیف میں قصائد و غزلیات کے علاوہ وہ پانچ مثنویاں ہیں جو فارسی ادب میں بے نظیر ہیں - اور جن کی تقلید کی ہر عہد میں کوشش کی گئی ہے - یہ پنج گنج یا خمسۂ نظامی کے نام سے مشہور ہیں - یہ مثنویاں اخلاقی، عشقیہ، تمثیلیہ اور رزمیہ ہیں - اور جس مبحث کو شاعر نے لیا ہے اس کا حق ادا کردیا ہے - اُن کی نازک خیالی اور شیریں کلامی کا سب کلمہ پڑھتے آئے ہیں - لیکن کہیں کہیں خیال اس قدر نازک ہے کہ شعر میں تعقید و اغلاق پیدا ہوگیا ہے -

ہم اُن کی پہلی مثنوی مخزن الاسرار سے جو اخلاقی مباحث پر مشتمل ہے - نعت نبوی کے اشعار نقل کرتے ہیں - فرماتے ہیں :-

اے مدنی برقع و مکی نقاب !　　سایہ نشیں چند بود آفتاب

گر نہی از ہر تو موئے بیار　　ور گلی از باغ تو بوئے بیار

منتظراں را بہ لب آمد نفس　　اے ز تو فریاد بہ فریاد رس

خیالات کی رفعت اور استعارات کی لطافت کے ساتھ عقیدت و محبت کا سمندر لہریں لے رہا ہے - کلام میں درد کی یہ کیفیت ہے کہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص پڑھے اور جذبات پر قابو رکھ سکے -

پانصد و ہفتاد نہ بس بود خواب روز بلند است بہ مجلس شتاب

سرکار! بہت آرام فرما چکے۔ ۵۷۰ سال کم نہیں ہوتے۔ دن چڑھ گیا ہے۔ اب مجلس میں تشریف لائیے اور امت کے حالِ زار پر نظر فرمایئے۔

سوئے عجم ران، منشیں در عرب زردہ روز اینک و شبدیز شب

لیل و نہار کے مرکب کو لیجئے اور عجم کی طرف بھی توجہ کیجئے۔ عرب میں مدت اقامت کافی ہو چکی۔

ملک برآرائے و جہاں تازہ کن ہر دو جہاں را پر از آوازہ کن

سکہ تو زن تا امرا کم زنند خطبہ تو خواں تا خلفا دم زنند

یعنی آجکل کے حکام (امراء ہوں یا خلفاء) جو آپ کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں در اصل غاصب ہیں۔ آپ تشریف لاکر اپنا سکہ چلائیے اور اپنا خطبہ پڑھیئے تاکہ اِن خود ساختہ مدعیوں کے حوصلے پست ہو جائیں۔

باز کش ایں مسند از آسودگاں غسل دہ ایں منبر از آلودگاں

اِن لوگوں نے آپ کی مسند پر قبضۂ مخالفانہ کر رکھا ہے۔ اور اپنے وجود سے آپ کے منبر کو ناپاک کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان سے مسند چھین لی جائے اور منبر کو پاک کیا جائے۔

واقعی اُس عہد کے جبابرہ کے خلاف اس جرأت سے زبان کھولنا مولانا ہی کا کام تھا۔ کاش ہم آج بھی اپنی تصویر اس آئینے میں دیکھتے!

مسلمانوں کے عام انتشار کا نقشہ کہ ایک طرف اپنے بھی گرم عناد ہیں۔ دوسری طرف غیر بھی آمادۂ فساد۔ کس خوبی سے کھینچا ہے۔ کہتے ہیں:۔

از طرفے رخنہ بہ دیں می کنند وز دگر اطراف کمیں می کنند

شحنہ توئی قافلہ تنہا چراست قلب تو داری علم آنجا چراست

یا علیئے در صف میداں فرست یا عمرے بر سر شیطاں فرست

انصاف سے کہئے امروز و دیروز میں کتنی مشابہت ہے کہ دونوں حذو النعل بالنعل نظر آتے ہیں۔ اللہ اکبر خسرو و شیریں کی نعت کا انداز بھی اپنی جگہ خوب ہے:۔

محمد کآفرینش ہست خاکش ہزاراں آفریں بر جان پاکش

چراغ افروزِ چشمِ اہلِ بینش! طراز کارگاہ آفرینش

سرو سرہنگ میدان وفا را سپہ سالار و سرخیل انبیاء را

یتیماں را نوازش در نسیمش از آنجا نام شد دُرِّ یتیمش!

بہ معنی کیمیائے خاک آدم بہ صورت توتیائے چشم عالم

خلفائے راشدینؓ شرع کی عمارت کی چار دیواری ہیں اور اُن کا فیض ابد تک ہے۔

سرائے شرع را چوں چار حد بست بنا بر چار دیوار ابد بست

آپ کی شریعت کا دَور دورہ قیامت تک رہیگا۔ اور آپ کے دین کے سامنے کسی دین کا چراغ نہ جل سکیگا۔

اساس شرع او ختم جہانست ! شریعتہا بدو منسوخ از آنست
بصر در خواب و دل در استقامت زبانش امتی گو تا قیامت !

حدیث میں فرمایا گیا ہے۔ تنام عینی ولا ینام قلبی۔ میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل جاگتا ہے۔ مصرع اول میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اس کے بعد حضورؐ کی خدمت میں یوں عرضِ حال کرتے ہیں:۔

بخدمت کردہ ام بسیار تقصیر چہ تدبیر اے نبی اللہ چہ تدبیر
کنم درخواستے زاں روضۂ پاک کہ یک خواہش کنی در کار ایں خاک
برآری دست از آں بُرد یمانی ! نمائی دست بُرد آنگہ کہ دانی !
کاہی بر نفسِ جامی کار بکشائے زنفس کافرش زنار بکشائے
اگرچہ جرم او کوہ گراں است تدار کہائے رحمت بیکراں است

اس جگہ اشعار تاثیر اور درد کے لحاظ سے بہت بلند ہو گئے ہیں۔ آخری شعروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ مولانا جامی نعت کے میدان میں آگے نکل گئے ہیں۔ لیکن وہ بھی نظامی ہی کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔

عطار، اور ان کے بعد رومی۔ سعدی اور خسرو ایسی ہستیاں ہیں۔ جن کو شاعری، خصوصاً تصوف و اخلاق کی شاعری کی روح رواں کہا جائے تو بجا ہے۔ ان کے یہاں نعت کا کلام بھی ہے اور خوب ہے۔ تاہم وہ بات نہیں جو خاقانی یا نظامی کے یہاں ہے۔

عطار۔ شیخ فرید الدین محمد نام۔ نیشاپور مولد۔ زمانۂ ولادت، اواسط قرنِ ششم۔ تاریخ وفات ۶۲۷ھ۔ عطار ثین اساطین تصوف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ کثیر التصانیف تھے۔ متعدد مثنویاں (جن میں منطق الطیر سب سے بہتر ہے) دیوان قصائد و غزلیات اور تذکرۃ الاولیاء (نثر) ان سے یادگار ہیں۔ ان کی شاعری تمام تر وحدۃ الوجود کی سرمستی سے لبریز ہے۔ اسی ایک مضمون کو وہ نئے نئے انداز سے باندھتے ہیں۔ مثنویات و قصائد میں پند و معرفت کے ساتھ نعتِ رسولؐ بھی ملتی ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے:۔

خواجۂ دنیا و دیں گنج وفا صدر و بدر ہر دو عالم مصطفٰے
آفتاب شرع و دریائے یقین نور عالم رحمۃ للعالمین
جان پاکاں خاک جان پاک او جاں رہا کن، آفرینش خاک او
خواجۂ کونین سلطان ہمہ آفتاب جان و ایمان ہمہ
صاحب معراج و صدر کائنات سایۂ حق، نور آں خورشید ذات

نعت کے بعد فرماتے ہیں کہ آپ کی رسالت ہر گروہ، ہر زمانے اور ہر جگہ کے لئے ہے۔ یہاں تک کہ انبیا علیہم السلام نے آپ کے امتی ہونے کی آرزو کی ہے۔ آخر میں اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے شفاعت کی طلب کرتے ہیں:۔

یا رسول اللہ بسے درماندہ ام باد برکف، خاک بر سر ماندہ ام
بیکساں را کس توئی در ہر نفس من ندارم در دو عالم جز تو کس

یک نظر سوئے منِ غمخوارہ کن — چارۂ کارِ منِ بیچارہ کن
اے شفاعت خواہِ مشتے تیرہ روز — لطف کن شمعِ شفاعت بر فروز
تاچہ پروانہ میانِ جمعِ تو — پر زناں آیم بہ پیشِ شمعِ تو

رومیؒ۔ مولانا جلال الدین محمد (۶۰۴-۶۷۲ھ) بن مولانا بہاؤ الدین۔ آپ کا مولد بلخ ہے۔ جہاں سے ہجرت کرکے آپ کا خاندان قونیہ میں سکونت پذیر ہوا۔ آپ کی عمر کا بڑا حصہ قونیہ میں گزرا اور وہیں مدفون ہوئے۔ مولانا نے تمام علوم عقلی و نقلی میں مہارت حاصل کی۔ پھر سید برہان الدین محقق ترمذی سے جو اُن کے والد ماجد کے شاگرد تھے سلوک کی تعلیم پائی۔ لیکن ذوق وجذب کی اصل زندگی کا آغاز اُس وقت ہوا جب ایک مجذوب صفت درویش شمس تبریزی کی صحبت اتفاق سے میسّر آئی۔ خود فرماتے ہیں:۔

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست — خام بُدم، پختہ شدم، سوختم

اُسی عہد کے جوش و خروش کا نتیجہ یہ شہرۂ آفاق مثنوی ہے۔ جس کو مشرق و مغرب کے تمام ناقدین نے سراہا ہے اور جس کے اسرارِ حِکَم کی توضیح کے لئے ہر زمانے میں بیسیوں شرحیں وجود میں آئی ہیں۔ مولانا کی یادگار ایک ضخیم دیوان بھی ہے۔ جو دیوان شمس تبریز کے نام سے مشہور ہے۔ اور جس میں جذب و شوق۔ سوز و گداز کی دنیا آباد ہے۔ نعت کا انداز یہ ہے:۔

سیّد و سرورِ محمدؐ نورِ جاں — بہتر و مہتر شفیعِ مجرماں
آں چناں گشتہ پُر از اجلالِ حق — کہ در وہم رہ نیابد آلِ حق
زاں محمدؐ شافعِ ہر داغ بود — کہ زِ مرمہ چشم او مازاغ بود
از المْ نشرح دو چشمش سرمہ یافت — دید آنچہ جبرئیل آں برنتافت
گر بگویم تا قیامت نعتِ او — ہیچ او را مقطع و غایت مجو

مثنوی میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوجہل نے آنحضرتؐ کو دیکھ کر کہا کہ (معاذ اللہ) بنی ہاشم میں ایسا بدصورت شخص پیدا نہیں ہوا۔ فرمایا۔ تو سچ کہتا ہے۔ اتنے میں حضرت صدیقؓ آئے اور عرض کی کہ اے آفتاب! دو عالم تیرے نور سے منوّر ہیں۔ ارشاد ہوا۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ حاضرین نے اس کی وجہ پوچھی تو:۔

گفت من آئینہ ام مصقولِ دست — تُرک و ہندو در من آں بیند کہ اوست

یعنی فرمایا۔ میں خدا کا صیقل کیا ہوا آئینہ ہوں۔ جس میں ہر کوئی اپنی صورت دیکھتا ہے۔ دوسری جگہ دسترخوان کا معجزہ کہ حضورؐ کے دست مبارک سے مس ہونے کی وجہ سے آگ سے محفوظ رہا۔ بیان کرکے فرماتے ہیں ؎

اے دلِ ترسندہ از نار و عذاب — باچناں دست و لبے کن اقتراب
چوں جمادے را چناں تشریف داد — جانِ عاشق را چہا خواہد کشاد

اے دل ایسے دست و لب سے قربت حاصل کر کہ تو عذاب نار سے محفوظ رہے۔ جب بے جان چیزوں پر آپؐ کا یہ کرم ہے تو عاشق پر جو بخشش ہوگی اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے۔

سعدیؒ کو جو شہرت اور مقبولیت خدا نے دی وہ شاید ہی کسی کو ملی ہو۔ ایران۔ ہندوستان۔ افغانستان اور

ترکستان میں چھ سو برس سے اُن کا کلام بچے بچے کی زبان پر رہا ہے۔ اُن کے ممدوح سعد بن ابوبکر بن سعد کو مؤرخ کے سوا کون جانتا ہے مگر ایشیا اور یورپ میں مشکل سے کوئی پڑھا لکھا ہوگا جو سعدی سے واقف نہ ہو۔ شیخ کا مولد و منشا شیراز تھا۔ وہ اغلباً ۶۰۶ھ کے قریب متولد ہوئے۔ اور طویل عمر پاکر ۶۹۱ھ میں رحلت فرما گئے۔ انہوں نے شیراز اور بغداد میں تحصیل علم کرنے کے بعد کئی سال سیاحت کی اور گرم و سرد روزگار کا تجربہ حاصل کیا۔ اُن کی تصانیف میں قصائد۔ غزلیات۔ مثنوی بوستاں اور گلستاں (نثر) صدیوں سے مقبول و متداول ہیں۔ اخلاقیات میں قصائد اور بوستاں کا خاص پایہ ہے۔ اُن کی غزلیں معاملہ بندی۔ شوخی۔ لطافت اور سلاست کے لحاظ سے بہت بلند ہیں۔ اسی وجہ سے ان کو پیمبر غزل کہا جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا اُن کی گلستاں سہل ممتنع عبارت کا بہترین نمونہ ہے۔ سعدی نے نعت میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی اُن کے دوسرے کلام کی طرح لطافت و ملاحت سے بھر پور ہے۔ زبان گویا چشمۂ کوثر میں دُھلی ہوئی ہے۔ اور اتنا زمانہ گزرنے پر بھی پُرانی نہیں معلوم ہوتی۔ چند اشعار پڑھیے اور لطف اُٹھائیے۔

اُن کے نعتیہ عربی شعر جو گلستاں میں درج ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دربار رسالت میں بھی مقبول ہو گئے۔

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ ۔۔۔ حسنت جمیع خصالہ صلّوا علیہ وآلہ

بوستاں میں جو نعتیہ اشعار ہیں وہ بھی حسن عقیدت اور حسن بیان میں لاجواب ہیں:-

کریم السجایا جمیل الشیم ! ۔۔۔ نبی البرایا شفیع الامم
امام رسل پیشوائے سبیل ! ۔۔۔ امین خدا مہبط جبرئیل
شفیع الوریٰ خواجہ بعث و نشر ۔۔۔ امام الہدیٰ صدر دیوان حشر
یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست ۔۔۔ کتب خانۂ چند ملت بشست

خدا کی شان تو دیکھو کہ وہ یتیم (روحی فداہ) جس نے کسی استاد سے قرآن نہ پڑھا تھا۔ اس مرتبہ پر فائز ہوا کہ متعدد مذاہب کے کتب خانے دھو ڈالے (کتابیں منسوخ کر دیں) جب حضورؐ معراج میں گئے تو جبرئیل جیسے مقرب فرشتے بھی پیچھے رہ گئے۔ حضورؐ دریافت فرماتے ہیں:-

چو در دوستی مخلصم یا فتی ۔۔۔ عنانم ز صحبت چرا تافتی

حضرت جبریلؑ عرض کرتے ہیں:-

اگر یک سر موئے برتر پرم ۔۔۔ فروغ تجلی بسوزد پرم

آخر میں سعدی نہایت خوبی سے عرض حال کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

چہ کم گردد اے صدر فرخندہ پے ۔۔۔ ز قدر رفیعت بہ درگاہ حے
کہ باشند مشتے گدایان خیل ۔۔۔ بہ مہمان دار السلام از طفیل

طیبات میں فرماتے ہیں:-

ماہ فرو ماند از جمال محمدؐ ۔۔۔ سرو نروید باعتدال محمدؐ
وعدۂ دیدار ہر کسے بہ قیامت ۔۔۔ لیلۃ الاسریٰ شب وصال محمدؐ
واں ہمہ پیرایہ بستہ جنت فردوس ۔۔۔ بو کہ قبولش کند بلال محمدؐ

سبحان اللہ! جنت اس توقع میں سجی بنی ہے کہ شاید محمد رسول اللہ کا غلام بلالؓ اس کو قبول کرلے۔

چشم مرا تا بہ خواب دید جمالش   خواب نگیرد مگر خیالِ محمدؐ
سعدی اگر عاشقی کنی و جوانی   عشقِ محمدؐ بس است و آلِ محمدؐ

سعدی کے ساتھ اگر سعدئ ہند امیر خسرو کا تذکرہ نہ کیا جائے تو بڑی ناانصافی ہوگی۔ یہ جامع الصفات انسان اس مرتبہ کا شاعر ہے کہ اہلِ ایران بھی اس کی عظمت کے اعتراف پر مجبور ہیں۔ خسرو کی متنوع حیثیتوں میں ہم صرف اُن کی شاعری خصوصاً نعتیہ شاعری پر مختصراً اظہارِ خیال کریں گے۔

امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین فتنۂ تاتار کے باعث اپنے وطن ترکستان سے نکل کر دہلی آئے اور دربار سے وابستہ ہوئے ۶۵۰ھ میں خسرو پٹیالی ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر سے شعر کی جانب میلان تھا۔ سن رشد تک متعدد السنہ و علوم میں اعلیٰ دستگاہ بہم پہنچائی اور پھر دربارِ دہلی سے منسلک ہو گئے۔ اُن کو اپنے شیخ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی بدایونی سے کمال ارادت تھی اور شیخ بھی ان پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ خسرو نے متعدد سلاطین دہلی کا زمانہ پایا۔ اور اُن کے مقرب رہے۔ آخر شیخ کی وفات کے چھ ماہ بعد ۷۲۵ھ میں سفر آخرت اختیار کیا۔ اُن کی تصانیف بہت ہیں۔ جن میں پانچ دیوان۔ دس مثنویاں۔ تین نثر کی کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔ وہ ہر صنفِ سخن پر قادر ہیں۔ اُن کی غزل میں سعدی کا۔ قصیدے میں کمال کا اور مثنوی میں نظامی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور وہ خود اپنے کو ان شعراء کا پیرو کہتے ہیں۔

ہم یہاں مطلع الانوار سے اُن کے نعتیہ کلام کا اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

چرخ کہ زیں سان عجب آراستند   بہرِ رسولِ عرب آراستند
احمدِ مرسل کہ نوشتہ قلم   حمد بہ نام وے و ختم ہم
زاں ازلی مکتب و اُمی لقب   عقلِ کل آموختہ لوح ادب
ہر سخنش کاملِ مسلمانی است   حاشیۂ نامۂ ربانی است

یعنی آپؐ کی ہر حدیث (جو اساس اسلام ہے) کلام اللہ کی تفسیر ہے۔

بارِ جہاں بر دل آں نازنیں   سینہ چناں نازک و بارے چنیں

آپ کا سینہ نہایت نازک ہے۔ اس کے باوجود تمام جہان کا بار (تمام امت کی فکر) اُٹھائے ہوئے ہے۔ سبحان اللہ!

چرخ کہ دورانش ز آبا نوشت   بر در او گشت ترابا نوشت

مشہور ہے کہ سرورِ عالم کا سایہ نہ تھا۔ اس کی کیا خوب توجیہہ کرتے ہیں:۔

سایۂ خویش آنکہ نہ کردیش نشر   داشتہ از پئے خورشید حشر
تا چو بسوزیم در آں آفتاب   خود فگنی سایہ بر اہلِ عذاب

یعنی سایہ کے ظاہر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ نے اس کو گرمیِ قیامت سے بچانے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ کہ جب گناہ گارانِ امت تابشِ آفتاب سے جلنے لگیں تو وہ سایہ اُن کے سروں پر ڈالا جائے۔

قوتِ ما دہ کہ پناہندہ ایم   نعمت ما بخش کہ خواہندہ ایم
من کہ بجاں تشنۂ جوئے توام   خسروم اما سگ کوئے توام

حقیقت یہ ہے کہ اس رنگ میں اگر کوئی شاعر نظامی کے قریب پہنچا ہے وہ امیر خسرو ہیں۔ البتہ مولانا جامی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ بعض اعتبارات سے نظامی سے بڑھ گئے ہیں۔

مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی ۸۱۷ ہجری میں ولایت جام (خراسان) میں متولد ہوئے۔ جامی تخلص اسی مناسبت سے اختیار کیا۔ نیز شیخ الاسلام احمد جام سے ارادت بھی اس کی محرک ہوئی۔ وہ ایک مدت تک علوم اسلامی کی تحصیل میں مشغول رہے پھر وادیٔ سلوک میں گامزن ہوئے۔ سلاطین و امرائے عہد خصوصاً سلطان حسین اور اس کا علم دوست فاضل وزیر علی شیر جامی کا بہت احترام کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ آخر عمر میں شاعری سے دست کش ہو گئے تھے۔ تاہم وہ ایران کے نامور شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ ناقدین کی رائے ہے کہ ان کے بعد خاک ایران سے کوئی بڑا شاعر نہیں اٹھا۔ اُن کی تصانیف نظم میں تین دیوان اور سات مثنویاں یادگار ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیات لطیف تغزل۔ عارفانہ مضامین اور شیرینی زبان ہیں۔ نعت میں یہ رنگ اور بھی لطف دے جاتا ہے۔

مولانا جامی ۸۹۸ھ میں ہرات میں واصل بحق ہوئے۔ یہاں اُن کی سب سے مشہور اور بلند پایہ مثنوی یوسف و زلیخا کے اشعار نعت نقل کئے جاتے ہیں:-

چہ نام است ایں کہ در دیوان ہستی　　برو نگرفت نامے پیش دستی

زبانم چوں ازو حرفے سر آید　　دل و جانم زلذت پر بر آید

چو نام اینست نام آور چہ باشد　　مکرم تر بود از ہر چہ باشد

جب حضورؐ کا نام لیتا ہوں تو دل و جان لذت سے معمور ہو جاتے ہیں (واضح رہے کہ نام اقدس لینے میں دونوں ہونٹ باہم مل جاتے ہیں) جب نام نامی اتنا پیارا ہے تو نام والے کی ذات گرامی کا کیا پوچھنا۔

سایہ نہ ہونے کی توجیہہ جامی کے یہاں بھی ملتی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ز سایہ بود برتر پایۂ او!　　زمین و آسمان در سایۂ او

تنش را بود از جاں پاک مایہ　　ندید از جاں کسے بر خاک سایہ

آپؐ کا جسم اقدس بھی روحانی لطافت کا مایہ دار تھا۔ اور ظاہر ہے کہ روح کا سایہ نہیں ہوتا۔

آگے چل کر جہاں حضور پُر نور سے التجا کرتے ہوئے شفاعت کے طالب ہوتے ہیں۔ وہ مقام درحقیقت لطافت و فصاحت درد و اثر کی معراج ہے۔ شاعری کا حسن۔ جذبات کی گرمی اور زبان کی شیرینی بیان سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقرب غلام خاص کیفیت سے متاثر ہو کر اپنے آقا سے ناز کر رہا ہے:-

ز مہجوری بر آمد جانِ عالم　　ترحم یا نبی اللہ ترحم!

نہ آخر رحمۃ للعالمینی　　ز محروماں چرا غافل نشینی

ز خاک اے لالۂ سیراب برخیز　　چو نرگس خواب چند از خواب برخیز

بروں آور سر از برد یمانی　　کہ روئے تست صبح زندگانی

شب اندوہ ما را روز گرداں　　ز رویت روز ما فیروز گرداں

بہ تن در پوش عنبر بوئے جامہ　　بسر بر بند کافوری عمامہ

فرو د آویز از سر گیسواں را | فگن سایہ بپا سرو رواں را
ادیم طائفی نعلین پا کن | شراک از رشتۂ جانہائے ما کن

سرکار ہم ہجر کے مارے ہوئے جاں بلب ہیں - آپ رحمۃ للعالمین ہیں - خدا کے لئے اُٹھئے اور ہم غم نصیبوں کی خبر لیجئے — نرگس کی طرح خواب راحت کب تک ؟ بُردِ یمانی سے سر نکالئے اور اپنے دیدار سے ہماری تیرہ روزی کو روشن طالعی سے بدل ڈالئے - للہ اُٹھیئے اور اس شان سے کہ جسم اقدس میں عنبر سے بھرا ہوا پیرہن ہو - سرِ اطہر پر کافوری عمامہ ہو - اور گیسوئے پاک جو کبھی تا بنا گوش ہوتے تھے اور کبھی تا سر دوش، ادھر ادھر لٹک رہے ہوں - اسی کے ساتھ پائے مبارک میں طائف کی نعلین ہوں - یہ نعلین بغیر تسمے کے نہیں پہنی جاتیں - درست - مگر تسمے کی کیوں فکر کیجئے - آخر ہم غلاموں کے رشتہ ہائے جاں کس مصرف کے لئے ہیں -

اللہ اللہ کیا اہتمام ہے اور کس لطف کے ساتھ - ہمارے خیال میں غیر ممکن ہے کہ کوئی درد مند دل ان اشعار کو پڑھے اور جی نہ بھر آئے -

جہانے دیدہ کردہ فرش راہند | چو فرش اقبال پابوس تو خواہند
ز حجرہ پائے در صحن حرم نہ | بہ فرق خاک رہ بوساں قدم نہ

اگر فرش کی ضرورت ہو تو آئیے - طالبانِ دید نے آنکھیں فرش راہ کر دی ہیں - کہ شاید اسی بہانے سے دولت پابوس نصیب ہو جائے - آپ بے تکلف حجرہ مقدسہ سے نکل کر صحن حرم میں تشریف لائیے اور مہجوروں کو شاد کام فرمائیے -

اگرچہ غرق دریائے گناہم | فتادہ خشک لب برخاک راہم
تو ابر رحمتی آں بہ کہ گاہے | کنی بر حال لب خشکاں نگاہے

روایتی Tantalus کی طرح میں دریا (گناہ) میں غرق ہو کر بھی خشک لب پڑا ہوں - مگر جانتا ہوں کہ حضور ابر رحمت ہیں - اگر آپ کے کرم کا چھینٹا پڑ جائے تو یہ پیاس بجھے -

مولانا جامی کی وفات سے ۵۶ برس کے بعد فیضی آگرہ میں پیدا ہوا - جو شیخ مبارک کا فرزند اکبر اور علم و فضل، ذہانت و فراست میں یگانۂ روزگار تھا - مختلف علوم اور زبانوں میں ید طولیٰ رکھتا تھا - اور متعدد تصانیف کا مالک تھا - اکبر کے تقرب سے بہرہ مند - اور خطاب ملک الشعرائی سے سر بلند - ۱۰۰۴ھ میں راہیٔ عدم ہوا - اس کی تمام تصانیف کا ذکر اور رائے طوالت سے خالی نہیں - یہاں ہم صرف اس کی شہرۂ آفاق مثنوی نل دمن سے کچھ اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں -

یہ وہ مثنوی ہے جو اس نے اکبر کی فرمائش پر مولانا نظامی کی لیلیٰ مجنوں کے جواب میں لکھی تھی - اور جس کے بارے میں اس عہد کے مشہور حق گو ناقد و مورخ ملا عبدالقادر بدایونی نے جو فیضی کے سخت مخالف ہیں کہا ہے کہ :-

"الحق مثنوی ایست کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند دیگر کسے نگفتہ باشد"

یہ مثنوی ۱۰۰۲ ہجری میں تصنیف ہوئی تھی - نعت کے اشعار میں بھی وہی خیالات کی نزاکت - تشبیہات کی ندرت اور جوش بیان ہے - جو فیضی کا خاصہ ہے - کہتا ہے :-

آں مرکزِ دورِ ہفت جدول　　گردابِ پسین موجِ اوّل
چابک قدمِ بساطِ افلاک　　والاگہرِ محیطِ لولاک
از آیتِ کبریا مؤیّد!　　سرِ لشکرِ انبیاءؑ محمدؐ
ہم مطلعِ اوّلِ سباعی　　ہم مصرعِ آخرِ رباعی

ترکیبیں کتنی نادر ہیں کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ حضور رسولِ مقبول سباعی (ہفت افلاک) کا مطلعِ اول بھی ہیں اور رباعی (اربعِ عناصر) کا مصرعہ آخر بھی۔ کہ آپ کا نور سب سے پہلے اور ظہور سب سے آخر میں ہوا۔ واضح رہے کہ رباعی کا آخر مصرع تمام رباعی کی جان ہوتا ہے۔

قصرِ جبروت آشیانش　　بامِ ملکوت آستانش
ہم از دو جہاں تہی و ہم پُر　　ہم ساحل و ہم محیط و ہم دُر
اسرارِ ازل خزینۂ او　　محرابِ ابد مدینۂ او
بنیانِ عرب زخانۂ او　　تختِ عجم آستانۂ او
بُت خانہ سپردۂ پئے او　　آتش کدہ گشتہ خوئے او

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترکیبیں ڈھلی ڈھلائی اور بنی بنائی اُس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ اور وہ جس کو چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے صرف کرتا ہے۔ گویا نگینے ہیں کہ جوہری نے جہاں مناسب سمجھا اُن کو جڑ دیا۔

فیضی کا معاصر اور اُس سے عمر میں چھوٹا مگر شاعری میں بڑھا ہوا عرفی شیرازی ہے۔ جو شیراز میں پیدا ہوا۔ آگرہ میں رہا۔ لاہور میں مرا۔ اور نجف میں دفن ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ عین جوانی میں (بہ عمر ۳۶ سال) زہر سے اس کی موت واقع ہوئی۔ (۹۹۹ھ) اس کی تصانیف میں ایک کلیات۔ قصائد و غزلیات۔ اور دو مثنویاں اور ایک رسالہ تصوف موسومہ بہ نفسیہ ہے۔ رفعتِ تخئیل۔ ندرتِ استعارات زورِ کلام اور اختراعِ تراکیب میں اس کا مقام مسلّم ہے۔ کلامِ نعت میں اِن اوصاف نے جوشِ عقیدت اور حسنِ طبیعت کے ساتھ مل کر عجیب سماں پیدا کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ عرفی خواب میں سرورِ عالم کی زیارت سے مشرف ہوتا ہے۔ بیدار ہو کر اپنے جذبات مسرت و ارادت کو اپنے مشہور قصیدے میں جس کا مطلع یہ ہے ؎

سپیدہ دم چو زدم آستیں بہ شمعِ شعور　　شنیدم آیتِ استغفروا ز عالمِ نور

پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ عالمِ خواب میں شاہدِ بزمِ ازل (حق سبحانہٗ) نے میری دستگیری کی اور صفۂ سرائے سرور میں مجھے طلب کیا۔ کمالِ جذبۂ لطف ہاتھ تھام کر مجھے ایک ایسی بزمِ قرب میں لے گیا جہاں کا سایہ بھی نور سے کم نہ تھا۔ وہاں پُر تکلف فرش بچھے ہوئے تھے۔ جن پر خاصانِ درگاہ جلوہ افروز تھے۔ اس بزم کی صدر نشین ایک ذاتِ قدسی تھی۔ جس کا نورِ جمال سب پریوں چھایا ہوا تھا جیسے آفتاب ستاروں پر۔ میں حیران تھا کہ الٰہی یہ کون مقرب درگاہ ہے۔ کہ آواز آئی۔ اے بے بصیرت تُو نے ہماری ہدایت کا سرمہ بارہا لگایا۔ پھر بھی تیرے دیدۂ معنی میں روشنی نہ آئی۔ خیر ہمارے آستانے پر اس محترم ہستی کی راہ کی گرد ہے جس کا ہر ذرہ چشمۂ نور ہے۔ پہلے اُن کے قدموں سے اجازت لا۔ تب یہ سرمہ تجھے مل سکتا ہے۔ کیونکہ یہ وہ سرمہ ہے جس کی حوریں بھی زیرِ بارِ احسان ہیں۔ ارے بے صبر! تُو تو گھبرا گیا۔ لے دل تھوڑا نہ کر۔ سُن۔ یہ طرازِ صورت و معنی محمدِ عربی ہیں۔ کہ اگر یہ نہ ہوتے تو عالمِ وجود میں نہ آتا۔ اب تو تجھے معرفت حاصل ہو گئی۔ جا اور اُس سرمہ کی مدد سے کوئی لائق

تحفہ تلاش کرکے لا۔ اس پر میں (عرفی) نے ذیل کا مطلع لکھا:-

زہے لوائے نبوت ز نسبتت منصور　　　مزاجِ عشق ز آمیزشِ دلت رنجور

نبوت کا علَم آپ کی نسبت سے فتح و ظفر سے متصف ہے۔ مزاجِ عشق (جو خود گرم ہوتا ہے) آپ کے دل کی گرمی کے اثر سے رنجور ہو گیا ہے۔ اگر آپ نور کو ٹھہرنے کا اور سایہ کو جانے کا حکم دیں تو نور و سایہ جو ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔ جدا رہنے پر مجبور ہو جائیں۔ آپ کے باغ طبیعت میں عقل کا ہما باغ کی چڑیوں کے زیر سایہ رہنے کا آرزومند ہے۔ اگر چاند آپ کی جبینِ انور سے کسبِ نور کرے تو کامل النور ہو جائے اور ماہ و سال کا حساب جو اب تک چاند سے متعلق ہے سورج کے سپرد ہو جائے۔ اگر ابر پر آپ کا شعلۂ قہر پڑے تو ابر تو ایک طرف، اس کے اندر جو برق ہے وہ جل کر خاک ہو جائے اور ہوا کے دوش پر ماری ماری پھرے۔

ان اشعار سے شاعر کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ کلام میں تصنع بھی ہے۔ مگر عقیدت میں شبہ نہیں۔ اس کا افسوس ہے کہ کہیں کہیں جادۂ شریعت سے ہٹ جاتا اور غلو تک پہنچ گیا ہے۔ آخر میں اپنے گناہوں کا ذکر کرتے ہوئے شفاعت کا خواستگار ہوتا ہے:-

نعوذ باللہ اگر روزِ حشر طے نکند　　　شفاعت تو عمل نامۂ اناث و ذکور

ز شرمِ کثرتِ عصیانِ من بہ رعشہ فتند　　　حساب گاہ قیامت چو ارضِ نیشاپور

خدا نہ کرے اگر قیامت میں آپ کی شفاعت عفو گناہ کی ضامن نہ ہوئی تو ڈر ہے کہ میرے گناہوں کی کثرت کی شرم سے میدان حشر میں زمین نیشاپور کی طرح بھونچال آ جائے گا۔

واضح رہے کہ نیشاپور کے علاقے میں اکثر بھونچال آیا کرتے ہیں۔

ایک دوسرے قصیدے میں فخریہ مضامین کے بعد جن سے عرفی کو خاص شغف ہے بڑے ناز سے کہتا ہے۔ کہ اب میرا دور ہے۔ زمانے سے کہو کہ از سر نو مسندِ جم میرے لئے آراستہ کرے۔ پھر چونکتا اور کہہ اٹھتا ہے۔ نہیں نہیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ زمانے کی کیا حقیقت ہے جو مداحِ شہنشاہ عرب و عجم کے لئے مسند سجائے۔ یہیں سے گریز شروع ہوتا ہے۔ کہتا ہے:-

روزے کہ شمردند عدیلش ز محالات　　　تاریخ تولد بنوشتند عدم را

مطلب یہ ہے کہ محالات کو ایک عالم فرض کیا جائے۔ جہاں رسولِ کریم کا عدیل (ہمسر) پیدا ہوتا ہے اور اس کی تاریخ ولادت "عدم" قرار پاتی ہے۔ اس میں لطف یہ ہے کہ عدیل اور عدم کے اعداد برابر ہیں۔

انعام تو بر دوختہ چشم و دہن آز　　　احسان تو بشگافتہ ہر قطرۂ یم را

آپ نے دنیا پر اتنی بخشش کی کہ حرص کی نیت بھر گئی۔ اور آپ کی سخاوت نے ہر قطرۂ بحر کو چیر کر دیکھ لیا (کہ آیا اس میں موتی بننے اور لوگوں کو عطا کئے جانے کی صلاحیت ہے یا نہیں) یعنی اب سمندر میں موتی باقی نہیں رہے۔

آگے چل کر کہتا ہے کہ آپ کا شرف ذاتی ایسا ہے کہ جب آپ عالمِ غیب سے عالمِ شہادت میں جلوہ افروز ہونے والے تھے تو آپ کے لئے حکمِ نزولِ دنیا لکھتے وقت کاتبِ تقدیر نے سو سو بار قلم تراشا۔ مراد یہ ہے کہ یہ امر اہم تھا اس لئے کاتبِ تقدیر نے ایسا کیا۔ یا اس کو آپ کی مفارقت گوارا نہ تھی۔

فارسی شاعری کے آخری دور میں دو باکمال پیدا ہوئے۔ ایران میں قاآنی اور ہندوستان میں غالب۔ جنہوں نے شعر کے قالبِ مردہ میں جان ڈال دی۔ اور بالخصوص نعت کا ترانہ اس بلند آہنگی سے چھیڑا کہ در و دیوار گونجنے لگے۔

قاآنی کا نام مرزا حبیب ہے۔ وطن شیراز۔ ۱۲۰۰ھ میں منزلِ اشباح میں قدم رکھا اور ۱۲۷۰ھ میں عالمِ ارواح کی جان
سدھارا۔ تمام علومِ مروجہ میں اعتبار اور عربی، فارسی، ترکی، فرانسیسی پر کامل اقتدار رکھتا تھا۔ سلاطین قاچار کا مقرب او
مداح تھا۔ واقعات کی تصویر کشی۔ کلام کی روانی۔ مترادفات کی کثرت، الفاظ پر قدرت، جوشِ بیان، ندرتِ تشبیہات او
موسیقیت میں اس کا جواب نہیں۔ نعت کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

نقطۂ پرکارِ ہستی خطِ پرکارِ وجود　　　قطبِ گردونِ کرم توقیعِ طغرائے ثواب
سرورِ عالم ابوالقاسم محمدؐ آنکہ چرخ　　　باوجودِ او بود چوں ذرہ پیشِ آفتاب
الذی رُدّت الیہ الشمس والشقّ القمر　　　کان امّیا ولکن عندہ امّ الکتاب
والذی فی کفّہ الکفار لما ابصروا　　　کلّمہ الحصباءُ قالوا انّہ شئٌ عجاب

ایسے صاحبِ اعجاز رسولؐ جن کے لئے رجعتِ شمس اور شق القمر وقوع میں آئے۔ جو امّی تھے لیکن ام الکتاب رکھتے تھے
جن کے کفِ مبارک میں کنکریوں کو بولتے دیکھ کر کفار پکار اُٹھے کہ یہ تو بڑی عجیب چیز ہے۔
جن کی خاطر تمام مخلوقات وجود میں آئی۔ یعنی:۔

نہ سپہر و شش جہات و ہفت دوزخ ہشت خلد　　　با سہ مولود و دو عالم چار مام و ہفت باب

ایک قصیدے میں جس کا مطلع ہے:۔

شبے بروشنی از آفتاب روشن تر　　　سہیل و پروین تابندہ اندریں منظر

معراج کی تفصیل بیان کی ہے۔ اور حضرت جبرئیلؑ کا آنا۔ حضورؐ کو ہمراہ لے جانا۔ سدرہ پر جبرئیلؑ کا ٹھہر جانا۔ استفسار پر کہنا ک
اگر میں ایک قدم بڑھاؤں تو جل کر خاک ہو جاؤں۔ اس کے بعد آپؐ کا قربِ الٰہی کے اعلیٰ درجات پر فائز ہونا نہایت صفائی او
روانی سے دکھایا ہے۔ یہاں تک کہ:۔

بہ علّے شد کانجا نہ اسم بود و نہ رسم　　　بہ محفلے شد کانجا نہ خواب بود و نہ خور

اس مقام پر شاعر اپنے مسلک کے خلاف وحدۃ الوجود کی وادی میں کھو جاتا ہے اور اگرچہ اس کی توجیہہ کرتے ہوئے خو
کہتا ہے کہ اس کو اتحادِ حلولی پر محمول نہ کیا جائے۔ بلکہ یہ اتحادِ وجودی ہے۔ جیسے صفت اور موصوف میں ہوتا ہے۔ کہ دونوں می
ذہنی مغایرت سہی مگر وجوداً مغایرت نہیں ہوتی۔ تاہم یہ سخت مزلّۃ الاقدام ہے اور ہم جیسے ظاہر بینوں کو یہاں سے
قدم سنبھالے ہوئے گزر جانا ہی اولیٰ ہے۔
چند شعر اور ملاحظہ ہوں:۔

شاہے کہ برتر است ز لولاک افسرش　　　تشریفِ کبریاست ز دادار در برش
اقبال و بخت شاطرِ میدان رفرفش　　　خورشید و ماہ خادمِ شبّیر و شبّرش
شامِ ابد جنیبۂ موئے مجعّدش　　　صبحِ ازل طلیعۂ روئے منوّرش
شب چہرۂ سیاہ بلالِ مؤذّنش　　　مہ غرّۂ جبینِ براقِ تگاورش

یہ حقیقت ہے کہ قاآنی الفاظ کا بادشاہ ہے۔ شعر میں بلا کے ٹکڑے اس خوبی سے لاتا ہے کہ اس کی قدرتِ کلام
ایمان لانا پڑتا ہے۔ اور سنئے:۔

موجے بود فلک ز محیطِ عنایتش — فوجے بود ملک ز سپاہِ مظفرش
قلبے بود مجسم فرخندہ قالبش — روحے بود مصور زیبندہ پیکرش
گردوں مجلہ ایست براثبات معجزش — کیواں محلہ ایست ز اقطاع کشورش

جیسا کہ اُوپر گزرا مرزا غالب قاآنی کے ہمعصر ہیں۔ اور جس طرح ایران کی کلاسیکل شاعری کا خاتمہ قاآنی پر ہوا۔ ہندوستان میں غالب رنگِ قدیم کے خاتم ہوئے۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب نام و تخلص۔ اکبر آبادی مولد، اور دہلوی مسکن و مدفن۔ سالِ ولادت ۱۲۱۲ ہجری اور تاریخِ وفات ۱۲۸۵ھ ہے۔ مرزا مبدءِ فیاض سے دل و دماغ کی وہ اعلیٰ صلاحیتیں لے کر آئے تھے کہ فارسی۔ اُردو۔ نظم۔ نثر میں جو لکھ گئے اس کی نظیر نہیں۔ جو سُنتا ہے سر دُھنتا ہے۔ خود کہتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی شاعری ایک ترک لاچین (خسرو) سے شروع ہوئی اور ایک ترک ایبک (غالب) پر ختم ہو گئی۔ وہ شروع میں بیدل کے مقلد تھے۔ بعد کو اساتذۂ ایران کی پیروی کی۔ اور حق یہ ہے کہ اُن سے پیچھے نہیں رہے۔

یہاں ہمیں اُن کی تمام تصانیف سے بحث نہیں۔ صرف اُن کی فارسی نعت موضوعِ سخن ہے۔ مرزا کی ایک نعتیہ غزل ہے۔ لطافت و سلاست میں نہایت بلند ہے اور جس کا تقریباً ہر شعر کسی نہ کسی آیت یا حدیث کی تفسیر ہے۔

حق جلوہ گر ز طرزِ بیانِ محمدؐ است — آرے کلامِ حق بہ زبانِ محمدؐ است — (وما ینطق عن الھوی۔ ان ھو الا وحی یوحی)
آئینہ دار پرتوِ مہر است ماہتاب — شانِ حق آشکار ز شانِ محمدؐ است — (اذا رُءوا ذُکِر اللّٰہ)
تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است — اما کشادِ آں ز کمانِ محمدؐ است — (ما رمیت اذ رمیت ولکن اللّٰہ رمی)
دانی اگر بہ معنیٔ لولاک وارسی — خود ہر چہ از حق است از آنِ محمدؐ است — (لولاک لما خلقت الافلاک)
ہر کس قسم بدانچہ عزیز است می خورد — سوگندِ کردگار بجانِ محمدؐ است — (لعمرک ......)
واعظ حدیثِ سایۂ طوبیٰ فرو گزار — کایں جا سخن ز سروِ روانِ محمدؐ است
بنگر دو نیمہ گشتن ماہِ تمام را! — کاں نیمہ جنبشے ز بنانِ محمدؐ است — (اقتربت الساعۃ وانشق القمر)
ور خود ز نقشِ مہرِ نبوت سخن رود — آں نیز نامور ز نشانِ محمدؐ است — (کان انہ خاتم مثل زر الحجلۃ)
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم — کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است

ایک قصیدے میں تعلّیٔ شاعرانہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا جب ہم سفرانِ منزلِ سخن مجھ سے غبار رکھتے تھے۔ اب تو میں شعرائے ماضی سے بھی آگے نکل گیا ہوں۔

سنج شوکتِ عرفی کہ بود شیرازی — مشو اسیرِ زلالی کہ بود خوانساری
بہ سومنات خیالم در آ تا بینی — رواں فروز بر دوش ہائے زناری

پھر گریز میں فرماتے ہیں۔ جب دشمنانِ نبیؐ کو جلانا منظور ہوتا ہے تو میرے پردۂ نفس سے دوزخ جوش مارنے لگتی ہے۔ اور جب نعتِ رسولؐ کے خوان کی ریزہ چینی کرتا ہوں تو میرے گوشۂ چادر سے جنت بکھر جاتی ہے۔ آگے چل کر حدوث و قدم کی نازک بحث چھیڑ دیتے ہیں۔ پھر خود ہی متنبہ ہو کر کہتے ہیں۔

چنیں کہ می نگرم جلوہ حجاب گداز — چہ مشکل است دگر خویشتن نگہداری

مے مشاہدہ پُر زور و من زسادہ دلی خورم چو بیش، کنم حرص بیشتر خواری
سخن بذاقِ دگر یافت، شور شے دارد نمک فشانی مستی بہ مغز ہشیاری
عناں گسیختہ بیراہہ تاختن تا چند بہ شرع پیچم و گردم بہ پویہ ہنجاری

یہاں سے مطلع ثانی کا آغاز ہوتا ہے۔

زہے زحرف تو اندیشہ را مددگاری خرد بہ سایۂ شرعت زفتنہ زنہاری

اس کے بعد حضورؐ سے اہلِ زمانہ کی شکایت کرتے ہیں :-

چو فتنہ جامع قانونِ عالم آشوبی چو غمزہ صاحب فرہنگ مردم آزاری
فگندہ دلو و رسن را بہ چاہ و بر سر چاہ شکستہ اند سبوئے مرا بہ سرشاری

ان ظالموں نے ڈول رسّی تو کنوئیں میں ڈال دیا ہے اور کنوئیں کی من پر میرا گھڑا توڑ دیا ہے۔

لیکن۔ ننالم از ستم غیر، برتو یاد کہ من مرا بہ دستِ من دیوسار نگزاری!

ایک جگہ کہتے ہیں میرے شوق کا تقاضا تھا کہ نعتِ نبیؐ میں دل کا حوصلہ نکالوں۔ مگر ادب نے مجھے سرزنش کی اور کہا :-

ہر چند شوق تشنۂ عرضِ عقیدت است اما تو و ستایش ممدوح کردگار
از ناکسی بنال و جبیں بر زمیں بسائے کلک و ورق بیفگن و دست دعا برآر

دوسری جگہ بڑے پُراثر انداز میں کمال حسرت کیساتھ اپنی کوتاہیوں اور کج رائیوں کو یاد اور سرکار مدینہ سے فریاد کرتے ہیں :-

فریاد رسا، داد ز بے برگیٔ ایماں کایں نخل بہ تاراج فنا رفت خزاں را
در خویشتن ایماں شمرم لیک از اں دست کاندر تن محبوب شمارند میاں را

یہ کیسے کہوں کہ ایمان نہیں رکھتا۔ ہاں ایسا ہی ہے جیسے حسینوں کی کمر۔

از عمرِ چہل سال بہ ہنگامہ سر آمد سرمایہ بہ بازیچہ تلف گشت دکاں را
روز آخر و من سست پے و قافلہ پس دور در باختہ ام از غم رہ تاب و تواں را

پھر کہتے ہیں میری غفلت دیکھئے کہ طاعت نہیں کرتا اور خدا کا کرم دیکھئے کہ رزق برابر دیئے جاتا ہے۔ جب میں روٹی کھاتا ہوں تو تن شرم سے پگھل جاتا ہے کہ اگر چاہوں تو آبِ شرم سے ہاتھ منہ دھولوں۔ آہ میں رُخ و گیسوئے صنم کا زناری اور رسم و راہ مغاں کا پجاری۔ نہ سجدے میں سر و پا کا ہوش۔ نہ روزے میں شوال و رمضان کا امتیاز۔ یہ مانا کہ میرا وجود سراپا سجود ہے۔ لیکن اگر حشر میں سجدے کا نشان پیشانی میں ڈھونڈا گیا تو میں کیا جواب دوں گا۔

گیرم کہ نہادم بود از سجدہ لبالب اے وائے گر از ناصیہ جویند نشاں را

آخر میں کہتے ہیں :-

شرع آں ہمہ خود بین و من ایں مایہ سبک سر کز ساقیٔ کوثر طلبم رطل گراں را

یہ ناتمام بحث اور بھی ناتمام رہ جائے گا اگر ہم دورِ حاضر کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال کے بارے میں یہاں مختصر طور پر اظہار خیال نہ کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس صدی میں عربی، فارسی، ترکی، اُردو، پشتو کسی زبان نے اتنا عظیم الشان شاعر پیدا نہیں کیا۔ شاعر ہی نہیں۔ وہ ایک فلسفی، مفکّر، مصلح اور مجدّد کی شان رکھتے تھے۔ مشرق و مغرب کے افکار اور

علومِ اسلام کے اسرار پر اتنی گہری نظر رکھنے والے ہند و پاکستان تو درکنار بلادِ شرق میں محدود سے چند ہی ہوں گے.

اقبال جو اصلاً ایک کشمیری برہمن خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۱۲۹۰ھ میں سیالکوٹ میں زینت فزائے ہستی ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اسکول اور کالج میں داخل ہوئے اور لاہور سے ایم اے کیا۔ بعد ازاں یورپ جاکر فلسفہ میں ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ انہوں نے شروع میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مگر بعد کو بیرسٹری کا آزاد پیشہ پسند کیا جو آخر میں مسلسل ناسازیِ طبیعت کی وجہ سے ترک کرنا پڑا۔ اُن کی علمی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے ان کو "سر" کے خطاب سے نوازا۔ اور علی گڑھ اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں نے اُن کو اعزازی ڈاکٹری پیش کی۔

اقبال شروع سے علم و ادب کا ذوق اور اس سے زیادہ اسلام اور ملتِ اسلام کا درد رکھتے تھے۔ اسی جذبہ کے تحت انہوں نے دوسری تصانیف کے علاوہ فارسی اور اردو میں کئی قابل قدر اور بے مثل مجموعہ ہائے نظم چھوڑے۔ آخر ۶۰ برس کی عمر میں ۱۳۵۷ھ میں عہدِ حاضر کا یہ مفکرِ اعظم راہیِ عدم ہوا۔ ان کی شاعری (خصوصاً فارسی شاعری) کے بارے میں زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھئے کہ ان کے خیالات نہیں آسمان کے تارے ہیں جو وہ توڑ کر لائے ہیں۔ اور زبان نہیں بلکہ چشمۂ کوثر کی لہریں ہیں جو اپنے اندر آبِ حیات کی بوندیں چھپائے ہیں۔ اقبال بڑے عاشقِ رسول تھے۔ اور رسولِ پاک کا ذکر سُن کر اپنے گریہ بے اختیار کو ضبط نہ کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں اُن کے کلام میں وصفِ رسول آگیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ چند نمونے ملاحظہ ہوں:-

عاشقی آموز و محبوبے طلب چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب
کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے بوسہ زن بر آستانِ کاملے
شمعِ خود را ہمچو رومی بر فروز روم را در آتشِ تبریز سوز

اُس معشوق کے ڈھونڈنے کے لئے کہیں دُور جانا نہیں پڑے گا۔

ہست معشوقے نہاں اندر دلت چشم اگر داری بیا بنمایمت

آگے کھُل کر کہتے ہیں:-

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ ست آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ ست
بوریا ممنونِ خوابِ راحتش تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش

امیر مینائی مرحوم نے اسی مضمون کو کیا خوب ادا کیا ہے:-

دولتِ دُنیا خاک برابر، ہاتھ کے خالی دل کے تونگر صاحبِ کشور تخت و افسر صلی اللہ علیہ وسلّم

در شبستانِ حرا خلوت گزید قوم و آئین و حکومت آفرید
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز دیدۂ او اشکبار اندر نماز

بیشک انسانِ کامل کی یہی شان ہے کہ ایک طرف میدانِ جنگ میں اس کی تلوار آگ برسائے اور دوسری طرف عبادت میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ جائے۔ جیسا کہ عرب شاعر نے کہا ہے:-

هو البكّاء في المحراب ليلاً هو الضحّاك في يوم الطعان

پھر فرماتے ہیں:-

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کشاد ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد

آپؐ نے دین کی کنجی سے دُنیا کا دروازہ کھولا۔ یعنی آپؐ کی شریعت کے بموجب جائز دُنیا سے دین کا جزو ہے۔ یقیناً ایسا جامع معلّم عالم کے بطن سے آج تک پیدا نہیں ہوا۔

درنگاہ او یکے بالا و پست   با غلام خویش بر یک خواں نشست

اس کے بعد پیر کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حضورؐ کے روبرو قبیلۂ طے کے قیدیوں میں سفانہ دختر حاتم طائی پیش ہوئی۔ سفانہ مقیّد تھی اور چادر سر پر نہ ہونے کی وجہ سے شرم سے سر نہوڑائے ہوئے تھی۔ حضورؐ نے جب اس کو بے پردہ دیکھا تو فوراً اپنی چادر مبارک عطا کی۔ اس واقعہ سے اقبال نے جو نتیجہ اخذ کیا ہے۔ وہ کس درجہ دردانگیز اور پُر تاثیر ہے:۔

ما ازاں خاتون طے عریاں تریم   پیش اقوام جہاں بے چادریم
روز محشر اعتبار ماست او   درجہاں ہم پردہ دار ماست او

آہ آج ہم مسلمان اُس خاتون سے بڑھ کر عریاں اور دُنیا کی قوموں کے سامنے بے چادر ہیں۔ کاش اُس رافت و رحمت والے آقاؐ کا کرم ہماری لاج رکھ لے۔

مولانائے رومؒ نے ایک نہایت مزے کی بات کہی ہے کہ کسی معشوق نے اپنے عاشق سے جو طویل سیاحت کے بعد وارد ہوا تھا پوچھا کہ تم نے تو سینکڑوں بڑے بڑے شہر اور قابلِ دید مقامات سفر میں دیکھے ہوں گے۔ ع

پس کدامیں شہر از آنہا خوشتر است

یہ تو کہو اُن میں سب سے زیادہ کون شہر پسند آیا۔ جواب سُننے کے قابل ہے:۔

گفت آں شہرے کہ دروے دلبر است

جہاں تم ہو وہی شہر سب سے زیادہ پسند ہے۔ مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں۔

اقبال کا نقطۂ نظر بھی اہلِ دل سُنیں اور داد دیں۔

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است   اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ اگر عشق رسولؐ کا دعویٰ ہے تو کامل تقلید کرنی ہوگی۔ دیکھو بایزید بسطامی نے عمر بھر اس بنا پر خربوزہ کھانے سے پرہیز کیا کہ اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ حضورؐ نے اس کو کس طریقے سے کھایا تھا۔

رموزِ بے خودی میں کہتے ہیں:۔

ما ز حکم نسبت او ملّتیم !   اہلِ عالم را پیام رحمتیم
از میانِ بحرِ او خیزیم ما !   مثلِ موج از ہم نمی ریزیم ما
اُمّتش در حرز دیوارِ حرم   نعرہ زن مانند شیراں در اجم

آخری شعر امام بوصیری کے شعر ذیل سے ماخوذ ہے:۔

احلّ امۃ فی حرز ملتہٖ   کاللیث حلّ مع الاشبال فی اجم

آپ نے اپنی امت کو اپنے دین کے حصار میں اس حفاظت سے اُتار دیا ہے جیسے شیر اپنے بچوں کیساتھ نیستاں میں اُترا ہوا ہے۔

اقبال کی آخری تمنا تھی کہ قسمت حجاز پہنچائے اور روضۂ نبویؐ کی زیارت کا شرف ہاتھ آئے۔ یہ تمنا ارمغانِ حجاز کے ایک ایک لفظ میں جس طرح جھلک رہی ہے وہ قابلِ دید ہے:۔

بہ ایں پیری رہ یثرب گرفتم ! | نوا خواں از سرورِ عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام | کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

بڑھاپے میں بڑے ذوق وشوق سے عازمِ طیبہ ہوں۔ اُس مُرغ کی طرح جو سرِ شام صحرا میں آشیانے کی طرف اُڑنے کو پَر تولے۔
اقبال ارضِ حجاز کو چلے جا رہے ہیں اور محویت میں زبان پر وہ گیت ہیں جن کو سُن کر لوگ صحرا کی تمازت اور پیاس بھُول گئے ہیں۔ اس پر کوئی شخص امیرِ قافلہ سے پوچھتا ہے کہ یہ کون عجمی ہے جس کے نغموں کی سیرابی کوثر کا اثر دکھا رہی ہے۔

امیرِ کارواں آں اعجمی کیست | سرودِ او بہ آہنگِ عرب نیست
زند آں نغمہ کز سیرابئ او | خنک دل در بیابانے تواں زیست

دیگر۔
مسلماں آں فقیرِ کج کلاہے | رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد، چرا نالد؟ نداند | نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

دیگر۔
شبِ ہندی غلاماں را سحر نیست | بہ ایں خاک آفتابے راگزر نیست
بما کن گوشۂ چشمے کہ در شرق | مسلمانے ز ما بیچارہ تر نیست

ایضاً۔
مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ | سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب، کجا میخانۂ شوق | تو خود فرما، مرا ایں بہ کہ آں بہ

ایک جگہ حق تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ میں فقیر ہوں اور تو بے نیاز ہے۔ قیامت میں میرے اعمال کا حساب نہ کرنا اور اگر یہ ضروری ہے تو کم از کم رسُولِ پاک کی نظر کے سامنے میرا حساب نہ لینا۔

مظفر حسین

بھٹکا ہوا راہی

یہ ایک سچی آپ بیتی اور محسوس شہادت ہے سیرت نبوی کی معجز نمائی اور اثر آفرینی کی، کہ حضورؐ کی مقدس زندگی کی روشنی میں ایک بھٹکے ہوئے راہی کو منزلِ مقصود مل جاتی ہے۔ (م ۔ ق)

اب سے چند سال قبل میرے ایمان کی دنیا میں تشکیک کا ایک زبردست زلزلہ آیا تھا۔ جس کے ناقابلِ برداشت جھٹکوں نے ایک بار تو میرے ایمان کی عمارت کو بالکل ہی زمین بوس کر دیا اور میں تھوڑی دیر کے لئے کفر و الحاد کی ظلمتوں میں ٹھوکریں کھانے لگا۔ مگر پھر اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کو جوش آیا۔ اُس کی توفیق کا ہاتھ بڑھا اور مجھے ان ظلمتوں سے نکال کر ایمان و اسلام کی روشن و منور فضا میں لے آیا۔ اب میں جب کبھی اپنی زندگی کے اس تاریک ترین دور کو یاد کرتا ہوں تو میرا رُواں رُواں لرز جاتا ہے۔ لیکن معاً میرا سارا وجود متشکر مجسم بن کر اُس ہادیٔ مطلق کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جاتا ہے جس نے مجھے ہدایت دی۔ میرے بھٹکے ہوئے قلب کو سکون بخشا۔ میری فکرِ بیتاب کو طمانیت کی دولت عطا کی۔ میرے تشکیک سے گھائل ذہن پر ایمان و ایقان کا مرہم رکھا۔ میری وساوس کے کانٹوں پر لوٹنے والی روح کو آرام ارزانی فرمایا اور میرے اُس دل میں اپنی اور اپنے رسولؐ کی محبت کو دوبارہ زندہ کیا جو اس دولتِ بے بہا سے قطعی خالی ہو کر بالکل ویران ہو چکا تھا۔

داستان بہت لمبی ہے۔ لیکن میں اسے زیادہ سے زیادہ مختصر الفاظ میں بیان کر دینا چاہتا ہوں۔

میں بفضلہٖ شروع ہی سے مذہبی خیال کا تھا اور میری زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں میرا یہی مذہبی رنگ تھا۔ لیکن جب میں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے الحاد میں ڈوبے ہوئے ماحول میں قدم رکھا[1] تو فوراً ہی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے ایمان پر آرے چل رہے ہیں اور میرے اسلام پر کاری ضربیں لگائی جا رہی ہیں۔ میرا سر چکرانے لگا اور ایمان کی زمین میرے پیروں کے نیچے سے کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مجھے بہت جلد نظر آنے لگا کہ میرا جذباتی اور تقلیدی اسلام الحادی فلسفہ کے بے پناہ حملوں کی تاب نہ لا سکے گا۔ شکوک کا ایک طوفان اٹھا۔ وسوسوں کا ایک سیلاب اُمڈا اور میں اُس میں ایک کمزور تنکے کی طرح بہنے لگا۔ اسلام کے برحق ہونے کا ثبوت، خدا کے وجود کا ثبوت۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے کا ثبوت، آخرت کا ثبوت، غرض اسلام کے ہر عقیدے کی صداقت کا ثبوت

---

[1] کسی ایک ہوسٹل یا شعبہ کی یہ حالت ہو سکتی ہے مگر مُسلم یونیورسٹی کا پورا ماحول ایسا نہیں ہے وہاں اللہ کے فضل سے دینی رجحانات بھی پائے جاتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

میرا ذہن مجھ سے طلب کرنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری ہستی ایک ہستی نہیں ہے بلکہ دو ہستیاں ہیں اور ان دونوں میں زبردست کشمکش ہو رہی ہے۔ ایک ہستی مجھے اسلام کی طرف لے جانا چاہتی ہے اور ایک ہستی کفر و انکار کی طرف۔ اس کشمکش میں میری حالت یہ تھی کہ میں ایک لمحہ میں اسلام کی طرف آتا تھا اور ایک لمحہ میں کفر کی طرف جاتا تھا۔ میرا ذہن سوچتے سوچتے تھک جاتا اور بعض اوقات مجھے اندیشہ ہونے لگتا کہ میں بیہوش ہو جاؤں گا۔ یہ کیفیت تین ماہ تک رہی اور اس پورے عرصہ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جبکہ میرے ذہن نے سوچنا بند کر دیا ہو۔

میں سوچتا رہتا اور سوچتے سوچتے سو جاتا اور غالباً خواب میں بھی سوچتا رہتا اور بیداری کے پہلے ہی لمحہ میں میرے ذہن میں وہی سوالات گردش کرنے لگتے۔ میں لوگوں سے بات کرتا تو اس کھوئے ہوئے انداز میں کہ بعض دفعہ وہ ہنس دیتے۔ اور جب ان کے قہقہوں کی آواز میرے کانوں میں آتی تب میں چونکتا اور پوچھتا کہ کیا بات ہے اور اس کا جواب مجھے مزید قہقہوں سے ملتا۔ میں کلاس میں صرف اس لئے جاتا تھا کہ کہیں حاضری کم نہ ہو جائے۔ لیکن وہاں لیکچرار کیا لیکچر دیتے تھے یہ مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ چنانچہ ایک بار میرے ایک دوست نے مجھ سے دریافت کیا کہ آجکل معاشیات میں کس عنوان پر لیکچر ہو رہے ہیں۔ تو میں انھیں اس کا جواب دینے سے قاصر رہا۔

مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ میرے ایک طرف جنّت ہے اور ایک طرف جہنم اور یہ خوف میرے دل کو کمزور پتّے کی طرح لرزاں رکھتا تھا کہ مبادا میں جہنم میں نہ گر جاؤں۔ میں سینکڑوں بار مسلمان ہوا اور سینکڑوں بار کفر کے گڑھے میں جا گرا۔ اور ہزاروں بار میں نے تنہائیوں میں رو رو کر خدا سے ہدایت پانے کے لئے دعائیں مانگیں۔ روتے روتے میری قمیص کا دامن آنسوؤں سے تر ہو گیا اور خوف و تفکّر نے میرے چہرے کا رنگ فق کر دیا۔

اس پورے عرصہ میں میں نے "تلاشِ حق" کے لئے کیا کیا اور کیا پڑھا۔ غالباً لوگ یہی سوچیں گے کہ ضخیم کتابوں کے اوراق میں سرمارا ہوگا اور عمیق فلسفیوں کی وادیوں میں ٹھوکریں کھائی ہوں گی۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کیونکہ پہلے ہی قدم پر میری سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ اس کائنات و مافیہا کی حقیقت کا کامل یقین صرف عقل کے ذریعہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کوئی فلسفی اور سائنس داں اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی تحقیق غلطی کے امکان سے ماوراء ہے اور اس نے جو کچھ بھی پیش کیا ہے علم کی بنیاد پر پیش کیا ہے۔ پس اگر حقیقت کی "تلاش" ہے تو ان لوگوں کی طرف رجوع کرو جو یہ کہتے ہیں کہ وہ عقل و فلسفہ اور سائنس کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر بات کہہ رہے ہیں۔ پھر ان کی بات پر عقل و منطق کی رو سے جتنی بھی جرح ہو سکتی ہے، کرو۔ ان کی معقولیت و نامعقولیت کو پرکھو اور یہ دیکھو کہ عقل اپنی رسائی کی حد تک اس کائنات کی حقیقت کے بارے میں جو اندازہ لگاتی ہے اس میں اور ان حضرات کے پیش کردہ عقائد و نظریات میں مطابقت ہے یا تضاد و اختلاف اور مزید اس پہلو سے بھی غور کرو کہ آیا یہ حضرات جھوٹ بول سکتے تھے یا نہیں۔ اس غرض کے لئے ان کی سیرت و کردار کو بالکل بے لاگ طور پر تنقید کی چھلنی میں چھانو۔ نہ عقیدت کو راہ میں آنے دو کہ ان کے عیب کو حسن بنا دے اور نہ تعصب کو دراندازی کا موقع دو کہ ان کی بے داغ سیرت داغدار نظر آنے لگے۔ غرض ایک انصاف پسند، غیر جانبدار جج کی طرح ان کے معاملہ پر غور کرو!

چنانچہ جب میں اس انداز پر سوچنے کے لئے تیار ہوا تو مجھے ایسی ہستی دنیا میں صرف ایک ہی نظر آئی جو اس قسم کی تلاش و تحقیق اور جرح و تنقید کا محور بن سکتی ہے۔ اور وہ تھی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس و مطہر، کیونکہ

دوسرے سارے مذہبی پیشواؤں کے حالات اس حد تک معلوم نہیں ہیں کہ تلاشِ حق کی راہ کا مسافر اُن کی روشنی میں اپنے سفر کا آغاز کر سکے اور اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے۔ سارے مذہبوں کی کتابوں کا محرف ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے اور اُن کے بانیوں کی تعلیمات اور اُن کی زندگی کے حالات جن معتداد اور جن ذرائع سے ہم تک پہنچے ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ ان پر شک وشبہ نہ کیا جاسکتا ہو۔ ہم کسی مذہب کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اب تک اسی حالت میں موجود ہے جس میں اُس کے بانی نے اُسے چھوڑا تھا۔ اور ہم کسی مذہبی پیشوا کے بارے میں دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اس کے حالاتِ زندگی اپنی حقیقی صورت میں اب تک محفوظ ہیں۔ پس جن کا معاملہ پہلے ہی مرحلہ میں مشکوک ثابت ہو وہ بعد کے مرحلوں میں یقین کی روشنی کے حصول کا ذریعہ کیسے بن سکتے ہیں۔ لیکن اسلام اور اُس کے پیشوا کی حیاتِ طیبہ اور اُس کی کتاب کے بارے میں کوئی مخالف بھی اس حقیقت کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ اب تک اپنی اصلی حالت پر اسی طرح باقی ہیں جس طرح پورے چودہ سو سال قبل تھے۔ پس حق کا متلاشی بے کھٹکے اپنی تحقیق کا محور انھیں بنا سکتا ہے۔ کیونکہ یہی وہ مواد فراہم کرتے ہیں جن کے معتبر و ثقہ (Authentic) ہونے کا کامل ثبوت موجود ہے۔

جب میں استدلال کے اس مرحلہ میں پہنچ گیا تو میں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اُن کی حیاتِ طیبہ کے مختلف گوشوں پر اپنی معلومات کی حد تک مہینوں غور کیا۔ آپؐ کی دعوت اور تعلیمات، عقل و فطرت کے عین مطابق معلوم ہوئیں اور آپؐ کی سیرت، کذب و افترا پردازی کے ہر امکان سے بالاتر نظر آئی۔ میں نے پورے مخالفانہ انداز میں سینکڑوں بار آپؐ کے جھوٹے ہونے کے امکانات پر (معاذ اللہ) غور کیا۔ لیکن جب بھی جھوٹا تسلیم کرنے کی کوشش کی آپؐ کی صداقت کا یقین میرے دل میں راسخ ہوتا چلا گیا اور ایک دن ایسا آیا کہ میں ایک گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرا دل اللہ تعالیٰ نے قبولِ حق کے لئے کھول دیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور میری زبان پر لاالٰہ الا اللہ محمدؐ الرسول اللہ کا ورد تھا۔ ظلمتیں چھٹ چکی تھیں۔ فضا نور میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ تمام مادی حجابات میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹ گئے ہیں۔ اور توحید و رسالت اور آخرت کی حقیقتیں محسوس طور پر میرے سامنے موجود ہیں۔ اُس وقت مجھے یقین کی جو کیفیت اور ایمان کی جو حلاوت حاصل تھی وہ پھر کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ البتہ اُس کی ایک حسرت بھری یاد دل میں موجود ہے۔

بہرکیف اب میرا دل اسلام پر پوری طرح مطمئن ہے اور شکوک وشبہات کے کانٹوں کی خلش مجھے پریشان نہیں کرتی وساوس اگر آتے بھی ہیں تو بغیر ٹھہرے گزر جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف پہلے میری حالت یہ تھی کہ اگرچہ خدا کے وجود پر یقین تو تھا۔ لیکن کسی منکر سے گفتگو کرتے ہوئے میرا دل گھبرانے لگتا اور میرے اعلانِ توحید میں کامل یقین کا فقدان محسوس ہوتا تھا۔ غالباً یہی ضعفِ ایمانی تھا جسے اللہ تعالیٰ نے تشکیک کے تھپیڑے کھلا کر مضبوط کر دیا۔ اب اگر کوئی منکر مجھ سے وجودِ باری تعالیٰ پر گفتگو کرتا ہے تو میں پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ اس سے گفتگو کر لیتا ہوں۔ اور شبہ کی ذرا سی خلش بھی میرے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

اللہ نے مجھے ہدایت دی۔ اس ہدایت کا راز نہ فلسفہ کی موشگافیوں میں ہے اور نہ منطق کے داؤ پیچ میں۔ بلکہ اس کا راز حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے داغ سیرت میں ہے۔ میں نے آپؐ کی سیرت پر غور کیا۔ اُس کے ایک ایک پہلو اور ایک ایک گوشہ پر غور کیا اور نہایت کافرانہ جرأت و شقاوت کے ساتھ آپؐ کے جھوٹے ہونے

کے امکان پر غور کیا (خاکم بدہن)، لیکن میرا ہر بار کا تفکر میرے اقرار کی بنیادیں مستحکم تر کرتا چلا گیا اور آج میں ہر منکر کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ حضورؐ پاک کی زندگی پر اس طرح غور کرکے دیکھ لے کہ آیا اُن پر جھوٹا ہونے کا شبہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُس کے دل میں طلبِ صادق ہوگی اور وہ پورے عقل و ہوش سے کام لیتے ہوئے غور کریگا تو اُس کے قلب سے تصدیق و اقرار کے چشمے پھوٹ نکلیں گے اور اس کا رُواں رُواں محمد الرسول اللہ کا اعلان کرنے لگے گا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم محض ایک شخص کے کہنے سے کس طرح خدا کے وجود کو تسلیم کرلیں۔ ہم تو اُس وقت تک اُس پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک اس کا کوئی سائنٹیفک ثبوت نہ مل جائے۔ تو میں یہ کہوں گا کہ انھیں سائنٹیفک طرزِ فکر کی ہوا بھی نہیں لگی۔ یہاں علوم طبیعی کے کسی نظریہ کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال نہیں ہے بلکہ ایک مخبر کے صادق یا کاذب ہونے کا سوال ہے۔ اس سوال کا جواب سائنس کی لیبارٹری میں نہیں نکلے گا۔ بلکہ خود اس مخبرؐ کی سیرت، اس کی دعوت، اُس کے پیش کردہ حقائق اور اصولوں پر منصفانہ نقطۂ نظر سے غور کرنے سے نکلے گا۔ یہاں لیبارٹری والا سائنٹیفک طریقہ کام نہیں دے گا۔ بلکہ وہ طریقہ کام دے گا جو ہم رات دن اپنی زندگی میں کسی مخبر پر سچے یا جھوٹے ہونے کا حکم لگانے وقت استعمال کرتے ہیں اور اس معاملہ میں وہی سائنٹفک طریقہ ہے۔ پس میں ہر جویائے حق کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں اور ذاتی تجربہ کی بنار پر اُسے یقین دلاتا ہوں کہ اس اندھیری دُنیا میں حضورؐ ہی کی ذات ایسی ہے جس کے ذریعہ حق کی معرفت حاصل ہوسکتی ہے اور حقیقت کا سُراغ مل سکتا ہے۔

لاکھوں سلام ہیں یقین و اذعان کے اس لازوال درخشاں آفتاب پر جس کی روشنی میں بھٹکے ہوئے دل اپنی منزل کا نشان پاتے ہیں؛

★ گرم مرغ مسلّم ★ گرم پلاؤ

★ گرم پراٹھا ★ گرم کباب

★ گرم چائے ★ گرم کافی

سے

اپنے نازک لبوں کو شفق رنگ بنائیے

آپ کی صحت اور توانائی قابلِ اعتماد کھانوں سے قائم رہ سکتی ہے

اور اس کیلئے

کیفے فردوس

(وکٹوریہ روڈ)

میں تشریف لاکر پُرسکون لمحات گزاریں اور اپنی شام کو خوشگوار بنائیں

فون نمبر :۔ 6885

صحیح ادویہ اور سب مناسب علاج کی فراہمی کی غرض سے

ہمدرد دواخانہ

کی

بنیاد ہند میں سنہ ۱۹۰۶ء میں اور پاکستان میں سنہ ۱۹۴۸ء میں رکھی گئی

ہمدرد کے کاروبار کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج اس کی تیار کردہ ادویہ ملک کے طول و عرض میں ہر جگہ مل سکتی ہیں۔ لیکن اس وسعت سے زیادہ اُس کی کامیابی کا معیار وہ احتیاط ہے جو ہمدرد کے معملوں اور دواسازی کے کارخانوں میں دواؤں کی چھان پھٹک، صفائی، ستھرائی۔ تحقیق و تفتیش اور قدم قدم پر فنّی جانچ پرکھ میں برتی جاتی ہے۔ ان چیزوں میں ہمدرد کا نام اصلی اور خالص ہونے کی ضمانت ہے!

یہ وہ طریق علاج ہے

جس سے ملک کے اسی فیصدی باشندے معالجے کے لئے رجوع کرتے ہیں

ہمدرد دواخانہ پاکستان کراچی

طب یونانی کا علمبردار ہے

ARAN Karachi Regd. No. S. 1262

رحمن پرنٹنگ پریس کراچی

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

فروری ۱۹۵۶ —————— /۸/-

جلد ۷ ماہنامہ نمبر ۱۱

فاران

فروری سنہ ۱۹۵۶ء ——— ایڈیٹر ——— ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے
فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

——— مقام اشاعت ———
دفتر فاران۔ کیمبل اسٹریٹ۔ کراچی ۱

——— نظم و ترتیب ———

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

کسی خطۂ زمین میں برسوں سے مینہ نہ برسا ہو۔ وہاں کے لوگ ایک ایک بوند پانی کے لئے ترس رہے ہوں۔ زمین دھوپ کی شدت سے تپ کر تانبے کی طرح خشک ہوتی جارہی ہو کہ اگر چند دن اور بارش نہ ہوئی تو یہاں کی مٹی میں شاید سرے سے قوت روئیدگی ہی باقی نہیں رہے گی، مسلسل خشک سالی نے لوگوں کو بدحواس بنادیا ہو اور قحط سالی کے ہاتھوں ملک میں لوٹ مار اور بدامنی کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورت میں تھوڑی سی بھی گھٹا برس جائے اور زمین پوری طرح سیراب ہونے کی بجائے نم آلود بھی ہو جائے تو وہاں کے لوگ شکر کے سجدے بجالائیں گے، ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے، بادل کے فرشتوں کی اس توجہ کا شکریہ ادا کریں گے اور اس ملک کے دردمند کسان اس ترشیح اور نمی کو غنیمت جان کر زمین میں تخم ریزی کا کام شروع کردیں گے ـــ پاکستان میں نیا مسودۂ دستور اقتدار و سیاست کے افق سے اسی قسم کے حالات میں نازل ہوا اور تشنگانِ آئین و دستور نے ابر کی اس تنگ دستی کو، ترشیح کی اس نمی کو اور گھٹاؤں کی ان پھواروں کو غنیمت سمجھ کر بلکہ رحمت جان کر اُن کا اس جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا جیسے اُن کے دل کی مُراد مل گئی!

پاکستان کا دستور اب تک کبھی کا بن جاکر نافذ ہو جانا چاہیئے تھا اور یہ زمانہ جو دستوری کشمکش اور آئین سازی کی جدوجہد میں صَرف ہوا ہے ملک کی تعمیر میں صَرف ہوتا مگر افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا؟ کیوں نہیں ہوا۔ یہ اب کوئی راز نہیں رہا۔ ایک ایک بات منظرِ عام پر آچکی ہے! عوام کا پہلے دن ہی سے یہ مطالبہ رہا ہے کہ پاکستان کا دستور جلد سے جلد بنے اور کتاب و سنت یعنی پاکستان کے اساسی تصورات کی بنیادوں پر بنے۔ مگر کرسیوں کی جنگ اور اقتدار و اختیار کی کشمکش نے وہ وہ رُوپ دھارے ہیں اور ایسی ایسی چالیں چلی ہیں کہ خدا کی پناہ! کمندوں کو ایسی حالت میں توڑا گیا ہے جب کہ "لبِ بام" بس کچھ دو چار

ہاتھ رہ گیا تھا ـــــــــ یہ داستان بڑی ہی تلخ اور انتہائی درد ناک ہے۔ اُسے ہم یہاں چھیڑ کر خود اپنے ہی زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں چاہتے! حالات کے بگاڑنے اور بنانے میں جس نے جو پارٹ ادا کیا ہے، وہ رتی رتی بھر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں درج کر لیا گیا ہے۔ اور دُنیا میں اور آخرت میں اُس کا انجام لوگ خود دیکھ لیں گے۔ اللہ کی پکڑ سے نمرود اور فرعون جیسے مطلق العنان اور با اختیار فرمانروا نہ بچ سکے تو وہ لوگ کیا بچیں گے، جن کی انانیت اور آمریت ایک دُو بہاریں بھی پُوری طرح دیکھنے نہیں پاتیں کہ عُمر کی تمام ہو جاتی ہے اور دستِ مشیت کی ایک ہی جُنبش میں جو "سب کچھ ہوتے ہیں" وہ "کچھ بھی نہیں رہتے"۔ "فاعتبروا یا اولی الابصار!"

دستورِ پاکستان کا یہ جدید مسودہ حقیقت میں پاکستان کے عوام کی بہت بڑی فتح ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ عوام کے مطالبہ کی شدت کے ساتھ ساتھ اس مسودہ میں اسلام اور جمہوریت کی قدروں کا اضافہ ہوتا رہا ہے اور اب جس صورت میں اور ہیئت میں مسودۂ دستور منظرِ عام پر آیا ہے اُس نے مُلک میں اس سرے سے لے کر اُس سرے تک مسرت کی لہر دوڑا دی ہے! اس نیک کام میں جس نے بھی جتنی مدد دی ہے اُس کا اجر اُسے ضرور ملے گا۔ کسی نیک کام پر دُوسروں کی مبارکباد اور تحسین و ستایش کی تمنا رکھنے سے اُس کا اجر بہت کچھ ضائع ہو جاتا ہے۔ توقع ہے کہ کاروانِ دستور سازی کے نقیب اور اربابِ کار وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پر اپنی نگاہ رکھیں گے تاکہ انھیں اجر و ثواب پُورے کا پُورا ملے اتنا کہ جس کا وہ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی عطا بے حد و بیکراں ہوتی ہے!

اسلامی دستور کی ایک جھلک دیکھ کر ہی، اسلامی ممالک نے مبارکباد کے عقیدت آمیز پیغام حکومتِ پاکستان کو بھیجے ہیں اور اس طرح پاکستان کی تمنا کے بغیر ہی مُسلمان مملکتیں اُس کی قیادت و رہنمائی کے منصب کو محسوس کر رہی ہیں۔ یہ پہلا انعام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکومتِ پاکستان کو عطا ہوا ہے اور ابھی تو اس منزل کا آغاز ہے۔ جب پاکستان کے دستور کی کمزوریاں دُور کر دی جائیں گی، اُس کے غیر جمہوری اور غیر اسلامی رخنے بند ہو جائیں گے اور پاکستان کا دستور سَو فیصدی اسلامی اور جمہوری بن کر نافذ ہو جائے گا۔ اور یہاں کے معاشرے میں اسلام و اخلاق کی بُنیادوں پر تعمیری انقلاب آ جائے گا تو اُس وقت اس گلشن کی بہار دیدنی ہوگی۔ بغداد و دمشق ہی نہیں ماسکو، لندن، نیویارک اور پیکن کے اندھیروں میں عدل و مساوات اور حق و صداقت کے ان چراغوں کی روشنی محسوس کی جائے گی اور ساری دُنیا اس سرزمینِ پاک سے ہدایت حاصل کرے گی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت و قدرت "انتم الاعلون" کا وعدہ وفا کرنے کے لئے بے چین ہے، تاخیر اور تساہل ہماری طرف سے ہو رہا ہے۔ "ان کنتم مومنین" کی اِدھر شرط پُوری ہوئی اور اُدھر سے رحمتوں کی بارش شروع ہو جائے گی!

پاکستان کے آئین و دستور کی بُنیاد "کتاب و سنت" ہے اور وہ اربابِ فکر جو کتاب و سنت کے جاننے والے ہیں انہوں نے مسودۂ دستور کے اُن رخنوں کی نشاندہی کر دی ہے جو اسلام، جمہوریت اور عام انصاف کے اصولوں سے مطابقت نہیں کرتے، ان رخنوں کو یقیناً بند ہونا چاہیئے، یہ چاک رفو کے محتاج ہیں۔ یہ کمزوریاں دُور ہونی ہی چاہئیں۔ اس گلدستہ میں خار و خس اور اس خریطۂ جواہر میں خزف ریزے آخر کیوں رہیں! اس ظرف کے مظروف کو نتھار کر اور چھان کر اگر آبِ مُعطر بنایا جا سکتا ہے تو اس کارِ خیر میں تامل کیسا؟

یہ صحیح ہے کہ انسانوں کے کاموں میں کوتاہیاں اور خامیاں بھی رہ جاتی ہیں۔ مگر ایک تو ایسے کام ہوتے ہیں جو ہو چکتے ہیں اور پھر اُن کی خامیوں پر کوئی افسوس تو کر سکتا ہے مگر اُن خامیوں کو دُور نہیں کر سکتا۔ لیکن کوئی منصوبہ جب بن رہا ہو، کوئی اسکیم تیار

کی جا رہی ہو اور اُس وقت اُس اسکیم اور منصوبہ کی خامیاں اور کمزوریاں معلوم ہو جائیں اور پھر اُن کو دُور کرنے سے پہلوتہی کی جائے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ کمزوریاں اور خامیاں جان کر رکھی گئی ہیں اور چور دروازے سوچ سمجھ کر رہنے دیئے گئے ہیں۔ پاکستان کے اربابِ حل و عقد اور دستور سازوں سے ہم توقع رکھتے ہیں، وہ ان الزامات سے اپنے دامن کو بچاتے ہوئے، مسودۂ دستور کی خامیوں کو پُورے انشراحِ قلب کے ساتھ دُور فرمادیں گے۔

دستور سازی کا معاملہ نہ کسی ایک فرد کا ہے اور نہ کسی خاص جماعت اور پارٹی سے اس کا تعلق ہے۔ دستور سازی سے پُورے پاکستان کی تقدیر وابستہ ہے۔ شخصیات اور ذاتی اغراض کی ذراسی بھی آمیزش دستور کی تشکیل میں رہی تو یہ زہر اس آبِ حیات کے مزاج کو بگاڑ دے گا اور ملک کو صدیوں تک اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔!

کرسیوں کی جنگ اور اختیار و اقتدار کی نزاع و کشمکش نے ملک کو جس خطرناک موقف پر لاکر کھڑا کر دیا ہے اُس کے احساس سے پاکستان کے کسی دردمند کا دل خالی نہیں ہے، توڑ جوڑ کی یہ آنکھ مچولی اور اقتدار کی یہ رسّہ کشی اب ختم ہو جانی چاہیئے۔ کہ اس بیمارِ ناتواں میں مزید جھٹکوں کی تاب و طاقت نہیں ہے؟ جن کے اندر خدمتِ خلق کا جذبہ ہو، جو خدا کا خوف اپنے دلوں میں رکھتے ہوں، جو ملک و قوم کے لئے ہر طرح کا ایثار کر سکیں، وہ بیشک پاکستان کی عنانِ اقتدار سنبھالنے کے مستحق ہیں۔ مگر جو لوگ پاکستان کو خوانِ یغما سمجھتے ہوں، جن کے اندر بادشاہی کی خُو بُو پائی جاتی ہو اور کرسیوں کی ... میں اپنے ذاتی اقتدار کی نمود چاہتے ہوں، اُن کو کوئی ذمہ دار منصب تو کجا، پاکستان کے ایک چپراسی کی خدمت بھی سپرد نہیں کی جاسکتی! کسی منصب اور عہدے کا نہ صرف چاہنا بلکہ اُس کے لئے طرح طرح کے داؤں پیچ سے کام لینا، اخلاص کے فقدان اور ذاتی اغراض کے وجود کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان وحی ترجمان نے فرمایا کہ جو کوئی عہدہ طلب کرے اُسے عہدہ نہ دو!

پاکستان کی دستور سازی قوم و ملک کے اجتماعی مفاد و مستقبل کا مسئلہ ہے اس میں موروثی جایدادوں کے ہبہ ناموں اور تبادلوں کی طرح قانونی گنجائشیں اور رعائتیں رکھنا، دستور کی صحیح اسپرٹ کو غارت کر دے گا۔ اسلامی نظام کو پاکستان میں برپا کرنا جب مقصود ٹھہرا لیا ہے تو پھر پُورے کے پُورے اسلام کو لائیے اور دستور کی کسی دفعہ میں بھی غیر اسلامی تصورات کیلئے کوئی خلاء باقی نہ رہنا چاہیئے۔ اور جب جمہوریت کو لانا ہے تو پھر مطلق العنانی اور آمریت کے لئے دستور میں کوئی چور دروازہ نہ رہنے دیجئے!

اسلام اور جمہوریت کے تقاضے اتنے واضح اور کھلے ہوئے ہیں کہ انھیں ہر کوئی جانتا ہے، اُن تقاضوں کو سَو فیصدی پُورا ہونا چاہیئے۔ جب حق و صداقت اور اخلاق و انصاف کی بُنیادوں پر ملک کی تعمیر اور نظامِ حکومت کی تشکیل مطلوب ہے تو پھر "کم سے کم" اور "غنیمت" کا کیا سوال! پُورے کا پُورا اسلام، زیادہ سے زیادہ جمہوریت، کمال درجہ کی مساوات اور عدل و انصاف یہ ہیں دستور کے عناصر، جن کو ہر دفعہ کی روحِ رواں بن جانا چاہیئے۔

اللہ کا شکر ہے کہ نظریات کی کشمکش کا دَور مسودۂ دستور کے بعد ختم ہو چکا ہے، جہاں تک دستورِ پاکستان کی اساس و ماخذ کا تعلق ہے عوام اور خواص سب متحد الخیال ہو گئے ہیں۔ اُن کے درمیان کوئی نزاع باقی نہیں رہی۔ اس عمارت کے ستون تک کھڑے ہو چکے ہیں۔ کام بس اب اتنا رہ گیا ہے کہ دیواروں کے رخنوں کو بند کر دیا جائے اور پلاننگ میں جو کجی رہ گئی ہے اُسے دُور کر دیا جائے۔ یہ کام معمارانِ دستور ہی کر سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ وہ پُوری طرح اپنی ذمہ داری کو محسوس

فرمائیں گے!

یہ مخالفین!!

اسلامی دستور سازی کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے مشرقی پاکستان میں کمیونسٹوں نے مہم شروع کر رکھی ہے۔ یہ وہ ٹولی ہے کہ جس پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہو سکتی کہ ان لوگوں کا نصب العین ہی یہ ہے کہ دنیا کی ہر غیر اشتراکی حکومت میں جس طرح بھی ممکن ہو سکے ابتری، لاقانونیت اور انتشار پیدا کرو۔ یہاں تک کہ اشتراکیت کے لئے زمین ہموار اور فضا سازگار ہو جائے۔ ان "سُرخوں" کو دنیا کا کوئی جمہوری نظام اور رفاہی منصوبہ مطمئن نہیں کر سکتا۔ اور دنیا میں سب سے زیادہ دشمنی انھیں "اسلام" سے ہے۔ جب سے اسلامی دستور کا مسودہ منظرِ عام پر آیا ہے یہ لوگ انگاروں پر لوٹ رہے ہیں۔ اور ان کی تخریبی کوششیں تیز تر ہو گئی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے حالات بگاڑنے میں اس گروہ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ زبان کا مسئلہ کمال ہوشیاری کے ساتھ انہی نے کھڑا کیا ہے۔ اور مرکز کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے اور صوبوں کو مطلق العنان بنانے کی اسکیم ان حضرات کے فکر و تخیل کا شاہکار ہے۔ مخلوط انتخاب کا خوفناک شوشہ بھی کمیونسٹوں ہی کا چھوڑا ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان کے عوام سے ہم درد مندانہ التجا کرتے ہیں کہ وہ کمیونسٹوں کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں سے ہوشیار رہیں اور اُن کی تخریبی کوششوں کو اپنی تائید یا سکوت و غیر جانبداری سے ذرا بھی سہارا نہ دیں!

حکومت سے ہماری یہ گزارش ہے کہ کمیونسٹوں کو جائز حدود میں اپنے نظریہ کی تبلیغ کا حق حاصل ہے مگر جب یہ حدود ٹوٹنے لگیں تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ احتساب سے کام لے اور تخریبی کوششوں کو سختی کے ساتھ دبا دے مگر حکومت کو اس احتساب میں انصاف کے تقاضوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے شدید دشمن کے خلاف بھی حدودِ عدل و انصاف سے تجاوز و انحراف کی اجازت نہیں دیتا!

کمیونسٹوں کے بعد دوسرا طبقہ کانگرسی بلکہ مہاسبھائی ذہنیت رکھنے والے ہندوؤں کا ہے جو پاکستان کے "اسلامی جمہوریہ" بننے پر چیں بر جبیں ہے۔ ہم اس گروپ سے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُس کی نوعیت خیر خواہانہ مشوروں کی ہے۔ یہ کوئی دھمکی نہیں ہے، اس لئے کہ مسلمان کی وسعتِ ظرف کے خلاف ہے کہ وہ کسی طبقہ کی قلتِ تعداد اور اپنے غلبہ و اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اوچھے واروں پر اُتر آئے اور جابر حاکموں کی طرح لوگوں کو دھمکیاں دے۔ اُنھیں ڈرائے اور خوف زدہ کرے۔ اسلام نے کمزوروں اور زیردستوں کے ساتھ شرافت و مروّت کا سلوک کرنے کی ہمیں تعلیم دی ہے۔

کانگرسی ہندو اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ہندوستان دو قومی نظریہ کی بنیاد ہی پر تقسیم کیا گیا ہے اور پاکستان کا مطالبہ مسلمانوں نے اسی لئے کیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو اور اسلامی معاشرہ وجود میں آئے۔ پاکستان بننے کے بعد مسلمان اُس نظریہ سے بغاوت کس طرح کر سکتے ہیں، جو پاکستان کی تخلیق کا باعث ہے! اگر وہ ایسا کریں گے تو اپنے خدا و رسول سے غداری کریں گے اور اس غداری کے لئے کوئی مسلمان تیار نہیں ہو سکتا!

پاکستانی ہندوؤں کو شاید پوری طرح معلوم نہیں ہے کہ اسلام امن و سلامتی کا دین ہے، اس کے دستور میں، آئین میں اور حدودِ مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق، مذہب، عزت اور جان و مال کی حفاظت کی جو ضمانت رکھی گئی ہے وہ دنیا کے کسی آئین و دستور میں نہیں مل سکتی۔ دنیا کی کوئی اکثریت، اقلیت کے ساتھ وہ شریفانہ سلوک نہیں کر سکتی، جو سلوک مسلم اکثریت کر سکتی ہے اور جس کے لئے خود اسلام نے حکم دیا ہے!

ہندوستان میں حکومت پر لیبل تو "سیکولر گورنمنٹ" کا لگا ہوا ہے مگر مسلم اقلیت کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک ہو رہا ہے۔

اُس کیلئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ تو کانگرسی ہندو بھی کیا یہی چاہتے ہیں کہ پاکستان میں "لادینی حکومت" کے نام پر یہاں کی اقلیت کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو ہندوستان میں اقلیتوں کیساتھ ہو رہا ہے۔ اگر پاکستان کے ہندو لیڈر یہی چاہتے ہیں تو اپنی قوم کے لئے بہت بڑی بات چاہتے ہیں اور اُن کا طرزِ عمل خود اُن کی قوم کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے!

ہندوستان کے مسلمانوں میں رفیع احمد قدوائی جیسا وفادار اور وطن دوست پیدا ہوا۔ گئو کشی کے انسداد میں خود مسلمان وزیروں نے حکومت کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے تیوہاروں میں شرکت کی، ہولی کھیلی، ماتھوں پر سیندور کے ٹیکے لگوائے، دیوالی پر اپنے گھروں میں دیپ جلائے مگر اُس کا صلہ اُنہیں یہ ملا کہ اخباروں میں کُھلے خزانے اُن کے رسُول کی توہین کی جاتی ہے، بھارت کے مسلمان تنگیٔ معیشت، قتل و غارت گری اور بے آبروئی کے تمام زخموں کو برداشت کر گئے مگر اس زخم کو وہ کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ جان لیوا زخم جان بوجھ کر پہنچایا گیا ہے، اس کے برخلاف پاکستان کا ہندو وزیر غداری کر کے بھاگ چلا گیا۔ ہندوؤں نے یہاں پاکستان کے بنیادی نظریوں کیخلاف محاذ کھڑا کیا، مشرقی پاکستان کے مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی اور اب اس پھوٹ سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر اُن کی ان تمام ناپسندیدہ حرکات کے باوجود مُسلم اکثریت کا سلوک اُن کیساتھ کس قدر عفو و درگزر اور شرافت پر مبنی ہے! یہ وہ حقائق ہیں جن پر پاکستانی ہندو اگر ٹھنڈے دل سے غور کریں تو اُن کو اپنی سیاسی روش پر ندامت ہو گی!

ہندوستان میں مسلمانوں کو کھلے خزانے دھمکی دی جا رہی ہے کہ وہ مکہ، مدینہ کی طرف دیکھنا چھوڑ دیں اور عرب کی پاک سرزمین سے اپنا روحانی تعلق منقطع کر لیں مگر پاکستان میں ہندوؤں کیلئے کسی ایک زبان سے بھی یہ بات نہیں نکلی کہ متھرا، بندرابن، کاشی اور اجودھیا سے پاکستانی ہندو اپنا سمبندھ نہ رکھیں۔ اور اپنے پوتر استھانوں اور مقدس مقامات کی محبت اپنے دلوں سے نکال دیں۔ مسلمان کا دل کہ توحید کا گنجینہ ہے اُس کے اندر اللہ تعالیٰ نے بڑی وسعت رکھی ہے، اُس میں غیروں کے لئے تنگی نہیں ہے۔

پاکستان میں جب اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو جائیگا تو پاکستانی ہندوؤں کو اُسوقت اپنی غلطی کا احساس ہو گا کہ ہم نے امرت کو زہرِ قاتل سمجھ رکھا تھا اور ہم دُنیا کی سب سے بڑی نعمت سے وحشت کر رہے تھے۔ پاکستانی ہندوؤں کو چاہیئے کہ وہ اپنے طرزِ عمل اور سیاسی روش سے ایسی فضا پیدا نہ کریں جس سے وہ "اغیار" بلکہ "حریف" سمجھے جائیں۔ یہ بات عام مصلحت و حکمت کے بھی خلاف ہے، پاکستانی ہندو مسلمانوں کے دوست بن کر ہی اپنے زیادہ سے زیادہ جائز حقوق منوا سکتے ہیں!

اس سلسلہ میں آخری بات یہ کہنے کی ہے کہ اقلیت کا اکثریت سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنے دین و ایمان کے بنیادی تقاضوں سے اقلیت کو خوش کرنے کے لئے دست بردار ہو جائے، ایک نامنصفانہ مطالبہ ہے، اقلیت کو خوش رکھنا اور مطمئن بنانا ضروری ہے مگر اکثریت یہ تو نہیں کر سکتی کہ اقلیت کی خوشی کیلئے اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کا گلا گھونٹ دے!

اسلامی دستور سازی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی سب سے زیادہ کوشش "عوامی لیگ" کر رہی ہے! حیرت ہے، افسوس ہے بلکہ اس تصور سے خود ہمیں شرم آتی ہے کہ یہ کیسے مسلمان ہیں جن کو "اسلام" کے نام سے چڑ ہے! عوامی لیگ نے جتنی سیاسی قلابازیاں کھائی ہیں اور اس کا بانی اور لیڈر اپنے موقف کو جس مضحکہ خیز انداز میں بدلتا رہا ہے، اگر یورپ کے کسی ملک میں کوئی پارٹی ایسی حرکتیں کرتی تو وہاں کی سیاست میں ایسے شعبدہ بازوں کیلئے کوئی جگہ نہ رہتی اور ان سیاسی قمار بازوں کو کوئی ہمنوا نہ ملتا، مگر یہ پاکستان ہی کی خصوصیت ہے کہ یہاں اس طرح کی متلوّن، غرض پرست، ضمیر فروش اور بے اصولی جماعت کو بھی کچھ پیرو اور ہمنوا میسّر آ جاتے ہیں!

"عوامی مُسلم لیگ" سے لفظ "مسلم" کا اخراج، پھر یہ اعلان کہ عوامی لیگ کے دروازے ہندوؤں کیلئے بھی کھلے ہوئے ہیں، مُسلم اکثریت کے خلاف ہندوؤں کیساتھ مل کر کُھلی ہوئی سازش نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ مسٹر حسین شہید سہروردی ہی تھے جنھوں نے دستوریہ کے توڑنے کا اُس وقت مطالبہ کیا جب دستور بالکل آخری مرحلہ میں تھا اور اب جبکہ نئی دستور ساز اسمبلی میں مسودہ دستور

پیش ہو تو اُس کو ناکام بنانے کی سازش کی جارہی ہو! اس بات کو سب جانتے ہیں کہ مسٹر سہروردی کس ساز باز کے ذریعہ مرکزی وزارت میں آگئے ہیں اور وزیر بننے کے بعد انہوں نے قوم کو ڈکٹیٹر شپ کی کیسی کیسی دھمکیاں دی ہیں اور جمہوریت کے تقاضوں کو کس کس طرح سے ٹھکرایا ہے! ون یونٹ کی تشکیل میں خود اُن کی تائید بھی شریک کار رہی ہو، مگر جب وزیر اعظم بننے کا خواب پورا ہوتا نظر نہ آیا اور منصب وزارت سے ہاتھ دھونے پڑے تو ون یونٹ کی مخالفت کی گئی! اس لیڈر نے صرف اپنے ذاتی اغراض کی خاطر اپنی پارٹی کے وقار کو داؤں پر لگادیا ہے اور اُس کی اس حرکت سے ناراض ہوکر خود اُس کے بعض رفقاء علیحدگی اختیار کرچکے ہیں!

ملک کی اکثریت اسلامی دستور کی حمایت کررہی ہو اور یہاں کے عوام پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا فیصلہ کرچکے ہیں اس لئے اللہ نے چاہا تو عوامی لیگ کے ان چند غرض پرستوں کی تخریبی کوششیں بارآور نہ ہوسکیں گی! عوامی لیگ کے لیڈروں کو ہم کیا سمجھائیں جب کہ ہر بات کو وہ ہم سے بہتر طور پر جانتے ہیں! پاکستان کس نظریہ کی بناء پر وجود میں آیا ہے؟ ملک کی اکثریت کا کیا مطالبہ ہے؟ اسلام کا طریق حکمرانی کس قدر عدل وانصاف کے مطابق ہو؟ ان میں کونسی ایسی بات ہو جسے وہ نہیں جانتے۔ مگر ع

بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند!

ہوسِ اقتدار انھیں اُس سطح پر لے آئی ہو، جہاں اخلاق وانصاف کی عام قدروں کو پوری دیدہ دلیری کیساتھ روند دیا جاتا ہے اور اس کی بھی پروا نہیں کی جاتی کہ جس ملک کے نظم ونسق کی باگ ڈور سنبھالنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں، اُس کے عوام کی نظروں میں تو سرخرو بنے رہیں۔ مگر یہاں اسکیم یہ ہو کہ توڑ جوڑ اور سازشوں کے ذریعہ اقتدار ہمارے ہاتھ میں آجائے، اب رہے عوام تو طاقت کے زور سے انھیں ہر وقت دبایا جاسکتا ہے! عوامی لیگ شاید دُنیا کی پہلی جماعت ہو جو عوام کے مطالبوں کو ٹھکرا کر اور عوام کی تمناؤں سے بے پروا ہوکر فتنوں کا دروازہ کھول رہی ہے اور قیادت کی تمنا رکھتی ہے!

یہ چکر!!

مسودۂ دستور ابھی اسمبلی میں پیش ہی ہوا ہے اور اُس پر بحث ہی ہورہی ہو کہ "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کی صدارت کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوگئی ہو۔ پہلے یہ باتیں صرف زبانوں پر تھیں۔ اب اُن کا ذکر اخبارات تک میں آگیا ہو ان افواہوں میں کتنی صداقت ہو اس کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی جان سکتا ہو یا وہ لوگ جانتے ہیں جو اس مہم میں شریک ہیں۔ ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ ان خبروں کی اگر تھوڑی بہت اصلیت بھی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ پاکستان کی قسمت کے ستارے ابھی تک گردش میں ہیں۔ اور ہوسِ اقتدار کا چکر ابھی تک چل رہا ہو! یہاں تک خبر گرم ہو کہ بعض اقتدار کے بھوکے، جن کو اسی میں مزہ آتا ہے کہ ایک کو گرائیں اور دوسرے کو بٹھائیں وہ سہروردی صاحب کو کرسیٔ اقتدار پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ یہ بڑے خوفناک ارادے ہیں یہ انتہائی خطرناک اسکیمیں ہیں، اختیار واقتدار کا یہ وہ چکر ہے جو پاکستان کا شیرازہ قیامت تک فراہم نہ ہونے دیگا۔ یہ کیسے لوگ ہیں جن کو غریب پاکستان کی اس زبوں حالی پر بھی رحم نہیں آتا!

اپنے کو بدلیئے!

کوئی مغرب زدہ ہو یا کمیونسٹ، عوامی لیگ کا کوئی ایجنٹ ہو یا کانگریس کا ساختہ پرداختہ۔ سب لوگ کان کھول کر سُن لیں کہ "اسلامی نظام" پاکستان کیلئے مقدر کردیا گیا ہو۔ یہ انشاء اللہ قائم و برپا ہوکر رہے گا، اسے کوئی طاقت، کوئی سازش اور فتنہ پردازی روک نہیں سکتی۔ حق وصداقت کا یہ آفتاب عالمتاب تو پاکستان کے افق پر طلوع ہوکر رہیگا۔ اللہ کی رحمت کے یہ بادل اس خطہ پر برس کرہی دم لیں گے۔ امن وسلامتی کے اس قافلہ کی راہ میں رکاوٹیں ڈال کر کوئی اپنے اعمالنامہ کو سیاہ کرلے تو کرلے مگر اس قافلہ کو منزلِ مقصود کی طرف بڑھنے سے باز نہیں رکھ سکتا۔ ہوسِ اقتدار آخر کب تک کھل کھیلتی رہے گی، سال دو سال، حد سے حد دس سال، کاغذ کی اس ناؤ کو،

ایک نہ ایک دن ڈوبنا ہے۔ حق ایک نہ ایک دن اُبھر کر اور بلند ہو کر رہے گا۔ نفاق کی گھٹائیں اور اغراض و خواہشات کے بادل انشاء اللہ چھٹ کر رہیں گے۔ پاکستان کا مطلع بہت دن تک گرد آلود نہ رہ سکیگا۔ اندھیرے کسی اُفق کی مستقل تقدیر نہیں بن سکتے اور سازشوں کو کسی خطۂ ارض میں حیاتِ جاوید حاصل نہیں ہو سکتی!

پاکستان کے عوام اسلام اور صرف اسلام چاہتے ہیں۔ وہی یہاں آئے گا اور آرہا ہے۔ دستور کا مسودہ اسلام کی آمد آمد ہی کا تو اعلان ہے، مسودۂ دستور کے آتے ہی بعض اُن اخباروں تک کا لب و لہجہ بدل گیا ہے جو اسلامی دستور پر پھبتیاں کستے تھے اور سیاست و دستور اور آئین و حکمرانی کے معاملہ میں اُن کی زبان سے "اسلام" کا لفظ بڑی دُشواری سے نکلتا تھا!

پاکستان کو جب آئینی طور پر اسلامی حکومت تسلیم کر لیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے سربراہ کار بھی وہی لوگ ہوں گے، جن کی زندگیاں اسلامی اخلاق کے مطابق ہوں گی۔ جو لوگ اقتدار کی خواہش اپنے دل سے کسی طرح نکال ہی نہیں سکتے۔ انھیں پاکستان کے اربابِ حل و عقد کی صف میں آنے کے لئے بہرحال اپنی زندگیاں بدل کر اسلامی اخلاق کے مطابق بنانا ہونگی۔ "اسلامی اخلاق" یہ ہے حکومت پاکستان کے عہدوں کے لئے سب سے اہم اور ضروری "qualification"۔

اسلامی دستور ہواؤں میں نہیں چلے گا، اس کا نفاذ پاکستان میں ہوگا، جہاں انسان بستے ہیں، پاکستان کے عوام اپنے اخلاق سے، سیرت سے، کردار و عمل سے، دستور کے ساتھ تعاون کریں گے تو یہ دستور کامیاب ہوگا اور اس کے ثمرات سے ملک بہرہ مند ہو سکیگا۔ پاکستان کو مثالی حکومت بنانا ہے تو اس کے لئے چھوٹے بڑے اور امیر و غریب سب کو مل جُل کر جد وجہد کرنی چاہیئے۔ عوام کو اوپر کے لوگوں پر تنقید و احتساب کا یقیناً حق حاصل ہے مگر دوسروں پر تنقید کرتے ہوئے اپنے گریبانوں میں بھی تو منہ ڈال کر دیکھ لینا چاہیئے کہ ہم خود کیا ہیں؟ عوام کی اکثریت اگر اچھی ہو تو خواص کی مجال ہے کہ وہ بُری راہ پر چل سکیں!

کرسیوں کی تطہیر کے ساتھ بوریوں اور چٹائیوں کی بھی تو تطہیر ضروری ہے۔ قصر و ایوان اور شبستانوں ہی کو نہیں، غریب خانوں، کوارٹروں، جھونپڑیوں اور جھگیوں کو بھی بدلنا ہے۔ موٹر نشین ہی نہیں، فٹ پاتھ پر رات بسر کرنے والے بھی لنگوٹی میں پھاگ کھیلتے ہیں اور جہاں تک اُن کا بس چلتا ہے اور حالات اجازت دیتے ہیں بُری باتوں سے نہیں چوکتے "مسٹروں" ہی کو نہیں "مولاناؤں" کو بھی اور کوٹ پتلون پہننے والوں ہی کو نہیں جبہ و دستار اور عبا و قبا جن کا پہناوا ہے اُن کو بھی بدلنا ہے۔ اور سب سے پہلے بدلنا ہے کہ ان میں سے نہ جانے کتنوں کا کردار اسلام کے لئے وجہ ننگ بنا ہوا ہے۔ اور کتنی عباؤں کی شکنوں میں بناوٹ اور ریاکاری کے بُت چھپے ہوئے ہیں اور کتنے ایسے ہیں جو جاہ پرستی، جی حضوری اور درباداری میں کسی گھٹیا درجہ کے مصاحب سے کسی طرح کم نہیں ہیں ؎

زنہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند   حق را بہ سجودے و نبیؐ را بہ درودے

اسلامی دستور، اسلامی نظام اور اسلامی معاشرہ یہ وہ عناصر ہیں جو مل جُل کر پاکستان کو "مثالی حکومت" بنائیں گے۔ جب یہ ہو جائیگا اُس وقت پاکستان اس قدر مضبوط اور طاقتور ہوگا کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر وہاں کی اکثریت دست درازی نہ کر سکے گی، روس کے لیڈروں اور کرتا دھرتاؤں کی یہ مجال نہ ہو گی کہ وہ پاکستان کے خلاف بکواس کر سکیں۔ امریکہ اور برطانیہ ہماری دوستی اور تعاون کی خود خواہش کرینگے۔ ہماری بات کا اس قدر وزن ہوگا کہ ہمارے اربابِ کار کراچی میں کوئی اعلان فرمائینگے اور مجلس اقوام کے ایوان میں اُس کی دھمک محسوس کی جائیگی، ہم شبنم بن کر جگرِ لالہ کو ٹھنڈک بھی بخشیں گے اور ہمارے عزم و حوصلہ کے طوفان دریاؤں کے دل بھی دہلا دے گا۔ ظالم کا ہم سے بڑھ کر حریف کوئی نہ ہوگا اور مظلوم ہم سے بڑھ کر کسی کو اپنا غمخوار نہ پائیگا

(آمین یارب العالمین)

ماہر القادری ۲۰ جنوری ۱۹۵۶ء

مولانا عبدالحمید ارشد
(ڈیرہ اسمٰعیل خاں)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

امام الانبیاء خاتم الرسل سرورِ عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبیؐ، محبوب اور عظیم المرتبہ رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو کائنات کا محسن و مربی ہے۔ اُس کا سب سے بڑا احسان اور انعام یہی "بعثت و رسالتِ محمدیہ" ہے یہی دُنیا کی کامیابی و کامرانی اور دارین کی سعادت مندی کا واحد ذریعہ اور تنہا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "بعثتِ محمدیہ" کا ذکر جب فرمایا ہے تو احسان و منّت کے پیرایہ میں اس کا اظہار فرمایا ہے۔ اور سب سے عظیم ترین نعمت کی قدر دانی کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۔ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۔ (التوبہ)

لوگو! تمہارے پاس تمہیں (انسانوں) میں سے اللہ تعالیٰ کا پیارا رسول تشریف لاچکا ہے۔ جنہیں تمہاری ہر تکلیف دشوار و ناگوار ہے۔ آپ لوگوں کی ہر گونہ خیر خواہی کے وہ بہت ہی خواہشمند ہیں۔ اور خصوصاً مومنوں پر تو آپؐ حد درجہ کے شفیق و مہربان ہیں۔ پھر بھی اگر یہ لوگ اُن کی اطاعت سے منہ موڑیں تو آپؐ کہدیجئے مجھے اللہ کافی ہے جس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ اُسی پر میرا سب سہارا ہے اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک شہنشاہ لایزال و بے مثال ہے۔

اس آیت کریمہ سے صحیح تفکر کے ذریعہ منجملہ دیگر فوائد حسب ذیل حقائق ظاہر ہوتے ہیں:۔

(۱) رسولؐ تمہاری جنس (بشر) ہی سے ہیں۔ تمہارے لئے اُن کی بات سمجھنا اور اعمال و اخلاق میں اقتدار کرنا سہل اور آسان ہے۔

(۲) بشر کو اللہ تعالیٰ نے یہ شرف عطا کیا ہے کہ اپنی برگزیدہ ترین مخلوق انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات انہی میں سے مبعوث فرمائے ہیں۔ یہ وہ شرف ہے جو انسان کو بحیثیتِ مجموعی تمام مخلوقات پر برتری اور امتیاز بخشتا ہے۔۔۔ انسان کو اس عطا کردہ شرف و امتیاز کی قدر کرنا چاہیئے۔ اور انبیاءؑ و رسل پر ایمان لاکر اُن کا اتباع کرنا چاہیئے۔ ورنہ کفرانِ نعمت اور قدر ناشناسی کے جرم کے مرتکب ہو کر دُنیا و آخرت میں خسران و ناکامی کے سوا انہیں کچھ نصیب نہ ہوگا۔ (والعیاذ باللہ)

(۳) انبیاء و رسل علیہم السلام جب آتے ہیں تو خالی ہاتھ نہیں آتے۔ بلکہ اپنے ساتھ عظیم الشان سوغات اور تحائف (علمی، عملی، اخلاقی اور مادی ہر قسم) لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب

تشریف لائے تو اپنے ساتھ قرآن پاک کا عظیم المرتبت، کثیر البرکات، گرانبہا خدائی تحفہ اور الٰہی ہدیہ، دنیا والوں کے لئے لائے۔ جس سے بڑھ کر کسی نعمت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہی اُس رسول کی رسالت کا پیغام ہے۔ جو وہ خدا تعالیٰ کی طرف سے تمام مخلوقات کی بھلائی کے لئے لائے ہیں۔

(۴) جو دین اور رسالت و پیغام آپؐ خدا کی طرف سے لائے ہیں۔ اُس میں سرتا سر بھلائی، خیر خواہی، تیسر اور آسانی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ امورِ شاقہ، دشوار اور مشکل یا مضرتِ رساں اور بے فائدہ اور کم سود مند چیزوں سے اس میں یکسر اجتناب فرمایا گیا ہے۔ دینِ حق ـــــ اسلام کی بناء ہی خیر خواہی اور نفعِ خلائق پر ہے۔
یہ تیسر سب رعایا کے ساتھ بلا امتیاز مومن و کافر (ذمی) برتا جائے گا۔ حتیٰ کہ نادار ذمی۔ جو کمانے کے قابل نہ ہو (بیمار، اپاہج یا بوڑھا ہو) اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ بیت المال سے اُس کا گزارہ بھی مقرر کر دیا جائے گا۔ اسی طرح بچوں اور عورتوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جائے گا۔ نیز انصاف حاصل کرنے کی سہولتیں (بلا ادائے فیس) سب کے لئے یکساں ہوں گی۔ اور سب کے سب امن و رفاہیت کی زندگی بسر کر سکیں گے۔

(۵) اس عام تیسر اور نفع رسانی کے علاوہ آپؐ مومنوں پر بے انتہا شفیق و مہربان ہیں۔ آپؐ کا پیغام اُن کے لئے بے حد شفقت و رحمت اور مروّت و احسان اور فیاضی و غمگساری کے جذبات کا حامل ہے۔ اور اُن کی دنیا و آخرت کی فلاح و سعادت مندی کا مستقل کفیل و ضامن ہے۔ الحمد للہ۔

(۶) اس قدر عظیم الشان برکات و منافع کے ہوتے ہوئے بھی اگر بدبخت اور قدر ناشناس لوگ اس پیغامِ حق ـــــ قرآنِ عظیم اور رسالتِ محمدیہ سے منہ موڑیں اور اعراض و سرتابی پر آخر وقت تک اَڑے رہیں۔ تو اس میں اُن کا اپنا خسارہ ہے۔ آپؐ کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ آپؐ اعلان فرما دیجئے کہ ہر حال میں میرا اللہ، میرا مولیٰ، میرا رب، اور میرا محسن و مربی میری حمایت و نصرت اور حفظ و صیانت کے لئے کافی ہے۔ وہ واحد و لاشریک اور یگانہ و یکتا ہے۔ وہی حافظ و ناصر اور کارسازِ حاجت روا اور لائقِ پرستش و بندگی ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا اِن صفات سے متصف نہیں اور مخلوقات میں سے کوئی بھی (خواہ نبی ہو یا ولی یا فرشتہ وغیرہ) حریمِ الوہیت میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ سب کے سب عبودیت و بندگی کے دائرے میں رہتے ہوئے "عبد" کے درجات و مراتب طے کر سکتے ہیں۔ تا آنکہ بفضلِ خدائے رحیم و کریم "عبدیت" کے انتہائی مقام پر (حسبِ استطاعت و توفیقِ ایزدی) فائز ہو جاتے ہیں۔ جہاں اُن کا ذرہ ذرہ عبودیتِ کاملہ کا (اعتقاداً، قولاً و عملاً) مظہرِ اتم بن جاتا ہے۔ اور عبد کا یہ منتہائے کمال ہے۔ اس مقام پر بندہ پیکرِ عجز و نیاز، ایثار و خلوص اور اطاعت و فدویت بن جاتا ہے۔ رضائے مولیٰ اس کے لئے سب سے مقدم اور اہم ترین چیز ہوتی ہے۔ اُس کی راہ میں قربان ہونا اُس کی اوّلین خواہش ہوتی ہے۔

(۷) تمام انبیاء کرامؑ کی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے آقا و مولیٰ ـــــ اللہ جلّ شانہٗ پر ہر وقت اور ہر معاملہ میں کامل اعتماد و توکل اور پورا پورا بھروسہ ہے کہ وہی مدد فرمائے گا اور دینِ حق اور کتابِ حق ـــــ قرآنِ عزیز اور اُس کے پیش کردہ نظامِ عدل و انصاف کو، منکروں کی ناپسندیدگی کے باوجود، غلبہ و برتری عطا فرمائے گا کہ وہی بلا شرکتِ غیرے مدبّر و متصرّف فی الامور، شہنشاہِ کائنات اور عرشِ عظیم کا مالک ہے۔ ؎

حضرتِ حق یگانہ و یکتا است   مالک الملک، صاحبُ الاسماست

ذاتِ او مجمعِ کمالات است — خالقُ الارض والسّمٰوات است
ذاتِ پاکش نہ مستعدِ فنا است — ہر کجا جلوہ از وپیدا ست
ہیچ کارے زغیرِ او ناید — جبہ سائی بپیشِ او شاید
نعمتش را چو نیست پایانے — کے توانیم مدح شایانے؟

خراجِ تحسین

اُدباء، شعراء اور عقلائے زمانہ میں سے انصاف پسند اور سعادت مند اشخاص نے ہر زمانہ میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت ہی عمدہ الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان میں سے چند نمونے ذیل میں ملاحظہ ہوں:۔

حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ شاعرِ دربارِ نبوی فرماتے ہیں:۔

تَاللّٰہِ مَا حَمَلَتْ اُنْثٰی وَلَا وَضَعَتْ — مِثْلَ الرَّسُوْلِ نَبِیِّ الْاُمَّۃِ الْھَادِیْ[1]

بخدا! کسی ماں نے آج تک رسول اللہ جیسا بچہ نہیں جنا۔ آپ ہادیٔ عالم اور جملہ اقوام و اُمم کی طرف خدا تعالیٰ کا پیغام پہنچانے والے رسولِ برحق ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا ہے:۔

وَاَحْسَنُ مِنْکَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَیْنٌ — وَاَجْمَلُ مِنْکَ لَمْ تَلِدِ النِّسَآءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ کُلِّ عَیْبٍ — کَاَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَآءُ[2]

آپ جیسا حسین و جمیل کسی آنکھ نے آج تک نہیں دیکھا اور نہ کسی عورت نے جنا ہے۔ آپ ہر عیب سے مبرّا پیدا کئے گئے ہیں۔ گویا آپ اپنے منشاء کے مطابق (کامل انسان) پیدا کئے گئے ہیں۔ (یہ سب اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم ہے)

ابوطالب ۔ رسول اللہ صلعم کے چچا ابوطالب آپ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں:۔

(۱) وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِیْنَ مُحَمَّدٍ — مِنْ خَیْرِ اَدْیَانِ الْبَرِیَّۃِ دِیْنًا
(۲) لَوْلَا الْمَلَامَۃُ اَوْحِذَارِیْ سُبَّۃً — لَوَجَدْتَنِیْ سَمْحًا بِذَاکَ مُبِیْنًا
(۳) وَاللّٰہِ لَنْ یَّصِلُوْا اِلَیْکَ بِجَمْعِھِمْ — حَتّٰی اُوَسَّدَ فِی التُّرَابِ دَفِیْنًا[3]

(۱) بخدا! مجھے معلوم ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ادیانِ عالم میں سے بہترین دین و آئین ہے۔
(۲) اگر ملامت کا اندیشہ یا خوفِ سب و شتم اور کفار کے طعن و تشنیع کا ڈر نہ ہوتا تو یقیناً آپ مجھے کھلے طور پر اور بخوشی اسے قبول کرنے والا پاتے۔
(۳) خدا تعالیٰ کی قسم! کفار اپنے جتھوں سمیت آپ کی آزار رسانی کے لئے آپ تک کبھی بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ تا آنکہ میں (مرکر) مٹی میں دفن کیا جاؤں۔ (میرے جیتے جی کافر آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے)

عباسؓ بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یہ آپ کے دوسرے چچا ہیں۔ جو مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ اور اسلام

---

[1] احسن القصص لعلی فکری۔ الجزء الثانی ص ۱۶۷۔
[2] "الادب الطیب" جزء ثانی ص ۸۳ (عَیْنِیْ بجائے عَیْنٌ) [3] احسن القصص جلد ۲۔ قصص الانبیاء ص ۲۲۹۔

کے لئے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ آپ کی مدح میں فرماتے ہیں:۔

(۱) وَاَنْتَ لَمَّا وُلِدْتَ اَشْرَقَتِ الْاَرْ ... ضُ وَضَاءَتْ بِنُوْرِکَ الْاُفُقُ

(۲) فَنَحْنُ مِنْ ذٰلِکَ النُّوْرِ فِی الضِّیَا ... ءِ وَسُبُلِ الرَّشَادِ نَخْتَرِقُ[1]

۱۔ (اے نبیؐ!) آپؐ جب پیدا ہوئے تو روئے زمین پر چاروں طرف روشنی ہی روشنی پھیل گئی اور آفاق واکناف عالم آپؐ کے مبارک انوار سے جگمگا اٹھے۔

۲۔ سو ہم اسی نور کی بدولت کھلی روشنی میں آگئے ہیں اور رشد وہدایت کے راستوں اور منزلوں کو آپؐ ہی کی نورانیت میں طے کر رہے ہیں۔

کعبؓ بن زہیر، مشہور عرب شاعر آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر سابقہ کوتاہیوں کی معذرت چاہتا ہے اور مشرف باسلام ہوکر آپؐ کی مدح میں ایک طویل قصیدہ[2] پڑھتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

اِنَّ الرَّسُوْلَ لَنُوْرٌ یُّسْتَضَاءُ بِہٖ ... وَصَارِمٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰہِ مَسْلُوْلُ

رسول اللہ صلعم فی الحقیقت ایک ایسی عظیم الشان روشنی کے مالک ہیں جن سے دنیا جگمگا رہی ہے، آپؐ آفتاب درخشندہ اور سراج منیر ہیں اور سرکش کافروں کے لئے آپؐ "خدائی شمشیر برہنہ" ہیں۔ جو ان کے سروں پر لٹک رہی ہے۔

آگے معذرت میں کہا ہے:۔

(۱) اُنْبِئْتُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ اَوْعَدَنِیْ ... وَالْعَفْوُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ مَأْمُوْلُ

(۲) لَا تَأْخُذَنِّیْ بِاَقْوَالِ الْوُشَاۃِ وَلَمْ ... اُذْنِبْ وَاِنْ کَثُرَتْ فِیَّ الْاَقَاوِیْلُ[3]

۱۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے ناراض ہیں اور مجھے سزا کا سزاوار گردانتے ہیں (لیکن) آپؐ کی ذاتِ گرامی سے عفو ودرگزر کی ہر وقت بڑی امید کی جاسکتی ہے۔

۲۔ چغلخوروں کی باتوں پر مجھے قصوروار ٹھہرا کر میری گرفت نہ فرمائیے گا۔ میرے بارے میں چاہے باتیں بہت پھیلائی گئی ہوں (لیکن) میں نے (ان جرائم) کا ارتکاب نہیں کیا۔

رسول اللہ صلعم نے کعبؓ کو معاف فرما دیا اور اپنی چادرِ مبارک اس کو انعام میں مرحمت فرمائی۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ۔

مالکؓ بن عوف نضری (امیر ہوازن) آپؐ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے:۔

(۱) مَا اِنْ سَمِعْتُ وَلَا رَأَیْتُ بِمِثْلِہٖ ... فِی النَّاسِ کُلِّھِمْ بِمِثْلِ مُحَمَّدٍ

(۲) وَاِذَا الْکَتِیْبَۃُ عَرَّدَتْ اَنْیَابُھَا ... بِالسَّمْھَرِیِّ وَضَرْبِ کُلِّ مُھَنَّدٍ

(۳) فَکَاَنَّمَا لَیْثٌ عَلٰی اَشْبَالِہٖ ... وَسْطَ الْمَبَاءَۃِ خَادِرٌ فِیْ مَرْصَدٍ[4]

---

[1] زاد المعاد الامام ابن القیم الجوزیؒ جلد ۳ صفحہ ۱۳۔ [2] یہ قصیدہ "بانت سعاد" کے نام سے مشہور ہے۔
[3] احسن القصص جلد ۲ صفحہ ۲۹۲۔ [4] السمھری: الرمح الصلب۔ المباءۃ: المنزل۔ خادر: مقیم، ساکن۔

(۱) میں نے باقی سب لوگوں میں محمد رسول اللہ جیسا جامع الکمالات انسان (عمر بھر میں) دیکھا نہ سنا ہے۔

(۲،۳) اور جب فوجیں مضبوط نیزے چبھو کر مخالفوں میں (گویا) اپنے دانت گاڑ دیتی ہیں اور ہر طرح کی شمشیر زنی کے کرتب دکھاتی ہوئیں مصروفِ پیکار ہوتی ہیں۔ تو اس وقت رسول اللہ صلعم (حمایتِ اسلام اور نصرتِ دینِ حق کے لئے) میدانِ جہاد میں، کفار کی تاک میں بیٹھ کر، ایسے بہادرانہ اور اولوالعزمانہ کارنامے انجام دیتے ہیں جیسے شیر اپنے کچھار میں اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے ہر وقت مستعد ہو کر دشمن کی تاک میں ہوتا ہے۔

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ علیہ وعلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْن ۔

ڈاکٹر شوقی:۔ مصر کے مشہور ادیب اور قومی شاعر (شوقی بک) نے مدحِ رسول میں فرمایا ہے۔ (بہ سلسلۂ ولادت باسعادت:۔

وُلِدَ الْھُدٰی فَالْکَائِنَاتُ ضِیَاءٌ		وَفَمُ الزَّمَانِ تَبَسُّمٌ وَّثَنَاءٌ

ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔ جس سے ساری دنیا یکقلم نور بن گئی اور زمانہ فرطِ مسرت سے مسکرا رہا ہے۔ اور رسول اللہ کی ستائش اور حمدِ باری تعالی کے ترانے گا رہا ہے۔

عائشۃ التیموریہ:۔ مصر کی مشہور قومی شاعرہ اس طرح مدحتِ رسول صلعم میں رقمطراز ہے:۔

(۱) طٰہٰ الَّذِیْ قَدْ کَسَا اِشْرَاقُ بِعْثَتِہٖ		وَجْہَ الْوُجُوْدِ سَنَاءَ الرُّشْدِ وَالْکَرَمِ

(۲) طٰہٰ الَّذِیْ کَلَّلَتْ اَنْوَارُ سُنَّتِہٖ		تِیْجَانَ، اُمَّتِہٖ، فَضْلًا عَلَی الْاُمَمِ

(۳) نِعْمَ الْحَبِیْبُ الَّذِیْ مَنَّ الرَّقِیْبُ بِہٖ		وَھُوَ الْقَرِیْبُ لِرَاجِی الْمَجْدِ وَالنِّعَمِ

(۴) رُوْحِی الْفِدَاءُ، وَمَنْ لِّیْ اَنْ اَکُوْنَ لَہٗ		ھٰذَا الْفِدَاءُ، وَمَوْجُوْدِیْ کَمُنْعَدِمِ

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے آفتاب عالمتاب نے ساری ہستی کو رشد و ہدایت اور کرم اخلاق کی خیرہ کر دینے والی چمک سے ڈھانپ دیا ہے۔

۲۔ آپ مہبطِ وحی "طٰہٰ" ہیں۔ آپ کی مبارک سنت اور طریقۂ دینی (شریعت) کی تابانیوں اور درخشانیوں نے، آپ کی امت کو "نورانی تاج" پہنا دیے ہیں۔ (لہٰذا) وہ باقی امتوں سے درجات میں (بفضلہٖ تعالیٰ) بڑھ گئی ہے۔

۳۔ آپ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ "حبیب" اور امت کے محبوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خاص احسان فرما کر امت کو آپ کی بعثت سے نوازا ہے۔ آپ کی رہنمائی اس شخص کے قریب ہے جو مجد و شرفِ انسانی کا طالب اور الٰہی نعمتوں کا صحیح امیدوار ہے۔ (آپ کا پیغام حق ان تک پہنچ چکا ہے جس پر عمل پیرا ہو کر وہ بزرگی و رفعت اور ہر طرح کی خداداد نعمتوں کو حاصل کر سکتے ہیں)

(۴) میری روح آپ پر قربان ہو۔ کوئی ہے جو میرے لئے اس قربانی کا موقع بہم پہنچا دے؟ اِس "نعمتِ فدویت" کے بدلے میں خواہ مجھے اپنی سب موجودہ ثروت اور مال و دولت کو قربان کرنا پڑے۔ (تب بھی میں ہیچ رہوں)

امام بوصیری رحمۃ اللہ علیہ قصیدہ بردہ شریف میں اس طرح مدحت سرا ہیں:-

وَانْسُبْ اِلٰی ذَاتِہٖ مَا شِئْتَ مِنْ شَرَفٍ ۔۔۔ وَانْسُبْ اِلٰی قَدْرِہٖ مَا شِئْتَ مِنْ عِظَمٖ

(دائرۂ عبدیت میں رکھتے ہوئے) آپ رسول اللہ صلعم کی ذات گرامی کی طرف جو بھی انسانی شرف و رفعت کو منسوب کرنا چاہیں، کریں کہ آپ اُس کے بجا طور پر حقدار ہیں۔

مُنَزَّہٌ عَنْ شَرِیْکٍ فِیْ مَحَاسِنِہٖ ۔۔۔ فَجَوْھَرُ الْحُسْنِ فِیْہِ غَیْرُ مُنْقَسِمٖ

انسانی محاسن و کمالات میں کوئی بھی آپ کا ہم پلہ نہیں، حُسن و خوبی میں آپ یکتائے روزگار ہیں۔ (سُبْحَانَ اللّٰہِ الْوَاحِدِ الْعَظِیْم !!)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا ہے:-

کَفَاکَ بِالْعِلْمِ فِی الْاُمِّیِّ مُعْجِزَۃً ۔۔۔ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ، وَالتَّأْدِیْبِ فِی الْیُتُمٖ

نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ ہدایت کے لئے کافی ہے کہ آپ دورِ جاہلیت میں پیدا ہونے کے باوجود خداداد علم کے بلند درجہ پر فائز ہیں۔ اور یتیمی میں اللہ تعالیٰ نے بلا واسطہ آپ کی تادیب و تربیت (وحی کے ذریعہ) فرمائی جس کی وجہ سے آپ کو مکارمِ اخلاق اور تہذیب و شائستگی میں کمال حاصل تھا۔

نیز امام بوصیریؒ قصیدہ ہمزیہ میں فرماتے ہیں:-

(۱) رَحْمَۃٌ کُلُّہٗ وَحَزْمٌ وَعَزْمٌ ۔۔۔ وَوَقَارٌ وَعِصْمَۃٌ وَحَیَاءٌ

(۲) لَا تَحُلُّ الْبَأْسَاءُ مِنْہُ عُرَی الصَّبْرِ ۔۔۔ وَلَا تَسْتَخِفُّہُ السَّرَّاءُ

(۳) کَرُمَتْ نَفْسُہٗ فَمَا یَخْطُرُ السُّوْ ۔۔۔ ءُ عَلٰی قَلْبِہٖ وَلَا الْفَحْشَاءُ

۱۔ رسول اللہ صلعم سراپا رحمت، ہوشمندی، ہمت و استقلال، عظمت و توقیر کے پیکر، صاحبِ عصمت و عفت اور سرتاسر روشنی و تابانی ہیں۔

۲۔ کوئی بڑی سے بڑی تکلیف بھی آپ کے صبر و ثبات کی کڑیوں کو نہ کھول سکتی۔ اور نہ ڈھیلا کر سکتی ہے۔ اور نہ خوشی اور سُکھ آپ کی سنجیدگی اور وقار میں کچھ کمی کر سکتے ہیں۔ تکلیف اور دُکھ میں آپ صابر و شاکر اور سُکھ اور آسودگی میں آپ باوقار اور شکر گزار رہتے ہیں۔ خفیف الحرکاتی اور بے صبری سے آپ بفضلہ تعالیٰ یکسر بالاتر واقع ہوئے ہیں۔

۳۔ آپ کی ذاتِ گرامی بڑی ہی شریف اور بلند کردار ہے۔ آپ کے قلبِ مبارک پر بُرائی یا خلافِ عصمت و مروّت کسی بات کا خیال تک بھی نہیں آ سکتا۔ (خداداد عصمت سے آپ معصوم و مأمون ہیں) الحمد للہ۔

عبدالحمید ارشد۔ راقم السطور ارشد نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں جذباتِ احترام کا اظہار بدیں الفاظ کیا ہے:-

أَمْسَی الْبِلَادُ مُضَاءَۃً بِضِیَائِہٖ ۔۔۔ اِذْ صَدَّقَ النَّاسُ الْبَشِیْرَ نَذِیْرًا

دُنیا کے سب ملک اور علاقے (آپ کی ولادت باسعادت اور پھر آپ کی بعثت کے وقت) آپ کی ضیا پاشیوں اور تابناکیوں سے بقعۂ نور بن گئے اور لوگ اس نورانیت سے اُس وقت بخوبی مستفیض ہوئے۔ جب انہوں نے اُس رسولِ کریمؐ کی جو بشیر و نذیر ہیں تصدیق کی۔ اُن پر ایمان لائے اور اُن کی تعلیمات و ہدایات اور اسوۂ حسنہ کی پیروی کی۔

آگے پھر عاجز راشد نے ہدایائے عقیدت اس طرح پیش کئے ہیں:-

نِعْمَ الْإِلٰهُ ، إِلٰهُنَا فَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْبَرِیَّةَ بِالْأُمُوْرِ خَبِیْرًا

ہمارا اللہ کس قدر پیارا اور جلیل الشان، قادر و توانا ہے کہ اُس نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور اُن کی سب باتوں اور حالتوں سے وہ ہر وقت باخبر، دانا و بینا ہے۔

نِعْمَ النَّبِیُّ ، نَبِیُّنَا الْمُخْتَارُ دَاعِی الْأَنَامِ إِلَی النَّجَاةِ بَشِیْرًا

اور اللہ تعالیٰ نے ہماری طرف جو نبیؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجا ہے وہ بھی بڑا ہی پیارا، مختار و برگزیدۂ رب تعالیٰ ہے۔ لوگوں کو فلاح و نجات کی طرف بُلانے والا اور ایمان و تقویٰ پر جنت کی بشارت دینے والا ہے۔

نِعْمَ الْکِتَابُ ، کِتَابُنَا الْقُرْآنُ نَارَ الْقُلُوْبُ بِنُوْرِهٖ تَنْوِیْرًا

اور ہماری کتاب یعنی قرآنِ پاک بڑی خوبیوں والا ہے۔ مومنوں کے دل اس کی نورانیت سے تاباں و درخشاں ہیں۔ (الحمد للہ)

یَا حَبَّذَا الْإِسْلَامُ دِیْنًا قَیِّمًا فَاقَ الْمَذَاهِبَ بِالْجَمَالِ کَثِیْرًا

اسلام — یعنی دینِ قیم و برحق کی خوبیوں کا کیا کہنا ہے؟ جو جملہ ادیان و مذاہبِ عالم میں ممتاز اور سب پر فائق ہے۔ اور حُسن و جمال میں یکتا و بے نظیر ہے۔ (الحمد للہ)

فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ الْمَلِیْكِ الْمُقْتَدِرِ ثُمَّ الصَّلٰوةُ عَلَی النَّبِیِّ کَثِیْرًا

سو ان تمام بے نظیر نعمتوں اور خوبیوں پر اللہ تعالیٰ کی جناب میں بے شمار تحائفِ حمد و ثنا پیش کرتا ہوں۔ جو اکیلا ہی شہنشاہِ کائنات اور اقتدارِ اعلیٰ کا مالک، واحد و یگانہ ہے۔ پھر کروڑوں کروڑوں مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر (آپ کی آلؑ و ازواجؓ و اصحابؓ پر اور اُن کے ضمن میں خود اپنے اور اپنے اہل و عیال اور اسلاف پر) صلوٰۃ و سلام بھیجتا ہوں۔ اللّٰھم آمین!

اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْنَا عَلَی الْإِیْمَانِ وَالْإِسْلَامِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ أَوَّلًا وَآخِرًا دَائِمًا أَبَدًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔

ماہر القادری

آنکھوں نے دیکھا اور قلم نے بیان کیا

شہر کی دیواروں پر پوسٹر لگ چکے ہیں جن میں اعلان کیا گیا ہے کہ جماعتِ اسلامی کا سالانہ اجلاس ککری گراؤنڈ میں منعقد ہوگا- لوگ اس اشتہار کو دیواروں پر چسپاں دیکھ کر گزر نہیں جاتے- اس اشتہار کو بڑے غور و توجہ کے ساتھ پڑھا جا رہا ہے کسی کسی راہگیر کی اشتہار پڑھنے میں پیشانی کی لکیریں ابھر آتی ہیں اور کوئی دبی زبان سے کہتا جاتا ہے:-

"اس اندھیرے میں امید کی کرنیں بس یہی نظر آتی ہیں"

وقت بڑا گریز پا واقع ہوا ہے- پلک جھپکی اور جُگ بیت گئے- لیجئے نومبر کی ۱۹ تاریخ بھی تیزی کے ساتھ دبے پاؤں آ پہنچی- چار دن پہلے ککری گراؤنڈ میں نوجوان لڑکے کھیلتے اور کودتے پھاندتے دکھائی دیتے تھے، مسطح اور کہیں کہیں ناہموار زمین! بچوں کے جھولنے اور ورزش کرنے کے لئے کچھ لکڑیاں گڑی ہوئیں- بس یہ تھی یہاں کی کل کائنات! پولیس کی نگاہ سے بچ کر کوئی خوانچہ والا بھی کبھی کبھار ادھر آ جاتا تھا- مگر تین چار دن میں یہاں کے زمین و آسمان ہی بدل گئے- بہتر گھنٹوں میں شاید ایک منٹ کے لئے بھی یہاں کام نہیں رُکا- جماعت کے فرض شناس کارکنوں نے دن رات ایک کر دیئے- ہفتوں کا کام یہاں گھنٹوں میں ہوا ہے-

حکومت کی طرف سے جلسہ کرنے کی اجازت تاخیر سے نہ ملتی تو اطمینان اور نشاطِ خاطر کے ساتھ انتظام ہو سکتا تھا- اس پریشانی اور طوفانی اہتمام کی نوبت کاہے کو آتی- مگر اس کو کیا کیجئے کہ جماعتِ اسلامی کے معاملہ میں حکومت کا دل کبھی پسیجا بھی ہے تو اس کرم فرمائی میں کچھ سرد مہری کی آمیزش رہتی ہے- لیکن:-

"رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند"

کا یہ سلسلہ دیر تک نہ چل سکے گا- ع

زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی!

اب سے چار سال پہلے میں نے ایک خالص تماشائی کی حیثیت سے جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجلاس کا نظارہ کیا تھا- اب کے دل چاہا، بلکہ یوں سمجھئے کہ اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس بزم میں خود شامل ہو کر اور اس بحرِ مواج میں اتر کر دیکھوں کہ نظارہ و تماشا میں تجربہ بھی شامل ہو جائے-

۱۹- نومبر کی شام میں عصر کی نماز پڑھ کر گھر سے روانہ ہوا- ککری گراؤنڈ کے لئے کرایہ کی رکشا کی اور پندرہ بیس منٹ میں وہاں پہنچ گیا- چار سال کے بعد اس قطعۂ زمین کے نصیب جاگے ہیں- کل تک یہ لہو و لعب اور تفریح کا میدان تھا- آج یہاں اقامتِ دین کے مجاہدوں کا قافلہ آ کر اترا ہے- کیا چہل پہل ہے- کیسی گہما گہمی ہے! ع

یہاں تو زندگی ہی زندگی معلوم ہوتی ہے!

مہمانوں کی بہت بڑی تعداد آچکی ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ میں نے بھی سات روپے داخل کرکے بلّہ اور راشن کارڈ حاصل کیا۔ مگر میری اقامت کا پروگرام کل صبح سے شروع ہوگا۔ آج شب میں مصروفیت ہے۔ "کاروانِ حجاز" اور فاران کے "سیرت نمبر" کے اشتہارات کپڑوں پر لکھوائے ہیں۔ انہی کو آویزاں کرانے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ انتظامی معاملات سے طبیعت کو کبھی مناسبت نہیں رہی۔ یہ معاملہ جب بھی درپیش آجاتا ہے تو ذراسی بات کے لئے خاصہ پریشان ہوجاتا ہوں۔ شاعرانہ مزاج ذمہ داریوں سے ہمیشہ گھبراتا ہے۔ یہ وحشی بڑی مشکل سے رام ہوتا ہے — اور یہ بھی ہے کہ ع

اندک اندک عشق در کار آورد دیوانہ را

اجتماع کا آغاز ۲۰ نومبر کو ساڑھے نو بجے ہوا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ارکانِ جماعت کو خطاب فرمارہے ہیں۔ یہ عام اجلاس نہیں ہے۔ پھر بھی حاضرین کی تعداد دس ہزار سے کیا کم ہوگی۔ مہمانوں کی اقامت گاہ کی قناتوں کو ہٹا کر حاضرین کی نشست کا انتظام کرنا پڑا۔ مولانا مودودی نے مختصر تقریر کی مگر مفید اور اثر انگیز۔ ایک ایک فقرہ جچا اور تُلا ہوا۔ مغز ہی مغز اور جوہر ہی جوہر! اللہ تعالیٰ نے اس مرد مجاہد کو پھانسی گھر سے ملتِ اسلامیہ کے درمیان پھر واپس بھیجا ہے۔ ع

دشمن اگر قوی است نگہباں قوی تراست!

کی معنویت اس واقعہ کے بعد پوری طرح سمجھ میں آئی۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مشیت کے آگے بڑے بڑوں کے ارادے ناکام ہو کر رہ گئے، آنے والے مؤرخ ان اسرار کو بے نقاب کریں گے۔ ابھی زبان و قلم کو پوری آزادی کہاں حاصل ہے!

امیر جماعتِ اسلامی کی تقریر کے بعد رپورٹوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جماعتِ اسلامی کے کام اور رفتارِ ترقی کی رُوداد کے علاوہ خدمتِ خلق اور محنت کاروں کے کام کی نیز بیت المال اور دارالعروبہ کی رپورٹیں پیش ہوئیں، ہم نے اچھے خاصے منظم اجتماعات میں دیکھا ہے کہ مقالے اور رپورٹیں حاضرین توجہ سے نہیں سُنتے۔ رپورٹوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی جمی جمائی بزم اُکھڑنے لگتی ہے۔ مگر جماعتِ اسلامی کے اس اجتماع میں رپورٹیں پڑھی جاتی رہیں اور ہزاروں آدمی خاموشی اور توجہ کے ساتھ سُنتے رہے۔ آخری رپورٹ دارالعروبہ کی تھی۔ جو عربی زبان میں جماعتِ اسلامی کے نشر و اشاعت کا شعبہ ہے۔ محمد عاصم صاحب رپورٹ سُنا رہے تھے اور میری آنکھوں کے سامنے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی صورت پھر رہی تھی۔ یہ پودا انہی کا لگایا ہوا ہے۔ اس کے پروان چڑھنے کا زمانہ آیا تو وہ اللہ کو پیارے ہوگئے! مسعود عالم ندوی کا بدل مشکل ہی سے مل سکے گا۔ مگر اللہ نے چاہا تو یہ کام رُکے گا نہیں۔ محمد عاصم نے اپنے اُستاد کی بہت سی علمی خصوصیتوں کو جذب کرلیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال رہا تو جماعتِ اسلامی کی دعوت اور پکار قاہرہ، دمشق، لبنان، خرطوم، ریاض، بغداد، افغان اور الجزائر میں پہلے سے زیادہ توجہ اور شوق کے ساتھ سُنی جائے گی۔ افراد آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں مگر قوم زندہ رہتی ہے۔ پھر اللہ چاہے تو گھاس کے تنکے میں کوہ گراں کی قوت پیدا کردے اور اپنے جس بندے سے جو چاہے کام لے لے۔ خود ذاتِ رسالت مآبؐ (فداہ ابی و امی) کے بعد دین کا کام بند نہیں ہوا تو اور کس کی موت سے یہ کام بند ہوگا!

وہ فتنہ پرداز اور الزام تراش جو جماعتِ اسلامی کی آمدنی کے بارے میں طرح طرح کے شوشے چھوڑتے رہتے ہیں ان سے تو خیر کچھ نہیں کہتے کہ وہ جان بوجھ کر ایسے اوچھے وار کرتے ہیں مگر عوام سے ہم یہ ضرور کہیں گے کہ وہ جماعتِ اسلامی کے بیت المال کی رپورٹ اپنے اطمینان کے لئے ضرور پڑھ لیں۔ اس رپورٹ سے انھیں معلوم ہوجائے گا کہ جماعتِ اسلامی کی آمدنی کے کیا ذرائع ہیں اور اخراجات کن مدوں میں ہوتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کے رجسٹروں میں پائی پائی کا حساب رکھا جاتا ہے۔ اس کے کارکنوں کی "امانت" سے کم آج کل کے خیانت آمیز معاشرے میں تو ایک مثالی کردار رکھتی ہے!

ضبط و نظم

لگری گراؤنڈ میں ایک اچھی خاصی بستی آباد ہے۔ جہاں ڈھائی ہزار کے لگ بھگ لوگ ٹھہرے ہوں اور جن کی نماز، طبی امداد اور قیام و طعام کا اسی خیمہ گاہ میں انتظام ہو تو اُسے بستی نہ کہیں تو اور کیا کہیں۔ اس اجتماع گاہ میں ایک درجن سے کم دفاتر کیا ہوں گے؟ سہولت اور آسانی کی جو تدبیریں ممکن ہو سکتی ہیں وہ سب بروئے کار لائی گئی ہیں۔ یہاں تک کہ "لقطہ" بھی قائم ہے۔ جہاں لوگوں کی گم شدہ اشیاء جمع کر دی جاتی ہیں۔ اور چیزوں کے مالک پہچان پہچان کر اپنی چیزیں حاصل کر لیتے ہیں۔ اشیاء کی گم شدگی اور پھر اُن کو پہچان کر حاصل کرنے کا مسئلہ خاصہ پیچیدہ ہے۔ مگر جماعت اسلامی کے اجتماع میں یہ عقدہ ایک ہی جنبش میں وا ہو جاتا ہے۔ یہاں امانت اور راست بازی کا چلن ہے۔ مہمان ہو یا میزبان، ارکان ہوں یا متفقین سب کے سب اللہ کے فضل سے خدا کا خوف دل میں رکھتے ہیں اور جن دلوں میں اللہ کا خوف ہوتا ہے۔ وہاں بد معاملگی، بدمزگی اور تلخی پیدا کیوں ہونے لگی!

اجتماع کے کارکن کس ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کیا ڈسپلن اور ضبط و نظم ہے۔ جس کی جہاں ڈیوٹی لگا دی گئی بس وہ فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کی ایک مثال قائم کر دینا چاہتا ہے۔ رات کو جو لوگ پہرہ دیتے ہیں۔ اُن میں مجاہدوں کے سے انداز پائے جاتے ہیں۔ بیت المال کے خیمہ کے دروازے پر ایک بندوق بدوش سنتری نظر آئے۔ باہر سے آئے ہوؤں کی امانتیں بھی تو یہاں رکھی ہوئی ہیں۔ امانت رکھوانے اور واپس لینے کا مرحلہ ذرا سی دیر میں طے ہو جاتا ہے۔ اجتماع گاہ کے ہر دفتر میں مشین کے کل پرزوں کی طرح کام ہوتا ہے۔ کام کرنے والے تھک کر چور ہو جاتے ہیں مگر اُن کے انداز میں جھنجلاہٹ پیدا ہونے نہیں پاتی۔ ہر شخص سے کشادہ خاطری کے ساتھ پیش آتے ہیں۔

جس گیٹ پر اندر جانے والوں کی چیکنگ ہوتی ہے اور جماعت اسلامی کا "بلّہ" دیکھا جاتا ہے۔ وہاں مجھے بھی کئی بار ٹوکا گیا۔ میں نے قمیص کی جیب سے بلّہ نکال کر دکھایا تو جانے دیا اور تو اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی ان فرض شناس پہرہ داروں کے احتساب سے نہ بچ سکے۔ اصول اور قانون شخصیتوں سے بالاتر ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔

تقریباً ڈھائی ہزار آدمیوں کے قیام و طعام کا انتظام ہے۔ مگر کسی کام میں گھبراہٹ، بے ترتیبی اور بے اصولاپن نام کو بھی نظر نہیں آتا۔ بیت الخلاء اور غسل خانوں سے لے کر وضو کے حوضوں تک ہر چیز میں سلیقہ پایا جاتا ہے۔ سات سات سو، آٹھ آٹھ سو آدمی ایک وقت میں کھانا کھاتے ہیں۔ مگر کس وقار اور سکون کے ساتھ! سکون و سنجیدگی کا یہ عالم ہے کہ طعام خانہ کے قریب کی قناتوں کے باہر ذرا فاصلہ سے کوئی شخص یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ اس شامیانے کے نیچے آٹھ سو آدمی کھانا کھا رہے ہیں۔ ایک روایت مشہور ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جنگ صفین میں کھانا تو حضرت امیر معاویہؓ کے دسترخوان پر کھاتے تھے مگر نماز حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ کی امامت میں پڑھتے تھے۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا؟ ابو ہریرہؓ نے جواب دیا کہ کھانے کا مزہ معاویہ کے دسترخوان پر آتا ہے اور نماز کی لذت علیؓ کی اقتدا میں ملتی ہے۔ تو میں بلاتشبیہ عرض کرتا ہوں کہ جماعت اسلامی کے اس اجتماع میں صلوٰۃ و طعام دونوں کی لذتیں میسر ہیں!

عورتوں کے قیام و طعام کا بالکل علیحدہ انتظام ہے۔ پردے کی اتنی پابندی کہ بارہ سال کا لڑکا بھی اندر نہیں جا سکتا۔ زنانہ میں خاتون کارکنوں (لیڈی ورکرز) ہی کا عمل دخل ہے۔ مردانہ قیام گاہ کے مقابلہ میں یہاں چھوٹے بچوں کی وجہ سے کبھی کبھار تھوڑی بہت برہمی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی نہیں جسے شور و ہنگامہ کہہ سکیں۔ اگر اتنی بہت سی عورتیں، بچوں کے ساتھ کسی اور جگہ اکٹھی ہو جاتیں تو شور و شغب کی کوئی انتہا ہوتی؟

طعام خانہ سے کچھ دور پر ایک ہوٹل ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس اجتماع گاہ کا یہ کلب گھر ہے۔ چائے پیتے ہیں لوگ ہنسی خوشی

باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ کھانا پینا، مسکراہٹیں اور خوش طبعی، یہ ہیں اس ہوٹل کی تفریح کے آخری حدود! ہوٹل کی بالکل پُشت پر وضو کرنے کا انتظام ہے۔ وضو کرنے میں لوگ لوٹوں کی چھینا جھپٹی، آپا دھاپی اور تکلیف دہ مسابقت سے کام نہیں لیتے!

میکروفون پر ہر قسم کے اعلان ہوتے رہتے ہیں۔ ہدایتیں بھی دی جاتی ہیں۔ لوگوں کو اُن کی کوتاہیوں پر ٹوکا بھی جاتا ہے۔ راشن کارڈوں کے نمبروں سے لے کر ڈھلے ہوئے کپڑوں تک کا اعلان میکروفون سے ہوتا ہے۔ نمازوں کے اوقات میں تو میکروفون کو آرام مل جاتا ہے۔ ورنہ ذرا ذرا سی دیر کے وقفہ سے کوئی نہ کوئی اعلان ہوتا ہی رہتا ہے!

جماعت اسلامی کے یونانی، ہومیوپیتھک اور انگریزی دواخانے تینوں بیک وقت کام کر رہے ہیں۔ مگر مریضوں کا زیادہ ہجوم انگریزی دواخانہ میں دکھائی دیتا ہے۔ شفاخانہ میں مریضوں کے لئے پلنگوں (BED) کا بھی انتظام ہے۔ ڈاکٹر عثمانی اور ڈاکٹر قیوم سعادت خاں رات میں مریضوں کی قیام گاہ پر جاجا کر انجکشن لگاتے اور مزاج پُرسی کرتے ہیں۔ ان صاحبوں کی ڈیوٹی بہت سخت اور ذمہ داری کی ہے۔ مگر اجر بھی تو سب سے زیادہ ہی ملے گا۔ ع

کہ طاعت بجز خدمتِ خلق نیست!

اجتماع گاہ میں کہیں ذرا سا بھی کوڑا کرکٹ دکھائی نہیں دیتا۔ صفائی، ستھرائی اور خوش سلیقگی یہاں کا طغرائے امتیاز ہے۔ میں نے اپنے خیمہ کے باہر امرود کے چھلکے پھینکے تو جماعت کے ایک کارکن نے فوراً اُٹھا لئے۔ اُس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میری طرف بس ذرا مسکرا کر دیکھا اور میں نے اپنے ندامت آمیز سکوت سے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا۔

بڑے بڑے شامیانوں میں باہر سے آئے ہوئے ارکان، متفقین اور متاثرین ٹھہرے ہوئے ہیں۔ شامیانوں کے دروازوں پر حلقوں کے نمبر نمایاں لفظوں میں لکھے ہیں۔ کسی سے ملنے اور ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ اس پر بھی کسی قسم کی دقت پیش آئے تو اس کام کے لئے دفتر معلومات موجود ہے۔

مہمانوں کا اتنا بڑا مجمع مگر کوئی شور و غل، کسی قسم کی چپقلش اور ہنگامہ نہیں۔ ہر شخص ایثار اور قربانی کا جذبہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس لئے کوئی بات خلافِ طبیعت بھی ظہور میں آتی ہے تو برداشت کی جاتی ہے۔ یہاں لوگ آرام کرنے، دل بہلانے اور کھانے پینے کے لئے نہیں آئے۔ اقامتِ دین کا جذبہ انھیں یہاں لے کر آیا ہے۔ سب کے سب ایک ہی جذبہ میں سرشار نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ لوگ ایک ہی کلمہ جامع اور مقصدِ اعلیٰ کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ مجاہدوں کے سے چہرے، غازیوں کے سے انداز، آپس میں ایک دوسرے سے انکسار و تواضع کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ مگر اللہ کے دین کو غالب کرنے کی امنگ ہر دل میں موجزن، جیسے دُنیا کی تقدیر انہی کے ہاتھوں بدلنے والی ہے۔ ان میں بے نمازی تو ایک بھی نہیں ہے۔ اللہ کے فضل سے بعض ان میں تہجد گزار بھی ہیں۔ اشراق بھی پڑھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ان کی زبانیں تر رہتی ہیں۔ قرآن کی تلاوت سمجھ کر کرتے ہیں، اللہ کے کلام میں تدبر و تفکر ان کی عادت بن گئی ہے۔ تشکیک و تذبذب کا یہاں دُور دُور پتا نہیں۔ ایمان و یقین ہی کی ہر طرف جلوہ آرائی ہے۔

پاکستان کے گوشہ گوشہ سے مردانِ حق پرست کھنچ کر یہاں آ گئے ہیں، آزاد کشمیر، سوات، سرحد، بلوچستان تک کے بعید ترین خطوں سے نمائندے آئے ہیں۔ چار سال قبل مشرقی پاکستان سے صرف ایک رکن کی حاضری تھی۔ اب کی بار مشرقی پاکستان کے تقریباً سترہ اٹھارہ صاحبان نے شرکت کی ہے۔ اس سے جماعتِ اسلامی کے کام کی رفتارِ ترقی کا اندازہ ہو سکتا ہے — حکومت کی سختیاں اور معاندین کی مخالفتیں جماعتِ اسلامی کی ترقی کو روک نہیں سکیں۔ یہ سبزہ پامال ہو ہو کر لہرایا ہے اور یہ

شاخیں چوٹ کھا کھا کر برگ و بار لائی ہیں۔ دبائے جانے سے یہ جوہر اور ابھرا ہے۔ جماعت اسلامی کو عوام میں نامقبول اور غیر ہر دلعزیز بنانے کی جتنی کوششیں کی گئیں اتنی ہی جماعت کو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ آزمائشوں نے جماعت کو اور زیادہ فعال اور فرض شناس بنا دیا ہے۔ ع

مصیبتوں سے محبت میں جان پڑتی ہے!

کس کس حلقے کے لوگ جمع ہیں، نسل اور زبان کا اختلاف بھی ان میں ہے۔ مگر سب کے سوچنے کا انداز ایک سا ہے۔ جیسے اُن کے دل و دماغ ایک ہی سانچے میں ڈھالے گئے ہیں۔ مقصد کی وحدت نے ان دانوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے!

شہر کے جو لوگ اجتماع گاہ میں آتے ہیں، اُن کا سب سے زیادہ ہجوم نمائش گاہ میں رہتا ہے۔ نمائش جماعت اسلامی کے ذوق، خوش مذاقی اور قوتِ ایجاد کی زندہ شہادت ہے۔ چارٹوں اور نقشوں کے ذریعہ جماعتِ اسلامی کے کام کی رفتار کو دکھایا گیا ہے کتنے پاکیزہ طغرے یہاں آویزاں ہیں۔ پاکیزگی و اخلاق کا یہ ماحول دُنیا کی اور کسی نمائش میں کہاں نظر آسکتا ہے۔ ساری نمائش میں بازاری قسم کی کوئی دلچسپی نہیں۔ یہاں تک کہ کوئی تصویر تک دکھائی نہیں دیتی۔ عوام کی اس نمائش سے دلچسپی اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ حق و صداقت کو اگر سلیقہ سے پیش کیا جائے تو آج کل کے بُرے ماحول میں بھی لوگ حق کے وزن کو محسوس کرتے ہیں اور صداقت اپنے کو منوا کر چھوڑتی ہے!

نمائش میں بعض چارٹ برقی روشنی کے ذریعہ کھینچے گئے ہیں۔ "دستوری چکر" کا نظارہ سب سے زیادہ جاذبِ توجہ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار نے دستور سازی کا کیا چکر چلا رکھا ہے۔ اور دستور کے مسئلہ کو کیسے کیسے حیلوں حوالوں سے ٹالنے کی کوشش کی گئی ہے!

اجتماع گاہ میں ہوٹل، آئی ساکو اور اشرف میڈیکل ہال کی دواؤں کے علاوہ تمام کی تمام دکانیں کتابوں کی ہیں۔ پاکیزہ لٹریچر اور اسلامی ادب یہاں ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ لگری گراؤنڈ میں ان دنوں جو کوئی بھی آتا ہے، دینی جذبات لے کر آتا ہے۔ اور یہاں سے رخصت ہوتے ہوئے اس متاعِ گرانقدر میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔

مذہبی لوگوں پر جو عام طور پر طنز کی جاتی ہے کہ "یہ لوگ صاف ستھرے نہیں رہتے"۔ یہ بد سلیقہ ہوتے ہیں۔ انتظام کرنا نہیں جانتے اپنی دعوت کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کا ڈھنگ انھیں نہیں آتا۔ جماعتِ اسلامی کا یہ اجتماع ایک ایک طنز، پھبتی اور الزام کی تردید کر رہا ہے۔ یہ اجتماع بتا رہا ہے کہ کسی میں دین کا صحیح شعور ہو تو اس سے بڑھ کر کوئی خوش سلیقہ، خوش مذاق، منظم، صاف ستھرا اور مہذب نہیں ہوتا۔ ڈسپلن تو دینِ حق کی سب سے بڑی خصوصیت ہے!

جماعتِ اسلامی کا یہ اجلاس ہر حیثیت سے ایک "مثالی اجتماع" ہے۔ ایسی تہذیب و تنظیم اور شائستگی اور کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ پوری قوم کی اسی انداز میں اگر تربیت ہو تو سارا معاشرہ ہی بلند و پاکیزہ ہو جائے۔

اجتماع گاہ سے جلسہ عام تک

ان تمام لوگوں میں سب سے زیادہ آرام طلب اور بے اصولا میرے سوا اور کوئی شاید نہ ہوگا۔ اوّل تو کوئی ڈیوٹی مجھ سے متعلق نہیں ہے۔ پھر ناظم شعبۂ تربیت کی قیام گاہ میں بستر جما لیا ہے۔ "سیرت نمبر" کی تیاری کے سلسلہ میں اجتماع گاہ سے باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ میرے کھانے پینے اور سونے کے معمولات میں بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ باہر سے آئے ہوئے اصحاب مجھ ناکارہ سے جس محبت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اُس نے بڑی کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ مسرت کا جذبہ نمودار ہوتے ہی احساسِ ندامت بڑھ کر دامن تھام لیتا ہے۔ کہ تم حقیقت میں کیا ہو؟ اور لوگ کیا سمجھ رہے ہیں؟

اس زمانے میں انشاء پردازی عجیب چلتا ہوا جادو ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہوں کہ میں لوگوں کے حسنِ ظن کے مطابق ہو جاؤں۔ (آمین)

۵۔ اجتماع گاہ کے عہدہ داروں اور عام کارکنوں میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ سب کی ایک ہی جیسی حیثیت ہے۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں مولانا عبدالجبار غازی اور سلطان احمد صاحب ایک زمانے میں مرکزی جماعتِ اسلامی (پاکستان) کے قائم مقام امیر رہ چکے ہیں۔ مگر اُن میں اپنے سابق عہدے کا احساس تک نہیں پایا جاتا۔ اجتماع کے ناظمِ اعلیٰ چودھری غلام محمد صاحب اس انداز میں گھومتے اور کام کرتے پھر رہے ہیں جیسے وہ سب سے چھوٹے خدمت گزار ہیں۔

مولانا مودودی کے علاوہ کارکنوں سے عام خطاب بس تنہا مولانا امین احسن اصلاحی نے فرمایا۔ کمیونسٹوں کے بقول وہ جماعت اسلامی کے آتشیں لیڈر ہیں۔ ان میں شانِ جلال نظر آتی ہے۔ مولانا کی ساری عمر قرآنِ پاک ہی میں غور و تدبر کرتے گزری ہے۔ تقریر کرتے میں بیدھے ہاتھ کو اس انداز میں جنبش دیتے ہیں جیسے باطل کے نظام کو توڑ کر رکھ دیں گے۔ حق کے معاملہ میں برہنہ شمشیر! صبر و ضبط کا یہ عالم ہے کہ شدتِ درد سے چہرہ تمتماتا ہوتا ہے مگر منہ سے ذرا سی کراہ بھی نہیں نکلتی!

جماعتِ اسلامی کے اجلاس میں تمام پر تائیدی تقریریں زندگی میں پہلی بار سنیں۔ مولانا حکیم محمد اشرف صاحب نے "اخوان المسلمون" کی مظلومیت کو اس قدر اثر انگیز انداز میں بیان کیا کہ مجھ جیسے سخت دل کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ ایک ریزولیوشن سے ملک محمد سعید صاحب ایڈیٹر روزنامہ "تسنیم" نے اختلاف فرمایا۔ مگر آداب و اخلاق کے حدود کی پابندی کے ساتھ! جماعت اسلامی میں کارکنوں کو اظہارِ رائے کی پوری آزادی ہے۔ یہاں اختلاف اپنے نفس کے لئے نہیں حق کی خاطر ہوتا ہے۔ اس لئے دل میلے نہیں ہوتے۔ اور کوئی کسی سے مکدر ہونے نہیں پاتا۔ ایک اجلاس میں بعض تعمیری کاموں کے لئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اپیل کی تو پورے چوبیس گھنٹے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ ساٹھ ہزار سے زیادہ فنڈ جمع ہو گیا۔ سکھر کے کسی صاحب نے سب سے زیادہ رقم پیش کی، پانچ ہزار روپیہ! مگر اپنے نام کا اعلان نہ ہونے دیا۔ جماعتِ اسلامی کے کارکنوں کا یہ جذبۂ انفاق قابلِ رشک تو ہے ہی مگر لائقِ تقلید بھی ہے!

ایک دن جناب نعیم صدیقی سے یہ بات طے ہوئی کہ شب میں نماز اور کھانے سے فارغ ہو کر اُن کی قیام گاہ پر جاؤں گا۔ میں انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ سوتے میں ایک صاحب نے آ کر جگایا اور وہ جلسہ گاہ میں لے گئے۔ وہاں یار لوگوں نے "مشاعرہ" کا انتظام کر ڈالا نعیم صدیقی اور کوثر نیازی سے لے کر عبداللہ شاکر تک نے اپنا کلام سنایا۔ اُردو، پشتو، پنجابی، سندھی اور بنگالی کی ایک ہی نشست میں نظمیں شاید اور کہیں نہ پڑھی گئی ہوں، بے میل مشاعرہ! سب سے زیادہ "قواعد" راقم الحروف ہی سے لی گئی۔ یہ نظمیں اور غزلیں مہ جبینوں کے زلف و رخسار کی عکاسی اور ترجمانی سے پاک تھیں۔ دین و اخلاق کی ترجمانی! لوگوں کے داد دینے کا انداز بھی کافی باوقار تھا! یہ شعر و شاعری کی محفل کس کے ایما سے جمی؟ کیا عجب ہے کہ اس کی پوچھ گچھ کی گئی ہو۔ میں تو شعر پڑھ کر اپنی قیام گاہ میں چلا گیا اور پھر جو لمبی تان کر سویا ہوں تو فجر کی اذان نے چونکایا۔ .... "الصلوٰۃ خیر من النوم" (نماز سونے سے بہتر ہے) بیشک بہتر ہے عمر! تم نے سچ کہا (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ان سالکانِ راہِ حق و صداقت میں ایک "مجذوب" بھی آ گیا ہے۔ لانبا قد۔ پچپن ساٹھ کے درمیان عمر۔ ہاتھ میں کنپٹی کے برابر لٹھ۔ جس میں لوہے کی میخ گڑی ہوئی ہے۔ ہر اجلاس کے بعد یہ شخص یہی مطالبہ کرتا ہے کہ "بہاولپور میں جمعہ کے بجائے اتوار کو چھٹی دیئے جانے کا حکم ہوا ہے، خدا کے لئے اس حکم کو بدلواؤ"۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ شخص درسِ نظامی کی تکمیل کر چکا ہے اور علمی گھرانے کا ایک فرد ہے۔ مگر چند دنوں سے دماغی حالت متوازن نہیں رہی۔ مولانا اصلاحی نے اپنے پُرجلال انداز میں جو اُسے ڈانٹ ڈپٹ کی تو اُس دن سے اس کا جذب بہت کچھ کم ہو گیا ہے!

آج نومبر کی بائیس ۲۲ تاریخ ہے۔ جہانگیر پارک میں رات کو عام اجلاس ہوگا۔ مقامی کارکن جلسہ میں انتظام کے لئے جائیں گے۔ اس لئے باہر سے آئے ہوئے کارکنوں کی اجتماع گاہ میں ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔ ہر کوئی اس جلسہ میں جانے کی تمنا رکھتا ہے۔ مگر جن کی ڈیوٹی ککری گراؤنڈ میں لگائی گئی ہے وہ شوق و تمنا کو دبا کر اور طبیعت کو مار کر رہ گئے ہیں۔ آج رات کا کھانا مغرب کے بعد ہی کھلا دیا گیا!

جلسہ کا آغاز سوا آٹھ بجے ہوگا۔ مگر لوگ مغرب کے بعد ہی آنے شروع ہو گئے۔ شہر کے ہر گوشہ سے لوگ چلے آ رہے ہیں۔ مولانا مودودی جب تشریف لائے ہیں تو جلسہ شروع ہونے میں دو تین منٹ باقی تھے۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد مولانا مودودی تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ اُن کی نگاہوں کے سامنے آدمیوں کا سمندر ہے۔ مگر یہ سمندر متلاطم نہیں ہے، پُرسکون ہے! روشنی اور فرش کا کتنا اچھا انتظام ہے۔ یہ جماعتِ اسلامی کا جلسہ ہے۔ یہاں سامعین سراپا گوش بنے بیٹھے ہیں۔ مولانا نے پورے دو گھنٹے تقریر کی اور ایسی تقریر کی کہ سننے والوں کو مدت تک یاد رہے گی۔ استدلال ہے، سلاست ہے، یقین و عزم ہے۔ اور سب سے بڑھ کر بولنے والے کا اخلاص ـــ از دل خیزد بر دل ریزد! بنگال کے ارکانِ دستوریہ اس ضبط و نظم کو دیکھ کر حیرت میں رہ گئے۔ کہنے لگے کہ اتنے عظیم الشان اجتماع میں ایسا ڈسپلن دیکھنے میں نہیں آیا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت دیکھئے کہ جس حلقوم کے لئے پھانسی کا پھندا تیار کیا گیا تھا وہ ہزاروں کے مجمع میں حق کی آواز بلند کر رہا ہے۔

آج مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف شہر کی دیواروں پر پوسٹر لگے ہیں۔ ہینڈبل بھی بانٹے جا رہے ہیں۔ مگر جماعتِ اسلامی کے اس جلسۂ عام نے فتنہ پردازوں کی شرارتوں کا ہاتھ کے ہاتھ جواب دے دیا۔ کراچی کی پبلک اچھی طرح واقف ہو چکی ہے۔ کہ اس فتنہ کا سلسلہ کہاں سے چلتا ہے؟ مفسدین نے اپنی رسوائی اور ناکامی اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لی!

ایک پوسٹر کی سُرخی ہے:۔

"مرزا غلام احمد قادیانی اور مولانا مودودی ایک اسٹیج پر"

اس پوسٹر سے مولانا مودودی کا کچھ نہ بگڑا۔ مگر بعض لوگ اس شبہ میں مبتلا ہو گئے کہ مولانا مودودی کی طرح غلام احمد قادیانی بھی شاید مظلوم ہی ہوں گے۔ لوگ نتائج سے بے پروا ہو کر اوچھے ہتھیاروں پر اُتر آتے ہیں! سب سے زیادہ رنج اس کا ہے کہ جن کے علم و زہد کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ وہ تک یہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ "علم و تقویٰ" (؟) کو اس سطح پر دیکھ کر دل لہو لہو ہو جاتا ہے!

خندۂ اہلِ جہاں کی مجھے پروا کیا تھی! تم بھی ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

شہر میں اس جلسہ کے ہر طرف چرچے ہیں۔ دفتروں میں، ہوٹلوں میں، اور بیٹھکوں میں یہی تذکرے ہیں۔ دو گھنٹے کی اس ایک تقریر نے سارے شہر کو چونکا دیا ہے۔ کراچی کے روزناموں نے جلسہ کی روداد بڑے نمایاں انداز میں چھاپی ہے۔ جماعتِ اسلامی کے معاملہ میں لاہور کے اخباروں کی طرح کراچی کے اخبار بخیل اور تنگ نظر نہیں ہیں۔ انگریزی کے اخبار "ڈان" نے البتہ جلسہ کے حاضرین کی تعداد "پانچ ہزار" لکھی ہے۔ ڈان کا رپورٹر شب کوری کے مرض میں شاید مبتلا ہوگا کہ پچاس ہزار کا جم غفیر اُسے پانچ ہزار دکھائی دیا۔ اور یہ بھی اُس کی مہربانی ہے وہ حاضرین کی تعداد پانچ سو لکھ دیتا تو کوئی اس کا کیا کر لیتا!

الوداع

کراچی میں سینکڑوں صبحوں کے طلوع اور صدہا شاموں کے غروب کا نظارہ ان آنکھوں نے کیا ہے۔ مگر ککری گراؤنڈ میں طلوع و غروب کا منظر ہی کچھ اور ہے۔ یہاں کے سونے والوں کو اللہ کے نام کی تکبیر چونکاتی ہے۔ ہر کوئی پھرتی کے ساتھ اُٹھتا ہے اور نماز کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ رات اور دن کے ملے جلے دھندلکے میں دو ہزار پیشانیاں اللہ کے حضور سجدہ ریز! وسیع و عریض شامیانہ کی زمین نمازیوں سے بھری ہوئی۔ سجدوں کے یہ نشان اللہ نے چاہا جب تھر دیوان پر

اُبھریں گے تو وہ بہار دیکھنے کے قابل ہوگی - حقیقت سے لوگ کب تک گریز کرتے رہیں گے - مفاد پرستی کاغذی ناؤ کی مانند ہے - یہ زیادہ دنوں تک چل نہ سکے گی، ڈپلومیسیوں اور حکمت عملیوں کے طلسم ایک دن ٹوٹ کر رہیں گے - شخصی اقتدار کی یہ آنکھ مچولی آخر کب تک اور یہ شطرنج کی بازیاں تابکے - یہاں سورج بھی غروب ہوتا ہے تو اللہ کے نام کی پکار گونجنے لگتی ہے اور یہ قافلہ اللہ کے حضور صف بستہ ہو جاتا ہے - یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے آگے اپنے کو خس وخاشاک سے بھی زیادہ ذلیل و درماندہ سمجھتے ہیں - مگر باطل کے سامنے شیر نیستاں بن جاتے ہیں - انھوں نے اللہ اور رسول سے پیمانِ وفا باندھا ہے - اقامتِ دین ان کی جدوجہد کا موضوع اور اللہ کی رضا ان کا مطلوب ہے - اس راستے میں چاہے موجِ خوں ہی سر سے کیوں نہ گزر جائے یہ رُکنے والے نہیں ہیں!

صبح کی نماز کے بعد روزانہ درسِ قرآن بھی ہوتا رہا ہے - ایک دن مولانا امین احسن اصلاحی کی طبیعت ناساز تھی - تو مولانا عبدالغفار حسن صاحب نے درسِ حدیث دیا - وہ جن کو ذکر و شغل، تسبیح و تہلیل اور تزکیہ و تصفیہ کا دعویٰ ہے ذرا جماعتِ اسلامی کے اس اجتماع گاہ کو بھی ایک نظر آ کر دیکھ جاتے کہ خشیتِ الٰہی کا یہاں کیا رنگ ہے! اور دلوں میں دین کی کیسی تڑپ پائی جاتی ہے -

۲۳ - نومبر کو آخری تقریر مولانا مودودی کی ہونی چاہیئے تھی - مگر مسلسل مصروفیت نے اُن کو نڈھال کر دیا ہے - جس مریض کے تقریباً چار سال قیدخانہ میں بسر ہوئے ہوں اس کی صحت پر جو عالم بھی گزر جائے تھوڑا ہے - الوداعی تقریر مولانا اصلاحی صاحب نے کی - وہ اس کے لئے پہلے سے تیار نہ تھے - پھر بھی جو کچھ کہا بر محل کہا - دعا ذرا طویل ہوتی تو اچھا تھا - مگر چند لفظوں ہی میں سامعین کی پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں -

بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے - جو آج نہ جا سکیں گے وہ ایک رات اور یہاں رہیں گے - چار دن پہلے لوگ یہاں آئے تھے - آج جا رہے ہیں - وہ آمد تھی یہ وداع ہے - یہاں کے قیام نے دلوں کو اور زیادہ گرما دیا ہے - ہر کوئی تازہ دم ہو کر رخصت ہو رہا ہے -

ہم عشاء کی نماز پڑھ کر اجتماع گاہ سے روانہ ہوا - اس احساسِ ندامت اور تمنّا کے ساتھ کہ کاش! میں بھی ان رہروانِ حق کے دوش بدوش چل سکتا - اب جب بھی اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا یہ ایمان افروز نظارہ پھر دیکھنے میں آئے گا - اجسام دُور ہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے دل تو سب کے ملے ہوئے ہیں - اور یہ بزم جو بظاہر ککری گراؤنڈ میں کل تک اُجڑ جائے گی - ہر دل میں جمی ہوئی ہے - اللہ تعالیٰ حق پرستوں کے اس قافلہ کی رہنمائی اور حفاظت فرمائے - (آمین)

ابوالبیان حمّاد

رحمۃ اللعالمینؐ کی شانِ رحمت

اللہ تعالیٰ، رب العالمین یعنی سارے جہانوں کا پروردگار اور پالن ہار ہے۔ جہانِ رنگ و بُو اور عالمِ آب و گل کا ذرہ ذرہ اللہ کی ربوبیت عامہ کا مرہون منّت ہے۔ کائنات کی ہر چیز اپنی تخلیق اور نشو و نما میں پروردگارِ عالم کی چشم کرم اور نگاہِ التفات کی محتاج ہے۔ اللہ کی قدرتِ کاملہ اور ربوبیتِ عامہ کی وسعت کا اندازہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یُوں تو اللہ کی صفات بے شمار ہیں۔ لیکن تین صفات ایسی ہیں جن میں سب سے زیادہ تاثیر و عمومیت پائی جاتی ہے۔ اُن میں سے ایک قدرت ہے۔ دوسری ربوبیت اور تیسری رحمت۔ عالمِ ایجاد کی ہر شے میں ان صفات کی تجلّی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ مشیتِ ایزدی کسی چیز کو خلعتِ وجود سے سرفراز کرتے وقت پہلے اپنی قدرتِ کاملہ کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جب وہ شئے پیرایۂ تخلیق اور لباسِ وجود سے آراستہ و پیراستہ ہو جاتی ہے تو اس کی نشو و نما اور بالیدگی کے لئے جذبۂ ربوبیت میں تحریک ہوتی ہے۔ اور داعیۂ رحمت عطیۂ وجود کی تنظیم و تکمیل کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ اللہ نے اپنی تمام صفات میں سے کسی صفت کی خود ہی مدح و ستائش باندازِ خصوصی فرمائی ہے تو وہ صفتِ رحمت ہے۔ چنانچہ ایک حدیث قدسی ہے۔ ان رحمتی سبقت علی غضبی۔ یعنی میری صفتِ رحمت میں اس قدر تاثیر ہے کہ جب کبھی صفتِ غضب کے شرارے بھڑک اُٹھتے ہیں اُس وقت صفتِ رحمت کے چھینٹے انھیں بُجھا دیتے ہیں۔ اور جمال، جلال پر غالب آ کر رہتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ کے سو درجے اور حصّے ہیں۔ جن میں سے صرف ایک حصّہ اللہ نے اس دُنیا میں نازل فرمایا ہے۔ اور اسی ایک حصّہ کی یہ کرشمہ سازیاں ہیں۔ کہ ماں باپ اپنے بچّوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ بھائی بہنوں کے درمیان محبت پائی جاتی ہے۔ میاں بیوی کے مابین عہدِ مودّت استوار ہوتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کے دُکھ درد کو دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے۔ مُرغی اپنے چوزوں کی نگہداشت و حفاظت کرتی ہے کبھی بے خبری میں کوئی چوزہ اُس کے پاؤں کی زد میں آ کر چلانے لگتا ہے تو فوراً اُس کے اُوپر سے پاؤں اُٹھا لیتی ہے حتیٰ کہ درندے اور زہریلے جانور بھی اس حصۂ رحمت کے اثرات سے تہی مایہ نہیں بلکہ درندوں کو اپنے بچّوں سے اور زہریلے سانپوں کو اپنے سنپولیوں سے گہری محبت ہوتی ہے۔

محبت و رحمت کے جذبات کم و بیش تمام مخلوقات میں پائے جاتے ہیں۔ کسی کو صرف اپنی ذات سے دل چسپی ہوتی ہے، کسی کو اپنے اہل و عیال سے محبت ہوتی ہے، کسی کو قبیلہ و خاندان سے اُلفت ہوتی ہے۔ محبّت کا دائرہ کچھ اور وسیع ہوتا ہے تو قوم بھی اُس میں داخل ہو جاتی ہے۔ کسی کی نگاہِ محبت اس سے زیادہ بلند ہوتی ہے تو خاکِ وطن کا ہر ذرہ اُسے دیوتا معلوم ہونے لگتا ہے۔ لیکن یہ سب مظاہرِ محبت بہر حال ناقص و تشنۂ تکمیل ہیں۔ نوعِ انسانی کو ضرورت تھی ایک ایسے پیکرِ محبت کی جو رحمتِ مجسّم ہو۔ اور اُس کا جذبۂ شفقت، خاندان و قبیلہ، نسل و رنگ اور قوم و وطن کی تنگنائیوں میں محدود رہنے کے

بنجائے، انسانیت کو محیط ہو جائے۔ وہ صرف دوستوں ہی سے محبت نہ کرے، بلکہ دشمنوں کو گلے لگائے۔ یگانوں ہی کو نہ چاہے بیگانوں سے بھی پیار کرے۔ اُس کے سرچشمۂ رحمت سے نوعِ انسانی ہی سیراب نہ ہو۔ بلکہ جانوروں کو بھی بہرۂ وافر نصیب ہو۔ حتیٰ کہ سرسبز و شاداب درختوں اور مرغزاروں میں بھی اس کی رحمت کے اثرات سرایت کر جائیں۔ جانوروں کی تکلیف بھی اُس سے دیکھی نہ جائے اور وہ کسی بھوکے اونٹ کو دیکھ کر تڑپ اُٹھے۔ ہرے بھرے باغات اور پھل والے درختوں کا بھی وہ اس قدر لحاظ رکھے کہ بلاوجہ انہیں اُجاڑنے اور بلا ضرورت کاٹنے سے وہ متاثر ہو جائے اور ایسی ہدایات دے جن میں انسانوں سے لے کر جانوروں اور درختوں تک کی رعایت رکھی گئی ہو۔ عالمِ انسانیت کی یہ ایک ایسی ضرورتِ شدید تھی۔ جس کی تکمیل بہرحال ضروری تھی۔ نوعِ انسانی کے اس اہم خلاء کو پُر کرنے اور کائنات کے اس ناگزیر تقاضے کو پورا کرنے کی خاطر رب العالمین نے رحمۃ للعٰلمین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کر کے کائنات پر احسانِ عظیم فرمایا۔ ایسا احسانِ عظیم جس کے بارِ گراں سے عالمِ انسانیت کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا!

اللہ تعالیٰ سارے جہانوں کا پروردگار ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہانوں کے لئے رحمت بنائے گئے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے خطاب کرتے ہوئے کس قدر بلیغ انداز میں ارشاد فرمایا ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْن۔ ہم نے اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم آپؐ کو ساری کائنات کے لئے پیکرِ رحمت بنایا ہے۔ مہر و مروّت اور شفقت و رحمت کے جذبات بھی اس طرح آپؐ کے خمیر میں سمو دیئے گئے تھے کہ رحمت و محبت کی جھلکیاں ہر وقت آپؐ کے اقوال و افعال، حرکات و سکنات اور زندگی کے تمام کارناموں میں صاف محسوس ہوتی تھیں۔ آپؐ کے پیغمبرانہ منصب اور داعیانہ حیثیت بھی اسی کی مقتضی تھی کہ آپؐ کے اعمال و عواطف اور جذبات و رجحانات کی تہ میں شفقت و رحمت کے اثرات کارفرما ہوں۔ اگر خدانخواستہ لینت و رحمت کے بجائے آپؐ کے مزاج میں سختی اور درشتی ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ آپؐ انسانوں کے قلوب موہ لیتے۔ خود اللہ تعالیٰ نے رحمت و لینت کی حکمت و مصلحت اس طرح بیان فرمائی ہے:۔

فبما رحمة من الله لنت لهم ولو كنت فظا غليظ القلب لانفضوا من حولك۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی آپؐ پر اللہ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اُس نے اپنے فیضانِ رحمت سے آپؐ کے دل کو لینت و رقت اور سوز و گداز کی آماجگاہ بنایا۔ اور اگر کہیں آپؐ بدخلق و بدمزاج اور تنگ دل و سنگ دل ہوتے تو وہ بندگانِ حق آپؐ کے اطراف سے چھنٹ جاتے جو آپؐ کے اخلاقِ فاضلہ سے متاثر ہو کر دینِ حق قبول کر چکے ہیں۔

دعوتِ اسلامی کی کامیابی کا بہت بڑا سبب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبۂ رحمت ہی ہے۔ جس کے اثرات آپؐ کی زندگی کے سارے مشاغل میں ہر لمحہ برابر ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ رحمت ہی وہ شجرِ طیبہ ہے جس کی شاخیں مہر و مروّت، عفو و درگزر، جود و کرم و محبت، سوز و گداز، رقت و لینت، شفقت و مودت، فیاضی و سیر چشمی۔ بلند نظری و فراخ حوصلگی، ایثار و قربانی اور اسی قسم کی صفاتِ عالیہ ہیں۔ جن کے گوناگوں مظاہر اور نت نئے روپ زندگی میں جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔

جبلِ فاران کی بلند و بالا چوٹیوں سے جب آفتابِ رسالت طلوع ہوا تو اُس کی عالمتاب شعاعوں میں تمازت و تپش نہیں تھی۔ بلکہ رحمت کی ٹھنڈک اور چاندنی کی خنکی تھی۔ جس کے باعث قلوبِ انسانی اُن شعاعوں سے مستفید و مسخر ہوئے بغیر نہ رہ سکے!

رحمۃ اللعالمین کی زندگی میں بے شمار ایسے واقعات نظر آتے ہیں۔ جن سے آپؐ کی شانِ رحمت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔
ایک مرتبہ آپؐ گلی میں تشریف لے جارہے تھے۔ چند معصوم بچے کھیلتے ہوئے نظر آئے۔ آگے بڑھ کر خود ہی آپؐ نے اُن کو سلام کیا۔ پھر انھیں پیار کرنے اور چمکارنے لگے۔ ایک بدو نے یہ مظاہرۂ رحمت دیکھ کر کہا۔

"آپؐ تو غیروں کے بچوں سے یہ شفقت آمیز سلوک کررہے ہیں۔ میرے دس بچے ہیں۔ لیکن میں نے آج تک کبھی اُن میں سے کسی کو پیار تک نہیں کیا۔"

آپؐ نے جواب دیا۔ "اگر اللہ نے تمہارے دل کو گداز و رحمت سے محروم کردیا ہے تو اس بدنصیبی کا تدارک میں کیسے کرسکتا ہوں"
سماج کے تمام طبقات کے مراتب و درجات کا پاس ولحاظ آپؐ کے جذبۂ رحمت کا ایک کرشمہ ہے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے ارشاد فرمایا ہے:-

لیس منا من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا و یامر بالمعروف وینھما عن المنکر۔

وہ ہمارا ساتھی نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بزرگوں کے ساتھ ادب واحترام سے نہ پیش آئے اور بھلائی کا حکم نہ دیتا ہو اور برائی سے روکتا نہ ہو۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے کسی غلام پر بگڑ رہے تھے اور خفگی کے عالم میں اُسے لعنت و ملامت کر رہے تھے۔ پیچھے سے آواز آئی۔ لعانین و صدیقین کلا ورب الکعبہ۔ کوئی شخص صدیق ہوتے ہوئے کبھی لعنت بھی کرسکتا ہے؟ کعبہ کے پروردگار کی قسم ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص بہ یک وقت صدیق بھی ہو اور لعان بھی ہو" صدیق اکبر نے مڑ کر دیکھا تو سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم شانِ رحمت کا اس طرح مظاہرہ فرمارہے ہیں۔ صدیقؓ نے رحمۃ اللعالمینؐ کے ارشاد سے متاثر ہوکر غلام کو آزاد کردیا۔ اور حضورؐ کی کبیدگی مسرت وخوشنودی سے بدل گئی۔
ایک غزوہ کے موقع پر یمامہ کے سردار ثمامہ بن آثال گرفتار ہو کر بارگاہِ رسالت میں پہنچے۔ چونکہ اسلام دشمنی میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اس لئے حضورؐ نے اُن کے متعلق یہ حکم دیا کہ اُن کو مسجدِ نبوی کے ستون سے باندھ دیا جائے۔ چنانچہ باندھ دیا گیا۔ اور وہیں کھانا بھی اُنھیں دیا جانے لگا۔ اگلے دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود اُن کے پاس پہنچے۔ اور حال دریافت کرنے کے بعد پوچھا" ثمامہ! اب تمہارا مقصد وارادہ کیا ہے؟" وہ کہنے لگے "سرکار! میں باغی و مجرم ہوں، کشتنی و گردن زدنی ہوں، آپؐ سزا دیں گے تو یہ پاداشِ عمل کا خمیازہ ہوگا جو میں بھگتوں گا۔ فدیہ بھی لے سکتے ہیں اور اگر درگزر فرمادیں گے تو یہ شانِ رحمت کا مظاہرہ ہوگا۔"
حضورؐ نے یہ سُنا تو خاموش چلے گئے۔ دوسرا دن ہوا تو پھر سرکارؐ تشریف لائے اور وہی سوال دُہرایا۔ ثمامہ نے پھر وہی جواب دیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کہے بغیر واپس ہوگئے۔ تیسرے دن پھر سرکارؐ نے ثمامہ سے نہایت شفقت آمیز انداز میں خیریت پوچھ کر مقصد دریافت فرمایا۔ ثمامہ نے حسب سابق جواب دیا کہ "حضورؐ آپ کو عفو وقتل دونوں کا اختیار ہے۔ معاف فرمادیں گے تو ہمیشہ کے لئے مرہونِ منت رہوں گا۔ اور قتل کرادیں گے تو عدل کا تقاضا پورا ہوگا۔ اور کوئی شکایت نہ ہوگی۔" یہ سُن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے مشکیں کھول دیں اور ثمامہ کو مسجد کے ستون سے جدا کرکے فرمایا۔ "ثمامہ اب تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جاسکتے ہو۔ تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"
ثمامہ نے شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلے گئے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ خیال کیا کہ ثمامہ اپنے وطن یمامہ

جا رہے ہیں۔ مگر وہ یمامہ جانے کے بجائے مدینہ سے باہر ایک کنوئیں پر پہنچے، نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں مدینہ واپس ہو گئے۔ دربارِ نبوت میں حاضر ہوئے اور کلمۂ طیبہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ پھر کہنے لگے:-

"سرکار پہلے مجھے آپؐ سے زیادہ کسی سے نفرت نہیں تھی۔ اور اب آپؐ سے بڑھ کر کسی سے محبت نہیں۔ پہلے آپؐ کا شہر میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض تھا اور اب وہی سب سے زیادہ محبوب ہے پہلے آپؐ کا دین میرے خیال میں غلط اور مضر تھا۔ لیکن اب وہی صحیح اور مفید ہے۔"

پھر اپنے خاندان و قبیلہ کو اسلام سے متعارف کرنے کی غرض سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت لے کر یمامہ چلے گئے۔ قریش اور کفارِ مکہ کو غلّہ یمامہ سے آتا تھا۔ ثمامہ بن اثال نے یمامہ پہنچنے کے بعد جو پہلا کام کیا وہ یہی تھا کہ مکہ جانے والا غلّہ بند کر دیا۔ اور باشندگانِ مکہ کو اطلاع دے دی کہ جب تک تم لوگ اسلام قبول نہ کرلو یمامہ سے غلّہ نہیں پہنچے گا — حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی تو آپؐ نے ثمامہ بن اثال کو ہدایت بھیجی کہ غلّہ روکنا ٹھیک نہیں ہے۔ تم مکہ والوں کو برابر غلّہ بھیجا کرو۔ چنانچہ پھر مکہ غلّہ جانے لگا۔

ایک مرتبہ مکہ میں قحط پڑ گیا۔ اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ ابوسفیان نے سرکارؐ سے دُعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے اپنے جانی دشمنوں کے لئے دُعا فرمائی اور قحط دُور ہو گیا۔

دوستوں کے ساتھ رحم و کرم کا برتاؤ کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کمال یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ اور وہ بھی ایسے جو خون کے پیاسے ہوں حُسنِ سلوک کیا جائے اور اپنے اخلاق کریمانہ سے اُن کے قلوب جیت لئے جائیں۔ ایک مرتبہ نجد کے نخلستان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سمیت فروکش ہوئے۔ صحابہ کرام نے ایک سایہ دار درخت کے نیچے حضورؐ کا بستر لگا دیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ سرکارؐ وہاں قیلولہ فرما رہے تھے۔ غورث نامی ایک تنومند مشرک و دشمنِ اسلام کو کسی طرح خبر ہو گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ آپؐ کو ہلاک کرنے کا اس سے بہتر موقع کبھی نہیں مل سکتا۔ چنانچہ غورث فوراً سرکارؐ کے قریب پہنچا۔ دیکھا کہ آپؐ آسودۂ خواب راحت ہیں۔ اور نیام درخت کی ڈال میں لٹک رہی ہے۔ چنانچہ اُس نے نیام میں سے تلوار کھینچ لی اور وار کرنا چاہتا تھا کہ اتنے میں سرکارؐ بیدار ہو گئے۔ غورث نے آپؐ کو دھمکاتے ہوئے پوچھا —

"بتائیے تو سہی اب آپؐ کو میرے حملہ سے کون بچائے گا؟" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے انتہائی اطمینان کے ساتھ "اللہ" نکلا۔ جیسے ہی غورث نے یہ سنجیدہ اور متین جواب سُنا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس پر کوئی بجلی گر گئی ہو اور دفعتاً تلوار اُس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی۔ سرکارؐ نے لپک کر تلوار اٹھالی۔ اور غورث کا بازو پکڑ کر اُس کا سوال اپنی زبانِ مبارک سے دہرایا۔ "کہو بھئی! تمہیں اب کون میرے ہاتھ سے بچائے گا؟" غورث نے کانپتے ہوئے کہا۔ "آپؐ مجھے معاف بھی کر سکتے ہیں اور قتل بھی کر سکتے ہیں۔" حضورؐ نے درگزر فرما دیا۔ اور جانے کی اجازت دے دی تو اس پر آپؐ کی شانِ رحمت کا اس قدر اثر ہوا کہ نہ صرف وہ خود ہی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ بلکہ اپنی قوم کو بھی متاعِ دین و ایمان سے بہرہ ور کر دیا۔

جنگِ اُحد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے۔ زخمی چہرے سے خون بہ رہا تھا۔ دستِ اقدس سے خون پونچھتے جاتے تھے اور زبانِ مبارک سے فرماتے جاتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِی فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ!

اسی جنگ میں ہندہ نے آپؐ کے چچا حضرت حمزہؓ کا کلیجہ چبایا اور وحشی نے حمزہؓ کو شہید کر دیا۔ مگر یہ دونوں ایک عرصہ گزرنے کے بعد مسلمان ہو کر آستانۂ رسالت پر پہنچتے ہیں۔ تو اُن سے انتقام لینا تو درکنار اُس واقعہ کا تذکرہ بھی نہیں فرماتے۔

آپؐ کی اس شانِ رحمت سے متاثر ہو کر ہندہ کہتی ہیں کہ "پہلے آپؐ کا خیمہ میرے نزدیک حد درجہ مبغوض تھا اور اب اس سے بڑھ کر محبوب کوئی اور خیمہ نہیں ہے۔"

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور ابو طالب کے انتقال کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بغرض تبلیغ طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے باشندوں کو آپؐ نے اسلام کی دعوت دی۔ لیکن آپؐ کی دعوت پر لبیک کہنے کے بجائے طائف والوں نے آپؐ کے ساتھ تمسخر کیا۔ اور شریر لونڈوں کو آپؐ کے پیچھے لگا دیا کہ وہ آپؐ پر سنگ باری کریں۔ چنانچہ آپؐ پر اس قدر پتھروں کی بارش ہوئی کہ جسم اطہر لہو لہان ہو گیا۔ اور سارا خون قدموں میں اس طرح جم گیا کہ وضو کے لئے جوتا نکالنا دشوار ہو گیا۔ زخموں سے جب کافی خون بہ گیا تو آپؐ ایک جگہ بیہوش ہو کر گر پڑے۔ زید بن حارثہ آپؐ کے ساتھ تھے۔ انہوں نے سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو اٹھا لیا اور ایک نخلستان میں پہنچ کر پانی کے چھینٹے دیئے تو آپؐ کو ہوش آیا۔ اور قدرے افاقہ ہوا۔ سرور عالم کا یہ حالِ زار دیکھ کر کرۂ بیانِ فلک کانپ اٹھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملک الجبال نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ بابرکت میں پہنچ کر عرض کیا۔

"اگر سرکار کا ارشادِ گرامی ہو تو طائف کے دونوں پہاڑوں کو آپس میں چکّی کے دو پاٹوں کی طرح ملا دوں اور یہ تمام ظالم کفّار پس کر رہ جائیں۔"

مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ رحمت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ نے پہاڑوں کے نگراں فرشتہ سے فرمایا:۔

"مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ طائف کے باشندوں کو مٹا دیا جائے۔ کیونکہ اگر موجودہ نسل مسلمان نہ بھی ہوئی تو اس کا امکان ہے کہ آنے والی نسل مسلمان ہو جائے۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جنگِ حنین کے بعد قبائلِ طائف مشرف بہ اسلام ہو گئے۔

ان واقعات کے علاوہ اور بھی بے شمار ایسے واقعات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں پائے جاتے ہیں۔ جن سے رحمۃ اللعٰلمین کی شانِ رحمت کا اظہار ہوتا ہے اور یہی وہ شانِ رحمت تھی جس نے سسکتی ہوئی انسانیت کو اسلام کے آبِ حیات سے سیراب کیا۔ اور نظامِ حق کی برکات سے دُنیا کو جنّت کا نمونہ بنا دیا۔

افتخار احمد بلخی

سنتِ رسولؐ دین میں حجّت ہے

تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے!

مولانا افتخار احمد بلخی کو اللہ تعالیٰ دارین میں اجر جزیل عطا فرمائے کہ انہوں نے فتنۂ انکارِ حدیث کی روک تھام کیلئے قرآن سے، سیرت سے، تاریخ سے اور عقل و درایت سے دلائل و شواہد فراہم کئے ہیں اور اس موضوع پر اس قدر سیر حاصل تحریریں پیش کی ہیں کہ منکرین حدیث کیلئے نزاع و مناظرہ کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ کٹ حجتی کی دوسری بات ہے کہ کوئی آفتاب کو طلوع ہوتا دیکھ کر بھی یہی کہے جائے کہ یہ تو شب سیاہ کا سماں ہے!

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ انکارِ حدیث کے فتنہ کے خلاف جو جدوجہد کی گئی ہے وہ بروقت کارگر ثابت ہوئی اور یہ فتنہ اب عالم نزع میں ہے اور اس کے لانے والوں کی ہوا اُکھڑ رہی ہے، انشاء اللہ حامیانِ سنت اپنی آنکھوں سے اس کی موت بھی دیکھ لیں گے کہ :-

"اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوقًا"

ہر باطل" کے لئے مقدر کر دیا گیا ہے! (م۔ق)

تاریخی شواہد

قرآن نے "سبیل المومنین" کی اتباع کو لازم قرار دیتے ہوئے اس سے انحراف کرنے والوں کو یہ وعید سنائی ہے کہ :-

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین له الهدیٰ ویتبع غیر سبیل المومنین نولّه ما تولّیٰ ونصله جهنم وساءت مصیرا (النساء ۱۷)

اور جو شخص رسول کی مخالفت پر کمربستہ ہو در آنحالیکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی ہو اور مومنین کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ اس معاملہ میں ہم یہ معلوم کریں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حدیث و سنت کو دین میں حجت و سند باور کیا تھا یا نہیں؟ چونکہ حدیث و سنت کا دین میں سند و حجت باور کرنا بھی ایک سبیل المومنین ہے۔ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ صحابۂ کرامؓ حدیث و سنت کو سرمایۂ دین سمجھتے تھے تو پھر اگر کوئی مسلمان حدیث و سنت کو دینی مقام نہیں دیتا ہے تو وہ "سبیل المومنین" سے روگردانی کر کے اس آیت کی وعید کا اپنے آپ کو مستوجب قرار دیتا ہے۔

اس سلسلہ کے مواد (MATTER) تو اتنے ہیں کہ ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے، ہم یہاں محض چند تصریحات و واقعات درج کئے دیتے ہیں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے پہلے خطبہ کا یہ جملہ سابق صفحات میں گذر چکا ہے کہ:۔

اطیعونی ما اطعت اللہ ورسولہ فاذا عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعۃ لی علیکم
(ابوبکر الصدیق للشیخ علی الطنطاوی ص ۱۶۶ و تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۴۸)

میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر واجب نہیں۔

اس خطبہ کی حیثیت ایک عہدنامہ کی ہے جو خلیفۂ اول رضؓ نے بیعت عامہ کے بعد خداد خلق سے کیا تھا۔

پھر آپ رضؓ کے اسی خطبہ کے یہ الفاظ بھی صفحات تاریخ پر ثبت ہیں کہ:۔

ایھا الناس قد ولیت امرکم ولست بخیرکم ولکن نزل القرآن وسن النبی صلی اللہ علیہ وسلم السنن فعلمنا وعلمنا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
ایھا الناس انما انا متبع ولست بمبتدع
(طبقات ابن سعد ج ۳ ق ا ص ۱۲۹)

لوگو! میں تمہارا صاحب امر بنایا گیا ہوں مگر میں تم سے بہتر نہیں۔ لیکن (یہ بات ہم سب کے پیش نظر رہنی چاہیئے کہ) قرآن نازل ہوا اور (اس کی بنیاد پر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی روش و طریقے کو جاری فرمایا، ہمیں آپؐ نے تعلیم دی، ہم نے جانے اور سیکھے!۔ ۔ ۔ ۔
لوگو! میں صرف (قرآن اور رسول کی ان تعلیمات کا) متبع ہوں، نہ یہ کہ کوئی نئی بات پیدا کرنے والا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

خطبہ کے یہ الفاظ اپنے مدلول کے لئے واضح ہیں، اگر کتاب کے ساتھ سنت بھی حضرت ابوبکر رضؓ کے نزدیک دین میں سند نہ ہوتی تو پھر اس کی اطاعت واتباع کا تذکرہ و اظہار کیوں فرماتے، اسی کے ساتھ بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضؓ نے اپنے فیصلوں کے لئے سنت کی تحقیق و تفتیش کی ہے، اور کتاب اللہ میں حکم صریح نہ ملنے کے وقت آپ سب سے پہلے سنت کی طرف رجوع کرتے، اور جب وہ معلوم ہو جاتی تو اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد حجیت حدیث و سنت پر دلالت کر رہا ہے کہ:۔

ایھا الناس، ان الرأی انما کان من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصیباً لان اللہ کان یُریہ، انما ھو منا الظن والتکلف

لوگو! رسول اللہؐ کی رائے غلطی سے مبرا ہوتی تھی، کیونکہ اللہ آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا، اور ہم؟ تو ہماری رائے بس گمان اور آورد ہے۔

اس میں لان اللہ کان یریہ (اس لئے کہ اللہؐ آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا کا جملہ، جو قرآن کے بما اراک اللہ کی بنیاد پر کہا گیا ہے حجیت حدیث و سنت کے فیصلہ کے واسطے ناطق ہے

پھر حضرت عمر رضؓ کے مکتوب کے یہ جملے ملاحظہ ہوں، جو انہوں نے قاضی شریح کے نام روانہ کیا تھا۔

اذا اتاک امر فاقض بما فی کتاب اللہ فان اتاک ما لیس فی کتاب اللہ فاقض بما سن فیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الموافقات للشاطبی ج ۴ ص ۶ مطبوعہ مصر)

جب تمہارے سامنے کوئی فیصلہ طلب معاملہ پیش ہو تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو، اور اگر وہ ایسا معاملہ ہو جس کے متعلق قرآن میں کوئی حکم نہ ہو تو پھر سنت رسول اللہ کے مطابق فیصلہ کرو۔ اور جب وہاں بھی نہ پاؤ تو ـــ فاجتھد برأیک ـــ پھر اجتہاد کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرو[1]

---

[1] بعینہ یہی بات حضرت عبد اللہ بن مسعود رضؓ نے بھی یوں فرمائی ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

اسی طرح ایک دوسرے مکتوب میں قاضی شریح کو ان الفاظ میں ہدایت کرتے ہیں کہ :۔ ......

انظر ما تبین لک فی کتاب اللہ فلا تسئل عنہ احدا و ما لم تتبین لک فی کتاب اللہ فاتبع فیہ سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (حوالۂ مذکور)

زیر غور معاملہ میں اگر تم کو کتاب اللہ میں حکم مل جائے تو پھر کسی سے اس کے متعلق دریافت نہ کرو اور اگر کتاب اللہ میں تمہیں کوئی وضاحت نہ ملے تو پھر اس معاملہ میں سنت رسول اللہ کی اتباع کرو۔

اور پھر حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں حج کے موقع پر والیانِ ملک، عمالِ حکومت، افسرانِ ماتحت اور عام مسلمانوں پر مشتمل مجمع میں جو خطبہ دیا تھا، اس خطبہ کے یہ جملے تاریخ کے سینوں میں محفوظ ہیں کہ :۔

ایہا الناس انی لم استعمل عمالا لیضربوا ابشارکم ولا لیاخذوا اموالکم وانما ارسلتھم الیکم لیعلموکم دینکم وسنۃ نبیکم۔

لوگو! میں نے تمہاری طرف جو عمال و حکام بھیجے ہیں وہ اس لئے نہیں کہ تمہیں زد و کوب کریں اور نہ اس لئے کہ تمہارے اموال تم سے لے لیں بلکہ اس لئے بھیجے ہیں کہ وہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں ...... الخ

اس طرح جب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بصرہ کے والی بنا کر بھیجے گئے تو وہاں انہوں نے مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :۔

بعثنی عمر لاعلمکم کتاب ربکم وسنۃ نبیکم۔

مجھ کو عمرؓ نے تمہاری طرف اس لئے بھیجا ہے کہ میں تمہیں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت کی تعلیم دوں۔

اسی کے ساتھ آپ وہ واقعات بھی پیش نظر رکھیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے خیال میں وقت کے اقتضائے کے مطابق ایک فیصلہ دیا، لیکن حدیث و سنت کے سامنے آنے کے بعد پھر اس سے رجوع کر لیا، اور بعض دفعہ یہ فرمایا کہ "اگر مجھے رسول اللہؐ کا یہ فیصلہ معلوم نہ ہوجاتا، تو میں اس کے خلاف فیصلہ دے دیتا"۔ ظاہر ہے کہ اگر زمانے کے تقاضے اور زمانے کی ضرورت کے مطابق مرکز ملت کی صوابدید پر معاملہ موقوف ہو، تو حضرت عمرؓ نے وقت کی ضرورت کے مطابق ایک فیصلہ دیدیا تھا، پھر اس سے رجوع کرنا چہ معنی دارد؟ یا زمانے کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق ایک فیصلہ پر پہونچ جانا، لیکن رسولؐ کا قول و فعل سامنے آنے کے بعد اپنی رائے سے دست کش ہوجانا اور یہ کہنا کہ "اگر رسول اللہؐ کا یہ ارشاد مجھ تک نہ پہونچتا تو میں اس کے خلاف فیصلہ دیتا" کیا حدیث و سنت کے حجت و سند ہونے کی محکم دلیل نہیں ہے؟

(بقیہ ص ـــ) من ابتلی منکم بقضاء فلیقض بما فی کتاب اللہ فان لم یکن فی کتاب اللہ فلیقض بما قضی بہ رسول اللہ فان لم یکن ...... فلیجتہد برایہ۔

(مفتاح الجنۃ ص ۳۲)

تم میں سے جو شخص منصب قضا کی ذمہ داریوں میں مبتلا ہوجائے تو اسے چاہیئے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے، کتاب اللہ میں نہ پائے تو رسول اللہؐ کے فیصلوں کی پابندی کرتے ہوئے اس کے مطابق فیصلہ کرے ...... پھر اگر وہاں نہ پائے تو اجتہاد کرے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اگر حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا مقصود سنت سے عمول ہے یہ ہوتا کہ رسول اللہؐ کی طرح قرآن میں اجتہاد اور قرآن سے استنباط کرو تو پھر درمیان میں "فاقض بما قضی بہ رسول اللہ" کہنے اور تیسرے نمبر پر "فاجتہد برایک برایہ" فرمانے کے کیا معنی؟ کتاب اللہ میں نہ پائے جانے کی صورت میں دوسرے ہی درجہ پر اجتہاد و استنباط کا تذکرہ ہونا چاہیئے تھا اور ظاہر ہے یہ اجتہاد و استنباط قرآن ہی سے ہوتا۔

اسی طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو خطبہ اپنی خلافت کے پہلے دن دیا تھا، اس کے یہ جملے تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں۔

فانی قد حُمّلتُ وقد قبلتُ الا وانی مُتّبع ولستُ بمبتدع الا وان لکم علیّ بعد کتاب اللہ عزوجل وسنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاثا ۔۔۔۔۔۔ الخ

مجھ پر ذمہ داری ڈالی گئی اور میں نے قبول کیا، یہ حقیقت ہے کہ میں اتباع کرنے والا ہوں، کوئی نئی بات پیدا کرنے والا نہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ مجھ پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے بعد تمہارے تین حقوق اور میری تین ذمہ داریاں ہیں الخ

(جمہرۃ خطب العرب حصہ اول ص۱۱ مطبوعہ مصر)

یہ خطبہ بھی ایک طرح کا میثاق ہے اور خلافت عثمانی کی پالیسی کا ایک اعلان۔ اس میں کتاب اللہ کے ساتھ سنت کے بھی حقوق کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے واجب الادا ہونے کا اظہار اور اس کی اتباع کا عہد کیا سنت کے دینی مقام اور اس کے سند ہونے کی روشن دلیل نہیں ہے؟

اسی کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھیے کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی طرح حضرت عثمانؓ کا بھی یہی دستور تھا کہ کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ پاتے تو سنت کی طرف رجوع کرتے اور اسی کے مطابق فیصلہ کرتے آپ کو علم نہ ہوتا تو دوسرے مقامات پر آدمی بھیجتے، پھر جب تلاش و جستجو کے بعد بھی علم نہ ہوتا تب اپنی رائے اور اجتہاد سے کام لیتے، اس کی کثرت مثالیں آپ کو تاریخ و سیر سے مل سکتی ہیں۔ پس اگر حضرت عثمانؓ سنت رسول کو حجت و سند تصور نہیں کرتے تھے تو خواہ مخواہ اس کے لئے دردسر کیوں مول لیتے؟

اسی طرح تاریخ کے سینے سے حضرت علیؓ کے وہ بے شمار کلمات و خطبات بھی محو نہیں کئے جا سکتے، جو سنت کے دینی مقام ہونے اور دین میں سنت کے سند و حجت ہونے کی تصریح کر رہے ہیں، مثلاً ایک طویل خطبہ میں آپ نے پہلے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کیا ہے، پھر حضرت ابوبکرؓ کا پھر حضرت عمرؓ کا پھر حضرت عثمانؓ اور ان کی شہادت کا، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ثم اتانی الناس وانا معتزل امورہم فقالوا لی بایع فابیت علیہم فقالوا لی بایع فان الامۃ لا ترضی الا بک وانا نخاف ان لم تفعل ان یفترق الناس فبایعتہم[1]۔ اس کے بعد مختلف باتوں کا تذکرہ کرکے ارشاد فرمایا کہ:۔

الا انی ادعوکم الی کتاب اللہ عزوجل وسنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔۔۔۔۔۔ الخ

ہاں! میں تمھیں اللہ کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت کی طرف دعوت دیتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ الخ

(جمہرۃ خطب العرب ج ۱ ص۱۶۲)

اسی طرح ایک دوسرے خطبہ میں حاضرین سے فرما رہے ہیں کہ:۔

---

[1] پھر لوگ میرے پاس آئے درآنحالیکہ میں ان کے معاملات سے کنارہ کش تھا، اور ان لوگوں نے مجھ سے درخواست کی کہ بیعت خلافت لے لیجئے، لیکن میں نے انکار کیا، پھر ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ بیعت لے لیجئے اس لئے کہ قوم سوائے آپ کے اور کسی سے مطمئن اور اس پر راضی نہ ہوگی، اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو ہمیں قوم کے درمیان انتشار و افتراق پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے، اس بنا پر پھر میں نے لوگوں سے بیعت خلافت لی۔

وابن عمّ نبیکم معکم وبین اظہرکم یدعوکم الی الجنۃ والی طاعۃ ربکم والعمل بسنۃ نبیکم ...... الخ

اور تمہارے نبی کا چچازاد بھائی تمہارے ساتھ اور تمہارے روبرو تمہارے درمیان ہے، جو تمہیں جنت کی طرف بلا رہا ہے اور دعوت دے رہا ہے تمہارے رب کی اطاعت کرنے اور تمہارے نبی کے سنت پر عمل پیرا ہونے کی طرف ...... الخ

ساتھ ہی یہ بھی ملحوظ رہے جیسا کہ تفصیلات گذر چکی ہیں کہ حضرت علیؓ کا احادیث کو قلمبند کرنے کا اعتراف خود یہ منکرین حدیث کرتے ہیں اور یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے اس مجموعۂ احادیث کا نام "الصحیفہ رکھا تھا" جو ان کی تلوار کے نیام میں ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

اس کے علاوہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے حضرت عمرؓ کے بعد خلافت کے لئے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں سے یہ دریافت کیا تھا کہ اگر آپ کی بیعت کر لی جائے تو کیا آپ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی اقامت و سربلندی کریں گے؟ اور دونوں نے اس پر آمادگی ظاہر کی تھی[1] - اور پھر دیکھئے کہ سارے صحابہ نے حضرت عثمانؓ کی بیعت بایں الفاظ کی تھی کہ :-

نبایعک علیٰ کتاب اللہ وسنۃ رسولہ

ہم آپ کے ہاتھ پر اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر عمل کرنے میں بیعت کرتے ہیں -

اگر صحابہ کی نظر میں سنت کا کوئی دینی مقام نہ تھا، اور حدیث و سنت انکے نزدیک محض "نظائر" کے کام لینے کی چیز تھی تو پھر معاملۂ بیعت میں کتاب اللہ کے ساتھ اس کو نتھی کرنے کی ضرورت کیا تھی؟

صحابہ کرام کی نظر میں مقامِ سنت کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب حضرت معاذ بن جبلؓ شاہ روم کے پاس سفارتی کام کو بھیجے گئے تھے تو وہ بھرے دربار میں شاہ روم اور اس کی سلطنت کے ارکان و اعیان کے روبرو اسلامی تعلیمات وہدایات اور مملکت اسلامیہ کی پالیسی پر تقریر کرتے ہوئے برملا اعلان فرماتے ہیں کہ :-

وامیرنا منا ان عمل فینا بکتابنا وسنۃ نبینا قررناہ علینا وان عمل بغیر ذالک عزلناہ عنا ...... الخ

ہمارا امیر ہم میں سے ایک فرد ہے، اگر وہ ہماری کتاب اور ہمارے نبیؐ کی سنت کے مطابق ہمارے معاملات سرانجام دے تو ہم اسے اپنا خلیفہ باقی رکھیں گے اور اگر وہ قرآن وسنت سے انحراف کرنے لگے تو ہم اسے معزول کر دیں گے -

سوچنے کی بات ہے کہ اگر صحابہ کی نظر میں سنت کا کوئی دینی مقام نہ ہوتا تو کتاب اللہ سے اعراض کی طرح سنت رسول اللہ سے اعراض کے نتیجہ میں بھی خلافت سے معزولی کی کون سی دینی وجہ جواز ہو سکتی ہے؟

یہ سطور تو اصولی طور پر سمجھانے کے لئے قلمبند کی گئی ہیں کہ صحابہ کرام کے نزدیک کتاب اللہ کی طرح حدیث و سنت بھی دین میں ایک حجت و سند تسلیم کی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر مختلف صحابہ کی بہ تصریح ضبط تحریر میں لائی جائے کہ "دو ہی چیزیں اصل ہیں، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ"[2] تو اس کے لئے ایک دفتر چاہیئے، اسی طرح جیسا کہ

---

[1] الامامۃ والسیاسۃ (ابن قتیبہ)

[2] یہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے، ملاحظہ ہو جامع بیان العلم وفضلہ ج ۲

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایک موقع پر اپنے ایک مخاطب پر حجیتِ حدیث و سنت پر اس آیت سے دلیل قائم کی تھی کہ ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھٰکم عنہ فانتھوا[1] (جامع بیان العلم ج ۲) دیگر صحابہ کے استدلالات نقل کئے جائیں تو ایک انبار لگ سکتا ہے۔

حدیث و سنت سے وحشت و نفرت رکھنے والے طلباء اعتصام بالسنۃ کے اس جذبہ کی عظمتوں کو کیا جانیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب میں سنت سے متعلق موجزن تھا جس کی صرف ایک مثال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی خلافت کے ایام میں حج فرما رہے ہیں، حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ :-

"میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کسی کو نقصان پہونچا سکتا ہے اور نہ نفع۔
اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو تجھے
ہرگز بوسہ نہ دیتا۔"

پھر سنت تو بڑی چیز ہے، اتباعِ رسولؐ میں صحابہ کے سرشار ہونے کی کیفیت تو یہ تھی کہ حضورؐ کے وہ کام بھی، جو امور دین سے تعلق نہیں رکھتے، انہیں اتنے محبوب تھے کہ ان کی تقلید کا اہتمام کرتے چنانچہ اسی والہانہ شیفتگی کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ جب اُن راستوں سے گذرتے جن راستوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ہو چکا تھا تو ہر وہ عمل کرتے جو حضورؐ نے اُس راہ پر چلتے ہوئے فرمایا تھا، حتیٰ کہ اگر کسی مقام پر رُک کر حضورؐ نے استنجا فرمایا تھا تو باوجود حاجت و خلش نہ ہونے کے حضرت ابن عمرؓ استنجا کرنے والے شخص کی ہیئت بنا کر اُس جگہ بیٹھتے۔

ایسے عاشقین رسالت پر تہمت لگائی جا رہی ہے کہ اُنہوں نے سمجھ لیا تھا کہ حدیث و سنّت کا دین میں کوئی مقام نہیں ہے۔

اسی کے ساتھ کتب تاریخ و روایات میں جو آپ یہ پڑھتے رہتے ہیں کہ صحابہ اپنے اقوال و افعال کے سلسلہ میں یہ کہا کرتے کہ میں نے یہ بات اس لئے کہی کہ رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے اور یہ کام اس لئے کیا کہ رسول اللہؐ کو یہ کرتے ہوئے دیکھا ہے تو اگر صحابہ کے نزدیک حدیث و سنت کا کوئی دینی مقام نہ تھا تو پھر کیا ان کا شب و روز یہ کہتے رہنا تکیۂ کلام کے طور پر یا تفریح طبع کی بنا پر تھا؟

پھر دورِ صحابہ کے بعد اس باب میں علمائے امت کی متفقہ شہادتیں ایک مستقل کتاب کی طالب ہیں، اسلئے ہم نے سب کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اصولی حیثیت کے دو چار واقعات نقل کر دئے ہیں ان سے آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ منکرین حدیث کا یہ باور کرانا صحابہ پر بہتان عظیم ہے کہ صحابہ کرامؓ حدیث کو حجت نہیں سمجھتے تھے[2] اور یہ کہنا ائمہ کرام پر اتہام ہے کہ اہل بصیرت ائمہ حدیث سمجھ گئے تھے کہ حدیث کی حیثیت دینی نہیں[3]۔

---

[1] اور آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ سنہ ۳۱ء، ۳۲ء میں طلوع اسلام کے نفوس ناطقہ نے بھی اس آیت کو حجیت حدیث وسنت پر بطور استدلال پیش کیا تھا۔ [2] و [3] مقام حدیث صٓ و صٓ ۱۱۳

یہ حضرات تاریخ تاریخ کی رٹ تو لگاتے رہتے ہیں، مگر پوری دیدہ دلیری سے تاریخ کے ایک ایک لفظ کی تکذیب کر ڈالتے ہیں۔ میں ان تاریخ والوں سے، جو وضع احادیث سے انکار حدیث پر دلیل قائم کرتے ہیں، یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی انھوں نے یہ بھی سوچا کہ آخر وضاعین وکذابین نے وضع احادیث کا وبال کیوں مول لیا؟ ان مفسدہ پردازوں کو آخر وہ کونسی ضرورت پیش آئی تھی جس کی خاطر انھوں نے وضع احادیث کی کھکھیڑ گوارا کی! اگر امت مسلمہ کا یہ مسلم الثبوت عقیدہ اور ملت کا اس پر اتفاق نہ ہوتا کہ حدیث و سنت دین میں حجت و سند ہے، تو پھر کیا موضوع احادیث اور مکذوبات کی خاطر یہ اعدائے دین اسی طرح سر توڑ کوشش کرتے تاکہ کسی طرح حدیث و سنت کو ملیامیٹ کر دیا جائے؟ اس نکتہ کو بڑے اچھے انداز میں مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے بیان کیا ہے کہ

"وضع احادیث ہی حجیت احادیث کی دلیل ہے، اگر حدیث حجت نہ ہوتی تو وضع حدیث کی ضرورت ہی پیش نہ آتی! معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں حدیث کی حجیت مسلّم تھی، اس لئے تو وضاعین اور کذابین حدیثیں بناتے تھے تاکہ حدیث کے نام سے قبول کر لی جائے، جھوٹ بولنا ہی صدق کے حجت ہونے کی دلیل ہے، اگر صدق حجت نہ ہوتا تو کذب کی ضرورت نہ ہوتی۔"

(حجیت حدیث صفحہ ۱۰۳)

یہاں مجملاً یہ بتا دینا مناسب ہے کہ یہ حضرات انکار حدیث کی لغو بیانی کے لئے "تاریخ کے صفحات سے چھانٹ چھانٹ کر جو دس بارہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ ان میں اول تو پوری خیانت نقل سے کام لیتے ہیں (جس کی کافی تفصیلات گزر چکی ہیں) اور پھر اس سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو ان حضرات کے "تاریخی حوالوں" سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ صحابہ نے کثرت روایت کو ناپسند کیا، خلفائے راشدین نے تثبت فی النقل کی خاطر احادیث پر شہادت طلب کی، "اہل بصیرت ائمہ" نے احتیاط اور احساس ذمہ داری کی بنا پر چند بصیرت افروز باتیں کہیں لیکن ان باتوں کو یہ حضرات انکار حدیث کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں اور اپنے بر خود غلط ہونے کی بنا پر سمجھتے ہیں کہ ساری دنیا جاہل مطلق ہے اور عقل و نظر سے قطعی بے گانہ۔

ایک مثال بھی تاریخ سے اس کی نہیں پیش کی جا سکتی کہ صحابہ یا اہل بصیرت ائمہ نے نفس حدیث و سنت کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہو، حدیث و سنت کو اصلاً و اصولاً دین میں حجت اور سند ہونے سے خارج کر دیا ہو۔ چنانچہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں ملتا جو علم و فہم رکھتا ہو اور پھر اتباع رسول کی مخالفت کرتے ہوئے جس نے یہ ادعا کیا ہو کہ رسول کا نفس قول و فعل اور رسول کا امر بجائے خود واجب الاطاعت نہیں ہے۔[۳]

آخر۔۔۔ تاریخ کو دریا برد کر کے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا لینے "کی فکر بلاوجہ تو نہیں کی جا رہی ہے؟ کوئی بات تو ہے؟ کوئی رمز تو ہے؟

---

[۳] کتاب الام ج ۷، صفحہ ۲۵۰ مطبوعہ مصر

اقبال سیفی

میرے معبود

ہاتھ پھیلائے ہوئے آئے ہیں
میرے معبود ترے در پہ فقیر
عرضِ احوال ہے اپنا مقصود
نہ کہ اخلاص و وفا کی تشہیر
دیکھ تو اپنے جہاں کے انداز
کلمۂ حق پہ ہے کیا کیا تعزیر
آتش افروز ہے فکرِ نمرود
کشمکش میں ہے دلِ ابراہیم
اک طرف بھیڑ ہے فرعونوں کی
اور تنہا ہے ادھر جذبِ کلیم
ہر طرف کبر و ریا کے چشمے
اور بے آب ہے رودِ تسنیم!
درپئے جورِ زمانہ ہے تو کیا
ہم تری چشمِ کرم چاہتے ہیں
پھر وہی جذبِ دروں کا ہے وُرود
پھر وہی ربطِ بہم چاہتے ہیں
ہمیں آزادئ گفتار ملے
حرمتِ لوح و قلم چاہتے ہیں!

ذکی زاکانی

نوائے سروش

سرشکِ خوں کی ہوئی چشمِ آرزو سے نمود
جگر کو چیر گیا جیسے نغمۂ داؤد
ابھی حیات ہے رقصندہ قالبِ فطرت میں
یہ انقلاب دمادم اک اضطرابِ نمود
مئے طلب نے دیا تیرہ مستیوں کو فروغ
اگرچہ آتشِ ہستی تھی آتشِ بے دُود
ہوں مطمئن نہ ابھی دورِ حاضرہ کے خلیل
بہارِ شعلہ بداماں ہی غیرتِ نمرود
تلاش چھوڑ نہ اے دوست حُسنِ معنی کی
اگر نظر سے ہی غائب کہیں تو ہے موجود

جھلکیاں

حیرت شملوی:-

مے ہی جب تلخ ہے پیمانے کی — مدح کیا کیجئے میخانے کی

کیسے ممکن ہے کہ رندانِ ازل — نہ کریں بات بھی پیمانے کی

پاس وحرماں کو بہانے ہوتے — کیا ضرورت ہے کہیں جانے کی

بات میں بات نکل آتی ہے — حد نہیں شوق کے افسانے کی

حوصلہ ہے تو کوئی وجہ نہیں — حال و ماحول سے گھبرانے کی

کوئی خوش فہم ہی رکھتا ہوگا — اُن سے امید صلہ پانے کی

شمع ہی بزم میں جب تک روشن — جان خطرے میں ہے پروانے کی

اللہ اللہ یہ پیچیدگیاں — اور کوشش نہیں سلجھانے کی

اُن کے دل سے کوئی پوچھے حیرت
تھی خوشی جن کو بہار آنے کی

وارث القادری:-

جھلکیاں تیری تجلی کی نظر آتی ہیں! — ورنہ اس عالمِ ایجاد میں کیا رکھا ہے

صرف معراجِ وفا کیلئے شاید اے دوست — تُو نے یہ مرحلہ صبر و رضا رکھا ہے

دونوں عالم ہیں بہ حیرت نگراں میری طرف — میں نے اک بارِ امانت جو اُٹھا رکھا ہے

ظفر ہاشمی:-

آ تجھ کو بتاؤں میں اک نکتۂ لولاکی — ہے پیکرِ خاکی بھی ایمان سے افلاکی

تبدیل نہیں ہوتے احوال محبت کے — جب تک کہ نہ دل سیکھے آزادی و بیباکی

آسان سمجھتے تھے ہم سیرِ گلستاں کی — دیکھی ہی نہ تھی تم نے لالے کی جگر چاکی

کل عرشِ معلیٰ پہ جبریل یہ کہتا تھا — اس خاک کے پتلے کا ہر نالہ ہے افلاکی

دردکا اظہار تو ہر دم نہ کر — نالہ کر لیکن ظفرؔ پیہم نہ کر!

دل کا جانا ہے محبت میں ضرور — دل اگر جاتا ہے اُس کا غم نہ کر!

ماہرالقادری

اجتماع گاہ

(جماعتِ اسلامی کے سالانہ اجلاس کراچی سے متاثر ہو کر!)

یہ خیمہ گاہ، یہ طُغرے، یہ دفتروں کی قطار
اک انجمن ہے مگر کتنی سادہ و پُرکار

نہ شور ہے نہ کہیں برہمی، نہ گرد و غبار
مقامِ غور و توجہ ہے یا اولی الابصار!

یہ ضبط و نظم و سلیقہ، یہ فرض کا احساس
دل و نگاہ بھی روشن، ضمیر بھی بیدار

روش روش سے نمایاں فراستِ مومن
قدم قدم پہ ہے دینی شعور کا اظہار

طلوعِ صبح کا منظر نہ پُوچھیے کیا ہے
غروبِ شام بھی ہے اس جگہ سحر آثار

ہوا کے دوش پہ جاتے ہوئے پیامِ عمل
فضا میں گونج رہی ہے خدا کے دیں کی پُکار

مجاہدوں کے سے انداز، غازیوں کی سی چال
یہی تو حق و صداقت کے ہیں علمبردار

وہ دشمنوں کی ہو یُورش کہ دوستوں کے ستم
ہر ایک حال میں اپنے خدا کے شکر گزار

خلوص جن کی ہے طینت وفا ہے جن کی سرشت
ز فرق تا بقدم سوز و اُلفت و ایثار

لئے ہوئے ہیں مہ و کہکشاں جبینوں میں
یہ آفتاب چھُپائے ہوئے ہیں سینوں میں

روحِ انتخاب

جاننا چاہیئے کہ گناہِ صغیرہ میں اس بات کی امید ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اُسے بخش دیگا - لیکن بعض اسباب کی بنا پر صغیرہ کبیرہ بن جاتا ہے اور اُس کا خطرہ بھی سخت ہو جاتا ہے اور وہ اسباب چھ ہیں - پہلا یہ کہ آدمی گناہ صغیرہ پر اصرار کرتا ہے جیسے کہ ہمیشہ غیبت کرے یا ہمیشہ ریشمی کپڑا پہنے یا گانے کو لہو و لعب کے طور پر سُنا کرے کیونکہ جو گناہ متواتر کیا جاتا ہے اُس کو دل کے تاریک بنانے میں بڑا دخل ہوتا ہے - اور اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ نیکی سب سے اچھی ہے جو ہمیشہ ہوتی رہے - چاہے وہ قلیل ہی کیوں نہ ہو اُس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک قطرہ پانی کے پتھر پر گرنے سے پتھر میں سوراخ ہو جاتا ہے اور اگر وہ تمام پانی یکبارگی بہادیا جائے تو اثر نہیں کرتا - پس جو شخص گناہ کبیرہ و صغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے اُسے چاہیئے کہ استغفار سے اُس کا تدارک کرے اور پشیمان ہوتا ہے اور اس بات کا قصد کرتا ہے کہ پھر ایسا نہ کریگا - بزرگوں کا قول ہے کہ گناہ کبیرہ استغفار سے صغیرہ ہو جاتا ہے اور صغیرہ گناہ اصرار سے کبیرہ ہو جاتا ہے - دوسرا سبب یہ ہے کہ اگر گناہ کو حقیر خیال کرے گا اور چشمِ حقارت سے دیکھے گا تو گناہ صغیرہ اس کی وجہ سے کبیرہ ہو جائیگا اور جب (چھوٹے) گناہ کو بڑا خیال کریگا تو وہ کم ہو جائیگا - کیونکہ گناہ کو بڑا خیال کرنا خوف اور ایمان کی وجہ سے ہوتا ہے اور گناہ کا چھوٹا خیال کرنا غفلت کے سبب سے اور گناہ کے ساتھ لگاؤ کے باعث ہوتا ہے اور یہ بات اس امر کی دلیل ہوتی ہے کہ گناہ نے دل کیساتھ مناسبت پیدا کر لی !

مسلمان اپنے گناہوں کو اپنے اُوپر ایک پہاڑ سمجھتا ہے اور ہمیشہ ڈرتا رہتا ہے کہ مبادا میرے اوپر کہیں پھٹ پڑے اور منافق اپنے گناہوں کو مکھی کی مانند خیال کرتا ہے کہ جو اس کی ناک پر بیٹھتی ہے اور اُڑ جاتی ہے - بزرگوں کا قول ہے کہ جو گناہ نہیں بخشا جاتا وہ یہ ہے کہ آدمی اس کو اپنے دل میں سہل اور خفیف خیال کرے اور کہے کہ کاش ! سب گناہ ایسے ہی ہوتے !

ایک پیغمبر علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ گناہ کے چھوٹے ہونے پر خیال نہ کر - حق تعالیٰ کی بزرگی اور عظمت کی طرف دھیان کر کہ تو نے اس کے حکم کی خلاف ورزی کی اور جس قدر بندہ حق تعالیٰ کے جلال کو زیادہ پہچانتا ہے اسی قدر چھوٹے گناہ کو بڑا جانتا ہے - ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم لوگ ایسے کام کرتے ہو کہ اُن کو بال برابر جانتے ہو اور ہم ہر ایک اُن میں سے پہاڑ جتنا سمجھتے ہیں ! اور تمام گناہوں میں حق تعالیٰ کا غصہ پوشیدہ ہے اور ممکن ہے اسی میں ہو جسے تو سب سے ہلکا جانتا ہے - جیسا حق تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

وتحسبونہ هیناً وهو عند اللہ عظیم !

یعنی تم ہلکا جانتے ہو حالانکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا ہے ! تیسرا سبب یہ ہے کہ گناہ کر کے طبیعت کو ایک طرح کی مسرت ہو اور اس کو غنیمت اور فتوح خیال کرے اور اُس پر فخر جتائے اور ممکن ہے فخر و مباہات کے طور پر کہے کہ میں نے فلاں کو فریب دیا اور اس کا مال ہضم کر لیا، گالیاں دیں شرمندہ کیا اور مناظرہ میں اُسے رنج پہنچایا اور اذیت و غصہ میں مبتلا کیا - پس جو شخص اپنی ہلاکت پر خوش ہو اور اُس پر فخر کرے تو یہ اُس کا سیاہ ہونے کی دلیل ہے اور یہی امر اُس کی ہلاکت کا سبب ہے !

چوتھا سبب یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ اس کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا ہے اور وہ اس بات کو حق تعالیٰ کی عنایت کہے اور نہ ڈرے کہ شاید حق تعالیٰ نے اس کو مہلت دی ہے تاکہ پورے طور پر ہلاک ہو جائے - پانچواں سبب یہ ہے کہ اپنے گناہ کو ظاہر کرے اور حق تعالیٰ کے پردے کو اپنے سے اٹھائے کہ شاید اور لوگ بھی اس کی وجہ سے گناہ کی طرف راغب ہوں تو ایسی حالت میں بھی دوسروں کے گناہ اور رغبت کا وبال بھی اُس کی گردن پر ہے سلف صالحین نے فرمایا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی قیامت نہیں کہ مسلمانوں کی نظر میں گناہ کو آسان اور ہلکا بنائے - چھٹا سبب یہ ہے کہ مقتدا ہو کر گناہ کرے کہ اس کے افعال کو دیکھ کر دوسرے بھی دلیر ہو جائیں اور کہیں کہ اگر یہ بات نا کردنی ہوتی تو وہ فلاں عالم و مقتدا ایسا نہ کرتا -

(کیمیائے سعادت، حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ)

تماشائی کے قلم سے

پرچھائیاں

شری مان "پوجیہ" پنڈت جواہر لال نہرو جی جب بھارت دیس سے روس میں پدھارے تھے تو وہاں کئی ہزار لڑکیوں نے اُن کا سواگت (خیر مقدم) کیا تھا اور اپنی نرم و نازک انگلیوں سے نہرو جی پر پھول برسائے تھے۔ دوشیزاؤں کی گل باری کا یہ منظر نہایت ہی دلکش بلکہ دیدنی تھا۔ شوخ رنگین قلم ایک طرف اور یہ منظر اُن سب کا تنہا جواب۔ ع

آپ آخر آپ ہیں تصویر پھر تصویر ہے!

نقل کہیں اصل کو پہنچ سکتی ہے، افسانے بھلا حقیقت کی برابری کر سکتے ہیں!

نہرو جی بھی روس کے نیتاؤں کو یہ سندیسہ دے آئے:-

"ہماری گلی آنا .... کبھی ہماری گلی آنا"

اور یوں بھی سیاسی حکمرانوں کے یہاں "تبادلۂ خیالات" کے ساتھ "تبادلۂ استقبال" بھی ضروری ہوتا ہے۔ شدھ ہندی میں اسے "آؤ بھگت کی ادلا بدلی" بھی کہہ سکتے ہیں۔ تم نے ہماری آؤ بھگت کی، ہم تمہاری آؤ بھگت کریں گے۔ ع

کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے!

میزبانی اور مہمانی کے عام اصول سے قطع نظر، دُنیا کو بھی تو یہ دکھانا ہوتا ہے کہ ہم "دو طاقتوں" میں اتحاد ہو گیا ہے اور دونوں نے ایک دُوسرے سے پیمانِ وفا باندھ لیا ہے۔ اب سیاست کی سٹے بازی اسی "اتحاد" کی "شرح" (Rate) سے ہوگی!

ہاں! تو بلگانن اور خروشچیف بھارت میں رونق افروز ہوئے اور اُن کے خیر مقدم کے لئے نہ جانے کس کس پاٹ شالا اور ودیا مندر کی سُندر کنیائیں منتخب کی گئیں۔ اور انہوں نے پھولوں، تالیوں اور مُسکراہٹوں کے ساتھ روس کے عظیم رہنماؤں کا سواگت کیا۔

بھارت کی اِن "کنواریوں" کو اس طرح منظرِ عام پر لایا گیا کہ پور پور بناؤ سنگھار اور ابروؤں کی کمانوں اور نگاہوں کے ناوکوں سے لیس! زُلفوں کے دام بھی اور مُسکراہٹوں کی تباشیر بھی! معاملہ بھی تو اُن سے آپڑا تھا جن کے پہلوؤں میں اگر دل ہیں تو پتھر کے بنے ہوئے ہیں! جو ذرا سی بات پر اپنے ساتھیوں کو بے دریغ گولیوں سے اُڑا دیتے ہیں، اور اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اُن کے ابرو پہ شکن بھی نہیں آتی!

یہ وہی بھارت ہے جہاں سیتا جیسی ستیہ وتی مہلائیں جنم لے چکی ہیں، اور آج اُسی بھارت میں کنیاؤں کی جوانی کو، مُسکراہٹوں کو، اداؤں اور جاذب بتیوں کو "راکششوں" کا دل موہ لینے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان جمہوری نیتاؤں اور راشٹر پتیوں سے تو وہ راجے مہاراجے ہی اچھے تھے، جو اپنی کنیاؤں اور استریوں اور دھرم پتنیوں کے "مان" کی رکھشا کرتے تھے!

سُننے میں تو یہ آیا تھا کہ مُسلم لیگ کا کفن دفن کیا، تیجا اور چالیسواں بھی ہو چکا - اور اب کچھ "بڑے لوگ" اس کے مقبرے کی مُجاورت کا فرض انجام دے رہے ہیں - مگر اخباروں میں ایکا ایکی یہ خبریں آنے لگیں کہ کچھ "مسیحا نفس" اس "تنِ بے جان" میں جان ڈالنے کے لئے اٹھ بیٹھے ہیں - اور اس مُردے کو زندہ کر کے دم لیں گے ـــ معلوم ہوا کہ وہ پہلی اطلاع پوری طرح واقعاتی نہ تھی مُسلم لیگ کے تابوت کو دفنایا نہیں گیا تھا - بلکہ فراعنۂ مصر کی ممیوں کی طرح اُسے محفوظ کر دیا گیا تھا -

مُسلم لیگ کی رگوں میں خون دوڑانے اور اس ڈھانچے میں جان ڈالنے کا دھیان اس کے "عشاق" کو اس موقع پر آیا ہے جب کہ مغربی پاکستان کی اسمبلی کا انتخاب ہونے والا ہے! عاشقی اور آشنائی کا یہ وہ "ماڈرن" مسلک ہے جہاں ہر چیز کو سود و زیاں کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے اور ذاتی اغراض کی ترازو میں تولا جاتا ہے!

ہاں! تو مُسلم لیگ کو زندہ کرنے کے نام پر عروس البلاد کراچی میں دو اجتماعات ہوئے - ایک آرام باغ میں "مُسلم لیگ ورکرز" کے نام سے اور دوسرا "مُسلم لیگ کنونشن" کے عنوان سے! ـــ مقصد ؟؟ یہ نہ پوچھئے - اس "دُکھتی رگ" پر خدا کے لئے انگلی نہ رکھئے ورنہ مُسلم لیگ کے بڑے بڑے جاں باز عُشاق تلملا اٹھیں گے!

مقصد ظاہر ہے، یہ کوئی "راز" نہیں ہے جس کی نقاب کشائی کی جائے - یہی کہ مُسلم لیگ کو زندہ ہونا چاہیئے کہ اُسی نے پاکستان بنایا ہے اور اب بھی پاکستان کی تعمیر کا فرض انجام دے گی - مگر کب ؟ اس وقت جب ہم "نیازمندانِ لیگ" کو قوم اسمبلی کی کرسیوں پر براجمان کرا دے گی - مطلب یہ ـــ کہ مُسلم لیگ کا مُردہ اُس وقت تک زندہ ہی نہیں ہو سکتا جب تک ہم "کچھ" بن نہیں جاتے!

دُنیا میں کسی پارٹی کو شاید ہی ایسے بے وفا، غرض پرست اور دشمنِ اصول لوگ ملے ہوں - جو اپنی جماعت کی لاش پر اپنی چودھراہٹ کا تخت بچھانے ہی کو اپنی ڈپلومیسی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتے ہوں!

بیگم لیاقت علی خاں بادِ بہاری کی طرح پاکستان میں رونق افروز ہوئیں اور بوئے گُل کی طرح سات سمندر پار واپس تشریف لے گئیں ـــ ع

آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا!

یہ تو شاعر کا کہنا ہے - حقیقت میں یہ فسانہ ختم نہیں ہوا - بلکہ یہ داستان اور طول کھینچ گئی ہے! بیگم صاحبہ موصوفہ "اپوا" کی تحریک کو "بڑھانے" کے لئے تشریف لائی تھیں - اور یہ کارنامہ وہ انجام دے کر چلی گئیں! انگریزی روزنامہ "ڈان" کے کالم اُن کے طوفانی دورے کی کامیابی کی شہادت دے رہے ہیں - کیسی کیسی گرما گرم تقریر فرمائی ہیں پاکستان کی اس "خاتون سفیر" نے! اور ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر "بیگمات" نے اپنی اس "عظیم لیڈرانی" کے کس گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کئے ہیں کہ بہت سے "دردمندانِ قوم" اور "لیڈرانِ ملت" کو حسرت ہوئی کہ کاش! ہم بھی "بیگم" ہوتے!

بیگم صاحبہ نے بعض تقریروں میں اخلاق و اسلام کا ذکر فرمایا ہے اور یہ بھی اُن کی عین مہربانی ہے جو اخلاق و اسلام کا نام اُن کی زبان پر آ گیا ورنہ وہ کچھ اور کہہ دیتیں تو کس کی جرأت تھی جو اُن کو ٹوک سکتا - مگر ہم بیگم صاحبہ کی خدمت فیض درجت میں یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جس "اخلاق و اسلام" کا نام وہ لیتی رہتی ہیں اُس کی رُو سے تو کسی مسلمان عورت کا اس طرح محرم کے بغیر سیر سپاٹے کرتے پھرنا، غیر مردوں سے ہاتھ ملانا اور ناچ گانوں کی محفل میں شرکت کرنا کسی عنوان جائز اور کسی طرح درست

نہیں ہے! ایک طرف اخلاق و اسلام کے معروف اصولوں کی پامالی، دوسری طرف اخلاق و اسلام کی تلقین۔ اس دورنگی کے خود اخلاق و اسلام کے حق میں اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے!

تماشائی نے ڈرتے ڈرتے اظہارِ خیال کیا ہے۔ خوف یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کی مدافعت میں کہیں "ادارہ ثقافتِ اسلامیہ" میدان میں نہ کود پڑے۔ کہ وہاں کئی سال سے اسلام کو "ماڈرن" بنانے کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ اور اصولِ اخلاق کی ایک جدید ترین لیبارٹری تیار کی جا رہی ہے!

وکیل:۔ تمہارا مقدمہ جھوٹا اور بنایا ہوا تو نہیں ہے؟

موکل:۔ جی نہیں! بس اتنا ہے کہ میں جن پر دعویٰ کرنا چاہتا ہوں وہ اس مہینہ کی چھٹی تاریخ کو لاہور میں تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ گواہوں کے بیانات سے ان کا اس تاریخ میں کسی طرح کراچی میں ہونا ثابت ہو جائے!

وکیل:۔ (پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہمارے محرر صاحب سے آپ پہلے مل لیجئے۔ ایسے مقدمات انہی کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے ہیں۔ میں تو بس عدالت میں پیروی کرنے کا گنہگار ہوں!

ضروری گزارش

کیا آپ "فاران" کے مستقل خریدار ہیں؟

اگر ہیں تو کیا آپ نے "سیرت نمبر" کی رجسٹری اور پیکنگ وغیرہ کے مصارف (چھ آنے) دفتر "فاران" کو بھیج دیئے ہیں۔ اگر نہیں بھیجے تو اب پہلی فرصت میں ضرور بھیج دیجئے۔

سیرت نمبر بہت ضخیم تھا اگر سادہ ڈاک سے بھیجا جاتا تو اس کے گم ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے دفتر فاران نے اسے آپ کی خدمت میں بذریعہ رجسٹری بھیجنے کی زحمت گوارا کی!

(مینیجر)

ہماری نظر میں

تاریخ دعوت و عزیمت

"تاریخ دعوت و عزیمت" (حصہ اول) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ ۳۹۲ صفحات (غیر مجلد) کتابت، طباعت اور کاغذ ہر چیز معیاری۔ قیمت چھ روپے۔ ملنے کا پتہ:۔
دار المصنفین، اعظم گڑھ (یوپی ــــ انڈیا)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے نام اور کام سے پاکستان اور ہندوستان ہی نہیں عرب ممالک بھی واقف و متعارف ہیں۔ اس مرد حق آگاہ کی ہر سانس خدمتِ دین اور تبلیغ اخلاق و صداقت کے لئے وقف ہے۔ "تاریخ دعوت و عزیمت" بھی اسی قلم کی تراوش ہے جس کے رشحات نے نہ جانے کتنے بنجر دلوں کو سیراب کیا ہے!

اس کتاب میں فاضل مصنف نے تاریخِ اسلام کے اُن نامور اور صاحب عزیمت اکابر کے کارناموں کو پیش کیا ہے۔ جو "تجدید و اصلاح" کے نقیب تھے۔ پہلی صدی ہجری میں اموی ملوکیت کے جاہلی رجحانات و اثرات کو مٹانے کے لئے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے کیا انقلابی قدم اُٹھایا؟ ــــ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اُمت کے اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف کو دُور کرنے کے لئے کیا اصلاحی کوشش فرمائی؟ ــــ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے فتنۂ خلقِ قرآن کا کس عزیمت کے ساتھ مقابلہ کیا؟ امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ نے فتنۂ اعتزال کے سیلاب کو کس طرح روکا؟ علم کلام کے انحطاط کے بعد فلسفہ اور باطنیت کو کس طرح فروغ ہوا؟ اور اُس عقلی اور یونان زدہ ماحول میں حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تجدید و اصلاح کی دعوت کس انداز میں پیش فرمائی؟ حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ العزیز نے اصلاح و ارشاد کا کیا کارنامہ انجام دیا؟ ــــ علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی قوتِ نقد و نظر اور ادبیت و خطابت نے ماحول پر کیا اثر ڈالا؟ ــــ نورالدین زنگی کا شوقِ جہاد اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مجاہدانہ کارنامے ــــ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ کا اعلاء کلمۃ الحق ــــ فتنۂ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش ــــ سب سے آخر میں مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور مثنوی معنوی کا اصلاحی مقام و پیغام!

نگارش و انشاء کا یہ دلنشین انداز ہے:۔

> "جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور جن گتھیوں کے سُلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں۔ مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا اُن میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی۔ اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں۔ مولانا (رومی) کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی

سے دل میں بٹھلانے اور ذہن میں اُتار دینے کی کوشش کرتے ہیں اور مخاطب کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے
کہ یہ بات پہلے سے اُس کے دل میں تھی"۔

کتاب میں جہاں فلسفیانہ مباحث آئے ہیں۔ وہاں سے لائق مصنف سرسری طور پر نہیں گزرے بلکہ ایک ناقد کا پارٹ ادا کیا ہے اور شاعرہ کی پُر زور حمایت کے ساتھ ساتھ اُن کی کمزوریوں کی طرف بھی اشارہ کردیا ہے۔ پوری کتاب دینی جذبہ سے معمور ہے۔

ابھی تو پہلی جلد منظر عام پر آئی ہے۔ یہ داستان جو سراپا حقیقت ہے کئی جلدوں میں پھیل کر رہے گی، ہم موجودہ دور کے صاحبان دعوت و عزیمت کے کارناموں پر بھی مولانا علی میاں کے خامہ حقیقت رقم کی جنبش کے بے تاب دیکھنے کے منتظر ہیں کہ ان اہل حق نے مرضات رضائے الٰہی کے لئے کال کوٹھڑیوں اور پھانسی کے تختوں کا کس پامردی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے اور ان کے قلم نے، زبان نے اور علمی افکار اور علمی تحریک نے کتنی زندگیوں پر اثر ڈالا ہے؟

مہدوی تحریک

"مہدوی تحریک" از۔ سید شمس الدین مصطفائی۔ ضخامت۔ ۷ صفحات (قیمت درج نہیں)
ملنے کا پتہ:۔ عبدالوحید خاں سلطان خاں ناشران و تاجران کتب شہداد پور (سندھ)

اس کتاب کے آغاز میں دکھایا گیا ہے کہ نویں صدی ہجری میں اسلام کی ہندوستان میں کیا حالت تھی؟ اسی پُر آشوب دور میں میراں سید محمد مہدی جونپوری منظر عام پر آتے ہیں اور حالات کو بدلنے کے لئے بڑی عزیمت کا ثبوت دیتے ہیں۔ مہدوی تحریک اپنے داعی کی وفات کے بعد اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے اور میراں سید محمد جونپوری کے خلفاء بڑے خلوص اور جوش کے ساتھ اس کام کو جاری رکھتے ہیں۔ عبداللہ خاں نیازی۔ شیخ علائی (بنگالی)، میاں آدم شاہ کلہوڑہ (سندھی)، شیخ مبارک ناگوری۔ ابو سعید بلیدی۔ اور میاں مصطفےٰ گجراتی مہدوی تحریک کے نقباء ہیں۔ ان سب کے مختصر تذکرے اس کتابچہ میں درج ہیں۔

اس کتاب میں بعض باتیں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً:۔

"اس جہاد کے بعد میراں سید محمد پر مسلسل بارہ سال حالت جذب طاری رہی مگر اس حالت جذب و بیہوشی میں آپ سے شریعت ظاہری کی ادائی میں کبھی کوتاہی نہیں ہوئی۔" (صفحہ ۱۷، ۱۸)

"جذب و بیہوشی" کے واردات اور کیفیات کی دین میں کوئی حیثیت نہیں۔ اس معاملہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیاں اہل ایمان کے لئے دلیل راہ ہیں کہ دینی معارف کے سمندر پی کر بھی ان پر "جذب و سکر" کی کیفیت طاری نہیں ہوئی۔ کیا عجب ہے سید محمد جونپوری کا "دعویٰ مہدویت" اسی بارہ سال کے "جذب و بیہوشی" کے اثرات و باقیات کا "اعلانِ والہانہ" ہو! ورنہ ایک عالم، مجاہد اور صاحب عزیمت بہ صحت ہوش و حواس اور بہ عالم اعتدال مزاج ایسا دعویٰ کس طرح کرسکتا ہے کہ جو کوئی میری مہدویت کو تسلیم نہ کرے گا وہ گمراہ اور بے دین ہوجائے گا!

"مہدویہ جماعت کا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن پاک کے احکام دو قسم کے ہیں۔ پہلی قسم میں وہ احکام ہیں جن کا تعلق شریعت ظاہرہ سے ہے۔ جن کی نہایت واضح اور مکمل توضیح خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ نے فرمادی ہے اور دوسری قسم احکام طریقت کی وضاحت سید محمد نے بہ حیثیت خاتم الاولیاء فرمائی ہے۔" (صفحہ ۵۳)

اگر مہدویوں کا واقعی یہ عقیدہ ہے تو نہایت جاہلانہ اور لغو عقیدہ ہے! "خاتم الانبیاء" کے توڑ پر "خاتم الاولیاء" کے منصب کی اختراع، پھر اتنی جرأت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف شریعت کے ظاہری احکام بتلائے تھے۔ احکام باطن

[و] طریقت)، کی وضاحت تو نو سو سال کے بعد سید محمد جونپوری نے فرمائی (نعوذ باللہ من ہذہ الھفوات) یہ تو "باطنیت" کے عقاید سے [م]لتا جلتا عقیدہ ہے!

[م]ہدوی فرقہ اور مہدوی تحریک کی اساس جب تک یہ عقیدہ رہے گا کہ سید محمد جونپوری کی مہدویت جزوِ ایمان ہے اور جو کوئی انھیں [م]ہدی" نہیں مانتا وہ کافر ہے ۔۔۔ مہدوی تحریک عام مسلمانوں کو متاثر نہیں کر سکتی!

[س]راپائے رسولؐ

"سراپائے رسولؐ" از۔ اعجاز الحق قدوسی ۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات (رنگین گرد پوش)
قیمت ایک روپیہ دس آنہ ملنے کا پتہ: مکتبہ فلاحِ انسانیت۔ آرام باغ روڈ ۔ کراچی ملے

اس کتاب کی مقبولیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کے سات ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ [م]ودودی نے "سراپائے رسولؐ" کا پیش لفظ لکھا ہے۔

اس کتاب میں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حلیہ مبارک، لباس، معمولات و عادات، کھانے پینے کے عادات [ا]خلاق، معاشرت، اوقات اور عبادات کو آسان زبان اور دل نشین انداز میں پیش کیا ہے! فاضل مؤلف نے احادیث و سیر کی [م]ستند کتابوں سے واقعات اخذ کئے ہیں اور جگہ جگہ حوالے بھی دے دیئے ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر مفید اور جامع ہے۔ اور مسلمان گھرانوں میں زیادہ سے زیادہ اشاعت کی مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ [م]ولف اور ناشر کو جزائے دارین عطا فرمائے کہ اتنی مفید کتاب اُن کی کوششوں سے منظر عام پر آئی ہے!

[ت]ذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ

"تذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ" (حصہ اول) مولفہ۔ علامہ ابن حسن جارچوی (ایم اے) ضخامت ۴۷۰ صفحات (مجلد رنگین گرد پوش کے ساتھ) قیمت مجلد دو روپے آٹھ آنے ۔ غیر مجلد دو روپیہ۔ "تذکرہ محمدؐ و آلِ محمدؐ" [ح]صہ دوم) ضخامت ۴۴۳ صفحات ۔ مجلد تین روپے۔ غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے ۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ انیس، لالوکھیت ۔ کراچی۔

یہ دونوں کتابیں علامہ سید ابن حسن رضوی جارچوی کی تالیف ہیں جو ایم اے ہیں۔ بی ٹی ہیں۔ ایم او ایل ہیں۔ ہندوستان میں [ش]یعہ ڈگری کالج کے پرنسپل تھے۔ اور اب کراچی میں کئی سال سے مقیم ہیں، اور شیعی مسلک کے مبلغ، خطیب اور اہلِ قلم ہیں۔

اس تذکرے کے دونوں حصے نگارش و انشاء کے اعتبار سے سلیس اور شگفتہ ہیں۔ اظہار و بیان میں پیچیدگی نہیں ہے [ک]ہیں کہیں خطابت کا رنگ بھی آگیا ہے جو اثر انگیز ہے۔ فاضل مولف نے حیوٰۃ الحیوان سے لے کر کامل ابن اثیر اور طبری تک [کے] حوالے جا بجا دیئے ہیں۔ زبان بھی رواں اور شستہ ہے۔

اِن دونوں جلدوں پر اگر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا جائے تو اس کے لئے کافی وقت اور فرصت درکار ہے۔ اور یہ تبصرہ [ف]اران کے نہ جانے کتنے بہت سے صفحات کو گھیرے گا۔ اس لئے ہم انتہائی اختصار اور اجمال سے کام لیں گے اور اشارے [ک]رتے ہوئے گزر جائیں گے۔ ان مباحث کو ہم چھیڑنا نہیں چاہتے تھے ۔ لیکن جب یہ باتیں کتابوں کے ذریعہ منظر عام پر لائی جا رہی ہیں [او]ر خود ہمارے پاس تبصرے کے لئے بھیجی گئی ہیں تو اب اُن سے اعراض صرفِ نظر اور سکوت کسی طرح مناسب نہیں!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن جنگوں (غزوات) میں بہ نفس نفیس شریک ہوئے ہیں۔ اُن کا ذکر کتاب کے پہلے حصہ میں

---

[۱]ے (جلد اول۔ صفحہ ۲۷) مسلمانوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور بغلیں بجاتے ہوئے مدینہ واپس آئے"۔ "بغلیں بجانے" میں ذم کا پہلو پایا [جا]تا ہے۔ یہاں اس کا استعمال کسی طرح مناسب تھا۔ (صفحہ ۸۰) "ہر شخص موجودگی دکھاتا" یہ جملہ "ترجمہ" سا معلوم ہوتا ہے۔ (م۔ ق)

موجود ہے - ان غزوات میں متعدد صحابہ نے بڑی جاں نثاری، جرأت و بے باکی اور خلوص و وفاداری کا ثبوت دیا ہے۔ مگر اس کتاب میں حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہ اور ایک دو صحابیوں کے علاوہ دوسرے جاں نثار صحابہ کے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں -

"اس جنگ (احد) میں پیغمبر خدا نے خود بھی متعدد تیر چلائے - یہاں تک کہ ترکش خالی ہوگیا اور کمان کا چلّہ ٹوٹ گیا -" — (صفحہ ۵۸)

اس جنگ میں حضرت ابو دجانہؓ اور حضرت طلحہؓ نے جس جاں نثاری اور وفاداری کا ثبوت دیا ہی اس کا زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ذکر ضروری تھا - اور تیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں حضرت ابو طلحہؓ نے برسائے تھے جو مشہور قدر انداز تھے اور دو تین کمانیں اُنہی کے ہاتھوں میں ٹوٹی تھیں - اور حضرت سعد وقاصؓ کے سامنے تو خود حضورؐ نے اپنا ترکش ڈال کر کہا تھا - "تم پر میرے ماں باپ قربان تیر چلائے جاؤ -"

بدر کے معرکہ میں حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمن بن عوف اور حضرت معاذ (رضی اللہ عنہم) کا ذکر نہ کرنا تاریخی واقعات کا دانستہ اخفاء نہیں تو اور کیا ہے! صحیح واقعہ نگاری اور غیر جانب داری ایک مؤرخ کی سب سے بڑی خصوصیت ہی - اسی جنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ماموں کے خون سے اپنی تلوار کو رنگ کر دنیا کو دکھا دیا کہ حق و باطل کا جب معرکہ گرم ہو تو ایک مسلمان کی نگاہ میں خون کے رشتوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی -

فدک کے سلسلہ میں "شرح مواقف" کے حوالے سے لکھا ہے:-

"حضرتؐ نے بذریعہ ایک دستاویز یہ جائداد فاطمہؓ کے نام ہبہ کردی۔" (صفحہ ۸۵)

حضورؐ کی وفات کے بعد جب حضرت سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس باغ فدک کا مطالبہ لے کر تشریف لے گئی ہیں - تو یہ دستاویز اور ہبہ نامہ کیوں ساتھ نہیں لے گئیں - کہ حضرت سیدہؓ کے دعوے پر اس سے بڑی اور کوئی حجت نہیں ہوسکتی تھی - روایتاً اور درایتاً باغ فدک کے سلسلہ میں ہبہ اور دستاویز کی روایت موضوع معلوم ہوتی ہے!

(حصہ اول - صفحہ ۱۳۱) "فطری طور پر آنحضرتؐ کو اس اکلوتے لڑکے کے مرنے پر بے حد ملال ہوا - آنکھوں میں آنسو آگئے اور گریہ گلوگیر ہوا - بعض لوگوں نے کہا رونا خلافِ صبر ہے - آپؐ نے فرمایا "جزع و فزع کرنا بُرا ہے" - یعنی انسان غم و افسوس کے موقع پر منہ نہ پیٹے، کپڑے نہ پھاڑے - چیخنے چلّانے سے باز رہے - آنسو بہانا اور اظہار افسوس کرنا منع نہیں ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جزع و فزع کرنا بُرا ہے" اور اس کے آگے (یعنی کہہ کر) فاضل مؤلف نے خود شرح بھی فرمادی ہی - مگر ایام عزا (محرم) میں جس طرح سڑکوں پر جزع و فزع اور ماتم کیا جاتا ہے اور چیخا چلّایا جاتا ہے - یہاں تک کہ دھار دار چھریوں سے ماتم کی رسم ادا ہوتی ہے اور جسموں سے لہو ٹپکتا ہوتا ہے - کیا اس کے لئے دین میں کوئی سند ملتی ہے؟ اور کیا کسی نبی کا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یا کسی امام کا یہ اسوہ رہا ہے اور کیا عزاداری کی یہ رسمیں حضورؐ کے اس ارشاد کی کہ "جزع و فزع کرنا بُرا ہے" نفی نہیں کرتیں؟ جن لوگوں نے عزاداری کی ان رسموں کو شیعیت کا جزو لاینفک بنا دیا ہے کہ شیعیت بس اُنہی کے دم سے زندہ ہے - انہوں نے خود شیعیت کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا -

اس کتاب میں یہ بھی ملتا ہے کہ:-

"آس پاس کے ملکوں پر خواہ مخواہ چڑھائی کرنے کی حکمت عملی دینی تو اس لئے نہ تھی کہ "لا اکراہ فی الدین" قرآن میں آیا ہے۔ ہاں! توسیع حکومت اور جلب مال و زر کا ذریعہ تھی۔ تو اس سے علیؓ کوسوں دور تھے۔ اس لئے انہوں نے کسی جنگ میں شرکت نہیں کی۔ اور لوٹ مار اور مار دھاڑ کی کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔" (صفحہ ۴۳۔ جلد دوم)

خلافت راشدہ کے دور کی ان دینی جنگوں اور حق و باطل کے معرکوں کو "لوٹ مار اور مار دھاڑ" کہنا کتنی افسوسناک جسارت اور فرقہ وارانہ عصبیت کی بری مثال ہے۔ اگر یہ جنگیں "لوٹ مار" تھیں تو حضرت عمر فاروقؓ کے دور خلافت میں یزدجرد کی بیٹی حضرت شہر بانو جو جنگی قیدی بن کر آئی تھیں۔ اُن کا حضرت امام حسین علیہ السلام سے نکاح اپنی جگہ کس قدر محلِ نظر قرار پاتا ہے جس سے اہل بیت اطہار کے شجرہ طیبہ اور نسب نامہ عالیہ کی عظمت ہی مجروح ہو جاتی ہے۔ لوگ کسی خاص نقطۂ نگاہ کے تحت حقائق کو مجروح کرتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس کی زد کہاں جا کر پڑتی ہے!

اس کتاب میں خلفائے راشدین اور بعض اکابر صحابہ پر جگہ جگہ طنز کی گئی ہے۔ جو ایک تاریخ کے عام طالب علم کے قلب و وجدان پر بھی گراں گزرتی ہے۔ کہ یہ وہ نفوس قدسیہ تھے جن کی دینی خدمات آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ کوئی آفتاب پر لاکھ خاک اڑائے مگر اُس کی روشنی تو اس گرد میں نہیں چھپ سکتی۔ فاضل مصنف مولانا جارچوی تو معتدل شیعہ عالم ہیں۔ جب اُن کا یہ حال ہے تو جو "غالی" ہیں اُن کا تو پوچھنا ہی کیا۔

شیعیت اصل میں کیا ہے؟ اس کی تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں ہے۔ جب یہ بات چل ہی پڑی ہے اور یہ مباحث "تذکرۂ محمدؐ و آل محمدؐ" پر تبصرے کے دوران میں چھڑ ہی گئے ہیں تو اجمالاً عرض ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی یہاں تک کہ کسی خلیفۂ راشد سے اسلام میں کوئی فرقہ موسوم اور منسوب نہیں ہے۔ فقہ کے فروعی اختلافات کے سوا صحابہ کرام کا (جن میں اہل بیت اطہار بھی شامل ہیں) توحید و رسالت اور معاد کے بارے میں بنیادی اختلاف عقائد نہیں پایا جاتا تھا۔ جمل اور صفین کی لڑائیوں میں اور خوارج کے ساتھ معرکوں میں جو مسلمان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حمایت میں نبرد آزما ہوئے تھے وہ "شیعانِ علی" کہلاتے تھے۔ "شیعیت" حضرت علیؓ کی رفاقت و حمایت کا نام تھی۔ یہ اسلام میں کوئی مستقل فرقہ نہ تھی۔ جو لوگ یہ خیال رکھتے ہیں کہ "شیعیت" کی اسلام میں ایک مستقل فرقہ کی حیثیت سے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ نے بنا ڈالی تھی وہ حضرت علیؓ پر (معاذ اللہ) افتراق فی الدین کا الزام لگاتے ہیں۔ فاتح خیبر کا دامن اس الزام سے پاک ہے۔ اور نہ نفس "شیعیت" صحابہ کرام کی اکثریت اور خلفائے ثلاثہ پر سب و شتم کا نام ہے۔ یہ "شیعیت" نہیں "رفض" ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حق و باطل کے پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ذکرِ غالب

"ذکرِ غالب" از:۔ مالک رام (ایم اے) ضخامت ۲۸۴ صفحات، قیمت تین روپے۔
ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

"ذکرِ غالب" کا یہ تیسرا ایڈیشن اضافہ و ترمیم کے بعد مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے کتابت طباعت، جلد، گرد پوش۔ غرض ہر چیز خوب سے خوب تر ہے۔ غالب کی ایک تصویر بھی اس میں شامل ہے۔ تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ مرزا غالب گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہیں اور ہاتھ میں پیچوان ہے۔

غالب کے حالات پر جو کتابیں اردو میں اب تک آئی ہیں۔ جناب مالک رام کی یہ کتاب (ذکرِ غالب) اُن میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ واقعات کو کس سلیقہ کے ساتھ پھیلایا ہے۔ انداز بیان کس قدر رواں اور دل نشین ہے۔ بعض معاملات میں

غالب کے تذکرہ نویسوں سے اختلاف کیا ہے تو اس میں بڑا وزن پایا جاتا ہے۔

"زبان اُن علوم میں سے ہے جو سماعت پر مبنی ہیں۔ یہاں [1] قیاس سے کام نہیں چلتا۔ میں نے جو پہلوں سے سنا وہ آج لکھ اور بول رہا ہوں۔ جو لوگ مجھ سے پہلے تھے انہوں نے اپنے بڑوں کی پیروی کی۔ اور جو میرے بعد آئیں گے وہ اپنے بڑوں کی تقلید کریں گے۔ یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص جمہور کی رائے کے خلاف نئے محاورے اور نئے الفاظ گڑھنا اور لکھنا شروع کر دے جب تک ان کو قبولِ عام اور تائیدِ جمہور کی سند نہ مل جائے۔ وہ ٹکسالی باہر ہیں اور زبان کا جزو نہیں سمجھے جا سکتے۔ انھیں یہ مقبولیت اور تائید جبھی ملے گی اگر وہ سماعی اصول پر پورے اُتریں گے اور انھیں زبان میں داخل کرنے کا حق بھی صرف اُس ملک کے باشندوں کو حاصل ہے۔ جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے۔"

فاضل مصنّف کی یہ رائے کتنی صائب اور وقیع ہے۔

"وہ (یعنی غالب) گھر گھسنے قسم کے انسان تھے اور انھیں سیر و تماشے سے زیادہ لگاؤ نہ تھا۔" (صفحہ ۵۵)

"گھر گھسنے" اگرچہ روزمرہ ہے۔ مگر یہاں اس کا استعمال کھٹکتا ہے۔

"اس گرجے کی پُشت پر ایک بازار ہوا کرتا تھا۔" (صفحہ ۵۹)

اگر وہاں کوئی پینٹھ یا بازار لگتا تھا تو "بازار لگتا تھا" لکھنا چاہیئے تھا۔ ورنہ "بازار تھا" کا محل ہے۔ "ہوا کرتا تھا" روزمرہ نہیں ہے۔

"وہ ظفر اور ناظم تک سے تو ٹلتے نہ تھے۔" (صفحہ ۲۲۵)

یہاں "چوکتے نہ تھے" کا محل تھا۔ "ٹلتے نہ تھے" ہر اعتبار سے نادرست ہے۔

"حالانکہ نہ اکیلے غالب نے قصیدہ نگاری کا گناہ کیا اور نہ ہی یہ بے غیرتی کی دلیل ہے۔" (صفحہ ۲۵۱)

"نہ ہی" چند دن سے بعض لوگ لکھنے اور بولنے لگے ہیں۔ مگر وجدان کے لئے یہ اندازِ بیان کس قدر ناگوار ہے۔

"......اور اُن کے صاحبزادے ناظر حسین میرزا اُن کے بچپن کے ہم جولی تھے۔" (صفحہ ۲۶۳)

مردوں کے لئے "ساتھی" بولتے ہیں۔ "ہم جولی" اور "سہیلی" عورتوں کے لئے بولا جاتا ہے۔

غالب کے ایک خط کا اقتباس ہے:۔

"...... نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سُوت کی رسّی کے لٹکالوں......" (صفحہ ۲۳۵)

یُو پی میں عام طور پر شطرنجی کو دری کہتے ہیں، مگر حیدر آباد دکن میں دری کے نام سے بھی لوگ نا آشنا نہیں ہیں۔ وہاں شطرنجی بولتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے غالب کے زمانے میں "شطرنجی" روزمرہ تھا۔

"ذکرِ غالب" اُردو ادب میں یقیناً قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اور مالک رام صاحب اُردو دُنیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔

---

[1] اس جگہ قیاس سے پہلے حرف "صرف" ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ کہ زبان کے معاملہ میں اگرچہ سماع کو بہت کچھ دخل ہے مگر "قیاس" بھی ایک درجہ ہے۔ (م۔ق)
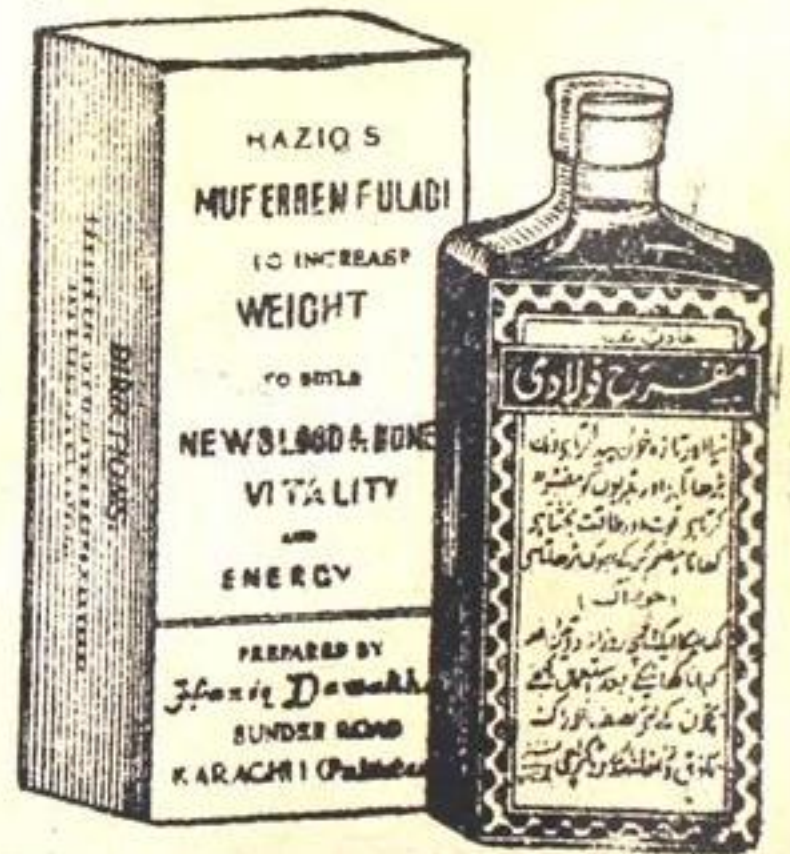
حدیث نمبر کیا ہے؟

پندرہ روزہ صحیفہ اہل حدیث کراچی کا خاص نمبر ہے۔ اہل قرآن۔ منکرین حدیث۔ چکڑالوی اور پرویزی حضرات احادیث نبویہ پر جتنے اعتراضات پیش کرتے ہیں، حدیث نمبر میں ان کے صاف، واضح، بیچے تلے مکمل مدلل مفصل مشرح اور اطمینان بخش جوابات درج ہیں۔ اس شاندار اور بے نظیر نمبر میں پاکستان اور ہندوستان کے مشاہیر زندہ دماغ اہل قلم علماء و شعراء حضرات نے نثر و نظم میں تعریف حدیث۔ شان حدیث۔ حفاظت حدیث۔ کتابت حدیث۔ تدوین حدیث۔ تنقید حدیث۔ اصول حدیث۔ دلائل حدیث۔ درایت حدیث۔ روایت حدیث۔ تاریخ حدیث۔ حجیت حدیث۔ سند حدیث۔ راویان حدیث۔ حفاظ حدیث۔ عظمت حدیث۔ فضیلت حدیث۔ کرامت حدیث۔ مقام حدیث۔ صداقت حدیث۔ شرافت حدیث اور کتب حدیث پر بہترین طریق و اعلیٰ انداز سے خامہ فرسائی فرمائی ہے شکر اللہ سعیہم۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ حدیث نمبر دشمنان حدیث نبوی کے بے بنیاد لایعنی اور بے سروپا اعتراضات کے قلعہ کو مسمار اور پاش پاش کرنے کے لئے لاجواب ایٹم بم ثابت ہوا ہے۔ عاشقان رسول و محبان حدیث رسول کے اعتقاد و ایمان کی صیانت و حفاظت کے لئے مستحکم ڈھال ہے۔ لہذا لازم ہے کہ فدایان حدیث نبوی کا بچہ بچہ اس کو خرید کر حرز جان و تعویذ ایمان بنائے۔ خود اس کا مطالعہ کرے اور منکرین حدیث تک بھی پہنچائے۔ بڑے بڑے علمائے کرام کا کہنا ہے کہ اس دور الحاد اور پرفتن زمانہ میں اس حدیث نمبر کی اشاعت کرنا جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ جن علماء و شعراء کے بہترین نتائج قلم اس گرانقدر نمبر کی زینت بن چکے ہیں ان میں سے چند حضرات کے اسمائے گرامی ذیل میں ملاحظہ ہوں:

مولانا عبد الستار صاحب دہلوی
مولانا عبد الجلیل صاحب دہلوی
مولانا عبد اللہ صاحب روپڑی
مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
مولانا عبد الجلیل صاحب سامرودی
مولانا محمد صادق صاحب سیالکوٹی
مولانا عبد الحق صاحب بہاولپوری
مولانا عبد اللہ صاحب عقیل مئوی
مولانا محمد اسماعیل صاحب [illegible]
مولانا عبد القادر صاحب روپڑی
مولانا محمد یوسف صاحب کلکتوی
مولانا عبد الجبار صاحب کھنڈیلوی
مولانا محمد [illegible] صاحب [illegible]
مولانا عبد القادر صاحب [illegible]
مولانا عبد المجید صاحب سوہدروی

مولانا شاہ بدیع الدین صاحب سندھی
مولانا عبد الغفار صاحب دہلوی الخیری
مولانا عبد السلام صاحب جھنگوی
مولانا عبد اللہ صاحب لائل پوری
مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری
مولانا شرف الدین صاحب دہلوی
مولانا نور الحسن صاحب مجاہد گھرجاکھی
مولانا ابو البیان عبد الرحمن حماد عمر آبادی
مولانا عبید اللہ صاحب مبارکپوری
مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی
مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی
مولانا سید سلیمان صاحب ندوی
مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی
مولانا نور الدین صاحب امیری
مولانا محمد [illegible] صاحب ارشد

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی
مولانا اسلم صاحب جیراجپوری وغیرہ

شعراء صاحبان

ابو البیان صاحب حماد
صابر صاحب کاشمیری
روش صاحب امروہوی
نظمی صاحب آروی
ماہر القادری صاحب
کوثر صاحب دہلوی
عبد المجید صاحب بی۔ اے سالک
مجید صاحب لاہوری
رئیس صاحب امروہوی
کوثر صاحب میرٹھی
عاصی صاحب کرنالوی
ماہر صاحب اکبر آبادی

صحیفہ اہلحدیث کا یہ خاص نمبر خوشنما سہ رنگا ٹائیٹل، دلکش نظمیں، عمدہ مضامین، بہترین لکھائی، عمدہ چھپائی اور ۲۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے ہدیہ مع محصول ڈاک صرف تین روپے ہے۔ شمع رسالت کے پروانے آج ہی تین روپے کا منی آرڈر پاکستانی پتہ پر بھیجکر یہ بیش بہا تحفہ جلد از جلد حاصل کریں۔ بعد میں کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہو سکے گا۔ نوٹ کر لیجئے۔ یہ حدیث نمبر وی پی پارسل روانہ نہ ہوگا۔ بلکہ تین روپے پیشگی آنے پر بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے گا۔ ہندوستانی حضرات: مولانا عبد الواحد صاحب مدرسۃ الکتاب والسنۃ منڈی پان صدر بازار دہلی کے پتہ پر تین روپے آٹھ آنے کا منی آرڈر کر کے رسید ہمیں بھیج دیں۔ ہم حدیث نمبر بھیج دیں گے۔ انشاء اللہ۔

پاکستان کا پتہ

مکتبہ شعیب بنس روڈ کراچی

رحمن پرنٹنگ پریس کراچی

فاران

کراچی

پاکستان

ماہر القادری

جلد ۷ نمبر ۱۲

ماہنامہ

فاران

مارچ ۱۹۵۶ء — ایڈیٹر — ماہر القادری

چندہ سالانہ ... ... چھ روپے

فی پرچہ ... ... آٹھ آنے

مقام اشاعت

دفتر فاران، کیمبل اسٹریٹ، کراچی ۱

نظم و ترتیب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ اوّل

بعض الفاظ اپنے معنی کے اعتبار سے حق ہوتے ہیں لیکن کہنے والے کی نیت میں فساد اور کھوٹ ہوتی ہے، اس لئے "حق" بول کر "باطل" مراد لی جاتی ہے۔ اور اس طرح حق و باطل کچھ اس انداز سے خلط ملط ہو کر رہ جاتے ہیں کہ اُن میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

"حق" کو "باطل" کے لئے استعمال کرنا۔ یہ اتنا بڑا فتنہ ہے کہ اس کی خطرناکی اور مضرت کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فتنہ شخصی بھی ہے اور اجتماعی بھی! اس سے افراد بھی تباہ ہوتے ہیں اور قومیں بھی ہلاک ہوتی ہیں۔ اور فرد و قوم کی ہلاکت و تباہی کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ وہ کسی زلزلے یا ابر و باد کے طوفان کا شکار ہو کر رہ جائیں۔ بلکہ فرد و قوم کا بے عمل، بد عقیدہ اور بے کردار ہو جانا اپنی جگہ بہت بڑی ہلاکت و تباہی ہے۔ جو نظریات اور معتقدات انسانوں کے کسی گروہ کو "قوم" اور "ملت" بناتے ہیں۔ جب وہ قوم اُن نظریوں کی دشمن ہو جائے تو پھر وہ قوم چلتے پھرتے انسانی اجسام کی کثرت کے باوجود حقیقت میں مر جاتی ہے اور ایسی مُردہ اور بے حس قوم کو دُنیا میں ذلت کی ٹھوکروں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا!

"الدین یُسر" دین آسان ہے، یقیناً اللہ کا دین آسان ہے۔ اس میں ضرورت سے زیادہ سختیاں اور ناقابلِ برداشت پابندیاں نہیں ہیں۔ اس کے تمام تقاضے انسانی فطرت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مثلاً "نماز" دین کا بہت بڑا رکن ہے۔ جس کا دیدہ و دانستہ ترک کرنے والا انکار (کفر) کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔ مگر اس فریضے کے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے یہ یہ آسانیاں رکھی ہیں کہ پانی نہ ملے تو مٹی سے تیمم کیا جا سکتا ہے۔ آدمی بیمار ہو تو بیٹھ کر، لیٹ کر بلکہ صرف اشارے سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح رمضان کے روزے سفر میں چھوڑے جا سکتے ہیں اور بعد میں اُن کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ ماہ صیام کے آخری عشرہ میں اعتکاف ہر مسلمان پر فرض ہے مگر ایسا فرض (کفایہ) ہے کہ ایک چھوٹی بستی یا ایک شہر کے محلہ میں صرف ایک

شخص کے اعتکاف سے یہ فرض اُس بستی اور محلہ کے دوسرے مسلمانوں سے ساقط ہو جاتا ہے ۔ یہ ہے " الدین یُسر " کا صحیح مفہوم
ور دینی اعمال و احکام میں اُس کی وہ جلوہ گری جو اللہ کی مرضی کے عین مطابق ہے اور جس آسانی سے فائدہ اُٹھانا چاہیئے !

یہودی و نصاریٰ کے قسیسین ، فریسیوں اور فقیہوں نے اپنی قیاس و رائے سے مسائل تراش تراش کر اہلِ مذہب کے لئے
قدم قدم پر مشکلات اور دشواریاں پیدا کر دی تھیں ۔ نبی آخر (ہماری جانیں حضورؐ پر قربان ہوں) جس شریعت کو لے کر مبعوث
ہوئے اُس شریعت نے خود تراشیدہ پابندیوں کے ان طوق و سلاسل کو کاٹ کر رکھ دیا اور اللہ کے دین کو آسان بنا دیا ! اسی لئے
تو اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے کہ یہ دین انسانی فطرت کے عین مطابق ہے ! یہ ہے " الدین یُسر " کی واقعی تفسیر
اور اس کی صحیح مُراد !

کوئی شخص کوٹ پتلون پہن کر یہ کہے کہ میرے لئے تو اس لباس میں رکوع و سجدہ اور قعدہ بہت دُشوار ہے اس لئے میں تو
کرسی پر بیٹھے ہی بیٹھے اشاروں سے نماز ادا کر لیتا ہوں ۔ یا کوئی گرمی میں پیاس کی تکلیف سے بچنے کے لئے رمضان کا فرض
روزہ چھوڑ دے ۔ یا کوئی صاحبِ استطاعت مسلمان سفرِ حج کی صعوبتوں سے گھبرا کر حج کو نہ جائے اور حج میں صرف ہونے والی
رقم خیرات کر دے ۔ اور یہ سب کچھ " الدین یُسر " کے نام پر کیا جائے ۔ تو ایک مسلمان کا یہ طرزِ عمل " الدین یُسر " کی معنویت
کے ساتھ نہایت ہی مکروہ مذاق ہے !

اللہ کا دین بیشک آسان ہے ۔ مگر اس کی سہولت ، نرمی ، لچک اور آسانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس " آسانی " کی آڑ میں
خود دین کے احکام کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا جائے اور دین ہی کے نام پر دین کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے ! یہ نفس کا فریب
اور شیطان کا بہت بڑا چکمہ ہے ۔ یہ وہ باطل دوست اور دُشمنِ حق ذہنیت ہے جو براہِ راست ایمان پر ضرب لگاتی ہے اور
ان ضربات سے آخر کار ایمان کا شیرازہ بکھر جاتا ہے

اسی طرح " قرآن میں غور و تدبّر کی دعوت " بھی اپنی جگہ درست بلکہ قرآن کا عین منشاء ہے لیکن کوئی شخص قرآن پر غور و تدبّر کرنے
کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ضروری نہیں ہے ۔ یا جنت و دوزخ کا ذکر صرف ترغیب
و ترہیب کے لئے کیا گیا ہے ۔ ان کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے ۔ یا " خمر " عربوں کے لئے حرام تھی ، سرد ملک کے باشندے اس کو
استعمال کر سکتے ہیں ۔ " میسر " (جوا) صرف وہی حرام ہے جو اہلِ عرب کھیلتے تھے ۔ یہ جو آج کل کلب گھروں میں تاش کے
کھیل بد کر کھیلے جاتے ہیں یا گھوڑ دوڑ میں شرط لگائی جاتی ہے ۔ یہ " میسر " کی تعریف میں نہیں آتا ۔ تو قرآن میں ایسا " غور و
تدبّر " درحقیقت قرآن کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی ہے ۔

قرآنِ پاک میں " غور و تدبّر " کی دعوت اس لئے نہیں دی گئی کہ خدا نخواستہ اس کتاب میں کچھ ظنی اور قیاسی باتیں اور
شخصی تجربے پائے جاتے ہیں ۔ اور ہر قرآن کے پڑھنے اور غور کرنے والے کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ غور و فکر کے بعد جو چاہے
رائے قائم کر لے ۔ قرآن میں " غور و تدبّر " کی دعوت اس لئے دی گئی ہے کہ غور و فکر کے بعد پڑھنے والے کے یقین و ایمان اور پختہ
ہو جائیں اور وہ قول کو عمل سے بدل کر " آمنوا " کے بعد " اعملوا " کی مجسّم تفسیر بن جائے !

قرآن میں " غور و فکر " کی دعوت نافرمان بننے کے لئے نہیں فرمانبردار بننے کے لئے ہے ۔ قرآنی احکام سے بغاوت کے لئے
نہیں بلکہ کامل اتباع کے لئے ہے ! قرآن میں " غور و تدبّر " کا لازمی نتیجہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت اور ایمان و یقین کی استواری ہونا
چاہیئے ۔ اگر قرآن کریم میں غور و فکر کے بعد یہ اثرات اور نتائج ظاہر نہیں ہوتے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم میں غور و فکر

کرنے والے کی نہ تو فطرت سلیم ہے، نہ اس کی فکر و فہم مستقیم و صحیح ہے اور نہ اس کی نیت فساد سے پاک ہے!

قرآنِ پاک کا تو کام ہی ہدایت دینا ہے۔ مگر کس کو؟ اُسے جو یا تو صاحبِ تقویٰ ہو یا اُس کے اندر "تقویٰ" کی تڑپ پائی جاتی ہو! قرآنی تعلیمات کا بیج اُسی دل میں جم سکتا ہے جس میں تقویٰ کی صلاحیت موجود ہو!

اہلِ نفاق کا ہر دور میں یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ کلمۂ حق کو باطل پر دلیل لانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ مصر کے جمال ناصر ہی کو لے لیجئے۔ اُس نے نہایت غیر جمہوری دستور اور غیر اسلامی آئین "اسلام" کے نام سے پیش کیا ہے۔ یہ وہ ظالم اور سنگدل شخص ہے جس نے چالیس ہزار حق پرستوں کو کلمۂ حق بلند کرنے کے جرم میں جیلوں میں ڈال رکھا ہے۔ اور ان بے گناہ اسیروں کے ساتھ وہ وہ ظلم و تعدی کی جا رہی ہے کہ اُسے دیکھ کر درندے بھی شرما جاتے ہیں۔ اخوان المسلمون کے رہنماؤں کے خون سے یہی جمال ناصر اپنے ظالم ہاتھوں کو رنگ چکا ہے۔ اگر نبوت ختم نہ ہو جاتی اور وحی کا سلسلہ بند نہ ہو جاتا تو یہ شقی اس کا مستحق تھا کہ "تبت یدا (جمال ناصر) وتب" جیسی وعید اس دشمنِ اسلام کے لئے آتی اور اللہ کی وحی دو ٹوک فیصلہ کر دیتی!

آج دُنیا میں اسی قسم کے منافق جگہ جگہ اُبھر آئے ہیں، جو اسلام ہی کا نام لے کر اسلام کے شجرِ طیبہ پر تیشہ چلانے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے اور لوگ اُن کے تیشوں پر "اسلام" لکھا ہوا دیکھ کر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ یہ تیشہ "اصلاح" کا فرض انجام دے رہا ہے۔

ایک گروہ اُن منافقین کا ہے جو "الدین یُسر" کے نام پر دین میں ایسی ایسی رُخصتیں اور چھوٹ دینا چاہتے ہیں جن سے دین کا سارا نظام ہی اُلٹ کر رہ جائے گا۔ یہ لوگ دین کے پیچھے چلنے کے بجائے دین کو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلانا چاہتے ہیں اور اس کے لئے اُنہوں نے یہ تدبیر سوچی ہے کہ علم و استدلال کے زور سے "ناگزیر صورتِ حال" اور "اضطرار" کو ایک مستقل ضابطہ اور عمومی کلیہ کی شکل دے دی جائے!

دُوسری ٹولی اُن اہلِ نفاق کی ہے جو "قرآن" کے نام پر قرآن کو افسانہ اور ناول کے انداز میں پیش کر رہے ہیں۔ جس خیال اور تصور کو چاہتے ہیں اُس کا پیوند قرآن کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی آیات کی یہ لوگ نعوذ باللہ حافظ و غالب کے شعروں کی طرح شرح کرتے ہیں۔ اس شوخیٔ فکر اور ندرتِ خیال کا نام انہوں نے "معارفِ قرآن" رکھ چھوڑا ہے۔ یہ لوگ آزادیٔ خیال اور تنویرِ فکر کے بہت بڑے داعی بن کر منظرِ عام پر نمودار ہوتے ہیں۔ مُلاؤں کا طرح طرح سے مذاق اُڑاتے ہیں اور اُن پر اقتدار پرستی اور تنگ نظری کی پھبتیاں چُست کرتے ہیں۔ مگر خود اپنے کردار کا یہ عالم ہے کہ جابر، خود غرض اور نفس پرست اربابِ اقتدار کی نہ صرف یہ کہ مدح سرائی کا فرض انجام دیتے ہیں بلکہ اُن کے لئے قرآن سے دلیلیں فراہم کرتے ہیں۔ کہ فلاں شخص "مرکزِ ملت" ہے اس لئے پوری ملت کو اُس کی بے چون و چرا اطاعت کرنی چاہیئے۔ اور پھر اس — "اولوالامر کو یہ" معارفِ قرآن" کے جاننے والے وہ وہ اختیارات سونپ دینا چاہتے ہیں جو دورِ ملوکیت کے "مالکانِ رقابِ اُمم" کو بھی حاصل نہ تھے!

اب سے دو سال پہلے کے "طلوعِ اسلام" کے فائل اُٹھا کر کوئی دیکھے تو ایک نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ پاکستان میں "ڈکٹیٹر شپ" قائم کرنے کے لئے اس ادارے نے کس قدر جد و جہد کی ہے اور صرف ایک شخص کی خوشنودی کی خاطر اس ادارے نے ملت کے سفینہ کو کن بے رحم موجوں کے حوالے کر دینا چاہا ہے! محدثین اور فقیہوں پر بادشاہوں اور امیروں کی درباداری اور

زمانہ سازی کی طنز کرنے والے اس "ارگن" نے جس شخصیت پرستی اور ضمیر فروشی کا ثبوت دیا ہے اُس کی مثالیں تاریخ میں کم ہی ملیں گی وہ تو پاکستان کی قسمت اچھی تھی کہ پالنسہ بہت جلد پلٹ گیا اور شخصی اقتدار کی ناؤ زیادہ دیر تک نہ چل سکی مگر "مرکزِ ملت" کے اس داعی اور ہوا خواہ نے تو اپنی کرنی میں کوئی کسر اُٹھا کر نہیں رکھی!

قرآنِ کریم سے فائدہ تو وہ لوگ اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر خشیتِ الٰہی کی فراوانی نہ ہو تو کم سے کم اُس کی کوئی رمق تو موجود ہو۔ مگر وہ لوگ جن کے قلوب "تقویٰ" سے خالی ہوتے ہیں اور اس "بے تقویٰ" کردار پر قرآن فہمی کے دعوے کرتے اور بڑے بول بولتے ہیں۔ اُن کو قرآن کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ وہ اُلٹے :-

"...... فِی قُلُوبِہِم مَّرَضٌ فَزَادَہُمُ اللہُ مَرَضاً۔"

کے مصداق بن جاتے ہیں اور چونکہ وہ گمراہی کو پسند کرتے ہیں اس لئے اللہ اُن کی گمراہی کو اور بڑھا دیتا ہے!

اس قسم کے منافق مداحوں اور منقبت سراؤں کی تگ و دو اُن کے ممدوحین کے زوال ہی کے ساتھ تمام ہو جاتی ہے۔ اُدھر اُن کے خداوندانِ نعمت کے جبر و اقتدار اور سطوت و شکوہ کی بساط اُلٹی اور اِدھر اِن بیا زمند ہوا خواہوں کی شہرت، مقبولیت، اور علمی طنطنہ کی ساکھ گر گئی۔ زمانہ نے ہر جابر، ممدوح اور ہر زمانہ ساز مداح کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔ تاریخ عبرت کی بہت سی داستانیں اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ بے ضمیر لوگوں کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ڈھیل کو اپنے حق میں "فضل و انعام" سمجھتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ ڈھیل کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور سنتِ الٰہی جب "گرفت و احتساب" کا فرض انجام دیتی ہے تو پھر بڑے بڑوں کی جھوٹی خدائی کے تخت اوندھے ہو جاتے ہیں۔ اور تاریخ کے اوراق پر عبرت موعظت کے بس نشان باقی رہ جاتے ہیں!

کھلا ہوا نفاق

مسودۂ دستور منظرِ عام پر آ چکا۔ علماءِ کرام اُس کی خامیوں کی بروقت نشاندہی بھی کر چکے، دستور ساز اسمبلی اپنے کام میں بڑی مستعدی کے ساتھ لگی ہوئی ہے، متنازعہ دفعات پر بڑی سخت کشمکش ہو رہی ہے۔ اس کشمکش کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ جو اطلاعات ہمارے کانوں تک پہنچتی ہیں اُن سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفہ سے مباحث کا موقف بدلتا رہتا ہے۔ کبھی امید بندھتی ہے، کبھی ٹوٹتی ہے ۔۔۔ امید و یاس کا ملا جلا دھندلکا، کچھ اجالا اور کچھ روشنی! حالات بہت نازک ہیں۔ اسلام کے مخالف بڑی گہری چالیں چل رہے ہیں اور منافقین کی دورنگی نے ان چالوں کی کامیابی کے لئے تھوڑا بہت میدان صاف بھی کر دیا ہے! اسلام کا مخالف گروہ حالات کو بگاڑنے پر تُلا ہوا ہے۔ اسلام پسند طبقہ اس کوشش میں مصروف ہے کہ یہ شیرازہ کسی قیمت پر بکھرنے نہ پائے توڑنا آسان ہے اور جوڑنا مشکل ہے۔ اس لئے جو لوگ تعمیر اور شیرازہ بندی چاہتے ہیں۔ اُن کا کام بہت نازک اور دشوار تر ہے!

اسلامی دستور کے مخالفین ۔۔۔ وہ جو کھلے ہوئے ہیں، اور وہ بھی جو چھپے ہوئے ہیں۔ اچھی طرح کان کھول کر سُن لیں کہ "اسلام" پاکستان کے لئے مقدر ہو چکا ہے، یہاں اسلامی نظام کے علاوہ کسی دوسرے نظام کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کیا جائے گا۔ پاکستان اسلام کے لئے بنا ہے اور اسلام ہی یہاں کی غالب طاقت بن کر رہیگا منافقین، کافروں سے ساز باز کر کے یقیناً حالات کو بگاڑ سکتے ہیں۔ مگر یہ تخریبی کوششیں زیادہ دن تک چل نہیں سکتیں

دیر یا سویر پاکستان میں آنا "اسلام" ہی کو ہے۔ کفر و نفاق کے متفقہ ساز باز سے بھی اسلامی نظام کو روکا نہیں جا سکتا۔ اقلیت کو خوش رکھنے کے لئے اکثریت اپنے خدا اور رسولؐ سے منحرف کیسے ہو سکتی ہے!

پاکستان میں کفر کو جو یہ جرأت ہوئی ہے کہ اُس نے اسلامی نظریوں کے خلاف ایک محاذ قائم کر لیا ہے۔ تو اس جرأت میں پاکستان کے منافقین کا بھی بہت کچھ ہاتھ ہے۔ اہلِ نفاق نے ان لوگوں کی ہمت بڑھائی ہے اور انھیں شہ دی ہے۔ جب کہیں جا کر وہ اس قدر جری ہوئے ہیں کہ حکومتِ پاکستان کا "اسلامی" کہلانا بھی انھیں ناپسند ہے! اسلام کے خلاف جن مسلمانوں کا نفاق ظاہر ہو چکا ہے، ملّت کا فرض ہے کہ وہ ان منافقین سے چوکنّا اور ہوشیار رہے۔ اسلامی معاشرے میں یہ لوگ ذرا سی بھی عزت کے مستحق نہیں ہیں۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کی نقل و حرکت پر حکومت کی نظر رہنی چاہیئے کہ نہ جانے یہ حضرات پاکستان کے کس دشمن سے کب ساز باز کر کے کیا کر بیٹھیں!

عوامی لیگ کے بانی اور لیڈر مسٹر شہید سہروردی نے دستور ساز اسمبلی میں جو خرافات بکی ہیں۔ اس کو صرف سیاسی اختلاف کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس شخص نے تو ڈنکے کی چوٹ اسلام کے بنیادی نظریوں کا مذاق اُڑایا ہے بلکہ اُن کی توہین کی ہے۔ ہمارا یہ منصب نہیں ہے کہ کسی پر کفر و اسلام کا فتویٰ لگا سکیں۔ مگر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ جو شخص کسی ادارے کا رُکن، کسی جماعت کا ممبر یا کسی ملّت کا فرد ہو کر اُسی ملّت اور جماعت کے اساسی معتقدات کی توہین کا ارتکاب کرے تو کیا ایسے شخص کو اُس ملّت کا وفادار کہا جا سکتا ہے! آخر کسی کی وفاداری اور غدّاری کے ناپنے کا پیمانہ اور معیار کیا ہے؟ دُنیا کسی شخص کے قول و فعل کو دیکھ کر ہی کسی مذہب یا جماعت سے اُس شخص کے اخلاص و وفاداری اور عداوت و بیزاری کا اندازہ لگا[illegible]تی ہے۔ ایک شخص کی پوری زندگی اسلامی معیار کے خلاف ہو اور دوسری طرف وہ شخص اپنے قول سے بھی اسلام کی تضحیک کرتا ہو۔ تو ایسے شخص کی اسلامی معاشرے میں کیا پوزیشن متعین کی جائے؟ اس کا فیصلہ ہم اُن دانشوروں پر چھوڑتے ہیں جو دین میں زیادہ سے زیادہ روا داری کے قائل ہیں!

بعض وہ لوگ جو "صلح کُل" مشرب کا نعرے لگاتے لگاتے قومی غیرت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ اس بات پر چیں بہ جبیں بلکہ برافروختہ ہیں کہ سہروردی صاحب پر اتنی لے دے کیوں ہو رہی ہے؟ یہ حضرات گرفت و احتساب کرنے والوں کے اقوال و افکار کو تو دیکھتے ہیں مگر اس پر اُن کی نظر نہیں جاتی کہ جس بات پر احتساب کیا جا رہا ہے وہ بات اپنی جگہ کتنی دل شکن، فتنہ انگیز اور ناواجب تھی، یہ وہی مجرموں کی پشت پناہی کرنے والی ذہنیت ہے جو ایک ڈاکو اور قاتل کے پیروں میں بیڑیاں دیکھ کر اُس سے ہمدردی کرنے لگتی ہے۔ مگر اُس کے جُرم سے چشم پوشی اختیار کر لیتی ہے۔ یہ عجیب منطق اور نرالا فلسفہ ہے کہ سہروردی صاحب کو تو اسلام کے خلاف سب کچھ کہنے کا حق حاصل ہے لیکن اُن پر کسی کو تنقید و احتساب کا حق حاصل نہیں ہے!

مسٹر سہروردی نے اسمبلی میں اسلام کے خلاف جو کچھ کہا ہے۔ نہ ایسی چیز نہیں ہے کہ انہوں نے ایک بات کہہ دی اور کچھ دن بعد لوگ اُسے بھول جائیں گے اور وہ اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑ گئی۔ سہروردی صاحب کے ان "ارشادات" (؟) کو عیسائی اور ہندو مبلّغین لوگوں کے سامنے پیش کر کے کہیں گے کہ اسلام کے بارے میں مُسلمانوں کے ایک بہت بڑے لیڈر کے یہ تاثرات ہیں۔ جو اسلام خود اپنے ماننے والوں کو مطمئن نہ کر سکا وہ دُوسروں کو کیا مطمئن کرے گا (معاذ اللہ!)

حقیقت یہ ہے کہ اس شخص کے نفاق نے اسلام کی رُسوائی کا سامان مہیا کر دیا ہے اور اس شخص کی اس اسلام دُشمنی

کے باوجود کچھ ایسے عجیب و غریب مسلمان بھی پاکستان میں پائے جاتے ہیں جو سہروردی صاحب کو اپنا رہنما اور قائد سمجھتے ہیں!

اس آشوب دور میں جب کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو شدھ بنانے کی تحریک زور پر چل رہی ہے اور مہاسبھائی ہندو مسلمانوں کو مرتد کرنے کا بیڑا اٹھا چکے ہیں۔ سہروردی صاحب کے ان بیانات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے گا۔ عوامی لیگ کے اس لیڈر نے اپنے نفاق کو ظاہر کر کے اسلام کے ساتھ بہت بڑی دشمنی کی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ یہ شخص اپنی اس فتنہ پردازی اور یاوہ گوئی پر ذرا بھی پشیمان نہیں ہے۔ بلکہ دعوتوں اور پارٹیوں میں اسلام کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

سات سال کی مدت میں یہ پہلا موقع ہے کہ ایک قومی لیڈر کا نام لے کر "نفثِ اوّل" میں اتنی کھلی ہوئی تنقید کی گئی ہے۔ اس دو ٹوک تنقید اور "حرف برہنہ گفتن" کے لئے ہمارے ضمیر اور غیرتِ ایمانی نے ہمیں مجبور کر دیا۔ ایسے موقعوں پر سکوت، صرفِ نظر اور رواداری کا خیال حقیقت میں پرلے درجہ کی بے حسی ہے۔ ذاتی اور شخصی معاملات میں عفو و درگزر شرافت اور وسعتِ ظرف کی دلیل ہے مگر قومی اور دینی معاملات میں چشم پوشی اور درگزر بے غیرتی اور بے حمیتی کی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو غضب کی قوت اسی لئے دی ہے کہ وہ اپنی مدافعت کر سکے۔ اور اس کا اظہار ایسے موقعوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے جب کسی کے دین پر کوئی حملہ کر رہا ہو۔ مدافعت نہ تنگ نظری ہے اور نہ ظلم و تعدی ہے۔ یہ ہر شخص کا فطری اور جائز حق ہے!

ایک شخص اس قدر بدلگام ہو جاتا ہے کہ اسلام کی معروف قدروں کی بھرے مجمع میں توہین کرتا ہے۔ متعصب مغربی مورخین نے اسلام پر جو تہمتیں جوڑی ہیں اور جھوٹے الزامات لگائے ہیں۔ یہ شخص پاکستان کی اسمبلی میں ان تمام تہمتوں اور دروغ بافیوں کا خلاصہ اپنی تقریر میں بیان کر دیتا ہے۔ ایسا شخص مدح و منقبت کا مستحق ہے یا زجر و توبیخ کا! کیا اس قسم کے لغو خیالات سے بیزاری اور برأت ایمان کا تقاضا نہیں ہے!

دلوں کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس کس کے دل میں نفاق چھپا ہوا ہے۔ ہمیں دلوں کے ٹٹولنے کا بھی حکم نہیں دیا گیا اور کسی مسلمان سے بدگمان ہونا بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مگر جن لوگوں کا نفاق "کھل کر سامنے آجائے اور جو منافقین اس قدر جری اور بے باک ہو جائیں کہ اسلام کے خلاف اپنے دل کا بغض نکالنے میں کوئی پردہ بھی باقی نہ رہنے دیں۔ ان کے ساتھ عوام مسلمانوں کو سوچنا پڑے گا کہ کیا سلوک کیا جائے؟

کھلے ہوئے منافقین پر اگر مسلم عوام معاشرتی دباؤ بھی نہیں ڈال سکتے تو پھر وہ دین کی مدافعت کے لئے اور کیا کر سکتے ہیں؟ یہ اربابِ نفاق اسی لئے تو سر چڑھ گئے ہیں اور انھیں اسلام کے خلاف لب کشائی کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں ہوتا کہ مسلمانوں کی سوسائٹی انھیں نفاق ظاہر ہونے کے بعد بھی برداشت کئے جاتی ہے اور "مخلص مسلمان" اور "منافق مسلمان" میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا!

"عزت اللہ کے لئے ہے، رسول کے لئے ہے اور مومنین کے لئے ہے"۔ منافقین کے لئے نہیں ہے! جو سوسائٹی اپنے مخلصین اور منافقین کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک کرتی ہے۔ اس کا حال اس بے وقوف جوہری جیسا ہے جس نے سچے موتیوں اور جھوٹے نگینوں کو ایک ہی لڑی میں پرو رکھا ہو!

"کفر و نفاق" نے پاکستان میں جو سادہ باز رکھا ہے اس کا مثبت جواب یہ ہے کہ یہاں جلد سے جلد اسلامی نظام

برپا ہو۔ اخلاق و پاکیزگی کی بنیادوں پر معاشرے کی تشکیل اور اللہ کا کلمہ بلند اور غالب ہو۔ حضور کی سنت مطہرہ عنوانِ فکر و عمل قرار پائے۔ برائیاں مٹیں، نیکیاں پروان چڑھیں، نسلی اور وطنی عصبیتوں کے لئے یہاں کوئی مقام پناہ نہ رہے ہر طرف بھائی چارے کا دَور دَورہ، نیکی کا چلن ـــــ پاکستان کی سالمیت اور اسلام کی سربلندی ہی کفر و نفاق کو نیچا دکھائے گی اور اُن کے ناپاک عزائم کو ناکام بنائے گی کیونکہ کفار و منافقین پاکستان کی سالمیت اور اسلام کی سربلندی ہی کے سب سے بڑے دُشمن ہیں!

کفر و نفاق کی سازش کو ناکام بنانے کے لئے آؤ ہم سب یک جان و یک دل ہو جائیں، اس دیوار کی طرح جس کی اینٹ دُوسری اینٹ کو تھامے رہتی ہے! اپنی زندگیوں کو اسلام کے معیارِ اخلاق کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ اقامتِ دین کی جدوجہد میں اُن نیک لوگوں کا ساتھ دیں جنھوں نے اس کام کے لئے اپنی زندگیوں کو وقف کر دیا ہے!

اسلامی دستور کے نفاذ کے بعد معاشرے کی تطہیر کی منزل آئے گی جس میں قدم قدم پر اخلاص، ایثار اور سخت جدوجہد کی ضرورت پڑے گی، اس کے لئے ابھی سے تیاری شروع کر دیجئے۔ کمرِ ہمت خوب کس کر باندھ لیجئے۔ حرکت میں برکت ہے۔ آپ عملی قدم اُٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی آپ کا ساتھ دے گی اور پھر:۔ "انتم الاعلون" کی بشارت کی جلوہ گری آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے (ان شاء اللہ العزیز)

ماہر القادری
۲۰ر فروری ۱۹۵۷ء

عبدالکریم عابد

پرویز صاحب کے افکار کا شجرۂ نسب

جناب غلام احمد پرویز صاحب رسالہ "طلوعِ اسلام" اور اپنی تصنیفات کے ذریعہ ایک مخصوص قرآنی نقطۂ نظر کی تبلیغ فرمارہے ہیں اور اس نقطۂ نظر کو سمجھنے کی میں نے کوشش کی اور گزشتہ کئی برسوں سے جو کچھ وہ لکھ رہے ہیں اس کا بیشتر حصہ اس امید میں پڑھ ڈالا کہ شاید کہیں پر کوئی اچھی اور نئی بات پلے پڑے۔ لیکن مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ ان مضامین و مقالات میں نہ صرف یہ کہ کوئی جدید فکر موجود نہیں ہے بلکہ بڑی حد تک یہ خیالات چند سابقہ نظریات کا پرتو ہیں۔ یہ نظریات وقتاً فوقتاً اربابِ نظر اور اہلِ علم جماعت کے روبرو تنقید و تجزیہ کے لئے پیش ہوتے رہے ہیں اور بالآخر زمانے کی کسوٹی پر آزمانے کے بعد یہ مسترد کردیئے گئے تھے۔ اور مفکرینِ ملت کا کوئی سنجیدہ اور ذمہ دار گروہ ان نظریوں کا حامل نہیں رہا۔ بلکہ اس قسم کی فکر کو "راسخون فی العلم" نے ملت کے انتشار کا سبب قرار دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ طلوعِ اسلام اور پرویز صاحب اس قدیم ذہنیت کی صدائے بازگشت ہیں جو ایک عرصہ پہلے بڑے زور و شور سے میدانِ علم و فکر میں نعرہ زن تھی۔ اس ذہنیت نے پے در پے اور مسلسل کئی تحریکات کا چولا بدلا اور طرح طرح کے سوانگ رچائے مگر غلبہ و سربلندی کی اس ساری جد و جہد کے باوجود علمائے دین کے آگے اُن کی کچھ نہ چلی اور انھیں امت کے مزاجِ اجتماعی کے آگے ہتھیار ڈال دینے پڑے۔

ہماری تاریخ میں یہ تحریکیں عجمی مسلمانوں کے قبولِ اسلام سے شروع ہوتی ہیں دراصل بعض عجمی مسلمانوں کا ذہن و دماغ علمی و فکری اعتبار سے عربوں کی طرح سادہ نہیں تھا کہ اُس پر قرآن فوراً ہی نقش ہو جائے بلکہ فلسفہ "علم کلام" مذہبیات وغیرہ کی طول طویل بحثوں اور نزاکتوں نے بعض عجمی مسلمانوں کو قرآن کے بارے میں ایک نئے زاویۂ نگاہ کی تلاش پر مائل کیا، مصر اور اسکندریہ کے علمی مراکز میں جب اسلام پہنچا تو فطری طور پر نئے نئے مسائل پیدا ہوئے اور اُن کا جواب دینے کے نئے نئے طریقے اختیار کئے گئے۔ یہ بات اصولاً تو بری نہ تھی مگر انتہا پسندانہ جذبات کی کش مکش نے فکر کے اس دھارے کا رُخ غلط سمت پر موڑ دیا اور یہی وہ منزل تھی جہاں پر غیر عربی مسلمانوں نے اپنے قدیم مسلک میٹر یلزم (Materialism) اور اپنے مخصوص تاریخی طرزِ فکر ریشنلزم (Rationalism) کو عام کرنے کے لئے علمائے دین کے خلاف ذہنی و عملی ریشہ دوانیوں کے سلسلہ کا آغاز کیا۔ انسانی ذہن و دماغ اس عالمِ آب و گل میں محدود ہونے کی وجہ سے خود بخود مادہ پرستی کی جانب جھکا ہوا ہے، انبیاء کرام کی بعثت اس "مادہ پرستانہ" رجحان کو کم کرنے کے لئے عمل میں آئی۔ مگر افسوس کہ پیروانِ مذاہب نے مذہب کو بھی مادی اقدار کے مطابق کردیا۔ مذہب یہ چاہتا ہے کہ ہماری زندگی کا ارتقاء اس تیرہ و تاریک عقل کی رہنمائی میں نہ ہو جس کے ارد گرد خواہشات نے بے شمار زنجیریں بنا رکھی ہیں۔ بلکہ ہم وحی کی روشنی میں اپنا راستہ طے کریں۔ لیکن عقل کی دیوی خدا کی بجائے اپنی پرستش بہرحال کرانا چاہتی ہے۔ اس لئے جب لامذہبیت کے مندر

سُونے ہوجاتے ہیں تو مذہب کے مقدس ایوانوں میں اس دیوی کا بُت نصب کیا جاتا ہے اور کوشش کی جاتی ہے کہ اس بُت کے سامنے وحیِ الٰہی بھی سجدہ ریز ہوجائے۔

اسلام کو بھی مادہ پرستی اور عقل پرستی کے ان فتنوں کا مقابلہ دو مختلف محاذوں پر کرنا پڑا۔ ایک محاذ تو باہر والوں کے لئے کھلا تھا اور دوسرے کا رُخ اندرونِ ملت کے مادہ پرستوں اور عقل پرستوں کی جانب رہا۔

ملتِ اسلامی کے افکار کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے دوران میں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی قرون میں مسلمان علمی اعتبار سے دو مختلف جماعتوں میں منقسم تھے۔ ان میں ایک گروہ علمائے دین ہیں اور دوسرا انہی مذہبی ریشنلسٹوں اور مادہ پرستوں کا ہے۔ ان کی کش مکش ہماری تاریخ میں بالکل نمایاں ہے اور پرویز صاحب جیسے لوگ جب اسے دیکھتے ہیں تو انھیں آخرالذکر گروہ کے بارے میں یہ شبہ ہوجاتا ہے کہ وہ واقعی ترقی پسند، وسیع النظر اور سائنٹیفک مزاج کا مالک ہے اس لئے وہ ان کی تقلید کو باعثِ فخر جانتے ہیں اور علمائے دین کے بارے میں یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ وہ تنگ نظر، ترقی دشمن اور رجعت پسند تھے۔

یہی وجہ ہے کہ "طلوعِ اسلام" کے پرچوں میں آئمہ وعلمائے دین کو گالیاں دی جاتی ہیں اور اُن کے برخلاف اکثر وبیشتر اکابرینِ معتزلہ کی سوانح حیات اور اُن کے کارناموں کی تفصیل شائع ہوتی رہتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ "طلوعِ اسلام" کے قاری کو معتزلہ کی شان میں یہ الفاظ بھی اس پرچہ میں لکھے نظر آتے ہیں کہ:-

> "اگر مسلکِ اعتزال باقی رہتا تو یہ جمود و تعطل جو آج ہمیں نظر آرہا ہے، وجود میں نہ آتا اور علم وفکر کی دُنیا میں آج مُسلمان ایسے مقام پر کھڑے ہوتے جہاں کوئی اُن کا مقابل نہ ہوتا" (طلوعِ اسلام۔ ہفتہ وار ۳۰ جولائی ۱۹۵۵ء)

کیا واقعی مسلکِ اعتزال ان برکتوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے تھا۔ جو مندرجہ بالا اقتباس میں بیان کئے گئے ہیں۔ یا یہ ایک خطرناک غلط فہمی ہے؟ اس کا تصفیہ کسی غیر جانبدار ہی سے سُن لیجئے۔ ایک مشہور یورپین عالم کہتا ہے کہ:-

> "معتزلہ کی عقلیت کا اسلام کے نظامِ فکر میں جذب ہونا دشوار تھا۔ اگر اعتزال کی تحریک کامیاب ہوتی تو اسلامی ثقافت انتشار اور برہمی کا شکار ہوجاتی اور اسلام کو اس سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا۔ اُن کی علمی کاوشوں نے راسخ العقیدہ مسلمانوں کو بھی کسی حد تک اپنا ہمنوا بنا لیا تھا۔ لیکن جب معتزلہ کی انتہا پسند جماعتوں نے اسلامی عقائد کو یونانی تصوّرات کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا اور قرآن کریم کی بجائے اپنے دینی عقائد یونانی فلسفہ سے اخذ کرنے شروع کئے تو آخرالذکر طبقہ نے اُن کا ساتھ چھوڑ دیا" (ماخوذ از ایچ، اے، آر، گب)

اِس فرقہ کی پیدائش کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ایک زمانہ میں جبکہ یونانی سائنس اور یونانی علوم کے چرچے سے دُنیائے علم میں ہر طرف شور بپا تھا تو کچھ لوگوں کو یہ شوق چرایا کہ وہ کتاب وسنّت کو عصرِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے پیش کریں اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہوں نے قرآن کی ایسی تفسیریں لکھیں جو یونانی سائنس اور فلسفہ کے بالکل مطابق تھیں اس گروہ کا یہ خیال کہ قرآن کو اپنے زمانے کے علوم ورجحانات اور بالخصوص یہ کہ اپنے دور کے سائنسی خیالات کے مطابق بنایا جائے، کچھ اس طرح کا تھا کہ اس کی وجہ سے قرآن قطب نما کی ایک سوئی کی طرح سمت بدلنے پر حرکت کرتا۔ ظاہر ہے کہ ہر دور میں

سائینس اور فلسفہ بدلتے رہے ہیں، اب اگر قرآن کے معانی و مفہوم کو ہر سائینسی تغیّر اور ہر فلسفیانہ تبدیلی کے ساتھ بدل جانا ہے تو پھر ایک قرآن کے ان گنت روپ پیدا ہو جائیں گے اور ہر روپ نرالا ہوگا۔ دوسرے معنوں میں یہ طرزِ فکر ہر نئے دور کے مُسلم کو اپنے سے پچھلے دَور کے مُسلم سے کاٹ کر رکھ دے گا۔ پھر صرف یہی نہیں بلکہ چونکہ فلسفیوں اور سائینسدانوں میں خواہ وہ ایک ہی عرصہ اور زمانہ کے کیوں نہ ہوں اختلافات اور بُنیادی و اصولی اختلافات اکثر و بیشتر رہتے ہیں۔ اس لئے قرآن و سائینس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش عملاً افتراق و پراگندگی کے سوا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں کر سکتی۔

اگر ہم خالی الذہن ہو کر قرآن پر غور کریں تو یہ ممکن ہے کہ قرآن ہم سب کو ایک ہی پیام دے۔ لیکن اگر مختلف سائینسدانوں اور فلسفیوں کے خیالات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے قرآن پڑھا جائے گا تو قرآن کا پیام بھی الگ الگ ہو جائے گا۔ اس طرح وہ افتراق جو سائینس کی دُنیا میں ہے آگے بڑھ کر مذہب کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ قرآن نہ سائینس کی کتاب ہے نہ فلسفہ کی۔ اس میں سائینس اور فلسفہ کے موضوعات تلاش کرنا اسی طرح فعلِ عبث ہے جس طرح کہ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ میں قرآن سے علمِ طب کے نظریات معلوم کروں۔ وحی الٰہی تو اخلاق کے مسلمہ اصولوں، مذہب کے معروف نظریوں، خیر اور اچھائی کی عالمگیر قدروں کو فروغ دینے کے لئے ظاہر ہوتی ہے۔ ایسے سائینس یا فلسفہ کی بُھول بھلیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ سمجھنا کہ قرآن بعض سائینسدانوں کی حمایت یا بعض کی مخالفت کے لئے نازل ہوا ہے، سخت حماقت ہے ــــــ کسی بھی مذہبی صحیفہ کو دیکھ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس نے کہیں بھی اپنے دعوے کی تائید میں فلسفہ اور سائینس کی کوئی دلیل نہیں دی ہے، بلکہ وہ سیدھے سادے طریقہ پر انسان کے شریف اور نیک احساسات کو ذریعہ تفہیم قرار دیتا ہے اور پند و نصیحت، عبرت و موعظت دلانے کے فطری و آسان طریقے پر عمل پیرا ہے۔ اس حقیقت کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یوں بیان کیا ہے کہ:۔

> "انبیاء کے اصول میں سے ایک یہ ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی خلقی عقل کے موافق خطاب کرتے ہیں انبیاء نے محض اس فہم و ادراک کے لحاظ سے خطاب کیا جو لوگوں کی خلقت میں ودیعت ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص۸۶)

انسانی فطرت میں پوشیدہ نیکی کی طاقت اور عام اوسط درجہ کی سمجھ بوجھ کی استعداد قرآن کے اساسی افکار کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ خواہ نخواہ سائینس اور فلسفہ کی پیچیدہ اور مشکل زبان میں کس لئے خطاب فرماتا! ہر کتاب کا ایک موضوع ہوتا ہے اور قرآن کا موضوع "ہدایت" ہے۔ قرآن میں انفس و آفاق کی، ارض و فلک کی، سفینہ و بحر کی، بادلوں اور ہواؤں کی جو مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ اُن کا مقصد یہ ہے کہ ان نشانیوں کو دیکھ کر انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا یقین پیدا ہو اور جو دل اس یقین کی دولت سے مالا مال ہیں اُن کی اس دولت میں اور اضافہ ہو جائے!

قرآن مجید کا طرزِ خطاب سائینس اور فلسفہ کے انداز پر نہیں ہے اور نہ یہ علوم اس کے موضوع ہیں ــــــ معتزلیوں نے قرآن کے سمجھنے میں جو ٹھوکریں کھائی ہیں۔ اُس کا یہی سبب ہے کہ انہوں نے قرآنی اصطلاحات کو فلسفیانہ مباحث کا "لباس ناموزوں" پہنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ قرآن روح کو "امرِ ربی" بتاتا ہے۔ تو ان کا ذہن "امر" کے سادہ اور عام فہم معنی کو نظر انداز کر کے فلسفہ یونان کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں لفظ "امر" یا "کلام" ایک خاص اصطلاح کے طور پر مستعمل ہوتا ہے۔ اب آپ انہیں لاکھ سمجھائیے کہ صاحب! یہاں لفظ "امر" کے معنی وہی ہیں جو روزمرہ کی زبان میں

مراد لئے جاتے ہیں۔ مگر قرآن سے فلسفہ ثابت کرنے کا جنون اُن سے یہی کہلوائے گا کہ نہیں نہیں یہاں "امر" سے مطلب وہی "کلام" ہے جو فلسفۂ یونان کی خاص اصطلاح ہے اور یوحنا نبی کی انجیل میں جو اس طرح بیان ہوا ہے:-

"ابتدا میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام ہی خدا تھا۔ سب چیزیں کلام کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں اور پھر کلام مجسّم ہوا"

اب آپ ہی بتائیے کہ اس ٹیڑھی ذہنیت کا کیا علاج! یہ وہی ذہنیت ہے جس نے ملائکہ کا مطلب یونانی فلسفیوں کی اصطلاح "عقول عشرہ" کو جانا اور جس نے یونانی سائنس دانوں کے اس قیاسی نظریہ کی تصدیق قرآن سے کی کہ آسمانوں کی تعداد کُل نو ہے اور وہ ہمیشہ حرکت کرتے رہتے ہیں۔

قرآن اخلاق کی کتاب ہے مذہب کا صحیفہ ہے یا فلسفہ کی تصنیف یہ معلوم کرنے سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔ مگر خواہ مخواہ آیاتِ قرآنی کو قیاسی اور فلسفیانہ موشگافیوں کی خراد پر رکھنا اُن کے نزدیک تجدید اسلام ہے، یہی حال سائنس کا سمجھئے قرآن ان مسائل سے بحث نہیں کرتا کہ زمین گول ہے یا چپٹی، ساکن ہے یا متحرک، آسمان ٹھوس مادّہ ہے یا خیالی فضا۔ سورج زمین کے گرد گھوم رہا ہے یا زمین سورج کے گرد طواف کر رہی ہے۔ یہ سب تو آپ کی دل چسپی اور کام کی چیزیں ہیں۔ انھیں اپنے طور پر پڑھئے پڑھائیے۔ قرآن کو ان مباحث میں اُلجھانا خود قرآن کی "جامعیت" کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے؟

یہ وہ حقیقتیں تھیں جو حضرات علمار نے معتزلہ کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی۔ لیکن افسوس کہ اپنے زعم علمی میں اس سرشار و بدمست جماعت نے اس قابلِ احترام گروہ کو ملّا، رجعت پسند اور ترقی دشمن کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ اور بالآخر یہ لوگ وہ کام کر گئے جس کے "تلخ خمیازے" اب تک ہمیں بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ ان معتزلیوں نے اپنے عظیم لٹریچر کے توسط سے یہ خیال علمی دنیا میں عام کر دیا کہ قرآن یونانی سائنس اور یونانی فلسفہ کی کلیات و جزئیات کا مُصدِّق ہے۔ اور پھر جب بعد میں یونان کے علم و فکر کا قصرِ بلند دھڑام سے زمین پر گر گیا تو اس کے ساتھ ہی قرآن اور علمبرداران قرآن بھی اس قصر عالیشان کے ملبہ کے نیچے دب کر رہ گئے۔ اب آج جو اشخاص معتزلیوں کی تقلید میں یہ فکر کر رہے ہیں کہ قرآن کو موجودہ زمانے کی یورپین سائنس اور فلسفہ سے مطابقت دی جائے انھیں عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ اور زمانہ حال کے علماء کے اس اعتراض کا وزن محسوس کرنا چاہیئے کہ اگر قرآن جدید یورپین سائنس اور جدید یورپی فلسفہ کے مطابق ہے تو یہ اس کی بڑی خامی ہے۔ کیونکہ اس کے معنی ہی یہ ہوں گے کہ قرآن صرف اُس مخصوص دور میں تو صحیح ہے اور باقی آنے والے ادوار جو آج سے قطعی مختلف ہوں گے، اُن میں غلط ثابت ہو جائیگا۔ کیونکہ یہ حقیقت خود یورپ کے سائنس داں اور فلسفی بھی مانتے ہیں کہ کل کی دنیا سائنس و فلسفہ کے اعتبار سے آج کی دنیا کے مقابلہ میں نہ صرف زیادہ ترقی یافتہ بلکہ مختلف ہوگی اور اس صورت میں قرآن جو کہ رائج الوقت سائنس و فلسفہ سے ہم آہنگ ہے، کل کے روز رخاک بدہن گستاخ، تقویم پارینہ اور out of date ہو کر رہ جائے گا۔

مثلاً چند دنوں پہلے نیوٹن کے قیاسات ساری علمی دنیا کے نزدیک مسلّم تھے۔ مگر اب ایک بچہ بھی اُن کی غلطیوں پر احتساب کر سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ اُس زمانے میں قرآن اور نیوٹن کو ایک دوسرے کا مصدق بنا دیا جاتا تو آج نیوٹن کے ساتھ قرآن کی قدر و قیمت بھی یقیناً متاثر ہوتی، پھر سوچئے کہ سائنس دانوں کی سائنس کسی ایک دور میں بھی ایک نہیں رہی مثلاً آئین سٹائین کو لیجئے۔ اُن کے بعض نظریوں کی کچھ فلسفی تردید کر رہے ہیں۔ اور کچھ ریاضی داں اس کی تائید کر رہے ہیں۔ اب بتائیے کہ ہم تردید کرنے والوں یا تائید کرنے والوں میں کسے سچا سمجھیں۔ اور پھر تائید کرنے والوں کا یہ حال ہے کہ دہائٹ ہیڈ کے نزدیک آئین سٹائین کے نظریوں کی ایک

تفسیر ہے تو جیمس جینس کے نزدیک دوسری، اور بقیہ لوگوں کے پاس اپنی الگ تعبیر ہے۔ اب بتائیے کہ ہم ان میں کس کو آئین سٹائین کا واقعی شارح سمجھیں۔

جب ایک سائنسدان کی تصدیق کے لئے اتنے جھگڑے ہیں تو پھر پورے علم سائینس اور سارے سائینس دانوں کی قرآن سے تصدیق کیسے ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ علماء دین سائینس و فلسفہ کی تحصیل کو ناجائز نہ جاننے کے باوجود قرآن و سائینس اور قرآن و فلسفہ کو ہم آہنگ اور ایک کر دینے کے نظریہ کی مذمت کرتے ہیں اور اگر علماء کے اس طرز فکر کی خوبی آپ کو معلوم ہوتی تو جناب اپنی تفسیر معارف القرآن میں قصۂ آدم و ابلیس، ارتقاء وغیرہ کے عنوانات سے جدت طرازیاں ہرگز نہ کرتے اور نہ یہ کہتے کہ:۔

"قرآن نے عالم کا لفظ "سائنٹسٹ" کے معنوں میں استعمال کیا ہے" (تاریخ زوال امت ص ۹۷)

کوئی شک نہیں کہ قرآن عقل و فطرت کے عین مطابق ہے۔ مگر اس کے بعض حقائق ایسے بھی ہیں جن کا عقل پورے طور پر احاطہ نہیں کر سکتی۔ اگر قرآن کے پیش کئے ہوئے تمام حقائق ریاضی کے مسلمات کی طرح سمجھ میں آجاتے تو پھر "ایمان بالغیب" کے لئے کیوں حکم دیا جاتا۔ قرآن پاک جہاں انفس و آفاق کے مشاہدے اور فکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ وہاں "ایمان بالغیب" کا بھی حکم دیتا ہے۔ کتاب و سنت کے اسی قسم کے حقائق کی جن پر "ایمان بالشہود" کا نہیں "ایمان بالغیب" کا حکم دیا گیا ہے۔ معتزلیوں نے عقلی توجیہات پیش کرنی شروع کیں۔ اپنے دانست میں تو وہ قرآن کی سائنٹیفک تشریح و تفسیر پیش کر رہے تھے مگر در اصل ان ضرورت سے زیادہ عقلمند بندوں سے تحریف قرآن جرم کا ارتکاب ہو رہا تھا!

مسلمانوں کا دورِ نبوی میں یہ عقیدہ رہا ہے کہ انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بعض غیر معمولی قوتیں بھی عطا فرمائی ہیں۔ معجزات انہی قوتوں کے باعث ظہور میں آتے ہیں۔ مگر یہ عقیدہ عقلیت اور ریشنلزم کے ساتھ نبھ نہیں سکتا۔ اس لئے ابو مسلم اصفہانی نے ایک ایسی تفسیر لکھی جس میں معجزات کے متعلقہ ساری آیاتِ قرآنی کو جدید تشریح کی بھول بھلیوں میں پہنچا دیا۔ حتیٰ کہ اس شخص نے مشہور معجزات کے انکار کے ساتھ ساتھ اس مسلمہ تاریخی واقعہ سے بھی انکار کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی!

"ایمان بالغیب" میں جب عقل دخل در معقولات سے کام لے گی، ٹھوکر کھائے گی اور منزل حقیقت تک پہنچنے کی بجائے گمراہی کی طرف چل پڑے گی!

اور ایک معجزات ہی پر کیا موقوف ہے ملائکہ اور وحی کی حقیقت کو بھی ان معتزلیوں نے مسخ کر کے رکھ دیا۔ ان کے نزدیک ملائکہ اصل میں اس جسم کے مختلف حواس ہیں اور انسان میں ایک خاص حس جبریلی بھی ہوتی ہے جو وجدان "الہام" اور وحی کی صورت میں درجہ بدرجہ ترقی پا کر نمایاں و ظاہر ہوتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے مولانا روم کی سوانح عمری میں وحی و ملائکہ کے بارے میں معتزلیوں کا نقطۂ نظر بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اس نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ حاسۂ انسانی میں وجدانیات کا ملکہ جو مذہبی زبان میں جبرئیل کہلاتا ہے ارتقاء پا کر الہام اور پھر وحی کے پیام سنانے لگتا ہے اور جس زبان سے یہ پیامات جاری ہوں وہ شخصیت پیغمبر یا رسول کہلاتی ہے، گویا وحی انسان کی اپنی داخلیت کی انتہائی مکمل شکل ہے اور جس طرح ذہانت عام ہونے کے باوجود جینیس (Genius) کا مرتبہ کم ہی افراد کو ملتا ہے، اسی طرح وجدان گو ہر شخص کے ساتھ ہے لیکن وحی کے حامل کوئی کوئی اور کبھی کبھی ہی رہے ہیں۔ اکثر معتزلہ نے یہ بھی کہا ہے کہ باطنی استغراق اور داخلی توجہ کی اعلیٰ ترین کیفیت میں سوچ بچار کی ایک خاص منزل پر الفاظ متشکل ہو کر ایک عجیب الخلقت وجود کی صورت میں باتیں کرتے ہیں اور گو کہ یہ وجود خارج میں

موجود نہیں رہتا ہے۔ مگر اپنی داخلیت میں ہمہ تن متوجہ شخص کو محسوس ہوتا ہے اور اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پیغمبروں کا جبرئیل یہی عجیب الخلقت وجود ہے اور وحی اسی باطنی استغراق اور داخلی توجہ کی اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، چند معتزلہ نے حقیقت وحی کی سائیٹفک تعبیر کے سلسلہ میں یہ بتایا کہ عقل تمام انسانی زندگی کے مسائل و معاملات کو حل کرنے کے لئے کافی ہے۔ مگر چونکہ عام انسانی عقل پر جذبات و خواہشات کا غلبہ رہتا ہے اس لئے وہ راہ سے بھٹک جاتی ہے۔ اگر ہم کسی طرح عقل کو خواہشات و جذبات کے تسلط سے آزاد کرالیں تو عقل بالکل شدھ اور پاک ہو جائے گی۔ اس پاک حالت میں عقل جو کچھ سوچے گی یا سمجھے گی وہ صحیح ہوگا اور اصل میں وحی عقل کی اسی تزکیہ شدہ حالت کا نام ہے۔

وحی کو انسان کی داخلیت کا کارنامہ سمجھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ شاعری کو بھی پیغمبری کا ایک جزو مان لیا گیا کیونکہ اس کے مضامین اور خیالات کا تعلق بھی داخلیت کے اسی غیب سے ہے جو انسان میں پوشیدہ ہے۔

عقیدۂ آخرت، جنت، دوزخ، جو ہر مسلمان کا ایمان ہے، یہ کم بخت اس پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔ مسلک اعتزال کہتا ہے کہ جنت، دوزخ، در اصل ان دو کیفیات کا نام ہے جو اس مادی زندگی میں ہمارے اعمال کے نتیجہ میں راحت و تکلیف کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں، نیز آخرت سے مقصد صرف خدا کا قانون عدل ہے۔

اور تو اور ان عقل پرستوں نے حد یہ کردی کہ قرآنی آیات کو اپنی تاویلات کے رندے سے چھیل چھال کر خالص دہریت اور مادہ پرستی کے فلسفہ کو بھی قرآنی حکمت ثابت کرنے کی کوشش کی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ الحاد اس کائنات سے باہر یا خارج میں خدا کے کسی وجود کا منکر ہے۔ ان معتزلیوں کا پیدا کردہ ایک اسکول جسے بالکل غلط طور پر حضرت محی الدین ابن عربی سے متعلق کر دیا گیا ہے، اس کا کہنا ہے کہ خدا خارج از کائنات کہیں موجود نہیں ہے اور صرف انسان ہی انا الحق کہہ کر ادعائے خداوندی اور منصب پروردگاری پر فائز ہے۔ قرآن میں جس ہستی کو خدا کہا گیا ہے وہ تمام موجودات میں پنہاں ایک طاقت ہے۔ یعنی رب العالمین کی ذات اس انرجی کا نام ہے جو مادہ میں پائی جاتی ہے اور چونکہ مادہ اپنی اس انرجی سمیت سب سے زیادہ ارتقا یافتہ شکل انسان کی رکھتا ہے، اس لئے خدا کا نشان اور سراغ نفس انسانی کی گہرائیوں میں ملے گا اور انسان مجاز ہے کہ وہ انا الحق کہہ اٹھے۔ ویسے یہ انرجی یا خدا ہر شجر و حجر، چرند و پرند میں اپنا جلوہ رکھتی ہے۔ اس لئے تمام موجودات خدا ہیں۔

عقل پرستی اور ریشنلزم کے نتیجہ میں پیدا شدہ یہ غلط تصورات مسلم جماعت کیلئے بڑے تباہ کن ثابت ہوئے۔ گو کہ ہمارے صوفیائے کرام نے ان رجحانات کا مقابلہ اسلامی تصوف سے کرنا چاہا اور اس میں وہ خاصے کامیاب رہے۔ لیکن پھر بھی اعتزال کی جڑیں ہمارے معاشرے میں بڑی دور تک سرایت کر گئی تھیں۔ اس کا ثبوت صرف اس واقعہ سے مل سکتا ہے کہ اس دور میں خواص ہی نہیں عوام بھی "جنات" کے وجود کو ماننے کے لئے آمادہ نہ تھے کیونکہ "جن" مشاہدہ و عقل کی دسترس سے باہر ایک غیر مرئی مخلوق ہیں۔ عقل پرستی کی یہ وبا کچھ ایسی عالمگیر شکل اختیار کر گئی تھی کہ اس نے ایمان کو دلوں سے کسی حد تک رخصت ہی کر دیا تھا اور اب مسلمانوں کے لئے خدا کی رضا، اور آخرت کے خیال میں کوئی کشش نہیں تھی بلکہ ان کی تمام تر صلاحیتیں عقلی موشگافیوں کی خاطر ضائع ہو رہی تھیں۔ اور مذہب کے سلسلہ میں اس عقلی تفکر کا اگر صلہ کچھ تھا تو وہ یہ کہ خود بعض مذہبی لوگ نزاع اور انار کی کا شکار ہو گئے۔

یقیناً مذہب کو سمجھنے، جاننے اور عمل کرنے کے لئے عقل کی ضرورت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ مذہبی اعتقادات جن کا تعلق ایمان بالغیب سے ہے، آخر کس طرح عقل انسانی اور علم انسانی کے احاطے میں آجائیں گے، ہماری عقل اور ہمارا علم بہرحال محدود

اور ناقص ہے۔ اس محدود اور ناقص عقل و علم کی سمجھ میں اگر چند مذہبی حقائق نہیں آتے ہیں تو ہم آخر ان حقائق کو مسخ کرنے کی کیوں کوشش کریں؟ صاف بات یہ ہے کہ اگر آپ کو وحی کے علم پر اطمینان نہیں ہے تو اس کا انکار کر کے عقل کو اپنا معبود بنا لیجئے۔ مگر وحی کو ماننے کے بعد عقل کے آزادانہ استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن و حدیث کی کچھ باتیں اگر ہمارے علم یا عقل سے متصادم ہوں تو تحریف کے ذریعہ انھیں مٹانے کی بجائے ہمیں صبر کے ساتھ یہ انتظار کرنا ہوگا کہ عقل یا علم ارتقاء پاکر اور آگے بڑھ کر اس منزل تک آئیں جہاں سے مذہبی حقائق کی تصدیق ممکن و آسان ہو جاتی ہے۔

اس حقیقت کو معتزلہ نے سمجھنے پر توجہ نہیں دی۔ اسی لئے وہ مذہب میں چند اصلاحات کر کے اسے عقل کے مطابق بنانا چاہ رہے تھے اور اب پرویز صاحب انہی کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں۔ مگر خدارا سوچئے کہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے کی ہر نئی منزل پر بدل جانے والی عقل کا یہ عالم اور انتشار اور مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے ہر گوشے میں نئے نئے سبق سکھانے والی یہ تفرقہ انگیز عقل جو ہر ہر قدم پر مختلف صورتوں کے ساتھ نظر آرہی ہے، اس کے ہجوم میں قرآن بیچارہ کیا کرے گا؟ اگر وحی الٰہی کسی عقل کے خلاف پڑے تو قرآن پر کیا ذمہ داری ہے اور اگر کسی کی عقل میں آجائے، تو اس کی خوبی میں کونسا اضافہ ہوتا ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ عقل و سائنس کے خود ساختہ اصولوں کی خاطر حقائق وحی میں بگاڑ پیدا کرنا مذہب کے ساتھ سب سے بڑی غداری ہے۔ قرآنی الفاظ کو جدید معانی سے آراستہ کرنے کا وہ کام جو پرویز صاحب انجام دینا چاہتے ہیں اس کی راہ میں سب سے زبردست رکاوٹ سنتِ رسول اور طریق صحابہؓ ہے۔ یہ رکاوٹ آج کی طرح زمانہ گزشتہ میں بھی معتزلیوں کے راستہ میں حائل ہوئی تھی۔ اس لئے انہوں نے محدثین کرام کو برا بھلا کہنا اور حدیث کی اہمیت کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ اور اس وقت سے لے کر اب تک فتنۂ انکار حدیث مسلسل کسی نہ کسی صورت میں چلا آرہا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ نے اپنے رسالہ میں انکار حدیث کے اس مسلک کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس لغو و غلط نظریہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ امام شافعیؒ کے علاوہ اور دوسرے ائمہ دین و بزرگان دین بھی اس گمراہ کن عقیدے کے خلاف ہمیشہ مصروف جہاد رہے اور آج بھی علمائے حق اس فتنہ کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

ان علماء کا کہنا ہے کہ اگر آپ حدیث کو دین میں اتھارٹی یا سند تسلیم نہ کریں تو پھر آپ کے مذہب کی بنیاد کیا رہ جاتی ہے کیونکہ جن ہاتھوں اور جن ذرائع سے ہم تک حدیث پہنچی ہے انہی ذرائع اور انہی ہاتھوں نے ہم کو قرآن بھی پہنچایا ہے۔ اگر یہ واسطہ غیر معتبر ہے تو پھر صرف حدیث ہی نہیں قرآن کا بھی انکار کرنا ہوگا۔ علاوہ ازیں سنتِ رسول اللہ اور سنتِ صحابہؓ کو حذف کر دینے کے بعد قرآن کے معانی کس طرح متعین ہوں گے۔ کیونکہ جہاں تک قرآن مجید کی آیتوں کا تعلق ہے اس کی تفسیریں بہت سی کی جا سکتی ہیں۔ اور بہت سی ہوئی ہیں۔ اب ان میں صحیح کونسی ہے اور غلط کیا ہے۔ اس کا فیصلہ تو صرف سنتِ رسولؐ اور اسوۂ صحابہؓ ہی کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے اور فیصلہ کی اس کسوٹی کو اٹھا کر پھینک دینے کے بعد ملتِ مسلمہ ایک عظیم افتراق اور انتشار کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ بلاشبہ آج ہم میں عملی انتشار بپا ہے اور جزئی مسائل پر ہزاروں اختلاف ہیں۔ جو کبھی کبھی ناگوار صورت بھی اختیار کر جاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ نظریاتی اعتبار سے ہم دین کے اساسی اصولوں اور بنیادی مسائل پر بالاتفاق ایک رائے رکھتے ہیں اور انکار حدیث کی پہلی ضرب اسی ذہن اور فکری وحدت پر پڑے گی، کیونکہ سنتِ رسولؐ اور سنتِ صحابہؓ کی طرف سے آنکھیں بند کرنے کے بعد اپنے طور پر نیا سارت عقلی کے ذریعہ قرآن کے معنی متعین کرنے کی کوشش ہم میں جزئی ہی نہیں اصولی اختلافات کو پیدا کرنے کا باعث ہوگی۔ اور یہ اختلافات اتنے گہرے اور شدید ہوں گے کہ مسلمانوں کو ان کی وجہ سے ایک

ملت کی بجائے کئی ملتوں میں منقسم ہوجانا پڑے گا۔

اس موضوع پر جتنا زیادہ سوچ بچار کیا جائے اتنی ہی زیادہ یہ حقیقت کھُلے گی کہ ہمارے ذہنی اتحاد اور فکری وحدت کی سلامتی کا انحصار یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کی کسی ایسی تفسیر کو قبول نہ کریں جس کی تائید سنتِ رسولؐ اور سنتِ صحابہؓ سے نہ ہوتی ہو۔ سنتِ رسولؐ اور سنتِ صحابہؓ کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث اور اس کا علم ہے، لہذا اسے ترک کرنے یا جھٹلانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم مسلمانوں میں افتراق، اختلاف، انتشار اور فساد کے بیج بو رہے ہیں۔

انکارِ حدیث کے مسلک کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اس کی وجہ سے وہ سارے گمراہ کن عقائد اور مردود نظریات جو اسلامی تاریخ میں بارہا آور نہ ہوسکے اُن کے مروج اور مقبول ہونے کا راستہ نکل آئے گا۔ مثلاً قرآن مجید میں بیسیوں آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص چاہے تو اُن کی تفسیر اس طرح کرے کہ اس کے ذریعہ تناسخ یا آواگون کے فلسفہ کو قرآنی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی کتاب غنیۃ الطالبین میں تناسخ کے ماننے والے قرآنی فرقوں کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، اور ابھی حال ہی میں ایک تھیاسوفسٹ نے اس موضوع پر جو کتاب لکھی ہے اس میں قرآن مجید کی کئی آیتوں کو تناسخ کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔ ہندوستان کے نامور عالم پنڈت سندر لال بھی اس بارے میں قرآن سے استدلال کرتے ہیں —— حیدر آباد دکن کے صدیق دیندار چن بشویشور کا دعویٰ تھا کہ میں قرآن مجید کے ہر ورق سے تناسخ کے ثبوت میں آیت پیش کرسکتا ہوں۔ مولانا رومؒ کی طرف تناسخ کے مضمون کا ایک شعر یہ منسوب کیا جاتا ہے کہ:۔

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام — ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

بعض مشاہیر اکابر مثلاً :——— ابن خلدون، محمد بن زکریا رازی، احمد بن حائط، ابومسلم خراسانی وغیرہ کے بارے میں یہ روایتیں ملتی ہیں کہ وہ تناسخ کو ازروئے قرآن صحیح مانتے تھے اور نصیریہ، باطنیہ، بہائیہ، سبائیہ، اسماعیلیہ وغیرہ فرقے تناسخ کے قائل ہیں۔ معتزلہ کا ایک گروہ بھی تناسخِ ارواح کا قائل تھا۔ مصر کے فاطمی خلیفہ بھی اسے صحیح جانتے تھے۔ موجودہ آغا خانی خوجوں کی مشہور مذہبی کتاب "دس اوتار" میں بھی تناسخ کو پیش کیا گیا ہے۔ دارشکوہ اور اس کی طرح کے مسلمانوں کا تصوف ہمیشہ تناسخ کا قائل رہا۔ اب آپ بتائیے کہ ان سب کے مقابلہ میں منکرینِ حدیث اس کے سوا کیا کرسکتے ہیں کہ ان کی تفسیر بالرائے کے مقابلہ میں اپنی تفسیر بالرائے پیش کردیں اور ظاہر ہے کہ جب معاملہ رائے کا ہو تو آپ کے قیاسات آپ کے مخالف کے لئے سند نہیں بن سکتے۔ البتہ سنتِ رسولؐ اور سنتِ صحابہؓ ایک ایسی شے ہے کہ جس کے بعد آدمی کے لئے اپنی ذاتی رائے پر اصرار کرنا ممکن نہیں رہتا ہے۔

خوارج کے چند گروہ اس کے قائل تھے کہ نماز صرف ایک رکعت صبح اور ایک رکعت شام کو ہے اور بعض خارجی پوتیوں، نواسیوں، بھتیجیوں اور بھانجوں کی بیٹیوں سے نکاح کو حلال جانتے ہیں۔ بعض معتزلی کہتے ہیں کہ صرف سؤر کا گوشت حرام ہے اس کی چربی اور مغز حلال ہے، اسی طرح مرجیہ میں سے بعض کہتے ہیں کہ نبوت اعمال صالحہ سے حاصل ہوسکتی ہے اور بعض صالحین انبیاء سے افضل ہوتے ہیں، یا یہ کہ کچھ لوگ نظریۂ حلول کے قائل ہیں اور اس کے ثبوت میں قرآنی آیتوں سے استدلال کرتے ہیں اور چند آدمی ختم نبوت کو نہیں مانتے اور خاتم النبیین کی اپنی الگ تفسیر پیش کرتے ہیں۔ بعض شیعوں نے دن میں پچاس رکعت نمازیں اور بعض نے سترہ وقت کی نمازیں فرض بتائی ہیں اور یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ اس کا تصفیہ اپنی ذاتی رائے اور علم سے ہرگز نہیں ہوسکتا۔ صرف سنتِ رسولؐ اور سنتِ صحابہؓ ہی ان قضیوں اور جھگڑوں میں فیصلہ کا

واحد معیار ہے اور اس معیار کو قبول کرنے ہی کی وجہ سے ملت اب تک انتشار اور تراج کی لعنت سے محفوظ رہی۔ کچھ لوگوں کو یہ بات بری معلوم ہوتی ہے کہ قرآن کے ساتھ رسول اکرم کی زندگی اور صحابہ کرام کی حیات طیبہ کو بھی جزو دین سمجھا جائے۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس دنیا میں جہاں تک تصورات کا تعلق ہے ایک سے ایک عمدہ تصور موجود ہے اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جہاں تک مجرد اچھے اصولوں کا تعلق ہے تو قرآن سے ملتے جلتے اچھے اصول بعض دوسری کتابوں میں ملتے ہیں۔ لیکن دنیا اسے اس لئے نہیں مانتی کہ وہ محض اٹوپیا کے طرز کی خیالی باتوں کی بجائے ایسا نصب العین چاہتی ہے کہ جس کے مطابق عملی نمونہ سامنے موجود ہو یہی وجہ ہے کہ ہر تھیوری کا اپنے ماننے والوں سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ اس عملی انقلاب پر اپنی نظریں جمائے رکھیں جو اس کے نتیجہ میں رونما ہوا۔ انکار حدیث کا مسلک اس کی تھیوری کو تو مانتا ہے مگر اس کے نتیجہ میں جو انقلاب رونما ہوا اسے سنت سمجھنے اور جاننے کے لئے تیار نہیں ہے اور عذر یہ ہے کہ اس انقلاب کے محدثین کرام یا مورخین غیر معتبر تھے۔

لیکن محدثین کرام کی سیرت اور ان کے فن کے متعلق جو ریسرچ ابھی کچھ دنوں پہلے یورپ میں ہوئی تھی۔ اگر اس پر ہم نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم کے اقوال و اعمال کی روایت کرنے والا یہ گروہ نہ صرف مذہبی اعتبار سے بلکہ دنیوی و اخلاقی اعتبار سے بھی اتنا بلند تھا کہ اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی اور ان کے اصول روایت اس قدر سائنٹیفک اور معقول تھے کہ نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی اسے ایک حیرت انگیز کرشمہ قرار دیتے ہیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا کے ایک فاضل مضمون نگار کے بقول جمع احادیث کا کام دنیا کی فن تاریخ نویسی میں ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر افسوس کہ جس ذخیرۂ علم کی اتنی قدر غیر مسلم دنیا بھی کرنے پر مجبور ہے اسے مسلمان منکرین حدیث اپنے مضحکہ اور مذاق کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ حالانکہ کم از کم یہ لوگ علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی کا ابتدائی حصہ ہی پڑھ لیتے تو ان کی تشفی ہو جاتی اور معلوم ہو جاتا کہ خالص تاریخی اعتبار سے بھی حدیث کا درجہ کس قدر مضبوط ہے۔

عام طور سے جو اعتراض منکرین حدیث کی طرف سے کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ حدیث عہد رسالت کے بعد مرتب ہوئی۔ منکرین حدیث کے بیانات کی پہلی خصوصیت تضاد ہے، وہ ایک طرف جہاں یہ کہتے ہیں کہ حضورؐ کے عہد میں علم حدیث کا وجود نہیں تھا۔ وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حدیث کے جمع شدہ ذخیرے جلا دیئے۔ سوال یہ ہے کہ اگر حضور اکرم اور حضرت ابوبکر کے زمانہ میں حدیثیں لکھی ہوئی نہیں تھیں تو پھر حضرت عمرؓ نے آخر کیا چیز جلائی تھی؟ خود منکرین حدیث ہی کے بیان سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کم از کم دور نبوی اور عہد ابوبکرؓ میں حدیثیں تحریری طور پر موجود تھیں۔ کیونکہ اگر یہ موجود نہ ہوتیں تو حضرت عمرؓ پھر اسے جلا کس طرح سکتے تھے؟

اگر منکرین حدیث یہ تسلیم کرلیں کہ عہد فاروقی تک احادیث و روایات کا تحریری سلسلہ موجود تھا تو بڑی مشکل آسان ہو جائے گی، ان کے مزید اطمینان کے لئے چند اور روایتیں اس بارے میں درج ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کے پاس حدیثیں محفوظ نہیں تھیں۔ البتہ عبداللہ بن عمرو مستثنیٰ ہیں۔ کیونکہ وہ آنحضرتؐ کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے۔ اور میں لکھتا نہ تھا۔ (صحیح بخاری باب العلم)

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلعم سے جو سنتے تھے لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت صلعم کبھی غصہ کی حالت میں ہوتے ہیں کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھ لیتے ہو۔ عبداللہ بن عمروؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرتؐ سے یہ واقعہ بیان کیا۔ آپؐ نے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تم لکھ لیا کرو

اس سے جو قول نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔ (ابو داؤد - جلد ۲ صہ ۷۷)

ان دو روایتوں کے علاوہ اور بھی کئی روائیتیں اس مضمون کی مل سکتی ہیں۔ ایک صحابی جو آنحضرت کی حدیثیں قلمبند کیا کرتے تھے۔ اُن کے مجموعہ حدیث کا نام "دیبائے صادقہ" تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت انسؓ کے پاس بھی حدیثوں کا لکھا ہوا ہونا ثابت ہے۔

احادیث کی روایتوں کے سلسلہ میں جو احتیاط کی گئی تھی۔ اس کا حال پڑھیئے تو معلوم ہوگا کہ رسولؐ اکرم کے اصل حالات و واقعات اور اقوال و افعال کے محفوظ رہنے میں کوئی شبہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت عمرؓ کا طریقہ تھا کہ جب کوئی صحابی روایت حدیث کرتے تو اُن سے وہ چند گواہ بطور ثبوت طلب کرتے۔ اگر یہ معتبر گواہ مل جاتے تو حدیث صحیح تسلیم کرلی جاتی اور ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتی۔ اور اگر معتبر گواہ نہ ملتے تو حدیث کو صحیح نہ سمجھا جاتا۔ اور روایت بیان کرنے والے کو دُرّے کی سزا دی جاتی۔ اپنے اس طریقے میں حضرت عمرؓ اس قدر سخت تھے کہ انہوں نے بعض صحابہ کبار کو بھی سزائیں دی ہیں۔ اگر حضرت عمرؓ حدیث کے مخالف ہوتے تو اس کے بیان کرنے والے کو فوراً ہی سزا دی جاتی۔ اُس سے گواہی کا مطالبہ کیوں کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ حدیثیں معتبر شہادتوں کی موجودگی میں اختیار کی جائیں۔ اسی لئے ان کے زمانے میں عام لوگوں کے لئے روایت حدیث کی اجازت نہ تھی۔

محدثین نے جو روایتیں بیان کی ہیں۔ اُس روایت کی ہر کڑی یعنی راوی پر باقاعدہ ریسرچ کیا ہے اور اس راوی کا نام، پیشہ، عمر، سلسلۂ نسب، خاندانی حالات، ذاتی مشاغل، تعلیمی قابلیت، قوتِ حافظہ، صحتِ جسمانی، عادات و اطوار، سابقہ اور موجودہ مذہبی عقائد، غرض ہر جزئی سے جزئی تفصیل معلوم کرنیکے بعد اُسے مندرج کردیا۔ تاکہ بعد میں آنے والے بھی ہر ہر راوی کے بارے میں اپنا اعتماد کرلیں۔ چنانچہ اس عظیم ریسرچ کے نتیجہ میں اسماء الرجال کی کتابیں تیار ہوئیں۔ ان کتابوں میں کئی لاکھ آدمیوں سے متعلق تفصیل مع محدثین کی آرا کے لکھی ہوئی ہیں۔ اور اب آپ کو جب کبھی کسی حدیث کے بارے میں شبہ ہو تو اس کے راویوں کی جانچ پڑتال کے لئے پہلے حدیث کی سند دیکھئے۔ اس سند میں جو نام پائے جاتے ہوں ان سے متعلق محدثین کی ریسرچ اسماء الرجال کی کتابوں میں پڑھ ڈالئے۔ اور پھر فیصلہ کیجئے کہ حدیث کا بلحاظ اسناد کے اعتبار سے کیا درجہ ہے؟

ان محدثین کی دیانت کا یہ حال تھا کہ اگر ان کو کوئی حدیث اپنی دانست میں ذرا سی کمزور یا ضعیف بھی نظر آئی تو انہوں نے اسے لکھ دیا اور تصریح کردی کہ ہماری اس حدیث کے بارے میں یہ رائے مندرجہ وجوہات کی بناء پر ہے، کوئی اور چاہے تو مزید ریسرچ کرلے شاید صحیح ثابت ہو اور اُمّت کے علم میں ایک مزید قول یا فعل رسولؐ کا اضافہ ہوجائے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تھے تو محض اپنے اختیار تمیزی کی بناء پر اسے رد کرسکتے تھے۔ کوئی اُن کو پوچھنے والا نہ تھا کہ آپ ایسا کیوں کررہے ہیں۔ مگر دینی ذمہ داری کا خیال محدثین کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ اور اسی ذمہ داری کے احساس نے اُن کے قلوب کی یہ کیفیت کردی تھی کہ جب کوئی راوی یا محدث حضورؐ کی روایت بیان کرتا یا لکھتا تو بسا اوقات فرطِ خشیتِ الٰہی سے لرزنے لگتا اور روایت بیان کرنے یا لکھنے سے پہلے بارگاہِ الٰہی میں انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ گڑگڑاتا، نماز پڑھتا اور دعا کرتا کہ یا اللہ! تو میری زبان اور قلم سے کوئی ایسی حدیث نکلنے نہ دے جو غیر صحیح ہو۔ ورنہ روزِ آخرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں کیا منہ دکھاؤں گا اور جب حضورؐ پوچھیں گے کہ تم نے میرے بارے میں ایک غلط بات کیوں بیان کی یا لکھی تو میں کیا

جواب دوں گا؟

اس خوف نے ان کو اتنا محتاط بنا دیا تھا کہ ایک محدث نے کسی بہت ہی ثقہ راوی کو دیکھا کہ وہ راستہ میں کچھ کھاتے جا رہے تھے، تو انہوں نے اُن کی روایت ناقابل اعتبار قرار دی کہ ایسے شخص کا کیا بھروسہ جو اتنا لاابالی ہو کہ معمولی آداب مجلس کی بھی پروا نہ کرے۔ ایک اور محدث کا واقعہ ہے کہ انہوں نے ایک شخص سے روایت لینے کے لئے دور دراز کا سفر طے کیا اور جب اس کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ کسی برتن میں کچھ دانہ رکھ کر گھوڑے کو دکھا رہے ہیں، گر دانہ دیکھ کر جب قریب آیا تو انہوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کی مشکیں کس دیں۔ یہ ترکیب انہیں اس لئے کرنی پڑی کہ بہت دیر سے گھوڑا اُن کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد جب وہ ان محدث کی طرف مخاطب ہوئے اور حدیث بیان کرنی چاہی تو ان محدث صاحب نے کہہ دیا کہ مجھے تمہاری حدیث منظور نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص گھوڑے کے ساتھ چالبازی اور دھوکا کر سکتا ہے ممکن ہے کہ وہ انسانوں کے ساتھ بھی دھوکا کرے۔ اس غیر معمولی احتیاط کا نتیجہ ظاہر تھا کہ اُن کا یہ تکلیف دہ اور طویل سفر بے کار گیا۔

مگر یہ سب غیر معمولی اہتمام صرف اس لئے تھا کہ احادیث زیادہ سے زیادہ صحیح جمع ہو سکیں اور اُن میں غلطی کا امکان کم سے کم رہ جائے۔ محدثین کی ان کوششوں کی پُشت پر وہ خدائی مشیت اور مرضی بھی موجود تھی جو قرآن میں یہ حکم دیتی ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو، رسُول کی اطاعت کرو اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اللہ نے ہماری ہدایت اور آیت کے پہلے جزو پر عمل کرانے کی خاطر قرآن کو اس کے حفاظ کے توسط سے محفوظ کر دیا ہے اور آیت کے دوسرے جزو یعنی رسُول کی اطاعت کے لئے احادیث کو محدثین کے ذریعہ محفوظ و قائم کر دیا ہے۔ اور اب ہم اطیعو اللہ اور اطیعوا الرسول پر بغیر کسی دقت کے عامل ہو سکتے ہیں۔ اگر قرآن کے ساتھ اللہ تعالیٰ رسُول کا نور نہ بھیجتا تو اس نور کی روشنی کے بغیر قرآن کے معنی دیکھنا ممکن نہ رہتا۔ خداوند کریم نے اپنے رسُول کو دو چیزیں دی ہیں اور دونوں کا ذکر بالکل الگ الگ ہے۔ ان میں پہلی سے تو "الکتاب" ہے اور دوسری کا نام "الحکمت" ہے۔

جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد سنتِ رسُول کی ہمیں ضرورت نہیں۔ وہ ہمیں بتائیں کہ قرآن نے صرف اقیموا الصلوٰۃ کا ذکر کیا ہے، آپ بتایئے کہ صلوٰۃ سے مراد کیا ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح اس کا مطلب ہم نماز سمجھ لیں تو یہ کس طرح پڑھی جائے، کب پڑھی جائے اور کتنی پڑھی جائے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا۔ اگر احادیث ناقابل اعتبار ہیں تو نماز کی کیا صورت ہوگی۔ قرآن میں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی نمازوں میں کتنی رکعت پڑھنی چاہئیں۔ اس میں فرض کی تعداد کیا ہے اور سنت کی کیا۔ نیز یہ کہ نماز میں آخر کونسی چیز پڑھی جائے۔ اس کی سب تفصیل تو حدیث اور صرف حدیث ہی میں ملتی ہے۔ یہی حال "آتو الزکوٰۃ" کا ہے۔ زکوٰۃ کب دینی چاہیئے۔ آیا ہر روز، اور ہر سال، یا صرف زندگی میں ایک دفعہ کافی ہے۔ اس پر قرآن روشنی نہیں ڈالتا۔ اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کس حساب سے وصول کی جائے اور کن کن چیزوں پر وصول کی جائے۔ روزوں کے سلسلہ میں بھی صرف "ایاماً معدودات" کا اشارہ ہے۔ جس کے معنی چند روز کے ہیں۔ اس کی تعداد اور دوسری تفصیلات معلوم کرنے کا واحد ذریعہ حدیث ہی ہے۔ قرآن پاک میں احکام کی تفصیل نہ ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قرآن اپنی تفصیل

کے لئے کسی دوسری چیز کا محتاج ہے۔ قرآن محتاج نہیں ہے بلکہ ہم محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہمارے اس احتیاج کو پورا کرنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور حضور کی اطاعت کو منصوص قرار دیا۔ اللہ تعالیٰ نے تنہا "الکتاب" نہیں بھیجی بلکہ اس کے ساتھ ایک لانے والے کو بھی بھیجا اور اُس سے تین فرائض متعلق فرمائے:۔

(۱) آیاتِ قرآنی کی قرأت۔

(۲) کتاب و حکمت کی تعلیم۔ اور

(۳) اہلِ ایمان کا تزکیہ نفس۔

تو احادیث در اصل قرآن ہی کے حکم اور منشاء کو پورا کرنے والی ہیں اور قرآن پر اضافہ نہیں ہیں بلکہ اس کی قولی و عملی تفسیر و تفصیل ہیں۔ اگر حضورؐ کی "رسالت" ربوبیت الٰہی پر اضافہ نہیں ہے تو آپؐ کی "سنت" قرآن پر اضافہ نہیں کہی جاسکتی بلکہ وہ اُس کی عملی تفسیر ہے!

بالکل یہی حال اور معاملات کا ہے، عبادات، طہارت، معاشرت، اخلاق، سیاست و معیشت کے بیشتر احکام قرآن مجید میں سرے سے لکھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اُن کا ذکر احادیث نبوی میں ہے، اس لئے حدیث کے بغیر اسلام اور قرآن پر عمل ناممکن ہے۔ منکرینِ حدیث یہ کہتے ہیں کہ ان مسائل میں اُمت کا عمل تواتر ہم تسلیم کریں گے یعنی عام مسلمان عبادات کے سلسلہ میں جو اعمال مسلسل اور متواتر انجام دیتے چلے آرہے ہیں اسے دیکھ کر ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ مگر اُمتِ مُسلمہ میں اور بھی بہت سے اعمال مسلسل اور متواتر چلے آرہے ہیں اور ان میں سے بعض غیر شرعی بلکہ مشرکانہ ہیں۔ کیا تواتر کی وجہ سے انھیں تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے قاری اور عامل کو قدم قدم پر حدیث کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معتزلہ کے گروہ میں سے بعض افراد نے انکارِ حدیث کی بجائے ایک اور مسلک ایجاد کیا۔ یعنی یہ کہ ہم صرف ان حدیثوں کو مانیں گے جو "تواتر" سے ثابت ہوں۔ حضرت امام شافعیؒ نے حدیث کا مطلق انکار کرنے والوں کے ساتھ اس تواتر والے گروہ کی بھی اپنے رسالہ میں خوب خبر لی ہے اور بتایا ہے کہ صحیح حدیث ہر صورت میں قبول کرنی ہوگی۔

حدیث کے بارے میں پرویز صاحب کا رویّہ عجیب و غریب ہے۔ کبھی تو وہ احادیث کو "عجمی سازش" کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور کبھی منکرِ حدیث ہونے کے الزام کی تردید فرماتے ہیں۔ مگر "طلوعِ اسلام" کے ہر شمارہ میں حدیث کی کتابوں سے چُن چُن کر چند مخصوص حدیثیں جمع کی جاتی ہیں جو اس نوعیت کی ہیں کہ ان کو پڑھ کر ناواقف آدمی یہ خیال کرنے لگے کہ احادیث نعوذ باللہ لغویت کا طومار ہیں۔ حالانکہ اس طرح سے اگر کوئی شخص چاہے تو ایک خاص ذہنیت کے مطابق چھانٹ کر قرآن مجید کی آیتوں کو بھی ایسا ترتیب دے سکتا ہے کہ وہ مضحکہ خیز معلوم ہوں۔ لیکن اس طرح کے سفلہ پن سے قرآن کی عظمت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوگا۔ اور حدیثوں کو بھی یوں مخصوص طریقے پر معاندانہ طرز سے ترتیب دے کر کوئی شخص رسُولؐ کے اقوال و اعمال کو بے وزن ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر پرویز صاحب منکرِ حدیث نہیں ہیں تو پھر یہ سلسلہ کس لئے جاری ہے۔ جہاں تک علماء کا تعلق ہے وہ یہ مانتے ہیں کہ روایت کے اعتبار سے غلط اور موضوع حدیث بھی موجود ہیں مگر حدیث کے اصولِ درایت و روایت کی مدد سے حدیث کا عالم اسے فوراً پہچان جاتا ہے۔ مثلاً ابن جوزی نے محدثین کے اصولِ درایت بیان کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ:۔

"جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصولِ مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے اس کی نسبت یہ بحث

کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس حدیث کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر، اسی طرح سے وہ حدیث جس میں ذراسی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو یا معمولی کام پر بہت بڑے ثواب کا وعدہ ہے، یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے یا جو محسوسات اور مشاہدے کے خلاف ہو قطعاً قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ (فتح المغیث)

ملا علی قاری نے موضوعات کے خاتمہ میں یہ لکھا ہے کہ:-

"جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو مشاہدہ کے خلاف ہو، جو صریح حدیث کے خلاف ہو اور وہ حدیث جو قرآن کے خلاف ہو، یا وہ جس میں رکیک الفاظ یا مضمون پایا جائے ناقابلِ اعتبار ہیں"۔

روایت اور درایت کے ان تمام اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھنے کے بعد جو احادیث صحیح ثابت ہوں اور اُن سے جو سنت مستنبط ہوتی ہو اُسے تسلیم کرنے سے انکار کرنا۔ انکارِ حدیث ہے، اگر اس سنت کو پرویز صاحب دین ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہیں تو وہ بلاشبہ منکرِ حدیث ہیں۔ اس بارے میں انھیں خود مُبتلائے غلط فہمی رہنا چاہیئے اور نہ دوسروں ہی کو دھوکا دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ انکارِ حدیث کا مسلک ضوق سے اختیار کریں۔ لیکن یہ جان لیں کہ اب سے پہلے معتزلہ نے حدیث کی اہمیت کو ختم کرنے کے لئے لاکھ جتن کر ڈالے اور باوجودیکہ وہ پرویز صاحب اور اُن کی طرح کے لوگوں کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا زیادہ علم رکھتے تھے، مگر انھیں اپنے مقصد میں شدید ناکامی ہوئی۔ حدیث کے سلسلہ میں معتزلیوں کا یہ طرزِ فکر علمائے حق کے دلائل و استدلال کی تاب کسی وقت بھی نہیں لاسکا اور آخر کار اُس نے اپنے آپ کو ایک اور دوسری تحریک کی صورت دی۔ یہ تحریک اسلامی تاریخ میں فرقہ باطنیہ کے نام سے روشناس ہے۔

باطنیوں کے مسلک کی بنیاد معتزلہ کی فلسفہ پرستی، سائنس پرستی، اور عقل پرستی پر استوار کی گئی۔ اور چونکہ اس کے ایرانی علمبردار پکے وطن پرست بھی تھے، اس لئے انہوں نے عرب کے غلبہ و تفوق کے خلاف اپنی وطنیت کو سربلند کرنے کے لئے عجیب و غریب عقائد تراش کر ایک فرقہ کی داغ بیل ڈال دی۔

باطنیوں کا عقیدہ ہے کہ ہر زمانے کے لئے ایک شریعت کا اصول اور ہر زمانہ یا ہر دور کیلئے مذہب کا ایک بندھا ٹکا نظام نہیں چل سکتا۔ اس لئے ایک دین کے باوجود بہت سی شریعتیں آتی رہی ہیں اور آئندہ بھی "صد جہاں باقی است در قدرتِ کن ہنوز" کے مطابق الگ الگ زمانے کے لئے جدا جدا شریعتیں بنائی جائیں گی۔ کیونکہ اصل میں شریعت تو صرف مذہب کا لباس ہے۔ جو انسان کی ذہنی ترقی اور زمانہ کے ماحول اور موسمی حالات کی بناء پر ہمیشہ بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہیگا ؎

دم بدم گر شود لباس بدل　　مرد صاحب لباس را چہ خلل

اس نظریہ کے مطابق باطنیہ صرف اصل دین حقائق اور مذہب کے بُنیادی اصولوں ہی کو دائمی و ابدی شئے سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کا اُوپری ڈھانچہ، رنگ روپ، رسم و رواج کبھی اس حیثیت سے ہمارے پیشِ نظر نہیں رہنے چاہئیں کہ یہ اصل دین کی طرح اَن مِٹ ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ قرآن جس سوسائٹی میں نازل ہوا وہاں اس نے اپنے زمانے کے شعور، ذہن کی سطح، تاریخی روایات، معاشی حالات اور تہذیبی پس منظر کے مطابق ایک خاص شکل اور ایک خاص شریعت اختیار کی۔ اس شکل کو دائمی اور ابدی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت، منہاج اور مناسک کے قوانین اولی الامر کی مرضی پر منحصر ہیں۔ وہ جس قانون کو چاہے مندرجہ بالا وجوہ کی بناء پر منسوخ قرار دے اور جسے چاہے باقی رکھے، باطنیہ کہتے

ہیں کہ احادیث کے بیشتر قوانین اور اصول رسولؐ اللہ نے بحیثیت اولی الامر یا صدر ریاست کے وضع کئے تھے اور وہ وحی نہیں ہیں۔ ان قوانین احادیث کی اہمیت وقتی، مقامی اور عارضی تھی۔ کیونکہ بعد میں آنے والی نسلوں کے لئے اُن کی پابندی کو کہیں بھی گزیر نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ مسلمانوں کے لئے اس باب میں رسولؐ کی سنت کی بجائے اولی الامر کی مرضی اور اس کی بصیرت کے مطابق کئے ہوئے فیصلے سند اور حکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شریعتِ اسلام کے سلسلہ میں پرویز صاحب کا مسلک بھی یہی ہے کیونکہ وہ بھی احادیثِ نبوی کو اس بنا پر کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ حضورؐ نے یہ فیصلے بحیثیت رسولؐ کے نہیں کئے تھے اور یہ اقوال و اعمال حضورؐ کی پیغمبرانہ حیثیت میں جاری نہ ہوئے تھے، بلکہ یہ صدر ریاست اور اولی الامر کے احکامات و اعمال ہیں اور رسول یا پیغمبر کی اطاعت کے ضمن میں اس کی حیثیت اولی الامر کا اتباع ضروری نہیں ہے۔ لیکن عام مسلمان باطنیوں اور پرویز صاحب کے بخلاف یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نے جس دین کی تبلیغ فرمائی اُس کی شریعت کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔

دراصل زمانہ چاہے کتنی ہی کروٹیں کیوں نہ بدلے، اُس کے مزاج اور طبیعت میں کوئی بُنیادی فرق پیدا نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہر زمانہ جُداجُدا ایک اکائی اور الگ الگ وجود نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک وحدت ہے جسے کہیں بھی تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور زمانہ کی اسی یکسانیت کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت بھی غیر متغیر ہے، یہ فطرت ابتدائے آدمیت سے ایک ہی رہی ہے اور آخر تک ایک رہیگی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی رسوم یا قوانین جو شاید حضرت آدمؑ کے زمانے اور انسانیت کے ابتدائی دَور میں وضع کئے گئے تھے۔ اب تک قائم ہیں، آپ کسی قوم یا علاقے کی رسومات، روایات، عادات، اطوار، طور طریق کو دیکھ لیجئے۔ تو یہ معلوم ہوگا کہ اُن کی بیشتر رسومات اور بہت سے طور طریقے نہ صرف پُرانے بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں برس سے جاری و ساری ہیں۔

پھر جب صورت یہ ہو کہ انسانوں کی متعین کردہ معمولی رسومات سینکڑوں اور ہزاروں برس سے قائم و دائم ہیں تو آخر محمدؐ رسول اللہ کی شریعت کو کیا ہو گیا کہ وہ ہزار برس ہی میں منسوخ ہو کر رہ جائے۔ حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا جن لوگوں نے مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس کے بیشتر قوانین ابتدا ہی سے عالمگیر حیثیت رکھتے تھے اور اسی لئے وہ جزو شریعت ہیں۔

پرویز صاحب میں اور باطنیوں کے اصولِ اساسی میں یہ تفکر بھی مشترک ہو کہ تمام معاملات میں "اولی الامر" کی رائے گناہ اور عیب سے پاک سمجھی جائے، اور اس کے سب احکام لوگ بلا چون وچرا مان لیں۔

"طلوعِ اسلام" کے صفحات میں وقتاً فوقتاً بعض ایسے مضامین بھی نکلتے رہتے ہیں کہ اُس میں اولی الامر کے اختیارات کے بارے میں اُسی تصوّر کی نمائندگی ملتی ہے جو زمانہ قدیم کے باطنیوں یا زمانہ حال کے فاسسٹوں کے درمیان موجود تھا۔ ملتِ مسلمہ میں اختلافِ فکر و نظر کے وجود کو پرویز صاحب بھی صحیح نہیں سمجھتے ہیں کہ ساری امت کو متحد کرنے کے لئے ہر طرح کی مذہبی و سیاسی جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے کر صدر ریاست کو غیر محدود اختیارات دینے چاہئیں۔ ہاکنیبھی اپنے حدود میں کسی اور گروہ کو سیاسی یا مذہبی طور پر منظم دیکھنا نہیں چاہتے۔ اور ان کا امیر بھی بالکل ہٹلر کے انداز میں مطلق العنان اور خدائی اختیارات کا حامل ہے۔

باطنیوں نے اولی الامر کے انہی اختیارات کے جواز کے لئے امامت من جانب اللہ، حلول، وغیرہ کے عقائد وضع

گئے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ امامت چونکہ منجانب خدا ہوتی ہے اور امام کو خدا تعالیٰ خاص طور پر منتخب کرتا ہے۔ اس لئے وہ دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں مطلق فضیلت کا مالک ہے اور اس فضیلت کا نتیجہ معصوم عن الخطا ہوتا ہے۔ دوسرے معنوں میں جماعت کا اولی الامر گویا ظلِ الٰہی ہے، کیونکہ اس کی مرضی میں ہمیں خدا کی مرضی نظر آتی ہے۔

اپنے اس نقطۂ نظر کی تقویت کے لئے وہ حلول یا اوتار کے عقیدہ کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صفاتِ خداوندی ہی صدر ریاست کی شخصیت میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہ رائے رکھتا ہو وہ تو اولی الامر کی مطلق اطاعت کا قائل ہی ہوگا۔ کیونکہ اس کے پاس اپنی رائے کی تائید میں صحیح یا غلط کچھ دلائل اور ایک خاص فلسفیانہ پس منظر موجود ہے۔ مگر پرویز صاحب جب امیر کی اطاعت مطلقہ کو ضروری بتاتے ہیں تو اپنے مسلک کی تائید میں صحیح یا غلط کسی قسم کی بھی وہ بنیاد نہیں بتاتے کہ ہم کیوں اس نظریہ کو معقول سمجھیں۔ آخر وہ دلیل کونسی ہے جس کی رُو سے اولی الامر یا صدر ریاست کو آپ اتنے غیر محدود اختیارات کا مالک قرار دیتے ہیں۔ کہ اگر وہ چاہے تو شریعتِ محمدیہ کو منسوخ کر دے، یا اگر وہ مناسب جانے تو اکثریت کے مقابلہ میں صرف اپنی ذاتی رائے کو دو ٹوک فیصلہ کی حیثیت دے دے اور جس کی یہ شان ہو کہ اس کے مقابلہ میں کوئی اختلاف کرنے والا گروہ باقی نہ رہ سکے۔

اگر اولی الامر خدا کا خاص منتخب فرد نہیں ہے اور ہماری ہی طرح کا انسان ہے تو پھر بتائیے کہ اُسے اپنی ذاتی رائے اکثریت پر مسلط کرنے کا کیا حق ہے، پھر جمہور کی مرضی یا اکثریت کے فیصلے سے چُنے جانے والا اولی الامر انتہائی محدود، کم سے کم اور صرف ناگزیر اختیارات اپنے لئے طلب کرکے حکومت کرتا ہے۔ کیونکہ از روئے کتاب و سنّت انسان کی حاکمانہ مطلق العنانی ہی دُنیا کی تمام خرابیوں اور فساد کی جڑ ہے۔ اس لئے اسلام چاہتا ہے کہ غالب جماعت یا فرد کے ہاتھوں میں سیاسی حاکمیت، معاشی استبداد اور معاشی تسلّط انتہائی کم سے کم ہو۔ اسلام کسی ایسے نظام حکومت کی حمایت نہیں کرتا جہاں عوام کی انفرادی آزادی سلب ہو سکے اور جہاں پر ریاست یا صدر حکومت "الٰہ" بن جائے۔ ہیگل، مارکس، اور باطنیوں کے کلیت پسندانہ نظام ہائے حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے بالکل غلط ہیں۔ اس لئے اسلامی حکومت کے صدر غیر محدود اور انتہائی اختیارات کے مالک کبھی نہیں رہے۔

پرویز صاحب اور باطنیہ پہلے تو رسول اللہ کو منصبِ رسالت سے ہٹا کر مقام اولی الامر تک لے آنے کی جسارت کیا کرتے ہیں اور پھر اولی الامر کو منصبِ رسالت سپرد کرتے ہیں تاکہ وہ غیر محدود اختیارات کا مالک اور ایک نیا شریعت ساز بن سکے۔ یہ فکر بالاتفاق مردود ہے اور اسلامی حکومت میں اولی الامر کے اختیارات مطلق اور آزاد نہیں ہیں۔ بلا شبہ نص قرآنی یا سنّتِ رسولؐ کے خلاف اکثریت یا شوریٰ اگر کوئی فیصلہ کر رہی ہو تو امیر کو اُسے مسترد کرنے کا حق حاصل ہے۔ جیسا کہ ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں تنہا اپنی رائے کو درست سمجھا اور اُسے نافذ کیا مگر اکثریت کی رائے کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ کے خلاف نہ ہو اور اختلاف سارا اولی الامر کی ذاتی رائے سے ہو تو بعض انتظامی معاملات میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہ کی اکثریت کے فیصلہ کو درست قرار دیا ہے، جب ذاتِ رسالت مآب کا شوریٰ کے معاملہ میں یہ حال ہو تو دُنیا میں کسی دوسرے کو چاہے وہ اولی الامر ہو یا صدر مملکت یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ وہ ان باتوں کو یک قلم نافذ و جاری کر دے جو مجلس شوریٰ کے نزدیک قطعاً غلط ہوں!

باطنیہ اور معتزلہ کے افکار کی یہ جھلک پرویز صاحب کے خیالات میں اس لئے نظر آتی ہے کہ وہ جن لوگوں سے

متاثر ہیں۔ انہوں نے اپنے ذہنی رجحان اور تفکر کو ترقی دینے میں مندرجہ بالا فرقوں کے نظریات سے بڑی مدد لی تھی۔ مثلاً سرسید کو دیکھئے وہ مغربی طرزِ فکر سے اثر پذیر ہو کر ایک نئے مکتبِ خیال کی بنیاد رکھتے ہیں۔ سرسید نے اگر معتزلہ کے خیالات کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو یقیناً اُن کی وہ مشہور تفسیر منظرِ عام پر نہیں آسکتی تھی۔ جس نے مذہبی طبقہ کو برافروختہ کر دیا تھا۔ سرسید کی اس تفسیر قرآن میں فرشتوں کا انکار، عذابِ قبر کا انکار، حشر و نشر اور معاد و آخرت کی نئی تشریح، روایات و احادیث کے خلاف عدم اعتماد، علماء، فقہا اور محدثین پر تہمت تراشی، غرض وہ سب کچھ ہے جسے ہم معتزلہ کے افکار کا نچوڑ کہہ سکتے ہیں۔

اسے از سرِ نو پیش کرنے کی ضرورت یوں محسوس ہوئی تھی کہ انہوں نے عیسائی پادریوں کی وہ بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی تھیں جن میں اسلام، قرآن، اور سنتِ رسولؐ کو خلافِ عقل اور خلافِ سائنس بتایا گیا تھا۔ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے ساتھ ہی یورپ سے پادریوں کی آمد کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا اور یہ پادری سڑکوں، چوراہوں، اور راستوں پر مجمع لگا کر ہندوستانیوں کے مذہب کو نیچر، عقل اور سائنس کے خلاف ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عیسائی پادریوں کی یہ تبلیغی جدوجہد ہندوستانیوں پر اثر انداز ہوئی اور سب سے پہلے ہندوؤں نے اپنے مذہب کو ترمیم و تنسیخ کے ذریعہ نیچر، عقل اور سائنس کے مطابق ثابت کرنے کے لئے مختلف تحریکات کا آغاز کیا اور ہندوؤں کی دیکھا دیکھی مسلمانوں میں بھی کچھ لوگوں کو یہ شوق چرایا۔ ان لوگوں میں مرزا غلام احمد قادیانی اور سرسید دو بڑی مشہور ہستیاں ہیں۔!

مرزا غلام احمد قادیانی کے پادریوں کے ساتھ بڑے مناظرے رہے ہیں۔ مگر ان مناظروں کی بدولت ان کا ذہن پادریوں سے شکست کھا گیا اور انہوں نے ضرورت محسوس کی کہ مسیح، مہدی، دجال وغیرہ کے متعلق جو احادیث پائی جاتی ہیں انھیں عقل اور نیچر کے مطابق کیا جائے، اور نبوت، وحی وغیرہ کے مسائل پر بھی سائنسی نقطۂ نظر سے نظر ثانی ہو۔ لیکن اس طرح پر تجدیدِ اسلام کی کوشش بالآخر ایک نئی نبوت کے قیام کا ذریعہ بن گئی۔ اور اسلام کو نیچر کے مطابق بنانے کی یہ مہم ملتِ اسلامیہ سے بالکل الگ ایک جداگانہ فرقہ کی صورت اختیار کر کے ختم ہو گئی۔ سرسید نے مرزا غلام احمد قادیانی کے مقابلہ میں زیادہ عقلمندی سے کام لیا۔ انہوں نے اس کی کوشش نہیں کی کہ وہ کسی مستقل فرقہ کے بانی بن جائیں۔ اُن کے اندر یہ داعیہ موجود نہ تھا۔ ہاں! اسلام کو نیچر، سائنس اور عقل سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش بلا مہم اُن کے پیشِ نظر رہی اور اللہ تعالیٰ اُن کی لغزشوں کو معاف فرمائے، اس منزل میں انہوں نے بڑی بڑی ٹھوکریں کھائیں۔ مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ انھیں واقعی خلوص بھی تھا۔ اور عیسائی پادریوں کے اعتراضات کے جواب میں اُن کے جذبۂ حمایت کو موافقت کی یہی ترکیب کارگر نظر آئی کہ جن مسائل کی وجہ سے یہ اعتراضات ہو رہے تھے ان مسائل کے بارے میں معتزلہ کی رائے نقل کر کے مشتہر کر دی جائے اور اُن کی یہ کوشش جدید نوجوانوں کے گروہ پر کافی اثر انداز ہوئی۔

سرسید بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اس کے بھی حامی ہو گئے تھے کہ مسلمان اپنے کلچر اور تمدن کو ترک کر کے یورپین تہذیب کو اختیار کر لیں۔ تہذیب الاخلاق میں وہ لکھتے ہیں کہ ترکیہ نے اپنی قدیم معاشرت و وضع قطع ترک کر دی ہے۔ اب وہ میز کرسیوں پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا کھاتے ہیں۔ بجائے ملنے کے ہاتھ ملاتے ہیں اور کوٹ پتلون پہننے لگے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کو بھی ترکوں کی تقلید میں ایسا ہی کرنا چاہیئے۔ اپنے اس خیال کی وجہ سے انھیں علماء سے بڑی جنگ کرنی پڑی۔ مولویوں کا

کہنا تھا کہ ہر قوم میں کچھ رسومات و روایات ایک خاص تسلسل کے ساتھ جاری و ساری ہوتی ہیں۔ یہ تسلسل توڑ دینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم قوم کو تباہ کر دیں۔ ہر قوم کے لئے اس کا ماضی، مستقبل و حال کی تعمیر کے لئے ایک بنیاد ہے اور ماضی سے اپنا تعلق ختم کر دینے کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم معلق ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر بہت ساری رسومات، روایات اور طور طریق ملی زندگی کے لئے ایک امتیازی نشان اور "Symbols" ہوتے ہیں، ان روایات، رسومات اور طور طریق میں ہمارے بنیادی افکار پنہاں ہیں۔ انھیں مٹانے کے معنی خود اپنے آپ کو مٹا دینے کے ہیں۔ مولویوں کی یہ بات سرسید کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ محض ہمارے قدامت پسند طبقہ اور مولویوں کی جہالت ہے۔ مگر حقیقتاً ان لوگوں کے علاوہ اکبر الہ آبادی، ڈاکٹر نذیر احمد اور دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ افراد بھی سرسید کے مخالف تھے۔ کیونکہ کسی بھی قوم کا ذہین اور خود دار طبقہ اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کو یوں آسانی سے خودکشی کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس لئے سرسید کی تحریک بحیثیت مجموعی ناکام ہو گئی۔ مگر چونکہ برطانوی راج کی مصلحتیں اس تحریک کے ساتھ وابستہ تھیں، اس لئے آزادی ہند تک یہ مسلک کسی نہ کسی طرح زندہ رہا۔ اور اب سمٹ سمٹا کر ہماری سوسائٹی کے ایک خاص طبقہ میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ مگر عوام پرانی تہذیب، پرانے کلچر کو ختم کرنا نہیں بلکہ اُسے ترقی دینا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قدیم شریعت کی تجدید کے مطالبے سُنتے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ مطالبے اُن لوگوں پر گراں ہی گزریں گے جو آج بھی سرسید کے طرزِ فکر کو اپنائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "طلوعِ اسلام" مسلمانوں کی اس کوشش کو پسند نہیں کرتا ہے جو وہ اسلامی دستور کے سلسلہ میں کر رہے ہیں۔

مگر ہم کو یہ حقیقت بہر حال اب سمجھ لینی چاہیئے کہ ایک مسلمان ہی کیا دُنیا کی کسی بھی قوم کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی قدیم شریعت اور قدیم فقہ کا گلا گھونٹ کر آگے بڑھ سکے، بدقسمتی سے ہمارے نوجوانوں کی ایک جماعت ترقی کا مطلب یہ سمجھنے لگی ہے کہ ایک قوم اپنے سینکڑوں برس کی تاریخ و تہذیب کو یک قلم منسوخ قرار دے اور مذہبی، معاشرتی، تاریخی و جغرافیائی زندگی سے جو رشتہ ہمارا قدیم نظامِ زندگی رکھتا ہے، اسے سمجھے بغیر پرانے نظام کے چہرے پر خطِ نسخ پھیر دیا جائے۔ یہ ذہنیت جس کی ابتداء سرسید نے کی تھی عمرانیات کی تاریخ سے ناواقفیت کا سبب اور عقلی جدت طرازیوں کا پیدا کردہ کھلونا ہے اور اس سے ہمارا مغربی تعلیم یافتہ طبقہ بہت زمانے سے دل بہلا رہا ہے۔

کسی بھی شے کو ترقی دینے کے معنی اس کے وجود کو قائم رکھ کر مزید نکھار پیدا کرنے کے ہیں، نہ یہ کہ سرے سے اس کا وجود ہی ملیا میٹ کر کے رکھ دیا جائے، پس کسی تہذیب کی ترقی کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اس تہذیب کی خصوصیات باقی رہیں اور اس کے حسن میں کچھ اضافہ ہو جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہم اپنی تہذیب پر تبرا بھیجنے لگیں اور اس کے حریف بن جائیں۔ ہر قوم کی ایک مخصوص طبیعت اور فطرت ہے، جو تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی مظاہر میں گھل مل کر رفتہ رفتہ پرورش پاتی رہتی ہے اور برسہا برس کے تاریخی، جغرافیائی و نفسیاتی عوامل کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے جو کسی ایک معاشرے کی تخلیق کر کے اسے اکثر پہلوؤں اور اکثر اعتبارات سے ایک قطعی شکل دیتا ہے، اس معاشرے اور تہذیب کا خاتمہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی قومی فطرت و جبلت کو قتل کر دیں اور صدہا برس کے عوامل کو نظر انداز و فراموش کر کے تہذیبی اعتبار سے دیوالیہ اور بربلا ہو جائیں۔ اگر یہ حقیقت سرسید سمجھ لیتے تو پھر نہ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے جواز کا فتویٰ دیتے اور نہ ہندوستانی مسلمانوں کو چھری چمچوں کانٹوں اور میز کرسیوں کے استعمال کا فلسفہ سکھاتے، اس کے مقابلہ میں ہمارے پاس کے مولوی کی آپ چاہے کتنی ہی بُرائی کیوں نہ کریں۔ مگر اس کی یہ حقیقت پسندی تو واقعی قابلِ داد ہے کہ اس نے ترقی کی محض خیالی اُڑان اور چھلانگ کی خاطر یہ بات کبھی نہیں بھولی کہ

قومی تہذیب اور قومی تمدن کے ساتھ اُس کا رشتہ ایسا نہیں ہے کہ جب وہ چاہے اسے طلاق دیدے۔ اپنی اسی خوبی کی بدولت "مولوی" مغرب زدہ طبقہ میں ملامت کا مستحق سمجھا گیا تھا۔

سرسید کے بعد مولوی کو گالیاں دینے کی تحریک ایک عرصہ تک رُکی رہی اور اس کا دوسرا دَور علامہ مشرقی کی صورت میں جاری ہوا۔ علامہ مشرقی اصل میں سرسید کا نیا روپ تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اُن کی تحریک سرسید سے زیادہ منظم اُن کے افکار سرسید کے افکار سے زیادہ مدلّل بھی تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ صاحب کی معرکتہ الآراء کتاب تذکرہ کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہے، تذکرہ کا ایک ایک لفظ مشرقی صاحب کی محنت اور مطالعہ کی وسعت کا ثبوت دیتا ہے، اس کتاب میں علماءِ دین کے طرزِ فکر کو انتہائی ہوشیاری اور تدبیر کے ساتھ رد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تذکرہ کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات ہیں :-

(۱) ہمارے لئے صرف قرآن کافی ہو اور قرآن کو سمجھنے میں اسلامی تاریخ، روایات، حدیث، فقہ اور لغت کی مدد ہرگز نہ لی جائے کیونکہ قرآن اپنا شارح آپ ہے اور تاریخ، روایات، حدیث، فقہ و لغت کی تشکیل کرنے والے سب عجمی سازش کا شکار رہے ہیں اس لئے ان کی مدد سے قرآن کو سمجھنا گمراہی ہوگی۔

(۲) مطالعہ قرآن سے پہلے ہمیں اس کی اصطلاحوں کی تعریف (Defination) طے کر لینی چاہیئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی اصطلاحات قرآن میں جہاں جہاں استعمال ہوئی ہیں انہیں دیکھا جائے اور پھر اس کا ایک ایک مطلب تعین کر دیا جائے اور یہ مطلب یا معنی قطعی سمجھ لئے جائیں۔

(۳) قرآن اور موجودہ یورپی سائنس کے اصولوں میں اتنا تطابق پیدا کیا جائے کہ قرآن و سائنس "من دیگرم تو دیگری" کو خیرباد کہہ کر "من تو شدم تو من شدی" ہو کر رہ جائیں۔

(۴) حضور اکرمؐ نے قرآن کو نافذ کرنے کے لئے چند مخصوص اوزارِ عمل وضع کئے تھے۔ ان اوزارِ عمل کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کئے جائیں۔ کیونکہ از روئے قرآن صرف دین کے بنیادی عقائد دائمی و ابدی ہیں، نہ کہ اُن کا اُوپری لباس مطمح نظر ہے۔

(۵) پُوری ملت کی تنظیم جدید اس اصول پر ہو کہ ان کا اولی الامر غیر محدود اختیارات کے ساتھ ملت پر حکمرانی کرے اور یہ حکمران ایک ایسی ریاست کو بروئے کار لائے گا جو معاشرہ اور افراد کی زندگی کے تمام شعبوں پر کلیتاً قابض و متصرف ہوگی

علامہ مشرقی کے یہ اصول ہائے پنجگانہ جب علمائے معاصرین کے درمیان زیرِ بحث آئے تو لوگوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ تذکرہ بھی باوجودیکہ بظاہر زیادہ مدلّل اور معقول نظر آتا ہے۔ مگر اس میں بھی سرسید کی پُرانی ذہنیت کارفرما ہے اور علامہ مشرقی کے اصولوں کو مان لینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اسلامی اساس ہی کو کھود کر پھینک دیں!

علماء کا استدلال یہ تھا کہ اگر مسلمان مورخین، راویوں، محدثین، فقہا اور اہلِ لغت حضرات کو عجمی سازش کا نمائندہ سمجھا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہماری قوم ابتدا ہی سے غداروں اور احمقوں پر مشتمل رہی ہے۔ کیونکہ جس قوم کے محدثین کرام، فقہائے عظام، مؤرخین اور اہلِ لغت حضرات سب کے سب سازشی ہوں یا سازشیوں کے آلہ کار ہوں۔ اس قوم کے قرآن کا بھی کیا بھروسہ ؟ کہ وہ بھی کہیں "عجمی سازش" کا شکار نہ ہو گیا ہو۔ دُوسرے معنوں میں یہ طریقِ فکر دانستہ یا نادانستہ ملتِ مُسلمہ کی تاریخی اہمیت اور عظمت کا انکار کر کے اُسے سازشیوں اور سازشی جماعت کا نام دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے

کوئی بھی عقل مند آدمی صحیح نہیں تسلیم کرے گا۔ بلاشبہ یہ تو ممکن ہے کہ ہم میں انفرادی طور پر کچھ لوگ غدار پیدا ہوئے ہوں۔ یا غیر شعوری طور پر بعض بزرگ بیرونی طاقتوں کے مفاد کا آلہ کار بن گئے ہوں۔ مگر یہ سمجھنا کہ پوری ایک قوم مع اپنے تمام بزرگوں اور اہل علم کے کسی سازش کی علمبردار یا آلہ کار رہی ہو۔ کس قدر غلط ہے۔

علماء کو علامہ مشرقی کی اس حرکت پر بھی اعتراض تھا کہ انہوں نے قرآن کے بارے میں یہ حقیقت نظر انداز کردی کہ اس میں ایک ہی لفظ متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے، دراصل یہ صرف قرآن ہی نہیں بلکہ ہر زبان اور خاص طور سے عربی کی ایک خصوصیت ہے کہ روزمرہ بولی اور لکھی جانے والی زبان میں ہر لفظ سیاق و سباق کے اعتبار سے مختلف معانی پیدا کرتا ہے اس حقیقت کو بھول کر قرآنی الفاظ کے ہر جگہ ایک ہی معنی متعین کرنا غلط ہے، قرآن سائنس یا کسی مخصوص علم و فن کی کتاب نہیں ہے کہ اس میں ایک لفظ باقاعدہ ایسی اصطلاح ہو کہ فلسفہ کی طرح جس کی تعریف طے کرلی جائے، یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وحی، جنت وغیرہ کے الفاظ قرآن میں مختلف جگہ پر مختلف معانی میں آئے ہیں۔ کہیں یہ لفظ "جنت" باغ کے لئے استعمال ہوا ہے اور کہیں مادی یا معاشی خوشحالی کے معنوں میں بھی۔ مگر جب جنت کا ذکر قرآن آخرت کے ضمن میں کرتا ہے۔ وہاں پر قیامت کے بعد کی بہشت ہی مراد ہے، اسی طرح وحی کا نزول شہد کی مکھی پر بھی قرآن سے ثابت ہے۔ اور حضور اکرم پر بھی لیکن ان دونوں مقامات میں وحی کا لفظ بالکل الگ الگ معنی رکھتا ہے۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص مومنین کی جنت کو اس معنی میں لے جس معنی میں " فاخرجنٰھم من جنٰت و عیون و کنوز و مقام کریم " پھر نکال باہر کیا ہم نے ان کو جنت اور چشموں سے اور خزانوں اور عمدہ مکانوں سے" تو یہ ایک فاش غلطی اور غلط ترجمانی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص محمد رسول اللہ کی وحی کو وہی شے سمجھتا ہے جو مکھی کو حاصل ہے تو یہ گمراہ ذہنیت ہوگی۔ کیونکہ الفاظ گو سب جگہ ایک ہی استعمال ہوئے ہیں مگر سیاق و سباق کے اعتبار سے معانی مختلف ہیں۔ اس نکتہ کو فراموش کردینے کا نتیجہ تھا کہ علامہ مشرقی نے قرآنی الفاظ کی نئی لغت تیار کی۔ اس لغت میں جنت کے معنی مادی و معاشی خوشحالی، جہنم کا مطلب مادی و معاشی تباہی، تقویٰ کے معنی اتحاد و ہم آہنگی، صالح کے معنی قوی اور طاقتور اور کافر کا مطلب مغلوب و کمزور، آخرت کے انسانی مستقبل کے ہیں۔ اسی طرح دوسرے الفاظ قرآنی کے بھی عجیب و غریب معنی و مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ اور قرآن پر جس شخص کی نگاہ ہو وہ ان معانی و مطالب کو کبھی درست نہیں جان سکتا۔

پھر قرآن و سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں انہوں نے قرآنی آیات سے ڈارون کے نظریہ ارتقاء، نیوٹن کے نظریات، اور دوسرے یورپی مفکرین اور سائنس دانوں کے تراشے ہوئے نتائج ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں تک نظریہ ارتقاء کا تعلق ہے اس سے پیشتر ابن مسکویہ اور فارابی وغیرہ نے بھی قریب قریب یہی نظریہ ارتقاء پیش کیا تھا۔

انسان کی حیاتیاتی ارتقاء کے اس نظریہ کی قرآن سے تصدیق یا تکذیب ناممکن ہے۔ کیونکہ حیاتیات قرآن کا موضوع بحث نہیں ہیں۔ پھر ڈارون کے معاملہ کا جہاں تک تعلق ہے تو اس کے نظریہ کے سائنسی نتائج کے ساتھ ذاتی قیاسات اور نظریات کی بھی آمیزش کردی گئی ہے۔ اور پھر ارتقاء کے بارے میں ڈارون کا مطالعہ بھی نامکمل اور یک رخی رہا ہے۔ اسی لئے لامارک کے پیرو ڈارون سے مختلف خیال رکھتے ہیں اور برنارڈ شا نے تو ڈارون کو کافی برا بھلا کہا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اسے سولی کا مستحق سمجھتا تھا۔

ابھی حال ہی میں برگسان کے بعد ڈارون ازم کی روشنی پھیکی پڑگئی ہے۔ یہی حال نیوٹن کا ہے۔ آئین سٹائین کی تصور

نیوٹن کے بہت سے خیالات کو غلط ثابت کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ قرآن سے ان غلط خیالات، مشکوک نظریات اور مُشتبہ تھیوریوں کی تصدیق کا کام لینا اس کا بدترین استعمال ہے، ہمیں چاہیئے کہ سائنس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ جہاں تک علم سائنس کے نفسی پہلو کا تعلق ہے اُس میں آج تک کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو گی جو قرآن کے مخالف ہو۔ البتہ سائنس کا قیاسی و نظریاتی پہلو جو ہر دور میں ادلتا بدلتا رہتا ہے اور جو کتاب و سنّت کے خلاف جا سکتا ہے۔ اُس میں اور کتاب و سنّت میں نہ مطابقت دی جا سکتی ہے اور نہ اس کوشش میں وقت ضائع کرنا چاہیئے۔ یہ راہ بڑی پُرخطر ہے!

علامہ مشرقی اور ان کے ہمنواؤں کی اس علمی جد وجہد کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشادات واقعی خوب ہیں وہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:-

"آج کل ہندوستان اور مصر کے بعض دانش فروشوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جو خود انھی کے لفظوں میں یہ ہے کہ زمانۂ حال کے "اصول علم و ترقی" قرآن سے ثابت کئے جائیں یا بقول اُن کے فلسفہ و سائنس اس کی ہر ہر آیت میں بھر دیا جائے۔ گویا قرآن صرف اسی لئے نازل ہوا تھا کہ جو بات کوپرنکس اور نیوٹن نے یا ڈارون اور ویلیس نے بغیر کسی الہامی کتاب کے اپنی فلسفہ اندیشیوں کے ذریعہ دریافت کر لی ان باتوں کو چند صدی معموں اور بجھاوتوں کی طرح دنیا کے کان میں پھونک دے اور پھر وہ صدیوں تک دُنیا کی سمجھ میں نہ آئیں اور اب موجودہ زمانے کے مفسر پیدا ہوئے اور وہ تیرہ سو برس پیشتر کے معمے حل فرما رہے ہیں"

ان لوگوں سے مخاطب ہو کر مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں:-

"کہ تم صحیح علم کی ایک ذراسی نمود دیکھ کر مرعوب ہوتے ہو اور چاہتے ہو کہ قرآن کو فوراً اس کی جگہ سے ہٹا دو۔ لیکن اگر تم جلدی نہ کرو تو قرآن کو ہلنے کی ضرورت کبھی نہ ہو گی جلد یا بدیر علم اپنی جگہ چھوڑے گا اور آگے بڑھ کر قرآن کی تصدیق کرے گا"

علامہ مشرقی کے اس نظریہ پر کہ "قرآن و سائنس کو ہم آہنگ کیا جائے" یہ بہترین تبصرہ ہے۔ اور حیرت تو اس پر ہے کہ اس نظریہ کا کھوکھلا پن اہل علم اور ارباب فکر پر پُوری طرح ظاہر ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی کچھ ایسے لوگ مسلمانوں میں اب تک پلے جاتے ہیں، جو اس نظریہ کو درست مانتے ہیں اور اپنی ضد پر قائم ہیں۔

علاوہ ازیں علامہ مشرقی صاحب کا یہ فرمانا کہ ملّت کو پُرانے اوزارِ عمل خیر باد کہہ کر نئے اوزار عمل اختیار کرنے چاہئیں اور قدیم شریعت کو ترک کر کے اپنے لئے نئی شریعت تشکیل دینا ہو گا۔ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ اوزارِ عمل قیامت تک ناکارہ و فرسودہ نہیں ہوں گے اور دین کے ساتھ اس کا اُوپری خول اور لباس بھی ضروری ہے۔ کیونکہ وہ اس میں جڑا ہوا اور محفوظ ہے۔

ما ز قرآں مغز را برداشتیم　　　استخواں پیشِ سگاں انداختیم!

کے رجحان کو ملّتِ اسلامیہ نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا کہ قرآن اپنے الفاظ و معانی کے اعتبار سے سراپا مغز و جوہر ہی واقع ہوا ہے، اس کا ایک حرف بھی ایسا نہیں ہے جس کے معنی سے کوئی "مغز" کو چن لے اور استخوان نا اہلوں کیلئے

چھوڑ دے! باقی رہی "اولی الامر" کی بات۔ تو یہ ہٹلر کے انداز میں ایک نئے "قرآنی نازی ازم" کو فروغ دینے کی بات ہے جس کو مسلمان کا حریت پسند مزاج کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اور اس دورِ جمہوری میں تو یہ سب سے زیادہ مضحکہ خیز اور بے وزن بات ہے ـــــ اِن تحریکات پر اجمالی تبصرہ کے بعد ناظرین سمجھ گئے ہوں گے کہ پرویز کے افکار و خیالات کا "شجرۂ نسب" کیا ہے؟ معتزلہ کی تحریک، باطنیہ کے عقائد، سرسید احمد خاں کے خیالات، اور علامہ مشرقی کے افکار۔ جو چند دن کی شور اشوری کے بعد اپنی موت آپ مر گئے۔ اُنہی کے بطن سے پرویزیت اور ادارۂ طلوعِ اسلام نے جنم لیا ہے!

ادارۂ طلوعِ اسلام نے تو ایک زمانہ میں خاکسار تحریک کا باقاعدہ ساتھ دیا تھا اور اُس کی پُرجوش حمایت کی تھی۔ نجانے اُن دنوں پرویز صاحب ادارۂ طلوعِ اسلام سے متعلق تھے یا نہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ علامہ مشرقی سے وہ مرعوب اور متاثر ہیں۔ اور علامہ مشرقی کا "تذکرہ" اُن کی تحریروں کا سب سے بڑا مآخذ اور منبع ہے! لیکن پرویز صاحب کی علمی دیانت (؟) کا یہ عالم ہے کہ اپنی تحریروں میں اپنے اس مآخذ کا حوالہ نہیں دیتے مگر اس قسم کے لباس پہننے سے کہیں "اندازِ قد" چھپ سکتا ہے!

پرویز صاحب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے ہم اپیل کریں گے کہ وہ ایک بار علامہ مشرقی کے "تذکرہ" کو پڑھ کر دیکھ لیں تو اُن کو پتہ چلے گا کہ اُن کی تحریریں نہ صرف ذہنی و فکری بلکہ الفاظ و اصطلاحات کے لحاظ سے بھی "تذکرہ" کی نقل اور عکس ہیں! اُنہی مستعار خیالات پر پرویز صاحب کو قرآنی معارف کے جاننے اور سمجھنے کا دعویٰ ہے۔ ہمیں پوری اُمید ہے بلکہ اطمینان ہے کہ پرویز صاحب کی تحریک انشاءاللہ چند دن میں اپنی موت آپ مر جائے گی، ایسی ہوائی باتیں زیادہ دن تک چل نہیں سکتیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ علامہ مشرقی کے افکار و عقائد بھی بس تھوڑی سی نمود دکھا کر قیامت کی نیند سو گئے!

عبد الرحمان حماد
استاذ جامعہ دار السلام عمر آباد
(مدراس)

مولانا مسعود عالم ندوی سے میری پہلی اور آخری ملاقات

طالب العلمی کے زمانہ ہی سے کان استاذ محترم المقام مولانا مسعود عالم ندویؒ کے نام سے آشنا تھے، ادب عربی کا ذوق تو بحمداللہ ابتدا سے موجود ہے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتے وقت ہی عربی زبان سے اُنس اس قدر زیادہ تھا کہ چاہے سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے لیکن عربی کی بڑی بڑی کتابیں اور رسالے پڑھنا میرا بہت ہی دل چسپ مشغلہ تھا۔ عمر لائبریری عمر آباد میں جہاں بہت سی فنی و علمی کتابیں موجود ہیں عربی رسائل و اخبارات کے بے شمار فائل بھی ہیں۔ ایک دن اچانک میری نظر ایک مجلّد فائل پر پڑی۔ جس پر "الضیاء" لکھا ہوا تھا۔ لپک کر اٹھا لیا۔ کھولا تو عربی کا ماہنامہ "الضیاء" تھا۔ یہ معلوم کر کے میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ رسالہ مصر و شام کی بجائے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں نکلتا ہے۔ اس کے بعد میں بڑے چاؤ کے ساتھ الضیاء کا مطالعہ کرنے لگا۔ کوئی مضمون سمجھ میں نہ آتا تو اسے بار بار پڑھتا۔ اور کسی طرح اُسے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

مدیر الضیاء سے غائبانہ تعارف کے یہ نقوش اوّلین تھے۔ جو دل پر اس طرح مرتسم ہو گئے کہ پھر کبھی دھندلے نہیں ہونے پائے۔ الضیاء کا مطالعہ کرتے وقت میں یہ سوچا کرتا تھا کہ جس کو عربی ادب پر اس قدر عبور حاصل ہو اس کے اُردو ادب میں کتنی حلاوت نہ ہو گی۔ چنانچہ جہاں کہیں مولانا مسعود عالم کا اُردو مضمون نظر سے گزرتا، اُسے پڑھے بغیر نہ رہتا۔ "الفرقان" کے شاہ ولی اللہ نمبر میں مولانا کا ایک پُر مغز اور محققانہ مضمون بعنوان "شاہ ولی اللہ سے پہلے ہندوستان کی حالت" شائع ہوا تھا۔ اس کو پڑھا تو مولانا کے فضل و کمال کا مزید احساس ہوا۔ یہی موقعہ تھا جب کہ غائبانہ تعارف غائبانہ عقیدت کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔

۱۳۷۳ھ میں جامعہ دار السلام عمر آباد سے علوم دینیہ کی تکمیل و فراغت کے بعد جامعہ قاسم العلوم متعلقہ انجمن خدام الدین شیرانوالہ دروازہ لاہور پہنچ کر حضرت الاستاذ مولانا احمد علی صاحب مدظلہ سے معارف قرآنی اور سلوک باطنی کی تربیت پاتا رہا۔ جامعہ قاسم العلوم کے دورانِ قیام میں برابر میرا یہ معمول رہا کہ فرصت کے اوقات میں پابندی سے دفتر کوثر پہنچ جایا کرتا اور مدیر کوثر "عزیز ملت" سے اصولِ صحافت کی واقفیت حاصل کرتا اور ہفتہ واری اجتماع میں تو بلا ناغہ بالالتزام شریک ہوا کرتا۔ ایک دن اجتماع کے موقع پر عزیز صاحب نے یہ نوید جانفزا سُنائی کہ مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی خدمات بالکلیہ جماعتِ اسلامی کے سپرد کر دی ہیں اور وہ بہت جلد خدا بخش لائبریری سے سبکدوش ہو کر لاہور تشریف لانے والے ہیں۔ یہ خوشخبری سن کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی اور میں نہایت بیتابی کے ساتھ مولانا کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اپنے دیرینہ رفیق اور بچھڑے ہوئے دوست کے لئے چشم براہ ہوتا ہے۔ ایک دن دوپہر کے وقت چلچلاتی ہوئی دھوپ میں شیرانوالہ گیٹ سے دفتر کوثر واقع گوالمنڈی پہنچا۔ تحیت و سلام کے فوراً ہی بعد مولانا نصر اللہ خاں صاحب نے پُر شوق لہجہ میں فرمایا۔ مولانا مسعود عالم صاحب آ گئے ہیں۔ اور سہولت کے خیال سے نیچے کے کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ دل نے بے ساختہ کہا ؏

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم!

اطلاع پاکر عزیز صاحب سے میں نے پوری طرح گفتگو بھی نہیں کی اور وفورِ شوق میں اُلٹے پاؤں سیدھا مولانا مسعود عالم
[کی قیا]م گاہ پہنچا۔ کمرے میں داخل ہو کر جیسے ہی میں نے سلام کیا مولانا نے بڑی خندہ پیشانی سے جواب دیا اور اس طرح ملاقات
[کی ج]یسے مدت سے راہ رسم اور آشنائی ہے۔ میں نے کہا مولانا آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ غائبانہ تعارف تو عرصہ
[سے] حاصل ہے لیکن اب ملاقات کے بعد یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم اس سے پہلے بارہا مل چکے ہیں۔ فرمانے لگے۔
"[الار]واح جنودٌ مجندۃ فما تعارف منہا ائتلف فما تناکر منہا اختلف" کیوں نہ ہو، آپ سے مل کر خود
[مجھے] بھی یہی حال ہے اور میرا تأثر بھی وہی ہے جو آپ کا ہے"۔
پہلی ہی ملاقات میں یہ کلمات شفقت اور مخلصانہ گفتگو سن کر مجھے جس قدر شادمانی ہوئی اس کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے
[ج]سے کسی سے عقیدت و محبت ہو اور اسے خلوص و نیاز کا جواب محبت و شفقت کی شکل میں ملے۔ مولانا کی زبانی یہ پُرخلوص الفاظ
[سنے ہو]ئے آج تقریباً دس سال ہو رہے ہیں۔ لیکن ان الفاظ کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ عرصہ دراز کے بعد آج بھی وہ الفاظ میرے کانوں
[میں گو]نج رہے ہیں۔ مولانا کئی دن تک دفتر کوثر میں رہے، اُن کی شخصیت میں اس قدر مقناطیسیت اور کشش تھی کہ میں ہر وقت
[ان] کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا۔ تھوڑی دیر کی جدائی بھی مجھے شاق گزرتی تھی۔ انہی دنوں ابوسعید بزمی صاحب سابق مدیر
"[احسان]" بھی دفتر کوثر ہی میں عزیز صاحب کے مہمان تھے۔ عموماً مغرب یا عشاء کے بعد ہم سب مل کر بیٹھتے تھے اور بڑی دلچسپ
[مجل]سیں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا مسعود عالم کے سنجیدہ علمی مباحث، نصر اللہ خاں صاحب کی بذلہ سنجی اور بزمی صاحب کے لطائف
[و ظر]ائف سے ہماری مجلسیں زعفران زار بن جایا کرتی تھیں۔ گفتگو کے دوران میں کبھی کبھی مدراس کی اُردو کا کوئی محاورہ میری زبان
[سے نک]ل جاتا تو وہ سب بے حد محظوظ ہوتے اور بڑا لطف محسوس کرتے۔
ایک دن حسب معمول ہماری مجلس جمی ہوئی تھی اور سب یارانِ حلقہ اکٹھا تھے۔ مولانا مسعود عالم فرمانے لگے۔ آج زیادہ دیر بیٹھنا میرے لئے
[مشک]ل ہے۔ کیونکہ صبح سے جسم میں بے حد درد ہے۔ میں نے فوراً مدراسی محاورہ کے مطابق عرض کیا۔ "مولانا گھبرائیے نہیں میں آپ کو رگڑ دونگا"
[(یعنی آپ] کا جسم دبا دوں گا) آپ کو آرام آجائے گا۔ پھر نہ صرف یہ کہ آپ ہمارے ساتھ بیٹھ سکیں گے بلکہ اطمینان سے سو بھی سکیں گے، میری
[یہ گز]ارش سن کر سب نے بڑا لطف اٹھایا۔ عزیز صاحب مسعود صاحب سے مخاطب ہو کر بار بار فرمانے لگے۔ لیجئے صاحب آپ کے رفیق
[ہی رفا]قت کا حق اس طرح ادا کریں گے کہ آپ کو خوب رگڑ دیں گے۔ بہرحال یہ لطیفہ خوب رہا۔ چونکہ مرطوب آب و ہوا تنفس کے مریض کے
[لئے ب]ڑی تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے مولانا تھے دمہ کے پرانے مریض، لاہور کی آب و ہوا کے بارے میں احباب اور مریض کی رائے یہ تھی
[کہ] وہ مرطوب ہے، اس لئے سب کی صلاح یہ ٹھہری کہ لاہور میں مولانا مسعود عالم کا قیام کسی طرح مناسب نہیں۔ مختلف مقامات سامنے
[آئ]ے۔ بالآخر قرعۂ فال سرزمین جالندھر کے نام پڑا۔ اور مولانا لاہور سے جالندھر منتقل ہو گئے اور مولانا سے یہ پہلی جدائی میرے
[لئے ا]سی قدر تکلیف دہ ثابت ہوئی جس قدر موصوف کی پہلی ملاقات سے مجھے مسرت حاصل ہوئی تھی۔ چونکہ جامعہ قاسم العلوم سے فراغت
[حاص]ل ہونے میں دن بھی چند باقی رہ گئے تھے، اس لئے مولانا کی دعوت اور خواہش کے باوجود اس وقت میں ہمراہ نہ جا سکا۔ البتہ یہ خیال
[ضرور] تھا کہ لاہور کی مصروفیات ختم ہونے کے بعد پہلے دار السلام پٹھان کوٹ جا کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ کچھ دن گزاروں،
[اور ان] کے سرچشمۂ علم و فضل سے فیضیاب ہوں تو پھر مولانا مسعود عالم کی خدمت میں پہنچوں۔
ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جالندھر سے مولانا مسعود عالم کا شفقت نامہ موصول ہوا۔ جس میں مولانا نے محبت بھرے
[الفا]ظ میں ملاقات کا ذکر فرمانے کے بعد مجھے جالندھر آنے اور علمی و دینی خدمات میں تعاون کرنے کی دعوت دی تھی۔ اپنے طے کردہ

پروگرام کے مطابق میں نے جواب دے دیا کہ میں آؤں گا اور ضرور آؤں گا۔ لیکن پہلے دارالاسلام پہنچکر پھر خدمت گرامی میں پہنچ جاؤں گا۔ اور مولانا مودودی صاحب کی خدمت میں بھی ایک عریضۂ شوق میں نے اسی مفہوم کا تحریر کر دیا کہ میں دارالاسلام آنا چاہتا ہوں۔ طفیل محمد صاحب نے مولانا مودودی صاحب کی طرف سے جواب دیا کہ "آپ جب چاہیں شوق سے آسکتے ہیں اور دارالاسلام کے مہمان خانے میں ٹھہر سکتے ہیں"۔ میں جواب پا کر دارالاسلام جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اتنے میں لاہور کمشنری کے ششماہی اجتماع کے انعقاد کی اطلاع ملی۔ چونکہ اجتماع میں میری شرکت بھی ضروری تھی۔ منتظمین میں مجھے بھی شامل کر لیا گیا تھا اور رُوداد نویسی بھی میرے ہی ذمہ تھی۔ اس لئے میں نے اجتماع کے بعد دارالاسلام جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وقت مقررہ پر اجتماع منعقد ہوا۔ مرکز سے مولانا مودودی صاحب اور طفیل محمد صاحب بھی اجتماع میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ اجتماع ختم ہونے کے بعد مولانا مودودی صاحب سے میں نے عرض کیا کہ آپ کی طرف سے تو دارالاسلام آنے کی اجازت مجھے حاصل ہو گئی ہے، دیر صرف اجتماع کے ختم ہونے کی تھی اس سے بھی فارغ ہو چکا ہوں۔ اب میں بالکل پابہ رکاب ہوں۔ فرمانے لگے۔ "آپ کی خواہش کے پیش نظر میں نے آپ کو دارالاسلام آنے کی اجازت دے دی ہے اور وہ اجازت بہرحال قائم ہے۔ لیکن آپ کی صلاحیتوں کے پیش نظر آپ کو میرا ذاتی مشورہ یہ ہے کہ آپ مولانا مسعود عالم ندوی کے پاس جالندھر چلے جائیں"۔ میں نے کہا "جالندھر تو میرے پروگرام میں شامل ہے لیکن دارالاسلام کے بعد"۔ فرمایا۔ "نہیں پہلے آپ جالندھر چلے جائیں، اس کے بعد دارالاسلام آجائیں۔ اس لئے کہ مرکز میں جتنے بھی لوگ ہیں وہ جماعتی کاموں میں بے حد مصروف رہتے ہیں۔ ہم لوگوں سے استفادہ کا زیادہ موقع آپ کو نصیب نہ ہوگا۔ مبادا آپ وہاں آکر دل برداشتہ ہو جائیں۔ اس لئے میری یہ رائے آپ کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگی کہ آپ مولانا مسعود عالم صاحب کے ساتھ رہیں۔ وہ خود بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ آپ اُن کے پاس رہیں۔ اُن کو زیادہ مصروفیت بھی نہیں ہے، وہ پوری توجہ سے آپ کی تربیت فرمائیں گے اور آپ زیادہ سے زیادہ اُن سے فیض حاصل کر سکیں گے۔ وہاں جب آپ کی تکمیل ہو جائے گی تو پھر آپ کا دارالاسلام آنا بھی سودمند ہوگا۔ اُس وقت ہماری ذراسی توجہ سے بھی آپ بہت کچھ حاصل کر سکیں گے اور بہت ممکن ہو اُس وقت تک تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں آجائے، اور سفر دارالاسلام آپ کے لئے گوناگوں فوائد کا حامل ثابت ہو"۔

مولانا مودودی صاحب کے مشورہ پر میں نے غور کیا تو فی الواقع یہی میرے لئے مفید بھی نظر آیا۔ چنانچہ میں نے مولانا کے مشورہ کو بطیب خاطر قبول کر لیا اور اُن سے وعدہ ہو گیا کہ میں مولانا مسعود عالم ہی کے پاس چلا جاؤں گا۔ اور مولانا مسعود صاحب کو بھی اطلاع کر دی کہ میں آپ کی خدمت میں بہت جلد حاضر ہونے والا ہوں۔ محبت سے لبریز جواب آیا کہ فوراً چلے آئیے۔ نیک کام میں دیری کیسی، آپ کا انتظار رہیگا۔ یہاں آپ کی سخت ضرورت ہے"۔

چنانچہ ایک دن شام کو میں لاہور سے جالندھر روانہ ہو گیا۔ اُس زمانہ میں ٹرینوں میں بے حد رش رہتا تھا (اپنے حقیقی مفہوم میں)، تِل دھرنے کو بھی جگہ نہیں رہتی تھی۔ اسٹیشن اگرچہ وقت سے کافی پہلے پہنچ گیا تھا مگر اس کے باوجود کسی بوگی میں بھی جگہ نہیں مل سکی۔ ناچار ایک زنانہ بوگی میں اپنا اسباب رکھ دیا۔ اور سامان خدا کے حوالے کر کے میں دوسری بوگی کے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ سردی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ وہ خوفناک رات مجھے اب تک یاد ہے، کئی بار میں نیچے گرتے گرتے بچا۔ ہاتھ چھوٹ چھوٹ جاتے۔ لیکن پھر میں جلد کسی طرح سنبھل جاتا۔ کافی فاصلہ مجھے اسی طرح طے کرنا پڑا تھا۔ مولانا مسعود عالم صاحب کی رفاقت کا تصور میرے لئے اس قدر خوش آئند اور نشاط انگیز تھا کہ جو زحمت و تکلیف مجھے جالندھر روانہ ہوتے وقت پہنچی، وہ عین راحت محسوس ہو رہی تھی۔ نصف شب کے قریب میں جالندھر پہنچا۔ چونکہ پہلی مرتبہ وہاں جانے کا اتفاق

تھا۔ راستوں سے واقفیت نہیں تھی۔ اس لئے صبح کے انتظار میں اسٹیشن پر ہی ٹھہر گیا۔ جب صبح ہوئی تو مولانا کی قیام گاہ کا پتہ دریافت کرتے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ یاد آتا ہے کہ اس امر پر مولانا نے شفقت آمیز خفگی ظاہر فرمائی تھی کہ میں دن میں آنے کے بجائے رات کی ٹرین سے کیوں آیا۔ اور اپنی آمد کے صحیح وقت سے انھیں مطلع کیوں نہیں کیا، جس کی وجہ سے مجھے زحمت گوارا کرنی پڑی۔ اڈہ ٹکودر جالندھر میں وہ مقام جہاں مولانا لاہور سے منتقل ہونے کے بعد سے ٹھہرے تھے، ہوادار اور کشادہ نہیں تھا اور اس کا کرایہ بھی بہت زیادہ تھا۔ جبکہ مولانا بیت المال کی رقم جماعت ہی کے کاموں میں صرف کرتے ہوئے بھی انتہائی کفایت شعاری کو ملحوظ رکھتے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ مولانا کو نظافت اور شائستگی کا خیال نہیں تھا۔ اس معاملہ میں اُن کا ذوق انتہائی بلند واقع ہوا تھا، خورونوش، لباس وبستر وغیرہ سے لے کر میز کرسی اور کاغذ قلم تک میں نفاست وصفائی کا لحاظ رکھتے تھے۔ لیکن اسراف وتبذیر کا شائبہ تک مصارف میں نہیں پایا جاتا تھا۔ کئی کئی شیروانیاں سلوا کر رکھا کرتے تھے۔ لیکن سب کی سب کھدر کی ہوتی تھیں۔ گھر کے اندر جب رہتے تو کھڑاؤں پہنے ہوتے۔ البتہ جب باہر کہیں جاتے تو نفیس جوتا پہن کر نکلتے۔ برآمدے میں ہمیشہ دری بچھی ہوئی رہتی۔ کوئی تنکا بھی اگر اس پر آ گرتا تو جب تک پھینکا نہ جاتا انھیں چین نہ آتا۔

مولانا میز کرسی پر بیٹھ کر ہی لکھنے پڑھنے کے عادی تھے۔ دمہ کا خطرناک مرض زندگی بھر سایہ کی طرح ساتھ لگا رہا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا تا جبکہ مرض کا دورہ نہ پڑتا ہو۔ انکسار وتواضع اور سادگی وبے نفسی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ اپنے لئے کسی امتیاز کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ بیماری کی تکلیف کی وجہ سے ٹرین میں تھرڈ کلاس کا سفر ممکن نہیں تھا۔ اسی لئے انٹر کلاس میں سفر کرنے کی عادت تھی۔ جب کبھی ہم میں سے کوئی رفیق ساتھ ہوتا تو انہیں بھی انٹر کلاس ہی میں اپنے ساتھ لے جاتے۔ تھرڈ کلاس میں سوار ہونے کی بالکل اجازت نہ دیتے۔ اگر کرسی یا چارپائی پر بیٹھے ہوتے اور کوئی ملاقاتی آجاتا۔ چاہے وہ کسی مرتبہ ودرجہ کا کیوں نہ ہوتا۔ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اس سے ملاقات کرتے۔ اُسے اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھا لیتے یا خود نیچے اُتر کر دری پر آ بیٹھتے مگر اسے کبھی پسند نہیں کرتے تھے کہ خود تو بیٹھے رہیں اُوپر اور دوسرے نیچے۔

ہاں! تو میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اڈہ ٹکودر والا مکان صحت اور کرایہ کی گرانی اور کام کے لحاظ سے غیر موزوں سمجھا گیا۔ تو تلاش اس کی شروع ہوئی کہ کوئی فراخ اور صاف ستھرا مکان مل جائے اور اس کا کرایہ بھی زیادہ نہ ہو۔ شرقی صاحب اور ہم نے مل کر اندرون شہر اس طرز کے مکان کو بہت ڈھونڈا۔ لیکن کہیں ملا نہیں۔ آخر مولانا کی صلاح یہ ٹھہری کہ جالندھر نہ سہی اس کے مضافات ہی میں کہیں ایسا مکان مل جائے تو پھر وہیں چل کر رہیں۔ ہم نے گرد ونواح میں جستجو کی تو بالآخر بستی دانشمنداں میں اپنی مرضی کا مکان مل گیا۔ مولانا اور ہم سب جالندھر سے اپنے تمام ساز وسامان اور اسباب سمیت منتقل ہو گئے۔ جب مستقل طور پر وہاں جم گئے تو مولانا نے اللہ کا نام لے کر "دار العروبۃ الدعوۃ الاسلامیہ" کی بنیاد ڈالی۔ میں اور قطبی صاحب دار العروبہ کے پہلے رفیق قرار پائے۔ مولانا کی رفاقت اگر میرے لئے موجب سعادت تھی تو یہ امر میرے لئے باعث شرف تھا کہ میری موجودگی ہی میں دار العروبہ کی تشکیل ہوئی۔ جس کے ذریعہ عالم عرب اور دنیائے اسلام تک حق کی آواز اور تحریک اسلامی کی دعوت پہنچائی جانے والی تھی۔ اور میں بھی اس کا ایک ادنیٰ رفیق اور خادم متصور کیا گیا۔

میں شروع ہی سے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے بطیب خاطر میری تربیت کی ذمہ داری قبول فرمائی۔ اپنی نگرانی میں عربی ادب کی اعلیٰ کتابوں اور مصر وشام کے رسائل وجرائد کا مطالعہ کراتے۔ لغات عربی پر عبور حاصل کرنے کا طریقہ بتاتے مشقیں کرواتے، مضامین لکھواتے، تراجم کراتے، اسالیب بیان اور محاورات وصلات کا طریق استعمال سمجھاتے اور صرف

میری علمی ترقی کا خیال رکھتے بلکہ عملی، اخلاقی اور فکری تربیت کا بھی ہر طرح اہتمام فرماتے اور ہر وقت مناسب ہدایات دیتے رہتے۔ چونکہ ہنوز میری تربیت کا سلسلہ جاری تھا اور جزوی طور پر ہی دارالعروبہ کی خدمت سرانجام دے رہا تھا اس لئے مجھے یہ بات کسی طرح گوارا نہیں تھی کہ میں جماعت کے بیت المال یا مولانا کی ذات پر اپنے اخراجات کا بار ڈالوں۔ مولانا میری بے سروسامانی اور تنگ دامانی کو دیکھ کر چاہتے تو یہی تھے کہ وہ خود میرے مصارف کی کفالت کر لیں گے۔ فرمانے لگے:-

"جو کھانا ہمارے لئے تیار ہو گا اسی میں آپ بھی شامل ہو جایا کریں گے۔ آپ کو زحمت بھی نہ ہو گی اور ہم پر آپکا کوئی بار بھی محسوس نہ ہو گا"

لیکن اپنی خودداری اور جماعت کی مالی حالت کے پیشِ نظر مجھے کسی درجہ میں یہ بات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوئی کہ دورانِ تربیت میں میرے اخراجات کا بوجھ جماعت یا مولانا کی ذات پر پڑے۔ میں نے صاف کہہ دیا:-

"یہی کیا کم ہے کہ آپ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود بلامعاوضہ مخلصانہ طور پر میری تربیت فرما رہے ہیں۔ یہ کیسے مناسب ہے کہ اس پر اپنے اخراجات کی بھی الگ سے آپ کو زحمت دوں"

میں نے ذرا دوڑ دھوپ کی تو اللہ کے فضل سے جالندھر شہر کے اندر ایک ٹیوشن ایسا مجھے مل گیا۔ جس سے میرے تمام اخراجات نکل جایا کرتے تھے۔ پھر بھی مولانا کی تاکید یہی تھی کہ ہر دن شام کی چائے اُن کے ساتھ ہی پینی ہو گی اور میں نے یہ "دعوتِ شیراز" قبول کر لی۔ کیونکہ اس میں کسی کے لئے بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ ٹیوشن چونکہ رات کا مجھے ملا تھا اور دارالعروبہ واقع بستی دانشمنداں سے جالندھر شہر کا فاصلہ تقریباً دو میل تھا۔ اس لئے میرا روزانہ کا معمول یہ تھا کہ میں رات جالندھر میں اور سارا دن مولانا کے ساتھ دارالعروبہ میں گزارتا۔ شہر سے بستی دانش منداں سویرے چلا آتا۔ تقسیم اوقات یوں تھی کہ کچھ عرصہ مولانا کی نگرانی میں مشق و تمرین اور مطالعہ میں صرف ہوتا اور کچھ دیر دارالعروبہ کی کوئی خدمت انجام دے لیا کرتا تھا۔ عموماً دارالعروبہ کی ڈاک میرے سپرد ہوتی تھی۔ مولانا کی جانب سے مختلف حضرات کو خطوط میں ہی لکھا کرتا تھا اور باہر سے جو ڈاک آتی اس میں سے ذاتی اور زیادہ اہم خطوط کا جواب تو خود اپنے قلم سے تحریر فرمایا کرتے۔ باقی ساری ڈاک میرے حوالے کر کے اشارات اور ہدایات دے دیا کرتے اور میں اُن کی روشنی میں جوابات لکھ دیا کرتا۔ جن پر مولانا نظر ثانی فرما لیا کرتے۔

عصر تک ہم سب اپنے مشاغل میں مصروف رہتے۔ نماز عصر کے بعد کا وقت فرصت و فراغت اور تفریح کا ہوتا۔ نماز کے فوراً بعد میں اور قطبی صاحب مل کر چائے بناتے، چائے تیار ہونے کے بعد مولانا ہم دونوں کو ساتھ لے کر برآمدے میں دری پر بیٹھ جاتے۔ چائے کا دور چلتا رہتا۔ اور باتیں ہوتی رہتیں۔ ویسے مولانا ہر وقت ہشاش بشاش رہتے اور ہم جیسے "خردوں" اور شاگردوں کے ساتھ بھی برابر والوں اور دوستوں جیسا برتاؤ کرتے، لیکن خصوصیت سے چائے نوشی کے وقت تو بالکل بے تکلف ہو جاتے۔ اور کھل کر گفتگو فرمایا کرتے۔ اپنی بیتی ہوئی زندگی کے حالات سناتے، واقعاتِ گزشتہ کا تذکرہ کرتے۔ حالاتِ حاضرہ اور سیاساتِ عالم پر تبصرہ فرماتے۔ دُنیائے اسلام کے عروج و زوال کی داستان سناتے، اقوامِ دوراں کے ارتقاء و انحطاط کے وجوہ بتاتے۔ انقلاباتِ زمانے کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے، دُنیا کی اہم تحریکات کے نشیب و فراز اور اُن کی کامیابی و ناکامی کا تجزیہ کرتے۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک کی روداد اس انداز سے سناتے جیسے یہ اُن کا آنکھوں دیکھا حال ہو۔ عربی لٹریچر کی خصوصیات بیان کرتے۔ عربی زبان کے ادیبوں اور شعراء کا تذکرہ فرماتے۔ عربی اشعار پر نقد و تبصرہ کرتے۔ جماعت اسلامی کے روح رواں تو وہ تھے ہی پھر اس کا ذکر وہ کیوں نہ فرماتے۔ اکثر و بیشتر اُن کی گفتگو

کی تان جماعت اسلامی کے ذکر پر آکر ٹوٹتی تھی۔ سلسلہ بیان کا آغاز کہیں سے کیوں نہ ہو انجام کار اس کی کڑیاں جماعت اسلامی ہی سے آکر مل جایا کرتی تھیں۔ ذکر ہو رہا ہے سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی برپا کردہ تحریک اسلامی کا۔ لیکن بین الکلام میں تمنا جھلک رہی ہے جماعت اسلامی کے روشن مستقبل کی، بات چل رہی ہے عالم اسلام کے انقلابات کی۔ مگر "آمدم برسر مطلب" جماعت اسلامی کی اہمیت و ضرورت کا اظہار ہے۔ غرض پیکر نحیف و نزار میں مجاہدانہ روح انگڑائیاں لے رہی ہوتی اور ہم نہایت حیرت و استعجاب کے ساتھ مشاہدہ کرتے ہوتے۔ مولانا کی ذات معلومات کا بحر زخار تھی۔ اس سمندر کے تموج کا ان آنکھوں نے شرف مشاہدہ حاصل کیا ہے۔

چائے کے معاملہ میں بھی مولانا کا ایک خاص مذاق تھا۔ اپنی نگرانی میں ہم سے بڑی لذیذ چائے بنواتے۔ مولانا کے ساتھ جو چائے میں نے پی ہے اس کے چٹخاروں کا مجھے اب تک احساس ہے اور بہت کم ویسی چائے پھر کبھی مجھے پینے کو ملی ہے۔ مولانا بہت گرم چائے پینے کے عادی تھے۔ کہتے تھے کہ چائے ٹھنڈی ہو جائے تو اس کا لطف ہی ختم ہو جاتا ہے۔ ہمیں تاکید تھی چائے تیار ہونے کے بعد جب اسے کیتلی میں ڈالا جائے تو کسی کپڑے سے ڈھک دیا جائے تاکہ وہ ٹھنڈی نہ ہونے پائے۔ چائے کا ذکر چھڑا ہے تو اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے:-

تقسیم ہند سے قبل جماعت اسلامی کا جو پہلا کل ہند اجتماع دار الاسلام پٹھان کوٹ میں ہوا تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد مولانا ہی کے ایک کام سے میں تو امرتسر چلا گیا اور مولانا غالباً دو ایک دن دار الاسلام ہی میں ٹھہر کر واپس ہوئے۔ پٹھان کوٹ سے چائے کی پیالیوں کا ایک سیٹ سات روپے میں خرید لیا تھا۔ مولانا اور قطبی صاحب جالندھر واپس ہونے لگے تو پیالیوں کا سیٹ بھی ساتھ لیتے گئے۔ ٹرین جب امرتسر پہنچی اور وہاں جالندھر کے لئے گاڑی بدلی گئی تو اتفاق سے سیٹ پہلی ہی ٹرین میں رکھا رہ گیا۔ اور تو سارا سامان اٹھا لیا گیا مگر سیٹ لینے کا کسی کو بھی خیال نہیں رہا۔ جالندھر پہنچ کر پتہ چلا کہ پیالیاں ٹرین میں دھری رہ گئی ہیں۔ ناچار کرتے کیا خاموش ہو رہے۔ چونکہ نعیم صدیقی صاحب نے بھی سیٹ کی فراہمی میں دلچسپی لی تھی اس لئے انہیں بھی اس حادثہ کی خبر کر دی گئی۔ امرتسر کے کام سے فارغ ہو کر میں جس وقت جالندھر واپس ہوا ہوں تو اسی وقت نعیم صاحب کا جواب مولانا کے نام موصول ہوا تھا جو بےحد دلچسپ تھا۔ مولانا نے ہنستے ہوئے نعیم صاحب کا مکتوب گرامی اس انداز سے مجھے بتایا جیسے اپنے لطف و دلچسپی میں خود مجھے بھی شامل کرنا چاہتے ہوں۔ لے کر میں نے پڑھا۔ تو جہاں اور بہت سی باتیں تھیں وہیں پیالیوں کے سیٹ کی گم شدگی پر بھی اظہار افسوس کیا تھا۔ اور تلافی مافات کی صورت یہ تجویز فرمائی تھی کہ ایک اور سیٹ خرید لیا جائے۔ اور اس کی قیمت سات روپے کے بجائے چودہ روپے تصور کر لی جائے۔ اس طرح نقصان کا غم کبھی نہیں ستائے گا اور چائے بھی فلک سیر ہو جائے گی!

چونکہ ٹیوشن کے سلسلہ میں مجھے ہر شب جالندھر میں گزارنی پڑتی تھی۔ اس لئے ہر دن عصر کے بعد والی چائے کی مجلس برخاست ہونے کے بعد میں دار العروبہ سے شہر پیدل روانہ ہو جاتا۔ اور مولانا بھی قطبی صاحب کو ہمراہ لئے ہوئے کافی دور تک تشریف لاتے اور مجھے رخصت کر کے واپس ہوتے۔ راستہ بھر مولانا کے ارشادات گرامی سے ہم مستفیض ہوتے رہتے۔ اور "طائفہ مشائین" کی یاد تازہ ہو جاتی کہ پیدل چل بھی رہے ہیں اور اپنی معلومات کے ذخیرہ میں اضافہ بھی کر رہے ہیں۔

ہفتہ میں دو دن مجھے ٹیوشن سے فرصت مل جاتی اور اس وقت بےحد خوشی اس وجہ سے ہوتی کہ شب و روز دار العروبہ ہی میں مولانا کے ساتھ گزرتے اور استفادہ کا نادر موقع مل جاتا۔ دمہ کا عارضہ مولانا کو جو لاحق ہوا تو مرتے دم تک ساتھ نہیں چھوڑا

یہ شکایت رفیقِ سفر و حضر بنی رہی اور یہی مرض جان لیوا بھی ثابت ہوا۔ بیماری کے دورے عموماً پڑتے تھے اور ہر دورہ نزع و جانکنی کا منظر پیش کرتا تھا۔ جن لوگوں نے دمہ کے کسی مریض کو دیکھا ہوگا وہی بخوبی اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ دمہ کا مریض دورے کے وقت کس درجہ کرب و اذیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ لیکن مولانا کے صبر و ضبط کا یہ عالم تھا کہ حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہیں آیا۔ مرض اس قدر موذی اور خطرناک لیکن مریض پیکرِ تسلیم و رضا۔ بسا اوقات ایسے ہوتا کہ مولانا نماز ادا کر رہے ہیں اچانک دورہ پڑ گیا۔ ظاہر ہے کہ دورہ کی حالت میں نماز کا سلسلہ جاری رکھنا نہ ممکن ہے نہ مناسب، غایت مجبوری سے نماز توڑنی پڑتی۔ جب کچھ سکون ہوتا تو پھر از سرِ نو نماز کا آغاز فرماتے۔ پھر دورہ کا حملہ ہوتا۔ اور نماز قبل از تکمیل ختم کر دینی پڑتی۔ کافی دیر مرض سے کش مکش کرنے کے بعد بالآخر مظاہرۂ عبودیت شدّتِ مرض پر غالب آجاتا اور مولانا نماز کی ادائیگی میں کامیاب ہو جاتے، دمہ کی شکایت کے باعث دنیوی نعمتوں اور جائز مادی لذّتوں سے بھی وہ بہرہ ور نہ ہو سکے۔ مگر نہ اس کا رنج و افسوس انھیں تھا اور نہ ان کے دل میں کسی لذت کی کوئی ہوس تھی۔ خیال تھا تو بس یہی کہ اسلام کا پرچم ساری دُنیا میں لہرائے۔ دُھن تھی تو فقط یہ کہ نظامِ حق کا سورج نکلے۔ اور دینِ قیّم ادیانِ باطل پر غالب ہو جائے۔

مولانا کی خانگی زندگی بھی افکار و آلام کا ایک مجموعہ تھی۔ والدین ضعیف اور خدمت کے حاجتمند خاندان کے کئی افراد کی کفالت کا بارِ گراں تنہا ایک دوشِ ناتواں پر۔ رفیقۂ حیات جنون و خفقان میں مبتلا۔ لیکن مولانا کا حال یہ تھا کہ جو غم ملا اُسے غمِ جاناں بنا دیا۔ آلامِ روزگار کو آسان بنا دیا۔ مولانا کی زندگی میں اس مشہور حدیث کی جھلکیاں نظر آتی تھیں جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:۔

”من کان همه هم الاخرة کفاه الله هم الدنیا ومن کان همه هم الدنیا فلن یبالی بای وادٍ هلک“

جس شخص کو محض فکرِ آخرت دامنگیر ہوتی ہے خود اللہ تعالیٰ اس کے افکارِ دُنیا کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ لیکن وہ ناعاقبت اندیش جسے آخرت کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اس کی ضروریات کی فراہمی کا ذمہ اللہ تعالیٰ نہیں لیتا۔ اگر وہ در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے تو اللہ کو جب بھی اس کی پروا نہیں ہوتی۔ مولانا نے زندگی کے تمام غموں کو صرف ایک غم یعنی دین کا غم۔ بنا لیا تھا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اُن کی ہر پریشانی رفع کر دیتا تھا اور ہر مشکل کا بہت جلد کوئی حل نکل آتا تھا۔ دمہ کا مرض جو عمر بھر ساتھ لگا رہا وہ جہاں مولانا کے لئے رفعتِ درجات کا باعث بنا وہیں تحریکِ اسلامی کے کارکنوں اور دین کے خدمت گزاروں کے لئے اتمامِ حجت بھی ہے۔ کہ خدا کا ایک کمزور اور ناتواں بندہ اپنی مستقل اور خطرناک علالت، شدید مجبوریوں اور آلام و حوادث کے ہجوم میں بھی دینِ حق کی عظیم خدمات کا شاندار ریکارڈ اپنے پیچھے چھوڑ جا سکتا ہے اور راہِ حق میں مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے قید و بند کی سختیاں تک جھیل سکتا ہے، تو پھر کسی اور کے لئے کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ وہ اقامتِ دین کی جد و جہد سے باز رہنے کیلئے کسی معمولی تکلیف یا ادنیٰ مجبوری کو عذر و بہانہ بنائے۔ جو لوگ اپنی غفلت و تن آسانی کے لئے وجہ جواز فراہم کرنے کی غرض سے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها جیسی آیات سے غلط استدلال کرتے ہوئے فریبِ نفس میں مبتلا رہتے ہیں، اُن کے لئے مولانا مسعود عالم ندوی کی ذاتِ گرامی اللہ کی طرف سے ایک واضح برہان و حجّت تھی۔ مولانا کا مقصود مرضیٔ مولا کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ رضائے دوست پر اپنا سب کچھ بے دریغ لٹا دینے پر آمادہ رہتے تھے۔ دُنیاوی راحتوں اور مادی آسائشوں سے محرومی کا انھیں ذرّہ برابر رنج نہ تھا۔ فرمایا کرتے تھے:۔

”خدمتِ دین میں جو لذت مجھے حاصل ہوتی ہے۔ وہ دُنیا کی سب سے بڑی نعمت سے بہرہ اندوز ہونے والے کو بھی

نصیب نہ ہوتی ہوگی - فانی لذتوں اور مادی نعمتوں کے رسیا کیا جانیں کہ بندۂ مومن کو دین سے وابستگی اللہ کی محبت اور جادۂ حق کی صعوبتوں میں کس قدر تسکین و طمانیت حاصل ہوتی ہے ۔ یہ واقعہ ہے کہ ابدی راحتوں کا تصور عارضی جانکاہیوں کا احساس ہی ختم کر دیتا ہے۔"

اگر کبھی تحریکِ اسلامی کے سلسلہ میں کسی ابتلاء و آزمائش کا خطرہ پیدا ہو جاتا تو مولانا برضا و رغبت اس کا خیر مقدم کرنے پر آمادہ نظر آتے، دہشت و سراسیمگی کا تو کیا سوال اس نوع کا اندیشہ کبھی محسوس ہوتا تو یقین و ایمان میں تازگی کی لہر دوڑ جاتی اور فرمانے لگتے :-

"ہمارا کیا ہے بھائی ہم تو سوختہ سامان بیٹھے ہیں، عہدِ وفا کو پورا کرنا بہر حال ضروری ہے - راہِ محبت میں سود و زیاں کی فکر ہی کیا ہے منزلِ دوست تک پہنچنے کے لئے جو بھی کٹھن مرحلہ پیش آجائے اسے عبور کرنا طالبِ صادق کا فرض منصبی ہے۔"

کبھی کبھی ہم لوگ کہا کرتے تھے کہ "تحریکِ اسلامی جب تک مضبوط و مستحکم نہ ہو جائے اسے سرفروش مردانِ کار اور جانباز مجاہدین کار زار میسر نہ آجائیں، خدا کرے کہ اس وقت تک کوئی ابتلاء نہ پیش آجائے اور تحریک تصادم و کشمکش سے محفوظ رہے۔" اس کے جواب میں مولانا پُرعزم انداز سے فرماتے :-

"اگرچہ شریعت نے ابتلاء کو دعوت دینے اور آزمائش کی تمنا کرنے سے منع کیا ہے، لیکن تحریکِ اسلامی کے مفاد ہی کے پیش نظر میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہ مرحلہ جلد ہی آجائے تو اچھا ہے، کیونکہ اس سے کھرے کھوٹے میں امتیاز ہو جائے گا - کسی جگہ جمود کی ذرا بھی کیفیت پائی جاتی ہے تو وہ ختم ہو جائے گی - مفاد پرست اور ناقص الایمان افراد جو ہر تحریک کو لے ڈوبنے والے ہوتے ہیں وہ چھٹ جائیں گے اور بے لوث کارکن عزیمت و استقامت کی دولت سے مالا مال ہو جائیں گے۔"

چنانچہ تقسیمِ ہند کے فوراً ہی بعد تحریکِ اسلامی ابتلاء و آزمائش کے مرحلے میں داخل ہو گئی اور مارشل لاء کے دوران میں مولانا بھی قید و بند کی سعادت سے بہرہ ور ہو گئے - اور جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے رکھے جانے کے بعد بھی دیوارِ زنداں اور زنجیرِ در نے جوشِ جنوں اور ولولۂ حق میں اضافہ ہی کیا ہے - چنانچہ جیل سے رہا ہونے کے بعد جو رودادِ قفس لکھی ہے اس میں شوقِ فراواں اور بے تابیٔ دل پوری طرح نمایاں ہے - مولانا کا مزاج چونکہ حد درجہ تحقیقی واقع ہوا تھا اس لئے جب تک کسی چیز کی تہ تک نہ پہنچ جاتے، اُس وقت تک تلاش و جستجو کا سلسلہ برابر جاری رہتا - آپ کی ژرف نگاہی اور وسعتِ نظر کا اندازہ آپ کی تصنیفات سے اچھی طرح ہو سکتا ہے - جو بات بھی کہیں گے وہ بے لاگ ہوگی اور جو بھی مقالہ تحریر فرمائیں گے اس میں تحقیق و کاوش کا حق ادا کر دینگے - آپ کا کوئی مضمون مآخذ کے حوالہ جات اور سنین سے خالی نہیں ہوتا - ایک مرتبہ اپنے مضمون کے سلسلہ میں سعیٔ پیہم کے باوجود کسی تاریخی شخصیت کا سن وفات مولانا کو نہیں مل سکا - تو یہ خدمت میرے حوالے کر دی - میں نے مختلف کتابوں کا مطالعہ کر کے کافی تلاش کے بعد "وفیات" لابن خلکان سے سن وفات نکال لیا اور مولانا کی خدمت میں پیش کیا تو وہ اس قدر خوش ہو گئے کہ اسی وقت اپنی بیش بہا تصنیف "مولانا سندھی کے افکار پر ایک نظر" بطور اظہارِ مسرت میری کاوش کے تذکرہ اور اپنے دستخط کے ساتھ عنایت کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"مصنف کے دستخط کے ساتھ یہ کتاب جو آپ کو مل رہی ہے وہ آپ کی سعیٔ مشکور کا صلہ ہے۔"

استاذ محترم پر اللہ کا یہ خاص فضل و کرم رہا کہ انہوں نے اپنی عمر کے تناسب سے دین کی بہت زیادہ خدمات انجام دی ہیں متعدد تصنیفات اپنی یادگار میں چھوڑی ہیں۔ جن میں سے بعض مقبول و مشہور کتابیں یہ ہیں (۱) محمد بن عبدالوہاب ایک بدنام اور مظلوم مصلح (۲) اسلام اور اشتراکیت (۳) مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر (۴) دیارِ عرب میں چند ماہ (۵) ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔ (۶) مکاتیب سلیمان (۷) نظرۃ اجمالیہ لدعوۃ الاسلامیہ فی الہند و الپاکستان۔ ان میں سے "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" تو میری موجودگی میں اور بالکل میرے سامنے مرتب ہوئی ہے[1] اور کتاب کا مسودہ بھی میں نے ہی صاف کیا ہے جس کی صورت یہ تھی کہ مولانا کتاب کے مضامین لکھتے جاتے پھر اس میں حک و اضافہ اور ترمیم کر کے میرے حوالے فرماتے جاتے۔ اور میں اسے صاف طور پر دوسری بیاض میں نقل کرتا جاتا اور میرا نقل کردہ مبیضہ ہی پریس بھیجا گیا تھا۔ میری اس حقیر سی خدمت پر خوش ہو کر مولانا نے مجھ سے وعدہ فرمایا کہ کتاب شائع ہوتے ہی ایک نسخہ بطور ہدیہ آپ کو دے دیا جائے گا۔ آپ کتاب خریدیں نہیں۔ لیکن اتفاق کی بات ہے کہ کتاب کی اشاعت کے بعد مولانا کو خیال نہیں رہا اور کتاب کے دو ایڈیشن بھی نکل گئے۔ مگر کتاب مجھے نہیں پہنچی۔ آپس کی بے تکلفی کی بناء پر میں نے خط لکھا "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک" کے اب تک دو ایڈیشن نکل گئے ہیں۔ آپ نے مجھے کتاب خریدنے سے منع کر رکھا ہے اور اب تک بھیجی بھی نہیں۔ میں خرید لوں یا آپ روانہ فرمائیں گے"۔ نہایت بے تکلفی سے اپنی وعدہ فراموشی پر اظہار معذرت کرتے ہوئے جواب میں تحریر فرمایا۔

"آپ ہرگز کتاب نہ خریدیں۔ میرا ذاتی نسخہ بھی اس وقت موجود نہیں ہے، ورنہ وہی آپ کو بھیج دیتا۔ عاصم صاحب کا نسخہ لے کر تصحیح کر رہا ہوں۔ تیسرے ایڈیشن کی تیاری ہو رہی ہے، اب کے انشاء اللہ آپ ہرگز بھلائے نہ جائیں گے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ رکھا ہے کہ وہ کتاب چھپتے ہی فوراً یاد دہانی کرا دیں"۔

چنانچہ جیسے ہی تیسرا ایڈیشن شائع ہوا اور کچھ نسخے بھی پریس سے مولانا کی خدمت میں پہنچ گئے تو مولانا نے اپنے ساتھیوں کو تاکید فرمادی کہ ایک نسخہ جلد میرے نام روانہ کر دیا جائے، چنانچہ ایک دن طٰہٰ صاحب رفیق دارالعروبہ کا خط میرے نام آیا جس میں مرقوم تھا۔ "کل ہماری مجلس میں آپ کی یاد تازہ ہو گئی۔ استاذ محترم نے ہدایت فرمادی ہے کہ آپ کو "ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک"، کا ایک نسخہ بھیج دیا جائے، کتاب بذریعہ رجسٹری بھیجی جا رہی ہے۔ موصول ہونے پر رسید سے مطلع فرمادیں"۔ مولانا کے انتقال سے چند ہی ماہ قبل مجھے کتاب موصول ہوئی۔ میں نے بڑے اشتیاق سے کتاب کھولی۔ پہلے ہی صفحہ پر محبت بھرا دل رکھنے والے مصنف نے اپنے قلم سے یہ سطور لکھی تھیں:۔

وفاءً بالوعد الذی سبق منذ ثمان سنین وتذکاراً لذالک العهد السعید اقدم هذا الکتاب هدیة الی الاخ العزیز عبدالرحمٰن المیسوری۔ العاجز مسعود الندوی۔ ۱۳/۲/۱۳۷۳ھ۔

ترجمہ:۔ آٹھ سال قبل جو وعدہ کیا گیا تھا اسے پورا کرتے ہوئے اور مودت و رفاقت کے اس دورِ سعید کی یاد تازہ کرتے ہوئے بطور ہدیۂ اخلاص میں یہ کتاب اپنے برادر عزیز عبدالرحمٰن میسوری کو دے رہا ہوں۔ عاجز مسعود ندوی"۔

کتاب موصول ہونے کے بعد رسید کی اطلاع دیتے ہوئے میں نے شکریہ کا ایک مفصل عریضہ بھی تحریر کر دیا تھا۔ اور یہی غالباً آخری مکتوب تھا جو میری جانب سے مولانا کے نام لکھا گیا تھا۔

---

[1] ترتیب کے دوران میں کتاب کی بابت ہم سے بحثیں اور مذاکرات ہوتے رہے ہیں۔

استاذ مرحوم کی رفاقت اور اُن سے استفادہ کی سعادت بدقسمتی سے زیادہ عرصہ تک مجھے نصیب نہ ہو سکی۔ جس کا مجھے ہمیشہ قلق رہا۔ ایک سال سے کچھ کم ہی مدت تھی جو میں حضرت مرحوم کی خدمت میں گزار سکا تھا۔ اُن کی قلبی تمنا اور دلی آرزو یہی تھی کہ میں ہمیشہ کے لئے ان کا رفیق کار بنا رہوں۔ اور دارالعروبہ میں مستقل طور پر ٹھہر جاؤں۔ فرمایا کرتے تھے:۔

"میری تربیت سے آپ چند ہی دنوں میں میرے کام کے ثابت ہو جائیں گے اور عربی تراجم وانشاء کی صلاحیت آپ کو حاصل ہو جائے گی، ہم سب مل کر ایک عربی مجلہ "البشریٰ" کے نام سے نکالیں گے جس کی منیجری قطبی صاحب کے ذمہ ہو گی اور ادارت کی ذمہ داری میرے اور آپ کے سپرد رہے گی۔"

لیکن چونکہ یہ سعادت کسی اور (عاصم صاحب) کے لئے مقدر کر دی گئی تھی۔ اس لئے مولانا کی پُرخلوص دعوت پر میں لبیک نہ کہہ سکا۔ جس کا سبب اپنی علالت کے علاوہ بعض خانگی الجھنیں اور ضعیف والدین کی خدمت کا تقاضا تھا۔ مولانا کو چونکہ ذہانت بہت محبوب تھی اور مجھ نااہل کو محض اخلاص وحسن ظن کی بناء پر وہ اپنے معیار مطلوب کے مطابق سمجھ رہے تھے۔ اس لئے جب میں نے مولانا کے سامنے اپنی معذوریاں اور مجبوریاں رکھ کر دارالعروبہ میں مستقل قیام کرنے سے معذرت کر دی تو مولانا بے حد رنجیدہ ہو گئے اور اخیر وقت تک اصرار کرتے رہے کہ میں کسی طرح اپنی مشکلات پر قابو پا کر رہ جاؤں۔ میں خود بھی مولانا کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اور انھیں بھی میری جُدائی گوارا نہ تھی۔ میں نے انتہائی سعی کی کہ میری اُلجھنیں اور رکاوٹیں دُور ہو جائیں۔ اور مولانا سے جُدائی کی نوبت نہ آئے، لیکن میرے عزائم اور فیصلوں پر مشیت ایزدی ہی غالب آکر رہی اور ایک دن بادل ناخواستہ مولانا کو آزردہ چھوڑ کر مجھے دارالعروبہ سے روانہ ہونا پڑا۔

میں اپنی زندگی کے اس عہد سعید کو کبھی نہیں بھول سکتا جبکہ مولانا مسعود عالمؒ کے ساتھ کچھ عرصہ گزارنے کا شرف مجھے حاصل ہوا تھا۔ مولانا کی تربیت سے میری بہت سی کوتاہیاں دُور ہوئیں اور مختصر سی مدت میں جو فیض مجھے اُن سے حاصل ہوا، اس کے نقوش باقی رہ گئے، میں اس امر کو اپنے لئے باعث سعادت تصور کرتا ہوں۔ کہ اپنے دورانِ قیام میں مولانا کی خدمت کرنے کے بہت سے مواقع حاصل ہوتے رہے۔

نفس کا مریض تو دورے کے وقت بالکل دوسروں کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ جس قدر احتیاط، نگہداشت اور دیکھ بھال اس موقع پر مریض کی ہو گی اسی قدر جلد اسے افاقہ بھی ہو گا۔ دورے کے وقت مولانا میرے ہاتھوں میں ہوتے اور میں انھیں بڑی احتیاط سے سنبھالتا اور پوری کوشش کرتا کہ اُن کی تکلیف دُور ہو جائے۔ جب انھیں قدرے سکون ہوتا تو وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے میرے لئے دعائیں فرماتے رہتے۔ کیا عجب کہ یہی مخلصانہ دعائیں میرے واسطے ذخیرۂ آخرت بن جائیں۔

مولانا سے رخصت ہو کر چلے آنے کے معاً بعد تقسیم ہند کا حادثہ پیش آگیا اور اس کے خطرات کی زد میں جان اور بہت سارے لوگ آئے وہیں بدقسمتی سے مولانا بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ محنتِ شاقہ سے اکٹھا کیا ہوا کتب خانہ اسی حادثہ کی نذر ہو گیا۔ بہار سے ہجرت کر کے جالندھر تشریف لے گئے تھے، پھر وہاں سے بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پاکستان ہجرت کرنی پڑی۔ بلاشبہ یہ ہجرت بھی اسی طرح اللہ کے لئے تھی جیسے پہلی ہجرت بھی اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے نہیں تھی۔ اس طرح یہ "مہاجر الی اللہ" پھر "مجاہد فی سبیل اللہ" بنا۔ اور اللہ کے دین کی خدمت ہی کے سلسلہ میں کبھی لاہور، کبھی گوجرانوالہ، کبھی حیدرآباد سندھ کی خاک چھانتا پھرا۔ بالآخر راولپنڈی کو دارالعروبہ کا مستقل مرکز بنا کر عالم اسلام کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتا رہا۔ اسی سلسلہ میں دیارِ عرب کا بھی اس نے ایک سفر کیا۔ اور مختلف ممالک اسلامیہ کو دعوت اسلامی سے روشناس کراتا رہا۔ جس کی زندہ

شہادت اس کی کتاب "دیارِ عرب میں چند ماہ" ہے۔ واپس ہوا تو مارشل لاء کے دوران میں "سنتِ یوسفی" کی یاد تازہ کرتے ہوئے زنداں میں مقید رہا۔ جیل سے چھوٹ کر کچھ دنوں بعد دوبارہ عالمِ اسلام کے سفر کا قصد لئے کراچی پہنچا تو اس کی جان پاک قفسِ عنصری سے چھوٹ کر عالمِ آخرت کے سفر پر اس طرح روانہ ہوگئی کہ اب اس کی واپسی کا کوئی امکان ہی نہیں۔ ایک دن میں نماز صبح کے بعد اپنے گھر میں لیٹا ہوا تھا۔ کسی نے باہر سے پکارا، آواز کی رقت خود المناک حادثہ کی غماز تھی۔ باہر نکلا تو اطلاع ملی کہ میرے محبوب اُستاذ محترم مولانا مسعود عالم ندویؒ ۱۶۔ مارچ ۱۹۵۶ء کو کراچی میں رحلت فرما گئے۔ اور اسی جگہ آسودۂ خاک ہوئے جہاں کچھ عرصہ قبل ہی اُن کے محبوب استاذ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تھا۔ یہ کمالِ ارتباط اور تعلقِ خاطر نہیں تو اور کیا ہے کہ استاذ، شاگرد، دونوں کا مولد ایک ہی صوبہ (بہار) تھا اور حسنِ اتفاق سے مدفن بھی ایک ہی شہر کراچی بنا۔

مولانا مسعود عالمؒ نے رضائے الٰہی اور خدمتِ دین کی خاطر گھر بار چھوڑا، کافی آمدنی والی ملازمت ترک کی، والدین اور اہل و عیال کی جُدائی کا صدمہ گوارا کیا۔ عیش و راحت چھوڑی۔ دُنیاوی اعزاز و اکرام سے مُنہ موڑا۔ اور وہ سب کچھ قربان کیا جو اُن کے بس میں تھا۔ مہاجرت در مہاجرت، کی یہ موت ویسے ہی قابلِ رشک ہے پھر اس پر "غربت در غربت" نے اس کے مرتبہ کو کچھ اور بڑھا دیا۔ رحمتِ باری سے بعید نہیں کہ وہ اپنے بندۂ مخلص و مجاہد کو اجرِ شہادت عطا کرے اور "مسعود عالم" کو "مسعود آخرت" بنا دے۔

تقسیم کے بعد سے اگرچہ استاذ مرحوم پاکستان میں رہے اور میں بھارت میں۔ لیکن سلسلۂ مراسلت برابر جاری رہا۔ جب بھی میں کوئی عریضۂ شوق تحریر کرتا ازرہِ شفقت جواب بہت جلد عنایت فرمادیا کرتے تھے۔ اور اگر میری طرف سے کبھی خط لکھنے میں تاخیر ہوجاتی تو گہرے روابط کے پیشِ نظر دوستانہ شکایت میں بھی تامل نہ ہوتا۔ مولانا سے میری پہلی ملاقات دفتر کوثر لاہور میں ہوئی۔ پھر کئی ماہ رفاقت حاصل رہی۔ آخری ملاقات دار العروبہ جالندھر میں ہوئی۔ اس کے بعد تقسیم کی خونیں لکیر ہمارے درمیان حائل ہوگئی۔ آٹھ سال اسی امید میں گزرے کہ کبھی نہ کبھی "تجدیدِ ملاقات" ہوگی۔ مگر ۱۶۔ مارچ ۱۹۵۶ء کو یہ امید بھی ختم ہوگئی۔ اس کے بعد عالمِ ناسوت میں مولانا سے ملاقات کی کوئی توقع نہیں۔ خدا نے چاہا تو عالمِ آخرت ہی میں اب ملاقات ہوگی۔ جہاں ملنے والے کبھی بچھڑتے نہیں :-

احب الصالحین ولست منہم - لعل اللہ یرزقنی صلاحا

عروج زیدی (بدایونی)

دعوت و پیام

اللہ رے دل کی عرفاں مقامی
اب ہر نفس ہے اُن کا پیامی

اے ابنِ آدم تیرے لئے ہے
فطرت کی ساری خوش انتظامی

شاعر کے نغمے بیدار کُن ہیں
ہر ایک لب پر ہے کم تمنامی

اے حُبِّ دُنیا! تیری بدولت
تا چند میری آوارہ گامی؟

دل کے ارادے باطل شکن ہیں
اللہ ناصر! اللہ حامی!

دورِ طرب ہو یا عہدِ غم ہو
میرا فریضہ شکرِ دوامی

مومن کی نظریں افلاک پیما
مومن کی حکمت رومی نہ شامی

شاہوں کا آقا ہے میرا آقا
شاہی سے بڑھ کر میری غلامی

در مہر پروری مہرِ فروزاں
در حسن و خوبی ماہِ تمامی

اقوالِ زرّیں، درسِ بصیرت
تابندہ اُسوہ، شمعِ دوامی

سارا زمانہ زیرِ نگیں ہے
اعجازِ ناطق، شیریں کلامی

دونوں جہاں کو بھولا ہوا ہوں
پیشِ نظر ہے ذاتِ گرامی

اعلانِ حق ہے معراجِ شاعر
چھوڑو عروج! اب افکارِ عامی

آباد شاہ پوری

دینِ حق

گرچہ بدلا تیری دُنیا کا نظام
آدمی ہے پھر بھی آدم کا غلام

زندگی ہے عشق و ایماں سے تہی
ہو میسّر کیوں تجھے سوزِ دوام

حال مجھ سے عصرِ حاضر کا نہ پوچھ
بے یقین و بے ضمیر و تشنہ کام

میرا نالہ نالۂ آہن گداز
نشہ و خواب آفریں تیرا کلام

میرے نغموں میں ہو کیوں سوزِ فرنگ
میں فرنگی کا نہیں ذہنی غلام

باغ میں ہے آمدِ فصلِ جنوں
میگسارو! توڑ دو مینا و جام

اب نہیں ہے دور کچھ منزل تری
دینِ حق کے کارواں ہو تیز گام

رزم گاہِ دہر میں جس کا وجود
کفر کے حق میں ہے تیغِ بے نیام

جس کا ایماں قصۂ طاغوت سے
چھین لیتا ہے زمانے کی زمام

جو نہیں آگاہِ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
بے اثر ہیں اس کے سجدے اور قیام

آہ! ٹوٹے کس طرح باطل کا سحر
پل رہی ہوں جب تمنائے خام

”عشق و مستی کا ملے کیوں کر سُراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوز و درد و داغ“

غزل

زکی زاکانی

بگڑ نہ جائے کہیں اہلِ جستجو کا مزاج
کہ مانگتا ہے ترا عشق زندگی کا خراج

جہاں سے رہتی ہے سب کائنات زیرِ نظر
اُسی مقام کو کہتے ہیں عشق کی معراج

چمن چمن میں ہوا عام رنگِ پامالی
نظر نظر نے لیا گُل سے تازگی کا خراج

خدا کا شکر کہ ہیں عام تابشیں غم کی
مری نگاہ نہیں تیرے حُسن کی محتاج

کچھ اور جیب و گریباں کو چاک ہونے دو
غمِ خزاں ہی نہیں بندۂ جنوں کا علاج

جو دل ہے شوق سے عاری تو ہے زجاج بھی سنگ
جو ضربِ شوق ہے کاری تو سنگ بھی ہے زجاج

تجھے انقلاب کی خواہش تو کر زمانے میں
زمانہ ایک ہی ضربِ نظر کا ہے محتاج

نہ زندگی ہے نہ زندہ دلی نہ خوش طلبی
یہ کس مقام پہ آ کر بھٹک گیا ہے سماج

سیّد حباب ترمذی

ایک مسلمان کالج زدہ سے

نہیں وہ خاک میں تیری شرار ایمانی
کہ جس کے نور سے پیدا ہو صبح نورانی

تصوّرات ترے ہفت آسماں پیما
خرد ہے تیری مگر خاکداں کی زندانی

فریب خوردۂ سحر فرنگیاں کب تک
کہ توڑنا ہے تجھے تو طلسم حیرانی

تری ہی شان میں آیا ہے "انتم الاعلون"
مگر ہے شرط کہ دل میں ہو نور ایمانی

فضا بسیط ہے پرواز کا ارادہ کر
کہ ننگ فطرت شاہیں ہے یہ تن آسانی

قفس کو توڑ کے میدانِ کارزار میں آ
ہے تیرے خون میں مضمر بہار سامانی

لہو کی بوندوں میں تاثیرِ آب نیساں ہے
نہ ہچکچا، ہے پیامِ حیات، قربانی

نہ اب ہے تیری امارت میں شانِ فاروقی
نہ فقر ہے ترا فقرِ بلالؓ و سلمانیؓ

نہ تجھ میں صدقِ ابوبکرؓ ہے نہ جوشِ عمرؓ
نہ تجھ میں زورِ علیؓ ہے نہ روحِ عثمانیؓ

تُو بن کے دیکھ غلامِ محمدِؐ عربی!
کہ رشکِ قیصر و خاقاں ہو اس کی دربانی

تجھے نصیب ہو پھر شانِ خالدؓ و ضرارؓ
اگر نصاب میں داخل ہو درسِ قرآنی

بیا و خاک درش توتیائے چشم بساز
کہ تا دہند بفرقت کلاہِ سلطانی

عالم اکبر آبادی

کردار

کب چال سے ابلیس کی انجان رہا میں
صد شکر کہ انسان تھا انسان رہا میں

حالات سے خود اپنے پشیمان رہا میں
اوروں کے لئے پھر بھی پریشان رہا میں

دولت کیلئے میں نے کبھی خود کو نہ بیچا
افلاس میں بھی صاحبِ ایمان رہا میں

ہر عیش کا سامان میسر مجھے آیا
اس پر بھی مگر بے سروسامان رہا میں

ہر داغِ محبت سے ستارے کا لیا کام
پھولوں کی طرح چاک گریبان رہا میں

مجروح کیا کفر کے پندار کو میں نے
بُت خانۂ حاضر میں مسلمان رہا میں

رُوحِ انتخاب

یہ بے حجابی و عریانی جس کے طوفان سے آپ ہر قدم پر دوچار ہیں۔ یہ نمائشِ حُسن اور آرائشِ جمال۔ جس کی بے باکیوں سے ہر گلی میں ایک ہنگامہ بپا ہے، یہ بدکاری اور فواحش کے اڈے، یہ قحبہ خانے اور شراب خانے جن سے ہر گوشہ میں آپ کو سابقہ ہے۔ یہ ہماری تہذیب کی چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ یہ زیادہ تر مغربی تہذیب کی آوردہ ہیں اور اگر ہم اس ملک میں صحیح اسلامی تہذیب و معاشرت کو لانا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم پہلے اس لعنت کو ختم کریں!

ہم اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ بتائیں گے کہ آپ کے لئے نمونہ مغربی تبرجات کی زندگیاں نہیں ہیں بلکہ آپ کو مائی عائشہ رضی اور بی بی فاطمہ زہرا رضی کے نمونوں کی تقلید کرنی ہے، ہم اُن کے آگے موجودہ تہذیب کے شیطانی اصولوں کی جگہ اُن اصولوں کو رکھنا چاہتے ہیں جو اُن کے لئے خدا نے سورۂ نور، سورۂ احزاب اور سورۂ تحریم میں اُتارے ہیں۔ ہم اُن سے یہ کہیں گے کہ آپ نسلِ آدم کے لئے فتنہ نہ بنیں بلکہ آیۂ رحمت بنیں۔ آپ کی کوکھوں سے خبیثوں و خبیثات کی لیس بھری فصل نہ اُگے بلکہ آپ کی گودوں میں طیبون و طیبات پلیں اور پروان چڑھیں۔ آپ کے دودھ سے وہ غازی پرورش پائیں جو زندگی کے باطل نقوش مٹائیں اور حق کے ایسے نقوش ثبت کریں جو انسانیت کیلئے رہنما ہوں، آپ ایسی لایعنی، ایسی ہیچ اور پوچ اور ایسی بے جان نسل کو جنم نہ دیں جو ہر ایک کے پیچھے بھاگے اور ہر ایک کی صدا پر لپکے!

ہم اپنی ماؤں اور بہنوں کو یہ بتائیں گے کہ آپ کی قدر و قیمت، آپ کی بے حجابی و عریانی میں نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی عفت و پاکدامانی میں ہے۔ ہم اُن سے یہ کہیں گے کہ آپ کا جمال سُرخی اور پاؤڈر کا رہینِ احسان نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی زینت اخلاق و عادات سے ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسُول نے آپ کو سکھائے ہیں۔ ہم اُن کو آگاہ کریں گے کہ آپ کی محبوبیت و دلربائی کا راز آپ کی ساریوں اور غراروں میں نہیں بلکہ اس لباسِ تقویٰ میں ہے جو خدا کی شریعت نے آپ کو پہنایا ہے!

ہم اپنی بہنوں کو دعوت دیں گے کہ وہ اس پاکیزہ اسلامی تہذیب کے قائم کرنے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے۔ یہ ہمارا اور اُن کا ایک مشترک کام اور مشترک فریضہ ہے۔ شیطان کی تہذیب پھیلانے والوں میں بھی علم ہیں اور عورتوں میں بھی اُن کی تعداد تھوڑی ہے۔ ہم اپنی بہنوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس خدائی فوج میں بھرتی ہوں اور خدا کے اس کام کو انجام دے کر اُس کی رضا حاصل کریں۔

(مولانا امین احسن اصلاحی)

آپ اگر دُنیا بھر میں اسلامی تہذیب کی علمبرداری کا منصب اپنے لئے پسند کرتے ہوں تو پھر گھٹیا مقاصد پر زندگیاں نچھاور کرنے کی عادت چھوڑ دیں۔ ذرا ذرا سے فائدے کیلئے اپنے آپ کو بیچتے پھرنا۔ کبھی اس جتھے کے ساتھ اُس کا جھنڈا بلند کرنا۔ کبھی اس ٹولی کے ساتھ جا کر "زندہ باد" کے نعرے لگانا۔ کبھی ایک کو پچھاڑنے کے لئے استعمال ہونا اور کبھی دُوسرے کو کرسی پر بٹھانے کیلئے آلۂ کار بننا۔ یہ وہ ادنیٰ ذلیل مقاصد ہیں کہ جن میں ایمان و اخلاق کی قوتیں برباد کرنے کا نہ دُنیا میں کچھ حاصل ہے نہ آخرت میں۔ اب ان فضول کاموں کو چھوڑیئے اور اُس عظیم الشان کام میں اپنی قوتیں، اپنے مال، اپنے اوقات اور اپنی جانیں کھپایئے جن کی تکمیل میں صرف آپ ہی کی نہیں، آپ کی آئندہ نسلوں کی اور آپ کے ساتھ ساری دُنیا کی فلاح ہے۔ اور پھر صرف دُنیا ہی کی فلاح نہیں آپ کی آخرت کی بھی فلاح اسی میں ہے۔

(نعیم صدیقی)

پرچھائیاں

تماشائی کے قلم سے

"کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کی کہاوت اب تک کتابوں میں پڑھی تھی۔ یا لوگوں کی زبانی سُنی تھی۔ مگر پاکستان میں اس کہاوت کو سچّے ہوتا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اور کانوں سے سُن لیا! مسٹر شہید سہروردی نے جب دیکھا کہ نہ تو پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کے ملنے کا کوئی "چانس" (Chance) باقی ہے اور نہ اُن کی لیڈری کے لئے فضا سازگار رہی ہے بلکہ اب وہ اپنی خود غرضی اور ہوسِ اقتدار کی بدولت اُس دوراہہ پر آگئے ہیں۔ جہاں سے قیادت کے زوال اور شخصیت کی غیر ہردلعزیزی کے راستے پھٹتے ہیں — تو وہ دستور سازی کی آڑ لے کر بیچارے "اسلام" پر برس پڑے اور وہ سب کچھ کہہ دیا جو اسلام کا بڑے سے بڑا مخالف کہہ سکتا تھا!

مانا کہ دستور ساز اسمبلی میں جو کچھ کہا جاتا ہے اُس پر کوئی قانونی پابندی عائد نہیں ہوتی مگر اس "آزادیٔ تقریر" کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ اسمبلی میں کھڑے ہو کر اسلامی اقدار کی کھُلی ہوئی توہین کی جائے اور اس کا نہ صدر صاحب کوئی نوٹس لیں اور نہ ارکانِ دستوریہ کچھ فرمائیں۔ اگر یہی باتیں کسی ہندو ممبر کے مُنہ سے نکل جاتیں تو دیکھ کیا کیا شور مچاتے۔ مگر ایک وہ شخص جس کا مسلمانوں کا سا نام ہے، دین و شریعت کی ڈنکے کی چوٹ توہین کرتا ہے۔ لیکن پاکستان کی "اسلامی فضا" میں کوئی قابلِ ذکر اضطراب پیدا نہیں ہوتا!

جب سہروردی صاحب زناکاروں کو "سنگسار کرنے" کی اسلامی سزا پر طنز فرما رہے تھے تو اُس وقت بھی کسی رکنِ دستوریہ کو یہ نکتہ نہ سوجھا۔ وہ اُٹھ کر کہہ دیتا کہ اے عوامی لیگ کی کشتی کے ناخدا! "سنگساری" کی سزا کا آپ کو دھڑکا کیوں ہے؟ جو جیسا کرے گا ویسا بھرے گا۔ بدکاری کے جُرم کی اسلامی سزا کے تصوّر سے یہ آپ کیوں لرزے جا رہے ہیں؟ کچھ کہیئے تو سہی، آخر اس اندیشہ کا پس منظر کیا ہے؟

ان حضرت کے بیان پر اخباروں میں تھوڑی بہت لے دے جو ہوئی تو فرماتے ہیں کہ "مجھے اُس دن بخار تھا"۔ خوب! جب بخار میں آپ کا دماغ خراب ہو جایا کرتا ہے تو اسمبلی ہال میں تشریف لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر یہ کیسا بخار تھا جس نے کفر کی تردید میں ایک لفظ بھی آپ کی زبان سے نہ نکلنے دیا۔ طنز و تضحیک کی ساری بمباری اسلام ہی کے خلاف ہوتی رہی۔

"حسین"، اور پھر "شہید" نام، اور سہروردی بھی! یعنی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ سے شاید خاندانی نسبت — مگر باتیں کالی چرن اور مارگیولیتھ جیسے معاندینِ اسلام کی سی!

سرحد کے "مردِ آہن" خان عبدالقیوم خاں جو بہ حیثیت "عبدالقیوم خاں" کے تو زندہ ہیں مگر بہ حیثیتِ وزیرِ پاکستان "مرحوم" بلکہ "شہید" ہو چکے ہیں۔ انصاف اور جمہوریت کی ان دنوں بہت دہائی دے رہے ہیں۔ خان صاحب موصوف اگر تماشائی کی اس جرأت کو معاف فرمادیں تو وہ عرض کرنے کی جسارت کرے کہ اے خانِ محترم! جب آپ سرحد کے وزیرِ اعظم تھے اُس وقت آپ نے

ہیں کیا؟ انصاف اور جمہوریت کی کونسی ایسی قدر تھی جس کی آپ کے ہاتھوں مٹی پلید نہیں ہوئی۔ کئی سال تک آپ سرحد میں ہٹلر اور مسولینی بنے رہے ہیں اور حجاج ثقفی کے کارناموں میں جان ڈالتے رہے ہیں۔ کرسی چھنی تو اب آپ کو "انصاف اور جمہوریت" یاد آنے لگی۔

مانا کہ اقتدار میں خاصہ نشہ ہوتا ہے مگر پاکستان میں اس "نشہ" کی تیزی نہ پوچھئے کہ جو آتا ہے کوس لمن الملکی بجاتا ہوا آتا ہے۔ جیسے پاکستان کے عوام اس کے زرخرید غلام ہیں۔ اور غلاموں کے ساتھ آقا ہر طرح کا سلوک روا رکھ سکتا ہے مگر چرخ شعبدہ کار کی ایک ہی گردش جب اس نشہ کو اتار دیتی ہے اور "عزت مآبی" کی دستار "سر اقدس" سے چھین لی جاتی ہے تو پھر ضمیر کس تیزی کے ساتھ بیدار ہو جاتا ہے اور انسانیت کتنی جلد عود کر آتی ہے!

اور یہ جو پاکستان کے مرحوم "عزت مآب" کرسیاں چھن جانے کے بعد جمہوریت و انصاف کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔ ان میں سے شاید کسی ایک نے بھی اصول کی خاطر اقتدار کو خیر باد نہیں کہا۔ ان میں سے ہر شخص کو کرسی سے اتارا گیا ہے تو وہ اترا ہے۔ اترے ہوئے "شحنوں" کی پاکستان میں کوئی کمی نہیں! بلکہ ہر انقلاب اس تعداد میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر دیتا ہے۔

ہائے! یہ عبرت کی چلتی پھرتی تصویریں اور زوال نعمت کے بولتے چالتے مجسمے!

پاکستان میں ایسے ایسے "مولینا" بھی موجود ہیں جو ارباب اقتدار کو مبارکباد دینے کے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں کہ جہاں کوئی خاص بات ظہور میں آئی اور ادھر سے مبارکباد کے ایک دو "برقیے" جھٹ سے داغ دیئے۔ مصر کے ڈکٹیٹر کرنل ناصر کی ظلم و ستم اور اسلام دشمنی سب پر آشکارا ہے۔ اس شخص نے ظلم و شقاوت میں حجاج اور ابن ہبیرہ کو منزلوں پیچھے چھوڑ دیا ہے یہی حضرت (؟) مصر کا جابرانہ دستور بناتے ہیں اور اس پر از راہ کرم "اسلام" کا لیبل چپاں فرما دیتے ہیں۔ بس اس لیبل کو دیکھ کر ہی پاکستان کے بعض "مولینا" کرنل ناصر کو تبریک و تہنیت کے برقیے روانہ کر ڈالتے ہیں!

ان میں بعض ایسے "مولینا صاحبان" بھی ہیں کہ جو دستور ساز اسمبلی (پاکستان) کے توڑے جانے پر بھی مبارکباد دے چکے ہیں اور نیا مسودہ دستور جب منظر عام پر آتا ہے تو اس پر بھی تبریک و تحسین کے برقیے بھیجتے ہیں۔ ع

با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

کے معنی ٹھیک طور پر اب سمجھ میں آئے۔ مزاج شاہانہ کو ان "بزرگوں" سے زیادہ کوئی پہچان نہیں سکتا۔ دوسرے فنون و علوم میں تو یہ "جفت جفت" ہیں۔ مگر درباداری اور بڑے آدمیوں کی مزاج شناسی کے فن میں یہ حضرات "طاق" واقع ہوئے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی حریف نہیں، آپ اپنا جواب!

کوئی بڑا آدمی سوء اتفاق سے مر جائے ـــ توبہ! غلطی ہوئی تماشائی سے، بڑے آدمی بھلا کہیں مرا کرتے ہیں۔ یوں کہئے "پردہ کر جائے" ـــ تو ان میں کے بعض "مولینا" اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مرحوم کے ورثاء کا ٹیلیفون کب آتا ہے کہ "مولینا! جنازے کی نماز آپ کو پڑھانی ہوگی" ـــ یہی صورت حال شادی بیاہ میں بھی پیش آتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ان "رہبران ملت" کی یہ خواہش رہتی ہے کہ "نکاح ہم سے پڑھوایا جائے"! بہرحال ایک شادی میں نکاح ایک ہی شخص سے پڑھوایا جا سکتا ہے۔ جن "مولیناؤں" کو یہ رتبۂ بلند حاصل نہیں ہوتا، وہ ایسی تقریبات میں شروع سے آخر تک اس انداز میں تشریف فرما رہتے ہیں۔ ع

چھیڑیو مت کہ بھرے بیٹھے ہیں!

ایک "مولینا" صاحب کی صدارت میں کوئی جلسہ ہوتا ہے تو اُس کے توڑ پر دُوسرے "مولینا" صاحب اپنی صدارت میں جلسہ منعقد کراتے ہیں۔ اور تماشائی کے کانوں تک یہ بات بھی پہنچی ہے کہ جلسہ کے اشتہار میں اپنے "نام نامی" اور "اسم گرامی" کے ساتھ القاب بھی مولینا صاحب "ازراہِ تواضع وانکسار" اپنے قلم ہی سے تحریر فرما دیتے ہیں۔ اور اُن کا یہ "ایثار" القاب و آداب سوچنے اور پھر اُنھیں کاغذ پر لکھنے کی زحمت سے دُوسروں کو نجات دلا دیتا ہے!

تماشائی عرض کرتا ہے کہ اس میں "مولیناؤں" کا بھی آخر کیا قصور ہے۔ جیسے "عوام" ہیں ایسے ہی اُن کے "مولینا" بھی ہیں۔ جب ہر کوئی اپنی دُنیا بنانے کی فکر میں لگا ہوا ہے تو یہ "مولینا صاحبان" دُنیا کی لذتوں اور منفعتوں سے دست بردار آخر کس طرح ہو جائیں۔ اب رہی عقبیٰ سو اُس دن کے لئے اُن کی روحانی نسبتیں بہت کافی ہیں۔ ان نسبتوں کے ہوتے ہوئے آخرت کا کیا کھٹکا؟ یہ دردِ سری کیوں؟ اس اندیشے سے قبل از وقت اپنی جانوں کو ہلکان کس لئے کریں؟

شاعروں کا کہنا ہے کہ موسمِ بہار میں دیوانگی عود کر آتی ہے۔ اور لوگوں پر جنون کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ پاکستان میں موسمِ بہار کرکٹ کے ٹیسٹ میچوں کے ساتھ آتا ہے۔ اور اس موسم کے آتے ہی "دیوانگانِ کرکٹ" اپنے آپے میں نہیں رہتے۔ ہوٹلوں میں، ریسٹورانوں میں، دفتروں اور دکانوں میں شائقین کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے، کرکٹ کمنٹری میں سامعہ غرق! پاکستانی ٹیم کا کوئی کھلاڑی آؤٹ ہو گیا۔ تو اس خبر کے سنتے ہی چہروں پر غم کی بدلیاں چھا گئیں۔ اور کوئی اچھی خبر سُن لی تو خوشی میں آ کر تالیاں بجانے لگے بلکہ ناچنے لگے!

یہ تو ملک کے بالغوں اور عاقلوں کا عالم ہے اور بچوں کی یہ کیفیت کہ گلیوں اور سڑکوں پر یہاں تک کہ مکانوں کی چھتوں پر گیند بلا کھیلتے ہیں۔ وہ نوجوان جنہیں "حیدر" و "خالد" بننے کی تمنا کرنی چاہیئے تھی وہ "بریڈ مین" اور "سٹ کلف" بننا چاہتے ہیں۔ اور حکومت پُورے جوش کے ساتھ کرکٹ کے اس شوق کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے، جس قوم کے سامنے "مسئلہ کشمیر" جیسی مہم درپیش ہو۔ اس کا کرکٹ کی تفریح میں اُلجھ جانا، قوم کے مستقبل کے لئے نیک فال نہیں ہو سکتا!

اور ہمارے اخبار! اُن کی نہ پوچھئے۔ پرلے درجہ کے زمانہ ساز! ؏

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی!

یہ ہماری صحافت کا مسلک ہے! کرکٹ کے شوق کو پروان چڑھانے میں خود اُن کا بھی ہاتھ ہے! ان کا تو اخبار بکنا چاہیئے۔ خواہ وہ کرکٹ کمنٹری چھاپ کر بکے یا ایکٹرسوں کی نیم عُریاں تصاویر شائع کر کے فروخت ہو! یہ تو ہوا کا رُخ دیکھتے ہیں۔ ان میں "زمانہ ستیز" تو بہت ہی کم نکلیں گے۔ زیادہ تر "زمانہ ساز" ہی ہیں!

ہماری نظر میں

مراۃ القرآن فی لغات القرآن

"مراۃ القرآن فی لغات القرآن" تالیف:۔ مولانا حافظ عبدالحی کیلانی ضخامت ۵۶۴ صفحات (بڑا سائز) قیمت مجلد دس روپے۔ غیر مجلد آٹھ روپے ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اسلام، کشمیری بازار لاہور۔

کلام پاک کے اس نادر لغت کو جناب مولانا حافظ عبدالحی کیلانی نے بڑی محنت اور کد و کاوش کے ساتھ مرتب فرمایا ہے۔ کتاب کے شروع میں اُن الفاظ کی فہرست دے دی گئی ہے جو "مفردات" اور "فتح الرحمٰن" میں مفسرین سے چھوٹ گئے ہیں پھر انبیاء علیہم السلام کی مختصر سوانح درج ہیں۔ اس کے بعد اُن قوموں کا ذکر ہے جن کے نام اور حالات قرآن پاک میں آئے ہیں "اقوام القرآن" کے بعد عرب کا جغرافیہ ہے۔ پھر حروف عاملہ (اِذ، اَل، الی، اَم، فی، قد ۔۔۔۔) اور حروف مقطعات کی بحث ہے۔

الفاظ کے معنیٰ کی ایک جھلک:۔

مکث

۱-۱	فمکث غیر بعید	پس زیادہ دیر نہ کی	۲۷-۲۲
۱-۳	فیمکث فی الارض	سو باقی رہتا ہے زمین میں	۱۳-۱۷
۱-۱۱	قال لاهله امکثوا	کہا اپنے گھر والوں کو کہ ٹھہرو	۲۰-۱۰
۱-۱۵	انکم ماکثون	تم کو ہمیشہ رہنا ہے	۴۳-۷۷
	علیٰ مکث	ٹھہر ٹھہر کر	۱۷-۱۰۶
۱-۱۵	ماکثین فیه ابدا	جس میں رہا کریں ہمیشہ	۱۸-۳

مکث (یمکث، مکثاً و مکوثاً) ٹھہرا، رہائش اختیار کی۔ فا۔ ماکث اور مکیث۔ ج، مکثار و مکیثون ٹھہرنے والا، مکث اسم ہے۔

الفاظ کا یہ "لغت" اسی انداز پر مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں جو لفظ جتنی بار اور جس جس معنیٰ میں آیا ہے۔ ان کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

یہ لغت اُردو دانوں کے لئے تو کام کی چیز ہے ہی۔ مگر عربی داں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ فاضل مؤلف نے اس لغت کو ترتیب دے کر اور تالیف فرما کر قرآن کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

اسلامی فن تعمیر

"اسلامی فن تعمیر" از۔ ارنسٹ ٹامس ہیام رچمنڈ۔ ترجمہ:۔ سید مبارز الدین رفعت ایم اے (عثمانیہ)، ضخامت ۲۳۵ صفحات (عمارتوں کی متعدد تصویروں اور نقشوں کے ساتھ)، مجلد (رنگین گرد پوش)، کاغذ، کتابت و طباعت، ہر چیز خوب سے خوب تر۔ قیمت سات روپے (طباعت زیر اہتمام مکتبہ جام

لمیٹڈ دہلی، ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔

اسلامی فن تعمیر پر یہ معلومات آفریں کتاب انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ جسے سید مبارز الدین رفعت نے اُردو میں منتقل فرمایا ہے اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب :- پہلی صدی۔ تین پشتیں۔ دُوسرا باب :- قبۃ الصخرا[1]، سامرہ اور ابو دلف۔ تیسرا باب :- مصر میں ابن طولون۔ قیروان میں مسجد سدی عقبہ اور مسجد قرطبہ۔ فاطمی سازش اور قاہرہ کی بناء۔ چوتھا باب :- فاطمی اور ایوبی دَور۔ اور پانچواں باب :- عہد مملوک (۱۲۵۰ء سے لے کر ۱۵۱۷ء تک)۔

یہ کتاب ہے تو "مسلمانوں کے فن تعمیر" پر۔ مگر لائق مصنف جگہ جگہ تاریخی اشارات کرتا ہوا گزر گیا ہے۔ اسلامی تاریخ پر اس کی نظر خاصی عمیق معلوم ہوتی ہے۔ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں نے فن تعمیر میں کس تدریج کے ساتھ ترقی کی اور دُوسری قوموں کے "آرٹ" کا کس قدر اثر قبول کیا۔

عمارتوں کے نقشے دیئے ہیں اور زمین کے رقبہ سے لے کر ستونوں، کمانوں اور دیواروں کے عرض و طول کو بھی اعداد میں لکھ دیا ہے۔ جا بجا مقدسی، مقریزی اور ابن خلدون جیسے مشاہیر مورخوں اور جغرافیہ دانوں کے حوالے دیئے ہیں۔ مصنف نے کتاب کی تیاری میں بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ جس کے لئے وہ علمی دنیا کی طرف سے شکریہ کا مستحق ہے۔

اصل کتاب "فن تعمیر" پر ہے۔ اس لئے فنی اصطلاحات کو سلیس اور عام فہم اُردو میں منتقل کر دینا اپنی جگہ خود ایک بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کارنامہ کو لائق مترجم نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔

مترجم نے ترجمہ میں کتنی محنت کی ہے اس کا اندازہ اُن کے اس نوٹ سے کیا جا سکتا ہے :-

"اُردو میں TILE کا مترادف کوئی لفظ موجود نہیں۔ اہل ایران ایسے کام کو کاشان کی نسبت سے کاشی کاری کہتے ہیں۔ لیکن ٹائل (TILE) کے لئے خود اُن کے پاس بھی کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے اس لفظ کے لئے متعدد الفاظ پیش کئے ہیں۔ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو ٹائل کے مفہوم کو پُوری طرح ادا کرے۔ عربی میں قرمید اور طوب کے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن ٹائل کی بہ نسبت یہ الفاظ اردو دانوں کے لئے زیادہ نامانوس ہیں۔ اس لئے ٹائل کے لئے ٹائل اور TILEWORKS کے لئے کاشی کاری کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔" (صفحہ ۶۵)

کتاب فنی ہونے کے باوجود دلچسپ ہے۔ مگر جہاں یہ رنگ ہو وہاں "آرکی ٹکٹوں" (Architects) کے لئے تو بہت کچھ ہے۔ لیکن دُوسروں کو پڑھتے وقت بہت زیادہ سوچنا پڑتا ہے :-

"..... اس میں یہاں وقفہ وقفہ سے چھوٹے چھوٹے روزن دیئے گئے ہیں جو "میما" کہلاتے ہیں۔ یہ میما "دُوبیرونی مرغولوں کو جن سے حاشیہ بنتا ہے۔ گتھا کر ایک قاسم CAVITTO کے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ یہ پُورا حاشیہ خود بھی اُفقاً سیدھے اور بائیں بڑھنے سے پہلے سہ برگی کمان کے اُوپر روزن بناتا ہے اور پھر عموداً کمان کے بیرون کی طرف نیچے آتا ہے اور اس طرح پُورے سہ برگی سرے اور ایسے ہی عموداً اور اُفقاً آگے بڑھ کر محصورہ نمایاں کمان شانوں کیلئے ایک حائط چوکھٹا بناتا ہے۔" (صفحہ ۲۲۸)

یہ کتاب اُردو ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے اور شاید اپنے اس انداز کی پہلی کتاب ہے۔ مصنف اور مترجم[2] دونوں کی محنت اور کاوش قابل ستائش ہے۔

---

[1] کتاب کا یہی نام موزوں تھا۔ [2] کتاب میں جگہ جگہ "چھت" کو مذکر استعمال کیا گیا ہے "چھت" تو بالاتفاق "مؤنث" ہے۔

جماعت اسلامی کیخلاف فتوے بازی کی مہم

"جماعتِ اسلامی کے خلاف فتوے بازی کی مہم" از۔ وحید الدین خاں — ضخامت، ۳۲ صفحات۔ قیمت ڈھائی آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ اسلامی پبلشنگ ہاؤس۔ باقی منزل، بدرقہ اعظم گڑھ (یوپی) ہندوستان۔

ہندوستان کے بعض علماء نے جماعتِ اسلامی کے خلاف جو مورچہ قائم کیا ہے اور اس مورچہ سے فتاویٰ کی توپیں داغی جا رہی ہیں۔ اس کتابچہ میں اُن کا جائزہ لے کر بتایا گیا ہے کہ ان فتوؤں کی کوئی دینی اساس نہیں ہے اور جماعتِ اسلامی اقامتِ دین کی جدوجہد صحیح بنیادوں پر کر رہی ہے۔ اس کتابچہ میں جمعیتہ علماء (ہند) کے ذمہ دار اصحاب کے اُن بیانات کے اقتباسات دیئے ہیں جن میں یہاں تک کہا گیا تھا۔

"شرعی نظامِ اجتماعی کے بغیر مسلمان کی زندگی گویا اسلام کے تخیّل سے بھی خارج ہے۔"

یہ انگریز کے دَور کی باتیں تھیں۔ ہندو کے دورِ حکومت میں جمعیتہ علماءِ ہند نے "سیکولرزم" کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔ وہ انگریزی حکومت کی طرح ہندو راج کو باطل نہیں سمجھتی۔ اور اس کے بڑے بڑے مجاہدین اور شیوخ چُپ اور دَم سادھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ اُن کا اب یہ کام رہ گیا ہے کہ جو جماعت ان ناسازگار حالات میں بھی اقامتِ دین کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اُس کے خلاف مسلمانوں میں بدگمانیاں پھیلائیں اور اس کی گمراہی پر دلیلیں گھڑیں اور نکتے تراشیں۔

اس کتابچہ کا اندازِ بیان دل نشین ہے، جذبات کم اور دلائل زیادہ ہیں۔ ایک انصاف پسند انسان اس کا اچھا اثر قبول کرے گا۔

قربانی کی اہمیت

"قربانی کی اہمیت بروئے کتاب وسنّت" مؤلفہ:۔ مولانا محمد بہاء الحق قاسمی۔ ضخامت ۴۸ صفحات ڈاک کے ٹکٹ بھیجکر مؤلف سے (ماڈل ٹاؤن۔ لاہور) مفت مل سکتی ہے۔

منکرینِ حدیث نے دین کے بعض دوسرے مسائل کی طرح "قربانی" پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے۔ اور اپنے قلم کے زور سے اس دینی شعار کو جس پر پونے چودہ سو سال سے اُمتِ مسلمہ کا تعامل رہا ہے ایک فعلِ عبث ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتابچہ میں قربانی کی اہمیت و وجوب پر کتاب وسنّت کے ذریعہ دلیلیں لائی گئی ہیں۔ جن کا ماننا اور اُن پر عمل کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔

جماعت اسلامی کا عقیدہ، دعوت اور طریق کار

"جماعتِ اسلامی کا عقیدہ، دعوت اور طریقِ کار" از:۔ حکیم عبدالرحیم اشرف ضخامت ۸۴ صفحات (قیمت درج نہیں)، ملنے کا پتہ:۔ ہفت روزہ "المنیر" لائلپور۔

جماعتِ اسلامی کے بارے میں بعض علماء اور اہلِ صحافت نے طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔ اور اس پروپیگنڈے کا بعض اچھے خاصے سمجھدار لوگ شکار ہیں۔ جناب مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے جماعت کے منشور سے اُس کے جلسوں کی مطبوعہ رُوئیدادوں سے اور جماعتِ اسلامی کے اکابر کی تقریروں سے اقتباسات لے کر جماعت کے نصب العین، دعوت، طریقِ کار، اور دوسرے اوصاف اور خصوصیتوں کو واضح کیا ہے۔ فاضل مرتب کی یہ نہایت ہی مفید کوشش ہے جس کا ہر پہلو ایجابی ہے، اس کتابچہ کو پڑھ کر بہت کچھ غلط فہمیاں دُور ہو سکتی ہیں۔ مگر جن لوگوں نے جماعتِ اسلامی کی مخالفت کو اپنے پروگرام میں شامل کر رکھا ہے کہ کوئی کتنی ہی روشن دلیلیں کیوں نہ لے آئے ہمیں تو بہرحال مخالفت کرنی ہے تو وہ اپنے کو کمزور پوزیشن میں پاکر اور برافروختہ ہو جائیں گے اور اُن کا عناد اور بڑھ جائے گا!

یہ کتابچہ بروقت شائع ہوا ہے اور ہم اس کی ترتیب و تالیف پر مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں۔

قادیانی غلط بیانی

"قادیانی غلط بیانی"۔ مؤلفہ۔ پروفیسر الیاس برنی۔ ضخامت ۳۲ صفحات۔ (قیمت درج نہیں) ملنے کا پتہ:۔ بیت السلام، سیف آباد۔ حیدرآباد دکن۔

پروفیسر الیاس برنی نے فتنۂ قادیانیت کے خلاف جو قلمی جہاد کیا ہے۔ اس کی افادیت اور اہمیت کی کوئی حد و انتہا نہیں اور اُن کو اس کارِ خیر پر جو اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ملے گا اُس کا وہ خود بھی اندازہ کیا تصور تک نہیں کرسکتے۔ اس کتاب میں برنی صاحب نے تفصیل سے بتایا ہے کہ اُن کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" پر قادیانیوں نے جو اعتراضات وارد کئے ہیں۔ وہ خود قادیانی لٹریچر کی طرح غلط، لغو اور دُوسروں کو دھوکے میں ڈالنے والے ہیں۔

پروفیسر الیاس برنی کی مشہور تالیف "قادیانی مذہب" پر ایک اعتراض یہ بھی وارد کیا گیا ہے کہ اس میں جو اقتباسات درج ہیں وہ نامکمل ہیں اُن سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا جواب پروفیسر صاحب موصوف نے یہ دیا ہے:۔

"قادیانی کتابیں اور رسالے موجود ہیں، ہماری کتاب میں اقتباسات بھی موجود ہیں۔ ناظرین مقابلہ کرکے اطمینان کرلیں۔ یقین ہے کہ مقابلہ کے بعد وہ کمالِ تحقیق کی داد دیں گے۔ دُوسری صورت یہ ہے کہ خود قادیانی صاحبان خالی اعتراض کرنے کے بجائے اقتباسات مکمل کرکے شائع کردیں۔ جن سے غلط فہمی رفع ہوجائے۔۔۔۔۔"

قادیان کے بارے میں مرزا غلام احمد کی کتاب ازالہ اوہام کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"تین شہروں کا نام قرآن شریف میں اعزاز کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ مکہ، مدینہ، قادیان۔ یہ کشف تھا کہ کئی سال ہوئے مجھے دکھلایا گیا تھا۔"

یہ خرافات جس شخص کے قلم سے نکلی ہوں۔ اس کو جو کوئی نبی، مسیح موعود یا مجدد مانتا ہو تو اس کی عقل اور ایمان و وجدان پر ہزار بار پھٹکار!

ندائے القرآن

"ندا القرآن مع الفتاوی علی مسئلہ دوران القرآن"۔ مؤلفہ:۔ حکیم شمس الدین احمد قریشی۔ ضخامت ۲۴ صفحات۔ قیمت پانچ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ دار الاشاعت قریشی دواخانہ ٹیکسلا، ضلع راولپنڈی۔

اس کتابچہ میں قرآنِ پاک سے شغف رکھنے اور اس کی تعلیمات و احکام پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآنِ پاک ایک منشورِ اخلاق اور ضابطۂ حیات ہے مگر مسلمان اسے صرف تعویذ، گنڈوں اور جھاڑ پھونک میں استعمال کرتے ہیں۔

اس میں "حکم الاقساط فی حیلۃ الاسقاط" کے استفتاء کا جواب بھی موجود ہے۔

مرزائی دائرۂ اسلام سے خارج ہیں

"مرزائی دائرۂ اسلام سے خارج ہیں"۔ ضخامت ۲۴ صفحات، مجلس ختم نبوت خداداد کراچی سے مفت طلب کی جاسکتی ہے۔

جناب محمد اکبر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ جج راولپنڈی نے ۳۔ جون ۵۵ء کو ایک مسلمان مرد اور ایک قادیانی عورت کی شادی کے مقدمہ میں ایک فیصلہ صادر فرمایا کہ مرزائی دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ اس کتابچہ میں یہ فیصلہ پورے کا پورا درج ہے۔ فاضل جج نے اپنے فیصلہ میں قادیانی لٹریچر سے اقتباسات دیئے ہیں کہ مرزا کی نبوت کس نوعیت کی تھی، پورا فیصلہ پڑھنے کے قابل ہے۔

اسلامی زندگی

"اسلامی زندگی" از:- ملک نصر اللہ خاں عزیز (بی اے) مدیر "ایشیا" لاہور- ضخامت ۲۰۹ صفحات-
قیمت دو روپے چار آنے- ملنے کا پتہ:- کوثر بک ایجنسی، نزد تھانہ گوالمنڈی- لاہور

ملک نصر اللہ خاں عزیز (بی اے) ایک بے باک حق گو اور صاحب عزیمت اہلِ قلم ہیں کہ حق گوئی کے جرم میں انگریزی حکومت میں بھی انھیں جیلخانے کی سختیاں جھیلنی پڑیں اور پاکستان میں بھی اسی جرم کی انھیں سزا ملی- وہ مارشل لاء کے قیدی تھے مگر اس قید میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی معیت نے ان کے علمی شغف اور دینی جذبہ کو تیز تر کر دیا- صاحب موصوف نے اس فرصت سے یہ فائدہ اٹھایا کہ جیل خانہ میں ایک نہایت ہی مفید کتاب مرتب فرمادی- جو "اسلامی زندگی" کے نام سے منظرِ عام پر آئی ہے-

اس کتاب کے تین حصے ہیں ــــ عقائد و عبادات ــــ اخلاق و معاملات ــــ حکومت و سیاست ــــ پھر ہر حصہ کے بہت سے ذیلی عنوانات ہیں اور ہر عنوان کی تفصیل کسی نہ کسی تاریخی واقعہ پر مشتمل ہے- اس طرح یہ کتاب عملی نمونوں کا ایک زندہ مرقع بن گئی ہے- ایک ایک تاریخی واقعہ انتہائی اثر انگیز ہے- فاضل مؤلف نے نہ جانے کہاں کہاں سے ان جواہر پاروں کو چنا ہے اور پھر ان کو سلیقہ سے ترتیب دیا ہے- زبان انتہائی آسان اور اندازِ نگارش سلیس و دلنشین ہے- یہ کتاب ہر مسلم گھرانے میں بار پانے کی مستحق ہے- اور اس قابل ہے کہ لوگ ہدیوں اور تحفوں کی طرح اسے ایک دوسرے تک پہنچائیں ملک صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اپنے لئے نجات و مغفرت کا پروانہ حاصل کر لیا ہے-

(۱) حضرت عثمانؓ (۲) حضرت علیؓ

(۱) حضرت عثمانؓ- مولفہ انوار الحسن رؤفی ایم اے- ضخامت ۱۲۰ صفحات- قیمت ایک روپیہ
(۲) حضرت علیؓ- مولفہ انوار الحسن رؤفی ایم اے- ضخامت ۱۲۴ صفحات- قیمت ایک روپیہ- دونوں کتابیں "المکتبۃ العلمیہ" ۵ ایبک روڈ لاہور سے طلب کی جائیں-

جناب انوار الحسن رؤفی نے بچوں کی دینی اور اخلاقی تعلیم کیلئے متعدد کتابوں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے- یہ دونوں کتابیں بھی اسی سنہری ہار کی لڑیاں ہیں- فاضل مؤلف نے سہل اور سلیس انداز میں حضرت سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی مبارک سوانح حیات کو پیش کیا ہے اور بچوں کی نفسیات اور فہم کو ملحوظ رکھا ہے- یہ کتابیں بچوں کے اخلاق اور کردار کے سنوارنے اور بنانے میں یقیناً کارگر اور مفید ثابت ہوں گی-

زبان بھی شستہ اور روزمرہ کے مطابق ہے- دو ایک جگہ البتہ کھٹک پیدا ہوئی:-

"مسلمانوں کے دلوں میں کوئی گھاٹ نہ تھی- مگر مکہ کے کافروں کے دلوں میں گھاٹ تھی" (حضرت عثمانؓ- صـ ۴۸-۴۹)
"گھاٹ" غالباً "کھوٹ" اور نیتوں کے فساد کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے- "گھاٹ" اس معنی میں پہلی بار نظر سے گزرا-
"..... دین کے صحیح احکامات بتا کر....." (حضرت علیؓ- صـ ۵۵) "احکام" کی جمع الجمع "احکامات" کی غلطی چل پڑی ہے مگر اہلِ قلم احتیاط برتیں تو اس کا ازالہ ہو سکتا ہے-

یہ کتابیں اس کی مستحق ہیں کہ مسلمان گھرانوں میں ان کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے- کتابت اور طباعت کا بھی خاصہ اہتمام کیا گیا ہے- خاص طور سے بچوں کی سہولت کے لحاظ سے قلم جلی رکھا گیا ہے- اللہ تعالیٰ مؤلف اور ناشرین کو دارین میں اجر عطا فرمائے گا کہ اس فلم زدہ دور میں وہ اخلاق کی تبلیغ کر رہے ہیں اور مثالی کرداروں اور مقدس شخصیتوں کو ادب و تاریخ کے منظر پر لا رہے ہیں-

---

ل صفحہ ۱۹ پر "مسلم بن یسار" کتابت میں "مسلم بن سیار" ہو گیا-

جہاں آراء بیگم

"جہاں آراء بیگم" از:- ضیاء الدین احمد برنی بی اے، ضخامت ۱۶۴ صفحے، سفید کاغذ پر ٹائپ میں - (مجلد، گرد پوش کے ساتھ)، قیمت دو روپے دس آنہ - ملنے کا پتہ:- تعلیمی مرکز- ۵۰۱ گیدومل لیکھراج روڈ- نزد مولد یا مسافر خانہ، کراچی ۲-

یہ کتاب اب سے چونتیس سال پہلے شائع ہوئی تھی، اب لائق مصنّف نے ضروری ترمیموں اور مفید اضافوں کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا ہے، یُوں سمجھئے کہ آئینہ گرنے پہلے کے بنائے ہوئے آئینہ پر دوبارہ صیقل کرکے اور اُس کی جھائیاں نکال کر اُسے پہلے سے زیادہ مجلی اور تابناک بنا دیا ہے۔

بعض بد باطن انگریزی مورخوں نے شاہجہاں کی اس نام آور اور شریف بیٹی کو بدنام کرنے کے لئے طرح طرح کی تہمتیں تراشی ہیں - یہ کتاب اُن تمام تہمتوں کا جواب ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُن الزاموں اور تہمتوں کا ذکر کرکے اُن کی تردید کی گئی ہے بلکہ سیرت نگاری کی یہ ایک مثبت کوشش ہے- اس کتاب کو پڑھ کر "جہاں آراء" کی شخصیت کے جوہر کھلتے ہیں کہ اس خاتون میں کتنی صلاحیتیں اور خوبیاں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کی تھیں- برنی صاحب نے بڑی کوشش سے واقعات جمع کئے ہیں اور سلیس انداز میں پیش کردیئے ہیں -

مصنّف کو لفظ "خوبصورت" بہت پسند ہے، اسے وہ بار بار لائے ہیں- "خوبصورت خصائل (صفحہ ۳۴) اور "خوبصورت کام" (صفحہ ۲۱) میں "خوبصورت" کا استعمال وجدان کو کھٹکتا ہے ــــ "جس ایوبی صبر اور استقلال کے ساتھ جہاں آراء نے اپنی طول طویل اور خوفناک بیماری کی تکلیفیں برداشت کیں" (صفحہ ۲۷) "ایوبی صبر" میں مبالغہ نمایاں ہے ــــ "خاندانی شیرازہ ایک مرتبہ ٹوٹنے کے بعد پھر سے جڑ جائے" (صفحہ ۵۶) "شیرازہ" کیلئے بکھرنا اور منتشر ہونا بولتے ہیں- "ٹوٹنا" پہلی بار نظر سے گزرا۔

"فلاح عامہ" (صفحہ ۷۰) کی جگہ "رفاہِ عامہ" زیادہ بہتر تھا ــــ "جہاں آراء متدین اور فیاض شاہزادی تھی" (صفحہ ۷۰) "متدین" کی صفت کا استعمال اس صورت میں موزوں اور مناسب تھا جب یہ ثابت ہوتا کہ جہاں آراء سے بیت المال یا خزانہ شاہی کی کوئی خدمت متعلق تھی، یا لوگوں کی امانتیں اُس کے پاس رہتی تھیں اور اُس نے "تدین" کا ثبوت دیا۔

مونس الارواح کے اقتباسات اور جہاں آراء کے بعض خطوط کتاب میں شامل ہو جانے سے اُس کی تاریخی حیثیت اور بلند ہوگئی ہے- جہاں آراء کے سفر اجمیر کا ایک اقتباس:-

> "خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ماہ رمضان کی چودھویں تاریخ کو جمعرات کے دن مجھے حضرت پیر دستگیر کے مرقدِ منوّر کی زیارت نصیب ہوئی- دن کا ایک پہر رہ گیا تھا کہ میں روضہ مقدسہ میں گئی اور اپنے زرد چہرے کو اس آستان کی خاک پر ملتی رہی اور دروازہ سے گنبدِ مبارک تک ننگے پیر زمین کو بوسے دیتے ہوئے چلی اور گنبد میں جا داخل ہوئی- اس فقیرہ نے مرقدِ مبارک کے سات چکّر کاٹے ......"

یہی وہ "بدعات و خرافات" ہیں جو "بڑے آدمیوں" کی دیکھا دیکھی عوام میں پھیلی ہیں- مصنّف کو اس پر نوٹ ضرور دینا چاہئے تھا- بیت اللہ کے سوا کسی مقدس مقام کا "طواف" جائز نہیں ہے- عقیدت کی یہ وہ مبالغہ آمیزیاں ہیں، جنھوں نے رفتہ رفتہ "بدعات" کے قلعے کھڑے کردیئے ہیں

آسان ریاضی (حصہ سوم)

"آسان ریاضی" (حصہ سوم) از: شوکت علی بی اے، ایل ٹی۔ ضخامت ۱۴۲ صفحات۔ قیمت بارہ آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ مرکزی درسگاہ جماعت اسلامی رام پور۔ (یوپی)

بچوں کے لئے ریاضی کی یہ کتاب انتہائی آسان انداز میں مرتب کی گئی ہے۔ سوالات، اور مشقوں میں بچوں کی نفسیات کا خاصہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ "ریاضی" ایک خشک علم ہے۔ اس لئے لائق مرتب نے ان پتھروں کو پانی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ریاضی کی کتاب میں بھی دینی تصورات کو باقی رکھا ہے ــــ چند سوالات:۔

ــــ حضرت عبادہؓ بن صامت نے ۱۸۱ حدیثیں بیان کیں اور حضرت نعمانؓ بن بشیر نے ۱۲۴۔ بتاؤ حضرت عبادہؓ نے کتنی حدیثیں زیادہ بیان کیں؟

ــــ ۱۲۰ نمازی ۸ صفوں[ف] میں برابر کھڑے ہوئے۔ بتاؤ ہر صف میں کتنے نمازی ہیں؟

ــــ ہماری مسجد کی چوڑائی میں ۵ گز لمبی چٹائی بچھتی ہے اور ۲ فٹ جگہ خالی رہتی ہے۔ بتاؤ مسجد کتنی چوڑی ہے؟

ــــ جنازے کی نماز میں پندرہ پندرہ آدمیوں کی ۴ صفیں کھڑی ہوئیں۔ لیکن امام نے انھیں ۵ صفوں میں برابر برابر کھڑا کردیا۔ بتاؤ اب ہر صف میں کتنے آدمی ہیں؟

جو خدا کے نیک بندے دین کو اس اس طرح سے دلوں میں اتار رہے ہیں بلکہ بچوں کو گھٹی میں پلا رہے ہیں ان کو بعض خود نما مفتی اور چودھویں صدی کے "قسیسین" بے دین اور گمراہ بتاتے ہیں۔! ع

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد!

ف: یہ "صفوں" کے بجائے "صفحوں" کتابت کی غلطی ہے۔

تذکرہ کا سالنامہ

نہایت آب و تاب کے ساتھ

یکم مارچ کو شائع ہو رہا ہے

- یہ اشاعتِ خاص اپنی مثال آپ ہوگی۔ گوناگوں اقسام کے سنجیدہ اور دلچسپ مضامین۔ بیش بہا علمی مقالات۔ اصلاحی افسانے۔ اور تعمیری غزلیات و منظومات اس کی زینت ہیں۔
- ہر مکتبِ خیال کے نامور علماء اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ ہر حلقۂ فکر کے مشاہیر اہلِ قلم نے اس کو زرنگار بنایا ہے، ہند و پاک کے مشہور و معروف ادباء اور بلند پایہ شعراء کے رشحاتِ قلم اس میں شامل ہیں۔ صحافتی دُنیا میں یہ خاص نمبر ایک یادگار ہوگا۔

چند لکھنے والے:۔

حسن وارثی ۔ وصی احمد بلگرامی ۔ ماہر القادری ۔ نعیم صدیقی ۔ خواجہ محمد شفیع دہلوی، علامہ تمنا عمادی ۔ م۔ نسیم ۔ مولانا غلام حسنین ندوی ۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی ۔ پروفیسر عبدالحمید ۔ بہزاد لکھنوی ۔ مولانا افتخار احمد بلخی ۔ مولانا اخگر ملتانی ۔ قاضی محمد زاہد الحسینی ۔ ظفر عالمگیر ۔ اختر ضیائی ۔ غلام یعقوب انور ۔ ابن فرید ۔ محمد مظہر بقا ۔ مولانا سعد حسن یوسفی ۔ عبدالسلام نعمانی ۔ محمود احمد برکاتی ۔ سید امیر حسن نورانی ۔ آغا صادق ۔ گوپال متل ۔ عبیداللہ قدسی ۔ ابوالبیان حماد ۔ اعجاز الحق قدوسی ۔ یوسف الاعظمی ۔ محمد صدیق قریشی ۔ معراج محمد بارق ۔ آغا عادل ندیم ۔ وغیرہ وغیرہ۔

دلکش سہ رنگا سرورق — بہترین کتابت — اعلیٰ طباعت۔

ضخامت دو سو صفحات۔ قیمت صرف ایک روپیہ ۔ سالانہ چندہ چار روپے

مستقل خریدار حضرات کی خدمت میں یہ سالنامہ مفت روانہ ہوگا۔

نئے خریدار اور ایجنٹ حضرات آرڈر دینے میں جلدی فرمائیں۔

دفتر ماہنامہ "تذکرہ"۔ آرام باغ ۔ کراچی

چمکدار لیکن

سکون بخش

حی سنز کے لیمپ قلیل مدت میں تمام پاکستان میں پھیل گئے
آپ انہیں مکانوں، آفسوں اور فیکٹریوں میں ہر جگہ پائیں گے در حقیقت
ایک اعلیٰ درجہ کی چیز عوام کی خدمت کیلئے پیش کی گئی ہے۔ آپ
حی سنز ہی استعمال کیجئے اس لئے کہ یہ بہترین ہیں۔

پاکستان میں بنے ہوئے

حی سنز
لیمپ

حی سنز الیکٹرک کمپنی لمیٹڈ

H.P.S.L

رحمٰن پرنٹنگ پریس کراچی